جلد - ۵۶ - شمارہ نمبر ۱، ۲، ۳

آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ ۱۹۸۵ء

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغازِ (بیاں)
جو بڑا ہی رحم والا ہے، نہایت مہرباں
(علامہ سیماب اکبرآبادی)

مکمل منظوم ترجمہ، قرآن مجید "وحیِ منظوم" سے

HIMACHAL

A quiet, captivating world.

A world, where your mind will roam fancy-free amidst enchanting Nature . lush green valleys . clear sun or misty snows A world made of many wonders. Legends & folk-lore Flora & fauna. Ancient temples & rituals

Whatever the season, you'll be comfortably placed Himachal offers all facilities of good accommodation, including top class hotels, tourist bungalows, log huts, dormitories, honeymoon cottages. Transport, finest food, sports, recreation . everything you need for a grand holiday

JUST MAKE UP YOUR MIND AND LEAVE THE REST TO US

AVAIL CONDUCTED TOURS IN HIMACHAL TOURISM LUXURY COACHES/CARS

Tourist Lodge, Mandi

Tourist Bungalow Khajjiar

Log hut, Manali
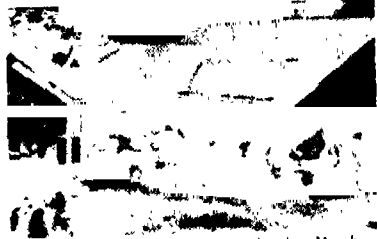
Himachal Pradesh Tourism Development Corporation Limited

Ritz Annexe, Simla-171001. Phones 3294, 3977, 5071

Neugal Cafe, Palampur

Chail Palace, Chail

For detailed information and reservations, please contact Himachal Tourism Offices at :

NEW DELHI : Chanderlok Bldg 36, Janpath Tel. 345320. CALCUTTA 16 Liaison officer, 25 Camac Street. Tel 446847.
BOMBAY . Shop No 2, Trade Centre, Arcade World Trade Centre, Cuffe Parade, Colaba, Bombay 400 005 Tel 219191 284.
MADRAS . 14, Ganga Nagar, Kodambakkam, Madras Tel 423214. CHANDIGARH S C O 1048 49, Sector 22 B, Tel 26494
SIMLA · The Mall Tel: 3311 & 3956. Kulu. Ph · 7. Manali:Ph 25. Dalhousie Ph 36. Kasauli. Ph 7. Dharamsala Ph. 363.

Compacta

علامہ سیماب اکبر آبادی شاعر (آگرہ) کے دفتر میں

اعجاز صدیقی

۱۹۱۱ء (آگرہ) — ۹ فروری ۱۹۷۸ء (بمبئی)

منظر صدیقی

۱۹۰۶ء (آگرہ) — ۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء (کراچی)

تاجدار احتشام صدیقی

۷ اگست ۱۹۴۰ء (آگرہ) — ۴ فروری ۱۹۸۱ء دہران

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی - علامہ سیماب اکبر آبادی (مرحوم)

بہ یادگار - اعجاز صدیقی (مرحوم)

اشاعت کا ۵۶ واں سال ● علمی، ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

جلد — ۵۶ ◎ شمارہ ۱-۲-۳

آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ

۸۵ — ۶ — ۱۹

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زر سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالک غیر سے
۴۰ روپے	۱۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

قیمت: افتتاحی شمارہ — ۹ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶،
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

ترتیب

انتساب

ان خوابوں کے نام جو شاعر کے بانی علامہ سیماب اکبرآبادی، مدیرِ اوّل منظر صدیقی، روحِ شاعر اعجاز صدیقی اور تازہ کار ذہن تاجدار احتشام صدیقی نے اپنی پل پل گذرتی ہوئی سانسوں میں پِروئے تھے لیکن ان بزرگوں کے بہت سے خواب ادھورے ہی رہ گئے تھے اِدھر سخت جان اردو کی طرح شاعر بھی باقی بچ رہا۔

مگر

اب ۱۹۸۵ء میں نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ شاعر کو پیش کرتے ہوئے ہم اپنے بزرگوں کے ادھورے خوابوں کی تکمیل کی طرف پیش رفت کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اردو کی اس عظیم ادبی روایت نے تیسری نسل کو بھی صرف خواب ہی دیئے ہیں یا پھر حوصلہ مندی اور قربانیوں کی ایک بے مثال روایت جو محدود ترین وسائل اور نامساعد حالات کے نشیب و فراز سے گذرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔

اعجاز صدیقی

ترانۂ اردو

اردو زبان کے متعلق ہندوستانی شعراء نے نظمیں تو بہت لکھی ہیں، لیکن اب تک اردو کا ایسا کوئی ترانہ نہیں لکھا گیا جو اس بڑی، مکمل اور خوبصورت مگر مظلوم زبان کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ جس سے ہماری اٹوٹ محبت کے جذبات کا اظہار ہو، قبلہ اعجاز صدیقی مرحوم نے ۱۹۶۷ء میں یہ ترانہ تخلیق کیا تھا موجودہ حالات میں یہ ترانۂ اردو ہمارے جذبات و تاثرات کی بھرپور عکاسی کر سکے گا۔ ہم درخواست کریں گے کہ پورے ہندوستان میں جب بھی اردو کا کوئی چھوٹا بڑا جلسہ ہو، مشاعرہ ہو وہ اسی ترانے سے شروع کیا جائے۔ اس ترانے کو زبان زدِ خاص و عام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو اسکولوں، کالجوں اور اردو کے تمام اداروں، اکاڈمیوں اور انجمنوں میں اسے ہر طرح سے نمایاں کیا جائے، اسے اردو کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ ہم اردو کے تمام چھوٹے بڑے اخبارات اور ادبی و نیم ادبی رسائل کے مدیران سے بھی درخواست گذار ہیں کہ وہ ترانۂ اردو کو اپنے یہاں نمایاں طور پر شائع فرمائیں تاکہ پوری اردو دنیا تک یہ ترانہ پہنچ سکے اور تمام اردو والوں کی آواز بن جائے۔ اس طرح نہ صرف دوسروں پر ہمارے دلی جذبات کا اظہار ہو سکے گا۔ بلکہ ہماری قومی اور لسانی حمیت بھی بیدار ہو گی۔ ترانۂ اردو تنہا بھی گایا جا سکتا ہے۔ اور کورس میں بھی ——— (ادارہ)

ہوگی گواہ، خاکِ ہندوستاں ہماری　　اِس کی کیاریوں سے پھوٹی زباں ہماری

ہندو ہوں یا مسلماں، عیسائی ہوں کہ سکھ ہوں　　اردُو زباں کے ہم ہیں، اردو زباں ہماری

مرنا بھی ساتھ اِس کے، جینا بھی ساتھ اِس کے　　ہم اس کے ہیں محافظ، یہ پاسباں ہماری

خسرو، کبیر و تلسی، غالب کی ہے امانت　　کیا بے نشان ہو گی پیاری زباں ہماری؟

قند و نبات سے ہے بڑھ کر مٹھاس اِس کی　　ہر دَور میں رہی ہے، یہ دِلستاں ہماری

اس میں ٹنکے ہوئے ہیں کتنے حسیں ستارے!　　قوموں کی کہکشاں ہے اردُو زباں ہماری

پھر چاہتا ہے اس کو دورِ جہاں مٹانا　　ہوگی رقم لہو سے پھر داستاں ہماری؟

ہیں جان سے بھی زیادہ ہم کو عزیز دونوں　　ہندوستاں ہمارا، اردُو زباں ہماری

وہ بھی تو ایک دن تھا، ہم میرِ کارواں تھے!　　تقلید کر رہا تھا، ہر کارواں ہماری

ہم تو ہر اک زباں کو دیتے ہیں پیار اپنا　　پھر کس لئے مٹائے کوئی، زباں ہماری؟

ہم ضبط کی حدوں سے آگے نکل چکے ہیں　　کب تک یہ آزمائش اے آسماں ہماری؟

اعجاز مل کے گائیں اردو کا سب ترانہ
گونجے فضا میں ہر سو "اردُو زباں ہماری"

کالیداس گپتا رضا — غیاث احمد گدی — یوسف ناظم

بلراج کومل — عمیق حنفی — سریندر پرکاش

شہریار — رشید امجد — نشتر خانقاہی

نوٹ!

آفسیٹ کے اس افتتاحی شمارے کے ساتھ ہم ادبی رسائل کی روایتی نہج کو کچھ اور نئی سمتیں دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

شاعر نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۸۴ء تک کے صحافتی سفر میں صوری و معنوی سطح پر بہت سے تجربے کئے ہیں، کئی نئے سلسلے اور نئے ابواب شروع کئے۔ بندھی ٹکی ڈگر سے ہٹ کر ہر دور میں انفرادیت کے نئے سنگ میل قائم کئے۔ بعض وہ سلسلے جو شاعر (۱۹۳۰ - ۵۰ آگرہ) کے ابتدائی برسوں میں بے حد مقبول رہے تھے۔ ہم ان سلسلوں کو نئے انداز سے دوبارہ شروع کر رہے ہیں، جیسے "نئی پرانی عکسی تحریریں"، "خطوط"، "تصاویر"، "تحقیق و تصحیح" وغیرہ، وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی ہم شاعر کو اور زیادہ وقیع اور معیاری بنانے میں مصروف ہیں۔ اس شمارے سے جو سلسلے شروع کئے جا رہے ہیں اس کے لئے ہم آپ کے مشوروں اور تعاون کے خواستگار ہیں حالانکہ خود ہمارے پاس بے شمار پرانی تحریریں، خطوط اور تصاویر وغیرہ موجود ہیں۔ لیکن ہمارا یہ قیمتی ادبی سرمایہ نہایت ہی غیر محفوظ اور بے ترتیب پڑا ہوا ہے۔ اس بے سروسامانی نے ایک راہ یہ سجھائی ہے کہ شاعر کے صفحات میں اس بیش قیمت سرمائے کو محفوظ کر دیا جائے لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔

چنانچہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی ہمیں نایاب خطوط، تحریریں اور تصاویر ارسال فرمائیں۔ شائع ہو جانے کے بعد ہم اسے بحفاظت آپ تک پہنچا دیں گے۔ سیماب اکبرآبادی اور اعجاز صدیقی کے خطوط اور پرانی تحریروں کی بھی ہمیں ضرورت ہے۔ شاعر میں کی جانے والی تبدیلیوں کا تمام تر تعلق آپ کے تعاون پر ہے اور ہمیں آپ کے تعاون کا انتظار رہے گا۔ OO

شاعر کی مجلسِ ادارت کے رکن آغا رشید مرزا بھی خواب ہوئے یہ تصویر قبلہ اعجاز صدیقی
کے سفرِ کلکتہ کی یادگار ہے جو مرحوم آغا صاحب کے گھر پر لی گئی تھی۔

شعر و افسانہ کے دو بڑے نام فیض احمد فیض اور کرشن چندر

حیدرآباد۔ دکن
ملے پلی ۲۰۴ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۰ء

مکرمی۔ تسلیم

حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کی تازہ تصنیف دستور الاصلاح میری نظر سے گزری۔ مولانا موصوف نے اس بیش بہا تصنیف سے دنیائے ادب کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ یہ کتاب صرف تلامذہ ہی کی حد تک قابل استفادہ نہیں بلکہ اساتذۂ فن کیلئے بھی بہت کچھ مفید ہے۔ اس کتاب میں دورِ قدیم سے عصر حاضر تک کے اساتذہ کی اصلاح کے نمونے پیش کئے گئے ہیں اور علامۂ موصوف نے ہر اصلاح کی توجیہہ فرماتے ہوئے اصلاحات کے حسن و قبح پر بھی غائر نظر ڈالی ہے اور یہ بھی جا بجا ظاہر فرمایا ہے کہ اگر وہ خود اصلاح فرماتے تو کس انداز سے فرماتے اور پھر اصلاح شدہ شعر کیا ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب جہاں ادبی معلومات کا ایک دلچسپ ذخیرہ ہے جہاں علمائے اصلاح کے دامن میلئے مشعل ہدایت ہے وہاں اُن شعرا کو جو ابھی شاگردی کی منزل سے نہیں گزرے استاد کے انتخاب کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا ایک قابل قدر وسیلہ ہے۔ غرضکہ مختصراً یہ اساتذہ کیلئے راہ نما اور شاگردوں کیلئے راہبر نما ہے۔ میں اساتذہ کو تو اس کتاب کی خریداری کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ڈرتا ہوں مگر یہ ضرور کہونگا کہ طبقۂ تلامذہ کو اس کتاب سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے۔

ضیا رشید فانی

● **علامہ سیماب اکبرآبادی کی معرکۃ الآرا تصنیف دستور الاصلاح (۱۹۴۰ء)**
پر اس دور کے مقتدر اساتذہ اور ارباب علم و فن نے بڑی تعداد میں اظہار خیال کیا تھا۔ اسی سلسلے کی یہ عکسی تحریر فانی بدایونی مرحوم کی یادگار کے طور پر نذر قارئین ہے۔

شاعر کا مذہب

مجھے کانٹوں سے ہے دلبستگی پھولوں سے الفت ہے
عقیدت میں مری کل کائنات اک بزمِ فطرت ہے

نہیں محدود رسم و راہ تک ذہنِ رسا میرا
ہو گرد آلود کیوں ان لغزشوں سے آئینا میرا

کلیسا میں بھی مجھ کو موقعِ تکمیلِ مستی ہے
مجھے محرابِ کعبہ میں بھی اذنِ بت پرستی ہے

مجھے اس بزمِ فطرت میں ہے آزادی نظاروں کی
پھرا کرتا ہوں سرخوش انجمن میں چاند تاروں کی

سمجھتا ہوں کہ ہر انساں کے دل کا آئینا میں ہوں
نہیں نفرت کسی سے وہ نگاہِ آشنا میں ہوں

خیالوں میں مرے وسعت نہیں محدود، بعید ہے
یہ ساری بزمِ عالم وقفِ سجدہ میرا معبد ہے

قیودِ سبحہ و زنار سے بھی ماورا ہوں میں
تعین کی حدیں ٹھکرا کے آگے بڑھ گیا ہوں میں

مجھے مطلب نہیں دیر و حرم کی تنگ راہی سے
براہِ راست ہے رشتہ مرا عرشِ الٰہی سے

خدا کا نام لے کر توڑتی ہیں میری تکبیریں
یہ کس نے ڈال دی ہیں پاؤں میں انساں کے زنجیریں؟

کرو اعلان ہے فطرت ہی مذہب نوعِ انساں کا
مری ملت میں جھگڑا ہی نہیں ہے کفر و ایماں کا

پھر اس اعلان میں گنجائشِ چون و چرا کب ہے
کہ جو فطرت کا مذہب ہے وہی شاعر کا مذہب ہے

علامہ سیماب اکبرآبادی

"کارِ امروز" (۱۹۳۴ء) کا ایک زرّیں ورق

منظر صدیقی اکبر آبادی

شمشاد حسین منظر صدیقی اکبر آبادی (خلفِ اکبر علامہ سیماب اکبر آبادی) نے ۱۹۲۳ء سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ رسالہ "پیمانہ" اور "تاج" (آگرہ) کے ناظم رہے۔ ۱۹۳۰ء میں شاعر کا اجرار کیا گیا تو منظر صاحب اس کے مدیر مقرر ہوئے اور کئی سال تک شاعر کو سنوارتے نکھارتے رہے۔ ماہنامہ "ثریا" اور "مشورہ" کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ایک اور منفرد ماہنامہ "کنول" (۱۹۳۵ء آگرہ) اپنی ادارت میں جاری کیا۔ منظر صاحب کے ساتھ ضیا فتح آبادی بھی ادارت میں شامل تھے اور سعادت حسن منٹو کا بھرپور تعاون بھی حاصل تھا۔ شاعر، سیماب و اعجاز کے ساتھ ساتھ منظر صدیقی مرحوم کے خوابوں کا بھی ثمر ہے۔ منظر صاحب نے بہت کچھ سرمایہ نثر و نظم اپنے بعد چھوڑا ہے۔ کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا تاہم افسانوں کے کئی چھوٹے بڑے مجموعے "عبرت کے آنسو" "دوست" "لالہ زار" وغیرہ اور ایک کتاب "عام فہم عروض" کے نام سے مشہور ہوئی۔ (ادارہ)

(۱)

انسان خود نمائی میں گر مبتلا نہ ہو
راہِ طلب میں ایک قدم بھی خطا نہ ہو

اب میں ہوں اور گردشِ لیل و نہار ہے
یارب مری طرح کوئی بے آسرا نہ ہو

یوں بے نیاز مجھ سے نہ ہو جانِ آرزو
میں اعتبارِ حسن ہوں مجھ سے خفا نہ ہو

یہ کیوں نہ ہو کہ شورشِ غم سے تھکے نہ دل
ایسا ہو کیا کہ دردِ محبت سوا نہ ہو

میں اور التجائے کرم آپ سے کروں!
یہ بھیک دیجیے اُسے جس کا خدا نہ ہو

یہ چاہتا ہوں مجھ سے کیا جائے بار بار
وہ ناروا سلوک جو اب تک روا نہ ہو

رسمِ جہاں یہ ہے کہ سہے جا غمِ حیات
آئینِ ضبط یہ ہے کہ شکوہ سرا نہ ہو

کیسے کہوں کہ زندہ رہوں گا کچھ اور دن!
منظر جو "ہم مزاج" ہی آب و ہوا نہ ہو

[شاعر ۱۹۴۷ء (بمبئی)]

(۲)

گل بار و گل نگار ہر اک گلستاں رہے
اے حسنِ دوست تو جو شریکِ خزاں رہے

یا میرا حال پوچھنے والا کوئی نہ ہو!
یا ساری کائنات شریکِ فغاں رہے

ناکامیوں نے فارغِ احساس کر دیا
اب تم رہو کہ دل میں غمِ دو جہاں رہے

جس پر قفس بھی بار، نشیمن کبھی تنگ ہو
وہ نامراد موسمِ گل میں کہاں رہے

ہونٹوں تک آچکی ہے مری روحِ بے قرار
کچھ دیر کوئی اور یونہی نغمہ خواں رہے

جب میں نہ تھا تو دل کا تعین محال تھا
جب دل نہ تھا تو آپ کے جلوے کہاں رہے

منظر مآلِ دردِ محبت کی فکر کیا؟
اب یہ دعا کرو کہ محبت جواں رہے

[شاعر ۱۹۳۳ء (آگرہ)]

سُریلی بانسری کا آخری تصحیح شدہ نسخہ

کالیداس گپتا رضا ۲-۱ اے ، جل درشن ، ۳۴ اے ، چوتھا منزلہ ، نیپنسی روڈ ۔ بمبئی ۔ ۶

سیّد انور حسین آرزوؔ (ولادت ۱۶؍ فروری ۱۸۷۳ء بارہ دری مادھورام لکھنؤ ـــــ وفات ۱۶؍ اپریل ۱۹۵۱ء کراچی پاکستان) کا یہ دیوان جو خالص اردو میں ہے ، آرزوؔ صاحب کی تصانیف میں خاص مقام رکھتا ہے ۔ یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں رسوم الخط میں چھپی تھی ۔ اردو میں پہلی بار نظامی پریس ، لکھنؤ میں ۱۹۳۸ء میں چھپی اور دوسری بار قادری پریس بمبئی سے چھپی اور تاج آفس سے شائع ہوئی ۔ اس ایڈیشن پر سالِ طباعت درج نہیں مگر قرائن سے پتا چلتا ہے کہ یہ ۱۹۴۸ء کے شروع میں شائع ہوئی ہوگی ۔ اردو کے یہی دو ایڈیشن ہیں جو آرزوؔ صاحب کی زندگی میں چھپے ۔ ۱۹۳۸ء ہی میں اسے انڈین بک ڈپو نے دیوناگری لیپی میں چھاپا ۔ مقدّمے میں سیّد علی عباس حسین مرحوم لکھتے ہیں ۔

" ان (آرزوؔ صاحب) کے شاگرد اخگرؔ صاحب وکیل نے ان کو لکھا کہ میر تقی میرؔ کا یہ شعر ؎

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو ـــ رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے[1] جس زبان میں کہا گیا ہے ، اسی زبان میں آپ پوری غزل لکھئے ۔ آرزوؔ صاحب نے پوری غزل لکھ ڈالی ۔ جس جس نے اسے سنا وہ پھڑک اٹھا ۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی نے بھی سُنا ۔ انہوں نے آرزوؔ صاحب سے فرمائش کی کہ اسی زبان میں سَو غزلیں کہیئے ۔ اردو کے مشہور پرچے " ادب " نے جو اس زمانے میں سیّد اعظم حسین صاحب لکھنؤ سے نکالتے تھے ، ان غزلوں کو ملک بھر میں پھیلانا شروع کر دیا اور میرے سے سر پھرے دوستوں نے آرزوؔ صاحب کا سر کھا لیا کہ سب کچھ کہنا چھوڑ دیجئے بس یہی کہئے ۔ ان سب باتوں کا پھل یہ ہوا کہ آرزوؔ صاحب نے لگ بھگ سوا سو غزلیں اور دو تین کہانیاں اسی زبان میں لکھ ڈالیں ۔ وہ سب اس کتاب میں آپ کے سامنے ہیں "

داستانِ آرزو [از ذاکر حسین فاروقی بحوالہ آرزوؔ لکھنوی از مجاہد حسین حسینی ص ۱۹۸] میں درج ہے کہ جب آرزوؔ کی خالص اردو والی غزلیں مشہور ہوئیں تو

" شدہ شدہ یہ خبر اردو کے بڑے محسن ، سرتیج بہادر سپرو تک پہنچی اور انہوں نے یہ فرمائش کی کہ کم از کم سَو غزلیں اسی طرز میں ہو جائیں تو ان کا ایک علاحدہ مجموعہ شائع کر دیا جائے ۔ آرزوؔ صاحب نے اسے قبول کیا اور یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ جب غزل کہنے بیٹھتے تو ایک عام مروّجہ زبان میں کہتے اور دوسری خالص اردو میں ۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ سو غزلوں کا ایک دیوان خالص اردو میں تیار ہو گیا "

جناب پرتوؔ لکھنوی جانشینِ آرزوؔ لکھنوی میرے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں ۔

" محترمی جناب رضاؔ صاحب ، تسلیم و نیاز

استادِ محترم (آرزوؔ صاحب) کے متعلق یہ خیال کہ انہوں نے وصی احمد اخگرؔ کے لکھنے پر خالص اردو میں غزل کہی (غلط ہے) اور نہ مسعود حسن صاحب مرحوم کی فرمائش پر سو غزلیں کہیں ۔

---

[1] یہ شعر میرؔ کا نہیں بلکہ بدھ سنگھ قلندر کا ہے ۔ دیکھئے میری کتاب سہو و سراغ میں " چند مشہور شعرا اور ان کے خالق " ص ۱۲۹

سارا واقعہ میرے سامنے کا ہے اور خالص اردو کا دیوان سُریلی بانسری، میرا ہی مرتب کیا ہوا ہے بلکہ استاد مرحوم کے کل دیوان، سوائے فغانِ آرزو کے، میرے ہی مرتب کئے ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ

نظام اردو میں اردو کی بنیاد کی بحث کرتے ہوئے خود آرزو صاحب نے لکھا کہ میر کا شعر ع تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے۔ کلیتاً اردو ہے لیکن غالب کا یہ شعر ع شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا اس کا اردو کہنا صرف فعل (آیا) پر منحصر ہے۔

اس کے بعد دمی (احمد افسر) صاحب نے لکھا کہ یہ میر کا ایک شعر تھا اتفاق سے ہو گیا اگر اس قید میں کہ سوا مستند اردو الفاظ کے غیر لفظ نہ آنے پائے، زیادہ شعر ہو سکتے ہیں تو ایک غزل ایسی فرمائیے کہ اس میں آپ کی شانِ گویائی گھٹنے نہ پائے تو مرحوم نے ع جس کو اکیلے میں آ آ کر دھیان ترا رہ رہ کے ستائے غزل کہی۔ یہ غزل شائع ہوئی۔ اس کے بعد استاد مرحوم کو مشاعرے میں سر تیج بہادر سپرو نے الٰہ آباد بلایا اور انہوں نے سَو غزلوں کی فرمائش کی۔ اور استاد مرحوم نے سَو سے زیادہ غزلیں، چند رباعیاں، چند قطعے اور دو مختصر کہانیاں اس قید میں کہہ کر دیوان چھپوا کر سر سپرو کو بھیجا۔"

نیاز کیش پرتو (۲۲/فروری ۱۹۸۰ء)

پرتو صاحب نے ۲۷/فروری ۱۹۸۰ء کو سریلی بانسری کے مشمولات کی تفصیل بھی مجھے الگ سے لکھی تھی جو یوں تھی

"مکمل غزلیں	۱۱۱
ایک غزل کے ۴ شعر	۱
ایک غزل کے ۲ شعر	۱
	۱۱۳
فردیات	۹
قطعات	۵
رباعیات	۲
ایک کٹھن رات	مختصر افسانہ
ستی سہاگن	مختصر افسانہ"

مگر یہ تفصیل مطبوعہ کتاب سے ذرا ہٹ کر تھی چنانچہ پرتو صاحب جب ۳/مارچ ۱۹۸۰ء کو میرے غریب خانے پر تشریف لائے تو میں نے اس کا سبب ان سے دریافت کیا۔ انہوں نے جواب میں فرمایا۔

"پہلا ایڈیشن (۱۹۳۸ء) شائع ہونے سے پہلے سریلی بانسری کا یہ مسودہ تھا۔ قطع و برید اور اضافے، طباعت کے دوران کئے گئے تھے۔"[1]

سریلی بانسری کا پہلا ایڈیشن میری دسترس میں نہیں۔ میں اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ کے پہلے فوٹو آفسٹ ایڈیشن (۱۹۷۹ء) ہی کو پہلے ایڈیشن کی فوٹو کاپی مانے لیتا ہوں۔ کیونکہ دوسرا ایڈیشن جو میرے پیشِ نظر ہے یہ اس کی فوٹو کاپی نہیں ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اکاڈمی (ناشر) نے یہ تو لکھا کہ "اتر پردیش اردو اکاڈمی فخر کے ساتھ .... سریلی بانسری ...... فوٹو آفسٹ کے ذریعے پیش کرتی ہے" مگر یہ نہ بتایا کہ یہ فوٹو آفسٹ کون سے ایڈیشن کا ہے اور کہ آیا اصل ایڈیشن میں کوئی تبدیلی روا رکھی گئی ہے کہ نہیں۔ بہرحال اگر یہ پہلے ایڈیشن ہی کا فوٹو آفسٹ ہے تو اس کے مشمولات یہ ہیں۔

---

[1] میں نے ان کے یہ الفاظ ان کے خط پر درج کر لئے تھے۔

مکمل غزلیں (۴ یا اس سے زیادہ شعر کی غزل)	۱۰۴
۳ شعر والی غزلیں	۴
۲ شعر والی غزلیں	۲
	۱۱۰
فردیات	۱۶
غزلوں کے تحت کل اندراجات	۱۲۶
قطعات	۵
رباعیات	۲
قومی گیت (بھارت ماتا کو پرنام)	۱
کچھار کی لڑائی (نظم)	۱

ایک کٹھن رات — مختصر افسانہ
ستی سہاگن — مختصر افسانہ

کسی بھی مصنف کی زندگی میں اس کی کتاب کا آخری ایڈیشن ہی مستند ترین ایڈیشن ہوتا ہے۔ اس طرح "سریلی بانسری" کا دوسرا ایڈیشن ہی جو ۱۹۴۸ء کے شروع میں تاج آفس بمبئی نے شائع کیا تھا، مستند ترین ایڈیشن تسلیم کیا جانا چاہیے کیونکہ یہ آرزو صاحب کی زندگی میں چھپنے والا آخری ایڈیشن ہی نہیں بلکہ ان کی زیرِ ہدایت چھپنے والا آخری ایڈیشن بھی ہے جیسا کہ ۱۲ / اکتوبر ۱۹۴۸ء کے بمبئی سے لکھے ہوئے ان کے خط بنام تنویر کاظمی خلفِ آرزو (بحوالہ آرزو لکھنوی مجاہد حسین حسینی ص ۲۰۱) سے ظاہر ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں

"سریلی بانسری کا معاملہ نذیر احمد مالک تاج آفس سے ہوا تھا وہ دو ہزار جلدیں چھاپ کر کراچی اٹھا لے گئے اور وہ ہوائی جہاز جس پر وہ بمبئی آ رہے تھے جل گیا۔ چھ سو روپیہ یہ ڈوبا"

اس ایڈیشن میں مقدمے وغیرہ کے علاوہ قابلِ ذکر جو حذف ہے وہ قومی گیت ہے ؎

اے ماں رے ماں تجھ کو سلام — بھارت ماتا کو پرنام

نظم و نثر کا باقی متن تمام و کمال پہلے ایڈیشن ہی کا ہے۔ شاید آزادی ملنے اور ملک تقسیم ہونے کے بعد سے ہی آرزو صاحب نے نقلِ ملک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مؤلف آرزو لکھنوی، مجاہد حسین حسینی، ص ۲۱۷ پر لکھتے ہیں

"ہندوستان کے زمانۂ قیام ہی سے آرزو کو بحیثیت ایک مسلمان کے پاکستان کے قومی مسائل سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے قائدِ اعظم محمد علی جناح بانیٔ پاکستان کے انتقال کی خبر سنی تو حسبِ ذیل نظم کہی تھی۔ (نظم کے کل شعر ۱۲ ہیں یہاں صرف آخری ۳ شعر دیے جاتے ہیں) ؎

فوقِ تدبّرِ جناح، مان گئے مدبّرین — بحث تمام ہو گئی، ختم کلام ہو گیا
جنگ بغیر فتح یاب، خون بغیر سرخرو — یوں جو کبھی ہوا نہ تھا، یوں ہی وہ کام ہو گیا
بن گئی سلطنت نئی، ہو گئی قوم حکمراں — اٹھ گیا کہہ کے کارکن، کام تمام ہو گیا

ایسے میں بھارت ماتا کے گیت کا حذف کیا جانا ہی بہتر سمجھا گیا ہوگا۔ آرزو صاحب بالآخر ۸ جنوری ۱۹۵۱ء کو پاکستان پہنچ گئے۔ یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا یہاں کوئی کام باقی نہ تھا۔ وہاں پاکستان ریڈیو نے ان کی خدمات پانچ سو ماہانہ مشاہرہ پر حاصل کر لیں۔ پھر انہوں نے وہاں جا کر ایک پاکستان کا قومی ترانہ بھی کہا جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎ ہم ہیں، ہم ہیں پاک انسان — ملک ہمارا پاکستان

بہر حال یہ مان لینا ضروری ہے کہ ۱۹۵۰ء کے آس پاس بلکہ اس کے بعد بھی ہندو مسلمان دونوں کثرت سے مستقل طور پر نقلِ ملک کرتے تھے اور یہ بات عام تھی۔

میرے کتب خانے میں تین نوادر ایسے ہیں جو آرزو صاحب سے وابستہ ہیں اور اہم ہیں۔

(۱) پہلی نادر چیز مجھے پرتو صاحب نے اپنی ذیل کی تحریر کے ساتھ عطا کی تھی۔

"یہ ایک ورق جس کے دونوں صفحوں پر تین غزلیں "خالص اردو" کی مصنفہ حضرت استاد خلد مکاں علامہ آرزو لکھنوی خود مصنف علام کے دستِ مبارک کی تحریر کی ہوئی ہیں۔ یہ ورق اس مجموعہ سے حاصل کیا گیا جو کل حضرت مصنف کا تحریر کیا ہوا ہے اور راقم الحروف نے اس مجموعہ سے ان کا دیوان سریلی بانسری مرتب کیا ہے۔

فقط سید اظہر حسین پرتو لکھنوی

جانشین علامہ آرزو لکھنوی مرحوم ۱۲؍مارچ ۱۹۸۰ء

جناب کالی داس صاحب گپتا رضا کی ادب نوازی، ادب پرستی کے پیشِ نظر یہ خاص تحفہ بطور یادگار اُن کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ادبی نوادر میں ایک اضافہ میری طرف سے ہو (اور) بعد میں یاد رکھا جاؤں۔ پرتو لکھنوی بقلم ۱۲؍مارچ ۸۰ء"

ان غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ (ا) ذیل کا شعر سریلی بانسری میں درج نہیں۔ حذف کر دیا گیا ؎

کوئی بڑی ہی چونپ ہے، آیا ہے جی کو وارنے   تو بھی سمجھ کے تیل ماش ہاتھ لگا کے چھوڑ دے

(ب) ؎ ہے دیکھنا بجلی کا بُرا، جوت نہ جل جائے، آرزو صاحب نے جوت کے نیچے لکھا ہے کہ "اس کا بدل کوئی لفظ نہیں۔ آنکھ کی جوت خاص اصطلاح ہے اہلِ زبان کی"۔ (ج) ؎ سمجھو نہ سیانا اسے جو اس کو گنوا دے۔ سیانا کے معنی لکھے ہیں ہوشیار و دانا (د) ؎ ہنسنا بھی وہ ہنسنا ہے کہ ہنستوں کو رلا دے۔ آخری ٹکڑا پہلے "روتوں کو ہنسا دے" تھا۔

(۲) آرزو لکھنوی از مجاہد حسین حسینی کے ص ۴۴ پر درج ہے

"آرزو نے نہ صرف یہ کہ خوشخطی سیکھی بلکہ اس کے استادِ فنِ خطاطی منشی شمس الدین اعجاز رقم سے فنِ خطاطی بھی سیکھا۔ افسوس یہ کہ ان کی تحریریں بجز چند خطوط کے ہم تک نہیں پہنچ سکیں"

میرے پاس آرزو صاحب کے ہاتھ کی جلی قلم سے لکھی ہوئی ایک وصلی موجود ہے۔ اس کا سائز تقریباً ۱۰×۷ انچ ہے۔ تفصیل یوں ہے

" ۷۸۶

تھکیں جس جگہ اِستادہ نہیں ہے   سمجھ پہنچے جس تک خدا وہ نہیں ہے

آرزو لکھنوی

۵؍فروری ۱۹۴۹ء "

(۳) تیسری چیز وہی ہے جو میرے مقالے کا عنوان ہے۔ یعنی سریلی بانسری کا دوسرا اور مصنف کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری ایڈیشن جس کی تصحیح شائع ہونے کے بعد خود مصنف نے اپنے ہاتھ سے کی تھی۔ اس کے صفحۂ اوّل پر آرزو صاحب کی یہ تحریر ہے

"میں نے اوّل سے آخر تک پڑھ کر اس کی تصحیح کر دی ہے۔

ناچیز آرزو لکھنوی۔ ۱؍اکتوبر ۱۹۴۹ء بمقام بمبئی"

پہلے ایڈیشن اور اس دوسرے ایڈیشن میں خاص فرق یہ ہے۔

(ا) کتاب کے آغاز میں کوئی نثری تحریر از قسم دیباچہ، عرضِ حال، عرضِ ناشر موجود نہیں۔

(ب) قومی گیت شامل نہیں اور کتاب کھلتے ہی پہلا صفحہ اندر کے سرورق کا ہے۔ دوسرے پر "طبع دوم/حقوق محفوظ" لکھا ہے۔ تیسرے صفحے سے غزلیات شروع ہو جاتی ہیں جو پہلے ایڈیشن کے مطابق ہیں۔

اب ترمیم، تنسیخ، تصحیح اور حواشی کی تفصیل درج کی جاتی ہے جو تمامتر آرزو صاحب کے ہاتھ سے پکّی نیلی پنسل میں ہیں۔ سریلی بانسری کے صفحات کے لئے اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ کا شائع کردہ ایڈیشن (۱۹۷۹ء) پیشِ نظر رکھیے۔

صفحہ نمبر سُریلی بانسری		اصل	تصحیح از آرزو	
۲۰	مصرع ۲	مرا	میرا	
۲۰	مصرع ۸	چھپ	چھپ	
۲۲	مصرع ۲	پر	پہ	
۲۲	مصرع ۶	اُس	اِس	
۲۲	مصرع ۳	اِن	اُن	
۲۸	مصرع ۳	اُٹھ	اُٹھ	
۳۰	مصرع ۲	چہکے پہ چہکا	چڑکے پہ چڑکا	
۳۰	مصرع ۳	لو	لُو	۱
۳۰	مصرع ۴	لوکا	لُوکا	۲
۳۱	مصرع ۱۰	کنمنانے	کُنمنانے	۳
۳۲	مصرع ۹	چھپ	چھپ	
۳۹	مصرع ۱۱	سِسکی	سِسکی	۴
۴۱	مصرع ۱	ہمیں	ہُمیں	
۴۱	مصرع ۵	ملاؤں	ملاؤں	
۴۸	مصرع ۵	متوالے	دیوانے	
۴۹	مصرع ۲	بجوگ	مجوگ	۵
۵۱	مصرع ۴	ہی	بھی	
۵۲	مصرع ۳	لونڈلا	بونڈلا	۶
۵۲	مصرع ۴	باولا	باولا	۷
۵۲	مصرع ۱۰	ٹھوسر	ٹھوکر سر	
۵۳	مصرع ۱	دھان یان	دھان پان	۸
۵۳	مصرع ۱	سینک مان	سینک مان	۹
۵۶	مصرع ۹	نہیں	"نہیں"	
۵۹	۔	۵۶	۵۹	
۵۹	مصرع ۷	چھپ	چھپ	
۶۳	مصرع ۱	تھم	تُھم	۱۰
۶۹	مصرع ۸	رات	رُت	
۷۲	مصرع ۲	ہواؤ	ہُواؤ	۱۱

---

۱ ہوائے گرم
۲ شعلہ
۳ پہلو بدلنا
۴ رونے کی گھٹی ہوئی آواز
۵ غلط فہمی کا سبب
۶ گردباد۔ بگولا
۷ بے سوچے سمجھے کام کر بیٹھنے والا
۸ نازک اندام
۹ لاغر و ناتواں
۱۰ بے حس اور بوجھل
۱۱ حوصلہ

۹۵ مصرع ۶	ہو	ہوں
۹۷ مصرع ۹	وہاں	یہاں
۹۸ مصرع ۱۲	جانو	سمجھو
۱۰۴ مصرع ۶	سیل یہ کرتی ہے	بھاپ کر دیتی ہے
۱۰۹	(غزل نمبر) ۸۲	(غزل نمبر) ۸۱
۱۱۲ مصرع ۳	سیؤ	رسیؤ
۱۱۳ مصرع ۴	جو	تو
۱۱۹ مصرع ۸	پھپانے	چھپانے
۱۱۹ مصرع ۹	کمل	کمّل
۱۱۹ مصرع ۱۰	وو	وہ
۱۲۵ مصرع ۵	بیدری	بیدردی
۱۳۰ مصرع ۱	راہ	چاہ
۱۳۱ مصرع ۵	ورو رہے	وہ رو رہے
۱۳۷ مصرع ۹	مجھے جو	جو مجھے
۱۴۲ مصرع ۶	اَور پھوڑے	اَور نہ پھوڑے
۱۴۵ مصرع ۸	میں	سے
۱۴۹ مصرع ۳	پھیلی	پہیلی
۱۵۱ مصرع ۱۰	اُلٹواَنسی	اُلٹواَنسی
۱۶۰ مصرع ۲	جھوپڑی	جھونپڑی
۱۶۱ مصرع ۸	ایک	اِک
۱۶۲ مصرع ۴	سوچین سے	سُوچین سے
۱۶۵ مصرع ۲	پُتلی	تیلی
۱۶۷ مصرع ۴	جگ بیتی کا...	اور جگ بیتی کا.....
۱۶۷ مصرع ۵	پوچھو، پوچھ	پُوچھو، پُوچھ
۱۷۲ مصرع ۶	ہوتا ہے	ہونا ہے
۱۷۲ مصرع ۸	بیٹھو	بیٹھوں
۱۷۲ مصرع ۹	دوں	دُوں
۱۷۲ مصرع ۲	بہیّا	بَہیا
۱۸۷ مصرع ۴	لو	لَو

اب آئندہ سریلی بانسری کا جو بھی ایڈیشن چھاپا جائے وہ مصنّف کی خواہش کے مطابق اسی تاج آفس بمبئی ایڈیشن (آرزو صاحب کی زندگی میں چھپنے والے آخری اردو ایڈیشن) کو بنیاد بنا کر چھاپا جائے۔ اور اس میں اوپر دیئے ہوئے تمام حواشی اور ترامیم شامل کئے جائیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بعض ترامیم یا اصلاحیں نہایت اہم ہیں اور ان کو شامل کئے بغیر "سُریلی بانسری" کا یہ ایڈیشن ناقص کہلائے گا۔

علامہ آرزو لکھنوی مرحوم

علامہ آرزو لکھنوی کی یہ دو غزلیں ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی صاحب کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ یہ دونوں غزلیں آرزو صاحب کے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ مجاہد حسینی صاحب (شاگرد رشید نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم) کے پاس آرزو صاحب کی غیر مطبوعہ غزلیں گیت اور خطوط وغیرہ موجود ہیں۔ غزل نمبر ۱ علامہ کی آخری غزل ہے جو ناوک لکھنوی مرحوم نے مجاہد صاحب کو نقل کروائی تھی۔

(۱)

تسکینِ دل کا یہ کیا قرینہ
روکوں جو نالہ پھٹ جائے سینہ

بڑھتی امنگیں کیا پر بنیں گی
ہے کس ہوا میں دل کا سفینہ

ہیں کیا معمہ یہ آگ، پانی
پیتا ہوں آنسو جلتا ہے سینہ

غم تجھ کو پیارا تو مجھ کو پیارا
دل کی تمنا نازک ہے سینہ

آج اس نے آنسو ہنس ہنس کے پونچھے
خشکی میں اترا ڈوبا سفینہ

تاریخ دل کی خود نقش دل ہے
کھا کھا کے چوٹیں چمکا نگینہ

حدِ خرد سے ذات اس کی برتر
اونچا ہے منزل نیچا ہے زینہ

تم آرزو ہو تم آرزو ہو
پھر کیسی رنجش پھر کیا کینہ

(۲)

جو بیٹھ کے دل سے اکیلے میں ہوتی ہیں یہ باتیں کبھی کبھی
دکھ درد جہاں میں رونے کے ہیں سکھ چین کی راتیں کبھی کبھی

تارے تو گھٹائیں چھپ جائیں تو چاند مرے گھر اتر پڑے
ہوتی تو ہیں لیکن ہوتی ہیں ایسی برساتیں کبھی کبھی

غم خوار بنے سودائی کا، اتنی فرصت ہے بھلا کسے
بے کار کی باتیں لاکھوں بار اور کام کی باتیں کبھی کبھی

چھائی ہوئی غم کی گھٹاؤں میں اتنی سی چمک ہے امید کی بھی
برسات میں جیسے ہوتی ہیں اجیالی راتیں کبھی کبھی

اکتا کے کوئی پوچھے ہی گا، کچھ آرزو آخر چپ ہو کیوں
یہ سیدھے سادے حضرت بھی کر جاتے ہیں گھاتیں کبھی کبھی

بلراج کومل

موسموں کی راکھ

یہ مکاں ہے
یا کوئی مرقد
عبادت گاہ
مقتل
یا کھلونا گھر
مکیں کوئی نہیں ہے
سنسنائی خامشی میں
چاپ سی کوئی
سنائی دے رہی ہے

میں تماشائی ہوں
زیرِ آسماں
چپ چاپ
منظر کی پناہیں ڈھونڈتا ہوں
اک ہیولا سا
افق کی سرحدوں پر
تیرتا ہے
موسموں کی راکھ
اڑتی جا رہی ہے
رات
کالی رات سر پر آ رہی ہے

میں

پاؤں سے سر تک میں مکمل ہوں
سب صورتیں
ساختی زاویے
بولتے ، بات کرتے ہوئے
سوختہ جاں ہوں
وہ آتشِ بے کراں
سب مسیحا ہیں جس کے لئے
سنگِ حرفِ دُعا
ان کی آنکھوں میں
لیکن
خدا جانے کیوں
کوئی وحشی ستارہ نہیں
صرف میں ہوں یہ میں ، اور
مرے خوں میں
زہر ہلاہل کی مانند
رواں

تحلیل ہوتا ہے رنگِ مکانات
چاروں طرف قہقہے گونجتے ہیں
مرے چار سو
ایک جشنِ عداوت کا ہنگام ہے ۔
قہقہہ ہوں ، یا گریہ
یا بہتی ہوا
راہ رو ، راہ زن
زہر پیتا ہوا آبِ نوریں ہوں میں
قتل کرتا ہوں میں
میں ہی مقتول ہوں
موجِ سفاک ہوں
میں ہی تریاق ہوں ۔

ای ۔ ۱۳۹ ، کالکاجی نئی دہلی ۔

جمغورہ الفریم ۔ دو

سریندر پرکاش ● ۱۱۳/۲۲، ایم۔ای۔ایس کالونی، کالینہ، بمبئی ۔ ۹۸

جمغورہ الفریم اداس اور ویران ہے۔ اس کے فرش پر ایک لاش رکھی ہے، جس کا انگ انگ کٹا ہوا ہے اور خون کے دھبوں سے سارا فرش سیاہی مائل ہو گیا ہے ــــــ مردہ جسم کے کئی حصے غائب ہیں۔ پرانی کتابیں جو میز پر رکھی ہیں، ان میں سے ایک کتاب (جسے ابھی دیمک نے چٹ نہیں کیا ہے) میں لکھا ہے کہ کھڑکی کے نیچے فوارے کے پاس بیٹھی خارش زدہ کتیا نے میرے جسم کے کئی حصے بھنبوڑ کر کھا لئے ہیں۔ اور ابھی اور حصے ملنے کی امید میں بیٹھی کان کھجا رہی ہے ــــــ [۱۹۷۱ء]

مَیں، حامد مرزا اور پریَل کمار ایک عرصہ سے خاموش بیٹھے گہری سوچ میں ڈوبے ہوتے ہیں کہ اچانک گرجا گھر کا گھڑیال بج اٹھتا ہے۔ ہم یکبارگی چونکتے ہیں ــــــ ہماری نظریں غیر ارادی طور پر ایک دوسرے کے چہرہ پر اٹھ جاتی ہیں ــــــ بظاہر ہم تینوں کے چہرے بالکل سپاٹ ہیں ــــــ لیکن ہم تینوں جانتے ہیں، ہمارے اندر ایک مدوجزر اٹھ رہا ہے ــــــ گرجا گھر کے گھڑیال کی آواز ہم تینوں کے لئے ایک اشارہ ہے ــــــ کہ زیر غور مسئلہ کا تعلق گرجا گھر کے پچھواڑے بنے کنویں سے ہے ــــــ مسئلہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنا کہ گرجا گھر اور پھر اس کے پچھواڑے بنا کنواں یعنی، اگر گرجا گھر کی تعمیر کو دو ہزار برس گزر چکے ہیں تو اس کے پچھواڑے بنا کنواں دو ہزار ایک برس پرانا ہے ــــــ چونکہ ہم نے مان لیا ہے کہ ہماری زندگیوں میں گرجا گھر کی عمارت سب سے پرانی ہے۔ تو اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں ایک ہی برس کافی ہے ــــــ اب یہ الگ معاملہ ہے کہ ہمارا تعلق اس ایک برس سے ہے یا دو ہزار ایک برس سے ــــــ اور مسئلہ وہ کنواں ہے جو گرجا گھر کی تعمیر سے پہلے کھدا ہوا تھا۔

پریَل کمار نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ کنواں دلدل سے بھرا ہوا ہے ــــــ نہ کوئی اس میں جا سکتا ہے اور نہ ہی اس میں سے کچھ برآمد ہو سکتا ہے ــــــ حامد مرزا اُن دنوں غیر خانگی معاملات میں بری طرح مصروف تھا ــــــ یہ بات ہم نے ایک کان سُنی اور دوسرے کان نکال دی ــــــ لیکن جب حامد مرزا غیر خانگی معاملات نپٹا چکا اور میں اقلیدس کے سوال حل کر چکا تو ایک دن حامد مرزا نے دبی زبان سے کہا۔

"کیوں نو تیجے تم نے پریَل کمار کی بات پر یقین کر لیا ــــــ؟"

"کون سی بات؟" میں نے لاپرواہی سے پوچھا تھا۔

"وہی ــــــ گرجا گھر کے پچھواڑے بنے کنویں کے دلدل سے اَٹے ہونے کی بات۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ــــــ؟"

"عجیب آدمی ہو ــــــ اپنے سرمائے میں سے دو ہزار سال دے کر جو ایک سال بچا ہے اس سے اتنی بے اعتنائی برت رہے ہو ــــــ"

تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ حامد مرزا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اور اسی وقت یہ بھی لگا تھا کہ سب لُٹ چکا ہے۔ اور دلدل سے اَٹا ہوا کنواں ہماری زندگیوں میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

"لیکن پریَل کمار نے کیسے کہہ دیا کہ کنواں دلدل سے اَٹا ہوا ہے؟" میں نے حامد مرزا سے سوال کیا تھا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں ــــــ ہمیں اتنی جلدی اس کی بات پر یقین نہیں کر لینا چاہیئے تھا ــــــ ہمیں خود جا کر دیکھنا چاہیئے تھا۔" حامد مرزا بولا تھا۔

لہٰذا میں، حامد مرزا اور پریل کمار پچھلی رات، چہل قدمی کا بہانہ کرتے ہوئے ــــ گرجا گھر کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ یہ بات بڑی عجیب لگی کہ اپنے سرمائے میں سے دو ہزار برس کی قربانی دے دینے کے باوجود جب ہم اپنے ایک برس کی طرف بڑھنے لگتے ہیں تو چوروں کی طرح دبے پاؤں جانا پڑتا ہے۔ رات کے اندھیرے سے مدد لینا پڑتی ہے۔ اور اپنے اندر چھپے ارادے کے خطرناک نہ ثابت ہونے کی دعائیں مانگنا پڑتی ہیں۔

وہ رات کا شاید وہی پہر تھا، جب یہ سب ممکن ہو سکتا تھا۔ کہ اپنے چبوترے پر، آسمان کی طرف دایاں ہاتھ اٹھائے کھڑا عیسیٰ، نیچے اترا اور مریم کی مورتی کی طرف بڑھا ــــ مریم نے بڑی احتیاط سے ایک بار ادھر اُدھر دیکھا اور پھر جھک کر اپنے ہونٹ عیسیٰ کی پیشانی پر ثبت کر دیئے ــــ قریب کھڑی بھیڑ کے تھنوں سے دودھ بہنے لگا اور اس کے سامنے رکھی گھاس میں سے ہزاروں جگنوں نکل کر فضا میں اِدھر اُدھر پھیل گئے ــــ گرجا گھر کا گھڑیال بالکل ٹھہر چکا تھا ــــ جھاڑوں اور جھاڑیوں میں چھپے پرندے بالکل ساکت تھے ــــ اور ہم قریب، قریب کنوئیں کے قریب تھے ــــ اور خطرے سے بالکل دوچار ــــ کہ جمعورہ الغریم لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا ــــ بات بالکل صاف ہے، کہ ہم دو ہزار سے تقسیم ہو کر بیٹھے ہیں اور ہمارے پاس صرف ایک برس بچا ہے ــــ ہماری پوری کائنات، کہ ہم جس پہ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں اور پریل کمار کے کہنے کے مطابق وہ دلدل سے اٹا ہوا ہے۔

ہم تینوں کے قریب سے ایک آدمی گزرتا ہے ــــ اس نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی، اندھیرے میں اس کا سفید لباس صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس لباس میں سے وہ آدمی گویا غائب تھا ــــ وہ سیدھے کنوئیں کی طرف بڑھ رہا تھا ــــ ہم ذرا ٹھٹھک گئے ــــ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُچک کر کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گیا۔ اور منڈیر کے دائرے پر چلتا ہوا کنوئیں میں اترنے لگا ــــ جیسے کنوئیں کے اندر دیوار کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں بنی ہوں۔ اور پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کے چہروں پر دیکھنے کی کوشش کی ــــ ظاہر ہے ہم اپنی حیرانی ایک دوسرے کو "پاس آن" کرنا چاہتے تھے۔

"اب سنو پریل کمار ــــ اگر کنواں دلدل سے اٹا ہوا تھا ــــ تو وہ آدمی کہاں غائب ہو گیا ــــ ؟ اور سوال یہ بھی ہے کہ وہ آدمی کون تھا ــــ ؟" حامد مرزا نے اچانک پوچھا ــــ گرجا گھر کا گھڑیال بدستور خاموش تھا ــــ میری نظر (پھر) بھی پریل کمار کے چہرے پر ٹکی تھیں ــــ اور پریل کمار کے ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمنے لگی تھیں ــــ جب پریل کمار نے بولنے کے لئے منہ کھولا، تو لگا کہ اُس کے ہونٹوں پر جمی پپڑیوں کے چٹخنے کی آواز آئی ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

"میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں"

"تو پھر، ہم وہ کنواں دن کے اُجالے میں کیوں نہیں دیکھ سکتے ــــ ؟" حامد مرزا نے پوچھا۔

"تو ہمیں ماننا ہو گا ــــ کہ ہمارا اس کنوئیں سے کوئی رشتہ ہے" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں ــــ دو ہزار ایک برس پرانا رشتہ" حامد مرزا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں ــــ ایک برس پرانا رشتہ ــــ دو ہزار پر ہم تقسیم ہو چکے ہیں ــــ اب کچھ نہیں ہو سکتا" پریل کمار چیخا اور پھر کہنے لگا ہمیں وہاں دن کے اجالے میں جانا ہی ہو گا ــــ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ــــ تم لوگ ٹھیک کہتے ہو"

جانے کا بلاوا کر دیا گیا ہے۔

"لیکن جناب آپ کا قیام کہاں پر ہے ؟"

"یہیں ... سامنے .... گرجا گھر کے پچھواڑے کنواں ہے نا ...."

ہم تینوں پلٹ کر دیکھتے ہیں دو آدمی باتیں کرتے ہوئے داخل ہو رہے ہیں ــــ ایک فربہ سا ٹھگنے قد کا ہے اور اس کے چہرے پر مستقل بشاشت کے تاثرات ہیں۔ دوسرا سفید لباس پہنے ہوئے ہے اور اچانک ہم تینوں کو لگتا ہے کہ وہ صرف لباس ہے اور وہ خود اس

لباس میں سے غائب ہے۔

ہم تینوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ہم بجلی کے تار سے چھو گئے ہیں۔

"حامد مرزا !" میں کہتا ہوں۔

"نویتجے !" حامد مرزا بڑبڑاتا ہے اور پیرل لکمار کے ہونٹوں کی پپڑیاں تڑخنے لگتی ہیں۔

گرجا گھر کے پچھواڑے دو ہزار ایک برس پرانا کنواں تھا ــــ اس کی منڈیر سے آگے شہر کا احاطہ ختم ہو جاتا تھا ــــ پھر میلوں میل پھیلا ہوا جنگل تھا ــــ جس میں بڑی، بڑی محراب دار عمارتوں کے کھنڈر تھے۔ اور جگہ، جگہ پرانی ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ منظر ہم بارہا دیکھ، سُن اور پڑھ چکے تھے ــــ تب یہ آدمی کہاں رہتا ہوگا ــــ؟ کہیں یہ وہی تو نہیں جو کل رات اُچک کر کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گیا تھا اور پھر دائرے کی شکل میں چلتا ہوا .....

ہم تینوں کی سوچ یک زبان ہے۔ ہم پھر پلٹ کر اندر آ بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی جس طرح کوئی آدمی باہر جانے کے ارادے سے اٹھے اور پھر یہ دیکھ کر کہ باہر تو بارش ہو رہی ہے۔ ایک گہری سانس لی اور پھر اندر آ بیٹھے۔

ہم تینوں ان دونوں کے ساتھ والی میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دوبارہ چائے منگوائی جاتی ہے اور بغور ان دونوں کے چہروں پر دیکھنے لگتے ہیں۔ اب ہم نے ایک عجیب بات محسوس کی ہے ــــ کہ جس شخص کو ہم صرف لباس سمجھ رہے تھے ــــ وہ اچھا خاصا خوبصورت، دراز قد آدمی ہے ــــ اس نے جو قمیص پہن رکھی ہے اس کا دایاں بازو کندھے ہی سے نکلتا ہے مگر بایاں بازو کمر سے تھوڑا اوپر پسلی سے نکل رہا ہے اور اس میں سے اس کا ہاتھ کسی بچھڑے کی تھوتھنی کی طرح باہر کو نکلا ہوا ہے ــــ جو دائیں ہاتھ سے ماپ میں بڑا ہے۔

ہم تینوں کو ایک ساتھ حیرت ہوتی ہے۔

"اور آپ کا اسمِ گرامی ــــ؟" فربہ اور ٹھگنے آدمی نے، جس کے چہرے پر بشاشت پھیلی ہوئی تھی ایک اور سوال کیا ہے۔

"قلقارمس" اس شخص نے (جسے ہم محض لباس سمجھ رہے تھے۔ اور جو دراصل ایک اچھا خاصا خوبصورت دراز قد آدمی تھا) جواب دیا ہے۔

فربہ آدمی حیران سا ہوتا ہے اور ہم بھی ــــ "یہ نام .. ! یہ نام ... ! جناب میں کچھ سمجھا نہیں ... یہ کیسا نام ہے ؟"

"یہ خوابوں کی خاموش آوازوں کا ثمر ہے" قلقارمس جواب دیتا ہے۔

میں، حامد مرزا اور پیرل لکمار سوچنے لگتے ہیں ــــ کہ ہم یہ نام پہلے سُن چکے ہیں۔ شاید اس شخص سے پہلے مل بھی چکے ہیں۔

"کہاں سُنا تھا۔ ؟" ہم میں سے ایک نے سوال کیا ہے۔

"شاید کسی اَنمل آوازوں کی بھول بھلیاں میں بھٹکتے یہ نام بار بار ہمارے کانوں سے ٹکراتا تھا" ہم میں سے دوسرے نے جواب دیا ہے۔

"کہاں دیکھا تھا ــــ ؟" ہم میں سے تیسرا پوچھتا ہے۔

"شاید ایک دیرینہ داستان کی منہدم دیوار کے ملبے میں بے سر پاؤں کا کوئی شخص تھا۔ جو اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے پتھروں پر کچھ کندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا ــــ" ہم میں سے کسی ایک نے جواب دیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ فربہ ٹھگنے آدمی کے چہرے پر سے بشاشت کی جھلّی ایکا ایکی اتر گئی ہے۔ اور وہ انتہائی خوفزدہ چہرے میں بدلا ہوا ایک وجود بن کر رہ گیا ہے ــــ اور پھر اس کا سارا وجود پگھل کر ایک چیخ میں ڈھلنے لگا ہے اور اس سے پیشتر کہ وہ چیخ آواز کے قالب میں داخل ہو۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور قلقارمس اکیلا بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

"یہ بے حسی کیسی ہے ــــ کہ ہم ایک واردات میں سے گزر جاتے ہیں۔ زندگی پر سے ایک سانحہ گزر جاتا ہے ــــ جو ہمارے حواس کو زخمی کر ڈالتا ہے اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوتی ــــ ہم آنکھیں بند کئے ــــ چائے کی پیالی میں سے اٹھنے والے دھوئیں کو اپنی ناک کی نوک پر محسوس کرتے ہیں اور اس کی خوشبو کو نتھنوں سے سونگھتے ہیں اور چائے کو گھونٹ، گھونٹ پی جاتے ہیں۔ اور جب سر اٹھا کر دیکھتے

ہیں تو مطلع صاف ہوتا ہے۔ بالکل صاف ـــ جیسے میدان کارزار میں سے لاشیں اٹھالی گئی ہوں !!

" یہ کون بولا ہے ـــ؟ ہم میں سے تو کوئی نہیں بولا ـــ! ہم میں سے تو کوئی بولنے کی جرأت ہی نہیں کرسکتا !ـــ" ہم تینوں بولتے ہیں۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ قلقارمس اکیلا بیٹھا چائے پی رہا ہے ـــ اور اس کی پسلی میں سے نکلتے ہوئے قمیص کے بازو میں سے پھیپھڑے کی تھوتھنی جیسا نکلا ہوا اس کا بڑا سا ہاتھ ہل رہا ہے ـــ جیسے اشارے سے ہمیں بلا رہا ہو۔

اچانک ہمارے لئے اس کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ پھیل رہی ہے۔ پھر وہ چائے ختم کرکے پیالی میز پر رکھتے ہوئے اٹھتا ہے اور کاؤنٹر پر پیسے دیکر باہر نکل جاتا ہے۔

ہم بے اختیار اس کے پیچھے لپکتے ہیں۔

فربہ آدمی ایک پیڑ کے نیچے یوں کھڑا ہے جیسے جوتے پالش کروا رہا ہو ـــ وہ قلقارمس کی طرف بالکل کوئی توجہ نہیں دیتا ہے ـــ قلقارمس اسکے قریب رک کر کچھ کہتا ہے ـــ جیسے جیب سے پیسے نکال کر جوتہ پالش کرنے والے چھوکرے کو دیئے ہوں اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے ـــ فربہ آدمی بدستور وہیں کھڑا رہتا ہے ـــ شاید اس کا جوتہ ابھی پالش نہیں ہوا ہے۔

ہمیں لگتا ہے ہم قلقارمس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

وہ گرجاگھر کے احاطے میں داخل ہو جاتا ہے۔

مستقبل ـــ حال ـــ اور ماضی ..... دو ہزار پر تقسیم شدہ دو ہزار ایک ....

"کمرے میں پرانے زمانوں کی ایک قندیل روشن ہو چکی تھی۔ اس کی روشنی میں، میں نے میز پر پڑی ایک کتاب اٹھا کر کھولی۔ اور بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا ـــ" پربتوں پر دیودار اور چیڑ کے اونچے پیڑ ہیں، پگھلی ہوئی برف کے جھرنے ہیں، ماؤں کی گودیں ہریالی سے بھری ہیں، میدانوں میں ان گنت مکان ہیں، ریگستان میں بکھرے ہوئے ذرّے، سورج کی روشنی میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں، ساگر اچھل کر ساحل پر بچھ جاتا ہے، گھونگے، سیپیاں اور مچھلیاں ایک دوسرے کی بانہوں میں باہیں ڈال کر ناچ کرتی ہیں !" کتیا کا بھونکتے، بھونکتے گلا بیٹھ گیا تھا ـــ کرسی پر بیٹھی لاش نے کہا ـــ" میرا ایک ٹکڑا کتیا کی طرف پھینک دو، وہ شانت ہو جائے گی ـــ ڈرو نہیں ـــ جو بھی یہاں آیا، اس نے ایسا ہی کیا۔ اسکے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ورنہ، کتیا بھونک، بھونک کر پورا جنگل جگا دے گی !"

میں حیرت سے لاش کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور کتیا کو بھونکتے ہوئے سنتا رہا۔ کتاب بند کرکے میں نے دوبارہ میز پر رکھ دی اور لاش کی طرف ندیدوں کی طرح دیکھنے لگا ـــ گوشت کا ٹکڑا کھاتے ہوئے کتیا بالکل اس میں کھوئی ہوئی تھی ـــ اتنے میں سویرا ہو گیا۔ لاش فرش پر چیت پڑی تھی۔ اس کے جسم کا جہاں سے نیا ٹکڑا نکالا گیا تھا ـــ وہ جگہ ابھی سرخ تھی ـــ" (۱۹۷۱ء)

ہم تینوں نے من ہی من کچھ ٹھان لی ہے ـــ اور گرجاگھر کا گھڑیال بجنے کی آواز کا انتظار کئے بغیر ہم دبے پاؤں اس کا تعاقب کرنے لگتے ہیں۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا، اچانک اپنی رفتار تیز کر لیتا ہے۔ اور گرجاگھر کی عمارت کے گرد گھوم کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ہم بھی رفتار تیز کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور جیسے ہی ہم گرجا گھر کی عمارت کے گرد گھوم کر کنوئیں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلنے لگتے ہیں ــــ وہ ہمیں کنوئیں کی منڈیر پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے ــــ اس سے پیشتر کہ ہم کنوئیں تک پہنچیں وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

"کیا وہ کنوئیں میں اتر گیا ہے ؟"

"شاید ــــ"

"لیکن کنواں تو بقول پریل کمار ...."

"خود دیکھ لیتے ہیں ــــ نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ پریل کمار آخر انسان ہی تو ہے !"

ہم تینوں کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ جاتے ہیں اور نیچے کنوئیں میں جھانک کر دیکھتے ہیں ــــ اور ہماری حیرانی کی حد نہیں رہتی کہ کنواں بالکل عام کنوؤں کی طرح تھا ــــ آسمان پر چاند چمک رہا تھا ــــ کنوئیں میں بہت نیچے سکون سے لہراتے پانی میں چاند کا عکس دکھائی دے رہا تھا ــــ اور کنوئیں کی دیوار کے ساتھ، ساتھ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں ــــ جو نیچے تک اترتی چلی گئی تھیں مگر قلقارس تو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہم تینوں حیرانی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگتے ہیں۔

"لیکن یہ سُنی سنائی بات نہیں ــــ آنکھوں دیکھی ہے کہ یہ کنواں دلدل سے اٹھا ہوا تھا" پریل کمار جلدی سے کہتا ہے۔

"لیکن دیکھ لو ــــ بتاؤ وہ دلدل کہاں ہے ؟" حامد مرزا کہتا ہے۔

پریل کمار خاموش ہو جاتا ہے ــــ اور اچانک کنوئیں میں سے کسی کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہاتھ کنوئیں میں سے نکل کر اس کی منڈیر کے کنارے، کنارے ٹٹولنے کے سے انداز میں چلنے لگتا ہے۔ اور اس ہاتھ کی شکل بالکل بھیڑیے کی تھوتھنی جیسی ہے ــــ اور اس کے پیچھے ایک بہت لمبا بازو ہے ــــ جو کنوئیں کے تل میں سے اٹھ کر اوپر تک پہنچ گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہہ سُن سکیں کنوئیں میں سے آواز آتی ہے۔

"میں آپ سے ہاتھ ملانا چاہتا ہوں .... میں یعنی قلقارس .... ہم کچھ دیر پہلے ملے تھے .... ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا ــــ ہمارا رشتہ بہت پرانا ہے .... یعنی دو ہزار ایک برس ...."

ہم تینوں بے اختیار آگے بڑھتے ہیں اور غیر ارادی طور پر ہمارے ہاتھ اس بڑے سے ہاتھ کی گرفت میں چلے جاتے ہیں ــــ پھر جیسے کوئی غیر مرئی طاقت ہمیں کنوئیں کی طرف کھینچ لیتی ہے اور ہم ایک، ایک سیڑھی نیچے اترنے لگتے ہیں ــــ اچانک ہمارے نتھنے کسی عجیب سی بُو سے بھر جاتے ہیں ــــ اور ہمارے ذہن ماؤف ہونے لگتے ہیں۔

وہ ہمارے آگے، آگے چل رہا تھا ــــ جنگل بہت گھنا تھا ــــ اس نے اپنا لمبا بازو اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اور حسبِ معمول اس کا بھیڑیے کی تھوتھنی جیسا ہاتھ قمیض کے اس بازو میں سے باہر نکل آیا جو اس کی پسلی کے قریب بنا ہوا تھا۔

اُس نے ہمیں سب بتا دیا تھا، سب سمجھا دیا تھا ــــ اس کنوئیں کی اصلیت اور جنگل تک پہنچنے کا راستہ اور جنگل کی زمین گیلی ہونے کی وجہ ــــ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ابھی ہم موسم کا اندازہ نہ لگا سکیں گے ــــ لیکن اپنے بارے میں وہ کچھ کہنے سے ہچکچاتا تھا ــــ اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے ــــ دُور، بہت دُور کھنڈر بکھرے ہوئے تھے۔ اور پتھریلی محرابیں فاحشہ عورتوں کی طرح سینہ تانے کھڑی تھیں۔

لیکن ایکا ایکی ہم نے وقت کی دہلیز پار کر لی اور یہ وہ لمحہ تھا جب ہمیں پیشوں میں بانٹا جا رہا تھا ــــ اور ہم نے دیکھا قلقارس دو ہزار ایک برس پہلے کا لباس پہنے اپنا لمبا بازو لہرا، لہرا کر ہمیں سمجھا رہا تھا۔ کہ ہمارے سیاسی حقوق کیا ہوں گے۔؟ وہ ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا ــــ اور منظر اس شہر کی تعمیر سے پہلے کا تھا ــــ جس کے کھنڈروں کی طرف ہم بڑھ رہے تھے۔

میں، حامد کمار اور پریل مرزا ــــ تینوں بے نام اکائیوں کی طرح اس انبوہ میں کھڑے تھے۔ جو میدان میں اونچی جگہ کی طرف منہ کئے کھڑا تھا ــــ ہم سینکڑوں میں تھے۔ اور اپنے مصرف سے ناآشنا ــــ کہ قلقارس نے کچھ لوگوں کے کان میں کچھ کانا پھوسی کی ــــ وہ لوگ بھی آگے

بڑھ کر قلقارمس کے ساتھ اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے ـــــ اور پھر ہمیں قبیلوں میں تقسیم کرکے ان لوگوں کے حوالے کر دیا گیا ـــــ میں، وہ اور وہ بھی مختلف قبیلوں کا حصّہ قرار دے دیئے گئے اور ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور پھر ایک دوسرے کے نام سے بھی ناآشنا ہو گئے۔

میں جس قبیلہ میں تھا ـــــ اس کا سردار "جبارا" تھا ـــــ بڑا ہی بھلا آدمی لیکن وقت پڑنے پر بڑا جابر، ظالم اور بڑبولا ـــــ وہ ہمیں ریوڑ کی طرح ہانک کر ایک طرف لے جانے لگا ـــــ قلقارمس تھوڑی دور تک ہمارے ساتھ آیا اور پھر آہستہ سے میرے کان میں کہنے لگا "گھبرانا نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں"

اس سے پیشتر کہ میں اس کی طرف پلٹ کر دیکھتا وہ لپک کر دوسرے ریوڑ کی طرف بڑھ رہا تھا ـــــ میں بے زبانی کی کیفیت میں دم بخود سا ایک پل رکا اور پھر بڑھ کر اپنے ساتھیوں میں شامل ہو گیا۔

شام ہوتے ـــــ ہم پہاڑ کے دامن میں پہنچ چکے تھے۔ ہمارا سردار جبارا جو بھلا آدمی تھا۔ تھک چکا تھا اور اس کا لنگوٹ پسینے سے شرابور تھا۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ہمارے قبیلے کی عورتوں نے لکڑیاں اکٹھی کر کے الاؤ جلایا اور سمندر میں سے پکڑی ہوئی مچھلی گرم راکھ میں دبا دی ـــــ جبارا اپنی نیم وا آنکھوں سے جو نیند سے بوجھل ہو چکی تھیں سارے عمل پر نظر رکھے ہوئے تھا ـــــ ایسا لگتا تھا، سب اس کی دسترس میں ہے، اور وہ انتہائی مطمئن ہے۔

وادی کے چرند، پرند اور درندے الاؤ کے شعلے دیکھ کر الٹے پاؤں اندھیرے میں منہ چھپا کر بھاگ نکلے۔ ہمارے قبیلے کی عورتوں نے اپنا مختصر لباس اتار کر ہمارے سردار جبارا کے گرد طواف کیا۔ ان کے برہنہ جسم الاؤ کے شعلوں میں تانبے کی طرح تپے ہوئے چمکتے تھے ـــــ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا صرف اس کے پسینے سے شرابور لنگوٹ کا سیال پتھر پر سے بہتا ہوا زمین میں جذب ہو گیا۔

پھر عجیب تماشہ ہوا ـــــ جب ہم سب اپنے اپنے حصے کی مچھلی لے کر کھانے لگے اور معلوم ہوا کہ ہم سب کا ایک ایک بازو غائب ہے ـــــ اور ہمارا سردار جبارا جو بھلا آدمی تھا ـــــ اس کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی ـــــ وہ کبھی اپنے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی دوسرے کندھے کو، جس پر سے بازو ندارد تھا۔

اچانک مجھے قلقارمس کی بات یاد آئی ـــــ کہ میں نے ایک ہاتھ سب کے قریب رینگتے ہوئے دیکھا ـــــ جس کا بازو بہت لمبا تھا اور جو خود آگے سے کسی بھیڑیے کی تھوتھنی . . . . .

قلقارمس کا ہاتھ سب کے کام آ رہا تھا ـــــ یعنی ایک ہاتھ اپنا اور دوسرا اس کا ـــــ سب نے پیٹ بھر کھایا اور اپنے سردار جبارا کا (جو کہ بھلا آدمی تھا) شکریہ ادا کیا اور سو گئے ـــــ خواب میں وہ تمام برہنہ عورتیں جن کے جسم الاؤ کے شعلوں میں تپے ہوئے تانبے کی طرح چمکتے تھے ہم بستری کے لئے ہمارے ساتھ آ کر لیٹ گئیں۔

رات مزے سے کٹ گئی۔

صبح ہمیں، ہمارے سردار جبارا نے بیدار کیا جو بھلا آدمی تھا ـــــ اس نے ہمیں بتایا کہ پہاڑ کے دامن میں دُور، دور تک جو زمین پھیلی ہے وہ قبیلہ کی ہے اور وہ قبیلہ کا سردار ہے ـــــ پھر اس نے حکم دیا کہ ہمیں اپنے اپنے کام پر لگ جانا چاہیئے ـــــ معمار مکان بنائے گا ـــــ کمہار برتن بنائے گا ـــــ سنار گہنے بنائے گا، لوہار اوزار بنائے گا، چمار جوتے اور کسان کھیتی کرے گا ـــــ ترکھان مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے بنائے گا ـــــ بنیا کھانے پینے کا سامان رکھے گا جسے ہم اپنی محنت کے بدلے لے سکیں گے، پروہت پیدائش اور موت کے وقت رسوم ادا کرے گا ـــــ اور ہم سب اسکے حکم کے پابند رہیں گے کہ وہ ہمارا سردار ہے اور بھلا آدمی ہے ـــــ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی سوچتا، سمجھتا اور سوال کرتا۔ کہ قلقارمس نے کہیں سے وارد ہو کر اپنے ایک لمبے اور ایک چھوٹے بازوؤں کے آگے لٹکتے ہوئے ہاتھوں سے تالی بجائی ـــــ اور سب نے خوش ہو کر ہاتھ اٹھا دیئے۔

میں نے آگے بڑھ کر پوچھا ـــــ "اور میرے ذمّہ کیا کام ہے سردار ؟"

سردار نے پلٹ کر قلقارمس کی طرف دیکھا جو اپنا لمبا ہاتھ اپنے جسم کے گرد لپیٹ رہا تھا۔ قلقارمس نے ایک بار مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر اپنی نظریں ہمارے سردار جبارا کے چہرے پر گاڑ دیں۔

سردار نے ہکلا کر پوچھا "یہ کون ہے ؟"

"ممرز ــــ" قلقارس نے جواب دیا۔" یہ تیرے قبیلے کا، تیرا، تیرے کارناموں اور تیرے وقت کا حساب رکھے گا ـــــ تاکہ آنے والی نسلوں کو تیرے بارے میں سب معلوم ہو سکے "۔

" لیکن یہ میرا چہرہ آنے والی نسلوں کو کیوں دکھائے گا ـــــ ؟" سردار نے پھر پوچھا۔ تب قریب کھڑا پروہت مسکرایا اور اس نے آہستہ سے کہا "ہمارا سردار جبارا بہت بھلا آدمی ہے ـــــ ہم اس کی مورتی بنائیں گے بالکل ایسی جیسا کہ یہ ہے۔ اور اسے بڑ کے پیڑ کے نیچے رکھ دیں گے ـــــ چونکہ یہ ہمارا اگنی دیو ہے ـــــ اس کی پوجا ہوگی۔

قلقارس اپنا بازو اپنے جسم کے گرد لپیٹ چکا تھا۔ اس نے پروہت کا کندھا تھپتھپایا۔ زور سے ہنسا اور چلا گیا۔

سارا کاروبار ٹھیک ٹھاک چلنے لگا اور ہم نے اپنے سردار جبارا کی ایک مورتی بنا کر بڑ کے پیڑ کے نیچے لگا دی اور سیندور سے اسے پوت دیا اور پوتر ندی کا جل لا کر اس پر چھینٹے مارے اور پوجا کے پھول اس کے قدموں میں رکھ دیئے ـــــ پروہت نے سب کو آشیرواد دیا۔ ہمارا سردار جبارا یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

[اور میں نے لکھا کہ کھیتوں سے فصل کاٹ لی گئی ہے۔ برتنوں میں کھانا بنتا ہے۔ اور ہماری عورتوں کے جسموں کا تانبا بہت چمک اٹھا ہے اور یہ سب جبارا کا ہے۔ کہ وہ ہمارا سردار ہے۔ اور بھلا آدمی ہے۔ پروہت نے سب سے اس کی مورتی کی پوجا کروا دی ہے۔ چرند، پرند اور درند ہماری جلائی ہوئی آگ سے مانوس ہو چکے ہیں اور وہ جنگل کے اندھیرے سے نکل کر ہمارے گرد منڈلانے لگے ہیں]

ایک دن ہمارا سردار جبارا، پروہت کے ساتھ میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ "کیا لکھتے رہتے ہو ـــــ ؟ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے "۔

میں اپنی جگہ سے تعظیماً کھڑا ہو گیا ـــــ اور آہستہ سے بولا ـــــ" یہ سب آنے والی نسلوں کے لئے ہے سردار۔ تم کیا کرو گے جان کر ـــــ ؟"

تب دونوں نے ایک دوسرے سے نظریں ملائیں ـــــ اور پھر دونوں نے نظریں جھکا دیں اور پروہت بولا ـــــ" اس کا فیصلہ تو پنچائت ہی کرے گی"۔ اور دونوں چلے گئے۔

پنچایت میں سردار، پروہت، بنیا اور کسان چار پنچ تھے اور پانچواں پنچ سردار کی وہ مورتی تھی جو بڑ کے پیڑ کے نیچے رکھی تھی ـــــ اور جس کی پوجا ہمارا دھرم تھا۔

میرا جرم طے کیا جانا تھا اور پھر اس کی سزا تجویز کرنا تھا ـــــ میں پنچائت کی اس تشکیل سے مطمئن نہ تھا ـــــ کہ چاروں پنچ ایک دوسرے کے ساتھ مفاد کے دھاگے سے بندھے تھے ـــــ اس رات پرندے ایک پل بھی نہ سوئے درندے اپنی کھوہ سے نہ نکلے اور چرندوں نے گندے تالاب سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پیا اس کے باوجود سب زندہ رہے، میرے سمیت ـــــ میں کچھ ایسا فکرمند نہ تھا ـــــ مگر آئندہ نسلوں کے لئے .....!!!

اس دوران میں ایک اور واقعہ ہو گیا جس کی وجہ سے پنچائت مقررہ دن اکٹھا نہ ہو سکی ـــــ ہوا یوں کہ کمہار سے کچھ مٹی کے برتن اور چھوٹے موٹے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں خریدنے کے سلسلے میں پروہت کا لین، دین کے معاملہ میں تنازعہ ہو گیا۔ پروہت، پروہت ہونے کے ناطے دام دینا نہ دینا چاہتا تھا، جو کمہار عام لوگوں سے لیتا تھا ـــــ اس کا کہنا تھا کہ پیدائش اور موت کے وقت جو خدمت وہ سدا انجام دیتا ہے دوسرے لوگ تو وہ سب نہیں کرتے لہٰذا اسے رعایت ہونی چاہئے۔ کمہار کا کہنا تھا کہ پیدائش اور موت کے وقت پروہت جو خدمات انجام دیتا ہے، اس کے بدلے وہ اپنی دکشنا وصول کر لیتا ہے۔ پھر اس کی محنت وہ کم داموں میں کیوں لینا چاہتا ہے ؟

دونوں کے دلائل کافی معقول تھے۔ لہٰذا وہاں فیصلہ نہ ہو سکا اور یہ معاملہ بھی پنچائت پر چھوڑ دیا گیا۔ جس دن اس مقدمہ کو طے کرنے کیلئے پنچائت اکٹھا ہوئی ـــــ اس دن میرا والا معاملہ، معمولی نوعیت کا سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

پنچائت کے دو اور پنچ ـــــ یعنی بنیا اور کسان بھی اس معاملہ میں کافی کشمکش و پیچ میں پڑے کہ اگر فیصلہ پروہت کے حق میں ہو جاتا ہے۔ تو اس کو ایک دائمی حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ کسی سے بھی رعایتی داموں پر اپنی ضروریات کی اشیاء خرید سکے۔ اور وہ دونوں بھی اس لپیٹ میں آجائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے آپ کو اس مقدمہ کے سلسلے میں پنچائت سے الگ کر لیا ـــــ اب فیصلہ کرنے والے صرف دو لوگ بچے۔ ہمارا سردار جبارا جو بہت بھلا آدمی تھا اور اس کی مورتی جس کی ہم پوجا کرتے تھے اور جسے کمہار نے ہی بڑے پیار سے بنایا تھا ـــــ مگر مورتی خاموش تھی ـــــ بول نہیں سکتی

تھی ـــــ پروہت چونکہ مقدمہ میں فریق اوّل تھا ـــــ لہٰذا انصاف کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ دخل نہ دے۔ اب فیصلہ صرف سردار کے ہاتھ میں تھا۔ مگر ہمارا سردار جبارا چونکہ بھلا آدمی تھا ـــــ وہ مورتی کی رائے جانے بغیر فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور مورتی جب تک بولے نہیں ـــــ رائے کیسے معلوم ہو سکتی ہے؟ سب دم بخود تھے کہ اب کیا کریں؟ کئی ہونٹ یکدم حرکت میں آئے، ساری فضا میں چھپانے کی آواز گونجی۔ کئی گردنیں حرکت میں آئیں، کئی ہاتھ تھوڑیوں تک آکر ٹھک گئے اور کئی آنکھیں حیرت سے پھیلیں اور پھر سکڑ گئیں ـــــ کوئی کسی نتیجے پر نہ پہنچا ـــــ اور پنچایت کا اجلاس کسی دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا ـــــ سارے قدم مٹی بھری پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے اپنے اپنے ٹھکانے تک پہنچ گئے ـــــ آگ جلی اور روٹیاں سینکی جانے لگیں اور پھر اندھیرے آنگنوں میں جو ٹھے برتن چھوڑ کر مرد اور عورتیں کونوں کھدروں میں دبک گئے اور عورتوں نے مردوں سے اس دن کی کاروائی کا خلاصہ مانگا ـــــ اور مردوں نے وہ خلاصہ انہیں کہہ سنایا ـــــ عورتیں بھی تذبذب میں پڑ گئیں اور تذبذب کی اس حالت میں ان کے جسموں کی گرہیں اندھے ہاتھوں نے کھول ڈالیں۔

وہ اپنے لمبے بازو کو، چھوٹے بازو والے ہاتھ سے مالش کر رہا تھا ـــــ سورج نے آسمان پر ایک ہی قدم رکھا تھا اور سارے میں دھندلکا سا پھیلا ہوا تھا۔ کہرہ پہاڑی کے دامن میں مچلتا ہوا چل رہا تھا ـــــ درخت اور پودے اس کہرے میں اپنا سبز رنگ ڈبو کر نچوڑ رہے تھے۔ اور پھر اس کے کھل اٹھنے کے انتظار میں دھیرے، دھیرے پھٹک رہے تھے ـــــ وہ ایک چٹان پر بیٹھا تھا اور اپنے لمبے بازو کو، چھوٹے بازو والے ہاتھ سے مالش کر رہا تھا ـــــ اس نے اپنے کپڑے بالکل اتار رکھے تھے اور پاؤں نیچے بہتی ہوئی ندی میں لٹکا رکھے تھے ـــــ میں ٹہلتا ہوا وہاں جا نکلا۔

"نہانے کی تیاری ہو رہی ہے ـــــ؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ، تم ـــــ دیکھو میں ننگا ہوں ـــــ تم دُور رہو ـــــ جسم کی کوئی بات نہیں ـــــ لیکن میں نہیں چاہتا ـــــ میرا یہ ہاتھ کوئی دیکھ لے ـــــ" قلقارس نے قدرے درشتی سے جواب دیا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ـــــ سب کے انگ ایک جتنے لمبے، موٹے یا چھوٹے تو نہیں ہوتے ـــــ پھر بھی ....." اس سے پہلے کہ میں اپنا جملہ پورا کرتا۔ اس نے ندی میں چھلانگ لگا دی ـــــ اور اپنا لمبا بازو پانی میں چھپا لیا۔

اس کا بدن کندن کی طرح دمکتا تھا ـــــ صاف، شفاف خوبصورت جسم ـــــ لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ وہ ندی میں جہاں کھڑا تھا اس کے اِرد گِرد کا سارا پانی جو تھوڑی دیر پہلے کنگن کی طرح صاف تھا ـــــ گدلا ہونے لگا ـــــ اس کے جسم سے نہ جانے کیا چیز نکل کر پانی میں گھل رہی تھی کہ پانی کا رنگ بدلتا جا رہا تھا ـــــ اور پھر دھیرے، دھیرے گدلے سے کیچڑ جیسا ہو گیا ـــــ وہ اپنے چھوٹے بازو والے ہاتھ سے سارے جسم کو مَل، مَل کر دھو رہا تھا۔

میں چٹان کے قریب کھڑا یہ سب دیکھتا رہا اور مبہوت سا ہو رہا تھا۔ کہ آبادی کی طرف سے چند شبیہیں ندی کی طرف آتی دکھائی دیں ـــــ اچانک میری اور قلقارس کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں ـــــ اس نے ان شبیہوں کو دیکھ لیا تھا شاید کہ مجھے چٹان کے پیچھے ہو جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔

اور پھر منظر صاف ہو گیا شبیہیں، انسانی صورتوں میں بدل گئیں ـــــ وہ تھے ہمارا سردار جبارا، پروہت اور دھوبی ـــــ دھوبی نے اپنے ہاتھوں میں اجلے دستر اٹھا رکھے تھے ـــــ پروہت نے پوجا کی تھالی اور سردار نے حلوہ اور مانڈہ ـــــ جیسے ہی وہ قریب آئے، قلقارس دھیرے، دھیرے ندی سے باہر نکلنے لگا ـــــ ننگا، برہنہ، عریاں ـــــ میں اُلجھن میں پڑ گیا ـــــ کہ یہ پردہ محض مجھ سے تھا۔ اور دیکھ بھی رہا تھا کہ وہ اپنے جسم کے سہارے آہستہ، آہستہ پانی میں سے ابھر رہا ہے ـــــ سورج کی کرنیں اس کے جسم کو روشن کر رہی ہیں اور اس کے جسم میں سے سنہری روشنی پھوٹ رہی ہے ـــــ جب وہ پورے کا پورا باہر نکل آیا تو وہ تینوں اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے ـــــ وہ مسکرایا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑایا ـــــ گویا کسی کو آشیرواد دے رہا ہو ـــــ پھر پروہت نے سردار کو کچھ اشارہ کیا ـــــ اور سردار ہاتھ میں پکڑا ہوا حلوہ مانڈہ دھوبی کو تھمانے کے لئے اس کی طرف بڑھا ـــــ دھوبی نے اُجلے دستر ایک ہاتھ میں لے لئے اور دوسرے

ہاتھ میں حلوہ مانڈہ پکڑلیا ـــــ قلقارمس جیسے چونک اٹھا ـــــ لیکن تیزی سے اس نے اپنے چہرے کی مچھلیوں پر قابو پالیا اور اس کی مخصوص فرشتوں جیسی مُسکراہٹ دوبارہ اس کے چہرے پر قابض ہوگئی۔

ہمارے سردار جبارا نے ـــــ جو بہت نیک آدمی تھا ـــــ آگے بڑھ کر اپنے انگوچھے سے قلقارمس کا بدن پونچھنا شروع کیا ـــــ بدن یعنی کہ بدن کا ہر انگ، حتیٰ کہ اس کا لمبا بازو بھی ـــــ اور جب بازو پونچھ دیا گیا تو تینوں نے مل کر اسے اس کے جسم کے گرد لپیٹ دیا۔ پھر اسے اُجلے دستر پہنا دیئے گئے۔ پروہت نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر سیندور کا تلک لگایا اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر آرتی اتاری ـــــ تب وہ سب ایک چٹان پر بیٹھ گئے ـــــ ندی کا پانی خاموشی سے بہتا رہا اور قلقارمس کے جسم سے امڈا ہوا کیچڑ پانی کے ساتھ بہہ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

قلقارمس سے انہوں نے اپنے قبیلے کا حال بیان کیا ـــــ پنچائت کے سامنے جو مسائل تھے وہ کہہ سُنائے۔ قلقارمس آہستہ سے اٹھا اور ان کے گرد چکر لگاتا ہوا ٹہلنے لگا جیسے کسی گہری سوچ میں کھوگیا ہو ـــــ پھر رکا اور آہستہ سے چلتا ہوا اپنی پہلے والی جگہ پر آکر بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا۔

"سردار جبارا ـــــ تیرے قبیلے کے لوگ کیا کہتے ہیں ـــــ؟ اس معاملہ میں ان کا ردِعمل کیا ہے؟"

"وہ کیا بولیں گے ـــــ وہ تو چُپ ہیں" سردار جبارا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تم بہت بھولے ہو ـــــ جو چُپ ہوتا ہے۔ وہی سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ جس سے کچھ کہنے کے لئے نہیں کہا جاتا ـــــ اسی کے اندر لاوا ابل رہا ہوتا ہے۔ تم کل پھر پنچائت بلاؤ ـــــ اور اپنی مورتی کی بجائے ان سے رائے مانگو!"

میں نے دیکھا ـــــ پروہت اور سردار جبارا پہلے بھونچکے سے رہ گئے پھر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اچانک ان کی نظر دھوبی پر پڑی ـــــ وہ ان کی باتیں سنکر کافی بے چین دکھائی دیتا تھا۔

سب اٹھے ـــــ اور وہ تینوں قلقارمس کو وہیں چھوڑ کر گاؤں کی طرف بڑھنے لگے ـــــ جب وہ چلے گئے تو قلقارمس میرے قریب آیا اور بولا۔

"کل یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ تمہیں کیا لکھنا ہے" اور پھر اُس کا ایک قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ میں نے سمجھا شاید وہ پاگل ہوگیا ہے۔ اس کے قہقہے کی آواز سے ندی کے بہاؤ میں بہتی ہوئی ایک مچھلی اپنا سر پانی سے نکال کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر مسکرا کر پانی میں ڈوب گئی۔

میں نے پوچھا ـــــ "قلقارمس ـــــ میں کہاں سے آیا تھا؟ اور میں یہاں کیوں ہوں؟ اور میرے دو ساتھی تھے ـــــ جن کے نام میں بھول چکا ہوں ـــــ وہ کہاں ہیں ـــــ؟"

قلقارمس نے بغور میرے چہرے پر دیکھا ـــــ اور فکرمند سا ہوگیا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"تم کیوں نہیں اپنے ماضی کو بھول جاتے ـــــ اور اپنے پچھلے ساتھیوں کو ـــــ یاد رکھو یہ بات تم سے خون کے آنسو رلوائے گی اور تم بڑے عذاب جھیلو گے ـــــ اچھا ہے تم اپنی جڑیں ماضی کی زمین سے اکھاڑ لو اور انھیں حال کی دھوپ میں سوکھنے کے لئے پھیلا دو"

دیکھتے ہی دیکھتے وہ چلتا ہوا ندی پار کر گیا۔

اگلے روز پنچائت میں بڑا واویلا ہوا۔ سب بولنے لگے ـــــ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بس اتنا پتہ چلا کہ کمہار سے کم داموں برتن ہتھیانے کے سب خلاف ہیں۔ میں کون ہوں کیا کرتا ہوں اور کیا لکھتا ہوں اور کیا لکھنا چاہیئے ـــــ اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔

پروہت اور ہمارا سردار جبارا اور بنیا تینوں کافی فکرمند ہو اٹھے ـــــ تب پنچائت کسی قسم کا فیصلہ کئے بنا ہی برخاست کردی گئی۔

رات قلقارمس اندھیرے میں سے ابھرا اور ہمارے سردار جبارا کے پاس جا کر بولا۔

"کیوں دیکھ لیا ـــــ؟ یہ سب گھلے ملے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ ان سب کا مفاد سانجھا ہے۔ اگر سردار رہنا چاہتے ہو تو انھیں گھروں میں تقسیم کردو ـــــ ان کے گرد دیواریں کھڑی کردو ـــــ اور حفاظت کے نام پر ان کے سروں پر چھت مہیا کردو ـــــ انھیں اپنی عورتوں کے ساتھ تنہائی میں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر مباشرت کرنے پر اکساؤ ـــــ"

ہمارا سردار جبارا یہ سب سنتا رہا ـــــ اور سوچتا رہا ـــــ میں نے سوچا ـــــ مجھے یہ سب لکھ دینا چاہئے ـــــ آنے والی نسلوں کے لئے کہ کیسے ہم پہلے پیشوں میں اور پھر گھروں میں بٹ گئے تھے۔
آدھی رات کو چاند نکلا تھا ـــــ پھر آسمان پہ ٹہلتا ہوا پھیکا پڑ گیا۔ سورج نے ساری سیاہی پی لی اور اس کے سنہرے ترکش سے نکلے ہوئے تیر ساری کائنات کے سینے میں پیوست ہو گئے۔

جگہ، جگہ مٹی کھدنے لگی اور گارا بننے لگا ـــــ پتھر ٹوٹنے لگے اور ان کو چوکور بنایا جانے لگا ـــــ اور تعمیر شروع ہو گئی ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹے، چھوٹے گھر بننے لگے۔

"کرسی پر بیٹھی لاش نے کہا ـــــ میرا ایک ٹکڑا گتیا کی طرف پھینک دو۔
وہ شانت ہو جائے گی۔ ڈرو نہیں، جو بھی یہاں آیا اس نے ایسا ہی کیا ـــــ"

تب سب خوش تھے اور جب وہ گھر بنا چکے تو پھر سب نے مل کر بڑے چاؤ سے اپنے سردار جبارا کا محل بنایا جو بڑا بھلا آدمی تھا ـــــ گو کہ میرے لکھے اور نہ لکھے سے ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، پھر بھی عادت سے مجبور تھا اور میں نے اپنی پوتھی میں لکھا" کہ راوی سب طرف چین ہی چین بیان کرتا ہے"!

جنگل میں سے دھول اڑتی دکھائی دی اور پھر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ـــــ اور عجیب و غریب نعرے ـــــ ہزاروں آوازیں مل کر کچھ کہہ رہی تھیں ـــــ اور ہمارے شہر میں ہر گھر مال و متاع سے بھرا ہوا تھا ـــــ بازار اور ہاٹ مال و اسباب سے اٹے ہوئے تھے۔
میں نے پہاڑ پر چڑھ کر دیکھا ـــــ وہ سب ہتھیار بند تھے۔ اور ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ہتھیاروں کی چمک سے جنگل کے چرند، پرند اور درند کی آنکھیں خیرہ ہوا اٹھی تھیں۔ وہ غیر ارادی طور پر چھپانے، گنگنے اور غرانے لگے تھے ـــــ ہتھیار بند سپاہ کے آگے ہراول دستہ کو جو شخص راستہ دکھا رہا تھا ـــــ وہ جانا پہچانا سا لگا ـــــ میں نے غور سے دیکھا تو پھر اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ وہ پیرل مرزا تھا۔ لیکن اس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ باقی تو سب ٹھیک ـــــ خاص چیز تھی اس کی کمر سے لٹکتی ہوئی خالی نیام اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی ننگی تلوار۔
میں بھی کتنا کوتاہ بین ہوں۔ کہ نہیں جانتا کہ اپنے شہر سے آگے اور بھی شہر ہیں۔ اور ان شہروں میں دوسرے قبیلے بستے ہیں۔ اور ان قبیلوں کا بھی کوئی سردار ہے جو ہمارے سردار جبارا کی طرح بڑا بھلا آدمی ہے ـــــ اور ہمارے سردار اور اس سردار کے مفادات آپس میں ٹکرا بھی سکتے ہیں۔ اور میرا لنگا دوست پیرل مرزا ـــــ اس قبیلے کے سردار کا خیر خواہ ہو سکتا ہے۔ اور مجھے پہچاننے سے انکار بھی کر سکتا ہے۔
ان سب باتوں کے نتیجے کے طور پر ہمارے قبیلے میں اور پیرل مرزا کے قبیلے میں گھمسان کا رن پڑا ـــــ ہمارے قبیلے کے لوگ اپنے، اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے چھتوں پر چڑھ گئے ـــــ اور حتی المقدور حملہ آوروں کا مقابلہ کیا ـــــ اس سارے عمل میں ہمارے سردار جبارا کی سپاہ تعداد میں ذرا کم پڑ گئی اور وہ جنگ ہار گیا ـــــ ہم سب بندی بنا لئے گئے ـــــ اور فاتح قبیلہ کے سردار کے سامنے مشکیں باندھ کر پیش ہوئے ـــــ وہاں میں نے دیکھا ـــــ فاتح قبیلے کے سردار کے ساتھ قلقارس بڑے انداز سے بات چیت میں مشغول تھا۔ بات چیت کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہوا ـــــ ہمارا سردار جبارا (جو بڑا بھلا آدمی تھا) کا سر قلم کر دینے کا حکم ہوا ـــــ اور ہم سب فاتحین کے غلام بنا کر چھوڑ دیئے گئے۔ ـــــ مگر چھوڑے جانے سے پہلے ہم سب کے چوتڑ داغ دیئے گئے ـــــ تاکہ پہچانے جا سکیں۔ اور فاتح قبیلے کے لوگ ہمارے گھروں کے اندر گھس، گھس کر ہمارے دیوی، دیوتاؤں کی مورتیوں کو تعجب سے دیکھنے لگے۔
یہ ساری داستان میں نے حامد کمار کو سنائی۔
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچھڑا ہوا حامد کمار مجھے کیوں ملا ـــــ؟ پیرل مرزا پر کیا گذری ـــــ؟ اور ہم تینوں دوستوں کا وصال کیونکر ممکن ہوا۔؟

فاتح قبیلے کے سردار نے وہ رات جشن منانے کا حکم دیا ـــــ ہمارے گھر اور ہمارا رہن سہن ان کے لئے بڑی ترقی یافتہ چیز تھی ـــــ سردار کبھی اپنے پچھڑے پن کی وجہ سے آہ سرد بھرتا اور کبھی سب تاراج کر دینے کی خوشی میں قہقہہ لگاتا ـــــ قلقارس بڑے غور سے ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ مگر کچھ بول نہیں رہا تھا۔

خاموشی کتنی خطرناک چیز ہے اس کا اظہار وہ خود ہی کر چکا تھا۔ اس کی فکرمندی کی وجہ سے اس کا بچھڑے کی تھوتھنی سا ہاتھ بُری طرح تڑپ رہا تھا ـــــ پربل مرزا پھر دکھائی نہ دیا ـــــ معلوم ہوا کہ وہ زخمی ہے اور گھنے جنگل میں کسی جڑی بوٹی کا لیپ کر کے دھوپ میں لٹا دیا گیا ہے ـــــ رات ہونے اور جشن کی شروعات میں ابھی دیر تھی۔ میں خراماں، خراماں گھنے جنگل کی طرف بڑھا ـــــ چلتا گیا، چلتا گیا حتیٰ کہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں زخمی لیپ کر کے دھوپ میں لٹائے ہوئے تھے۔ وہاں وہ بہت سے تھے۔ سب ایک خاص قسم کے لیپ سے لتھڑے ہوئے تھے ـــــ کسی کا بھی چہرہ پہچانا نہ جا سکتا تھا ـــــ میں اسے تلاش کرتے، کرتے تھک گیا آخر ایک شخص کے پاس بیٹھ کر میں نے اپنا حال کہہ سنایا یہ سمجھ کر کہ وہی شاید پربل مرزا ہو ـــــ لیکن افسوس وہ شاید وہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے کوئی ہنکارہ نہ بھرا۔ میں چُپ چاپ وہاں سے اٹھا اور بستی کی طرف بڑھا۔ بھاری دل سے کہ مجھے غم تھا۔ اپنے بچھڑے ہوئے دوست کے دکھائی دے کر پھر بچھڑ جانے کا۔

بستی کے عین وسط میں بڑا سا الاؤ جل رہا تھا۔ الاؤ میں کچھ جنگل سے کاٹی ہوئی لکڑیاں تھیں اور کچھ ہمارے گھروں کا ایندھن تھا ـــــ جو برسات کے موسم کے لئے جمع کر کے رکھا تھا۔ کہ جب سب طرف جل تھل ہو جائے گا تو گھروں میں روٹیاں سینکنے کے کام آئے گا ـــــ سب جلایا جا رہا تھا ـــــ ہمارے موسم برسات کے لئے بچائے ہوئے ایندھن کا لحاظ کئے بغیر۔

میں الاؤ کے گرد بیٹھے لوگوں میں جا بیٹھا ـــــ فاتح اور مفتوح ساتھ، ساتھ بیٹھے تھے۔ سردار اور قلقارمس ایک چبوترے پر تھے ـــــ ارد گرد مشعلیں جل رہی تھیں۔ بہت سے ساز جن پر جانوروں کی کھالیں منڈھی ہوئی تھیں ـــــ دھم دھما دھم بجائے جا رہے تھے۔ لوگ خوشی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ بھنا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ مٹی کے لوٹوں میں عرق پی رہے تھے۔ اچانک قلقارمس اور سردار میں کچھ کانا پھوسی ہوئی ـــــ اور پھر سردار کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا ـــــ اس نے دایاں ہاتھ اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا ـــــ اس طرف کھڑے آدمی نے سر جھکا کر حکم بجا لانے کا جوابی اشارہ کیا اور پھر اندھیرے میں گم ہو گیا ـــــ دھما دھم کی آواز مزید بلند ہوئی ـــــ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو مزید پھیلی ـــــ اور شور کچھ سوا ہو گیا ـــــ کہ اچانک عورتوں کی چیخ و پکار سنائی دی اسی طرف سے جس طرف وہ حکم کا بندہ اندھیرے میں گم ہوا تھا ـــــ پھر دیکھا کہ اندھیرے میں سے کچھ جسم نمودار ہوئے جن پر الاؤ کے شعلے ناچ رہے تھے ـــــ وہ جسم ہمارے قبیلے کی عورتوں کے تھے ـــــ جن کو بالکل برہنہ کر دیا گیا تھا۔ اور وہ اپنی بے پردگی اور بے بسی کے احساس سے آہ و بکا کر رہی تھیں ـــــ ان کی آنکھوں کے آنسو ان کے پستانوں پر گرتے اور پھر پیٹ پر سے بہتے ہوئے زیر ناف بالوں میں گم ہو جاتے ـــــ ان کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اور وہ اپنے لمبے اور گھنے بالوں سے اپنے برہنہ جسم کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ـــــ ان سب کی گردنوں میں رسیاں بندھی تھیں اور وہ گھسیٹ کر الاؤ کے پاس لائی جا رہی تھیں۔ اس جگہ جہاں چبوترے پر فاتح قبیلے کا سردار بیٹھا تھا۔ اور قلقارمس، پروہت کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا ـــــ فاتح قبیلے کے لوگ خوشی سے اچھل رہے تھے اور ہم سب کے سر شرم، شرمندگی اور نامردی کے احساس سے جھک گئے تھے۔ ہمارے پروہت نے سر اٹھایا اور ہجوم کی طرف دیکھا ـــــ شور ذرا کم ہوا پھر اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا ـــــ اور فضا میں عورتوں کی ہچکیوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی ـــــ پروہت نے اعلان کرنا شروع کیا۔

"جبارا قبیلے کے لوگو اور پشارا قبیلے کے لوگو ...!

ہمارا نیا سردار پشارا بڑا مہربان ہے ـــــ اس نے ہم پر حکومت کرنا قبول کر کے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ وہ ہم سے یکا رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ ہماری عورتوں کے بطن سے اس کے قبیلے پشارا کے بچے پیدا ہوں۔ تاکہ ہمارا اور ان کا خون ایک ہو جائے۔ ہمارا نیا سردار پشارا بھی ہمارے قبیلے کی ایک لڑکی سے شادی کرے گا ـــــ اور نہ بیاہ پڑھانے کا فرض اس نے مجھ پر عائد کیا ہے ـــــ میں اس کا شکر گزار ہوں ـــــ اور آپ سب کو بھی شکر گزار ہونا چاہیئے۔ اس کی طرف سے اب ہمیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ ہم پہ کوئی ظلم نہ ہو گا؛ اور اس نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ ہمارے داغے ہوئے چبوترے دوبارہ

پر جڑی بوٹیوں کا لیپ لگایا جائے گا تاکہ زخم بھر جائے ــــــ اس نے کہا ہے۔
کہ اسے زخم سے کوئی سروکار نہیں ــــــ بس وہ چاہتا ہے کہ داغ قائم رہے۔
اب جبارا قبیلے کے لوگ اور پشارا قبیلے کے لوگ مل کر ناچیں گے پھر ہماری عورتیں
اپنے آپ کو پشارا قبیلے پر نچھاور کر دیں گی۔ اور پھر ہمارا خون اور ان کا خون...!"

اس سے پیشتر کہ وہ اپنا جملہ پورا کرے۔ دھم دھا دھم کی آوازیں بلند ہوئیں اور پشارا قبیلے کے لوگ خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے ــــــ چیختے اور چلاتے ہوئے اپنے حلق اور حلقوم کا پورا استعمال کرتے ہوئے ناچنے لگے۔ ہمارے قبیلے کے لوگ اور عورتیں اس بھیڑ کا حصہ بن گئیں اور اتنی دھول اڑی کہ آنکھ پڑی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔

ناچ رنگ اور شراب رات بھر چلتا رہا ــــــ صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے سردار پشارا نے ہمارے قبیلے کی سب سے زیادہ حسین اور کم سن عورت جنتاں سے بیاہ رچایا ــــــ بیاہ سے پہلے ایک بوڑھی عورت نے جنتاں کی اندام نہانی میں انگلیاں ڈال کر اس کا اچھی طرح سے معائنہ کیا اور پھر سردار پشارا کی طرف دیکھ کر مسکرائی ــــــ سردار پشارا نے اپنے ماتھے کا پسینہ اپنی انگلی پر لیکر اس بوڑھی عورت کے ہونٹوں پر مَل دیا۔ عورت خوش ہوئی ــــــ اس نے سر جھکا دیا اور واپس چلی گئی۔

اس سارے ہنگامے میں قلقارس کہاں غائب ہو گیا کچھ پتہ نہیں لگا۔

وقت گزرتا گیا ــــــ سب ٹھیک ٹھاک چلنے لگا ــــــ گھر کے آگے آنگن بنے اور چار دیواری سی چُن دی گئی ــــــ ہمارے کھیتوں میں اور گھروں کے آنگنوں میں پیٹ پھولی عورتیں چہل قدمی کرتی دکھائی دیتیں۔ ان کے پیٹ میں ہمارے نئے سردار پشارا کے قبیلے کی انتہائی قیمتی امانت محفوظ تھی۔

خبر آئی کہ ہمارے قبیلے کی حسین ترین اور کم سن عورت جنتاں نے چاند سے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ اور ہمارے نئے سردار پشارا نے اعلان کیا ہے۔ کہ جنتاں کے بطن سے پیدا ہوا بچہ ہی اس کے قبیلے کا وارث ہو گا ــــــ ہمیں بتایا گیا کہ یہ بات ہمارے قبیلے کے لئے قابلِ فخر ہے اور خوشی کا مقام ہے۔

"اب تو خوش ہو ــــــ؟" ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ قلقارس کھڑا مسکراتا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اوہ ــــــ تم ــــــ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ــــــ "کس بات پر خوش ہونا چاہئے ــــــ؟"

"اب پشارا قبیلہ تمہارے جبارا قبیلے کا غلام ہو گیا ــــــ"

"وہ کیسے ــــــ؟"

"اوہو ــــــ تم راج نیتی نہیں سمجھتے ــــــ!"

"راج نیتی ــــــ؟"

"ہاں ــــــ راج نیتی ــــــ اسے راج نیتی کہتے ہیں نو تیج ــــــ پشارا قبیلے کے سردار نے جبارا قبیلے پر حملہ کیا ــــــ خون خرابہ کیا ــــــ اور اس قبیلے کی ہر چیز پر قابض ہو گیا۔ میں نے جنتاں کی شادی اس سے کرا دی جو اس قبیلے کی حسین ترین اور کم سن عورت تھی ــــــ سردار پشارا کے نطفہ سے اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جو دونوں قبیلوں کا وارث ہو گا ــــــ یعنی کہ پشارا قبیلے کے لوگ جبارا قبیلہ کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے کے غلام ہوں گے ــــــ بولو، فتح کس کی ہوئی ــــــ؟"

میں حیران پریشان سا کھڑا تھا ــــــ قلقارس ہنس رہا تھا۔ اس کا جھڑے کی تھوتھنی جیسا ہاتھ تڑپ رہا تھا۔

ہمارے قبیلے کے لوگ پشارا کی پہاڑی پر پہنچے تاکہ بچے کو دیکھ سکیں میں بھی ان سب کے ساتھ تھا۔ بچہ دھوپ میں لیٹا ہوا کلکاریاں مار رہا تھا۔ ہم باری باری اسے دیکھتے اور خوش ہوتے ہوئے جنتاں کے قریب جاتے تھے اور شکریہ ادا کرنے کے انداز میں سر جھکا دیتے تھے وہ مسکراتی تھی۔

جب میری باری آئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بچہ بالکل حامد کمار تھا میں ہکا بکا سا ہو گیا تھا۔ بچہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور تیزی سے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میں اس وقت تک وہاں رہا جب تک کہ وہ بچہ جوان نہ ہو گیا۔ اس دوران ہم نے بڑے، بڑے مندر بنائے اور ان میں اپنے من پسند دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں استھاپت کیں۔ ہماری عورتوں نے کئی بچے جنے۔ اور پھر ہماری زمین ان بچوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہم سب غریب ہو گئے اور نئی زمین کی تلاش میں نکلنے کیلئے

تیاریاں کرنے لگے۔ کہ حامد کمار نے سردار پشارا کو موقعہ پاکر قتل کر دیا۔ اور اپنی لہو میں لت پت تلوار اپنی ماں جنتاں کے قدموں میں رکھ کر کہا۔

"میں نے تیری عصمت دری کا بدلہ لے لیا۔ مجھے آشیرواد دے۔"

جنتاں نے آشیرواد دیا۔ اور ہم سب بھی آشیرواد دینے کے لئے آگے بڑھے اور پروہت نے حامد کمار کی پیشانی پر تلک لگا کر اس کے گلے میں پھول مالا ڈالی۔ قلقارس نے پروہت کے کان میں کچھ کہا جسے ہم نے بالکل نہ سنا۔ ہم نے تو سُنیں دعائیں، دعائیں کی وہ آوازیں جو شاید دُور شہر میں گولی چلنے کی وجہ سے بلند ہوئی تھیں۔

میں آہستہ، آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا ـــــ قدموں کی ایک آہٹ میرے آگے تھی اور ایک آہٹ میرے پیچھے ـــــ میں بہت تھک گیا تھا جیسے بڑی لمبی مسافت طے کی ہو ـــــ مگر اتنا ہی تو تھا کہ کنویں میں اترا تھا۔

"خیر اس بات کا تو پتہ چل گیا کہ کنواں دَل دَل سے اَٹا ہوا نہیں ہے۔" آواز میرے پیچھے سے آئی میں نے پلٹ کر دیکھا پربل کمار آہستہ، آہستہ میرے پیچھے آرہا تھا۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا پربل کمار کہ یہ تیری نظر کا دھوکا ہے۔" آواز میرے آگے سے آئی ـــــ میں نے سر اٹھا کر دیکھا ـــــ حامد مرزا کنویں کے اندر سے نکل کر مینڈھ تک پہنچ رہا تھا۔

ہم تینوں کنویں میں سے نکل کر، اس کے چبوترے پر سے کودے اور گرجا گھر کے احاطے میں داخل ہوگئے۔ اچانک گرجا گھر کا گھڑیال بجنے لگا۔ ہم تینوں نے اس طرف دیکھا تو ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی ـــــ جس چبوترے پر کبھی عیسیٰ کا مجسمہ تھا، وہاں اب قلقارس کا بڑا سا مجسمہ کھڑا تھا۔ جس کا لمبا بازو آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ چبوترے کے نیچے سوکھی ہوئی گھاس کے انبار میں ایک بھیڑ مری پڑی تھی۔ اور مریم کی مورتی بدرنگ ہو چکی تھی۔ اس مورتی کے پستان اور اندام نہانی خون آلود تھی۔

ہم آہستہ، آہستہ چلتے ہوئے ریستوران تک پہنچے۔ ہم نے دیکھا کہ ٹھگنے قد کا فربہ آدمی جس کے چہرے پر بشاشت پھیلی رہتی تھی۔ کاؤنٹر پر، پی ہوئی چائے کے پیسے دے رہا تھا ـــــ نہ اس نے ہماری طرف دیکھا نہ ہم نے اس کی طرف دیکھا ـــــ ہم تو بس خوش تھے کہ ہمیں ہمارے بھولے ہوئے نام یاد آگئے ہیں حامد مرزا، پربل کمار اور توتیج۔

ہم تینوں نے اپنی، اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے چائے کا آرڈر دیا اور گفتگو میں محو ہو گئے ـــــ ہم نے اپنے تمام مسائل پر بات چیت کر ڈالی ـــــ چائے آگئی چائے پی گئی ـــــ بڑا لطف آیا ـــــ اچانک پھر ایک طرف سے دعائیں، دعائیں کی آواز آئی ـــــ کچھ لوگوں نے اس سمت دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی ـــــ سڑک پر سے ایک پُرانا کھڑکھڑاتا ہوا ٹرک گزر گیا جس کے ٹوٹے ہوئے حصّوں میں سے انسانی ٹانگیں لٹکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

"اور کچھ ـــــ؟" ویٹر نے آکر آہستہ سے پوچھا۔ ہم تینوں چونکے ـــــ "اب چلنا چاہئے۔" ہم تینوں نے ایک ساتھ سوچا ـــــ "نہیں کچھ نہیں!" ہم تینوں نے ویٹر کو جواب دیا۔ اور اگلے دن ملنے کا وعدہ کر کے اپنی، اپنی جگہ سے اٹھے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھائے۔

"یہ کیا ـــــ؟ ہم میں فاصلہ اتنا کیونکر ہو گیا ـــــ؟" ہم تینوں نے ایک ساتھ سوچا ـــــ اور پھر ہمیں احساس ہوا کہ ہم تینوں کا مصافحہ کے لئے بڑھا ہوا بازو بہت لمبا ہو گیا ہے۔

جمغورہ الفریم اُداس اور ویران ہے۔ اس کے فرش پر ایک لاش رکھی ہے جس کا انگ، انگ ...

سریندر پرکاش نے جدید انسان کے ذہنی مسائل کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ اس کی کہانیاں زبان و بیان کے ایجاز اور تہہ در تہہ علامتوں کی معنویت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ وہ بہ ظاہر نہایت سادہ زبان استعمال کرتا ہے جیسے کوئی روانی سے بے تکلف لکھے چلا جاتا ہو، لیکن ہر سطر گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہے اور چند ہی جملوں کے بعد احساس ہونے لگتا ہے کہ پڑھنے والے کو ذہنی چیلنج کا سامنا ہے۔ سریندر پرکاش کے افسانوں کا تانا بانا خواب اور بیداری کے بیچ کی کیفیتوں سے تیار ہوتا ہے اس لئے اکثر چیزیں اپنے روایتی تصور سے ہٹ کر سامنے آتی ہیں اور پڑھنے والا چونک چونک اٹھتا ہے۔ نیم شعوری اور تحت الشعوری کیفیتوں کے امتزاج سے جابجا تحیر کے چھینٹے بھی ملتے ہیں جو کہانی کی دلچسپی بنائے رکھتے ہیں۔ سریندر پرکاش کے افسانوں میں لفظوں کے معنوی اور منطقی معنوں کے پیچھے ایک دوسرا معنی آباد نظر آتا ہے۔ وہ استعاروں کے جال سے علامتی معنوں کی ایک وسیع اور مشکل فضا قائم کر دیتا ہے۔ اس کی ذہنی پرچھائیاں، اجلی، نمایاں اور متحرک ہوتی ہیں اور واقعات کا ایک دریا سا اپنے حسن اور فکری اتار چڑھاؤ کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ لغوی معنی سے پرے دیکھ سکنے والوں کے لئے سریندر پرکاش کے افسانوں میں داستان کی سی واقعیت ہے اور قصے کی سی کشش۔ لیکن وہ لوگ جو دو سو معنی میں الجھنے کا ماتم کرتے رہتے ہیں ان کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انہیں اپنی تخیلی نارسائی اور کم فہمی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔

("اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ" از گوپی چند نارنگ اردو افسانہ روایت اور مسائل صفحہ نمبر ۲۱۲ — ۲۱۴)

اویس احمد دوراں

تہہِ خنجر

اقلیت کہیں کی ہو تہہِ خنجر ہی رہتی ہے
ہلاکت خیز ہاتھوں کے ہزاروں جبر سہتی ہے
خس وخاشاک کی مانند سیلِ غم میں بہتی ہے

نہ کوئی خواب آنکھوں میں، نہ دل میں آسرا کوئی
نہ جوئے خوں سے بچنے کا نظر میں راستہ کوئی
نہ مستقبل کی آوازیں نہ منزل کی صدا کوئی

خود اپنی ہی فضا میں خوف کا احساس ہر لمحہ
عدم محفوظیت کا دور تک غمناک سناٹا
سہانی ہو کے بھی بے رونق و بے کیف سی دنیا

حقارت کی نظر، نفرت کی چنگاری تعاقب میں
مصیبت آگے آگے ذلت و خواری تعاقب میں
جدھر جائے وہیں طوفانِ بیزاری تعاقب میں

زباں معتوب، تہذیب و ثقافت دار کی زد میں
گھر آنگن عزت و ناموس کل تلوار کی زد میں
لبوں کی مسکراہٹ آتشیں یلغار کی زد میں

اقلیت جہاں بھی ہے یہی اس کا مقدر ہے
یہ زخمی، بے اماں مخلوق ہر سو زیرِ خنجر ہے
بتائے دل یہ غم کی رات ہے یا روزِ محشر ہے

پا کے اکیلا تیر چلایا، اس کے سب انکاری ہیں
جس کا کوئی صیاد نہیں ہے ہم وہ گھائل پنچھی ہیں

چاند مرے تم ڈوبے جب سے آنکھیں بے حد روئی ہیں[1]
ہو نہ یقین تو دیکھ لو آکر پلکیں اب تک بھیگی ہیں

ابھی ابھی کچھ دیر ہوئی آئی تھی چھناکے کی آواز
شہرِ وفا میں شیشے کی دیواریں شاید ٹوٹی ہیں

قتل کا منظر گلی گلی ہو اس کا ہے ارمان تمہیں
خون میں ڈوبی مقتل کی تلواریں لیکن دیکھی ہیں ؟

دیکھیں کس میں کتنی سکت ہے، گر کر کون سنبھلتا ہے
اونچی نیچی راہ وفا میں تم بھی ہو اور ہم بھی ہیں

عزت و حرمت نام ہے کس کا، دل کا سکوں کیا ہوتا ہے
ہم کیا جانیں ہم سے نہ پوچھو ہم دو نمبر کے شہری ہیں

زخمی دل والوں کے غم سے میرے غم کا رشتہ ہے
اسی لئے تو میری آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں

ندی کنارے صدیوں سے آباد ہے چھوٹا سا اک گاؤں
اسی طرف سے درد بھری آوازیں آتی رہتی ہیں

مجھی پہ کچھ موقوف نہیں ہے سب ہیں فدا البیلوں پر
میٹھی باتیں، بھولی شکلیں سب کو اچھی لگتی ہیں

جھیل سہانی، پربت دلکش، وادی وادی رنگ بہار
دیکھو ذرا دنیا کی یہ تصویریں کتنی پیاری ہیں

میرا بھی احساس یہی ہے لوگوں کا بھی یہی خیال
دوراں جی خود بُرے ہیں لیکن باتیں ان کی اچھی ہیں

[1] یہ مطلع اپنے مرحوم بھتیجے کی یاد میں کہا ہے ــــ دوراں

● محلہ فیض اللہ خان دربھنگہ (بہار)

Accession Number.
8609 S
Date 21.12.87

جدید علامتی افسانہ۔ تخلیق اور تنقید

عتیق احمد ● ۱۹۵/آر۔ بلاک نمبر ۱۵، دستگیر سوسائٹی، کراچی۔ ۳۸ (پاکستان)

جدید علامتی افسانہ نے نہ جانے کس نحس گھڑی میں جنم لیا ہے کہ اس کی پیدائش کے دن سے آج تک اس کے موضوعات، اس میں سمیٹے گئے معاشرتی مسائل سے لیکر زبان و بیان حتیٰ کہ خود علامتوں کے استعمال تک (جو اس کا سرمایۂ فخر و افتخار ہے) سب ہی کچھ بحث و تحمیص بلکہ شب و ستم کی زد میں ہے۔ عدم مقصدیت اور لاسمت ہونے کے الزامات اس سب کچھ پر مستزاد۔ خود علامتی افسانہ نگاروں کا یہ حال ہے کہ اپنے قارئین کے بار بار اصرار کے باوجود نہ اپنے موضوعات کی کوئی کنہہ دیتے ہیں نہ کرداروں کی اہمیت کے قائل ہوتے نظر آتے ہیں نہ واقعہ کو افسانے کی بنیاد کے طور پر ماننے کو تیار ہیں۔

جدید علامتی افسانہ نگار اپنی جگہ اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ اس سے پہلے افسانے کے نام پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف اور محض روائتی انداز کی چربہ نگاری، صحافت اور سیاست تھا اور صرف اور محض ایک مینی فیسٹو کی غیر تخلیقی تشریح، توضیح اور تابع داری نہ اس افسانے میں کوئی حسن تھا، نہ تخلیقی اپج اور لاکھ دعوں کے باوجود زندگی سے کوئی تعلق نہ ادب سے۔ دوسری طرف غیر جدید غیر علامتی افسانہ نگار اور نقاد یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ جدید افسانہ مجذوب کی بڑ ہے اور مجذوب کی بڑ نہ شاعری کے ذیل میں آتی ہے اور نہ افسانہ اور ناول کی۔ جدید علامتی افسانے سے قارئین کی خاصی بڑی تعداد اور نقادوں کی یہ گتھم گتھا کوئی بیس برسوں سے چلی آرہی ہے۔ نہ آج کا جدید افسانہ نگار افسانے لکھنے سے باز آرہا ہے نہ تنقید کی آویزش میں کوئی اضمحلال واقع ہوتا نظر آرہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ افہام و تفہیم کی کوئی صورت نکل پارہی ہے اور نہ دونوں طرف کے موقف میں کسی تبدیلی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں گویا "معرکہ سخت ہے" اور افسانہ بھی دونوں طرف عزیز۔

جدید علامتی افسانے کے دفاع میں، یوں تو خود جدید افسانہ نگاروں نے بہت سی باتیں کی ہیں، بہت سی تاویلات پیش کی ہیں اور اپنی بات کے صائب ہونے پر خاصی بساط بھی دکھائی ہے۔ ان حضرات کی اس شکایت میں بھی مجھے کم وزن نظر نہیں آتا کہ جدید علامتی افسانے کو کوئی نقاد میسر نہیں آیا۔ میری اس بات کی تائید میں یہ حقیقت بالکل سامنے کی بات ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں جدیدیت کا تذکرہ تو ہم سب ہی اتنے زور و شور سے کرتے ہیں کہ گویا جدیدیت کوئی لازمی شرط ہے کہ جس کے اقرار کے بغیر آج کے دور میں کوئی انسان مرد معقول کی تعریف میں نہیں آسکتا اور نہ ثقہ طبقے میں اس کا شمار ہونا چاہیئے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ جدیدیت کو اس کے بے محابا گن گانے والوں نے جدید معاشرتی علوم سے اس کے سارے رشتے منقطع کر کے کوئی قائم بالذات قسم کی چیز بنا دیا ہے۔ گویا نہ اس کا تعلق علم و تعلیم سے ہے نہ خبر و آگہی سے۔ چنانچہ فلسفہ، منطق، تاریخ، سیاست اور دوسرے سماجیاتی علوم سے باخبری اور ان کے اثرات و نتائج سے لاپرواہی ایک ایسا لائحہ عمل بن گیا ہے جس کو صرف اور محض بلکہ مجرد جدیدیت کا نام دے دیا گیا ہے اور اب جدیدیت کا لفظ ہی اس معاشرے کی تمام موجود صورت حال کا احوال بلکہ جملہ مصائب اور مسائل کے حل میں اسم اعظم کا درجہ پا گیا ہے۔

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ جدید افسانہ نگار اپنے دفاع میں جتنی فلسفیانہ تاویلات کا زور باندھتا رہا بات سلجھنے کے بجائے اتنی ہی الجھتی چلی گئی۔ ان سب الجھی ہوئی باتوں کا نہ دہرانا آسان ہے اور نہ ہی یہاں ان باتوں کے رد یا دفاع کا مسئلہ درپیش ہے۔ بس دو ایک باتیں جو بنیادی بھی ہیں اور اہم بھی پیش خدمت ہیں تاکہ ان پر مزید سوچنے کی راہ نکلے اور قاری اور افسانہ نگار کے درمیان تناتنی کی فضا

ں کچھ کمی ہونے کا امکان پیدا ہو۔

جدید افسانہ کا آغاز کن وجوہ کے سبب اور کس ماحول میں ہوا ؟ اب یہ بحث سمٹ سمٹا کر صرف اتنی رہ گئی ہے کہ جدید افسانہ نگاروں کے بقول ترقی پسند افسانے کے موضوعات اور زبان و بیان کی یکسانیت اور یک رنگی نے اس افسانے کی کشش ماند اور سانگ میں کساد بازاری پیدا کر دی تھی۔ دوسرے یہ کہ ترقی پسند تحریک کو disintegrate کر دیئے جانے کے بعد آنے والے افسانہ نگاروں کے سامنے یہ سوال بطور چیلنج سامنے آیا کہ وہ ترقی پسند افسانے کی طرح اپنے ماحول میں جاری و ساری بے اطمینانی اور ظلم و جبر کے خلاف کس انداز میں اپنے موقف کو پیش کریں۔ مختصر الفاظ میں یہ دونوں باتیں یوں بھی کہی جا سکتی ہیں کہ جدید افسانہ نگار اپنے معاشرتی مسائل کی بھی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے اظہار میں ترقی پسندوں کے برعکس ایسی جدّت اور ندرت بھی ہو جو انھیں ممتاز اور ممیّز بھی کرا سکے۔ معاشرتی مسائل کے بارے میں ان کی یہ بھی رائے ہے کہ پانچویں دہائی کے اختتام کے بعد سے ہمارے معروضی حالات میں ایسی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں جو زمانۂ گزشتہ کے مقابلے پر بالکل نئی نوعیت کی ہیں اور ان میں سب سے اہم تبدیلی لوٹ مار کرنے والے ان ایٹمی ہتھیاروں پر دو سُپر پاورز کی دسترس ہے جن کے انبار نے پورے عالم انسانیت کو بے بنیاد بنا کر رکھ دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان متذکرہ بالا دونوں باتوں سے، بلکہ ان سے متعلق اور بھی بہت سے ذیلی پہلوؤں پر، کسی بھی ہوش مند آدمی کو کیا اختلاف ہو سکتا ہے ؟ گزشتہ تیس بتیس برس کی ہماری معروضی تاریخ ہمارے سامنے ہے چنانچہ ان حقائق سے چشم پوشی نہ ممکن ہے نہ مستحسن۔ یہاں نہ بے جا ہمدردی کی ضرورت ہے، نہ کسی دور کا ادب اور ادیب اس بخشش کا کبھی طلبگار رہا ہے اور نہ تنقید نگاری کا عمل یتیموں اور لسیروں کے سر پہ ہاتھ رکھنا ہے۔ حق کی بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک ۲۰/۲۲ برس کے لگ بھگ بطور منظم تحریک فعال اور integrated رہی اگر اپنی تنظیمی disintegration کے باوجود ہر دور کی جدید نسل کے باشعور اور باہمت نوجوانوں کی تہذیب اور ترتیبِ ذہن میں مسلسل فعال رہتی چلی آ رہی ہے۔

بیسویں صدی کے ابتداء سے نصف اوّل کے آخر تک برّصغیر پاکستان اور ہندوستان کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی حاکم اور محکوم کے درمیان حقوق شکنی اور حقوق طلبی کی مبازرت کا دور تھا۔ زندگی کے اثبات پر یقین اور اس کی معنویت سامنے نظر آنے والی باتیں تھیں۔ حاکم اور محکوم کے درمیان کھلی مبازرت پست ہمتی نہیں بلند ہمتی پیدا کرتی تھی اس لئے کہ جذبۂ مبازرت طلبی کو سہارا دینے میں سیاست داں، مزدور، دانشور ادیب، طلباء، اساتذہ غرض معاشرہ کی ہر اکائی ایک دوسرے کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ ترقی پسند ادب کی تحریک اسی ماحول میں جتنی سُرعت کے ساتھ مستحکم اور نمو پذیر ہوئی اس کا یہ کچھ ہونا اتنا تعجب خیز نہیں جتنا اس کا یہ کچھ نہ ہونا ہو سکتا تھا۔ مقصد یہ عرض کرنا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے دور کے تقاضوں کا جواب اور تاریخی دھارے کے بہاؤ کا جزو لاینفک تھی۔

اب جدید لکھنے والوں کی دنیا ہے۔ سیاسی استحصال کی بدیہی قوتیں پردہ پوش ہو چکی ہیں اور وہ اب جن کی دوست بن جاتی ہیں، آسمان بھی ان کے دوستوں سے دشمنی بلا جبر و اکراہ ترک کر دیتا ہے۔ پہلے بیرونی یا غیر ملکی عناصر سیاسی شب خون مارتے تھے اب وہ ثقافتی اور دفاعی میدانوں میں اپنی اعدادی رقوم کے بل پر روز روشن میں آنکھوں دیکھتے نقب زنی کرتے ہیں اور آقائے ولی قسمت گردانے جاتے ہیں۔ اس سب کچھ پر مستزاد یہ کہ جس دنیا پر پس پردہ حکمرانی فرماتے ہیں بیرونِ پردہ اس ہی دنیا کے سر پر ہلاکتوں سے لبریز اپنے ہتھیار لٹکائے رہتے ہیں۔ یہ "جدید" صورتِ حال ترقی پسندوں کے دور کی قدیم صورتِ حال سے یکسر بدلی ہوئی ہے۔ ان کا مدِمقابل بھی نظر آتا تھا اور اس کے ہاتھ میں خنجر کھلا ہی سامنے ہوتا تھا۔ اب دوستوں کی آستینیں لمبی ہیں ان میں "دشنۂ پنہاں" نظر ہی نہیں آتا ور رگِ جاں پر ہر لمحہ اس کی دھار بھی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ جدید عہد کی یہ ساری منفی معنویت ہی فی الواقع جدید افسانہ نگار کی فضا میں لامعنویت اور اس کی تحریروں کی بے سمتی اور لایعنیت کی جڑ بنیاد ہے۔ لہٰذا اپنی حد تک میں یہ بات باور کرانا چاہتا ہوں کہ ان معروضی اور ٹھوس شہادتوں کے ہوتے ہوئے مجھے جدید افسانہ نگاروں کی بنیادی اور موعودہ باتوں سے نہ اختلاف ہے نہ ان کی تحریر دل سے پُرخاش۔

رہا جدید افسانہ نگاروں کا دعویٰ کہ بات وہ بھی ترقی پسند انہ ہی کرتے ہیں البتہ وہ بات کہنے کے ڈھب (یعنی اسلوب) میں ایک

ندرت پیدا کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی بات میں سچائی ہی ہو بہت سامنے کی بات تو یہ ہے کہ ذریعۂ اظہار کا پیرایہ کچھ بھی ہو لیکن اظہار کی آخری شکل حقیقی اور مادی پس منظر کے قرار واقعی سیاق و سباق کے حوالے لیکن اُس سے اخذ و تاثر کے بغیر ممکن الوجود نہیں ہو سکتا۔ رواں پس منظر میں چھٹی دہائی اور اس کے آگے کی دنیا کو ایٹم کی گزشتہ اور مستقبل میں متوقع تباہ کاریوں پر ٹیکنوکریٹس کی دسترس نے عام زندگی کو جس درجہ وحشت اور خوف میں مبتلا کر رکھا ہے وہ آج کی پوری حقیقت نہیں تو واہمہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں اس بات کے اعتراف میں بخیل نہیں ہونا چاہیئے کہ چھٹی دہائی کے بنتے ہوئے تخلیقی ذہن کو اپنے ابتدائی تشکیلی مراحل ہی میں جس زہرناک فضا میں سانس لینا پڑا اور مستقبل کے بارے میں اندیشہ ہائے دور و دراز میں اس کچے ذہن کو جھونک دیا گیا وہ پختہ شعور پانے کے بعد اس نسل کے لئے محض تماشہ بینی کا درجہ نہیں رکھ سکتا۔ اسے تو آنکھ کھولتے ہی کسی بھی لمحہ فنا کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار دیئے جانے کے خدشے میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ جان ہے تو جہان ہے۔ چنانچہ نئے تخلیقی ذہن کو جن میں جدید افسانہ نگاروں کی نسل بھی شامل ہے۔ جتنی بے اعتباری اپنی جان کے ہونے کی لاحق ہوئی جہان کے کسی لمحہ بھی فنا ہو جانے کا خطرہ اس سے کم سنگین نہیں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انسان بحیثیت جاندار (یا انسانی وجود) ایک ایسا مثبت شبہ بن گیا کہ" ہرچند کہیں کہ ہے پر نہیں ہے" کا اعلان ہونے لگا، اور جہان صرف نظر کا دھوکہ بن کر رہ گیا۔

خواتین و حضرات ! میں آپ کو موجودیت کا درس نہیں دے رہا ہوں کہ نہ میں اس کا قائل ہوں نہ اہل۔ میں یہاں صرف جدید افسانے لکھنے والوں کے ہاں ترقی پسند افسانے کے مقابلے پر ان کی تحریروں کے سماجی سیاق و سباق کی بات کر رہا ہوں۔ تو سلسلۂ کلام یہ تھا کہ ایسی صورتِ حال ہو کہ جب حال بدحال اور مستقبل اس سے کہیں زیادہ بے حال نظر آتا ہو اور بنتے ہوئے ذہن پر خوف اور دہشت کا پہرہ بھی ہو اور اس ماحول میں بسنے والے فنکار کو اس صورتِ حال سے نپٹنے کی چاہت بھی ہو تو اس چاہت کے اندازِ اظہار و عمل کی شکل بدل جانا نہ غیر فطری ہوگا نہ غیر منطقی۔ گویا جدید افسانہ نگار کے اپنے قول کے مطابق بنیادی سوال ان کے سامنے بھی وہی ہے جو ترقی پسندوں کے سامنے تھا۔ یعنی معاشرے کو تباہ کاری کی راہوں پر لگا دینے والوں سے دو دو ہاتھ۔ اب بلا کسی تفصیل میں جاتے ہوئے اس موقف کی وہ شکل دیکھنا ضروری ہے جو ترقی پسندوں کے یہاں منتج ہوئی اور جو جدیدیت پسندوں کے یہاں بھی ہو رہی ہے۔

یہ بات ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے وقت برِصغیر کی تاریخ سیاسی اور سماجی اعتبار سے استحصال کے اس بدترین اور خطرناک موڑ پر آ چکی تھی کہ جہاں انگریزوں کی حکمرانی اور بالادستی نے برِصغیر کے باشندوں کی تہذیب، ثقافت، علم، تعلیم، زبان اور شہری اور سیاسی آزادیوں کے گرد اپنی مطلق العنانی کا تسمہ اتنا کس دیا تھا کہ پورا معاشرہ بلبلا اٹھا تھا۔ ان حالات میں اگر جد و جہدِ آزادی کی جاں فروشانہ لہر سے دامن بچا کر ادب اُس دور میں بھی عشق و عاشقی کی سحر انگیز فضاؤں میں چہل قدمی کرتا رہتا تو ۱۹۴۷ء میں صرف سیاست کے بل پر آزادی حاصل ہو جانے کے بعد دونوں مملکتوں کے عوام کے سامنے اسے بجز پشیمانی اور کیا حاصل ہوتا ؟ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے کہ ترقی پسند ادب نے جد و جہدِ آزادی کے تمام مراحل میں عوامی ابھار کے کسی بھی کٹھن موڑ پر بھی اپنا کردار ادا کرنے سے دامن کش نظر نہیں آئے گا۔ آج جو حضرات جدید ترقی پسندی کے نشہ میں اس درجہ سرشار ہیں کہ انھیں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۰ء تک کے درمیانی عرصے کا ادب صرف ترقی پسند تحریک کے مینی فیسٹو کی تابعداری میں پروپیگنڈہ اور پمفلٹ بازی نظر آتا ہے، کیا ان کی اس بے خبری کا کوئی جواز ہے کہ بغیر کسی مینی فیسٹو کے تابعداری کے دنیا میں کوئی ذی جان بامقصد انداز میں سانس بھی نہیں لے سکتا خواہ وہ امریکی جنگ پسند ادارہ pantagon ہی کے مینی فیسٹو کی تابعداری کیوں نہ ہو۔ قباحت اس میں نہیں ہے کہ کون کس مینی فیسٹو کی تابعداری کے تحت زندگی گزارتا ہے اصل قباحت مینی فیسٹو کی اپنی ہے کہ وہ ہم سے کس قسم کا کمٹ مینٹ چاہتا ہے ؟ اس فرق کو نہ سمجھنے ہی کی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادب کو مینی فیسٹو کی تابعداری کا طعنہ دینے والے خود اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتے کہ وہ جو ڈان کوئکزوٹ والی ہوائی چکی wind mill کو دشمن جان و ایمان سمجھ کر وا ہموں کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں تو کیا یہ pantagon کے جنگجوؤں کے پھیلائے ہوئے واہموں اور خدشات کی خدمت گزاری نہیں ہے ؟ اور کیا ہمارے بیشتر ترقی پسند ادب دشمن اس خدمت گزاری کے سبب ٹیکنوکریٹس کی پھیلائی ہوئی دہشت اور خوفِ زندگی کی فضا کو عوام کے دلوں اور دماغوں کو مستحکم تر کرنے کا غیر شعوری (فی الواقعہ شعوری) فریضہ انجام نہیں دے رہے ہیں ؟ سو بات یہاں آکر ٹھہرتی ہے کہ اگر یہی سب کچھ

"جدیدیت پسند فکر" کی اساس بن رہا ہے تو پھر تو یہ ہولا ہے والی بات ہوئی کہ "فارسی تیار ہو رہی ہے تو پھر بھیا ہونے دو" لیکن اس فارسی میں "ہونے دو" کا جو نتیجہ کھل رہا ہے وہ عبرت ناک ہے۔ یعنی یہ کہ معاشرے غائب، ان میں استحصالی قوتیں بے وجود اور لکھنے کا مطمح نظر معدوم ہو گئے ہیں اور سب سے کٹ کٹا کر فرد جدیدیت کے جنگل میں راستہ بھٹک کر "یوسفِ بے کاروان" ہو کر رہ گیا ہے۔

چلئے تھوڑی دیر کو مان لیتے ہیں کہ ترقی پسندوں کی اجتماعیت نگاری اور جدیدیت پسندی کی فرد نگاری ایک ہی منزل تک پہنچنے کے دو راستے ہیں (حالانکہ ان دونوں میں فرق صرف طریقۂ کار ہی کا نہیں بنیادی نقطۂ نظر کی تشکیل کے اعتبار سے بھی بعد المشرقین کی نوعیت کا ہے) تاہم اس طریقۂ کار کی افادیت بھی تسلیم کی جا سکتی ہے بشرطیکہ فلسفۂ حیات مثبت بنیادوں پر استوار ہو۔ جدید افسانے نے ابتدا ماحول کی غیر یقینی کیفیت کی پیش کش گزشتہ نسل کے مقابلے میں اپنے تشخص کا نقطۂ آغاز بنایا۔ چنانچہ زندگی کی رہی سہی اثباتی قدروں کو نظر انداز کر کے ابسرڈ کے فلسفۂ حیات کی تبلیغ شروع کر دی گئی۔ انسان کی خلاق حیثیت کو یکسر مجبور مخلوق قرار دینے کے اس عمل نے اس قسم کے افسانوں میں "نقطۂ نظر کردار کے تصور، زندگی کی معنویت، کہانی پن اور پلاٹ کے رسے بسے تصورات اور برتے برتائے اصولوں کو قدیم کی پیروی سے بچنے کی خاطر ترک کر دینے کا نتیجہ جو نکلا وہ سامنے ہے۔

جدید اور جدید علامتی افسانے کے حوالے سے اس صورتِ حال کو میں نے عدم ابلاغ کی شکایت کے طور پر نہیں دہرایا ہے۔ مجھے تو افسانے کی تنقید کی اس کوتاہی کی بات کرنا چاہئے کہ اس نے اس صورتِ حال کو تمام تر عدم ابلاغ کا مسئلہ بنا کر رکھ دیا۔ حالانکہ امکانی طور پر یہ صورتِ حال زندگی کی نئی اقدار اور کسی نئے فلسفۂ حیات کی تلاش کا مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔ جدید اور جدید علامتی افسانہ نگاروں کی سہل پسندی نے پہلے سے موجود فلسفۂ موجودیت کو اس کا گھڑا گھڑایا حل اور نعم البدل جانا اور افسانہ کے نقادوں نے ابلاغ کا گنڈاسہ سنبھال لیا۔

اب ایک دوسرا پہلو دیکھئے گزشتہ بیس برسوں سے رسمی لسبی اقدار کا جنازہ نکل جانے کا خاصا شہرہ ہے۔ انسان کی بے چہرگی کا رونا اس پر مستزاد۔ تلاشِ ذات، فلسفۂ زندگی کا نعم البدل مان لیا گیا۔ تشخص معاشرے کی تمام قباحتوں اور مسائل کا اسمِ اعظم قرار دیا گیا۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی اقبال کا تھوڑا سا حلیہ بگاڑ کے جدید اور علامتی افسانے کے متعلق آپ سے کہوں کہ "یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے فسانہ!" خیر جانے دیجئے۔ شاید یہ وقت ہنسی مذاق کا نہیں ہے۔ میں اپنے جدید اور علامتی افسانہ نگاروں سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے کہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے کہ جب جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے ماہرین کا یہ اعتراف وزن رکھتا ہے کہ خلا میں زندگی لامحدود وسائل کے بل پر خاص الخاص انتظامات اور تحفظ کے بل پر ان محدود وقت تک ہی برقرار رکھی جا سکتی ہے اور امریکہ جیسا ڈالروں کے سمندر رکھنے والا ملک بھی اب خلا میں آبادیاں قائم کرنے کے خواب دیکھنے سے باز آ گیا ہے تو انسان کے زمینی ایسے معاشرے بھی جو اقدار و روایات اور کسی قابلِ عمل فلسفۂ حیات سے عاری ہونے کا اعلان کر دیا جائے محض فضا یعنی خلا میں زندگی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اسی لئے آج کی لایعنی اور لغو زندگی میں اثبات اور معنویت کی تلاش تخلیقی عمل کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ آج کے ان افسانہ نگاروں کو بھی اب اقدار، روایات اور قابلِ عمل فلسفۂ حیات سے عاری خلا میں زندگی کو برقرار رکھنے کے خواب سے بیدار ہو جانا چاہیئے جو صرف ابجرشن land scape painting کا عمل کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانے کا اعلان کر دے کہ میں نے تو جیسا کچھ دیکھا ویسا دکھا دیا۔

اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ اگر اس کے بعد کا باقی کام قاری ہی کو کرنا ہے تو از راہِ کرم land scape painting کے اس مشغلے میں اپنی جان اور توانائی کھپانے سے کوئی بہتر پیشہ اختیار کر لیجئے۔ دو پیسے کی آمدنی تو بڑھے گی۔ اور اگر افسانے ہی لکھنے ہیں تو یہ گم شدہ ذات کی تلاش اور چہرے کی پہچان جیسے فروعی مسائل پر توانائیاں صرف کرنے کے بجائے ان عوامل اور عناصر کی گرفت کیجئے جو معاشرے میں فرد کی گمشدگی اور چہرے کو مسخ کرنے کے ذمے دار ہیں۔ جس ذات کی تلاش اور چہرے کی پہچان میں توانائیاں صرف کی جا رہی ہیں۔ میں تو فی الحقیقت مجرد فرد یعنی معاشرے سے کاٹے ہوئے انسان کی اس تصویر کشی کو افسانہ نگاروں کے ہاتھوں مزید تذلیل سمجھتا ہوں یعنی اس تذلیل پر فرد کی دوستی اور غم خواری یعنی جدید افسانہ نگاروں کی طرف سے طعن و تشنہ کا اضافہ موجودہ عالمی معاشرہ نیک جنگ جوؤں اور استحصالیوں کے ہاتھوں ہی برداشت کر کر کے اپنی شخصیت اور انفرادیت گنوا بیٹھا ہے۔ ایک بات افسانے کے نقادوں سے بھی کہنا ہے کہ شاعری اور نثر کی تنقید میں فرق کو قائم

رکھنا ضروری ہے۔ جدید اور جدید علامتی افسانے میں زبان و بیان کا ابہام اس طرح کا شعوری نہیں ہے جیسا کہ ہماری سہل پسند تنقید نے سمجھ رکھا ہے کہ یہ صرف گزشتہ دور کے افسانے سے اپنے آپ کو علاحدہ محسوس کرانے کا عمل ہے۔ نئی لفظیات سائنس اور ٹکنالوجی کی اس بے حسی اور تباہ کاری کا پرتو ہے جس میں خوف زندگی اور دہشت گردی بے صدا کرب نئی نسل کے محسوسات کو اپنے ڈھب پر چلا رہا ہے۔ دوسری طرف ہمارا تنقیدی ذہن شاعری کی دروبست اور آواز و آہنگ کا عادی ہے۔ ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ نثر کی زبان کھردری ہوتی ہے اور بعض اوقات تکلیف دہ حد تک کھردری بھی ہو سکتی ہے۔ اس زبان پر شاعرانہ اعانت کی کمی کا الزام بھی غلط ہے اور مطالبہ بھی غلط۔ جدید نسل کے فکری اثاثہ کی جولان گاہ ابھی خاصی سکڑی ہوئی ہے اسے ادب کے سیاسی اور سماجی رول سے خوفزدہ کر کے ذات کے نہاں خانوں کی تلاش پر لگا دیا گیا تھا۔ میری رائے میں تلاش کے لئے بیس برس کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ تجربات کا دور اب گزر جانا چاہیئے۔ اور شاید گزر بھی گیا ہے۔ جدید، جدید علامتی اور آج کے نوجوان افسانہ نگار کو اب خلائی سفر سے واپس آکر مصنوعی تنفس کی کِٹ اتار کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے آدمی کو کھو دیا تھا۔ وہ اب بھی اس کے اردگرد سانس لے رہا ہے۔ اور قیاسی انسان سے سانس لیتا ہوا آدمی بہرحال اہم ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے اپنے محسوسات بھی ہیں، دکھ درد بھی ہیں اور اس کی اپنی زبان بھی ہے جس میں وہ آپ سے باتیں کرنے اور باتیں سننے کا شدید متمنی ہے۔ شاید میری یہ توقع عبث نہیں ہے کہ اس عمل سے زبان و بیان کا وہ بوجھل پن اور ابہام بھی نہیں رہے گا جس کی شکایت عام ہے مگر شکایت کرنے والوں کو بھی تھوڑا بہت نئی زبان کو پڑھتے رہنے اور سمجھتے رہنے کا عمل جاری رکھنا چاہیئے مگر بس ایک حد تک۔ اصل ذمہ داری تخلیق کار کی ہی ہے۔

یہاں سے بات جدید افسانہ کے تخلیقی میدان سے نکل کر قاری اور فنکار کے درمیانی واسطے (یعنی نقاد) کی سمت بھی مڑ جاتی ہے۔ ایک یہ شکایت جدید افسانہ نگاروں کی عام ہے کہ انھیں اپنے ڈھب کے نقاد میسر نہیں آئے۔ اس شکایت میں کچھ حقیقت حال بھی ہے اور کچھ خود فریبی کے منصوبہ سے ڈھکے چھپے دستبرداری کا اعلان بھی۔ یعنی یہ بھی سچ ہے کہ جدید افسانے پر تنقید نہ ہونے کے برابر لکھی گئی ہے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ شماتتِ ہمسایہ۔ دوسرا پہلو اس بات کا یہ بھی ہے کہ اگر جدید افسانے پر تنقید نگار اسی رفتار سے ہم قدم رہتا جس رفتار سے یہ افسانہ لکھا جا رہا تھا تو اس کے امکانات تھے کہ قاری اور افسانہ نگار کے مابین عدمِ ابلاغ اور طلبِ ابلاغ کی رسہ کشی کمزور پڑ جاتی وہ اس طرح کہ نقاد جدید افسانہ نگاروں سے ان کی حد سے بڑھی ہوئی گنجلک بیانی اور ایبسرڈٹی کو ترک کرانے میں فعال کردار انجام دیتا۔ مگر ہوا یہ کہ ایک طرف تو طوفانی رفتار سے جدید افسانے کا انبار لگتا چلا گیا اور دوسری طرف نقاد گونگے کا گڑ کھائے بیٹھا رہا۔ یا بولا تو صرف دل کے پھپھولے پھوڑنے کی خاطر۔ ایک تو جدید افسانہ نگار ہی نے اپنی بات کھل کر نہ کہنے کی قسم کھا رکھی تھی دوسرے یہ کہ ہمارا تنقیدی ذہن بھی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی شاعرانہ دروبست اور آواز و آہنگ کا عادی ثابت ہوا۔ شاعری پر تنقید کے بمقابلہ نثر کی تنقید نہ ہونے کی بنا پر ہم لوگوں کا ذہن لطافتوں اور رموز و علائم سے پوری طرح بے تکلف نہیں ہو پاتا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاعری کی تنقید میں تو گفتنی اور ناگفتنی سب ہی کچھ نقاد کی نوکِ قلم پر رہتا ہے، لیکن نثر کی تنقید میں ہمارے یہاں نقاد از خود اور شاید بلاوجہ خاص قسم کے ڈسپلن کا تابع ہو کر اگرچہ اور چنانچہ کے حصار میں بند ہو جاتا ہے۔

ہمیں یہ بات واضح طور پہ سمجھ لینی چاہیئے کہ نثر کا لہجہ اور آہنگ اور اس کی رمز شناسی، شاعری کے مقابلے میں خاصے کھردرے بلکہ کہیں کہیں سنگلاخ میدان کا سفر ہے۔ چنانچہ شاعری کی تنقید میں زبان کے لوچ اور آہنگ کی طرح نثر میں ان لوازمات کی کمی کا الزام بھی غلط ہے اور مطالبہ بھی غلط۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ شعر میں ہر قسم کی پیچیدگی اور ابہام بلکہ ابہام تو عینِ فن اور قابلِ قبول، لیکن نثر — اور بالخصوص ایسے افسانے جن میں زبان و آہنگ کی سطح شعری روایت کی ہو تو مطالبہ سہل ممتنع کا۔ سو صاحبو! میرا یہ خیال بھی درج گزٹ کر لیجئے کہ موقع بے موقع سہل ممتنع کا مطالبہ کرتے کرتے کہیں ہم آج کی پیچیدہ روز زندگی کے مقابلے میں ہم اپنی ادبی اور شعری موت کو تو سہل ممتنع بنانے کی راہ پر گامزن نہیں ہیں؟ جدید افسانے کے مطالعہ میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے۔ یا شاید نہ بھی ہو۔ مگر ہمیں کوئی ایک فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ○○

شہریار

(۱)

ہوا کا زور ہی کافی بہانہ ہوتا ہے
اگر چراغ کسی کو جلانا ہوتا ہے

زبانی دعوے بہت لوگ کرتے رہتے ہیں
جنوں کے کام کو کر کے دکھانا ہوتا ہے

ہمارے شہر میں یہ کون اجنبی آیا
کہ روز خواب سفر پہ روانہ ہوتا ہے

کہ تو بھی یاد نہیں آتا یہ تو ہونا تھا
گئے دنوں کو سبھی کو بھلانا ہوتا ہے

اسی امید پہ ہم آج تک بھٹکتے ہیں
ہر ایک شخص کا کوئی ٹھکانا ہوتا ہے

ہمیں اک اور بھری بزم یاد آتی ہے
کسی کی بزم میں جب مسکرانا ہوتا ہے

(۲)

ہنس رہا تھا میں بہت گو وقت وہ رونے کا تھا
سخت کتنا مرحلہ تجھ سے جدا ہونے کا تھا

رتجگے تقسیم کرتی پھر رہی ہیں شہر میں!
شوق جن آنکھوں کو کل تک رات میں سونے کا تھا

اس سفر میں بس مری تنہائی میرے ساتھ تھی
ہر قدم کیوں خوف مجھ کو بھیڑ میں کھونے کا تھا

ہر بنِ مو سے درندوں کی صدا آنے لگی
کام ہی ایسا بدن میں خواہشیں بونے کا تھا

میں نے جب سے یہ سنا ہے خود سے بھی نادم ہوں میں
ذکر تجھ ہونٹوں پہ میرے دربدر ہونے کا تھا

۱۳۔ سی، میڈیکل کالج کیمپس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

غیاث احمد گدّی ● فتح پور لین ۔ جھریا ۔ دھنباد (بہار)

رات سرد تھی بے حد سرد۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ باہر اندھیرا تھا اور پُراسرار ہوا کے تیز جھونکے چیختے ہوئے گزر رہے تھے۔ اندر آتش دان میں لکڑیاں دہک رہی تھیں۔ اور سارے ماحول پر ایک غم انگیز کیفیت طاری تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی موت ہونے والی ہے۔ حالانکہ کوئی ایسی بات نہیں تھی مرنے والے نے موت سے جنگ جیت لی تھی اور اس وقت وہ لمبے چوڑے پلنگ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ سُرخ و سفید چہرہ، مہندی رنگ سے رنگی ہوئی سرخ مونچھیں، خشخشی داڑھی، سر بکا کل، چہرے پر ایک وقار، ایک فاتحانہ تبسم، ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا زندگی سے ساری عمر اُلجھتے رہنے کے باوجود ہراساں نہیں۔

"یہ کون ــــ؟ یہ کون ہیں؟؟"

یہ نواب عصمت بیگ ہیں پرانی ہڈّی، پرانا جسم اور جسم میں دَوڑنے والا پرانا خون جو آج سالہا سال بعد بھی بدستور سُرخ ہے۔ کیا ہُوا اگر جاگیر نہ رہی۔ کیا ہوا اگر زندگی کی ان آسائشوں نے مُنہ موڑ لیا جو پشت ہا پشت سے نسل در نسل ان کے ابّا غفور خان بہادر عفت اللہ بیگ مرحوم و مغفور کے ایّام شباب بلکہ اس سے کچھ آگے تک ساتھ دیا اور اب زمانے کی گردشوں نے نواب عصمت سے وہ رہی سہی دولت بھی چھین لی جس کی کمی آج خاندان کے سارے افراد محسوس کر رہے ہیں۔ کیا ہوا اگر آباؤ اجداد کی جائداد میں سے صرف ایک حویلی رہ گئی اور وہ بھی گِروی ہے مگر شان تو زندہ ہے وہ آن تو سلامت ہے زمانے کی صرصر نے سارے چراغ بجھا دئیے مگر وہ وقار، وہ جلال، وہ اعلیٰ مزاجی تو اب بھی باقی ہے اس چراغ کو کون بجھا سکتا ہے جس میں ان کے آباؤ اجداد کا لہو جل رہا ہے؟ اس مٹھی کو کون کھول سکتا ہے جس میں ان کے بزرگوں کی شرافت کی دستاویز ہے آج بھی وہی عظمت، وہی شان، وہی احساسِ برتری نواب عصمت بیگ کے قدموں پر لوٹ رہی ہے جو ان کے جد امجد کی امانت تھی یہ ہیں نواب عصمت بیگ!

کہتے ہیں سینکڑوں سال قبل نواب عصمت بیگ کے خاندان کے ایک بزرگ نے پتھروں کی سوداگری کرتے ہوئے مغل دربار میں شرف باریابی حاصل کیا تھا ایک معمولی پتھر فروش کی طرح مغل دربار میں داخل ہوئے لیکن ایک ہی لمحہ میں مغل خاندان کے کسی بادشاہ نے انھیں وہ رتبہ بخشا کہ سارے دربار، سارے شہر اور اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو سارے ملک نے اس پتھروں کے اس سوداگر کو جھک کر سلام کیا اس خاک کو افلاک نے سلام کیا یہ مغلوں کا ادنیٰ کرم تھا یہ مغلوں کی ایک جنبش لب کا اعجاز تھا نگاہِ کرم کا ایک معمولی سا کرشمہ ایک معمولی پتھر فروش لمحہ بھر میں ہندوستان کا بے حد دولت مند، بلند اقبال اور اعلیٰ مرتبت انسان ہو گیا۔

اس بات کو سینکڑوں سال گزر گئے ــــ رات اور دن اجالا اور اندھیرا کتنی بار اس محفلِ رنگ و نور میں آئے اور آکر چلے گئے۔ پھر یوں ہوا کہ زمانے کی صرصر بھی چلی اور مغلوں کی نگاہِ محبت، نگاہِ کریمانہ سے جو چراغ روشن کئے گئے تھے وہ بجھے بھی خود مغلوں کی وہ شان نہ رہی کل تک جو جسم پھولوں سے بھی نرم اور ستاروں سے بھی روشن بستر پر آرام نہ پاتا تھا اسے کانٹوں میں پناہ لینی پڑی۔ جن نازک پیروں میں مخمل سے بھی خراش آتی تھی وہ ریگستانوں اور پتھریلی چٹانوں پر چلنے کے لئے مجبور ہوئے جن نگاہوں نے پیشانی پر شکن کی ہلکی سی لکیر بھی برداشت نہ کی وہ گستاخ نگاہیں کا مرکز بنیں۔

کہتے ہیں کہ جب دست محبت ہی نہ رہے تو محتاجِ محبت کا پوچھنا ہی کیا اور یوں مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی نواب عصمت بیگ کا ستارہ بھی فلکِ بلند تر سے ٹوٹا اور اپنے پیچھے دُور تک نور کی ایک لکیر چھوڑتا ہوا ایک ایسی شاخ پر آ رُکا جو خود بجلیوں کا نشانہ بن چکی تھی چنانچہ نواب عصمت بیگ جانتے تھے کہ ان کا قدم جس شاخ زمانہ پر رکا ہے وہ خود برق گزیدہ ہے اور اس کے ٹوٹ کے آرہنے کا ہر وقت احتمال ہے لیکن نواب عصمت بیگ ایک ستارہ ہی تو ہیں۔ ستارہ اپنی تابندگی کیسے کھو سکتا ہے ستارہ! وہ عرش کا باشندہ فرشِ زمین پر کیسے اُتر سکتا ہے ــــــ چنانچہ یہ نواب عصمت بیگ ہی وقت خوردہ کتابِ زندگی کا وہ آخری ورق جسے اگرچہ دیمک نہیں چاٹ پائی تھی مگر بوکیسر زرد ہو گیا تھا وہ ورق جسے کوئی انگلی جہاں سے، جس جگہ سے موڑنے کی کوشش کرے وہ وہیں سے، اسی مقام سے ٹوٹ کر الگ ہو جائے ..... لیکن کیا وقت کی انگلی میں اتنی طاقت ہے؟ ہے اتنی طاقت دستِ فطرت میں؟؟ نہیں نہیں! ہرگز نہیں!! شاخِ بریدہ سے اس ستارۂ روشن کو کون زمین پر گرا سکتا ہے؟ کوئی نہیں..... کوئی نہیں..... ! یہ نواب عصمت بیگ ہیں۔

"مگر کل ــــــ مگر کل ــــــ؟" نواب عصمت بیگ نیند میں بڑبڑا دیئے۔

اچانک انھوں نے کروٹ لی اور آنکھیں کھول دیں اور پھر چند ثانیئے کے بعد بند کمرے میں وہی خوبصورت جسم تھا۔ ستار کے تار کی طرح تنا ہوا۔ ابھی تیرہ سال کے بعد کس قدر بدل چکی تھی۔ جب وہ ایک کلی تھی، مگر آج ایک پھول تھی دہکتا ہوا انگارہ ....!

پھر اچانک نواب عصمت بیگ کو اس کی طنز سے بھری ہوئی ہنسی یاد آگئی پھر اس کی زہر میں بجھی ہوئی باتیں یاد آئیں تیرہ سال قبل جب انھوں نے اس کے ــــــ جسم کو چھوا تھا اس وقت ابھی انہیں ایک معصوم لڑکی محسوس ہوئی تھی جس کے احساسات سو گئے تھے جو گناہ و ثواب کے فلسفے سے کوسوں دُور، جسم کی بے حُرمتی سے بھی ناآشنا تھی..... مگر کل.....؟

نواب عصمت بیگ کو معلوم ہوا کہ اس وقت وہ غلطی پر تھے اگرچہ ابھی اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ دے سکتی تھی مگر نفرت کی میخ اس کے سینے میں بیٹھ گئی تھی جسے آج تک وہ چھپائے ہوئے تھی۔ نفرت اور انتقام کا ایک گہرا جذبہ۔ نواب عصمت بیگ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑائے باوجود ضبط کے ایک ہلکی سی آہ ان کے منہ سے نکل ہی گئی انھوں نے پھر آنکھیں کھول دیں۔

"تم نے تیرہ سال بعد سخت انتقام لیا ہے، ابھی تم نے صدیوں کی اکڑی ہوئی گردن کو جھکنے پر مجبور کر دیا..... آہ!"

"ابّا حضور! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اختر بیگ نے ان کے پلنگ کے قریب جھک کر دریافت کیا۔ اچھا ہوں بیٹے اچھا ہوں۔ انھوں نے اختر کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور پھر سینے کے پاس ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دبایا اور آنکھیں موند لیں۔

"ابّا حضور شاید آپ کچھ فرما رہے تھے...؟ آپ فرمائیے کس نے آپ کی تضحیک کی وہ کون ہے جس نے آپ کو جھکنے پر مجبور کیا؟!"

وہ چونک اٹھے۔ کیا نیند میں انھوں نے ساری باتیں دہرادی ہیں ان بچوں کے سامنے؟؟

اچانک انھوں نے آنکھیں کھول کر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کمرے کا جائزہ لیا۔ مقابل کے پلنگ پر دوسرا ان کا لختِ جگر اختر بیگ لیٹا ہوا تھا سرہانے صاحب زادی امت النساء بیگم، پیروں کے قریب اس کی بہو اختر دلہن اور ان سے کچھ دور چھوٹا لڑکا انور بیگ نفرت کی ایک لہر اٹھی اور نواب صاحب کے اعصاب پر چھا گئی ــــــ "میری اولاد... میری یہ ناخلف اولاد..... کیا تم بھی میری گردن کو جھکانا چاہتے ہو انور بیگ...؟ کیا میں نے تمہیں اسی لئے زندگی دی تھی۔ تمہاری پرورش کی تھی کہ تم بڑے ہو کر میرے گال پر طمانچے رسید کرو؟

انھوں نے ضبط کیا اور نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

انھوں نے آہستہ سے پوچھا کیا وقت ہوا ہے اختر!"

کمرے میں ایک طرح کا شور جاگ اٹھا سارے لوگ اپنی اپنی جگہ چونک اٹھے ابّا حضور جاگ اٹھے ہیں ابّا حضور جاگ اٹھے ہیں۔

"ابھی دس بج رہے ہیں ابّا حضور" اختر پھر اٹھ کر ان کے قریب آگیا۔ نواب عصمت بیگ نے گردن اٹھا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ بڑی سی پرانی وضع کی خوبصورت سی گھڑی اختر بیگ کی اطلاع کی تصدیق کر رہی تھی۔ نواب عصمت بیگ نے آہستہ سے ہُوں کہا اور

کروٹ بدلی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ابّا حضور؟"

"ہوں، اب ٹھیک ہے۔ یہ دورہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ تم وہ کھڑکی بند کردو" نواب صاحب بولے پھر اچانک انھیں کچھ یاد آگیا" لیکن حشمت کہاں ہے کیا وہ اب تک نہیں لوٹا کہاں گیا ہے؟" "پتہ نہیں ابّا میاں... کونار ڈیم کے ٹھیکے کے لئے گئے ہوں گے۔ شاید کل صبح ہی لوٹیں" "ہوں اور حشمت دلہن؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہیں، اب کی امت النساء نے جواب دیا" ان کا بچّہ جاگ اٹھا تھا" اتنے میں وقت دیکھ کر انور نے دوا کا گلاس پیش کیا" ابّا میاں دوا پی لیجئے" ڈاکٹر کی ہدایت ہے آپ کے بیدار ہوتے ہی دوا پلا دی جائے"۔

"دوا میز پر رکھ دو اور تم جاؤ" نواب صاحب کے لہجے میں ترشی تھی۔

انور بیگ نے کوئی جواب نہیں دیا اس نے گردن تک نہیں اٹھائی اور دوا میز پر رکھ دی اور اختر بیگ کو اشارہ کیا کہ دوا وہ اپنے ہاتھ سے پلائے۔ انور بیگ چُپ چاپ کرسی پر آن بیٹھا اُمت نے انور کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہنا چاہا مگر شاید کچھ کہہ نہ سکی۔ اختر دلہن نے انور کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے بولیں "چلو انور کھانا کھالو" تم نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا بہت پریشان ہوتے آج، چلو......"

اتنے میں دُور اصطبل میں نیلم کے ہنہنانے کی آواز آئی جسے سُنکر نواب صاحب کی آنکھیں چمک اٹھیں" اختر دیکھنا تو بیٹے۔ حشمت آیا کیا؟ نیلم چلّا رہی ہے"۔

واقعی حشمت بیگ تھے۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھے نواب صاحب کے کمرے میں آئے دراصل ان کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا جب انھوں نے حویلی کے اندر قدم رکھتے ہی ابّا میاں کے کمرے میں روشنی دیکھی تھی انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی لاپرواہی سے اوور کوٹ کو ساتھ والے پلنگ پر ڈال دیا اور بڑے نواب صاحب کے پلنگ پر جھک کر نہایت گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیا ابّا میاں، آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

"طبیعت تو بہت زیادہ خراب تھی، مگر اب ٹھیک ہے۔ دورہ بہت سخت تھا لیکن آپ کہاں تھے بھائی جان؟" اختر بیگ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

"حشمت میں تم سے ناراض ہوں۔ میری طبیعت اتنی زیادہ خراب تھی اور تم دِن بھر غائب رہے" بڑے نواب صاحب نے رُک رُک کر کہا۔

حشمت بیگ نے ایک بار اپنی طرف دیکھا۔ اختر کو دیکھا۔ پھر نواب صاحب کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بہت بُجھے ہوئے لہجے میں بولے "مجھے بہت افسوس ہے ابّا میاں۔ میں ذرا کونار ڈیم چلا گیا تھا رائے صاحب نے ٹھیکے کے لئے بلایا تھا نا! - میں بے حد شرمندہ ہوں"۔

حشمت بیگ کے سر پر بڑے نواب صاحب نے محبّت سے ہاتھ پھیرا۔

"کوئی بات نہیں بیٹے، کوئی بات نہیں۔ تم بھی تو ضرورت ہی سے گئے تھے"۔

"جی ہاں ابّا میاں میں تو شام ہی کو آجاتا میری طبیعت خود گھبرا رہی تھی مَیں ڈر رہا تھا کہ پتہ نہیں آپ کی طبیعت کیسی ہو۔ آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز نہ ہوگئی ہو اور ابّا میاں بلکہ رائے صاحب نے تو مجھ سے پوچھا بھی کہ کیا بات ہے حشمت میاں تم بے حد پریشان نظر آتے ہو خیریت تو ہے..... خیر خدا کا شکر ہے آپ کی طبیعت تو سنبھل گئی" پھر اختر کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"اختر میاں تم نے تیمارداری میں کوئی کوتاہی تو نہ کی تھی انجکشن دِلوائے کیسی مصیبت ہے میرے بغیر کوئی کام ہوتا ہی نہیں مَیں باہر

جاتا ہوں تو گھر میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ گھر میں رہتا ہوں تو باہر کا کام نہیں چلتا ....."
بڑے نواب صاحب بے حد خوش ہو گئے "گھر بھر میں صرف یہی لڑکا ہے جو اپنے خاندان کی عزت رکھے گا ورنہ تم لوگوں کی طرف سے تو میں مایوس ہو چکا ہوں!"
اتنے میں اختر دلہن پھر کھانسنے لگی مسلسل کئی منٹ تک وہ کھانستی رہی نواب صاحب نے گردن گھما کر دیکھا وہ منہ پر دوپٹہ رکھے کھانس رہی تھی۔ نحیف و نزار اختر دلہن زرد رنگ، ہر وقت خاموش اور پژمردہ رہنے والی زہرہ بانو ـــــ پتہ نہیں کون سا گھن اسے دن بدن کھائے جا رہا تھا.....!
"اختر دلہن تم پھر کھانس رہی ہو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے آج بہت سردی ہے جاؤ آرام کرو اور تم لوگ بھی جاؤ اختر آمنہ تم بھی۔ میری طبیعت ٹھیک ہے میں کچھ دیر حشمت سے باتیں کروں گا پھر سو رہوں گا، جاؤ!"
آمنہ اور اختر دلہن یکے بعد دیگرے کمرے سے باہر چلی گئیں۔ بڑے نواب صاحب نے نظر اٹھا کر اختر دلہن کو دیکھا پھر بولے۔
"حشمت! کل ڈاکٹر آئے تو تم خود سے اختر دلہن کو دکھا دینا۔ بے چاری کس قدر کمزور ہو گئی ہے پھر حاملہ بھی ہے۔ اختر کو کچھ فکر نہیں رہتی!"
"بہت اچھا ابا میاں!"
اس وقت کمرے میں اختر بیگ اور انور بیگ بھی تھے انور بہت تھک گیا تھا اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں جسم ٹوٹ رہا تھا اور بھوک لگ رہی تھی ابا میاں کی طبیعت سنبھل جانے کے بعد اس نے مزید ٹھہرنا ضروری نہیں سمجھا۔
"حشمت بھائی جان، ڈاکٹر کی ہدایت ہے کہ ابا میاں کو زیادہ بات چیت نہیں کرنی چاہئے میں بہت تھک گیا ہوں جا رہا ہوں آپ تو یہیں سوئیے گا نا؟"
"ہاں میں یہیں سوؤں گا آمنہ سے کہو وہ اپنی بھابی کے کمرے میں سو رہے۔"
"اچھا ابا میاں، اب آپ کو آرام ہے نا؟"
"ہاں ہاں بہت آرام ہے۔ تم جاؤ۔ تم کیوں خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہو" بڑے نواب صاحب نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔
جواب میں انور نے کچھ نہیں کہا۔ وہ صرف مسکرایا اور پلنگ پر رکھے ہوئے مفلر کو اٹھا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی رہی حشمت معاملے کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھا آخر اس نے سرگوشی ہی میں اختر سے پوچھا اختر نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تو بڑے نواب صاحب کی طرف مخاطب ہوا۔
"ابا میاں! یہ اچانک آپ کی طبیعت کیسے خراب ہو گئی ..... کیا انور نے آج پھر کچھ.....؟"
"تم اس نالائق کا نام میرے سامنے نہ لو بلکہ ہو سکے تو اس کو میری نظروں سے کہیں دور بھیج دو" بڑے نواب صاحب نے غصہ سے کہا "آج اس ناخلف نے اتنی سخت بات کہی ہے کہ میرا بس چلتا تو میں اسے ..... کیا کہا جانتے ہو؟
ہاں! انور کا مزاج مجھے بھی پسند نہیں مگر کیا کیا جائے ابا میاں، بچہ ہے سمجھ جائے گا آپ کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔
"تم کہتے ہو میاں میں اپنے آپ کو تکلیف پہنچاتا ہوں۔ جانتے ہو آج دوپہر کو اس نے کپڑے کی دوکان میں کیا حرکت کی ہے میں نے ستّر روپے گز والی عمدہ سی سلک لکھوائی تو کہنے لگا اس کی کیا ضرورت ہے۔ بھلا بتاؤ تو اس کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے اسے میں سمجھتا ہوں یا یہ ٹانگ بھر کا لڑکا؟ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ تم اپنی بات کرو تو اس نے تمام لوگوں کے سامنے سات روپے جو دہ آنے گز کا ایک معمولی کپڑا اور ایک گھٹیا قسم کا لٹھا پسند کیا۔ حشمت کیا بتاؤں کپڑا پسند کر کے تو وہ چلا گیا مگر دوکان کے سارے لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے..... وہ تو خیریت ہوئی اس وقت میرے دماغ نے میرا ساتھ دیا میں نے سارے لوگوں کے سامنے کہہ دیا کہ یہ دراصل میرے ملازم کا لڑکا ہے جسے میری پہلی بیوی نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا اور تب لوگوں کا استعجاب ختم ہوا۔ مکھن لال بھی وہیں موجود تھے شکر ہے

خوش ہوئے کہ میں ملازم کے لڑکے کو بھی اپنے لڑکے کی طرح رکھتا ہوں" یہاں پہنچ کر نواب صاحب کا چہرہ ذرا شگفتہ ہو گیا جیسے ہوا کی زد میں رکھے ہوئے چراغ کی تھرتھراتی ہوئی بتی اکسا دینے سے سنبھل جائے۔

اختر اس وقت چپ چاپ بیٹھا تھا۔ ہر قسم کے خیال سے الگ.... حسبِ دستور اس نے اپنے دماغ کو اس وقت بھی الجھنوں سے دُور رکھا تھا.. لیکن یہ بات سنکر اس نے عجیب سا محسوس کیا گویا ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس وقت اسے کس کا ساتھ دینا چاہیئے... انور کا یا ابّا حضور کا....؟ انور جس نے سارے ماحول سے بغاوت کرکے زندہ رہنے کے لئے الگ راستہ ڈھونڈ نکالنا چاہا..... ابّا میاں، جو وضع داری کو بہر حال نباہنا ضروری سمجھتے ہیں ان دونوں میں کون حق بجانب ہے کس کا عمل درست ہے اور کس کا غلط... ؟ ابّا حضور کا جو محض ذرا سی بات کے لئے اپنے واقف کاروں کے سامنے انور کو اپنی اولاد کے بجائے ملازم کی اولاد کہنے پر مجبور ہوتے یا انور کا جو لوگوں کے سامنے بھی اپنے گستاخانہ اندازِ گفتگو کو نرم نہ کر سکا؟؟

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا لیکن ابّا میاں کی بات اسے بھلی نہیں لگی دس آدمیوں کے درمیان اپنے کو ادنچار کھنے کے لئے کوئی اپنی حقیقی اولاد سے انکار کر جائے یہ کیسی بات ہے ؟

اختر بیگ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کی توجہ حشمت بیگ کی باتوں کی طرف مڑ گئی حشمت ابّا میاں کی حاضر دماغی کی تعریف کرکے انور کی ایک نئی شکایت سُنا رہے تھے۔

"وہ تو یوں کہئے کسی نے پہچانا نہیں ورنہ یوں سمجھئے ابّا میاں کہ آج تو اپنی ساری پوزیشن، بلکہ سارے خاندان کی ناک کٹ جاتی۔ ساتھ میں حفیظ الدین صاحب تھے ـــــ وہ تو بے حد ناراض ہوئے کہنے لگے ـــــ انور کے رویّے کو میں پسند نہیں کرتا۔ شاید وہ رشتہ بھی نہ دیں انھوں نے دو ایک اور باتیں بھی بتائیں کہ انور شاید شراب بھی پیتا ہے اور شہر کے چھوٹے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، خیر شراب کی بات تو غلط ہے۔ لیکن اس بات کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اس کی نشست و برخاست ایسے لوگوں کے ساتھ ہے جو بہر حال ہمارے شایانِ شان نہیں"

"جہنم میں جائے کمبخت۔ مجھے تو اس کی شکل تک سے نفرت ہے ایسی اولاد سے خدا لاولد ہی رکھے تو بہتر ہے"

"لیکن ابّا میاں اس طرح کیسے کام چلے گا؟ کچھ بھی ہے انور ہمارا بھائی ہے۔ نادان ہے۔ راستہ بھٹک گیا ہے اسے راہ پر تو لانا ہی ہوگا وہ غلط رو ہوگا تو اس میں ہماری بد نامی ہے، کیوں اختر؟"

"جی ہاں، جی ہاں" اختر نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے رائے دی۔ "بلکہ میرا تو خیال ہے ابّا جان کہ عید کے بعد اس کی شادی ہی کیوں نہ کر دی جائے"

"تو اس سے کیا وہ سدھر جائے گا؟ جب تو اور میرے سینے پر مونگ دلے گا، بڑے نواب صاحب بولے، ابّا میاں، اختر کی تجویز کو میں پسند کرتا ہوں۔ عید کے بعد انور کی شادی کرکے اس سے صاف کہہ دیجئے کہ وہ کلکتہ چلا جائے وہاں عبد الحنان صاحب اسے مزدو ملازمت دے دیں گے انور وہیں رہے گا۔ وہاں جو اس کا جی چاہے شوق سے کرتا رہے۔ پھر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ رہ گئے حفیظ الدین صاحب تو میں انھیں راضی کر لوں گا برسوں کی نسبت آسانی سے نہیں توڑی جا سکتی ہے۔

بات پتے کی تھی بڑے نواب صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اب جب کہ لوگ ہر طرح سے سمجھا بجھا کے تھک گئے تھے اس سے نجات کا واحد طریقہ یہی تھا کہ سہولت سے اسے شہر سے دُور بھیج دیا جائے ساتھ ہی اس کی شادی بھی کر دی جائے تاکہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ نواب صاحب نے اپنے چھوٹے لڑکے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ دراصل نواب صاحب کو واقعی یہ صدمہ تھا کہ انور ایسا کیوں کرتا ہے؟ وہ چھوٹے چھوٹے لوگوں سے تعلقات کیوں رکھتا ہے۔ ۷۵ روپے کی کلرکی کرکے کیوں سارے خاندان کی تضحیک کراتا پھرتا ہے۔ ارے ابھی بے کاری ہے آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی ٹھیکہ ضرور مل جائے گا۔ حشمت بیگ کی کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوگا۔

اتنے میں کمرے کا پردہ اٹھا کر حشمت دلہن داخل ہوئیں۔ لمبا سڈول جسم، بڑی بڑی آنکھیں، متناسب اعضا، عمر تقریباً تیس سال لیکن رنگ روپ سے بائیس سال کی معلوم ہوتی تھیں آتے ہی بڑے نواب صاحب کی خیریت دریافت کی۔ پھر قدرے غصّہ سے حشمت بیگ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"آپ بھی کمال کے آدمی ہیں، آپ کو علم تھا کہ رات ابّا میاں کو دَورہ پڑا تھا پھر بھی دن بھر غائب رہے۔ گھر میں ہے کوئی اتنی سمجھ بوجھ والا، جو ابّا میاں کی تکلیفوں کو محسوس کر سکے ؟

اختر بیگ چونک پڑا، بھابھی دلہن واقعی چالاک ہیں۔ انھوں نے کتنی خوبصورتی سے اپنے شوہر کی اہمیت بڑے نواب صاحب پر واضح کر دی۔

حشمت بیگ نے جواب نہیں دیا ان کے کہنے سے قبل ہی نواب صاحب بولے" بات یہ ہے حشمت دلہن کہ تم خواہ مخواہ میاں پر خفا ہو رہی ہو، وہ کوئی سیر سپاٹے کے لئے نہیں گیا تھا وہ بھی تو ضرورت سے گیا تھا۔ تم سے گھر کی حالت تو چھپی نہیں۔ گھر میں تین تین جوان لڑکے بے کار ہیں۔ حویلی گروی ہے۔ دوسری کوئی جائداد نہیں اگر اوروں کی طرح حشمت بھی لاپرواہی برتتے تو گھر کا کیا حشر ہوگا۔ وہ تو حشمت نے حویلی کے ایک رُخ کو کرایہ پر دے کر عقلمندی کا ثبوت دیا۔ ورنہ ربُّ العزّت ہی جانتا ہے کہ کیا حشر ہوتا"

"ابّا میاں، یہ بعد کی بات ہے جس پر بر سے گا وہ خود چھپنے کی فکر کرے گا۔ آپ کی جان اس وقت بہت قیمتی ہے۔ آپ ہیں تو ہماری دُنیا ہے اور جب آپ نہیں ہوں گے"

حشمت دلہن کی آنکھیں بھر آئیں اور ان کا یہ تیر حسب توقع نشانہ پر بیٹھا اگرچہ بڑے نواب صاحب نے کچھ کہا نہیں مگر لیمپ کی روشنی میں صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ متاثر ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد نواب صاحب نے کروٹ لی۔

"رات بہت ہوگئی ہے میرا خیال ہے اب تم لوگ جاؤ۔ اختر تم بھی جاؤ۔ تمہاری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور حشمت تم بھی تھکے ہوتے ہو کھانا کھا کر سو رہو۔ دلہن، حشمت کے کھانے کا انتظام کرو"

"میں کھانا کھا چکا ہوں۔ ابّا میاں بھلا رائے صاحب بغیر کھانا کھلائے واپس آنے دیتے ہیں" پھر سارے لوگ کمرے سے نکل گئے۔ حشمت بیگ نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کمرے میں ان کے ساتھ رہیں گے۔ مبادا رات کے وقت ان کی طبیعت بگڑ جائے۔ لیکن نواب صاحب نے یقین دلایا کہ ان کی طبیعت بہت اچھی ہے اور اب کسی بات کا اندیشہ نہیں۔ وہ تھکا ہوا ہے آرام کرے۔ صبح پھر رائے صاحب کے بارے میں بات ہوگی۔

جب حشمت بیگ دروازے سے باہر نکل گئے تو انھوں نے اطمینان اور بے اطمینانی کا ملا جلا سانس لیا پھر ایک طرح کے فخر اور غرور سے ان کی چھاتی پھول سی گئی۔ ان کے یہ بچے بچیاں، یہ چھوٹا سا خاندان جس کے ہر فرد کے دل میں ایک دوسرے کے لئے بے پایاں محبّت موجیں مار رہی ہے۔ کیا ہوا آج اگر وہ جاگیر نہ رہی۔ کیا ہوا جو زندگی کی ان آسائشوں نے منہ موڑ لیا جو پشت ہا پشت سے نسل در نسل ان کے ابّا حضور خان بہادر عفت اللہ بیگ مرحوم و مغفور کے ایام شباب بلکہ اس سے کچھ آگے تک ساتھ دیتی آئی تھیں..... وہ شان تو باقی ہے ــــــ عظمتوں کا وہ چراغ تو روشن ہے اور اس چراغ کو کون بجھا سکتا ہے.....

مگر اچھی ! وہ طوائف زادی اچھی..... اچھی..... اس کا وہ جسم، وہ خوب صورت بے داغ جسم۔ ستار کے تاروں کی طرح تنا ہوا جسم، پھر اس کی باتیں..... وہ زہریلی، دل و دماغ کو خاکستر کر دینے والی باتیں کیا وہ اچھی تھی ؟

وہ اچھی جو تیرہ سال قبل شرمائی شرمائی ایک پھول کی طرح اُن کی آغوش میں آ پڑی تھی۔ تیرہ سال قبل..... تیرہ سال قبل.... نواب عصمت بیگ کو ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔

آج انہوں نے اللہ رکھی کے یہاں اسے دیکھا تھا۔ سمٹی سمٹائی گڑیا سی..... سرخ و سبز ریشم میں لپٹی لپٹائی ہوئی انھوں نے اسکی

تھوڑی پکڑ کر اوپر اٹھائی تھی۔ بلب کی تیز روشنی میں اچھی نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ گول سا چہرہ، جوانی اور بچپن کی رس بھری سی کیفیت، ناک میں بڑی سی سونے کی نتھ۔ انھوں نے بے اختیار ہو کر اسے چھونا چاہا تھا...

"ابھی نہیں حضور... ابھی نہیں...... اس کمبخت نتھ کو تو اتر لینے دیجئے !!

اللہ رکھی نے کہا تھا۔ پھر یہ نتھ بھی اتر گئی !

اور جس روز یہ نتھ اتری اس روز بنارس بھر کی طوائفیں جشن منا رہی تھیں۔ شہر بھر کی طوائفوں، سازندوں، بھڑوؤں اور دوسرے لوگوں میں کپڑے تقسیم کئے گئے۔ دیگیں پکی تھیں، شہنائیاں بجی تھیں اور پوری ایک سو ایک گنیاں، پانچ انگوٹھیاں درجنوں کامدار جوڑے اور مختلف چھوٹی بڑی چیزیں بے شمار تھیں جو نذر کی گئی تھیں۔ تب کہیں جا کے اچھی ان کے سامنے پیش کی گئی۔

پھر رات بھر وہ سسک سسک کر روتی رہی اور منتیں کرتی رہی کہ مجھے چھوڑ دیجئے میں شریفوں کی طرح زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا ان کے سارے جسم کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ ایک ہلکی سی کراہ ان کے دل میں اٹھی اور وہیں دم توڑ گئی۔

انھوں نے آہستہ سے کروٹ بدلی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل رہا تھا، چراغ کی لو لمحہ بہ لمحہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو رہا ہے... انھوں نے سوچا ــــ انھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چراغ کو گھورنا شروع کر دیا۔ زرد زرد، اداس اداس سی روشنی پھیلانے والی لو مدقوق دکھائی دے رہی تھی۔ پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ چراغ کی لو ایک دم سے جھک گئی، لیکن پھر استادہ ہو گئی۔

کیا یہ اس کے خاندان کا چراغ ہے ؟ کیا یہ اس کی شان ہے، دبدبے اور بلند اقبالی کا چراغ ہے....؟!.... اچھی.....؟ نفرت کی ایک لہر سی ان کے دل میں اٹھی۔ دو کوڑی کی طوائف۔ اس کی یہ ہمت کہ وہ نواب عصمت بیگ کی تضحیک کرے پھر گزشتہ رات بھی انھیں یاد آئی جب ایک دوست کے اصرار پر وہ ایک طوائف کو خوش کرنے کے لئے گئے تھے اور وقت نے تیرہ برس پیچھے چھوڑے ہوئے نقشِ پا کو سامنے لا کر کھڑا کیا تھا۔ تیرہ برس پہلے اچھی ایک کلی تھی جو اب شگفتہ پھول بن چکی تھی۔ ایک ہلکا سا تبسم تھا جو ایک بے باک قہقہے میں بدل گیا تھا جاگتے ہوئے جسم کی کسلمندی تھی جو آج بھرپور انگڑائی تھی....!

انھوں نے برسوں کے سوئے ہوئے جذبات کو بھرتا ہوا محسوس کیا۔ پچپن برس کی سرد راکھ سے شباب کی آنچ پھوٹ پڑی تھی انھوں نے تخلیہ چاہا۔ اچھی بھرپور روشنی میں ایکدم نیم عریاں ہو گئی نواب عصمت بیگ کا بوڑھا دل اچانک اچھل کر ان کے حلق تک آ پہنچا... نور ہی نور... آگ ہی آگ.... انھوں نے اس آگ کو چھونا چاہا۔ دفعتاً اچھی تن کر کھڑی ہو گئی۔

"نواب صاحب اس جسم کی قیمت آپ کو معلوم ہے ــــ؟ بارہ سو روپے، آپ نواب ہیں، رئیس ہیں۔ دولت آپ کے قدموں پر لوٹتی ہے۔ اسی دولت کے سہارے آپ نے سینکڑوں شریف عورتوں کو کوٹھے پر بٹھا دیا ہو گا... صرف بارہ سو، کیا آپ کے پاس ہیں... شاید نہیں شاید بارہ آنے بھی آج آپ کی جیب میں نہیں ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے..... اس ڈھول کے اندر محض پول ہے اور کچھ نہیں....!"

"نواب صاحب ہم طوائفیں اپنے دروازے سے کسی کو بغیر کچھ دیے واپس نہیں کرتیں، کہئے خیرات دوں اپنے اس جسم کی خیرات....؟؟"

خیرات... خیرات... ڈھول کے اندر پول... خیرات... بارہ سو..... ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سینے میں درد اٹھا، پاؤں کانپے۔ پھر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ○○

● مجموعی طور پر ہم عصر ناول نگاروں نے اردو ناول نگاری کو نئی بلندیوں سے روشناس کیا ہے۔ اردو ناول کی ترقی کی رفتار اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں خود ہماری بہت سی کوتاہیاں شامل ہیں۔ ناول کی صنف جو توجہ اور انہماک چاہتی ہے اور اپنی چلک اور وسعت کے لحاظ سے جو امکانات رکھتی ہے شاید اس کا صحیح اندازہ کرنے سے بھی ہم ابھی تک قاصر ہیں۔ یہ بات بھی اردو ناول کی ترقی میں ایک اہم رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی، معاشی تعلیمی، علمی اور جغرافیائی اور ایسے کتنے ہی عوامل ہیں جو اردو ناول کی ترقی میں حائل ہیں۔ ("ہم عصر اردو ناول" ڈاکٹر یوسف سرمست ہم عصر اردو ادب نمبر ص۲۱۳ ماہنامہ شاعر بمبئی ۱۹۷۷)

زیبؔ غوری

۱

دل کبھی اٹھتا ہے کسی کی گفتگو کرتے ہوئے
دیکھنا سبزے کو بارش میں نمو کرتے ہوئے

خوش بھی ہو لیتا ہوں میں نقشِ نوا کو دیکھ کر
درد بھی ہوتا ہے کچھ دل کو لہو کرتے ہوئے

کتنا شاطر ہے کسی پہچان میں آتا نہیں
رکھ گیا آئینہ خود کو روبرو کرتے ہوئے

میں کہاں ہوں اُس سے پوچھوں جی میں آتا ہے مگر
شرم بھی آتی ہے اپنی آرزو کرتے ہوئے

کچھ نہیں ہے روشنی کے ماسوا چاروں طرف
یہ کہاں پہونچا میں سیرِ رنگ و بو کرتے ہوئے

روز دریا کے کنارے خود کو وہ پانا مرا
ڈوب جانا پھر گہر کی جستجو کرتے ہوئے

رات میں نے ایک خرقہ پوش کو دیکھا ہے زیبؔ
اپنے چہرے کے اجالے میں رفو کرتے ہوئے

۲

رنگ غزل میں دل کا لہو بھی شامل ہو
خنجر جیسا بھی ہو لیکن قاتل ہو

اس تصویر کا آب و رنگ نہیں بدلا
جانے کب یہ دل کا نقش بھی باطل ہو

شورِ فغاں پر اتنی بے چینی کیسی
تم سے کیا تم کون کسی کے قاتل ہو

دیکھ کبھی آ کر یہ لامحدود فضا
تو بھی میری تنہائی میں شامل ہو

میں کہ ہوں ایک تھکا ہارا درماندہ شخص
میری انا کہتی ہے میرے مقابل ہو

زیبؔ سوال اب یہ ہے تجھے پہچانے کون
کس کی نظر اس گہرائی کی حامل ہو

● ۹۷/۳۳ بیت الراشدہ ، ناظر باغ کانپور ـ ۱

ترقی پسند آواں گارد اور غزل

عتیق اللہ ● اے جی ۲۵۲، شالیمار باغ، نئی دہلی ۔ ۳۳

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں اردو غزل کو ایک بار پھر آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔ حالی کے بعد غزل کی مخالفت ایک فیشن بن چکی تھی مگر ترقی پسندوں نے مارکسی شعریات کی روشنی میں اپنی مخالفت کے چند نئے جواز ڈھونڈ نکالے تھے۔ ترقی پسند تحریک سے قبل جو اعتراضات کئے گئے تھے ان میں حد درجہ یکسانیت تھی علاوہ اس کے بیشتر ملامت نظم کی کشادگیوں کے پیش نظر کی گئی تھی ان مخالفتوں میں کسی قدر سچائی کی آنچ بھی جھلکتی ہے۔ لیکن بنیادی سچائی جوں کی توں حالی ہی سے وابستہ تھی۔ غور کیجئے تو حالی کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں نظم کی ترکیب اور وہ بھی مقصدی، پاک صاف اور خالصتہً زندگی آمیز و زندگی آموز نظم کی ترکیب ہی کام کر رہی تھی اور نظم کی ترویج کی راہ میں غزل کی عام مقبولیت مانع نہیں تو کم از کم حالی ایسے مخلص اور بامروت انسان کے لئے شرمندگی کا باعث ضرور تھی۔ حالی شاعری ہی میں نہیں بلکہ زندگی کی عام شریعت میں بھی نظم بہ معنی ترتیب کے مبلغ تھے اور سرسید کے مشن کو غزل ایسی کم آمیز گستاخ صنف سے فوائد کم، نقصان پہنچنے کے خطرات زیادہ تھے کہ غزل آپ اپنے میں بڑی انا پرست ذات رکھتی ہے۔

ترقی پسندوں کے جواز کے پس پشت نو مسلم کا سا جوش ایمانی کام کر رہا تھا مارکسی فکر سے ابھی ابھی معانقہ ہوا تھا۔ روایت کے ساتھ ماضی جڑا ہوا ہے۔ اس لئے روایتی غزل کو کئی صبر آزما لمحوں سے دوچار ہونا پڑا۔ غزل کی ریزہ کاری میں مقصدیت اور ضبطِ فکر کو سمو لینا آسان نہ تھا اور پھر وہ نوجوان ترقی پسند جن کے شعری ریاض کی عمر بھی ابھی زیادہ نہ تھی۔ ان میں اتنی صلاحیت کہاں تھی کہ غزل کے شعور کو اپنے شعور سے ہم آہنگ کر سکتے۔ اس لمحے دوسرے کو بدلنا ان کا مقصود تھا مگر خود میں کسی تبدیلی کو راہ دینے پر ان کا ایمان کم سے کم تھا۔ ان کے نوجوانانہ خروش اور ان کی بوہیمین اسپرٹ میں ایک پندار چھپا ہوا تھا جسے غزل کے سامنے چکنا چور ہوتے ہوئے دیکھنا انھیں منظور نہ تھا کہ رحم طلبی کے بجائے مبارز طلبی، مدافعت کے بجائے مجادلت اور مجادلت میں بھی مزاحمت پر ان کے اصرار اور شکست کے مقابلے میں فتح کے حصول یا کم از کم فتح کے خواب دیکھنے پر ان کی ترجیح تھی۔ بعد ازاں ترقی پسندوں نے غزل سے کچھ اس طور پر مفاہمت کی یا مطابقت پیدا کی کہ دونوں کی تہذیب اور آبرو بھی محفوظ رہی اور دونوں کی غیر معمولی صلاحیتیں بھی اجاگر ہوئیں اور اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ دونوں ہی اپنے اندر ایک دوسرے کے لئے نرم گوشہ بھی رکھتے تھے اور دونوں اتنے سخت کوش تند خو اور کم آمیز نہ تھے جتنا کہ بادی النظر میں قیاس کیا جاتا تھا۔

لطیفہ یہ ہے کہ جوش جنھوں نے غزل کی شاعری کو جنون کی بکواس ٹھہرایا تھا خود ان کی بیشتر نظموں میں غزل کا پورا cult اور کلچر کام کر رہا ہے۔ وہی تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا ذخیرہ مطلع سے مقطع تک وہی ڈھانچہ ردیف و قافیہ کا وہی التزام، درمیان سے کئی اشعار نکال دیئے جائیں تب بھی نظم پر کوئی حرف نہیں آتا ــــــ گویا غزل کے آسیب سے وہ آخر دم تک چھٹکارا نہیں پا سکے ان کی نظم کی سب سے بڑی کمزوری ان کا غزلیہ برتاؤ ہے جس میں تسلسل تو ہے مگر وہ ایسا نہیں جس میں نظم کا ہر ایک جزا اپنے دوسرے جز سے نامیاتی طور پر مربوط اور اس کی توسیع کرتا ہوا نظر آئے۔ کبھی کبھی نظم ــــــ مسجد قرطبہ، خضر راہ یا ساقی نامہ کی مانند بہ ظاہر ٹکڑے ٹکڑے نظر آتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر ان میں سے کوئی جز، بند یا ٹکڑا منہا کر دیں تب بھی نظم کی خارجی ساخت کسی طرح متاثر نہیں ہوتی مگر نظم کی کلیت اور قوت پر گہرا اثر پڑتا ہے اور وہ اپنے طور پر ایک تجربے کی حد تک مکمل اظہار کا نمونہ نہیں بن پاتی نظم کا اصل جوہر تو اس کے

اسی تکمیل کے پہلو میں مضمر ہے جس میں زندگی لمحہ لمحہ جی جاتی ہے مگر وہ جینا ایک طویل عرصۂ حیات کے تحت عمل میں آتا ہے اور وقت وقتِ محض نہیں رہتا بلکہ دوران میں بدل جاتا ہے۔ اس قسم کا توسیعی تواتر جوش کی قدرت سے باہر ہے۔ ان کی نظم ایک مکمل قوت کا مظہر بنتی ہے اور نہ ہی مختلف تلازمے کسی ایک مخصوص محور کو منتج ہوتے ہیں۔ بیان کا زور اور آہنگ کی رعب داری انھیں اپنی ذات سے الگ نہیں ہونے دیتی۔ میری مراد جوش کے پورے شعری سرمائے سے نہیں بلکہ صرف ان نظموں سے ہے جن میں ان کی ذہنی اور نفسیاتی پسپائی (اگرچہ جوش کو اپنی پسپائی کبھی قبول نہیں ہوگی) نظم کے آزاد و نامیاتی ارتقا میں شامل و حارج ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسی نظمیں نظم کے معیار پر پورا اترتی ہیں اور نہ غزل کے عنوان سے ان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

ہر صنف کا اپنا ایک مختلف ہیئتی اور کارسازانہ کردار ہے جس سے اس کی شناخت قائم کی جاتی ہے۔ بعض وقت فنکار کی غیر معمولی تخلیقی قوت ان حدود کو تہس نہس کر دیتی ہے لیکن یہ عمل دخل اور توڑ پھوڑ ذیلی سطح پر اتفاقی ہوتی ہے نہ کہ مسلسل اور شعوری۔ یہ عمل کلاسیکی شعرا کے یہاں بھی پایا جاتا ہے لیکن اس کے پس پشت کسی بدنیتی کا دخل یا ان کا مقصود کسی صنف کی اپنی توقیر کو صدمہ پہنچانا نہیں تھا بلکہ یہ سارا عمل مفاہیم کی ادائیگی اور موضوع کی نامیاتی رد کے تحت وقوع پذیر ہوتا ہے غزل سے انصاف یا ہم اپنے آپ سے انصاف اسی وقت کر سکتے ہیں جب غزل کو اس کے اپنے ہیئتی اور کارسازانہ کردار کی روشنی میں سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کریں۔

یہ خیال کہ صنفِ غزل اس منطقی ربط اور اس نامیاتی جوہر سے عاری ہوتی ہے جس کے بعد ہی تخلیق کو تخلیق کا نام دیا جا سکتا ہے اور یہی سبب ہے کہ اس کی ریزہ کاری تاثر کی وحدت میں مانع ہے۔ میرا جواب یہ ہوگا کہ تخلیقی سطح پر تاثر کی وحدت کا تصوّر اور تخلیق کے ضمن میں منطقی ربط نام کی چیز دونوں ہی اضافی ہیں۔ صنف کے ساتھ تاثر کی وحدت کا تصوّر بلکہ تاثر کا تصوّر بھی بدل جاتا ہے ناول جیسی بلند کوش اور ہمہ جہت صنف تو منطقی ربط کی ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے لیکن شعر کی اپنی بوہیمین اور انارکسٹ اسپرٹ سے اس قسم کی توقع زاید ہے حتیٰ کہ نظم ایسی صنف کے تعلق سے بھی اس قسم کا خارجی اور منطقی ربط کبھی کبھی بے معنی اور ذیلی ہو کر رہ جاتا ہے

[لیکن خیال رہے اس تصوّر کا اطلاق جوش پر نہیں کیا جا سکتا کہ جوش ہی ہمارے اور اپنے درمیان لفظوں کی ایک عظیم دیوار کھڑی کر دیتے ہیں اور ہم ان سے معاملت بھی نہیں کر پاتے اور لفظوں کی یہی ماتحتی ان کی نظم کو داخلی ہم آہنگی سے بھی محروم کر دیتی ہے] وہ نظمیں جو انتہائی واضح، قطعی اور آر پار ہیں ان میں بھی حقیقت محض واحد اور مجہول نہیں ہوتی بلکہ ایک خیال اپنے ما قبل اور ما بعد کئی ثانوی اور فروعی خیالات کے گچھوں میں حرکت کرتا ہے۔ نظم کسی خیال، تصوّر یا فکر کا ثبوت پیش کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وہ تو چند ایسے تاثرات کی حامل ہوتی ہے جنھیں شعر کے علاوہ کسی اور پیرائے میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں غزل سے جس کا اپنا بلند کوش ماضی اور جس کی اپنی ایک فعال روایت کا نظام ہے یہ شکایت ہی بے جا ہے کہ وہ ریزہ کار ہے یا اس میں منطقی ربط ناپید ہے یا یہ کہ اسلوب زبان کے اعتبار سے اس کی اپنی حدود ہیں اور ان حدود سے تجاوز کرنا ممکن نہیں ہے اور یہ کہ محض اپنی ذات یا چند مخصوص داخلی کوائف کی عکس ریزی تو اس میں ممکن ہے مگر دیگر انسانی مسائل و موضوعات کے آداگون کی وہ اہل نہیں ہو سکتی —— ترقی پسندوں میں جن لوگوں نے ان تعصّبات کو ہوا دی تھی وہ یا تو محض اور محض نقاد تھے یا انھیں غزل کی روایتوں کا علم کم سے کم تھا جو بظاہر غیر مبدّل معلوم ہوتی ہیں مگر یہ باطن ان میں بلا کی نمو اور بالیدگی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میر، غالب اور اقبال کی غزلیں متنوع انفرادیتوں اور ایک دوسرے سے مختلف تجربے کی حامل نہ ہوتیں۔ ان کی غزل میں غزل کی اپنی ساکھ بھی قائم ہے اور غزل کے عمومی اسلوب کے متوازی ایک ایسے اسلوب نے بھی نمو پائی ہے جو منفرد بھی ہے اور ایک نئی روایت کی بنیاد کا حامل بھی۔ بعد ازاں خود ترقی پسند غزل کے تجربے نے یہ ثابت کر دکھایا کہ غزل کا اسلوب مخصوص ضرور ہے محدود نہیں۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا کے دور میں میرا جی اور ان کا گروہ انفرادیت کے اس تجربے سے زیادہ نزدیک تھا جس میں سارا زور جبلّت اور ذات کی نارسائیوں پر تھا۔ اظہار کی آزاد منطق کی بنیاد پر انھیں ہر خارجی دباؤ سے کد تھی۔ ان کے لئے زندگی کے تاریک ترین پہلوؤں اور تلخ آگیں تجربات کا اظہار ہی کافی تھا۔ وہ سماج کے ان مصائب سے تو دوچار تھے جنھیں طبقاتی اور ایک قطعی معنوی

تہذیب میں دبے ہوئے معاشرے نے جنم دیا تھا۔ مگران کی "اصل فطرت" مسخ ہورہی تھی تاہم میراجی اور ان کا پورا گروہ تجربہ پسند تھا بغاوت کا دلدادہ تھا۔ گویہ بغاوت محدود دا ور جنس و اظہار کے چند مخصوص پہلوؤں پر ہی محیط تھی۔ المیہ یہ ہے کہ ان میں شعر فہمی کی صلاحیت غیر معمولی تھی مگر قوتِ اظہار کا فقدان تھا۔ ان کے تجربات نے آئندہ نسلوں اور خود ان کے عہد کے کئی خلاق ذہنوں کو خام مواد تو فراہم کیا مگر بذاتِ خود کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ دراصل موضوعاتی یکسانیت اور چند مخصوص اسالیب کی تکرار کے باعث کشادگی کی فضا ہی پروان نہ چڑھ سکی ترقی پسندوں کے شعری تجربات میں انقباض کی وہ عمومی کیفیت سرے سے ناپید ہے جس نے میراجی اور میراجی سے زیادہ ان کے حاشیہ نشینوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو میراجی کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے منکر ہیں؟ میراجی کے دشمن تک ان کی طباعی اور جودت کو تسلیم کرتے ہیں مگر انہوں نے اپنے لئے جو حدود قائم کرلی تھیں ان میں وسعت کی گنجائش کم تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے تجربات میں بے دریغی سے روایت کو توڑنے کا حوصلہ اور اپنے جذبے کی تطہیر کا خوش آگیں سلیقہ تھا۔ میراجی کے یہاں جس ذات کے اظہار اور شخصیت کے اشتراک کی بات کی جاتی ہے وہ ان کی غزل اور گیت میں موجود تو ہے مگر پوری طرح حاوی نہیں ہے۔ یہی حال ان کے دیگر حلقہ نشینوں کا بھی تھا۔ علامتی رویّہ ایک خالص اسلوبی رویّہ ہے جب کہ انفرادیت کوشی کے مرتکز بالذات رویئے نے مذکورہ حلقے میں علامتی تجربے کی کشادگی کے امکانات کم سے کم کر دیئے اور انقباض کی وہ صورت پیدا کردی جس کی طرف میں اس سے قبل اشارہ کرچکا ہوں۔ اب گر حلقے سے وابستہ شعراء کی غزل ملاحظہ فرمائیں تو وہ دوئی صاف نظر آجائے گی جو ان کے تخلیقی تجربے کی اکائی کی نفی کرتی ہے قیوم نظر، یوسف ظفر اور ضیا جالندھری وغیرہ کی غزلوں میں تجربے کی پسپائی اور علامتی رویئے سے گریز کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یعنی یہ غزلیں روایت زدہ اسلوب کی زیادہ حامل ہیں جبکہ غزل میں علامتی اسلوب کی گنجائش بیش از بیش ہے۔ انہی شعراء کی نظم کا اسلوب ان کی غزل سے مختلف کسی قدر جدید، نئے مفاہیم سے ہم آہنگ اور غزل کے مقابلے میں زیادہ نجی اور شخصی ہے ان کی غزل پٹی ہوئی اور بے رس روایت کی تقلید کے باعث غیر شخصی ہو کر رہ گئی اور نظم نے وہ شخصیت پالی جیسے غزل کی فضا کچھ زیادہ ہی راس آسکتی تھی۔ ترقی پسند شعراء کے تجربوں میں اس قسم کی دوئی کم سے کم پائی جاتی ہے۔ میں یہاں خالص ہنگامی اور للکارنے والی نظموں کی بات نہیں کر رہا ہوں کہ ایسے کم کوش تجربات کو خود ترقی پسند نقادوں نے کسی التفات کے قابل نہیں سمجھا ہے۔ میرے پیش نظر تو نظم کے وہ تجربات ہیں جس میں لفظ صناعی کے بجائے تخلیقی تناؤ سے گزر کر اپنے اظہار کو پہنچتے ہیں۔ استعارہ ان میں مشترک قدر ہے اور علامت نے کہیں کہیں از خود نمو پائی ہے۔ اپنی صحیح صورت میں کائنات کی نفی اور محض ذات کے اظہار پر زور دینے کے معنی اصلاً ذات سے فرار کے ہیں اور ذات شخصیت بالخصوص شعری اور فنی تجربے میں اپنے رشتوں، حوالوں اور اپنے پس منظر سے بامعنی ہوتی ہے۔ حلقہ کے شعراء میں ذات کی تفہیم اور اظہار کا یہی کم تر تصوّر عیاں اور پنہاں ہے۔ جب کہ ترقی پسند نظم اور غزل کا آہنگ اور ذات کی تفہیم کا رویّہ بڑی حد تک یکساں اور تخلیقی تجربے میں دوئی کم سے کم ہے۔

ترقی پسند شعراء اپنے تمام تر باغیانہ رویّوں کے باوجود فنّی اظہار میں کلاسیکی تھے۔ اس کلاسیکیت کا اظہار ان کی غزل میں بہ خوبی ہوا ہے۔ موضوعی اور موضوعاتی اعتبار سے ان کے مفاہیم ماضی کے گھسے پٹے محاورے سے مختلف تھے۔ اظہار کی سطح پر ان میں کچھ سختیاں تھیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسی تحریک جس نے عوامی مسائل اور دبے کچلے ہوئے انسانوں کو اپنا موضوع بنایا تھا اور عوام سے گفتگو پر جس کا اصرار تھا اس کے اظہار کے رویئے میں فن کا ایسا شستہ مذاق کام کر رہا تھا جو ان کے معاصر حلقے کے شعراء میں کمیاب ہے۔ اس طور پر جہاں ایک طرف چند فرسودہ روایتوں کو انہوں نے تہس نہس کیا وہاں دوسری طرف چند ایسی روایتوں کی از سرِ نو دریافت کی اور انھیں بروئے کار بھی لائے جو مشرقی جمالیات اور بالخصوص ایرانی جمالیات کی زائیدہ و پروردہ تھیں۔ لفظ کے برتاؤ، صوتیاتی نظم و ترتیب اور تلمیحاتی، استعاراتی حوالوں کے ضمن میں ان کا وہی فنکارانہ شعور کام کرتا ہے جس کی تربیت میں کلاسیک کا دخل زیادہ ہے۔ اس خصوص میں غزل کا فارم ان کے لئے بہترین وسیلۂ اظہار ثابت ہوا۔ غزل کی اپنی اسلوبی روایت میں ایسی گنجائش پیدا کرنا کہ سماجی وابستگی پر حرف بھی نہ آئے اور زبان و فن کی حرمت بھی محفوظ رہے کارِ دارد تھا۔ واقعتًا غزل کی انتہائی انا کوشی ذات، ترقی پسند مفاہیم کے اظہار میں بڑی حد تک مانع تھی ـــــ غزل کے اس کفر کو توڑنے کے لئے سودا ایسی پندار شکن شخصیت غالب ایسی خطرناک حد تک فہم اور اقبال ایسی حسّاس بصیرت درکار ہے۔ ترقی پسندوں نے غزل کے جس اسلوب کی تشکیل کی ہے اس میں

تنوع کے باوصف ایک انتخابی انفرادیت بھی واضح ہے جو داخلی سطح پر ایک نئے تجربے کا اظہار اور خارجی سطح پر فن کی انتخابی روایت کی توسیع اور چند مجہول روایات کی تنکیر سے عبارت ہے اب ہم دیکھتے ہیں تو غزل کی وہ فطرت جو اسرار آگیں ہے ترقی پسندوں کے یہاں اپنی رمزیت کے ساتھ ساتھ رجزیہ آہنگ کی حامل ہو جاتی ہے بالخصوص احتجاجی لمحوں میں ـــــ ترقی پسند غزل سودا اور غالب کی لفظیات سے اپنی شناخت قائم کرتی ہے یہ لے اس وقت ایک فکر انگیز توازن میں ضم ہو جاتی ہے جب اسے اقبال کی دانشورانہ فہم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان معنوں میں اقبال کا شعری ضبط اور غزل کا مفکرانہ اسلوب ترقی پسند غزل کے بلند آہنگ میں معنویت اور تہہ داری سی پیدا کر دیتا ہے۔

مجھ میں یہ آرزو وہ اٹھائیں نقاب خود — ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی — مجاز لکھنوی

اسی سے تیغ نگہ آب دار ہوتی ہے — تجھے بتاؤں بڑی شے ہے جرأتِ انکار — سردار جعفری

ہمیں نہ کر سکے تجدیدِ آرزو ورنہ — ہزار بار کسی کے پیام بھی آئے — غلام ربانی تاباں

خاموش ہو کیوں نالہ کشان شب ہجراں — یہ تیرہ شبی آج بھی کچھ کم تو نہیں ہے — جذبی

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے — مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا — احمد ندیم قاسمی

موضوع کی سرکشی پر قابو پانا اور مختلف قسم کے اجزاء کو ایک شعری وحدت میں سمو لینا آسان نہ تھا۔ خصوصاً ترقی پسند شعراء کے لئے جن کی وابستگی واضح اور جن کی وفاداریاں بے لچک تھیں۔ ترقی پسند غزل میں خیال کا ایک ایسا ردِ عمل نمایاں ہے جو احساس میں ڈھل جاتا ہے۔ اور استعارے کی تخلیقی قوت دو متضاد تجربوں کو ایک ٹھوس مگر ترکیبی پیکر میں بدل دیتی ہے ان معنوں میں ترقی پسند غزل فن کی جمالیاتی بنیادوں کے انکار کا نہیں اقرار کا نام ہے۔ اسی باعث وہ جذباتی انتشار جو بعض نظموں کا خاصہ ہے ترقی پسند غزل میں ارتکاز اور تطہیر کے عمل سے گزرتا ہے۔

قفس ہے بس میں تمہارے تمہارے بس میں نہیں — چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم — فیض احمد فیض

خون سر بہہ گیا موت آ گئی دیوانوں کو — بارشِ سنگ سے طوفانِ شرر سے پہلے — سردار جعفری

مسافروں سے کہو رات سے شکست نہ کھائیں — میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے بھر کے چراغ — احمد ندیم قاسمی

پرتوِ ساغرِ صہبا کیا تھا — رات اک حشر سا برپا کیا تھا — مجاز لکھنوی

مجاز کی نظم جس قدر نوجوانانہ جوش و خروش اور ہنگامی جذبات و تاثرات کی حامل ہے ان کی غزل اتنی ہی ان لمحاتی ہیجان انگیز پہلوؤں سے بڑی حد تک عاری ہے گو جذبے کی سرمستی و بے اختیاری، لہجے کا والہانہ پن اور آہنگ کی نشاطیہ وضع یہاں بھی قائم ہے مگر نظم کی وہ شخصیت جو بہ باطن پسپا ہے بہ ظاہر باغیانہ سرکشی اور انا کی صلابت کا مظاہرہ کرتی ہے جب کہ غزل میں وہی شخصیت ربودگی، سپردگی اور اضمحلال سے گزرتی ہے۔ مجاز اس اقلیم میں بھی مطرب ہیں مگر یہ نغمہ انقلاب کم اور نغمۂ شباب زیادہ ہے۔ اس نغمے میں کہیں کہیں فکر کی تابناکی بھی پیدا ہو گئی ہے لیکن اس کی وجہ مجاز کی ہوش مندی نہیں ہے بلکہ غزل کی اپنی روایت کا خود کار عمل ہے۔ جگر کی وارفتہ مزاجی جوش کی سرکوشی و سرشاری اور فانی کی دردمندی اور شکست خوردگی نے مجاز کی غزل کو ایک خاص سیاق عطا کیا ہے۔ مجاز کی غزل کے مفاہیم اور لفظیات غزل کے سانچے میں باہم دیگر رچ بس گئے ہیں۔ اس لئے تجربے کی علاحدگی کے التزام سے مجاز کی غزل بری ہے مجاز نے جس منطقی تطابق کی بنیاد پر اپنی شخصیت اور غزل کو ایک اکائی میں ضم کر دیا ہے اور روایت کے جس وسیلے سے اپنے لمحاتی بلکہ ہنگامی تاثرات سے ہیجانیت کو چھانٹ کر تجربے کی تطہیر کی ہے۔ اگر یہ عمل ان کی نظموں میں بار پاتا اور خود اسی عمل کے تحت کچھ اور بھی غزلیں کہی ہوتیں تو مجاز کا سرمایہ آج ہمارے سامنے قطعی مختلف صورت میں ہوتا۔ تاہم ان کی موجودہ غزلوں میں بھی بلا کی توانائی اور قوت موجود ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس نے فیض کے اولین دور کی غزلوں کو بھی اپنا اسیر بنا لیا تھا۔

تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا — بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

خاموشی کا تو نام ہوتا ہے — ورنہ یوں بھی کلام ہوتا ہے

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے — اس سعیٔ کرم کو کیا کہئے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم — ہٹ کر چلے ہیں رہ گزرِ کاروان سے ہم

آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے　　دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے
پھر مری آنکھ ہو گئی نمناک　　پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طرازِ شوق　　لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم
الجھنوں سے گھبرائے میکدے میں در آئے　　کس قدر تن آساں ہے ذوقِ رائیگاں اپنا

فیض ذہنی معاملت میں سودا کے نزدیک ہیں لیکن کبھی کبھی اقبال کے کوچے سے بھی ان کی آشنائی کا سراغ ملتا ہے احتجاجی لمحوں میں ان کا لہجہ نکیلا اور اثر آفریں ہو جاتا ہے پھر بھی ایسی مثالیں قلیل تر ہیں جن میں ترقی پسندوں کی معروف بلند آہنگی اور بلند آہنگی سے زیادہ دہشت پسندی کا جوہر نمایاں ہو۔

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

یہاں جوش کی ذہنیت کار فرما ہے مگر فیض عموماً اس قسم کے ہنگامی لمحوں سے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں۔ ایسے لمحے بھی آتے ہیں مگر کم جن میں وہ جملہ حقوق اقبال کے نام محفوظ کر کے خود سے فرار اختیار کرتے ہوں۔ اکثر ایسے مقامات پر وہ اپنی گم شدگی قبول کر لیتے ہیں۔ سودا کی رفاقت ہی میں ان کی ایک غزل کو ایک نئی آب ملتی ہے۔ میں غالب کو سودا کے اسلوبی دبستان سے الگ نہیں سمجھتا اور غالب کی غزل کو سودا کے اسلوب کی ترقی یافتہ مگر تطہیری شکل قرار دیتا ہوں فیض کے یہاں بہ یک وقت سودا اور غالب کی انا رسے معاملت کا رویّہ کام کر رہا ہے۔ فیض ہی نے غزل کی کلاسیکی علامت و استعارات کی راہ از سرِ نو روشن کی ہے۔ ترقی پسندوں میں روایت کے تعلق سے جس قسم کی راسخیت جڑ پکڑ چکی تھی فیض نے اسے توڑ کر روایت کی اہمیت اور توانائی کا احساس دلایا ہے میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ ترقی پسند نظم اور ترقی پسند غزل کے مابین تجربے کی دوئی کم سے کم ہے۔ غزل کی مطلق انانیت عمومی ترقی پسند انانیت پہ غالب نہ آسکی اور نہ ترقی پسند عمومیت پوری طرح غزل کی خصوصیت کو محو کر سکی نتیجہ ان دونوں قطبین کے بین بین ہے۔ جس کی بہترین مثال فیض کی شاعری ہے جس میں تخلیقی تجربہ صنفی سطح پر ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوتا بلکہ یکساں اور متوازی ہے۔ حقائق کے ادراک و اظہار کا وہ طریقہ کار جو ان کی نظم کی واردات بنا ہے کم و بیش تجربے کی یہی نوعیت فیض کی غزلوں میں بھی عیاں و نہاں ہے ۶۰ء سے قبل کی شاعری میں جس ملال آگیں تفکر یا فکر آگیں ملال اور کسی قدر حزنیہ باقی پسپائی نے فروغ پایا تھا بعد ازاں اس کی جگہ ایک مخصوص لسانی رویّے نے لے لی۔ فیض کے علاوہ یہ رویّہ ایک مختلف نہج پر راشد اور ایک دوسری نہج پر سردار جعفری کے یہاں محیط ہے۔ فیض اپنے مفاہیم کو وسعت دے سکے اور نہ اپنی مخصوص لسانی وابستگی میں کوئی نرم گوشہ پیدا کر سکے۔ راشد نے تجربے کی آفاقیت کو محض و صرف خارجی لسانی نظم اور قرأت پر ترجیح نہ دی اور اپنے مختلف النوع تجربات کو کسی ایک یا چند مخصوص ہیئتوں کے حوالے بھی نہ کیا۔ راشد اپنی بے پناہ تخلیقی حس کو پوری قوت اور بے دردی کے ساتھ بروئے کار لاتے رہے جب کہ فیض، جن کے لسانی رویّے راشد سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے اپنی حدود میں گنجائش پیدا نہ کر سکے وہ اپنی سماجی اور سیاسی وابستگی کے باوجود تخلیقی عمل کے ان مغالطہ آمیز اور گمراہ کن لمحوں کے فریب کو نہ سمجھ سکے جو فن کار کو اپنی ذات سے وراہیں ہونے دیتے۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ فیض محض اپنی ذات کے اسیر ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ ان کے تخلیقی رویّے پر لسانی دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد اس معمول کے شکار ہو جاتے ہیں جو ان کی ذات کا حصّہ اور ان کی شخصیت کا جزوِ اعظم بن گیا ہے۔ سردار جعفری کا لسانی رویّہ ابھرا مگر مخصوص ہے۔ وہ فیض اور راشد ہی کی طرح فارسی کے دلدادہ اور تراکیب کی خوش وضعی اور لفظوں کی صوتیاتی قدروں کا شعوری طور پر لحاظ رکھتے ہیں لیکن لسانی فطرت کی جدلیّت کے راز سے واقف ہونے کے باوجود اپنے بار بار آزمائے ہوئے یکساں لسانی رویّے کو رد کر کے نئی مطابقتوں اور مغائرتوں کو راہ نہیں دیتے۔ انھوں نے پتھروں کی دیوار اور نئی دنیا کو سلام کے لسانی رویّوں کو توسیع نہیں دی یا یہ کہ انھیں ان کی قوتوں کا احساس نہیں ہے۔ سردار میں تخلیقی صلاحیت بے پناہ ہے وہ بہترین تنقیدی شعور کے مالک ہیں۔ ان کا علم بسیط ہے۔ وہ خود آگاہ بھی ہیں اور زمانہ شناس بھی۔

ان سے ہمیں یہ توقع تھی اور ہے کہ وہ لسانی توسیعات سے بھی کام لیں گے اور اپنے مفاہیم میں بھی کشادگی پیدا کریں گے۔ فیض اور سردار کی غزل میں یہی فرق ہے کہ فیض نے جہاں لسانی توسیعات کو راہ دی ہے سردار نے ان شانیوں میں اپنی عادت کی توثیق پر ہی اکتفا کی ہے گو ایک واضح جمالیاتی نظم اور موسیقیاتی فسق کا تجربہ دونوں کے یہاں مشترک ہے۔

جب تجھے یاد کیا صبح مہک مہک اٹھی جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

ایک بار اور مسیحائی دلِ دل زدگاں کوئی وعدہ کوئی اقرار مسیحائی کا

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا ——!

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گذر بھی نہیں

غم جہاں ہو غم یار ہو کہ تیر ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں
اور کچھ دیر نہ گزرے شب فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں
حضورِ یار ہوئی دفتر جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کے تار تار آئے

فیض احمد فیض

جذبی نے جب روایت کا سہارا لیا روایت کو عصری دھارے میں سمویا تو ایک ایسی غزل کا کردار ابھر آیا جس میں نت نئی خوبصورت تراکیب کے ساتھ یک گونہ سلاست اور خوش وضعی بھی تھی۔ ان کی غزل میں ایک طرف کلاسیکی نظم اور توازن کا پاس ہے تو دوسری طرف نئے عہد اور نئے انسان کی بصیرت، بے چارگی اور بے بسی کا شدید احساس بھی ہے اس نوع کی غزلیں عموماً مسلسل ہیں نیز اقبال کی یاد دلاتی ہیں وہ غزلیں بھی ہیں جن میں ایک رد فانی اور جگر سے ہو کر ان کے شعور پر چھا جاتی ہے۔ محض ذات کا عکس ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ پیش و پس کی ناہمنگی کا عرفان بھی اس میں جزو جان کی طرح شامل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے غزل میں نفی ذات کے مرحلے کو سرکرنا آسان نہیں ہے۔ جذبی نے ان معنوں میں نفی ذات سے کام بھی نہیں لیا ہے اور نہ جذبی کی حسیاتی فطرت اس طور پر چیزوں میں تحلیل ہو سکتی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کا جز بن جاتے جذبی صرف محسوس کرتے ہیں اور احساس کے تجربے کو ہی وقیع خیال کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں بے ساختگی تو ملتی ہے مگر لسانی انفعار کا وہ عمل مفقود ہے جس میں تعقل کا دباؤ شدید ہوتا ہے اور شاعر جہاں تہاں مشابہتوں کی دھن میں سرگرداں نظر آتا ہے۔

اداسیوں کے سوا دل کی زندگی کیا ہے
کسے بتائیے خوابوں کی برہمی کیا ہے
منزل عشق پہ یاد آئیں گے کچھ راہ کے غم
مجھ سے لپٹی ہوئی کچھ گرد سفر بھی ہوگی
یوں تو سینکڑوں غم تھے پر غم جہاں جذبی
بعد ایک مدت کے دل کو سازگار آیا

جذبی کسی کو تجھ سے کیوں بدگمانیاں ہیں کیا اضطراب دل بھی شامل ہے خامشی میں
کچھ وہ بھی ہیں چپ چپ کچھ میں بھی ہوں خاموش در پردہ کوئی رنجش باہم تو نہیں ہے

جذبی

فیض کی غزل میں انا کی پاسداری اور استقلال کی کیفیت سودا اور غالب سے ماخوذ ہے، لیکن حسن کی کارفرمائی مصحفی کی یاد دلاتی ہے جبکہ سردار جعفری اور غلام ربانی تاباں ——— اقبال کی محسوس فکر سے اپنی غزل کو تاب کار بناتے ہیں۔ اس قسم کا اثر سردار پر گہرا ہے اور وہ اقبال کے مفکرانہ اسلوب کے متوالے ہیں۔ تاباں غزل کے قدر شناس بھی ہیں اور روایت فہم بھی۔ ان کی اپنی ایک وضع ہے۔ ان کی غزل کا نہایت سنجیدہ قماش ——— کہیں کمزوری اور کہیں قوت بن جاتا ہے۔ سردار ——— اکثر اوقات ——— ایسی متانت کو جھٹک کر out spoken ہو جاتے ہیں طنز کی کاٹ گہری ہو جاتی ہے۔ اور غزل میں ایک مسلسل شہر آشوب کا سا سماں روشن ہو جاتا ہے۔

یہ حکم کیجئے پھر خنجروں کی دلداری
دہانِ زخم سے افسانہ گو کہیئے
شکایتیں بھی بہت ہیں حکایتیں بھی بہت
مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیئے

امتحاں بزم وطن میں ہے وفاداری کا
اہرمن تخت نشیں ہے اسے یزداں کہیئے
کیجئے روح کو تیار غلامی کے لئے
شوقِ آزادیٔ انساں کو گریزاں کہیئے
اپنے ہر زخم کو اک پھول تصور کیجئے
سرخیٔ خونِ عزیزاں کو بہاراں کہیئے
چارہ گر جانئے اس دور میں ہر قاتل کو
زندگی موت کو اور درد کو درماں کہیئے

سردار جعفری

سردار جعفری کی غزل وہاں وہاں گہرے جذبوں سے گزرتی ہے جہاں وہ جوش کی آواز میں آواز ملانے کی کوشش کرتے ہیں سردار کے یہاں اب ایک ضبط کی کیفیت بھی پیدا ہو ئی ہے پچھلے دس برسوں میں ان کی غزل میں ایک نشاط لَے نے بھی فروغ پایا ہے جسے میں حافظ ایسی والہانہ ترنگ کا نام دوں گا۔ سردار کی نظم کی طرح غزل اور غزل کے اشعار کا ایک پس منظر ہوتا ہے سردار کا کمال یہ ہے کہ وہ خارجی تجربے کو بڑی خوبی کے ساتھ فنی تجربے میں لانے کا آرٹ جانتے ہیں۔ اپنی بہترین غزلوں میں انھوں نے اس بات کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

مٹتے مٹتے دے گئے ہم زندگی کو حسن و رنگ
رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا افسانہ ہم
میں جہاں تم کو بلاتا ہوں وہاں تک آؤ
میری نظروں سے گزر کر دل وجاں تک آؤ
کام اب کوئی نہ دے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
تمام دولتِ کونین ہے خراج اس کا
یہ دل نہیں کسی ٹوٹے ہوئے نگر کی طرح
اِک دھوپ سی ہے جو زیرِ مژگاں
وہ آنکھ ابھی اٹھی نہیں ہے

ترقی پسند شعراء میں مجروحؔ کی غزل ایک اعلیٰ معیار قائم کرتی ہے۔ ان کی غزلیں اسباب کی مظہر ہیں کہ وہ فن اور بالخصوص غزل کے فن کا بڑا شستہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے ذہن کی ابتدائی تربیت غزل کے کلاسیکی ماحول میں ہوئی جس سے انھیں روایت کا شعور حاصل ہوا اور ترقی پسند تحریک کے وسیلے سے عصری تقاضوں کو سمجھنے میں مدد ملی۔ "لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا" یا "یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے" انھیں چند اور وہ بھی انتہائی قلیل مثالوں سے قطع نظر مجروحؔ نے غزل کو اپنے عہد سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور فنِ غزل کی جمالیاتی حرمتوں کو بھی محفوظ رکھا ہے ان کی غزلوں کا خارجی نظام ایک والہانہ پن اور نشاطیہ آہنگ سے عبارت ہے لیکن داخلی سطح پر اس میں تصادم اور رچاؤ ہے۔ حتیٰ کہ وہ غزلیں یا وہ اشعار جو بہ ظاہر بے حد چست و درست اور جوڑ جوڑ سے کسے بندھے ہیں ان کی تہ میں بھی ایک داخلی جنگ نظر آتی ہے۔ مجروحؔ کہیں اور کسی مقام پر بھی سپر نہیں ڈالتے بلکہ انتہائی غیر یقینی لمحوں میں بھی استقلال حوصلے اور رجا سے کام لیتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے تجربے میں تیکھا پن اور نوک داری ہے۔ ایسے لمحوں میں آہنگ کا بلند ہونا ایک فطری بات ہے لیکن مجروحؔ کے یہاں خارج اور داخل کا تصادم یا ناآہنگی کسی غصّہ وری ہیجان یا کشاکش کو راہ نہیں دیتی۔ فن کا کلاسیکی رچاؤ —— اس سطح پر ڈھال بن جاتا ہے۔ مجروحؔ غزل کی نفسیات سے آگاہ اور غزل کے امکانات سے واقف ہیں۔ وہ اپنی غزل کو نئے ادبی لسانی شعور سے ہم آہنگ کرتے اور اپنی لفظیات کو وسیع کرنے کی سعی کرتے تو یقیناً غزل سے ایک نیا جہان آشکار ہو سکتا تھا چند مخصوص الفاظ، تراکیب اور استعاروں کی تکرار کے باعث شعر اپنے طلسم اور اپنے تاثر سے محروم ہو جاتا ہے۔

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کارواں سحر نہ ہو

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

دل سے ملتی تو ہے اِک راہ کہیں سے آ کر
سوچتا ہوں یہ تری راہ گذر ہے کہ نہیں

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لئے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

کس کس کو ہائے تیرے تغافل کا دوں جواب
اکثر تو رہ گیا ہوں جھکا کر نظر کو میں

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اِک چراغ بجھا دیا کبھی اِک چراغ جلا دیا

مجروحؔ سلطان پوری

ہمارے نقادوں نے مخدومؔ کی غزل سے ابھی تک انصاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مخدومؔ کی غزل ایک کارنامے کی حیثیت سے بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں بے باکی ہے۔ ان کا اپنا وزن ہے ان کا اپنا اسلوبِ حیات کام کر رہا ہے۔ تاہم ان کی غزل اس نئی زبان کی تخلیقی جہتوں اور وارداتوں سے تطابق پیدا نہ کر سکی جس کی ایک روشن مثال فیضؔ کی زبان تھی۔ فیضؔ نے پرانے استعاروں کو نئے تناظر میں منقلب کرنے کی راہ سجھائی تھی۔ مخدومؔ نے یہ کام بہت بعد میں کیا۔ ان کے یہاں فیضؔ، مجروحؔ اور حتیٰ کہ فراقؔ کا شیوۂ گفتار بھی کہیں کہیں در آیا ہے اور تجربے واضح طور پر ایک مشترک تعمیم کی شکل اختیار کر لی ہے جس طرح جاں نثار اخترؔ نے جدید اسالیب اور جدید طرزِ احساس سے روشنی اخذ کر کے اپنے شرار کو شعلے میں بدل دیا۔ اس مشترک تعمیم کی ایک دوسری شکل مخدومؔ کے یہاں پائی جاتی ہے وہ اپنے معاصرین کی اسلوباتی تبدیلی اور جدید ترنسلوں کے نئے تخلیقی رویّوں سے اپنے فن کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ اپنے پیش رووں میں فراقؔ کی فضا سازی ادا

بصری اور لمسی پیکروں کے عمل اور آخر شب کی خواب گوں کیفیتوں اور ہجر کے تجربوں کو انھوں نے بڑی فن کاری کے ساتھ از سرِ نو دریافت کیا ہے وہ مجروح سے متاثر ضرور ہوئے ہیں لیکن بصری پیکروں کی تکرار ان کی غزل کو ایک دوسرا ہی رنگ عطا کر دیتی ہے۔ ان کی زبان مجروح سے زیادہ سیال اور رواں دواں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ان کی اپنی واردات جھلکتی ہے اور ایک المناکی کی فضا غزل پر محیط ہو جاتی ہے وہ شعر کی مجموعی صوتیات پر نگاہ رکھتے ہیں۔ کہیں الفاظ کی ابتدائی آوازوں کی یکساں تکرار یا کہیں کسی خاص لفظ کا تواتر کہیں کسی خاص فقرے کی دو اور کبھی کبھی سہ بار تکرار شعر کے ماحول کو متحرک کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ایک مشترک تعمیم کے باوجود اسلوب کی محولہ بالا صفت انھیں اپنے معاصرین سے ایک بالکل مختلف مقام عطا کرتی ہے۔

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب
سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
کوئی لیتا تھا ترا نامِ وفا آخرِ شب

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے
کوہِ غم اور گراں اور گراں اور گراں
غم زدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے
بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

سیماب وشی، تشنہ لبی، باخبری ہے
اس دشت میں گر رختِ سفر ہے تو یہی ہے
مخدوم محی الدین

غلام ربانی تاباں تراشیدہ اور چست مصرعوں کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھاتے۔ تاباں نے یہ ہنر اقبال اور میکش اکبرآبادی سے سیکھا ہے گو اقبال ایسی تہہ داری، انضباط اور معنویت تاباں کے بس کی بات نہیں تاہم غیر ضروری تلازمات سے پرہیز کی راہ انھیں اقبال ہی سے ملی ہے جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ تاباں کی غزل کا سنجیدہ اور وہ بھی نہایت سنجیدہ قماش —— کہیں کمزوری اور کہیں قوت بن جاتا ہے۔ وہ جذبے کی بلاخیزی اور بے اختیاری کا دفاع کرتے ہیں اور اظہار کی منزل سر ہونے تک تحفظ اور احتیاط برتتے ہیں۔ اگرچہ استعارے کا وہ حسن جو مغائرت سے پیدا ہوتا ہے اور جس کی ایک عمدہ مثال فیض کی شاعری ہے۔ تاباں کو اس سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ تاہم کوئی بات ہے جو تمام تحفظ، احتیاط اور دفاع کے باوجود دامنِ دل پکڑ لیتی ہے۔ دراصل ان کی ایک عمر اسی کوچے کی سیاحی میں گزری ہے شعری نزاکتوں اور روایتوں کا انھیں بخوبی علم ہے۔ ان کے معاصرین اور خود ان کا ایک دور ہنگامی خوش گمانیوں اور خالی خولی لفاظیوں کی نذر ہو چکا تھا لہٰذا اس کی تلافی کی ایک راہ انھوں نے یوں نکالی کہ صرف اور صرف غزل سے رشتہ جوڑ لیا۔ غزل ان کے لئے ایک بڑی آزمائش تھی۔ تاباں نے غزل کے رمزیاتی پیرائے کو برقرار رکھا اور کوشش یہ کی کہ گفتار برہنہ یا آرپار دکھائی نہ دے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ تاباں کے اشعار میں متداول مطابقتوں کا عمل پایا جاتا ہے اور وہ بھی بے حد مانوس لیکن سامنے کے لفظوں کو وہ اس طور پر مصرعے کی ترکیب میں ڈھالتے ہیں کہ نتیجہ عموماً غیر متوقع نکلتا ہے۔

تاباں کے بہترین اشعار میں یہ عمل موجود ہے اس لئے تاباں کی غزل بہ ظاہر جتنی بھی بنی، بچی، تلی اور جوڑ جوڑ سے کسی بندھی دکھائی دیتی ہے اتنی ہی رمز آگیں نادانستہ مگر خوش وقتی کا نمونہ بھی ہے پچھلے چند برسوں سے ان کی غزل میں ایک رمز آگیں طنز نمودار رہا ہے۔ ان کی کم آمیزی کے تئیں

یہ ایک نیک فال ہے میں سمجھتا ہوں عصری ادب کا سب سے طاقتور اور کاری اسلوب طنز ہی ہے تاباں اس کے حوالے سے اپنی غزل کو ایک نیا گراف دے سکتے ہیں۔

سکوتِ راز کہو یا سکوتِ مجبوری ۔۔۔ مگر لبوں کی جسارت تھی ناگوار کسے
یہ بھی عروجِ رنگ کا اک معجزہ سہی ۔۔۔ پھولوں کی تازگی کو فروغِ شرر کہو

بھر آئی آنکھ تو اکثر کسی کے نام کے ساتھ
مگر وہ اشک جو چھلکا گئے ہیں جام کے ساتھ
یہ منزل کی کشش ہے یا شعورِ جادہ پیمائی
بہر مشکل مذاقِ جستجو بڑھتا ہی جاتا ہے

غلام ربانی تاباں

احساس اور گھنی رمزیت جو کبھی کبھی احمد ندیم قاسمی اور بیشتر لمحوں میں جان نثار اختر کی غزل کو سرگوشیوں میں بدل دیتی ہے اور جس کا آہنگ ایک ایسی مقامیت کو راہ دیتا ہے جس کی مانوسیت میں بھی ایک طور پر نامانوسیت اور حیرت کا عنصر تہ نشین رہتا ہے، ترقی پسند غزل میں ایک نئے تجربے اور ایک نئی توسیع سے مماثل ہے۔ جان نثار اختر (خصوصاً آخری دور کی غزل) اور قاسمی کی غزل نسبتاً داخلی جنگ کی تخلیق ہے۔ ایک قطعی تماما آہنگ اور سوالوں سے بھرے پرے معاشرے اور انا کی پسپائی اور اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کے عہد کی پروردہ اور رنزائیدہ غزل، اس غزل میں آہنگ کی بلندی کے بجائے سادگی پر اصرار زیادہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی ان ابتدائی غزلوں میں مقصد و تسلسل کا دخل زیادہ ہے جس پر اقبال کی چھاپ گہری ہے۔ بعد ازاں احمد ندیم قاسمی نے اپنے لئے ایک ایسی راہ نکالی جو ان کی ذات اور داخلی وارداتوں سے ہو کر جاتی تھی اور قاسمی جس طور پر احساس کو فکر اور فکر کو احساس میں بدلتے اور خصوصاً رومانوی وارداتوں اور ماحول کو اپنی غزل کے خارجی سنجیدہ تماش میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں اس کی دوسری بہترین مثال احمد فراز ہیں۔ جان نثار اختر داخلی تجربے کی واقعیت کو احتساسی آہنگ عطا کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبہ شدید اور اس جذبے کو ادا کرنے والی زبان تاثرات سے معمور ہے۔ جدید انسان کی انا شکستگی اور داخلی پائمالی کے ساتھ ساتھ خوابوں کی ناقدری اور بے بضاعتی کا شدید احساس جان نثار کی غزل کو کئی صدموں سے دوچار کراتا ہے۔

یہ ترے جسم کی مہکار تھی یا پھولوں کی ۔۔۔ میں ترے پاس سے یا صحنِ چمن سے گزرا
یاد آئے ترے پیکر کے خطوط ۔۔۔ اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی
دور سے دیکھا تو پلکوں تک کے سائے گن لئے ۔۔۔ جیسے جیسے تم قریب آئے دھواں بنتے گئے
ذکر اک روز پلٹنے کا کیا تھا تم نے ۔۔۔ اک دیا دل کے اندھیرے میں جلا رکھا ہے

احمد ندیم قاسمی

ہر چند اعتبار میں دھوکے بھی ہیں مگر ۔۔۔ یہ تو نہیں کسی پہ بھروسہ کیا نہ جائے
سستے داموں لے تو آئے لیکن دل تھا بھر آیا ۔۔۔ جانے کس کا نام لکھا تھا پیتل کے گلدانوں پر
پہلے حقیقتوں ہی سے مطلب تھا اور اب ۔۔۔ اک آدھ بات فرض بھی کرنے لگا ہوں میں
ہم نے انسان کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا ۔۔۔ کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے
گزر گیا ہے کوئی لمحۂ شرر کی طرح ۔۔۔ ابھی تو میں اسے پہچان بھی نہ پایا تھا

جان نثار اختر

میں نے یہاں فراق گورکھپوری، شاد عارفی اور پرویز شاہدی کا ذکر دانستہ طور پر نہیں کیا۔ فراق گورکھپوری ترقی پسند سے زیادہ روایتی تھے وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ضرور ہوئے اور ہونا بھی ضروری تھا کہ فراق کا شمار اپنے عہد کے ذہین و متین اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ ترقی پسند تحریک نئی نسل کی نئی دانش کا مظاہرہ تھی۔ فراق اگر اس نسل کی آواز سے آواز ملانے کی کوشش یا لفظی حمایت بھی نہ کرتے تو جگر اور ان میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ فراق کی غزل کلاسیکی سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے اس میں تھوڑی بہت عصری بے چینیاں بھی شامل ہیں اور اشیاء کی تفہیم

اور ان سے رشتہ استوار کرنے کا طریقہ کسی حد تک نفسیاتی ہے تاہم فراق نئے جیالوں کی سی بے باکی، بلاخوفی اور سرشاری اور روش کیسے پیدا کر سکتے تھے۔ ان کی جڑیں تو ماضی میں تھیں اور ان جڑوں سے انحراف ان کے بس میں نہ تھا۔ شاد عارفی کی بلاخوفی سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے موضوعات کو وسیع کر دکھائیں گے۔ لیکن شاد بھی پرانی اخلاقیات ہی کے مارے ہوئے تھے وہ حقیقت پسند محض اس حد تک تھے کہ انھوں نے طنزیہ اسلوب اختیار کیا تھا۔ ان کے مکالماتی انداز میں رمز گہرا اور طنز تیکھا ہوتا تھا۔ تاہم ان کے مفاہیم محدود بلکہ مقامی ہو کر زیادہ رہ گئے تھے۔ ان کا یہ انداز غزل کی نسبت نظم میں زیادہ کارگر اور متاثر کن ثابت ہوا۔ غزل کے خصوص میں شاد کا مکالماتی اور طنزیہ اسلوب نیا اور چونکا دینے والا تھا مگر اس میں استقامت کے آثار کم تھے۔ اس لئے شاد ہی اس کے موجد بھی ٹھہرے اور خاتم بھی۔ پرویز شاہدی نے غزل کو بہت بعد میں اپنایا۔ ان کی غزلوں سے ان کی غزل گوئی کی بے پناہ صلاحیت کا سراغ ملتا ہے۔ پرویز شاہدی نے عصری بے چینیوں کو اپنے کلام میں جگہ دی تھی۔ آہنگ کی وہ بلندی اور لہجے کا وہ راست انداز جو ترقی پسند شعرا میں بالعموم پسندیدہ تھا۔ پرویز نے اس سے گریز اختیار کیا تاہم ان کی غزل کا ارتقا ایک خاص سطح پر جا کر رک گیا۔ وہ بھی اپنے لہجے کو توسیع اور اپنے مفاہیم کو وسعت نہ دے سکے۔

۱۹۵۰ء کے اردگرد اور اس کے بعد ایک نئی نسل ابھرتی ہے۔ ناصر کاظمی، عارف عبدالمتین، احمد فراز، حفیظ ہوشیارپوری، سلیمان ادیب، فارغ بخاری، باقر مہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، عزیز قیسی، راہی معصوم رضا، شاذ تمکنت، حسن نعیم، بشر نواز، مظہر امام، زبیر رضوی، وحید اختر، شہاب جعفری، مغیث الدین فریدی، اختر سعید، اظہار اثر اور تاج بھوپالی وغیرہ کی غزل پیش رو ترقی پسند غزل کی روایت کے اقرار سے اپنا سفر شروع کرتی ہے۔ مگر یہ اقرار ہی مکمل حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نسل کا اپنا طرز احساس، اپنی اغراض، نئی وابستگیاں اور نئے ترجیحات تھے۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے تناظر میں بڑا فرق تھا۔ اس فرق نے اظہار و اسالیب کو بھی متاثر کیا۔ غزل کا وہ کلاسیکی قماش جس کی از سر نو وضع ـــــ فیض، سردار، جذبی مجروح اور غلام ربانی تاباں کے ذریعے عمل میں آئی تھی۔ جدید نسل نے اپنی انفرادیت کا جادو اس میں جگایا۔ قفس، صلیب (یہ استعارہ فیض کی عطا ہے) زنداں اور صیاد وغیرہ منقلب استعاروں کا وہ سرمایہ جس سے ترقی پسند غزل نے طرح داری کا فن سیکھا تھا۔ نئی غزل کے لئے زیادہ کارگر ثابت نہ ہوا کہ یہ رموز علائم اپنا ایک مخصوص لسانی سیاق رکھتے تھے اور وہ سیاق آزادی کے بعد یکسر بدل گیا تھا۔ مسائل کی نوعیت بدل چکی تھی۔ اب احتجاج کی لے دھیمے پن میں اور تخلیقی تناؤ نے جگہ بنا لی تھی۔ ترقی پسندوں کے ہراول دستے میں زبردست لاابالی پن تھا۔ ان کی بغاوت میں ایک رومانی آب و تاب تھی۔ آہستہ آہستہ ان کی بوہیمین اسپرٹ میں کمی آتی گئی اور وہ ہیرو زیادہ کہلانے لگے۔ نئے شعرا ملازمت پیشہ تھے۔ ان کے اپنے گھر تھے، خاندان تھے۔ ذمہ داریاں تھیں۔ محدود وسائل تھے۔ اردو زبان کے مخالفین اور سیاسی قتالوں کے ماحول میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو نت نئے چیلنج کا سامنا تھا۔ تاہم نئے عہد کی تمام تہدیدات اور ذمہ داریوں کو صورتِ حال کو انھوں نے قبول کیا تھا اس سے کسی محاذ پر فرار اختیار نہیں کیا۔

اس نسل کی غزل میں ایک ہلکی سی ماورائی افسردگی نے بار پایا ہے۔ اس میں گھریلو پن ہے۔ تجربے مقامیت کا وہ احساس جاگزیں ہے جو مانوس بھی ہے نامانوس بھی۔ داخلی کشاکشوں کے نئے تجربات ہیں جن سے پیش رو نسل کو کم سے کم واسطہ پڑا تھا۔ نئے تخلیقی لسانی رویوں کی بنیاد پر لفظ کے خود کار عمل کے لئے گنجائشیں فراہم کی گئیں۔ نئے پیکر، نئی علامتیں خلق کی گئیں۔ لہجے میں پہلے سے زیادہ شدت اور نکیلا پن پیدا ہوا۔ ان معنوں میں نئی غزل نئے عہد کا اسلوب تھی۔ اور جس کی اپنی شناخت تھی۔

اس غزل میں خواب سازی کے ساتھ ساتھ خوابوں سے ادب جانے اور شکستِ خواب کے آثار بھی شامل ہیں۔ لہجے میں ٹھہراؤ اور جذبے پر دباؤ ہے۔ جذباتی اور نفسیاتی کشمکش کا ایک دوسرا منظر نامہ ہے۔ دبا چھپا احتجاج ہے۔ موضوعات اور مفاہیم میں وسعت ہے۔ فکر میں آزادی ہے۔ بیانیہ اور راست انداز کے بجائے کم گفتاری اور رباوانشگی ہے۔ یہ غزل اپنی آزادروش اور نئے تخلیقی کمالات کے باوصف ترقی پسند اسلوب کے اثر سے یکسر خالی نہیں ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اپنے ۲۵ سالہ دور میں اردو زبان کے شعری سرمائے میں جو کچھ اضافہ کیا ہے اسے اگر تخلیق ادب کے اعلیٰ فنی اور جمالیاتی معیار پر جانچا جائے تو اس کا بہت کچھ حصہ تاریخ اور [illegible] ہونے کے سبب سے ناقابلِ التفات قرار پائے گا اور چند مخصوص شعرا کا کلام ہی باقی رہے گا جن کی مستقل ادبی حیثیت ہے اور جن کی تخلیقات اپنے گرد و پیش کا ایسا روشن آئینہ ہیں جو ایسے عکس ہیں جنھیں بدلتے ہوئے زمانے کی رو بھی بے نور نہیں کر سکتی..... (اردو میں ترقی پسند تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی صفحہ نمبر ۱۱۳)

نشتر خانقاہی

۱

قہر تھا، ہجرت میں خود کو بے اماں کرنا ترا
دشتِ نامحفوظ اور اس میں مکاں کرنا ترا

اِس فسانے میں مرا کردار ہی گویا نہ تھا
یوں حقیقت کو مری بے داستاں کرنا ترا

چھن گیا آکاش کا خیمہ، تو شام ہجر میں
کچھ دھوئیں کے بادلوں کو آسماں کرنا ترا

اُف یہ مجبوری کہ جب سارے نشیمن جل گئے
ٹوٹنے والے شجر پر آشیاں کرنا ترا

بھولنا مشکل ہے وہ منظر کہ مجھکو ایک دن
سر پہ رکھ کر ہاتھ یوں بے سائباں کرنا ترا

بدگمانی کی خلش پیدا ہوئی تھی جن دلوں
ان دلوں کو میرے، اپنے درمیاں کرنا ترا

مستقل لاحاصلی کو اپنا حاصل مان کر،
زندگی کو لمحہ لمحہ رائیگاں کرنا ترا

۲

زندگی کو 'روشنی رفتار' ہوتے دیکھنا
شب سے نالاں، نیند سے بیزار ہوتے دیکھنا

کثرتِ دانشوراں کو قحطِ دانش جانا
وسعتوں کو دشت کی، دیوار ہوتے دیکھنا

رکنے والی ہے فشارِ دم سے نبضِ انحراف
خود کو اب سرتا بہ پا، انکار ہوتے دیکھنا

پیر صد سالے سے سنا قصۂ آسودگی
لمحہ لمحہ زیست کو دشوار ہوتے دیکھنا

دیکھنا لفظوں کو معنی سے مفر کرتے ہوئے
چپ کے عالم میں مرا اظہار ہوتے دیکھنا

تھیں جو کل تک شب گزاری کا وسیلہ ہجر میں
تم انہی یادوں کو اب آزار ہوتے دیکھنا

قصرِ کہنہ ہم: کہ کچھ محسوس تک کرنا نہیں
صرف اپنے آپ کو مسمار ہوتے دیکھنا

۳

علم کس کو تھا کہ ترسیلِ ہوا رک جائے گی
اگلے موسم تک میری نشو و نما رک جائے گی

ہو چکے گا دفعتاً ذوقِ سماعت مختلف
آتے آتے میرے ہونٹوں تک صدا رک جائے گی

تو ہی کیوں نادم ہے اتنی میرے گھر کی آبرو
کس کے سر پہ ایسی آندھی میں ردا رک جائے گی

اب تماشا دیکھنے والوں میں ہمسایہ بھی ہے
ٹوٹتی چھت میرے چلانے سے کیا رک جائے گی

کارواں کو گھیر ہی لے گا سکوتِ ریگ زار
گونجنے سے قبل ہی بانگِ درا رک جائے گی

کیا تحفظ دے سکے گی مجھ کو وضعِ احتیاط
کیا دریچے موند لینے سے بلا رک جائے گی

کل نہ ہو گا کوئی اس بستی میں میرا منتظر
کل مرے تلووں ہی میں آوازِ پا رک جائے گی

محلہ بھاٹان، بجنور (یوپی)

فروغ کی سمت میں

یوسف ناظم ● ۱۹ نیو دیپ، پلاٹ نمبر ۱۳، باندرہ ریکلیمیشن، ممبئی ۵۰

ہر تصنیف خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی اور دُبلی کیوں نہ ہو اور کتابت و طباعت کی بیسیوں غلطیوں ہی کے ساتھ کیوں نہ چھپی ہو، مصنّف کی اولادِ معنوی ہوتی ہے۔ اس اولادِ معنوی میں معنویت کا ہونا بھی ضروری نہیں اور اس لئے ضروری نہیں ہے کہ اولادِ معنوی سے ہٹ کر جو عام اولادیں ہوتی ہیں اُنکی پیدائش کے موقع پر کہا ہی جاتا ہے کہ فلاں کے گھر چاند سے بیٹے یا بیٹی کی ولادت عمل میں آئی ہے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اس اولادیں چاند کا کتنا عنصر ہوتا ہے۔ بس اسی طرح اولادِ معنوی بھی ایک استعارہ ہے اور مصنف کو بہر حال اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی اس کراؤن یا ڈیمائی سائز کی تخلیق پر ناز کرے۔ مصنف اس تخلیق پر جتنا بھی ناز کرے اسے کم سمجھا جائے گا کیونکہ اولادِ معنوی کی تخلیق کا عمل بلا شرکتِ غیرے ہوتا ہے۔ اس کا سارا کریڈٹ مصنف ہی کو جاتا ہے۔ (کریڈٹ کے لئے کوئی عمدہ لفظ تجویز کیا جانا چاہیئے اس کی جگہ جگہ ضرورت پیش آنے لگی ہے) یوں بعض مصنفیں اپنی تخلیق کے عمل کے دوران کچھ اور لوگوں کو شریکِ محفل کر لیتے ہیں لیکن کریڈٹ بہر کیف تنہا مصنف ہی کا کاپی رائٹ ہوتا ہے۔

یہ تو کتاب کا تعارف ہوا لیکن مصنف کا اصل کارنامہ یہ کتاب نہیں بلکہ اس کا تصنیف کیا ہوا پیش لفظ ہوتا ہے۔ پیش لفظ ہی اردو لغت میں وہ تنہا لفظ ہے جو نہ صرف کئی الفاظ بلکہ کئی صفحات پر مشتمل ہوتا اور کافی پریشان کن حالات پیدا کرتا ہے۔ مصنف اس پیش لفظ میں وہ تو نہیں لکھتا جو اس کے دل میں ہوتا ہے لیکن اپنا کلیجہ نکال کر ضرور رکھ دیتا ہے۔ [پڑھنے والوں کو بھی بعد میں یہی کرنا پڑتا ہے]

خود مصنف اپنی کتاب کا مقدمہ نہیں لکھ سکتا۔ مولانا حالی نے مقدمہ ضرور لکھا تھا لیکن وہ مقدمہ شعر و شاعری تھا (اس مقدمے کی کارروائی آج بھی جاری ہے۔ جس وقت یہ مقدمہ لکھا گیا اس کی نوعیت دیوانی مقدمے کی تھی لیکن اب اس نے فوجداری مقدمے کی شکل اختیار کر لی ہے) کتاب کا مقدمہ جہاں تک ممکن ہو کسی اور شخص سے لکھوایا جاتا ہے جو یا تو مصنف کا ہم کلاس ہوتا ہے یا ہم کلاس۔ حالات بہت نازک ہوں تو یہ مقدمہ کسی کہنہ مشق نقاد سے لکھوایا جاتا ہے۔ اس کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے لیکن اس طرح کہ ایک ہاتھ کی خبر دوسرے ہاتھ کو نہ ہو (دوسروں کے ہاتھ اس کی خبر پڑ جائے تو اس کی ذمہ داری دینے والے ہاتھ پر نہیں ہوتی) لیکن مصنفین کی بات چھوڑ یئے ان دنوں خود مقدمہ نگاروں کے حالات اتنے ناگفتہ بہ ہوگئے ہیں کہ ایک ادیب یا شاعر کو اپنے مجموعۂ خیالات کے لئے ایک نہیں، دو تین مقدمے تحفتاً مل جاتے ہیں اور یہ اپنی کتاب میں وہی مقدمہ لگاتے ہیں جو خود انہیں پسند آئے (اس عمل کا نام مقدمہ شناسی ہے) کہا جاتا ہے کچھ مقدمے تو ایسے معرکتہ الآرا لکھے گئے ہیں کہ خود ممدوح نے حیرت سے دانتوں میں انگلی دبالی کہ وہ برصغیر کے اتنے کبیرادیب تھے (یعنی اب بھی ہیں) اور خود انہیں اس کی خبر نہ تھی۔ قارئین کی [رائے اس سے مختلف ہی نہیں اس کی متضاد ہوتی ہے]

مقدمہ نگار کے اختیارات پہلے ہی سے کافی وسیع ہوتے ہیں لیکن وہ خود بھی ان میں وقتاً فوقتاً اپنی ضرورت کے مطابق ان اختیارات میں توسیع کرتا رہتا ہے اس لئے اس کا لکھا ہوا مقدمہ ایک مختصر مضمون بھی ہو سکتا ہے اور ایک طویل مقالہ بھی۔ مختصر مقدمے میں مقدمہ نگار، مصنف کے خاندانی حالات (جن سے وہ واقف نہیں ہوتا) مصنف کا شجرہ (جو سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے کیونکہ جب سے اخلاف نے اسلاف کا نام روشن کرنا ترک کر دیا ہے شجرے بھی متروک ہوگئے ہیں)۔ مصنف سے اس کے اپنے تعلقات (جو اتنے ہوتے نہیں ہیں جتنے کہ بیان کئے جاتے ہیں) مصنف کے اہل و عیال کے نام اور ان کی غلط عمریں، بیوی (یا شوہر) کی ایسی خصوصیات جن پر اب تک کسی کی نظر نہیں پڑی، اور اس نوعے کی چند اور باتیں جو کسی اور جگہ زیب نہیں دیتیں، درج کی جاتی ہیں۔ مقدمہ نگار کا جی چاہے تو وہ ان چیزوں میں سے چند کو حذف بھی کر سکتا ہے کیونکہ مختصر سے مقدمے کو زیادہ بوجھل

اور خشک بنانے میں کوئی خاص فائدہ ہوتا نہیں ہے۔ بوجھل مقدمے قارئین کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔

مختصر مضمون کے برعکس، مقالہ نما مقدمہ، ادب اور زبان کے حالات و کوائف کے علاوہ ادب کے آثارِ قدیمہ کی تاریخ و جغرافیہ اور ادب کی موجودہ رفتار (جو ادب میں جمود طاری ہونے کے باوجود برقرار رہتی ہے) اور ادب کے مستقبل اور اس کی ترقی کے روشن امکانات وغیرہ جیسے اہم اور قبولِ عام امور پر مشتمل ہوتا ہے اور مقدمہ نگار ان امور پر اتنا کھل کر لکھ سکتا ہے کہ خود اس کے کھل جانے کی وجہ سے قارئین کی سلامتی کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس مقالہ نما مقدمے میں مقدمہ نگار کا جی چاہے (اس کا جی کیا نہیں چاہتا) تو وہ کتاب کے مصنف کو کسی بھی گزشتہ یا حاضر ادیب سے ٹکرا دے اور مصنف کو فاتح قرار دے [مقدمہ نگار کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا]

پیش لفظ میں مصنف یہ سب کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ پیش لفظ کسی پرائمری اسکول یا ٹریننگ ہوم کی افتتاح کی تقریب نہیں ہوتی کہ افتتاح کرنے والا شخص خود ہی ربن کاٹے اور خود ہی تالی بھی بجائے۔ پیش لفظ تنگنائے غزل کی طرح کی چیز ہوتی ہے۔ مضامین تو اس میں طرح طرح کے باندھے جا سکتے ہیں لیکن تعلّی کی اجازت صرف مقطع میں ہوتی ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مصنف اپنی علمی قابلیت کے علاوہ مدرسے اور کالج کے زمانے کی اپنی بے پناہ مقبولیت کی وجہ کے بارے میں ایک تحریری بیان دے۔ جس طرح بعض مقدمے معیاری مانے گئے ہیں اسی طرح چند پیش لفظ بھی غیر معمولی سمجھے جاتے ہیں۔ اچھے پیش لفظ وہ ہوتے ہیں جن میں مصنف مندرجہ ذیل امور و واقعات کی وضاحت کرتا ہے۔

(۱) وہ ادیب یا شاعر کیوں بنا؟ خود اپنی مرضی سے بنا یا کسی کے حکم کی بنا پر اسے یہ کام کرنا پڑا یعنی یہ واردات خود سوزی کی ہے یا آتش زنی کی۔

(۲) اس نے اپنا پہلا مضمون دودھ کے دانت گرنے سے پہلے لکھا یا سارے دانت گرنے کے بعد۔

(۳) مضمون نگاری یا شعر گوئی کے آغاز پر اس کے گھر والوں نے اس کی خوب خبر لی یا اب تک انہیں خبر ہی نہیں ہوئی ہے۔

ان سارے معاملات کو مصنف اگر اپنے لکھے ہوئے پیش لفظ میں مختلف پیراگراف میں ترتیب وار پیش کرے اور لکھتے وقت حتی المقدور املا و انشا کا خیال رکھے تو کوئی وجہ نہیں کہ (دو چار) قارئین اسے پسند نہ کریں۔ پیش لفظ کی چونکہ خاصی اہمیت ہوتی ہے اس لئے سمجھدار شعراء اپنے کلام پر نظرثانی کریں یا نہ کریں اپنے پیش لفظ کو کئی بار پڑھتے اور آخر وقت تک اس کی مرمت کرتے رہتے ہیں۔

ادب میں چونکہ کوئی معینہ قواعد و ضوابط نہیں ہیں اس لئے بعض صورتوں میں پیش لفظ بھی مقدمے کی طرح کسی اور شخص سے قلمبند کروا لیا جاتا ہے ایسی صورت میں پیش لفظ رقم کرنے والے شخص یعنی ادیب کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کا پیش لفظ مقدمے کی نوعیت اختیار نہ کر لے۔ یہ ذرا نازک کام ہوتا ہے لیکن اتنا نازک بھی نہیں کہ کوئی ادیب اسے کر ہی نہ سکے۔ پیش لفظ اور مقدمے میں وہی فرق ہے جو پلاؤ اور بریانی میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پیش لفظ اور مقدمے کا ذائقہ دار ہونا ضروری نہیں ہے پیش لفظ لکھنے کے لئے شاعر، ادیب، معلم یا کوئی سوشل ورکر ہونا کافی ہے لیکن مقدمہ نگار کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ وہ نقاد ہو۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ منتخب مقدموں کے مجموعے تو مل جاتے ہیں لیکن آج تک ایسا کوئی مجموعہ نہیں شائع ہوا جس میں صرف پیش لفظ ہی پیش لفظ ہوں۔ حالانکہ یہ بھی شائع ہو سکتا تھا کیونکہ ادب میں کیا چیز شائع نہیں ہو رہی ہے۔ ایسے کسی مجموعے کی اشاعت کی طرف کوئی ناشر غالباً اس لئے متوجہ نہیں ہوا کہ ایک ہی شخص کے تصنیف کئے ہوئے پیش لفظ تعداد میں اتنے کم ہیں کہ ان کی کتاب نہیں بن سکتی اور خود مصنفین کے اپنے لکھے ہوئے پیش لفظ تو اور بھی کم ہیں۔ پانچ چھ جز سے کم کی کتاب چھاپ کر کوئی ناشر کیا بنائے گا اور کیا نچوڑے گا۔ ناشروں کے متعلق یوں بھی کئی بڑی بڑی باتیں مشہور ہیں مثلاً یہی کہ وہ ادیبوں کو نچوڑنے میں مطلق تکلف نہیں کرتے۔ ہماری رائے چونکہ ادیبوں کے بارے میں اچھی نہیں ہے اس لئے ہم ناشروں سے متعلق کوئی فقرہ، خواہ وہ مبنی بر حقیقت ہی کیوں نہ ہو، سننے کے لئے رضامند نہیں ہیں۔ ویسے ہمارے کان کھلے ہیں جس کا جو جی چاہے بول لے ______ ناشر بہر حال ناشر ہوتے ہیں اور اب تو خود ناشر بھی پیش لفظ لکھنے لگے ہیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ ناشر جب بھی کوئی پیش لفظ لکھے گا اس میں مصنف کی تعریف ہی کرے گا۔

جن لوگوں کو پیش لفظ لکھنے کا وقت نہیں ملتا (اور جنہیں کچھ لکھے بغیر چین نہیں آتا) وہ چند جملے ضرور لکھ دیتے ہیں۔ اسے فلیپ کی تحریر کہا جاتا ہے۔ آج کل ہر کتاب میں دو چھوٹے فلیپ اور ایک بڑا فلیپ ضرور ہوتا ہے۔ سرورق کے اندرونی حصے (جنہیں استر بھی کہا جا سکتا ہے) چھوٹے فلیپ

[باقی صفحہ ۸۱ پر دیکھئے]

حامدی کاشمیری

۱

کون تاریک عذابوں میں نہ تھا
حرفِ رخشندہ کتابوں میں نہ تھا

وادیوں میں بھی چلی تھی وہ ہوا
نزہت و نور گلابوں میں نہ تھا

لے گئی کتنوں کو پانی کی صدا
کوئی سنسان سرابوں میں نہ تھا

ایک چہرہ بھی نہ پہچان سکے
کوئی بھی چہرہ حجابوں میں نہ تھا

باعثِ خوف تھی کیوں گل ریزی
یہ تو موسم کے عتابوں میں نہ تھا

حرف کاری کی کرامت دیکھو
ایسا پیکر مرے خوابوں میں نہ تھا

۲

ناخوشی کا سبب نہیں کوئی
دور و نزدیک اب نہیں کوئی

سر ہتھیلی پہ رکھ کے بیٹھے ہیں
بزم میں بے ادب نہیں کوئی

انجمادِ حروف کیا ٹوٹے
سامنے شعلہ لب نہیں کوئی

مثلِ انجم رفیقِ شب ہیں سبھی
واقفِ دردِ شب نہیں کوئی

ان کو پہچاننا نہیں مشکل
ان کا نام و نسب نہیں کوئی

کیسی آوازیں، کن کے سائے ہیں
میرے کمرے میں جب نہیں کوئی

۳

ہم کہاں کنج نشینوں میں رہے
آسمانوں میں، زمینوں میں رہے

راہیں بے وجہ منوّر نہ ہوئیں
رات خورشید جبینوں میں رہے

تھا فلک گیر تلاطم شب کا
ہم ستاروں کے سفینوں میں رہے

جسم سے سانپ نکل آتے ہیں
ایک دو پل ہی دفینوں میں رہے

تم کو اصرار ہے خالی یہ مکاں
ہم شب و روز مکینوں میں رہے

سبز دائم شجرِ حرف اُگے
عمر بھر شورہ زمینوں میں رہے

● صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر۔ (جموں کشمیر)

نوری نستعلیق

جمیل نقوی ● اے ۱۱۹- بلاک جے - شمالی ناظم آباد کراچی - ۳۳ (پاکستان)

کسی[1] نے سچ کہا ہے کہ ہر ایجاد کے پیچھے ایک ضرورت کارفرما اور ایک تخلیقی ذہن یا کئی تخلیقی اذہان موجود ہوتے ہیں۔ آج کے سائنسی دور میں ترقی پذیر اور ترقی یافتہ، دونوں اقوام کی یہ کوشش ہے کہ وہ وسعتِ علم، صنعتی اختصاص، فراوانی وارتکازِ معلومات اور نت نئی ایجادات کے میدان میں سبقت لے جائیں اور خود کو برق رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے زمانے سے ہم آہنگ رکھیں اور یہی جذبہ ایجادات کا محرک ہے۔

سائنسی ایجادات کے اس ماحول میں ایک ایسی ایجاد رُونما ہوئی ہے جو سراسر انسانی بہبود کے لئے ہے۔ جس کا تکنیکی طور پر غلط استعمال ہو ہی نہیں سکتا۔ میری مراد "نوری نستعلیق" سے ہے۔

"نوری نستعلیق" کیا ہے ؟

- کمپیوٹر کے ذریعے نستعلیق رسم الخط میں اردو کتابت کا جدید ترین طریقہ۔
- فنِ خطاطی، اردو زبان اور صنعتِ طباعت کی ایک تاریخ ساز خدمت۔
- ایک قومی اہمیت کی عہد آفریں ایجاد، جسے پاکستانی ذہن اور مغرب کی تکنیکی مہارت نے جنم دیا۔

اس ایجاد نے ہماری قومی زبان اردو کے روائتی حسین اور خوش نما رسم الخط کو تجارتی عمل کے ذریعے بتدریج مسخ ہونے سے بچا لیا ہے اور ساتھ ہی خطِ نستعلیق کی تمام روائتی خصوصیات اور مابہ الامتیاز دلکشی کو بجنسہٖ کمپیوٹر کی یادداشت میں سمو کر ہمارے اس قیمتی ثقافتی سرمائے کو رہتی دنیا تک محفوظ کر دیا ہے، اور بقول شخصے "اردو زبان و ادب کی ترقی میں جو کئی نوری سال حائل تھے، نوری نستعلیق نے اُن نوری سالوں کو پلک جھپکتے عبور کر لیا"

اس ایجاد سے اردو زبان و ادب اور ہماری قومی زبان میں تعلیم کے فروغ کا ایک نیا افق رُوشن ہو گیا ہے اور نوری نستعلیق کے منظرِ عام پر آنے سے اردو زبان کی ٹھوس ترقی کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور اس کی بدولت ہم اب علم و خبر کی دنیا میں پیچھے نہ رہیں گے۔ طباعت میں سُرعت کے ساتھ نہ صرف ہماری سوچ کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی اور علم و دانش کی ایک نئی لہر اٹھے گی بلکہ سوچنے اور لکھنے والوں کی ذمہ داریاں بھی علیٰ ہذا القیاس بڑھ جائیں گی۔ تصنیف، تالیف اور ترجمے کے ذریعے جدید ترین مسائل و موضوعات پر اردو مطبوعات بروقت سامنے آسکیں گی اور اس طرح نوری نستعلیق اردو زبان کو موجودہ دور کے سائنسی و تکنیکی رجحانات سے ہم کنار کرنے کا ایک شاندار ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

نوری نستعلیق کو ہمارے ادیبوں، دانش وروں اور صنعتِ طباعت سے وابستہ حضرات نے ایک ایسا نادر کرشمہ کہا ہے جو اس کے موجد نے انجام دے کر ہمیں وہ تمام سہولتیں بہم پہنچائی ہیں جن کا اس سے بیشتر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انقلاب آفریں ایجاد اردو کتابت و طباعت کے لئے نیک فال ہے اور اس برقی طریقۂ کتابت کی ایجاد سے اردو طباعت کی تاریخ کے صدیوں پرانے خواب کی تکمیل ہوتی ہے

---

[1] گزشتہ دو سال کے دوران اس موضوع پر خود میں نے اور دوسروں نے بہت لکھا ہے۔ اس مضمون کی تیاری میں تمام مطبوعہ مواد سے استفادہ کیا گیا ہے۔

نوری نستعلیق یعنی کمپیوٹر سے اردو کتابت نے خطِ نستعلیق کی رعنائی و زیبائی کو برقرار رکھتے ہوئے اردو کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں سے ترقی کی منزلیں زیادہ روشن نظر آنے لگیں اور بقول شخصے ساتھ ہی اسے ہمارے عہد کی رفتار بھی عطا کر دی ہے ۔

نوری نستعلیق بلاشبہ ایک نہایت قابلِ قدر اور تاریخی نوعیت کا کارنامہ ہے اور ہمارے ادب و صحافت بلکہ ہماری ثقافتی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔

یہ ایجاد میدانِ علم و ادب میں جرس کارواں سے کم نہیں ۔ اس نے اردو طباعت و اشاعت کے ایک بڑے خلا کو پُر کیا ہے ۔ اب اردو ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں ایک باعزت مقام پر آ کھڑی ہو گی اور اس ایجاد کی وجہ سے اردو ادب کو جو فروغ حاصل ہو گا اس کو احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے ۔

نوری نستعلیق دراصل خطِ نستعلیق کا نہیں بلکہ اردو کتابت کے طریقۂ کار کا ارتقا ہے اور مشینی طریقۂ کتابت ایجاد کرنے کی تقریباً ڈھائی سو سال کی کوششوں کا نقطۂ عروج ہے ۔ جس میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا خطِ نستعلیق کے ان تمام روایتی محاسن کو برقرار رکھا گیا ہے جو اساتذۂ فن کے صدیوں کے ریاض کا نتیجہ ہیں اور جس کی جاذبیت و مقبولیت میں باوجود شدید مخالفتوں کے آج تک کوئی فرق نہیں آیا ۔ اس تہذیبی ورثے کو کمپیوٹر کے حافظے میں منتقل کر کے احمد مرزا جمیل نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا ہے ۔

نوری نستعلیق کی ایجاد سے پہلے ہم اردو طباعت کے شعبے میں مستقل پسماندگی کا شکار تھے اور یہ پسماندگی بالواسطہ ہماری قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی اور ابھی تک ہے ۔

نوری نستعلیق کی ایجاد اردو زبان کی ایک لازمی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو جناب احمد مرزا جمیل (تمغۂ امتیاز) نے محسوس کیا ۔ محسوس تو سب ہی عرصۂ دراز سے کرتے چلے آ رہے تھے لیکن موصوف نے اس اہم ضرورت کو عملی طور پر پورا کر کے نہ صرف پاکستان اور بھارت بلکہ ساری دنیا میں کروڑوں اردو بولنے ، لکھنے اور پڑھنے والوں کو نوری نستعلیق کا تحفہ دے کر مسرت آمیز حیرت سے دوچار کر دیا ہے ۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا خطّاطی کے سلسلہ میں یہ ریمارک جناب احمد مرزا جمیل پر صحیح صادق آتا ہے کہ " خطّاطی ہماری میراث ہے لیکن میراث کو اپنے حال اور مستقبل کا حصّہ بنانے کے لئے تخلیق کی ضرورت ناگزیر ہے اور تخلیق ہزاروں دروازے اپنے لئے کھولتی ہے اور اپنے لئے آدمی کو خود چُن لیتی ہے ۔"

جناب احمد مرزا کو بھی خطّاطی نے (نوری نستعلیق کے حوالے سے) اپنے لئے چُن لیا اور آج وہ ان موجدوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں جو نسلِ انسانی کے محسن کہلاتے ہیں ۔ وہ لوگ جن کے دل سمندر اور حوصلے آسمان ہوتے ہیں وہی اپنی ذات سے ماورا سوچ سکتے ہیں اور پھر ایسے لوگوں کا نام بھلانا اور جریدۂ عالم سے مٹانا ناممکن ہو جاتا ہے ۔ احمد مرزا جمیل کا نام بھی انھیں مخصوص ناموں کے زمرہ میں لکھا جا چکا ہے ۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سچ کہا ہے کہ " فن ہو یا زندگی ، افراد ہی کے مرکب پر سوار ہو کر آگے بڑھتے ہیں ، ان کے لئے کوئی اور مرکب اب تک دریافت نہیں ہو سکا ۔ قدیم ہو یا جدید ، اپنے اظہار یا اقتدار کے لئے فرد کا محتاج ہے کسی اور کا نہیں اور فرد کی اہمیّت سے انکار کرنا جہالت بھی ہے اور ظلم بھی ۔"

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بقول مقبول جلیس " ہماری مردہ پرست قوم نے اتنے بڑے کارنامے پر اس کے موجد کی وہ پذیرائی نہیں کی جس کے وہ مستحق ٹھہرے ہیں ۔ ہماری کور ذوقی یا بے حسی اپنی جگہ لیکن آنے والے زمانے میں ہر روز سورج کی پہلی کرن آج جس طرح ہمارے دوسرے محسنوں کو سلام پیش کرتی ہے اسی طرح کا سلام اب احمد مرزا جمیل کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے ۔ تاریخ کے ہاتھوں میں جو میزانِ عدل ہے ، اسے کون چھین سکتا ہے ۔"

اگر احمد مرزا جمیل کی اس نادر عصر ایجاد " نوری نستعلیق " سے کما حقہٗ استفادہ کیا گیا تو یہ عہد آفریں ایجاد ان شاعروں ، ادیبوں ، علما

مفکروں اور دانش وروں سے تا قیامت خراجِ تحسین وصول کرتی رہے گی جن کی تخلیقات و افکار ذہن سے قلم تک کو پہنچ جاتے ہیں لیکن طباعت کی راہ میں دوسری بے شمار دشواریوں کے علاوہ کتابت کی سُست رفتاری ان کو منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے میں حائل رہتی ہے۔

ہم ایک مشینی دَور میں سانس لے رہے ہیں۔ سائنس اور نفسیات نے ہمارے ذہن و فکر کو نئی وادیوں اور نئے زاویوں سے آشنا کیا ہے نئی حقیقتیں برابر سامنے آ رہی ہیں جنھوں نے جانی پہچانی حقیقتوں کو اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ سائنسی اور صنعتی ترقی کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ انسان کو اس کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا ہے۔ طباعتی صنعت بھی اس تیز رفتاری سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اردو کے حوالے سے جہاں تک طباعتی صنعت کا تعلق ہے ہم آج بھی ازمنۂ وسطیٰ سے آگے نہیں بڑھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی، صنعتی، سائنسی ادب اردو زبان میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ محدود طبقہ مغربی زبانوں سے جدید معلومات حاصل کرتا ہے اور اگر ان جدید معلومات کو اردو کے قالب میں ڈھال کر چھاپنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے تو کتابت کی سُست رفتاری کی وجہ سے مذکورہ معلومات عوام تک پہنچتے پہنچتے اتنی پرانی ہو جاتی ہیں کہ ان کی افادیت صفر رہ جاتی ہے۔

علمی، صنعتی، سائنسی، اقتصادی، معاشی اور فنی شعبوں میں اسی وقت قومی ترقی ممکن ہے کہ قومی زبان میں تازہ ترین علمی مطبوعات صحیح وقت پر مہیا کی جا سکیں۔ چین، جاپان اور دوسرے مشرقی ممالک کی مثال سامنے ہے۔

اگر طباعتی صنعت قومی اور نجی سطح پر نوری نستعلیق ـــــ کمپیوٹر سے اردو کتابت ـــــ کو قبول کر لے تو اس مشینی خطّاطی کے نتیجہ میں اردو طباعت کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی جائے گی اور تعلیم کے فروغ میں معاون ثابت ہو گی۔

جناب احمد مرزا جمیل نے نوری نستعلیق کو اپنے والد بزرگوار مرزا نور احمد مرحوم کے نام سے منسوب کیا ہے۔ مرزا صاحب مرحوم برِّ صغیر پاک و ہند کے مشہور مصوّر تھے اور ساتھ ہی نسخ و نستعلیق لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل رنگین لتھوگرافی کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ طغریٰ نویسی میں کمال حاصل تھا۔ ہمیں جہاں تک علم ہے وہ پاک و ہند میں سب سے پہلے مصوّر تھے جنھوں نے مصوّری و خطّاطی کی آمیزش سے مصوّر طغریٰ نویسی کا آغاز کیا اور یہ اہتمام کیا کہ مصوّرانہ تقاضوں کی وجہ سے خطّاطی کے کلاسیکل بیس پر آنچ نہ آنے پائے اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ ان کے بنائے ہوئے طغرے، جو غالباً اپنی نوعیت کی پہلی مثال تھے، بے حد مقبول ہوئے۔ اور مصوّری و خطّاطی کا نادر نمونہ قرار دیئے گئے۔

جناب مرزا نور احمد مرحوم کے سلسلہ میں یہ واقعہ خاص طور پر قابلِ بیان ہے کہ مرحوم نے وفات سے کچھ عرصہ قبل قرآنِ کریم کی کتابت شروع کی تھی۔ ابھی بمشکل نو سیپارے ہی لکھنے پائے تھے کہ اپنے خالق سے جا ملے اور مرزا جمیل نے ایک خاص طریقہ اختیار کر کے (جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے) اس کتابُ الہُدیٰ کو مکمل کر لیا اور آج کل زیرِ طباعت ہے۔

جناب احمد مرزا جمیل خود بھی ایک منجھے ہوئے آرٹسٹ اور جے جے اسکول آف آرٹس کے فارغ التحصیل ہیں۔ بچپن ہی سے فائن آرٹس کی طرف متوجہ رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں مصوّری کے مقابلوں میں انعامات حاصل کیے۔ فلم اسٹوڈیوز میں آرٹ ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیئے۔ اپنا ایک آرٹ کا ادارہ کلکتہ میں قائم کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے اور ۱۹۵۱ء میں ایلیٹ پبلشرز کی داغ بیل ڈالی جو اب پاکستان کے چوٹی کے طباعتی اداروں میں شمار ہوتا ہے، خصوصاً رنگین چھپائی میں اس کا کوئی مدِّ مقابل نہیں۔

نوری نستعلیق کے خیال نے کس طرح ایک زندہ جاوید ایجاد کا روپ دھار لیا، اس اجمال کی تفصیل خود اس کے موجد جناب احمد مرزا جمیل کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔ موصوف کی بیان کردہ یہ تفصیلات اردو کتابت و طباعت کے تاریخی ارتقا پر آئندہ کام کرنے والوں کے واسطے ایک مستند دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ انھوں نے فرمایا۔[1]

"قبل اس کے کہ میں نوری نستعلیق کی کہانی خود اپنی زبانی آپ کے گوش گزار کروں، میں نہایت خلوص و انکسار کے ساتھ عالی مرتبت

---

[1] احمد مرزا جمیل کی اس تقریر کا اقتباس جو انھوں نے ۱۰ مئی ۱۹۸۲ء کو راولپنڈی کے ایک شاندار استقبالیہ میں کی تھی۔

صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق بالقابہ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ موصوفِ محترم نے میری کاوش نوری نستعلیق کو "قومی اہمیت کی ایجاد" کا درجہ عطا کرتے ہوئے مجھ ناچیز کو تمغۂ امتیاز کے قومی اعزاز سے سرفراز فرمایا۔

صدیوں سے اردو کتابت ہاتھ سے کی جا رہی ہے۔ مایۂ ناز خطاطوں نے سات سو برس سے اس رسم الخط کے جاذبِ نظر حسن میں اضافہ کرنے اور اسے ایک عظیم ورثے کی طرح ہم تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں ان مایۂ ناز فن کاروں کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں مشینوں کے ذریعے کتابت کا دور آیا تو خطِ نستعلیق مشینوں کی ساخت اور مزاج کے لیے ناموزوں ثابت ہوا۔ انگریزوں نے اس رسم الخط کی مقبولیت کے پیشِ نظر ۱۸۴۳ء سے اسے دھات کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی کچھ کامیابی بھی ہوئی لیکن خطِ نستعلیق کی نزاکت مشین کی ضروریات کی تاب نہ لا سکی سارے تجربے ناکام ہو گئے۔ نستعلیق ڈھالنے کا آخری تجربہ ۱۹۳۰ء میں برطانوی ہند کی سابق اسلامی ریاست حیدر آباد دکن میں کیا گیا جو فنی لحاظ سے کسی حد تک کامیاب رہا لیکن تجربے کی حد سے آگے بڑھ کر عملی شکل اختیار نہ کر سکا ۔

نستعلیق ٹائپ بنانے کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب علاوہ اور وجوہات کے لیتھو چھپائی کی مقبولیت بھی تھا اور اسی کی بدولت کتابت کا پرانا طریقہ آج بھی جاری ہے۔ حالاں کہ تیز رفتاری کے اس دور میں قلم سے کتابت جیٹ طیارے کی جگہ بیل گاڑی میں سفر کرنے کے مترادف ہے۔

طباعت کی صنعت سے وابستگی کے ساتھ میرا یہ عزم روز بروز پختہ ہوتا گیا کہ اس رکاوٹ کو دُور کرنے کے لیے جو اردو کتابوں کی سُست روی کی وجہ سے ہماری قومی تعلیمی ترقی کی راہ میں حائل ہے، کچھ کیا جائے۔ میں نے فوٹو میکانکی ساز و سامان کے ساتھ کئی تجربے کیے لیکن جمالیاتی ذوق کی تسکین تو ایک حد تک امید افزا تھی لیکن رفتارِ کتابت کو تیز کرنے کے سلسلے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

آخر کار جناب مطلوب الحسن سیّد کی رفاقت میں اللہ کے فضل و کرم سے کامیابی ہمارا مقدر بن گئی اور اردو خطاطی و کتابت کا کمپیوٹری نظام آج ایک حقیقت بن گیا ہے۔ اسے نوری نستعلیق کا نام دیا گیا ہے۔ یہ نام ابّا جان مرزا نور احمد کے نام کی نسبت سے رکھا گیا ہے مرحوم اپنے عہد کے ایک عظیم خطاط اور آرٹسٹ تھے۔

جب نوری نستعلیق کا بنیادی تصور بالکل واضح ہو گیا تو ٹائپ سیٹنگ مشینیں بنانے والے مختلف اداروں کو خطوط لکھے گئے۔ ان سے بالمشافہ گفتگو کی گئی۔ دورانِ گفتگو ایک انگریز نے طنزیہ انداز میں کہا کہ آپ کی زبان کا لکھنا بہت مشکل ہے، آپ اس طریقہ کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ میں نے جواب دیا کہ محترم! آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن جب دو سو برس آپ ہم پر مسلّط رہ کر ہماری زبان کو نہ بدل سکے۔ ہاں، انگریزی زبان کو تو سرکاری زبان کے طور پر آپ نے مسلّط کر دی لیکن اردو زبان یا اس کے رسم الخط کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ آپ نے رومن رسم الخط بھی رائج کرنے کی کوشش کی مگر اسے ہماری قوم نے قبول نہیں کیا۔ اب تو بہت دیر ہو گئی۔

بہر حال یورپ کے مشہور مشین سازوں کی مشینیں دیکھنے کے بعد یہ طے پایا کہ برطانیہ کی مونوٹائپ کارپوریشن کی "لیزر کومپ" مشین رد و بدل کے بعد میرے مقصد کو پورا کر سکتی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں راضی کیا کہ ایک صفحہ تجربہ کے طور پر کمپوز کر کے تو دیکھیں۔ مونوٹائپ کے ڈائرکٹر صاحبان نقصان کے خوف سے جھجک رہے تھے۔ جب انھیں یقین دلایا گیا کہ اگر یہ پراجکٹ ناکام ہو گیا تو اس کا نقصان میں ادا کروں گا۔ ردّ و قدح کے بعد وہ تیار ہو گئے۔ خدا کے فضل و کرم سے نمونہ کامیاب رہا۔

جس وقت تفصیلی بات چیت ہوئی تو مونوٹائپ کی ٹیکنیکل کمیٹی نے کہا کہ کتابت کے اس کام میں پانچ سال لگیں گے۔ مزید دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ کمپیوٹر کی پروگرامنگ یعنی کمپیوٹر کے حافظے میں ترسیموں LIGATURES کو محفوظ کرنے اور مختلف سائز میں کمپیوٹرائز کرنے کا کام ڈیڑھ سال میں مکمل ہو گا۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ اگر یہ کام دو یا تین شفٹوں میں کیا جائے تو مدّت کم ہو سکتی ہے میں نے ان سے پوچھا کہ کیا چھ مہینوں میں وہ اپنا کام مکمل کر سکتے ہیں؟ تو انھوں نے یہ سوچ کر کہ جمیل پانچ برس سے پہلے تو پلٹے گا نہیں چھ مہینے میں

اپنا کام پورا کرنے کی ہامی بھر لی۔ میں نے کہا کہ میں بھی چھ مہینے ہی میں اپنا کام کر کے دے دوں گا۔ بات ایک طرح مقابلہ بازی کی آ گئی میرے رفیقِ کار مطلوب الحسن سیّد نے ترسیمے مہیا کرنے کا کام اپنے ذمّہ لے لیا اور انھیں آخری شکل دینی شروع کر دی۔ اب ترسیموں کی تشکیل و کتابت کا سوال پیدا ہوا۔ میرے ذہن میں تھا کہ میں کراچی یا پاکستان کے بیس اچھے خوش نویس ہر قیمت پر اپنی فیکٹری میں بلوا لوں گا۔ اگر ایک خوش نویس نے بیس پچیس ترسیمے روز لکھے تو ڈھائی سو تین سو روزانہ کے حساب سے چھ ماہ میں سارے ترسیمے مکمّل ہو جائیں گے۔ کراچی پہنچ کر جب کاتبوں سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مختلف استادوں کے شاگرد ہیں۔ ہر ایک اپنے طرز پر لکھتا ہے۔ لہٰذا سب کی تحریریں یکساں ہونا ناممکن ہے اور تحریر کی یکسانیت ترسیموں کی کتابت کے لئے ایک بنیادی اور ناگزیر ضرورت ہے۔ اب میرے اوسان خطا ہونے شروع ہوئے اور میں نے کہا کہ پھنس گئے۔

ایک کاتب سے میں نے پوچھا کہ اس طرح کے ترسیمے لکھنے ہیں تو کہنے لگے کہ ایک دن میں پچاس لکھ دوں گا۔ میں نے جب بتایا کہ پون انچ قط کے قلم سے ۱۰ × ۱۰ انچ کے سائز میں لکھا جانا ہے تو کہنے لگے کہ پھر تو ایک دن میں پانچ دس ہی لکھے جائیں گے۔

اس کے بعد میں نے تفصیل سے سمجھایا کہ کمپیوٹر کے لئے ڈیزائن کی ضروریات کیا ہوتی ہیں۔ میں نے ہاکی گراؤنڈ کی مثال دی کہ گیند کس طرح ایک احاطہ میں چلتی ہے۔ کھیل کہاں سے شروع ہوتا ہے، کہاں کہاں باؤنڈریاں ہیں اور اگر گیند وہاں تک گئی تو سیٹی بج جائے گی۔ کہاں آف سائڈ ہے، کہاں ڈی ہے، کہاں گول ہے اور کہاں پینلٹی کارنر ہے۔ جب اس طرح سے سمجھایا تو کہنے لگے، دو دن میں ایک لکھوں گا۔ اس پر میں نے سوچا کہ انگریز صحیح سوچتا تھا کہ یہ پانچ برس سے پہلے واپس نہیں آ سکتا۔

کامیابی کے قریب تر پہنچنے کے بعد ساری عمارت ڈھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ سب کچھ ٹھپ ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ "کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک"۔ پانچ سال میں تو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔

مطلوب الحسن سیّد صاحب نے کہا کہ جمیل! یہ سب کچھ تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ ورنہ بھول جاؤ اور بات ختم کرو۔ بڑا نازک مرحلہ درپیش تھا۔

آخر اللہ کا نام لے کر میں نے خود ہی ترسیموں کی کتابت کا کام شروع کر دیا اور چھ مہینے میں سترّہ ہزار ترسیمے نستعلیق کے روائتی حُسن کو قائم رکھتے ہوئے مکمل کر کے مونوٹائپ کارپوریشن کے حوالے کر دیئے۔ ہر شخص حیرت میں تھا کہ آخر یہ کیا جادوگری ہو گئی۔ البتہ چھ مہینے مجھے اٹھارہ بیس گھنٹے مسلسل روزانہ کام کرنا پڑا۔

بات آگے بڑھانے سے پہلے یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ نوری نستعلیق، خطِ نستعلیق کا ارتقا نہیں بلکہ خطِ نستعلیق میں کتابت کے طریقۂ کار کا ارتقا ہے۔

نستعلیق رسم الخط کی تحریر میں جوڑ توڑ ممکن نہیں۔ اس میں ابتدائی، درمیانی اور آخری جگہیں اور امتزاجی ترکیبیں، عمودی اور اُفقی طور پر بہت مختلف ہوتی ہیں۔ چنانچہ آج تک اردو طباعت کے لئے قلمی کتابت پر ہی انحصار کیا جاتا رہا ہے۔ نوری نستعلیق نے جوڑوں کے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے جو اردو (نستعلیق) رسم الخط کو مشینی بنانے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ میں اس بات کو یوں کہتا ہوں کہ اردو کے اس رسم الخط کو جوڑوں کے درد سے نجات مل گئی۔

نوری نستعلیق میں الفاظ کو لگیچر یعنی ترسیموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اردو کے کم و بیش تمام الفاظ کو دو حرفوں سے لے کر آٹھ حرفوں تک کے ترسیموں میں منتقل کر دیا گیا ہے اور اب یہ ترسیمے ایک سادہ keyboard یعنی کلیدی تختے کے ذریعے تقریباً ڈھائی لاکھ الفاظ کی صورت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ان ترسیموں کی کتابت خطِ نستعلیق میں سائنسی بنیادوں پر کی گئی ہے اور انھیں مختلف پوائنٹ سائزوں میں کمپیوٹر کے حافظے میں سمو دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی خطِ نستعلیق کے روائتی حسن، دیدہ زیبی، نزاکت غرض کہ اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنے والی نسلوں کے واسطے محفوظ کر دیا ہے۔ آج کے معروف خطّاطوں کے خط بھی اسی طرح محفوظ کئے جا سکتے ہیں تا کہ وہ صرف عجائب گھر کی

زینت نہ بنیں بلکہ کتابوں اور اخباروں کی شکل میں ہر گھر میں موجود رہیں ۔

نوری نستعلیق مشینی کتابت کی اہم خوبیاں یہ ہیں ۔

۱۔ مشینی کتابت کے دوران عبارت اسکرین پر نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور اسی مرحلہ پر عبارت کی تصحیح بھی کی جاسکتی ہے ۔

۲۔ لیزر شعاعوں کے ذریعے آٹھ کالموں کے اخباری صفحہ کو دس منٹ سے کم وقت میں فوٹوگرافک کاغذ یا فلم پر اتارا جاسکتا ہے ۔

۳۔ تقریباً پانچ سو صفحات کی کتاب چار پانچ دن میں کمپوز کر کے شائع کی جاسکتی ہے ۔ اگر زیادہ کی بورڈ key board استعمال کئے جائیں تو ایک دن میں بھی اس کتاب کی مکمل کتابت ہو سکتی ہے ۔

۴۔ اردو میں hyphen کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے ۔ پورے لفظ، خواہ مفرد ہوں یا مرکب، ایک ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں ۔ مثلاً "کتابچہ" اگر ہم اسے دو حصّوں میں لکھیں، یعنی "کتا"، ایک سطر کے آخر میں اور "بچہ" دوسری سطر کے شروع میں، تو ہو سکتا ہے کہ پڑھنے والا اسے "کتّا ۔ بچّہ" پڑھے ۔ "نوری نستعلیق کی مشین پورے لفظ کو یا تو پہلی سطر میں ضم کرنے کی کوشش کرے گی اور اگر جگہ نہیں ہے تو پھر دوسری سطر میں منتقل کر کے الفاظ کے درمیان فاصلوں کو مساوی کر دے گی ۔

۵۔ اگر پروف ریڈنگ کے بعد عبارت میں تبدیلی کرنا ضروری ہو تو اس کے لئے پورا مضمون یا اس کا کوئی بڑا حصّہ دوبارہ کتابت کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ایڈی ٹوریل ٹرمینل کی مدد سے الفاظ یا عبارت کو درست کیا جاسکتا ہے اور پوری کتاب کے پروف دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ۔ سائنس وغیرہ کی کتابوں میں اس طریقۂ کار سے بآسانی ردّ و بدل کیا جاسکتا ہے ۔

۶۔ اردو کتابت میں اب تک انگریزی کی طرح پوائنٹ سائز کا تصوّر نہیں تھا ۔ کاتب کو "جلی اور جلی"، "خفی اور خفی" لکھنے کی ہدایت دی جاتی تھی ۔ پھر بھی قلم یکساں نہیں رہتا تھا ۔ اب آپ ضرورت کے مطابق ۹ ۔ ۱۰ ۔ ۱۲ ۔ ۱۶ ۔ ۱۸ ۔ یا ۲۴ پوائنٹ تک اپنی ضرورت کے مطابق مطلوبہ پوائنٹ میں صرف ایک بٹن دبا کر براہِ راست کتابت حاصل کر سکتے ہیں اور آپ کی پوری کتاب یا اخبار وغیرہ یکساں طور پر ایک ہی پوائنٹ سائز یا مختلف پوائنٹ سائزوں کی کتابت میں چھپ کر بآسانی تیار ہو جاتا ہے ۔ آئندہ ردّ و بدل میں بھی خط میں کوئی فرق نہیں ہوتا ۔

۷۔ پوسٹر سائز کی کتابت بھی آسانی سے ممکن ہے ۔ آپ کیمرے یا انلارجر کی مدد سے ۲۴ پوائنٹ سائز کی تحریر کو بڑا کر سکتے ہیں اور صرف قینچی کی مدد سے حروف و الفاظ کو کاٹ کر کاتبوں کے سُرخیاں لکھنے کے انداز میں جوڑا جاسکتا ہے ۔

۸۔ اس کے علاوہ نوری نستعلیق کی مشین کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ٹیلیفون کی برقی لہروں کے ذریعے کتابت شدہ تحریر ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کی جاسکتی ہے ۔

۹۔ نوری نستعلیق کے طریقۂ کتابت کو کام میں لاکر اب ٹیلی فون ڈائرکٹری اور اس قسم کی دوسری کتابیں بھی بہت آسانی سے چھاپی جاسکتی ہیں، یعنی آپ جس طرح چاہیں، نام کمپیوٹر کے حوالے کرتے جائیں ۔ آخر میں بس ایک بٹن دبا کر کمپیوٹر کے حافظہ کو ہدایت دیں کہ وہ مذکورہ ناموں کو حروفِ تہجّی کے اعتبار سے مرتّب کر دے ۔ تو ترتیب کی اس طرح ترتیب کا کام جو مہینوں کا ہے، بہت ہی کم وقت میں انجام پائے گا ۔

بہر حال نوری نستعلیق کی ایجاد کے بعد اب بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے ہمہ جہت فروغ کے سلسلے میں اب ان تمام چھوٹی اور مصنوعی رکاوٹوں کا ازالہ ہو گیا ہے جو اردو کتابت کی سُست رفتاری، ٹائپ کی سہولتوں کی عدم موجودگی اور دوسرے فنی نقائص کی آڑ لے کر مغربی ذہنیت کا حامل اور اردو دشمن طبقہ اب تک پیش کرتا چلا آیا ہے ۔

● ۱۶۷۴ سے آج تک خطِ نستعلیق کو مشینی دَور سے ہم آہنگ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوتی رہی ہیں ۔ نوری نستعلیق کی ایجاد سے اُردو زبان کو اس کے روائتی رسم الخط میں کمپیوٹر کتابت کے ذریعہ ایک ہی جست میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صفِ اوّل میں لاکھڑا کیا ہے ۔ مذکورہ طریقہ بہت پسند کیا گیا ہے اور فنِ خوش نویسی کی تاریخ میں ایک بے مثال کارنامہ قرار دیا گیا ۔ اُردو طباعت کا یہ نمونہ مونوٹائپ کارپوریشن کی "لیزر کامپ" مشین پر تیار کیا گیا ہے ۔ بلاشبہ یہ برقی کتابت حُسنِ خط اور تیز رفتاری کے پیشِ نظر اُردو زبان کو فروغ دینے میں انقلابی کردار ادا کرے گی ۔

(تنقید و تفہیم ۱۹۸۴ء صفحہ نمبر ۴ جمیل نقوی)

رضا ہمدانی

یہ صداؤں کا جہاں تھا پہلے
اتنا سناٹا کہاں تھا پہلے

منجمد آج ہے ذہنِ انساں
صورتِ آبِ رواں تھا پہلے

یاد ہے تیرے بدن کا وہ طلوع
کیا دل آویز سماں تھا پہلے

شمع کشتہ ہوں پہ سورج کی طرح
میرا اندازِ بیاں تھا پہلے

سایۂ زلفِ معنبر کی طرح
یہ جہانِ گزراں تھا پہلے

ایک گرتا سا مکاں اب ہے رضا
ایک گبھرو سا جواں تھا پہلے

محسن احسان

درشت کیوں تھا وہ اتنا کلام سے پہلے
کہ میرا نام نہ تھا اس کے نام سے پہلے

وہ سب چراغ کہ تھی جن میں روشنی کی رمق
بجھا دیئے گئے بستی میں شام سے پہلے

وہ مہرباں بھی ہوئے دشمنی پہ آمادہ
ہم آشنا بھی نہ تھے جن کے نام سے پہلے

خود اعتماد کبھی تھے، پر اب یہ عالم ہے
ہزار وسوسے دل میں ہیں کام سے پہلے

ہمارے درسِ محبت کا پوچھتے کیا ہو
کتابی چہرہ پڑھا ہے کلام سے پہلے

سبک روانِ رہِ غم نے زندگی محسن
مسافرانہ گزاری، قیام سے پہلے

سرمد صہبائی

ہو لاگ درمیاں تو کوئی دل بھی تب لگائے
بیٹھے رہو امید یونہی بے سبب لگائے

کس حبیبِ احتیاط میں رکھیں متاعِ دل
وہ راہزن کہاں ہیں کہ بیٹھا نقب لگائے

جو قرضِ ہجر سونپ گیا عمر کے عوض
شرطِ وصال اس سے کہیں بے طلب لگائے

کھلتا نہیں ہے عقدہ شبِ انتظار کا
یاروں نے داؤ پیچ تو یاں سب کے سب لگائے

اس خوانچۂ سخن پہ تو سرمد گزر نہیں
اس سے کہیں وہ ہم کو کسی اور ڈھب لگائے

محسن نقوی

اب کے بارش میں تو یہ کارِ زیاں ہونا ہی تھا
اپنی کچی بستیوں کو بے نشاں ہونا ہی تھا

کس کے بس میں تھا ہوا کی وحشتوں کو روکنا
برگِ گل کو خاک شعلے کو دھواں ہونا ہی تھا

جب کوئی سمتِ سفر طے تھی نہ حدِ رہ گزر
اے مرے رہرو سفر تو رائیگاں ہونا ہی تھا

مجھ کو رکنا تھا اسے جانا تھا اگلے موڑ تک
فیصلہ یہ اس کے میرے درمیاں ہونا ہی تھا

چاند کو چلنا تھا بستی سیپیوں کے ساتھ ساتھ
معجزہ یہ بھی تہِ آبِ رواں ہونا ہی تھا

میں نئے چہروں پہ کہتا تھا نئی غزلیں سدا
میری اس عادت سے اس کو بدگماں ہونا ہی تھا

شہر سے باہر کی ویرانی بسانا تھی مجھے
اپنی تنہائی پہ کچھ تو مہرباں ہونا ہی تھا

اپنی آنکھیں دفن کرنا تھیں غبارِ خاک میں
یہ ستم بھی ہم پہ زیرِ آسماں ہونا ہی تھا

بے صدا بستی کی رسمیں تھیں یہی محسن مرے
میں زباں رکھتا تھا مجھ کو بے زباں ہونا ہی تھا

قارئین شاعر کی دلچسپی اور معلومات کے لئے روزنامہ جنگ (لاہور پاکستان) کے شکریے کے ساتھ اس کے جمعہ ادبی ایڈیشن سے چند عکسی تحریریں دی جا رہی ہیں۔ چونکہ یہ ادبی ایڈیشن نوری نستعلیق میں مختلف رنگوں کے ساتھ طبع ہوتے ہیں اور رنگوں کا عکس لینا ممکن نہیں ہو پاتا لہٰذا غزلوں پر شعراء کے نام کی کتابت ادارۂ شاعر کی طرف سے ہے اس طرح دوسرے صفحے کی سرخیاں اور نام بھی علیحدہ سے کتابت شدہ ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

عالی نے اردو شاعری میں کئی اعتبار سے اضافے کئے ہیں۔ انہوں نے غزل میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے اور نئے احساسات کو بڑی خوش اسلوبی سے سمویا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دوہے لکھنے کا جو تجربہ کیا ہے وہ انہیں اردو شاعری میں ایک بلند مقام پر پہنچاتا ہے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

عالی کے بارے میں میرے لئے لکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ ہم سخن فہم بھی ہیں اور عالی کے طرف دار بھی۔ غزل میں عالی نے روایت کی پاسداری کی' دوہے کا پودا انہوں نے اردو شاعری کی زمین میں لگایا اور اپنی طرح دار جوانی اور اب اپنی پختہ پاکستانیت کے ذریعے اس کو سینچا۔ (یہ موقعہ اردو میں دوہے کی تاریخ پر بحث کرنے کا نہیں) اب عالی ہمارے جذبوں کی زبان بن گیا ہے۔ جیوے۔ ۔ ۔ جیوے۔ ۔ ۔ جیوے پاکستان۔

قتیل شفائی

جن دوستوں کے خلوص پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے' ان میں عالی صاحب کا نام بسعتی نمایاں ہے۔

احمد بشیر

محل میں بیٹھا ہوا لوک گیت۔ لوبھی۔ چاتر۔ خوشنویس۔

سرشار صدیقی

جمیل الدین عالی شاعری میں اس صنف کے حوالے سے جانے جاتے ہیں جس میں اب بھی ان کا کوئی حریف نہیں۔ دوہے ان کی بنیادی شناخت ہیں۔ لیکن ان کی غزل بھی اردو غزل کے معیار کے شانہ بشانہ فکری سفر طے کر رہی ہے۔

امید فاضلی

جمیل الدین عالی ایک باغ و بہار شخصیت' اپنے خدو خال کی طرح خوب صورت غزل گو اور اردو دوہوں میں ایک معتبر ترین نام۔

نسیم درانی

بہت اچھے انسان اور بہت اچھے دوست ہیں۔ لیکن دوسروں سے ہمیشہ مشکوک رہتے ہیں۔

جمیل اختر خان

جمیل الدین عالی ایک اہم پاکستانی شاعر ہیں۔ اردو غزل کی پاکستانی روایت میں وہ ایک معتبر نام ہیں اور دوہے لکھنے والے کی حیثیت سے منفرد۔ ان کی ذات میں جدید شعری روایت کا عکس خاصا نمایاں ہے۔

ایس ایم اختر

ایک ایسا کوی جسے کالم نویسی کھا گئی اور رہی سہی کسر بکاری نے نکال دی۔

حسن اکبر کمال

عالی جی دوہوں کی دھنک رنگ فضا سے غزل کی دھوپ چھاؤں تک اور پھر وطن سے سچے عشق کے نغموں کی گونج کے پس منظر میں ایک من موہ لینے والے شاعر ہیں۔ وہ لوگوں سے محبت حاصل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

کشور ناہید

عالی جی کو سننے اور پڑھنے کو دو شخصیتیں چاہئیں۔ لوگ ان کے دوہے پسند کرتے ہیں مگر میں تو صرف ایک شعر کو سنبھال سنبھال کر رکھتی ہوں کہ مجھے بہت پسند ہے۔

کچھ نہ تھا یاد بجز کار محبت اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

ڈاکٹر انور سدید

دوہے کی طرح گل' غزل کی طرح لطیف' انجمن آرائی میں یکتا۔ خود نگر اور نگہ۔ اردو دنیا کو انہوں نے رائٹرز گلڈ کے علاوہ اکادمی ادبیات کا خاکہ بھی دیا۔ لیکن اب ان دونوں اداروں میں وہ اجنبی نظر آتے ہیں۔

اجمل نیازی

میں نے پرتو روحیلہ کے دوہوں کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ دوہے جذبے کی شاعری ہے۔ عالی جی کے دوہے سن کر ایک دوراہے پر آ ٹھہرا ہوں۔ ایک رستہ لفظوں کی گلیوں کے دیس کو جاتا ہے اور ایک آواز کے جمال شہر کی طرف۔ ۔ ۔ کبھی دونوں طرف بیک وقت جانے کو جی چاہتا ہے۔

افتخار عارف

عالی جی محبت کرنے والے' دوستوں پہ جان دینے والے بظاہر ترش لہجہ مگر دل ہمہ وقت کھلے پر آمادہ۔ شاعری کا آغاز پر شکوہ' پھر ایک دور خاموشی کا' اب پھر متوجہ ہیں۔ تازہ غزلیں وہ خوش آمد کا پتا دیتی ہیں۔

نذیر قیصر

جدید صوفی ہے مگر اس کی شاعری کیا ہے۔ ۔ ۔ انتظار فرمایئے۔

زبیر رضوی

حمد

تو میری آنکھوں کو خوابوں کی بتیاں دے دے
ہوائے تازہ گلابوں کی پتیاں دے دے

اگر میں بندۂ مجرم تری ہدایت کا
مجھے تمام عذابوں کی سختیاں دے دے

میں پا برہنہ بہت پتھروں پہ چلتا رہا
مرے سفر کو تو راہوں کی نرمیاں دے دے

مجھے قبول کر میں لغزشوں کا پروردہ
مری دعاؤں کو تو مستجابیاں دے دے

میں پی کے جھوموں اگر موسموں کے آنگن میں
تو جام جام مجھے ہوش مندیاں دے دے

مری جبیں ترے سجدوں سے تابناک رہے
سر نیاز کو تو کج کلاہیاں دے دے

● ۱۵۸۰ ــ ترکمان گیٹ ، نئی دہلی ــ ۶

○

بارش نہیں ہوا نہیں بادل گھٹا نہیں
اب دل میں تیری یاد کا موسم ہرا نہیں

دو چار صحبتوں میں اسے اور دیکھ لیں
وہ شخص پہلی بار تو اچھا لگا نہیں

ہر راہ پر تھے کانچ کے ٹکڑے بچھے ہوئے
ہم اس طرح چلے کوئی شیشہ چبھا نہیں

خیمے تھے سنگ پاشوں کے پیڑوں کے آس پاس
شاخوں سے پھر بھی کوئی پرندہ اڑا نہیں

مجھ سے بچھڑ گیا وہ ہرے جنگلوں کے بیچ
میں کس طرف کو جاؤں کوئی راستہ نہیں

ان قربتوں نے اور بھی تنہا سا کر دیا
اب درمیاں ہمارے کوئی فاصلہ نہیں

سب شور دستکوں کا ہواؤں نے پی لیا
سنسان ہر گلی ہے کوئی جھانکتا نہیں

بے وفا شام میں ایک ٹھہرا لمحہ

رشید امجد ● ۱۸۵- اے- نانک پورہ راولپنڈی (پاکستان)

اُس نے ایک لمحہ توقف کیا، پھر بولا ــــــ "یہ کہانی بہت الجھی ہوئی ہے، اس لئے اسے کسی ترتیب سے سُنانا ممکن نہیں۔"

مرشد مسکرایا ــــــ "زندگی تو خود ایک بے ترتیب کہانی ہے، ہم سارا وقت اسے ترتیب دینے میں گزار دیتے ہیں، اور تم نے سنا نہیں جب چیزوں میں ضرورت سے زیادہ ترتیب پیدا ہو جائے تو وہ ٹوٹ جاتی ہیں۔"

اُس نے پوچھا ــــــ "تو پھر میں کہانی کہاں سے شروع کروں ؟"

مرشد ہنسا ــــــ "کہانی تو شروع ہے، میں اور تم اس کے چھوٹے چھوٹے کردار ہیں، جو اپنی مرضی سے نہ شروع کر سکتے ہیں نہ ختم۔"

اُس نے کہا ــــــ "اگر ہم اتنے بے بس ہیں تو پھر کیسی کہانی اور کیسے کردار۔"

مرشد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا ــــــ "آؤ میں تمہیں اس کہانی کے شہر میں لے چلوں۔"

وہ شہر میں داخل ہوئے تو مرشد یکدم کہیں غائب ہو گیا،

شہر اس کے سامنے تھا اور وہ اکیلا،

سامنے ایک کھلا میدان تھا، وہ آہستہ آہستہ میدان کے قریب پہنچا، دیکھا کہ میدان کے درمیان میں ایک صلیب گڑی ہے جس پر کوئی ٹنگا ہوا ہے، وہ گھبرا کر تیز تیز چلتا قریب پہنچا، صلیب پر ٹنگے ہوئے نے اس کی چاپ سُن کر آنکھیں کھول لیں اور مسکرا کر بولا ــــــ "تم بھی پتھر مارنے آئے ہو۔"

اُس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ آگے کئے ــــــ "میرے تو ہاتھ ہی خالی ہیں، اور پھر میں کیوں پتھر ماروں گا۔"

صلیب والا ہنسا ــــــ "یہاں پتھر مارنے کے لئے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں، ایک کو دیکھ کر دوسرا بھی شروع ہو جاتا ہے۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا ــــــ "لیکن یہاں تو کوئی نہیں، لوگ کدھر چلے گئے۔"

صلیب والا ایک لمحہ چُپ رہا پھر بولا ــــــ "وہ سارے واش بیسنوں کے سامنے کھڑے اپنے ہاتھ دھو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اس فیصلہ میں اُن کا ہاتھ نہیں۔"

اُس نے پوچھا ــــــ "کس فیصلہ میں ؟"

"مجھے مصلوب کرنے کا فیصلہ"

"اُن کا ہاتھ نہیں تو پھر یہ فیصلہ کس نے کیا ہے"

"انہوں نے ہی، لیکن اپنی مرضی سے نہیں، بس ایک دوسرے کو دیکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھ کھڑے کئے تھے، یہاں یہی ہوتا ہے، یہاں کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے، بس جو دوسرے کر رہے ہیں وہ بھی وہی کرتا ہے۔"

پھر اس نے آسمان کی طرف نظریں کیں ــــــ "اے خدا ان کے کھیتوں میں فصلیں سرسبز اور لہلہاتی رہیں، ان کے دریاؤں میں پانی موجیں مارے اور ــــــ"

وہ دُعا کے باقی لفظ سنے بغیر ہی وہاں سے بھاگ نکلا اور دوڑتا ہوا سڑک پر آ گیا!!

لوگ ہر کام کرنے سے پہلے دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں،

اُسے لگا کہ وہ سارے کسی پُراسرار شئے کی گرفت میں ہیں۔

کیا یہ جادو کا شہر ہے

اور یہ سارے لوگ، لوگ ہیں بھی یا جادو کے پُتلے ہیں،

اگر یہ سارا کچھ جادو ہے تو سامری کہاں ہے؟

اُس نے اپنے آپ کو ٹٹولا ——— یہ خواب تو نہیں

اگر خواب ہے تو کتنا طویل اور اکتا دینے والا کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا،

یہاں ہر شخص نے استری کیا ہوا لباس پہنا ہوا ہے، لیکن اندر شکنیں ہی شکنیں ہیں۔

وہ آہستہ آہستہ بڑے چوک میں ایستادہ مجسمے کے سامنے پہنچ گیا۔ مجسمہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور اب اس کا ہیولہ ہی باقی رہ گیا تھا

وہ دیر تک اس ہیولے کے سامنے کھڑا رہا، پھر اس نے پاس سے گزرتے ایک شخص سے پوچھا ——— "یہ مجسمہ کب ٹوٹا تھا"

اُس شخص نے کچھ سوچا ——— "یاد نہیں، مدّت سے یونہی ہے"

اُس نے پھر پوچھا ——— "لیکن یہ تو تمہارا ہیرو تھا"

"شاید، ہاں ——— لیکن ہمارا عہد بغیر ہیرو کا عہد ہے"

"بغیر ہیرو کا عہد"

"ہاں ہمارا ہیرو مدّت ہوئی مر چکا، ہم نے اسے مار دیا، اب نئے ہیرو کے جنم لینے کا انتظار کر رہے ہیں"

"لیکن وہ کب جنم لے گا؟"

"کون جانے ——— جنم لے گا بھی کہ نہیں" اس نے کندھے اُچکائے اور آگے بڑھ گیا،

وہ وہیں ہیولہ کے قدموں میں بیٹھ گیا

عجیب شہر ہے ——— ہر چیز کو اوپر سے چمکایا جا رہا ہے اور اندر سے وہ تڑختی چلی جا رہی ہے،

یہاں ہر شخص کا اپنا ایک جہنم ہے جس کا انتخاب اس نے خود کیا ہوا ہے،

مرشد نے ہیولہ کے پیچھے سے سر نکالا ——— "یہ بیماروں کا شہر ہے لیکن ہر شخص خود کو تندرست سمجھتا ہے"

اُس نے مرشد کا ہاتھ پکڑ لیا ——— "اس شہرِ بے وفا میں مجھے اکیلا نہ چھوڑو"

مرشد نے اس کا کندھا تھپتھپایا ——— "میں تو تمہارے ساتھ تھا ہر لمحہ"

اُس نے کہا ——— "لیکن تم مجھے دکھائی کیوں نہیں دیئے"

مرشد ہنسا ——— "یہی تو اس شہر کی خصوصیت ہے، یہاں کسی کو اپنا آپ دکھائی نہیں دیتا، سارے دوسروں کو دیکھتے ہیں"

اُس نے کہا ——— "تو پھر میں اس شہر سے نکلنا چاہتا ہوں"

مرشد نے نفی میں سر ہلایا ——— "اس شہر سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں"

"کوئی راستہ نہیں" وہ خوف زدہ آواز میں بولا،

مرشد لمحہ بھر چُپ رہا پھر بولا ——— "صرف ایک راستہ ہے"

"وہ کیا"

"وہ جو صلیب پر ٹنگا ہے اُسے صلیب سے اتار دیا جائے اور اس کی جگہ کسی دوسرے کو مصلوب کیا جائے"

"لیکن کیسے"

"جو شہر سے نکلنا چاہتا ہے"

"یعنی ـــــ" اُس نے خوف سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا ـــــ "لیکن میں مصلوب نہیں ہونا چاہتا"

مرشد نے اُس کا کندھا دبایا ـــــ "تو پھر جو کر رہے ہو اسے کرتے رہو"

اُس نے ایک لمبی سانس لی اور قلم اٹھایا۔ سیکشن آفیسر نے فائل آگے کھسکاتے ہوئے کہا ـــــ "سر سکریٹری صاحب دوبار فون کر چکے ہیں، میں نے آپکی مرضی کے مطابق نوٹ بنا دیا ہے"

اُس نے سر ہلایا اور نوٹ کے نیچے دستخط کر دیئے ـــــ "ٹھیک ہے یہ فائل ابھی ان کے پاس بھیج دو"

پھر فوراً ہی اسے خیال آیا ـــــ "نہیں ٹھہرو، میں خود ہی لے جاتا ہوں، آج صبح سے انہیں سلام کرنے بھی نہیں جا سکا" ○

بقیہ: صفحہ ۶۸ فروغ کی سمت میں

بقیہ: صفحہ ۶۸

کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ سرورق کا عقبی حصہ بڑے فلیپ کے لئے محفوظ ہوتا ہے اور اس پر اسی نقاد یا ادیب کی تحریر شائع ہو سکتی ہے جو چار پانچ مرتبہ بلادِ یورپ جا چکا ہو۔ سرورق کے اندرونی دو حصے جو کتاب کے دائیں اور بائیں جانب ہوتے ہیں خالص مقامی ادیبوں کے خیالات کی آبیاری کے لئے ہوتے ہیں۔ اس طرح کتاب ایک گلدستے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس میں مصنف کی تصنیف گل سر سبز اور اس کی تصویر گل سر سبز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کچھ لوگ بک شیلف میں سجا کر رکھتے ہیں اور کچھ اسے طاقِ نسیاں کی زینت بناتے ہیں۔ کتاب کے قارئین میں خود مصنف کے علاوہ ناشر، مقدمہ نگار اور رائے زن حضرات شامل ہوتے ہیں۔ (رائے زن حضرات سے وہ لوگ مراد ہیں فلیپ نشین ہوتے ہیں)

آج کل ایک کتاب کو اتنے سارے قارئین مل جائیں تو سمجھنا چاہیئے زبان اور ادب مائل بہ فروغ ہیں۔ ○○

عمیق حنفی

سبز سرمئی سیاہ

دردمیں تکلیف تو ہوتی ہے ، نشہ بھی ہوتا ہے اور شاعرانہ مستی بھی ویسی ہی جیسی پنیلے سانپ کے ڈسنے پر ہوتی ہے ۔ کشتی بانی کا شوق چراتا ہے تو تصور واحساس کے سفینے سمندر کے سینے کو چیرنے لگتے ہیں ۔ اور سمندر کی سطح میوزک کی نوٹیشن شیٹ بنتی چلی جاتی ہے ۔

۲ ر دسمبر ۱۹۸۴ء میں ایسا ہی تجربہ مجھے بھی ہوا اور اسے فراموش نہ کردوں اس لیے ۲ ر دسمبر ۱۹۸۴ء میں معالجین کی شدید نگرانی کے باوجود ویسے ہی تجربے کا اعادہ ہوا ایک بے نام اور غیر شاعرانہ درد کی فوج کے دستے چاروں طرف سے دل پر ٹوٹ پڑے ۔ دھونکنی سی چلنے لگی ۔ سینے میں کوئی بھاری جماؤ ہونے لگا ۔ ٹیس کی ترنگیں وسط قلب سے اٹھ اٹھ کر بائیں شانے کی طرف شب خون بولنے لگیں ۔ سینے کے بیچوں بیچ درد نے اپنی صدر کمان قائم کرلی ۔ ڈاکٹروں نے کہا دورہ پڑا ہے ۔

علاج کے دوران میں ، اسپتال میں اور وہاں سے آرام کے نام پر نظر بندی کے دنوں میں دل و دماغ اور ذہن واحساس سے آتی جاتی ہوئی موجیں کبھی کبھی ملفوظ و موزوں بھی ہو جاتیں ۔ سکت ہوتی تو انھیں کاغذ پر قید کر لیتا ورنہ طاق نسیاں پر چراغ روشن ہوتے اور بجھ جاتے جیسے برسات کی راتوں میں جگنو چراغاں کرتے اور غائب ہو جایا کرتے ہیں ۔ انھیں میں سے چند جگنو رومال میں بند کر لیے تھے ۔ چھوڑتا ہوں ، دیکھیں پھر جگمگاتے ہیں یا نہیں ۔

(۱)

کشاں کشاں نہ گذرا ے نفس شیشہ گراں
ابھی تو شیشہ کئی صورتوں سے گذرے گا

(۲)

دنیا نے مجھے گمنامی میں جینے کی رعایت بخشی تھی
دنیا ہی مجھے گمنامی میں مرجانے کا موقعہ بھی دے گی

(۳)

میں بے ضروری فضول سا شخص
میں ایک پرزہ جو گھومتا ہے تو گونجتا ہے
جو اپنے آہنگ کے دائرے میں تمام اشیاء کو گوندھتا ہے
جو ان کو پہچان بخشتا ہے
نئی ردم و دھن ، نئے ترنم ، نئی نئی چالیں ، تالیں ، تھرکن
نئے نئے کان پچھلی چالوں کو بے سُرا کہہ کے ہنس رہے ہیں

(۴)

اسپتال میں
دکھ کا ارتھ
چپہ چپہ چھاننے والا
میں مورکھ اگیانی
ریگستان میں
ریت کا ذرّہ ڈھونڈھتے پھرنا
سرتاپا میری نادانی

(۵)

رنگ جلتے ہوئے جگمگاتے ہوئے چند جچتے ہوئے چند رمتے ہوئے
پتلیوں پر ہوئے نیزہ زن
کیسی تیزی سے تبدیلیاں رونما
اور ناگفتہ تبدیلی کے ساتھ ساتھ
ہر تشنج کی رنگت بھی بدلی ہوئی

ہر تنفس کی سنگت بھی بدلی ہوئی
سُر رگوں کا تغیر پذیر
نسوں میں نئی تال دُھن کو ملی
کوئی آواز تھی
گیت تھا
درد تھا یا چمک
جس نے ظلمات میں کھلبلی پیدا کر دی
روشنی کے کئی تیز تیروں کی بوچھار سے
اربوں کھربوں دھنک کھل پڑیں
روشنی رنگ، آواز کے خار و گل
جان پر چھا گئے

(۶)

پران پکھیرو کنٹھ سریلا پنکھ سنہرے
چونچ اَتِ سندر پنجے نکیلے بول اکھرے
پنجرے سے ہے موہ اسے، بگیا سے گھبرائے ہے
کھلی فضا پر کم ہے بھروسہ، پنجرے پر وشواس ہیں گہرے

(۷)

پھُس
یا زوردار دھماکا
کیسا ہوگا اَنت؟
یہ جو کہیں بھی جاتا ہے
لوٹ کے اب کیا آوے گا
اس کے بول بڑے میٹھے تھے
یہ لوگوں کے کام آتا تھا
نیک تھا سیدھا سچا تھا
لوگ جنازہ دیکھنے کو اک پل کے لئے
چلتے چلتے رک جائیں گے
یا میّت کے رستے سے
ہٹ کر دور گذر جائیں گے
دارا اور جمشید نہیں ہیں
اسکندر چنگیز نہیں ہیں
اکبر اور اشوک نہیں ہیں
تو دنیا میں کون کمی ہے
دنیا جیسی تھی ویسی ہے
کچھ سانسیں آتی جاتی ہیں
کبھی روتی ہیں کبھی گاتی ہیں

(۸)

دل کی دیواروں کا پلستر
ادھڑا ادھڑا سا لگتا ہے
پپڑی پپڑی رنگ و روغن
اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے
دل پر تنگ گرفتیں اپنی
دل کے چارہ گر کرتے ہیں
گھٹتے ہیں انفاس رگوں میں
رگتی ہے رفتار نسوں میں

(۹)

موت کیسی ہوگی تو؟
خوب صورت؟ خوش جمال؟
ایک مصور کا تصور
ایک شاعر کا خیال؟
سانولی یا سنبلی
گندمی یا مرمریں
موسوی یا احمریں
اک تراشیدہ صنم
یا زہرۂ لاآفریں
دیو یا آسیب
زندگی کو چھ برس اور آدھ سو سال آزمایا
ایک ٹکڑا حسن و خوبی کا نہ پایا
رنج و غم رحم و کرم ظلم و ستم حزن و ملال
جو دیا پیتا رہا

اس کا ہر تعمیل ارشاد و اشارہ بھی کیا

جی لیا بس جی لیا
جو لیا تھا بیشتر لوٹا دیا
احسن تقویم پہ کستے رہے
زاویے حسن و کشش کے
نغمۂ آوازِ پائے آرزو سے
روز و شب بستے رہے

زندگی چھپن برس تیری جبیں سائی تو کی
آج تک دامن تہی

ایک چھن اب
موت کا دیدار ہو
موت برحق ہے تو پھر کیوں سامنے آتی نہیں!
اک نفس کو اپنی چھب آخر کیوں دکھلاتی نہیں!!

(۱۰)

روز و شب ہر دم رواں　　آوازِ پا گم
گردشِ ایام جاری　　اور صدا گم
دنیا اپنی کھال میں مست　　اور خدا گم
ایک دھاگا خود گرفتہ　　دوسرا گم

(۱۱)

ادھر نے بارش جیسی شکل پکڑ لی ہے　　کہرے نے مٹھی میں رات جکڑ لی ہے
شطرنجِ شب اتارے پٹتے جاتے ہیں　　دوست و دشمن سارے پٹتے جاتے ہیں
دیکھا چہرہ رات کے بھیگے آنچل میں　　روشنی چھنتی دودھیا رنگ کے بادل سے
چلو عمیق لا سپتال میں کب تک پڑے ہو گے　　مینج کے مانند لاش میں اپنی گڑے رہو گے!

(۱۲)

دل کی حویلی کی دیواریں
جگہ جگہ سے زخمی

یہاں وہاں سے
چونا ماٹی جھڑتی ہے
کنکریاں آنکھوں کے اندر گڑتی ہیں
جگہ جگہ بے جان پلستر اُدھڑ رہا ہے
رگوں نسوں میں
گرم و سرد ہواؤں کی گھٹتی ہوئی آمد و شد سے
سانس پھولنے لگتی ہے دم گھٹتا ہے
دل کے قریں سینے میں کہیں
نغمہ چکرانے لگتا ہے

کیا یہ بدن
یہ بوسیدہ آثارِ قدیمہ
اپنا سارا بوجھ اٹھائے
سر پہ آن پڑے گا۔؟

(۱۳)

دنیا کو مجھ سے دُور رکھو
یہ جاتے جاتے کیا دے گی
یہ دوا یہ دارو بند کرو
یہ سوئی سلائی دور رکھو
یہ جسم ہے، ذی احساس بھی ہے
پن کشن نہیں ہیں انگ مرے
اکھڑے اکھڑے سے ڈھنگ مرے
اڑتے اڑتے سے رنگ مرے
مت کسو مجھے تاروں میں یہاں
میں مٹی، پانی، آگ، ہوا
آکاش میں ملنا چاہتا ہوں
میں موت کی سانس کی لہروں میں
اک پھول سا ملنا چاہتا ہوں

(۱۴)

سلیٹ صاف ہو گئی
تمام حرف و رنگ و خط
تمام نقش اڑ گئے
مرا خمیدہ بجھا تا خط نمایاں ہو گیا
لکیر تھی کہ بال تھی
داہنے سے بائیں اس کی چال تھی
سکوت بھی زباں ہوا
طلسم خوں بیاں ہوا
لفظ گنگ ہیں
معانی نغمہ سنج ہیں
مگر یہ بھاگیہ لیکھ کوئی پڑھ سکے گا کیا۔؟
بھلا اسی میں ہے کہ ہم
یہ زیر و بم یہ پیچ و خم
یہ جوار بھاٹا دیکھتے رہیں

۱۵

نہ کوئی آیا نہ کوئی گیا فقط میں ہوں
زماں مکاں میں اگر کچھ ہوا فقط میں ہوں

تمام حرکت و رفتار کا بھرم مجھ سے
سکوتِ صحرا میں آوازِ پا فقط میں ہوں

لہو کے دریا میں کچھ ڈوبتا ہوا سا ہے
وہ سنگ ریزہ ؟ حرفِ وفا فقط میں ہوں

یہ گھنٹی کہتی ہے اٹھو کہ وقت ہو بھی چکا
مجھے لگے ہے کہ زنجیرِ پا فقط میں ہوں

کوئی نہیں ہے مری سننے والا میرے سوا
خدا کرے نہ کہوں میں خدا فقط میں ہوں

کوئی تو بول لبوں پر کھِلے کھِلے تو سہی
بیان ہو یہ کہانی گلے گلے تو سہی

دہن پہ گُن کی شفق ہی ذرا ذرا چھو لے
وہ برگِ سبزۂ تازہ کھِلے کھِلے تو سہی

یہ دارِ حزن : کمینگاہِ رنج و درد و ملال
کبھی وجود پہ کھل کر پلے پلے تو سہی

بدل تو جائے سر مو یہ منظرِ یکساں
موئے مژہ کوئی کچھ تو ہِلے ہِلے تو سہی

سیاہ پانی پہ چھ دن سے مستقل ہوں رواں
بس ایک دن کا ہی وقفہ ملے مِلے تو سہی

میں مانگتا ہوں زبان واپس
زبان واپس بیان واپس

وہ جن سے منزل تلاشتے تھے
وہ اجلے دھندلے نشان واپس

فضا پہ گو دھول چھا رہی ہے
مویشی اور ہوں کسان واپس

زمین داروں سے چھیننا ہے
وہ قحط سالہ لگان واپس

ملے ہری دوب پاؤں کو پھر
پرندوں کو آسمان واپس

● ۱ے - ۲۲۳ ، پنڈارا روڈ ، نئی دہلی

فیض احمد فیض ـــ ایوانِ وقت میں

شرکار

○عارف نظامی ○ عطاء الحق قاسمی ○ اشفاق احمد
○ ڈاکٹر سلیم اختر ○ شبنم شکیل ○ امجد اسلام امجد

فیض احمد فیض کا درج ذیل انٹرویو جو غالباً ان کا آخری انٹرویو بھی ہے، نوائے وقت لاہور (پاکستان) کی ۱۳ر مارچ ۱۹۸۴ء کی اشاعت سے جناب عطاء الحق قاسمی اور نوائے وقت کے شکریے کے ساتھ نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔ اس انٹرویو کی گونج ہندوستان کے انگریزی اخبارات اور دیگر زبانوں کے اخبارات میں برابر سنائی دی کیوں کہ فیض صاحب نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا تھا۔ اس انٹرویو کا ایک حصہ روزنامہ سالار بنگلور (کرناٹک) میں شائع ہو چکا ہے اسی حصے کو ہفت روزہ ہماری زبان (نئی دہلی) نے اپنی ۸ر ستمبر ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں سالار کے شکریے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ موضوع بحث اس انٹرویو کو فیض صاحب کے آخری انٹرویو کے طور پر اور ہندوستان میں اس کی بازگشت کے پیشِ نظر مکمل انٹرویو دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے ـــــــــــــ ادارہ

عطا:۔ فیض صاحب سب سے پہلے میں آپ کا نوائے وقت کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہمیں وقت دیا۔

ایک سوال جو ابھی میرے ذہن میں آیا ہے اسی سے ابتدا کرتا ہوں۔ آپ نے تمام عمر شاعری کی صحافت میں بھی حصہ لیا اور مختلف میدانوں میں اپنے جوہر دکھائے اب آپ کی عمر ستر برس سے اوپر ہے آپ کیا محسوس کرتے ہیں کیا آپ زندگی میں جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ کام مکمل ہوتے یا ادھورے رہ گئے؟

فیض:۔ ہمارے خیال میں، تو سب کام ادھورے رہ گئے۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم کسی ایک مضمون پر عبور حاصل کریں یا پھر کسی ایک کلاسیک کا مکمل ترجمہ کریں۔ مثلاً شیکسپیئر پر اب تک کوئی مکمل ترجمہ نہیں ملتا۔ ایک کتاب تاریخ آف ہیومن پر کام شروع کیا تھا لیکن وہ بھی ادھورہ ہی رہا... صحافت شروع کی وہ ادھوری رہی اور بہتیرے کام ادھورے ہیں۔

عطا:۔ سب سے زیادہ خلش کس کی محسوس ہوتی ہے؟

فیض:۔ خواہش تھی کہ ایک طویل نظم لکھتا وہ پوری نہیں ہوئی دوسری بات وہی کہ اردو زبان میں کسی بڑی کلاسیک کا ترجمہ ہو جائے یہ بھی نہ ہوا۔

عطا:۔ فیض صاحب ابھی آپ نے کہا کہ طویل نظم کی خواہش ہے؟ بہت سے لوگ جو بات طویل نظم میں کہتے ہیں آپ مختصر نظم میں کہہ جاتے ہیں۔

امجد:۔ اسی میں میری بات بھی شامل کر لیں کہ آپ نے جو طویل نظم کے متعلق بات کی تو بعض اوقات مختلف نظموں پر اس کا اثر نظر آتا ہے لیکن ان کی کوئی ایک خاص شکل نہیں بنتی تو وہ جو آپ کا طویل نظم بارے میں نظریہ ہے وہ کسی اور شکل میں بھی نظموں میں آیا ہے یا وہ بھی ابھی ویسے ہی پڑا ہے۔

فیض:۔ نہیں ان کی تشکیل تو برقرار ہیں آپ نے دیکھا ہو گا چند نظموں کے بعد ہم نے ناتمام لکھ دیا تھا ارادہ یہی تھا کہ اس کو آگے چلائیں جیسے ایک "انتساب" بھی خیال تھا کہ اس کو آگے بڑھائیں گے پھر "شہر آشوب" کی ابتدا کی اس کے نیچے بھی ناتمام لکھ دیا پھر "نا... کی ایک صبح" شروع کی اس پر بھی ناتمام لکھا اب یہ ہے کہ ہمت اتنی نہیں رہی اس لئے جلد ہی بوریت ہو جاتی ہے۔

اشفاق:۔ اچھا اس ناتمامی کی کیا وجہ ہے آپ کی ذات...

کوتاہی کی ذمہ دار ہے یا کوئی اور.....

شبنم :۔ ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ بڑے ڈھیلے آدمی ہیں.....

فیض :۔ خارجی وجہ تو کوئی نہیں ہے بس کچھ تساہل ہی ہے...

اشفاق :۔ فیض صاحب ویسے آپ خارجی عوامل سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے آپ جلدی سے مان جاتے ہیں۔ آپ کو کہنا چاہئے کہ میں ایسا شاعر تھا جس نے اپنے ارمانوں کا خون کرکے کام کیا لیکن مجھے حکومت وقت نے آگے نہ بڑھنے دیا بلکہ پیچھے دھکیل دیا آپ کیوں ایسا نہیں کہتے جب کہ آپ کو پچھلی حکومتوں کے دوران موقعہ بھی ملا کہنے کا.....

امجد :۔ بلکہ اب بھی موقعہ ہے کہنے کا..... تمام حضرات کا قہقہہ.....

اشفاق :۔ آپ اس سے فائدہ اٹھائیں اور اتنی شرافت اور مرنجی سے بات کرتے ہیں بلکہ منفی پر ہی لیٹ جاتے ہیں یہ کچھ ٹھیک نہیں۔

فیض... شکایت نہ کرنے کی عادت تو ہم نے بچپن میں ہی سیکھ لی تھی۔ کہ جب آدمی شکایت کرے گا تو کسی نہ کسی کا نقصان ہوگا۔ اس لئے خاموشی بہتر ہے۔

اشفاق.... واہ.... واہ.... سبحان اللہ.....
آپ نے بچپن میں کیسے یہ باتیں سیکھیں ان بچوں کو بتائیں انہیں تو معلوم ہی نہیں ہے آپ بتائیں کہ کس طرح ابا صوفی صاحب کے پاس لے جایا کرتے تھے۔

فیض... جی ہاں ایک صوفی صاحب بھی تھے اور صاحبزادہ رفیق الحسن صاحب یہ ہم سے اسکول میں ایک سال جونیئر تھے بڑے اچھے شاعر تھے۔ اور نہایت رنگین مزاج تھے اور یہ داڑھی وغیرہ تو بعد میں رکھی تھی۔ ان کی بہت بڑی گدی تھی سیالکوٹ میں اس کے پانچ چھ میل پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اس کا نام تھا "مہار" وہاں پر ایک درویش رہتے تھے۔ ہمارے ابا ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ مہار والے تو بڑے پیر تھے ان کی شاندار گدیاں ہیں۔ لیکن جن کے پاس ابا جایا کرتے تھے۔ وہ پیر نہیں بلکہ درویش تھے..... ہم بہت چھوٹے تھے ان دنوں شاید وہاں سے بھی کچھ اثر آگیا ہو.....

اشفاق :۔ ضرور اثر آیا ہوگا اس کا پتہ تو نہیں چلتا۔

فیض :۔ ہمارے ابا کا خیال تھا کہ جاوا لوگ گمراہ ہیں ان کو بھی وہاں لے جانا چاہئے۔ ہمارے ایک سرکاری وکیل تھے بڑے رکھ رکھاؤ والے مغربی تہذیب سے متاثر ان کا نام تھا۔ میاں احسان الحق ان کو لے کر گئے اب وہاں گاؤں میں کہاں انگریزی قسم کے غسل خانے اور رہنے کا طریقہ تو وہ بڑے پریشان ہوئے کہنے لگے کہ کہاں سے آگئے ہو بھئی... ابا نے جواب دیا کہ تمہیں ہم ہندوستان دکھانے لائے ہیں تمہیں پتہ چلے کہ تم کہاں رہتے ہو.... میں تمہیں یہاں فقیر صاحب سے ملانے کے علاوہ یہ دکھانے لایا ہوں کہ تم سرکاری وکیل ہو تمہارے پاس روزانہ موکل آتے ہیں اور تم کسی کو بری کرواتے ہو کسی کو سزا دلواتے ہو میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دیکھ لو اس وقت تمہارا ملک ہے کہاں..... خیر یہ تو میں دوسری طرف نکل گیا۔ اصل بات ہو رہی تھی بچپن کی.... مجھے اسکول میں مانیٹر بنا دیا گیا۔ اور بعض استاد بہت کاہل ہوتے تھے لڑکوں کو سزا دینے کا کام ہمارے ذمے لگا دیا کہ تم چانٹا لگایا کرو۔

اشفاق :۔ ناک پکڑ کر چانٹا لگاتے تھے..... ؟

فیض... اب ہمیں عادت نہیں تھی کہ کسی کو سزا دینے کی تو بس ایسے ہی گال سہلا دیا کرتے تھے۔ ماسٹر جی کہتے تھے زور سے لگاؤ.... آخر تنگ آکر میرے ساتھ ایک ہندو لڑکا بیٹھتا تھا میں نے اسے راضی کیا کہ یہ کام تم کر لیا کرو.... تو پھر وہی یہ کام کرنے لگا، ہم آزاد ہو گئے....

عطا.... فیض صاحب ہمارے اور آپ کے کچھ دوست اب بھی آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ حکومتوں کے ناک پکڑ کر ان کو چانٹا لگائیں تو میرا خیال ہے کہ اب بھی آپ کا رویہ وہی اسکول والا ہوگا۔

امجد.... وہ بے طاقت لوگوں کو اس وقت بھی نہیں لگاتے تھے....

فیض :۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو کام خوش اسلوبی سے ہو وہی اچھا ہے یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات حقوق کے تحفظ کے لئے لڑائی بھی کرنی پڑتی ہے لیکن بیشتر اوقات لڑائی بے مقصد ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر کبھی کبھار لڑائی کرنی بھی پڑ جائے تو وہ نفرت کے لئے نہیں کی جاتی بلکہ محبت کے لئے کی جاتی ہے۔ اگر کسی چیز کی محبت کیلئے کسی برائی کے خلاف لڑنا پڑے تو وہ جائز ہے لیکن محض لڑائی کرنا اپنی بدمزاجی یا احساس برتری کی وجہ سے یا کسی غیر ضروری وجہ کے بغیر لڑنا ٹھیک نہیں ہے باقی جہاں تک حکومتوں کا تعلق ہے... جو.... اصل بات تو یہ ہے.... کہ.... حکومتیں ہی ہم سے لڑتی آئی

ہیں ہم تو کبھی لڑائی نہیں لڑتے .....

.... بھرپور قہقہہ .....

امجد .... یہ تو آپ نے ٹھیک فرمایا کہ لڑنا کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب ہم پانچ سات ہزار سال تک کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو یہی محسوس کرتے ہیں کہ شر کی قوتوں پر سچ کی فتح ہوتی ہے جبکہ اکثر یہ غلط ہوتا ہے۔

فیض .... نہیں بھئی ہم نہیں مانتے اگر تاریخ کو دیکھیں تو شر کی قوتوں کو بالادستی تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن آخرکار فتح سچ کی ہی ہوتی ہے .... اب دو لڑائیاں تو ہمارے سامنے ہوئی ہیں پہلی جنگِ عظیم کا تو اتنا معلوم نہیں لیکن دوسری جنگِ عظیم تو سامنے کی بات ہے اور اس میں ہٹلر اور نازیوں نے شروع میں سارے یورپ پر اور آدھے ایشیا پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اس وقت نظر یہی آتا تھا کہ اب بازی ختم ہو گئی ہے لیکن آپ نے دیکھا کہ ان کی تمام تر فوجی کامیابیوں کے باوجود آخرکار ان کو ہار ہوئی اور پھر یہ نہیں کہ اس کے بعد دنیا میں امن قائم ہو گیا ... چھوٹی موٹی لڑائیاں تو ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں .... الجیریا کے ساتھ فرانس کی لڑائی اب فرانس بہت بڑی طاقت ہے ویت نام کے ساتھ امریکہ کی لڑائی اس وقت اسرائیل اور فلسطینیوں کی لڑائی ہو رہی ہے۔ اور مجھے تو یقین ہے کہ آخرکار اس میں بھی فلسطینی جیتیں گے۔ خواہ اس میں دیر لگے گی۔ ایک طریقہ سے حق و صداقت کا کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلتا ہے۔ اور مثبت نکلتا ہے.....

اشفاق.... اس طرح تو فیض صاحب آج کل روس اور افغانستان کی بھی لڑائی ہو رہی ہے اس کا کیا بنے گا۔ اصولاً تو وہاں بھی افغانستان جیتنا چاہیئے.....

فیض.... وہاں صرف افغانستان کی لڑائی نہیں اس میں اور بھی عوامل شامل ہیں ....اس میں دکھ کی بات یہ ہے کہ افغانی عوام دونوں طرف سے پٹ رہے ہیں۔

اشفاق..... میرے خیال میں ویت نام کے بعد مظلوم ترین قوم افغانی ہیں کہ وہ ادھر سے بھی پٹ رہے ہیں اور ادھر سے بھی .....

فیض..... ہاں یہ فرق ہے کیوں کہ ویت نام میں تو یکطرفہ لڑائی تھی۔ جبکہ افغانستان دو طرفہ جنگ بھی نہیں بلکہ اور بھی طاقتیں ہیں۔

شبنم.... یہ تو علیحدہ بات ہے کہ کون کون سی طاقت اس میں ملوث ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ افغانی پس رہے ہیں بیس پچیس لاکھ افغانی مہاجر بھی ہو گئے ہیں۔ تو اس کا کوئی حل ہونا چاہیئے ....

فیض.... لڑائی تو اس مسئلے کا حل نہیں ہے سب ہی لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا کوئی سیاسی حل ہونا چاہیئے، تو اس کا یہی ہے کہ کوئی پُرامن حل ہونا چاہیئے ....

عارف .... جب آپ ۱۹۸۲ء میں واپس آئے تھے تو اخبارات میں کچھ اس قسم کی خبریں آئی تھیں۔ کہ اس سلسلے میں اگر آپ کو کہا جائے کہ ثالثی کا کردار ادا کریں تو اس مسئلے کا کوئی حل نکل سکتا ہے ....

فیض .... بھئی ہم کیا رول ادا کر سکتے ہیں یہ تو وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کو کچھ حیثیت یا اہمیت حاصل ہو ..... ہماری نہ تو اپنی سرکار کی طرف سے کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی دوسری طرف سے .... تو ہم صرف باتیں کر سکتے ہیں .....

امجد .... بطور ایک دانش ور کے آپ کی ایک حیثیت تو ہے ... اور آپ کو ساؤتھ ایشیا میں جو مقام حاصل ہے شاید ہی کسی اور رائٹر کو ہو اور آپ کی بات کو سیاسی طور پر بھی وزنی تسلیم کیا جاتا ہے تو اس حوالے سے آپ بات کر سکتے ہیں۔

فیض .... جب ہم آئے تھے تو یہ بات ہوئی تھی اور ہم نے کہا تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ لکھ سکتے ہیں لیکن لکھنے سے اگر معاملات حل ہو سکتے ہیں تو پھر کوئی مسئلہ نہ ہوتا ..... اب آپ اخبارات کو دیکھ لیں کیا ملکی اور غیر ملکی سب یہی لکھتے ہیں کہ اس کا کوئی سیاسی حل ہونا چاہئے مگر نتیجہ کیا ہے ....

عطا.... فیض صاحب قطع نظر اس کے کہ اس کا کوئی سیاسی حل ہونا چاہیئے بطور دانش ور آپ دکھ تو محسوس کرتے ہوں گے جب کوئی افغانی قتل ہوتا ہو گا.....

فیض..... بھائی یہ تو قدرتی بات ہے .... میں دو دن کیلئے جلال آباد گیا تھا وہاں پر ہم نے دیکھا کہ ہر تیسری دکان پر سردار جی بیٹھے ہیں، میں نے ایک سردار سے پوچھا کہ ہم نے تو سنا تھا کہ یہاں لڑائی ہو رہی ہے اور کاروبار وغیرہ بند ہے .... کہنے لگا جی ہاں لڑائی تو ہو رہی ہے لیکن کاروبار بند نہیں ہے .... ہوتا یہ ہے کہ ادھر سے لوگ آتے ہیں کافی گڑبڑ ہوتی ہے اور پھر وہ چلے جاتے ہیں .... تو بات یہ ہے کہ ڈاکے تو آپ کے ہاں بھی پڑتے ہیں..... یہاں ذرا بڑے پیمانے پر پڑتے ہیں۔ جب ڈاکہ ڈال کر لوگ چلے جاتے ہیں تو پھر سرکار آ جاتی ہے اور وہ ان کو پوچھتی ہے.... تو یہ عوام بے چارے

دونوں طرف سے رگڑے میں ہیں.....اب بات یہ ہے کہ وہ ملک تو اس قسم کا ہے کہ وہاں سڑکیں تو دو تین ہی ہیں۔ وہاں کوئی قابو نہیں پا سکتا یہ تو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے..... انگریز ہمارے قبائلی علاقے کو فتح نہیں کر سکے اور افغانستان تو ایک ملک ہے وہاں پر قابو پانا بڑی مشکل ہے۔

سلیم..... فیض صاحب آپ نے جو باتیں بتائی ہیں تو بچپن سے آپ تصوّف کی طرف مائل تھے اس کے بعد آپ سوشلزم کی طرف کیسے چلے گئے..... ؟

فیض..... بھئی اب تو سوشلزم تصوّف سے الگ نظر نہیں آتا.....

عطا..... اس کی ذرا وضاحت کریں.....

فیض..... اس لئے کہ آج کل ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات درست ہے... اگر آپ اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اسلام میں سب سے پہلے سوشلسٹ ابو ذر غفاری تھے اور اس کے بعد اگر انتہا پسند سوشلسٹ دیکھیں تو وہ خارجی تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے... ویسے واقعاتی طور سے یہ ہے کہ بچپن میں اس کے متعلق کوئی علم نہیں تھا۔ ابّا فقیر کے پاس لے جاتے تھے۔ ہم چلے جاتے تھے۔ جب ہم ساتویں جماعت میں پہنچے تو شمس العلماء سیّد میر حسن کی مسجد میں چلے گئے۔ عربی وغیرہ ان سے پڑھی وہ اقبالؒ کے بھی استاد تھے.....

سلیم..... فیض صاحب آپ نے فارسی نہیں پڑھی تھی.....

فیض :۔ فارسی ہم نے مدرسے میں نہیں پڑھی تھی کیونکہ وہ تو گھر میں بولی جاتی تھی اس لئے اس پر عبور تھا.... تو مولوی میر حسن سے پڑھا پھر ہم گورنمنٹ کالج چلے گئے وہاں ہم نے پہلی دفعہ نام سُنا لینن وغیرہ کا جب ہم تھرڈ ایئر میں تھے ہمارے ایک دوست خواجہ خورشید انور یہ موسیقار تھے... یہ ایک انقلابی گروپ میں تھے۔ جب ہم صبح کالج میں داخل ہوتے تو نوٹس بورڈ پر انقلابی اشتہار لگا ہوتا تھا ٹریبون اخبار آتا تھا اس کے اندر اشتہار ہوتا تھا ہماری ان سے بڑی دوستی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ لٹریچر پڑھا کرو اچھا ہے..... ایک آدھ بار ہم نے دیکھا ہمیں بہت ڈر لگا... ہوا یہ کہ ہم بی اے میں پڑھتے تھے تو ہمارے ابّا کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک تو ہم بڑے رئیس تھے۔ یکایک ہم قلاش ہو گئے کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا سوائے زمینوں کی آمدنی کے..... پھر وہ ڈپریشن کا دور آ گیا..... اور آپ لوگوں کو شاید یہ بات معلوم ہو کہ پاکستان کے بننے میں اور بہت سے عوامل کے ساتھ ایک ڈپریشن بھی شامل ہے..... جس کی کسی نے تحقیق نہیں کی.....

اس زمانے میں یہ ہوا کہ جو کاشت کار کسان اور دیہات میں رہنے والے لوگ تھے ان کو اس پریشانی کا سامنا تھا کہ ان کی پیدا کردہ اجناس کا کوئی گاہک ہی نہیں تھا ایک روپے من گندم تھی لیکن خریدار کوئی نہیں تھا بے کاری بے حد تھی۔ ایم۔ اے پاس کو چالیس روپے کی نوکری ملتی تھی..... حالات اس قسم کے ہو گئے تھے کہ لوگوں نے مجبوراً کچھ سہارے ڈھونڈنے شروع کر دیئے ہمیں بھی کچھ تلاش تھی تو اس وقت ہمیں کسی نے یہ کالا علم پڑھا دیا۔

تمام حضرات کا فلک شگاف قہقہہ.....

اس کے ساتھ ہی پھر یہ ترقی پسند تحریک شروع ہو گئی پھر جلوسوں میں جانا شروع کر دیا اور لوگوں کو سبق پڑھانا شروع کیا۔

عطا..... فیض صاحب آپ پاکستان کے لئے کون سا نظام پسند کرتے ہیں..... چین یا روس والا سوشلزم یا ڈنمارک سویڈن اور بلجیم میں جو سوشلزم ہے یا پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی مملکت دیکھنا چاہتے ہیں.... ؟

فیض :۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سوشلزم کوئی امرت دھارا نہیں ہے کہ ہر جگہ یہی نسخہ استعمال ہو جائے۔ ہر ملک کا اپنا نسخہ ہے اپنے اپنے حالات اور روایات کے مطابق ذہن میں رکھیں..... اب ظاہر ہے پاکستان اسلامی ملک ہے تو بنیادی اصول تو اسلامی ہوں گے...

عطا..... یعنی آپ اسے اسلامی سوشلزم کہہ سکتے ہیں..... ؟

فیض کیوں نہیں کہہ سکتے..... بالکل کہہ سکتے ہیں.....

عطا..... تو اس کا مطلب ہے کہ آپ پاکستان میں اسلامی سوشلزم چاہتے ہیں...

فیض... بالکل یہی سمجھ لیں جب مولانا حسرت موہانی کہہ سکتے ہیں تو ہمیں کہنے میں کیا اعتراض ہے...

عطا :۔ آپ پاکستان میں خالص سوشلزم نہیں بلکہ اسلامی سوشلزم کے قائل ہیں.....

فیض :۔ بھئی سوشلزم تو ایک طریقِ کار ہے۔ یہ کوئی عقیدہ تو نہیں ہے..... وہ تو ایک سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ ہے.....

عارف :۔ ڈھانچے تو ہمارے پاس بے شمار ہیں.....

فیض :۔ بہرحال یہ ایک نظام ہے اور جہاں اسلام ہو گا وہاں یہ اسلامی ہو گا اور جو ملک اسلامی نہیں ہو گا۔ وہاں خالص سوشلزم ہو گا

سلیم... جب آپ اسلامی سوشلزم کہتے ہیں تو آپ کی اس سے مراد بلحوالہ

سوشلزم ہے یا اس کی کوئی نئی صورت ہے یہ ...... ؟

فیض .... بھٹو صاحب نے تو اسلامی سوشلزم نہیں چلایا تھا۔ انھوں نے سوشلزم ہی نہیں چلایا تو اسلامی یا غیر اسلامی کی بات تو بعد کی ہے۔ انھوں نے یہ نعرہ ضرور لگایا تھا کہ ہمارا مذہب اسلام ہے اور سوشلزم ہمارا نظام ہے اور یہ نعرہ تو الجیریا کا ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے اور جمہوریت ہماری سیاست ہے ....

عطا۔ لیکن نہ جمہوریت رہی نہ معیشت رہی اور نہ ہی اسلام رہا.....

سلیم :۔ فیض صاحب! میں نے ابھی کچھ دن پہلے راوی کے پرانے پرچے دیکھے تھے۔ تو تھرڈ ایئر کے زمانے کی چیزیں مجھے نظر آئیں تو آپ نے شاعری تھرڈ ایئر میں شروع کی تھی، یا اس سے پہلے۔

فیض :۔ نہیں انہی دنوں شروع کی تھی۔

شبنم ۔ آپ نے ان کی رومانی نظمیں پڑھی ہوں گی۔

سلیم ۔ ایک نظم تھی اس پر ایڈیٹر کا نوٹ بھی لکھا ہوا تھا کہ "جی چاہتا ہے کہ اس نظم کے نیچے اصل نام بھی لکھ دوں،، ان دنوں ایڈیٹر ن۔م راشد تھے۔ ان کی ایک نظم تھی۔ اس میں فیض صاحب نے نام کی جگہ ڈیش (....) ڈیش لکھا تھا۔

عطا۔ فیض صاحب وہ ڈیش۔ ڈیش۔ کون تھی.... ؟

فیض ۔ اب پردہ نشینوں کے نام تو نہیں بتائے جاتے۔

اشفاق :۔ اب آپ انٹرویو میں کیا پوچھنا چاہتے ہیں ؟

سلیم ۔ دراصل فیض صاحب اس لئے نام نہیں بتا رہے کہ اگر ایک نام بتا دیا تو کتنے لوگ ناراض ہو جائیں گے۔

.... ہلکے پھلکے قہقہے .....

اشفاق :۔ فیض صاحب! ایک بات یہ ہے کہ عام طور پر جو دانشور ہوتا ہے وہ تھرڈ ایئر میں سوشلسٹ ہوتا ہے۔ اور فورتھ ایئر میں بھی تھوڑا بہت ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد کافی دیر تک رہتا بھی ہے۔ لیکن پچاس سال کے بعد بھی سوشلسٹ رہنا ذرا مشکل نظر آتا ہے کیونکہ گردوپیش کا کافی مطالعہ کرایا ہوتا ہے تو میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ بھی اب پہلے جیسے نہیں رہے گو لوگ میری بات نہیں مانتے .... ناراض ہو جاتے ہیں۔ آپ بتائیں کہ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

فیض :۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہمیں تھرڈ ایئر، فورتھ ایئر تک سوشلزم کا پتہ ہی نہیں تھا۔ ہمیں تو کافی بعد جا کر پتہ چلا۔ شروع میں ذرا ولولہ ہوتا ہے۔ آدمی مختلف ڈھانچے بناتا ہے۔ بعد میں آہستہ آہستہ مطالعے اور تجربے کی روشنی میں دیکھتا ہے کہ یوں نہیں ہے تو پھر حقائق کی طرف آتا ہے۔ ہر مقام اور کام کے لئے حالات اور واقعات کو مدِنظر رکھنا پڑتا ہے۔

امجد :۔ جیسے ڈاکٹر اور حکیم بھی مزاج دیکھ کر دوا دیتے ہیں۔

فیض :۔ بالکل ایسے ہی ہے اب بنفشہ تو ہر چیز کا علاج نہیں ہے۔ اگر کسی کو زندگی کی بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے تو ان سے دور رکھنا غلط ہے .... کم از کم بنیادی ضروریات تو پوری ہونا چاہئیں۔

اشفاق :۔ دوسرے ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی بہت سے مسائل حل طلب ہیں۔ آپ اپنے ملک کے وسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اگر کوئی قابل قدر آسان اور قابلِ عمل نسخہ آپ کے ذہن میں ہو جو لوگوں کے لئے تسکین کا باعث ہو۔

فیض :۔ بھئی ہم کہاں کے دانا ہیں۔

امجد :۔ فیض صاحب! آپ کا مشاہدہ بھی تو ہے وہ کیا کہتا ہے ... ؟

فیض :۔ ہم بڑے مسائل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ چھوٹے موٹے مسائل کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارا گاؤں ضلع سیالکوٹ میں ہے اب سیالکوٹ میں بہت نامور لوگ پیدا ہوتے .... لیکن واقعہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ پسماندہ ضلع وہی ہے .... اور ہمارا جو گاؤں ہے۔ اس سارے علاقے میں نہ کوئی سڑک تھی اور نہ دوسری سہولتیں ..... اگر اس گاؤں والے چاہتے تو ان بڑے بڑے لوگوں کا گھیراؤ کرتے یا ان سے استدعا کرتے کہ اس علاقے کے لئے کچھ کرو۔ اب تھوڑی دیر کیلئے سابقہ دورِ حکومت میں حنیف رامے جب وزیر اعلیٰ بنے تو میں نے ان سے کہا کہ ہماری سڑک تو بنوا دو۔ اب یہ کوئی مشکل کام نہ تھا وہاں سڑک بن گئی۔ پھر یوسف خٹک صاحب سے کہا کہ بجلی لگوا دو انھوں نے بجلی لگوا دی....

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ سب کچھ میں کرتا کوئی اجتماعی ادارہ ایسا کرتا تو زیادہ بہتر تھا یہ جو ڈسٹرکٹ کونسلیں وغیرہ ہیں ان کا کام کیا ہے.... باقی ملک کو چھوڑ دیں

آپ کوئی ایک گاؤں یا قصبہ بغیر امریکن امداد کے حل کر لیں تو وہی بہت ہے... بنیادی ضروریات جو ہیں۔ ان کے لئے کوئی بڑا منصوبہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ جو پانچ سالہ منصوبے اور دوسرے منصوبے ہیں ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ منصوبے کتنے سالوں سے بن رہے ہیں لیکن کا ہنا کا چھا وہیں کا وہیں ہے۔ تو صورت یہ ہونی چاہئے کہ کام ہو خواہ کوئی کرے۔

اشفاق :۔ اس کے لئے کوئی بڑا منصوبہ بنانے کی ضرورت بھی نہیں اگر بیت المال بنا دیئے جائیں اور ان کے تحت بنیادی ضروریات پوری کی جائیں تو بہت اچھے نتائج سامنے آئیں گے .... جتنی دفعہ بھی ہمارے ملک میں جمہوریت آئی اور عوامی نمائندے وزیر بنے تو انھوں نے کیا کام کیا..... اب جمہوریت پھر آئے گی تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ان بنیادی ضرورتوں کی طرف توجہ دی جائے گی....

فیض :۔ محض الیکشن کروا لینا ووٹ لے لینا انھیں گن لینا الیکشن جیت جانا اور پارلیمنٹ بنا لینا یہ تو اوپر کا نقشہ ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم جمہوریت کو بناتے اور اسے آگے بڑھاتے ہم نے اسے محدود کر دیا ہے..... نام تو جمہوریت رہا ہے لیکن نظام کوئی اور تھا۔ جمہوریت اسی لئے چلی بھی نہیں کہ ہمارے ہاں جمہوریت آئی ہی نہیں اور ہم نے آنے بھی نہیں دی۔

سلیم :۔ زمانہ طالب علمی میں کبھی علّامہ اقبال سے ملاقات ہوئی تھی....؟

فیض :۔ جی ہاں میں نے گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لئے ان سے ہی خط لکھوایا تھا۔ پہلی دفعہ جب میں نے انھیں دیکھا اس وقت میری عمر پانچ یا چھ سال ہوگی۔ سیالکوٹ میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ اور وہ وہاں پہلی بار آئے تھے....

اشفاق :۔ اس سے پہلے بھی آتے تھے۔ پیدا ہونے کے لئے....

فیض :۔ یہی سمجھ لیں.... میری ہوش میں سیالکوٹ جب ہی پہلی بار آئے تھے.... اس کے بعد دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب ہم گورنمنٹ کالج میں داخلہ کے لئے ان سے خط لینے گئے اس وقت ہمارے ابّا ساتھ تھے اس لئے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے اس زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ کا جھگڑا تو نہیں تھا لیکن کچھ کشمکش جاری تھی.... چونکہ ہمارے گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلبا کی اقلیت تھی اس لئے غیر مسلم حاوی تھے.... ہمارے دوستوں نے کہا کہ ہم ایک اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن بنائیں چنانچہ ہم نے گورنمنٹ کالج مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن بنائی۔ اور ہم نے کہا کہ چلتے ہیں ڈاکٹر اقبال صاحب کے پاس کہ وہ اس کا افتتاح کریں۔ یہ تیسری ملاقات تھی۔ جس میں ہم ان کے کافی قریب گئے اور باتیں بھی کیں... میں اور دوسرے دوست ان کے گھر گئے ان سے عرضداشت کی کہ تشریف لائیں اور مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا افتتاح فرمائیں۔ انھوں نے فرمایا کہ بہت اچھی بات ہے آپ نے اچھا کام کیا ہے۔ نوجوان طلبا کو اسی طرح کام کرنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ.... لیکن میں تو کہیں جاتا آتا نہیں ہوں اور پھر دوسری بات یہ کہ تم کسی ایسے آدمی کو بلاؤ جو تمہیں کچھ پیسے بھی دے۔ تاکہ تمہاری ضروریات بھی پوری ہوں... ابھی ایک راجہ صاحب آرہے ہیں انہیں لے جاؤ.... تھوڑی دیر بعد وہ راجہ صاحب آگئے اور ہم انہیں لے گئے باقاعدہ افتتاح ہوا اور مزے کی بات یہ ہے کہ مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا وہ ایک ہی جلسہ ہوا۔ کچھ ڈاکٹر صاحب نے پڑھانا شروع کیا تھا اور ان کا جو حلقہ تھا ڈاکٹر تاثیر اور سالک صاحب اور صوفی صاحب وغیرہ وغیرہ یہ ہمارے اساتذہ بھی تھے اور ہماری ان سے نیازمندی بھی تھی۔ اس زمانے میں جب ایم۔ اے پاس کر لیا تو پھر اس کے بعد دوستیاں بکھر گئیں۔

شبنم... سب سے زیادہ قربت کس سے تھی ؟

فیض... مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے رہی لیکن سب سے پہلے صوفی تبسم سے اور سب سے آخر میں بھی صوفی صاحب سے رہی۔ پھر دو تین بار ہم ان بزرگوں سے ملے... یہاں میں ایک بات بھول گیا جب علّامہ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس سے واپس آئے تھے تو گول باغ میں جلسہ ہوا اور اس زمانے میں ان کے آنے سے ایک یا دو ماہ قبل ایک انٹر کالجوں کا مشاعرہ ہوا جس کا موضوع تھا اقبال اور اس میں مجھے ایک تمغہ ملا تھا اور وہ تمغہ ابھی تک میرے پاس ہے۔

اشتفاق :۔ فیض صاحب علّامہ اقبال کی آمد پر جو گول باغ میں جلسہ ہوا تھا اس میں ہندو اور سکھ بھی آئے تھے....؟

فیض :۔ بالکل آئے تھے ان کی شاعری کے بہت مداح تھے

اور اب بھی ہیں۔۔۔

شبنم:۔ صوفی صاحب کے حوالے سے ایک بات یاد آئی ہے کہ ایک دفعہ فیض صاحب اور پطرس بخاری باتیں کر رہے تھے کہ امریکہ میں یہ بھی ہے اور یہ بھی مل جاتا ہے وہ بھی مل جاتا ہے تو صوفی صاحب کہنے لگے کہ یار امریکہ تو موچی دروازہ ہو گیا جہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔۔۔۔

فیض:۔ ہماری علامہ اقبال سے بعد میں تین چار مرتبہ اور ملاقات ہوئی۔۔۔۔ ایک مزے کی بات یہ ہے کہ ہم نے ان کو کبھی اُردو کا ایک لفظ بھی بولتے نہیں سُنا۔ پنجابی بولتے تھے یا انگریزی بولتے تھے۔

سلیم:۔ اور انگریزی بھی پنجابی لہجے میں بولتے تھے۔۔۔۔

عارف:۔ آپ ایک اچھے انگریزی اخبار کے ایڈیٹر رہے ہیں اور صحافت میں اچھا نام پیدا کیا پھر آپ نے چھوڑ کیوں دی؟

فیض:۔ اس نے ہمیں چھوڑ دیا ہم نے اسے نہیں چھوڑا بلکہ دوسرے لفظوں میں چھڑوا دی گئی۔۔۔۔ اصل قصہ یہ ہوا کہ ہم تاشقند گئے ہوئے تھے جب یہاں مارشل لا لگا یہاں سے ہمیں خط وغیرہ جاتے رہے ان میں کچھ عجیب وغریب باتیں ہوتی تھیں۔۔۔ جب ہم وہاں سے آنے لگے تو دوستوں نے کہا کہ مت جاؤ پکڑے جاؤ گے۔۔۔۔ ہم نے کہا کہ جائیں گے تو ضرور چاہے پکڑے جائیں۔۔۔۔۔

جس دن ہم کراچی اترے ان دنوں منظور قادر وزیر خارجہ تھے وہ ہمارے دوستوں میں سے تھے۔۔۔۔ سارا دن ہم منظور قادر کے ساتھ رہے۔۔۔۔ وہ کہتے رہے کہ اچھا کیا کہ تم وہاں گئے اور یہ کیا وہ کیا ہم یہ صلاح کریں گے آپ بھی کچھ ہماری امداد کریں۔۔۔ ہم نے کہا خیریت تو ہے۔۔۔ خیر اگلے دن ہم گھر پہنچے اس دن ہماری بیٹی سلیمہ کی سالگرہ تھی۔۔۔۔ وہ دن بھی خیریت سے گزر گیا۔۔۔ ہماری بیوی ایلس نے کہا کہ کچھ دن سے یہ چکر لگا رہے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کب آ رہے ہیں۔۔۔ ان دنوں سی آئی ڈی کے ڈی آئی جی سید نذیر رضوی وہ ہمارے کلاس فیلو تھے۔۔۔ میں نے انہیں فون کیا کہ بھئی سنا ہے تم ہماری تلاش میں ہو کیا بات ہے۔۔۔؟ کہنے لگے نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے خوش آمدید۔۔۔۔ بہت اچھا کیا تم آ گئے۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے ورنہ میں خود ملنے آتا۔۔۔۔ ہماری تسلی ہو گئی۔

اگلے دن دوپہر کو دروازہ بجا ہماری بیوی دفتر گئی ہوئی تھی۔۔۔ ہم نے دروازہ کھولا۔۔۔ تو دیکھا کہ چار پانچ پولیس افسر کھڑے ہیں۔۔۔ ہم نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔۔۔ کہنے لگے بہت ناخوشگوار خبر ہے۔۔۔ ہم نے کہا پکڑنے آئے ہو۔۔۔ کہنے لگے جی ہاں۔۔۔ میں نے کہا چلو۔۔۔ میری بیوی ایلس تمہیں بہت گالیاں دیگی۔۔۔ ہم ان کے ساتھ چلے گئے۔۔۔ چار پانچ ماہ مہمان رکھا پھر رہا کر دیا رہائی کے دوسرے یا تیسرے دن ہم پاکستان ٹائمز کے دفتر گئے وہاں تالہ لگا ہوا تھا۔۔۔ رہائی والے دن ہی سرکار نے اخبار پر قبضہ کر لیا تھا۔۔۔۔

عطا:۔ اس میں قدرت اللہ شہاب کا بھی کوئی دخل تھا؟

فیض:۔ بالکل تھا۔۔۔ پہلا اداریہ تو انھوں نے ہی لکھا تھا۔ ان معنوں میں نہیں تھا کہ انہوں نے پکڑوایا تھا۔

عطا:۔ فیض صاحب آپ کا صحافت میں حمید نظامی مرحوم کے ساتھ بھی تعلق رہا ہے تو ان کے بارے میں کچھ فرمائیں؟

فیض:۔ ان سے ہماری دوستی تھی۔ جب وہ طالب علم تھے جب ہم امرتسر میں پڑھاتے تھے اور وہ پڑھتے تھے ایک گروپ تھا یہ عبدالستار خان نیازی وغیرہ کا۔ م۔ش اور حمید نظامی کا گروپ تھا۔ ہماری ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ اس زمانے میں پہلا اقبال ڈے ہوا تھا یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ اس میں اکٹھے شمولیت کی۔ جب سے ہماری ملاقات رہی۔ پھر ہم بمبئی چلے گئے۔ جب واپس آئے اور پاکستان ٹائمز شروع کیا۔ اسی وقت ایک ایڈیٹر کمیٹی بنائی۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ ایڈیٹرز کانفرنس ہوئی دہلی میں جس کی صدارت قائد اعظم نے کی تھی۔ اس میں ہم حمید نظامی (مرحوم) کے ساتھ گئے تھے۔ ہماری اکثر ملاقات رہتی تھی اور ہمارے درمیان بہت ہم آہنگی تھی۔ جب پاکستان بن گیا تو سب سے پہلے ہم نے ایک پریس ایڈوائزری کمیٹی بنائی جس کے پانچ ممبر تھے۔ میں اس کا کنوینر تھا۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ ہم نے پنجاب کی حکومت سے یہ منوا لیا تھا کہ کسی اخبار کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی جب تک کہ ہم اس کے بارے میں مشورہ نہ دیں اس کمیٹی کے ممبر حمید نظامی۔ شورش کشمیری، نورالٰہی، مولوی اختر علی خان اور پیٹمن وغیرہ اس وقت پریس برانچ کے

کرتا دھرتا تھے، چودھری محمد حسین ..... ان کی اور ہماری ہمیشہ چلتی رہتی تھی۔ حکومت نے پریس سنسرشپ لگا دی تھی کہ کسی اخبار میں فسادات کے بارے میں یا فرقہ وارانہ بغاوت کے بارے میں کوئی خبر نہ لگائی جائے اس لئے ہماری ان سے چلتی رہتی تھی۔ بہر حال جب پاکستان ایڈیٹرز کانفرنس ہوئی تو اس کے صدر تھے الطاف حسین اور نائب صدر ریسٹن تھے کیونکہ وہ واحد غیر مسلم تھے اور دوسرے نائب صدر تھے پیر علی محمد راشدی اور ہم اس زمانے میں چلے گئے اپوزیشن میں اور حمید نظامی ابھی تک انہی لوگوں کے ساتھ تھے۔ لیکن جب پہلا پریس ایکٹ بنا ہے اس کے بعد پیر علی محمد راشدی، الطاف حسین اور راولپنڈی کراچی کے اخبار ایک طرف ہم اور حمید نظامی دوسری طرف جتنی بھی لڑائیاں ہوتی رہیں وہ ہم نے مل کر لڑیں، جب تک ہم قید نہیں ہوئے، جب ہم قید ہو گئے تو تمام اخبارات نے کہا کہ ان کو فوراً پھانسی لگا دی جائے۔ صرف نوائے وقت نے کلمہ خیر لکھا تھا کہ پہلے ان کے بارے میں تحقیق تو کر لیں اور ہمارے بارے میں لکھا تھا کہ جرم ثابت ہو نہ ہو وہ الگ بات ہے لیکن جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ اتنا بُرا نہیں ہے۔ بعد میں جب ہم رہا ہو گئے پھر بھی ہماری ملاقات ہوتی، ہمارے سیاسی اختلافات رہے لیکن ذاتی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس زمانے میں ہوتا تھا کہ سیاسی اختلاف تھا لیکن دوستی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ الگ الگ خانے بنے ہوتے تھے۔

امجد :۔ یہ بات اچھی تھی، اب تو یہ حال ہے کہ ذاتی اختلاف پہلے ہوتا ہے اور بعد میں کسی اختلاف کی باری آتی ہے۔

فیض :۔ میں جب پانچ ماہ کی قید سے رہا ہو کر آیا اور پاکستان ٹائمز کے دفتر گیا وہاں پولس کا پہرہ دیکھ کر واپس گھر آ گیا تو تیسرے دن میرے ملازم نے بتایا کہ جناب پولس کی گاڑی آئی ہے، میں نے کہا کہ پھر آ گئے میں نے دیکھا کہ نذیر رضوی آئے ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ وہ کہنے لگے میں سی۔ آئی۔ ڈی کے ڈی آئی جی کی حیثیت سے نہیں آیا ہوں بلکہ تمہارے دوست کی حیثیت سے آیا ہوں ـــــ میں نے کہا بہت اچھی بات ہے اور بتاؤ کیا بات ہے کہنے لگے کہ وہ جو اخبار سرکار نے لے لیا ہے آپ اس کے چیف ایڈیٹر بن جائیں۔ میں نے کہا بھاگ جاؤ یہاں سے ....

.... تمام شرکاء مذاکرہ کا فلک شگاف قہقہہ .....

امجد :۔ یہ اچھی رہی پانچ ماہ اندر رکھ کر پھر کہتے ہیں کہ ایڈیٹر بن جاؤ ... فیض صاحب یہ جو ۱۹۵۸ء میں آپ کا صحافت سے رابطہ ٹوٹا اس کی شکل اب دو تین برس پہلے سے اس کی پھر شکل نظر آنے لگی ہے کہ آپ جو لوٹس کے ایڈیٹر ہیں اس سے ہمیں ایک امید اور توقع ہے اور ہونی چاہئے کہ پاکستان کا جو ادب ہے وہ کس حد تک بیرونی ممالک میں متعارف ہوا ہے اور اس کے لئے آپ کوئی کوشش کر رہے ہیں .... ؟

فیض :۔ جیسے میں نے کہا کہ ہمارے آنے سے پہلے وہاں شاید کوئی ایک آدھی نظم چھپی ہو ورنہ کبھی ہمارا نام نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اس دوران میں کچھ کیا ... دقت یہ تھی کہ ترجمہ کرنا پڑتا تھا انگریزی، فرانسیسی میں اسی وجہ سے مشکل ہوتی تھی لیکن تین سال سے میری ادارت میں چھ یا سات نمبر نکلے ہیں۔ اس میں ہم نے غلام عباس کی کہانی چھاپی۔ مسعود اشعر کی کہانی چھاپی۔ لطیف کاشمیری کی کہانی چھاپی اور مختلف نظمیں بھی چھاپی ہیں۔ اتنی گنجائش نکلتی تھی کیونکہ ستر ملک اس میں شامل تھے۔ اگر یہ گڑبڑ درمیان میں نہ ہوتی تو ہمارا خیال یہ تھا کہ کسی ایک ملک کا ادب لے کر اس پر بحث کی جائے اس کی چیزیں شامل کی جائیں۔ چنانچہ ہم نے نائیجیریا، ویت نام، منگولیا، انگولا پانچ چھ ملک کور کئے تھے اس سال بھارت کی باری تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے بعد پاکستان پر کریں گے۔ لیکن پھر بیروت ہی ختم ہو گیا اور بیروت کے بعد ایک سال تک افراتفری رہی پھر ابھی تنویس میں دفتر قائم تھا وہاں بد قسمتی سے وہ فلسطینی جن کے حوالے دفتر کیا گیا وہ بیچارے فوت ہو گئے۔ اب میں اس انتظار میں ہوں کہ وہاں سے اطلاع آئے ..... تو پھر نئے سرے سے کچھ کریں۔

عارف :۔ فیض صاحب یہ جو ہمارے ملک میں آزادیٔ اظہار پر مسلسل پابندی ہے چاہے وہ مارشل لاء کا دور رہا ہو یا پھر جمہوریت کا۔ اس سے تخلیقی صلاحیتوں پر کیا اثر پڑا ہے اور نئی نسل جو ادیبوں اور شعراء کی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے .... ؟

فیض :۔ یہ بات صحیح ہے کہ کسی نہ کسی صورت سے آزادیٔ اظہار پہ بندشیں ہر دور میں رہی ہیں اس لئے یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ انگریز کے زمانے میں بھی یہ پابندیاں رہی ہیں۔ لیکن اس وقت

کچھ لوگوں کو لکھنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اور وہ ان بندشوں کے باوجود اپنی بات کہہ جاتے تھے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہر کوئی نہیں لکھ سکتا۔ آپ یہ دیکھئے کہ ہر دور میں لکھنے والوں کے دو یا تین طبقے ہوتے ہیں۔ ایک تو بالکل ہی اول درجے کا سمجھ لیں جن میں علامہ اقبال اور دوسرے ساتھی آتے ہیں۔ دوسرے درجے میں اچھے لکھنے والوں کی کافی تعداد ہوتی ہے۔ ان سے جو کم درجے میں ہوتے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بندشوں کی وجہ سے ان کی آواز بیٹھ جاتی ہے.... جو دوسرے درجے کے لکھنے والے ہیں ان کے دو طبقے ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے آدھے تو ہاں میں ہاں ملانے والے ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی صلاحیتوں میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ اور باقی جو بچ رہتے ہیں وہ طریقے نکالتے رہتے ہیں۔ استعارے اور علامتیں استعمال کرتے ہیں اور ہمیں تو بزرگ کچھ عمل دے گئے ہیں وہی استعمال کرتے ہیں۔

ع جو دل کو لگانے کا ڈھب جانتے ہیں
وہ ترکیب در کیب سب جانتے ہیں

سلیم:۔ فیض صاحب آپ کی ایک کتاب تنقیدی مقالات کا مجموعہ آئی تھی کسی زمانے میں اس کا بہت چرچا ہوا تھا۔ تو اس میں آپ کا نقطۂ نظر بہت اچھا تھا۔ لیکن آپ نے تنقید کچھ زیادہ نہیں کی.....؟

فیض:۔ یہ صحیح ہے۔ اصل میں وہ جو پہلے بات ہو رہی تھی کہ کون سی چیزیں چھوڑ دی ہیں۔ تو ہماری رائے میں ابھی تک اردو ادب کی کوئی تاریخ اس نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئی کہ اس کے ادب کا لوگوں کے ساتھ کیا رشتہ تھا.... جو معاشرتی عوامل ہیں ان کا کیا رشتہ تھا.... جب ہم تین سال پہلے امریکہ گئے تو وہاں پر ہمیں کچھ سوشیالوجی اور لٹریچر پر کچھ کام تو نہیں کیا ہاں تھوڑا بہت دیکھا ادھر ادھر کے کام زیادہ تھے اور تنقید لکھنا بھی شعر لکھنے کی طرح ہے اس طرف مکمل توجہ چاہیئے اور ہم نے اس طرف خاص توجہ نہ دی البتہ یہ جو تین چار برس ثقافتی امور کے سلسلے میں جو گزارے اس میں ہم نے کوشش کی ادب کی بجائے کیوں کہ ہمارا یہ خیال تھا کہ یہاں ادب کی بجائے کلچر میں زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے اس لئے ہم نے سوچا کہ پہلے ثقافت کو ٹھیک کیا جائے پھر ادب کی طرف توجہ کریں گے اب فرصت ملی ہے تو شاید اب کچھ کریں۔

عطا:۔ فیض صاحب آپ نے ابھی جو ذکر کیا ثقافتی امور کا تو اس سے متعلق ایک سوال ہے کہ نیشنل کونسل آف آرٹس کے ساتھ جو آپ کے اختلافات پیدا ہوئے تھے اس کا پس منظر کیا تھا؟

فیض:۔ شروع میں تو یہ ہمارے حوالے کی گئی تھی ہمیں اس کا صدر بنایا گیا تھا اس کے بعد اس کی قانونی اور آئینی صورت بنائی تھی.... ہم ان دنوں یونیسکو کی کانفرنس میں گئے ہوئے تھے.... جب ہم واپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ ایکٹ بن گیا ہے حالانکہ جانے سے پہلے ہم اس کا نقشہ وغیرہ نذیر صاحب کے مشورے سے تیار کر کے گئے تھے واپس آنے پر پتہ چلا کہ ایکٹ بن چکا ہے اور اس میں صدر وزیر ثقافت ہوں گے اور اس کے بعد جنرل سکریٹری وغیرہ ہوں گے.... ہم نے کہا کہ بھئی ہم تو چپراسی گیری نہیں کر سکتے اس لئے آپ کو مبارک ہو اس پر کافی دیر تک بات چلتی رہی۔ آخر میں کہنے لگے کہ آپ مشیر بن جائیں ہم نے کہا کہ اچھا جب کوئی کام ہو گا بلا لینا۔

عطا:۔ اسی سے ملتا جلتا سوال کہ وہ جو ایک فلم بنی تھی جس کا نام غالباً سکھ کا گاؤں تھا کار دار کے ساتھ وہ کیا مسئلہ تھا؟

فیض:۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ اس کا نام تو ابھی طے ہی نہیں ہوا تھا کبھی پر یت کی ریت اور کبھی کچھ بہر حال اس کا نام طے نہیں ہوا تھا جب یہ فلم ختم ہو گئی تو اسی زمانے میں حکومت بدل گئی.... اور چونکہ انھوں نے غلطی سے طے یہ کیا تھا کہ اس فلم کو بین الاقوامی میلے میں جانا ہے اس لئے اس کی پرنٹنگ وغیرہ لندن کروائی جائے۔ لہٰذا اس کو لندن بھیج دیا گیا.... وہاں جا کر پتہ چلا کہ یہاں کراچی میں جو اس کا ساؤنڈ ٹریک بنا ہوا ہے۔ اس میں نقص ہے نئے سرے سے بنانا پڑے گا.... اب اسی دوران حکومت بدل گئی.....

شبنم:۔ ایک تو دوران میں ہمیشہ حکومت بدل جاتی ہے۔

فیض:۔ اب حکومت جو بدلی تو ساتھ ہی سارا عملہ تبدیل ہو گیا۔ وہ جو ادارہ تھا۔ نیفڈک اس پر مارشل لا نے قبضہ کر لیا.... یہ فلم اس وقت لندن میں تھی، ہدایت کار کار دار اور نیفڈک والوں کا آپس میں تنازعہ چل رہا تھا۔ کہ انہوں نے پانچ چھ ماہ سے ان کی تنخواہ نہیں دی.... وہ جو تنخواہ دار کارکن تھے، ان کو تنخواہ نیفڈک سے ملتی تھی اور نیفڈک والوں نے یہ کیا، بجائے تنخواہ دینے کے ان کو ہمارے کھاتے میں ڈال دیا تھا کہ فلم والوں سے تنخواہ ملے گی اب یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ مارشل لاء والے آ کر بیٹھ گئے اور فلم

اسٹوڈیو میں پڑی تھی۔ وہ پیسے مانگتے تھے اس میں کافی مشکلات پیش آئیں جو کافی طویل ہیں۔

مختصر یہ کہ فلم ساؤنڈ ٹریک کی ریکارڈنگ کے لئے ہدایت کار کے پاس تھی انھوں نے ہدایت کار کو قانونی نوٹس بھیج دیا کہ ہماری تنخواہیں ادا کرو ... انہوں نے جواب میں ان کو نوٹس دیدیا کہ ہم نے تمہاری کوئی تنخواہ نہیں دینی بلکہ تم نے ہمارے پیسے دینے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ، اچھا پھر ایسے تو ایسے ہی سہی اور وہ نگیٹو لیکر چلا گیا۔ اب پروڈیوسر چونکہ ہم تھے اس لئے ان کی طرف سے اب نوٹس ہمیں آنے شروع ہو گئے کہ ہمارا نگیٹو واپس دو۔ ہم نے کہا کہ تمہارا جھگڑا اس کے ساتھ ہے اور قانون کے تحت وہ جب تک فلم مکمل نہیں ہو جاتی وہ ہر کام کرنے کا مجاز ہے .... اس میں بہت لڑائی جھگڑے ہوئے۔ پھر میں نے اس کو سمجھایا کہ تصفیہ کر لو۔ بس کچھ اس قسم کی باتیں ہیں ۔

اشفاق :۔ کچھ پیچیدگیاں تھیں جو دور نہ ہو سکیں .... ویسے مارشل لاء والوں نے انہیں تو خوب پیسہ دیا ہے ...."خون حسین" کو اور "میلے" کی پروڈیوسروں کو ....

امجد :۔ یہ تو اندر کی باتیں ہیں۔ یہ عام آدمی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں ان پر خاموشی ہی بہتر ہے۔

عطا :۔ فیض صاحب یہ جو کچھ عرصے سے ہمارے ملک کی دائیں اور بائیں بازو کی کشیدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے آپ اس کو ملک کے لئے صحت مند سمجھتے ہیں، یا مضر .... ؟

فیض :۔ ظاہر ہے مضر ہے ..... اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، کم از کم بنیادی معاملات میں تو اتفاق رائے ہونی چاہیئے ۔ ٹھیک ہے بہت سے معاملات ایسے ہیں جن پر اختلافات تھے اور رہیں گے، لیکن بنیادی باتوں پر اتفاق بہت ضروری ہے۔

امجد :۔ اختلافات اپنی جگہ لیکن گھر تو گھر رہنا چاہیئے ....

فیض :۔ ہم اس میں کسی کو الزام نہیں دے سکتے کہ کس کی زیادتی ہے اور کس کی نہیں۔ پوری طرح اتفاق تو کبھی نہیں ہو سکتا لیکن جہاں ملک کے تحفظ کا تعلق ہے وہاں تو اتفاق ہونا چاہیئے۔

اشفاق :۔ کوئی تین، بنیادی باتیں بتائیں، جس سے کشیدگی کم ہو سکے۔

فیض :۔ تین تو نہیں، صرف ایک ہے کہ کم از کم یہ دیکھیں ... کہ جو اختلاف کرتا ہے وہ ضروری نہیں کہ غدار بھی ہے ـــــ اور ملک دشمن بھی ہے، یہ ایک بات ہی کافی ہے .....

سلیم :۔ فیض صاحب آپ نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے، بحیثیت ادیب صحافی شاعر اور ثقافت کے حوالے سے بڑے ادوار دیکھے ہیں، آپ نے کبھی سوچا نہیں کہ اب عمر کے اس دور میں اپنی خوبصورت سوانح عمری ہی لکھ ڈالیں .... ؟

فیض :۔ ہم نے اس بارے میں سوچا ہے اور پچھلے تین چار ماہ سے سوچ رہے ہیں .... بس ایک بات ہے کہ ابھی ذہن پوری طرح کشادہ نہیں ہوا ....

اشفاق :۔ فیض صاحب باوجود اس کے آپ کی طبیعت بہت نرم ہے اور بچپن میں کسی کو چانٹا بھی نہیں مارتے تھے، لیکن وہ کیا بات تھی کہ آپ نے کشمیر میں جا کر بھارت کے خلاف عملی طور پر جنگ میں حصّہ لیا اور بھارت کے خلاف ہتھیار اٹھائے ..... ہم تو اس وقت مزے میں یہاں بیٹھے تھے اور ڈوگرہ راج کے خلاف لڑنے آپ ہی گئے تھے، اس کی مختصر سی داستان سنائیں ....

عطا :۔ یہ اشفاق صاحب نے بات سنائی ہم سب کو اس بارے میں تجسس ہے آپ کچھ فرمائیں ....

فیض ..... یہ ریاستوں کا چکر تھا اور اس کے بارے میں معلوم یہ ہوا کہ راجہ فیصلہ کریں گے ..... لیکن واقعہ یہ تھا کہ ہم نے غلطی کی کہ راجستھان میں دو نوابوں کا اعلان منظور کر لیا ہے .... کیونکہ کسی صورت وہ یہاں نہیں آسکتے نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے وہاں قبضہ کر لیا اور ہماری حکومت نے مہاراجہ کے ساتھ کچھ معاہدہ وغیرہ کر لیا تھا .... بجائے اس کے کہ ہم شیخ عبداللہ یا کسی اور لیڈر سے بات کرتے ہم بات چیت کر رہے تھے، مہاراجہ اور وزیر اعظم سے جو ہماری رائے میں صحیح نہیں تھی۔ اس وجہ سے کچھ اور لوگوں نے بھی کوشش کی کہ وہاں کے عوام کے ساتھ یا ان کے نمائندوں سے کچھ بات وغیرہ کی جائے ... کیونکہ ہمارے خیال میں تو کشمیر کے بغیر پاکستان کا نقشہ ہی مکمل نہیں ہوتا تھا .... لیکن خیر نہیں ہو سکا، کیونکہ اوپر کے لوگوں نے اپنا کھیل شروع کر دیا ....

امجد .... فیض صاحب یہ جو اُردو نظم ہے اردو دنیا میں جو شاعری ہو رہی ہے کیا یہ اس کی سطح پر آتی ہے یا کہیں ملاپ ہوتا ہے۔

فیض .... بالکل واسطہ تو رہا ہے آپس میں رابطہ بھی تھا .... ۱۸۵۷ء جنگ آزادی کے بعد رابطہ ہوا تھا جب حالی اور مولانا آزاد

نے شروع کیا تھا، لیکن وہ بڑی سطحی چیز تھی اصل میں زیادہ قریبی رابطہ جب ہوا جب علامہ اقبال اور ان کے ہم عصر باہر سے تعلیم حاصل کرکے آئے تھے اور وہ سُنی سُنائی باتیں نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی اپنی معلومات تھیں .... ان کی گرفت تھی اور انہوں نے کام بھی کیا... ۱۹۲۵ء میں وہاں بھی رومانی دور چل رہا تھا یہاں بھی وہی چلا پھر ۱۹۳۵ء کے بعد وہاں پر فاشزم پیدا ہوا اور اقتصادی بحران پیدا ہوا تو یہاں پر بھی وہی گونج پیدا ہوئی اسی دوران میں ہمارا رابطہ جرمنوں کے ساتھ بھی ہو چکا تھا اور ایک پوری کھیپ یہاں سے گئی جس میں ڈاکٹر عابد حسین ڈاکٹر محمد اور دوسرے شامل تھے، بہت سے لوگ گئے تھے جب وہاں ترقی پسند آئے تو یہاں بھی ترقی پسندوں کا قبضہ ہوا، تو اس طرح سے رابطہ چلتا رہا ہے.... لیکن ہمارے ہاں یہ رہا کہ ہم وہاں سے لیتے رہے، اپنا کچھ خاص حصّہ نہ بھیج سکے....

اشفاق.... اصل میں ہم بھی ان کے پیچھے چلتے رہے اب ہمارے ہاں سے کیا جاتا وہاں.... اگر ہم نے مثنوی کی روایت کو سنبھال کر رکھا ہوتا تو کچھ جاتا رہتا... اب ہم ان کی عادات لے رہے ہیں مختلف چیزیں اپنا رہے ہیں....

فیض.... ہم نے تو منصوبے بنائے تھے... کہ دوسری زبانوں کے ترجمے ہو چکے ہیں فارسی شاعری اور ترکی شاعری کے ترجمے انگریزی میں ہو چکے ہیں اُردو کے ابھی تک نہیں ہوئے.... اور ہوئے تو بہت کم ہوئے یا پھر جو بڑے ناشر ہیں، ان تک نہیں پہنچ سکے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے جو اسکالر ہیں انھوں نے ابھی تک اُردو کو گھاس نہیں ڈالی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بغیر مطلب نہیں کرتے... اب ان کو عربی سے کوئی عشق نہیں ہے، بلکہ عربوں سے مطلب ہے اس لئے عربی سے مطلب ہے.... چونکہ اردو والوں سے کوئی مطلب نہیں، اس لئے اردو سے بھی کوئی مطلب نہیں ہے....

عطا.... نوبل پرائز بھی کسی اردو پر کام کرنے والے کو نہیں ملا....

فیض.... نوبل پرائز تو ویسے ہی "ریکٹ" ہے.... ہمیشہ اس میں کچھ سیاسی مصلحتیں ہوتی ہیں، پھر اس میں رشوت بھی چلتی ہے.... اب دو دفعہ امیدواروں کی لسٹ میں ہمارا بھی نام آیا.... اتنے اتنے بڑے لوگوں کی موجودگی میں بڑے ہلکے لوگوں کو دے دیا جاتا ہے.... وہاں پر سفارشیں اور رشوت دونوں ہی چلتی ہیں.... اسے آپ انگریزوں کی بات کرتے ہیں تو ان کا یہ حال ہے کہ برخوردار سلمان رشیدان کا نمائندہ شاعر ہے ان کی باتیں چھوڑیں....

عطا.... فیض صاحب عالمی سطح سے ہٹ کر عام سطح پر آتے ہیں، مجھے یاد آیا ہے کہ ایوب مرزا کی جب نثری نظموں کی کتاب چھپی تھی تو انہوں نے گھر میں رونمائی کی تھی اور آپ وہاں موجود تھے، آپ نے شروع ہی میں ایک فقرہ کہا تھا کہ تقریب نثری نظم کی ہے لیکن میری موجودگی کو نثری نظم کے بارے میں مستند نہ سمجھا جائے.... اس کا مطلب ہے کہ آپ نثری نظم کو شاعری نہیں مانتے کیونکہ آپ اس سلسلے میں پہلے بھی کچھ فرما چکے ہیں اب ذرا تفصیل سے فرمائیں....

فیض.... ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ نثری نظم کیا ہوئی یا تو اسے نثر کہو یا پھر نظم کہو نثری نظم تو کوئی چیز نہیں ہے....

عطا.... یہ اسلامی سوشلزم والی بات نہیں ہے....

فیض.... اسلامی سوشلزم تو پھر بھی سمجھ میں آتا ہے... یہ بالکل ہی نہیں آتی.... مجھے نثری نظم پر اعتراض نہیں ہے اس کے نام پر اختلاف ہے یہ کوئی نئی چیز ہمارے ہاں نہیں ہے کیونکہ پہلے بھی لوگ شاعرانہ نثر لکھا کرتے تھے، لیکن اس کو وہ نظم کا نام نہیں دیتے

عطا.... یعنی یہ شاعرانہ نثر ہے....

امجد.... کیونکہ نثری شاعری تو یہ ہے نہیں اس لئے شاعرانہ نثر ہی ہو سکتی ہے....

عطا.... فیض صاحب آپ آج کل اخبارات پڑھتے ہوں گے ان میں سیاسی لیڈروں اور دوسرے لوگوں کے ایسے ایسے بیان شائع ہوتے ہیں کہ ان کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ خدانخواستہ یہ ملک آج نہیں تو کل ٹوٹ جائے گا.... جو عجیب مایوسی کی فضا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے....؟

فیض.... ہمیں تو کوئی آثار نظر نہیں آتے ٹوٹنے کے اس لئے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کافی عرصے سے اس قسم کے وسوسے ڈالے جا رہے ہیں یہ کوئی مٹھائی ہے کہ چیل اٹھا کر لے جائے گی.... کیسے لے جائے گی۔ اگر کوئی آدمی خودکشی کرنا چاہتا ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

عطا.....آپ کا کیا خیال ہے کہ ہمارا خودکشی کا ارادہ نہیں ہے یا ہے ؟

فیض.....میرے خیال میں تو فی الحال نہیں ہے... صاف بات یہ ہے کہ ہم تو مایوس وغیرہ بالکل نہیں ہیں۔ اور "بعد از خرابی بسیار" کوئی نہ کوئی صورت نکلے گی شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالےٰ جو شر پیدا کرتا ہے اس میں سے خیر کی کرن نکلتی ہے....

امجد.....جب پاکستان بنا اور جو لوگ اس کے مخالفین تھے وہ کہتے تھے کہ یہ قائم نہیں رہے گا لیکن اب پچھلے کچھ برسوں میں سے دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ ہیں یہاں کے وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں عزت اور آبرو سے۔ اس کے باوجود ایک مایوسی کی فضا قائم کرنے کی کوشش جاری رہتی ہے۔ اب بھارت نے سوئی سے جہاز تک بنایا ہے لیکن وہاں کا عام آدمی بھی خوش اور مطمئن نہیں ہے تو اس صورت میں پاکستان میں اس کی بالکل گنجائش نہیں ہوتی چاہئے کہ اس قسم کا پروپیگنڈا کیا جائے....

فیض.....اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اب تک کوئی نظام پیدا نہیں کیا نہ تو سیاسی نظام نہ اقتصادی نظام کوئی تعلیمی نظام اور ثقافتی نظام کچھ نہیں بنایا.....کسی چیز کا بھی نقشہ پوری طرح سے اجاگر ہونے نہیں دیا..... نتیجہ اس کا یہ ہے کہ لوگوں میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے..... اب ہر پانچویں دن نقشہ بدل جاتا ہے۔

عطا.....فیض صاحب آپ ملک سے باہر تشریف لے گئے اور کافی عرصہ باہر رہے تو یہاں بعض حلقوں میں یہ کہا گیا کہ یہ خود ساختہ جلاوطنی ہے.....اس کے بارے میں کچھ فرمائیں....؟

فیض کئی وجوہات تھیں، ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہمارے پاس کوئی تعمیری کام نہیں تھا اس لئے ہمارے یہاں کوئی ضرورت تو تھی نہیں دوسری بات یہ کہ کچھ ہم نے کام شروع کر رکھے تھے، جس کے لئے ہم چلے گئے.....اور تبدیلی حالات کرنے چلے گئے....اور اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں تھی.... باقی ہم مایوس وغیرہ نہیں ہو کر گئے تھے....

عطا.....آج کل اسٹار میں ایک صاحب کالم لکھ رہے ہیں لاہور کے خلاف کہ لاہور علمی ادبی طور پر ختم ہو چکا ہے...آپ بھی لاہور کے بارے میں ایسا محسوس کرتے ہیں....

فیض.....ہم تو لاہور سے ذرا فاصلے پر رہتے ہیں....ہمیں کچھ خاص معلوم نہیں کیونکہ ہم تو یہاں سے اڈے تک جاتے ہیں اور پھر آگے چلے جاتے ہیں.....بس لاہور کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہے باقی ہمارے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہے....

عطا.....فیض صاحب ایک بار پھر آپ کا شکریہ....آج بہت اچھی باتیں ہوئیں اور یقین جانئے بہت مزہ آیا آپ تمام حضرات کا بھی بہت شکریہ۔ ○○

تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء اور میٹرک کے جنوری سنہ ۱۹۱۲ء میں درج ہے، میں نے حال ہی میں ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات کا ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳ فروری سنہ ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے۔

فیض احمد فیض ۱۶/۲/۶۵ء

فیض احمد فیض کی ایک اہم عکسی تحریر جو روزنامہ "جنگ" (کراچی) جمعہ ایڈیشن ۲۳ نومبر ۱۹۸۴ء سے حاصل کی گئی ہے۔

لطف الرحمٰن

(۱)

غرض کہ یہ بھی ہوا اب کہ بے زباں ہوں میں
کہ اپنے آپ میں ہر لمحہ رائیگاں ہوں میں

ازل سے تا بہ ابد بس وہی اکیلا پن
گذرتے لمحوں کی بے ربط داستاں ہوں میں

خلا خلا یہ خموشی کا سلسلہ پھیلا
اُفق اُفق کوئی ڈوبی ہوئی فغاں ہوں میں

عیاں ہوں زخم کی صورت اداس آنکھوں میں
کھنڈر کھنڈر کسی فردا کا پاسباں ہوں میں

یہی گداز ہے پچھلی رفاقتوں کا ثمر
جلے کہیں بھی کوئی گھر دھواں ہوں میں

اڑی ہے تیز بگولوں کے ساتھ عمر عزیز
مجھے خبر بھی نہیں ہے کہ اب کہاں ہوں میں

یہی تو چاند سے کہتا رہا سمندر بھی
میری تہوں میں کبھی دیکھ آسماں ہوں میں

بس ایک بوسۂ بے ساختہ، نجات مری
یہ سن رکھو کہ کوئی دم میں بے نشاں ہوں میں

غزل کہی ہے تو آنکھوں سے اوس ٹپکی ہے
جو سو گئیں انھیں یادوں کا نوحہ خواں ہوں میں

(۲)

اک سحر زینہ بہ زینہ میرے گھر تک آئے گی
رات کے پچھلے پہر دستک سی دَر تک آئے گی

خوف کی راہوں سے گذرے گی خطر تک آئے گی
زندگی اظہار سے ہو کر اثر تک آئے گی

سینکڑوں صحرا کا سناٹا رواں آنکھوں میں ہے
موجِ خوں جب بھی اٹھے گی سیل سر تک آئے گی

اس کی چڑھتی چاندنی کا لمس پھر روشن ہوا
پھر مری کشتی کنارے سے بھنور تک آئے گی

رہ گذر اس نے بچھا دی ہے مرے چاروں طرف
جستجو میری نہ جانے کس کے گھر تک آئے گی

ق

تشنگی منظر بہ منظر رات کی باہوں میں ہے
اک روایت نارسائی کی نظر تک آئے گی

ڈوب جائے گی ہجومِ شب میں نبضِ داستاں
بے زباں لمحوں کی لَے بامِ سحر تک آئے گی

(۳)

ایک طوفانِ تباہی کی روانی میں رہا
خواب کا تاراج منظر بے کرانی میں رہا

اب شہادت کے سوا میرے لیے چارہ نہیں
مرکزی کردار بن کر میں کہانی میں رہا

نیستی کے خوف سے دریا ہے مصروفِ گریز
مستقل صحرا لبِ ساحل بھی پانی میں رہا

عمر بھر رکھا مجھے جس نے انا کی دھار پر
وہ نشہ ٹوٹا تو رنجِ رائیگانی میں رہا

اجنبی سی اک خلش سانسوں میں پیوستہ رہی
گم ورق کوئی کتابِ زندگانی میں رہا

ہم ہی کیوں جھک کر کہیں کہ ہم تمہارے ہو گئے
اب بھی جھگڑا ہے وہی جو نوجوانی میں رہا

بس یہی رکھی تھی اس نے آخری بوسے کی شرط
عادتاً ہنسنا مرا اس کی نشانی میں رہا

● شعبۂ اردو بھاگل پور یونیورسٹی، بھاگل پور (بہار)

عنوان کے بغیر

تاجدار احتشام صدیقی

تاجدار احتشام صدیقی مرحوم کا یہ طنزیہ ان کی نامکمل تحریروں سے منتخب کیا گیا ہے۔ غالباً وہ اپنے اس مضمون پر نظرِ ثانی نہیں کر سکے تھے۔ اس طنزیے کو ہم یادگار تحریر کے طور پر قارئین شاعر کی نذر کر رہے ہیں۔ تاجدار بھائی کے کئی طنزیے اور انشائیے شاعر اور دیگر ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

○

ہمارے گھر میں مختلف النوع کیڑے مکوڑے اسی طرح گذر بسر کرنے پر مجبور ہیں جس طرح ہم تمام اہلِ خانہ زندگی کے دن گذارنے پر۔ کبھی کبھی سوچنے پر یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ قناعت پسندی کا درس ان لوگوں نے ہم سے لیا یا ہم نے ان سے، لگتا ہے کوئی خفیہ سمجھوتہ ہے۔ اب اس سمجھوتہ کی سرحد کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم یہ نہ ہمیں معلوم ہے اور نہ انھیں یا یہ کہ ایک بہت ہی چھوٹے کمرے میں رہنے والے ہم اور یہ کیڑے مکوڑے کبھی یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ اہلِ خانہ کون ہیں وہ یا ہم ؟ یہ ضرور ہوا ہے کہ کبھی راتوں کی بڑھتی ہوئی پریشانیوں میں ہم نے قتل و غارتگری کی ہوا اور اُس طرف سے بھی انتقامی کارروائیاں ہوئی ہوں۔ کھٹملوں اور مچھروں کے ساتھ قدیم اور جدید ہر طرح کے اسلحہ جات استعمال ہوتے رہے ہیں اور سالہا سال سے استعمال ہوتے آ رہے ہیں۔ ایک طرف تو گھر کے تمام افراد ہیں کہ رات رات بھر نہ صرف پہرا دیتے رہتے ہیں بلکہ ہر ممکنہ طریقہ پر دشمن پر مکمل فتح کے منتظر بھی۔ اور گھر کی تمام دیواروں پر گزشتہ دنیاؤں اور آنے والی دنیاؤں کے نقشے بنائے جاتے ہیں مسلسل جگار کی بنا پر سوجی ہوئی آنکھوں بلکہ پتھرائی آنکھوں میں آنے والے کل کے حسین خوابوں کے تصوّر اور سپنے ایسے اتھل پتھل ہیں کہ آج کا کاٹنا دوبھر۔

کھٹملوں اور مچھروں کے ساتھ ساتھ چھپکلیوں کی چمکدار آنکھیں ہم پر یوں پڑتی ہیں کہ جیسے انہیں مکھیوں کی نہیں ہماری ہی تلاش ہے۔ انتظار کا کرب جتنا چھپکلی کی آنکھوں میں جھلکتا ہے کسی عاشقِ دلگیر کی آنکھوں میں کیا جھلکتا ہوگا۔ ان کے انتظار کی مگر داد بھی دیجئے ایک ہی جگہ مسلسل کئی گھنٹوں تک چپکی رہتی ہیں کیا مجال کہ ایک سوت بھی اِدھر سے اُدھر ہو جائیں بالکل اس سوالی کی طرح کہ جس کا سوال جب تک پورا نہ ہو جائے ایک ہی در پر کھڑا رہتا ہے۔ اب ہر در سے تو حاتم طائی برآمد ہونے سے رہا۔ ہم ہیں کہ دیکھ دیکھ کر ذہنی کوفت ہی نہیں بلکہ شدید اذیت میں مبتلا ہیں۔ یقین مانیئے یہ صرف فطری بات ہے اور خاندانی شرافت بھی کہ ہمہ وقت یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ سارا قہر اور سب بلائیں ہم پر ہی نازل ہو رہی ہیں کاش کہ کوئی ایسی صورت بھی ہو کہ ہم ان چھپکلیوں کا دکھ بانٹ لیں۔ اب انھیں کیسے سمجھائیں کہ وہ ہندوستانی عوام کی طرح اپنے کار و افکار کے لئے غلط وقت کا انتخاب کرتی آئی ہیں۔ ہمارے گھر میں اور ہمارے ہی گھر میں کیا ہر ہندوستانی کے گھر میں مکھیاں عموماً دن کو ہی نظر آتی ہیں اس پر یہ شکایت کہ ہمیں کھانے کو نہیں ملتا۔ صرف ایک مکھی کی خاطر اپنا اتنا قیمتی وقت خراب کرنا ارے بھائی اور بھی بہت سے طریقے ہیں کھانے کمانے کے اور کچھ نہیں مڈل ایسٹ ہی چلی جائیں۔

کھٹملوں اور مچھروں کو مارنے کے بے شمار طریقے آپ کو معلوم ہیں اور اتفاق سے ہمیں بھی معلوم ہیں۔ چھپکلی آپ نے ماری یا نہیں یہ تو ہمیں نہیں معلوم ہاں دادی سے یا نانی سے یا دونوں ہی سے یہ ضرور سنا ہوگا کہ اگر چھپکلی کو مارنا ہے تو صرف ایک ہی وار میں مارنا چاہئے اگر چھپکلی کو ایک ہی ضرب میں مار دیا جائے تو سوا دنٹوں کا ثواب ہوتا ہے۔ سننے میں آیا تھا کہ پڑوس کے ایک لڑکے نے کسی چھپکلی کو مار دیا تھا

چھپکلی مری یا نہیں یہ تو ہمیں پتہ نہیں ہاں دو حصّوں میں تقسیم ضرور ہو گئی تھی اور دونوں حصّے مختلف جگہوں پر تین دن تک تڑپتے رہے تھے۔ ٹھیک تین دن کے بعد وہ لڑکا بھی تین دن تک تڑپتا رہا تھا۔ بہت علاج کرایا معلوم نہیں نتیجہ کیا نکلا۔ بمبئی میں اتنی فرصت کہاں کہ سب کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔ زندہ ہی ہوگا۔ مر گیا ہوتا تو پتہ چل ہی جاتا۔ پڑوسی کے مرنے کی خبر بھی نہ ملے اب ایسا بھی کیا۔

کھٹمل، مچھر، مکھی اور چھپکلی کے بعد جھینگر سے بھی ہمارے کافی قدیم تعلقات رہے ہیں۔ کلیات میر پڑھنے کے بعد اپنے اوپر مکمل طور پر دلو داسیت پیدا کرنے کے بعد اور اپنے آپ کو صفحۂ ہستی کا مظلوم ترین انسان سمجھنے کے بعد جھینگر کے تصوّر سے وابستگی پیدا ہو تی ہے۔ اگر اس میں چاندنی راتوں کی اداس تنہائیاں بھی شامل کر لی جائیں تو حسن میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ میر کی یاسیت اور فراق کی شاعری میں ہجر کے قصّے پڑھنے کے بعد جو ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے وہ جھینگر کے وجود سے پوری ہوتی ہے۔

جھینگر کی مونچھیں خطرناک حد تک خطرناک ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان سے خاندانی وقار اور اسلاف کی پشتینی اور سپہ سالاری کا دُور دُور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ صرف دیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ حالانکہ دُور سے دیکھیں تو بس یہی لگتا ہے کہ جیسے گورنر صاحب کی گاڑی سے پہلے موٹر بائک پر ان کے باڈی گارڈ (جس کا مصرف کچھ بھی نہیں)

جھینگر مارنے کے لئے موجودہ تمام ادویات بالکل بے کار ہیں۔ انھیں مارنے کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ آپ کو امرت راج پرا در س کی طرح ٹینس کا چیمپئن ہونا چاہیئے کہ آپ فوری طور پر اندازہ لگا سکیں کہ مقابل سے آنے والا جھینگر اب کس طرف جائے گا کہ آپ فوری طور پر اپنے ریکٹ کے ساتھ مختلف طرح کے زاویے بناتے ہوئے جائے وقوع تک پہنچ جائیں اور اگر وقتی طور پر ریکٹ کا اہتمام ممکن نہ ہو تو پلاسٹک اور ربر کی چپلیں جھینگر مارنے کے سلسلے میں بہترین ہتھیار ثابت ہوئی ہیں کہ ان چپلوں کے خریدنے کا کوئی تو جواز پیدا ہو۔ ایک آخری بات اور بتاتے چلیں کہ جھینگر مارنے کے بعد جتنا افسوس آپ کو ہوتا ہوگا اتنا ہی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہمیں ہوتا ہے۔ کیونکہ جھینگر کا معاملہ تو بہ قول غالب ؎

جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا
والا ہوتا ہے مگر یہ سُرخی صرف دکھاوے کی ہے کہ ؎ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

جھینگر کے بعد اب ان سے بھی مل ہی لیجئے کہ ان کے بغیر یہ فسانہ ادھورا ہے۔ جی ہاں میری مُراد ہے چوہے سے۔ چوہے نہیں بلکہ چوہوں سے۔ یہ واحد حاضر میں بھی اتنے ہی خطرناک ہیں جتنے جمع غائب میں۔ ماضی کی ایک اچھی سی خبر تھی کسی اخبار میں پڑھی تھی (نہ جانے کیوں ماضی کی ساری خبریں اچھی معلوم ہوتی ہیں) شاید ماضی بعید اور ماضی قریب کے درمیان کا کوئی زمانہ رہا ہوگا۔ بہر حال خبر کچھ یوں تھی کہ ہمارے وطن ہندوستان میں اتنا زبردست اناج پیدا ہوتا ہے کہ اسے محفوظ رکھنے کا انتظام حکومت کے پاس نہیں چنانچہ ہمارے وطن عزیز کی پیداوار کا ایک بہت بڑا حصّہ ان چوہوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اپنی مفلسی سے قطع نظر کہ اس کے مسلسل تذکرہ سے اب طبیعت اوب سی گئی ہے۔ اپنے گھر کے اناج کے خالی ڈبوں کو دیکھ کر اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا اس احساس سے روحانی تکلیف ہوتی ہے کہ ملک کے اناج کے ذخائر کو برباد کرنے والی فوج کے کچھ جانباز ساتھی ہمارے ہاں بھی اپنے آپ کو نظر بند کئے ہوتے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ اپنی زندگی کو جوکھم میں ڈالے آئے دن نت نئی اذیتوں کو برداشت کر رہے ہیں (یا برداشت کرنے پر مجبور ہیں)

ہماری حسرت بھری نظریں اپنے گھر کی دیواروں پر پڑتی ہیں اور جب ہم ان بلوں کی طرف دیکھتے ہیں جن میں سے ان گنت چوہے اپنی گردن باہر نکالے اس دنیا کی نیرنگی کا معائنہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ہم پر ایک عجیب سا عالم گزر جاتا ہے اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ ہماری نظروں میں حسرت زیادہ ہے یا ان کی آنکھوں میں یاسیت کا رنگ۔ فقر کا یہ انداز، اس عالم رنگ و بو سے یہ بے نیازی، سرمستی کا یہ عالم، جینے کا یہ انداز کہ فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ ہمیں ان سے اتنی مانوسیت کہ روٹیوں کے ٹکڑے ٹکڑے پنجرہ میں لگا کر رات رات بھر سکے مگر کیا مجال کہ انھوں نے اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ اتنے صابر اور اتنے شاکر کہ کبھی کسی چھوٹی موٹی واردات کے بعد اگر کوئی جاں بحق بھی ہوا ہے تو ہمیں احساس فتح سے زیادہ اس کی مرگ ناگہانی پر دکھ ہوا ہے۔ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے وغیرہ وغیرہ

مغنی تبسّم

۱

بیداری کے خوابِ گراں ہیں میرے بھی
خوابوں میں آباد جہاں ہیں میرے بھی

قیدِ مکاں سے باہر ہیں سب میرے خواب
بے تقویمِ نفسِ امکاں ہیں میرے بھی

میں نے بھی ساحل سے باندھے ہیں پیماں
بحر میں تیرے کچھ طوفاں ہیں میرے بھی

میں نے بھی کچھ رنگ بھرے ہیں خاکوں میں
کچھ منظر یاں خاک نشاں ہیں میرے بھی

منزل منزل تیرے کرم کے ڈیرے ہیں
تپتی دھوپ میں دشت رواں ہیں میرے بھی

تیرے بگولوں میں رقصاں ہے میری خاک
صحرا صحرا کارِ زیاں ہیں میرے بھی

۲

نظر کے سامنے صد رنگ روشن آئینے ہیں
مگر یہ سلسلے سارے خمارِ خواب کے ہیں

گزشتہ موسموں کے خواب میں دیکھا تھا جن کو
وہی منظر نگاہوں میں ابھی تک گونجتے ہیں

کہاں سے آئے گا رنگِ تمنّا ساعتوں میں
ہنوز اک زندگی ہے اور غم بیتے ہوئے ہیں

غنیمت ہے بہت یہ نغمۂ زنجیر بھی اب
کہ اس کے بعد سب قحطِ نوا کے مرحلے ہیں

نیا یہ غم ملا ہے اب سرِ منزل پہونچ کر
جو چھوڑ آئے ہیں پیچھے نقشِ پا، سب مٹ رہے ہیں

★ ਨਿਰਦਈ ਸੁੰਦਰੀ ★

ਕੁਝ ਉਹ ਵੈਸੇ ਹੀ ਸੁਹਣੀ ਸੀ ਤੇ ਕੁਝ ਉਹ ਇਸ ਪਾਸੇ ਧਿਆਨ ਵੀ ਵਾਹਵਾ ਹੀ ਦੇਂਦੀ ਸੀ। ਲੱਗਦੀ ਸੀ ਉਹ ਕੁੜੀ ਚਿੜੀ, ਪਰ ਸੀ ਬੱਤੀ-ਤੇਤੀ ਸਾਲ ਦੀ! ਉਸ ਦਾ ਵੱਡਾ ਮੁੰਡਾ ਅੱਠਵੀਂ ਵਿੱਚ ਤੇ ਕੁੜੀ ਪੰਜਵੀਂ ਵਿਚ ਸੀ। ਉਹ ਪਿੰਡ ਲਾਗੇ ਹੀ, ਖੇਤਾਂ ਵਿਚ ਵੱਡਾ ਸਾਰਾ ਬੰਗਲਾ ਬਣਵਾ ਤਾਂ ਬੈਠੀ, ਪਰ ਦਿਲ ਕਿਵੇਂ ਲੱਗੇ? ਸੋ ਉਹ ਭਾਲ ਰਹੀ ਸੀ, ਕੋਈ ਚੰਗਾ ਕਿਰਾਏਦਾਰ। ਇਲਾਕੇ ਵਿਚ ਕੰਮ ਕਰਨ ਵਾਲੇ ਕਈ ਕਰਮਚਾਰੀ ਕਿਰਾਏਦਾਰ ਬਣਨ ਆਏ, ਪਰ ਕੋਈ ਪਸੰਦ ਵੀ ਆਵੇ? ਸ਼ਾਇਦ ਇਸੇ ਕਰਕੇ ਪਿੰਡ ਦੇ ਇਕ ਕਵੀਸ਼ਰ ਨੇ 'ਨਿਰਦੱਈ ਸੁੰਦਰੀ' ਦੇ ਨਾਂ ਨਾਲ ਉਸਨੂੰ ਮਸ਼ਹੂਰ ਕਰ ਦਿੱਤਾ ਸੀ। ਇਕ ਦਿਨ ਇਕ ਮਾਸਟਰਨੀ, ਜੋ ਨਵੀਂ ਨਵੀਂ ਤਬਦੀਲ ਹੋ ਕੇ ਇਸ ਪਿੰਡ ਆਈ ਸੀ, ਉਸ ਬੰਗਲੇ ਤੇ ਆ ਪਹੁੰਚੀ ਤੇ ਇਕ ਦਿਲਚਸਪ ਵਾਰਤਾਲਾਪ ਹੋਇਆ:—

ਮਾਲਕਣ—ਬੱਚੇ ਕਿੰਨੇ ਨੇ?

ਮਾਸਟਰਨੀ—ਜੀ, ਬੱਸ ਇੱਕੋ, ਇਹੋ ਕੁੱਛੜ ਵਾਲਾ, ਤਿੰਨ ਮਹੀਨਿਆ ਦਾ ਹੈ!

ਮਾਲਕਣ—ਬੀਬੀ, ਇਸ ਗੱਲ ਦੀ ਕੀ ਗਰੰਟੀ ਹੈ ਤੂੰ ਇਕ ਤੇ ਟਿਕ ਕੇ ਰਹੇਂਗੀ? ਮੇਰੇ ਪਹਿਲੇ ਮਕਾਨ ਦਾ ਸੱਤਿਆਨਾਸ ਇਕ ਫੁੱਟਬਾਲ-ਟੀਮ ਨੇ ਕੀਤਾ ਸੀ। ਲੋਕੀਂ ਇਸ 'ਟੀਮ' ਨੂੰ ਪਰਵਾਰ ਕਹਿੰਦੇ ਨੇ। ਦੋ ਸਾਲ ਦਾ ਕਿਰਾਇਆ ਛੱਡਿਆ, ਤਾਂ ਕਿਤੇ ਮਕਾਨ ਖਾਲੀ ਕਰਵਾਇਆ। ਮਾਪੇ ਕਿਰਾਇਆ ਦੇਂਦੇ ਵੀ ਕਿੱਥੋਂ?

ਮਾਸਟਰਨੀ—ਜੀ, ਮੈਂ ਤਾਂ ਵਕਤ-ਸਿਰ ਕਿਰਾਇਆ ਦੇਵਾਂਗੀ, ਯਕੀਨ ਜਾਣੋ!

ਮਾਲਕਣ—ਠੀਕ ਹੈ, ਪਰ ਪਹਿਲਾਂ ਕੁਝ ਉਪਾਅ ਕਰਨਾ ਪਏਗਾ! ਹਾਂ ਸੱਚ, ਤੂੰ ਅਜੇ 'ਤਾਂਬੀ' ਰਖਵਾਈ ਏ ਕਿ ਨਹੀਂ?

ਮਾਸਟਰਨੀ—"...?"

ਮਾਲਕਣ—ਚਿੰਤਾ ਵਾਲੀ ਕੋਈ ਗੱਲ ਨਹੀਂ, ਮੈਂ ਕਈ ਸਾਲ ਰਖਵਾਈ ਰੱਖੀ ਹੈ, ਸਰੀਰ ਨੂੰ ਪਤਾ ਹੀ ਨਹੀਂ ਲੱਗਦਾ।

ਮਾਸਟਰਨੀ—ਪਰ...?

ਮਾਲਕਣ—ਹੈਂ! ਕੱਪੜੇ ਨਹੀਂ ਆਏ?

ਮਾਸਟਰਨੀ—ਬੱਸ ਭੁੱਲ ਹੋ ਗਈ! ਪਤੀ-ਦੇਵ ਤਾਂ ਸਗੋਂ ਉਸੇ ਦਿਨ ਤੋਂ ਨਰਾਜ਼ ਨੇ।

ਮਾਲਕਣ—ਕੋਈ ਗੱਲ ਨਹੀਂ; ਸਰਕਾਰੀ ਹਸਪਤਾਲ ਜਾ, ਨਿਵਾਰਨ ਕਰਵਾ ਆ, ਲਾਗੇ ਹੀ ਹੈ! ਮਨਜ਼ੂਰ ਈ ਕਿ ਨਹੀਂ?

ਮਾਸਟਰਨੀ—ਮਨਜ਼ੂਰ ਹੈ ਜੀ!

ਮਾਲਕਣ—ਬੀਬੀ ਰਾਣੀਏ, ਅੰਦਰ ਆ ਜਾ ਤੇ ਬੈਠਕ ਵਿੱਚ ਸਜ ਜਾ! (ਉੱਚੀ ਆਵਾਜ਼ ਮਾਰ ਕੇ), 'ਪ੍ਰੀਤੋ ਦੇ ਪਾਪਾ! ਸੁਣਦੇ ਹੋ? ਸਾਡੇ ਸੁਪਨਿਆਂ ਦੀ ਕਿਰਾਏ-ਦਾਰਨੀ ਆ ਪਹੁੰਚੀ ਹੈ! ਮਹਾਰਾਜ, ਛੇਤੀ ਚਾਹ ਬਣਾ ਕੇ ਲਿਆਉ ਜੀ! (ਅਧਿਆਪਕਾ ਨੂੰ) ਮੈਂ ਜਦ ਦੀ 'ਨਲਬੰਦੀ' ਕਰਵਾਈ ਏ, ਮੇਰੇ ਪਤੀ ਜ਼ਰਾ ਵਧੇਰੇ ਹੀ ਆਗਿਆਕਾਰ ਹੋ ਗਏ ਨੇ। 'ਮੇਰਾ ਨਾਅਰਾ ਏ—"ਸੁੰਦਰੀਓ, ਸਾਰੀ ਉਮਰ ਸੁੰਦਰ ਰਹੋ, ਤੇ ਮਰਦਾਂ ਨੂੰ ਰੰਨ-ਮੁਰੀਦ ਬਣਾਈ ਰੱਖੋ! ਤੂੰ ਵੀ ਕੁਝ ਸਿਆਣੀ ਲੱਗਦੀ ਏਂ, ਫ਼ਿਕਰ ਨਾ ਕਰ। ਮੈਂ ਆਪ ਜਾਵਾਂਗੀ ਤੇਰੇ ਨਾਲ, ਹਸਪਤਾਲ, ਅੱਜ ਹੀ, ਹਾਂ!!"

ਪ੍ਰਕਾਸ਼ਕ: ਡਾਇਰੈਕਟਰ, ਸਿਹਤ ਤੇ ਪਰਵਾਰ ਕਲਿਆਣ, ਪੰਜਾਬ।

افتخار امام صدیقی

○

نغمے سے ساز، ساز سے مضراب ہٹ نہ جائے
دھیمے سُروں میں گاؤ کہ آواز پھٹ نہ جائے

اب تک تو کھیل کھیل میں ہارا کیے ہیں ہم
سنبھلیں کہ اب جناب کی بازی الٹ نہ جائے

طاقت، جنون، نفرتیں، شدت، تباہیاں
ڈر ہے کہ خاک و خون میں دنیا سمٹ نہ جائے

حرف و صدا میں فاصلے بڑھنے لگے ہیں اب
صدیوں کا سلسلہ کہیں لمحوں میں بٹ نہ جائے

○

سوال حیرت، جواب حیرت
ہے لمحہ لمحہ، عذاب حیرت

زمیں تباہی، فلک خموشی
قدم قدم، اضطراب حیرت

سوال آنکھیں، سکوت منظر
کوئی تو ہو انقلاب حیرت

خزاں تھی کل بھی، خزاں ہے اب بھی
مگر یہ ذکرِ گلاب حیرت

تضاد تجھ میں، تضاد مجھ میں
یہ چہرہ چہرہ نقاب حیرت

ہیں میری سانسیں، تمام دنیا!
اور ایک لمحہ حبابِ حیرت

○

شدّتِ تنہائی سے کٹ جائیں گے
بادباں احساس کے پھٹ جائیں گے

اک ذرا سی بے رخی سے آپ کی
حرف ہیں روشن مگر چٹ جائیں گے

دور تک ہیں بستیاں جلتی ہوئی
کارواں اب شور میں اُٹ جائیں گے

سلسلہ در سلسلہ تقسیم .. کا
تیز ہے اتنا کہ سب بٹ جائیں گے

اردو کا عالمی منظر نامہ

یورپ میں اردو ایک سفرنامہ

رام لعل
شانتی نکیتن، ڈی - ۲۲۹۰، اندرا نگر، لکھنؤ (یو۔پی)

میں ۱۹۷۸ء میں پہلی مرتبہ یورپ گیا تھا جہاں میری پہلی منزل ناروے تھی۔ ناروے کی رائٹرس یونین نے مجھے وہاں کے سفر کے لئے مالی امداد دی تھی اور اوسلو میں ایک انٹرنیشنل سمینار میں بھی شرکت کی دعوت دی تھی جو عالمی سنسرشپ کے موضوع پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس سمینار میں تیرہ ممالک کے مندوبین نے شرکت کی تھی۔ ناروے میں قیام کے دوران مجھے وہاں کی ثقافت، سماجی نظام اور ایشیائی ممالک کے تارکینِ وطن کے مسائل کا بھی بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ لگ بھگ دو ماہ کے سفر میں میں نے ناروے کے علاوہ سویڈن، ڈنمارک اور انگلینڈ کی سیاحت کر لی تھی اور ہندوستان واپس آکر میں نے ایک سفرنامہ "خواب خواب سفر" کے عنوان سے لکھا تھا جو بعد میں ۱۹۸۳ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۱۹۸۴ء میں ناروے کا میرا دوسرا سفر اسی سفرنامے کی رسمِ افتتاح کے سلسلے میں تھا جس کا اہتمام وہاں کے ملٹی کلچرل ایکٹوٹی سنٹر اور ایک ادبی انجمن "ادبی سنگت" نے کیا تھا۔ اس تقریب کے لئے اوسلو کے اردو ماہنامہ کارواں، نارویجین رائٹرس یونین اور نارویجین حکومت کے شعبۂ ثقافت نے اپنا اپنا مالی تعاون دیا تھا۔ جس کی بدولت میں اس مرتبہ ڈھائی ماہ کے سفر میں ناروے کے علاوہ سویڈن، ڈنمارک، مغربی جرمنی، سوئٹزرلینڈ، فرانس، انگلینڈ اور روس کے دارالحکومت ماسکو کی بھی سیاحت کر سکا۔

ناروے اسکنڈے نیویا کے تین ممالک میں سے ایک ہے دوسرے دو ممالک سویڈن اور ڈنمارک ہیں۔ ناروے کی آبادی چالیس لاکھ ہے جس میں ایشیائی ممالک کے قریباً پندرہ ہزار لوگ ہیں۔ ان میں اردو جاننے والے دس ہزار لوگ صرف پاکستان کے ہیں۔ دو ہزار ہندوستانی نژاد ہیں جو اردو ہندی اور پنجابی زبانیں جانتے ہیں۔

اردو والوں کے لئے اوسلو سے اردو کا ایک ماہنامہ کارواں سید مجاہد علی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے جس میں ادبی حصّے کے علاوہ تارکینِ وطن کے مسائل اور وہاں کی حکومت کے جاری کئے گئے قوانین وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ ایک روزنامہ اخبار وطن کے نام سے بھی شائع ہوتا ہے۔ ہندی پنجابی اور انگریزی زبانوں کے دو ماہنامے پریچے اور پہچان بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان سب کا انتظام تارکینِ وطن کے ہاتھ میں ہے۔

اوسلو سے ناروے ریڈیو سے ہر جمعہ اور اتوار کو اردو، ہندی، پنجابی اور بنگالی کے پروگرام بھی نشر کئے جاتے ہیں جن کی مدّت آدھ گھنٹہ ہوتی ہے۔ اس کے پروڈیوسر انیس احمد ہیں جو اردو کے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ناروے سے ہر اتوار کو آدھ گھنٹے کے لئے ایک اور پروگرام امیگرانٹ ریڈیو سے بھی نشر کیا جاتا ہے جس میں تارکینِ وطن کے مسائل کے علاوہ اردو کی ادبی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔

ناروے ریڈیو سے مجھ سے انیس احمد اور ایک اور اردو افسانہ نگار سعید انجم نے اردو ادب میں سفرناموں کی اہمیت کے موضوع پر گفتگو کی تھی۔ وہاں کے نارویجین روزنامہ "آربائید ربلادے" نے میرے یورپ کے سفرنامے کی پانچ طویل اقتباسات قسط وار شائع کئے جن میں تارکینِ وطن کے مسائل کے علاوہ ایک نارویجین سوسائٹی کے بارے میں میرے تاثرات بھی شامل تھے۔ اخبار کے علاوہ نارویجین ماہنامہ ایوانڈرر انفارمیشن کی سب ایڈیٹر برت شومان نے مجھ سے طویل انٹرویو لئے جن میں میں نے اس بات پر زور دیا کہ ترقی یافتہ ممالک میں تیسری دنیا کے لوگوں کے ساتھ نسلی امتیاز نہیں برتا جانا چاہئے اور تارکینِ وطن کے جن ادیبوں کے شعور کی تربیت نئے معاشرے نے کی ہے اور جن کی تخلیقات میں نئے معاشرے کی عکّاسی ملتی ہے اس ادب کو یورپی معاشرہ اپنا ادب سمجھ کر قبول کرے اور اس زبان کی بھی سرپرستی کرے جس میں یہ ادب خلق کیا جا رہا ہے۔

[illegible]

اوسلو کے اردو ادیبوں کی انجمن" ادبی سنگت"، نے میرے ساتھ ایک شام افسانہ منائی تھی جس میں اردو کے علاوہ ہندی کا بھی ایک افسانہ سُنایا گیا۔ ان افسانہ نگاروں میں ڈنمارک میں مقیم پاکستان کے سابق ڈپلومیٹ رضی صدیقی، سعید انجم، شاہد وسیم، ولوذ پاسی، ارشد اقبال اور علی اصغر شاہد شامل تھے۔ ادبی سنگت اور سپیچے کی دوسری نشستوں میں مجھے سریش چند شکلا، شگفتہ انور، جوشی جی، خالد حسین اور نوید انجم ملک کی بھی کہانیاں سننے کا اتفاق ہوا۔ ان ساری کہانیوں میں ایک بات یہ مشترک تھی کہ ناروے کا نیا معاشرہ ایشیائی تارکین وطن کو اجنبیت اور تنہائی کا احساس دے رہا ہے اور ان کے احساسات میں احتجاج کی آواز خاصی بلند ہے۔ ناروے میں مقیم اردو افسانہ نگار سعید انجم نے کچھ فلموں کے لئے اسکرپٹ بھی لکھے ہیں۔ ایک نارویجین فلم ڈائرکٹر ایسپن نے مجھے اور دوسرے ڈائرکٹروں کی بنائی ہوئی چار فلمیں دکھانے کا بھی اہتمام کیا جس میں سعید انجم کی لکھی ہوئی فلم" دروازے بند ہوتے ہیں" شامل تھی۔ اس فلم کی کہانی اردو کے ایک شاعر عاصم صحرائی کی ایک نظم کے گرد گھومتی ہے۔ اس فلم کی شوٹنگ اوسلو اور لاہور میں کی گئی تھی جس کا مرکزی کردار خود عاصم صحرائی ہے۔ اس کی کہانی بھی نارویجین سوسائٹی کی ایشیائی لوگوں سے بے اعتنائی کی عکاسی کی گئی ہے اور یہ فلم بیک وقت اردو اور نارویجین دونوں زبانوں میں پیش کی گئی ہے۔ نارویجین معاشرے کے آزاد اور کشادہ دل دانشوروں نے اس موضوع کی خاصی تعریف کی ہے۔

میں ناروے سے بذریعہ ٹرین کوپن ہاگن گیا جہاں دو روز قیام کیا اور وہاں کے ایشیائیوں سے ملا۔ وہاں بھی اردو جاننے والے بے شمار لوگ ملے۔ کوپن ہاگن سے جنیوا تک کا سفر میں نے اردو کی ایک نئی افسانہ نگار خاتون شہانہ جمشید اور اس کے شوہر محمد جمشید خان کے ساتھ ان کی کار کے ذریعہ کیا۔ جرمنی کے دو بڑے شہر فرنکفرٹ اور ہائیڈل برگ دیکھے۔ ہائیڈل برگ کی یونیورسٹی میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال زیر تعلیم رہے تھے۔ وہاں دریائے رائن کے کنارے ایک تراہا انہی کے یعنی اقبال اوفیر کے نام سے موسوم ہے۔

جنیوا بین الاقوامی تنظیم یعنی U.N.O کا ہیڈ کوارٹر ہے جہاں دنیا کی قریب قریب ساری قومیتوں کے مدبّر رہتے ہیں۔ وہاں کئی ایشیائیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ ہندوستانی اور پاکستانی نمائندوں نے اپنے اپنے لوگوں کے علاوہ دوسری قومیتوں کے لوگوں سے بھی ملانے کے لئے خصوصی تقریبات منعقد کیں۔ ہندوستان کے شعبہ اقتصادیات کے سربراہ لیاقت علی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جن کی بیگم مسز صہبا علی اسرار الحق مجاز مرحوم کی سگی بھتیجی ہیں اور وہاں سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ جنیوا نیوز کے ادارتی عملے میں شامل ہیں۔

شہانہ اور جمشید خان کے ساتھ میں نے سوئزرلینڈ کے کئی شہروں اور قصبوں کی سیر کی۔ جن میں ایک گاؤں ویوے اس لئے قابل ذکر ہے کہ وہاں مشہور و معروف اداکار چارلی چپلن پیدا ہوا تھا اور مرنے کے بعد وہیں دفن ہے ایک جھیل کے کنارے اُس کا قدآدم بُت بھی نصب ہے۔

میں نے جنیوا سے پیرس تک کا سفر یورپ کی سب سے تیز رفتار ریل گاڑی کے ذریعے کیا۔ ریل کے سفر کو میں نے ہمیشہ ایک سماجی کارواں کے نام سے یاد کیا ہے۔ کیونکہ اس میں ملک کا پورا اور زندہ معاشرہ مل جاتا ہے لیکن اس ٹرین میں تو فرانس کے علاوہ دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ میرے ہم سفر تھے۔ پیرس میں بھی جو ایک بین الاقوامی شہر ہے ساری قومیتوں کے لوگ ملے تھے۔

ڈنکرک سے ڈوور تک کا سفر جس کے درمیان انگلش چینل حائل ہے میں نے ایک بحری جہاز کے ذریعے کیا۔ لندن میں گیارہ روز کے قیام کے دوران مجھے بے شمار ہندوستانی، پاکستانی، عرب اور ویسٹ انڈیز کے لوگ ملے جن میں ادیب، شاعر، صحافی اور دوسرے پیشوں سے متعلق افراد تھے۔ چونکہ گزشتہ سفر میں لندن میں قیام کر چکا تھا اس لئے اس مرتبہ وہاں میں نے زیادہ تر وقت اہل قلم کی معیت میں گزارا۔ ساقی فاروقی (جو ایک مشہور شاعر ہیں) کے ساتھ میں نے ان عمارات کی زیارت کی جہاں رابندر ناتھ ٹیگور، ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور کیٹس رہائش پذیر ہو چکے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک صحافی شاہد علی سید بھی تھے اور ہم نے اولڈ بل اینڈ بش ریستوران میں جا کر لنچ بھی کیا جہاں چارلس ڈکنز ہر روز شام کو شراب پینے کی غرض سے جایا کرتا تھا۔ لندن میں اردو مرکز نے اور اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز اسکول لندن یونیورسٹی میں ایک استقبالیہ دیا جہاں میری ملاقات احمد فراز، افتخار عارف، زہرہ نگاہ، فارغ بخاری، شہرت بخاری، سوہن راہی، جتیندر بلو، گلشن کھنہ، رضا علی عابدی، چاند کرن جمیل مدنی، سحاب قزلباش وغیرہ بے شمار اہل قلم سے ہوئی۔ اس محفل میں ہمارے ہندوستان سے گئے ہوئے ہیکل انساہی اور آفاق فاخری کے بھی نیاز حاصل ہو گئے۔ ایک اور استقبالیہ فیض اکاڈمی نے دیا تھا جہاں" تارکین وطن کے مسائل اور اردو ادب" پر مباحثہ چھڑ گیا تھا۔

انجمن سخن زار نے میرے ساتھ ایک شام افسانہ اردو مرکز میں منائی جہاں مجھے شاہدہ احمد، علی رضا عابدی، امیر زہرہ اور چاند کرن کے افسانے سنوائے گئے۔ میری نظر سے لندن کی ایک مطبوعہ کتاب "برطانیہ میں اردو کے افسانے" بھی گزری جس میں عبداللہ صیف، جتیندر بلو، شاہدہ احمد، پروین میرزہ، صفیہ صدیقی وغیرہ کے افسانے شامل ہیں۔ ان سب افسانوں میں ایک نئی تخلیقی جہت یہ دیکھنے کو ملی کہ برطانیہ میں رہنے والے ہمارے ایشیائی تارکین وطن نئے معاشرے کی تبدیلیوں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرتے جا رہے ہیں اگرچہ ان کی مشرقی وابستگیاں بھی جذباتی طور پر انہیں ماضی اور اپنی سرزمین سے یکسر الگ نہیں ہونے دیتیں۔

لندن اردو کے ایک اور بڑے مرکز کے طور پر بڑی تیزی سے ابھر رہا ہے جہاں ہر روز کہیں نہ کہیں مشاعرے یا ادبی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ وہاں سے اردو کے دو بڑے روزنامے جنگ اور وطن شائع ہوتے ہیں۔ جنگ نے ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال اور اردو اکاڈمیوں سے متعلق مجھ سے ایک طویل انٹرویو لیا۔ تارکین وطن کے انگریزی ہفت نامہ ایشین ٹائمز کے علاوہ بی بی سی کی اردو ہندی سروس نے بھی مجھ سے انٹرویو لئے جو تارکینِ وطن کے مسائل کے علاوہ میری افسانہ نگاری سے متعلق تھے۔ سوہن راہی، شاہد علی، سیّد، چاند کرن اور گلشن کھنّہ نے میرے ساتھ الگ الگ شامیں مناکر کئی اردو ادیبوں سے متعارف کرایا۔

انگلینڈ سے ناروے کی طرف واپسی کا سفر میں نے بحری جہاز سے کیا مکمل دو دن سطحِ سمندر اور اس پر پھیلے ہوئے وسیع آسمان کی مختلف کیفیات کا مطالعہ کیا جس کے ساتھ میرے دل و دماغ پوری طرح ہم آہنگ تھے۔

ناروے سے دو دن کے لئے میں سوئیڈن کی راجدھانی اسٹاک ہولم گیا جہاں پاکستان فرینڈز فورم نے ایک استقبالیہ کا اہتمام کر رکھا تھا وہاں میری ملاقات ایک سو سے زائد اردو جاننے والے لوگوں سے ہوئی جن کے سامنے میں نے اردو کے ماضی اور حال کے بارے میں تقریر کی اور بے شمار سوالات کے جوابات دیئے۔ اسٹاک ہولم سے بھی اردو کے کئی چھوٹے چھوٹے اخبارات اور گزٹ شائع ہوتے ہیں۔ اور وہاں اردو تصانیف بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

ہندوستان لوٹتے ہوئے دو دن کے لئے میرا قیام ماسکو میں بھی رہا جہاں میں نے ریڈ اسکوائر، کریملن، بولشوئیک تھیٹر، گورکی اسٹریٹ اور بے شمار تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ لیکن وہاں کے قیام کے دوران میرا سب سے بڑا تجربہ ایک ہوٹل میں ایک ساتھ درجنوں قومیتوں کے لوگوں سے ملنے کا تھا جن میں ہندوستانی، پاکستانی، الجیرین، افغان، افریقی، ڈینش، سویڈ، آسٹریلین، فرانسیسی وغیرہ شامل تھے۔ یوں بھی میں اڑھائی ماہ کے اس طویل سفر میں جگہ جگہ بے شمار لوگوں سے ملتا رہا اور میرے پاس ان کی مختلف ثقافتوں، لباسوں، زبانوں، طرزِ زندگی، رویوں اور سیاست کے بارے میں اتنی یادداشتیں محفوظ ہیں جنھیں میں مختصر سے مضمون میں سمیٹنا بھی چاہوں تو ایسا نہیں کر سکوں گا۔ میں انسانی ہمدردی کا ایک ایسا بیش بہا خزانہ سمیٹ کر اپنے ساتھ لا سکا ہوں جس کے تفصیلی ذکر کے لئے مجھے پھر ایک کتاب لکھنی پڑے گی اور اس ذی مشقت کے لئے میں فرصت کے ان لمحات کا متلاشی ہوں جو مجھے دوسرے سارے معمولات سے ایک مرتبہ پھر بے نیاز کر دیں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں

ع کام اب کوئی نہ آئے گا بس، اب دل کے سوا ۔ ○

بقیہ: صفحہ ۱۰۰ عنوان کے بغیر

قسم کے اشعار سے دل کو ڈھارس بندھانے کے بعد جب کبھی یہ کوشش کی کہ ان کا کچھ شمار ہی کر لیا جائے کہ کچھ لوگ ہر گھر میں ایسے ضرور ہوتے ہیں کہ جن کے لئے زندگی کا لازمی جزو ہوتا ہے اور جنھیں اس بات کا یقین دلانا بے حد ضروری ہوتا ہے کہ دل ایک منٹ میں واقعی بہتّر مرتبہ دھڑکتا ہے۔ تو جہاں تک شمار کرنے کا تعلق ہے تو اب کیا بتائیں کہ ہر بل میں چوہوں کے داخل ہونے کے بعد بھی بل من مزید کی آوازیں آتی ہی رہتی ہیں۔ اب کیا کہ ان چوہوں نے تو اردو کے بہت سے محاوروں کا حلیہ ہی بگاڑ دیا ہے۔ بڑی قد و قامت کے ہو گئے ہیں۔ یہ اب تو ڈھیٹ، ضدّی، پلٹ کر مقابلہ کرنے والے۔ اثر و رسوخ بھی بہت پیدا کر لیتے ہیں چنانچہ آزادانہ جہاں چاہیں گھس جائیں اور جو چاہیں کر ڈالیں، آپ کیا کر لیں گے ان کا؟ کچھ بھی نہیں، تمام حربے ناکارہ، تمام کوششیں بیکار۔ ایک ہمارے ہی گھر پر کیا موقوف یہ تو ہر جگہ موجود ہیں۔ فقیر سے لے کر امیر تک اور گھر سے لے کر سرکاری اور نیم سرکاری دفتروں تک۔ ○

ع ان ہی چوہوں کے ...

پاکستان میں اردو

مرتبہ: افتخار امام صدیقی

پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن عملی طور پر اس کے نفاذ میں جو دشواریاں حائل ہیں اور جو مسائل ابھرتے رہے ہیں وہ قیامِ پاکستان سے اب تک مکمل طور پر حل نہیں ہو سکے ہیں۔ علاقائی زبانوں اور انگریزی کی موجودگی سے اردو بہ حیثیت قومی زبان اپنا وہ مقام حاصل نہیں کر سکی ہے جو قیامِ پاکستان کے تصور سے وابستہ رہا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ پاکستان میں اردو کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجوہ کیا ہیں۔ ہم اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے "اردو کا عالمی منظر نامہ" کے تحت پاکستانی اخبارات و رسائل سے ایک مختصر سا انتخاب پیش کر رہے ہیں۔ اس سے پاکستان میں اردو کے مسائل کو پورے طور پر تو نہیں سمجھا جا سکتا تاہم یہ ضرور ہے کہ اردو کی موجودہ صورتِ حال کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی سے انٹرویو

عبدالغفور اعوان

س:۔ مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین کی حیثیت سے آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اس ادارے کا وجود کس ضرورت کے تحت محسوس کیا گیا اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

ج:۔ مقتدرہ قومی زبان کے قیام کی تجویز ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے پیش کی تھی اور وہی اس کے پہلے سربراہ تھے۔ یہ ادارہ ۱۹۷۹ء میں قائم ہوا۔ اردو زبان کو پاکستان بننے کے بعد سے لے کر اب تک قومی زبان تسلیم تو سب لوگ کرتے تھے اور کرتے ہیں، لیکن عملی طور پر اس کے نفاذ کے لئے کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ایک ایسے ادارے کے وجود کی ضرورت محسوس کی گئی جو اردو کے لئے منظم و مرتب طریقے سے کام کر سکے۔

اس ادارے کے بنیادی اغراض و مقاصد میں چار پانچ چیزیں شامل ہیں مثلاً (۱) دفاتر میں نفاذِ اردو کے لئے ضروری مواد تیار کیا جائے یعنی دفتری مراسلے، قواعد و ضوابط اور ان چیزوں کے انگریزی سے اردو میں تراجم کرنا (۲) نفاذِ اردو کے لئے سفارشات مرتب کر کے حکومت کو بھیجنا، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے دور میں سب سے زیادہ اس بات پر توجہ دی گئی اور تین سفارشات مرتب ہوئیں جن کا تعلق سرکاری دفاتر میں اردو کا رائج کرنا، اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ مرکزی ملازمتوں کے امتحانات میں اردو زبان کو اختیار کرنے سے تھا (۳) اردو زبان کے لئے پاکستان میں جو مختلف ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان ربط و ہم آہنگی پیدا کرنا۔ تاکہ مختلف ادارے بیک وقت ایک ہی موضوع پر کام نہ کریں۔ ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ پاکستان میں ایک کام کے لئے بیک وقت متعدد ادارے قائم کر دیئے جاتے ہیں اور ان کے حدود و دائرۂ کار متعین نہیں کیا جاتا اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام ادارے ایک ہی موضوع پر کام کرتے رہتے ہیں اور اس طرح جو پیش رفت ہونی چاہیئے وہ نہیں ہو پاتی، اب حکومت نے بعض اداروں کے دائرۂ کار کا تعین کیا ہے۔ اردو بورڈ کا نام اردو سائنس بورڈ رکھ دیا گیا ہے اور سائنسی کتب تک اس کا دائرۂ کار محدود کر دیا گیا ہے۔ ترقیٔ اردو بورڈ کراچی، اردو ڈکشنری پر کام کر رہا ہے اور کئی کتابیں بھی انہوں نے شائع کی ہیں اب اس کا نام اردو ڈکشنری بورڈ رکھ دیا گیا ہے اور اس کے دائرے کار کو صرف اردو ڈکشنریاں تیار کرنے تک محدود کر دیا

گیا ہے اسی طرح ہمارے ہاں سرکاری سطح پر سرمائے کا ضیاع ہوتا ہے اور انسانی محنت رائیگاں جاتی ہے آپ کو علم نہیں ہے کہ حکومت کی طرف سے اردو زبان کی ترویج و ترقی پر کس قدر سرمایہ خرچ کیا جاتا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود نتیجہ کچھ نہیں نکلتا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی بھی ادارہ اپنے آپ کو ایک طریقہ کار تک محدود نہیں رکھتا ۔ غیر ممالک میں یہ ہوتا ہے کہ ایک ادارہ قائم کیا جاتا ہے اور پھر اس کی شاخوں کو پھیلا دیا جاتا ہے ۔ پاکستان میں اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ کئی ادارے بیک وقت وجود میں آتے ہیں کسی کے ہاتھ میں ٹانگ کسی کے ہاتھ میں بازو اور کسی کے ہاتھ میں سر ہوتا ہے اور اس طرح یہ ادارے انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں اور نتیجہ کچھ برآمد نہیں ہوتا ۔

(۴) چوتھی چیز جو مقتدرہ قومی زبان کے دائرہ کار میں آتی ہے وہ اردو اصطلاحات کو معیاری بنانا ہے خواہ ان کا تعلق دفتری اصطلاحات سے ہو ۔ خواہ وہ سائنس کے مضامین سے سروکار رکھتی ہوں ۔ یا پھر ادب و سماجی علوم کے ساتھ ان کی وابستگی ہو ۔ ان تمام موضوعات کی اصطلاحات کو معیاری بنانا اس ادارے کے بنیادی فرائض میں شامل ہے ۔

(۵) اور آخری چیز جو اس ادارے کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے وہ اردو زبان کے نفاذ کی پیش رفت کے لئے ضروری مواد تیار کرنا ہے ۔ ان میں ببلوگرافی، کتابیں، ڈکشنریاں، درسی کتابوں کے تراجم اعلیٰ تعلیم کے لئے نصابی کتب لکھوانا وغیرہ شامل ہیں ۔ نچلی سطح کی نصابی و درسی کتب کیلئے تو پہلے ہی بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں لیکن یونیورسٹیوں کی سطح پر ہمارے ہاں کوئی ادارہ نہیں ہے ۔ اگرچہ مختلف یونیورسٹیوں نے تالیف و ترجمے کے کچھ شعبے اپنے طور پر بنا رکھے ہیں لیکن ان میں بھی کچھ زیادہ تندہی سے کام نہیں ہو رہا ہے ۔ میری کوشش یہ ہے کہ جن یونیورسٹیوں میں اس قسم کے شعبہ جات نہیں ہیں وہاں پر بھی قائم ہوں اور پھر ان کے درمیان ربط ہو اور مالی طور پر مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے ان کی اعانت بھی کی جائے ۔ اردو زبان پر کام کرنیوالے مختلف اداروں کے درمیان ربط و ہم آہنگی اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس سے آسانی سے یہ پتہ چل سکے کہ کون سا ادارہ کون سی چیز پر کام کر رہا ہے ۔ ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس چیز پر کراچی یونیورسٹی میں کام ہو رہا ہو اسی پر پنجاب یونیورسٹی میں بھی کام شروع کر دیا جائے اور اردو کا ایک ادارہ جس کام کو نپٹا رہا ہو دوسرا ادارہ بھی اسی پر عمل پیرا ہو جائے ۔ اس خدشے کو ختم کرنے کے لئے ہم نے اردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر کام کرنے والے اداروں کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ تاکہ منظم طریقے سے کام آگے بڑھے ۔ بعض چیزیں ہم خود چھاپتے ہیں اور بعض دوسرے اداروں کی وساطت و تعاون سے شائع کی جاتی ہیں ۔ ایک کتاب ہم نے تیار کروائی تھی اس کو اردو سائنس بورڈ چھاپ رہا ہے ۔ اسی طرح حال ہی میں کراچی یونیورسٹی سے جو کتابیں چھپی ہیں ان میں بھی ہمارا تعاون شامل تھا ۔ اداروں کے درمیان ارتباط قائم کرنے کے لئے ہم نے ایک کمیٹی بنائی ہے جس میں مختلف اداروں کے سربراہ شامل ہیں اس کمیٹی کے سامنے ہم اپنے پروگرام بھی پیش کرتے ہیں اور ان کے پروگراموں کا بھی جائزہ لیتے ہیں ۔ ادیبوں کی ایک ڈائریکٹری ہمارے ہاں تیار ہو رہی تھی ہم نے وہ سارا مواد اکیڈمی آف لیٹرز کے حوالے کر دیا ہے تاکہ وہ اپنی ڈائریکٹری اپ ٹو ڈیٹ بنا سکے اسی طرح اردو انگریزی لغت کا کام یہاں شروع کیا گیا تھا اس کے کارڈز ہم نے انجمن ترقی اردو کے حوالے کر دیئے ہیں تاکہ وہ مولوی عبدالحق کی اردو لغت پر نظرثانی کر کے اسے مزید بہتر بنا سکے ۔ علاوہ ازیں دوسرے اداروں کے گورنروں کے بورڈوں میں ہمارا نمائندہ شامل ہوتا ہے اور ایگزیکٹو باڈیز میں بھی ایک نمائندہ شریک ہے اور ان اداروں کے نمائندوں کو ہم نے اپنی کمیٹی میں شامل کر رکھا ہے ۔

س :۔ ہماری حکومت کی بھی خواہش ہے کہ اردو قومی زبان کے طور پر ملک میں رائج ہو پاکستانی عوام کا مطالبہ بھی ہے لیکن اس کے باوجود عرصہ دراز سے ہم اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں ۔ اس کی کیا وجوہات ہیں ؟

ج :۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں اور ان کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سماجی بھی ہیں، سیاسی بھی ہیں، اقتصادی بھی ہیں اور بعض دوسرے عوامل بھی اس میں شامل ہیں امر واقع یہ ہے کہ جس وقت پاکستان بنا تھا اگر اس وقت فوری طور پر اردو کے نفاذ کے لئے کچھ عملی اقدامات ہو جاتے تو وہ صورت حال پیدا نہ ہوتی جو بعد میں ہوئی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ زبان کا مسئلہ ہمارے ہاں فقط علمی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آزادی کی تحریک کے ساتھ زبان کا مسئلہ بھی وابستہ تھا اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سیاسی مسائل کا حل بھی سیاسی طریقے سے ہوتا ہے اور ہمارے ادارے کے فرائض میں سیاسی پہلو شامل نہیں ہے سیاسی فیصلے حکومت کرتی ہے ہم تو زبان کے بارے میں سفارشات حکومت کو ارسال کرتے ہیں ان پر غور کرنا اور ان کے نفاذ کے بارے میں فیصلہ کرنا اور پھر اس کو عملی طور پر نافذ کرنا بھی حکومت کا کام ہے ۔

س:۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اردو زبان انگریزی کا متبادل نہیں بن سکتی لہٰذا انگریزی کی لازمی حیثیت کو برقرار رکھا جائے۔ آپکی کیا رائے ہے ؟

ج:۔ میں بنیادی طور پر اردو کا طالب علم نہیں ہوں بلکہ فارسی اور تاریخ کے راستے سے اردو میں داخل ہوا ہوں۔ اردو میرا پسندیدہ و شوقیہ مضمون تھا۔ درسی طور پر میں نے اسے نہیں پڑھا۔ تاہم میں یہ جانتا ہوں کہ اردو میں اس قدر سرمایہ موجود ہے کہ اگر آج ہم اسے درس و تدریس میں نافذ کرنا چاہیں تو کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی۔ بحیثیت استاد میرا تجربہ یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں جب سوشل سائنسز کو انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو میں پڑھانے کی اجازت دی گئی تو غالباً میں پہلے آدمیوں میں سے ہوں جنھوں نے ان مضامین کی اردو میں تدریس کا آغاز کیا۔ کئی برس تک یہ سلسلہ رہا کہ ایف۔ اے کی کلاس کو تاریخ کے مضمون میں اردو میں لیکچر مجھے دینا پڑتا تھا جب کہ بی۔ اے کی کلاس کو انگریزی میں لیکچر دیا کرتا تھا۔ مجھے اس کام میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور جو علوم میں پڑھاتا رہا ہوں ان میں کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ باقی اردو کے خلاف دو تین دلیلیں دی جاتی ہیں ایک یہ کہ اس میں ابھی بہت سی کتابیں ترجمہ نہیں ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے اس وقت تک اردو میں انگریزی سے کتنی ہی چیزیں اور علوم ترجمہ کئے جاچکے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اس کی ببلوگرافی بھی تیار ہو رہی ہے جو ڈاکٹر سید عبداللہ تیار کر رہے ہیں۔ یہ ببلوگرافی تین یا چار جلدوں میں مکمل ہوگی اس کے بعد جہاں تک سائنس کا تعلق ہے نصاب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایف، ایس، سی اور بی، ایس، سی کی کتابوں کے تراجم کی بھی ببلوگرافی تیار ہو رہی ہے جو صاحب تیار کر رہے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ اس وقت تک تقریباً ساڑھے چار سو کے قریب ترجمہ شدہ کتابیں موجود ہیں اور ان میں حیدر آباد دکن کی پرانی کتابیں شامل نہیں بلکہ پاکستان بننے کے بعد سائنسی مضامین پر مبنی کتب شامل ہیں۔ لہٰذا یہ دلیل غلط ہو جاتی ہے کہ اردو میں کتابوں کے تراجم موجود نہیں ہیں۔

دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اردو میں قومی زبان بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ صلاحیت کا انحصار ذخیرہ الفاظ پر ہوتا ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اگر اردو زبان میں ذخیرہ الفاظ کی کمی ہے تو پھر بیس جلدوں میں اس کی ڈکشنری کیسے مرتب ہو رہی ہے جہاں تک ترجمے کے عمل کی بات ہے تو یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیئے کہ دنیا میں کوئی زبان بھی صرف ترجمے کا سہارا نہیں لے سکتی ہاں یہ ضرور ہے کہ ضرورت کی کچھ کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ضرور ہونا چاہیئے اور باقی کتابیں از خود ہمیں لکھنی پڑیں گی۔ ہر ایک چیز کا انگریزی سے ترجمہ کرنا اور ہر چیز کو انگریزی سے اخذ کرنا ضروری نہیں۔ میں اپنی مثال دیتا ہوں جب میں نے تاریخ کو اردو زبان میں پڑھانا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ انٹرمیڈیٹ سطح کی کتب مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھیں۔ میں انگریزی کتابوں سے مواد لے کر اردو میں طلباء کو لیکچر دیتا تھا۔ علاوہ ازیں ہمارے ہاں اردو ذریعہ تعلیم کا تعلق ہے۔ ہم نے فارسی بھی انگریزی کے حوالے سے پڑھی ہے اور تاریخ بھی، میرا تجربہ یہ ہے کہ انگریزی زبان سیکھنے پر انسانی ذہن کا غیر معمولی ضیاع ہوتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی سزا ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ قوم کے نوے فیصد لوگ تو یہ چاہتے ہوں کہ قومی زبان رائج ہو لیکن صرف ایک فیصد یہ چاہیں کہ اردو کا نفاذ بطور قومی زبان کے نہ ہو۔ دقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں دوغلا نظام چل رہا ہے ایک انگلش میڈیم اسکولوں کا نظام ہے اور اس نظام سے یہ نقصان پہنچا ہے کہ اب جو نسل اعلیٰ ملازمتوں میں آرہی ہے وہ زیادہ تر انگلش میڈیم اسکولوں کی پیداوار ہے۔ ان کے گھروں میں بھی اردو بول چال نام کی کوئی چیز نہیں ہے اس لئے دونوں کے درمیان وہ فرق بڑھ گیا ہے جو پہلے بہت کم تھا۔

آپ نے اصطلاحات کی بات کی ہے ہمارے ہاں قدیم و جدید اصطلاحات دونوں موجود ہیں ان اصطلاحات کو معیاری نہیں بنایا گیا اور ایک ایک لفظ کی لاتعداد اصطلاحات گھڑ لی گئی ہیں جس سے اصطلاحات گڈمڈ ہو کر رہ گئی ہیں عموماً ایک انگریزی اصطلاح کے متبادل ایک اردو اصطلاح ہونی چاہیئے ہم اس چیز پر بھی کام کر رہے ہیں اور اصطلاحوں کے مسئلہ کو بھی حل کر رہے ہیں اصطلاحات کا مسئلہ صرف ہمارے ہاں نہیں ہے بلکہ اس کا سامنا بہت سے ممالک کو ہے دوسرے ممالک میں بھی یہ ایک ذاتی نوعیت کا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ ادب کی اصطلاحوں کے حوالے سے جب میں دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ انگریزی میں بھی بعض نقادوں نے بعض اصطلاحوں کے اپنے معنی متعین کر رکھے ہیں جو ان کے چند دوستوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا جہاں اس قسم کا خلفشار ترقی یافتہ ممالک میں پایا جاتا ہو وہاں اردو زبان کے لئے یہ زیادہ تکلیف دہ نہیں۔ ہے اصطلاحوں کے معاملے میں دو تین چیزوں کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے ایک تو ترجیحات کو یعنی اگر اردو زبان میں بنی بنائی اصطلاح ہمیں نہ ملے تو پھر کہاں سے حاصل کرنی چاہیئے میرے نقطۂ نظر سے مانوس اور غیر مانوس کا فارمولا اس کے لئے استعمال کرنا چاہیئے

مثال کے طور پر انگریزی کے بعض الفاظ اردو زبان میں رچ بس کر اس کا حصّہ بن گئے ہیں ایسے مانوس الفاظ کے ترجمے کی ضرورت نہیں اس کے بعد عام استعمال کی دنیا کو لے لیجئے عام زندگی میں علاقائی زبانوں میں جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں وہ بآسانی اردو میں جذب ہوسکتے ہیں اور ان سے کام لیا جاسکتا ہے۔ یعنی ہماری ترجیح کی ترتیب اردو سے شروع ہوتی ہے، اردو پھر اس کے بعد علاقائی زبانیں اور آخر میں عربی و فارسی زبانوں سے مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو اصطلاحوں کو زیادہ سے زیادہ عربی آمیز بنانا چاہتا ہے اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ عربی لفظوں کے اشتقاق اس قدر زیادہ ہیں کہ ایک لفظ کی کئی مختلف شکلیں آپ بنا سکتے ہیں لیکن جہاں تک استعمال کا تعلق ہے آپ دیکھیں گے کہ عربی سے ماضی قریب میں ہمیں اس قدر قربت نہیں رہی جس قدر فارسی سے اور جس قدر انگریزی سے قربت رہی ہے اس قدر فارسی سے نہیں رہی۔ ان ترجیحات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں کام کرنا پڑے گا جن لوگوں میں ہم نے ان اصطلاحوں کو نافذ کرنا ہے وہ اس پس منظر سے واقف نہیں ہیں جس میں ہماری نسل نے پرورش پائی تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ کہا جائے کہ پہلے کتابیں لکھی جائیں اور بعد ازاں پڑھنے والے آئیں گے یہ تو مرغی اور انڈے والی بات ہوئی۔ حالانکہ پبلشر کتابیں اس وقت چھاپتے ہیں کہ جب مارکیٹ میں ان کتابوں کی مانگ ہو آپ مارکیٹ مہیّا کیجئے کتابیں خود بخود آتی چلی جائیں گی۔ اب آپ دیکھئے کہ آزاد کشمیر کے سرکاری دفاتر میں اردو زبان رائج ہے انہوں نے اس کے لئے نہ کوئی ڈکشنری بنائی ہے نہ کوئی باقاعدہ ریفریشر کورسز کئے ہیں صرف آغاز کیا گیا دو چار برس میں تجربے کے ساتھ وہاں پر اردو زبان چل نکلی ہے اور کوئی دقت و تکلیف پیش نہیں آئی ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ پہلے اس قدر کتابیں، اس قدر ڈکشنریاں اور اس قدر فلاں فلاں چیزیں مہیّا کی جائیں تب جاکر نفاذ کی بات ہوگی پبلشر دلچسپی اس لئے نہیں لیتا کہ اسے مالی منفعت دکھائی نہیں دیتی آپ آج میڈیم بدل دیجئے کل کتابیں مارکیٹ میں خود بخود آنے لگیں گی جہاں جہاں یہ تجربہ کیا گیا ہے وہاں پر کامیابی ہوئی ہے۔

(بشکریہ ورلڈ اسلامک ٹائمز)

قومی زبان کا نفاذ اور ہمارے تنفّس کا مسئلہ

مشکور حسین یاد

معلوم نہیں سوچنے اور غورؔ و فکر کرنے کے آپ کس حد تک قائل ہیں میں تو اس فعل کا بڑی حد تک قائل ہوں۔ ہوسکتا ہے آپ یہاں یہ فرمائیں صاحب زیادہ سوچنا اور غور و فکر کرنا کسی طرح بھی عیاشی سے کم نہیں بلکہ اگر اسے خالص عیاشی کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو، لیکن معاف کیجئے مجھے آپ سے اتفاق نہیں، غور و فکر کو کسی صورت میں بھی عیاشی نہیں کہا جاسکتا البتّہ ایک بات ضرور ہے کہ جہاں غور و فکر کی ضرورت نہ ہو وہاں کوئی غور و فکر کرنے بیٹھ جائے تو اس طرح سوچ بچار کو ہم یقیناً بلا خوفِ تردید قابلِ اعتراض کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں بھی غور و فکر کو ہم عیاشی پھر بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس غور و فکر کو حماقت کا نام دیا جاسکتا ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ عیاشی کو بھی حماقت کہہ کر زندگی کی ساری لذّتوں کا ستیاناس کر ڈالیں، دیکھئے تو سہی عام حالات میں آپ کو بھوک لگی ہوئی ہے لیکن کھانا کھانے کے بجائے آپ یہ سوچنے بیٹھ جائیں کہ کھانا کھانا چاہئے یا نہیں تو آپ کی یہ سوچ کس حد تک درست کہی جاسکتی ہے۔ یا آپ پیاسے ہیں اور اپنی پیاس بجھانے کے بجائے سوچنا شروع کردیں کہ پانی پیا جائے یا نہیں۔ ان مثالوں سے بھی واضح اور کڑی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ آپ سانس لینے کے بارے میں سوچنے بیٹھ جائیں کہ سانس لی جائے یا نہیں تو خدارا انصاف سے بتائیے کہ یہاں آپ کی سوچ کو کون شخص ذرّہ برابر بھی معقول کہہ سکتا ہے۔

تو بندہ نواز قصّہ دراصل یہ ہے کہ سوچنا اور غور و فکر کرنا بہت اچھا کام سہی لیکن ہمارے کچھ کام اور کچھ ضرورتیں ایسی ہیں کہ ان کے بارے میں اگر ہم سوچ بچار شروع کردیں تو خدانخواستہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں ایسی صورتِ حال میں ایک بڑا المیہ یہ بھی پیش آتا ہے کہ انفرادی طور پر تو ہمیں اس نقصان کا احساس فوراً ہوجاتا ہے مگر اجتماعی طور پر اس کا احساس جلدی سے نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر کوئی سانس لینے کے بارے میں یہ سوچنے لگے کہ سانس لینا چاہئے یا نہیں اور پھر اس سوچ کے نتیجے میں وہ سانس لینا چھوڑ دے تو اسے اپنی حماقت کا احساس چند ثانیے گزرنے کے بعد ہی ہوجائیگا۔

لیکن اگر پوری قوم یہ سوچنے بیٹھ جائے کہ سانس لینے کا عمل ضروری بھی ہے یا نہیں اور اس سوچ کے نتیجے میں پوری قوم کا دم رُکنے لگے تو یاد رکھئے اس گھٹن کا احساس فوری طور پر نہیں ہوگا۔

اجتماعی اعتبار سے قومی زبان کے نفاذ میں تاخیر کرنے کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہے۔ یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ہم نے ابھی ابھی سانس لینے کے عمل کے بارے میں عرض کیا ہے یعنی اگر کوئی قوم اپنی قومی زبان کو نافذ کرنے میں تاخیر سے کام لیتی ہے تو اس قوم کے اس عمل کو ایسا ہی سمجھئے جیسے کوئی شخص فوری سانس لینے کے بجائے اس ہلاکت خیز سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ آیا اُسے سانس لینا بھی چاہیئے یا نہیں۔ قومی زبان کا نفاذ قوم کی حیات کے لئے بنیادی ضروریات میں سے ایک ضرورت ہے۔ معلوم نہیں ہمارے ارباب حل و عقد نے اس مسئلہ کی اہمیت کو تا حال کیوں محسوس نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے اِن صاحبان کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جو اجتماعی مسائل کی سوچ کے ساتھ ہوا کرتا ہے یعنی اجتماعی مسائل کی نزاکت کا احساس جلدی نہیں ہوا کرتا۔ ورنہ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ کسی نازک اور اہم مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت کا پوری طرح احساس بھی ہو اور پھر وہ مسئلہ حل ہونے سے بھی رہ جاتے یا اُس مسئلہ کو معلق حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انگریزی زبان کی مانگے کی آکسیجن ہمیں اتنی مدّت سے مل رہی ہے کہ اپنی زبان کی آزاد اور تازہ آکسیجن کا احساس ہی ہمارے لئے عنقا ہو گیا ہے ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ آزاد اور تازہ ہوا تو ہمارے جسم و جاں کی بلائیں لیتی پھر رہی ہو اور ہم اس کے سچّے احساس سے بھی عاری ہو کر بیٹھ جائیں۔

ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامِ پاکستان سے آج تک ہر زمانے میں قومی زبان کے نفاذ کے مسئلہ کی نزاکت کو قوم کے سامنے بڑھ چڑھ کر پیش کیا جاتا رہا ہے جس سے عملی فائدہ تو خیر کیا حاصل ہونا تھا ہاں یہ ضرور ہوا کہ افرادِ قوم اس تسلّی تشفّی کے طلسم میں آکر ایک حد تک مسحور ہوتے رہے۔ آپ جانتے ہیں کسی قوم کے عوام تو بے چارے یوں بھی طفل تسلّیوں میں جلدی سے آجانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑی ذمّہ داری دانشور طبقے پر عائد ہوتی ہے لیکن اب تو یہ بات کہنے یا اعتراف کرنے میں بھی کوئی کشش یا نیا پن باقی نہیں رہا کہ ہمارا دانشور طبقہ بے حد خود غرض، ڈرپوک اور مصلحت کوش بن چکا ہے۔ اس طبقہ کی اپنی خود غرضیاں اور مصلحت کوشیاں اتنی ہو گئی ہیں کہ دانشور حضرات اُن کے جال سے نکلنے نہیں پاتے۔ اوّل تو جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ کسی صاحبِ دانش میں اتنی سکت ہی نہیں کہ وہ کوئی زوردار آواز بلند کر سکے اور اگر اِدھر اُدھر سے کوئی آواز بلند بھی ہوتی ہے تو اُس آواز میں اس قدر کپکپاہٹ اور لرزش ہوتی ہے جس کو سنکر صاف پتہ چل جاتا ہے کہ یہ آواز خلوص کی بناء پر نہیں بلکہ چند دکھاوے کی ہمدردیوں کے تحت بلند کی گئی ہے۔ لہٰذا جن اہم اشخاص تک اس آواز کو پہنچانا مقصود ہوتا ہے وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ اِس آواز کے بلند ہونیکا مقصد کیا ہے یعنی وہ مقصد تو ہرگز نہیں ہے جسے اس آواز کے الفاظ ادا کر رہے ہیں بلکہ اس کا مقصد محض فضا میں اس آواز کو بکھیرنا ہے سو یہ اہم اشخاص مسکرا کر اس آواز کو گوش گزار فرما لیتے ہیں اور اس آواز کے ارتعاش کی داد بھی دل ہی دل میں خوب دے ڈالتے ہیں۔

قومی زبان کے نفاذ کا مسئلہ ایسا نہیں تھا جس کو ہم یوں مسلسل غور و فکر کی بھول بھلیوں میں چکر دیئے پھرتے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی قومی زبان کو نافذ کر دیا جاتا اور نافذ کرنے کے بعد اس پر غور و فکر شروع کیا جاتا۔ بظاہر یہ ایک مضحکہ خیز سی بات نظر آتی ہے لیکن ذرا گہری نظر ڈال کر دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ جو امور قومی سطح پر نہایت اہم ہوتے ہیں ان کا مخلصانہ طریق کار یہی ہوتا ہے کہ پہلے ان پر عمل کی ابتدا کی جاتی ہے اور اس کے بعد غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح بنیادی مسائل پر غور و فکر سے قبل عمل پیرا ہُوا جائے تو پھر ہماری فکری صلاحیتیں خود بخود صراطِ مستقیم پر چل کر ان مشکلات کا حل تلاش کر لیتی ہیں جو ہمارے اس کام کی راہ میں حائل ہو رہی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اب تک یہی سوچتے رہے کہ اگر قومی زبان کا نفاذ کر دیا گیا تو اتنے ڈھیر سارے اردو ٹائپ رائٹر کہاں سے آئیں گے (غالباً اب تو یہ مسئلہ بھی کافی حد تک حل ہو چکا ہے) حالانکہ نفاذ کے بعد اگر غور کیا جاتا تو یقین ہے کہ ہم اس مسئلے کو آج سے کہیں پہلے حل کر چکے ہوتے۔ کبھی کہا جاتا ہے ہماری قومی زبان کے پاس اتنے الفاظ نہیں جو آج کے ترقی یافتہ علوم کی اصطلاحوں کا نعم البدل بن سکیں حالانکہ ہماری قومی زبان کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ اگر آپ کسی مشکل سے مشکل زبان کا لفظ بھی ہماری قومی زبان میں جوں کا توں رکھ دیں تب بھی ہمارے لئے تھوڑی مدّت بعد ہی کوئی اجنبی لفظ نہ رہے گا۔ کبھی اس تاخیر کا ذمّہ دار نوکر شاہی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں بیورو کریٹ حضرات بھی کوئی غیر ملکی نہیں ہیں۔ ماسوائے چند حضرات کے جن کا لائحہ عمل واقعی غیر ملکیوں کا سا ہوتا ہے ان میں اکثریت ایسے افراد ہی کی ہے جو اپنے قومی مسائل پر نہایت ہمدردانہ غور و خوض کے لئے ہمہ وقت تیار

بتے ہی فرق صرف اتنا سا ہے کہ کوئی ان حضرات کو خلوص کے ساتھ سمجھانے والا ہو۔

غرض قومی زبان کے نفاذ کے مسئلہ پر غور و فکر کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ اس پر فوری طور پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ اور عمل پیرا ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اس کے لئے طرح طرح کی کمیٹیاں قائم کرنا شروع کر دیں۔ عمل پیرا ہونے کا سیدھا سادھا مطلب یہی ہے کہ قومی زبان کا نفاذ عمل میں آئے اور بغیر کسی توقف اور تکلف کے۔ اہم اور بنیادی قومی امور میں توقف اور تکلف اور وہ بھی بشکل تامل سخت مہلک ثابت ہوا کرتا ہے۔ اللہ ہمیں اس ہلاکت سے بچائے اب بھی ہم ہوش میں آجائیں تو میرا خیال ہے کوئی مضائقہ نہیں۔ [اخبار اردو (اسلام آباد (پاکستان) فروری ۱۹۸۴]

حرفِ شکایت

وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات راجہ محمد ظفر الحق نے اُردو زبان اختیار کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ قومی زبان قومی تشخص کی علامت ہوتی ہے انہوں نے وزارت اطلاعات و نشریات میں نفاذ اردو کے کام کو اطمینان بخش قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسی سادہ زبان جو چاروں صوبوں کے علاوہ عوام کے درمیان رابطہ کا کام دے سکے اور ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بولی اور سمجھی جا سکے صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔ تاہم وزیر موصوف نے دوران خطاب ایک نکتہ یہ بھی بیان کیا کہ اردو کو اس وقت تک نافذ نہیں کیا جا سکتا جب تک لوگوں کا ذہنی احساس کمتری دور نہیں ہو جاتا۔

راجہ محمد ظفر الحق نے قومی زبان کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے قومی زبان سے لگاؤ اور اس کی اہمیت سے واقفیت کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اپنے زیر نگرانی شعبوں میں اردو کا اجراء کر کے دوسروں کے لئے ایک قابل مثال قائم کی ہے۔ اس طرح صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی مختلف موقعوں پر قومی زبان میں خطاب کر کے ایک اچھی طرح ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان اقدامات سے قومی سطح پر ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے جو ارباب اقتدار کے ساتھ ساتھ ہم سب کا فریضہ ہے اور جس کے لئے پوری قوم آئندہ نسلوں کے سامنے جوابدہ ہے۔ راجہ محمد ظفر الحق نے یہ کہہ کر کہ اردو کو اس وقت تک نافذ نہیں کیا جا سکتا جب تک لوگوں کا ذہنی احساس کمتری دور نہیں ہو جاتا ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس نام نہاد احساس کمتری کو دور کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہے یا اس سے اس احساس میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

یہ درست ہے کہ زبانوں کو زندہ رہنے کے لئے جس توانائی کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ خود ان ہی کے اندر سے پھوٹتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ زبان اپنے استحصال کی شعوری اور مؤثر کوششوں کے باوجود پوری آب و تاب سے زندہ رہ سکتی ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہمارے ہاں زبان کی حد تک احساس کمتری کا شکار ایک مخصوص اور محدود طبقہ ہے جو تعداد کے لحاظ سے خیبر سے کراچی تک ٹھاٹھیں مارتے اردو کے قدر شناسوں کے سمندر میں ایک قطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری بات جو اس سلسلے میں مدنظر رہنی چاہئے یہ بات ہے کہ جب کوئی اردو کو تعلیمی، سرکاری اور قومی سطح پر اپنانے کی بات کرتا ہے تو اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انگریزی کو مکمل دیس نکالا دیا جائے گا۔ انگریزی بہ حیثیت ایک زبان کے درسگاہوں میں موجود رہنی چاہئے اور کسی بھی طالب علم کو یہ زبان پڑھنے اور سیکھنے کی پوری آزادی اور مواقع میسر ہونے چاہئیں۔ لیکن بنیادی طور پر سارے ملک کی درسگاہوں میں اردو کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت حاصل ہونی چاہئے تاکہ قوم کے نونہالوں کی بڑی تعداد ایک غیر ملکی زبان سے کم میلانی یا عدم دلچسپی کی بنا پر اہم تعلیمی، انتظامی اور فنی شعبوں میں جگہ پانے سے محض اس لئے محروم نہ رہ جائے کہ وہ انگریزی نہیں جانتی۔ ہمارے خیال میں حکومت کو اس سلسلے میں زیادہ مؤثر اقدامات کرنے چاہئیں۔ جس طرح دینی معلومات کا حصول، روزگار یا اعلیٰ اداروں میں ملازمت کے لئے بنیادی شرائط کے طور پر عائد کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح سارے امتحانات (بشمول مقابلے کے اعلیٰ ترین امتحانات) میں اردو کو لازمی قرار دیدینا چاہئے۔ تعلیمی اداروں میں

اُردو انگریزی کی تفریق کو یکسر ختم کر کے سب کے بچّوں کے لئے ایک سا نصاب تعلیم مقرر ہونا چاہیئے۔ کم از کم ملکی سطح تک ایسی کسی تفریق کا تصوّر بھی ہمارے قومی کردار پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان اردو اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم سے تجاویز طلب کی جاسکتی ہیں اسی طرح ذرائع ابلاغ، بالخصوص ٹیلی ویژن سے بھی بھرپور مدد لی جاسکتی ہے۔ پوری قوم کی دلچسپی ہے کہ صدر ضیاء الحق اور راجہ محمد ظفر الحق نے جس جذبے کے تحت اُردو کا علم بلند کیا ہے وہ جذبہ ماند نہیں پڑنا چاہیئے بلکہ مزید موثر اور مفید اقدامات سے اس میں مزید گہرائی اور ہمہ گیری پیدا ہونی چاہیئے۔ [روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۲۷ نومبر ۱۹۸۴ء]

○ "وفاقی وزیر خزانہ نے مجلسِ شوریٰ کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یقین دلایا ہے کہ سرکاری امور میں اردو اختیار کرنے کی پالیسی پر باضابطہ طور پر عمل درآمد کیا جارہا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ پہلے مقامی اور علاقائی سطح پر اور اس کے بعد صوبائی اور وفاقی سیکریٹریٹ میں اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ اردو رائج کرنے کے بارے میں تیاریوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ زیر ملازمت اسٹینو گرافروں کو اردو مختصر نویسی کی تربیت دینے کے لئے ایک اسکیم تیار کی جاچکی ہے۔

○ سرکاری امور میں اردو اختیار کرنے کے بارے میں وفاقی وزیر خزانہ کی وضاحت غیر مبہم ہے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کو بتدریج اسکا مقام دینے کا کام سُست روی ہی سے سہی لیکن جاری ہے اور اس طرح یہ امید کی جاسکتی ہے جلد یا بہ دیر اس زبان کو اس کا جائز مقام مل جائیگا لیکن جہاں تک اس کو رائج کرنے کی کوششوں میں ہونے والی پیش رفت کا تعلق ہے اسے کسی بھی طرح حوصلہ افزا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیوں کہ گزشتہ چھتیس برسوں کے دوران اس کے نفاذ کے لئے مختصر نویسوں کی تربیت کے صرف پروگرام کی تیاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سمت پیش رفت بہت ہی سُست ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کام کی رفتار کو ممکنہ حد تک تیز کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ صدیوں سے مسلّط ایک غیر ملکی زبان کو راتوں رات دیس نکالا نہیں دیا جاسکتا، لیکن غلامی کی اس یادگار کو تا دیر سینے سے لگائے رکھنا بھی قومی حمیت کے منافی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اردو سے محبت رکھنے والے لوگوں کو اس اہم کام میں حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لئے آگے آنا چاہیئے تاکہ یہ اہم کام جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔"

[روزنامہ حرّیت (کراچی) ۱۵ نومبر ۱۹۸۳ء]

○ "خبر ہے کہ تین سال قبل جن سرکاری اسکولوں میں انگریزی کی جگہ اردو نافذ کی گئی تھی وہاں دوبارہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا گیا ہے صوبہ سندھ کے بیشتر اسکولوں میں ایسا کیا جاچکا ہے اور رواں تعلیمی سال کے آغاز سے اسلام آباد کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے اسلام آباد کالج برائے طلبہ میں بھی اردو ذریعۂ تعلیم کو ختم کر کے انگریزی رائج کر دی گئی ہے جہاں تک فنی و سائنسی تعلیم کے لئے اور ایک عالمی زبان کے طور پر انگریزی پڑھانے کا سوال ہے، ہم نے اس کی ضرورت کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے لیکن یہ ضرورت قومی زبان پر فائق نہیں ہوسکتی علمی و عملی ضروریات کے تقاضے اور ہیں اور قومی تشخص و کردار کے تقاضے اور ہیں۔

○ وقت آگیا ہے کہ اب قومی زبان کے خلاف سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ مذکورہ تعلیمی اداروں سے قومی زبان کو بے دخل کرنے والے عناصر کا پتہ چلا کر ان کی سرزنش کی جائے اور وہاں دوبارہ قومی زبان کو نافذ کیا جائے۔ ہم تمام محبِ وطن حلقوں سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ انگریزی کے اس دوبارہ تسلط کی سختی کے ساتھ مزاحمت کی جائے، اس سلسلے میں صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کی خدمت میں بھی درخواست کریں گے کہ وہ ذاتی طور پر اس معاملے کا جائزہ لیں اور قومی زبان کو دفتری زبان بنانے کی رفتار پر بھی خصوصی نگاہ رکھیں تشخص کا بحران پہلے ہی ہمیں تباہی سے دوچار کرچکا ہے ہم کب تک اس بحران میں مبتلا رہیں گے؟ کب تک اسے ابھارنے کے لئے مضبوطی سے ٹھوس قدم نہیں اٹھائیں گے؟" [روزنامہ جنگ ۱۳ نومبر ۱۹۸۳ء]

○ پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے ہوئے بفضلِ خدا ۳۷ برس ہو گئے ہیں لیکن قومی زبان کا مسئلہ ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ یہ صورتحال کسی طرح بھی قابلِ تعریف نہیں۔ بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اس اہم مسئلہ کا فیصلہ ۱۹۴۸ء میں کی گئی ایک تقریر میں کر دیا تھا۔ انہوں نے واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ بابائے قوم چونکہ ایک بلند مرتبہ سیاست داں تھے اور پھر اللہ نے انہیں پاکستان جیسی عظیم مملکت کے بنیان گزار کی حیثیت سے منتخب کیا تھا اس لئے وہ اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ایک آزاد ریاست کے عناصر ترکیبی میں قومی زبان کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قائدِ اعظم کے بعد قومی زبان سے متعلق دو ٹوک

فیصلہ نہیں کیا گیا۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ آج لوگ مختلف دلائل و براہین کے سہارے یہ ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں کہ اردو میں ایک قومی اور دفتری زبان بننے کی صلاحیت ہی نہیں اور یہ زبان جدید دَور کے تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔

اس صورتِ حال کے ذمّہ دار اسباب کی تفصیلی بحث میں پڑے بغیر ہم مختصراً یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ جب نیّتیں صاف نہ ہوں تو بہانے بہت۔ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مراحل میں متعدد مرحلے ایسے ہوتے ہیں کہ بے فائدہ اور فضول بحث و تمحیص سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ سرے سے بحث و تمحیص کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اصل معاملہ کی نوعیت اس بات کی متقاضی ہوا کرتی ہے کہ اسے عوام الناس کی مرضی کے مطابق حل کر کے قصّہ ختم کر دیا جائے۔ اردو کے استحقاق کے سلسلہ میں پاکستان کی آبادی کا ایک انتہائی معمولی حصّہ بوجوہ لیت و لعل سے کام لے رہا ہے ورنہ طورخم سے لے کر کراچی تک سارے پاکستانیوں کی آواز اردو کے حق میں بلند ہوتی رہی ہے اور ہمیشہ بلند ہوتی رہے گی اور ایسے نام نہاد عناصر کو انشاء اللہ مُنہ کی کھانی پڑے گی جو وقتی طور پر بعض منفی عوامل اور عوام دشمن ہتھکنڈوں سے کام لینے کی پوزیشن میں ہیں اور گاہے گاہے اردو کی مخالفت میں اپنی بے وقت کی راگنی الاپتے رہتے ہیں۔

دراصل ایسے قومی اہمیت کے حامل مسائل کا معرضِ التوا میں پڑے رہنا خطرے سے یکسر خالی بھی نہیں ہوتا۔ اس سے جہاں وطن دوست عناصر کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے وہاں بعض ایسے عناصر کی بالواسطہ حوصلہ افزائی کا بھی سامان ہوتا ہے جن کا نصب العین قومی تشخص کو دھندلا کر کے پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ آہستہ آہستہ قوم شکوک و شبہات کا شکار ہو جائے اور آخرکار اپنا تشخص کھو بیٹھے۔ جہاں تک جدید علوم اور ٹیکنالوجی کے حصول کا تعلق ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دنیا کی سربرآوردہ قوموں سے اکثریت نے انگریزی کے بغیر اپنی اپنی قومی زبانوں میں علم حاصل کر کے قابلِ رشک ترقی کی ہے۔ اگرچہ اربابِ اقتدار اور پاکستان کا باشعور طبقہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہے۔ تاہم ہم اس بات کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اردو کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے اور انگریزی کے لئے راہیں ہموار کرنے سے اردو دشمن عناصر کا مقصد دراصل یہ ہے کہ انگریزی کے ذریعے ان کی جھوٹی انا کو تسکین ملنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ ان کے بچے مہنگے انگریزی طرز کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ایک ایسی زبان میں لکھنے اور بولنے کی کچھ شُد بُد پیدا کر لیتے ہیں جو ان کے آقاؤں کی آخری نشانی کے طور پر ان کے لئے بڑی متبرک ہے اور یوں وہ عوام اور اپنے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس فاصلے کو وہ امتیازِ آقا و بندہ کے طور پر استعمال کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔

جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے ہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ ایک ذریعۂ اظہار و ذریعۂ حصولِ علم کی حیثیت سے اسے محترم جانتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کے بزرگوں کا احترام کرتے وقت آدمی اپنے آباؤ اجداد کی تنقیص کرنے لگے۔ ہر ذی شعور پاکستانی کا تقاضا یہ ہے کہ اردو کو سرکاری دفتروں اور تعلیمی اداروں میں فی الفور نافذ کر دیا جائے۔ اس راہ میں اوّل تو مشکلات سرے سے موجود ہی نہیں اور اگر کہیں کچھ معمولی نوعیت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں تو ان سے بآسانی نمٹا جا سکتا ہے۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ وفاقی وزیر اطلاعات جناب راجہ محمد ظفرالحق نے اپنی زیرِ نگرانی دونوں وزارتوں میں اس کا اطلاق کر دیا ہے۔

تعلیمی شعبوں میں اردو کو رائج کرنے کا بہت بڑا اور دور رس فائدہ یہ ہے کہ طلبہ میں اردو انگریزی ذریعۂ تعلیم کی شرمناک تفریق ختم ہو جائیگی اور مقابلہ کا دائرہ وسیع تر ہو جائے گا اور ہم یقین سے کہتے ہیں کہ صحیح صلاحیتوں کا پتہ بھی تبھی چلے گا جب تعلیمی ماحول ایک سا ہوگا۔ انگریزی ایک اختیاری یا زیادہ سے زیادہ لازمی مضمون کی حیثیت سے ایک خاص درجہ تعلیم سے شروع کی جا سکتی ہے۔ امتحانات لازمی طور پر اردو ہی میں لئے جائیں اس سے صحیح اور نیچے پاکستانی نوجوان آگے آئیں گے اور موجودہ طبقاتی اور ترجیحی صورتِ حال ختم ہو جائے گی۔ جو لوگ اعلیٰ سائنسی اور فنی تعلیم حاصل کرنا چاہیں گے انگریزی جانتے ہوں گے اس لئے انہیں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت پاکستانی عوام کے تشخص کی حامل اس زبان کو جو بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے اور اپنے دامن میں علم و ہنر کا بیش بہا خزانہ رکھتی ہے فی الفور نافذ کر کے قائدِ اعظم کے تصوّرِ پاکستان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مزید تاخیر سے کام نہیں لے گی۔ (روزنامہ جنگ، راولپنڈی، ۱۵؍ جولائی ۸۴ء)

بنگلہ دیش میں اردو اور اس کا مستقبل

ایوّب جوہر ۲۶-لال چند مقیم لین (رتھ کھولا) ڈھاکہ-۱ بنگلہ دیش

بنگلہ دیش میں اُردو زبان وادب سے متعلق کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ایک بڑے انقلاب کے بعد اس ملک میں اردو کی بقا اور اس کے تحفظ کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ اس لئے بھی کہ ایک مخصوص سیاسی فکر و نظر کے تحت یہ زبان اس خطّے میں نہ صرف مطعون قرار دی گئی بلکہ ہر جائز و ناجائز حقوق سے محرومی کے ساتھ ساتھ ہمدردی سے بھی مستثنیٰ سمجھی گئی۔ لہٰذا اس کے متعلق یہ کہنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سخت جان اب بھی اس علاقے میں زندہ ہے، لیکن اسے کیا کہئے کہ تمام مایوسیوں اور محرومیوں سمیت یہ سخت جان جسے اردو کہتے ہیں نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کی سوکھی ہوئی ٹہنیوں سے اب بھی نئی نئی کونپلیں پھوٹنے کے کرشمے جاری ہیں۔

۱۹۷۱ء سے پہلے یہاں اردو لکھنے پڑھنے والوں کا ایک جم غفیر موجود تھا اور جس طرح بنگلہ زبان کو تمام سہولتیں میسّر تھیں ٹھیک اسی طرح اردو کو بھی کم و بیش تمام سہولتیں مہیّا تھیں۔ اور دونوں زبانیں ایک دوسرے سے گلے مل کر آگے بڑھ رہی تھیں اور اپنے رشتوں کی یکائی کو اور زیادہ مستحکم اور پائیدار بنانے میں مصروف تھیں لیکن جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ ۱۹۵۲ء کے بھاشا اندولن کے بعد یہاں کی ایک مخصوص سیاسی جماعت نے جس طور پر زبان کا مسئلہ کھڑا کیا اور بھاشا اندولن کو پورے طور پر اپنے سیاسی مفاد میں استعمال کیا اور اردو کے سلسلے میں نہ صرف نفرت کا بیج بونے کی کوشش کی بلکہ بڑی حد تک اخوت اسلامی کے صالح جذبوں کو زیر و زبر کرتے کے منفی رجحان کی پرورش بھی کرتی رہی۔ اور بالآخر ۱۹۷۱ء کے آتے آتے یہ منفی رجحان اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا اور تمام صالح جذبے جس سے اخوتِ اسلامی کی پہچان ہوتی تھی یکلخت دم توڑ گئے۔ اور بے چاری اردو پر جو گزری سو یہ ایک الگ کہانی ہے۔ اسے درس و تدریس کے شعبوں سے نہ صرف نکالا گیا بلکہ اسے گونگی اور اپاہج کر کے چھوڑ دیا گیا، اردو بولنے والے بڑی تیزی سے اپنی جان بچانے کی خاطر بنگلہ دیش سے دوسری جگہوں پر منتقل ہو رہے تھے، کسی کا رخ ہندوستان تھا کوئی پاکستان بھاگا جا رہا تھا۔ غرض بھاگ دوڑ کے اس ریلے میں اردو کے بہت سارے شاعر، ادیب بھی یہاں سے نکل گئے۔ تبادلے اور مختلف طریقوں سے اردو والوں کے انخلا کے بعد جو لوگ یہاں بچ رہے وہ بھی کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے، یا جنہیں بنگلہ دیش سے کہیں اور جانے سے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا گیا تھا غرض ایسی افراط تفریط میں اردو کی کراہ سننے اور اس کے درد و کرب سے آگاہ ہونے کی کسے یہاں فرصت تھی لیکن انہی لوگوں میں ایک طبقہ ایسا بھی یہاں تھا جنھیں اپنی زبان اپنی تہذیب اور کلچر کچھ زیادہ ہی عزیز تھے وہ لوگ جنہیں عام طور پر شاعر، ادیب یا دانشور کہا جاتا ہے، اپنی لسانی اور ادبی ذمہ داریوں کو محسوس کر رہے تھے اور جنھوں نے خلوص دل سے انقلاب بنگلہ دیش کو ایک انقلاب ہی جانا تھا وہ شدت سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہاں جو کچھ ہوا اسے ہونا تھا اور اس ہونے کے بعد گزرے ہوئے حالات کا ماتم کرنے کے بجائے ہمیں اپنے منتشر اجزا کو جوڑ لینا چاہئے اور بکھری ہوئی زندگی کو نئے نام سے قبول کر لینا چاہئے۔ سوچ کے اس مثبت انداز نے یہاں کے اردو بولنے والوں کو ایک نئی قوت سے آشنا کیا اور وہ زندگی کرنے اور گزارنے کے ہنر سے مانوس ہوئے۔ اسی طرح اردو کے وہ شاعر و ادیب جنھوں نے بنگلہ دیش کی وحدت اور حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا وہ اپنی زبان اور ادب کے الجھے ہوئے گیسو سنوارنے میں مصروف ہو گئے۔ اور یوں لکھنے پڑھنے کی فضا قائم ہوئی۔ اشاعتی پروگرام بھی بنائے گئے، مشاعروں اور ادبی نشستوں کا اہتمام بھی کیا گیا۔ اور اب یہ دیکھ کر طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ تمام تر دشواریوں اور پابندیوں کے باوجود یہاں پر جو ادبی کارنامے انجام دیئے گئے ہیں وہ قابلِ رشک ہیں۔ انہی کارناموں میں جہاں بنگلہ دیش

کے مختلف شہروں میں چھوٹے بڑے مشاعرے، مذاکرے یا ادبی نشستیں شامل ہیں وہیں ترویج و اشاعت کی بھی ایک لمبی فہرست ہے جو مختلف ادوار میں جریدے، اخبار، ناول، افسانوی شعری مجموعے اور کتابچوں کی شکل میں سامنے آتی رہیں، جس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے مختصراً عرض کرتا ہوں، قیامِ بنگلہ دیش کے بعد ڈھاکا سے تقریباً پندرہ عدد رسائل یا جرائد مختلف ناموں سے شائع ہوئے، چھ عدد شعری مجموعے، ایک عدد افسانوی مجموعہ، دو ناولٹ، ایک ہفت روزہ، ایک نیم سیاسی اخبار اور تین کتابچے شائع ہوئے۔ چاٹگام سے چار عدد رسالے، کھلنا سے ایک عدد رسالہ، تین افسانوی مجموعے، اور ایک عدد ناول۔ سیدپور سے چھ عدد جریدے مختلف ناموں سے شائع ہوئے۔ ان اجرا ہونے والے رسالوں میں کوئی بھی دوسرے شمارے سے تیسرے شمارے تک نہ پہنچ سکا سوائے ایک جریدہ "افق" کے جس کے تین شمارے شائع ہوئے۔ ان رسائل، اخبارات، افسانوی مجموعے، شعری مجموعے اور کتابچوں کے مصنفین کا نام جو لیا جا سکتا ہے وہ اس طرح سے ہیں۔ ڈھاکا سے ایوب جوہر، محبوب شیدائی، حبیب اعظم، رعنا علی راز، احمد الیاس، س۔ م۔ ساجد، مسعود ہادی، ظفر احمد ظفر، زاہد مظفر پوری، محمد افسر، اختر آنولوی، شررآروی، حافظ دہلوی، زین العابدین، حسن ممتاز، احمد سعدی، اسلم فریدی، عبدالرحمٰن خوشتر منگرولوی، قاضی محی الدین، ظہور المبارکی، اور حصیر نوری۔ سیدپور سے جلیل عشرت اور نیک علی عبرت۔ کھلنا سے شام بارک پوری، خلیل الرحمٰن زخمی اور شمیم زمانوی اور چاٹگام سے طارق بنارسی، اصغر راہی اور یوسف راہی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ترویج و اشاعت کے ان کارناموں کے ذکر کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی ادبی انجمنوں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جن کے ادبی کارناموں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان ادبی انجمنوں میں بنگلہ دیش میں جو سب سے فعال انجمن ثابت ہوئی وہ "حلقۂ فکر و دانش" (بنگلہ دیش) ہے اس کے بانی اور کرتا دھرتا یہاں کے ایک معروف شاعر اور استادِ فن حافظ دہلوی صاحب ہیں جن کی مخلصانہ کوششوں سے اس انجمن نے بہت سارے ادبی کارنامے انجام دیئے۔ خصوصی طور پر اس انجمن نے جہاں بڑے بڑے مشاعروں کا اہتمام کیا، یومِ غالب اور یومِ نذرل مناتی رہی وہیں اس انجمن نے ترویج و اشاعت سے متعلق بھی بڑی ہی سنجیدگی، متانت اور خلوص کا مظاہرہ کیا اور کئی ادبی رسالے اور شعری مجموعے کی اشاعت کے اہتمام سے گزری۔ اس انجمن کے بعد دوسری اہم انجمن "حلقۂ اہلِ قلم" (چاٹگام) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس انجمن نے بھی بنگلہ دیش کی ادبی تاریخ میں نمایاں رول ادا کیا ہے اور چاٹگام سے ڈھاکا تک کئی بڑے مشاعروں کے اہتمام سے گزر رہی ہے۔ اس انجمن کے روحِ رواں یہاں کے ایک معروف غزل گو شاعر اصغر راہی ہیں جنہیں شاعرِ مہوشاں بھی کہا گیا ہے، خالصتاً غزل کے شاعر ہیں اور مشاعروں پر جان دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں سوائے مشاعرے کے کوئی بڑا اشاعتی کام دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ ایک رسالہ "ماحول" کے نام سے اس انجمن نے ضرور شائع کیا لیکن اس کا دوسرا شمارہ شائع نہ ہو سکا۔ ۱۹۷۱ء سے پہلے بنگلہ دیش کی سب سے بڑی ادبی انجمن "انجمنِ ادب" تھی، لیکن قیامِ بنگلہ دیش کے بعد یہ چند شانے کے لئے افقِ ادب پر ضرور ابھری اور پھر یوں معدوم ہو گئی جیسے اس سے پہلے اس کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو، یہ انجمن جو بنگلہ دیش میں ترقی پسند مصنفین کی واحد ترجمان سمجھی جاتی تھی، یہ اپنے ہی لوگوں کی مصلحت کوشیوں کا شکار ہو گئی اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد سوائے ایک ادبی مجلہ "انجمن" اور چند چھوٹی موٹی ادبی نشستوں کے علاوہ کوئی بڑا کام اس انجمن نے انجام نہیں دیا۔ جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ واحد ادبی انجمن ہے جسے بنگلہ دیش کے معروف اہلِ قلم کا تعاون حاصل رہا ہے جن میں نوشاد نوری، احمد الیاس، زین العابدین عطاء الرحمٰن جمیل، س۔ م ساجد اور راقم الحروف کے علاوہ محبوب شیدائی اور کلیم احمد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں کی ایک اور پرانی ادبی انجمن بزمِ آصفی جو وحشت کلکتوی کے شاگرد رشید علامہ آصف بنارسی (مرحوم) سے منسوب تھی اس نے قیامِ بنگلہ دیش کے بعد اپنی تحریکات کو جاری رکھا لیکن اس انجمن کے ساتھ بھی بدنصیبی یہ رہی کہ اس کے اراکین میں سوائے عثمان غنی شاداں (مرحوم) کے کسی کو انجمن سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور یہ عثمان غنی شاداں کی انفرادی کوششوں سے ہی یہ بزم زندہ رہی اور اس کے زیرِ اہتمام ادبی نشستیں منعقد ہوتی رہیں۔ لیکن علامہ آصف بنارسی کے انتقال کے بعد اس بزم کو ایک بڑا دھچکا لگا اور آصف مرحوم کے ساتھ ساتھ ان کے کئی شاگرد بھی ادبی مرحومین میں شامل ہو گئے۔ پھر عثمان غنی شاداں کے انتقال کے بعد بزمِ آصفی بھی یہاں کی زمین میں دفن ہو گئی۔ اس انجمن کے ایک دو اراکین جو بچ رہے ہیں وہ پہلے سے ہی مرحومینِ ادب کی صف میں کھڑے ہوئے ہیں۔ ڈھاکے میں ایک نئی ادبی انجمن "دبستانِ ادب" کے نام سے ابھری اس نے بھی کچھ ادبی کام کیا لیکن بہت جلد انتشار کا شکار ہو گئی اور کچھ سیاسی جماعتوں کی طرح یہ بھی دو حصوں عطا آصفی گروپ اور جمال مشرقی گروپ میں بٹ گئی اور بالآخر اس انجمن کا وہی حشر ہوا

دوناؤ پر چڑھنے والوں کا ہوتا ہے۔ سیدپور اور کھلنا میں کوئی بھی انجمن باقاعدہ اپنا وجود قائم نہ رکھ سکی البتہ نجی طور پر کچھ لوگوں نے ادب سے متعلق ،چیپیاں لیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ کھلنا میں جہاں سب سے بڑا نام شام بارک پوری کا لیا جاتا ہے وہیں نوجوانوں میں شمیم زمانوی اور عبدالمجید ،قی کا نام لیا جاتا ہے جن کے دم خم سے وہاں اردو کی روایت اب بھی زندہ ہے۔ اسی طرح سیدپور میں جلیل عشرت، احمد سعدی، ڈاکٹر معز یزی اور ،ام الحق اورنگ کی انفرادی کوششیں ادب کے رگ وپے میں حرارت کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ سیدپور میں اردو آبادی نسبت بنگلہ دیش کے دوسرے ،ہروں کے کافی زیادہ ہے لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اور خصوصاً ادبی سرگرمیوں کے لئے یہ علاقہ کچھ زیادہ ہی بنجر ہے، ،ر بھی کبھی کبھی ادب کی کوئی لہر جب یہاں اٹھتی ہے تو ریگستان میں بوندا باندی کا سا احساس ہوتا ہے۔ الغرض مجموعی طور پر بنگلہ دیش میں اردو زبان ادب کی جو موجودہ صورت حال ہے وہ انتہائی مایوس کن ہے۔ ادبی انجمنیں تقریباً بے وجود ہو چکی ہیں۔ اردو بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے ،الوں کے نقل وطن کا سلسلہ جاری ہے۔ بڑی تیزی سے اب بھی لوگ یہاں سے نکلے چلے جارہے ہیں۔ جو لوگ کہیں جانے کی سکت نہیں رکھتے وہ لوگ ،ہاں موجود ضرور ہیں لیکن مایوسی کا شکار ہیں۔ مایوسی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں پر سرکاری طور پر اب بھی اردو سے متعلق کوئی ہمدردی نہیں ،ئی جاتی، اسکول، کالج اور مدرسوں سے تو آج سے بارہ سال پہلے ہی اردو نکال باہر کی گئی تھی کچھ دینی درسگاہوں میں اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی کہ وہاں ،ے بھی اسے نکال باہر کرنے کے منصوبے مکمل ہو چکے ہیں۔ دینی کتابیں بڑی تیزی سے اردو سے بنگلہ میں منتقل ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں۔ حالات کی ان ستم ظریفیوں کی موجودگی میں کوئی یہ کیسے خواب دیکھے کہ یہاں پر اردو کی سوکھی ہوئی ٹہنیاں ایک بار پھر سبز مائل ہوں گی اور ایک بار پھر ان ٹہنیوں ،ر پھول پتوں کی بہار کروٹیں لیتی دکھائی دے گی۔ بظاہر یہ خواب دم ماردم کی غماز نظر آتا ہے لیکن دم جب تک دم ہے، تب تک آس بھی دم بہ دم ،ے اور یہی آس ہمیں جیتے جاگتے خواب دیکھنے پر آمادہ کرتی ہے کہ آج جو کچھ بھی ہے کل یہ سب کچھ نہیں رہے گا اور آنے والا کل یقیناً وہ کل ہوگا جس کل کے لئے ہم جیتا جاگتا ایک خواب دیکھ رہے ہیں، وہ خواب جو حکیم حبیب الرحمٰن نے ۱۸۹۹ء میں دیکھا تھا اور وہ خواب جو ۱۹۸۴ء میں ایوب جوہر دیکھ رہا ہے کہ اس خطے میں جہاں اردو سے متعلق کوئی خیالی روشنی نہیں ہے یقیناً وہ دن ضرور آئے گا جب یہاں پر اردو کا مستقبل نہ صرف روشن ہوگا بلکہ قابلِ رشک بھی۔ ○○
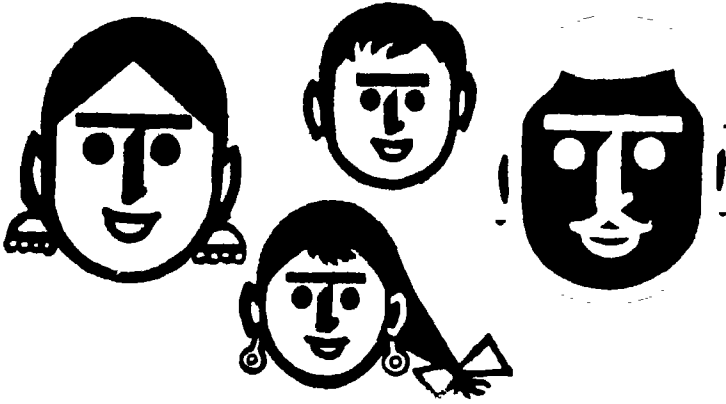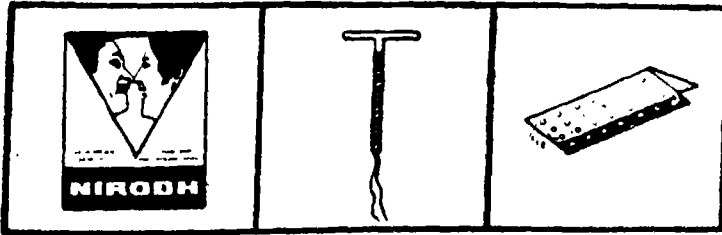
کوئی بھی طریقہ اپنایئے

davp 84/225

۱۹۸۴ء ایک باب

وفیات ۱۹۸۴ء

انسر صدیقی امروہوی
۹/دسمبر ۱۸۹۹ء امروہہ (یوپی) ○ ۹/فروری ۱۹۸۴ء کراچی (پاکستان)

اطہر پرویز
جون ۱۹۲۵ء سیوہارہ ضلع بجنور ○ ۱۰/مارچ ۱۹۸۴ء علی گڑھ

ایمن جعفری
۱۹۱۳ء ہوڑہ ○ ۱۳/دسمبر ۱۹۸۴ء ہوڑہ

خواجہ عبدالغفور
۶/اکتوبر ۱۹۱۸ء حیدرآباد ○ ۲۶/اپریل ۱۹۸۴ء بمبئی

راجندر سنگھ بیدی
۱/ستمبر ۱۹۱۵ء سیالکوٹ ○ ۱۱/نومبر ۱۹۸۴ء بمبئی

رگھبیر داس ساحر (پنڈت)
۱۹۰۴ء سیالکوٹ (پاکستان) ○ ۱۰/جولائی ۱۹۸۴ء سونی پت

رونق دکنی سیمابی (عبدالعظیم خان)
۱۹۰۲ء وشاکھاپٹم (آندھرا پردیش) ○ ۲/ستمبر ۱۹۸۴ء جمشید پور

ساغر نظامی (محمد یار خان)
۲۱/دسمبر ۱۹۰۵ء علی گڑھ ○ ۲۷/فروری ۱۹۸۴ء دہلی

ضمیر الدین قریشی
۱۹۱۹ء جلیسر ضلع ایٹہ (یوپی) ○ ۲۵/دسمبر ۱۹۸۴ء علی گڑھ

ضیاء عظیم آبادی
۱/جنوری ۱۹۱۸ء پٹنہ ○ ۴/جولائی ۱۹۸۴ء لکھنؤ

ظفر ادیب (حکیم سین)
۱۳/جنوری ۱۹۱۳ء ملتان کینٹ (پاکستان) ○ ۲۲/جون ۱۹۸۴ء دہلی

عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی (مولانا)
۱۷/اکتوبر ۱۹۲۰ء سیدھا سلطانپور اعظم گڑھ ○ ۴/دسمبر ۱۹۸۴ء اعظم گڑھ

عتیق الرحمٰن عثمانی (مفتی)
۱۹۰۱ء دیوبند (یوپی) ○ ۱۲/مئی ۱۹۸۴ء دہلی

عشرت حسین انور
۱۴/جون ۱۹۱۸ء مرادآباد ○ ۲۹/ستمبر ۱۹۸۴ء علی گڑھ

فیض احمد فیض
۱۳/فروری ۱۹۱۱ء کالا قادر خان ضلع سیالکوٹ (پاکستان) ○ ۲۰/نومبر ۱۹۸۴ء لاہور

قادر علی بیگ
۱۹۴۰ء ○ ۲/جون ۱۹۸۴ء حیدرآباد

قاضی عبدالودود
مئی ۱۸۹۶ء پٹنہ ○ ۲۵/جنوری ۱۹۸۴ء پٹنہ

کنول ابنالوی (کنور لعل)
۱۹۲۱ء ○ ۲۷/مئی ۱۹۸۴ء

محمد صادق (ڈاکٹر)
۱۸۹۸ء پشاور (پاکستان) ○ ۱۷/جون ۱۹۸۴ء لاہور

مظفر حسین
۱۹۰۴ء پٹنہ ○ ۱۷/جولائی ۱۹۸۴ء پٹنہ

مظفر شاہجہاں پوری
۱۹۱۵ء الٰہ آباد ○ ۲۳/جولائی ۱۹۸۴ء بمبئی

موہن سنگھ دیوانہ
۱۷/مارچ ۱۸۹۹ء دیوی ضلع راولپنڈی (پاکستان) ○ ۲۵/مئی ۱۹۸۴ء

نازش پرتاپگڈھی
۲۴/جولائی ۱۹۲۴ء پرتاپگڈھ ○ ۱۰/اپریل ۱۹۸۴ء پرتاپگڈھ یوپی

ناوک لکھنوی (سید اشتیاق حسین)
۱۹۲۲ء ○ ۱۸/جنوری ۱۹۸۴ء

نوبہار صابر — ۱۱/نومبر ۱۹۰۷ء — ۲۷/مئی ۱۹۸۴ء پٹیالہ (پنجاب)

اُردُو نامہ

حیدرآباد ۱۸ر فروری۔ اردو اخبارات سے وابستہ صحافیوں کے مسائل و مشکلات کو دور کرنے اور ان کی مدد و اعانت کے لئے جرنلسٹ چیرٹی آف انڈیا نے ایک سوسائٹی کے قیام کا فیصلہ کیا ہے جسے ممتاز صحافی جناب سیّد لطیف الدین قادری مرحوم مینیجنگ ایڈیٹر رہنمائے دکن کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ سوسائٹی کے اغراض و مقاصد میں صحافی برادری کے بچّوں کو مفت تعلیم اور مفت طبّی سہولتوں کی فراہمی کے علاوہ ایک عوامی دواخانے کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔

۷ر مارچ۔ ہندی کے ادیب اور اترپردیش ہندی سنستھان کے نائب صدر ڈاکٹر شیو منگل سنگھ سُمن نے پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج خلیل آباد کے جلسۂ تقسیم اسناد میں طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "جو لوگ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہیں وہ سیاسی پاگل کہے جا سکتے ہیں"۔ اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے سے احتراز ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے اردو کے بانکپن اور اس کی نزاکت کو اہمیت دی اور رسم خط تبدیل کرنے والوں کے لئے حیرت ظاہر کی۔ ڈاکٹر سُمن نے اس سلسلے میں گندی سیاسی چالوں کی مذمّت کی اور کہا کہ اردو میں ہندوستان ہے اور ہندوستان میں اردو۔ اردو کی ترقی بہرحال ہونی چاہئے۔

گلبرگہ ۱۲ر اگست۔ انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ کے زیرِ اہتمام خواجہ بندہ نواز ایوانِ اردو میں ایک اعزازی ادبی اجلاس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں سیّد فضل متین، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر نظام الدین گوریکر، ڈاکٹر خورشید حسین (امریکہ) ڈاکٹر محمد ہاشم علی، جناب احمد جلیس اور جناب بشیر احمد عارف بٹ نے شرکت کی۔ ڈاکٹر محمد عبدالعظیم نے اجلاس کی صدارت کی۔

ڈاکٹر خورشید حسین نے امریکہ میں اردو کے موضوع پر تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ کے مختلف علاقوں میں اور بڑے بڑے شہروں میں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔ یہاں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی سے اردو پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ مختلف کلچرل سنٹرس کی جانب سے مشاعرے اور ادبی جلسوں کا انعقاد عمل میں آتا ہے اور ہر سال ایک عالمی مشاعرہ ہوتا ہے۔ شکاگو، مانٹریال، ٹورنٹو اور دیگر شہروں سے اردو اخبارات اور جرائد شائع ہوتے ہیں۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اورینٹل اسٹڈیز کے تحت شعبۂ اردو بھی قائم ہے جہاں امریکی اسکالر اردو میں ریسرچ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین گوریکر نے مہاراشٹر میں اردو کے زیرِ عنوان اپنی تقریر میں کہا کہ مہاراشٹر میں اردو کا موقف دیگر ریاستوں کے مقابلے میں مضبوط اور بہتر ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی اور سیّد فضل متین نے اپنے کلام سے سامعین کو مستفیذ کیا۔

غازی پور ۱۶ر اگست۔ ضلع اردو اساتذہ ایسوسی ایشن کی اردو پڑھاؤ مہم کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔ ایک ہفتہ تک چلنے والی اس مہم کے تحت والدین سے ذاتی طور پر ملاقات کرکے اساتذہ نے بچّوں کو اردو پڑھانے پر زور دیا۔ ایسوسی ایشن نے اردو داں عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ دوکان کے بورڈ اور نام کی تختیاں اردو میں لکھیں۔ سرکاری کاموں کے دوران اردو کے استعمال پر زور دیں۔

پٹنہ ۱۵ر جولائی ۱۹۸۴ء کو بہار کی راجدھانی پٹنہ میں وزیر اعلیٰ بہار چندر شیکھر سنگھ کے دست مبارک سے "اردو بھون" کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ گورنمنٹ اردو لائبریری کے احاطے میں دس بجے دن کو ایک پر شکوہ تقریب منعقد کی گئی۔ اس رنگا رنگ،

پرکشش اور تاریخ ساز تقریب میں جناب چندر شیکھر سنگھ، جناب ناگندر جھا، وزیر کابینہ جناب محمد حسین آزاد، وزیر مملکت ڈاکٹر خالد رشید صبا، وزیر مملکت ڈاکٹر محمد عیسیٰ، پروفیسر سید علی اشرف شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جناب سید شہاب الدین دسنوی، ڈاکٹر اختر قادری نائب صدر بہار اردو اکاڈمی، جناب محمد یونس سکریٹری اکاڈمی، پروفیسر عبدالمغنی صدر انجمن ترقی اردو بہار، جناب ہارون رشید سکریٹری گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، جناب دیوتا پرشاد سنگھ میئر پٹنہ، جناب ظا انصاری، جناب علی جواد زیدی، جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ، پروفیسر ممتاز احمد، پروفیسر شمیم احمد، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، ڈاکٹر ابوذر عثمانی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر سید محمد حسنین، جناب قیوم خضر اور دیگر ممتاز علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیتیں شریک جلسہ تھیں۔

◯ کلکتہ۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے ایک وفد نے ۱۶ مئی کو سکریٹری بنگال کاؤنسل آف ہائر سکنڈری ایجوکیشن سے ملاقات کی تھی اور ہائر سکنڈری کی سطح پر اردو کے نصابی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ گفتگو کے دوران اکاڈمی نے تشویش کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ کاؤنسل کی مقررہ نصابی کتاب "منتخباتِ اردو" کی نایابی کے باعث اردو طلبہ بُری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اکاڈمی نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کونسل سے ایک معاہدہ کرتے ہوئے "منتخباتِ اردو" کی دوسری اشاعت کا اہتمام کیا۔ اکاڈمی نے بہ طورِ خاص یہ ملحوظ رکھا کہ پہلے ایڈیشن کی تمام غلطیاں دور ہو جائیں۔

اکاڈمی نے ۲۶ مئی کو مغربی بنگال سکنڈری ایجوکیشن کے سکریٹری سے بہ صورتِ وفد ملاقات کی اور ثانوی درجات (مدھیامک) کے لئے اردو کے نصابی مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ گفتگو کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ "منتخباتِ اردو" درجہ نہم دہم (بورڈ کی مقررہ کتاب) کی ۱۶۰۰ کاپیاں بورڈ کے سیل ڈپو میں پڑی ہوئی ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں کتابیں نہ ہونے کے سبب اردو حلقہ میں اس کی مصنوعی قلت پیدا ہوگئی۔

◯ رامپور کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسا آرڈر جاری ہوا ہے جس کے ذریعہ ملازمین کو اردو میں کام نہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ اس آرڈر سے رامپور کے تمام علاقوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ نگر پالیکا کا تمام کام اب تک اردو ہی میں ہوا کرتا تھا لیکن تبادلہ ہو کر آنے والے نئے ڈپٹی کلکٹر مسٹر کے ملہوترہ کو ضلع کلکٹر نے جب سے افسر انچارج نگر پالیکا مقرر کیا تو انہوں نے سب سے پہلا کام اردو کے خلاف ہی کیا۔ سپرنٹنڈنٹ ولی چند نے نوٹس بورڈ پر ایک آرڈر آویزاں کیا جس میں تحریر تھا کہ جوئنٹ مجسٹریٹ اور افسر انچارج کے زبانی حکم کے تحت چنگی چوکیوں کا تمام کام ہندی اور انگریزی میں ہوگا۔

◯ اتر پردیش میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اردو پرائمری اسکول کی تعداد ۲۱۴۲، طلبہ کی تعداد ۲۲۴۷۲ ۱۲۲ اور اردو اساتذہ کی تعداد ۵۴۴۶ ہے۔ ان کے علاوہ اردو بہ حیثیت مضمون پڑھانے والے اساتذہ کی تعداد ۲۸۶۷ ہے۔ وزیر اعلیٰ این ڈی تیواری نے اردو کی تدریس کو بہتر بنانے کے لئے فوری طور پر ایک مشیر برائے احیائے اردو مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔

◯ حکومت مدھیہ پردیش نے اردو کے مطالبات میں سے ۱۰ + ۲ + ۳ تعلیمی نصاب میں اردو کو اوّل زبان میں (اسپشل گروپ) شامل کر دینے کے مطالبہ کو منظور کر لیا ہے۔ اس اعلان کے بعد نویں درجے کے جو طلباء اردو پہلے پڑھ چکے ہیں وہ اب نویں درجے میں معیاری اردو ہی پڑھ سکیں گے۔ اس سلسلے میں کئی انجمنوں کی جد و جہد بہ طورِ خاص اردو ایجوکیشنل اینڈ کلچرل فورم کی کوششوں کے نتیجے میں یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اس سرکاری حکم پر کبھی عمل ہوتا ہے یا صرف اعلان ہی تک محدود رہتا ہے جیسا کہ سابقہ میں صرف اعلانات کر کے ہی خوش کر دیا جاتا رہا ہے۔

اردو کے مطالبات کے سلسلے میں جد و جہد کرنے والی تمام تنظیموں کو بھی چاہئے کہ وہ اب بھی عملی اقدامات پر توجہ دیں اور باقی ماندہ مطالبات کے لئے بھی سرگرم عمل رہیں۔

◯ اردو ہفتہ ــــــ زیر اہتمام انجمن ترقی اردو (ہند) مغربی بنگال اور ادارہ فروغِ اردو ہوڑہ

خط کا پتہ:۔ شری جیوتی باسو وزیر اعلیٰ مغربی بنگال رائٹرس بلڈنگ کلکتہ۔

مطالبہ:۔ مغربی بنگال میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے

خط کا پتہ:۔ مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات حکومتِ ہند پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی

مطالبہ:۔ کلکتہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے روزانہ اردو خبریں اور اردو پروگرام نشر کرنے کا فوری انتظام کیا جائے

خط کا پتہ:۔ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کلکتہ

مطالبہ:۔ کلکتہ ریڈیو سے روزانہ اردو خبریں اور پروگرام نشر کرنے کا فوری انتظام کیا جائے

خط کا پتہ:۔ ڈائرکٹر ٹیلی ویژن سنٹرل ٹالی گنج کلکتہ

مطالبہ:۔ کلکتہ ٹیلی ویژن سے روزانہ اردو خبریں اور اردو پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا جائے۔

اُردو دوست زیادہ سے زیادہ تعداد میں خطوط اور پتے لکھ کر روانہ کریں۔

○ اُردو اساتذہ کی تنظیم کراٹا کے جنرل سکریٹری جناب عبدالعلیم الامین نے وزیراعلیٰ کے اس بیان پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ انہیں اردو دان ڈائرکٹوریٹ کے دیرینہ مطالبہ اور متفقہ طور پر منظور کردہ قرارداد کا کوئی علم نہیں تعجب کی بات ہے کہ، یہ قرارداد صرف اردو اساتذہ کی کانفرنس ہی میں منظور نہیں ہوئی، بلکہ کنٹری اساتذہ کی ریاستی کانفرنس میں بھی اسے منظور کیا گیا۔ علاوہ ازیں کراٹا کے ایک وفد نے وزیراعلیٰ کو جو یادداشت پیش کی تھی اس میں بھی یہ مطالبہ شامل تھا۔ وزیراعلیٰ نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کراٹا کو مدعو کریں گے۔

جناب عبدالعلیم الامین نے اپنے مراسلے میں مزید کہا ہے کہ جب وزیراعلیٰ نے اس معاملہ میں کوئی دلچسپی نہ دکھائی تو کراٹا نے ۱۰ر نومبر ۸۴ء کو آئندہ احتجاجی قدم اٹھانے کے بارے میں وزیراعلیٰ کو آگاہ کیا۔ وزیراعلیٰ کے سکریٹری نے کراٹا کو ایک خط کے ذریعے مطلع کیا کہ وہ احتجاجی اقدام نہ کرے۔ حکومت ان کے مطالبے پر غور کر رہی ہے۔ اس کے باوجود حکومت نے کوئی توجہ نہ دی۔ مزید یہ کہ وزیراعلیٰ اس مطالبے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہے ہیں۔

○ گورکھپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر بینی مادھو پرشاد شکل ہندی اور سنسکرت کے ممتاز فاضل ہیں۔ انہوں نے انجمن ترقی اردو یوپی کے ایک وفد سے دورانِ ملاقات اردو زبان سے اپنی محبت وتعلق کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "۱۹۳۰ء سے مجھے اردو سے عشق ہوگیا تھا اور وہ اب تک قائم ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں تو یہ تھا کہ میں راتوں کو دیوار پھاند کر مشاعروں میں شرکت کرتا تھا"۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ "اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا مسئلہ تو اب نذرِ سیاست ہو چکا ہے لیکن جہاں تک اردو تعلیم کا سوال ہے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑنی چاہئے اور جس طرح ہماری نسل پہلے ہندی اور اردو ساتھ ساتھ پڑھتی تھی اسی طرح موجودہ نسل بھی پڑھے یعنی اسکولوں میں درجہ آٹھ تک اردو اور ہندی دونوں کی تعلیم لازمی رکھی جائے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل اس ریاست میں آٹھویں درجے تک دونوں زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ملک کے آزاد ہوتے ہی اردو دشمنی کی جو لہر چلی اس میں یہ تعلیمی سلسلہ بالکل بند کر دیا گیا۔

○ لکھنؤ۔ ڈاکٹر محمد رضوان علی چیرمین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی اطلاع کے مطابق ۱۹۸۴ء کے آغاز میں کمیٹی نے اردو کے ۷۰ مسودوں کی طباعت کے لئے ان کے مصنفین کو دو لاکھ اڑتالیس ہزار روپئے کی مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے قبل ۲۶۵ مسودوں کی طباعت میں سات لاکھ تینتالیس ہزار ۲۳۲ روپئے کی مالی امداد منظور کی جا چکی ہے اس طرح کمیٹی اب تک ۳۳۲ مسودوں کی طباعت میں مجموعی طور پر ۹ نو لاکھ اکیانوے ہزار دو سو اسّی روپئے کی مالی امداد کا اعلان کر چکی ہے۔

واضح رہے کہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کل ہند پیمانے پر بلند پایہ اُردو مسودات کی طباعت میں ان کے مصنفین کو کتاب کی چھ سو جلدوں پر مجموعی اخراجات کے ۷۵ فی صد تک مالی امداد دینے پر غور کرتی ہے۔

○ ۸۳-۱۹۸۲ء سے الٰہ آباد بورڈ نے ہائی اسکول میں نویں کلاس میں سات مضامین کر دیئے ہیں اور ان مضامین کی گروپنگ کچھ اس طرح ہے کہ طالب علم انگریزی اور اردو میں سے کوئی ایک زبان ہی منتخب کر سکتا ہے۔ اس سے قبل ایسا نہ تھا بلکہ دوسرے اختیاری

مضامین کے ساتھ اردو بھی ایک مضمون تھا اور طلباء اپنی سہولت خواہش اور حالات کے مطابق دوسرے مضامین کے ساتھ اردو بھی لے سکتے تھے۔
موجودہ طریقۂ کار کے تحت اب طالب علم انگریزی کے ساتھ اردو نہیں لے سکتا۔ موجودہ صورت میں سائنس ضروری مضمون قرار دیا گیا ہے جس کے ساتھ طلباء انگریزی پڑھنا اپنے لئے نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور اردو سے رغبت کے باوجود اس مجبوری کی وجہ سے اردو سے محروم رہ سکتے ہیں۔

◯ گورکھپور۔ ریاستی انجمن ترقی اردو کے نائب صدر گورکھپور کے بزرگ سیاست داں نیز کانگریس (ا) گورکھپور کے صدر جناب شری ہتیندر پانڈے نے شمال مشرقی ریلوے کے جنرل منیجر مسٹر ڈی سری رام سے ملاقات کرکے ریلوے کے اردو ٹائم ٹیبل، ریلوے لائبریری میں اردو کتب اور اخبارات کی فراہمی، ریلوے اسٹیشنوں، مسافرخانوں پر اسٹیشن کا نام اور قیمت اردو زبان میں درج کرنے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا۔ جنرل منیجر نے ان لیڈران کو بتایا کہ ابتدا میں صرف دو سو ریلوے ٹائم ٹیبل اردو میں چھپوائے گئے تھے لیکن اردو ٹائم ٹیبل کی مقبولیت اور اس کی مانگ کے باعث امسال چار ہزار ٹائم ٹیبل چھپوائے گئے ہیں اور اس میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ جنرل منیجر نے یہ بھی بتایا کہ ریلوے کے اہم اسٹیشنوں کے تمام اردو میں لکھوائے جاچکے ہیں اور مزید اسٹیشنوں پر بھی نام لکھوائے جائیں گے۔ جنرل منیجر نے ان لیڈران کو یقین دلایا کہ ریلوے لائبریری میں اردو کتب، رسائل اور اخبارات فراہم کرنے کے لئے ضروری احکامات جاری کئے جائیں گے۔ ٹکٹوں پر اردو میں شرح اور اسٹیشن کا نام درج کرنے کے سلسلے میں ہمدردانہ غور کیا جائیگا۔

◯ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والوں کو سرکاری و خانگی شعبوں میں ملازمت نہیں ملتی۔ پنچایت سمیتیوں اور اردو اخبارات کا ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس طرح سے آندھرا پردیش میں اردو زبان بے سہارا بنا دی گئی ہے۔ کانگریس آئی کے دور میں اردو کی حیثیت سے متعلق جو "جی او" جاری ہوا تھا وہ سرد خانے کی نذر ہو گیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود سرکاری سطح پر اردو کی ترقی و ترویج کا کام تقریروں کی حد تک جاری ہے۔ انجمن ترقی اردو اور دوسرے اداروں کے علاوہ اردو اخبارات اور مجلس کے ارکان اسمبلی اردو کو اس کا مستحکم مقام دلانے کی جد و جہد میں مصروف ہیں لیکن سرکاری سطح پر اردو کے تعلق سے خاموشی اختیار کر لی گئی ہے سکریٹریٹ سے لے کر پنچایت کی سطح تک تیلگو کو رائج کر دیا گیا ہے اور جب تمام دفاتر میں انگریزی سرکاری زبان ہے تو پھر اردو کی سرکاری حیثیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر حکومت اردو کے ساتھ کوئی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے تو پھر وہ زبانی ہمدردی ہے۔ اردو صرف بول چال کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔

◯ اتر پردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی ایکشن کمیٹی کے کنوینر جناب رفیق الرحمٰن نقوی اور نگراں جناب عبدالوحید بیگ نے اپنے مشترکہ بیان میں الزام عائد کیا ہے کہ جونیر ہائی اسکولوں کے تقریباً ایک ہزار اردو ٹیچروں کو نہ صرف یہ کہ پرائمری اسکول گریڈ کی تنخواہیں دی جارہی ہیں بلکہ ریاستی حکومت کے ایک حالیہ سرکاری حکم نامے (ڈی او) کے تحت انہیں جونیر ہائی اسکولوں میں نئی تقرری پانے والے پانچ ہزار اردو ٹیچروں کی آسامیوں میں بھی شامل کر لیا ہے۔ اس طرح اردو ٹیچروں کے لئے پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ دس گیارہ سال قبل چلائے جانے والی ۵۰ ہزار افراد کو کام دینے کی اسکیم کے تحت تقرر پانیوالے جونیر ہائی اسکول کے ایک ہزار ۲۷ اردو ٹیچر جنھیں پرائمری اسکول گریڈ کی تنخواہیں دی جارہی ہیں اس طرح اپنی سینیارٹی سے بھی محروم ہو جائیں گے اور گزشتہ یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو جاری کیا جانے والا ان کے مستقل ہونے کا حکم بھی عملی طور سے کالعدم ہو جائے گا۔ بیان میں الزام عائد کیا گیا ہے کہ بیسک ایجوکیشن بورڈ نے یہ "حکمت عملی" اس لئے اختیار کی ہے تاکہ ان ایک ہزار ستائیس اردو ٹیچروں کو ان کی مستقلی سے اب تک جونیر ہائی اسکول گریڈ کی تنخواہیں نہ دینی پڑیں۔ واضح رہے کہ ضلع بیسک ایجوکیشن افسران کو اس مستقلی کے ساتھ یہ حکم بھی دیئے جاچکے ہیں کہ جونیر ہائی اسکولوں کے ان اردو ٹیچروں کو نئی تقرری کی تاریخ سے جونیر ہائی اسکول کے گریڈ کے مطابق تنخواہیں دی جائیں گی۔

اس صورتِ حال کی بدولت اتر پردیش کے جونیر ہائی اسکولوں میں ریاستی حکومت کے حالیہ سرکاری حکم نامے کے مطابق

پانچ ہزار اردو ٹیچروں کے بجائے صرف ۴۷۰۹ اردو ٹیچر تقرر پا سکیں گے۔ کیونکہ بورڈ نے ان پانچ ہزار ٹیچروں میں پہلے کے ایک ہزار دو سو ستائیس اردو ٹیچروں کو بھی شامل کر لیا ہے۔

انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبد المغنی کی صدارت میں بہار اقلیتی بورڈ کا جلسہ ہوا جس میں تمام مذہبی ولسانی اقلیتوں کے تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے نمائندہ حضرات شریک ہوئے۔ ان لوگوں نے تقریباً ڈھائی گھنٹے تک اقلیتی تعلیمی مسائل خاص کر اقلیتی اسکولوں اور کالجوں کی درپیش مسائل و مشکلات پر بحث کی۔ حکومت اور اس کے افسران کے رویّوں پر سخت تنقید کی گئی یہ الزام لگایا گیا کہ حکومت خود اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے سے جان بوجھ کر گریز کر رہی ہے۔ اس معاملے میں بعض حضرات نے وزیر اعلےٰ اور وزیر تعلیم کے طریق کار کی خامیوں اور کوتاہیوں کے خلاف بھی شکایت کی۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ حکومت وقت بعض حالات کے پیش نظر انتخاب عام کے موقع پر بھی بے جا اطمینان کا اظہار کر رہی ہے حالانکہ جمہوری طور پر عوامی بالخصوص اقلیتی مطالبات پر پوری توجہ دیئے بغیر حکمراں جماعت کو انتخاب میں کامیابی کا یقین نہیں کرنا چاہیئے۔

شہر ہبلی کے مسلمانوں کی جانب سے کرناٹک کے وزیر اعلیٰ شری رام کرشن ہیگڈے کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا گیا۔ جناب چاؤس نے اس میمورنڈم میں درج ذیل باتوں کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

(۱) ریاست میں جہاں بھی اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۵ سے ۲۰ فیصد ہو وہاں اردو کو ثانوی درجہ دیا جائے۔

(۲) ہر تعلقہ میں ایک گورنمنٹ اردو ہائی اسکول قائم کیا جائے۔

(۳) اردو پرائمری اسکولوں میں بچّوں کی تعداد کے لحاظ سے اساتذہ کی تعداد کم ہے، اس لئے اعداد و شمار کے مطابق اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے۔

جناب چاؤس نے مسلمانوں کو میڈیکل کالج اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹس دیئے جانے پر حکومت کا شکریہ ادا کیا۔

ترقی اردو بیورو اپنے قیام کے فوری بعد سے مختلف سائنسی علوم سے متعلق معیاری کتابوں کی تیاری اور اشاعت میں مصروف ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ عام معلومات کی کتابوں اور بچّوں کے ادب کی اشاعت پر بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ سال رواں کے دوران اب تک چالیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس طرح بیورو نے مختلف شعبہ جات علوم سے متعلق اب تک ۲۸۴ کتابیں شائع کی ہیں۔

اردو میں تصنیف و تالیف کے کام کے سلسلے میں خاص طور پر سائنسی علوم کی کتابوں کی ترتیب و تیاری کے دوران علوم جدیدہ سے متعلق معیاری اصطلاحوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ترقی اردو بیورو ابتدا ہی سے اصطلاحات سازی کے کام میں بھی مصروف ہے۔ مختلف علوم سے متعلق اب تک ایک لاکھ بائیس ہزار فنی اصطلاحات کو قطعیت دی جا چکی ہے۔ علم کیمیا، معاشیات، لسانیات کی فرہنگ اصطلاحات شائع ہو چکی ہیں۔ دفتروں، عدالتوں اور انتظامیہ کے دیگر شعبوں میں استعمال ہونے والی اصطلاعات بھی وضع کی گئیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طلبا یونین کی جانب سے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر اور اردو کی موجودہ صورت حال کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح وائس چانسلر سید حامد نے کیا۔ نامور انگریزی صحافی کلدیپ نیّر نے کہا کہ جب تک اردو کو روزگار سے نہیں جوڑا جاتا، اردو کا مستقبل غیر یقینی رہے گا۔ ملک کی تقسیم سے اردو کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ اردو کو مسلمانوں سے بہت زیادہ جوڑنا صحیح نہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے گجرال کمیٹی کی کارکردگی اس کے طریقۂ کار اور اہم سفارشات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ حیات اللہ انصاری ممبر پارلیمنٹ نے کہا کہ اس وقت تمام توجہ اردو کی تعلیم کی طرف دی جائے۔ جناب مسعود حسن خان نے کہا کہ اردو کی ترقی ہندی یا کسی اور زبان کے لئے خطرہ نہیں ہے۔ مذاکرہ کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اردو اس وقت عوامی سطح پر ترسیل کے ایک طاقتور وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے۔

حکومت اڑیسہ نے اردو زبان کی ترقی کے لئے ریاست میں ایک اردو اکیڈمی کے قیام کا فیصلہ اصولی طور پر کر لیا ہے۔ ایک

رکاری پریس ریلیز میں اس بات کا باقاعدہ اعلان کیا گیا ـــــ فنڈ کی منظوری ہوگئی ہے۔ قاعدے بھی بنائے جا چکے ہیں: اردو، عربی ر فارسی زبانوں کے ماہرین کے ساتھ صلاح و مشورے کے بعد مجوزہ اکیڈمی کو آخری شکل دی جائے گی۔

علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

بزمِ اُردو انجمن خیر الاسلام اردو بوائز ہائی اسکول کے زیرِ اہتمام ۲۵ اور ۲۶ جنوری کو کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح ہاراشٹر اردو اکاڈمی کے ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور نے کیا اور صدرِ جلسہ جناب ریاض احمد خان مدیر قومی راج تھے۔ اس نمائش میں بمبئی کے دس بک سیلرز نے علم، ادب، فلسفہ، تاریخ، مذہب، صحافت، شاعری، طب، حکمت، سیاست اور بچوں کے ادب سے متعلق تقریباً دس ہزار کتابیں آراستہ کیں۔ پانچ ہزار سے زاید طلباء، اساتذہ اور دیگر اہلِ ذوق حضرات نے نہ صرف کتابیں دیکھیں بلکہ اپنی پسند کی کتابیں خرید کر ادب دوستی کا ثبوت بھی دیا۔

۱۲ مارچ ۱۹۸۴ء کو لکھنؤ میں کلارک اودھ ہوٹل کے تقریبات ہال میں مسٹر ریاض پراچہ سفیر پاکستان برائے ہند نے "ہند پاک دوستی میں مصنفین کا رول" کے موضوع پر سے می نار میں بہ طورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ صدارت انڈو پاک فرینڈشپ سوسائٹی کے صدر مشہور افسانہ نگار رام لعل نے کی۔ سے می نار کا افتتاح شری پت مشرا نے کیا۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری جناب اطہر نبی نے سفیر پاکستان کو ایک سپاسنامہ اور ایک یادگار تحفہ پیش کیا جو امنِ عالم کا سمبل تھا۔ جناب رام لعل نے مباحثے کا آغاز اپنے خطبۂ صدارت سے کیا۔ مباحثے میں شریک ہونے والے دیگر لوگوں میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (سرپرست انڈو پاک فرینڈشپ سوسائٹی) ڈاکٹر قمر رئیس، جگن ناتھ آزاد، جوگندر پال، پاکستان کے مشہور شاعر افتخار عارف، جمیل الدین عالی اور پاکستانی سفارت خانے کے وزیر برائے پریس سید محمد حسن عسکری شامل تھے۔

فیض آباد ۱۴ اپریل کو انیس و چکبست لائبریری میں اردو لٹریری فورم کے زیرِ اہتمام فراقؔ و جوشؔ کے سلسلے میں ایک سمی نار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سے می نار میں ۷ مقالے پڑھے گئے جن میں سے ایک جوشؔ ملیح آبادی پر تھا اور باقی پانچ فراقؔ پر تھے۔ اس سے می نار کی صدارت ممتاز محقق اور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کی۔ اردو لٹریری فورم کے سکریٹری جناب منیر قریشی نے مہمانوں اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔ مقالہ نگاروں کا تعارف پروفیسر احسن رضوی نے کروایا۔ جناب غلام رضوی گردش نے فراقؔ پر خاکہ پڑھا، عصمت ملیح آبادی نے جوشؔ کے متعلق اپنا مضمون "جوشؔ اور تضاد" پڑھا۔ جناب ایم کوٹھیاوی راہی نے فراقؔ پر اپنا پیڈیائی خاکہ پڑھا۔ زرعی یونیورسٹی فیض آباد کے ڈین ڈاکٹر کیرتی سنگھ نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ آخر میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے فراقؔ کے کلام کے محاسن و مکاتب پر اظہارِ خیال کیا۔

یکم مئی۔ جوہرا کاڈمی لکھنؤ کے زیرِ اہتمام ایک ادبی نشست میں جناب جاوید عادل رشید نے بتایا کہ نیویارک میں انہوں نے اردو شاعر مامون ایمن جو اصلاً الٰہ آباد کے ہیں ایک اردو تنظیم کی بنیاد ۱۹۷۹ء میں ڈالی تھی جس کا نام "ادبی سنگم" رکھا گیا تھا۔ اس ادبی ادارے نے نیویارک میں مشاعروں کی بنا ڈالی اور اب اس ادارے نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں۔ اس تنظیم سے نیویارک میں جو لوگ تعاون کر رہے ہیں ان میں امریکہ میں مقیم اردو بولنے والے مسلمان، ہندو، سکھ سب شامل ہیں۔ جناب جاوید عادل رشید نے اس سلسلے میں افتخار سحر، ڈاکٹر نریندر کمار سیٹھی، نہال سنگھ، آر۔ ڈی سیٹھی، اجیت نہال، جاوید ارشد، محترمہ شتی اور محترمہ راج کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس تنظیم کے زیرِ اہتمام [illegible] ہوئے ہیں جن میں ہند و پاک کے نامور شعراء نے شرکت کی۔

○ پٹنہ ۱۵ر جولائی کو گورنمنٹ اردو لائبریری میں بہار اردو اکاڈمی کے زیرِ اہتمام "قومی یکجہتی میں اردو کا حصّہ" کے موضوع پر ایک سے می نار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سے می نار کا افتتاح وزیرِ اعلیٰ بہار جناب چندر شیکھر سنگھ نے کیا۔ ڈاکٹر علی اشرف وائس چانسلر جامعہ ملّیہ اسلامیہ نئی دہلی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب علی جوّاد زیدی نے اپنے مقالے میں کہا کہ اس ملک میں تقریباً ۱۶۷۲ بولیاں رائج ہیں۔ جس ملک میں اتنی زبانیں بولی جاتی ہوں وہاں اس زبان کی بڑی اہمیت ہے جو ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور بیشک یہ اردو زبان ہے۔ ملک کے ممتاز ادیب اور صحافی جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے قومی یکجہتی اور اردو مغربی بنگال میں" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سے می نار کی دوسری نشست کے دوران ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، جناب ابوذر عثمانی، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، جناب قیوم خضر اور ڈاکٹر سید محمد حسن نے اپنے مقالات پیش کئے۔ جب کہ بمبئی سے آئے ہوئے ممتاز دانشور ڈاکٹر ظ انصاری نے برجستہ تقریر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

○ کلکتہ ۱۳ر اکتوبر چین نے یہاں واقع نیشنل لائبریری کو چار سو سے زاید کتابیں تحفے میں پیش کیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں بچّوں کے لئے ہیں۔ یہ کتابیں اردو، ہندی اور بنگالی زبان میں چین میں شائع ہوئی تازہ ترین مطبوعات ہیں۔

○ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے پاکستان سے تشریف لائے ہوئے ممتاز ناقد پروفیسر ممتاز حسین کے اعزاز میں ۲۶ر ستمبر ۱۹۸۴ء کو ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا اس نشست میں لکھنؤ کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اردو کے معروف ادیب جناب تارا چرن رستوگی جو آسام سے تشریف لائے ہوئے تھے وہ بھی اکاڈمی کی دعوت پر اس نشست میں شریک ہوئے۔

نشست کی صدارت مشہور محقق، شاعر اور مجاہد آزادی جناب علی جوّاد زیدی نے کی اور نظامت کے فرائض جناب محمد رضا انصاری فرنگی محلی (چیئرمین اردو اکاڈمی) نے انجام دیئے۔

جناب علی جوّاد زیدی نے افتتاحی کلمات فرماتے ہوئے ممتاز صاحب کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ یہ اتر پردیش اردو اکاڈمی کی خوش قسمتی ہے کہ ناسازیِ طبع کے باوجود ممتاز صاحب نے اکاڈمی کی دعوت پر زحمت فرمائی۔ علی جوّاد صاحب نے ممتاز حسین صاحب کو عہدِ حاضر کا اہم ترین اردو نقاد قرار دیتے ہوئے بتایا کہ ممتاز حسین صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسی شہر لکھنؤ سے کیا تھا۔ ابتدا میں وہ ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر تھے لیکن بعد میں انہوں نے ادبیات کا وسیع تر تناظر میں جائزہ لیا اور اردو کے تنقیدی ادب میں اپنی تحریروں کے ذریعے وقیع اضافہ کیا۔

صدر جلسہ کی تقریر کے بعد جناب محمد رضا انصاری نے لکھنؤ کے عوام اور ادبی حلقوں کی طرف سے ممتاز صاحب کا استقبال کرتے ہوئے معزز مہمان سے پاکستانی ادب کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی درخواست کی۔

ممتاز صاحب نے کہا کہ قیامِ پاکستان کو ابھی چالیس برس بھی نہیں ہوتے ہیں اور تاریخ میں یہ وقفہ نہایت ہی مختصر وقفہ ہوتا ہے۔ اتنی مدّت میں رجحانات اور میلانات میں جو صدیوں سے مشترک رہے ہوں، کوئی خاص وجہ امتیاز پیدا ہونا مشکل ہے۔ ممتاز صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے ادبی افق پر خاص کر لاہور (پنجاب) اور کراچی (سندھ) زیادہ نمایاں ہوتے۔ انھوں نے کہا کہ پنجاب کا علاقہ دونوں ملکوں میں ہے اور کراچی میں، جس کا تعلق سندھ سے ہے بیشتر تخلیق کار وہ ہیں جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچے۔ اس لئے جہاں تک ادبی قدروں اور رویّوں کا تعلق ہے بڑی حد تک دونوں جگہ یکساں ہیں۔

ممتاز صاحب نے ترقی پسند ادبی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس تحریک نے پاکستان کے ادیبوں کو بھی اسی طرح متاثر کیا جس طرح ہندوستان کے ادیبوں کو۔ اس کے جلسے برابر ہوتے تھے لیکن انھوں نے کہا کہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے نصف آخر سے اس انجمن پر پابندیاں عائد ہوئیں۔ ممتاز صاحب نے بتایا کہ انجمن تو ختم ہو گئی لیکن اس تحریک کا جو اثر ذہنوں پر تھا وہ

ترقی پسند ادب کی تخلیق کا موجب بنتا رہا۔

ممتاز صاحب نے کہا کہ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے بعد پاکستانی ادیبوں نے اپنی شناخت کی کھوج شروع کی۔ اس جنگ کا ممتاز صاحب نے بتایا "ایک بہت بڑا اثر یہ ہوا کہ اب تک دونوں ملک، جو سرحدوں سے الگ ذہنی طور پر ہم آہنگی محسوس کرتے تھے، اپنے اپنے وجود کو ایک دوسرے سے جدا ہو کر محسوس کرنے لگے۔ اور پاکستانی تخلیق کار نے اپنی جڑوں کو وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب میں تلاش کرنا شروع کیا۔

پاکستان میں ۱۹۵۸ء کے بعد ڈکٹیٹر شپ کے جو اثرات اردو ادب پر پڑے، وہ ممتاز صاحب نے کہا۔ علامتی اظہار کو انگیز کرنے کا موجب بنے۔ انھوں نے کہا کہ آزادیٔ تحریر و تقریر کی حد بندیوں کو علامتی اسلوب کے ذریعے پار کرنے کی کوششیں کی گئیں اور یہ طرز اظہار اتنا موثر و مرغوب ثابت ہوا کہ اب تک پاکستانی ادب میں علامتوں کا بیش از بیش استعمال ہو رہا ہے۔ ممتاز صاحب نے کہا کہ ادھر کچھ عرصے سے اظہار مظلومیت کے لئے واقعاتِ کربلا کو علامت کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان عام ہوا ہے۔

ممتاز صاحب نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تک پاکستانی ادب کی کوئی ایک سمت متعین نہیں ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت پاکستان میں دو طرح کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ ایک طرف کھل کر بات کہنے کا رجحان ہے تو دوسری طرف علامتوں کا پیچیدہ نظام ہے۔

اثنائے گفتگو میں ممتاز صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا کہ تیسری دنیا کے ادب پر ایک کتاب لکھنے کا پروجکٹ انھیں لندن کے "تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن" نے دیا ہے اور اس سلسلے میں وہ تیسری دنیا کے ممالک کا دورہ بھی کرنے والے ہیں۔

تقریر کے بعد پروفیسر ممتاز حسین نے اپنا ایک مختصر مقالہ "معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصّہ" پیش کیا۔ اس مقالے میں بیش تر فکر اقبال کے حوالوں سے بات کہی گئی تھی۔ اور بعض مغربی شعراء کو بھی QUOTE کیا گیا تھا۔

تقریب کے خاتمے پر محمد رضا انصاری صاحب نے معزز مہمان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

○ ۲۸ اکتوبر فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی جانب سے سہکار تا بھون میں فخرالدین علی احمد یادگاری خطبات کی پانچویں تقریب کا انعقاد ہوا جس کا افتتاح مرکزی وزیر تعلیم شریمتی شیلا کول نے کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہندوستان کے صوفی اور سنتوں نے ایکتا اور بھائی چارے کا سبق ہم کو دیا ہے جس کو ہمیں ذہن میں رکھ کر ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کرنا چاہئے۔ انھوں نے کبھی بھی مذہب کی بنیاد پر بھید بھاؤ کو اچھا نہیں سمجھا۔ آنجہانی فخرالدین علی احمد، سابق صدر ہندوستان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وزیر تعلیم نے فرمایا کہ وہ ہندو مسلم ایکتا اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت تھے۔

صدر جلسہ ڈاکٹر آر۔ ایس مصرا وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ملک کی یک جہتی کو بچانے کی اس وقت جتنی ضرورت ہے اتنی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی اس سلسلے میں صوفی اور سنتوں کی تعلیم بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہو سکتی ہے۔

مہمانِ خصوصی پروفیسر خلیق احمد نظامی، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و سابق سفیر لیبیا برائے ہند نے مقالہ پیش کیا۔ فاضل مقالہ نگار نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ان کا لب لباب یہ تھا کہ ہند کے صوفیائے کرام آدم گری کو کارِ نبوت سمجھتے تھے۔ وہ انسانیت کی تعلیم دیتے اور بلا تفریقِ مذہب و ملّت خدمتِ خلق کو عبادت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمام انسان ایک ہی جوہر کامل کے جز وہیں۔ اس لئے جس طرح اللہ کی فیض ربوبیت تمام بنی نوع انسان کے لئے مساوی ہے اسی طرح انسان کے افعال و اعمال میں بھی مذہب کی بنیاد پر تفریق نہیں ہونی چاہئے۔

○ مشہور و منفرد ادیب و نقاد اور دانشور ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں حضرت امیر خسرو پر اپنا توسیعی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ حضرت امیر خسرو کا اعتراف ان کے اپنوں سے زیادہ غیروں نے کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ روس میں ڈیڑھ درجن اسکالر امیر خسرو کے بارے میں تحقیقی کام میں مصروف ہیں۔ خسرو اور حضرت نظام الدین اولیا کے مقبروں کے مجاوروں کے

بجائے ہم جو ان کے فکری کارناموں کے مجاور ہیں ان کے صحیح وارث ہیں ۔

○ حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) کے زیر اہتمام مغنی تبسم کی صدارت میں منعقدہ جدید طرز فکر کے نمائندہ ادیبوں اور شاعروں کے ایک کثیر اجتماع میں ممتاز شاعر عزیز قیسی نے "عصری اردو ادب اور سماج کا رشتہ" کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پچھلی ربع صدی میں جو اردو ادب تخلیق ہوا ہے وہ راست اظہار بیان کا حامل نہیں ہے جب کہ ہمارے سارے مسائل واضح اور راست بیانی کے متقاضی ہیں ۔ ادیبوں اور شاعروں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو نقادوں اور رسالوں کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں پیش کرنے کے بجائے اپنے منفرد احساسات و جذبات اور ذاتی تجربات ہی کو بنیاد بنائیں ۔ اس ادبی جلسے میں علی ظہیر، غیاث متین، یوسف اعظمی اور یوسف کمال نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔

○ علامہ اقبال کی چھیالیسویں برسی کے موقع پر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام یوم اقبال منایا گیا ۔ اسی سلسلے میں "اقبال اور اردو نظم" کے عنوان سے سے می نار منعقد کیا گیا جس کا افتتاح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد نے کیا ۔

افتتاحی تقریب کے آغاز میں جناب شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں اقبال کی دو نظموں کی قرأت کی ۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر آل احمد سرور نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کی کارگذاریوں کا ذکر کیا اور سے می نار کے موضوع کی اہمیت و افادیت بیان کی ۔ سید حامد نے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع شدہ کتاب "جدید دنیا میں اسلام ـــ مسائل اور امکانات" کی رسم اجرا انجام دی ۔ افتتاح کے بعد جناب سید حامد نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھا ۔ کشمیر یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر کا چرو تے صدارتی خطبہ پیش کیا ۔ اس اجلاس میں جناب مسعود حسین خاں نے "اقبال کے اردو ترکیب بند" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا ۔

سیمینار کا دوسرا اجلاس بعد دوپہر پروفیسر مقبول احمد کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں سب سے پہلے شمس الرحمن فاروقی نے "نظم کیا ہے" کے عنوان سے ایک فکر انگیز مقالہ پڑھا اور نظم کی ایک واضح تعریف کی ۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن نے مومن قطرۂ خون است کی ایک مثال کے عنوان کے تحت اقبال کی مشہور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کا تجزیہ پیش کیا ۔ اجلاس کا تیسرا مقالہ پروفیسر حامدی کاشمیری کا تھا جنھوں نے اقبال کی نظموں کے ساختیاتی پہلو سے بحث کی ۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی نے "بانگ درا" اور "بال جبریل" کی روشنی میں اقبال کی نظم و غزل کا جائزہ پیش کیا ۔ آخر میں پروفیسر آل احمد سرور نے اردو نظم میں اقبال کے کارنامے کو اجاگر کیا ۔ ان تمام مقالات پر مفید بحث بھی ہوئی ۔

○ خدا بخش لائبریری کے زیر اہتمام اردو ادب کی سمت و رفتار پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۴۷ قبل اردو ما بعد کے اردو ادب کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اردو ادب کا مستقبل بہت زیادہ امید افزا نظر نہیں آتا ۔ اردو ادب کی زوال پذیری کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ ہمارا ادب جو ایک خاص فکری دھارے، کلچر اور روایت سے جڑا ہوا ہے، اگر ہم اس سے کٹتے چلے گئے تو ہمارا ادب اپنی شناخت کھو دے گا ۔ انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ اردو، اسکولوں اور تعلیمی اداروں سے ختم ہو رہی ہے ۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ایک سماج تھا جو اردو کی تعمیر کر رہا تھا اس کے بعد خود اس معاشرے میں انتشار آ گیا ۔ عوامی ذرائع ابلاغ کی وجہ سے گھٹیا ادب کو مقبولیت حاصل ہونے لگی اور ادب لطیف یا اعلیٰ درجے کی شاعری کو یہ چیزیں OVER SHDOW کر رہی ہیں ۔ ادب انسان کے اعلیٰ جذبات کی تسکین کرتا ہے جب کہ گھٹیا ادب جو ذرائع ابلاغ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما کے ذریعہ آیا ہے وہ سفلی جذبات کی تسکین کرتا ہے ۔ ہمارے یہاں چونکہ پڑھے لکھے عوام کی تعداد کم ہے اس لئے سطحی ادب مقبول ہو رہا ہے اور معیاری ادب کم ہو رہا ہے ۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے آزادی کے بعد اردو ادب میں پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے
رقی پسند تحریک کے اثرات اور اس سے وابستہ ادبا شعراء کے کارناموں کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ترقی پسند تحریک کے اثرات
ج بھی نمایاں ہیں اگرچہ اس تحریک کو انتہا پسندوں کی وجہ سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق اور جدیدیت کی تحریک کا
فصیلی تعارف کرواتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ آج اردو غزل پر جدیدیت کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ اس تحریک نے غزل
ے ڈکشن کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اردو تنقید کا جائزہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ اردو کو اچھے نقاد نہیں مل رہے ہیں۔
چھ نقاد تو انتہا پسند ہیں تو کچھ تعصب کا شکار ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو کسی کو ناراض کرنا نہیں چاہتے۔ ترقی پسندوں کو کئی نقاد ایسے
لے جنہوں نے ان کی ہمت افزائی کی لیکن جدیدیوں کو حسن عسکری کے بعد کوئی نقاد نہیں ملا۔ خلیق انجم نے کہا کہ میں اردو ادب کے
ستقبل سے مایوس نہیں ہوں

○ شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی کی جانب سے مقامی سطح پر کامیاب سیمینار منعقد کرنے کے بعد ۲۰/ ۲۱/ ۲۲/ دسمبر ۱۹۸۴ء کو کل ہند
دبی اجتماع کا انعقاد کیا گیا۔ اس سیمینار کا موضوع تھا "دکنی اردو ـــــ سماجی، لسانی اور تحقیقی اہمیت"
افتتاحی جلسہ ۲۰/ دسمبر شام ساڑھے چار بجے جناب سیٹھی مادھو راؤ کی صدارت میں ہوا، صدر شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی
جناب عبدالستار دلوی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا نے دکنی اردو کے آغاز و ارتقاء پر عالمانہ تحقیقی مقالہ
پیش کیا۔

سیمینار کا پہلا اجلاس ۲۱/ دسمبر صبح دس بجے
صدارت ـــــ ڈاکٹر سیدہ جعفر

ڈاکٹر شیخ فرید ـــــ "شیخ بہاؤالدین اور ان کی خزائن رحمت"
ڈاکٹر سید نعیم الدین ـــــ "دکنی ادب میں ایرانی روایات"
محترمہ اودیش رانی کوڑ ـــــ "دکنی کی موجودہ بول چال اور ادب کے عنوان"
ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ـــــ "گجری اور دکنی اردو"

دوسرا اجلاس ـــــ صدارت ـــــ رشید حسن خاں

جناب عالی جعفری ـــــ "خوب ترنگ کی لسانی خصوصیات"
ڈاکٹر محمد اقبال احمد خاں ـــــ "دکنی شاعری میں ہندو اساطیر و مذہب"
ڈاکٹر سیدہ جعفر ـــــ "قلی قطب شاہ کی شاعری کا تہذیبی مطالعہ"
ڈاکٹر گیان چند ـــــ "دکنی کے لسانی رشتے"

تیسرا اجلاس ۲۲/ دسمبر صبح دس بجے
صدارت ـــــ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی

ڈاکٹر عبدالستار دلوی ـــــ "دکنی اردو ـ سماجی لسانی تناظر میں"
ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ـــــ "دکنی اردو میں جمع بنانے کے قاعدے"
یونس اگاسکر ـــــ "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں کہاوتیں"
رشید حسن خاں ـــــ "دکنی مخطوطات کی تدوین کے بعض مسائل"
ڈاکٹر میمونہ دلوی ـــــ "دکنی اردو لوک گیت"

○ مشرقیات کے مشہور ذخیرے خدابخش لائبریری کو ایک تحقیقی مرکز کی حیثیت بھی مل گئی ہے۔ لائبریری میں محفوظ اہم مخطوطات اور نادر مطبوعات پر ریسرچ کے لئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے طور پر جونیر اور سینئر فیلوشپ بنائی گئی ہیں اور ہسٹاریکل ریسرچ کونسل کے انداز پر وزٹنگ فیلوشپ بھی طے کی گئی ہیں۔ خدابخش فیلوشپ کے تحت آزاد ریسرچ بھی ہوگی جس میں کسی ڈگری کا حصول مطمع نظر نہ ہوگا۔ فیلوشپ کے تحت پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریوں کے لئے کام بھی ہوگا جس کے لئے کشمیر یونیورسٹی یا جامعہ ملیہ میں رجسٹریشن کرایا جاسکے گا۔ وزٹنگ اور نٹیشل فیلوشپ ممتاز عالموں اور ادب یا تاریخ کے فاضلوں کے لئے مختص ہیں جو یا تو آزاد کام کرتے ہیں یا کسی یونیورسٹی سے منسلک ہیں یا ریٹائر ہو چکے ہیں۔

وہ موضوعات جن پر تحقیق ہوگی وہ اردو، فارسی، عربی، اسلامیات، دینیات، طب، اور مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور وسط ایشیا کی تاریخ سے متعلق ہوں گے۔ فی الحال جن موضوعات پر کام کا آغاز ہو گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اردو میں مناظرہ لٹریچر (۲) اردو کا لسانی ارتقاء عہد میر وسودا سے قبل (۳) علمائے بہار کی اردو خدمات (۴) بہاری اردو لغت کی تدوین (۵) بہار کے صوفیائے کرام۔ ملفوظات ومکتوبات کا انتخاب مقدمہ اور ترجمہ کے ساتھ۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ خدابخش فیلوشپ کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ امیدوار کے پاس یونیورسٹی کی ڈگری ہو۔ مشرقی مدارس سے اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے فاضل حضرات خدابخش فیلوشپ کے لئے اتنا ہی استحقاق رکھتے ہیں جیسے ایم اے، پی ایچ ڈی صاحبان ماہانہ معاوضہ جونیر فیلوشپ کے لئے سات سو روپے، سینئر فیلوشپ کے لئے ایک ہزار روپے اور وزٹنگ نیشنل فیلوشپ کے لئے دو ہزار تا تین ہزار۔ وزٹنگ فیلوشپ چھ ہفتوں کے لئے ہے۔ ۱۸ ماہ تک کے لئے اور بقیہ دو سال کے لئے۔

○ پٹنہ۔ بہار اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی صد سالہ تقریب ولادت یکم تا ۳/دسمبر ۱۹۸۴ء منعقد ہوئی افتتاحی نشست میں علامہ سید سلیمان ندوی کی حیات اور ان کے کارناموں پر مشتمل کتاب یادگار سلیمان کا اجرا بھی عمل میں آیا جس کے مرتب جناب عبدالقوی دسنوی ہیں۔ یکم دسمبر سہ پہر ساڑھے تین بجے مقامی بھارتیہ نرت کلا مندر میں تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے گورنر بہار ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی نے سید سلیمان ندوی کو فخر بہار ہی نہیں فخر ہندوستان بھی کہا۔ مرحوم کی علمی وادبی خدمات کو سراہتے ہوئے گورنر بہار نے ان کارناموں پر حیرت کا اظہار کیا۔ جلسہ کی ابتدا اکاڈمی کے نائب صدر جناب سید شہاب الدین دسنوی کے خطبۂ استقبالیہ سے ہوئی جس میں انہوں نے سید صاحب پر منعقد ہونے والی تقریبات کا تعارف پیش کیا اور اکاڈمی کی جانب سے گورنر بہار قدوائی صاحب اور مہمان خصوصی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دیگر مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس افتتاحی تقریب کا اہم اور کلیدی خطبہ جناب علی میاں ندوی کا تھا۔

تین روزہ سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱/دسمبر (بعد مغرب) صدارت :- جناب صباح الدین عبدالرحمٰن

سید سلیمان ندوی بہ حیثیت ناقد	ـــــ ڈاکٹر عبدالمغنی	پٹنہ یونیورسٹی
سید سلیمان ندوی کی نثری خدمات	ـــــ ڈاکٹر وہاب اشرفی	رانچی یونیورسٹی
سید سلیمان ندوی کی نثری خدمات	ـــــ ڈاکٹر مظفر اقبال	بھاگلپور یونیورسٹی

۲/دسمبر (صبح نو بجے) صدارت :- ڈاکٹر خلیق انجم

سید سلیمان ندوی کی دینی خدمات	ـــــ شہباز حسین	محکمۂ اطلاعات حکومت ہند
سید سلیمان ندوی اور معارف کے شذرات	ـــــ ڈاکٹر شیخ فرید	انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی
سید سلیمان ندوی کی سیرۃ نگاری	ـــــ ضیاءالدین اصلاحی	رفیق دارالمصنفین (علی گڑھ)
سید سلیمان ندوی کا مسلکِ طریقت	ـــــ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	دہلی یونیورسٹی دہلی

(دوسری) نشست (سہ پہر) صدارت پروفیسر عطاءالرحمٰن عطا کاکوی

سید سلیمان ندوی کے مکاتب بنام سید ابوظفر ندوی کا مطالعہ — پروفیسر سید حسن — پٹنہ
سید سلیمان ندوی کی اردو شاعری — ڈاکٹر ممتاز احمد — پٹنہ یونیورسٹی
سید سلیمان ندوی کا اردو کلام — ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی — سیفیہ کالج بھوپال
سید سلیمان ندوی کی لسانی تحقیق — ڈاکٹر حامد حسین — بھوپال
سید سلیمان ندوی بہ حیثیت محقق — ڈاکٹر خورشید نعمانی — مہارشی دیانند کالج بمبئی
ارض القرآن اور مستشرقین — عبدالصدیق دریاآبادی — دارالمصنفین اعظم گڑھ

۳/دسمبر صدارت :- پروفیسر سید محسن

سید سلیمان ندوی اور معارف کے شذرات — مولانا ابوالبقا ندوی — دارالمصنفین اعظم گڑھ
سید سلیمان ندوی بہ حیثیت ناقد و تبصرہ نگار — ڈاکٹر لطف الرحمٰن — بھاگل پور یونیورسٹی
لسانی خدمات — ڈاکٹر خلیق انجم — انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
ایسا کہاں سے لاؤں — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — مدیر معارف

۳/دسمبر کو ساہو جین ہال میں سید صاحب کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ایک نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس میں سید صاحب کی زندگی کی چند جھلکیاں چند نادر تصاویر کے ذریعہ پیش کی گئی تھیں۔ انکی مطبوعہ تصانیف اور غیر مطبوعہ خطوط اور مسودے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے۔

انعامات و اعزازات

- مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدیر برہان کو دس ہزار روپئے کا پرویز شاہدی ایوارڈ ان کی غیر معمولی تاریخ و سوانح نگاری، تنقیدی تصانیف اور طویل صحافتی خدمت کے پیش نظر دیا گیا۔
- جناب سالک لکھنوی کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے دس ہزار روپئے کا مولانا سعید ملیح آبادی ایوارڈ پیش کیا۔ صحافت و ادب میں سالک صاحب کی طویل خدمات کے اعتراف کے طور پر یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔
- پروفیسر مسعود حسین خاں کو ان کی تصنیف "اقبال کی نظری و عملی شعریت" پر ساہتیہ اکاڈمی کا ایوارڈ دیا گیا جو دس ہزار روپئے کے چیک اور تانبے کی ایک تختی پر مشتمل ہوتا ہے۔ مسعود صاحب کا شمار اردو کے صف اوّل کے ادیب، محقق، نقاد اور ماہرین لسانیات میں ہوتا ہے۔
- اردو کے مشہور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ہندی اردو ساہتیہ کمیٹی نے دس ہزار روپئے کا ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ عطا کیا۔
- مشہور و معروف ترقی پسند شاعر جناب کیفی اعظمی کو ان کی شعری خدمات کے اعتراف میں افرو ایشائی تنظیم نے انھیں اس سال کا لوٹس ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ تیسری دنیا میں لوٹس ایوارڈ کی وہی اہمیت ہے جو تمام دنیا میں نوبل انعام کی ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے انعامات

- ۶/جون ۱۹۸۶ء کو محترمہ اندرا گاندھی نے مندرجہ ذیل سات فن کاروں کو غالب انعامات تقسیم کئے۔

ساغر نظامی مرحوم (شاعری) ریوتی سرن شرما (ڈراما)

پروفیسر خلیق احمد نظامی	(تحقیق)	عابد علی خان	(صحافت)
محترمہ قرۃ العین حیدر	(نثر)	مجتبیٰ حسین	(طنز و مزاح)

محمد خلیق ٹونکی (خطاطی)

○

○ سید وقار الدین ایڈیٹر رہنمائے دکن (حیدر آباد) کو آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کی جانب سے مخدوم ایوارڈ پیش کیا گیا۔ مخدوم ایوارڈ اردو دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ تصور کیا جاتا ہے جو دس ہزار روپے، توصیف نامہ اور ایک شال پر مبنی ہوتا ہے۔

○ ڈاکٹر صابرہ صدیقی کو ان کی کتاب "دیکھنا تقریر کی لذت" پر ۱۹۸۴ء سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ نئی دہلی کے ماولنکر ہال میں ۱۳ نومبر ۱۹۸۴ء کو منعقدہ ایک تقریب میں ہندوستان کے نائب صدر جناب وینکٹ رمن نے دیا۔ انعام ایک سرٹیفکیٹ ایک تمغہ اور تین ہزار روپے نقد پر مشتمل ہے۔

○ تخلیقی انشاپردازی، صحافت، فنونِ لطیفہ، پرفورمنگ آرٹس اور سماجی و ثقافتی ترقی کے میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دینے کے سلسلے میں پانچ فن کاروں کو سنسکرتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اردو میں تخلیقی انشاپردازی کے لئے جناب قمر احسن کو اور سماجی و ثقافتی ترقی کی غیر معمولی کامیابی کے لئے محترمہ قمر النساء کو منتخب کیا گیا۔ یہ ایوارڈ پانچ ہزار روپے نقد اور ایک توصیفی تختی پر مشتمل ہے۔

○ ۱۹۸۳ء کا گیان پیٹھ ایوارڈ کنڑ زبان کے ماہت ونکٹیش آئنگر کو ان کے ناول "چکویر راجیندر" پر دیا گیا۔ یہ انعام ڈیڑھ لاکھ روپے کا ہے۔ آئنگر کے ۱۷ شعری مجموعے ۱۸ ناٹک، ۳ ناول، ۱۷ افسانوی مجموعے، ۴۶ آپ بیتیاں اور دیگر تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔

● دہلی اُردو اکاڈمی کے انعامات ●

درج ذیل ادبا شعرا کو ان کے ادبی کارناموں کے لئے دو دو ہزار روپے کے انعامات دیئے گئے۔

ناول۔ افسانہ۔ ڈراما۔ خاکے

○

ڈاکٹر صغرا مہدی	راگ بھوپالی
رفعت سروش	نقوشِ رفتہ
دیویندر اسّر	کینوس کا صحرا
بلراج ورما	کابوس

شاعری

○

مخمور سعیدی	بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا
ڈاکٹر محمد یعقوب	آسمانی خطوط

آرٹ

○

عبد الحق	بچوں کے آرٹ اور اس کی تدریس

تنقید و تحقیق

○

پروفیسر قمر رئیس	رتن ناتھ سرشار
پروفیسر عنوان چشتی	معنویت کی تلاش
ڈاکٹر سید فرحت حسین	خواجہ غلام السیدین
	حیات و کارنامے
امیر حسن نورانی	اردو نثر کے سرچشمے

بچوں کا ادب

○

ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی	بڑوں کا بچپن
ڈاکٹر مظفر حنفی	نیلا ہیرا

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل ناشروں کو ان کی معیاری مطبوعات ۱۹۸۴ء کے لئے دو دو ہزار روپے کے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کوچہ پنڈت دہلی —— ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۔

بہار اردو اکیڈمی کی طرف سے ۱۹۸۳ء کی مطبوعات پر انعام

تین ہزار روپئے کا قاضی عبدالودود ایوارڈ			تین ہزار روپئے کا اختر اورینوی ایوارڈ		
یوسف زلیخا	تحقیق	ڈاکٹر سیدہ جعفر	گولڈن جوبلی	افسانے	کلام حیدری

دو ہزار روپئے کے انعامات (فی کتاب)

عصری ادب کا شعور	تنقید	قمر اعظم ہاشمی	شعرستان دہلی	شاعری	رضا نقوی واہی
سب رس کی تنقیدی تدوین	"	ثمیرہ جلیلی	محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات	تنقید	جگن ناتھ آزاد

ایک ہزار روپئے کے انعامات (فی کتاب)

حرف زار - اقبال کا مطالعہ	تنقید	حامدی کاشمیری	تکلف برطرف	انشائیہ	مجتبیٰ حسین
آواز اور آدمی	"	مغنی تبسم	نواب صدیق حسن خاں	تحقیق	رضیہ حامد
جدید تنقیدی مقالے	"	محمد حنیف	اردو کے مسیحی شعراء	شاعری	ڈی اے ہربرٹ سین فرقان
تلوک چند محروم حیات و کارنامے	تحقیق	یوسف انصاری	آم کے آم	انشائیہ	رام لعل نابھوی
رتن ناتھ سرشار	تنقید	قمر رئیس	دجلہ و فرات تک	سفرنامہ	حسین امین عظیم آبادی
موج غبار	شاعری	ظفر حمیدی	طنز و تبسم	طنزیہ	جلال حسن ملیح آبادی
پہلو بہ پہلو	افسانہ	شعیب عظیم آبادی	حیدرآباد کے علمی ادارے	تحقیق	شفیقہ قادری
پس دیوار	"	عبدالصمد	مدعا	شاعری	ظہیر صدیقی
وہ سب باتیں	"	بشیشر پردیپ	دیوان لطف	تحقیق	مرزا علی بیگ
نیا سورج	"	شائق مظفرپوری	شرار جستجو	تنقید	قیصر صحی عالم
فصیل شب	"	رضوان احمد	احوال و افکار و آثار	تحقیق	عبدالغفار انصاری

کینوس کا صحرا — افسانے — دیوبندر اسّر

پانچ سو روپئے کے انعامات (فی کتاب)

تذکرہ شعرء ہریانہ	تذکرہ	رانا گنوری	مکاتب احسن	مکاتب	عنوان چشتی
عہد جدید کے ممتاز شعراء	تنقید	زرینہ عقیل احمد	خوش نفساں	سوانح خاکہ	مرزا اکبر علی بیگ
برگ آتش سوار	شاعری	مصور سبزواری	تجلیات ولی	شاعری	ریاض الرحمٰن (مرتب)
صنف انشائیہ اور اردو کے چند اہم انشائیہ نگار	تنقید	عشرت بانو	ادب کی ماہیت	تنقید	یوسف سرمست
صحیفہ	شاعری	قیصر صدیقی	سید سالار مسعود غازی	تاریخ	حیات وارث
تیسری آنکھ	افسانہ	معین شاہد	تنقیدی معروضات	تنقید	ظفر احمد صدیقی
یہ لوگ	خاکہ	محمد مثنیٰ	افسانوی ادب	"	عظیم الشان صدیقی
مرزا کلب حسین خان بہار	تحقیق	معز قیصر	یہ وادیاں	افسانہ	اعجاز شاہین
تصوف کے مسائل و مباحث	تصوف	مرزا صفدر علی بیگ	مسائل و مباحث	تنقید	نجم الہدیٰ
گلستان حمد و نعت و منقبت	شاعری	سید مظفرالدین احمد	شیشے اور پتھر	شاعری	فرحت قادری

امتزاج — تنقید — مناظر عاشق ہرگانوی

خصوصی انعامات پانچ سو روپے (فی کتاب)

بہارِ چمن	بچوں کی نظمیں	متین طارق	بیسویں صدی کے قاتل	میڈیکل	ڈاکٹر آر ایچ دستور
زندہ کہانیاں	بچوں کی کہانیاں	محمد شان	دردمنت کش	″	اسریٰ ارشد
نیلا ہیرا	″	مظفر حنفی	طبی کلیات	طب	حکیم احتشام الحق قریشی
جھاڑوں کے پیچھے	شکاریات	عبدالسلام	علم القبالت	″	محمد عبدالبسین
حیوانات	حیوانیات	قیصر سرمست	طبیب کی ڈائری	″	خالد جاوید شمسی

۱۹۸۴ء کا شاتاب ا۰۰ ادب ایوارڈ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کو ان کی ادبی خدمت کے اعتراف کے طور پر دیا گیا۔

مدھیہ پردیش حکومت نے پروفیسر آلِ احمد سرور (سری نگر) پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں) جناب علی سردار جعفری (بمبئی) اور محترمہ قرۃ العین حیدر (دہلی) کو علامہ اقبال ادبی مرکز کا رکن نامزد کیا ہے۔ یہ مرکز اقبال پر کام کرنے کے لئے حال ہی میں قائم کیا گیا ہے۔ مرکز ان طالب علموں کو وظائف دے گا جو اقبال پر کام کریں گے۔ اقبال کی یاد میں ایک لائبریری اور ایک میوزیم قائم کیا جائے گا اور علامہ اقبال پر سیمینار منعقد کئے جائیں گے۔

مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکاڈمی کی جانب سے علاقائی اردو ڈراموں کے انعامی مقابلہ کا انعقاد ناگپور کے دھنوتے رنگ مندر میں کیا گیا جس میں مختلف انجمنوں اور اداروں کی جانب سے پانچ ڈرامے پیش کئے گئے۔ حاضرین کی کثیر تعداد ان ڈراموں کو دیکھنے کے لئے موجود تھی۔ جج صاحبان نے درج ذیل ڈراموں کو انعامات سے نوازا۔

پہلا انعام	ہاں میں قاتل ہوں	بزمِ غالب (کامٹی)
دوسرا انعام	عقل والے	مسلم اسٹوڈنٹ
تیسرا انعام	ایک انقلاب اور	اسلامیہ جونیر کالج

انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر اور محقق غالب جناب مالک رام کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر غالب میموریل ویلفر سوسائٹی نے انہیں فخرِ غالب کے انعام سے نوازا۔ سوسائٹی کا یہ انعام حیات اللہ انصاری (صدر غالب ویلفر سوسائٹی) نے ایک جلسے میں مالک رام صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ جلسہ دہلی کی مختلف ادبی انجمنوں کے اشتراک سے منعقد کیا گیا تھا۔

نئی دہلی۔ اتری شری پرسکار سمیتی کی جانب سے ایک پرشکوہ تقریب فیڈریشن آف انڈین چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹریز کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی جس میں ملک کی مختلف زبانوں میں نکلنے والے اخبارات، اخبار نویسوں اور فلمی اداکاروں کو ان کی بہتر اور نمایاں کارکردگی پر ایوارڈ دئے گئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دیگر اخبارات میں شامل دہلی سے نکلنے والا مشہور روزنامہ قومی آواز بہترین اردو اخبار ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ پی ٹی آئی کے خصوصی نمائندے ام تشکیل احمد کو بھی ایوارڈ دیا گیا۔

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۸۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ ازراہِ کرم سالِ آئندہ کے لئے مبلغ ۔ نو روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

اردو ادب ۱۹۸۴ء

انور سدید ● گینال کالونی۔ فیصل آباد۔ (پاکستان)

ایک سال کا وقفہ بظاہر تین سو پینسٹھ دنوں پر محیط ہے لیکن اسے قلزمِ حیات کا ایک ننھا سا قطرہ سمجھیے، جس کی کم مائیگی کا احساس زندگی کے وسیع ترمدار میں شاید زیادہ ہو، لیکن غائر نظروں سے دیکھیے تو اس ننھے سے قطرے میں کائنات کی بوقلمونیاں موجود ہیں اور انھیں بوقلمونیوں کو شاعروں، افسانہ نگاروں اور ادیبوں نے ہمیشہ اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے، اور قطرے کے تجربے کو پورے قلزم کے تجربے میں شامل کر دیا ہے۔ ۱۹۸۴ء کے دوران ادبا نے جو معاشرے کا ہمدرد طبقہ ہے، معاشرے کے خارج اور اپنی ذات کے داخل پر نظر ڈالی اور لمحے کی فولادی گرفت سے آزاد ہو کر جذبے اور تاثر کی اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کی جس کے لیے "کھل جا سم سم" کا آوازہ تخلیقی عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات دل سے لبوں پہ آئی اور صریرِ خامہ بن کر اس عہد کے قاری تک پہونچ گئی۔ زیرِ نظر مضمون اس قافلۂ نوبہار کا گوشوارہ ہے جو جرسِ غنچہ کی صدا پہ مسلسل چل رہا ہے۔ اور ۱۹۸۴ء کے لمحوں کا پہاڑ عبور کر کے اب ۱۹۸۵ء کے زرد پہاڑ کے دامن میں کھڑا ہے۔

ادب کے جائزوں میں بالعموم تخلیقات اور مطبوعات کو موضوعِ بحث بنا کر نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ زیرِ نظر گوشوارے میں مختلف اصناف میں کام کرنے والے چند اہم ادبا کے سال بھر کے تخلیقی اور تنقیدی کام کو جمع کرنے اور ادب میں ان کی گذشتہ سال کی عطا کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ بعض ادبا کی اظہار کی صنف صرف ایک ہے اور وہ اس ایک صنف میں ہی اپنا تمام تخلیقی سفر طے کر رہے ہیں۔ لیکن متعدد ادبا ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایک سے زیادہ اصنافِ ادب میں اظہار کیا ہے۔ اور جن کی کثیر الجہت حیثیت پر زمانے کی پختہ مہر ثبت ہو چکی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ مؤخر الذکر قسم کے ادبا کو اصناف میں تقسیم کرنے کے بجائے ان کا ذکر ایک ہی جگہ کر دیا جائے۔ ان کے مجموعی کام کا گوشوارہ مرتب کرنے میں مجھے یہ طریقہ زیادہ سہل اور مفید نظر آیا ہے۔ سب سے پہلے ان ادبا کا ذکر جنھوں نے اردو ادب کی تنقید میں گذشتہ سال نمایاں حیثیت حاصل کی۔

تنقیدی ادب

۱۹۸۴ء کی تنقید کا گوشوارہ مرتب کرتے وقت سب سے پہلے جوانِ پیر سال ڈاکٹر سید عبد اللہ پر نظر پڑتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمہ جہت ادیب ہیں۔ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود گذشتہ سال انھوں نے اپنی موجودگی کا احساس ہمہ وقت بیدار رکھا۔ ان کا مضمون "البیرونی" اقبال کی نظر میں" ان کے ذوقِ نظر سے ہم آہنگ تھا۔ البیرونی اقبال کے ممدوح مصنف تھے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اقبال کی پسند کو اساس بنا کر البیرونی کی مشرک پسندی کو اور اس کی دریافتوں کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ ان کا دوسرا مقالہ "مفکر" نیاز فتح پوری کی لبرلزم کی بازیافت کرتا ہے۔ مطالعۂ کتب کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے صدیق سالک کے ناول "پریشر ککر" کے داخل سے اس آدمی کو ڈھونڈ نکالا جس کا نصب العین یہ تھا "بہتے رہو" "سلگتے رہو۔ مگر مت بولو" "قومی زبان" میں افسر سرحدی پر ان کا مضمون ایک خادمِ اردو کو خراجِ تحسین ادا کرتا ہے اور اس تب و تابِ جاودانہ کا مظہر ہے جسے صلۂ خدمتِ اردو کہنا چاہیے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کے باطن میں بیسویں صدی کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔ اس کے کچھ حصے انھوں نے اپنی آپ بیتی میں پیش کیے۔ جو "امروز" میں چھپ کر مقبول ہوئے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک قابلِ مطالعہ خاکہ لکھا اور اپنے استادِ محترم کی خدمت میں عقیدت کے چراغ روشن کیے۔ سید شبیر علی کاظمی نے ان کی اردو دوستی پر "ماہِ نو" میں مضمون پیش کیا۔ ان پر مرزا ادیب کا خاکہ "تخلیق" کراچی میں شائع ہوا۔

اختر انصاری کا نام ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں ابھرا تھا۔ لیکن پھر طویل عرصے تک وہ مطلعِ ادب سے غائب ہو گئے۔ ان کے فکر کی موثر چاپ ان کے مقالہ "غزل اور علامتی اظہار" میں سنی گئی۔ انھوں نے غزل کی رمزیت کو منفرد اور ممتاز رمزیت قرار دیا ہے۔ اور اس کی مثال میر درد، سودا اور حالی کے اشعار سے دی ہے۔ اختر انصاری کی شاعری اور افسانہ نگاری ان کی تنقیدی خوبیوں میں دب گئی تھی۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے ان کی طویل نظم "وقت کی بانسری میں" کا تجزیہ معنی خیز انداز میں کیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اورینٹل کالج کی پرنسپلی سے ریٹائرمنٹ کے بعد ادب میں زیادہ فعال ہو گئے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے شخصیت نگاری کی دو نادر قدر کتابیں "آوارگانِ عشق" اور "راہ نوردانِ شوق" شائع کی تھیں۔ پھر "سیاحت نامہ" اور "خواجہ میر درد" شائع ہوئیں۔ حال ہی میں اطلاع ملی کہ انھوں نے متفرق مضامین کا ایک مجموعہ دلی دکنی پر ایک کتاب اور مولوی عبدالحق کے خطوط کا مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے۔ گذشتہ سال انھوں نے "یادِ عہدِ رفتہ" کے عنوان سے "افکار" میں خود نوشت لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو آہستہ آہستہ ماضی سے حال کی طرف سفر کر رہا ہے۔ گذشتہ سال کے دوران ادب کے بڑے سمندر سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کا رشتہ کٹا رہا۔ اور ان کی کتابوں سے بھی مناسب تعارف نہ ہو سکا۔ تاہم ڈاکٹر حسن اختر نے ان کی شخصیت پر "امروز" میں اپنا تاثرنامہ پیش کر کے ان سے اپنا تعلقِ خاطر بخوبی قائم رکھا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اس دور کے سب سے زیادہ متنازعہ ادیب ہیں۔ محمد علی صدیقی کے اس جملے میں بڑی صداقت ہے کہ اس عہد کو فیض اور وزیر آغا نے زیادہ متاثر کیا ہے۔ گذشتہ سال کے دوران بھی وہ ایک فعال تخلیقی ادیب اور ذہن و خیال کو متاثر کرنے والے نقاد کے طور پر نمایاں ہوئے۔ نظریاتی سطح پر انھوں نے "قومی تشخص اور ثقافت" کے موضوع پر "قومی زبان" میں اظہارِ خیال کیا۔ افسانے کی بحث میں انھوں نے ثابت کیا کہ علامتی افسانہ منفی رجحان نہیں بلکہ علامت نگاری بجائے خود ایک مثبت تحریک ہے۔ ان کا مقالہ "اقبال کا تصورِ عشق" "کتاب نما" میں شائع ہوا۔ عملی تنقید کے باب میں انھوں نے عرش صدیقی کا مطالعہ "محبت لفظ تھا میرا" کی روشنی میں کیا۔ جوگندر پال کے معرکہ آرا ناول "نادید" کا اولین بھرپور تعارف بھی انھوں نے ہی پاکستان میں کرایا۔ انور سجاد کی دریافت نو میں وزیر آغا کے تجزیے کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ شخصیت کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کے لئے انھوں نے لطیف کاشمیری اور غلام جیلانی اصغر پر دو عمدہ مضامین لکھے۔ اس صنف میں ان کے مقالے "کچھ نثری نظم کے بارے میں" کی بازگشت بھی متعدد مرتبہ سنی گئی۔ ایک مکمل شاعر کی حیثیت میں انھوں نے دو طویل نظمیں "ترمینس" اور "اندر کے رونے کی آواز" تخلیق کیں۔ ان کی نظم "دستک" "اوراق" میں اور "گوری اور کالی" "کتاب نما" میں شائع ہوئی۔ انشائیہ نگاری میں "چرواہا" اور "دسترخوان" دو انشائیے منظرِ عام پر آئے۔ رسالہ اوراق میں ان کے اداریئے "عصری آگہی اور ادب" "انسان کا بائی کیمرل دماغ" اور "عالمی ادب کی عصریت" نے خاصہ طلعیانِ خیال پیدا کیا۔ وزیر آغا کے فکر و فن نے گذشتہ سال کے دوران بھی متعدد لوگوں کو ان کے مطالعے پر اپنا ردِ عمل پیش کرنے کی تحریک پیدا کی۔

انور سدید کی کتاب "وزیر آغا ایک مطالعہ" اگرچہ ۱۹۸۳ء کے اواخر میں شائع ہوئی لیکن اس پر بحث و نظر کا باب ۱۹۸۴ء میں کھلا اور وزیر آغا افراط سے زیرِ بحث لائے گئے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد، رشید امجد، حمید قریشی، انجم نیازی، رشید نثار، خیر الدین انصاری، محمد منشا یاد اور اکبر حمیدی نے اس کتاب پر کھل کر تنقید کی۔ جگن ناتھ آزاد نے وزیر آغا کی کتاب "تصوراتِ عشق و خرد" پر اور صفدر نے ان کی تنقید نگاری پر "شب خون" میں اور انور سدید نے "الفاظ" علی گڑھ میں مضامین لکھے۔

انور سدید نے ان کی خطوط نگاری کو بھی موضوع بنایا۔ اور اس پر "نیرنگِ خیال" میں تنقیدی نظر ڈالی۔ اختلافی زاویے سے وارث علوی اور فضیل جعفری نے وزیر آغا پر دو طویل مضامین لکھے۔ اول الذکر نے قلم کے بجائے تیغِ دشنام استعمال کی۔ جب کہ موخر الذکر اپنی طوالت بیانی کی وجہ سے تضاد فکری کا شکار ہو گئے۔ اور ہر دوسرے پیراگراف میں اپنے سابقہ پیراگراف کی تردید کر دی۔ ان مضامین کو پاکستان میں بالعموم پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا گیا اور تنقید کے نام پر ایک فروغ کی شدید مذمت کی گئی۔ "تخلیقی ادب" میں وزیر آغا پر ایک گوشہ مشفق خواجہ صاحب نے مرتب کیا تھا۔ علی حیدر ملک اور شمع زیدی نے ان کے انٹرویو شائع کئے۔ گذشتہ سال "الفاظ" علی گڑھ نے ان پر ایک جامع گوشہ شائع کیا۔ وزیر آغا کا اپنا اور ان کے فکر و فن پر کیا گیا کام گذشتہ سال کا وقیع ادبی اثاثہ نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی بے حد فعال اور شش جہات پر نظر رکھنے والے ادیب ہیں۔ وہ ان معنوں میں نقاد نہیں جیسے لوگ ڈاکٹر سلیم اختر کو نقاد سمجھتے ہیں لیکن ان کی عمر ادب کے دستیاب وفا میں گذری ہے جب سے ان کے ہاں تخلیق پارے پر گہری تنقیدی نظر ڈالنے کا شعور کمال بھی پیدا ہوا۔ گذشتہ سال انھوں نے

زیک پاکستان" اور "تحریک تحفظ پاکستان" کی بحث اٹھائی اور اس بات پر ملال کا اظہار کیا کہ اہلِ قلم نے آزادی کے موضوع کو جیسے ترک کر دیا ہے۔"
اگر انھیں خلیل رامپوری پسند آیا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے آزادی کے موضوع پر یہ بے لاگ شعر کہہ رکھا ہے۔

کتنے آزاد تھے برسات کے خودرو نالے　　اپنی دنیا تھی، کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا

قاسمی صاحب نے گذشتہ سال خلیل رامپوری اور جمال احسانی کو ان کے منفرد اسلوب سے دریافت کیا۔ ندرت الامین کے افسانوں پر ان کا تبصرہ بھی ایک بھرپور
تنقیدی مقالے کا درجہ رکھتا ہے۔" یادنگاری" کے سلسلے میں انھوں نے اشفاق نقوی کی کتاب "جوناگڑھ کے آخری ایام" کی داد تصنیف تنقیدی قدروں سے
دی۔ اور "ماڈرن اردو سٹوریز فرام پاکستان" کے بارے میں ان کی رائے میں بھی صداقت محسوس کی گئی کہ "انیس ناگی نے ایک فرد ہو کر ایک ادارے کا کام کیا ہے"۔ تنقید
قاسمی صاحب کے اظہار کی ضمنی صنف ہے، تخلیق کار کی حیثیت میں انھوں نے "ممی" اور "درد" نظمیں ارشاد کیں۔ نظم "ممی" گذرے وقت کا نوحہ ہے۔ یہ وقت
سفاکی کو ظاہر کرتی ہے جو آہستہ آہستہ زندہ لوگوں کو مضبوط کرتی جا رہی ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر قاسمی صاحب کی ایک شہرۂ آفاق نظم "مجھے حنوط کر دو" بے اختیار
یاد آ جاتی ہے۔ ان دونوں نظموں کے برعکس نظم "درد" میں قاسمی صاحب کی وہ رجائیت نمایاں ہے جو ترقی پسند تحریک کا قیمتی عطیہ ہے اور جو شاعر کو جان
سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس نظم میں قاسمی صاحب نے "درد" سے حیات اور ماورائے حیات کے ممکنات روشن ہونے کی نوید دی ہے۔
صہبا لکھنوی کے نام ایک خط میں قاسمی صاحب نے گذشتہ سال لکھا کہ "ہر انسان کے ساتھ جو مجبوریاں اور الجھنیں ہیں وہ مجھ پر بھی ہجوم کر آئی تھیں۔ شعر تک کہنا
چھوٹ گیا۔ ایک غزل مدتوں بعد ہوئی"۔ قاسمی صاحب کے اس خط سے جو اضمحلال نمایاں ہے وہ آہستہ آہستہ اب ان کی غزل میں بھی راہ پا گیا ہے۔ گذشتہ سال انھوں
نے بقول اپنے خود بہت کم غزل کہی۔ تاہم "افکار" میں ان کی جو غزل شائع ہوئی ہے۔ اس میں درمندی کے ساتھ یاس اور ناامیدی زیادہ نظر آتی ہے۔

کائناتوں کے تماشائی تھے　　ہم کبھی لالۂ صحرائی تھے
خول ٹوٹا جو انا کا، تو کھلا　　ہم خود اپنے ہی تمنائی تھے

۱۹۸۴ء میں — احمد ندیم قاسمی کا سب سے بڑا کارنامہ "فنون" کے "خدیجہ مستور نمبر" کی ترتیب و تدوین ہے۔ اس سے خدیجہ مستور کے ثباتِ فن کا زاویہ
پیدا ہوا۔ اور چند یادگار خاکے اور نوحے تخلیق ہوئے۔ اختر حسین جعفری کے نوحے کا یہاں بالخصوص حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ سال کے دوران ان کا کوئی
نیا افسانہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ ان کے اخباری کالم کی بازگشت متعدد مرتبہ ابھری اور یہ اکثر اوقات موضوعِ شہر بھی بنی۔ نومبر میں ان کی سالگرہ پر ایک
قومی اخبار نے ان پر ایک ادبی صفحہ شائع کیا۔ اور اس میں ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر آغا سہیل اور شبنم شکیل نے ان پر مضامین لکھے۔ اختر حسین جعفری اور پروین
شاکر نے ان پر نظمیں کہیں۔ شبنم شکیل نے لکھا کہ "وہ ایک عظیم شاعر اور انسان ہیں"۔ فیض صاحب نے فرمایا کہ "انھوں نے صحافت میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔
کالم، افسانہ، نظم، غزل اور ہر صنف میں کامیاب مشقِ سخن کی ہے۔" منیر نیازی نے شہادت دی کہ "اتنی دیر تک اور اتنی دور تک صفحۂ ادب پر موجود رہنا
ان کی حیرت انگیز تخلیقی توانائی کے سبب سے ہے"۔ فتح محمد ملک نے "تحسین و تردید" اور "انور سدید" نے "اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" کتابوں
میں انھیں موضوعِ تنقید بنایا۔ انور سدید نے ان پر ایک کتاب لکھنے کا اعلان بھی کیا۔
قاسمی صاحب نے گذشتہ سال متعدد چھوٹے بڑے مشاعروں میں شرکت کی۔ بہت سی ادبی مجالس کی صدارت کی، ان میں جنرل عارف کی کتاب
"گرد سفر" اور فیض صاحب کے تعزیتی ادبی ریفرنس کی صدارتیں بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ یوں ان کی رابطۂ عوام مہم کو بہت فروغ حاصل ہوا اور انھیں
مشاعروں میں محبت سے سنا گیا۔ ٹی وی پر "چہرے" پروگرام میں ان کی زندگی کے بعض نادر گوشوں کو منظرِ عام پر آنے کا موقعہ ملا۔ اس پروگرام میں عطاءالحق
قاسمی، حفیظ تائب، اختر حسین جعفری، توصیف احمد خان نے شرکت کی اور کلمات خیر کہے۔ قاسمی صاحب نے گذشتہ سال بھی بہت سی کتابوں کے فلیپ لکھے
ان میں سے غلام جیلانی اصغر کی کتاب "میں اور میں" کے فلیپ کو بالخصوص شہرت حاصل ہوئی۔ اس اجمال کی روشنی میں ڈاکٹر آغا سہیل کی اس رائے سے اختلاف
شاید ممکن نہ ہو کہ احمد ندیم قاسمی پاکستانی ادب کی ایک تابندہ اور فعال علامت ہیں۔ قاسمی صاحب نے گذشتہ سال کو بھرپور انداز میں بسر کیا۔
محمد علی صدیقی نے سید احتشام حسین کے بعد ترقی پسند تحریک کے فکری زاویے کو استحکام بخشا ہے۔ فکر و نظر کے اعتبار سے وہ لبرل نقاد ہیں۔ گذشتہ
سال انھوں نے ادب کے منظر پر ایک مصلح کی نظر ڈالنے کی سعی کی۔ انھوں نے اس المیے کو بالخصوص ابھارا کہ ہمارے ہاں ادبی تنقید کو وہ درجہ حاصل نہیں جو
دوسرے سماجوں میں اسے دیا جا چکا ہے۔ ان کا مقالہ "تنقید کا جدید کردار" اسی ضرورت کو روشنی میں لاتا ہے۔" افکار" کے مہمان مدیر کی حیثیت میں انھوں نے

یہ افسوس کیا کہ "علم کے پھیلاؤ کے دور میں بھی ہم قحطِ علم کا شکار رہے"۔ انھوں نے لفظ کی زندگی کو احساسات کے دائرے سے مشروط قرار دیا۔ انھوں نے کلچر کی ان مشکلات کا ذکر بھی کیا جو علوم کے پھیلاؤ سے بڑھ رہی ہیں۔ اگرچہ ان کا اشارہ ڈاکٹر سلیم اختر کی طرف نہیں تھا لیکن ان کا یہ جملہ دلچسپی سے پڑھا گیا کہ "تنقید اصنافِ سخن کی تاریخ گوئی نہیں"۔ محمد علی صدیقی نے ڈان کے "لٹریری راؤنڈ آپ" میں بھی ادب کے متعدد دیکھتے ہوئے سوالات اٹھائے۔ لیکن ان کی بازگشت اردو دنیا میں بہت کم سنی گئی۔ تقریباتی تنقیدوں میں انھوں نے زاہدہ حنا کے افسانوں کا اور فارغ بخاری کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا۔ محمد علی صدیقی کا سکور کارڈ مجموعی طور پر نظر افروز ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ "نشانات" پر ادیب سہیل کے تبصرے نے کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی شخصیت پر ان کی تحقیق نے ایسا غلبہ ڈال رکھا ہے کہ ان کی تنقید بالعموم پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں انھیں شیخ الجامعہ کراچی مقرر کیا گیا تو خدشہ پیدا ہوا کہ اب ادب کیلئے مناسب فرصت شاید نہ نکال سکیں۔ لیکن گذشتہ سال کے سکور بورڈ پر ان کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ "اوراق" میں ان کے اٹھائے ہوئے اس سوال نے کہ "علامتی افسانہ منفی رجحان ہے"، خاصہ طغیانِ خیال پیدا کیا۔

"شاعر" میں انھوں نے "ادب کا سماجی عمل" کے عنوان سے ایک فکر انگیز مقالہ لکھا۔ فکر جدید میں شبلی نعمانی کی عطا کا اثبات انھوں نے "تخلیق" کراچی میں کیا۔ ان کی شخصیت اور فن پر "افکار" میں ایک گوشہ مرتب کیا گیا جس میں جمیلہ ہاشمی، صادق حسین اور سلیم اختر نے مضامین لکھے، صہبا لکھنوی نے حالاتِ حیات کا گوشوارہ ترتیب دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک خیال انگیز انٹرویو مسعود طاہر نے رسالہ "تکبیر" میں شائع کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت کا ایک نقش "نگار پاکستان" ہے۔ تحقیق اور تنقید دونوں پر ان کی توجہ رہتی ہے۔ گذشتہ سال انھوں مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں ایک مقالہ "اقبال اور یان اسلام ازم" لکھا۔ افتخار عارف کی شاعری کا تجزیہ مقالہ "آہنگ کی تلاش کا شاعر" میں کیا۔ "واسوخت" خط کے موجد پر دادِ تحقیق حاصل کی۔ اور اپنی نسبت کو دوامِ ابد عطا کرنے کے لئے اختر حسین مرحوم کی شخصیت نگاری کی۔ فرمان صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ کراچی میں نیاز سیمینار کا انعقاد ہے جس میں ہند و پاک کے چند بڑے ادیبوں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایک جامع انٹرویو شمع زیدی نے اخبار "حریت" میں شائع کیا جس کی گونج دور دور تک سنی گئی۔ مقالہ "استفادہ یا سرقہ" میں ڈاکٹر صاحب نے کریم الدین احمد کے تذکرہ "گلدستۂ نازنیناں" کی ایسی عبارتیں دریافت کی ہیں۔ جن پر صہبائی سے سرقے کا گمان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ایک گوشے میں بیٹھ کر خاموشی سے کام کرنے والے نقاد ہیں۔ ان کی گوشہ نشینی کا ثمر ان کا مقالہ "نیاز فتح پوری کی تنقید نگاری" ہے۔ انھوں نے "شبلی کی مورخانہ و ناقدانہ خدمات" کا جائزہ بھی غیر جانبدارانہ انداز میں لیا۔ یہ دونوں مقالے وقعت کی نظر سے دیکھے گئے۔

جگن ناتھ آزاد کا شمار ان ادبا میں کرنا چاہیے جو ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد زیادہ فعال ہو جاتے ہیں۔ اب ان کا زیادہ وقت اقبال شناسی میں صرف ہو رہا ہے۔ چنانچہ گذشتہ سال انھوں نے "شب خون" میں یہ سوال اٹھایا کہ کیا اقبال مسلمانوں کے شاعر ہیں" اور پھر مراکش کے پروفیسر ایس، آئی فہد کی اس رائے کی توثیق کی کہ "اقبال ایک ہمہ گیر شہری ہیں۔ اور ان کی ہمدردیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان میں تمام دنیا کے انسان بلا امتیاز نسل و ملک سما جاتے ہیں"۔ "اقبال اور جوش" میں آزاد نے بعض مروجہ غلط فہمیوں کو صاف کرنے کی کاوش کی ہے۔ اس مقالے پر پاک و ہند میں خاصہ ردِعمل پیدا ہوا اور رشید نثار نے جوش کو اقبال کا اینٹی تھیسس قرار دے دیا۔

عمیق حنفی نے رسالہ "کتاب نما" میں "خوشبو کا بدن" کے عنوان سے لفظ کے بارے میں جامع اور خیال انگیز مقالہ لکھا۔ اور اس کی آواز دور دور تک سنی گئی۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے بھی اپنی توجہ زیادہ تر تیکنیکی نوعیت کے مضامین کی طرف مبذول کی۔ ان کا مقالہ "شکستِ ناروا" اسی نوعیت کا مقالہ ہے۔ انھوں نے تحقیق کی روشنی میں رباعی کے اوزان پر بھی خیال انگیز بحث کی۔ ڈاکٹر عبدالمغنی عبارت کے نظریاتی نقاد ہیں۔ انھوں نے تنقید معاشرہ میں ظریفانہ ادب کا کردار متعین کرنے کی کاوش کی، ان کا مقالہ موجودہ دور میں کیا ادب کی ضرورت ہے۔" بحث کو اخلاقی زاویے سے سمیٹتا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے گذشتہ سال تشریح و توضیح کا منصب سنبھالے رکھا۔ انھوں نے "شب خون" میں غالب کی اور "جواز" میں میر کی شرح جدید زاویوں سے کی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے گذشتہ سال شعر کے پس پردہ حقیقت میں زیادہ دلچسپی لی۔ انھوں نے "شعر حسرت کی سیاسی جہت" میں حسرت موہانی کی عہد کی عصری حقیقت دریافت کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ گذشتہ سال پاکستان تشریف لائے تھے۔ یہاں انھوں نے مختلف محفلوں میں ادب کے موضوعات پر عالمانہ تقریریں کیں۔ جن کی بازگشت عرصے تک اخبارات میں گونجتی رہی۔ حسن رضوی کے پینل انٹرویو میں بھی انھوں نے ادب کی صورتِ حال کا تجزیہ کیا۔

ٹیلی ویژن پر ان کے انٹرویو کو جنت گوش کے مماثل قرار دیا گیا۔ نظری تنقید میں باقر مہدی کے مضمون "سائنسی شعور کی ضرورت شخصیت کی تعمیر میں"۔ اظہر قادری کا مقالہ "ادب معاشرہ اور مفاد پرستی" ڈاکٹر عبدالباری کا "ادب میں وابستگی کا مسئلہ" قیصر زماں کا "استعارے کی اہمیت" اور ممتاز حسین کا "معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ" بہت دلچسپی سے پڑھے گئے۔

ممتاز حسین ایک طویل عرصے تک ترقی پسند تحریک کے وکیل استغاثہ کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب ان کی تنقید کے موضوعات پھیل گئے۔ ان کے سکور کارڈ پر ان کا مضمون "اقبال کا تصور اجتہاد" بھی درج ہے۔ انھوں نے علامتی افسانے کی بحث (اوراق) میں بھی سرگرم حصہ لیا ہے۔ نظری تنقید میں جن مضامین نے دلچسپی پیدا کی ان میں محب عارفی کے مضمون "خالص شاعری ایک واہمہ" محمد محسن سید کا "شخصیت کے اجزائے ترکیبی" کا ذکر ضروری ہے رام لعل اور تنویر اقدس کے ہاں غصہ ور ادیبوں کا رویہ پیدا ہوا۔ اس ضمن میں رام لعل کے مضمون "اردو ادب کی تنقید میں دہشت پسندی" اور تنویر اقدس کے مقالہ "جدید اردو افسانہ اور بوکھلائے ہوئے نقاد" کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یہ ان ادبار کے سالِ گذشتہ کے واحد تنقیدی مضمون ہیں۔ گذشتہ سال ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے متنوع موضوعات پر تنقیدی کام کیا۔ ان کے اسکور کارڈ پر "اقبال کی نظموں کا ساختیاتی پہلو" فراق گورکھپوری کا شعری ادراک" اور "جدید اردو شاعری میں طنز و مزاح" جیسے مقالات شامل ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے گذشتہ سال "فکر اقبال بین الاقوامی تناظر"۔ "ٹھنڈا میٹھا پانی کی عورتیں"۔ "ادب اور عصری آگہی — افسانہ"۔ "مجید امجد کی غزل کا روپ سروپ" وغیرہ مضامین اپنے اسکور کارڈ پر درج کرائے۔ ان کی دو کتابیں "ادب اور کلچر" اور "شعور اور لاشعور کا شاعر غالب" بھی اسی سال شائع ہوئیں۔ صابر لودھی نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ وہ لکھنا کم کر دیں تو اچھا لکھ سکتے ہیں۔ ان کی کتاب "اقبال ممدوح عالم" پر خواجہ عبدالحمید یزدانی کا تبصرہ "شاعر" میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی پچاس ویں سالگرہ پر "الفاظ" کراچی نے ایک اشاعت وقف کی جس کے بعض مندرجات سے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اچھا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً ان کے ایک شاگرد رشید نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر اردو دنیا کے انوکھے ہیں۔ وہ نہ صرف خود اکھاڑے میں اترتے ہیں بلکہ اپنے پٹھوں کو بھی تھپکیاں دے کر میدان میں اتارتے ہیں۔ اور یوں وہ خلیفے کے ساتھ ساتھ لاہوری بادشاہ بھی ہیں۔ ایک اور جگہ لکھا گیا ہے کہ "وہ جب کسی کے پیچھے پڑتے ہیں تو ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ جس طرح آج کل ڈاکٹر وزیر آغا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ڈاکٹر ملک حسن اختر نے گذشتہ سال تنقید میں اپنی موجودگی کا مثبت احساس پیدا کیا۔ انھوں نے "اقبال کا تصور خدا" "جدید اردو ڈراما کا نقش اول" "طالب علم — اقبال" اور "محمد حسین آزاد کی اردو کی پہلی کتاب" پر جامع مقالات سپرد قلم کیے۔ ان کی کتاب "تنقیدی نظریے" کو پڑھ کر محمد خالد اختر نے رائے دی ہے کہ ان کا انگریزی اور اردو ادب کا مطالعہ بے حد وسیع معلوم ہوتا ہے"۔

پروفیسر رشید حسن خان حافظ محمود شیرانی کے سلسلے تحقیق کے پیروکار ہیں۔ گذشتہ سال انھوں نے حافظ صاحب کی روایت کے اثبات کے لئے ایک گرانقدر مقالہ "شیرانی کی تاریخی اہمیت" سپرد قلم کیا۔ روبینہ ترین نے "تحقیق و تدوین کے اصول و مباحث" پر نقد و تبصرہ کیا۔ گذشتہ سال شہزاد منظر کا اشہب تنقید غیر معمولی طور پر رواں رہا۔ اور انھوں نے متعدد ایسے مضامین لکھے جن کی بازگشت بعد میں دیر تک سنی جاتی رہی۔ اسی قسم کے مضامین میں "محمد حسن عسکری کی شناخت" "ترقی پسند تنقید کی کمزوریاں"۔ "پاکستان میں اردو ناول کا معیار"۔ "علامتی افسانے میں ابلاغ کا مسئلہ"۔ "ادب میں فرد کا تصور" کو اہمیت حاصل ہے۔ شہزاد منظر کا تخلیقی ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور اس پر انیس خیام اور اسرار زیدی نے تجزیاتی تبصرے لکھے۔ شہزاد منظر کے اسکور کارڈ پر "کرشن چندر سے ایک یادگار ملاقات" کا نام بھی درج ہے۔

ستار طاہر نقاد کے بجائے تعارف نگار ہیں۔ ان کے مطالعے کے ثمرات سال بھر تک اخبارات میں بکھرے رہے "حلقۂ دامِ خیال" کے نام سے ان کے کالموں کا انتخاب چھپا ہے۔ ان کے "فٹ نوٹس" نے بھی تلاطم بپا کئے رکھا۔ سراج منیر ان نوجوان نقادوں میں سے ہیں۔ جو اپنی رائے کو ذاتی مطالعے سے ثبات فراہم کرتے ہیں۔ اور اس میں جز و مد آتا ہے تو اس کے پس پشت نئے مواد اور مطالعے کی اساس ہوتی ہے۔ گذشتہ سال انھوں نے "روایت اور جدید ذہن" کے بارے میں ایک فکر انگیز مقالہ لکھا۔ "سلیم احمد کا سفر" میں اس مرحوم ادیب کی دریافتِ نو کی۔ وزیر آغا کی تنقید نگاری پر صلاح الدین پرویز کے ساتھ ان کی گفتگو "امروز" میں شائع ہوئی۔ اس گفتگو کے فکری پہلو نے متعدد لوگوں کو چونکا دیا۔ روایت اور جدیدیت کے بارے میں ان کے تصور کو حال ہی میں "فنون" میں للکارا گیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور مقالہ جس کا ذکر محمد ارشاد صاحب نے افراط سے کیا ہے، وہ جمال پانی پتی کا "سلیم احمد اور دبستان فنون"

مطبوعہ نیرنگ خیال ہے۔ اس مقالے کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کی اشاعت پر غالی ترقی پسندوں نے مدیر نیرنگ خیال سے تعلقات منقطع کر لیے۔ اس مقالہ میں جمال پانی پتی نے نہ صرف محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے نظریات کا دفاع کیا ہے بلکہ مخالفین کو ٹھکانے لگانے کے لیے ترقی پسندوں کے غیر ادبی ہتھکنڈوں کی نشان دہی بھی کر دی ہے اور اسی کا نتیجہ محمد ارشاد کا مقالہ "روایت اور جدیدیت" (فنون) اور رشید ملک کا مکتوب ہے جن میں بقول خامہ بگوش سراج منیر اور جمال پانی پتی کو چوڑ وکرانے کمالات دکھائے گئے ہیں۔ یہ بحث جواب گالیوں اور دشنام طرازیوں سے بھی مرصع ہو گئی۔ انشاء اللہ ۱۹۸۵ء کے سال میں بھی چلے گی۔

ادیبوں اور شاعروں کے انفرادی خصوصی مطالعوں نے گذشتہ سال ایک مقبول رجحان کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ کتابوں اور ادیبوں کی رونمائی کی تقریبات کے علاوہ بھی کچھ ایسے مضامین شائع ہوئے جن میں ادیب کے فن کی توضیح و تعبیر کرنے کی کاوش کی گئی۔ اس ضمن میں جن ادبا اور مضامین کا گوشوارہ تیار ہو سکتا ہے ان میں ابن فرید (سلیم احمد کی تنقیدی بصیرت) اسلوب احمد انصاری (اطہر پرویز بطور ایک خاکہ نگار) جاذب قریشی (رئیس فروغ کی شاعری) شمیم حنفی (میرا جی حقیقت سے علامت تک) شفیق احمد شفیق (غلام عباس ایک مطالعہ) شہنشاہ مرزا (مجید امجد کی غزلیں) وفا راشدی (میر صدر الدین کا ملا۔ محمد صادق اداپوری اور محمد محسن بیکس پر مضامین)۔ نذیر احمد (جیلانی بانو کی افسانہ نگاری) ابو الکلام قاسمی (حسرت کا شعری کردار) مظہر امام (جوش کی شاعری)، محمد نعیم (مجروح سلطانپوری کی غزل) رام لعل نابھوی (ہری چند اختر، کرنل غلام سرور (رشید نثار کی انقلابی شاعری) مصطفیٰ راہی (جگر یات) اور پطرس ایک عہد آفریں شخصیت) قمر احمد شمسی (محسن احسان کی غزل، عاصی کرنالی (ہلال جعفری کی نعت) انور مسعود (خیام ایک مطالعہ) خواجہ منظور حسین (فانی ایک معنوی ترتیب) شامل ہیں۔

اسی طرح بعض ناقدین نے مختلف اصناف ادب کے خصوصی مطالعے اور ان اصناف میں تخلیق فن کے نادر گوشے تلاش کرنے کی سعی کی۔ اس اسکور کارڈ پر مندرجہ ذیل ادبا اور ان کے مضامین کا نام روشن نظر آتا ہے۔ "جدید اردو شاعری اور رومانی تحریک از ڈاکٹر محبوب راہی، نظیر صدیقی کا مقالہ اردو غزل کے جدید رجحانات شہزادہ احمد کا مقالہ "غزل کے بارے میں ایک سوال"۔ وقار احمد رضوی کا مقالہ "ترقی پسند تحریک ایک جائزہ"۔ راجندر سنگھ ورما کا "اردو میں دوہا"۔ خالد حسین کا "جدید کہانی اور ناولٹ کی تکنیک"۔ ایوب مرزا کا "ترقی پسند تحریک"۔ جمیل زبیری "پاکستان میں جدید افسانہ"۔

جدید اردو افسانے کو جو نئے نقاد ملے ہیں ان میں صبا اکرام ایک اہم اضافہ ثابت ہوئے۔ انھوں نے "اوراق" اور "اردو ادب" وغیرہ رسائل میں "جدید افسانے کے چند گوشے" "ابلاغ کی صورتیں" اور "جدید افسانے میں علامت" وغیرہ مضامین یوں لکھے کہ اب وہ بطور شاعر پس منظر میں جاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لے خیام نے بھی افسانے سے توجہ ہٹا کر جدید افسانے کی تنقید کی طرف رخ کیا۔ جدید افسانے کے ایک سرگرم نقاد مہدی جعفر نے اپنا زیادہ وقت بلراج مینرا، انور سجاد، انتظار حسین، اختر الایمان، احمد جمال پاشا، سید یوسف بخاری اور متعدد دوسرے ادبا کے انٹرویو لینے میں صرف کیا۔ انھوں نے "افواہیں اور سرگوشیاں" جیسا مضمون لکھ کر مزاح کی طرف کامیاب پیش قدمی بھی کی۔ ان کے اسکور کارڈ پر افسانہ "جھوٹے سچے خواب" (شاعر بمبئی) بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین کا مقالہ "جدید افسانہ اور علامتی اظہار"، ڈاکٹر سلیمان اطہر کا مقالہ "اشاریت کیا ہے"۔ ڈاکٹر یوسف سرمست کا "ترقی پسند تحریک اور اقبال" مظفر علی سید کا "ادب اور تاریخی شعور" محمد ابن الحسن کا "شاعری کیا ہے"؟ کو بہت توجہ سے پڑھا گیا۔ اور ابن الحسن ادب سے کہیں زیادہ معاشرے کے نقاد بن کر ابھرے۔ انھوں نے اپنی پہچان کے لیے "تاریخی شعور اور قومی یک جہتی" "آشوب آگہی" وغیرہ متعدد مضامین لکھے اور بعد ازاں انھیں ادب عالیہ کی صورت میں کتاب "شمع اور دریچہ" میں جمع کر دیا۔ سجاد نقوی نے "اوراق" کی ادارتی مصروفیات سے نکل کر "الطاف مشہدی کے گیت" اور "اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش" دو تنقیدی مضامین لکھے۔ ان کی کتاب "تنقید اور تجزیہ" کی اشاعت کے بارے میں بھی خبر شائع ہوئی۔ ڈاکٹر ایم۔ کوثر کی کتاب "اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقاء کا حصہ" ایک اچھا علمی اور تحقیقی مقالہ ہے۔

یہ تھا اردو تنقید نگاروں کا گوشوارہ۔ تنقید کے باب میں چند اور ادبا نے بھی قدم رنجہ فرمایا۔ لیکن ان کے اظہار کی بنیادی اصناف دوسری تھیں ان کا ذکر ان کی بنیادی اصناف کے حصے میں کروں گا۔

تحقیقی ادب

ادب کی تحقیق کا کام بڑا صبر آزما اور جان لیوا ہے اور اس کے ثمرات بہت دیر کے بعد حاصل ہوتے ہیں، تاہم جن ادبا نے یہ فریضہ اپنے ذمے لے رکھا ہے وہ اسے عشق کے جذبے سے سرانجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان کے ثمرات سے عہد حاضر و آئندہ کو فیضیاب کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن

میں سب سے پہلے ڈاکٹر گیان چند کا ذکر ضروری ہے۔ جنھوں نے گذشتہ بیس سال کی تحقیق و تدوین کا تذکرہ مرتب کیا اور اس میں ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر فضل امام مشفق خواجہ، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، مجوی صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر معین الرحمان، ڈاکٹر سہیل بخاری قدرت نقوی، کلب علی خاں فائق، اور عابد پیشاوری کے تحقیقی کارناموں کا تذکرہ کیا۔ محقق حضرات بالعموم منظر عام پر نہیں آتے۔ ڈاکٹر گیان چند نے یہ مقالہ لکھ کر ان کی خدمات کا کشادہ نظری سے اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ قدسی کا مقالہ "مفکرین اسلام" انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ندوہ پنجاب کی صد سالہ تاریخ اردو میں مرتب کی ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے لیکن تا حال منظر عام پر نہیں آئی۔ افسر صدیقی امروہوی کا تحقیقی کارنامہ "سنگھاسن بتیسی" ایک عرصے سے نایاب تھا۔ اب اسے انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے۔ یونس جاوید نے "حلقۂ ارباب ذوق" پر اپنا ایم اے کا مقالہ مجلس ترقی ادب سے شائع کیا۔ اس مقالے کے تحقیقی معیار پر اخبارات میں مختلف نوعیت کے بیانات شائع ہوئے لیکن یونس جاوید نے اپنا دفاع نہیں کیا۔ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے بنگال میں اردو شاعری کے نقوش انیسویں صدی کے اواخر تک لکھے۔ محمد انصار اللہ نے ڈاکٹر نذیر احمد کے خطوط ایران دریافت کیے ہیں۔ محمد یونس خالدی نے "مطالعۂ رنگین" کا ایک باب پیش کیا۔ محقق کی حیثیت میں اداجعفری کا خیر مقدم کرنا بھی مناسب۔ انھوں نے غزل نما کے زیر عنوان انعام اللہ یقین، سید محمد اثر، حسرت عظیم آبادی، شیخ حاتم، سید محمد اثر، مبارک آبرو، جہاں دار، شاد وغیرہ کو نئے انداز میں متعارف کرایا۔

پاکستان میں رسالہ "اردو" "قومی زبان" اور "صحیفہ" تحقیقی مضامین کی اشاعت کے لیے مخصوص تھے۔ لیکن اب "اردو" قحط اشاعت کا شکار ہے۔ "قومی زبان" نے اپنی وضع بدل لی ہے۔ اور "صحیفہ" کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ رسالہ چھپ کر مجلس ترقی ادب کے دفتر میں ہی دفن ہو جاتا ہے۔ تحقیق ادب کا کام مختلف یونیورسٹیوں نے بھی سنبھال رکھا ہے۔ اور یہاں پی ایچ ڈی کی سطح پر کام کروایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں جن مقالات پر گذشتہ سال پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ ان میں ڈاکٹر ابو خالد صدیقی کا مقالہ "اردو کے افسانوی ادب میں جدوجہد آزادی" ڈاکٹر سید ریحان غنی کا مقالہ "اردوئے معلیٰ کی ادبی خدمات" ڈاکٹر اے، بی اشرف کا مقالہ "اردو ڈرامہ اور حکیم احمد شجاع کا خصوصی مطالعہ"۔ ڈاکٹر اسلام عشرت کا مقالہ "خلیل الرحمان اعظمی حیات اور شاعری"۔ ڈاکٹر انوار احمد کا مقالہ "مختصر اردو افسانہ۔ سیاسی اور سماجی تناظر میں"۔ ڈاکٹر صدیق مجیبی کا مقالہ "چھوٹا ناگ پور میں اردو کا ارتقا"۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا مقالہ "ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب"۔ اور ڈاکٹر رضیہ سلطانہ کا مقالہ "اسلامی کلچر اردو مرثیے میں" وغیرہ شامل ہیں۔ میری ذاتی معلومات کے مطابق ڈاکٹر انور محمود خالد کا مقالہ "اردو ادب میں سیرت نگاری"۔ ڈاکٹر ریاض مجید کا مقالہ "اردو ادب میں نعت نگاری"۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا مقالہ "تنقید کا نفسیاتی دبستان" اور طاہر تونسوی کا مقالہ "ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب" فی الوقت زیر اشاعت ہیں۔ بشیر سیفی کا مقالہ "اردو انشا اور انشائیہ نگاری"۔ احسن زیدی کا مقالہ "اردو میں منقبت نگاری"، ریاض احمد ریاض کا مقالہ "ابن انشا — احوال و آثار"۔ صدیق جاوید کا اقبال پر مقالہ، اور مرزا حامد بیگ کا ترجمہ نگاری پر مقالہ یونیورسٹی میں ڈگری کی عطا کے لیے پیش کیے جا چکے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ان دنوں تحقیقی کام کو اہمیت تو بہت دی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے معیار پر مناسب توجہ مبذول نہیں ہو رہی ہے۔ بیشتر نگران اس قسم کے ہیں جن کا تفویض شدہ موضوع پر مطالعہ ناقص ہے اور وہ محقق طلبہ کو راہنمائی فراہم کرنے کے بجائے خود ان کے محتاج نظر آتے ہیں۔ پروفیسر رشید حسن خاں نے تو اس قسم کے غیر راہنما اساتذہ کو باقاعدہ تعزیری سزا دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ یونیورسٹی سے باہر اپنی ذاتی استعداد پر ابو سلمان شاہجہاں پوری نے گذشتہ سال بھی قابل قدر کام کیا۔ مولانا محمد علی اور ان کی صحافت"۔ مولانا آزاد پر ان کی دو کتابیں اور "تحریکات ملی" ان کی گذشتہ سال کی فتوحات ہیں۔ احمد پراچہ کی کتاب "کو ہاٹ کا ذہنی ارتقا" بھی دریافت نو کا درجہ رکھتی ہے۔ پاکستان میں فی الوقت جو ادبا تحقیق کا جان لیوا کام محبت کی آتش زیر پا سے کر رہے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری مشفق خواجہ، وفا راشدی، سہیل بخاری، کلب علی خاں فائق، قدرت نقوی، اور اکرام چغتائی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اور یہ لوگ اپنے اپنے کلبۂ تحقیق میں گم ہیں۔ ڈاکٹر قادر رضوی کا مقالہ "اسماعیل میرٹھی ایک مطالعہ" بھی گذشتہ سال شائع ہوا۔ ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب "بیسویں صدی میں اردو ادب" اگرچہ انگریزی میں ہے لیکن اسے اردو داں طبقے نے بھی بغور پڑھا۔

ناول :- گذشتہ چند سالوں کی ناول نگاری کا گوشوارہ مرتب کریں تو سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ناول کی تخلیق ہمارے ادیبوں کا جز وقتی مشغلہ ہے۔ زندگی کے "کل" پر نظر ڈالنے کے لیے بہت کم ادیبوں نے اسے ایک علیحدہ اور خصوصی صنف اظہار کے طور پر قبول کیا ہے۔ گذشتہ

سال بھی جو ناول منظرِ عام پر آئے وہ کسی باقاعدہ ناول نگار کی تخلیق نہیں، بلکہ افسانہ نگاروں کے تخلیقی تجربہ کا جوہر تھے۔ یہ تجربہ بتدریج پھیلتا چلا گیا اور زندگی کے ایک مخصوص حصے کو وسیع تناظر میں پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جوگندر پال بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ گذشتہ سال اس نے زندگی کو غزل کا شعر بنانے کی کاوش کی تو اسے طویل نظم کے روپ میں دیکھنے کا تجربہ بھی کیا۔ کتھا نگر کے افسانوں میں زندگی کا اجتماعی تجربہ اور بعنوی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے افسانے "موجود" "مسافر" اور "ستے اور رشتے" میں زندگی کی چلتی پھرتی قاش کو مجسم کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ جوگندر پال نے "کولاژ" کے عنوان سے افسانے کے موضوع پر ایک معرکہ آرا مقالہ "افکار" میں لکھا۔ پریم چند کی منتخب کہانیوں کے مقدمے میں جوگندر پال نے چند بنیادی سوالات اٹھائے تاہم جس کتاب نے جوگندر پال کو زیادہ مستحکم کیا۔ وہ ان کا انوکھا ناول "نادید" ہے۔ یہ بے بصارت لوگوں کا ناول ہے۔ اس ناول میں اندھوں کی مسرتوں، خوشیوں، محرومیوں اور نارسائیوں کو موضوع بنا کر حقیقی زندگی کے نقوش اجاگر کیے گئے ہیں۔ "نادید" اس زندگی کا بیانیہ ہے جو بلائنڈ ہاؤس میں مقید ہے۔ لیکن اندھوں کی داخلی سطح پر اپنا ہنگامہ بصارت اور بصیرت سے پیدا کرتی ہے۔ اس ناول میں جوگندر پال نے بلاشبہ ایک بڑا تجربہ کیا ہے جس کی مثال تاحال اردو ادب میں دستیاب نہیں۔

فہیم اعظمی بھی افسانے سے ناول کی طرف آئے ہیں۔ گذشتہ سال ان کے افسانہ "چوتھا آدمی" نے ایک خاص تاثر پیدا کیا لیکن ان کے اسکور کارڈ پر سب سے نمایاں ان کا ناول "جنم کنڈلی" ہے۔ یہ ناول بیک وقت حقیقی بھی ہے اور علامتی بھی، یہ جگ بیتی بھی ہے اور آپ بیتی بھی۔ یہ اقدار کی شکست و ریخت سے سماج کی ٹوٹ پھوٹ کی طرف سفر کرتا ہے۔ اور "کشکول" کی صورت میں ایک بڑی علامت تخلیق کرتا ہے۔ اس ناول کے تجربے پر گذشتہ سال ملے جلے تاثرات ابھرے اور اس کی تفہیم کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ انیس ناگی کی نمود میں ادب لطیف میں شائع شدہ "ایک کہانی" نے نئی جہت کا اضافہ کیا۔ سال کے اختتام سے قبل انھوں نے منٹو پر اپنی تنقیدی کتاب پیش کی۔ اردو افسانوں کے انگریزی تراجم پر ندیم صاحب نے انیس ناگی کو دل کھول کر داد دی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ "میں اور وہ" کی اشاعت سے ان کی ناول نگاری کو نسبتاً زیادہ وسیع حلقے میں سراہا گیا۔ "دیوار کے پیچھے" کی طرح اس ناول میں انیس ناگی نے ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ انھوں نے مختصر سے وقفے کے اس ناول میں داخل کی مکمل یاترا کی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ "دیوار کے پیچھے" جیسا تاثر پیدا نہیں کر سکا۔ محمد عالم خان نے اس ناول کا تجزیہ خوبی سے کیا۔ زیتون بانو بنیادی طور پر پشتو کی افسانہ نگار ہیں۔ گذشتہ سال انھوں نے ناول کی طرف پیش قدمی کی۔ ان کے ناول کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اسے پہلے ٹی وی پر ڈرامے کی صورت میں دکھایا گیا۔ بعد میں "برگِ آرزو" کے نام سے شائع کیا گیا۔ یہ ناول صوبہ سرحد کے پٹھانوں کے رسم و رواج کا حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کرتا ہے۔ دیہات اور شہر کی آویزش کو قدیم اور جدید کے حوالے سے اس ناول میں دلآویز اور کریہہ دونوں قسم کے کرداروں سے نمایاں کیا گیا ہے۔

ناول نگاری شہزاد منظر کی بھی بنیادی جہت نہیں۔ گذشتہ سال وہ افسانہ نگار سے کہیں زیادہ نقاد کے روپ میں ابھرے۔ ان کی ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" کا ذکر شہزاد منظر کے اسکور کارڈ پر پہلے درج ہو چکا ہے۔ شمس کاشمیری کی بنیادی صنف سفرنامہ ہے۔ گذشتہ سال انھوں نے سفر کی ٹیکنیک کو ناول میں آزمایا۔ اور "سری نگر ۵۷ میل" جیسا ناول پیش کیا۔ رحیم گل کا "وادی گماں میں" ایک شعری سمفنی ہے۔ افسانہ اور خاکہ نگاری میں آبلہ پائی کے باوصف ناول رحیم گل کی بنیادی صنف نظر آتی ہے۔ گذشتہ سال انھوں نے عطاء الحق قاسمی، سلیم اختر وغیرہ پر دلچسپ خاکے لکھے۔ لیکن ان کی شہرت کے گراف کو ناول "وادی گماں میں" نے بلندی کی طرف بڑھایا۔ اسرار زیدی نے لکھا ہے کہ اس ناول میں آئیڈیل کی تلاش نمایاں ہے۔ اور یہ انسان کی تلاش پر منتج ہے۔ انھیں دنوں منیر احمد کا ناول "من کی چور گلی"۔ حمید کاشمیری کا ناول "۱۹۸۴ء کی بیٹی" اور مصطفیٰ کریم کا ناولٹ "گرم دن" بھی شائع ہوئے۔ احمد جاوید نے "پیادے" کے عنوان سے ناول کا ایک باب پیش کیا۔

ہرچرن چاولہ بھی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن اب وہ اپنے تجربے کو افسانے کے "جزو" کے بجائے ناول کے "کل" میں پیش کر رہے ہیں۔ گذشتہ سال انھوں نے "البم" کی یاد نگاری کے علاوہ "بے باک بات" اور "چھیمی دے دے" دو اچھے افسانے لکھے۔ ان کے اسکور کارڈ پر ناول "بھٹکے ہوئے لوگ" کو زیادہ اہمیت ملی۔ یہ ناول تارکین وطن کے مسائل و جذبات کو جرمنی، ہالینڈ اور لندن کے تناظر سے ابھارتا ہے۔ اور خاصہ کڑوا ذائقہ پیدا کرتا ہے۔

ناول کی تنقید میں سب سے اہم نام ممتاز احمد خان کا ابھرا۔ انھوں نے خدیجہ مستور کے ناول "زمین" کا ایک معنی خیز تجزیہ کیا۔ ناول کے مطالعوں میں بانو قدسیہ، اے خیام، احمد سہیل، ڈاکٹر اسلم فرخی، اسرار زیدی، اور عالم خان نے بھی اچھے مضامین پیش کیے۔ "تلاش" پر عتیق احمد کا "امراؤ جان ادا" پر محمد فضیل الفضا کا

جمیلہ ہاشمی کے ناول "دشتِ سوس" پر بانو قدسیہ کا اور سائرہ ہاشمی کے ناول "درد کی رُت" پر محمد عالم خان کے مضامین کو دلچسپی سے پڑھا گیا۔

افسانہ :- غزل کی طرح مختصر افسانہ بھی کثرت سے لکھی جانے والی صنفِ ادب ہے۔ گذشتہ سال جن ادبا نے افسانے لکھے ان میں پانچویں دہائی سے لے کر نویں دہائی تک کے متعدد افسانہ نگار شامل تھے۔ احمد ندیم قاسمی کے باب میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ گذشتہ سال میری نظر سے ان کا کوئی قابلِ ذکر افسانہ نہیں گذرا۔ راجندر سنگھ بیدی اگرچہ اپنی علالت کے باعث نیا افسانہ لکھنے سے معذور ہو چکے تھے لیکن انھوں نے اپنی موجودگی کا احساس سب سے زیادہ دلایا۔ اور انھیں سال بھر تک ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ سہج سہج کر موت کا استقبال کر رہے تھے۔ اور ان کے پرستار اپنا زیادہ وقت ان کے مطالعے میں صرف کر رہے تھے۔ پاکستان میں تاج سعید نے راجندر سنگھ بیدی کے لیے "جریدہ" کا ایک شمارہ وقف کیا اور "چشمِ بد دور" "لعطّل" "ایک باپ بکاؤ ہے" "متھن" اور "جوگیا" وغیرہ کی نئی تفہیم کے لیے ان کے تجزیاتی مطالعے شائع کیے۔ انوار احمد، مظفر علی سید، فتح محمد ملک، احمد سلیم، زیتون بانو، ڈاکٹر نذیر احمد، منصور قیصر اور متعدد دوسرے ادبا نے بیدی کو سلامِ آخر کہنے کے لیے ان کے فن افسانہ نگاری پر عمدہ مقالات پیش کیے۔ ان کی وفات کے بعد محمد سلیم الرحمان، شمیم حنفی اور انور سدید نے مضامین لکھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن چندر کی وفات کے بعد اس کی مقبولیت کا گراف نیچے آ گیا تھا۔ لیکن بیدی کا مقام ان کی موت کے بعد کچھ اور بلند ہو گیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ افتخار امام صدیقی "شاعر" کا اور سہیل احمد "محراب" کا بیدی نمبر شائع کر رہے ہیں۔

افسانے کے بڑے معماروں میں سے ممتاز مفتی نے گذشتہ سال بھی افسانے کے نئے موضوعات کو اپنے فن کا لمس عطا کیا۔ ان کے افسانے "دو مونہی" "میر اور منیرہ" اور "اماں" ان کے مخصوص اسلوب کا احساس دلاتے ہیں۔ اور خارج کے بجائے داخل کی سیاحت کا نادر نقش سامنے لاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ "روغنی پتلے" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ سید انور اپنے عہد کا آئینہ ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد انھوں نے نیا افسانہ "جگنو کی روشنی" پیش کیا اور کوٹ اَدّو جیسے دور افتادہ مقام کی رینگتی ہوئی زندگی کو تلخیوں اور ناکامیوں سمیت گرفت میں لے لیا۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں میں سے کوثر چاندپوری سے ملاقات "تخلیق" کے کہانی نمبر میں ہوئی۔ کوثر چاندپوری کا افسانہ "گلاب جل" اور "میرا محبوب" (شاعر) میں زندگی کو مستقیم نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ بانو قدسیہ کا افسانہ "بات" "احساسِ خزاں کا افسانہ ہے۔ بانو قدسیہ افسانے کو سویٹر کی طرح بنتی ہیں اور اس کی ہر گرہ میں حقیقت سمٹتی جاتی ہے یہ افسانہ گذشتہ سال کے لیے بانو قدسیہ کا واحد عطیہ تھا۔ انتظار حسین کا بھی صرف ایک افسانہ "بیلیں" میری نظر سے گذرا۔ الطاف فاطمہ نے "چرواہا" اور "درماندگیٔ شوق" دو اچھے افسانے تخلیق کیے۔ غلام الثقلین نقوی کو جزئیات سمیٹنے کا فن آتا ہے۔ اور اس فن کے انوکھے زاویے ان کی یادنگاری میں نمایاں ہو رہے ہیں۔ "رابطے" کی ایک دلچسپ قسط کے علاوہ انھوں نے "تخلیق" میں "بجھتی ہوئی کرن" جیسا زندگی آمیز افسانہ لکھا۔ فرخندہ لودھی کی آنکھیں مشاہدہ زیادہ کرتی ہیں لیکن اس مشاہدہ کو افسانے کی بنت میں ڈھالنے کے لیے انھیں طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ گذشتہ سال انھوں نے تخلیق فن کا فریضہ نسبتاً تیزی سے سرانجام دیا۔ ان کا افسانہ "ہزاروں خواہشیں" "تحریریں" اور "خاتونِ آخر" اوراق میں شائع ہوئے۔ ان کا افسانہ "بے چاری" کردار کے داخل میں جھانکنے کی ایک عمدہ کاوش ہے۔ افسانہ نگاروں کے ایک بڑے طبقے نے زندگی کی ایک چھوٹی سی قاش کو ٹھوس حقیقت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سے کہانی اپنی بھرپور معنویت اور گہرے تاثر کے ساتھ ابھری۔ اس نوع کے افسانے میں ڈاکٹر آغا سہیل نے "نظام" عذرا اصغر نے "سوکھی دھرتی" اور "تنہا برگد کا دکھ" جیسے افسانے لکھے عذرا اصغر حقیقت کے پس پردہ ایک اور حقیقت دیکھنے کا ملکہ رکھتی ہیں۔ ان کی یہ خوبی متذکرہ افسانوں میں بھی موجود ہے جمیل زبیری کے افسانے "پہلی چیخ" اور "لاہوت کا مکان" نگہت سیما کے افسانے "مراجعت" اور "سیکنڈ ہینڈ" ابن فرید کا "ایک ادنیٰ سا حادثہ" "بے چارے لوگ" "خون زندہ ہے" ایوب جوہر کا "پل" نقی حسین خسرو کے افسانے "اتھاہ اور بے کنار" "روشنی کے جاگنے سے پہلے اور واپسی" جتندر بلّو کے افسانے "ماں، بیٹی، باپ" اور "جزیرہ" حمیدہ معین رضوی کا "شیشوں کا مسیحا" رفعت نواز کے افسانے "چبھن" "سکھ دکھ" رشیدہ رضویہ کا افسانہ "بے سایہ" شام بارک پوری کا "جاگتی آنکھوں کا خواب" شمع خالد کا "میرے بچپن کے جگنو" سیدہ حنا کا "بے کل" رحمان شاہ عزیز کا "شامیانے" شہناز پروین کا "پانی کی دیوار" وغیرہ میں زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر ایک طویل عرصے کے بعد افسانہ "آدم خور" لے کر افسانے کی بزم میں شریک ہوئے۔ رام لعل کا صرف ایک افسانہ "ایک اوراُگنی" نظر سے گذرا۔ اسی سال ان کے افسانوں کا ایک نمائندہ انتخاب شائع ہوا۔

نئے افسانہ نگاروں میں سے طاہر نقوی اور طارق محمود کے ہاں شعلۂ تخلیق بہت برانگیختہ رہا۔ انھوں نے زندگی کے ہر موڑ سے ایک نیا افسانہ لیا۔ طاہر نقوی کے اسکور کارڈ پر "آشنا فصیلوں کے اندر" "دو لمحوں کے درمیان" "خلا میں اٹکا ہوا آدمی" "ازل سے ابد تک" اور "اندر کا اندھیرا" وغیرہ افسانوں کا اندراج

گذشتہ سال ہوا۔ طارق محمود نے "تخلیق کار" ــ "لال باغ" "بشارت" "تیل کی دھار" اور "لمحے" جیسے افسانے اُوراق اور افکار میں لکھے۔ سیپ میں ان کا افسانہ "تنہائیوں کا ہجوم" چھپا۔ سلیم آغا قزلباش نے موضوع کو کروٹ دے کر نیا افسانہ تخلیق کرنے کی کاوش کی۔ ان کا افسانہ "برگد" کو نسبتاً زیادہ اہمیت ملی۔ اور افسانہ "عذاب" دلچسپی سے پڑھا گیا۔ سلیم آغا قزلباش کو ان کی انشائیہ نگاری نے حقیقت کی تہہ میں اترنے کا ملکہ عطا کیا ہے۔ اور اس خصوصیت کا فائدہ انھوں نے افسانہ نگاری میں بھی اٹھایا ہے۔ افسانہ "مہر بہ لب" اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ شرون کمار ورما کا افسانہ "بوجھ"۔ عزیز قیسی کا "شب موم سحر آہن"۔ قیوم راہی کا "دروازہ" اور "رابطہ"، نسیم سحر کھی کے افسانے "سیپیاں" اور "طول البلد"۔ حسرت کاسگنجوی کا "آئینہ بولتا ہے"۔ وحیدہ ضا بھٹی کا "وارننگ"۔ افشاں عباسی کا "کچی دیواریں"۔ بلقیس فاطمہ کا "چرواہا" حمید اختر کا "لامکاں"۔ ستار طاہر کا "آٹھواں ریگھاری"۔ صالحہ خاتون کا "آخری بندھن"۔ غزالہ محمود کا "بینو"۔ "حفیظ احسن کا "پھیلتا ہوا جنگل"، "تاخیر" اور "یہ راستے وفا کے"۔ پروین سرور کا "دل دریا" مرزا ریاض کا "چاندی کی لکیر"۔ امر جلیل کا "تیسری دنیا"۔ رفعت کیانی کا "آؤٹ سائیڈر"۔ ش۔ صغیر ادیب کا "میں دل کی بات کہوں گا"، ہرچرن چاولہ کا "بے باک بات"، منصور قیصر کا "سرورق کا بحران"، وغیرہ متعدد ایسے افسانے شائع ہوئے جس میں عصر حاضر کی آنچ موجود ہے۔ انیس صدیقی نے "مشکوک آدمی" میں۔ سلطان جمیل نسیم نے "زہر اور آسیب" میں۔ کلیم اختر نے "منگلا کا چاند" میں۔ محمد جمیل آفاقی نے "پراسس" میں۔ ضیا بٹ نے "آیا" میں۔ شہناز پروین نے "سچا، جھوٹ" "جھوٹا سچ" میں جتندر بلو نے افسانہ "ہوا کے دوش پر" میں۔ پروین عاطف نے "آدھی سے پوری" میں حقیقت کی لرزیدہ لہر کو فنکاری سے پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ انور عنایت اللہ کا افسانہ "چھٹا فائر" حقیقت کو خوردبین سے دیکھنے کا افسانہ ہے اور بے حد دلآویز ــ علامت۔ زندگی

گذشتہ سال کے دوران تجرید کو علامتی انداز میں پیش کرنے، علامت کو غیر ذاتی بنانے، قصص الاولیا ر سے نئی کا اثبات کرنے اور تجرید کے داخل سے کردار کی معنویت کو ابھارنے کے متعدد اور متنوع تجربے ہوئے۔ اس قسم کا افسانہ کثرت سے لکھا گیا۔ اس اسکور بورڈ پر ہمیں رشید امجد سے لے کر علی تنہا تک کئی نام ملتے ہیں۔ سب سے پہلے رشید امجد کو لیجیے۔ انھوں نے تاثر کی ہر سلگتی ہوئی کیفیت کو پکڑنے اور اسے افسانہ کا روپ دینے کی سعی کی۔ ان کے جن افسانوں کو دلچسپی سے پڑھا گیا ان میں "بانجھ لمحوں میں مہکتی خوشبو"۔ "سمندر مجھے بلاتا ہے"۔ "کھلے دروازے پر دستک" "گم راستے میں کشف" وغیرہ شامل ہیں۔ رشید امجد کے افسانوں کا نیا مجموعہ "بت جھڑ میں خودکلامی" کو علامتی اظہار کا نمائندہ مجموعہ شمار کیا گیا۔ انور سجاد نے سلسلہ "آج" کی تین نئی قسطیں پیش کیں۔ علی امام نقوی نے "ڈونگر واڑی کے گدھ"، "لاش اور باتیں" اور "عذاب مانگنے والے" چند اچھے افسانے لکھے۔ عبدالصمد کا افسانہ "تھوڑی سی خوشی" مرزا اطہر بیگ کا افسانہ "دس لاکھ میں ایک"۔ محسن شمسی کا "نجات"۔ م۔ ناگ کا "پرندے"۔ حسین الحق کے افسانے "کیا دے میں پتھر" اور "سورج کی پیٹھ" تنویر اقدس کا "اسٹیج کہانی" وغیرہ افسانوں میں حقیقت کو تہہ داری سے پیش کیا گیا ہے۔ آصف فرخی نے قصص قدیم سے اپنے عہد کی شناخت کرنے کی سعی کی۔ اس کے افسانے "شہر نامہ رساں" کو گذشتہ سال دلچسپی سے پڑھا گیا۔ انوار احمد نے افسانہ "قومی مفاد... یا خارج کی صورت واقعہ کو ایک سنجیدہ طنز نگار کے زاویے سے دیکھا۔

محمد منشا یاد نے "سارنگی" "دنیا کا آخری بھوکا آدمی"۔ "وقت سمندر ہے" اور "بھول جانے والے" افسانوں میں سماجی احساس کو ایک خاص نوع کے ذہنی تاثر میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ مرزا حامد بیگ مظاہر کو ایک مخصوص پس منظر سے اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی دیہاتی آگہی کو شہری شعور نے نئی تازگی دی ہے "ملاقات" "رات کا جادو" "پھول بانٹنے والا" افسانوں میں مرزا حامد بیگ نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ گذشتہ برس ممتاز احمد خان نے متعدد اچھے افسانے لکھے۔ اس کے اسکور کارڈ پر "پھیلاؤ" "اندھے موسموں کی فصل" اور "حکمت عملی" جیسے افسانے درج ہیں۔ منظر علی خان نے "چھوڑا ہوا گھر" میں شفق نے "جنگل کلرات" میں زاہدہ حنا نے "شیریں چشموں کی تلاش" میں۔ م۔ ق خان نے "درندہ صفت کتے" اور "غیر نوشتہ لوحِ مزار" میں مظہر الزماں خان نے "پہلے دن کی تلاش" میں انسانی وجود کی نئی ماہیت تلاش کرنے کی کاوش کی لیکن ان سب کی تلاش کے زاویے مختلف ہیں۔ انور زاہدی (رابطے کا موسم" اور انتہائے شب)۔ اصغر ندیم سید (ایک دن کا گراف)۔ ریاض صدیقی (بے آسمان ستارہ) حیدر قریشی میں "غریب بادشاہ" شوکت حیات (کوا)، شفیع جاوید (تعریف اس خدا کی)، عذرا سید (پہچان)، مظہر الزمان (پہلے دن کی تلاش) علی تنہا (ریوڑ) نے تجریدی افسانے سے تاریخ کے معاشرتی شعور کا تصور پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے زندگی کے اسرار کو افسانوی حقیقت سے پرکھنے کی سعی کی ہے۔ شب خون میں ان کا افسانہ "مسکن" اس اسرار کو باندازِ خاص پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود کے افسانوں کی تفہیم میں شہنشاہ مرزا کا مطالعہ مطبوعہ "جواز" بھی بہت معاونت کرتا ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں میں نشاط فاطمہ نے گذشتہ سال اپنے فن کے کئی نقوش پیش کیے۔ ان میں "شمع جلائی یا نہیں" "سمے بیت گیا" اور "وقت کی صلیب" کو اہمیت حاصل ہے۔

رفعت مرتضیٰ نے "حبس" سے خود اپنی بازیافت کی۔

گذشتہ سال غزل کے ممتاز شاعر ریاض مجید نے "جھٹپٹے کا شہر"۔ اکبر حمیدی نے "آخری خوبصورت آدمی" اکبر کاظمی نے "قربانی" اور کے۔ ایم اشرف نے "جسم سے باہر ایک دن" اور "زیرو آور" لکھ کر افسانہ نگاروں میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ قائم نقوی (گم شدہ آواز) کرن منور (دھند) ۔غزالہ محمود (چیونٹی کی موت) میں چند نئے افسانہ نگار سامنے آئے۔ ظہیر بابر (بخار ۱۰۵۰۹) عظمیٰ گیلانی (مساوی خطوط) ندرت الطاف (بے دل ہائے تماشا) نے زندگی کو بنیو راما انداز میں دیکھنے کی کاوش کی۔ غلام دستگیر ربانی اور مشتاق مومن اس صنف کے نو وارد افسانہ نگار ہیں۔

اردو افسانے کا متذکرہ بالا گوشوارہ متنوع اور ہم رنگ ہے۔ افسانہ نگار اپنے شعلۂ احساس کو قاری تک منتقل کرنے کی سعی بھی کرتا ہے۔ ذہنی آسودگی کا فقدان اور وہ بے اطمینانی اور بے یقینی جس نے خطۂ عالم کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا۔ ایک اجتماعی رجحان کی صورت میں افسانہ نگاروں کے ہاں فروغ پاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ معاشی بدحالی کے فروغِ عام کی وجہ سے جنسی ناآسودگی افسانے میں زیادہ نمایاں نہیں۔ افسانہ نگاروں میں احساسِ تنہائی، کرب اور اضمحلال کی کیفیت بھی موجود ہے۔ اور یہ متعدد مرتبہ ایک جذباتی لاوے کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ گذشتہ سال افسانہ کثرت سے لکھا گیا لیکن مجموعی طور پر یہ سال افسانے کے کمالِ فن کا سال نہیں تھا۔ اور وہ ایک اعلیٰ پائے کا افسانہ جسے ہم پورے سال کا حاصل کہہ سکیں شاید تخلیق نہیں ہوا۔ علامت نگاری اور تجرید نے فیشن کی صورت اختیار کی اور بالعموم ایسی ذاتی علامتیں تخلیق کی گئیں جن کی کلید افسانہ نگار نے اپنے پاس سنبھال رکھی تھی۔

شاعری ـــــ نظم

سب سے پہلے فیضؔ کے لئے تعزیت

شاعری کے باب میں گذشتہ سال کا سب سے المناک واقعہ یہ ہے کہ فیض احمد فیض نغمۂ گل سناتے سناتے آخر خاموش ہوگئے۔ فیض ایک طویل عرصے سے زندگی کا بیشتر حصہ بیرون وطن گذار رہے تھے۔ لیکن گذشتہ سال انھیں اپنے وطن کی مٹی نے واپس بلا لیا۔ اور یہاں آکر انھوں نے اپنے چاہنے والوں سے گفتگو کا سلسلہ تا دمِ مرگ جاری رکھا۔ ان کا آخری کلام وہ نظم ہے جو "افکار" میں صرف چار اشعار کی صورت میں شائع ہوئی۔ اور سانحۂ مرگ تک مکمل نہیں ہوئی۔ گذشتہ سال فیضؔ نے اپنے آپ کو سب سے زیادہ منکشف کیا۔ اخبارات و رسائل میں ان کے سب سے زیادہ انٹرویو شائع ہوئے۔ رسالۂ کتاب نما میں نصرت چودھری کا "جنگ اور نوائے وقت میں پینل انٹرویو اور حریت میں شمع زیدی کے انٹرویو نے فیض کی شخصیت، فن اور نظریات ادب کے بے شمار گوشے بے نقاب کئے۔ "ادبِ لطیف میں سہیل احمد خان اور جاوید شاہین کی گفتگو میں بھی فیض کو ان کے داخل سے تلاش کرنے کی کاوش کی گئی۔ فیض صاحب نے بتایا کہ "ادب اور ترقی پسندی کو ایک دوسرے کا حریف نہیں ہونا چاہیے اور ترقی پسندی کے لئے ضروری ہے کہ ادب کے تقاضے پورے کئے جائیں ورنہ یا ترقی پسندی پیچھے رہ جائے گی یا ادب" اور وقت یہ فیصلہ دے چکا ہے کہ ادب اور ترقی پسندی کو باہم متصادم کیا گیا تو ادب کو ہی دوامِ ابد حاصل ہوا۔ فیض کی شاعری میں غم کی ایک نشیلی کسک موجود ہے۔ گذشتہ سال یہ نشہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ فیض پر گذشتہ سال بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن معرکے کا کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔ فتح محمد ملک کے مجموعۂ مضامین "تحسین و تردید" میں اس بات کا اثبات کیا گیا کہ "صوفی اصلی کا مرید ہوتا ہے"۔ فیض کی وفات پر بہت سے مضامین اخبارات میں چھپے اور ان میں فیض کی شخصیت کے گرد رقص کرتے ہوئے روشن دائرے کو مزید منور کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن دریافت و اثباتِ فن سے اغماض برتا جا رہا ہے۔ ممتاز احمد خان اور خالد حسن کے دو ایسے مضامین سامنے آئے جن میں فیض کو منور دائرے سے الگ کر کے فطری انسان کی صورت میں دیکھنے کی کاوش کی گئی۔ ایک مضمون ان کی زندگی میں چھپا۔ دوسرا ان کی وفات کے بعد۔ اب آخر میں فیض کے آخری اشعار ان کی یاد میں۔!

مـ	پھر غمِ یادِ یاراں کے دن آگئے	ماتمِ دلِ فگاراں کے دن آگئے
	دعوتِ بیعتِ شہ پہ ملزم بنا	کوئی اقرار پہ کوئی انکار پہ

۱۹۸۴ء میں اردو افسانے کی طرح اردو شاعری میں بھی کم و بیش گذشتہ پانچ دہائیوں میں قبولِ عام پانے والے شعراء سرگرمِ تخلیقِ سخن رہے۔ ان میں زیادہ شعرا نے نظم اور غزل تخلیق کی۔ طویل نظم کی طرف مراجعت کا رجحان پیدا ہوا۔ ہائیکو کو فروغ حاصل ہوا۔ قطعہ، دوہا، رباعی اور گیت کی اصناف میں معتدبہ

پیش قدمی ہوئی احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ خالص نظم کے شاعروں میں سے گذشتہ سال بلراج کومل کے ہاں شعلۂ تخلیق نسبتاً زیادہ فروزاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے "فرازِ خواب کی باتیں پرندوں بھرا آسمان" "ایک ہاتھ کی تالی" "لاٹری" "شام" "کہانی" جیسی نظمیں کہیں۔ بلراج کومل کی شاعری میں گذشتہ سال سفید رنگ کو اہمیت ملی۔ ان کی نئی کتاب "پرندوں بھرا آسمان" میں احساس کی یاترا میں خلقِ خدا کو شریک کرنے کی آرزو نمایاں ہے۔ منیر نیازی اردو نظم کا بڑا نام ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سال رفتہ میں انھوں نے کوئی ایسی نظم نہیں لکھی جس پر تخلیقِ منیر کی پختہ مہر لگی ہوئی ہوتی۔ نوائے وقت میں ان کا انٹرویو بے حد ہنگامہ خیز ثابت ہوا اور اس کی گونج دور دور تک سنی گئی۔ کلیاتِ منیر کی اشاعت بھی منیر نیازی کی تخلیقی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ خالص نظم کے شاعروں میں ایک اور اہم نام اختر حسین جعفری کا ہے۔ ان کی نظم "اکہری چھت پر نمی بہت ہے" علیحدہ ذائقے کی نظم شمار کی گئی۔ خدیجہ مستور کے نوحے میں اختر حسین جعفری نے اپنا داخلی کرب شامل کیا ہے۔ خالص نظم ادیب سہیل کے اظہار کی مخصوص صنف ہے۔ انھوں نے عہدِ جدید کو نقاد کی آنکھ سے دیکھا اور "شوکیس کا آدمی"، "ریکھائیں"، "شخص محترم" اور "سرکل" جیسی نظمیں تخلیق کیں۔

اختر الایمان بھی خالص نظم کے شاعر ہیں۔ گذشتہ سال انھوں نے "وقت کی کہانی" میں بارہ منزلہ عمارت سے زمانِ متحرک کی گردش کو پکڑا ہے۔ ادا جعفری نے گذشتہ سال نظم کی طرف خصوصی توجہ صرف کی اور "اجتماعی موت سے پہلے" اور "سوچ کا سایہ" نظمیں تخلیق کیں۔ دیارِ غیر میں رہنے سے جو کرب پیدا ہوتا ہے، عمر فانہ عزیز اس کرب سے آگہی کا زاویہ پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے "دائرے"، "بے ستون" اور "جن کو منزل کی خواہش تھی" نظمیں لکھ کر اپنی تخلیقی زندگی کا ثبوت دیا۔ احمد ظفر کا تخلیقی شعلہ "ڈیڈ ہاؤس" "حیرت خانۂ امروز" "پاتال زمین اور آسمان" جیسی نظموں میں سامنے آیا۔ احمد شمیم کی وفات پر احمد ظفر کے نوحے میں درد کی گہری کسک موجود ہے۔ جمیل ملک نے نظم اور غزل دونوں یکساں انداز میں تخلیق کاری کی۔ ان کی نظموں میں سے "پہلا اور دوسرا محاذ" "عجائب گھر" "رتھ بان" اور "بابا لوگ" کو اہمیت حاصل ہے۔ ترقی پسند نقطۂ نظر کے شاعروں میں سے فارغ بخاری کے ہاں چھوڑی ہوئی زمین سے مفارقت کا جذبہ زیادہ نمایاں ہوا۔ "یہ سفر عجیب ہے" "اپنے دریا کی پیاس" "گم گشتہ لمحے" "لوحِ غیر محفوظ" اور "ہجرت کے بعد" وغیرہ نظموں میں ایک عجیب نوع کا کرب موجود ہے۔ ساقی فاروقی نے "سوگ نگر کے لوگ" "کیمرہ" اور "توجیہہ" جیسی نظموں میں آگہی کا نیا زاویہ ابھارا۔ پروین شاکر نے "میں تیری رہنے میں خوش ہوں"، "ربر سٹمپ" دو اچھی نظمیں لکھیں۔ تخت سنگھ کی نظموں میں سے "سونے کا جزیرہ" "تصور کے دوزخ" اور "تہہ بہ تہہ" اچھی نظمیں تھیں۔ نظم کی بنت میں داخل کی آواز شامل کرنے کا انداز صلاح الدین پرویز نے پیدا کیا۔ گذشتہ سال اس کی نظم "مدینے کی سستیہ عورتوں کے نام" اور "چندر لکھی" نے ایک خاص کیفیت پیدا کی۔ ڈاکٹر وحید اختر کی نظم "دور کی آواز" اور "کووِندا" میں بھی فطرت کی لرزیدہ کرن پکڑنے کا زاویہ موجود ہے۔ شہر یار نے "خدا کرے" اور "کالی نظم" میں جذبے کو کنایت لفظی سے پیش کرنے کی کاوش کی۔ قیصر قلندر نے "دیوارِ شب" اور ظہیر غازی پوری نے "تناسخ" اور "آئینۂ شکستہ" جیسی اچھی نظمیں لکھیں۔ محسن بھوپالی نے "نظانے" کے سلسلے کی چند اچھی نظمیں کہیں۔ گذشتہ چند سالوں کے دوران جن شعراء کو اردو نظم میں اہمیت ملی ان میں شبنم عناروی، حیدر قریشی، ابرار احمد، سیما شکیب، ناہید قاسمی، حسین سحر، احسن زیدی، لطیف ساحل، فرحت نواز، ماہ طلعت زاہدی، اظہر ادیب، اقبال فریدی، اشرف جاوید، انور زاہدی، نصیر احمد ناصر، عباس رضوی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء نے مختصر نظم میں اپنی شخصیت کے دلکش نقوش متعدد مرتبہ پیش کیے اور اپنے گراف کا رخ کو بلندی کی طرف بڑھنے میں مدد دی۔ صفیہ سلیم سیال کی نظم "زمین زندہ ہے" اور امجد اسلام امجد کی نظم "ملے دنیا" میں خارج کو شخصی زاویے سے دیکھنے کا انداز نمایاں ہے۔

شہزاد احمد نے "آنکھ مچولی"۔ محب عارفی نے "آپ بیتی"۔ ضمیر جعفری نے "زندگی کے دھارے پر"، شاذ تمکنت نے "آسودگی"۔ امین راحت چغتائی نے "سولھواں سال"۔ احسان اکبر نے "میں اپنے خواب کاہے کو اٹھالے شہر آنکلا"۔ انجم اعظمی نے "مرگِ انبوہ"۔ شاہد عشقی نے "اکیلے راستے کا اکیلا مسافر"۔ رب نواز مائل نے "بستیوں کے خواب"۔ جاذب قریشی کی "رات کے بستروں میں" اور "زرد گلاب"۔ حفیظ صدیقی نے "اطمینان"۔ محمد اظہار الحق نے "آتش کیک"، نگہ کر اردو نظم کے آفاق کو جگمگائے رکھا۔ جیلانی کامران نے طویل نظم کی طرف قدم بڑھایا اور "امیر دنی" جیسی نظم لکھی۔ اس صنف میں سعید احمد اختر نے "سبا گوں میں بہار ہے" جیسی عمدہ نظم تخلیق کی۔ اردو نظم کا یہ گوشوارہ خاصہ طویل ہے۔ تاہم مجھے احساس ہے کہ اس میں تمام شعراء کو شریک نہیں کیا جا سکا۔

غزل:- یہ نیم وحشی صنفِ سخن گذشتہ سال ہر سطح کے شاعر کا دامن اپنی طرف کھینچتی رہی۔ افسانہ اور نظم کی طرح تقریباً پانچ نسلوں کے شاعروں نے اس کی تخلیق میں سرگرم حصہ لیا۔ شاعروں کے جو مجموعے گذشتہ سال شائع ہوئے۔ ان میں غزل کو سب سے زیادہ اہمیت ملی۔ انجم رومانی کا مجموعہ

"کوئے ملامت" ۱۹۸۴ء کی تصنیف ہے۔ لیکن اس کی تقریب رونمائی ۱۹۸۴ء کے اواخر میں ہوئی۔ فیض کی غزل کی آواز سال بھر تک سنی جاتی رہی۔ احمد ندیم قاسمی جیسے رجائیت پسند شاعر پر اضمحلال کے آثار ہویدا ہوئے۔ غزل کی جدیدیت میں نمالد اقبال یاسر، سیم کوثر، انجم ترازی، ماہ طلعت زاہدی، محمد فیروز شاہ، یمین عثمانی، سیما شکیب، حنیط اسماعیل، زماں کنجاہی، عباس تابش اور اظہار الحق جیسے شعراء نے گونا گوں اضافے کیے۔ غزل کا گوشوارہ ۱۹۸۴ء اتنا طویل ہے کہ ہر شاعر کا "کریڈٹ کارڈ" الگ الگ تیار کرنا ممکن نہیں۔ بہت سے شعراء نے اس صنفِ سخن میں اس قدر تخلیقی سرگرمی کا ثبوت دیا کہ صرف ایک سال کے عرصے میں کہی ہوئی غزلوں سے دو تین مجموعے آسانی سے مرتب ہو سکتے ہیں۔ اردو ادب کا ہر پرچہ ایک بامعنی غزل نمبر نظر آتا ہے۔ میں اس گوشوارے میں صرف چند ایسے شاعروں کا ذکر کر سکوں گا کہ بعضوں نے غزل کو آگے بڑھانے اور اسلوب کے کسی سابق قرینے کو مستحکم کرنے یا اظہارِ معانی کے نئے علائم و رموز تراشنے کی کاوش کی۔

اس زاویے سے غزل کا گوشوارہ مرتب کیجیے تو سب سے پہلے شہزاد احمد پر نظر پڑتی ہے۔ گذشتہ سال اس کے ہاں صبور رہنے منزلِ مراد تلاش کرنے کا زاویہ ابھرا۔ ساقی فاروقی نے خوف کی تقدیر سے موت کا زمانہ دیکھنے کی کوشش کی۔ جگن ناتھ آزاد نے صبحِ فردا کے مسافر کو سنگِ میل سے آگے بڑھنے کی نوید مددی۔ اختر ہوشیار پوری نے غزل کی ہتھیلی پر تتلیوں کے نقش ابھارے۔ رشید نثار نے اپنے وجود سے زندہ مسدس کے سناٹے کو آواز دی۔ غالب احمد نے ان رنگوں کو اجاگر کیا جن سے ملکہ شبنم روتی تھی۔ عالمتاب تشنہ نے سفینۂ جاں کو سنبھالنے کی راہ تلاش کی۔ کیف انصاری نے تعبیرِ خواب کی بھیک سے نجات حاصل کرنے کے لیے رت جگے قبول کیے۔ ماجد الباقری نے کربلا کے ایک قطرۂ خون سے تمام عالم کے لیے روشنی فراہم کی۔ بیدل حیدری نے ٹاٹ کی دنیا کو کاغذی پیرہن بنانے کی سعی کی۔ زیب غوری نے اس پری جسم کا پیکر غزل میں تراشا جو غسل کر کے سنہری دھوپ میں لیٹا ہوا ہے۔ جان کاشمیری نے اس پری پیکر کو گلدان میں سجا ہوا دیکھا۔ جمیل یوسف نے اس چمکتی دھوپ کو یاد کیا جس کا عکس اب شام میں اتر آیا تھا۔ خورشید رضوی نے صرف ایک ساعت کو زندگی کے شب و روز پر حاوی کر کے دیکھا۔ آفتاب احمد شاہ نے اس بے مروت شہر سے نکلنے کی آرزو کی جس میں قتل یاراں عام تھا۔ پریم کمار نظر نے لوحِ آب پر نقش ابھارنے کی طرح ڈالی۔ ضیا شبنمی نے اس حسرت کو ابھارا جو گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسعد گولسری نے جیون جنگل سے ریزہ ریزہ ہو کر گذرنے کی سعی کی۔ اس کے برعکس انجم نیازی نے اپنی ذات کو انتشار سے بچانے کی کوشش کی۔ حمید قریشی نے سرد گھروں سے ابرِ عذاب کا زاویہ تراشا۔ خاور اعجاز نے نور آستانے سے سفر کا استعارہ تراشا۔

حسن عباس رضا نے موت کو تحفۂ جاناں سمجھ کر گھر میں بسانے کی آرزو کی۔ انور جمال نے وہم امکاں سے نجات کی آرزو کی۔ پروین عزیز نے دل پر کھل عبارتوں سے منسلکتوں اور منافقتوں کو الگ الگ کر کے دیکھنے کی سعی کی۔ سیما شکیب نے لمبی عمر کاٹنے کے لیے دل بیٹھنے اور تدبیر سوچنے کا مشورہ دیا۔ شفیق سلیمی نے درد کو شبنمی دریچوں سے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ خالد احمد نے بے چراغ تنہائی میں مہربان ہوا کی آہٹ سنی۔ ایوب خاور نے یادوں کے جگنوؤں سے دل کے گھر کو روشن کیا۔ اسلم اعظمی نے لفظوں سے مرمر کے بدن تراشے۔ عباس تابش کو احساس ہوا کہ زمانہ اسے روند کر آگے گذر گیا ہے۔ ظفر اقبال نے اس کوشش رائیگاں کا ذکر کیا جو اس کی ہنروری میں صرف ہو رہی تھی۔ رشید قیصرانی نے دل و نظر کی عبارت میں آنسوؤں کو امام بنایا۔ انور مسعود نے آنسوؤں کو خامۂ مژگاں کا عنوان دیا۔ راحم ریاض نے خاک کی بساط سے عمود کی طرف اڑان کا رستہ تلاش کیا۔ مظفر حنفی نے اس چکر کو یاد کیا جو بگولوں کی صورت گھر میں رہتا تھا۔ شبنم شکیل نے اپنے نام کی رعایت سے اس چہرے کو یاد کیا جو سورج کی رفاقت میں چمک اٹھتا تھا۔ خالد اقبال یاسر نے اس بادِ مخالف میں سفر کیا جس نے وسوسوں کی بیلیں پیدا کر دی تھیں۔ صفدر سلیم سیالوی نے اس شجر کو تلاش کیا جو کڑی دھوپ میں سایہ بن جاتا ہے۔ محمود علی محمود کی غزل کے آنگن میں چاندنی چنبیلی کی طرح نکھری۔ قائم نقوی نے یقین مقتل کا استعارہ زمینِ کربلا سے تلاش کیا۔ مرتضیٰ برلاس کی توانا آواز نے مآلِ ناآشنائی کا احساس پیدا کیا اور یہ آواز دور دور تک سنی گئی۔

غزل کا کلاسیکی روپ اقبال صفی پوری، محشر بدایونی، رئیس امروہوی، صبا اکبر آبادی، کرار نوری کے ہاں نمایاں ہوا۔ جمیل یوسف، رفعت سلطان، اظہر جاوید، زاہد فخری اور احسن زیدی نے جمالیاتی زاویے کو اہمیت دی۔ سیف زلفی، شہرت بخاری، راشد بزمی، اور نذیر قیصر کے ہاں عہدِ کرب و بلا کے خلاف احتجاجی رویہ ابھرا۔

غزل کا یہ اجمال اس صنفِ سخن کے تنوع کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ تاہم اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ گذشتہ سال کی غزل میں مایوسی، قنوطیت، نارسائی

اور بے بسی کے مضامین نے لاشعوری طور پر اہمیت حاصل کی اور علائم و رموز کی جدیدیت کے باوصف غزل کا قدیم مزاج قائم رہا۔

انشائیہ

انشائیے کا اسکور بورڈ باقاعدہ طور پر ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ نصب ہوا تھا اور بہت عرصے تک اس پر صرف وزیر آغا کا اسکور کارڈ نظر آتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس بورڈ پر انشائیہ نگاروں کا اضافہ ہونے لگا کہ اس صنف کا بارہواں تخلیق کار محمد اسد اللہ بھی صفِ اول کے تخلیق کاروں میں شامل ہو گیا۔ جب کہ مشتاق قمر، راحت بعثی، محمود شام، انجم انصار، پرویز عالم وغیرہ اپنی اپنی رنگز شاندار طریقے سے کھیلنے کے بعد اس صنف کے میدان سے رخصت ہو گئے، ۱۹۸۴ء انشائیہ کے ارتقاء کا ایک اہم سال تھا۔ اس کے تخلیقی اثاثے میں ڈاکٹر وزیر آغا سے لے کر اظہر ادیب تک نے اظہارِ فن کیا۔ انشائیوں کی پہلی باضابط کتاب "خیال پارے" کا نیا ایڈیشن آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ منتخب انشائیوں کا ایک نمائندہ مجموعہ سلیم آغا قزلباش نے مرتب کیا۔ اور اسے مکتبۂ اردو زبان سرگودھا نے زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ رام لعل نابھوی کے انشائیوں کا مجموعہ "آم کے آم" بھارت سے شائع ہوا۔ اور بے حد مقبول ہوا۔ انشائیہ کے اسکور بورڈ پر چند نئے نام ابھرے اور متعدد انشائیہ نگاروں نے اتنی بڑی تعداد میں انشائیے لکھے کہ ان کا اسکور کارڈ تیار کرنے کے لیے مجھے رسائل و اخبارات سے اسی طرح نوٹس تیار کرنے پڑے جس طرح مجھے ادب کی دوسری اصناف یعنی نظم، غزل، تنقید، ناول اور افسانہ کے نوٹس کی ضرورت پڑتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے نئے انشائیوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس صنف میں دوسرا بڑا نام غلام جیلانی اصغر کا ہے۔ جیلانی صاحب کا انشائیہ "تسخیرِ کائنات" ان کی انشائیہ نگاری کی ایک نئی جہت کی طرف پیش قدمی کی نشاندہی کرتا ہے۔ خیر الدین انصاری نے لکھا کہ "یہ ایک ایسی تحریر ہے جو ذہن کے گوشوں کو مدتوں منور رکھے گی"۔ ان کے انشائیہ "مکان بنانا" کی اشاعت ماہنامہ "آہنگ" گیا میں ہوئی۔ جمیل آذر کے اظہار کی بنیادی صنف انشائیہ ہے۔ انھوں نے "آرٹس سٹوڈینٹس" اور "غیر معروف شہری" کے عنوان سے دو اچھے انشائیے پیش کیے۔ سلیم آغا قزلباش نے "آمنا سامنا" "ناریل" اور "انگلیاں" تین خیال انگیز انشائیے لکھے، ان میں سے "ناریل" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس صنف میں اکبر حمیدی نے کچھ ایسی طوفانی پیش قدمی کی کہ اب غزل ان کے اظہار کی ثانوی صنف نظر آتی ہے۔ انھوں نے "گولڈن چانس" "خزاں" "چھوٹا آدمی" "اترن" اور "پرانے کپڑے" انشائیے لکھے۔ اکبر حمیدی نے ایسے انشائیوں کا مجموعہ بھی مرتب کر لیا۔ بشیر سیفی گذشتہ سال انشائیہ کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے میں مصروف رہے تاہم انھوں نے اس صنف میں تخلیق کاری سے غفلت نہیں برتی اور "پھول" اور "کتابیں" لکھ کر اس صنف میں بھی اپنے اسکور کارڈ کو تابندہ بنا یا۔ تقی حسین خسرو انشائیہ کا گم شدہ ادیب ہے۔ گذشتہ سال انھوں نے انشائیہ "فٹ پاتھ" لکھ کر اپنی واپسی کا اعلان کیا۔ انشائیہ میں جان کاشمیری کی منفرد عطا یہ ہے کہ انھوں نے گجرانوالہ کو "شہرِ انشائیہ" بنا دیا ہے۔ گذشتہ سال پہلوانوں کے اس شہر سے پہلوان کم اور انشائیہ نگار زیادہ نمایاں ہوئے۔ ان میں اوّلیت جان کاشمیری کو حاصل ہے۔ جنھوں نے "شادی مسکراہٹ" اور "لاگ شیٹ" جیسے دلچسپ انشائیے پیش کیے۔ اس شہر کا دوسرا اہم انشائیہ نگار یونس بٹ ہے۔ انھوں نے "ڈرنا"، "کالج کینٹین"، "جیل"، "سنسنی" اور "کاغذ" وغیرہ انشائیے لکھے۔ یونس بٹ نے اس صنف کو روزانہ اخبارات میں مقبول بنانے کا بیڑہ بھی اٹھا رکھا ہے۔ ان کے متعدد انشائیے اخبارات کے ادبی اڈیشنوں میں شائع ہوئے۔ محمد اقبال انجم کا انشائیہ "برسوں کی فصل" اور "کتاب" نے بھی توجہ حاصل کی۔ گوجرانوالہ سے ممتاز مزاح نگار ارشد میر نے "دھوتی" جیسا شگفتہ انشائیہ لکھ کر اس صنف کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔

شہروں کا ذکر آیا ہے تو راولپنڈی کی عطا کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس شہر سے جمیل آذر اور مشتاق قمر انشائیہ میں اپنی انفرادیت تسلیم کرا چکے ہیں۔ بشیر سیفی، حامد برگی، اکبر حمیدی اور راجہ ریاض الرحمان کا طلوع بطور انشائیہ نگار اسی شہر سے ہوا۔ گذشتہ سال راجہ ریاض الرحمان نے متعدد انشائیے لکھے ان میں سے "کاہلی" "تاش کے پتے" "روح کی غذا" "باتونیوں کے حق میں" اور "بڑھاپا" کو بہت سراہا گیا۔ اس صنف میں گذشتہ سال حامد برگی کا اسکور کارڈ خالی نظر آتا ہے۔ امجد طفیل کے تخلیقی اظہار کی بنیادی صنف بھی انشائیہ ہے انھوں نے "گرفتاری" "موسم" "بے تکلفی" جیسے انشائیے تخلیق کیے۔ اظہر ادیب نے "خوشامد" اور نذیر احمد راہی نے "پیدل چلنا" لکھ کر اس صنف میں پہلا قدم رکھا۔ انور جمال اور تصدق حسین الم بھی اس صنف کے نووارد ہیں۔ ان کا انشائیہ "اخبار بینی" (انور جمال) اور "آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے" (تصدق حسین) کو دلچسپی سے پڑھا گیا۔ شمیم ترمذی کے انشائیوں کا مجموعہ "پھوار" زیرِ اشاعت ہے۔ گذشتہ سال ان کا ایک بہت اچھا انشائیہ "جھوٹ بولنا" کے عنوان سے "اوراق" میں شائع ہوا۔ محمد اسد اللہ کا انشائیہ "ڈائری" اس

صنف میں بھارت کی نمائندگی کرتا ہے۔ احمد جمال پاشا کا قلم گذشتہ سال طنز و مزاح کی وادی میں چہل قدمی میں مصروف رہا۔ سلمان بٹ پر ادبی صحافت کی مصروفیات نے اچانک یلغار کر دی۔ انھوں نے انشائیہ نگاری کی طرف پیش قدمی جاری رکھنے کے بجائے ایسی شگفتہ نگاری اختیار کی جو سنجیدہ مسائل پر سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس ضمن میں "دیکھتی آنکھیں" کے متعدد مضامین مثلاً "پیشہ ور شاعر" نقادوں پر تنقید" سماجیوں کا گھر" اور تنقید و تخلیق کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ ان کے مضمون "کچھ عزت کے بارے میں" میں انشائیہ کا جوہر موجود ہے۔ سلمان بٹ کو موضوع منتخب کرنے کا اچھا سلیقہ ہے۔ انھیں تھوڑی فرصت اور یکسوئی حاصل ہو تو وہ رابرٹ لینڈ جیسا اخباری انشائیہ تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ "فنون" میں مشکور حسین یاد کے مضمون "نشوونما" کو انشائیہ کے زیر عنوان شائع کیا گیا۔

انشائیہ کی تحریک کو مؤثر بنانے میں "ادب لطیف" میں رضی عابدی کے مقالے نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ رشید نثار اور بشیر سیفی نے انشائیہ کی عملی تنقید میں حصہ لیا۔ انشائیہ پر بشیر سیفی کا مقالہ مکمل ہوا۔ انور سدید کی کتاب "انشائیہ اردو ادب میں" سال کے آخر میں چھپی اور اب ۱۹۸۵ء کی ابتدا میں شائع ہوگی۔ غلام جیلانی اصغر، جان کاشمیری، یونس بٹ، محمد اسداللہ اور اکبر حمیدی نے انشائیوں کے نئے مجموعے مرتب کیے۔ بھارت میں احمد جمال پاشا نے "انشائیہ کا فن" کے عنوان سے ایک تنقیدی کتاب لکھنے کی اطلاع دی" اور "اوراق" نے انشائیہ نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا۔ انشائیہ کے حزب اختلاف سے مشکور حسین یاد کی تخلیقی کتاب "ممکناتِ انشائیہ" پر مسعود ہاشمی کا ایک دلچسپ تبصرہ شائع ہوا جس میں اس کتاب کے بعض جملوں کو الہامی قرار دیا گیا۔ ان میں سے ایک جملہ یہ تھا کہ انشائیہ "امّ الاصناف" ہے۔

طنز و مزاح

وہ شگفتہ مزاح جو طبیعت میں پھلجھڑی کی طرح نکھار پیدا کر دیتا ہے۔ برصغیر میں بہت کم لکھا جاتا ہے اس کے برعکس ایسا طنز جو تلوار کی طرح کاٹتا ہے اور بالعموم شخصیت کو ہدف بنا کر اچھالا جاتا ہے۔ گذشتہ سال بھی مائل بہ ترقی نظر آیا ہے۔ مزاح کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کرنل محمد خان، سید ضمیر جعفری درسلطان رشک اور ڈاکٹر صفدر محمود نے رسالہ "اردو پنچ" جاری کیا تھا۔ سال رفتہ میں اس کے دو شمارے شائع ہوئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کو اچھے اور معیاری مزاح کی قلت کا شدید احساس ہے۔ طنز و مزاح میں گذشتہ سال سب سے زیادہ اہمیت فکر تونسوی کو ملی۔ انھوں نے "مجھے ایوارڈ ملا" "میری بیوی" "میں ریٹائر ہوا" "ایک اکھائی" اور "میں" جیسے خیال افروز اور شگفتہ مضامین لکھے۔ فکر تونسوی معاشرے کی ناہمواریوں کو اپنی ذات پر وارد کرتے ہیں۔ اور پھر صورت واقعہ کو یوں پلٹا دیتے ہیں کہ ایک بامعنی مسکراہٹ بے اختیار ہونٹوں پر آویزاں ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں جراحت کا شائبہ تک نہیں لیکن مزاح کی شائستگی نمایاں ہے۔

(۱) "جب میری بیوی پیدا ہوئی تو میں اس سے دس برس پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ ممکن ہے تاخیر سے پیدائش میں اسے یہ خوبی نظر آئی ہو کہ اسے بیوہ بننے میں آسانی ہو جائے گی"

(۲) "جس طرح درخت کو بڑھنے کے لیے شاخوں کو بڑھنا پڑتا ہے اسی طرح انسان کو بڑھنے کے لیے عمر کو بڑھنا پڑتا ہے"

طنز و مزاح میں گذشتہ سال منظور علی خان منظر نے بھی بہت اہمیت حاصل کی۔ ان کے مضامین میں سے "سنتا نہیں ہوں بات"۔ "سایہ"۔ اور "بخش مشرک" کو بہت آفرینی کا ماخذ قرار دیا گیا۔ ان کی کتاب "مکرر کہے بغیر" گذشتہ سال کے اواخر میں شائع ہوئی۔ شفیق الرحمان نے لکھا ہے کہ منظر روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے ناہموار واقعات اور جانے پہچانے کرداروں کی خامیوں پر دلچسپ پیرائے میں رائے زنی کرتے ہیں" ضمیر جعفری نے شہادت دی کہ منظر کسی فارمولے کے تحت مزاح تخلیق نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا مزاح بے ساختہ پیدا ہونے والے تبسم کی مسرت سے مالا مال ہے" کرنل محمد خان نے کہا کہ منظر علی خان کو پڑھتے وقت . . . بوجھ نہیں اٹھانا پڑتا۔ بلکہ ایک ہموار اور خوشگوار روش پر سبک پانی کے گذرنے کا احساس ہوتا ہے" اس کتاب پر اردو کے ممتاز محقق مشفق خواجہ نے ایک چھوٹا سا تعارفی نوٹ لکھا ہے۔ یہ نوٹ فی نفسہٖ شائستہ مزاح کا ایک مثالی نمونہ ہے اور میں اسے سال گذشتہ کے مزاح کا نمائندہ نقش قرار دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس نوٹ کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"منظر صاحب نے اپنی پہلی کتاب پر مجھ سے دیباچہ لکھوایا۔ دوسری کتاب پر رائے لکھوائی۔ تیسری کتاب کے چھپتے چھپتے وہ مجھ سے

اس حد تک بے تکلف ہو چکے تھے کہ اس کی کتابت کرنے کی فرمائش بھی کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے میری مصروفیات کے پیش نظر اس قسم کی زحمت دینے سے احتراز کیا حالانکہ خود ان کی مصروفیات کا تعلق اسی قسم کی فرمائشوں سے ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ اس نئی کتاب پر بھی میری رائے ہو۔ میں نے کتاب کی بجائے صاحب کتاب پر رائے دینا مناسب سمجھا۔ اوپر منظر صاحب کی جو تصویر چھاپی گئی ہے وہ میری کھینچی ہوئی ہے یہ میرا ہی حوصلہ تھا کہ یہ کام کر گذرا ورنہ منظر صاحب کو کھینچنا۔ خواہ وہ تصویر ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو بہت مشکل کام ہے۔ وہ ہر وقت برق کی طرح مضطرب رہتے ہیں اور کسی نہ کسی کام میں مصروف۔ اس تصویر میں بھی وہ دکھائی مصروف نظر آتے ہیں کہ تصویر کھنچوانا بھی ایک مصروفیت ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ تصویر اتارتے وقت میں مصروف نہیں تھا۔ ورنہ یہ تصویر اصل سے بہتر ہوتی ——"

مزاح نگاروں کی صف میں نجم الحسن رضوی ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ انھوں نے زندگی کی میکانکی جہت سے مزاح پیدا کیا۔ یہ جیتے بے حساب تنا ریاضی) یکسانیت ہے۔ "کھوئی ہوئی چیزوں کی فہرست" میں بعض اشیا کی ہیئت کذائی سے لذت آفریں مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ ان کے مضمون "اکیس ہے ۹۴ء" سے بھی مزاح داخلی کا تقاضا بن کر ابھرتا ہے۔ نسیم سحر کا طنز سماجی بے اعتدالیوں کا زائیدہ ہے۔ انھوں نے "افسانہ اور دسترخوان" اور "ادیب اور ہوس شہرت" میں طنز کو جراحت آمیز تنقید بنانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم ان کا وار خالی نہیں گیا۔ رسالہ "کتاب نما" سے ایک مزاح نگار نصرت چودھری کے نام سے نمایاں ہوا۔ ان کا مضمون "جاگتے ہاتھ" ایک بہجت آفریں مضمون ہے۔

شفیق الرحمٰن کی ایک دلکش پیروڈی "استفسارات و جوابات" کے عنوان سے شائع ہوئی اور اس میں پورے عہد کی ناہمواریوں کو سبک اور لطیف انداز میں نشانۂ مزاح بنایا گیا۔ مشتاق احمد یوسفی نے "نوبل" لکھ کر طنز و مزاح کی طرف اپنی واپسی کا یقین دلایا۔ یہ مضمون مزاح کی لطافت اور شائستگی سے معمور ہے۔ احمد جمال پاشا نے "ادبی سہرا" لکھا۔ ان کے مضامین "ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو ...." اور "بیزاری" کو قبول عام حاصل ہوا۔ محمد یوسف پاپا کا "اسٹیٹس سمبل" اور رضیہ ساجد کا "خلا پیدا کرنے والے بندے" دلچسپ مضامین تھے۔ عورت جمیل یوسف کا مستقل اور مرغوب موضوع ہے۔ گذشتہ سال انھوں نے "یہ عورتیں" اور "اب کچھ خواتین کی حمایت میں" لکھ کر اس صنف میں اپنی گہری وابستگی کا ثبوت دیا۔ "اردو پنچ" نے متعدد ایسے لوگوں کو بطور مزاح نگار کے طور پر پیش کیا جن کی تخلیقی خوبیاں پہلے اس صنف میں کبھی نمایاں نہیں ہوئیں۔ ان میں عذرا اصغر (انوکھا پھل) رئیس حسین چودھری (جو جدید) تابش صدیقی (تابستان) اور رفیع احمد موڈی (خالہ) وغیرہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسرار اشفاق نے نظم و نثر دونوں میں مزاح کے شگوفے پیدا کئے۔ "کھلی غزل" اور "ناک" اس کی مثالیں ہیں۔ غلام جیلانی اصغر کے مزاح کی جھلکیاں "بچوں کے نام سرگرم سلام" میں سامنے آئیں۔ سلیم آغا قزلباش نے "ادبی مکاتب فکر" کے عنوان سے ایک شگفتہ پیروڈی لکھی۔ صلاح الدین حیدر نے "وجدان ہوئی اور نادان" جیسے مزاح پارے لکھے۔ نواح ملتان سے مزاح کی جو تازہ کار صورتیں ابھریں ان میں اقبال ساغر صدیقی بہجت اور شائستگی کی مثال ہیں۔ انھوں نے حالات حاضرہ کو غالب اور اقبال کی آنکھ سے دیکھنے کی سعی کی۔ گذشتہ سال کے سکو کار ڈیران کا انشائیہ "خوش دامن" بہت نمایاں ہے۔ اور اس کی کیفیت مندرجہ ذیل پیروڈی میں ملاحظہ کیجیے۔ جو اقبال ساغر صدیقی کی ساختہ نظر آتی ہے۔ ؎

رنگ دھنک مہتاب ستارے نغمے خوشبو پھول ساس کے دامن میں کیا کچھ ہے دامن ہاتھ میں آئے تو

مزاح کی صنف میں محمد خالد اختر نے بھی کئی شگوفے پیدا کئے۔ ان کا مضمون "بوڑھی اور تیسا" ایک لطیف تاثر نامہ ہے۔ مشاہیر کے خطوط میں پیروڈی کی صنف آزمائی گئی۔ لیکن روئے سخن چونکہ مخصوص شخصیات کی طرف تھا اس لئے ان سے تیزابیت پیدا ہوئی۔ ان کے لکھ پایہ کر کے سفرنامے میں مزاح کی لہر زیر سطح بہتی ہے۔ محمد خالد اختر کی مزاح نگاری کا ایک سابقہ شاہکار "چاکی واڑہ میں وصال" کے نئے ایڈیشن کی اشاعت کی اطلاع بھی ملی ہے۔ کرنل محمد خان نے گذشتہ سال زیادہ تر مغربی ادب کے مزاح پارے کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ محمد ابن الحسن سید نے "ہیز ہیجان کے لئے" اور "صرف ستی" جیسے شگفتہ مضامین لکھے۔ ان کا مجموعہ "شمع اور دریچہ" "مزاح سے زیادہ انکا کو کردکے دینے والی تخلیق ہے۔ اس میں سسکنے اور راستہ تلاش کرنے کا جذبہ نمایاں ہے۔ پرویز ید اللہ مہدی نے "دعوت اور عداوت" اور "حکم بیگم مرگ شوہر ذات" میں صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کے علاوہ رعایت لفظی سے بھی شگفتگی پیدا کی۔ راجہ ریاض الرحمان کی انشائیہ شخصیت "بیمار ماڈل ٹیسٹ پیپر" میں نمو پذیر ہوئی۔ شبلنت فرنت کا "اس تسکار سے اس تسکار تک" شکیل اعجاز کا "ریڈیو" محمد اسد اللہ کا "گدھے" وجاہت سندیلوی کا "انسان کھو گیا" "مانجا لے کا" کا بیان در ہے۔ محمد اسلام تبسم کا "اونگھ" اور رشید گوریجہ کا "ونگھنا" بھی اس گوشوارے کے قابل ذکر مضامین ہیں۔ منصور قیصر "جو مرد کار میں گھرا ہوا آدمی ہے"

گذشتہ سال اس نے مزاح نگاری میں "کلاس ون مریض"۔ اور "محترم کی موت" لکھ کر شرکت کی حسین احمد شیرازی (جدید قصہ چہار درویش، چیل کی کہانی)۔ باقر علیم (نئی نسل) ارشد مہر (دادا) مرزا یاض (مقراضِ محبت)، غلام نبی اعوان (سسرال کا تحفہ)۔ شمس کاشمیری (لاؤڈ سپیکر) اظہر علیم مجوکہ (لیڈر) ناصر قریشی (انتقادیہ) اعجاز علی ارشد (داماد) آمنہ اقبال (عینک)، شاکر حسین شاکر (شیو) عصمت اللہ خان (محقق) میں ظرافت اور شگفتگی کا غالب عنصر موجود ہے۔ رحیم گل اور ملیٰ یاسمین نجمی نے بھی ایک مسرّت افزا کیفیت پیدا کی۔

سال رفتہ میں شاعری میں خالص مزاح کے نقوش بھی کثرت سے نمایاں ہوئے۔ اس قسم کے شعرا میں ڈاکٹر شاہد الوری، سید ضمیر جعفری، ارشد میر، اطہر کاشمیری انعام احسن حریف، سرفراز شاہد، نیاز سورتی، انور مسعود، اطہر راز، عطا حسین کلیم، قتیل شفائی، راغب مراد آبادی اور خالد اقبال یاسر بالخصوص تذکرے کے حقدار ہیں۔

دیگر اصنافِ نثر

گذشتہ چند برسوں میں خاکہ، آپ بیتی، یاد، شخصیت، سفرنامہ، کالم اور ملاقات نگاری نے نثر کی منفرد اصناف کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ان اصناف میں اتنی گرانقدر چیزیں لکھی جاچکی ہیں کہ اب ان کے علیحدہ علیحدہ فنی نقوش مرتب کرنا اور ان اصناف میں مختلف ادبا کے اسکور کارڈ مکمل کرنا بھی ممکن ہو گیا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ اصناف اردو ادب میں پہلے ناپید تھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قدیم ادب میں ان کے بعض گرانقدر نمونے دستیاب ہونے کے باوجود انھیں علیحدہ اصناف کی صورت میں نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر سفرنامہ لیجیے۔ اس کے ابتدائی تابندہ نقوش انیسویں صدی میں یوسف خان کمبل پوش کے سفرنامہ کی صورت میں موجود ہیں۔ حال میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بہادر شاہ ظفر کے سفیر نواب کریم خان کا "سیاحت نامہ" دریافت کیا ہے۔ جو ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۱ء کے درمیان تصنیف ہوا لیکن سفرنامے کو جدید اور باقاعدہ صورت محمود نظامی اختر ریاض الدین جمیل الدین عالی اور مستنصر حسین تارڑ نے دی اور اب نہ صرف سفرناموں کا سیلاب آگیا ہے بلکہ اس صنف میں اظہار کے نئے نئے اسالیب بھی تراشے جارہے ہیں۔ گذشتہ سال سفرنامے کی متعدد کتابیں مثلاً منظار حسین کا سفرنامہ "زمین اور فلک اور"، ممتاز مفتی کا "ہند یاترا"، جمیل زبیری کا "موسموں کا عکس"۔ فرمان فتح پوری کا "دیدو نادیدہ"۔ ارشاد احمد حقانی کا "انقلاب ایران"۔ مولانا اسعد گیلانی کا "سفرنامۂ ایران" جلال الدین صدیقی کا "زیتون کے سائے" ظہیر قریشی کا "تری وادی وادی گھوموں" اور شوکت علی شاہ کا "اجنبی اپنے دیس میں" شائع ہوئے۔ لیکن رسائل میں سفرناموں کی نسبتاً کم تعداد کو جگہ ملی۔ اس گوشوارے میں کتب کے برعکس رسائل میں مطبوعہ مضامین سے گوشوارہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے مندرجہ بالا کتب کے اجمالی تذکرے کے بعد مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ گذشتہ سال ش فرخ نے "اوراق" میں اسکاٹ لینڈ کا ایک دلچسپ سفرنامہ لکھا جس میں اسکاٹ لینڈ کی سرزمین اور اس کے لوگوں کو مغرب کی پرتوں میں ڈھونڈا گیا۔ ش فرخ منظر سے مرعوب نہیں ہوتیں، پرانی دنیا اور نئی دنیا کو دیکھ کر ناسٹلجیا کی کیفیت شعوری طور پر اپنے اوپر طاری نہیں کرتیں "اوراق" میں ہی بدیو مرزا کا سفرنامہ "سترد گا کا عالمی جشن شاعری" چھپا۔ یہ سفرنامہ کم اور ادبی رپورتاژ زیادہ ہے۔ اس سفرنامے میں مقدونیہ کے ایک چھوٹے سے شہر میں "جشن شاعری" کا احوال دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم بدیو مرزا نے اپنی نظر صرف شاعری کے جشن تک محدود نہیں کی۔ بلکہ سترد گا کے حسنِ منظر کو بھی خوبی سے گرفت میں لیا ہے۔ قیوم نظر بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن گذشتہ سال "ماہِ نو" میں ان کا ایک خوبصورت سفرنامہ "کلگن کورٹ" شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ لندنی مناظر اور واقعات کا رواں اور خوبصورت بیانیہ ہے۔ ادبی زاویے سے حسن رضوی کا "دیکھا بھارت" بھی ایک دلچسپ سفرنامہ ہے۔ اس میں زندہ ادبی شخصیات کو اور تاریخی مقامات کو اہمیت دی گئی ہے۔ اور اس کا ذائقہ الگ ہے۔ صغریٰ مہدی نے گذشتہ سال "شاہنامہ ابن بطوطی" (کتاب نما) لکھ کر سفرنامہ نگاروں میں ایک اہم حیثیت حاصل کرلی۔ وہ حقیقت کو نسائی لطافت سے پیش کرنے کا ملکہ رکھتی ہیں۔ فخر زماں کا سفرنامہ "گردش میں پاؤں" اور پروین عاطف کا "خوابوں کے جزیرے" "تخلیق" میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان سفرناموں نے بھی قاری کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔ افکار میں محمد خالد نے تھرپارکر کے سفرنامے کو ایک ناولٹ کی صورت دی ہے۔ یہ انگریزی میں سوچا ہوا اور اردو میں لکھا ہوا ناولٹ ہے اور متعدد مقامات پر قاری کی انگلی چھوڑ کر بے محابا صحراؤں میں بگولے اڑانے لگتا ہے۔

خاکہ نگاری میں سب سے اہم تو نصر اللہ خان کی کتاب "کیا قافلہ جاتا ہے"، اور مرزا ادیب کا آپ بیتی "مٹی کا دیا" ہے۔ موخرالذکر کے دوسرے حصے میں متعدد اچھے خاکے بھی شامل ہیں۔ تاہم سنتو بھائی کی کتاب "جنگل اداس ہے" میں دنیا سے رحلت کر جانے والے دوستوں کو داخل کی آنکھ سے دیکھنے اور

ہمدردی کے نازک آبگینے مرتب کرنے کی ایک عمدہ کاوش ہے۔ احمد پراچہ نے حال ہی میں زیتون بانو کا شخصیت نامہ شائع کیا ہے جس میں شخصیت کے ساتھ فن کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ رسائل میں سب سے اچھا خاکہ صابر لودھی نے مرزا منور پر لکھا۔ مرزا صاحب اقبالیات کے ماہر ہیں۔ ان کا تصور ذہن میں آتے ہی ایک ایسی شخصیت سامنے آجاتی ہے جس نے اپنے سر پر بھاری بھرکم عمامہ باندھ رکھا ہے۔ اور وہ علم کے فاضل بوجھ سے مغلوب ہے۔ صابر لودھی نے ان کے علم و فضل کا اعتراف تو کیا ہے۔ لیکن مرزا صاحب کی طبع لطیف کے آثار و نوادر تک بھی خوب رسائی حاصل کی ہے۔ اور ان کی سیرت کا متوازن نقش مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس خاکے کو پڑھ کر خالد حسن کا "اسکور کارڈ" بے اختیار یاد آجاتا ہے جس میں شخصیت سے بے تکلفی کو تہذیب آشنا کرنے اور صداقت کو حقیقت بیانی سے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

حسرت کاسگنجوی نے محمد احسن فاروقی کو زمانی فاصلے سے دیکھا لیکن انھوں نے محبت اور عقیدت کے جگنوؤں کو جمع کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ گذشتہ سال راجندر سنگھ بیدی کو دریافت کرنے کی بھی عمدہ کوششیں ہوئیں۔ ان میں سے اوپندر ناتھ اشک نے راجندر سنگھ بیدی کو ماضی کی یادوں سے دریافت کیا اور اس کی معصوم شخصیت کا ایک خوبصورت نقش مرتب کر دیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے غلام جیلانی اصغر کے خاکے میں اس بے تکلفی کو اجاگر کیا۔ جو قربِ محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ سلمان بٹ کے ہاں مزاح کی ایک شوخ کرن ہمیشہ سر ابھار لیتی ہے۔ لیکن گذشتہ سال اس نے خاکوں کا جو سلسلہ "مشرق" میں لکھا اس میں شخصیت کے "کل" پر نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ انھوں نے مستنصر حسین تارڑ اور محمد طفیل کے بہت اچھے خاکے لکھا ہے۔ ان کا سب سے اچھا خاکہ "پاک ٹی ہاؤس" پر تھا اور اس میں اس چائے خانے کو ایک ادبی کردار کی صورت میں دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی گئی۔ خدیجہ مستور نمبر میں اس ادیبہ کو گھریلو زندگی سے تلاش کیا گیا۔ توصیف احمد خان اور شاہدہ زریں نے خدیجہ مستور پر خاکے لکھ کر اس صنف میں شاید پہلی دفعہ قدم رکھا۔ یوسف ناظم کے خاکوں میں لطافتِ طبع کا انداز نمایاں تھا۔ انھوں نے خواجہ عبدالغفور اور ابن بطوطی (صغریٰ مہدی) کا خاکہ اپنے مخصوص شگفتہ قلم سے لکھا۔ اوراق کے گوشۂ تحت سنگھ میں مجید امجد کی نمودِ نو بطور خاکہ نگار ہوئی۔ اسی طرح آزاد گلاٹی اور راز سنتوکھ سری کے شخصیت ناموں میں دلچسپی کا خطیر عنصر موجود ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمان نے محمد طفیل کے تخلیقی کارناموں پر "محمد نقوش" کے عنوان سے ایک جامع کتاب مرتب کی اور اس میں ان کے نقوشِ ذات کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

یادنگاری میں غلام الثقلین نقوی نے "رابطے"، اور ہرچرن چاولہ نے "البم" کی نئی اقساط لکھ کر اپنے ماضی کو کچھ اس صورت بازیافت کیا کہ قاری کی دلچسپی اس میں بڑھتی چلی گئی۔ لکھنؤ کی یادوں کو رام لعل نے بھی خوبصورتی سے رسالہ سب رس میں سمیٹا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یادنگاری کا فن بالعموم افسانہ نگاروں نے زیادہ جذب و شوق سے قبول کیا ہے۔ اور وہی اس میں عمدہ نقوش فن مرتب کر رہے ہیں۔ شیخ منظور الٰہی کا مضمون "مانوس اجنبی" کو "فنون" نے سفرنامہ کی ذیل میں شائع کیا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ یادوں کا سرمایہ سمیٹنے ہی کی ایک عمدہ کاوش ہے۔ یادوں کو اپنی زندگی کے حوالے سے پیش کرنے کی صورت ڈاکٹر عبادت بریلوی نے پیدا کی۔ افکار ان کی آپ بیتی سلسلہ وار شائع کر رہا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی سرگذشت "گردِ راہ" کی صورت میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں گذشتہ نصف صدی کے اہم ادبی واقعات کو حیاتِ نو مل گئی ہے۔ "مٹی کا دیا" کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے رسالہ "قومی زبان" میں اختر حسین صاحب کی آپ بیتی بھی اس صنف میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ گذشتہ سال اخبارات کے ہفتہ وار ایڈیشنوں میں سوانح کو بہت اہمیت ملی۔ اس ضمن میں قتیل شفائی، مہدی حسن اور لقمان کے سوانح میں خاصی دلچسپی لی گئی۔

گذشتہ سال خطوط کی صنف میں پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے خطوط کا معتد بہ ذخیرہ محمد انصار اللہ نے اپنے والد گرامی جناب محمد مطیع اللہ سے حاصل کیا۔ اور اسے مناسب حواشی کے ساتھ رسالہ "اردو" میں شائع کیا۔ راجندر سنگھ بیدی کے خطوط اوپندر ناتھ اشک کے نام اس عظیم افسانہ نگار کے داخل کو پیش کرتے ہیں۔ یہ خطوط بیدی کے عہد میں ترقی پسند حلقے میں ملنے والے داخلی تعصبات میں جھانکنے کا عمدہ موقع فراہم کرتے ہیں۔ نظیر صدیقی نے "نامے میرے نام آئے" کے تحت مختلف ادیبوں کے خطوط کتابی صورت میں شائع کیے ہیں۔ یہ مجموعہ مصطفےٰ راہی نے مرتب کیا اور اس سے خود نظیر صدیقی کی شخصیت بھی گرد سے اٹ گئی۔ اس مجموعے میں سلیم احمد کے خطوط سب سے زیادہ ہیں اور ان کے نظریات کو سمجھنے اور ان کی شخصیت کی تفہیم میں بہت معاونت کرتے ہیں۔ "فنون" میں خدیجہ مستور کے خطوط بظاہر ایک خاتونِ خانہ کے خطوط ہیں۔ تاہم ان سے خدیجہ مستور کے دل میں پلنے والے نرم اور کومل جذبوں کے مطالعے کا عمدہ موقع فراہم ہوا ہے۔ انور سدید کی کتاب "وزیر آغا کے خطوط" کی کتابت مکمل ہو چکی ہے۔ محمد ابن الحسن

کے مضامین کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ گذشتہ سال واصف علی واصف نے دانشِ مشرق کو الفاظ میں ڈھالنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ انھوں نے "میں اور میں" "اضطراب" اور غیر معروف ادیبوں کے نام" وغیرہ مضامین میں دانش کے قیمتی جواہر بکھیرے۔ واصف صاحب کے اس قسم کے مضامین کا مجموعہ بھی گذشتہ سال شائع ہوا۔ خالد حنیف کے مضامین کا مجموعہ "میں، تو اور وہ" اور عبدالغفور شیخ کے مضامین "دل لگی" کے عنوان سے شائع ہوئے۔

کالم نگاری

روزانہ اور ہفتہ وار صحافت کے فروغِ عام نے گذشتہ سال کالم نگاری کو قبولِ عام کا درجہ دے دیا اور اتنے نئے نام سامنے آئے کہ گذشتہ سال کو بلا توقف کالم نگاروں کا سال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ قمر جمیل، سرشار صدیقی، احمد ہمدانی، محسن بھوپالی اور انجم اعظمی جیسے شاعروں نے بھی کان پر قلم رکھا اور اخبار کا اور اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کالم لکھنے لگے۔ کالم نگاری میں متعدد تجربے ہوئے لیکن سب تجربے کامیاب نہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے "حرّیت" مقبول جہانگیر نے (امروز) ظفرالدین (جسارت) منو بھائی (جنگ) مظفر بخاری (امروز) عبدالقادر حسن (جنگ) رشید گوریجہ (وفاق) اور نصراللہ خان نے (حرّیت و تکبیر) میں بالعموم سیاسی و معاشرتی واقعات و مسائل پر طنزیہ کالم لکھے۔ سجاد میر نے محمد حسن عسکری کا کالم "جھلکیاں" ادبی انداز میں لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ مولوی مدن کی سی بات پیدا نہ کرسکے۔ قمر جمیل کا ادبی کالم "دروازہ" اور "اب آپ کا خیال ہے"؟ دونوں قمر جمیل کی شخصیت کی طرح بکھرے ہوئے نظر آئے۔ اور وہ اکثر جھلاہٹ میں خود اپنے آپ برستے رہے۔ اسرار زیدی، بیدار سرمدی، علی حیدر ملک، راشد نور، خالد احمد، محسن بھوپالی، حسن رضوی، شاکر حسین شاکر اور یونس احقر نے زیادہ تر ادبی رپورتاژ نگار کا فریضہ سرانجام دیا۔ اور رپورٹ میں اپنے ذاتی تاثر کو بالعموم زیرِ سطح رکھا۔ چنانچہ ان کے کالموں میں ادبی جلسوں کی بازگشت زیادہ سنائی دی۔ ذوالفقار احمد تابش نے ادب کے مسائل حاضرہ کے تفصیلی جائزے لکھے اور یہ موضوع بحث بنے "امروز" سے ایک کالم نگار الف شاہ ابھرے اور انھوں نے ادبی مسائل کو سنجیدگی سے زیرِ بحث لانے کی اور نئے سوالات ابھارنے کی سعی کی۔ کالم کو ذاتی تاثر سے ابھارنے کی سب سے اچھی مثال انتظار حسین ہے۔ انھوں نے ادب اور معاشرے پر اپنے زاویۂ خیال سے خاصے چونکانے والے تبصرے لکھے اور شخصیات کی ذاتی ناہمواریوں پر اپنا تاثر شستگی سے پیش کیا۔ گذشتہ سال کے آخر میں منو بھائی سے ان کی نوک جھونک نے دلچسپی پیدا کی۔ ان کا تعمیری کالم جس میں ڈاکٹر سلیم اختر کو وزیر آغا کے خلاف رویہ تبدیل کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ ملک بھر میں دلچسپی سے پڑھا گیا۔

ادبی طنز کا مقبول ترین کالم خامہ بگوش کا "سخن در سخن" ہے۔ اس کالم میں لطیف اور سبک انداز میں کتاب اور مصنف دونوں کو موضوعِ خاص کی حیثیت دی جاتی ہے۔ لیکن اس کا ذائقہ کبھی کبھی کڑوا بھی ہو جاتا ہے۔ گذشتہ سال خامہ بگوش نے۔ نظیر صدیقی، استاد اختر انصاری اکبرآبادی، قمر جمیل اور رسالہ "فنون" کو متعدد مرتبہ کلماتِ "محبت" سے یاد کیا۔ "شاہینوں کے شہر سے"، "قلم بردار" کا کالم تھا جس نے مقامی ادبی رپورٹ سے ابتدا کی اور آخر میں پورے برصغیر کے واقعات پر رائے زنی شروع کردی۔ یہ کالم نگار اب میدانِ صحافت سے بوریا بستر سمیٹ چکے ہیں۔ حقیقت بیانی کا ایک انداز سرور مجاز نے بھی ایجاد کیا۔ ادب کے ہر بادشاہ سلامت کو وہ پوری جرأت سے ننگا کہہ جاتے ہیں۔ ان کی "ادبی باتیں" "مشرق" میں دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ "حرّیت" میں "غیر ادبی باتیں" کا سلسلہ دوراندیش نے شروع کیا تھا۔ لیکن وہ چند کالم لکھنے کے بعد اپنا ٹھاٹھ سمیٹ کر چلے گئے۔ سلمان بٹ کا کالم "دیکھتی آنکھیں" اب "امروز" میں شروع ہوا ہے۔ وہ سنجیدہ موضوع سے ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "جونیئر سینئر" کا سلسلہ "اردو ادب پر پاک ٹی ہاؤس کا اثر" "ادب میں تنوع" وغیرہ کالموں میں یہ کیفیت نمایاں نظر آئی۔ "امروز" سے کالی داس کی نمود بھی حال ہی میں ہوئی ہے اور یہ کالم ادبی منظر کی ناہمواریوں کو ابھارنے میں مصروف ہے۔ منصور قیصر ادب کی کمرشل کمپنی کا سب سے بڑا اسپیلزمین ہے۔ اور وہ موقع کی مناسبت سے کالم لکھتا ہے۔ گذشتہ سال اس نے "پنڈی پوائنٹ" کالم میں حسبِ طبیعت اردو میں پنجابی کا تڑکا لگانے کی کوشش کی۔ جمیل الدین عالی کا کالم مطالعے کی روشنی وافر مقدار میں بکھیرتا ہے۔ ستار طاہر کا کالم "حلقۂ دامِ خیال" میں بھی غیر ملکی ادب کے مطالعے کا حاصل پیش کیا جاتا ہے۔ گذشتہ سال انھوں نے منتخب کالموں کی کتاب شائع کی۔ زود اندیش نے دوسروں کی خلوت میں گھسنے کی کوشش کی، عطاء الحق قاسمی "روزنِ دیوار سے" اور امجد اسلام امجد "اہلِ ادب" کو چشمِ تماشا سے دیکھتے رہے، اسلم کمال نے "قلم موقلم" کو فکری طور پر آراستہ کرنے کی سعی کی۔ فریدہ حفیظ نے راولپنڈی کے اور جان کاشمیری نے گوجرانوالہ کے ادبی منظر کو خوبی سے سمیٹا۔ مرزا ادیب کا کالم "اذکار و افکار" ایک ایسا تبرک ہے جسے محبت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ظفر اقبال پرانی سرخیوں کو ڈھونڈ

متن تفویض کرنے کے بعد اب "نوائے وقت" میں "تذکرہ" لکھ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسے شاعر کا کالم ہے جو ادب اور وکالت میں ناکامی کا انتقام ادبا اور شعراء سے لے رہے ہیں۔ اور اکثر کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے لگتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا کارواں سرائے۔ بس سفرنامہ سمجھئے جس کے لئے وہ اپنے باطن کے سیاح کو ہمہ وقت بیدار رکھتے ہیں۔ راولپنڈی سے "کوہ کن" بظاہر ادبی رپورٹنگ سے آگے نہیں بڑھتے لیکن کبھی اپنا تاثر ظاہر کریں تو ان کے کالم میں ایک مخصوص مہک اٹھنے لگتی ہے۔ کالم نگاری کے یہ تمام رنگ متنوع ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو صحافت سے تاحال ایک بھی ایڈیسن یا اسٹیل نہیں ابھر سکا۔

ادبی رسائل

ادبی رسائل گذشتہ سال کے دوران بھی انتشارِ اشاعت کا شکار رہے۔ "افکار" کے ساتھ اب یہ اعزاز "نیرنگ خیال" اور "کتاب نما" کو حاصل ہوا کہ ان دونوں نے سال بھر کے دوران بارہ پرچے شائع کئے۔ بلکہ نیرنگ خیال نے تو دو خاص نمبر بھی شائع کئے۔ "افکار" کے سب کام پہلے صہبا لکھنوی تنہا سر انجام دیتے تھے۔ گذشتہ سال ان کا ہاتھ ادیب سہیل اور راشد نور نے بھی بٹایا۔ افکار واحد پرچہ ہے جو کمرشل خطوط پر چلنے کے باوجود اردو ادب کی گراں بہا خدمت کر رہا ہے۔ اور متصادم مسائل میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ تاہم گذشتہ سال پیروڈی کے موضوع پر ایک بحث چھیڑ دی گئی جس میں نقطۂ اختلاف انور سدید نے اٹھایا۔ اس بحث میں صہبا اکرام، اکبر حمیدی، محمد اسماعیل احمدانی، احمد علی خان اور ایم۔ ایل وغیرہ نے حصہ لیا۔ لیکن صہبا لکھنوی اس میں اپنی غیر جانبداری قائم نہ رکھ سکے۔ اور انور سدید کا "نقطۂ نظر" افکار کے خطوط کے صفحات میں دفن کر دیا۔ افکار نے تنقید، نظم، غزل، افسانہ اور طنز و مزاح سب اصناف کی نمائندگی کی۔ "کتاب نما" کو گذشتہ سال ایک فعال ادبی پرچے کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اردو کی مروجہ اصناف کے ساتھ ساتھ اس میں ادب کے خصوصی گوشوں اور دوسری زبانوں کے نامور ادیبوں کا تعارف کرانے میں گہری دلچسپی لی گئی۔ ممبئی سے "شاعر" نے نثری نظم اور آزاد غزل نمبر شائع کر کے بڑی شہرت حاصل کی۔ حسبِ معمول کے پرچے نے اس نے ادب کی سب اصناف کو اور بالخصوص جدید افسانے کو پروان چڑھانے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

کلام حیدری کا رسالہ "آہنگ" گیا بھی باقاعدگی سے شائع ہونے والے پرچوں میں سے ہے۔ تنقید و تخلیق کی جدیدیت کو آہنگ نے عصری آگہی کے ساتھ منسلک کرنے کی سعی کی۔ اور جدید افسانے کے چند نئے نقوش پیش کئے۔ گذشتہ سال ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے رسالہ "نگار" نے تنقیدی ادب کو پیش کرنے اور تحقیقی روایات کو مستحکم کرنے میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ اس پرچے میں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، اختر انصاری، اے بی اشرف اور حمید قریشی کے تنقیدی مضامین بڑے ادبی حلقے میں پڑھے اور پسند کئے گئے۔

"ماہِ نو" اور "اظہار" اگرچہ سرکاری پرچے ہیں تاہم ان دونوں کا مزاج ادبی ہے۔ "ماہِ نو" نے نئے ادب کو اور اظہار نے معاشرتی زاویوں کو نمایاں کیا۔ ماہِ نو میں ادباء اور شعراء کے لئے متعدد گوشے معین کئے گئے۔ اور ان کے فکر و فن کا ایک مجموعی تاثر پیدا کرنے میں معاونت کی۔ بیدی کے لئے تاج سعید نے جریدہ کا ایک شمارہ خاص نمبر کی صورت میں شائع کیا جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

گذشتہ سال نقوش کے رسول نمبر کی دس جلدیں تکمیل کو پہنچیں۔ اور اس کی پذیرائی پورے ملک میں ہوئی۔ "اوراق" نے تین ضخیم خاص نمبر شائع کئے اور ادب میں اپنے فعال کردار کو مزید مؤثر بنانے کی سعی کی۔ اوراق کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ بیشتر ادبی پرچے ضخامت کم کر رہے ہیں لیکن قیمت بڑھا رہے ہیں۔ "اوراق" نے ضخامت بڑھا دی لیکن قیمت کم کر دی۔ اوراق نے طویل نظم، ہائیکو اور انشائیہ کو فروغ عام دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان تخلیقی اصناف کو اوراق کا امتیازی وصف شمار کیا گیا۔ غلام جیلانی اصغر اور تحسینہ نگہت نے اوراق میں خصوصی گوشے شائع کئے۔ اوراق اگرچہ دیر سے شائع ہوتا ہے لیکن اس کے مضامین کی بازگشت سال بھر تک سنی جاتی ہے۔ "فنون" کا سب سے بڑا کارنامہ خدیجہ مستور نمبر کی اشاعت ہے۔ سال کے آخر میں فنون کا ایک ضخیم خاص نمبر شائع ہوا اور اس میں محمد ارشاد کے مضمون نے حسن عسکری گروپ کے ادبا میں شدید ردِ عمل پیدا کیا۔ فنون ترقی پسند مصنفین کا غیر سرکاری ترجمان ہے۔ قاسمی صاحب کی ادارت میں مجلس ترقی ادب کا رسالہ "صحیفہ" بھی شائع ہوتا ہے۔ لیکن اس رسالے تک عام قاری کی رسائی حاصل نہیں۔ یہ چھپتا ہے اور مجلس کے دفتر میں ہی پڑا رہتا ہے۔ نعیم صدیقی کا رسالہ "سیارہ" نے دو ضخیم اشاعتیں پیش کیں۔ اس پرچے نے اسلامی ادب کی تحریک کو موثر انداز میں آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ آخری اشاعت کے ساتھ فضل من اللہ اس پرچے سے رخصت ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ سیارہ سے ادب کے اس مخلص خدمت گار کی علیحدگی اس پرچے کے لئے شاید غیر مفید ثابت ہو۔ طنز و مزاح کا نمائندہ رسالہ "اردو پنچ" دو مرتبہ منظر عام پر آیا اور

ایک وسیع حلقے میں دلچسپی سے پڑھا گیا۔ علی حیدر ملک، اور ادا بدایونی نے "قومی زبان" کا پرانا قالب بدل کر اسے ایک جدید ادبی پرچہ بنا دیا۔

اظہر جاوید اور عذرا اصغر نے تخلیق باقاعدگی سے شائع کیا۔ گذشتہ سال افسانے کے موضوع پر تخلیق کا مذاکرہ اور کہانی نمبر کی اشاعت اس پرچے کی زندگی کے یادگار واقعات ہیں۔ راولپنڈی سے بشیر سیفی کے رسالہ "اردو ادب" نے اب قدم جما لیے ہیں اور یہ آہستہ آہستہ بڑے ادیبوں کی توجہ حاصل کر رہا ہے۔ اختر انصاری اکبر آبادی کا رسالہ "نئی قدریں" نے سندھ میں اردو کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ گذشتہ سال بھی اس نے خدمت اردو کا کام جاری رکھا۔ صدیقہ جاوید اور مسعود اشعر کی ادارت میں "ادب لطیف" غیر ملکی شاہپاروں کو اردو ادب میں منتقل کرنے کا فریضہ سرگرمی اور تندہی سے سرانجام دے رہا ہے۔ نئے افسانے کو متعارف کرانے میں گذشتہ سال اس پرچے نے گرانقدر خدمت سرانجام دی۔

نسیم درانی کا رسالہ "سیپ" کی دو اشاعتیں منظرِ عام پر آئیں۔ اور ایک دیرپا تاثر قائم کر گئیں۔ الفاظ نے من جملہ دیگر اصناف کے جیلانی بانو کے فن پر ایک خصوصی اشاعت پیش کی۔ الفاظ کے سلیم اختر نمبر میں سابقہ مضامین کو دوبارہ چھاپا گیا۔ اردو ادب کے جدید تقاضوں کو "سیپ" اور الفاظ نے بڑی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے پورا کیا ہے۔ حمید الدین شاہد کا رسالہ "سب رس" کلاسیکی مزاج کا پرچہ ہے۔ گذشتہ سال اس نے ممتاز حسین نمبر شائع کر کے ایک خادمِ ادب کو عمدہ خراجِ تحسین پیش کیا۔ "جواز" اور "اظہار" کے دو پرچے پاکستان میں پہنچے۔ اور ان پہلے جیسے تاثرات پیدا ہوئے۔ اکادمی ادبیات کا رسالہ "اکادمی" اور مقتدرہ کے "اردو اخبارنامے" نے ایک موثر خبرنامے کی صورت اختیار کی۔ خالد اقبال یاسر نے اقتباسات کی اشاعت سے اور ڈاکٹر وحید قریشی نے اردو کے بارے میں مضامین سے اسے ادبی روپ دینے کی سعی کی۔ حفیظ صدیقی نے "تحریریں" کے دو پرچے شائع کیے۔ مضامین نظم و نثر کے مجموعے چھاپنے کی روایت ملتان سے شروع ہوئی تھی۔ گذشتہ سال حسین سحر نے اہل قلم کا نیا شمارہ آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ "لفظ ہمارے" کا لغت نمبر شائع ہوا۔ خورشید ناظر اور انور صدا برنے بہاولپور سے "حروف" کا ایک خاص نمبر شائع کیا جس میں ادب کو نمائندگی دی گئی۔ سہیل احمد خان نے گذشتہ سال "محراب" کا صرف ایک پرچہ شائع کیا جس میں تراجم کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ شعبۂ اردو کراچی کا "سفینہ" اور سائنس کالج کے رسالہ "تخلیق" نے بھی علم و ادب کی خدمت میں گرانقدر حصہ لیا۔

گذشتہ کئی سالوں سے روزنامہ اخبارات بھی ادبی ایڈیشنوں کے وسیلے سے ادب کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ اخبارات کی ادبی اہمیت سے ملاقات نگاری کو خصوصی فروغ حاصل ہوا۔ ادیب کو ٹٹولنے اور اس کی زندگی سے عوامی دلچسپی کے عناصر تلاش کرنے کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ گذشتہ سال اخبار "جنگ" میں حسن رضوی، سعادت سعید اور اسرار زیدی نے ادیبوں سے متعدد دلچسپ انٹرویو کیے۔ حریت سے شمع زیدی، جسارت سے اختر سعیدی، علی حیدر ملک اور احمد فواد، تکبیر سے طاہر مسعود، نوائے وقت سے عطاء الحق قاسمی، بیدار سرمدی، امروز سے محمد عالم خان ملاقات نگاری کی صورت میں نمایاں ہوئے۔ ادبی رسائل میں، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، انصرت چودھری اور سہیل احمد کے انٹرویوز کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی۔ روزنامہ اخبارات میں ادب کے بجائے ادیب کو اور کتاب کے بجائے تصویر کو نمایاں کرنے کا رجحان گذشتہ سال بھی مقبول رہا۔ میرا اندازہ ہے کہ گذشتہ سال تصویریں چھپوانے میں سب سے زیادہ دلچسپی ڈاکٹر سلیم اختر نے لی۔ ان کا سکور کارڈ رنگا رنگ تصویروں سے بھرا ہوا ہے۔ گذشتہ سال فروغِ شخصیت میں دعوت ہائے طعام کو بھی اہمیت دی گئی۔ چنانچہ ادب کے بارے میں کم اور تقریباتِ طعام کی اطلاعات زیادہ شائع ہوئیں اور خوش آئند بات یہ ہے کہ اس قسم کی تقریبات پانچ ستارہ ہوٹلوں میں منعقد کی گئیں۔ جس سے اس بات پر بے حد طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ اس دور میں ادیب کا سماجی مرتبہ بلند ہو رہا ہے۔ اور ادب ٹی ہاؤس سے نکل کر پانچ ستارہ ہوٹلوں تک پہنچ گیا ہے۔

اعتذارِ آخر

اردو ادب ۱۹۸۴ء کے اس گوشوارے کو میں نے دستیاب رسائل سے ہر ممکن طریق سے مکمل اور جامع بنانے کی کوشش کی ہے تاہم مجھے احساس ہے کہ مجھے سب اخبارات تک رسائی حاصل نہیں ہوئی اور بھارت کے متعدد رسائل نہیں ملے۔ یہ ایک فردِ واحد کی ذاتی اور انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے اور اس میں بعض کوتاہیوں کا اور فروگذاشتوں کا دخل پا جانا ایک فطری عمل ہے۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اس کی مزید تکمیل کے لیے مناسب معاونت عطا کریں۔

○○

وفیات

پروفیسر محمد مجیب

۳۰/اکتوبر ۱۹۰۲ء لکھنؤ ــــــ ۲۱/جنوری ۱۹۸۴ء دہلی

اردو اور انگریزی کے مشہور مصنف اور برِ صغیر کے نامور دانشور اور ماہر تعلیم پروفیسر محمد مجیب ۲۰ اور ۲۱/جنوری کی درمیانی شب میں ایک طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔

پروفیسر مجیب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے تعلیمی میدان میں طویل ترین خدمات انجام دی ہیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعہ سے بے شمار ذہنوں کی فکری تربیت میں حصہ لیا۔ تہذیبی اور تمدنی امور پر وہ بے پناہ دسترس رکھتے تھے۔ مجیب صاحب کی پوری زندگی لکھنے پڑھنے اور مختلف النوع علمی ادبی تہذیبی اور سماجی کاموں میں بسر ہوئی۔ ہندوستان اور پھر بیرونی ممالک میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بہ حیثیت استاد تاریخ کی تدریس کے لئے مقرر ہوئے (۱۹۲۶) ۱۹۴۸ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ ہندوستان کی جانب سے مختلف مواقعوں پر دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کیا۔ وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ۱۹۶۱ء میں میکسگل یونیورسٹی مانٹریال تشریف لے گئے۔ حکومتِ ہند کی مختلف کمیٹیوں میں شامل کئے گئے۔ مجیب صاحب کی کوششوں سے حکومتِ ہند کی طرف سے اردو بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور مجیب صاحب اس کے پہلے وائس چیئرمین مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں حکومتِ ہند نے پدم بھوشن کا خطاب عطا کیا۔

مجیب صاحب کی تصانیف کی تعداد ۲۶ سے بھی زائد ہے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

تاریخ فلسفۂ سیاسیات (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) دنیا کی کہانی (ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ جون ۱۹۳۷ء) روسی ادب (دو جلدیں ۱۹۴۰ء) تاریخ تمدن ہند۔ عہد قدیم (۱۹۵۱ء) ہماری آزادی از ابوالکلام آزاد ترجمہ (جنوری ۱۹۵۹ء) تاریخ فلسفۂ سیاسیات (دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۳ء) کیمیا گر (افسانوں کا مجموعہ ۱۹۳۲ء)

ڈراموں کے چند اہم مجموعے:۔ خانہ جنگی (۱۹۴۶ء) حبّہ خاتون (۱۹۵۲ء) ہیروئن کی تلاش (۱۹۵۳ء) دوسری شام (۱۹۵۶ء) آزمائش (۱۹۵۷ء) ان کے علاوہ اردو اور انگریزی کی کئی اور کتابیں مجیب صاحب نے تصنیف و تالیف کیں۔

آغا رشید مرزا

۱۹۲۶ء دہلی ــــــ ۲۲/جنوری ۱۹۸۵ء کلکتہ

۱۹۸۵ء کی ابتداء ہی میں ادارۂ شاعر ایک بہت بڑے سانحے سے دوچار ہوا اور ہم اپنے دیرینہ سرپرست بزرگ اور رفیق کار سے محروم ہو گئے۔ آہ! محترم آغا رشید مرزا کو مرحوم لکھتے یا تصوّر کرنے ہی سے جو اذیت محسوس ہو رہی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔

۲۲/جنوری ۱۹۸۵ء کو شب میں ۸ بجے ۵۹ سال کی عمر میں ووڈلینڈز نرسنگ ہوم کلکتہ میں انتقال کر گئے۔

شاعر اور قبلہ اعجاز صدیقی مرحوم سے آغا رشید صاحب کو جو تعلق رہا ہے وہ ایک طویل داستان ہے، ایک عالم، ایک ادیب اور افسانہ نگار جس نے بہت ہی خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی اور نام و نمود کے بغیر اردو زبان کے لئے کام کرتے رہے۔ والدِ محترم قبلہ اعجاز صدیقی اور تاجدار بھائی کے انتقال کے بعد ہمیں جو حوصلہ اور عملی تعاون آغا صاحب سے ملتا رہا وہ ناقابلِ فراموش رہے گا۔ شاعر سے ان کی وابستگی اور تعلق عملی سطح پر تھا جس کے لئے وہ برابر کوشاں رہے انہیں اپنی تحریروں کی اشاعت سے زیادہ شاعر کے لئے کچھ کر گذرنے کی فکر اور تجسّس رہتا تھا۔ اپنے طویل طویل خطوط کے ذریعہ وہ ہم لوگوں میں کام کرنے کا جوش پیدا کرتے، حوالے اور مثالیں دیتے، طریقۂ کار کا تعین کرتے۔

آغا رشید مرزا صاحب ایک نہایت ہی بلند پایہ علمی و ادبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں ڈپٹی نذیر احمد، علامہ راشد الخیری، خان بہادر میر ناصر علی اور نور الحسن برلاس جیسے مشاہیر پیدا ہوئے۔ آغا رشید مرزا مرحوم کے والد آغا خورشید مرزا اسٹرل گورنمنٹ کے محکمہ انکم ٹیکس میں ریونیو آفیسر تھے۔ ملازمت اور تجارت کے ساتھ ساتھ آغا خورشید مرزا نے کئی اصلاحی ناول بھی تحریر کئے۔ جن میں سے اصلاح رسوم (ناولٹ) اور نعیم کی زندگی (دو حصوں میں طویل سوشیل ناول) بے حد مقبول ہوئے۔ آغا خورشید مرزا اکلوتے تھے لیکن رشتے کے بھائی بہنوں کی فہرست طویل ہے۔ رشتے کے بھائی بہنوں میں سے ایک بھائی حکیم اجمل خاں کی صاحبزادی سے وابستہ تھے۔ ایک بھائی نور الحسن برلاس ٹوکیو یونیورسٹی (جاپان) میں شعبۂ علوم مشرقی کے صدر تھے۔ جاپانی تہذیب و تمدن کے متعلق انکے مضامین کا سلسلہ ماہنامہ ساقی (دہلی) میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ دادا آغا حاتم مرزا انڈین پولس کی سروس میں تھے اپنی بہترین کارکردگی کے سبب انھیں کپور تھلہ (پنجاب) انسپکٹر جنرل آف پولس کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد دہلی آ گئے۔ اور آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ آغا حاتم مرزا کا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا تھا چنانچہ ہفتہ میں ایک دن اپنے گھر ہی پر عدالت کرلیا کرتے تھے۔ فارسی میں شعر کہا کرتے تھے اور مولانا حالی کے شاگردوں میں سے تھے۔ آغا رشید مرزا کی دادی ہاجرہ بیگم، علامہ راشد الخیری کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور ڈپٹی نذیر احمد ان کے خالو تھے۔ ہاجرہ بیگم کے نانا ہی کے یہاں ڈپٹی نذیر احمد کی پرورش ہوئی تھی۔

اسی خاندانی پس منظر میں جناب آغا رشید مرزا کی ذہنی تربیت ہوئی تھی۔ اس طرح علم و ادب انھیں ورثہ میں ملا تھا۔ آغا صاحب نے اپنا پہلا افسانہ ۱۹۴۳ء میں لکھا تھا جو سعادت حسن منٹو کی فرمائش پر ان ہی کے رسالے مصور (بمبئی) میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں پنجاب یونیورسٹی (لاہور) سے اردو میں ایم اے کیا لیکن اپنے والد محترم کے انتقال کے بعد معاشی ذمہ داری نے انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اسی طرح کاروباری الجھنوں نے لکھنے پڑھنے کا موقع بھی کم دیا۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں ہوئے فسادات نے یہ کم کم مواقع بھی چھین لئے اور آغا صاحب اپنے بھائی بہنوں کی جانیں بچا کر کلکتہ چلے آئے۔ اپنی والدہ ماجدہ کے اس قدر خدمت گزار رہے کہ پوری زندگی بغیر شادی کے گزار دی۔

۱۹۶۶ء میں قبلہ اعجاز صاحب کے بے حد اصرار پر دوبارہ لکھنے کی طرف مائل ہوئے اور اس تجدید نے ان سے ڈھیروں افسانے انشائیے اور مضامین اور مختلف النوع علمی، ادبی اور مذہبی تحریریں لکھوالیں جو شاعر کے خاص و عام شماروں کے علاوہ آجکل، شاخسار، معارف وغیرہ رسائل میں شائع ہوئیں۔ آغا رشید مرزا کی موت ادارۂ شاعر کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

سمن سرحدی

۲۵ / اکتوبر ۱۹۲۲ء ــــــ ۲۳ / جنوری ۱۹۸۵ء

اُردو کے کہنہ مشق شاعر اور پرانے صحافی جناب رام چند رسمن سرحدی ۲۳ / جنوری ۱۹۸۵ء کی شب میں ساڑھے بارہ بجے انتقال کر گئے۔ وہ ۲۵ / اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں کے قصبے پروا میں پیدا ہوئے ان کا آبائی پیشہ زرگری تھا لیکن مزاجاً وہ ادیب و شاعر ہی تھے چنانچہ عمر کی آخری سانسوں تک وہ اپنے قلم سے کام لیتے رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ فوج میں شامل ہو گئے تھے اور "حوالدار کلرک" کی رینک سے سبکدوش ہوتے، سبکدوشی کی وجہ علالت تھی۔ فوج سے تا عمر انھیں پنشن ملتی رہی۔ فوج سے سبکدوشی کے بعد وہ "ہند سندیش" کے جوائنٹ ایڈیٹر ہو گئے اور آخر وقت تک اسی سے وابستہ رہے۔

سمن سرحدی نظم کے شاعر تھے۔ ۱۹۷۳ء میں انھوں نے بچوں کی دنیا کے زیر عنوان روسی شعراء کی نظموں کے منظوم تراجم شائع کئے جس پر ہند سرکار کی وزارت تعلیم نے خصوصی انعام دیا۔ ۱۹۸۰ء میں انھوں نے شہرۂ آفاق شاعر مایاکوفسکی کی مشہور نظم لینن کا منظوم ترجمہ شائع کیا جس پر انھیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے بھی انھیں انعامات دئے۔ ابھی غیر مطبوعہ منظوم تراجم اور نثری تراجم وغیرہ کی اشاعت ہونا باقی ہے۔ پسماندگان میں بیوہ دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں شامل ہیں۔

محفل اپنی

تاخیر سہی لیکن .....

شاعر کی اشاعت کے ۵۵ سال مکمل ہوجانے کے بعد ۵۶ ویں سال کا یہ پہلا مشترکہ شمارہ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۸۵ء، مواد و ہیئت کی نئی تبدیلیوں اور منفرد روپ کے ساتھ نذرِ قارئین کرتے ہوئے ہم بے انتہا مسرت محسوس کر رہے ہیں باوجود اس کے کہ نئے سال کا پہلا شمارہ تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے لیکن اس تاخیر کا ہونا بھی کم از کم شاعر ایسے خاص ادبی رسالے کے لئے ناگزیر تھا۔ نئے انتظامی امور، لیتھو سے آفسٹ تک کا سفر، بڑھتی ہوئی ضخامت، انداز پیش کش، کثیر اخراجات اور وسائل کی کمی۔ ہم اب بالکل نئے تجربوں سے گزر رہے ہیں لہٰذا قدم قدم احتیاط بھی ضروری تھی۔

پہلے تو یہ سوچا تھا کہ جنوری ۱۹۸۵ء کا شمارہ سالگرہ نمبر ہو لیکن مرکزی اور صوبائی انتخابات نے کسی خاص نمبر کی اجازت نہیں دی، عام شمارہ ترتیب دینے کے خیال نے اس نئے پن کو بھی سامنے رکھا جو ہم شاعر کو دینا چاہتے ہیں اور یہ تمام نئے رنگ سالگرہ نمبر میں سجائے جاتے جو کسی بھی طرح ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔

عام شمارہ اپنی ترتیب و تدوین میں پھیلنے پھیلنے ایک نامس تھا۔ ... کی شکل یہ آپ کے سامنے ہے یہ سالگرہ نمبر نہیں ہے لیکن اس کی ایک کڑی ضرور ہے۔

قارئین! ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ اب شاعر آفسٹ کی طباعت کے ساتھ بروقت آپ تک پہنچ سکے گا۔ ہمارے حوصلے بے حد بلند ہیں اور ہم اپنی تمام تر کوششوں میں مصروف ہیں۔ شاعر اردو کی روایت ہے، ہندوستان میں اردو کا سب سے قدیم اور اہم ادبی ماہنامہ ہے۔ ہم اسے اور زیادہ خوب سیرت، متنوع اور تازہ کار بنانے میں مصروف ہیں تاکہ عالمی سطح پر جہاں جہاں اردو زبان و ادب موجود ہے شاعر وہاں تک پہنچے شاعر عالم اردو کا نمائندہ بن جائے پوری اردو دنیا کے لئے رابطہ بن سکے۔

یہ خصوصی شمارہ

آفسٹ کا یہ افتتاحی شمارہ ایک خاص نمبر ہی ہے جس کے مندرجات اپنی ترتیب و پیش کش میں آپ کو پوری طرح متوجہ کر لیں گے۔ ہم نے ایک سو ساٹھ (۱۶۰) صفحات میں اتنا کچھ سمو دیا ہے کہ دو سو صفحات بھی ناکافی ہوں۔ بعض تخلیقات آپ کو مطبوعہ معلوم ہوں گی لیکن اسکی وجہ یا تو موضوع کی ضرورت ہے یا پھر رسالے کی اشاعت میں تاخیر کا سبب۔ "۱۹۸۴ء ایک باب" کو ہم "ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام" کی طرح ترتیب دینا چاہتے تھے لیکن بڑھتی ہوئی ضخامت نے کئی اہم تخلیقات کو روک لینے پر مجبور کر دیا۔ ہم اپنے اختراعی شمارے کو ایک روایت بنا دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں تاکہ کسی ایک سال کو پوری طرح ایک جگہ محفوظ کیا جا سکے۔

سالگرہ نمبر یا خاص نمبر

آفسٹ کے افتتاحی شمارے کا اعلان ادبی حلقوں تک پہنچ گیا ہے، ہمارے مشاہیر قلم کاروں نے سالگرہ نمبر کے لئے اپنی تخلیقات ارسال فرمائی ہیں وہ حسب وعدہ خاص نمبر ہی کے لئے ہیں۔ ایک غلط فہمی یہ پیدا ہوگئی کہ اب شاید سالگرہ نمبر شائع نہیں ہوگا جبکہ دسمبر ۸۴ء کی اشاعت میں ہم اعلان کر چکے تھے کہ سالگرہ نمبر سے پہلے آفسٹ کا افتتاحی شمارہ پیش کیا جا رہا ہے چنانچہ سالگرہ نمبر جو کہ اب خاص نمبر ہوگا اور پوری آب و تاب اور اختراعی جدتوں کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ ہم اپنے تمام قلم کاروں سے درخواست گذار ہیں کہ وہ اپنی تخلیقات کو خاص

ئے محفوظ سمجھیں۔ ادارے سے جلد ہی ان کے نام تفصیلی خط ارسال کیا جارہا ہے۔ انشاء اللہ خاص نمبر بھی اپنی مثال آپ ہوگا اور شاعر
ہم موضوعاتی اشاعتوں کی توسیع بھی کرے گا۔

شاعر کی طرف سے اپیل

قارئین! شاعر کو آفسٹ پر طبع کرنے کے ساتھ ہمارے جو منصوبے ہیں اور جو ارادے ہیں ان کے لئے ہم نے ایک اپیل کتابچے
ورت میں آپ تک پہنچائی ہے۔ ہم اس پر ہونے والے ردِ عمل کے منتظر ہیں۔ ہم نے اردو کے عام قاری وطالب علم سے لیکر مشاہیر
ارول، مقتدر ارباب علم وفن، اردو کے ہمدرد و سرپرست اور بہی خواہ حضرات سے بھرپور تعاون کی اپیل کی ہے۔ شاعر
دستان میں اردو کا سب سے اہم ادبی جریدہ ہے چنانچہ اس کے ساتھ اشتراک و تعاون بھی پوری اردو دنیا کی طرف سے ہونا
ئے۔ فرد ہو یا جماعت، انجمن، ادارے، اردو اکاڈمیاں۔ اردو کے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے سب ہی سے ہم پرخلوص توجہ
استگار ہیں۔ شاعر کسی ایک صوبے کا رسالہ نہیں ہے۔ اردو کا رسالہ ہے لہٰذا ہر طرف سے اسی کے لئے آواز بلند ہونی چاہئے۔
و کچھ بھی شاعر کے لئے کرسکتے ہوں وہ ضرور کریں۔ اس وقت شاعر کو آپ کی تخلیقات سے زیادہ آپ کے عملی تعاون کی ضرورت
شاعر نے جس طرح گزشتہ ۵۵ برسوں میں اپنی کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو زبان وادب کی خدمت کی ہے اس کا
ضہ یہ ہے کہ اس ماہنامے کے ایڈ بغیر کسی تعصب، علاقائی حد بندیوں اور خود ساختہ قوانین کے اس کی طویل ترین صحافتی خدمات
ں نظر اشتہارات وعطیات، انعامات واعزازات سے نوازا جائے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو اس ادبی رسالے کی طرف متوجہ
جائے کہ شاعر اردو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخی روایت بھی ہے۔ ہم نہایت ہی بے چینی کے ساتھ آپ کے فیصلوں کے منتظر ہیں۔
یہ اگر آپ کو نہیں موصول ہوا ہے تو ہمیں لکھئے تاکہ دوبارہ ارسال کیا جاسکے۔

● یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟، اپنی رائے اور مشوروں سے ہمیں آگاہ کیجئے۔

● غیر ممالک میں اپنے دوستوں تک شاعر کی ترسیل کے لئے ہم سے رابطہ قائم کیجئے۔

بیان ملکیت اور دیگر تفصیلات
ماہنامہ شاعر بمبئی
(مطابق فارم نمبر ۴۔ قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت	بمبئی	وقفۂ اشاعت	ماہنامہ
پرنٹر و پبلشر	ناظر نعمان صدیقی	قومیت	ہندوستانی
پتا	دینا تھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴	ملکیت	ناظر نعمان صدیقی
ایڈیٹر	افتخار امام صدیقی	قومیت	ہندوستانی
پتا	دینا تھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴		

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات
میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں۔ ۲۸ فروری ۱۹۸۵ء
دستخط ناظر نعمان صدیقی

پرنٹر، پبلشر، مالک ناظر نعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۴ نور دزجی اسٹریٹ ٹھاکور دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا۔

جمہوریت کے کروڑوں ستون

چار ہفتے پیشتر
دسمبر کے آخری ہفتے میں
ہمارے کروڑوں
شہری اور دیہاتی
بڈھے اور جوان
مردوں اور عورتوں نے
اُمڈ کر
اپنی حکومت
منتخب کی
اور آزاد ووٹ
اور جمہوریت کی طاقت کو
ایک بار پھر نمایاں کیا۔
جمہوریت اور آزادی
ہمارا بیش قیمت خزانہ
اور بے بہا ورثہ ہے۔
آئیے
اپنی جمہوریہ کی
35 ویں سالگرہ پر
اسے برقرار رکھنے
کا عہد کریں۔

اتحاد اور مضبوطی کے ساتھ

davp 84/272

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی ۔ علامہ سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

بہ یادگار ۔ اعجاز صدیقی (مرحوم)

اشاعت کا ۵۶ واں سال ● علمی، ادبی و تہذیبی ماہنامہ

بمبئی

جلد ۔ ۵۶ ◎ شمارہ ۔ ۴

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زر سالانہ	معاونین سے	تاحیات خریداری	ممالک غیر سے
۴۰ روپے	۱۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

قیمت: ● ۴ روپے

فون: ۳۵۹۹۰۴

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سنٹرل پوسٹ آفس
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶،
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

کوئی بھی طریقہ اپنائیے

davp 84/225

ترتیب

زبان، رسم الخط، ادب اور فن کار

آج جب یہ سوچا جاتا ہے کہ کیا اردو کے تمام مسائل حل ہو گئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدنصیب زبان ہندوستانی سیاست کا دوسرا نام ہو گئی ہے۔ جو عصری مزاج ہندوستانی سیاست کا بن گیا ہے وہی اردو زبان کا مزاج بھی بن گیا ہے یا آوازوں کا ایک شور ہے جو کسی اکائی کے بجائے انتشار کی زد پر ہے۔ تحفظ اور عدم تحفظ کی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے۔ علاقائی علاحدگی پسندی کا رجحان کسی نہ کسی شکل میں ابھر رہا ہے سوال بے شمار ہیں اور جواب ——— ؟ ایک سلسلہ ہے بے اطمینانی کا، بے سکونی کا اور انتشار کی کوئی سمت نہیں ہے۔

اردو کے سلسلے میں جس مسئلے پر بھی بات کیجئے کوئی سرا ہاتھ نہیں آئے گا۔ بظاہر سب ہی مصروف ہیں، سب ہی اردو کے لئے کام کر رہے ہیں مگر نتائج ؟ ۔ زبان کا مسئلہ تو پیچیدہ ہے ہی، اردو کا تخلیقی ادب بھی انحطاط پذیر ہے۔ کوئی رسالہ یا کتاب اٹھا لیجئے معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ تخلیقی ادب کی سمت سفر کیا ہے ؟ ملک، قوم، مذہب، زبان، معاشرہ، فرد، جماعت اور پھر زندگی کی بے معنویت کے مقابل صرف اور صرف اپنے آپ کو قلم کار تصور کر کے ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا جو کہ عموماً ہو رہا ہے۔ اگر ہمارے پاس کہنے کے لئے کچھ ہے تو اس کے اظہار میں شدت کیوں نہیں ؟ ہمارا رسم الخط نئی نسل کے لئے غیر مانوس ہوتا جا رہا ہے اور ہم "ذاتی معیار" کے خود ساختہ قول میں خوش فہمی کی مصنوعی سانسوں پر جینے کو اپنی کامیابی تصور کر رہے ہیں۔

یہ تو سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ ادیب و شاعر اپنے عصر کا نباض ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنی تخلیقات سے ملک کو اپنے معاشرے کو اور اپنی قوم کے حالات کو بھی تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہاں سے چھوٹے چھوٹے نظریہ ساز قلم کار طرح طرح کی بے معنی بحثوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں کہ فن کار صرف فن کا ہوتا ہے، سماج سدھار نہیں ہاں ! سیاسی اصطلاحوں میں بٹ کر ادب تخلیق کرنے کو آپ کیا نام دیں گے ؟ یہ تمام مباحث آج کے تو نہیں ہیں لیکن کیا آج کا قلم کار اپنے بنیادی مسائل کو فن کارانہ روپ دے رہا ہے ؟ اظہار کا ذریعہ زبان ہی تو ہے، جب زبان ہی نہ رہ سکے گی تب ؟ حقائق و نتائج بہت تلخ ہیں، انھیں محسوس کرنے والے کہاں ہیں ؟ ہمارے تمام تر اعمال، احساس، فکر اور تلاش کی اجتماعی مرکزیت سے ٹوٹ کر ذاتی مفاد تک محدود ہو گئے ہیں۔ ہم اپنی زبان کو کلیجے سے لگائے ہوئے جہاں جہاں بھی اس زبان کے لئے مصروف کار ہیں، شاید یہ تصور کر رہے ہیں کہ "اردو زبان کا مستقبل روشن ہے"، شاید روشن مستقبل کے آثار یہی ہیں کہ زبان کا رسم الخط "اجنبی" ہوتا جائے ؟ سہ لسانی فارمولا ہر صوبے میں اس طرح نافذ ہوتا جائے کہ بے چاری اردو دم بھی نہ مار سکے۔ اردو پڑھنے اور بولنے والے یہ سوچتے رہ جائیں کہ اردو زبان ان کے معاشی مستقبل کی ضامن کیونکر ہو سکے گی ؟ تو کیا اردو کو "صرف ادبی زبان" ہی تصور کر لیا جائے ؟ سوال یہ ہے کہ "اردو ادب" کا بھی معیار کیا ہے۔ ؟ ممکن ہے کہ معیار کا سارا معاملہ زبان کے پیچیدہ مسئلوں میں کہیں گم ہو گیا ہو ؟ آپ کی ہماری کوئی پہچان ہے ؟ کوئی شناخت ہے ؟ کیا ہم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے اور حالات کے رحم و کرم پر جی رہے ہیں ؟ اگر ہمیں اپنی زبان عزیز ہے اور ہم واقعی فن کار ہیں تو پھر ہمیں اپنی فکری اور عملی سطح کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے آپ کو تبدیل کرنا ہوگا۔ طریقۂ کار کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا احتساب کرنا ہوگا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک لیکن اندر ہی اندر جو بحران پیدا ہو رہا ہے وہ اردو زبان و ادب کیلئے بے حد خطرناک ہے۔

دعوتِ انقلاب

"آگے بڑھو — یا وقت کی رفتار روک دو!"

تجھے ہے یاد نسخہ ظلمتِ عالم بدلنے کا
تو پھر کیوں منتظر بیٹھا ہے تو سورج نکلنے کا

کبھی تو گرمیِ خورشید سے بیتاب ہوتا ہے
بہانا ڈھونڈتا ہے راستے کی دھوپ ڈھلنے کا

کبھی تو تیرگی کے خوف سے آگے نہیں بڑھتا
یہ طفلانہ طریقہ ہے غرض تیرے مچلنے کا

تجھے یارانِ منزل شمعِ جادہ ہی بنا لیتے
مگر تجھ کو سلیقہ ہے نہ بجھنے کا نہ جلنے کا

خلافِ کامیابی ہے یہ تیری حیلہ فرمائی
بکھر جاتا ہے تو، جب وقت آتا ہے سنبھلنے کا

اسی تاریکیِ شب میں عمل کا نور پھیلا دے
صدا دے کارواں کو، آگیا ہنگام چلنے کا

ستاروں سے عیاں ہے جادۂ منزل کی بیداری
بھلا یہ کوئی موقع ہے کفِ افسوس ملنے کا

مثالِ ماہِ تاباں ضوفشاں ہو اور آگے بڑھ
مثالِ شمع کیوں خوگر ہے جل جل کر پگھلنے کا

گلِ خورشید جب شاخِ شجر پر نور پیرا ہو
وہی ہے وقت تیرے پھولنے کا اور پھلنے کا

قدم آگے بڑھا اور بے نیازِ صبح و شب ہو جا
خدا کو دے نہ الزام اپنی ہستی کے کچلنے کا

"خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو خود جس کو احساس اپنی حالت کے بدلنے کا"

بدل کر حال اپنا پھر ثبوتِ سعیِ کامل دے
اٹھا اپنی حسرتِ واماندہ کو پیغامِ منزل دے

علامہ سیماب اکبرآبادی

ساز و آہنگ (۱۹۴۱ء) کا ایک زریں ورق

ڈاکٹر سیّد حامد حسین

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

عبد القوی دسنوی

اقبال متین

ضیاء فتح آبادی

کمار پاشی

مخمور سعیدی

عطاء الحق قاسمی

صدیق عالم

اختر الایمان ـــــ مختلف النوع زندگی کے دو محفوظ لمحے

عکس تحریر مولانا حالی

قاضی محمد خلیل صاحب آنریری مجسٹریٹ اعظم ریلی کے نام

رباعی

در شکر عطیۂ جناب قاضی محمد خلیل صاحب دام بقاؤہم

ہر چند ز تیغ قحط خلقے ست قتیل
از بسکہ فلک بخاکیان گشتہ بخیل

ما را چہ غم از قحط کسے را کہ مدام
الوان نعم میرسد از خوان خلیل

رہین احسانات بندگان عالی
خاکسار الطاف حسین حالی

● یہ دونوں عکسی تحریریں ماہنامہ شاہکار (گورکھپور) کے جدید شاعری نمبر جولائی ۱۹۳۸ء سے لی گئی ہیں۔ مرتبہ حکیم عارف بلگرامی

عکس تحریر مرزا غالب رحمۃ اللہ علیہ

خان بہادر قاضی عبدالجمیل صاحب جنوں مرحوم رئیس اعظم بریلی کے نام

جناب قاضی صاحب کو سلام اور قصیدہ کی مبارکباد۔ اگر مجھ میں قوت ناطقہ
تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدہ کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت کی
مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔ بات یہ ہے کہ جو میں شایستہ مدح نہیں
تو یہ ستایش راجع آپ کی طرف ہوگی گویا یہ قصیدہ آپ کی
مدح میں ہے ۱۲

میں اب رنجور نہیں تندرست ہوں مگر بوڑھا ہوں جو کچھ طاقت قوت
باقی تھی وہ اس ابتلا میں زائل ہو گئی اب ایک جسم بے روح
متحرک ہے بیگ مردہ شخص بمردی بردوش اس مہینے یعنی
رجب سنہ ۱۲ [illegible] سے ستروان برس شروع اور استقام و آلام کا شروع
ہے لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ

نجات کا طالب غالب — سہ شنبہ ہفتم رجب و ہفتم جنوری

سید ضمیر جعفری

تجزیہ اپنے حوادث کا بھی اب ہوتا نہیں
دل بجھا جاتا ہے اور کوئی سبب ہوتا نہیں

ہم نے کب بخشا کسی ساعت کو سستانے کا اِذن
زندگی میں کام اتنا تھا کہ سب ہوتا نہیں

ہم کسی کے غم سے کچھ اس طرح دل منسوب ہیں
درد کیا معلوم کب ہوتا ہے کب ہوتا نہیں

ہدیۂ تسلیم جاں کب بادشاہوں کو بلا
جزیہ و جرمانہ دینے سے ادب ہوتا نہیں

زندگی تو کس گھنے جنگل میں لے آئی مجھے
صبح ہو جاتی ہے اور اتمامِ شب ہوتا نہیں

نطق کی لو بھی اگر اونچی تو ہم مجبور تھے
ماتمِ زنجیر تھا یہ زیرِ لب ہوتا نہیں

۱/۹ جی - ۱۳۲ ، اسلام آباد (پاکستان)

حسن نعیم

یہ سچ ہے شال پرانی ہے، پانو گندا ہے
مگر ضمیر سلامت ہے، عشق زندہ ہے

میں اڑ کے سات سمندر گیا تو مجھ پہ کھلا
مری اڑان ہی میرے گلے کا پھندہ ہے

کدھر سے آتے ہیں مضموں، کہاں سے نقد و سوال
مجھے بھی علم ہے کیا ناقدوں کا دھندا ہے

نئی غزل میں ہے نرمی و کیف ناصر کا
ادائے فکر و تحیر عطائے بندہ ہے

مری تلاش کی قیمت ہے ایک دانۂ جو
نعیم علم کا بازار اتنا مندا ہے

سی - ۳۹ - شالیمار - ایس۔ وی روڈ، فونیگ نگر، دھیسر (ایسٹ)
بمبئی - ۶۸

علّامہ سیّد سلیمان ندوی، دسنہ اور اہلِ دسنہ
کچھ تلاش کچھ تاثر

عبدالقوی دسنوی ● صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج۔ بھوپال۔۱

جیرائین ندی کے کنارے کسی زمانے میں دو چھوٹی چھوٹی بستیاں، اکبرپور اور کلیان پور آباد تھیں۔ آبادیوں کے اضافہ، ربط وضبط کی مضبوطی اور رشتے ناطے کے اثر و تاثیر نے ان دونوں چھوٹی چھوٹی بستیوں کو ایک دوسرے میں ضم کر کے ایک بڑی بستی "دسنہ" کی شکل میں پیش کیا۔ جہاں عہدِ اکبری میں مشہد کا ایک مختصر قافلہ میر حسن جیسے دین دار بزرگ کے ساتھ آ کر آباد ہوا جن کے دو صاحب زادے سید صدرالدین اور سید جان محمد تھے۔ سید میر حسن کو اکبری فتنہ " دین الٰہی " میں شہادت نصیب ہوئی۔ ان کے بیٹوں نے دسنہ میں سکونت اختیار کی، آگے چل کر اسی خاندان کے ایک فرد حکیم ابوالحسن کے یہاں ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کی پیدائش ہوئی۔ نام ابو نجیب رکھا گیا تھا لیکن منجھلے چچا کے دیئے ہوئے نام "سلیمان" سے مشہور ہوئے۔ یہ نام اس قدر مبارک ثابت ہوا کہ سید سلیمان ندوی نے علّامہ سید سلیمان ندوی کے نام سے شہرت پائی اور ایک دن وہ آیا کہ علّامہ اقبال نے ان کے متعلق یہ فیصلہ سنایا:

> " آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنّف ہی نہیں رئیس المصنّفین ہیں۔ ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں " لہ

امیر العلماء بننے میں جہاں سید صاحب کی زندگی میں ندوہ کا ماحول، اس کی تعلیم، اس کے اساتذہ کی صحبت اور علامہ شبلی نعمانی کی تعلیم اور تربیت کے ساتھ ان کی خاص توجہ، اہمیت رکھتی ہے، ان کی جائے پیدائش یعنی دسنہ کی علمی فضا، اس کا دینی رنگ، اس کا مذہبی مزاج، بزرگوں اور اہلِ خاندان کے صوفیانہ اور درویشانہ خیالات اور ان کی علم و ادب سے رغبت اور تعلق کی بڑی اہمیت ہے۔

چنانچہ ان کی گھریلو تعلیم اور مکتبی زندگی نے بہت جلد انھیں اس راستہ پر لگا دیا جو آگے چل کر امیر العلماء کی منزل پا لیتا ہے۔ والد صاحب مولانا ابوالحسن کی دیکھ ریکھ اور تربیت، بڑے بھائی مولوی ابو حبیب کی نگہداشت اور تعلیم اور مولوی مقصود علی صاحب کی درس و تدریس نے سید صاحب کی ابتدائی زندگی میں علمی آبیاری خوب خوب کی۔

خود دسنہ کا ماحول ان کے لئے مفید ثابت ہوا، یہ گاؤں بہار شریف سے آٹھ میل مشرق میں آباد ہے، اس کے قریب استھانواں اور گیلانی جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بستیاں آباد ہیں دسنہ، استھانواں اور گیلانی تینوں بستیاں سرسید تحریک سے متاثر تھیں تینوں کے ایک دوسرے پر نہایت اچھے اثرات پڑے۔ اور تینوں ایک دوسرے کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئیں۔ ان کے رہنے والوں میں آپس میں رشتہ داریاں تھیں جس نے ایک دوسرے کی معاونت کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ جس کی وجہ سے ان گاؤں کے رہنے والوں نے ایک دوسرے سے اور زیادہ اثرات قبول کئے۔ یہ بستیاں، نالندہ، جس کی بڑی اہم تاریخی حیثیت ہے سے بھی قریب ہیں اس لئے ان کے باشندوں پر اس کے اثرات پڑے ہوں گے۔

ماضی میں دسنہ کے بعض حصّے کی کھدائی کے دوران پرانی اینٹیں اور تراشے ہوئے پتھر اس طرح کے ملے تھے جن سے پتا چلتا ہے کہ گوتم بودھ

لہ اقبال اور سید سلیمان ندوی: طاہر تونسوی ص ۱۹

اور جینی کی تعلیمات نے بھی اس علاقہ کو ایک زمانہ میں متاثر کر رکھا تھا۔ ان بزرگوں کے خیالات اور عبادات کے اثرات اور نالندہ یونیورسٹی کی قربت نے پہلے ہی سے اس سرزمین کا ایک مزاج بنانے میں مدد کی ہوگی۔

ایسے علاقہ کی ایسی سرزمین جو مذہبی، دینی، تعلیمی، معاشرتی زندگی میں اپنا منفرد مزاج اور نمایاں کردار رکھتی تھی، اس کے پرسکون، خاموش، اور روحانی ماحول میں سید صاحب کی ابتدائی زندگی پروان چڑھی۔ انھوں نے دسنہ ہی میں اپنی ابتدائی تعلیم خلیفہ انور علی اور مولوی مقصود علی سے پائی۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں انھیں حضرات نے پڑھائیں۔ ابتدائی تعلیم کی منزلیں طے کرنے میں ان کے تیسرے استاد کی شکل میں ان کے بڑے بھائی سید ابو حبیب صاحب جو عمر میں سید صاحب سے تقریباً اٹھارہ سال بڑے تھے اور عربی فارسی میں بڑی اچھی صلاحیت رکھنے کے علاوہ اچھے طبیب اور عالم با عمل بھی تھے اور شاہ ابو احمد مجددی بھوپالی کے خلیفہ تھے۔ انھوں نے سید صاحب کی تعلیمی زندگی سنبھالی اور نہ صرف عربی میں میزان و منشعب پڑھائیں بلکہ ان کی ذہنی تربیت بھی کی، وہ مذہبی معاملات میں بھی نہ صرف بڑی اچھی نظر رکھتے تھے بلکہ ان پر عمل پیرا بھی رہتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے گاؤں کی مسلمان خواتین میں اصلاح کا کام شروع کر رکھا تھا۔ چنانچہ ہفتہ میں ایک دن وہ وعظ کیا کرتے تھے۔ طریقہ اس کا یہ ہوتا تھا کہ سید صاحب بیبیوں میں بیٹھ کر مولانا اسمٰعیل شہید کی مشہور تصنیف تقویۃ الایمان پڑھتے اور مولانا حبیب صاحب پردے کے پیچھے سے اس کے معنی و مطالب بتاتے اور اسلوب وہ اختیار کرتے کہ گاؤں کی بیبیوں کے ذہن و دماغ میں صحیح اسلام اتر جائے، چنانچہ اس کا خاصا اثر دسنہ کی عورتوں پر پڑنے لگا اور اس کے ساتھ ہی خود سید صاحب کے دل و دماغ بھی متاثر ہونے لگے وہ بھی کم سنی سے نہ صرف اسلام کی صحیح تعلیم سے آگاہ ہونے لگے بلکہ اسلام سے انھیں گہری دلچسپی بھی پیدا ہونے لگی چنانچہ انھوں نے اپنے مضمون "میری محسن کتابیں" میں تحریر کیا ہے:

"یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں، کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہید کی تلقین بہر حال اپنی جگہ پر قائم رہی" [۵۱]

غلام محمد صاحب بیان کرتے ہیں:

"خود حضرت فرماتے تھے کہ لڑکپن میں میں نے اپنے بڑے بھائی صاحب کے حسب ہدایت کچھ ذکر اور مراقبات بھی کئے اور ان کے حلقہ توجہ میں بیٹھا کرتا تھا، اور ان کے فیض صحبت سے اپنے اندر یا کی محسوس کرتا تھا، لیکن یہ باطنی پہلو اس دور میں کچھ اجاگر نہ ہو سکا کیونکہ اس وقت حصول علم مقدم تھا"۔ [۵۲]

دسنہ کے بعد سید صاحب نے اپنے والد مولانا سید ابوالحسن سے اسلام پور میں تعلیم حاصل کی پھر پھلواری شریف گئے اور خانقاہ مجیبی میں رہ کر خانقاہ پھلواری کے سجادہ نشین مولانا محی الدین سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ یہیں انھوں نے پہلی بار عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول "منصور و موہنا" کا مطالعہ کیا اور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ یہاں چونکہ شعر و شاعری کی بھی عام فضا تھی اس لئے سید صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پھلواری شریف سے چند ماہ کے لئے دربھنگہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے۔ پھر ندوہ میں قیام کیا جہاں سے گوہر درخشندہ بن کے چمکے اور ایک دنیا کو منور و متاثر کیا اور اپنا گرویدہ بنایا، اور علمی، دینی، تعلیمی، تاریخی اور اسلامی دنیا میں اپنے لئے ایک منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور شہرت و عزت کی اس بلند ترین منزل پر پہنچے جہاں عام حالات میں رسائی آسان بات نہیں۔

لیکن وہ اپنی کامیابی اور کامرانی کی کسی منزل پر اپنے ہم وطنوں، بزرگوں، دوستوں، رشتہ داروں اپنے ہم عمر عزیزوں اپنے ہم درس

---

۵۱ مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں مرتبہ محمد عمران خان ندوی ص ۸

۵۲ معارف سلیمان نمبر ص ۲۸۵

ساتھیوں کو نہیں بھولے بلکہ ان سے اچھے تعلقات قائم کئے رہے۔ اپنے وطن دسنہ کو بھی وہ بے حد عزیز رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے زندگی کے آخری ایام وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ کوشاں بھی رہے۔

اپنے وطن دسنہ میں انھیں اپنی زندگی کے ابتدائی چودہ پندرہ سال مسلسل گزارنے کا موقعہ ملا، جہاں ابتدائی عمر میں بچپن کے کھیلوں میں ایک کھیل بچوں کے علاج کا کھیلا کرتے تھے۔ مولانا ابوظفر ندوی لکھتے ہیں :

"علامہ صغر سنی میں ایک کھیل اور بھی کھیلا کرتے تھے، آپ کے والد، دادا، بھائی، بلکہ خاندان کے بیشتر بزرگوں کا پیشہ طبابت تھا۔ اس لئے گھر میں علاج و معالجہ کا چرچا ہر وقت رہتا تھا، اس کی نقل میں کبھی کبھی مختلف قسم کے شیشوں میں پانی بھر کر بچوں کا علاج کرتے تھے ان کی بڑی ہمشیرہ جب پوچھتیں کہ یہ کیا کرتے ہو تو کہتے کہ بیماروں کا علاج کرتا ہوں، لوگ کہتے کہ یہ لڑکا آگے چل کر بڑا طبیب ہوگا لیکن باوجود ان کے والد کی دلی تمنا کے یہ پیشین گوئی پوری نہ ہوئی" [۱]

چار پانچ سال کی عمر میں بسم اللہ ہوئی۔ غالباً پہلے استاد خلیفہ انور علی تھے، اس کے بعد مکتبی زندگی شروع ہوئی جہاں مولوی مقصود علی اوکھدوی تعلیم دیتے تھے۔ سید صاحب کے اس مکتب کے ساتھی مولوی سید محمد حنیف کا بیان مولانا مناظر حسن گیلانی نے اس طرح تحریر کیا ہے :

" مولوی سید محمد حنیف کا بیان ہے کہ سید صاحب سے تین چار سال عمر میں اگرچہ وہ بڑے تھے لیکن مکتب خانے میں ابجد سے فارسی کی عام درسی کتابیں گلستاں، بوستاں وغیرہ تک دونوں نے سالہا سال تک ایک ہی استاد سے ایک ہی مکتب خانہ دسنہ ہی میں سید صاحب کے گھر پر قائم تھا، دسنہ ہی کے نواح میں اوکھدوی نامی بستی کے ایک معلم جن کا نام مولوی مقصود تھا ان ہی کا تقرر بچوں کو پڑھانے کے لئے سید الملت کے والد ماجد مولوی حکیم ابوالحسن صاحب مرحوم نے کیا تھا علاوہ کھانا، ناشتہ پان حقہ وغیرہ کے سید صاحب کے گھر سے مولوی مقصود صاحب کو دو پیسے ماہوار ملتے تھے اور جاڑوں کے موسم میں سید صاحب کے والد ماجد جب اسلام پور سے وطن دسنہ میں تشریف لاتے تو مولوی مقصود صاحب کے لئے روئی کا ایک (دگلا) روئی بھرا ہوا پائجامہ روئی کا کنٹوپ التزاماً ساتھ لاتے۔ گویا سرمائی لباس بھی تنخواہ کا ایک جزء تھا۔

— — — — — — — — — — —

.... کہتے ہیں کہ ایام طفلی ہی سے فطرتاً سید صاحب کچھ خاموش رہنے کے عادی تھے، بچوں کی عام شرارتوں سے ان کی طبیعت کو جبلتاً کسی قسم کی مناسبت نہیں تھی، اسی لئے شرارت وغیرہ کے قصوں میں مولوی سید محمد حنیف کا بیان ہے، سید الملت تنبیہہ کے بہت کم محتاج تھے" [۲]

مکتبی تعلیم کا سلسلہ کب تک قائم رہا اس کا علم نہیں لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان مکتبوں میں سید صاحب کی بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھی تربیت بھی ہوئی جس کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں بھی ابھریں۔ انھیں مکتبوں میں انھوں نے بیت بازی میں حصہ لینا شروع کیا۔ مولانا ابوظفر ندوی صاحب بیان کرتے ہیں :

" علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں بھی دو پارٹیاں تھیں، جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور ان کے مشیر خاص مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی تھے اور دوسری کے مولوی محمد قاسم صاحب۔ یہ دونوں آج بھی بقید حیات ہیں، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہوگیا اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہوگئے۔ خاکسار بھی باوجود کم سنی کے ان جلسوں میں عموماً شریک رہتا تھا" [۳]

مولانا محمد قاسم کے نام سید صاحب کا دارالمصنفین سے لکھا ایک بے تکلف خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے :

اللہ رے ناز حسن کہ بولیں بھی وہ تو یوں ‏ ‏ ‏ ‏ ہاں وہ کہاں ہے در پہ جو میرے پڑا رہا،

---

[۱] بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات : ابوظفر ندوی : سلیمان نمبر : معارف مئی ۱۹۵۵ء ص ۴۹

[۲] سید الملت کی مکتبی زندگی : مناظر حسن گیلانی : سید سلیمان ندوی نمبر : ریاض کراچی مارچ ۱۹۵۴ء ص ۲۰

[۳] بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات : ابوظفر ندوی : سلیمان نمبر : معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۵۵ء ص ۴۹

بھولے دوست ! جسے میں کبھی نہ یاد آؤں، آپ کو دار المصنفین کا خیال آیا تو غیر سے استفسار کی کیا حاجت تھی شاید وہ سزاوارِ خطاب نہ تھا!" [51]

سیّد صاحب کے انتقال کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نے سیّد صاحب کے ان کے نام پچاس ساٹھ خط ایسے دیئے تھے جن میں بیشتر بہت کم سنی کے زمانے کے لکھے ہوئے تھے یہ تمام خطوط میں نے جناب صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے تھے تاکہ دار المصنّفین میں محفوظ ہو جائیں۔

سیّد صاحب کے بچپن کے ساتھیوں میں محمد حنیف صاحب نے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اختتام تعلیم کے بعد مختاری شروع کر دی تھی بعد میں اس پیشہ سے بے تعلق ہو کر گیلانی میں بس گئے۔ وہ ہمیشہ اپنے مزاج کی سادگی کی وجہ سے کھدر پہنا کرتے تھے اور نسوار کے استعمال کا بھی شوق رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ سیّد صاحب کا گیلانی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیّد صاحب شہرت اور عزت کی بلند ترین منزل پر پہنچ چکے تھے انھیں وہاں پہنچ کر سیّد محمد حنیف صاحب کی یاد آئی چنانچہ انھوں نے لوگوں سے دریافت کیا :

"میرے پرانے ساتھی اور بھائی کھدر اوڑھ الناس کہاں ہیں،، [52]

چنانچہ ان کو تلاش کر کے لایا گیا تو سیّد صاحب ان سے نہایت بے تکلفی، اخلاص اور اخلاق سے ملے۔

۱۹۴۹ء میں جب سیّد صاحب حج کے لئے گئے تو اتفاق سے سیّد محمد حنیف صاحب بھی حج کے لئے مکّہ معظمہ گئے ہوئے تھے، جہاں وہ بیمار پڑ گئے، سیّد صاحب کو جب اس کی اطلاع ملی کہ حنیف صاحب حج کے لئے آئے ہوئے ہیں اور بیمار ہیں تو دیکھنے آئے اور ان سے تسلّی و تشفّی کی باتیں دیر تک کیں، جس کا حنیف صاحب کو بڑا احساس رہا، چنانچہ صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں۔

"سیّد محمد حنیف صاحب اس واقعہ کو جب یاد کرتے ہیں تو یہ کہہ کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں کہ کہاں میں ایک لاابالی آدمی جو کس مپرسی میں پڑا ہوا تھا اور کہاں سیّد صاحب کی ذاتِ والا قدر جن کی تعظیم کے لئے حکومت سعودی کے بڑے بڑے حکام سروقد کھڑے ہو جاتے تھے وہ میری عیادت کے لئے آتے اور تسلّی و تشفّی سے سرفراز کرتے رہے"۔ [53]

سیّد صاحب کے مکتب کے ساتھیوں میں مولانا سیّد نجم الہدیٰ کا نام بھی اہم ہے۔ ذکر آچکا ہے کہ مکتبی زندگی کی بیت بازی کے مقابلہ میں وہ سیّد صاحب کی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے، پھلواری شریف کے مدرسہ میں بھی وہ سیّد صاحب کے ساتھ پڑھتے تھے ایک واقعہ اس طرح کا بیان کرتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی سیّد صاحب میں صبر و ضبط اور عفو و درگذر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا :

"ان کے مزاج میں شروع ہی سے تحمّل، بردباری اور عفو و درگذر کا مادہ تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا، پھلواری شریف کے مدرسہ میں جہان آباد ضلع گیا کا ایک لڑکا پڑھتا تھا۔ ۱۲ ربیع الاوّل کے عرس کے موقع پر اس نے دھوکا دے کر ہم دونوں سے کچھ نقد وصول کر لیا اس کے بعد سیّد صاحب سے اس کی ملاقات ہوئی تو نادم ہونے کے بجائے ان سے لڑنے لگا میں بھی اتفاق سے وہاں پہنچ گیا۔ سیّد صاحب جیسے جیسے نرم ہوتے جاتے ویسے ہی وہ گرم ہوتا جاتا میں نے اس کو سختی سے جواب دیا وہ کچھ ہاتھا پائی پر اتر آیا اور میں مغلوب ہو گیا۔ سیّد صاحب کھڑے تماشہ دیکھتے رہے اور انھوں نے میری کوئی مدد نہیں کی، جب وہ لڑکا چلا گیا تو میں ان سے بہت برہم ہوا کہ تمہاری خاطر تو میں لڑ تا رہا اور تم نے کوئی مدد نہیں کی۔ جب میں زیادہ بگڑا تو بولے میں نے تم سے کب کہا تھا کہ تم میری مدد کے لئے اس سے جھگڑا کرو، وہ خود ہی بولتے بولتے خاموش ہو جاتا اور اس کی نوبت ہی نہیں آتی"۔ [54]

سیّد ابوالکمال عبد الحکیم رشتہ کے چچا تھے، عمر میں سیّد صاحب سے چند سال بڑے تھے لیکن دونوں کی ایک دوسرے کے لئے محبت بے مثال تھی۔ اہلِ وطن میں جن لوگوں کو سیّد صاحب نے خطوط لکھے ہیں ان میں شاید سب سے زیادہ خطوط انھیں کے نام ہیں۔ یہ خطوط اس لحاظ سے بھی نہایت اہم ہیں کہ

---

۵۱ بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات : ابو ظفر ندوی، سلیمان نمبر معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۵۵ء ص ۴۹

۵۲ اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے : سیّد صباح الدین عبد الرحمٰن : سلیمان نمبر معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۵۵ء ص ۶۳

۵۳ اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے : سیّد صباح الدین عبد الرحمٰن : سلیمان نمبر معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۵۵ء ص ۶۳

۵۴ سیّد صاحب کی یاد میں : سیّد نجم الہدیٰ ندوی : معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۵۹ء ـــــــــ ص ۳۴۷

ان کے مطالعہ سے سید صاحب کی علمی ادبی، سیاسی، تصنیفی اور صحافتی زندگی کے بعض ایسے اہم پہلوؤں سے بھی واقفیت ہوتی ہے، جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ سید صاحب کے خطوط کا ایک اہم مجموعہ "برید فرنگ" ہے جو انھوں نے ۱۹۲۰ء میں یورپ سے ہندوستان میں بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کے نام لکھا اور جن میں انھوں نے اس وقت کے یورپ اور دنیائے اسلام کے سیاسی و اجتماعی حالات لکھے اور سیاسی تبصرے کئے ہیں اور دنیائے اسلام کے اکابر رجال کی ملاقاتوں کا حال بیان کیا ہے۔

اس مجموعہ میں سید عبدالحکیم رحمانی صاحب کے نام کئی اہم خطوط ہیں ابتدا میں سید صاحب نے ان کے متعلق تحریر کیا ہے:

"مولوی سید ابوالکمال عبدالحکیم صاحب دسنوی میرے رشتہ میں چچا ہیں اور جنھوں نے میرے کاموں سے ہمیشہ گہری دلچسپی رکھی اور میری تحریر کے ایک ایک رقعہ اور پرزہ کو محفوظ رکھا ہے"۔[1]

معارف کے کئی شماروں میں سید صاحب کے خطوط بنام سید عبدالحکیم رحمانی شائع ہوئے ہیں ان میں سے اکثر ایسے خطوط ہیں جن سے "حیاتِ سلیمان" کی ترتیب میں مدد ملی ہے۔

پروفیسر ابوظفر ندوی صاحب مولوی ابوحبیب کے بیٹے اور سید صاحب کے بھتیجے تھے ان کے نام بھی "برید فرنگ" میں سید صاحب کے کئی خطوط شامل ہیں جو بلاشبہ اہم ہیں۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے سید صاحب نے تحریر کیا ہے۔

"مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی، میرے حقیقی بھتیجے، جن کو لوگ بحیثیت مورخ اور مصنف کے اچھی طرح جانتے ہیں"۔

انھوں نے ۱۹۲۳ء سے چند سال دارالمصنفین میں رفیق کی حیثیت سے بھی کام کیا اور تصنیف و تالیف کے میدان میں سید صاحب سے رہنمائی حاصل کی۔

دارالمصنفین کے قیام کے بعد سید صاحب نے مولانا ابوظفر ندوی کے علاوہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبان کو دارالمصنفین میں بحیثیت رفیق کام کرنے کا موقع فراہم کیا اور ان کی تربیت کی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی غالباً ۱۹۲۴ء میں دارالمصنفین سے متعلق ہوئے اور چھ سال وہاں قیام کیا۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے پہلے گجرات کالج میں بحیثیت استاد کام کیا پھر اسماعیل یوسف کالج بمبئی میں اردو کے استاد مقرر ہوئے ان کی مشہور تصنیف "مقدمہ رقعات عالمگیر" قیام دارالمصنفین کی دین ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو بھی ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے ۱۹۳۵ء سید صاحب دارالمصنفین لے گئے تھے، جہاں وہ پہلے رفیق کی حیثیت سے اور اب سالہاسال سے ناظم کی حیثیت سے علمی، ادبی اور مذہبی خدمات میں مصروف ہیں۔ اس دوران میں ان کی کئی اہم تصانیف دارالمصنفین سے شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اسی دوران صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے سید صاحب کی اہم تصنیف "خواتینِ اسلام کی بہادری" کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔

میرے والد محترم پروفیسر سید سعید رضا صاحب کو سینٹ زیویرس کالج بمبئی تک لے جانے میں سید صاحب ہی کا ہاتھ تھا۔ وہ والد صاحب کے لئے بہت پہلے سے فکر مند تھے چنانچہ ۱۱ر جنوری ۱۹۱۴ء کے مکتوب بنام عبدالحکیم رحمانی صاحب سے ان کی فکرمندی کا شدت سے احساس ہوتا ہے انھوں نے لکھا تھا:

"سعید رضا کے لئے اس صوبہ میں پروفیسر عبدالقادر کی معرفت کوشش کرتا ہوں"۔[2]

سعید الحق عاشق کا اپنے طالب علمی کے زمانہ میں دسنہ کے نہایت ذہین طلبہ میں شمار ہوتا تھا وہ میٹرک سے لے کر ایم اے کے امتحانات میں ہمیشہ نمایاں طور سے کامیاب ہوئے اور نیک نام ہوئے۔ انگریزی کی استعداد ان کی نہایت اچھی تھی چنانچہ ابھی ان کی عمر انیس سال کی تھی کہ سید صاحب انھیں دارالمصنفین لے گئے جہاں بیٹھ کر انھوں نے سید صاحب کی مشہور کتاب خطبات مدراس کا انگریزی ترجمہ LIYING PROPHET کے نام سے کیا۔

---

[1] برید فرنگ: سید سلیمان ندوی ص ۱۴

[2] حیاتِ سلیمان: شاہ معین الدین احمد ص ۶۵

انجمن الاصلاح دسنہ سے سید صاحب کو بہت زیادہ لگاؤ تھا، وہ اس زمانہ میں بھی اس انجمن کو مضبوط کرنے میں معروف رہے۔ اس انجمن نے بھی سید صاحب کی صلاحیتوں کو خوب سے خوب تر بنانا کروش کرنے میں مدد کی۔ انجمن کے مختلف جلسوں میں انھوں نے مضامین پڑھے۔ "عورتوں کی تعلیم" "آخر وقت" اور "مذہب" جیسے مضامین انھیں جلسوں کی دین ہیں۔ بعض جلسوں کے لئے نظمیں لکھیں جن میں نہایت جذباتی اسلوب اختیار کیا۔

ایک ترکیب بند ۸/اکتوبر ۱۹۰۴ء کو انجمن الاصلاح دسنہ کے سالانہ جلسہ میں سنایا جس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ کیجئے:

بزم کیا خوب ہے، باشان ہے جلسہ کیسا	ولولے کیسے ہیں، ہے جوش تمنا کیسا،
جمگھٹے کیسے ہیں، کیا دھوم ہے محفل کیسی	فرطِ شادی سے ہے ان ہونٹوں کا ہنسنا کیسا
- - - - - - - -	- - - - - - - -
کیوں ہے یہ شان یہ شوکت یہ ہجوم خلقت	دوستو! کچھ تو بتا دو ہے تماشا کیسا
آئیے آئیے احباب سے پردہ کیا ہے	اور بزرگوں سے بھلا راز چھپانا کیسا
- - - - - - - -	- - - - - - - -
جس طرح بُو ورقِ غنچۂ گلشن میں ہے	رکھئے سینے میں یونہی اپنے وطن کی الفت
پھر تو دریائے جہالت سے کنارے ہوکر	تم بھی چمکوگے کسی روز ستارے ہوکر ۵۱

اسی جلسہ میں سید صاحب نے "مذہب" سے متعلق مضمون پڑھا تھا۔

سید صاحب کا ایک دوسرا ترکیب بند دستیاب ہوا ہے جو انھوں نے کتب خانہ الاصلاح دسنہ کے کسی جلسہ میں پڑھا تھا، ابتدائی دو شعر ملاحظہ کیجئے:

اے بزرگو! دوستو! پھر باغ میں آئی بہار	پھر رہی ہیں چہچہے اور پھر وہی صورت ہزار
پھر ہوا آزاد مجنوں توڑ کر زنجیر پا	نوک کی لیتا ہے پھر تلوؤں سے دشتِ خار دار

ایک عزیز کے انتقال پر سید صاحب کا لکھا ہوا ایک شخصی مرثیہ" آہ اے سید صغیر الحق" بھی ملتا ہے جس میں انھوں نے زندگی کو اس طرح دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

چونک بھی او مستِ خوابِ زندگی	ہے لب بام آفتابِ زندگی
چشمکِ برقِ اضطرابِ زندگی	لے اڑی آندھی سحابِ زندگی
ایسے گرداب بلا میں اے خدا	تا بہ کے آخر حبابِ زندگی

زندگی اک رشتۂ کمزور ہے

ایک دن پھر موت ہے پھر گور ہے

سید صاحب کی پہلی شادی ان کی چچا زاد بہن سے ہوئی تھی جن کا انتقال ۱۲/اپریل ۱۹۱۷ء کو ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ رنجیدہ خاطر ہوئے تھے۔ انھوں نے معارف کے شذرات میں اپنے مجروح جذبات اور غمناک احساسات کا کچھ اس طرح اظہار کیا تھا:

"آخر خدا کی مرضی پوری ہوئی، دو ماہ شدید علالت کے بعد میری رفیقۂ زندگی نے ۲۷ سال کی عمر میں اس عالم ارواح کو الوداع کہا۔ استاد مرحوم کی وفات کے بعد دوسرا سانحہ ہے جس نے میرے سکونِ خاطر کو درہم کر دیا.... اس پیکر وفا نے اپنی جان دے کر مجھے علم و ملت کی خدمت گزاری کے لئے کشاکش غم پنہاں سے فرصت عطا کی، لیکن ایک ایسا کانٹا دل میں چبھو کر رہ گیا جو شاید عمر بھر نہ نکلے:

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا	عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ	تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

---

۵۱ پنچ پٹنہ ۲۶ نومبر ۱۹۰۴ء

۵۲ پنچ پٹنہ ۴ فروری ۱۹۰۵ء

گوشِ محرومِ پیامِ چشمِ محرومِ جمال　　ایک دل تس پہ یہ ناامیدواری ہائے ہائے [۱]

اور ایک غمناک مرثیہ "مرگِ یار" قلم بند کیا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے، درد و غم کی تصویر ہیں:

ہم سفر وادیٔ ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا　　شمع اس راہ میں اس کا رخِ انور نہ ہوا

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

درد اٹھ اٹھ کے مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے　　کیوں رگِ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا

یہ تماشائے جہاں خواب ہے میں مانتا ہوں　　پر یہ کیوں خواب مرے واسطے شب بھر نہ ہوا

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

تیرے جانے پہ گمان تھا کہ ہو محشر برپا　　تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا!

اس مرثیہ نے بہتوں کو متاثر کیا، اکبر الٰہ آبادی نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۲ رمئی ۱۹۱۷ء کو اپنے اس طرح کے تاثرات کا اظہار کیا ہے:

آپ کے اشعار نے میرے دل و دماغ ہرے کر دیئے، ہرے تو رہتے ہی ہیں، یہ کہیئے لہولہان کر دیئے جوش غم نے آپ سے ایسے مصرعے لکھوائے:

؎ شمع اس راہ میں اس کا رخِ انور نہ ہوا

؎ تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا!

سید صاحب کے مندرجہ بالا کلام کے علاوہ جن کا تعلق دسنہ سے کسی نہ کسی طرح ہے مندرجہ ذیل چار ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جو دسنہ ہی میں کہی گئی ہیں۔

اے خوشا جذبِ محبت اے خوشا تاثیرِ عشق　　گاہے گاہے ان کو میری یاد آنے لگی

[۲۵ رمئی ۱۹۴۲ء دسنہ]

اُدھر کہتا گیا وہ اور اِدھر آتا گیا دل میں　　اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوائے باطل میں

[۱۱ رجولائی ۱۹۴۲ء دسنہ]

اس فقر میں بھی عاشق کیا صاحبِ ثروت ہے　　ایک ذرہ محبت کا کونین کی دولت ہے

[۲۰ راگست ۱۹۴۲ء دسنہ]

تری قدرت وہ کر سکتی ہے جو تیری مشیت ہے　　مگر تیری مشیت آپ ہی پابند حکمت ہے

[۱۹۴۳ء دسنہ]

شعر و شاعری کے علاوہ دوسرے علمی ادبی کام بھی سید صاحب دسنہ میں رہ کر انجام دیتے رہے تھے، اگر ان کی جستجو کی جائے تو ایسے کاموں کی ایک فہرست تیار ہو جائے گی جس سے یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ اہل علم کے لئے جگہ کی قید نہیں ہوتی وہ جہاں رہتے ہیں علم و ادب کی خدمت میں معروف رہتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں جب خطباتِ مدراس کی اشاعت کی نوبت آئی تو سید صاحب نے اس کا دیباچہ دسنہ ہی میں لکھا۔

دسنہ میں رہ کر وہ کتب خانہ الاصلاح کی کتابوں اور قلمی نسخوں کا بھی مطالعہ کرتے رہتے تھے، چنانچہ انھوں نے بعض قلمی نسخوں کے حوالے بھی اپنے مقالوں میں دیئے ہیں۔

اپنے مضمون "ہندوستان میں ہندوستانی" میں جو انھوں نے ۱۹۳۳ء میں اردو کے معلّیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا تھا لکھتے ہیں:

"ہمارے وطن (دسنہ ضلع پٹنہ) میں اردو کا ایک کتب خانہ ہے اس میں چند پریشان اوراق کا ایک پرانا مجموعہ ہے جس میں کسی صاحب نے حضرت بابا فرید کے کچھ فارسی اقوال لکھے ہیں اور ساتھ ہی ذیل کی ایک غزل بھی ہے:

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے　　خیز دراں وقت کہ برکات ہے

---

[۱] یادِ رفتگاں: سید سلیمان ندوی: ص ۳۲/۳۱

نفس میادا کہ بگوید ترا — خشپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
بادمِ خود ہمدم و ہشیار باش — صحبتِ اغیار بوری بات ہے
باتن تنہا چہ روی زیں زمیں — نیک عمل کن کہ وہی مہات ہے
پندِ شکر گنج بدل و جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

اس نظم کو اردو کے ایک مشہور مؤلف نے حضرت شکر گنج کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ میرے خیال میں یہ حضرت کے فارسی اقوال کے جامع کی نظم ہے نہ کہ خود حضرت کی نظم ہے، اخیر شعر میں شکر گنج کے توصیفی لقب کو تخلص سمجھنا تعجب انگیز ہے۔ ظاہر ہے کہ خود حضرت اپنے آپ کو شکر گنج نہیں کہتے تھے لے

اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں ۔

ہمارے وطن (دسنہ ضلع پٹنہ) کے کتب خانہ الاصلاح میں ایک فالنامہ کے دو صفحے پرانے کاغذ کے ہیں، جن میں اسی زبان میں مختلف اعداد کے جوابات بتائے گئے ہیں اور اس کے سرنامہ پر اس فالنامہ کی نسبت حضرت مخدوم کی طرف کی گئی ہے، اس میں کل ستائیس فقرے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۱۱ — جو من کی منسی کیا ہوئی سو ہوئی
۱۱۳ — ناہیں کچھ کرد نصیب لاگی بات ہے
۱۳۱ — ایہیں، ابھیں ناہیں،
۳۱۱ — ابھیں ناہیں، سوت رہو جائے،
۳۳۱ — راج پاٹ اچل کے دیا تمکوں
۳۳۳ — آگے برے دن گئے اب سکھ پاوہ گے
۳۳۲ — ابھیں ناہیں آگو ہو پکا۔ ؎ ۲

اپریل ۱۹۲۹ء میں کتب خانہ الاصلاح ہی میں ایک مضمون "کلیات عشق" تحریر کیا۔ "عطر سخن" بھی دسنہ ہی کی یادگار ہے۔ یہ دونوں مضامین "نقوش سلیمانی" میں دوبارہ شائع کر دیئے گئے ہیں ۔

سید صاحب کی مشہور کتاب" خیام" ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی ہے جس میں کتب خانہ الاصلاح کے" نسخہ جدیدہ رباعیات عمر خیام" سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ اس کتاب کے آخر میں اس سرورق کے ساتھ اسے الگ سے شائع کر دیا گیا ہے ۔

"نسخہ جدیدہ رباعیات کہ اصلش در ۹۱۱ھ بخطِ کاتبِ شہیر سلطان علی الکاتب المتوفی ۹۱۹ھ استنساخ یافت، واکنو در کتب خانہ الاصلاح دسنہ ضلع پٹنہ موجود راست، بہ سعی و تصحیح سید سلیمان ندوی در مطبع معارف اعظم گڑھ بطبع شد، ۱۳۵۱ھ

سید صاحب کو جو دسنہ سے لگاؤ تھا اور لازوال محبت تھی اسی وجہ سے وہ کوشش کرتے تھے کہ تعطیلات میں نہ صرف دسنہ ہی میں موجود رہیں بلکہ علمی ادبی کاموں میں خود بھی مصروف رہیں اور انجمن الاصلاح کے جلسوں میں شریک ہو کر اہلِ دسنہ اور نوجوانانِ دسنہ میں علمی و ادبی جذبہ بیدار کرتے رہیں اور رہنما کے فرائض انجام دیتے رہیں۔ ان کے دسنہ میں رہنے کی وجہ سے بڑی چہل پہل رہتی تھی ہندوستان کے مشہور و معروف اہل علم برابر دسنہ آتے رہتے تھے اور سید صاحب ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے رہتے تھے۔ مولانا مسعود عالم بیان کرتے ہیں :

" سید صاحبؒ قبلہ میں مہمان نوازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس کا صحیح اندازہ، دسنہ پہنچ کر ہوتا، شبلی منزل میں وہ مصروف رہتے ۔

لے نقوش سلیمان: سید سلیمان ندوی ص ۴۴
؎ ۲ نقوش سلیمان: سید سلیمان ندوی ص ۴۲

دسنہ میں نسبتہً فرصت ہوتی، وہاں وہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کی بھی بڑی آؤبھگت کرتے۔ حضرت الاستاذ کو آموں کا بہت شوق تھا۔ بڑے شوق سے اپنا باغ بھی لگایا تھا ایک مرتبہ آموں کے موسم میں دسنہ حاضری ہوئی۔ تقی الدین نعمانی میرے پٹنہ کے رفیق بھی ساتھ تھے۔ سید صاحب اپنے ہاتھ سے ایک ایک قاش کاٹ کر تقسیم فرماتے۔ ایک مرتبہ سید صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں گٹھلی رہ گئی، تقی صاحب نے ازراہ تواضع گٹھلی طلب کی، فرمایا آموں کے باب میں تواضع نہیں [1]

دسنہ سے سید صاحب کو جو گہری دل چسپی اور بے پناہ محبت تھی اس کے بارے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے بہت وضاحت سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :

"اپنے وطن دسنہ سے بڑی محبت رکھتے۔ جب گھر آتے اور یہاں سے رخصت ہونے لگتے تو اشک بار ہو جاتے۔ طالب علمی کے زمانہ سے آخر عمر تک اس کے اجتماعی کاموں میں پوری دل چسپی لیتے رہے۔ وہاں کے باشندوں نے ۱۸۹۸ء میں اپنی معاشرتی و علمی اصلاح و ترقی کے لئے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے ماتحت اردو کا ایک شاندار کتب خانہ بھی ہے اس کی ترقی میں ہر قسم کی امداد کرتے رہے۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں کبھی اپنی نظم سناتے کبھی مقالہ پڑھتے اور کبھی تقریر کرتے۔ اس کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کی۔ فرمایا کرتے تھے کہ یوں تو اللہ تبارک و تعالٰی نے بہت سی کانفرنسوں کی صدارت کا شرف عطا کیا لیکن جو لذت وطن کی انجمن الاصلاح کی صدارت میں محسوس ہوئی وہ کسی اور میں نہیں ہوئی۔" [2]

اپنے گاؤں سے اس قدر محبت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ دسنہ کی تاریخ لکھنا چاہتے تھے جس کی انھوں نے شاید ابتدا بھی کر دی تھی مولانا مناظر حسن گیلانی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں :

"مجھے یاد آتا ہے غالباً سید الملت نے خاکسار سے خود ہی فرمایا تھا کہ فارسی زبان میں اپنے مولد و منشا دسنہ کی تاریخ مرتب فرما رہے تھے [3] لیکن سید صاحب یہ کتاب نہ لکھ سکے۔ شاید اسی بنا پر جب میری کتاب "ایک اور مشرقی کتب خانہ" ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی تو برادر محترم و مکرم صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اپنی مسرتوں کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں تحریر کیا تھا :

"آپ کی مرسلہ کتاب "ایک اور مشرقی کتب خانہ" ملی۔ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ وطن کے علمی رستم نے جو کام نہیں کیا تھا وہ آپ نے کر ڈالا۔ آپ کے اندازِ تحریر کی متانت سے بھی مسرت ہوئی امید ہے کہ آپ اپنی اس صلاحیت سے برابر کام لیتے رہیں گے۔"

میں سید صاحب سے متعلق یہ مضمون قلم بند کر رہا ہوں اور ان کی مختلف تصویریں میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہی ہیں۔ سب سے پہلی بار میں نے انھیں ۱۹۳۶ء میں دیکھا تھا، جب میں ابھی بہت چھوٹا تھا لیکن اب بھی وہ منظر نگاہوں کے سامنے ہے۔

والد صاحب پروفیسر سید سعید رضا نے اپنے مختصر شہری مکان کی فرشی منزل مکمل کر لی تھی اور مع اہل و عیال وہاں منتقل ہو چکے تھے۔ شاید یہ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ سید صاحب دسنہ آئے ہوئے تھے، ڈاکٹر سید محمود بھی اس تعطیل میں کسی دن انجمن الاصلاح کے جلسہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ والد صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسی روز چار بجے شام میں اپنے نئے مکان میں سیرت النبی کی مجلس منعقد کرائی تھی جس میں ڈاکٹر سید محمود مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے، سید صاحب نے نہایت ہلکی اور سادہ زبان میں سیرتِ رسول پر تقریر کی تھی پہلی بار میں نے سید صاحب کو بہت قریب سے اور کافی دیر تک اسی موقع پر دیکھا تھا۔ اس مجلس کی تصویر دل پر اب بھی نقش ہے اور ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ ہے جس کے کچھ عکس آج بھی تقریباً ۴۸ سال گزرنے کے بعد مجھ پر عجیب کیفیت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس کی یاد میرے لئے "یادِ ماضی" عذاب کی صورت نہیں ہے بلکہ مسرت اور راحت کا باعث بنی ہوئی ہے۔ سید صاحب ٹھہر ٹھہر کر آہستہ تقریر کر رہے تھے۔ درمیانہ قد، گداز جسم، روشن اور متبسم چہرہ، آنکھیں ذہانت، متانت، شرافت اور وسعتِ قلب کی امانت دار، پیشانی چوڑی، چکنی، چمکیلی، ان کی شخصیت کی عظمت و حشمت کی گواہ، سر پر سجی سجائی صاف و شفاف پگڑی مومنانہ جمال و وقار اور

---

[1] استاذ مرحوم : مسعود عالم ندوی : سلیمان نمبر معارف اعظم گڑھ ص ۱۴۹

[2] اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے : سید صباح الدین عبدالرحمٰن معارف اعظم گڑھ سلیمان نمبر مئی ۱۹۵۵ ص ۵۸

[3] سید الملت کی مکتبی زندگی : مناظر احسن گیلانی : سید سلیمان ندوی نمبر "ریاض" کراچی ص ۱۸ حاشیہ

صوفیانہ انداز و ادا کی مظہر، جسم پر شیروانی، چہرہ پر نور، اسلامی داڑھی سے روشن تر۔ سیّد صاحب کی ظاہری شخصیت کی یہ تمام خصوصیات ہم جیسے بچوں کے دلوں پر ایک خاص مرعوبیت اور مسرّت کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں پھر تقریر کا انداز، بات کہنے کا سلیقہ، سمجھانے کا ڈھنگ، حاضرین محو تھے، رسول کی سیرت کا بیان، سید صاحب کی شخصیت کا پرتو، سننے والوں کے دلوں میں اسلام سے عجیب قربت پیدا کرنے کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ والدمرحوم کا چہرہ چمک رہا تھا، وہ بے انتہا خوش تھے بڑے ابّا عبدالحفیظ ندوی تقریر میں گم تھے برادر محترم پروفیسر عبدالحی رضا میری طرح کبھی تحیّر کبھی تجسّس کی تصویر بنے ہوئے تھے دوسرے عزیز و اقارب جو شریک محفل تھے اس پاکیزہ ماحول میں گم تھے۔

اس کے بعد تو سیّد صاحب کو دسنہ میں بار بار دیکھا، جوں جوں عمر بڑھتی گئی، شعور پیدا ہوتا گیا، ہوش و حواس جوان ہوتے گئے، عقل و خرد میں پختگی آتی گئی، سیّد صاحب کی علمیّت کا نقش دل پر بیٹھتا گیا، ان کی شخصیّت کا احترام بڑھتا گیا، ان کے کردار کی عظمت قلب و نظر کو مسحور کرتی گئی، ان کی علمی و ادبی فتوحات اہل دسنہ کے لئے مسرّت کا پیغام لاتی گئیں اور ان کی شان و فخر میں اضافہ کرتی گئیں۔ چنانچہ جب فروری ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سیّد صاحب کو ڈاکٹریت کی اعزازی ڈگری پیش کی گئی تو اہل دسنہ خوشی سے جھوم اٹھے اور ان کا سر فخر سے بلند ہوگیا، انھوں نے اپنی خوشی کا اظہار اہل دسنہ کی طرف سے سیّد صاحب کی خدمت میں "سپاسنامہ" پیش کر کے کیا جس کا ابتدائی حصّہ یہ تھا:

"عزیز گرامی! آج کا دن دسنہ کی تاریخ میں سب سے زیادہ فخر و مسرّت کا دن ہے کہ اس کے عزیز ترین فرزند کی شاندار علمی خدمات کا اعتراف ہندوستان کی اسلامی، علمی، تعلیمی دنیا کے مرکز وحید نے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ نذر عقیدت و اعتراف ہے جو ایک جامعہ پیش کر سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جامعہ کے اس اقدام نے آپ کی ذات گرامی کو بلند نہیں کیا ہے بلکہ اس سے خود اس کا درجہ بلند تر ہوگیا ہے یہ آپ کی عزت افزائی نہیں ہے بلکہ خود مسلم یونیورسٹی کی عزت افزائی ہے۔"

سیّد صاحب دسنہ برابر آتے ان آنکھوں نے انھیں اپنے خوبصورت بلند و بالا، وسیع اور کشادہ بنگلہ نما مکان کی تعمیر میں مصروف دیکھا اعظم گڑھ کے راج اور مستری تعمیر میں لگے رہتے، پھر ایک دور آیا، جیرائین ندی کے اس پار سیّد صاحب کو اپنے باغ کے سجانے میں مصروف پایا، اچھے، قیمتی، لذیذ آموں کے درخت لگائے گئے اور پھر درخت بڑھے، پروان چڑھے اور پھلوں سے لدے۔ یہ سب منزلیں آئیں۔ سیّد صاحب خاص طور سے گرمیوں میں دسنہ آتے، عصر کی نماز کے بعد باغ جاتے، کچھ دیر وہیں گزارتے اور باغ کی دیکھ ریکھ میں مصروف رہتے، مسرور رہتے۔

کبھی دسنہ لائبریری میں بھی تشریف لاتے، ہم نوجوانوں سے گفتگو کرتے، ہمارے بارے میں دریافت کرتے۔ ایک بار ظہر کی نماز کے بعد تشریف لائے تو رسائل کے کمرہ کا جائزہ لینے لگے۔ مجھ سے دریافت کیا کہ "وکیل" (امرتسر) کی جلدیں کہاں ہیں۔ میں نے تمام جلدیں لاکر ان کے سامنے رکھدیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ پھر بتایا کہ ابتدا میں ان کی بعض تحریریں اس میں شائع ہوئی تھیں۔

انجمن الاصلاح کے جلسوں میں تو شریک ہوتے ہی تھے کبھی کبھی بعض نجی محفلوں اور تقریبوں میں تشریف لاتے تو محفل میں جان پڑ جاتی، شان بڑھ جاتی۔

ذکر آچکا ہے کہ سیّد صاحب کے دسنہ میں قیام ہی کی وجہ سے اس زمانہ میں اس چھوٹے سے قریہ میں اہل علم کی آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہوگیا تھا، مولانا شوکت علی، مولوی عبدالحق، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی وغیرہ مختلف وقتوں میں تشریف لائے اور اس گاؤں کی نیک نامی میں اضافہ کر گئے۔

آخری ملاقات سیّد صاحب سے بمبئی میں ہوئی جب وہ ۱۹۴۹ء میں حج سے واپسی پر بیمار پڑ گئے تھے اور بمبئی میں اعظم گڑھ کے ایک نیک دل فرزند منشی عبدالعزیز صاحب کے یہاں انھوں نے قیام کیا تھا، میں اپنے والد پروفیسر سعید رضا صاحب اور بڑے بھائی پروفیسر عبدالحی رضا کے ساتھ ان سے ملنے گیا تھا، نہایت آہستہ آہستہ بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا وہ یقین اور اعتماد کے پیکر تھے، روحانیت کی تصویر تھے آج بھی ان کی صورت دل کے آئینے میں محفوظ ہے اور قلب و نظر کو مسحور کئے ہوئے ہے۔

۱۹۶۱ء میں جب بھوپال آیا تو اکثر یہاں کے لوگوں کو اقبال کے قیام بھوپال کا ذکر کرتے ہوئے پایا، جگر اور بھوپال کے تعلق پر بھی وہ بہار رشک ڈالتے اور یہ جان کر کہ میں سیّد صاحب کا ہم وطن ہی نہیں بلکہ اسی شجر کا ایک برگ کم مایہ ہوں جس کے سیّد صاحب گل شگفتہ تھے۔

جس کی خوشبو سے ایک دنیا معطر ہو گئی تھی تو ان کے بارے میں بھی نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ ان کی باتیں بتلاتے۔ چنانچہ میں نے ان کا قیام جس مکان میں تھا اسے دیکھا، دیر تک مجھ پر عجیب کیفیت طاری رہی، خیالات کے تانے بانے نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچاتے رہے، وہ جس مسجد میں نماز پڑھتے تھے وہاں نماز پڑھی، موتی مسجد جہاں وہ نماز جمعہ ادا کرتے تھے بارہا گیا اور بارہا ان کو یاد کیا اور جذبات کی رَو میں بہتا گیا۔

ام اے کی تعلیم کے زمانے میں جب علامہ شبلی کا مطالعہ کر رہا تھا تو سید صاحب کی ندوہ کی طالب علمی، الہلال سے تعلق اور کلکتہ کے قیام پونا کالج کی پروفیسری اور دارالمصنفین کی تعمیر کے زمانے سامنے آئے۔ سید صاحب کی تعلیمی، علمی، ادبی، مذہبی اور کسی قدر سیاسی مصروفیات سے آگاہ اور فکر و نظر سے با خبر ہوا۔

جشن اقبال میں اقبال کے مطالعہ نے سید صاحب کی عظمت کی بار بار کہانیاں سنائیں اور ان سے متعلق اقبال کے اس فیصلے سے آگاہ کیا:

"علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے"

ادھر چند برسوں سے مولانا ابوالکلام آزاد کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ابتدا میں سید صاحب اور مولانا آزاد ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں، پہلے صحافتی زندگی میں، پھر سیاسی میدان میں، لیکن رفتہ رفتہ سید صاحب عملی سیاست سے الگ ہو کر علمی، ادبی اور دینی خدمات میں مصروف ہو جاتے ہیں اور "امیر العلماء" کا درجہ پاتے ہیں وہ زندگی کے آخری لمحے تک علمی اور دینی خدمت میں مصروف رہے۔

یہاں تک کہ ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کی وہ یادگار تاریخ آئی جب ۶۹ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے۔

ان کے مرنے سے غیر منقسم ہندوستان نے ایک فرزند عظیم کو کھویا، عالم اسلام کو ایک مرد جلیل کا نقصان اٹھانا پڑا۔ دنیائے ادب کو ایک محترم ادیب سے ہاتھ دھونا پڑا اور ہم اہل دسنہ کو عظیم المرتبت بزرگ سے محرومی کا دلدوز ماتم کرنا پڑا۔ ○

ضیاءفتح آبادی

(۱)

بے ثمر سائے کا پاس
ڈوبتا سورج اُداس
کھول کر البم کھُلا
کل بہو تھی آج ساس
سونگھتی آنکھوں میں دیکھ
کاغذی پھولوں کی باس
مکتبِ غم کا عمل
اکتساب و اقتباس
رات کو ، تنہائی کی
روشنی کیا آئے راس
کوئی آنسو پی گیا
پانچ دریاؤں کی پیاس
یا مرے جانے کا غم
یا ترے آنے کی آس
صبح منتی ہی نہیں
شام بیٹھی ہے اُداس
پھر وہی قطع و برید
پھر وہی خوف و ہراس
جنگلوں کی بھیڑ میں
پیڑ سب تنہا اداس
ساقی و مینا و مے
ہوش مندی کی اساس
گھر مرا بھی ہوتا کاش
تیرے گھر کے آس پاس
چھُپتا پھرتا تھا نتیا
درد نکلا دل شناس

(۲)

چھٹی جو شب کی سیاہی ، سحر نظر آئی
تمام پردے اُٹھے ، آپ کی خبر آئی

اُٹھا جو دل میں لیے عزم چارہ سازیٔ غم
کھلے دریچے ، ہوائے حیات گر آئی

کیا حیات نے مایوس اس قدر دل کو
امیدِ مرگ ہی انجام کار بر آئی

جمی تھی گردِ کدورت جو دل کی بستی میں
کسی کی یاد کبھی آئی تو سوچ کر آئی

نزولِ شعر یہ محسوس کرتا ہوں ، جیسے
زمیں پہ کوئی پری عرش سے اُتر آئی

تمہارا دیکھنا آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں
مجھے اندھیروں میں اک روشنی نظر آئی

ضیاؔ اسی کو بناتا ہوں رہبرِ منزل
جو عمر ہی بڑی مشکل سے راہ پر آئی

سیمابؔ اور اردو

سیمابؔ کو یاد کرنے والو
اردو کی بھی کچھ تمہیں خبر ہے

سیمابؔ نے اپنے خونِ دل سے
سینچا تھا جسے یہ وہ شجر ہے

یہ سوکھ گیا اگر تو جانو
سیمابؔ کی سعی بے ثمر ہے

جب تک ہے میسّر اس کا سایہ
کیا فکر جو دھوپ جوش پر ہے

اردو کی حیاتِ جاوداں میں
سیمابؔ مرا نہیں ، امر ہے

اردو ہی کو شمعِ رہ بنا لو
سیمابؔ کو یاد کرنے والو

سیّد سلیمان ندوی کی سیاسی و علمی خدمات

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ● اے-۱۰۶، نیو ہیرا نگر، ماروے روڈ، ملاڈ (ویسٹ)، ممبئی ۶۴

(۱)

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ابھی نوعمر تھا ایک دن بہت دیر گئے گھر لوٹا، والد ماجد نے باز پرس کی، میں نے بتایا کہ مسلم لیگ کا ایک جلوس جا رہا تھا اور میں اس میں شریک ہو گیا تھا۔ وہ خفا ہوئے اور کہنے لگے سیّد سلیمان ندوی اور حسین احمد مدنی جیسے زبردست عالم کانگریس کے ساتھ ہیں چند سرپھروں کے مسلم لیگ بنا لینے سے کیا ہوتا ہے، میں اپنے والد بزرگوار کی زبان سے سیّد سلیمان ندوی کا نام سن کر مرعوب سا ہو گیا، ندوی، ندی، دریا، سمندر، آہ! کتنا بڑا نام ہے۔

کچھ دنوں بعد مجھے دینی تعلیم کے لئے جامعہ عربیہ دار السلام، عمرآباد بھیج دیا گیا، دار السلام جنوبی ہند کا ایک بڑا اہم دینی اور تعلیمی ادارہ ہے، مجھے وہاں گئے ابھی دو چار ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک دن معلوم ہوا کہ سیّد سلیمان ندوی آئے ہوئے ہیں، ذہن کے جھروکوں سے ایک بھولی بسری یاد نے جھانکا، دل میں ایک خواہش ابھری، کہ بس کسی طرح سیّد صاحب کو ایک نظر دیکھ لوں۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد جامعہ کی مسجد میں ان کا درس قرآن تھا، سارے طلبہ وہاں جمع ہو گئے ظاہر ہے میں بھی ان میں شامل تھا کہہ نہیں سکتا کہ پہلی بار سیّد سلیمان ندوی کی باوقار اور ملکوتی شخصیت کو قریب سے دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی، گورا رنگ، اونچی ناک، گھنے ابرو، متین نظریں، خوبصورت داڑھی، مضبوط جسم، میانہ قد، سفید دوپلیا ٹوپی، سفید قمیص اور سفید چھوٹی مہری کے پاجامے میں بہت ہی بھلے لگتے تھے، وہ درس قرآن دے رہے تھے اور میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ دھیرے دھیرے بہہ رہا تھا، مگر آواز اتنی دھیمی تھی کہ دور کے لوگ بڑی مشکل سے ان کی باتوں کو سن پاتے تھے۔

سیّد سلیمان ندوی کی شخصیت کا جادو میرے سر پر سوار تو تھا ہی، مجھے بھی خواہش ہو گئی کہ میں بھی لکھنؤ جاؤں اور ندوہ میں تعلیم حاصل کروں، اُن دنوں جنوب کے ایک دور افتادہ علاقے سے شمال کے ایک دور دراز شہر لکھنؤ جانا اور وہاں تعلیم حاصل کرنا ایک عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی، مگر جب جذبہ صادق ہو تو راہ نکل ہی آتی ہے، ایک دن ایک مقامی اردو اخبار میں ندوہ میں نئے داخلوں کا اشتہار نظر سے گزرا، اُس وقت دار العلوم ندوہ کے مہتمم مولانا عمران خان ندوی تھے، میں نے ڈرتے ڈرتے انھیں ایک خط لکھا کہ میں جنوبی ہند کی ایک جامعہ عربیہ دار السلام میں تعلیم پا رہا ہوں، میری بڑی خواہش ہے کہ میں ندوہ میں داخلہ لوں مگر میرے والدین کی حیثیت اتنی نہیں ہے کہ وہ میری اس تعلیم کا خرچ برداشت کر سکیں، اگر آپ میرے لئے کوئی راہ نکال لیں، تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔

اِدھر میرا خط گیا اُدھر فوراً جواب آیا کہ فلاں تاریخ تک چلے آؤ، میں تمہارے داخلے اور ہوسٹل کے اخراجات کا انتظام کر دوں گا، میرے دل کی ایک دیرینہ مراد بر آئی، میں خوشی خوشی مقررہ تاریخ سے پہلے ہی ندوہ پہنچا، مولانا عمران خان ندوی کی خدمت میں حاضری دی، انھوں نے فوراً میرے رہنے سہنے کا بندوبست کر دیا۔ دوسرے دن باقاعدہ ٹیسٹ لیا گیا اور میرا داخلہ براہ راست درجہ [illegible] میں ہو گیا جو ندوہ میں الفضیلت تعلیم کا آخری [illegible] سال ہوتا ہے۔

ایک دن مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا طلبہ نماز کے لئے ایک ایک کر کے صحن مسجد میں جمع ہو رہے تھے میں بھی ذرا وقت سے پہلے ہی مسجد

پہنچ گیا، وہاں نمازیوں کی تعداد معمول سے کچھ زیادہ ہی دکھائی دی، پتہ چلا کہ سید سلیمان ندوی آئے ہوئے ہیں، میں ندوہ میں ابھی نیا نیا تھا، مجھ پر جنوبی ہند کی چھاپ ابھی بھی باقی تھی، قمیص، پاجامہ اور سر پر فرکیپ، ان دنوں مدراس کی فرکیپ دوسرے علاقوں کی جناح کیپ سے کچھ زیادہ ہی اونچی ہوتی تھی جو مجھے وہاں نمایاں کرنے کے لئے کافی تھی، سید صاحب کی نظر جونہی مجھ پر پڑی فوراً بولے مدراس سے آئے ہو؟ میں نے کہا، ہاں، جب انھیں معلوم ہوا کہ میں دارالسلام عمرآباد کا طالب علم ہوں تو وہ بے حد خوش ہوئے، دارالسلام کے حالات پوچھنے لگے، انھیں جنوبی ہند کے اس جامعہ عربیہ سے ایک خاص لگاؤ تھا، کہنا چاہئے کہ اس جامعہ کا درسی نصاب بہت کچھ انھیں کے مشورہ سے مرتب کیا گیا تھا، اور اس جامعہ کے بانی کاکا عمرا اور ان کے خاندان کے لوگ بھی سید صاحب کو بے حد چاہتے تھے۔

میرے اس ایک سالہ دورِ طالب علمی میں سید صاحب تقریباً چار بار ندوہ آئے اور ہر بار مجھے اُن سے شرفِ نیاز حاصل ہوا، اتفاق سے ایک بار جامعہ عربیہ دارالسلام کے ایک استاذ مولانا صبغۃ اللہ بختیاری بھی ایسے موقعہ پر ندوہ آئے جب سید صاحب بھی ندوہ میں موجود تھے، مولانا بختیاری نے جب مجھے سید صاحب سے خاص طور پر ملایا تو وہ مسکرائے اور کہنے لگے میں انھیں جانتا ہوں، پھر مجھے دعا دی۔

۱۹۴۶ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک بڑا اہم سال سمجھا جاتا ہے، یہی وہ سال تھا جب مولانا آزاد نے لکھنؤ میونسپلٹی کے ایک عصرانے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا، لوگ کہتے ہیں کہ آزادی کی منزل ابھی بہت دور ہے مگر میں ان سے کہتا ہوں کہ نہیں، آزادی کی منزل دور نہیں، بس یہ ہے، یہ ہے، یہ ہے (انھوں نے تین بار پورے وثوق کے ساتھ ہاتھ سے اشارہ کیا تھا) ان دنوں مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے، کانگریس اور مسلم لیگ کا ٹکراؤ اپنے انتہائے عروج پر تھا، پوری فضا سیاسی نعروں سے گونج رہی تھی، بڑے بڑے لیڈر لکھنؤ آتے اور اپنا اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے، کوئی ٹکراؤ پر آمادہ تھا تو کوئی مصالحت کی بات کر رہا تھا، اس سلسلے میں ایک بار مولانا آزاد بھی چودھری خلیق الزماں سے ملنے کے لئے لکھنؤ آئے ہوئے تھے، لکھنؤ کے مشہور ہوٹل، ہوٹل اشوکا میں ان کا قیام تھا، اتفاق سے انہی دنوں سید صاحب بھی ندوہ میں قیام پذیر تھے، سید صاحب اور مولانا آزاد کا رشتہ بہت پرانا تھا، ایک عرصے تک دونوں کا تقریباً اتصال شبلی تھے، کچھ دنوں الہلال میں ساتھ کام بھی کیا تھا، بعد میں کسی وجہ سے ان دونوں کے راستے الگ ہو گئے، ایک نے کعبے کا رُخ کیا اور دوسرے نے ترکستان کا۔

آزاد کے دل کا حال تو خدا ہی جانے، مگر سید صاحب نے آزاد کو کبھی نہیں بھلایا، یہاں تک کہ جب مولانا آزاد کی کتاب غبارِ خاطر شائع ہوئی تو سید صاحب نے معارف کے اداریہ میں اس پر ایک شاندار نوٹ لکھا اور چونکہ غبارِ خاطر کے خطوط میں زیادہ تر خطاب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی طرف تھا اس لئے انھوں نے اپنے اس نوٹ کو ذیل کے شعر پر ختم کر کے آزاد سے ایک دوستانہ شکایت بھی کر دی۔

چوں با حبیب نشینی و بادہ پیمائی   بیاد آر محبّانِ بادہ پیما را

ان دونوں کے اسی دیرینہ تعلق کی وجہ سے ندوہ کے طلبہ کو ایک آس سی ہو گئی تھی کہ اگر سید صاحب کوشش کریں تو مولانا آزاد ندوہ آسکتے ہیں سید صاحب کو بھروسہ نہ تھا، پھر بھی طلبہ کے اصرار پر انھوں نے آزاد کے نام ایک چٹھی لکھ دی، یہ چٹھی لے کر کچھ طلبہ آزاد سے ملنے گئے، مگر جلد ہی خالی ہاتھ لوٹ آئے، آزاد نے معذرت ظاہر کر دی تھی۔

اُن دنوں ندوہ میں ایک طالب علم تھے، بڑے تیز اور چرب زبان، لوگوں کو پرچانا انھیں خوب آتا تھا، شاید عبدالقدیر اُن کا نام تھا، انھوں نے سید صاحب سے کہا اگر آپ اجازت دیں تو میں آزاد کو ابھی لے آؤں۔ سید صاحب اُن کے مزاج سے واقف تھے، معنی خیز انداز میں مسکرائے اور انھیں اجازت دیدی، آدھا ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا کہ کیا دیکھتے ہیں مولانا آزاد اپنے سکریٹری اجمل خان کے ساتھ ایک کار میں چلے آرہے ہیں، سب کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی، دیکھتے ہی دیکھتے ندوہ کی مسجد، ندوہ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ سے بھر گئی، مسجد کی محراب کی ایک جانب سید صاحب تشریف فرما تھے اور دوسری جانب مولانا آزاد، آزاد نے طلبہ کی مناسبت سے ایک مختصر سی تقریر کی اور آخر میں عبدالقدیر کی طرف اشارہ کر کے کہا، آپ کے ساتھی نے مبالغہ سے کام لیا، انھوں کہا تھا کہ ساڑھے بارہ کی گاڑی سے حبیب الرحمٰن خاں شروانی ندوہ آئے ہوئے ہیں اور فوراً آپ کو بلایا ہے۔

ندوہ میں اس قران السعدین کی خاص بات یہ تھی کہ دونوں کے مزاج میں بعد المشرقین تھا، سید صاحب سرتاپا حلم و انکسار اور مولانا آزاد

حضرت والاتبار، جب آزاد ندوہ پہنچے تو طلبہ نے انھیں سب سے پہلے سید صاحب سے ملانے کی کوشش کی، سید صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن آزاد میں کوئی جنبش نہ ہوئی، مسجد میں وہ تقریباً دس منٹ طلبہ سے گفتگو کرتے رہے مگر ایک بار بھی سید صاحب کا نام نہ لیا، طلبہ بس سوچتے رہ گئے۔

دل سے اتنا قریب ہم سے دور کس سے کچھ اس کو آشنائی ہے

آخری بار مجھے سید صاحب سے اس وقت نیاز حاصل ہوا جب وہ حج کے سفر پر روانہ ہونے کے لئے بمبئی آئے ہوئے تھے، عمر ہال میں ان کا قیام تھا ایک دن مغرب کی نماز کے بعد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اکیلے تھے، پاس میں کوئی نہ تھا، میں نے سلام کیا، وہ مجھے پہچان نہ سکے، میں نے انھیں اپنا ندوہ اور دارالسلام کا رشتہ یاد دلایا، ایک ہلکی سی چمک ان کی آنکھوں میں دکھائی دی، میری مصروفیت کے بارے میں پوچھا، میں نے انجمن اسلام اور نجیب اشرف ندوی کا نام لیا، کہنے لگے ہاں وہ بھی کل ملنے آئے تھے، تھوڑی دیر میں ان کے پاس بیٹھا رہا، وہ کچھ سوچ میں تھے، مجھے ان کی تنہائی میں مخل ہونا مناسب نہیں معلوم ہوا، اجازت لے کر چلا آیا، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے، مگر میرے دل و دماغ پر ان کی شخصیت اور ان کے علم و فضل کا جو نقش بیٹھ گیا ہے وہ شاید کسی کے مٹائے بھی نہ مٹے۔

(۲)

سید صاحب کی زندگی بڑی پہلو دار تھی، قدرت نے ان کی ذات میں بعض ایسی نادر اور بے مثال صلاحیتیں ایک ساتھ جمع کر دی تھیں جو تاریخ کی بہت سی نامور ہستیوں میں بھی بہت کم یکجا ملتی ہیں، ان سب کا احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں اس لئے ان کی زندگی کے صرف تین پہلوؤں کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے، ذاتی، سیاسی اور علمی۔

ذاتی زندگی

وہ ۲۲/ نومبر ۱۸۸۴ کو بہار ضلع پٹنہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں دسنہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کچھ دسنہ میں اور کچھ پھلواری میں پائی، ۱۹۰۱ میں انھوں نے دارالعلوم ندوہ میں داخلہ لیا اور وہیں سے باقی تعلیم مکمل کی، ۱۹۰۸ میں وہ ندوہ ہی میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاذ مقرر ہوئے اور ساتھ ہی "الندوہ" کی ادارت کا کام بھی سنبھالا، ۱۹۱۳ میں وہ ندوہ کی ملازمت چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے اور مولانا آزاد کے ساتھ ان کے اخبار الہلال میں کام کرنا شروع کر دیا، مگر وہاں وہ زیادہ دن رہ نہ سکے، کچھ ماہ بعد دکن کالج پونا میں السنۂ مشرقیہ کی پروفیسری قبول کر لی، ۱۹۱۴ میں شبلی کی وفات کے بعد انھوں نے دکن کالج کی ملازمت کو بھی خیرباد کہہ دیا اور اپنے استاذ کے ادھورے خواب کو پورا کرنے کے لئے اعظم گڑھ چلے آئے اور ۱۹۱۵ میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی۔

سید صاحب کی ذاتی زندگی کا ایک بڑا حصہ دارالمصنفین میں گزرا، وہاں رہ کر وہ ایک طرف تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگ گئے اور دوسری طرف "معارف" جاری کر کے مسلمانوں میں دینی اور ثقافتی بیداری کو عام کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۴۲ میں ان کی بڑھتی ہوئی علمی، ثقافتی اور دینی مصروفیتوں نے انھیں بیمار ڈال دیا، ڈاکٹروں نے انھیں تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا، چنانچہ اسی بہانے میں وہ ۱۹۴۶ میں قاضی القضاۃ اور امیر جامعۂ مشرقیہ بن کر بھوپال چلے گئے، ۱۹۴۹ تک وہ وہیں رہے، آخر بھوپال سے بھی جی گھبرانے لگا تو وہ ۱۹۴۹ میں بیوی بچوں کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ حج سے واپس آنے کے بعد وہ زیادہ دن ہندوستان میں نہ رہ سکے، بھوپال چھوڑا، اعظم گڑھ چھوڑا، لکھنؤ چھوڑا اور آخر ۱۹۵۰ میں انھوں نے ہندوستان بھی چھوڑ دیا اور پاکستان سدھارے۔

پاکستان میں ان کی آمد پر ہر طرف خوشیاں منائی گئیں، حکومت سے لے کر عام اداروں تک ہر گروہ نے انھیں اپنانا چاہا، مگر انھوں نے کسی کی پیشکش قبول نہ کی اور رضا کارانہ طور پر وہاں علمی، دینی اور تعلیمی کاموں میں لگ گئے، آئے دن وہاں کے کالج، یونیورسٹیاں اور دینی ادارے انھیں اپنے یہاں بلاتے اور ان سے کسب فیض کرتے، ان مصروفیتوں نے انھیں عزت و احترام تو بخشا، مگر غم روزگار کی کوئی تلافی نہ ہوئی، اس اثنا میں حکومت پاکستان نے انھیں از سرِ نو ادارہ تعلیمات اسلام کی صدارت پیش کی اور سید صاحب نے اب کی بار کچھ شرائط کے ساتھ اس عہدہ کو قبول فرما لیا۔

۱۹۵۲ میں وہ پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لئے ڈھاکہ تشریف لے گئے، ان دنوں مشرقی پاکستان کے نوجوانوں پر بنگالی زبان اور بنگالی کلچر کا بھوت سوار تھا، وہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہ تھے، سید صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں ان کی توقعات کے

بالکل ہی برعکس اردو زبان کی ثقافتی اہمیت پر زیادہ زور دیا، یہ بات انھیں پسند نہ آئی، وہ توڑ پھوڑ پر اتر آئے اور تشدد کا ننگا ناچ ناچنے لگے۔

ڈھاکہ سے کراچی جاتے ہوئے وہ سرزمین ہند میں اتر پڑے اور فتح پور کے ایک گاؤں میں اپنے داماد کے ہاں قیام کیا۔ جب دارالمصنّفین کے رفقاء اور ندوہ کے اساتذہ وطلبہ کو پتہ چلا تو وہ سید صاحب کو اپنے ہاں لے چلنے کی غرض سے وہاں پہنچے، سید صاحب دارالمصنّفین تو نہ جاسکے البتہ ندوہ کی کشش انھیں وہاں لے گئی، وہاں ان کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال ہوا، کئی سال بعد ملے تھے، سب مل کر خوب روتے، سید صاحب سے بھی ضبط نہ ہوا، ان کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا جھرنا پھوٹ پڑا، یہ ان کی اپنے ہندوستانی دوستوں سے آخری ملاقات تھی کیونکہ وہ ابھی کراچی واپس بھی نہ ہوئے تھے کہ ۲۲/نومبر ۱۹۵۲ کو پاکستان ریڈیو نے خبر دی کہ سید صاحب اس جہان سے رحلت فرما گئے۔

سید صاحب کی ذاتی زندگی ایک صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی تھی، ان کی شرافت نفسی اور ان کے علم وفضل کا وقار ان کی صورت انکے رہن سہن سے عیاں تھا، وہ کم گو اور کم آمیز تھے، ان کے مزاج میں بے حد نرمی اور متانت تھی، ان میں تحمل اور برداشت کا مادہ بھی بے حد تھا، وہ کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے، تلخ سے تلخ باتوں کو بھی وہ خاموشی سے پی جاتے تھے، بہت ناگواری کی حالت میں بھی اس کا اظہار پیشانی کی ہلکی سی شکن سے آگے نہ بڑھتا تھا، قناعت، بے نفسی اور ایثار کا جذبہ ان میں بے حد تھا، ان میں خودرائی اور خودپسندی کی بو باس تک نہ تھی، بات چیت میں ان کا لہجہ ہمیشہ نرم ہوتا تھا، وہ کم آمیز ضرور تھے مگر خشک مزاج نہ تھے، بے تکلفی کے موقعوں پر دوستوں سے کھل کر چھیڑ چھاڑ بھی کر لیا کرتے تھے۔

سید صاحب کو تفریحی مشاغل سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، ان کا تمام تر وقت مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں گزرتا تھا، انھیں اگر کسی چیز کا شوق تھا تو صرف سیر وسیاحت کا، وہ اپنے سفر یا تو دارالمصنّفین کے لئے کرتے تھے یا علمی اور سیاسی کاموں کے لئے، شمال سے جنوب تک، مشرق سے مغرب تک ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان کے علم وفضل کا چرچا تھا، لوگ انھیں اپنے جلسوں اور کانفرنسوں میں بلاتے اور ان سے فیضان حاصل کرتے رہتے تھے، انھوں نے ہندوستان سے باہر بھی بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے جس میں سفر یورپ، سفر حجاز اور سفر افغانستان اپنی ایک ثقافتی اہمیت رکھتے ہیں۔

گو سید صاحب کو خدا نے علم وفضل، دین وحکمت، عزت ونیک نامی اور شہرت ومقبولیت کی ہر نعمت سے نوازا تھا اور انھیں ہر اعتبار سے سربلند کیا تھا. مگر ان ساری سربلندیوں کے باوجود ایک کسک ایک بے چینی تھی جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی رہی، ایک دن یہ خلش یہ بے قراری انھیں تھانہ بھون لے گئی اور انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کے آستانہ پر اپنا سر تسلیم خم کر دیا۔

جاں ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

سیاسی زندگی

گو مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ میں ہز ہائی نس آغا خان کے ہاتھوں عمل میں آچکا تھا، مگر محمد علی جناح کے اس پلیٹ فارم پر آنے سے پہلے اس کی کوئی خاص آواز نہ تھی، بلکہ اس کی قیادت محمد علی جناح کے ہاتھوں میں آجانے کے بعد بھی ایک بڑے عرصے تک وہ نوابوں، زمینداروں اور انگریز پرستوں کی جماعت ہی سمجھی جاتی تھی، ہندوستان میں اگر ہر طرف شور تھا تو وہ قومی تحریکوں کا تھا جس میں خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء اور کانگریس سب سے نمایاں تھے، اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت سر تا سر علماء کے ہاتھ میں تھی، علماء کی قیادت کا جو سکّہ سید احمد شہید کی تحریک اسلامی سے شروع ہوا وہ مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی تک برابر چلتا رہا، یہاں تک کہ مغربی تہذیب کے زیر سایہ تربیت پائے ہوئے لوگوں کو بھی مسلمانوں کا قائد بننے کے لئے سو فی صد علماء کا ظاہر وباطن اور انھیں کا رویہ اپنانا پڑتا تھا، جس کی نمایاں مثال علی برادران تھے۔

ظاہر ہے ایسے ماحول میں سید صاحب بھی قومی تحریکوں سے الگ نہیں رہ سکتے تھے، چنانچہ ان تحریکوں میں ان کا بھی نمایاں حصّہ رہا اور ۱۹۳۸ میں، مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ پر بیعت کرنے تک وہ بالراست یا بالواسطہ برابر ان تحریکوں کا ساتھ دیتے رہے اور ان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

سید صاحب کے سیاسی یا قومی رجحانات کا پہلا عملی مظاہرہ اس وقت ہوا جب وہ ۱۹۱۲ میں مولانا آزاد کے ساتھ الہلال میں کام کرنے لگے. ان دنوں مغربی طاقتیں سلطنت عثمانیہ کو توڑنے میں لگی ہوئی تھیں اور ان کے اشارہ پر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا

ملائے بازگشت ہندو سنگٹھن بھی سنائی دی، اور ایک خاص سازش کے تحت کانپور کی ایک مسجد کو شہید کیا گیا اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلائی گئیں،
ب نے "مشہد اکبر" کے نام سے اس کے خلاف الہلال میں ایک درد انگیز مضمون لکھا جس کے ردعمل سے ڈر کر حکومت نے الہلال کے وہ شمارے ہی ضبط کر لئے۔
۱۹۱۴ میں جب ٹرکی نے پہلی جنگ عظیم میں شرکت کی اور جرمن کا ساتھ دیا تو انگریز ان کے دشمن ہو گئے، ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردیاں
ساتھ تھیں، انگریزوں کے خلاف جگہ جگہ مظاہرے ہوئے، بڑے بڑے لیڈر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیئے گئے، قیادت صف دوم کے علماء
ہاتھوں میں لے لی جس میں سید صاحب نے بھی نمایاں حصہ لیا، اور پھر ۱۹۱۷ میں جب بنگالی مسلمانوں کی سیاسی وسماجی حالت کو سدھارنے
ے انجمن علمائے بنگال کا قیام عمل میں آیا تو اس میں بھی سید صاحب پیش پیش رہے، انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت
پنے خطبۂ صدارت میں کھلم کھلا انگریزوں کی نفاق انگیز پالیسی کی مذمت بھی کی۔
۱۹۲۰ میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں، ٹرکی کے معاملات میں انصاف طلبی کے لئے ہندوستان سے جو وفد خلافت یورپ اور انگلستان
ے پر گیا تھا اس کے تین ممبروں میں ایک سید صاحب بھی تھے، اس وفد کے تینوں ممبر اٹلی، فرانس اور انگلستان میں ٹرکی کے حقوق
زبان و قلم سے لڑتے رہے، اس سلسلے میں وہ انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج سے بھی ملے اور ان کے سامنے ٹرکی سے متعلق
ستانی مسلمانوں کے جذبات کو پوری شدت کے ساتھ پیش کیا۔
ورپ کے اس سفر سے واپسی کے بعد جب خلافت کمیٹی نے تحریک ترک موالات شروع کی تو اس کو ہندوستان بھر میں عام کرنے کی غرض
علماء کے ساتھ سید صاحب نے بھی پورے ملک کا دورہ کیا۔
۱۹۲ میں خلافت کمیٹی کے اجلاس میرٹھ کی صدارت کی اور بعض اہم مضامین، خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام اور خلافت اور ہندوستان
سے لکھے جو ہندوستان بھر میں مقبول ہوئے، اسی سال جب احمد آباد میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو اس میں وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے
زد کئے گئے اور ساتھ ہی جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ کے رکن بھی مقرر ہوئے۔
۱۹۲۱ میں جب سلطان ابن سعود اور شریف حسین میں حجاز کے اقتدار کے لئے جنگ چھڑی تو سید صاحب ان دونوں میں مصالحت
غرض سے ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد لیکر حجاز گئے اور مسلسل دو ماہ جدہ میں رہ کر اس بات کی کوشش کی کہ حجاز میں بجائے
حکومت کے ایک جمہوری حکومت قائم ہو جائے، مصر کے علماء نے بھی سید صاحب کی اس کوشش کو سراہا۔
۱۹۲ میں جب سلطان ابن سعود نے حجاز کے سلسلے میں تمام دنیا کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس بلائی تو سید صاحب دوبارہ ایک اور
کر مکہ معظمہ گئے، اب کی بار وفد میں علی برادران بھی شریک تھے، اس کانفرنس میں بھی سید صاحب نے نمایاں حصہ لیا، ان کی تقریریں بے حد
ئیں اور کانفرنس کے نمائندوں نے انھیں اتفاق رائے سے کانفرنس کا نائب صدر بنا دیا۔
۱۹۲۱ میں جب انگریزوں اور یہودیوں نے فلسطین سے عربوں کو نکالنے اور وہاں ایک اسرائیلی ریاست قائم کرنے کا ایک خفیہ منصوبہ بنایا تو
ستانی مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، جگہ جگہ اس کے خلاف احتجاجی جلسے ہوئے، سید صاحب نے بھی زبان و قلم کے ذریعہ اس سازش
ف جہاد شروع کر دیا، یہاں تک کہ اسی سال جب دہلی میں ایک آل انڈیا فلسطین کانفرنس بلائی گئی تو سید صاحب نے اس کانفرنس کی
ت کی اور ان کا خطبۂ صدارت اس قدر مقبول ہوا کہ فلسطین کے صدر مفتی امین الحسینی نے بھی اس سے متاثر ہو کر سید صاحب کے نام
کا ایک تار بھیجا۔

ج جب ہم سیاست کا نام لیتے ہیں تو جھوٹ، مکاری، بے ایمانی، خود غرضی اور ضمیر فروشی کی ایک ایسی گھناؤنی تصویر ہمارے سامنے
کہ کوئی شریف آدمی اس کوچہ میں قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، مگر سید صاحب کے عہد کی سیاست موقع پرستیوں اور ضمیر
وں کی سیاست نہ تھی بلکہ اس کا دارو مدار تمام تر سچائی، ایمانداری اور حق پرستی پر تھا، وہ ہر قسم کی گندگی سے پاک تھی، اس میں
ہی لوگ حصہ لے سکتے تھے جو مخلص تھے، جن میں اپنے مقصد کے حصول کے لئے دکھ جھیلنے اور مصائب برداشت کرنے کی طاقت تھی،
ت اپنی جان اور اپنے مال کی قربانی کے لئے تیار رہتے تھے، جن کی جدوجہد میں ذاتی اغراض کا شائبہ تک نہ تھا۔

بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس وقت ہندوستان کی مسلم سیاست کا اصل سرچشمہ متحدہ قومیت سے زیادہ دین تھا، علامہ اس کو ایک ملی اور آفاقی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے، صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں مسلمانوں پر مظالم ہوں تو وہ تڑپ اٹھتے تھے، ان کی آنکھیں صرف کانپور کے شہیدوں پر ہی نہیں طرابلس کے شہیدوں پر بھی خون کے آنسو روتی تھیں، ان کا دل مسلمان تھا، دماغ مسلمان تھا، فکر و نظر کا ہر گوشہ ہر پہلو مسلمان تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستانی سیاست میں اکثریت کا ساتھ دینے کے باوجود خود نیشنلسٹ کانگریس کا حصہ نہ بن سکے جمعیۃ کے نام اور اس کی انفرادیت کو ہر حال میں باقی رکھا، سیّد صاحب کی سیاسی زندگی کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے، کیونکہ ان کی ساری سیاسی جد و جہد کا مرکز فکر یہی تھا کہ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

علمی زندگی

سیّد صاحب کی علمی زندگی کا آغاز ان کی طالب علمی کے زمانے میں ہی ہو چکا تھا وہ پڑھائی میں تو اور طلبہ سے آگے تھے ہی تھے، تقریر و تحریر میں بھی کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ۱۸۹۹ میں انھوں نے پہلی بار مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے طلبہ کی انجمن میں پڑھنے کے لئے تعلیم نسواں، پر ایک مقالہ لکھا تھا جو بہت پسند کیا گیا، بعد میں یہ مقالہ پٹنہ کے مشہور اخبار البنچ میں شائع ہوا۔

دارالعلوم ندوہ میں داخلہ کے بعد ان کے یہ جوہر اور کھلے اور ۱۹۰۳ میں "وقت" کے نام سے ان کا پہلا باقاعدہ مضمون اس دور کے سب سے اہم رسالہ مخزن لاہور میں چھپا جس کو خود مخزن کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر نے بھی سراہا۔ پھر مختلف موضوعات پر ان کے یکے بعد دیگر متعدد مضامین شائع ہوتے رہے جن کا سلسلہ ۱۹۰۷ میں "الندوہ" کے سب ایڈیٹر بننے کے بعد اور تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا مگر سیّد صاحب کی صحیح قدر و منزلت لوگوں میں اس وقت ہوئی جب ان کی عالمانہ تصانیف بھی ایک کے بعد ایک منصۂ شہود پر آنے لگیں، ان کی ان گرانمایہ تصانیف کا مختصر سا تعارف درج ذیل ہے۔ اس تعارف میں صرف سیرۃ النبی کی ۴ جلدوں کو تاریخ اشاعت کا لحاظ کئے بغیر یکجا کر دیا گیا، باقی تصانیف کا ذکر ان کی اپنی تاریخ اشاعت کے لحاظ سے درج ہے۔

دروس الادب [حصہ اوّل دوم] یہ دو عربی ریڈریں ہیں جو بچّوں کو عربی سکھانے اور ان میں عربی کا ذوق عام کرنے کے لئے سیّد صاحب نے مرتب کی تھیں، یہ ۱۹۱۰ کے آس پاس منصۂ شہود پر آئیں اور ایک عرصے تک متعدد عربی مدارس میں داخل نصاب رہیں، ان میں جدید عربی کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔

لغات جدیدہ: یہ عربی زبان کے جدید الفاظ کا لغت ہے جس کو سیّد صاحب نے دارالعلوم ندوہ کی تحریک پر مرتب کیا تھا، ۱۹۱۲ میں یہ تکمیل کو پہنچا، اس میں سیّد صاحب نے وہ تمام عربی الفاظ جمع کر دیئے ہیں جو اس وقت تک مصر، شام اور دوسرے عرب ممالک کے اخبارات و رسائل میں عام طور پر رائج تھے۔

حیات امام مالک: سیّد صاحب کو امام مالک سے ایک خاص عقیدت تھی "الندوہ" کے لئے انھوں نے حیات امام مالک کے نام سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو کئی نمبروں میں شائع ہوا، بعد میں اس مقالہ میں کچھ اور اضافے کئے گئے اور ۱۹۱۷ میں اس کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا، اس میں امام مالک کے حالات زندگی کے علاوہ ان کی فقہی بصیرت کا بھی نہایت تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔

ارض القرآن [جلد اوّل و دوم] اس کو سیّد صاحب نے دراصل سیرۃ النبی کے مقدمہ کے طور پر لکھنا شروع کیا تھا جو بہت طویل ہو گیا اس لئے اس کو ایک مستقل کتاب کی صورت دیدی گئی، اس کی پہلی جلد ۱۹۱۵ میں اور دوسری ۱۹۱۸ میں شائع ہوئی، پہلی جلد میں عرب قدیم کا مفصل جغرافیہ، اس کی قدیم تاریخ اور قرآن مجید میں جن اقوام، قبائل اور مقامات کا ذکر ہے ان کی تاریخی تفصیل ہے اور دوسری جلد میں قرآن مجید، توریت اور یونانی و رومی مصنفین کے بیانات کی روشنی میں بنو ابراہیم کی تاریخ، عربوں کی قبل از اسلام تجارت اور ان کے مذاہب کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اس طرح یہ دونوں جلدیں دراصل قرآن مجید کے بیانات کی تاریخی، جغرافیائی اور اثری تفسیر ہیں۔

سیرۃ النبی [حصہ اوّل] یہ دراصل شبلی کی تصنیف ہے جو ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، سیّد صاحب نے اس کے مسودہ کو درست کر کے ۱۹۱۹ میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا اس میں پہلے فن سیرت پر ایک تفصیلی مقدمہ ہے جس میں سیرت نبوی کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور بعد میں رسول اکرمؐ کی ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے غزوات و سرایا کے مفصل حالات ہیں اور آخر میں غزوات پر

ا میں تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ان لڑائیوں کا مقصد قتل و غارت گری یا ہوسِ ملک گیری نہیں بلکہ محض اسلام کی تبلیغ اور عرب میں امن و امان کا قیام تھا۔

سیرۃ النبی [حصّہ دوم] یہ بھی شبلی ہی کی تصنیف ہے جو محض ایک مسودہ کی صورت میں تھی اور جگہ جگہ سے بیاضیں چھوٹی ہوئی تھیں ا
صاحب نے ان کو مکمل کرکے ۱۹۲۰ میں شائع کیا، اس میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت، عرب قبائل کا قبولِ اسلام، مدینہ میں اسلامی
ت کی تاسیس، شریعت کی تکمیل، وفاتِ نبوی، رسولِ اکرمؐ کے عادات و اخلاق، ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیت کے حالاتِ زندگی اس طرح
ئے گئے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ کی پیغمبرانہ صداقت اور اُن کی اخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

سیرۃ النبی [جلد سوم] سیرت کی سوم تا ششم چار جلدیں سید صاحب کی ان کی اپنی طبع زاد تصانیف ہیں اور ان کی حیثیت سیرت
، دو حصّوں کے تکملہ کی سی ہے اور ان سے اُن کا مقصد اسلامی تعلیمات کی تفصیلات پیش کرنا ہے، سیرت کی یہ تیسری جلد ۱۹۲۴
ائع ہوئی، اس میں پہلے معجزہ کی حقیقت اور قرآن مجید، قدیم و جدید فلسفہ اور علم کلام کی روشنی میں معجزہ کے امکانِ وقوع سے
ی گئی ہے اور پھر مکالمۂ الٰہی، نزولِ ملائکہ، رویا، معراج اور شرحِ صدر کی تفصیلات پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں خصائص
، کا ذکر ہے۔

سیرۃ النبی [جلد چہارم] سیرت کی یہ جلد ۱۹۳۲ میں شائع ہوئی، اس میں پہلے منصبِ نبوّت پر ایک تفصیلی مقدمہ ہے جس میں
کی حقیقت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے لوازم و شرائط بیان کئے گئے ہیں، پھر اللہ پر ایمان، ملائکہ،
، رُسل اور کتبِ سماوی پر ایمان کی بحث ہے، پھر عالمِ برزخ، جزا و سزا، جنّت و دوزخ اور قضا و قدر کے مباحث ہیں
خر میں ایمان کے نتائج کا بہ تفصیل جائزہ لیا ہے۔

سیرۃ النبی [جلد پنجم] سید صاحب کی یہ تصنیف ۱۹۳۵ میں منظرِ عام پر آئی، سیرت کی یہ جلد اسلامی عبادات کی تفصیلات
ہے، اس میں پہلے اعمالِ صالحہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور پھر ان عبادات کو جسمانی عبادات اور قلبی عبادات میں تقسیم کرکے
فصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، جسمانی عبادات سے مراد نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد ہیں اور قلبی عبادات سے مراد
، اخلاص، توکل اور صبر و شکر وغیرہ ہیں، اس سلسلے میں اسلامی عبادات کا دوسرے مذاہب کی عبادتوں سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

سیرۃ النبی [جلد ششم] سیرت کی یہ جلد ۱۹۳۸ میں شائع ہوئی اور اس میں اخلاقیات سے بحث ہے، اس میں پہلے اسلام
خلاقِ حسنہ کا تعلق ظاہر کیا گیا ہے اور پھر دنیا کے تمام اخلاقی معلموں میں رسولِ اکرمؐ کی امتیازی شان پر روشنی ڈالی
، اور پھر انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض اور اخلاقِ فاضلہ اور اخلاقِ رذیلہ کی تفصیل ہے اور آخر میں آدابِ معاشرت
ی ذکر ہے۔

سیرتِ عائشہ: بی بی عائشہ کی سیرت پر سید صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے کام شروع کردیا تھا مگر اس کی
ں دیر لگ گئی چنانچہ وہ کتابی صورت میں ۱۹۲۰ میں منظرِ عام پر آئی، اس میں بی بی عائشہ کے حالاتِ زندگی اور ان کی علمی،
ور سیاسی خدمات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی بی بی عائشہ اور حضرت علیؓ کے تعلقات اور جنگِ جمل
ے میں جو غلط واقعات مشہور ہیں اُن کی تردید کی ہے۔

خطباتِ مدراس: یہ سیرۃ النبی پر آٹھ خطبے ہیں جو سید صاحب نے مدراس کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا
ت پر ۱۹۲۵ میں مدراس میں دیئے تھے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے اس میں ایک نئے نقطۂ نظر اور نئے ڈھنگ
تِ نبوی کے مختلف اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور رسولِ اکرمؐ کی تاریخی حیثیت، ان کی جامعیت و کاملیت اور
زندگی کے عملی پہلوؤں کو اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ساری دنیا رسولِ اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے چراغ
انے پر راضی ہوجائے۔

عرب و ہند کے تعلقات: یہ سید صاحب کے اُن لیکچرز کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کے بلاوے پر

۱۹۲۹ میں دیئے تھے جو بعد میں اکیڈمی کی طرف سے کتابی صورت میں شائع ہوئے، یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب عرب و ہند کے تعلقات کے آغاز کی تفصیلات پر مشتمل ہے، دوسرے باب میں ان دونوں کے تجارتی تعلقات سے بحث کی گئی ہے، تیسرے اور چوتھے باب میں بالترتیب ان دونوں کے علمی اور مذہبی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پانچویں باب کا موضوع ہے ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی اسلامی فتوحات سے پہلے، آخر میں سندھ و ملتان میں مسلمانوں کی آبادی کا حال بھی بیان کیا ہے، بحیثیت مجموعی اس میں عرب و ہند کے تعلقات کے ایسے گوشوں کو روشنی میں لایا گیا ہے جو اب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل تھے۔

عربوں کی جہازرانی: یہ سید صاحب کے اُن خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی دعوت پر ۱۹۴۰ میں انجمن اسلام ہال میں دیئے تھے، جنھیں بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا، یہ چار خطبوں پر مشتمل ہے، اس میں پہلے افادات عرب اور قرآن مجید سے عربوں کی جہازرانی کے ثبوت دیئے ہیں اور عہدِ رسالت و عہدِ خلافت کی بحری سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے اور پھر دنیا کے سمندروں سے عربوں کی واقفیت، عربوں کے آلاتِ جہازرانی اور ان کی بحر محیط کو عبور کرنے کی کوششوں پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں عربوں کی بحری تصانیف کا اجمالی ذکر ہے۔

خیام: سید صاحب نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس پٹنہ منعقدہ ۱۹۲۰ میں عمر خیام پر ایک تحقیقی مقالہ پڑھا تھا جو بہت پسند کیا گیا، یہی مقالہ کچھ اضافوں کے ساتھ ۱۹۳۳ میں کتابی صورت میں شائع ہوا، اس میں پہلی بار عمر خیام کے حالاتِ زندگی بڑی شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور اس کے علمی کارناموں پر مفصل تبصرہ کرکے دکھایا ہے کہ وہ کوئی رند شاہد باز نہیں بلکہ اپنے زمانے کا بہت بڑا فاضل، حکیم، ہیئت داں، منجم، ریاضیات کا ماہر اور ایک صوفی مشرب فلسفی تھا۔

نقوشِ سلیمانی: سید صاحب نے وقتاً فوقتاً اردو زبان و ادب اور اس کی تاریخ سے متعلق جو مقالات لکھے اور مختلف جلسوں میں جو خطبات پڑھے تھے انھیں اس میں یکجا کر دیا گیا ہے، یہ کتابی صورت میں پہلی بار ۱۹۲۹ میں منظر عام پر آئی، اس میں اردو زبان کی پوری تاریخ کے علاوہ ان مسائل کا بھی ذکر ہے جو سید صاحب کے عہد میں ہندوستان کے سیاسی افق پر ابھرے۔

رحمتِ عالم: یہ رسولِ اکرمؐ کی سیرت ہے جو بچوں کے لئے لکھی گئی اور ۱۹۳۹ میں شائع ہوئی زبان آسان اور سہل ہے اور اسلوب بچوں کو اپیل کرنے والا، لہٰذا یہ کتاب کافی بہت سے مدارس میں رائج ہے۔

حیاتِ شبلی: یہ شبلی کی سوانح حیات ہے جس کو سید صاحب نے کئی سال کی محنت کے بعد مکمل کیا، ۱۹۴۳ میں شائع ہوئی، یہ سید صاحب کی آخری تصنیف تھی، اس میں انھوں نے اپنے شفیق استاذ کے ذاتی حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی اور اصلاحی کارناموں کا بھی بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے، کتاب کی ابتدا میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں اودھ اور اس کے مشرقی اضلاع خصوصاً اعظم گڑھ کی کئی صدیوں کی علمی، دینی، اخلاقی اور روحانی تاریخ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ آگئی ہے، اس طرح یہ کتاب صرف شبلی کی سوانح حیات ہی نہیں بلکہ ان کے عہد کے مسلمانوں کی مذہبی، علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی اور قومی تاریخ بھی ہے۔

مکتوبِ فرنگ اور یادِ رفتگاں: یہ دونوں کتابیں بھی سید صاحب کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکی تھیں، مکتوبِ فرنگ میں سید صاحب کے خطوط ہیں جو انھوں نے تحریک خلافت کے سلسلے میں یورپ کے سفر پر روانہ ہونے کے بعد لندن سے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو لکھے تھے یہ کتاب ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی۔

یادِ رفتگاں سید صاحب کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے وفیات کے نام سے مختلف عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی موت پر وقتاً فوقتاً لکھے تھے، اس کو بھی سید صاحب نے اپنی زندگی ہی میں مرتب کر دیا تھا، مگر یہ شائع ہوئی ان کی وفات کے بعد۔

ارمغانِ سلیمان: یہ سید صاحب کے اردو کلام کا مجموعہ ہے اور اس میں ان کا وہ تمام کلام یکجا کر دیا گیا ہے جو انھوں نے اپنی تعلیمی زمانے سے لے کر آخر عمر تک موزوں کیا، سید صاحب رمزی تخلص کرتے تھے اور اس مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ سید صاحب کی نعتیہ اور قومی نظمیں، مراثی، قطعات اور رباعیات سبھی شامل ہیں۔

مقالات سلیمان | جلد اوّل، دوم، سوم | یہ سید صاحب کے وہ مقالات ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر لکھے، دارالمصنّفین نے ان کو ان کی افادیت کے پیش نظر مختلف موضوعات میں تقسیم کرکے کتابی صورت میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، اب تک ان کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں پہلی جلد میں ان کے تاریخی مقالات ہیں، دوسری میں ان کے علمی وتحقیقی مقالات اور تیسری میں ان کے مذہبی مقالات ہیں۔

معارف : سید صاحب نے اپنے دوستوں کے اشتراک سے شبلی کی ایک دیرینہ تمنا کو پورا کرنے کے لئے 1915 میں دارالمصنّفین کی بنیاد رکھی اور ۱۹۱۶ء میں معارف جاری کیا جو دریائے دجلہ اور فرات کی طرح آج بھی اپنے فیضان سے علم وعرفان کے متلاشیوں کی پیاس بجھا رہا ہے، اس میں سید صاحب کے ایک دو نہیں سینکڑوں مضامین ومقالات شائع ہوئے، علمی، ادبی، لسانی، مذہبی، مختلف موضوعات پر، اور ہر مقالہ مواد، تحقیق اور جامعیت کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے۔

ان مضامین ومقالات کے علاوہ معارف کے ہر شمارہ میں سید صاحب کے شذرات اور تبصرے بھی ہوتے تھے جو مذہبی، قومی اور ملّی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔

سید صاحب اپنے علم وفضل میں ایک دائرۃ المعارف تھے، ان کی علمی زندگی ایک اتھاہ سمندر تھی، انھوں نے اپنی تحریروں سے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری، ذہنی اور تعلیمی زندگی کے ہر گوشہ کو متاثر کیا، ان کے وسعت مطالعہ، ذوق تحقیق اور اصابت رائی کے سبھی قائل تھے، ان کا قلم نرم رو اور سبک مزاج تھا اور تنقید کے نازک سے نازک موڑ پر بھی جادۂ اعتدال سے ہٹتا نہ تھا، وہ ہر موضوع پر اس اعتماد سے قلم اٹھاتے تھے کہ بعض اوقات اختلاف رائے کے باوجود کسی کو ان پر نکتہ چینی کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، ان کی تصنیفات وتالیفات، ان کے مضامین ومقالات، ان کی تقاریر وخطبات، پرانے اور نئے دونوں قسم کے تعلیم یافتہ طبقوں میں پسندیدہ اور مقبول تھے، ہر ایک ان کی قدر کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا تھا۔

سید صاحب نے اپنے علمی کارناموں کے ذریعہ ایک طرف علماء کو اپنے حجروں، مکتبوں، متن اور حاشیوں کے چکر سے باہر نکالا، ان میں ذوق تحقیق وتنقید پیدا کیا اور ان کے منہ میں وقت کی زبان رکھی تو دوسری طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقے میں بھی اسلامی تاریخ سے دلچسپی پیدا کی، انھیں اپنی قومی روایات کا احترام کرنا سکھایا اور ان کو مغرب کی اندھی تقلید سے نجات دلا کر مشرق کے سیدھے اور سچّے راستے پر چلنے کی تعلیم دی، اس طرح آج علماء سے لے کر مغربی تعلیم یافتہ طبقہ تک، ہر گروہ میں، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم وفنون اور اسلامی ادبیات کو وقت کی قدروں کی روشنی میں پرکھنے اور انھیں عوام کے سامنے ایک خوشگوار اسلوب، نئی اور مانوس زبان میں پیش کرنے کی جو ایک عام فضا سی بن گئی ہے وہ سرتاسر سید صاحب کی دین ہے۔

(۳)

اسلامی تاریخ میں سید صاحب کے صحیح مقام کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان حالات کو ذہن میں رکھنا ہوگا جن حالات سے اس عہد کا ہندوستانی مسلمان گزر رہا تھا۔ اس عہد کی تاریخ کو ہم مسلم نقطۂ نظر سے دو حصّوں میں بانٹ سکتے ہیں، سنہ ستّاون سے پہلے اور سنہ ستّاون کے بعد، سنہ ستّاون سے پہلے مسلمانوں کے سامنے چاہے کتنے ہی اقتصادی اور سیاسی مسائل رہے ہوں مگر کوئی ثقافتی اور مذہبی مسئلہ نہ تھا، مرکزی اور صوبائی سطح پر جگہ جگہ انھیں کی حکومتیں تھیں، مسلمان اپنی مذہبی اور ثقافتی قدروں کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے آزاد تھے، ان کا کسی اور مذہب یا ثقافت سے کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔

سنہ ستّاون کے بعد یہ صورتِ حال باقی نہ رہی، اب وہ حاکم نہیں محکوم تھے اور محکوم بھی انگریزوں کے جو تاجر کے بھیس میں ہندوستان آئے اور آہستہ آہستہ پورے ہندوستان کو اپنا زرخرید غلام بنا لیا، انگریزوں نے حکومت چونکہ مسلمانوں سے لی تھی اس لئے وہ ان سے ڈرتے تھے اور ہمیشہ ایسی ریشہ دوانیوں میں لگے رہتے تھے جو انھیں مذہبی، ثقافتی، اخلاقی، اقتصادی ہر اعتبار سے نکمّا کر کے رکھ دے اور وہ دوبارہ سر ہی نہ اٹھا سکیں، اس کے لئے انھوں نے متعدد محاذ کھولے اور ہر محاذ سے پوری شدت کے ساتھ حملہ کرنا شروع کر دیا۔

ان حملوں میں سب سے زیادہ مہلک حملہ وہ تھا جو انھوں نے مسلم ثقافت پر کیا، ایک طرف ان کی مشنریاں گلی گلی گھوم کر اسلام اور رسول اکرمؐ کے خلاف کھلم کھلا زہر اگل رہی تھیں اور دوسری طرف ان کے نام نہاد اسکالرز، علم وتحقیق کے نام پر اسلامی روایات کو توڑ موڑ کر اس انداز سے پیش کر رہے تھے کہ خود مسلمان اپنی مذہبی اور ثقافتی قدروں سے شرمانے لگیں، اس حملہ کے تدارک کے لئے ایسے علماء کی ضرورت تھی جو دینی بصیرت کے ساتھ ساتھ تلاش وتحقیق کے جدید اصولوں سے بھی واقف ہوں اور ان مستشرقین کے حملوں کا جواب خود ان کی اپنی زبان میں دے سکیں۔

وقت کی اس ضرورت کو سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے محسوس کیا، ان کی دوررس نگاہوں نے مسلمانوں پر آنے والی اخلاقی اور دینی تباہی کا نظارہ وقت سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا، چنانچہ وہ اپنی سمجھ اور طاقت کے مطابق مختلف طریقوں سے اس کے تدارک میں لگ گئے "اسباب بغاوت ہند" سے لے کر "خطباتِ احمدیہ" تک، "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام تک، ان کی ہر کوشش اس سمت میں ایک اگلا قدم تھا، مگر چونکہ وہ اس راہ کے پہلے راہرو تھے اور انگریزی تہذیب اور انگریزی علوم سے بے حد مرعوب بھی تھے اس لئے ساری نیک نیتوں کے باوجود انھوں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں اور انگریزوں اور مسلمانوں کو قریب لانے کے جوش میں خود اسلامی عقائد و تعلیمات کی ایسی تاویلیں کرنی شروع کر دیں جو اسلام کی بنیادی روح کے ہی خلاف تھیں۔

سر سید کی ان فکری اور اجتہادی کمزوریوں کو شبلی نے محسوس کیا، وہ سر سید کے ایک اہم رفیق کار تھے، سر سید کی طرح شبلی نے بھی مخالف ہواؤں کے رُخ کو پہلے ہی پہچان لیا تھا، مگر اس کے تدارک کے لئے سر سید جو کچھ کر رہے تھے اس سے ان کو اختلاف تھا، ان اختلافات نے آخر کار رنگ لایا اور ایک خاص موڑ پر پہنچ کر دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

سر سید کے مقابلے میں شبلی علومِ اسلامیہ کے زیادہ ماہر تھے، اسلامی تاریخ پر ان کی نظر گہری تھی اور قدرت نے انھیں ایک حساس دل اور بیدار دماغ عطا کیا تھا، علاوہ ازیں سر سید کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے انھیں وقت کے نئے تقاضوں کا بھی پوری طرح علم تھا، وہ سر سید کی طرح اس ضرورت کے تو قائل تھے کہ مشرق و مغرب کی اس درمیانی خلیج کو پاٹنا چاہئے مگر وہ اس کے لئے تیار نہ تھے کہ ہم اس خلیج کو پاٹنے کی دُھن میں اپنی ثقافتی قدروں سے ہی دست بردار ہو جائیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہ چاہتے تھے کہ پوری اسلامی تاریخ کو جدید علوم، جدید اصول اور جدید تقاضوں کی روشنی میں از سرِ نو اس انداز سے مدوّن کیا جائے کہ مسلمان اس کو پڑھ کر اپنے بزرگوں کے کارناموں پر فخر کر سکیں اور ان میں احساس کمتری کے بجائے خود اعتمادی پیدا ہو۔

اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے دو راستے اپنائے، ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی، انفرادی راستہ یہ تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گئے، ایک طرف اپنے تاریخی، تعلیمی اور سیاسی مضامین کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے میں ایک صحت مند فکری انقلاب لانے کی کوشش کی اور دوسری طرف اپنی گراں بہا تصانیف المامون، الفاروق، الغزالی، سیرۃ النعمان اور سوانح مولانا روم کے ذریعے ان میں یہ احساس جگایا کہ مسلمانوں کا ان کا اپنا ثقافتی اور دینی سرمایہ زیادہ قیمتی ہے، اور مغربی تہذیب کے سکّے کھوٹے ہیں۔ اجتماعی راستہ یہ تھا کہ وہ ندوہ سے منسلک ہو گئے اور اپنی ساری صلاحیتیں اس کوشش میں لگا دیں کہ ندوہ کے ذریعے علماء و فضلاء اور اسکالرز کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جائے جو مشرقی اور مغربی دونوں علوم میں یکتا ہو اور اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیم کو وقت کے نئے تقاضوں کے مطابق ایک سائنٹفک اور پسندیدہ ڈھنگ سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اجتماعی سطح پر ان کی جدوجہد تو ان کی زندگی ہی میں بار آور ہو گئی، ندوہ نے اپنی پہلی ہی باری میں صفِ اوّل کے ایسے علماء کا ایک اچھا خاصا گروہ پیدا کر دیا جو ان کے بعد بھی ان کے مشن کو جاری رکھ سکے اور مختلف محاذوں سے اسلام پر ہونے والے حملوں کا منہ توڑ جواب دے سکے مگر انفرادی سطح پر انھوں نے جو جدوجہد کی اس میں کسر رہ گئی، ان کی ایک دیرینہ تمنا تھی، نئے تقاضوں کے مطابق سیرۃ النبی کی تدوین، اس کے لئے انھوں نے ۱۹۱۰ ہی میں ایک مستقل شعبہ قائم کیا تھا مگر پھر بھی وہ اس کام کو ادھورا ہی چھوڑ گئے۔

شبلی کے اس ادھورے مشن کو سید صاحب نے پورا کیا، انھوں نے اپنے مشفق استاذ کی آخری تمنا کو پوری کرنے کے لئے دکن کالج کی ملازمت بھی چھوڑ دی اور پوری یکسوئی کے ساتھ شبلی کے بنائے ہوئے خاکے میں رنگ بھرنے کا کام شروع کر دیا۔ دارالمصنفین کا قیام، معارف کا اجرا، سیرۃ النبی کی تدوین، خلفائے راشدین کی اشاعت، سیرۃ الصحابہ و صحابیات کی تکمیل، تاریخ اسلام کی تالیف، قرآن، حدیث، فقہ اور اسلامی تہذیب و تمدن پر وہ ہزاروں مضامین و مقالات جو معارف میں شائع ہوئے یہ سب وہ عظیم الشان کارنامے ہیں جو سید صاحب نے اپنے مٹھی بھر رفقاء کو ساتھ لے کر شبلی کے ایک ادھورے مشن کو پورا کرنے کے لئے ۳۵ سال کے ایک مختصر سے عرصے میں انجام دیئے تھے، اور یہ وہ عظیم الشان کارنامے ہیں جن کی نظیر بیسویں صدی کی پوری تاریخ میں، ہندوستان کے علاوہ مشرق و مغرب کے کسی اور

گئے ہیں، اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔

ان سارے کارناموں میں سیّد صاحب کی سیرۃ النبی اور ان کے خطبات مدراس کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، سیرۃ النبی رسولِ اکرمؐ کی صرف ایک سوانح حیات نہیں بلکہ ایک ایسا صحیفہ بھی ہے جو پورے اسلامی نظام حیات کو ایک مکمل اور دلنشیں صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، اس میں رسولِ اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کی مکمل تصویر کے علاوہ ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہے جو اس تصویر کو داغدار بنانے کے لئے مخالفین نے بڑی چالاکی سے پھیلا رکھی ہیں، خطبات مدراس اس سیرۃ النبی کی روح ہے، اس میں بالکل ہی جدید ڈھنگ سے سیرتِ نبوی کے ایسے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے جن کی طرف اب تک ہمارے علماء اور سیرت نگاروں کی نظر بھی نہیں گئی تھی، اس کو پڑھ لینے کے بعد پھر اس میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ رسولِ اکرم خاتم النبیین ہیں اور ان کا لایا ہوا نظامِ حیات ایک مکمل نظامِ حیات ہے جس کے بعد کسی اور نظامِ حیات کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

ان ساری تفصیلات سے ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مختلف علماء دین نے تجدید واحیائے دین کی خاطر، مسلمانوں میں اپنے ثقافتی ورثہ کی اہمیت کا احساس جگانے اور مغربی تہذیب کے مقابلے میں ان کے احساسِ کمتری کو دور کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً اپنی زبان اپنے قلم سے جو جہاد کیا ان میں تین شخصیتیں بے حد نمایاں ہیں، سرسیّد، شبلی اور سیّد صاحب، سرسیّد نے اس سلسلے میں پہل کرنے کی جرأت کی، شبلی نے انکی غلطیوں کو درست کرکے ان کے اس مشن کو صحیح سمت میں آگے بڑھایا اور سیّد صاحب نے اپنی بے پناہ علمی صلاحیت اور مسلسل محنت سے اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔

مگر یہاں ایک بات پھر بھی رہ جاتی ہے جس کا ذکر کئے بغیر سیّد صاحب کی جدوجہد کا خاکہ پورا نہیں ہوتا، اس عام حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ ایک ادیب، ایک مصنّف، ایک عالم جب ایک مضمون، ایک مقالہ، ایک کتاب لکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس اس کا اپنا یا کسی اور کا جس کو وہ پسند کرتا ہے ایک پیغام ہے جو وہ ان وسائل کی مدد سے دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اپنے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے جس قدر موثر وسائل اختیار کرے گا اتنا ہی اس کا فائدہ بھی عام ہوگا، مگر سرسیّد سے لے کر سیّد صاحب تک دین اسلام کے فطری پیغام کو عام کرنے کے لئے جو وسائل اختیار کئے گئے ہیں ان کی پہنچ بہت محدود تھی، وہ رسالوں، کتابوں اور اداروں سے آگے نہ بڑھ سکا، اس سے متاثر ہوا بھی تو صرف پڑھا لکھا طبقہ، عوام اور خاص طور پر مسلم عوام تک اس کی آواز پہنچ نہ سکی۔

انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں مغربی ممالک میں جو سیاسی، معاشی یا ادبی انقلابات آئے ان کے پس منظر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان انقلاب لانے والوں نے اپنے پیغام کو زندہ اور جاری وساری رکھنے کے لئے صرف مضامین، مقالے یا کتابوں کا سہارا نہیں لیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس کو ایک مستقل تحریک کی شکل دیدی جس کو چلانے کے لئے ایک منظم طاقت، ایک مستقل جماعت ہر پل ہر گھڑی سرگرم عمل رہتی تھی۔

ہم سرسیّد، شبلی یا سیّد صاحب کی کوششوں کو لاکر علی گڑھ تحریک، ندوہ تحریک اور دارالمصنّفین تحریک کے نام سے یاد کرلیں لیکن سچ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں یہ تحریکیں نہ تھیں بلکہ چند عظیم شخصیتوں کی مخلصانہ مگر انفرادی کوششیں تھیں جو ان شخصیتوں کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد رسالوں، کتابوں اور اداروں میں بند ہو کر رہ گئیں، ان کا فائدہ اتنا عام نہ ہوا جتنا ہونا چاہئے تھا۔ اس کمی کو ابوالاعلیٰ مودودی نے پورا کیا، انھوں نے ان تین عظیم شخصیتوں کے اس مشن کو ایک تحریک کی شکل دی، اور اس کو عوام تک پہنچانے کے لئے ایک منظم طاقت اور ایک مستقل جماعت بھی پیدا کر دی۔

ابوالاعلیٰ مودودی کا رشتہ سرسیّد، شبلی اور سیّد صاحب سے جوڑنا اور ان کی تحریک کو سیّد صاحب کے مشن کا تکملہ قرار دینا بعض لوگوں کو عجیب سا لگے گا مگر جو لوگ شبلی سے، ندوہ سے، سیّد صاحب سے اور معارف سے ابوالاعلیٰ مودودی کے قریبی تعلق کو جانتے ہیں، جنھیں یہ معلوم ہے کہ سیّد صاحب کے پاکستان پہنچنے کے بعد سب سے پہلے جن لوگوں نے انکا استقبال کیا وہ ابوالاعلیٰ مودودی اور انکے رفقاء تھے یا جن کو اس کا علم ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستور کی تدوین کی خاطر حکومت کی طرف سے ادارۂ تعلیمات اسلام کے نام سے جو ادارہ قائم ہوا تھا اس کی صدارت کے لئے سیّد صاحب کو تیار کرنے والے ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقاء ہی تھے، انھیں ہماری اس رائے سے بالکل حیرت نہیں ہوگی۔

سیّد صاحب کو قدرت نے پاکستان میں ادارۂ تعلیمات اسلام کی صدارت کی صورت میں ایسے مواقع او رذرائع عطا کر دیئے تھے جن سے وہ اپنے زندگی بھر کے مشن کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہوسکتے تھے مگر کچھ قدرت کی مصلحت، کچھ پاکستانی سیاست اور کچھ سیّد صاحب کی اپنی صحت وہ اپنی زندگی کے اس واحد مشن کو انجام تک پہنچانے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مخمور سعیدی

ادھوری قربتوں کے خواب آنکھوں کو دکھا جانا
ہزاروں دوریوں پر یہ ترا کچھ پاس آجانا

اداسی کے دھندلکوں کا دماغ و دل پہ چھا جانا
نظر کے سامنے اک گم شدہ منظر کا آجانا

سُنی ہے میں نے اکثر بند دروازوں کی سرگوشی
صدائیں چاہتی ہیں سب، کھلی سڑکوں پر آجانا

تعلّق کی یہ منزل بھی ہماری راہ میں آئی
کسی کو ڈھونڈنا لیکن پتہ اپنا ہی پا جانا

نگاہ و دل کے رشتوں کو کہیں رُسوا نہ کر دوں میں
بچھڑنا ہو تو چُپ رہنے کا فن مجھ کو سکھا جانا

تری یادیں، کہ اس طوفانِ ظلمت میں بھی روشن ہیں
ہُوا مشکل ہوا کو اِن چراغوں کا بجھا جانا

سمجھتے تھے حسیں پرچھائیوں کا کیا بھروسہ ہے
مگر ہم نے تری پرچھائیں کو تجھ سے جُدا جانا

خلا میں ڈوبتی سی آہٹیں تھیں کچھ، جنھیں ہم نے
سفر میں ساتھ رکھا، منزلوں کا آسرا جانا

میں تیرے ساتھ ہوں، تو اُس کی خوشبو کے تعاقب میں
جہاں تک جا سکے اے سرپھری موجِ ہوا، جانا

نظر اس کی بھی اے مخمورؔ دھوکا کھا گئی آخر
وہی تھا آشنا چہرہ جسے نا آشنا جانا

● ۳۲۰۰- پھاٹک تیلیان۔ ترکمان گیٹ۔ نئی دہلی ۶

سرشار بلند شہری

کبھی گُل کے کبھی گلزار کے بوسے
جبیں کے چشم کے رخسار کے بوسے

لہو کی سرخیوں میں پہ بہ پہ ہمدم
مہکتے ہیں تری دیوار کے بوسے

لہو کی سرکشی میرا مقدّر ہے
مجھے مرغوب ہیں تلوار کے بوسے

فلک تکتا رہا حیرت سے اس کا منہ
زمیں لیتی رہی رفتار کے بوسے

ہوا میں سربہ سر اعجاز ہے کوئی
خلا میں ثبت ہیں اسرار کے بوسے

● چوبیٹرل کی چال، دودیشور روڈ۔ احمد آباد (گجرات)

دریدہ

اقبال متین ● اے سی ٹی-۲۰، دودھ گانو کالونی، پوچم پڑ، ۵۰۳۲۱۹ (آندھرا پردیش)

میں نے بستر پر اتنا بے خواب اور بے آرام آدمی نہیں دیکھا۔ مجھے راتوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ وارڈن سے کہہ کر اپنا کمرہ بدل لوں لیکن یہ سب کچھ اس طرح ہو کہ اس کو شائبہ تک نہ ہو کہ اس تبدیلی میں میری اپنی کاوشیں شامل ہیں۔

نیند کے ساتھ ایسا برتاؤ میں نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے رات بھر وہ نیند کے شیش محل پر پتھراؤ کرتا رہتا ہے۔ یا کچھ اس طرح اپنی آنکھوں میں خود ہی سوئیاں چبھوتا رہتا ہے کہ اس کے پپوٹوں کو خبر نہیں ہوتی۔ میں بھلا اس کی اس کیفیت کو کس طرح بیان کر سکتا ہوں ——— آپ کو آنکھ میں کنکر کی کھٹک تو یاد ہوگی۔ آپ کو گنج سے گزرتے ہوئے ہوا میں اڑتی ہوئی مرچ کی بکنی کی 'ڈھانس' کے پل بھر کو آنکھوں سے چھو جانے کا تجربہ کبھی تو ہوا ہوگا۔ آپ نے میٹرک کے امتحان کی تیاری میں ٹھنڈے پانی کے چھپاکے آنکھوں پر لگا لگا کر منٹ بھر ہی میں پھر سے اونگھ جانے کی تکلیف کبھی تو برداشت کی ہوگی، آپ کبھی کسی سرائے میں اس بستر پہ تو سوئے ہوں گے جس میں کھٹمل ہی کھٹمل بھرے ہوئے ہوں اور آپ کو اس وقت پتہ چلا ہو جبکہ آپ کی نیند ٹوٹی ہو اور اس وقت تک وہ آپ کے کپڑوں میں رہ بس کر آپ ہی کے بدن کا ایک حصہ بن گئے ہوں۔ ایسی ہی کیفیات سے وہ رات رات بھر دو چار رہتا ——— برابر کے بستر پر کوئی تڑپ رہا ہو تو رات سکون سے کس طرح کٹ سکتی ہے۔

مجھے یاد ہے۔ بہت اچھی طرح یاد ہے۔ جھنجلاہٹ اور غصے سے مجھ پہ جو کچھ بیت رہی تھی اس کا دہرانا بھی مشکل ہے۔ ابھی ہم ٹریننگ کیمپ میں ایک دوسرے کے روم میٹ ROOM MATE نہیں ہوئے تھے۔ ہوسٹل کی جان پہچان تھی اور قریبی تھی۔ شاید ابھی تو ہمارا سلکشن SELECTION بھی نہیں ہوا تھا۔ گرمی شدید تھی۔ گھٹن کا وہ عالم تھا کہ سائیں سائیں کے لئے جی ترس گیا تھا۔ میں نے شہر کی گھٹی گھٹی فضاؤں سے اکتا کر اپنے گاؤں پہونچنے کی اسکیم بنا لی تھی جہاں میرے بھائی کی زمینات تھیں۔ باولیاں تھیں۔ باغ تھے۔ یہ سب کچھ ہمارا مشترکہ ورثہ تھا۔ میرے خاندان کے چھوٹے بڑے ایک حد تک میرے مخالف تھے کہ اتنی ساری زمینات اور جائداد رکھ کر میں نے سب کچھ بڑے بھائی پر چھوڑ دیا تھا۔ ان کا ہاتھ نہیں بٹاتا۔ گاؤں سے اس طرح بھاگتا، جیسے کوئی کال کوٹھری سے بھاگتا ہے ——— یہاں ان تفصیلات کی سچ پوچھئے تو ضرورت نہیں ہے لیکن میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ آپ میری آؤ بھگت، میرے مان پان کا اندازہ کر سکیں جب میں گاؤں کی طرف رخ کرتا ——— بھیا ایمان دار آدمی تھے، بھابھی کچھ کم نہ تھیں۔ میں گاؤں جاتا تو وہ لوگ اس طرح رجھاتے جیسے میں کوئی رشتہ جوڑنے آگیا ہوں۔ وہ چاہتے بھی یہی تھے کہ یہاں کی زمین سے میرا رشتہ اس حد تک اٹوٹ ہو جائے کہ گاؤں میرے پیروں میں بیڑیاں پہنا سکے۔

مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی اکیلا بھی اپنے گاؤں گیا ہوں۔ دو چار دوست ہمیشہ ساتھ رہتے۔ میں ادھر کا رخ کرنے کی اسی وقت سوچ سکتا تھا جب میرے دوست راضی ہو جاتے۔ بھیا ہم سب کی مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ میں اور میرے دوست شہزادوں کی طرح گاؤں میں رہتے۔ ہر طرح کا آرام ہمیں حاصل رہتا۔ ہماری ہر خواہش پوری کی جاتی۔ ایسے ماحول میں بھی ہم نے اس کو بستر پہ بے آرام دیکھا۔ لیکن کھلی فضا میں تین چار پلنگ پڑے ہوں تو کون کسی کی کروٹیں گنتا ہے۔ میں نے تو ان ساری باتوں کا محاسبہ اس وقت کیا جب وہ میرا

روم میٹ ہوگیا۔ اسی لئے آج کمرے کی بوجھل فضا میں یادوں نے یاروں کی طرح ڈیرہ جما رکھا ہے۔

ہم چھ دوست بس میں سوار ہیں۔ بھیا کو اطلاع دیدی گئی ہے کہ ہم آ رہے ہیں۔ بس فراٹے بھر رہی ہے۔ ڈرائیور انتہائی RASH اور غیر محتاط ہے کہ سواریاں جانکنی کے عالم میں دم سادھے بیٹھی ہیں ـــــ سائڈ ریلنگس SIDE RELINGS پر رکھی ہوئی چیزیں ادھر اُدھر گر رہی ہیں۔ ذرا سا موڑ آئے تو کونوں پر بیٹھی ہوئی سواریاں بہ مشکل خود کو اپنی سیٹ پر سنبھال سکتی ہیں۔ ایک عورت کی گود سے اس کا شیر خوار بچہ نکل گیا ہے اور برابر کے ایک مرد نے جھپٹ کر اس کو سنبھال لیا ہے۔ اوپر سے ایک تربوزہ ایک صاحب کے سر پر گر کر تڑاخ سے دو ٹکڑے ہوگیا ہے۔ ہم لوگ بہ دقت تمام اپنی ہنسی روک سکے ہیں۔ اب تو آہستہ آہستہ ساری سواریاں اپنا صبر و تحمل کھو رہی ہیں۔ اور کنڈکٹر سے احتجاج کر رہی ہیں کہ ڈرائیور کو ایسی RASH DRIVING سے منع کرے۔ بس کے اندر زندگیاں اتنی غیر محفوظ لگ رہی ہیں کہ جیسے پل بھر میں کسی کھڈ میں گر پڑنا یا کسی درخت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا یقینی ہے اور وہ سو رہا ہے۔ کبھی اس طرف کو ڈھلک جاتا ہے، کبھی کسی کے کندھے پر سر رکھ دیتا ہے کبھی زانو پر جھک کر میلے کے اس بڈھے کی طرح سر ہلاتا ہے جس کی گردن اور سر کو ایک مہین تار کے ذریعہ جوڑ دیا گیا ہو۔

بس کے مسافروں نے ڈرائیور سے راست احتجاج شروع کر دیا ہے۔ ان کی مجہول آوازیں بلند ہوگئی ہیں۔ خدشہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ڈرائیور سب کی سن رہا ہے پیمائی کئے جا رہا ہے۔ بہت سے لوگ بے اطمینانی سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور وہ سو رہا ہے۔ آخر سب نے بس روکنے کا مطالبہ کیا۔ ڈرائیور نے بس نہیں روکی، رفتار کم کر دی ہے۔ لوگ مطمئن ہو کر اپنی اپنی جگہ سنبھال چکے ہیں۔ اب بس اس طرح چل رہی ہے جس طرح بس چلتی ہے۔ بس کے مسافر بے بسی سے نجات پا چکے ہیں۔ اس کی نیند میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ادھر اُدھر جھولنے والا سر بہت اطمینان سے کسی شانے پر ٹک گیا ہے۔ اس کو اس طرح سوتا دیکھ کر ہم سب کو حیرت ہو رہی ہے۔ سورج کے اجالے کب کے جا چکے ہیں۔ شام ڈھل رہی ہے۔ دوڑتی ہوئی رات اپنے سیاہ پردوں میں آہستہ آہستہ مسافروں سمیت بس کو سمیٹ رہی ہے ـــــ ڈرائیور نے پھر اسپیڈ بڑھا دی ہے۔ لگتا ہے بس کے سامنے پھیلے ہوئے اجالوں کا اندر کی تاریکیاں تعاقب کر رہی ہیں۔ لیکن اجالے بگٹٹ بھاگ رہے ہیں۔ مطمئن مطمئن سے بیٹھے ہوئے مسافروں میں پھر کھلبلی سی مچنے لگی ہے۔ اونگھنے والے لوگ آہستہ آہستہ بیدار ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ ہر بات سے بے نیاز سو رہا ہے۔ ایسی نیند ہم نے کبھی نہیں دیکھی ـــــ بس میں پھر وہی تماشہ ہو رہا ہے جو دن کے اجالے میں ہو رہا تھا۔ مسافروں نے پھر احتجاج شروع کر دیا ہے۔ آوازیں لگا کر اندر کی روشنیاں کھلوا لی ہیں۔ اس کو نہ اندر کے اندھیروں سے کوئی تعلق ہے نہ باہر کی روشنیوں سے۔ وہ صرف سو رہا ہے اور بس۔ میرے ایک دوست نے بگڑ کر اس کو جھنجوڑ دیا ہے کیوں کہ اس کا سویا ہوا بدن ڈھے کر میرے دوست کے زانو پر پڑا تھا جو اس کا بھی دوست تھا۔ ہم سب ہی اس پر برہم ہیں ـــــ جھنجوڑنے پر وہ اٹھ بیٹھا ہے۔ ہم سے اس طرح سفر کی روئداد سن رہا ہے جیسے وہ اس سفر میں شریک ہی نہیں ہے۔ بس فراٹے بھر رہی ہے۔ لگتا ہے ڈرائیور نے اکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ پھر سے بڑھا دیا ہے۔ بے بیکنی سی بے چینی پھیل رہی ہے۔ ہمارے غصے اور جھلاہٹ پر وہ کہہ رہا ہے کہ یار و سو جاؤ۔ اس وقت یہی ایک طریقہ ہے شانت اور پرسکون رہنے کا۔ اگر بس کو کچھ ہو ہوا گیا تو، یہی ہوگا تا کہ اپنی نیند طویل ہو جائے گی۔ سوتے رہنے میں بڑے فائدے ہیں۔ اس نے بات ختم ہی کی ہوگی کہ پھر اونگھنے لگا۔ جی چاہا گردن مروڑ کر اس کو بس کے باہر پھینک دیں۔ لوگوں کو زندگی کی پڑی ہے اور وہ سو رہا ہے۔ اس کو خطرے سے آگاہ کر دیا گیا ہے اور وہ سو رہا ہے۔ سولی پر چڑھ کر آدمی کس طرح سو سکتا ہے لیکن وہ سولی پر چڑھ کر بھی سو رہا ہے۔

خدا خدا کر کے بس ہماری منزل تک آ پہونچی۔ بس رکی تو دوسرے مسافروں نے ہمیں زندہ سلامت پہونچ جانے پر مبارکباد دی۔ اور ان کے لئے دعا کرنے کی التجا کی۔ ہم نے کہنیاں مار کر اسے بیدار کیا۔ جماہی لے کر وہ بس سے اتر پڑا۔ اور اتر کر اس نے پھر لمبی لمبی جماہیاں لیں۔

گاؤں پہونچ کر کچھ ہی دیر بعد ہم تازہ دم ہو گئے۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکوں نے بوجھل پن کو دور کر دیا تو گردن پر بھیگے ہاتھوں کے

لس نے اور تازگی بخشی ۔ پھر ٹخنوں تک پاؤں دھلے اور کھانے کی میز پر پہونچنے سے پہلے ہی مرطوبیاں شروع ہو گئیں ۔ وہ اپنے گنجے سر کے چھدرے بالوں پر تولیہ رگڑتا کمرے میں داخل ہوا تو سر سے قدم تک تقریباً بھیگ چکا تھا ۔ بھیا نے اس کا یہ حال دیکھا تو انہیں اس احساس نے بے چین کر دیا کہ شاید ان کی طرف سے کوئی کمی ہوئی ہے ۔ ہم سب اس کی حالت دیکھ کر ہنسنے لگے تو بھیا نے کہا ۔

آپ نے کہہ دیا ہوتا میں فوری نہانے کا انتظام کر دیتا ۔

صوفہ چھوڑ کر بید کی کرسی اس نے اپنے گیلے کپڑوں کے باعث مناسب سمجھی ۔ اور یہ کہتا ہوا بیٹھ گیا کہ باضابطہ نہانا تو ایک رُٹین ROUTINE ہے اور نند دجانتا ہے کہ ان گرمیوں میں تو میں ۲۴ گھنٹوں میں تین چار بار نہاتا ہوں ، رات کا اشنان بھی کبھی اس میں شامل ہے ، کبھی اس کے سوا ہے ۔ لیکن یہ جو گیلے کپڑوں کی تراوٹ ہے ، یہ کچھ اور ہی چیز ہے ۔

بھیا مسکرائے اور اس میں دلچسپی لینے لگے ۔

میں نے بھیا کو فی الوقت صرف اتنا ہی بتلانا مناسب سمجھا کہ ہوسٹل میں جب وہ غائب ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھی اس کو حمام ہی سے برآمد کرتے ہیں ۔

بھیا کھل کر مسکرائے ۔

میں نے کہا یہ تو راتوں کو بھی بستر چھوڑ کر سیدھے نل پر پہونچ جاتا ہے ۔ اور اطمینان سے اشنان کرتا ہے ۔ اپنے اس اشنان کا اس نے موٹا سا نام بھی رکھا ہے ۔ کیا نام ہے ؟

گسلے نیم شا ۔ ایسا ہی کچھ ہے ۔ گسلے نیما شا ۔ بدری بول اٹھا ۔ اس نے اپنی ہنسی ہونٹوں میں دبا لی ۔ کہنے لگا غسلِ نیم شبی ۔ گسلے نیم شا نہیں ۔ بدری ناتھ پنڈت ـــــــــ غسلِ نیم شبی ۔

بھیا نے بالکل اسی طرح دہرایا ۔ غسلِ نیم شبی ۔ اور خوب ہنسے ۔ ہنسنے کے دوران وہ کہتے جاتے تھے " گسلے نیما شا " یعنی غسلِ نیم شبی اور بدری کھسیانا ہو رہا تھا اور میرے وہ دوست بھی مزہ لے رہے تھے جو اس فرق کو نہیں سمجھتے تھے ۔

اس کے چہرے پر چمک سی آ گئی اور وہ راست بھیا سے مخاطب تھا ۔

" آپ فارسی ــ "

جی ہاں ، جی ہاں ۔ آپ کا نند د تو بچپن ہی سے انگلش میڈیم اسکولوں کا ہو رہا اور میں نے آنکھ کھولی گلستاں بوستاں میں ـــ لیکن نند ریکر اتنا نابلد بھی نہیں ہے ۔

اس نے اٹھ کر نہایت ادب سے بھیا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے ۔ اور بڑے پیار سے دبایا ۔

اپنی کرسی پر واپس آتے آتے رک کر اس نے ہم سب کو بتلاتے ہوئے بھیا سے کہا ۔

بھیا جی ـــــــ یہ سارے کے سارے " گسلے نیما شا " ہیں ۔

بھیا خوب ہنسے ۔

میں جی ہی جی میں خوش ہوتا رہا کہ بھیا اس میں دلچسپی لے رہے ہیں ۔ اور بقول اس کے ـــ وہ خلیج پاٹی جا رہی ہے جو ایسی صحبتوں میں میرے دوستوں اور بھیا کے درمیان حائل رہا کرتی ۔

کھانے کی میز پر ہم جمع ہوئے تو اس نے کھاتے کھاتے یکایک بھیا سے پوچھا ۔

" بھیا جی آپ کا قریہ محفوظ لگتا ہے ۔ غالباً تیس بتیس کلو میٹر اُدھر تک ہی نکسلائٹس کی سرگرمیاں ہیں " ۔

بھیا نے کہا ـــــــ " آپ تو نند و کے ساتھ پہلی بار آئے ہیں اور ابھی ابھی آئے ہیں پھر آپ کو ان باتوں کا علم کیسے ہوا " ۔ ویسے اُدھر ڈیڑھ دو مہینے سے اطراف کے مواضعات میں نکسلائٹس ہنگامہ مچا رہے ہیں ۔ لیکن ہمارا گاؤں چوں کہ ضلع سے بالکل قریب ہے شاید اسی لئے ہم ابھی تک محفوظ ہیں ۔

بھیا جی، آپ کو ایک دل چسپ بات بتلاؤں ؟

"ہم جس بس میں آئے ہیں اسی میں خفیہ پولس کے دو سب انسپکٹر اور آٹھ جوان سیول ڈریس میں ہمارے ساتھ تھے۔ اور سب کے سب مسلح تھے۔ بس ڈرائیور بس اتنی تیزی سے چلا رہا تھا کہ مسافر پریشان ہو گئے تھے۔ نند و سب جانتا ہے۔ سنا ہے کہ آج کوئی خطرہ متوقع تھا جو ٹل گیا۔

میں اور دوسرے ساتھی اس کا منہ تکنے لگے ــــــ وہ تو گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ شاید خواب میں اس نے ــــــ

نند ریکر تم نے کچھ نہیں بتایا۔ بھیا مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

کیا بتلاتا میں۔ ایسی کوئی بات ہو بھی تو بتلاؤں۔ ضرور اس نے خواب دیکھا ہوگا بھیا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ڈرائیور بہت ہی رَیش تھا۔ کیا عجب تھا کہ مسافر اس سے مار پیٹ کرتے ــــــ سوائے اس ایک شخص کے جو ہر بات سے بے خبر سو رہا تھا اور ایسا سو رہا تھا کہ ہمیں اس کی نیند سے الجھن ہو رہی تھی ــــــ جھنجوڑ کر جگاتے تو دو چار منٹ بعد پھر بے سدھ ہو جاتا اور اب خفیہ پولس کی باتیں کر رہا ہے۔ بے پر کی اڑانے میں کمال رکھتا ہے۔

اس نے بڑے اطمینان سے ہم سب کو نظر انداز کر دیا اور راست بھیا سے مخاطب ہو کر انہیں یقین دلانے لگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے ــــــ بڑے اعتماد سے اس نے کہا ــــــ

بھیا جی ــــــ پہلی بات تو یہ کہ میں مقدور بھر دروغ گوئی سے گریز کرتا ہوں۔ میں نے آپ سے کیا کہا تمدو نے سمجھا نہیں ہوگا ــــــ میں نے بھیا جی سے کہا نند و صاحب کہ میں جھوٹ سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہوں اور آپ ہی اس بات کے گواہ ہیں۔ بھیا جی سے پہلی بار ملا ہوں ــــــ اتنا بد تمیز نہیں ہوں پیارے کہ ایسا مذاق ان سے کروں جو ان کا سکھ چین چھین لے ــــــ پھر آپ نے بڑا سویپنگ ریمارک SWEEPING REMARK میرے بارے میں کر دیا۔ وہ بھی بھیا جی کے آگے۔ اگر بس میں آپ سب جاگ رہے تھے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اگر بس میں اس کی تیز رفتاری سے بے نیاز ہو کر میں بے سدھ سو رہا تھا تو اس میں بھی میرا کوئی قصور نہیں۔ قصور تو آپ سب کی جاگتی آنکھوں کا ہے جو صرف کھلی رہتی ہیں اور دیکھتیں کچھ نہیں۔ اور میرا دوش صرف اتنا ہے کہ میں سوتا ہوں تو شاید میری آتما میرے آس پاس کھڑی جاگتی رہتی ہے جس کو تھپک تھپک کر میں سلا نہیں سکتا۔ اور سلانا چاہتا بھی نہیں۔

ہمیں محسوس ہوا وہ یقیناً سنجیدہ ہو گیا ہے ــــــ وہ ہم کو آپ سے مخاطب کر رہا تھا اور پیارے، کہنا تقریباً بھول گیا تھا پیارے کی جگہ صاحب نے لے لی تھی۔ یہ سچ ہے کہ میں اس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ہوسٹل میں بھی سب کو ہنسانے والا ــــــ باتیں کرتے کرتے کبھی سنجیدہ ہو جاتا تو اس کی زبان کچھ اس طرح چلنے لگتی کہ جانے پہچانے شبد بھی ہمیں نئے معلوم ہوتے ــــــ جیسے اس کے منہ میں دو زبانیں ہوں۔ ایک ہمارے لئے اور ایک صرف اس کے لئے

پھر ڈائننگ ٹیبل کی گمبھیرتا میں نندا کو اس نے خود نوچ پھینکا۔ ہم سے مخاطب ہو کر ہنسنے لگا ــــــ میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ کھاتے بھی جاؤ پیارے۔ اتنی لذیذ نعمتیں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ اور خود اطمینان سے کھانے لگا۔ کئی نوالوں تک کسی سے بات نہیں کی۔

میں نے دیکھا بھیا بڑی پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور وہ کھانے میں مگن تھا۔

" لیجئے نند و صاحب اپنا ہی گھر سمجھئے "

میرے دوست ہنسنے لگے۔ وہ بھی ہنسا اور ہنستے ہوئے بھیا سے کہنے لگا۔

" بھیا جی! ان سب میرے پیاروں کی مصیبت یہی ہے کہ یہ "کسیلے نیاشنا" ہیں ــــــ انگریز اپنے جسم اٹھا کر انگلستان لے گئے لیکن جسموں کی پرچھائیاں یہیں ہندوستان میں چھوڑ دیں۔ اتنی معمولی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی اور اس لئے نہیں آتی کہ وہ پرچھائیاں ان کی نظروں سے اوجھل ہیں "

" آپ سچ کہتے ہیں "۔ بھیا اس سے مخاطب تھے ــــــ " ہمارا نند ریکر اگر ان پرچھائیوں کو دیکھ سکتا تو اپنے گاؤں اور اپنی زمینوں سے اس حد تک بیزار نہ رہتا "

ولی نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــــ "جناب سید صاحب وہ تو ہم جان گئے ہیں کہ آپ ہمارے بزرگوں میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔
اور آپ کی کوشش ہماری توقعات سے زیادہ ہی بارآور ہو رہی ہیں۔ مگر یہ نکسلائٹس والی ہوائی باتیں۔

وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"ولی پیارے، آپ تو ولی ٹھہرے۔ چلیئے مانتے ہیں ہم مجذوب ہی سہی لیکن ٹاپو پر پہنچنے والوں میں، آپ جانتے ہیں پیارے، ہم سب سے آگے تھے۔ کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، کچھ ہوش مندوں نے بتایا، کچھ عادت کے مطابق مراقبے میں گئے تو ان لوگوں کے خلاف جو فسق و فجور میں مبتلا ہیں، خفیہ پولس، ڈرائیور اور کنڈکٹر نے اپنی سرگوشیاں ہمارے گوش گزار کیں ــــــ کچھ غیب سے ظاہر ہوا۔ کچھ ہمارے چلتے پھرتے اعتکاف نے ہم پر وا کیا۔ آپ جن کو مجذوب کی بڑ سمجھ رہے ہیں پیارے، وہ کل آپ جیسے کسی ولی کا اِتقا ثابت ہو گا۔"

ہم نے ولی سے کہا کہ اس نے کیا ٹرم ٹرم کی ہے ذرا ہمیں سمجھا دُ۔ کچھ ولی نے، کچھ خود اس نے سمجھایا۔

کچھ دیر تو ہم فکر مند رہے، پھر باری باری سے جاگ کر حافظے کے پھیرے لگانے والوں کی آوازیں سنیں تو اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔

اس کو جگایا تو کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

جاؤ بھی پیارے، میں یہیں ٹھیک ہوں۔

رات ہم اچھی طرح سوتے رہے۔ اس کی بے خوابی کے بارے میں جتنی باتیں ہوسٹل میں سنی تھیں اس سے بھلا کیا دلچسپی ہمیں ہو سکتی تھی۔

وہ تو ہوسٹل بھر میں الارم پیالا مشہور تھا۔ کسی کو کسی وقت بیدار ہونا ہوتا۔ اسٹڈی کرنے کیلئے ہو یا رات کے کسی حصے میں بس پکڑنے کے لئے۔ وہ ہر ایک کو ان کے وقت پہ بیدار کر دیتا۔ الارم کی گھڑی صرف گھنٹی بجا سکتی ہے۔ وہ تو جھنجوڑ کر رکھ دیتا۔ نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ چابی بھرنے کی زحمت۔ بس چھوٹی سی التجا بہت ہوتی۔

"سید بھائی کل ٹسٹ ہے تین بجے جگا دیجئے پلیز۔"

"سید بھائی ڈیڑھ بجے یہاں سے بس نہ پکڑوں تو دوسری رات ہی گاؤں پہنچ سکوں گا۔"

"سید بھائی آپ تو جانتے ہیں کہ ــــــ"

"ہاں ہاں جانتا ہوں کہ امتحان سر پہ ہے۔ اپنا اپنا وقت نوٹ کرا دو۔"

چلئے چھٹی ہوئی آرام سے سو رہے۔

صبح اٹھے تو وہ بستر پر نہ تھا۔ ویسے ہماری صبح سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔ اور وہ پو پھٹنے سے بہت پہلے اٹھ بیٹھتا۔
ہم سمجھ گئے۔ چہل قدمی کے لئے کہیں گیا ہو گا۔

رات کے پھیری لگانے والے کامگاروں نے بتلایا کہ وہ کرسی پر ہی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑا رہا۔ ان لوگوں کے جگانے پر بستر پر دراز ہو گیا لیکن کامگاروں نے پھر اس کو چین سے سوتے نہیں دیکھا۔ انہیں میں سے کسی نے بتلایا کہ ــــــ

"صاحب بستر پر کروٹ بدلتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے کسی نے نیچے سے چھپ کر بھالا مار دیا ہو۔"

ہم گھومنے پھرنے کے لئے نکلے تو وہ ریلوے برج کی ڈھلان سے نیچے اترتا ہوا نظر آیا۔ قریب آیا تو اس نے کہا۔

یار نندو پیارے۔ نام کے ہندو پیارے۔ واقعی کمال کرتے ہو۔ تم نے بتلایا ہی نہیں کہ ریلوے لائن کے ادھر اتنی سندر اور شانت جھیل ہے سچ کہتا ہوں پیارو۔ تم سب چلو اور اس کے پانی میں اتر پڑو۔ دیکھو آتما کو کتنی شانتی ملتی ہے۔

"اب جو بھیا سے مل رہی ہے، جب بھی دیکھو آتما کو ساتھ لئے پھرتا ہے، بہروپیا کہیں کا۔"

سب کے سب ہنس پڑے۔

"اور چلو۔ اور چلو نندو۔ مگر یاد رہے پیارے، کہ ہم تمہارے بڑوں سے ــــــ ہاں۔"

گھر پہنچنے پر بھیا نے بتلایا کہ رات تین نکسلائٹس ضلع بستی سے اٹھارہ بیس کیلومیٹر ادھر گرفتار کئے گئے اور گرفتار کرنے والوں میں شہر

ئی خفیہ ملک بھی شامل تھی۔
اس نے جھک کر سب کو آداب کیا۔
بھیا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ——— "بھیا جی۔ میرا انعام"۔
بھیا نے کہا، ضرور۔ مگر تم ہی انعام تجویز کرو گے"۔
"میرا انعام یہی ہے کہ ان سب کو سزا دیجئے"۔
بھیا نے کہا ——— پھر تو سزا بھی تمہیں کو تجویز کرنی ہو گی۔
کہنے لگا ——— "ان سب کو دن بھر کھانا نہ دیا جائے۔ صرف صبح کی چائے اور دوپہر کو ایک گلاس چھاچھ۔ رات اگر یہ سب مجھ سے
البتہ معافی مانگتے ہیں تو پھر غور کیا جا سکتا ہے"۔
ناشتے کے وقت وہ میز پر نہ تھا۔
وکی نے کہا ——— دیوانہ ہے، کہیں نکل گیا ہو گا۔
ہم سبھوں نے بھیا سے اجازت چاہی کہ۔ ناشتہ شروع کریں۔
انہوں نے کچھ پس و پیش کرتے ہوئے کہا ———
، ذرا دیکھ تو لوں کہ آخر ———"
"میں یہاں ان سلاخوں کے پیچھے بند ہوں بھیا جی۔ ان نکسلائٹس نے مجھے دن دہاڑے قید کر دیا ہے"۔
مرکرے سے کھڑکی کا پٹ کھولے جھانک رہا تھا۔
نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا جو باہر سے بند تھا۔ کہنے لگے۔
"یہ بھی غنیمت ہے کہ میں تم کو بروقت رہا کروانے میں کامیاب ہو گیا ——— میں ٹھہرا زمین دار اور یہ نکسلائٹس، ہمارا تو جنم جنم کا بیر ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان سے دشمنی کر کے مجھے خطرہ نہیں مول لینا چاہئے"۔
ا نے کہا ———
"بھیا جی ——— آپ سے ایسی توقع تو نہ تھی، لیکن خیر میں اکیلا ہی ان سب سے نپٹ لوں گا ———"
——— اور اس نے ہاتھ بڑھا کر چار پوریاں اپنی پلیٹ میں اتار لیں۔ ہم سے کہنے لگا ———
"لیجئے آپ لوگ بھی تھوڑا بہت کھا لیجئے ہماری رہائی کی خوشی میں۔ اور ہاں بھیا جی آپ بھی تو لیجئے۔ ویسے آج پہلی بار ہم نے دیکھا ہے کہ گورنمنٹ اور نکسلائٹس کی ملی بھگت ہو گئی ہے"۔
نے کے دوران بھیا نے کہا ———
، رات جاگنے اور پھیری لگانے والے کارندوں نے بتلایا کہ تم ہر تھسے کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دیر گھومتے رہے اور بستر پر جب بھی لیٹے ہو کچھ اس طرح کروٹیں لیں کہ تخت کی آوازوں سے انہیں چوکنا ہونا پڑا اور انہیں بار بار دیکھ کر یہ اطمینان کرنا پڑا کہ یہ آوازیں تمہاری بے خوابی کی ہیں یا احاطے کی دیوار کے باہر کوئی خاص تیاری ہو رہی ہے۔ تاریک رات کے سناٹے میں جب کہ آدمی آوازوں ہی کا متلاشی رہتا ہے کوئی کھٹ پٹ بھی اپنی جانب لازمی طور پر متوجہ کر لیتی ہے ——— وہ تو کہتے تھے کہ صاحب سوتا نہیں ہے بستر پر، ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے بتلایا کہ یوں یوں تڑپتا ہے۔ جمین پر مچھی کے ما نک۔ (زمین پر مچھلی کی طرح) اور تمہارے احباب کہتے ہیں کہ تم اتنی خطرناک بس میں سُدھ بُدھ کھو کر سوتے رہے ہو"۔
کہنے لگا۔
"بھیا جی نندو اور میرے دوسرے احباب بالکل درست کہتے ہیں۔ اس میں ذرا سی بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور آپ کے

کارندوں نے بھی جو کچھ کہا ہے بالکل سچ کہا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان کو غلط سمجھا جائے۔ اب رہ جاتا ہے سوال ان دو متضاد بیانوں کا، سو آپ تضادات کے ہیر پھیر میں ہرگز نہ جائیے۔ کچھ ایسا لگتا ہے۔ کچھ ایسا لگتا ہے میرے اندر ہی کوئی ڈھکی چھپی اتھل پتھل ہے۔ کوئی ایسی چیز ہے جو بنتے بنتے ٹوٹتی ہے اور ٹوٹتے ٹوٹتے سنبھل کر پھر سے بننا شروع کر دیتی ہے۔ اپنی اس کیفیت کا ادراک خود مجھے کہیں نہیں ملتا آپ کو شاید ڈھنگ سے سمجھا بھی نہ سکوں۔ یوں سمجھئے جیسے کوئی ستار کے تاروں کو مضراب سے نہیں ہتوڑی سے چھو رہا ہو۔ جیسے کسی نے ہواؤں میں ڈولتے ہوئے پتنگ کو مہین دھاگے سے نہیں سُتلی سے باندھ رکھا ہو ——— میرے اندر وہ شاید وہ ستار بھی ہے اور وہ ڈولتا ہوا پتنگ بھی جو ہتوڑی اور سُتلی کے خلاف احتجاج کر رہا ہو ——— اب اس احتجاج کا کوئی اختتام بھی تو ہو۔ جس وقت یہ احتجاج ختم ہو جائے گا اس وقت میں بستر پر آرام سے سو لوں گا ورنہ اس وقت تک اسی طرح کبھی کرسی پر کبھی بس میں، کبھی چلتے چلتے سڑک پر سو رہوں گا۔ نہ اس نیند سے بچاؤ میرے بس میں ہے اور نہ اس بے خوابی سے گریز میرے اختیار میں۔

آپ یاد کیجئے کہ میں اپنی موٹر سائیکل چلاتے چلاتے سڑک پر سو گیا ہوں۔ اور جب کسی چھٹی حس نے جھنجھوڑ کر بیدار کیا تو پیر زمین پر ٹکے ہوئے تھے۔ بریک کو پوری قوت سے پیر نے دبا رکھا تھا۔ موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ کھائی کے نشیبی حصے پر آ کر جیسے زمین میں گڑ گیا تھا خطرہ ٹل جانے سے دل پر کسی خاص کیفیت کا اثر نہیں تھا۔ ایک ایسا سکون تھا جو سکون ہی کے بطن سے پیدا ہو سکتا ہے۔ احساسات کے آگے پیچھے کہیں بھی نہ کوئی طوفان تھا نہ شور شرابا۔ یہاں تک کہ کسی بلائی کا خوف تھا نہ بدخواہی کا۔ موٹر سائیکل کو آہستہ سے کنارے پر لانے کے بعد میں نے اپنی بائیں کلائی کے جوڑ کو سیدھے ہاتھ سے دبا کر درد کو محسوس کیا۔ اس درد کو جو دباؤ یا جنبش ہی سے محسوس ہو سکتا تھا، ورنہ کلائی کسی ایک جگہ شو پیس کی طرح رکھی جا سکتی تو نہ درد ہوتا نہ درد کا احساس۔ میں نہ کسی سے ٹکرایا تھا نہ کوئی مجھ سے۔ کلائی کا درد موٹر سائیکل کے ہینڈل کو مضبوطی سے گرفت میں لے کر پیچھے کو زور لگانے کا سبب ہو سکتا ہے۔ بہرحال کھائی سے بچ جانے پر بہ حفاظت تمام یہ درد ہوا تھا اور جو کھائی میں پہنچ جاتا تو عالم بالا میں پتہ نہیں کتنے درد لئے پھرتا۔ سڑک پر پہنچ کر کلائی میں درد کا احساس اس قدر ہونے لگا کہ موٹر سائیکل کا ہینڈل گرفت میں نہ آتا تھا۔ مزید نو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے جوں توں گھر پہنچا تو کلائی میں جنبش کی جگہ سوجن نے لے لی تھی اور ہاتھ تو م توم کر نام پوچھ رہا تھا۔ دیکھئے سادہ آدمی جو خلا میں پہنچ گیا ہے بیک وقت آہن و فولاد بھی ہے شیشہ و موم بھی۔

اور پھر اس تضاد کو آپ کیا کہیں گے۔ دوست احباب، خاندان کے چھوٹے بڑے۔ جاننے پہچاننے والے ——— بہرحال وہ سارے چاہنے والے جن کے پاس ان فروعات کے لئے بھی وقت ہے، میرے بارے میں ایک دوسرے سے بڑا دل فریب اختلاف رکھتے ہیں ——— کوئی کہتا ہے میں سوتا رہتا ہوں۔ کسی کا خیال ہے کہ رات دن جب بھی بیدار ہوتا ہے مجھے جاگتا ہوا پاتا ہے۔ دن اور رات کا فرق مٹا دیا جائے تو مجھے دونوں ہی سے اتفاق ہے ——— وہ جو یہ کہتے ہیں کہ میں دن میں بھی سوتا رہتا ہوں، غلط نہیں کہتے۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ رات کے ہر حصے میں انہوں نے مجھے ہوشیار پایا ہے تو سچ ہی کہتے ہیں ——— دونوں سچے ہیں تو پھر جھوٹا کون ہے؟ میں خود ہوں ——— وہ شخص جس کی بے ہوشی اور باہوشی کا فرق مٹ جائے وہ کس طرح سچا ہو سکتا ہے ——— دن کام کرنے کے لئے ہے اور رات سونے اور آرام کرنے کے لئے ——— فطرت کا یہ نظام انسان کی جبلّت بن گیا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ دیوانگی کی منزلیں نہیں ہوتیں ——— آپ کے اندر سب سجا سجایا ہو تو سایہ دار درختوں کے نیچے شفاف جھیل کے کناروں کا سا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ احساس ہی زندگی کا دوسرا نام ہے ——— لیکن اس کو کیا کیجئے کہ زندگی کا ایک اور نام بھی ہے ——— شاید پہلا نام یہی ہو۔ جیسے کوئی میرے اندر ہی اندر۔ نہ چلچلاتی دھوپ چھوڑ جاتا ہے نہ لمبی لمبی شعلوں کی زبانیں کہ سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے۔ وہ تو راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں گرم گرم راکھ سمیت میرے اندر پھینکتا ہے اور پھینکتا ہی رہتا ہے ——— اب اس اندر ہی اندر اڑتی ہوئی راکھ سے نکل کر اندر ہی اندر چٹرکے لگانے والی چنگاریوں کا نام بھی زندگی ہے، تو بتائیے میں بھی کہاں جھوٹا رہا

باتا ہوں ۔ ہم سب سچے ہیں ۔ الزام کسی پر نہیں آتا ۔ مورد الزام اگر ہے تو وہ زندگی ہی ہے اور کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں "
بھیا اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے ۔ لگتا تھا وہ بھیا کو اپنے ساتھ ساتھ دُور دُور کہیں لے جا رہا ہے ۔ میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا
ں کے ساتھ چل رہا ہوں ۔ لیکن مجھ میں اور بھیا میں بہت فاصلہ تھا اور میرے دوست تو مجھ سے بھی پیچھے کہیں رہ گئے تھے ۔
ب تو یہ ساری باتیں قصۂ پارینہ ہوئیں ۔ یاد کے جھروکوں سے کبھی جھانکتی بھی نہیں ـــــــ اس کے سونے اور جاگنے کا کسی پر کیا اثر
ا ہے ۔ لیکن میں یکا و تنہا اس عذاب کو سہہ رہا ہوں ۔ جب ہم روم میٹ ہوئے ہیں تو میں اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بے خوابی
ندوں کے شیش محل کو چور چور کرتی رہے گی اور میں کرچیاں سمیٹ سمیٹ کر خون روتا رہوں گا ۔
یں نے اس سے مصالحت کی پوری کوشش کی ۔ اس کی غیر فطری عادتوں کو اپنے مزاج کا حصّہ بنا لینے کی کوشش میں اذیتیں تک برداشت
بن کب تک ۔ کوئی شک نہیں وہ میرا دوست ہے اور اچھا دوست ہے ۔ آدمی بھی بُرا نہیں بلکہ بھلا ہی ہے ۔ بھیا اسے آج بھی یاد کرتے
ر وہ بھی بھیا کو بہت پیار سے یاد کرتا ہے ۔ کبھی کبھی تو پلاننگ کرتا ہے کہ میں چلوں نہ چلوں وہ دو ایک روز کے لئے اکیلا ہی گاؤں ہو آئے
ے اور میرے کالج کے زمانے کے مشترک ساتھی اپنی اپنی راہوں پر پتہ نہیں کہاں جا چکے ہیں ۔ ٹریننگ کیمپ سے لے کر ڈائن میس
ی کبھی بستی کے سینما ہال تک ہم ہمیشہ ہی ساتھ رہتے ـــــــ وہ کبھی تعطیل کے دن شہر کو چلا جاتا اور دن دن بھر نہ لوٹتا تو میرا جی نہ لگتا ۔ لیکن
کے نمائیانے میں اپنی بے دلی کے احساس کو کبھی اس پر ظاہر نہ کرتا ۔ اُلٹے وہی مجھ سے شکوہ کرتا ۔
"تم چلے نہیں ۔ کچھ بات بنی نہیں ۔ گھومنے پھرنے میں لطف نہ آیا ۔ دن غارت ہو گیا آج کا "
یں جل کر رہ جاتا ۔ عجیب قلندر آدمی ہے ۔ جاتے وقت بتاتا نہیں اور چپکے سے نکل جاتا ہے ۔ لوٹ کر نمائشی محبت جتلاتا ہے ۔ میں کیوں اس کو
ں کہ میرا دن بھی تمہارے انتظار میں کچھ ڈھنگ سے نہیں گزرا ـــــــ وہ مجھ سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار برابر کئے جاتا ہے ـــ ایسا
اس سے کچھ چھپاتا ہوں ۔ چھپاتا ہی ہوں ۔ اس رازداری کا شاید یہی جواز ہو سکتا ہے کہ دن میں جس شخص کی کمی کا احساس ہوتا ہے رات اسی کا
لنے لگتا ہے ۔ اور میں دن اور رات دونوں کی کیفیتوں کا اس پر اظہار نہیں کرتا ـــــــ نہیں کرنا چاہتا ـــــــ ایک سوال ذہن میں ابھرتا
ہے ۔ اور وہ یہی ہے کہ رات اس کی اپنی بے خوابی میں وہ مجھے اس بے دردی سے کیوں شریک کر لیتا ہے ۔ اس کو یہ احساس کیوں نہیں ستاتا
رے میں اس کو اپنی مضطرب بے خوابی کا حق ہے وہیں اس کے ایک چہیتے ساتھی کو گہری نیند کا مزہ لوٹنے کا حق بھی ہے ـــــــ اور جب دونوں
ستے ہیں تو پھر رات کے تین بجے وہ اس کمرے کے مکمل سکون و سکوت کو اپنے ٹیپ ریکارڈ پہ کیسٹ چڑھا کر کس طرح برباد کر سکتا ہے ۔
وہ سوچتا ہی نہیں ۔ اطمینان سے دھیمے سُروں میں موسیقی کا لطف اٹھاتا ہے اور دبک کر لیٹے میں پڑا رہتا ہے ۔ اس وقت کم سے کم اتنا تو ہوتا ہے کہ
خواب ناک فضا کو تیز لیمپ کی روشنی برباد نہیں کر جاتی ۔ اس لئے میں بھی غنودگی کے عالم میں پڑا رہتا ہوں ۔ کبھی جاگتا ہوں ، کبھی سو بھی جاتا ہوں ۔
وقت تک جبکہ موسیقی کے ساتھ ساتھ وہ بتی جلا کر کاغذ اور قلم بھی سنبھال لیتا ہے تو اندر ہی اندر مجھے اپنی دھجیاں سی اڑتی ہوئی محسوس
ہیں ۔ پپوٹوں کے نیچے نیندوں کی تہہ در تہہ دبیز چادریں یکایک بکھر جانے والی روشنی کی زد میں آکر تیزی سے سرکنے لگتی ہیں اور اُجالے پپوٹوں کے کواڑ
کھڑکی آنکھوں میں در آتے ہیں ۔ میں جھلا کر کبھی چادر ، کبھی بلانکٹ ، کبھی تولئے سے اپنی آنکھیں ڈھک لیتا ہوں ـــــــ فوراً کچھ نہیں
تکیے میں منہ چھپا لیتا ہوں یا جلدی میں اپنے ہی ہاتھ اور آستین سے اجالوں کو روکتا ہوں ـــــــ اب وہ جاگتا ہے اور میں جاگنے اور
کے درمیان لٹکتا ہوں ۔

جب وہ سوتا تھا تو لگتا تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کو تخت توڑ رہا ہے ۔ اس کی ان بے سکون نیندوں کا میں آہستہ آہستہ عادی ہو گیا تھا ۔
ی تو یوں بھی ہوتا کہ کھڑکی کی سلاخوں سے بلی اندر آکر کوئی چیز گرا جاتی تو نیند اچاٹ ہو جاتی ـــــــ میں اٹھ کر بتی جلاتا اور ادھر اُدھر
تو گرا پڑا کچھ بھی نہ ملتا ۔ ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ رہتی ۔ لیکن لگتا تھا کمرے میں جو ہے تو کیا گھونسلے دوڑتی پھرتی ہیں ۔ ان کی بے تحاشہ
واز دیں جو بھی آتا ہے گر ۔ تا ہے ـــــــ نیند کے اچاٹ ہو جانے کے خوف سے کروٹ لے کر میں سب کچھ بھول جاتا اور صبح جب اس یقین
تھا کہ گری پڑی بکھری ہوئی سب چیزیں سمیٹ لوں گا تو ہر چیز اپنی اپنی جگہ جوں کی توں دھری ہوئی ملتی ۔ یہ سب کچھ شروع شروع ہوتا رہا ۔

پھر میں جان گیا کہ چوہے، گھونسیں، ابلیاں سب کے سب اس کے پلنگ پر رات بھر اس کے ساتھ رہتے ہیں ـــــ وہ کروٹ کروٹ انہیں جنم دیتا اور مارتا رہتا ہے ـ جب روز کا یہ معمول ہو تو راتیں اپنے وجود کو کسی نہ کسی طرح آنکھوں میں گھس کر منوا لیتی ہیں ـ رات اور دن کا یہ فرق مٹ جائے تو پھر زندگی میں رہ ہی کیا جاتا ہے ـــــ دن کو ہم اپنا وجود منوانے میں اپنا سب کچھ لگا دیتے ہیں ـــــ مجھے اس سے اسی لئے ڈر لگنے لگا تھا کہ اس کے پاس دن اور رات کا کوئی خاص فرق نہیں تھا ـــــ مجھے راتوں سے وحشت ہونے لگی تھی، اور میں چاہتا تھا کہ وارڈن سے کہہ کر اپنا کمرہ بدل لوں لیکن یہ سب کچھ اس طرح ہو کہ اس کو پتہ ہی نہ چل سکے کہ یہ سب کچھ میری مرضی سے ہوا ہے ـ

وارڈن خلیق اور ہمدرد آدمی تھا ـ کیمپس سے متعلق ہر شخص کی ممکنہ مدد کرتا ـ لیکن میرے لئے مشکل یہ تھی کہ میں علیحدہ کمرے کیلئے اس سے کچھ کہتے ہوئے اس لئے گھبراتا تھا کہ اس کو بھی ہم دونوں کی یک دلی اور تعلق خاطر کا علم تھا ـــــ سچ پوچھئے تو سارے کیمپس میں ہم دونوں کی دوستی مثالی حیثیت سے شہرت رکھتی تھی ـــــ میں اکیلا ہوتا تو دوسرے ساتھی مجھ سے پوچھتے، تمہارا پیارا کہاں ہے ـــــ اور وہ اکیلا ہوتا تو اس سے میرے بارے میں دریافت کیا جاتا ـــــ سارے کیمپس میں "پیارے" کا لفظ اسی کی وجہ سے مروّج ہو گیا تھا ـــــ وہ کبھی اپنے ساتھیوں کو 'پیارے' کہہ کر مخاطب کرتا ـــــ یا پھر گفتگو کے دوران اس طرح پیارے پیارے کہا کرتا کہ واقعی اس کے منہ سے بار بار سننے کو جی چاہتا ـ اب تو دوسرے بھی اس سے مخاطب ہوتے تو اسی کے لہجے میں ـــــ

"کہو پیارے کیا ارادے ہیں"

"کہاں جا رہی ہے سواری پیارے"

"پیارے کمال کر دیا تم نے تو"

"نہیں پیارے یہ دھاندلی مجھ سے نہیں ہو گی"

"دل اتنا بڑا، اتنا بڑا رکھو پیارے کہ سب سما جائیں اس میں"

"درگزر کرو پیارے کہ معاف کرنے میں بڑا مزہ ہے"

"ایسی کچھ کر کے چلو پیارے کہ بہت یاد رہو"

ایسے ہی بہت سارے جملے اس کے نام سے منسوب ہو کر دوسروں کے زبان زد ہو گئے تھے ـ کیمپس کے اکثر ساتھیوں نے ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کا طریقہ ہی کچھ اس طرح بنا رکھا تھا ـــــ "کہو پیارے کیا ارادے ہیں"

دوسرا کہتا "کہو پیارے کہاں جا رہی ہے سواری"

میں نے سنا تھا کہ خود وارڈن نے اس سے کہا تھا ـــــ "پیارے کمال کر دیا تم نے تو دو روز سے نظر ہی نہ آئے"

ان حالات میں وارڈن سے دوسرے کمرے کا مطالبہ کرنا کچھ اتنا آسان بھی نہ تھا ـــــ میرے لئے سوائے اس کے چارہ بھی نہ تھا کہ دا سے اُن کے کوارٹر میں تنہا ملوں اور تفصیل سے اپنی راتوں کی پریشانی کا تذکرہ کروں اور وعدہ لوں کہ وہ نہ صرف یہ کہ مجھے علیحدہ کمرہ دیں بلکہ اس بات کو راز میں بھی رکھیں کہ میں نے یہ سہولت مانگی ہے ـــــ مجھے یقین تھا سنگل روم خالی ہے اور میری سنیارٹی کو ملحوظ رکھتے، آسانی سے مل بھی سکتا ہے ـ لیکن یہ بالکلیہ ممکن چیز بھی اس لئے ناممکن تھی کہ وارڈن سے لے کر سب ہی جانتے ہیں کہ ہم سنگل روم کے آفر کو اس سے پہلے رجکٹ REJECT کر چکے ہیں اور نسبتاً جونیرس کو روم دے دیئے گئے تھے ـ

میں ابھی گومگو کے عالم میں تھا کہ ایک دن وارڈن نے بتلایا کہ "کہو پیارے کیا بات ہے؟ تمہارے پیارے نے سنگل روم کے لئے درخواست دی ہے"

میں اس احساس کی توضیح کر ہی نہیں سکتا کہ مجھے اس کی یہ بات کیوں اچھی نہیں لگی ـ ہونا تو یوں چاہیئے تھا کہ میں جی ہی جی میں خوش ہوتا میں نے بہت سوچا ـ صرف اس حد تک ایک بات ذہن میں ضرور آئی تھی کہ مذاق مذاق میں ایک بار میں نے اس سے کہا تھا ـ

"یار، اب تو راتوں سے خوف آنے لگا ہے ـ تم وہ ہنگامے مچاتے ہو کہ نیند حرام ہو جاتی ہے"

اس نے بھی کھلے دل سے ہنس کر کہا تھا ——

"پیارے تم نے اتنی معمولی سی بات کہنے میں بہت دیر کر دی۔ اتنی دیر کہ اب تو ایک دوسرے سے بیزارگی بھی مشکل ہے"

بات آئی گئی ہو گئی اور میں وارڈن سے ملنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔

لیکن آج وارڈن کی زبانی یہ سن کر میں خواہ مخواہ دکھی ہونے لگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔ مشورہ تو کرنا ہی چاہیئے تھا۔

ال آیا کہ مجھے اس طرح سوچنے کا کیا حق ہے جبکہ میں خود ہی منصوبے بنا رہا تھا۔ اس نے اتنی اخلاقی جرأت کا ثبوت تو دیا کہ اپنے نام

ضابطہ درخواست دے دی اور یہی صحیح طریقۂ کار تھا۔

اس کی عرضی منظور ہو گئی لیکن اس نے مجھ سے کچھ نہیں بتایا۔ میں بھی انجان رہا۔ ساری باتیں وارڈن سے معلوم کیں۔ چار دن اسی

زر گئے۔ ہم وہی تھے۔ ہمارے دن رات وہی تھے۔ اندر ہی اندر یوں لگتا تھا جیسے کچھ بکھر جانے والا ہے جس کو ہم دونوں ہاتھوں

ھال سنبھال کر رکھ رہے ہیں۔ جھکڑوں کی زد سے بچا رہے ہیں —— کبھی کبھی یوں لگتا کہ جھکڑوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ایک جھونکا اس موم بتی کو بجھا دے گا جس کی لو کو ہم نے اپنی ہتھیلیوں کی دو بوں میں چھپا رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں کچھ ایک

سب سے جی رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لئے دو ایک روز بھیا کے پاس چلے چلتے ہیں۔

ہفتے کے دن انٹرول میں، اس سے میں نے کہا کہ ——

"یار بھیا کچھ زیادہ ہی یاد آرہے ہیں۔ چلو چلیں ہم دونوں، آج شام نکل پڑتے ہیں"

اس کا چہرہ ایک دم دمک اٹھا۔ لگتا تھا جیسے چہرے پر جمی ہوئی اداسیوں کی گرد کو پانی کے ایک ہی چھپاکے نے صاف کر

ہ۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ اس حد تک دھندلا گیا جیسے نظروں سے اوجھل ہو رہا ہو۔ میں نے کم ہی کسی کیفیت کو چہرے

اتنی تیزی سے رنگ بدلتے دیکھا ہو گا۔ یوں سمجھئے کبھی کبھی بتی جلانے پر جیسے بلب فیوز ہو جاتا ہے۔ کس طرح اپنی روشنی سے

تنا زیادہ روشنیاں بکھیر کر اسی لمحے وہ تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ بس کچھ یہی حال اس کا ہوا تھا۔

میں حیران تھا —— یہ کیسے ممکن ہے —— بھیا کے پاس چلنے کے لئے وہ پس و پیش کر سکے گا!!۔ ایسا انکار تو اس کے بس کا

ہی نہ تھا۔ کہنے لگا۔

"پیارے تم ہو آؤ۔ بھیا جی کو میرا اتنا پیار پہنچانا، اتنا پیار پہنچانا —— کہنا میں نے ڈھیر ساری محبت بھیجی ہے۔ احترام

بھیجا ہے —— مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔ تمہارے آنے تک میں اس کام سے نبٹ لوں گا"

میں سُن ہو گیا —— اس کے اوجھل چہرے کو سامنے لا لا کر تکتا رہا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ دبا کر کہا ——

"دیکھو پیارے، اس بار مجھے معاف کر دو ذرا ایک بہت ضروری پلاننگ کو عملی جامہ پہنانا ہے"

میں بھانپ گیا تھا کہ وہ کس پلاننگ کو عملی صورت دینا چاہتا ہے۔ لیکن جی چاہتا تھا کہ وہ ایسا کچھ نہ کرے جو میں سوچ رہا

) —— میں بھیا کے پاس چلا گیا۔

بھیا نے اس کو بہت یاد کیا۔ ادھر ادھر سے وہ موضوعِ گفتگو بن جاتا تھا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کچھ اس ڈھنگ سے

لجھنیں بھیا کے آگے رکھ دیں کہ ان الجھنوں کے اظہار سے میرا ڈھکا چھپا پیار جو آج بھی اس کی ذات سے مجھے تھا بھیا پر عیاں

ا۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا ——

"تو پھر تم کمرہ کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ تمہاری صحت متاثر ہو جائے گی۔ اس کا کیا ہے۔ وہ تو عادی ہو چکا ہے"

مجھے بڑی طمانیت ہوئی۔ بلکہ یوں سمجھئے بڑی تقویت محسوس ہوئی کہ اس مسئلہ میں بھیا نے میری مجبوریوں کا صحیح اندازہ لگایا

میری حمایت کی۔

میں شہر لوٹ آیا اور کیمپس پہونچتے پہونچتے میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک بوجھ سا جو میرے دل پر تھا وہ بڑی حد تک کم ہو گیا ہے۔

مظہر امام

(۱)

بے آب آئینے تھے، شجر بے لباس تھے
دُنیا بہت اُداس تھی، جب ہم اُداس تھے

سوئے ہوؤں کے خواب دریدہ لباس تھے
جاگے ہوؤں کے سچ بھی فریب و قیاس تھے

دنیا بھی آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب
بھیگے ہوئے ورق کا ہم اک اقتباس تھے

اک خوش ادا کے قرب سے روشن تھیں لذتیں
لیکن وہ وسوسے جو مرے آس پاس تھے!

یہ راہ خار و سنگ مرا انتخاب تھی
جو مرحلے بھی آئے وہ حسبِ قیاس تھے

(۲)

جلی کتاب کا اک اقتباس لگتا ہے
وہ میرا دوست، مزاج شناس لگتا ہے

گلاب بن میں گلابِ سفید کی صورت
وہ عام سا ہے مگر دل کو خاص لگتا ہے

ہوا میں خوشبوئے موسم کہیں زیادہ نہ ہو
وہ پاس ہے، یہ بعید از قیاس لگتا ہے

سپردگی کا نشہ بھی عجیب نشہ ہے!
وہ سر سے پانو تلک التماس لگتا ہے

ہے اُس کے ہاتھ میں سوکھے گلوں کا گلدستہ
وہ شخص میرا ستارہ شناس لگتا ہے

ذرا میں اپنی نگاہیں تہہ نقاب کروں
مرا زمانہ مجھے بے لباس لگتا ہے

● ڈائرکٹر ٹیلی ویژن سنٹر، سری نگر (کشمیر)

اختر الایمان سے ایک گفتگو

انٹرویو: عطاء الحق قاسمی ● ۳۰۴۔الفیصل پلازہ، شاہراہ قائد اعظم۔لاہور

س..... اختر الایمان صاحب پہلا سوال گفتگو کو رواں کرنے کے لئے اور وہ یہ ہے کہ آپ پچھلے دنوں پاکستان آتے تھے آپ کو پاکستان کیسا لگا؟

ج..... مجھے پاکستان اچھا اس لئے بھی لگتا ہے کہ میرے جتنے بھی دوست تھے وہ سب پاکستان میں ہیں اس لئے وہاں جانے کے بعد خاص طور پر کراچی میں جاکر دلی کا لطف آتا ہے وہ الگ بات ہے کہ ان لوگوں میں اب دلی والی عادتیں نہیں رہیں..... لیکن خلوص میں کمی نہیں آئی۔

س.....آپ کو اپنے پرانے دوستوں میں کس قسم کی تبدیلی نظر آئی؟

ج..... تبدیلی تو وقت کے ساتھ آتی ہے جسم میں تبدیلی آتی ہے چہروں میں تبدیلی رہن سہن میں تبدیلی تو واقع ہوتی ہے ان میں سے بہت سے دوست میرے ساتھ پڑھتے تھے مگر اس وقت کچھ اور حالات تھے مالی حالت بھی یہ نہ تھی زندگی کا انداز بھی مختلف تھا اس وقت تو ہم سب لڑکے تھے۔

س..... ان کے ساتھ مل کر تو اب بھی آپ لڑکے بن جاتے ہوں گے؟

ج..... جی ہاں! وہاں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ہے میری بیوی ایک مرتبہ وہاں میرے ساتھ گئی تو دیکھ کر بے حد ہنسی کہ جتنے اولڈ بوائز ہیں سب کی لمبی داڑھی ہے یا سفید بال ہیں لیکن وہ ہمارے ساتھی ہیں۔

س..... یہ جو آپ کے ادیب دوست پاکستان میں ہیں ان کے خیالات میں آپ کو کوئی تبدیلی نظر آئی؟

ج..... خیالات کی تبدیلی میں نے محسوس نہیں کی وہ اس لئے کہ خیالات کی تبدیلی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب سیاسی بنیاد پر ملیں تب سوچنے کا انداز معلوم ہوتا ہے۔ جب دوستانہ بنیاد پر ملیں ادبی بنیاد پر ملیں تو کیا فرق محسوس ہوگا۔

س..... ممکن ان کی ادبی سوچ میں کوئی فرق آپ کو محسوس ہوا ہو؟

ج..... نہیں ایسی کوئی بات نہیں وہ ویسے ہی ہیں جیسے اس وقت تھے مثلاً احمد ندیم قاسمی ہیں وہ اس وقت بھی انہی خیالات کے تھے جیسے اب ہیں۔

س..... خود آپ کے اپنے خیالات میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟

ج..... نہیں میرے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

س..... آپ اس عہد کے اہم جدید نظم نگاروں میں سے ہیں اردو کی عصری نظم کے بارے میں کیا تاثر ہے؟ (سوال اردو کی عصری نظم کے حوالے سے تھا مگر اختر الایمان صاحب نے سہواً نثری نظم سمجھا چنانچہ اسی حوالے سے جواب دیا)

ج..... اس سے پہلے بھی اس پہ بات ہو چکی ہے ہمیشہ سے میرا یہی خیال ہے کہ اگر کوئی نئی چیز نظر آئے تو اس کو فوراً ہی نہیں دھتکار دینا چاہئے جو نئی چیز آتی ہے اس کے امکانات ہمیں معلوم نہیں ہوتے اس کا آغاز تو ہمارے سامنے ہوتا ہے لیکن اس کی انتہا کے بارے میں

کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اب آپ آزاد نظموں کو لے لیجئے اس پر کتنی بحث ہوئی اور یہ آزاد کے زمانے سے شروع ہوئی لیکن مقبول نہیں ہوئی اس زمانے میں ڈاکٹر بجنوری اور دیگر حضرات نے بہت سی آزاد نظمیں کہیں لیکن اس کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ہمارے ساتھ ہوئی راشد، فیض، میراجی ان حضرات کے آنے کے بعد لوگوں نے اس طرف توجہ دی حالانکہ حالی نے بہت پہلے اس کو تسلیم کر لیا تھا.... لیکن دوسرے لوگوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس وقت اس کے امکانات معلوم نہ تھے لیکن آج اس کو تسلیم کیا جاتا ہے اور مقبولیت حاصل ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی نئی چیز آتی ہے تو بڑے ذہن اس کے ساتھ شامل نہیں ہوتے جب بڑے ذہن اس میں شامل ہو جاتے ہیں تو پھر اس کو اٹھا لے جاتے ہیں۔

س ..... آپ نے بھی نثری نظمیں کہی ہیں ؟

ج ..... میں نے جتنی نظمیں کہی ہیں وہ خاص طور پر اس خیال سے تو نہیں کہیں کہ یہ نثری ہیں لیکن میری نظموں کی بہت سی بحریں نثر سے قریب ہیں دانستہ نثری نظمیں نہیں کہیں۔

س ..... اس کا مطلب ہے کہ آپ اس تجربے کے حق میں ہیں لیکن ذاتی طور پر اس کو ناپسند کرتے ہیں ؟

ج ..... ناپسند نہیں کرتا ذہنی میلان ہوتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ میں شاعر ہوں لیکن فلم میں گانے نہیں لکھتا..... مکالمے لکھتا ہوں منظر نامے لکھتا ہوں مجھ سے لوگوں نے کہا کہ آپ گانے کیوں نہیں لکھتے میں نے کہا مجھے آتے نہیں..... میرا مزاج گانے لکھنے کا نہیں ہے۔

س ..... آپ کے اشعار میں اتنی ملائمیت اتنی نغمگی اور مٹھاس ہوتی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو گانے لکھنے نہیں آتے یہ الگ بات ہے کہ آپ لکھنا نہیں چاہتے .....

ج ..... چاہنا تو بعد میں آتا ہے پہلے اس طرف ذہن تو جائے جب ذہن ہی نہیں جاتا تو لکھا کیسے جائے

س ..... یہاں ہندوستان میں آج کل آزاد غزل لکھی جا رہی ہے کچھ روشنی اس پر ڈالیں ؟

ج ..... اس میں بس مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں ارکان کم ہوتے ہیں، ہے تو وہ غزل ہی !

س ..... یہ تجربہ آپ کو کیسا لگا ؟

ج ..... میں نے کہا نہ کہ تجربے تو تجربے ہی ہوتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ ان کو مقبولیت کتنی حاصل ہوتی ہے یا ان کی ادب میں حیثیت کیا ہے اگر لوگوں کو پسند آئے گی اور اس کی کچھ حیثیت ہوگی تو وہ مقبولیت حاصل کرے گی ورنہ صرف تجربہ بن کر رہ جائے گی۔

س ..... ہم نے ابھی آزاد نظموں کی بات کی تھی تو اس وقت بہت سے شعراء آزاد نظم کی طرف متوجہ ہوئے تھے جن کو ہم بڑے شاعر کہہ سکتے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ ابھی تک نثری نظم اور آزاد غزل کی طرف کوئی بڑا شاعر متوجہ نہیں ہوا ؟

ج ..... ہو سکتا ہے کہ انہیں اس میں کوئی دلچسپی نہ ہو یا انہیں کوئی نئی بات نہ معلوم ہوتی ہو اس لئے کہ آپ اگر غزل کہہ رہے ہیں ایک مصرعہ میں چار یا پانچ رکن ہیں اور دوسرے میں تین رکن کر دئے تو کوئی نئی بات تو نہیں ہے..... آزاد نظم میں بھی تو یہی ہوتا ہے ہاں اگر آزاد نظم نہ کہی گئی ہوتی تو غزل میں نیا پن محسوس ہوتا..... لیکن ایک چیز پہلے سے موجود ہے، آزاد غزل کا تجربہ ایسے ہی ہے کہ ایک شخص ہاتھی بنائے اور جدت یہ پیدا کرے کہ اس کی دو سونڈیں بنا دے !

س ..... آج کل بھارت میں ترقی پسند تحریک اپنی عملی شکل میں موجود ہے یا نہیں ہے دوسری بات یہ ہے کہ جو شاعر ترقی پسند خیالات لے کر جس جذبے کے ساتھ چلے تھے آیا وہ اسی رستے پر ہی چلے جا رہے ہیں یا ادھر ادھر ہو گئے ہیں ؟

ج ..... اس سوال کا جواب اتنا آسان اور سادہ نہیں ہے کہ فوراً دے دیا جائے..... جہاں تک ترقی پسند تحریک کا سوال ہے تو وہ آج بھی موجود ہے اس کی تنظیم بھی ہے وہ کتنی موثر ہے یا اس میں اب زور کتنا ہے، یہ بات الگ ہے ترقی پسند کہلوانے والے لوگ بھی موجود ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ وابستگی جو ابتدا میں تھی اب نظر نہیں آتی اس کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ ہے کہ جب ترقی پسندی وجود میں آئی ہے اور لوگ ادب کی طرف آئے ہیں اس وقت کے لوگ زیادہ مخلص تھے وہ ادب سے زیادہ اس کے سیاسی پہلو پر زور دیتے تھے۔

س..... معذرت کے ساتھ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ اتنے آسودہ نہیں تھے انہیں محرومیوں کا زیادہ تجربہ تھا؟

ج..... نہیں ایسی کوئی بات نہیں..... ترقی پسند تحریک اگر آج اتنی مضبوط نہیں ہے یا آج اس میں وہ زور نہیں ہے اس کا سبب آسودگی نہیں ہے اس کا سبب یہ ہے کہ جو لوگ ترقی پسند تحریک میں آتے تھے ان میں سے بہت کم لوگ جینوئن اور دیانتدار تھے مگر اس کے خلاف ردعمل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ تحریک چلانے والوں نے ترقی پسند تحریک کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی جن کے ہاتھ میں یہ تحریک تھی وہ چودھری نہیں تھے ادب میں ان کا بڑا مقام نہ تھا لیکن انہوں نے کوشش یہی کی کہ وہ مقام حاصل کر لیا جائے جو بڑے ادیب کا ہے مثال کے طور پر فیض تھے وہ چودھری نہیں تھے وہ اس تحریک میں نہیں تھے، وہ زندگی بھر ترقی پسند رہے مگر اس طرح نہیں جس طرح ان لوگوں نے ڈکٹیٹ کرانا چاہا کہ اس طرح نہ کہو یہ ترقی پسندی ہے، یہ ترقی پسندی نہیں ہے، مجھے یاد ہے ہمارے ایک دوست نے "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ شعر تو کوئی جن سنگھی بھی کہہ سکتا ہے، اس میں ترقی پسندی کہاں ہے؟

س..... یہ اعتراض کس دوست نے کیا تھا؟

ج..... سردار جعفری نے کیا تھا میں یہ نہیں کہتا کہ سردار جعفری نے غلط کہا تھا، ممکن ہے انھوں نے دیانتداری سے ایسا ہی محسوس کیا ہو، مگر میرا کہنا یہ ہے کہ تحریک چلانے والوں نے تحریک کو ذاتی شہرت کا زینہ بنایا۔ ترقی پسند تحریک ٹھیک ہے اشتراکیت ٹھیک ہے، انہیں استعمال کرنے والے غلط تھے۔

س..... اگر اس میں کوئی ہرج نہ ہو تو ان کا نام لے دیں جنہوں نے تحریک کو.....

ج..... ایک آدمی نہیں تھا بلکہ بے شمار لوگ تھے۔ سجاد ظہیر تھے سردار جعفری تھے اور دوسرے بھی تھے جو لوگ "رجڈ" نہیں تھے انہیں ان کا مقام نہیں دیا گیا، مثلاً مخدوم تھے، حالانکہ وہ پارٹی ورکر بھی تھے، اسی طرح اگر راولپنڈی کانسپریسی کیس نہ ہوتا تو شاید فیض اوپر نہ آتے ہم لوگ ایک یا دو غیر شاعروں کو تو تسلیم کر لیتے ہیں مگر انہوں نے تو غیر شاعروں کی ایک بھیڑ ہمارے سامنے کھڑی کر دی کہ انہیں قبول کرو چنانچہ انہیں ہم آج جانتے بھی نہیں ہیں مثلاً میں نے کتنی دفعہ کہا کہ جیسا وامق جونپوری کہتے ہیں ویسا الطاف مشہدی بھی کہتے ہیں مگر تم نے ان کو وہ درجہ نہیں دیا کبھی ان کا نام نہیں لیا کیونکہ وہ آپ کے حلقے سے باہر ہیں۔

س..... احمد ندیم قاسمی کو بھی پوری طرح قبول نہیں کیا گیا تھا؟

ج..... احمد ندیم قاسمی سیدھے اور شریف آدمی ہیں انہوں نے ترقی پسند تحریک کو اپنے لئے استعمال نہیں کیا تحریک میں باقاعدہ ایک گروہ بن گیا تھا اور اک دو ہوتے تو قبول کر لیتے لیکن انہوں نے تو ایک گروہ جمع کر لیا جو شعرا ہی نہیں تھے میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک میں کوئی خرابی نہیں ہے اس کو چلانے والوں میں دیانتداری کی کمی تھی ان کی وجہ سے پوری ترقی پسند تحریک نہ چل سکی۔

س..... شعر کی جو جمالیاتی اور فنی سطح ہے اور جس میں آپ کا اپنا ایک اسلوب ہے جو خصوصیت رکھتا ہے..... آپ کے نزدیک شعر میں فنی اور جمالیاتی سطح کو کیا مقام حاصل ہے؟

ج..... جب ہم شاعری کہتے ہیں تو وہ ہوتی ہی جمالیاتی ہے شعر تو یہ بھی ہے..... ؎

جاتے ہو کس طرف کو کدھر کا خیال ہے

بیمار جوتوں کا یہی ہسپتال ہے

شعر کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں ردیف قافیہ ہے ایک بحر ہے ایک ردھم ہے شاعری کی کبھی کوئی صحیح تعریف نہیں کر سکا..... تعریف ہو نہیں سکتی لیکن اس کا جمالیاتی پہلو بہر حال مقدم ہے......

س..... کچھ شعرا ہیں جیسے احمد فراز ہیں اور ادھر ساحر لدھیانوی تھے یہ عوام کے پسندیدہ شاعر ہیں تو کیا ایک پسندیدہ یا معروف شاعر کو بھی بڑے شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے؟

ج..... مقبولیت اور اچھی شاعری یہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں احمد فراز تو اچھا کہتے ہیں ہمارے ہاں ساحر تھے میں ان کو معمولی شاعر شمار کرتا ہوں اور اس اعتبار سے احمد فراز بھی معمولی شاعر ہیں لیکن مقبولیت میں میں شکیل بدایونی کا نام لوں گا اس لئے کہ ان کی شاعری ادب میں نہیں آتی حالانکہ مشاعروں میں جگر مرادآبادی انہیں داد دیتے ہوئے کہتے تھے کیا شیر کی طرح پڑھتا ہے بعض لوگ بڑا اچھا پڑھتے ہیں اور اس میں ان کی آواز ان کی شخصیت اور ان کا انداز شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو مقبولیت مشاعروں میں حاصل ہوتی ہے مشاعرہ تفریح کا ایک پہلو ہے ایک تہذیبی ورثہ تو ہے ہی لیکن آج کل بطور تفریح استعمال ہوتا ہے کیونکہ پہلے کتابیں شائع نہیں ہوتی تھیں اس لئے شاعروں کو اہمیت حاصل تھی مشاعروں کا یہ منفی پہلو ہے کہ لوگ کتاب نہیں خریدتے.....

س..... کیا ایک ترقی پسند شاعر کے لئے عوام میں مقبول ہونا ضروری نہیں ہے ؟

ج..... مقبول ہونا اور بات ہے اور اگر کوئی آدمی محض ترقی پسندی کے زاویئے سے لکھتا ہے اور اچھا شاعر نہیں ہے تو مقبول نہیں ہوگا۔

س..... تو پھر شاعر کا عوام سے کیسے رابطہ ہوگا ؟

ج..... رابطہ تو شاعری کے ذریعے ہی ہوتا ہے کیونکہ میڈیا تو وہ شاعری میں استعمال کرتے ہیں..... اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کا انداز کیا ہے اگر اس میں تھوڑا سا بھی شاعرانہ لطف ہے تو لوگ قبول کریں گے.....

س..... میں کسی غیر ترقی پسند شاعر کی بات نہیں کر رہا میں بات کر رہا ہوں ترقی پسند شاعر کی کہ ایک طرف وہ شاعر بھی ہے اور ایک طرف وہ ترقی پسند بھی ہے اور بطور ترقی پسند وہ عوام کی فلاح و بہبود کا دعویدار ہے اور عوام کے ذہنوں میں انقلاب لانا چاہتا ہے اگر وہ عوام تک پہنچتا ہی نہیں صرف جمالیاتی شاعری ہی باقی رہ جاتی ہے تو کیا پھر بھی آپ اس کو ترقی پسند مانیں گے ؟

ج..... میں یہ کہتا ہوں کہ وہ جو میڈیا استعمال کر رہا ہے جو میڈیم اس نے اپنایا ہے وہ توضیح ہو۔

س..... جب میں عوام کہتا ہوں تو اس کا مطلب وکیل پروفیسر یا پڑھے لکھے افراد نہیں بلکہ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور بھی ہیں ؟

ج..... عوام میں تو سب ہی آتے ہیں جو سامنے آکر بیٹھ گیا عوام ہے.....

س..... اب جیسے پنجابی کے شعرا ہیں سلطان باہو، بلھے شاہ میاں محمد اور دوسرے ہیں یہ بڑی اعلیٰ اور فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں مگر وہ عوام کے دلوں میں بھی گونجتے ہیں اور عام آدمی بھی ان کو سمجھتا ہے ؟

ج..... اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا جو میڈیم ہے اور جو شعری انصاف ان کی شاعری میں موجود ہے وہ بہت خوب ہے جو وہ کہتے ہیں وہ شاعری ہے۔

س..... تو پھر اردو میں ایسا کون شاعر ہے جس کی شاعری عام کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے لوگوں کی زبان پر ہو ؟

ج..... اس کے لئے کسی ایک کا نام نہیں لیا جا سکتا خاص طور پر ہندوستان میں کیونکہ اس کی ایک زبان نہیں ہے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں ہیں ہمارے ہاں عوام کا شاعر کوئی نہیں ہے یہ سب شاعر شہروں میں رہنے والے ہیں شہر والوں کی زبان میں کہتے ہیں.....

س..... اقبال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ج..... اقبال بہت اچھے شاعر تھے..... جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے وہ الگ ہے نہ اس پر اقبال کا اثر نہ اس پر کسی اور کا اثر ہے۔ میرے ہاں جو آدمی ہے وہ نہ اقبال کے ہاں ہے اور نہ ہی کسی اور شاعر کے..... میرے ہاں ٹوٹا ہوا اور بٹا ہوا آدمی ہے مثلاً وہ سچ بولنا چاہتا ہے لیکن نہیں بول سکتا ساری اخلاقی قدریں اس کے پاس ہیں لیکن ان کو استعمال نہیں کر سکتا وہ قدریں ہم کتابوں میں پڑھاتے ہیں لیکن ان کو سننا گوارا نہیں کرتے اور میری شاعری اس آدمی کی ہے جو اس بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔ اقبال ہمارا

ورنہ ہیں بڑے شاعر ہیں لیکن میری ان سے ذہنی مطابقت نہیں ہے۔

س..... میرے نزدیک اقبال بہت بڑے مسلمان ترقی پسند شاعر ہیں کیا آپ کو اس سے اختلاف ہے ؟

ج..... مسلمان ترقی پسند تو ہیں لیکن خود ان کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہیں وہ اپنے آپ کو تسلیم کرتے ہیں کہیں نہیں تسلیم کرتے۔

س..... وہ تو ان کے مختلف ادوار ہیں ؟

ج..... تو پھر شاعر کو ادوار میں ہی دیکھنا چاہئے اقبال کو بھی ادوار میں دیکھئے مسلمان تو وہ ہیں مسلمان میں بھی ہوں خواہ اپنے ایمان کا اقرار کروں یا نہ کروں کیونکہ میرا نام اختر الایمان ہے۔

س..... ایک سوال اور ذہن میں آیا کہ ہم صرف اقرار یا انکار والے مسلمان ہیں یا کبھی کبھار مسلمان والا خون بھی جوش مارتا ہے؟

ج..... ایسے بہت سے موقع آتے ہیں مثلاً جب مسلمانوں کا قتل عام ہوتا ہے چاہے کہیں بھی ہو اور یہ احساس تو انسانی سطح پر بھی ہوتا ہے مسلمانوں کے قتل کا سننے کے بعد کون خوش ہوگا اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہندو دو ہزار مارے گئے تب بھی خوشی تو نہیں ہوگی کیونکہ یہ انسانی سطح کا معاملہ ہے کسی کے بھی مارے جانے کا یا اس کے ساتھ ناروا سلوک ہونے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا کہیں بھی مسلمان کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی ہو افسوس تو ہوگا کیونکہ بہر حال ہم مسلمان ہیں۔

س..... معاشی آسودگی کے بعد ہمارے انقلابی ادیبوں میں اتنی شدت نہیں رہی اور وہ جتنے اپنے خیالات میں سچے تھے اب نظر نہیں آتے کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ معاشی آسودگی بھی انسان کو سہل بنا دیتی ہے ؟

ج..... معاشی آسودگی سے تساہل تو یقیناً آتا ہے لیکن معاشی آسودگی ضرور ہونی چاہئے جب ہم اشتراکیت کی بات کرتے ہیں تو اس لئے کرتے ہیں کہ ہر شخص کو معاشی آسودگی بھی حاصل ہو۔

س..... اشتراکیت میں فرد کی آزادی کو جس طرح کچل دیا جاتا ہے بطور شاعر آپ اس کو قبول کرتے ہیں ؟

ج..... فرد کی آزادی کو کہاں کچل دیا جاتا ہے آج کے دور میں ہم ایسا نہیں کہہ سکتے کیونکہ چین میں دیکھئے ایسا نظر نہیں آتا۔

س..... میرے خیال میں کوئی اشتراکی حکومت اس کو برداشت نہیں کرتی ؟

ج..... بالکل حکومت اس کو برداشت نہیں کرتی اس کی وجہ ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ پہلے جو معاشرہ یا نیا ڈھنگ آیا ہے پہلے لوگ اس کو سمجھ تو لیں پھر آگے چلا جائے ممکن ہے حکومت اس طرح سوچتی ہو..... تھوڑی بہت آزادی بہر صورت ضرور ہوتی ہے۔

س..... اس کا مطلب یہ ہے کہ اشتراکیت میں اگر آزادی چھین بھی لی جائے تب بھی اسے قبول کر لینا چاہئے ؟

ج..... آزادی کہیں بھی آزادی نہیں ہے آپ اشتراکیت کی بات چھوڑ دیں آزاد ہم اس وقت تھے جب ہم غاروں میں رہتے تھے اور ہم نے کوئی بھی اخلاقی پابندی قبول نہیں کی تھی جس دن ہم نے یہ تسلیم کیا کہ ہمیں مہذب ہو جانا چاہئے اس دن سے ہم آزاد نہیں رہے ہماری آزادی کی حدود متعین کر دی گئیں..... جیسے جیسے آدم مہذب ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے پابندیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں آزادی صرف ایک نعرہ ہے آزادی کا وجود نہیں ہے..... آزادی کی حدود ہیں ہم اس سے باہر نہیں جا سکتے لیکن آدمی آزاد نہیں ہے۔

س..... آپ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں بھی گئے ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں ہر فرد کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے اور ساتھ ہی معاشی آسودگی بھی حاصل ہے ؟

ج..... نہیں وہاں بھی آزادی نہیں ہے چاہے معاشی ہو گروپ بنے ہوئے ہیں وہاں آزادی کس طرح ہے جس طرح فلسطینیوں اور افغانیوں کے ساتھ ہو رہا ہے یہ کہاں آزادی ہے۔

س..... بطور ایک ترقی پسند ادیب کے افغانستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس بارے میں آپ کیا محسوس کرتے ہیں ؟

ج..... میں ذاتی طور پر یہ نہیں چاہتا کہ کوئی بھی ملک کسی بھی ملک پر فوج کشی کرے اس میں کوئی بھی ملک ملوث ہو نہیں سراہا جا سکتا۔

[روز نامہ "نوائے وقت" لاہور ۹ر مارچ ۸۵ء]

حمید الماس

فراق کے بعد

وہ اپنے ہاتھ میں
کب سے ردائے گل لے کر
کھڑی ہوئی ہے مرے پاس
اس طرح جیسے
اداس رقص کی کوئی ادائے آزردہ
کئی دنوں سے
میں لیٹا ہوا ہوں بستر پہ
صدائے مرثیہ خوانی نہ نوحۂ غم ہے
سوادِ مرگ سے آئے جو مجھ کو پروانہ
مرے بدن کی رفاقت کو چھوڑ کر تنہا
لرزتی روح کہیں آسماں پہ جائے گی
وہ انتظارِ شکستِ سکوت میں یوں ہی
کھڑی رہے گی مگر
وہاں سے اس کے لئے کیسے
مرثیہ بھیجوں

فردا کی دستک

کوئی دستک دے رہا ہے
نیم شب میں
ہاتھ شل ہیں
خون کی گردش نہیں ہے پیر میں
کس طرح دروازہ کھولوں
لیٹے لیٹے پوچھتا ہوں کون ہے
آ رہی ہے ہلکی ہلکی سی صدا
منزلِ زیریں پہ شاید
کوئی دستک دے رہا ہے
دیر سے

● ڈور نمبر ۵-۱۳۵۵، ہاؤسنگ کوارٹرس
۹ واں بلاک ۔ جیانگر ۔ بنگلور ۔ ۴۴

ڈرائنگ روم کی پینٹنگ

جگدیش چترویدی ● سی ۲-۳۲۰ A لارنس روڈ، نئی دہلی - ۳۵

روز کی طرح آج بھی وہ دیر سے اٹھا اور داڑھی بڑھے چہرے پر بڑی دیر تک ہتھیلیاں ملتا رہا۔ سامنے والی کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے بینگنی آسمان نظر آرہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس شہر میں آسمان کے رنگ بہت بدلتے ہیں۔ وہ لگاتار گھر سے نہیں نکلتا ہے۔ اور آسمان کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ اسے آسمان کے بدلتے ہوئے یہ رنگ ریستوران کی بھیڑ میں گھومتی لڑکیوں کے رنگوں میں سے کچھ خاص رنگ چرا کر بنے نظر آتے ہیں۔ تیسری منزل کی برساتی کے سامنے والی چھت پر سوکھتے کپڑے، مندر کا کلش اور دور گرجے کے کراس پر اڑتی ہوئی چیلیں اسے اچھی لگتی ہیں۔

سارا پہاڑ سا دن، وہ سامنے کے گھر کی رسّی پر ٹنگے کپڑوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ روز صبح ایک اداس سی صحت مند عورت آتی ہے اور روز کی طرح کپڑے سکھا کر چھت سے لوٹ جاتی ہے۔ کبھی کبھی چھت پر سوکھتے ہوئے کپڑوں میں اداس پڑوسن کی سلوٹیں پڑی انگیا بھی جھولتی ہے اور اسے یاد آجاتا ہے کہ اس نے کافی چھوٹی عمر میں اپنی نئی شادی شدہ ممانی کی انگیا رسّی سے اتار کر سونگھی تھی۔ ان دنوں وہ ترگنیف اور شرت چند کے ناول پڑھ رہا تھا۔ اسے ممانی اپنی ہم عمر نظر آتی تھیں اور اسے یکایک اپنے ماموں سے نفرت ہوگئی تھی۔ آج بھی ہوا میں سامنے کی چھت پر انگیا جھول رہی ہے اور کچھ چیلیں چھتوں کے اوپر بہت اوپر اڑتی ہوئی کہیں آکاش میں چلی جا رہی ہیں۔ وہ اداس ہو جاتا ہے۔

اسے یکایک کچھ خیال آتا ہے اور وہ گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔ گھڑی کی سوئیاں صاف نظر نہیں آتیں۔ اسے اپنی آنکھوں میں جلن سی محسوس ہوتی ہے۔ جلن آنکھوں سے نیچے اتر کر پسلیوں اور بازوؤں میں بھر جاتی ہے۔ اور وہ انگلیاں چٹخا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ اس کے سینے میں ہلکا، ہلکا درد ابھر آتا ہے۔ اس کا جی چاہ رہا ہے کہ وہ پھر سے سو جائے اور رضائی کو اتنی کس کر اپنے چاروں طرف لپیٹ لے کہ اس کا دم گھٹ جائے۔ لیکن وہ ابھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ آج اسے مسز لال کا بلاوا آیا ہے۔ اس قسم کے بلاوے زندہ رہنے کے لئے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ اسے مسز لال کے یہاں جانا ہی ہے۔ یہ اس کی مجبوری ہے۔

ویسے بھی مسز لال اسے اچھی لگتی ہیں۔ یوں تو اسے سگریٹ پینے والی تمام عورتیں ہی اچھی لگتی ہیں۔ لیکن تمباکو کھانے والے مرد بڑے بھلے اور گھن چکر لگتے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ مسز لال کا شوہر تمباکو کھاتا ہے۔ ساتھ ہی وہ ہلکا سا سلک کا سوٹ اور انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھی پہنتا ہے۔ مسز لال کو اس نے کبھی گہنے پہنے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ سفید رنگ کی ساری پہنتی ہیں اور اسے اکثر لگتا ہے کہ وہ مسز لال سے کہہ دے کہ آپ کو دیکھ کر مجھے کلوپیٹرا کی یاد آتی ہے۔ اسے سلیقے کے ساتھ سفید کپڑے پہننے والی سبھی عورتوں سے دلچسپی ہے۔ وہ کئی بار مسز لال سے ان کی پسند کی تعریف کرنا چاہتا ہے، پر وہ ان کے سامنے زیادہ تر چپ ہی رہتا ہے۔ نہ جانے کیوں اسے اچھی لگنے والی عورتوں کے سامنے چپ رہنے کی عادت ہے۔ بُری لڑکیوں سے وہ دور بھاگتا ہے۔

اسے یاد ہے بچپن میں اس کی ایک دوست تھی گیتا۔ اس کے بال لمبے تھے۔ آنکھیں کان تک کھنچی کھنچی بڑی بڑی اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں بڑے سلیقے سے بہت باریک کاجل بھی لگاتی تھی۔ پر وہ فیروزی رنگ کی ساری پہنتی تھی جس کی پٹلیوں میں نفاست کی جگہ بھدا پن رہتا تھا۔ وہ اسے بہت پیار کرتی تھی پر اس کی ہری ساری اور گندی پٹلیوں کی وجہ سے وہ شہر چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ اس نے اپنے

ذہن میں حسین لڑکی کی ایک تصویر بنائی تھی اور مسز لال اس سے مشابہت رکھتی تھیں۔

مسز لال ایک ڈانسنگ اسکول میں ڈائرکٹر تھیں۔ اور انہوں نے اپنے بالوں کو ترشوا کر اور بھی خوبصورت بنا لیا تھا۔ بال روم میں اس نے ایک بار ان کے ساتھ رقص بھی کیا تھا اور ان کی دوستی ہو گئی تھی۔ جب ناچتے ناچتے اس کا ہاتھ یکایک ان کے بلاؤز اور ساری کے بیچ ننگی کمر کے پاس سرک گیا تھا تو انہوں نے برا نہیں مانا تھا۔ اور دھیرے سے اسے ہٹا کر مسکرا دی تھیں۔ وہ انہیں پسند کرنے لگا تھا۔ اس نے رقص کے بعد باہر برآمدے میں گھومتے ویٹر سے شکنجبی منگائی تھی اور بعد میں مسز لال نے اسے سگریٹ پلائی تھی۔ پھر وہ اکثر مسز لال سے ملتا رہتا تھا۔ اور اسے ان کی آواز، برتاؤ اور نفاست سے انس ہو گیا تھا۔

لیکن مسز لال نے ادھر اس سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ یکایک کل رات ان کا فون آیا تھا کہ تمہیں صبح آنا ہے بہت ضروری کام ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی جلدی نہیں اٹھ سکا تھا۔ موسم بڑا امس بھرا تھا اور اسے اپنے باتھ روم کی گندگی یاد آ گئی تھی جس سے وہ دیر تک الگ رہنے کی سوچ رہا تھا۔ اس کے باتھ روم میں کئی دنوں سے صفائی نہیں ہوئی تھی اور مکڑیوں نے جالے بنا لئے تھے۔ وہ ان جالوں کو صاف کرنا چاہتا تھا۔ پر مکڑیوں سے اسے پیار تھا۔ بچپن میں وہ سوچا کرتا تھا کہ کسی کانچ کے برتن میں اگر مکڑی جالا بنائے تو اسے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ وہ بہت حسین آرٹ پیس ہو گا۔ وہ ڈرائنگ روم میں اسے سجائے گا۔

اسی وقت پاس کے مکان سے اونچے سروں میں ریڈیو سیلون کے گیت سنائی دینے لگے۔ اور اس کی زبان کے گرد ایک لس لسا پن محسوس ہونے لگا۔ اسے فلمی گانے اچھے نہیں لگتے اور جیو باکس میں چونی ڈال کر گانا سننے والے ٹیڈی بوائے انٹلکچوئل دوستوں کی شکلیں بھی اسے ہائی اسکول کے بگڑے ہوئے لڑکوں سی دکھائی دیتی ہیں۔ پڑوس کے ریڈیو کی آواز جب اسے کمرے کی دیواروں پر کافی تیزی سے رینگتی محسوس ہوئی تو وہ اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

باتھ روم کی دراز میں سے اس نے سامنے کی چھت پر سوکھتے کپڑوں کو گھورا اور ہوا میں ہلتی انگیا اسے ایک غبارے کی طرح نظر آئی جسے دیکھ کر اس کی مٹھیاں بند ھ گئیں پر وہ سنبھل گیا۔ فرش پر نل کا پانی بہنے لگا تھا۔ اور اسے ننگے پیروں زیادہ دیر ٹھنڈے پانی میں کھڑے رہنے کی عادت نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں موند کر تمام پانی کو جسم پر محسوس کیا اور اسے محسوس ہوا کہ صرف ٹھنڈے پانی میں حرکت ہے باقی تمام مرد عورتیں اس کی طرح آنکھیں موند کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے ہیں۔

تقریباً بارہ بجے وہ مسز لال کے گھر پہنچا۔ مسز لال نے آج شلوار پہن رکھی تھی۔ اور ان کی کرتی کا گھیر بہت کم تھا۔ اسے لگا کہ مسز لال اپنی صحت کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اور اپنے شوہر کی طرح انہوں نے اپنے جسم کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے۔ اسے مسز لال سے ایک عجیب سی ہمدردی محسوس ہوئی جو تھلتھل تیلیا چہرے والے مرد کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ مسز لال نے بہت دھیمی آواز میں رازدارانہ انداز میں کہا ——— مسٹر دوبے، یو آر انٹیمیٹ ٹو می YOU ARE INTIMATE TO ME کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مسز مہتا کی کلینک میں کیا چارجیز ہیں!

اسے تھوڑی سی حیرت ہوئی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مسز مہتا کے کلینک میں کیا کام ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک بدنام لڑکی نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس کو کلینک لے جا کر اپنے گناہ سے نجات دلائے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ گناہ یا ثواب جو کچھ بھی ہو، اس کا ڈھویا ہوا نہیں تھا۔ پر اسے قیمت چکانی تھی۔ کیونکہ اور دوستوں کے اصرار پر بہت رات گئے وہ اس کے ساتھ آئی تھی۔ اور صبح اس کے میز پر پھینکے گئے پرس سے ساتے روپئے نکال کر لے گئی تھی۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا پر اس وقت اس کی پنڈلیوں میں درد تھا اور اس کی بنیان پچپچی ہو رہی تھی۔

وہ اس لڑکی کی بالوں بھری ٹانگوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ تبھی مسز لال نے کہا ——— "آپ کیا سوچنے لگے مسٹر دوبے! کیا آپ میری مدد نہیں کر سکتے؟"

"ضرور کر سکتا ہوں"، اس نے جواب دیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ تو شادی شدہ ہیں۔ آپ ایسا کیوں کرنا چاہتی ہیں؟ پر اسے لگا

کہ یہ بہت بچکانہ سوال ہوگا۔ وہ شادی شدہ نہ ہوتے ہوئے بھی کئی ایسے کام کرتا رہا ہے جو شادی شدہ لوگوں کو کرنے چاہئیں اور پچھلے کئی دنوں سے اسے لگنے لگا ہے کہ اس کی عادتیں بھی شادی شدہ لوگوں جیسی ہوتی جا رہی ہیں۔

"تو چلئے؟" اس نے یکایک اصرار کیا۔

مسز لال نے ایک خوبصورت گڑیا کی طرح اس کی طرف دیکھا اور اپنے دوپٹے کو لاپرواہی سے کندھے سے اتار کر گلے سے لپیٹ لیا۔ ان کے ترشے ہوئے بال خشک اور یاسمین کی خوشبو سے بھرے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ وہ انہیں غور سے دیکھنے لگا کہ تبھی عام لڑکیوں کی طرح اس کو ہلاتے ہوئے مسز لال نے کہا ــــــ "آپ تو ایک دم شاعروں کی طرح کرنے لگتے ہیں مسٹر دوبے!"

وہ شاعری ضرور کرتا ہے لیکن شاعروں کی طرح جینا نہیں چاہتا۔ اسے یہ بات اچھی نہیں لگی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مسز لال کو عجیب نگاہوں سے دیکھا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل آیا ــــــ "آپ ٹھہریئے میں ابھی ٹیکسی لے کر آتا ہوں!"

مسز لال نے اندر کچھ اٹھا کر میز پر رکھا اور اس نے سنا کہ وہ ابھی "سلی" کہہ رہی تھیں۔ اس کے کان لال ہو گئے اور اسے اپنی بیوقوفی پر ہنسی آئی۔ اسے لگا کہ مسز لال نے آج فیروزی رنگ کی شلوار پہنی ہے۔ شاید اس لئے وہ ان سے اس قسم کا برتاؤ کر رہا ہے۔ وہ نکڑ تک جا کر ٹیکسی لئے بغیر ہی واپس آ گیا اور اس نے مسز لال سے آ کر کہا ــــــ "مسز لال برا نہ مانئے۔ آپ سفید سوٹ پہن لیجئے۔ آپ مجھے اس ڈریس میں بہت اچھی لگتی ہیں!"

مسز لال نے اسے ایک بار اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اندر چلی گئیں۔ ان کا بھرا بھرا جسم پیچھے سے بہت تراشیدہ لگ رہا تھا۔ اجنتا کی یکشنی کی طرح۔

وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ سامنے ایک پینٹنگ لگی تھی۔ جس میں ایک مگرمچھ ایک مچھلی کو چبا رہا تھا۔ اسے لگا کہ عورت بھی ایک مچھلی ہے اور مگرمچھ کی طرح چبانے کے بعد ہی اسے سکون ملتا ہے اور مچھلی کو بھی اتنی تسکین ملتی ہے اپنے جسم کی توڑ پھوڑ میں۔ اسے تمام عورتیں مچھلیوں کی طرح حسین اور نازک لگیں۔ اسے لگا کہ مسز لال ان تمام مچھلیوں میں اپنا الگ وجود رکھتی ہیں۔ مسز لال کے تراشیدہ جسم میں کشش کے ساتھ ہی عورت بھی ہے۔

اچانک وہ اٹھا۔ اور پاس کے کمرے میں ہڑبڑا کر گھس گیا۔ مسز لال کپڑے بدل رہی تھیں۔ اور ان کا آدھا جسم ایک دم عریاں تھا۔ اسے لگا کہ نیم عریاں جسم کتنا دلکش ہوتا ہے۔ وہ انہیں عقیدت سے دیکھتا رہا۔ مسز لال پہلے حیرت سے پھر بچوں کی طرح غصے سے اسے دیکھتی رہیں۔ اسے ان کی مچھلیوں سی آنکھوں کے اس روپ میں بہت اپنائیت لگی اور دوسرے ہی لمحے اسے لگا کہ کپڑوں میں جالے ہیں۔ مکڑیوں کے جالے جنہیں وہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ ان جالوں میں آگ لگ گئی ہے۔ وہ جل رہے ہیں۔ جلتے جا رہے ہیں۔ الجھتے جا رہے ہیں۔ تمام فرش پر جالے بکھرے ہوئے ہیں۔ مسز لال کے سفید کپڑے اسے فرش پر پڑی کینچلی جیسے لگ رہے تھے۔ اسے کہیں پاس سے آواز آئی تھی۔ یو آر ویری سویٹ دوبے ..... مائی ہسبنڈ از ......

اسے اپنے جسم پر ایک لجلجا کیڑا رینگتا محسوس ہوا۔ وہ سائڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ سامنے کی پینٹنگ دھندلی لگ رہی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ تمام عورتوں کو کلینک میں لے جانے کا ٹھیکا اس نے ہی لے رکھا ہے۔ ○○

◎ زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری اپریل ۱۹۸۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۴۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدیدِ خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

کمار پاشی

اگنی پریکھشا

پاپا ــــ میں ترے گھر کی باندی

میں نے اپنے سترہ برس میں
گڑیوں سے کے دن کھیلا ہے
میں نے تو بس سترہ برس تک
تیرے گھر کا چوکا برتن صاف کیا ہے

ان ہاتھوں سے چھوکر تجھے جگاتی تھی میں
رات کا بھوجن سب کو کھلا کر
بچا کھچا کچھ کھاتی تھی میں

ممی پاپا، بھائی اور بہنوں کے سوا تو
میری ان آنکھوں نے کسی کو
آج تک دیکھا بھی نہیں ہے
تیرے گھر کی ڈیوڑھی کے باہر تو اکیلے
میں نے قدم رکھا بھی نہیں ہے

میں کیا جانوں
مرا پڑوسی کون ہے پاپا
سچ مچ روز سحر نے مجھ کو
چوکے چولہے میں دیکھا ہے

رات بھی مجھ کو
چوکے میں مصروف دیکھ کر سو جاتی تھی
تیرے گھر کی دیواروں سے باہر پاپا کب جاتی تھی
کیا جانوں اس جنم میں میں نے
کون سا ایسا پاپ کمایا
سترہ برس تک تو نے مجھ کو
میرے ہر لمحے میں دیکھا
پھر بھی مجھے تو سمجھ نہ پایا

تو ابھی مانی ہے یہ سچ ہے
میں بھی تو ابھی مانی پاپا کی بیٹی ہوں
دیکھ مجھے میں ــــ تیری خاطر
اگنی ماں کے
سندر، شیتل، میٹھے شعلوں میں لپٹی ہوں
پاپا ــــ
میں اچھی لڑکی ہوں۔

● ۳۳۷۱ - دہلی گیٹ ، نئی دہلی ــ ۲

اردو مزاح کی موجودہ صورتِ حال

ڈاکٹر سید حامد حسین ● ای - ۸۴ - ۳ پروفیسر کالونی۔ بھوپال - ۲

اُردو ادب کے اکثر تاریخی جائزوں میں اردو کے جس آخری باضابطہ مزاح نگار کا نام دیکھنے کو ملتا ہے وہ رشید احمد صدیقی ہیں۔ ترقی پسند ادب پر بحث کرتے ہوئے بعض اوقات مروّتاً کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کا ذکر مل جاتا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد کے اردو ادب کی جب بھی بات کی جاتی ہے اس میں کسی مخصوص مزاح نگار کا ذکر تو دور کی بات، مزاحیہ نگارشات کو بحیثیت مجموعی بھی زیرِ غور لانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک خارجی جن کا تعلق اس زمانے کے مخصوص ادبی رویّے سے ہے اور دوسرے داخلی جو خود مزاحیہ ادب کی تخلیق سے متعلق ہیں۔ گزشتہ ایک صدی کے دوران ہمارا ادب کسی نہ کسی کھونٹے سے بندھا رہا ہے۔ اس عرصے میں ادیب نے خود کو شعوری طور پر کسی نہ کسی مقصد، کسی قسم کی افادیت، کسی نظریے سے وابستہ رکھا ہے۔ کبھی سماجی یا ادبی اصلاح کا مقصد ادیب کے ذہن پر حاوی رہا ہے تو کبھی قومی اور وطنی مسائل اس کی توجہ کا خصوصی مرکز رہے ہیں اور پھر گزشتہ نصف صدی کے دوران تو ترقی پسند اور جدیدیت کی تحریکات کے زیرِ اثر واضح نظریاتی جانبداریاں اس کا مطمحِ نظر بنی رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ادب کی تخلیق اور پھر اس کی شناخت انہیں تحریکات اور نظریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے اور کیونکہ مزاحیہ اسلوب کو ان تحریکات اور نظریات کے لئے واضح طور پر مفید وسیلے کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا گیا اس لئے مزاح، نظریہ پرست ناقدین اور تحریک پسند مورخین کی بھرپور توجہ اپنی جانب نہیں کھینچ سکا اور رفتہ رفتہ کچھ اس قسم کا تاثر پیدا ہونے لگا گویا مزاحیہ ادب کسی طرح سنجیدہ ادب سے کم تر درجہ کی تخلیق ہے چنانچہ ایسے متعدد با صلاحیت ادیبوں نے جو مزاحیہ فن کو اپنی نگارشات سے نیا نکھار اور نئی جہت دے سکتے تھے، خود کو پوری طرح سنجیدہ اسالیب میں محدود رکھا اور مزاح نگاری صرف چند گنے چنے سر پھروں کا شعار بن کر رہ گئی۔

اس کا واضح اثر مزاحیہ اسلوب کی گیرائی اور توانائی پر پڑا۔ آج مزاح کو تفریح اور سرسری پن کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے اور وہ بیانیہ نثر اور غیر رسمی شعر گوئی کی بعض ہیئتوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا ہم رفتہ رفتہ ادب میں طربیہ تصوّر کی اہمیت سے آنکھیں چراتے جا رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں مزاح ہمارے لئے صرف ایک اتفاقی اور ہنگامی سا پیرایۂ اظہار بن گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آج کے سنجیدہ ادب کی ایک بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ طربیہ تصوّر سے عاری ہے۔ اس میں زندگی کے بہت سے ایسے نرم و نازک، لطیف و شگفتہ اور ذکاوت و فراست کو تحریک بخشنے والے عناصر کی کمی ہے جن کے بغیر زندگی کی دلآویز تصویر گری مکمل نہیں ہوتی۔ طربیہ فن یعنی کامیڈی ہر عالمی ادب کا ایک بہت اہم حصّہ پر مشتمل ہے۔ وہ صرف وقتی تفریح کا آلۂ کار نہیں بلکہ نفیس تضادات، حسین تصادمات، دلچسپ بوالعجبیوں، قابلِ برداشت بے ضابطگیوں کو نمایاں کرنے، انہیں اظہار بخشنے اور ان سے ایک لطیف تاثراتی آہنگ ترتیب دینے کا مفید وسیلہ بھی ہے۔

MICVISION

دورِ حاضر میں نظریات کی تیزابی بارش ایک تخلیقی ریگ زار کو جنم دے رہی ہے اور اس ریگ زار کی سرحدوں کی روک تھام

ب ہی راستہ ہے اور وہ ہے طربیہ فن کی قلمیں پھر سے لگانے کا اور طربیہ فن کے بارے میں از سرِ نو اعتماد بحال کرنے کا۔

ایک اور اندیشہ جس کا ہمیں سامنا ہے وہ یہ ہے کہ نئے ذرائع ابلاغ کی توسیع کے نتیجے میں کامیڈی کمرشیل بنتی جا رہی ہے اور مزاح کی پستی اور اُتھلے پن کی جانب مائل ہے۔ INSTANT COFFEE کی طرح INSTANT HUMOUR نگ بڑھ رہی ہے اور پھر نئے بنائے دساور ی مال کی کھیپ اُتر رہی ہے۔ بچوّں کے غیر ملکی COMICS اخبارات ن بدیسی COMIC STRIPS ٹیلی ویژن پر باہر کے COMIC SERIALS غرض بدیسی مال بہ آسانی بلہ موجود ہے۔ ہنسو اور بھول جاؤ، یہ رویہ تجارتی نقطۂ نظر سے تو خوش آئند ہے۔ اگر جوتا ٹوٹے گا نہیں تو نیا جوتا کون خریدے گا اور بڑی کیسے چلے گی۔ لیکن یہ رویہ اعلیٰ ادب کی ضمانت نہیں۔ اعلیٰ طربیہ فن پارے بھلانے کے لئے نہیں بار بار دہرائے جانے کے لئے تے ہیں۔ ان کے لئے بڑے فنّی ریاض اور مزاح و اظہار کی بڑی نزاکتوں اور نفاستوں کی احتیاج ہوتی ہے۔ یہی چیلنج ہمارے آج ح نگار کے سامنے ہے۔

اگر ہم نظریاتی دلدل میں نہ پھنسیں تو مزاحیہ اسلوب ہمارے عہد کا خصوصی اسلوب بن کر اُبھر سکتا ہے۔ دورِ حاضر عقلی رجحانات کا دور ر عقلی موشگافیاں آج کے اندازِ بحث کا خاصہ ہیں۔ ہم اپنی گفتگو میں، تحریروں میں، رسمی و غیر رسمی مباحث میں موضوع کو باریک ت میں تحلیل کرنے کا رجحان رکھتے ہیں اور نکتہ آفرینی کے ذریعے دوسرے کی ذکاوت کو چھیڑ کر لطف لیتے ہیں۔ اس ذہنی تربیت کے تھ جس وقت ادیب اپنا قلم اٹھاتا ہے تو اس کے ذہن میں جو گونا گوں لطیف نکات ابھرتے ہیں، ان کی ہنرمندانہ ترتیب و پیش کش وہ نہ صرف لطفِ انشا کو بروئے کار لاتا ہے بلکہ نکات کے تقابل، تضاد اور تصادم کے ذریعہ وہ بعض صورتوں میں مزاح، بعض میں م ظریفانہ صورتِ حال اور بعض میں طنز کے تاثرات پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ عقلی مباحث سے کامیڈی کس طرح جنم لیتی اس کی ایک نمایاں مثال جارج برنارڈ شا کا فن ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ طنز و مزاح دورِ حاضر کے عقلی مزاج کی ایک نگ ہے اور آج کا ادیب طربیہ نہ صرف ایک اسلوب کی شکل میں بلکہ ایک ادبی رویّے کی شکل میں بھی اپنا کر ہم عصر زندگی سے تعلق رکھنے لے تاملات و تاثرات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ تخلیقی اظہار بخشنے میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ ہمارے ہی دور میں کرشن چندر تخلیقات "گدھے کی سرگزشت"، اور "گدھے کی واپسی"، فنکارانہ تخیّل، مزاحیہ حس اور سماجی شعور کے امتزاج کی ایک حسین مثال ں کرتی ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں جس قسم کا مزاحیہ ادب تخلیق ہوا اس میں تندی اور تلخی کا عنصر نسبتاً کم ہے۔ ترقی پسند تحریک ، دورِ عروج میں ایک واضح سماجی شعور اور نظریاتی وابستگی نے جس طنزیہ تندی کو جنم دیا تھا وہ ۱۹۵۰ء کے بعد ایک زیادہ لطر رویّہ میں بدلتا نظر آتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بذلہ سنجی، نکتہ آفرینی اور لطفِ انشا کی جانب نمایاں رجحان دکھائی دیتا ہے۔ سماجی تید کا لہجہ نرم ہو گیا ہے اور منفرد کرداروں کے مضحک پہلوؤں کی پیش کش آج کا ایک بڑا مقبول پیرایہ ہے۔ بعض مزاح نگاروں نے الی کرداروں کے وسیلے سے کسی ٹائپ کی مضحک تصویر کشی کو ترجیح دی ہے لیکن ادھر کچھ عرصے سے مزاحیہ خاکہ نگاری کی جانب ارے مزاح نگار کافی توجہ دے رہے ہیں۔

ہندوستان میں رفتہ رفتہ اردو صحافت کا دائرۂ اثر جس طرح محدود ہو رہا ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ صحافتی مزاح دائرہ تنگ تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب گنے چنے روزناموں میں ہی مزاحیہ کالم باقی رہ گئے ہیں اور ہفتہ وار اخبارات میں مزاحیہ مضامین فاقاً ہی جگہ پا رہے ہیں۔

گزشتہ تیس سال کے دوران اردو نثر میں جو مزاح تخلیق ہوا ہے اس کا زیادہ حصہ انشائیوں اور خاکوں کی شکل میں ہے۔ ندوستانی انشائیہ میں بالعموم مزاح کی ایک لہک اور لطفِ اظہار بنیادی عناصر کا کام کرتے ہیں اور اس لحاظ سے اکثر پاکستانی شائیہ کے اس اسلوب سے جداگانہ معلوم ہوتے ہیں جس میں غیر رسمی فلسفہ طرازی کا رجحان نظر آتا ہے یوں اس وقت ہندوستان میں

خالص انشائیہ کم ہی لکھا جا رہا ہے۔ بیشتر مضامین میں واقعاتی مزاح اور بیانیہ مزاح مختلف تناسب میں ملا جلا نظر آتا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے مثل افسانوی مزاح کے میدان میں بھرپور مزاحیہ نگارشات کی تخلیق دورِ حاضر میں نہیں ہو سکی ہے۔

اس سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی کے بعد جو مزاح نگار ابھرے ہیں انھوں نے مزاحیہ اسلوب کو ایک خاص توانائی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اپنی اختراعی صلاحیتوں کا خصوصی طور پر مظاہرہ کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مضامین ہوں یا خاکے اپنی تضاد سے چونکا دینے والی تفصیلات اور سادگی سے چبھ جانے والے فقروں کے ذریعے اپنا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ یوسف ناظم نے جانے بوجھے معاملات وحادثات سے گدگدی کا سامان پیدا کرنے کا فن سیکھا ہے اور وہ اپنی بے تکلفی سے ہمیں زیر کر لیتے ہیں۔ شفیقہ فرحت کا مزاح مضمون کے رگ و ریشے میں پیوست ہو کر بڑھتا ہے اور شاخ در شاخ پھیلتا ہے۔ وجاہت علی سندیلوی نے مزاحیہ صورتِ حال کو افسانوی تعمیر ماجرا کی بنیاد بنا کر بیانیہ مزاح نگاری کی دلکش مثالیں پیش کی ہیں۔ نریندر لوتھر نے مزاح کو سلیقے اور شائستگی میں تلاش کر کے اس کی توانائی کا راز رنگارنگی میں پایا ہے۔ وآہی صاحب نے شعر سے شمشیر کا کام لیا ہے۔ ایک سپاہ طنز ہے کہ تیر و تبر، نیزہ و خنجر، سے آراستہ ان کے یہاں مصرع مصرع میں قدم زن نظر آتی ہے۔ اور خواجہ عبدالغفور اور بھارت چند کھنہ نے اردو مزاح کو عالمی مزاحیہ ادب کے آداب و شستگی سے واقف کرانے کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے۔ ان جانے پہچانے ادیبوں پر ہی کیا منحصر، گزشتہ دس سال میں نثر و نظم میں مزاح نگاروں کی ایک پوری نسل ہمارے سامنے آئی ہے جس نے مزاحیہ اسلوب کو ایک نئی قوت اور نئی آواز بخشی ہے۔

شکایت بہرحال ادب کی جانب بالعموم اور مزاح کی جانب بالخصوص ہمارے رویّے سے ہے۔ مزاح نگار کے لئے اس وقت کامیڈی کے پستی کی جانب مائل کمرشیل رجحان ایک زبردست چیلنج ہے اور اس سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ اپنے عموماً طربیہ تصوّر کو فروغ دے اور طربیہ اسلوب کو صرف اتفاقی پیرایے کی حیثیت سے اختیار نہ کرے بلکہ ناول، ڈرامے، افسانے طویل نظم جیسی بسیط تر تخلیقات کے لئے بھی اس کو اپنائے۔ ○○
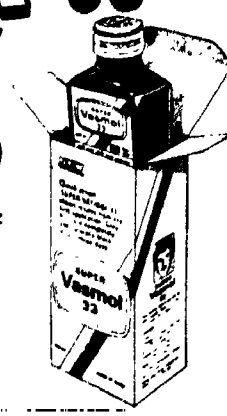
ظہیر غازی پوری

ایک ہی کروٹ میں کتنی پائمالی ہوگئی
زندگی اب بے کسوں کے منہ کی گالی ہوگئی

لب پہ میرے آگئی تھی برگِ خوں پیکری بات
سبز رشتوں کی زمیں یک لخت کالی ہوگئی

ہاتھ کا اک لمس تھا جس کے لئے بارِ گراں
چھو کے وہ پتے حنا کے لاابالی ہوگئی

سامنے آیا نہ وہ بے پردگی کے خوف سے
شوق میں میری زباں ناحق سوالی ہوگئی

رات بھر محسوس کرتا ہوں ستاروں کی دھمک
میرے محسوسات کی دنیا نرالی ہوگئی

ارتقا نے بخش دی ایسی طلسمی روشنی
اپنی جنّت اپنی نظروں میں خیالی ہوگئی

دل میں آیا جب مرے آزارِ نفسی کا خیال
خود بخود گریز میری خستہ حالی ہوگئی

بی۔ ایس۔ آر۔ ٹی۔ کور پور۔ ہزاری باغ (بہار)

حنیف کیفی

نہ جانے کتنے اجالوں کا خواب دیکھا تھا
کھلی جب آنکھ تو چاروں طرف اندھیرا تھا

بڑھا تو وسعتِ آفاق کھا گئی مجھ کو
میں اپنے آپ میں سمٹا تو ایک دنیا تھا

زمانہ میری حقیقت بتا رہا ہے مجھے
میں خود پسند نگاہوں میں اپنی کیا کیا تھا

غبارِ آئینۂ ماہ و سال کے پیچھے
دھواں دھواں سا جو چہرہ تھا میرا اپنا تھا

نظر نہ دیکھ سکی ہفت رنگ قوسِ قزح
سفید رنگ کا جلوہ تو ایک پردا تھا

اس ایک لمحے میں کتنی قیامتیں گذریں
یکایک اپنی تمنا سے جب میں روٹھا تھا

سلوکِ اہلِ زمانہ کا کیا گلہ کیفی
مرا حریف مرا ہی خلوصِ بے جا تھا

۲۷/۳۔ سی۔ ۱۲۔ ٹیلا ہاؤس، جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

ایم قمرالدین

قینچی میں زبان دے رہا ہوں
میں اپنا بیان دے رہا ہوں

اک شغل ہے مخالفوں سے جاری
تیروں کو کمان دے رہا ہوں

جو اترے ہر ایک دل میں۔ ایسی
خاموش اذان دے رہا ہوں

کمزور یقین لے کر۔ اس کو
مضبوط گمان دے رہا ہوں

دیوار ہے اور نہ در ہے کوئی
ذہنوں کو مکان دے رہا ہوں

میں اپنی کئی حقیقتوں کو
خوابوں کی امان دے رہا ہوں

رخصت کے وقت اب اور کیا دوں؟
قدموں کے نشان دے رہا ہوں

۱۲۰۔ لائرس چیمبرس۔ سپریم کورٹ نئی دہلی

جنگ اور جل

صدیق عالم ● کمرشیل ٹیکس آفیسر۔ رادھا بازار چارج، ۱۴، بیلیا گھاٹا روڈ، کلکتہ۔۱۵

کردار : دو فوجی، دو بچے، ایک نوعمر لڑکی، ایک عورت، ایک مرد، ایک بوڑھا آدمی۔
منظر : متوسط طبقے کا ایک کمرا۔ کمرے کے ساز و سامان سب اپنی جگہ موجود ہیں۔ مگر صوفہ یا میز پر جو لوگ بیٹھے یا لیٹے ہوئے ہیں، سب مر چکے ہیں۔ ان کے جسموں پر خون کی لالیاں سوکھ چکی ہیں۔

[دو فوجی رائفل لٹکائے اندر داخل ہوتے ہیں]

پہلا فوجی : ارے! ان لوگوں نے تو کام پہلے ہی تمام کر دیا۔ اطلاع دینے والا تو جھوٹا نکلا۔
دوسرا فوجی : کیا کہا تھا اس نے ؟
پہلا فوجی : کہ کچھ لوگ زندہ بھی بچے ہیں۔
دوسرا فوجی : وہ خود تو زندہ تھا ؟
پہلا فوجی : مجھے نہیں معلوم۔ لیکن جب میں اس کا بیان لکھ رہا تھا تو... مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کفن کے اندر سے بول رہا ہو۔
دوسرا فوجی : اس کے جسم پر زخم تو ہوں گے ؟
پہلا فوجی : ایک بھی نہیں، اور اسی کا تو اسے دکھ تھا۔ کہہ رہا تھا اب میں اتنا گیا گزرا ہو گیا کہ میرے جسم پر ایک بھی زخم نہیں۔
دوسرا فوجی : وہ کس خانے سے بول رہا تھا ؟
پہلا فوجی : میں نے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔ مجھے لگا وہ کسی بھی خانے کا نہیں تھا۔
دوسرا فوجی : ناممکن۔ اب وہ کہاں ہے ؟
پہلا فوجی : (انگلی سے پیشانی دبا کر) کہاں ہے وہ ؟
دوسرا فوجی : تم کہاں ہو ؟
پہلا فوجی : کہاں ہوں میں ؟
دوسرا فوجی : دراصل ہم لوگ کہیں بھی نہیں اور ہر جگہ ہیں۔
پہلا فوجی : دراصل ہم جہاں ہیں وہاں کوئی نہیں اور سب لوگ ہیں۔
دوسرا فوجی : مگر کہیں پر کوئی ضرور ہے۔ میں قدموں کی چاپ قریب آتے ہوئے سن رہا ہوں۔
پہلا فوجی : میں بھی، مگر —— چاپ تو دور جا رہی ہے۔
دوسرا فوجی : دور، کروڑوں میل تک کوئی نہیں ہے۔
پہلا فوجی : لیکن ایک سیارہ پوری رفتار سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ کبھی نہ کبھی تو وہ زمین سے ٹکرائے گا ہی۔ جانے کب ٹکرائے گا!

[ایک فوجی صوفے پر نیم دراز ایک جوان شخص کے مُردے سے ٹکرا جاتا ہے۔ مردہ جاگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں فوجی خوفزدہ ہو کر صوفے کے پیچھے چھپ جاتے ہیں]

جوان کا مُردہ : [اپنے خون آلود کپڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے] کیا پھر اخبار والوں نے غلط خبریں پھیلائی ہیں؟ مگر مجھے لگتا ہے میں بدل گیا ہوں۔ کیا یہ میرا خون ہے؟

[مڑ کر دوسری لاشوں کی طرف دیکھتا ہے۔ دفعتاً وہ کانپنے لگتا ہے اور اپنے گھٹنوں پر گر کر چہرا ہتھیلی سے چھپا لیتا ہے]

ہم لوگ اتنی صدیوں تک چلتے رہے ہیں مگر جنگل سے نکل نہیں پائے۔ وہ وحشی آج بھی جنگل میں آزاد گھوم رہا ہے۔ وہ پھر آئے گا کیونکہ جنگل چپ سادھے کھڑے ہیں۔ بلکہ میں اس کے قدموں کی چاپ سن رہا ہوں۔ شاید وہ میرے پیچھے کھڑا ہے۔

دونوں فوجی : [خوفزدہ ہو کر صوفہ کے پیچھے سیدھے کھڑے ہو کر رائفل تان لیتے ہیں] خبردار! ... تم ہمیں غلط سمجھ رہے ہو۔

جوان کا مردہ : [ہنس کر] اسے دنیا کی کوئی رائفل نہیں مار سکتی کیونکہ وہ ہمیشہ رائفل کے پیچھے کھڑا رہتا ہے۔

پہلا فوجی : [اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر] وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا اعتبار نہ کرنا۔

دوسرا فوجی : مر جانے کا صدمہ اس کے لئے اتنا کٹھن ثابت ہوا ہے کہ اس کا دماغ پھر گیا ہے۔

جوان کا مردہ : تم دونوں میں سے میرا خدا کون ہے؟

پہلا فوجی : ارے، یہ تو زندہ ہے۔ اس نے خدا کا نام لیا ہے۔

دوسرا فوجی : اس سے پوچھو وہ لوگ کون تھے؟

جوان کا مردہ : ان کے سروں پر سینگ نہیں تھے۔

دوسرا فوجی : کیا نام تھے ان کے؟

جوان کا مردہ : مگر ان میں سے کسی کا نام ....

دوسرا فوجی : وہ کہاں سے آئے تھے؟

جوان کا مردہ : اسی جنگل سے جو ہم اور تم ہیں۔ کاش ہمارے جنگل ہمیں تک ختم ہو جاتے۔

پہلا فوجی : میں نا کہتا تھا یہ زندہ ہے [قریب جا کر اس کے چہرے کا جائزہ لیتا ہے] ارے! یہ تو وہی ہے۔ کیا تم وہ نہیں تھے جس نے یہ اطلاع پہنچائی تھی؟

جوان کا مردہ : شاید۔ مگر تم تو وہ نہیں ہو۔ مگر نہیں، تم تو کوئی بھی نہیں ہو۔

پہلا فوجی : تم کس طرح مرے؟

جوان کا مردہ : میں نے اس بچے کی لاش کے زخم کی گہرائی میں انگلیاں ڈال کر یہ گولی برآمد کی تھی۔

دوسرا فوجی : بچے کی لاش؟ میں یقین نہیں کر سکتا کیونکہ میرا کوئی بچہ نہیں۔

جوان کا مردہ : میں نے وہ گولی ایک زنگ خوردہ بندوق کے اندر ڈالی اور ایک کتے کا نشانہ بنایا۔ کتا خارش زدہ تھا اور ہمیشہ بھونک بھونک کر دوسرے کتوں کو اشتعال دلایا کرتا تھا۔ بندوق چلی نہیں اور کتا اپنی ٹیڑھی دُم کے ساتھ ہنستا رہا۔

پہلا فوجی : گھبراؤ مت، ہم نے وہ کتا مار ڈالا ہے۔ اب وہ کسی کو زخمی نہیں کر سکتا۔

جوان کا مردہ : اسے مارنا اتنا آسان نہیں۔ کبھی کبھار وہ خود مارنے والے کے اندر داخل ہو جایا کرتا ہے۔ یہ کتا اتنا چالاک ہے کہ پانی دیکھ کر بھی نہیں بھونکتا وہ صرف ٹی وی کے اندر سے بھونکتا ہے۔

[اسٹیج پر بم کا دھماکہ ہوتا ہے۔ فوجی صوفہ کے پیچھے چھپ جاتے ہیں۔ جوان کا مردہ اپنی جگہ کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ دھوئیں کے حصار میں دھیرے دھیرے تمام مُردے جاگنے لگتے ہیں]

بچے کا مردہ : ماں، میرے اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے کفن پہنا دو۔ ورنہ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔

نو عمر لڑکی کا مردہ : ابا، ابا، میری سہاگ رات کٹ گئی۔ میرے ان گنت شوہر جانے کہاں چلے گئے ہیں؟ میرے پیٹ میں بچہ سڑ گیا ہے۔ مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلئے۔

بوڑھے کا مردہ : بھو! میرا حقہ میری قبر کے سرہانے رکھ دو۔ تب تک میں اپنے حصّے کی کھانسی کھانستا رہوں گا۔

عورت کا مردہ : اجی سنتے ہو، کیا وہ لوگ چلے گئے؟ اب میری لاش کو کندھا کون دے گا؟

جوان کا مردہ : وہ نامحرم نہیں ہیں جو تمہیں کندھا دیں گے۔

دونوں فوجی : [جواب تک صوفہ کے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں] نہیں!

عورت کا مردہ : تم دونوں میرے بچے کو سمجھاؤ۔ وہ اسکول جانا نہیں چاہتا۔

پہلا فوجی : مگر تمام اسکول تو بند ہیں۔ تم نہیں جانتیں؟

جوان کا مردہ : جھوٹ، تمام اسکول اب بھی کھلے ہیں۔ نفرت کا زہر پھیلاتے ہوئے اسکول، اسکول جہاں سے بچے بوڑھوں کی طرح بدصورت ہو کر نکلتے ہیں۔

دوسرا فوجی : اگر تم انارکسٹ ہو تو دوسری بات ہے۔

عورت کا مردہ : اسے معاف کر دینا۔ اب وہ کسی لائق نہیں رہ گیا ہے۔ اب وہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی تمام کتابیں جل چکی ہیں اور تمام الفاظ بے گور و کفن پڑے ہیں۔

[بم کا ایک اور دھماکہ ہوتا ہے۔ تمام مردے یہاں وہاں جا گرتے ہیں۔ فوجی صوفہ کے پیچھے پوزیشن لے لیتے ہیں۔ دھواں چھٹتا ہے۔ سبھی مردے ساکت و جامد پڑے ہیں۔ فوجی صوفے کی پشت سے سر ابھارتے ہیں۔ ایک بچہ اپنی ٹرائی سائیکل دوڑاتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے]

بچہ : جیک اینڈ جل، وینٹ اپ دی ہل۔ جیک اینڈ جل [سائکل کو کمرے میں چکر دیتا ہے۔ تین چار بار چکر لگا کر صوفہ سیٹ کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔ دونوں فوجی صوفہ کے پیچھے سے باہر نکل آتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف سنجیدگی سے دیکھتے ہیں]

دوسرا فوجی : جیک کون ہے؟

پہلا فوجی : اور یہ جل کیا ہے؟

دوسرا فوجی : یہ دونوں نام مشتبہ لگتے ہیں۔ انہیں ڈائری میں نوٹ کر لو اور گرد و پیش کی گلیوں میں پتہ چلاؤ کہ جیک اور جل کون ہیں؟

پہلا فوجی : [ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر غور کرتے ہوئے] میرے خیال میں تو یہ دونوں پہاڑ کی طرف بھاگ گئے ہوں گے۔ OO

[پردہ گرتا ہے]

بقیہ صفحہ ۴۸ دریدہ

پڑا تھا جس پر پہلے میری نظر نہیں پڑی تھی ——— اس کی تحریر تھی جو اس نے میرے لئے چھوڑ دی تھی ——— لکھا تھا ———

" وہ جو ٹیپ ریکارڈر پر دھری، فریم میں جڑی ہوئی تصویر تم دیکھتے رہتے ہو، سچ پوچھو تو وہ میرا بچپن نہیں ہے ——— وہ کھلنڈرا ہنس مکھ لڑکا میرا بیٹا تھا جواب، اس دنیا میں نہیں ہے ——— کچھ پیسوں کی سبیل کے امکانات نکل آئے ہیں۔ سو اس کی قبر بنانے جا رہا ہوں ـ اس کی تصویر تو فریم میں سجا رکھی ہے لیکن اس کی قبر کے نشانات تک مٹ چکے ہیں۔ اب انہیں کھوجنا ہے۔ وہاں سوائے زمین کے اب کچھ نہیں ہے۔ مٹی کا تودا بھی نہیں " OO

رفتار ـــــــ علمی، اَدبی اور تہذیبی خبریں

مَیں کسی قیمت پر اُردو کو سرکاری زبان تسلیم نہیں کروں گا (باسو)

کلکتہ ۲۸ مارچ۔ اُردو کو آرڈی نیشن کمیٹی کے وفد سے وزیر اعلیٰ مغربی بنگال شری جیوتی باسو نے اپنے چیمبر میں انتہائی غصّہ کے عالم میں کہا "میں اردو کو مغربی بنگال میں کسی قیمت پر دوسری سرکاری زبان قبول نہیں کروں گا" اس پر جب وفد کے ممبر پروفیسر اچنیتا بسواس (صدر شعبۂ انگریزی بنگا باسی کالج) نے کہا کہ "ہم لوگ بھی آپ کی بات نہیں مانیں گے"۔ اس پر وزیر اعلیٰ نے کہا "آپ لوگ جا سکتے ہیں"۔ شری جیوتی باسو کے اس رویّے کی مذمت کرتے ہوئے وفد کے ارکان چیمبر سے باہر آگئے۔

اُردو کو آرڈی نیشن کمیٹی کا وفد پروفیسر حسن کاظمی کی قیادت میں پولیس کی گاڑی میں سوار ہو کر رائٹرس بلڈنگ میں پہنچا۔ وزیر اعلیٰ نے وفد کے ارکان کو ان کے چیمبرز میں آتے ہی سوال کیا "کہئیے کیا بات ہے" وفد کے ارکان کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ وزیر اعلیٰ جیوتی باسو نے پھر سوال کیا "آپ لوگوں کے پاس میمورنڈم کی کوئی کاپی تو ہو گی"۔ پروفیسر کاظمی نے میمورنڈم کی کاپی پیش کی۔ وزیر اعلیٰ میمورنڈم کی کاپی پڑھنے لگے، جب ان کی نظر میمورنڈم نمبر ے پر پڑی تو انہوں نے کہا "اردو اکاڈمی سے اردو میں سوالنامہ آنے کے بارے میں گفتگو کر چکا ہوں"، اس پر کاظمی صاحب نے کہا "کون سی اکاڈمی ہم لوگ کسی اکاڈمی وغیرہ کو نہیں جانتے"۔ اس پر وزیر اعلیٰ چراغ پا ہو گئے اور بولے "آپ نے میری بات سن لی ہو گی جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنئے"۔ انہوں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "مدھیامک ہائی اسکول، ہائر سکنڈری، بی اے، بی کام، بی ایس سی وغیرہ میں اردو میں سوالنامے دینے کی ہدایت بورڈ اور یونیورسٹی کو کر دوں گا۔ میں اردو اکاڈمی کے وفد سے کہہ چکا ہوں"۔ وزیر اعلیٰ کی گفتگو سننے کے بعد پروفیسر اچنیتا بسواس نے کہا کہ "ہمارے مطالبہ نمبر ۱ پر غور فرمائیں یعنی اردو کو مغربی بنگال کی دوسری سرکاری زبان بنایا جائے"۔ اس پر وزیر اعلیٰ نے کہا "میں اردو کو مغربی بنگال میں کسی قیمت پر سرکاری زبان قبول نہیں کروں گا"۔ تب پروفیسر بسواس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا، "تب ہم بھی آپ کی بات نہیں مانیں گے"۔ شری جیوتی باسو نے غصّے سے کہا "آپ لوگ جا سکتے ہیں"۔

اس طرح انتہائی ناخوشگوار ماحول میں صرف چند ہی منٹ بات ہوئی۔ جب اردو وفد کے ارکان چیمبرز سے باہر آئے تو پولس افسران نے وفد سے کہا کہ آپ لوگوں کو مجمع عام کو کنٹرول کرنا ہے۔ اگر مجمع کنٹرول نہ ہوا تو صورتِ حال بگڑ سکتی ہے۔ وزیر اعلیٰ اور پولس آفیسرس سے بات کرنے کے بعد اردو وفد کے ارکان نے لگ بھگ دو گھنٹے آپس میں تبادلۂ خیال کیا۔ تقریباً ڈھائی بجے دن میں اسپلینڈ ایسٹ میں ایک مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر حسین کاظمی نے اپنے بیان میں کہا کہ "اردو کے شیدائیوں، بہی خواہوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں آپ لوگوں کے اتحاد و اتفاق کی وجہ سے آج اردو کو آرڈی نیشن کے وفد کو وزیر اعلیٰ سے ملاقات کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہم نے جو مطالبات وزیر اعلیٰ کے سامنے رکھے تھے ان میں سے ایک مطالبہ انھوں نے مان لیا ہے۔ قائدِ وفد نے دوسرے مطالبات کے بارے میں کہا کہ آپ حضرات کی تائید و حمایت اسی طرح حاصل رہی تو وزیر اعلیٰ کو سارے مطالبات ماننے ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ وزیر اعلیٰ سے نہایت ہی خوشگوار ماحول میں بات چیت ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری دوڑ دھوپ اور بھوک ہڑتال کارگر ہوئی ہے اور وزیر اعلیٰ نے ہمارا مطالبہ مان لیا ہے۔

مجمع میں لوگ خوشی سے ناچنے لگے اور ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ اردو کے متوالے یہ کہہ کر خوشی بانٹنے لگے کہ وزیر اعلیٰ نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہی کہا کہ کاظمی صاحب نے اپنی تقریر میں یہی تاثر دیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً ڈھائی لاکھ اردو کے شیدائی جمع تھے۔ لوگ اپنے گھروں کو پہنچ کر چراغاں کرنے لگے اور مٹھائی تقسیم کی گئی اور وزیر اعلیٰ زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔

۵ ہزار اردو کے اساتذہ کی تقرری

لکھنؤ۔ اتر پردیش کے وزیر تعلیم سید سبط رضی نے یہاں ریاستی اردو کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ ۲۰ جون تک اردو اساتذہ کی تقریباً پانچ ہزار آسامی اردو ٹیچرز کا تقرر کر دیا جائے گا تاکہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طلباء اردو پڑھ سکیں اور لسانی بے روزگاری دور کی جا سکے۔

جناب سبط رضی اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام لکھنؤ کرسچین کالج میں اردو کانفرنس کو خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اردو قومی یکجہتی اور مشترکہ کلچر کی اس خوشبو کا نام ہے جس سے پورا چمن معطر ہے اور اس کی جنت کو کسی بھی طرح کم نہیں کیا جا سکتا۔

جلسہ میں وزیر محنت سعید الحق نے اپنی تقریر میں اردو کو آئینی ضمانت دیتے جانے کے وعدوں کو پورا کرنے پر زور دیا اور کہا کہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اردو کو صوبے کی دوسری سرکاری زبان قرار دیا جانا چاہئے۔

کانفرنس کے جنرل سکریٹری جناب علی حیدر رضوی نے اردو کے اساتذہ اور اردو کے تعلیمی مسائل پر مشتمل ایک ۱۵ نکاتی مطالبہ ایوان کے سامنے رکھا جو اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ اس میں اردو کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک اردو ڈائرکٹریٹ کے قیام کا مطالبہ بھی شامل ہے۔

دو روزہ کل ہند سید سلیمان ندوی سیمینار

۹/ اور ۱۰/ مارچ کو انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی اردو اکاڈمی کے خصوصی اشتراک اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے تعاون سے دو روزہ کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا۔ افتتاحی اجلاس، انجمن کے لان پر ایک خوبصورت اور باوقار پنڈال میں ہوا۔

افتتاح ○ سید مظفر حسین برنی —— استقبالیہ ○ مالک رام —— اختتامیہ ○ خلیق انجم

پہلا اجلاس ○ صدارت ○ حسینی شاہد —— نظامت ○ صدیق الرحمٰن قدوائی

مقالات ○ عبدالمغنی ○ سید سلیمان ندوی بہ حیثیت ادیب —— عنوان چشتی ○ سید سلیمان ندوی کا نظریہ رسالت

ظہیر احمد صدیقی ○ سید سلیمان ندوی اور الہلال کے مضامین —— مشیر الحق ○ سید ندوی کی تاریخ نگاری

اس اجلاس میں پروفیسر آلِ احمد سرور، عبداللطیف اعظمی، رشید حسن خاں اور دیگر حضرات نے پڑھے گئے مقالوں پر اظہار خیال کیا۔

دوسرا اجلاس ○ صدارت ○ پروفیسر آلِ احمد سرور —— نظامت ○ رفعت سروش

مقالات ○ ارتضیٰ کریم ○ سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات —— مولانا عبیداللہ کوٹی ○ سیرت النبی میں الفاظ کی تحقیق

رشید حسن خاں اور تنویر علوی نے مقالوں پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے مقالوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ سید صاحب کا خاص کارنامہ سیرت النبی ہے۔

تیسرا اجلاس ○ صدارت ○ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن —— نظامت ○ اسلم پرویز

مقالات ○ مولانا ابوالبقا ندوی ○ سید سلیمان ندوی اور دار المصنفین —— رفعت سروش ○ سید صاحب کو حیثہ شاعری میں

شارب ردولوی ○ سید سلیمان ندوی کی تنقید نگاری —— سید شہاب الدین دسنوی ○ سید سلیمان ندوی اور ندوۃ العلماء

اس اجلاس میں پڑھے گئے مقالوں پر بحث کرنے والوں میں صدیق الرحمٰن قدوائی اور ارتضیٰ کریم کے نام لئے جا سکتے ہیں سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے صدارتی کلمات ادا کئے۔

چوتھا اجلاس ○ صدارت ○ جگن ناتھ آزاد —— نظامت ○ عنوان چشتی

مقالات ○ ڈاکٹر افتخار بیگم ○ سید سلیمان ندوی دبستان شبلی کا ممتاز ادیب —— عبداللطیف اعظمی ○ سلیمان ندوی کی مکتوب نگاری

انوار عالم ○ سلیمان ندوی اور قومی یکجہتی ــــــ تنویر احمد علوی ○ سلیمان ندوی اور فارسی ادبیات
سید صباح الدین عبدالرحمٰن ○ خیام پر ایک نظر

ان مقالوں پر ہونے والی بحث میں نوجوان اسکالرز توقیر احمد خاں، حیدر کشمیری، ضیاء الرحمٰن صدیقی کے علاوہ رشید حسن خاں اور مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نے بھی حصہ لیا۔ صدر جلسہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اس اجلاس میں پڑھے گئے مقالوں کو سراہتے ہوئے بطور خاص اقبال اور سید صاحب کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔

آخری اختتامی اجلاس میں جناب سری نواس لاہوتی، رشید حسن خاں، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور جمیل اختر نے اس دو روزہ سیمینار کو کامیاب قرار دیا۔

بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں راجندر سنگھ بیدی پر سیمینار

بمبئی ۲۰ فروری شام کو ۵ بجے بمبئی یونیورسٹی کے کشادہ ہال میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام راجندر سنگھ بیدی پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس (دہلی یونیورسٹی) نے کی۔ اس سیمینار میں باقر مہدی، فضیل جعفری، وارث علوی اور یونس اگاسکر نے بیدی کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں پر مقالے پیش کئے۔

ابتدا میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے بمبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی تشکیل اور اس کی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا اور بتایا کہ بیدی پر یہ سیمینار دراصل ان کی زندگی میں ہونا طے پایا تھا لیکن افسوس کہ بعض حالات کی بنا پر یہ سیمینار ملتوی ہوتا رہا۔

انعامات و اعزازات

ولی ایوارڈ

گجرات اردو بورڈ (احمد آباد) کی جانب سے ہندوستان میں سب سے پہلے اردو کے اولین شاعر ولی گجراتی کے نام سے منسوب ولی ایوارڈ کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ۲ جنوری ۱۹۸۵ء کو ٹیچے شنکر ستدری ہال میں گجرات کے وزیر اعلیٰ جناب مادھو سنگھ سولنکی کے ہاتھوں سے اردو کے مشہور اور قابل قدر محقق ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کو ان کی طویل ترین علمی و تحقیقی خدمات کے اعتراف کے طور پر تفویض کیا گیا۔ حبیب میاں سریس والا ٹرسٹ کی جانب سے ہر دو سال میں یہ ایوارڈ اردو بورڈ کے ذریعہ پیش کیا جائے گا۔

وزیر اعلیٰ نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ مدنی صاحب نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کا اولین شاعر ولی گجراتی تھا جو یہیں شہر احمد آباد میں مدفون ہے۔ یہ بات ہم لوگوں کے لئے باعث فخر ہے کہ گجرات اردو بورڈ کے صدر احسان جعفری، جنرل سکریٹری رحمت امروہوی اور دیگر اراکین نے ایک اچھے کام کی ابتدا کی ہے۔ تالیوں کی گونج میں وزیر اعلیٰ نے گجرات اردو اکاڈمی کے قیام کا اعلان کیا۔

۱۹۸۳-۸۴ء کے لئے غالب انعامات

۲۱ فروری کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایوارڈ سب کمیٹی کا جلسہ ایوان غالب نئی دہلی میں منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل دانشوروں کو انعامات دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

انعام		انعام یافتگان	سال
۱۔	فخرالدین علی احمد غالب انعام (برائے اردو فارسی تحقیق)	۱۔ پروفیسر مختارالدین احمد	(۱۹۸۳)
		۲۔ پروفیسر ابومحمد سحر	(۱۹۸۴)
۲۔	مودی غالب انعام (برائے اردو نثر)	۱۔ جناب خواجہ احمد عباس	(۱۹۸۳)
		۲۔ جناب صباح الدین عبدالرحمٰن	(۱۹۸۴)
۳۔	مودی غالب انعام (برائے اردو شاعری)	۱۔ نازش پرتاب گڈھی (پسِ مرگ)	(۱۹۸۳)
		۲۔ جناب میکش اکبرآبادی	(۱۹۸۴)
۴۔	ہم سب غالب انعام (برائے ڈراما)	۱۔ محترمہ شیاما بھاٹیہ	(۱۹۸۳)
		۲۔ جناب اظہر افسر	(۱۹۸۴)
۵۔	سلوانیا لکشمن غالب ایوارڈ (برائے صحافت)	۱۔ جناب یونس دہلوی	(۱۹۸۳)
		۲۔ جناب ناز انصاری	(۱۹۸۴)
۶۔	ساغر سوری غالب انعام (برائے طنز و مزاح)	۱۔ جناب فکر تونسوی	(۱۹۸۳)
		۲۔ جناب یوسف ناظم	(۱۹۸۴)
۷۔	پدم چند گپتا غالب ایوارڈ (برائے خطاطی)	۱۔ جناب فضل الرحمٰن	(۱۹۸۳)
		۲۔ جناب سید مختارالزماں	(۱۹۸۴)

اوّل چار انعامات دس دس ہزار روپیہ نقد اور باقی تین انعامات پانچ پانچ ہزار روپے نقد اور ایک ایک تمغہ اور توصیفی اسناد پر مشتمل ہیں۔ تقسیم انعامات کی تقریب جلد ہی عمل میں آئے گی۔

مہاراشٹرا اُردو اکاڈمی کے انعامات

حکومتِ مہاراشٹرا نے جنوری سے دسمبر ۱۹۸۴ء کے درمیان شائع ہوئی اردو ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں اور صحافیوں ... ر ۴۸ روپے کی مالیت کے انعامات عطا کئے ہیں۔ ریاست مہاراشٹرا اردو اکاڈمی کی جانب سے جن انعام یافتگان اور خصوصی انعام حاصل کرنے والوں کے ناموں کا اعلان کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

نظم ○ پہلا انعام (کسی کو بھی نہیں دیا گیا) دوسرا انعام (ڈیڑھ ہزار روپے) ۱۔ انجم عباسی ○ لہو کے چراغ
۲۔ ہمت رائے شرما ○ شہاب ثاقب تیسرا انعام (ایک ہزار روپے) شاکر انکوٹی ○ چہرے

نثر ○ (ناول فکشن) پہلا انعام (دو ہزار روپے) انور قمر ○ چوپال میں سُنا ہوا قصّہ
دوسرا انعام (پندرہ سو روپے) انور خان ○ فن کاری مشتاق مومن ○ رت جگوں کا زوال
تیسرا انعام (ایک ہزار روپے) عرفان عارف ○ سمر کا خواب

نثر ○ (تعلیمی ادب) دوسرا انعام (پندرہ سو روپے) خلیل شارق نیازی ○ تعلیم و تنقید
بچوں کے ادب کے زمرے میں پہلا دوسرا اور تیسرے انعام کا مستحق کسی کو بھی قرار نہیں دیا گیا لیکن ہمت افزائی کے طور پر درج ذیل قلم کاروں کو پانچ سو روپے کا انعام بالترتیب دیا گیا
غنی نمازی ○ شبنم کے موتی حیدر بیابانی ○ ننھی منھی باتیں

تنقید و تحقیق ○ دوسرا انعام (ڈیڑھ ہزار روپے) ○ ایم اے رضوی ○ امراض الصبیان
تیسرا انعام (ایک ہزار روپے) ○ ایم اے واقف ○ مکاتیب نجم

ڈراما ○ ہمّت افزائی کے طور پر پانچ سو روپے کا انعام ○ مجیب خان ○ لاچار ہیں
صحافت ○ (دو انعام ڈھائی ہزار روپے) شمیم طارق (اردو بلٹز۔ اردو ٹائمز) ○ داؤد کشمیری (انقلاب)
خصوصی انعام (ایک ہزار روپے) حنیف غازی (اردو ٹائمز) ○ مولانا حنیف علی (گلشن مالیگاؤں)
پرویز ہاشمی (بمبئی ٹائمز) ○ وکیل عارف (اخوت کامٹی) ○ پروفیسر اے آر مومن (بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ سماجیات)
○ قمر اقبال (اورنگ آباد ٹائمز) ○ سید مبین احمد (انقلاب)
○ مرحوم خواجہ عبدالغفور کو اردو زبان کی خدمات اور ریاست مہاراشٹر میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں ان کی کوششوں کے اعتراف میں ان کے نام پانچ ہزار روپے (پس مرگ) ایک خصوصی انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔
○ ڈاکٹر ابنائے واٹکر اور مرحومہ ڈاکٹر زرینہ ثانی (ناگپور) کو تین ہزار روپے کا مشترک انعام ان کی مراٹھی اور اردو کو قریب لانے کی کوششوں پر دیا گیا۔
○ جناب خواجہ احمد عباس مشہور اردو صحافی اور ادیب کو پانچ ہزار روپے کا خصوصی انعام دیا گیا۔ جو ان کو اُردو ادب اور صحافت کی طویل خدمات کے پیشِ نظر دیا گیا۔

شاعر کو پانچ ہزار رُوپئے کا خصوصی انعام

مہاراشٹرا اُردو اکاڈمی نے ۱۹۸۴ء کے انعامات میں ماہنامہ شاعر بمبئی کو اس کی تاریخ ساز علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کو سراہتے ہوئے پانچ ہزار روپئے کا خصوصی انعام دیا ہے۔

کتب و رسائل

- انکشاف —— بنگلہ دیش کے معروف افسانہ نگار ایوب جوہر کی ادارت میں شائع ہونے والا ادبی سہ ماہی مجلہ محاذ پبلی کیشنز کے زیر اہتمام نئے رنگ و روپ میں جلد منظر عام پر آرہا ہے۔ پتہ —— محاذ پبلی کیشنز ۲۶۔ لال چند مقیم لین (رتھ کھولا) ڈھاکہ (بنگلہ دیش)
- شیشے اور پتھر —— جدید فکری رجحان کے سنجیدہ شاعر فرحت قادری کا دوسرا مجموعۂ کلام آفسٹ کی خوبصورت طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آگیا ہے۔ صفحات ۱۴۴ قیمت بیس روپے۔ ظفر بک ڈپو جی۔ بی روڈ گیا (بہار) سے رابطہ قائم کریں۔
- قوس (ماہنامہ) نیا افسانہ —— کچھ نئے نام ایک خصوصی شمارہ نویں دہائی میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں کی تخلیقات ان کے سوانحی اشاریے اور تجزیاتی مطالعے کے ساتھ۔ ساتھ ہی جدید افسانے پر ایک گرانقدر مذاکرہ۔ شرکاء مذاکرہ، رام لعل، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔ ناوک حمزہ پوری کی ترتیب و تہذیب کے ساتھ ماہنامہ قوس کا یہ خصوصی شمارہ عنقریب منظرِ عام پر آرہا ہے۔ پتہ:۔ ماہنامہ قوس، حمزہ پور شیر گھاٹی، گیا (بہار)
- اقبال متین کی کتابیں ○ اجلی پرچھائیاں (افسانے) ۱۲ روپئے ○ نچا ہوا البم (افسانے) ۱۲ روپئے ○ خالی پٹاریوں کا مداری (افسانے) ۱۲ روپئے ○ چراغ تہہ داماں (ناول) ۱۲ روپئے ○ آگہی کے ویرانے (افسانے) ۱۲ روپئے

ان کتابوں کی بے پناہ مقبولیت کے بعد اقبال متین کی زیر طبع کتابیں میں بھی فسانہ تم بھی کہانی (افسانے) اور مزبلہ (افسانے) جلد منظر عام پر آرہی ہیں۔ ان تمام کتابوں کے لئے رابطہ قائم کیجئے۔ اے۔ بی۔ ۲۰ دددھ گاؤں کالونی پوچم پاڑ ۲۲۱۹۰۵ (آندھرا پردیش)

● ماہ رخ (خواتین کا ماہنامہ) اشاعت کا پہلا سال مکمل ہونے پر مئی ۱۹۸۵ء میں ماہ رخ کا پہلا سالنامہ شائع ہو رہا ہے جو اپنی امتیازی شان اور نئی سج دھج کے ساتھ ادبی دستاویز کی حیثیت سے بار بار پڑھا جائے گا اور مدتوں یاد رہے گا۔ قیمت صرف ۱۶ روپئے۔ سالانہ خریداروں سے سالنامے کی اضافی قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔ زرِ سالانہ چالیس روپیے۔ عام شمارہ ساڑھے تین روپے۔ ایجنٹ حضرات مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔ پتہ:۔ ماہ رخ اردو ماہنامہ گھیر کٹھے باز خاں، نزد پیلا تالاب، رامپور (یوپی)

● نذیر احمد کی ناول نگاری ——— ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے اس کتاب میں ملکی وغیر ملکی زبانوں میں ناول کی روایت کو سامنے رکھ کر نذیر احمد کے ناولوں کا مدلل اور بھرپور جائزہ لیا ہے۔ بہترین کتابت وطباعت، نفیس کاغذ، دیدہ زیب سرورق قیمت صرف تیس روپے ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی نمبر ۶ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔

● شاغیں (سہ ماہی) اندور (مدھیہ پردیش) سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالے شاغیں کا تازہ شمارہ منظر عام پر آگیا ہے۔ اس کی ادارت طارق شاہین کے ذمہ ہے۔ مدیران میں عزیز اندوری، مختار شمیم اور راحت اندوری شامل ہیں۔ نئے پرانے قلم کاروں کی تازہ ترین نثری اور شعری تخلیقات کے ساتھ ۱۲۰ صفحات کے دیدہ زیب کتابی سائز رسالے کی قیمت دس روپئے ہے۔
پتہ:۔ ۷۰ ظفر آباد کالونی، کھجرانا اندور (ایم پی)

وفیات

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا انتقال

برِ صغیر ہند و پاک کے معروف مصنف، محقق، دانشور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر غلام جیلانی برق ۱۲ر مارچ کی صبح کو ایک طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ مرحوم کی عمر ۸۴ سال کی تھی۔ انہوں نے مختلف علمی اور مذہبی موضوعات پر پچاس سے زاید کتابیں تصنیف کی تھیں۔

نسیم قریشی انتقال کر گئے

اردو کے مشہور ادیب اور شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی کے استاد جناب نسیم قریشی کا مختصر سی علالت کے بعد بعارضۂ قلب ۶۵ سال کی عمر میں ۱۷ر فروری ۱۹۸۵ء کو انتقال ہو گیا۔ نسیم صاحب کا آبائی وطن مہوبا تھا جہاں ۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کو ان کی ولادت ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی اور عالم جوانی ہی میں وہ لکھنؤ کی علمی ادبی محفلوں کی جان بن گئے۔ مشاعروں کی نظامت کو انھوں نے اپنی خوش گفتاری اور خطابت سے ایک فن کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ علی گڑھ آئے اور رشید احمد صدیقی مرحوم کی زیر نگرانی تحقیقی کام شروع کیا۔ ۱۹۵۶ء میں بہ حیثیت لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہوئے۔

حفیظ قتیل چل بسے

اردو کے ممتاز نقاد و محقق ڈاکٹر محمد عبد الحفیظ قتیل کا طویل علالت کے بعد ۲۶ر جنوری ۱۹۸۵ء کی شام ان کے مکان واقع سلطان پورہ میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۵ برس تھی۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے جامعہ عثمانیہ سے اردو ادب میں پوسٹ گریجویشن کیا تھا اور اسی جامعہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے اردو ادب، تنقید و تحقیق اور تدریس کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ دکنی ادب پر بھی انھوں نے گرانقدر تحقیقی کام کیا تھا۔

جیمس ہیڈلی چیز کا انتقال

جرائم اور جاسوسی کہانیوں کے عالمگیر شہرت یافتہ برطانوی ادیب جیمس ہیڈلی چیز کا ۷ر فروری ۱۹۸۵ء کو ۷۸ سال کی عمر میں ان کی قیام گاہ واقع دیوے (سوئزرلینڈ) میں انتقال ہو گیا۔

برِّ صغیر کے اردو داں حلقوں میں بھی چیز بے حد مقبول تھے، ان کے ناول کے تراجم اردو میں نہایت ہی شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ہندوپاک کے اردو ڈائجسٹوں میں ان کے ناولوں کی تلخیص اور ترجمے برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چیز ۱۹۰۶ء میں لندن میں پیدا ہوئے تھے، انھوں نے ۸۰ سے زاید ناول لکھے۔ گزشتہ چیز کے کئی ناول برطانیہ فرانس اور امریکہ میں فلمائے گئے ہیں۔

شاعر کے چند گراں قدر خصوصی نمبر

قومی ایک جہتی نمبر ○ قیمت ۱۵ روپے

ایک شمارہ ۸۰ء کے نام ○ قیمت ۱۰ روپے

افسانہ نمبر ۱۹۸۱ء ○ قیمت ۱۲ روپے

اہم نثری و شعری مطبوعات

لوحِ محفوظ — شعری مجموعہ

سیماب اکبر آبادی ○ قیمت ۲۰ روپے

کربِ خود کلامی — نظمیں

اعجاز صدیقی ○ قیمت ۱۲ روپے

سیماب کی نظمیہ شاعری۔ تحقیق و تنقید

ڈاکٹر زرینہ ثانی ○ قیمت ۱۲ روپے پچاس پیسے

— علاوہ محصولِ ڈاک —

مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶
بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس بمبئی ۴۰۰۰۰۸

نیویونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۲ نوروزجی اسٹریٹ ٹھاکردوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر وہیں سے شائع کیا۔

محفل اپنی

آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ

قارئین! شاعر کا آفسیٹ پر افتتاحی شمارہ آپ سب کو مل گیا ہوگا۔ ہمیں آپ کے خطوط ملنا شروع ہوگئے ہیں، مشاہیر قلم کاروں کے خطوط بھی آرہے ہیں۔ ابھی یہ شمارہ آپ کے زیرِ مطالعہ ہوگا۔ شاعر کو اس رنگ و روپ میں پسند تو کیا جارہا ہے لیکن ابھی پوری طرح یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ اردو دنیا پر اس خصوصی شمارے کا کیا ردِ عمل ہوا ہے۔ قدم قدم منزلیں چنتا ہوا شاعر بتدریج آگے بڑھ رہا ہے۔ افتتاحی شمارے میں کی جانے والی تبدیلیاں ابھی ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے، ممکن کہ آپ کے ذہن میں کئی سوال ابھریں۔ آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں، محسوس کر رہے ہیں وہ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کے خطوں سے بھی مدد لی جاسکے۔ ہمیں اپنی خامیوں اور خوبیوں کا اندازہ ہوسکے۔ شاعر آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ اسے ان لوگوں تک بھی پہنچایئے جو رسالہ خرید کر نہیں پڑھتے، جو اردو کے لئے کام تو کر رہے ہیں لیکن کوئی ادبی رسالہ ان کے نزدیک اہمیت نہیں رکھتا۔

شاعر کی طرف سے اپیل

ہم نے شاعر کی طرف سے ایک اپیل شائع کر کے آپکو بھجوائی ہے جس کا اعادہ آفسیٹ کے افتتاحی شمارے میں بھی کر چکے ہیں۔ ہم نے پوری اردو دنیا سے بھرپور معاونت کی درخواست کی ہے۔ ہم شاعر کے لئے جو خواب دیکھ رہے ہیں اس کی تعبیر آپ ہیں۔ ہمیں آپ سب کے عملی فیصلوں کا انتظار ہے۔ شاعر علاقائی حد بندیوں میں نہیں آتا۔ شاعر ان لوگوں کا بھی رسالہ ہے جو اس سے واقف تو ہیں لیکن ان تک ہماری رسائی نہیں۔ آپ اپنے وسائل کا جائزہ لیجئے اور اپنی زبان کے ایک اہم ترین ادبی رسالے کے لئے وہ کچھ کر گزریئے جو آپ اپنے لئے کر سکتے ہوں۔ بعض ہمدرد اور بہی خواہ ہماری اپیل کے باوجود ہم سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک ادبی رسالے کے لئے ضروری ہوتا ہے عطیات و اشتہارات اور خریدار۔ اور شاعر کے لئے بھی یہی کچھ کرنا ہے، آپ ہماری آواز دور تک پہنچایئے اپنے صوبے کی اردو اکاڈمیوں کو متوجہ کیجئے، اداروں کو لکھئے، مخیّر حضرات سے مالی تعاون کی درخواست کیجئے، اپنا زرِ سالانہ وقت پر ارسال کیجئے۔ شاعر چوں کہ تجارتی سطح کا رسالہ نہیں ہے اس لئے بر وقت زرِ سالانہ ارسال نہ کرنے سے رسالے پر کافی اثر پڑتا ہے۔

یہ تازہ شمارہ

اس شمارے کے تمام مشمولات ہی اہم ہیں، ہم شاعر کے ہر شمارے کو خصوصی شمارہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس شمارے میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم پر دو گرانقدر مضامین شائع کئے جارہے ہیں۔ ہم سید صاحب پر گوشہ ترتیب دینا چاہتے تھے جو ممکن نہیں ہوسکا۔ بہر حال! شاعر کی طرف سے یہ چھوٹا سا خراجِ عقیدت سید صاحب کی نذر ہے۔

ہم نے اپنے مستقل کالم شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ آئندہ شمارے سے مکتوبات اور نقد و نظر کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جارہا ہے۔ آپکے خطوط جو شاعر کے مندرجات کے حوالے سے ہوں گے اور جن میں علمی و ادبی مسائل ہوں گے، تحقیقی و تنقیدی مباحث ہوں گے، انھیں شائع کیا جائے گا۔ از راہِ کرم تخلیقات ارسال کرتے وقت شاعر کے معیار و مزاج کا خیال رکھئے، اپنی تخلیق کے ساتھ مناسب ڈاک ٹکٹ ارسال کیجئے۔ اس شمارے کے متعلق آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی ۔ علامہ سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

بہ یادگار ۔ اعجاز صدیقی (مرحوم)

اشاعت کا ۵۶ واں سال ● علمی، ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

جلد ۔ ۵۶ ◎ شمارہ ۔ ۵

مئی ۸۵

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالک غیر سے
۴۰ روپے	۱۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

قیمت : ● تین روپے پچاس پیسے

فون: ۳۵۹۹۰۴

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶،
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

SUPER
Vasmol
33

تیز اثر سوپر
وسمول ۳۳

- سفید بالوں کو شرطیہ تین دن میں قدرتی سیاہ بناتا ہے۔
- سوپر وسمول ۳۳ سائنٹفک طریقوں سے تیار کردہ چکنائی سے پاک بالوں کا تیل ہے جو سفید بالوں کو قدرتی سیاہی بخشتا ہے۔

ہائیجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۴۰۰۰۰۱

HYGIENIC RESEARCH INSTITUTE Post Box 1192, Bombay 400 001.

METRO PLAYING CARD CO.
Metro Estate, Bombay-400 029. • TEL : 531687

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

ڈراما

مکتوبات

رفتار

تحریریں

تصاویر

ادب کے غیر ادبی مسائل

ادب زوال پذ[illegible]

ادب مر رہا ہے !

موجود لمحوں میں سانس لیتا ہوا بے ترتیب معاشرہ اور ادیب ایک دوسرے کو فاصلے سے دیکھ رہے ہیں۔

ادب کی تخلیق تحریکوں کے زیرِ اثر ممکن ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے تو کیا اب تحریکیں نہیں رہیں ؟

بعض رجحانات تحریکیں کیوں نہیں بن سکے یا ادب کو تحریکات کی ضرورت نہیں کہ تخلیقی ادب کو "سکّہ بند" نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تحریکات و رجحانات بھی تو ناگزیر ہیں کہ پل پل فطری تغیّر و تبدّل کے تیز تر بہاؤ اور انسانی فطرت میں شامل درندگی و تضادات کا شدید ٹکراؤ بھی مسلسل ہے۔

ادب میں وہ گھما گھمی کیوں نہیں جو ہمارے ماضی کا خاصہ رہی تھی۔ ہمارا علمی، ادبی اور شعری ورثہ آنکے مقابلے میں زیادہ وقیع، معتبر، گراں قدر اور متنوع ہے۔

وہ عظیم اور خلّاق ذہن جو اپنی تحریروں سے متاثر کرتے تھے وہ کہاں گئے ؟ وہ اساتذہ کیا ہوئے جو نہ صرف شعر و ادب کا ذوق اُبھارتے نکھارتے تھے بلکہ شاعر و ادیب گر بھی تھے۔

ادب کی تخلیق عظیم تر مقاصد کے لئے ہوتی تھی لیکن آج شہرتوں کے حصول اور اپنے آپ میں "عظیم" ہونے کے جنون نے چھوٹے چھوٹے فن کاروں کے پیروں سے زمین چھین لی ہے۔

ذہانتوں کا استحصال ہو رہا ہے کیونکہ ادب میکانیکی سطح پر زیادہ تخلیق ہو رہا ہے۔

ادیب و شاعر کا اوّل و آخر تعارف اس کا کام ہے نہ کہ نام لیکن جہاں ذرائع ابلاغ اور تعلقات کا استوار رہنا زیادہ اہم ہو، اسی سے معیار بنتے ہوں وہاں کام کی اہمیت کیا ؟

آنے والی نسل کو سونپے جانے والے ورثے میں کیا شامل کیا جا رہا ہے ؟ صرف نام ہی نام اور کام ؟

ادب کی تخلیق سے زندگی اپنا راستہ تلاش کرتی ہے لیکن تخلیقی ادب میں کوئی نظامِ خیال، کوئی فلسفۂ زندگی یا فکری رویّوں میں کوئی نظم نہ ہو تو زندگی کو کیسے جیا جائے ؟

آج وہ قابلِ ذکر کتابیں کیوں نہیں لکھی جا رہی ہیں جن کی گونج دُور دُور تک سُنائی دے اور جن کے اثرات بے پناہ ہوں۔

آج بھی یہ امر مسلّم ہے کہ وقت فیصلے کرتا ہے اور یہ فیصلے اٹل، کھرے اور سچے ہوتے ہیں۔ لیکن ان مشکوک فیصلوں کا کیا کیا جائے جو تسلیم تو کئے جا چکے ہیں لیکن یہ فیصلے وقت نے نہیں بلکہ ان لوگوں نے کئے ہیں جنھوں نے وقت کو اپنا غلام سمجھا اور اپنے ہمنواؤں کے ذریعہ من مانی کی۔ اردو شعر و ادب کی پوری تاریخ میں ایسے مشکوک فیصلے آج بھی بدستور ہیں۔

کیا کیجے کہ بے اصولیوں کے
پہلے سے اصول بن گئے ہیں

(اعجاز صدیقی)

ہولناک تبدیلی

ایک زینہ ہے اِدھر میرا مکاں ہے، اور اُدھر
کچھ دنوں سے آ کے ٹھہرا ہے کوئی شخصِ دگر

رات کو زینے سے آئی مست سیٹی کی صدا
سُن کے اُس سیٹی کو میری زندگی نے یہ کہا

تجھ سے ملنے کے لئے یہ شخص آ سکتا نہیں
اب یہاں ذوقِ جوانی بار پا سکتا نہیں

اب تو آئیں گے اِدھر لے دے کے اربابِ کلیم
سُست چہروں پہ صحافت کا لئے بارِ عظیم

تند مطبع کی ہزاروں جھڑکیاں کھائے ہوئے
کاتبوں کے دو رخی وعدوں سے گھبرائے ہوئے

زندگی کے جادۂ آرام سے بھٹکے ہوئے
اچکنوں کے دامنوں کی طرح مُنہ لٹکے ہوئے

آئیگی جنکے شکن آلودہ ماتھوں سے صدا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

کام کی باتوں سے وہ ہر آن جنگیں کیا ہوئیں
ہائے وہ بیکار باتوں کی اُمنگیں کیا ہوئیں

جوشؔ سا انسان فکروں سے کچل کر رہ گیا
ہائے کیا میخانہ دفتر میں بدل کر رہ گیا

جوشؔ ملیح آبادی

● یہ نظم ماہنامہ کنول (آگرہ۔ مدیر منتظر صدیقی) کے خاص نمبر جنوری ۱۹۳۶ء سے لی گئی ہے۔
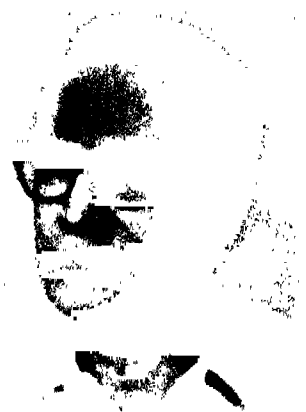
ڈاکٹر ابو محمد سحر — فضا ابن فیضی — جوگندر پال

بشر نواز — خمار قریشی — مقدر حمید

ف۔ س۔ اعجاز — عباس دانا — رئیس الدین رئیس

حلقۂ اربابِ ذوق کراچی کے ایک یادگار مشاعرے کی تصویر جس میں علامہ سیماب اکبر آبادی اپنا کلام سنا رہے ہیں۔
شرکائے محفل میں ہادی مچھلی شہری، ادیب سہارنپوری، شان الحق حقی اور نہال سیوہاروی وغیرہ شامل ہیں۔

برجموہن دتاتریہ کیفی اور سید نجیب اشرف ندوی۔

شاعر

سیماب

اکبرآباد

معصوم منزل - محلہ کٹرہ غوث - نیا مشہدی

قصر الادب

آگرہ

باسمہ تعالیٰ

محبی السلام علیکم - خط ملا - خیریت معلوم کر کے مسرت ہوئی - میں زندہ ہوں
گرمی رہی ہے شدید سر رہتے طبیعت میں تازگی نہیں ہے - اعجاز حسین سلمہٗ کا کاروبار
ابھی صحیح نقطۂ عمل پر نہیں آیا - رسالے میں ذاتی طور پر اپنے اخراجات کی تکمیل بڑی مشکل
سے کر رہے ہیں - کچھ احباب اعانت کرتے رہتے ہیں - اور خدا کی کارسازی کسی طرح کام
چلا رہی ہے - فالحمد للہ علیٰ احسانہ و الحمد للہ علیٰ نعمائہ -

وحی منظوم ترجمہ منظوم کی طباعت و اشاعت کے لئے آپ بہت زیادہ زور دے رہے
ہیں - مگر ذرائع اشاعت پر آپ نے کبھی غور نہیں کیا - اگر آپ دو لاکھ روپیہ
فراہم کر دیں تو ترجمے کی طباعت کا کام کل ہی شروع ہو سکتا ہے - کہئے
کیا ارادہ ہے؟

"نیستاں" کی پہلی اشاعت کو میں منسوخ کر چکا ہوں - اس لئے اس کی تلاش
کی فکر نہ کیجئے - دوسرا ایڈیشن مسودہ تیار ہے - صرف چھپنے کی دیر ہے - جب
ایڈیشن تیار ہو جائے تو قصر الادب سے منگا لیجئے -

سورۂ فاتحہ کے ترجمہ کی نقل منسلک ہے - خدا کرے آپ بخیر اور مسرور ہوں

دعاگو سیماب اکبرآبادی

سیماب

اکبرآبادی

قصر الادب

آگرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ---------- وَلَا الضَّآلِّیْنَ ع

نام سے اللہ کے (کرتا ہوں آغاز بیاں)
جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

ہیں سزاوارِ خدا (پاک) ساری خوبیاں (جو ہی) رب سارے جہانوں کا: رحیم و مہرباں لا
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک (بےگماں):

(یا الٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی اور ہوتے ہیں تجھی سے طالب امداد بھی:

(یا الٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا: اُن کا رستہ جن پر (انعام و کرم) تیرا ہوا:

راستہ اُن کا نہیں جن پر غضب (کی) ہے (نگاہ) اور نہ اُن کا راستہ جو ہوگئے گم کردہ راہ:

"آمین"

علامہ سیماب اکبرآبادی کی یہ عکسی تحریریں ان کے عزیز شاگرد عارف سیمابی بانکوٹی کے نام ہیں۔ عارف صاحب کے شکریے کے ساتھ شائع کی جارہی ہیں۔ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن عارف صاحب کو لکھے گئے خطوط کے تسلسل میں یہ ۱۹۴۶ء کے آخر اور ۱۹۴۷ء کے اوائل کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ۲۱ جولائی ۱۹۴۶ء میں قرآن مجید کا منظوم ترجمہ مکمل ہوگیا تھا۔ یہ منظوم ترجمہ سات ماہ نو دن میں مکمل ہوا تھا۔

فضا ابن فیضی

تیرے حق میں ہے یہ تعویذِ شفا محفوظ رکھ
میری جاں! اپنے بزرگوں کی دُعا محفوظ رکھ

بُجھ نہ جائے، میرے سینے میں جو روشن ہے چراغ
مصلحت یہ ہے، دریچوں پر ہوا محفوظ رکھ

خواب کا کیا ہے، یہ آنکھوں سے نہاں ہو جائیں گے
چہرہ چہرہ، کچھ غبارِ ماجرا محفوظ رکھ

عکس اندر عکس، بے چہرہ حقائق کی یہ بھیڑ
تجھ سے ممکن ہو تو اپنا آئینا محفوظ رکھ

سنگ کے سینے میں بھی دل ہے، اسے دریافت کر
نقش کی صورت میں تو اپنی نوا محفوظ رکھ

ہے تری پہچان مشکل، اس حوالے کے بغیر
اپنے اس کے درمیاں کا سلسلا محفوظ رکھ

وہ اسی رستے سے تیرے پاس اک دن آئے گا
قربتوں کے بیچ بھی اک فاصلا محفوظ رکھ

اور صیقل تجھ کو کر دے گا یہ احساسِ انا
جوہر اپنی ذات میں اس تیغ کا محفوظ رکھ

اپنی جنت کا ہوں میں بھی ایک ممنوعہ شجر
میرے بارے میں تو اپنا فیصلا محفوظ رکھ

میں تو کر لوں گا سزا پر بھی گذارہ اے خدا
دوسروں کے واسطے ساری جزا محفوظ رکھ

ہے بڑی سفاک تیرے عہد کی یہ آگہی
اِس شکست و ریخت میں خود کو فضاؔ محفوظ رکھ

● مئو ناتھ بھنجن (یوپی)

تخت سنگھ

بے زباں اشکوں کے سینے کی فغاں ہو جاؤں گا
چیر کر صدیوں کے سناٹے عیاں ہو جاؤں گا

میری آنکھوں کی بصارت چھین بھی لو گے تو کیا
دل کی بینائی سے آئینہ بجاں ہو جاؤں گا

میری آمد پر ہیں خوش کیوں اس قدر سوکھے شجر
میں ہرا موسم نہیں جو گل فشاں ہو جاؤں گا

جنگ کے میداں میں اترو تو سہی، وعدہ رہا
تم بنو گے تیر جب بھی، میں کماں ہو جاؤں گا

جس کو لکھیں گے نقوشِ پا خود اپنے ہاتھ سے
میں غبارِ راہ کی وہ داستاں ہو جاؤں گا

کیا خبر تھی، فرق روز افزوں یہیں بلنے گا یوں
تم زمیں بن جاؤ گے، میں آسماں ہو جاؤں گا

شاخِ غم دل میں لگا لی میں نے اِس امید پر
پھول جب نکلیں گے اس میں، گلستاں ہو جاؤں گا

سی کے کیا لو گے مجھ ایسے قطرۂ شبنم کے ہونٹ
دن کو چڑھ لینے دو، خود ہی بے نشاں ہو جاؤں گا

اوس اگر پڑتی رہی یوں ہی مری ہر آس پر
ایک دن بھڑکوں گا یوں، آتش بیاں ہو جاؤں گا

● ۲۰۴۷۔ اگوار گجران۔ جگراؤں۔ ضلع لدھیانہ (پنجاب)

[ار]دو کے ہم صوت حروف

[ڈ]اکٹر ابو محمد سحر ● ۳۹ مالویہ نگر بھوپال ۴۶۲۰۰۳

اردو کے حروف تہجی میں اہل اردو کے عام تلفظ کے مطابق کئی حروف ہم صوت ہیں۔ حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ان کو مندرجہ ذیل گروہوں میں [تق]سیم کیا جا سکتا ہے :

۱۔ الف ، ع ، ء
۲۔ ت ، ط
۳۔ ث ، س ، ص
۴۔ ح ، ہ
۵۔ ذ ، ز ، ض ، ظ

یوں تو یہ سبھی حروف عربی الاصل ہیں لیکن ان میں سے مندرجہ ذیل کو اس لحاظ سے الگ سمجھنا چاہیے کہ ان کا امتیازی تلفظ اہل عرب کے ساتھ مخصوص ہے:

ع ، ط ، ث ، ص ، ح ، ذ ، ض ، ظ

[عر]بی داں حضرات انکے تلفظ پر قادر بھی ہوں تو اردو میں اصل مخارج کے مطابق ان کے تلفظ کا رواج نہیں ہے بلکہ اس طرح کی کوشش مضحکہ خیز سمجھی جاتی ہ[ے]۔ عرقِ نعنع کے متعلق ایک لطیفہ اہل اردو کے رویّے کا آئینہ دار ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی نے جب ایک عطّار کی دوکان پر عین کے پورے اعلان کے ساتھ [پو]چھا کہ عرقِ نعنع ہے تو عطار نے جواب دیا کہ ہے تو لیکن آسنا گاڑھا نہیں ہے۔

اردو میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اہلِ عرب ان میں سے ہر حرف کے تلفظ میں امتیاز برتتے ہیں لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اکثر عرب [م]مالک میں ض، ظ اور ذ کو دواد یعنی دال کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ صرف ز کو ز کی طرح ادا کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر ض، ظ اور ذ کو ز کی [ط]رح ادا کیا جائے تو اسے ز سمجھا اور لکھا جائے گا۔ عرب ریاض کو ریاد، کاظمین کو کادمین، روضہ کو رودہ اور حضرت کو حدرت بولتے ہیں۔ ابوظبی کا تلفظ بودھبی ہے۔ اسی طرح ث کو تھ پڑھتے ہیں مثلاً ام کلثوم کو ام کلتھوم، عثمان کو عتھمان اور ثلاثہ کو تھلاتھہ بولتے ہیں لہ ث اور ابوظبی کے تلفظ سے [یہ خ]یال بھی غلط ہو جاتا ہے کہ ہائیت (ہکاریت) صرف ہندآریائی یا ہندوستانی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔

ح اور عین کا تلفظ عربوں کے ساتھ اسی طرح مخصوص ہے جس طرح اہل اردو سمجھتے ہیں۔ تاہم عین اردو تلفظ میں اتنا بے صوت حرف نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ [ط]بقے میں اس کے الفاظ کا تلفظ اس طرح کیا جاتا ہے کہ الف اور عین میں خفیف سا امتیاز ظاہر ہوتا ہے مثلاً شعرا، شعار، شعور، موعود، انعام، [ت]عجیل، تعمیل، نستعلیق، تعقل، تعالیٰ، اعلان، معلوم وغیرہ۔ اگر شورہ (ایک قسم کا کھار) یا شوریٰ (مشورہ) کے ساتھ شعرا کو اور تالا (قفل) [ک]ے ساتھ تعالیٰ کو بول کر دیکھا جائے تو فرق صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

رسم الخط اور زبان کا بڑا قریبی تعلق ہے۔ عربی رسم الخط جن زبانوں میں اختیار کیا گیا ان میں عربی الفاظ یا تو پہلے سے داخل تھے یا رسم الخط کے ساتھ داخل ہوئے۔ دونوں صورتوں میں عربی الفاظ کا اصل املا برقرار رکھا گیا، حالانکہ دوسری زبانوں کے بولنے والے بعض عربی حروف کی ادائگی پر پوری طرح قادر نہ تھے۔ اس کا ایک معنوی پہلو بھی تھا۔ بہت سے عربی الفاظ میں حروف کے اختلاف سے معنی کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے

مثلاً الم، علم۔ ثواب، صواب۔ مامور، معمور۔ نظیر، نذیر۔ عرض، ارض وغیرہ۔ اہل ایران کچھ عربی حروف کے تلفظ پر پوری طرح قدرت نہ رکھ
تھے لیکن جب انھوں نے فارسی کے لئے عربی رسم الخط اپنایا تو معنوی اقتباس سے بچنے کے لئے نہ صرف عربی الفاظ کا املا برقرار رکھا بلکہ فارسی
میں بھی اس روش کو اختیار کیا۔ مؤلف فرہنگ آصفیہ صواد کے ذیل میں لکھتے ہیں :

"یہ حرف سوا اپنے خاص تلفظ کے ساتھ جیسے صواد کہنا چاہیے کسی زبان میں نہیں آیا۔ ہاں عربی الاصل الفاظ
میں آتا ہے۔ جن زبانوں میں عربی الفاظ مخلوط ہو گئے ہیں ان کے حروف تہجّی میں بھی اس کو جگہ دی گئی ہے ....
اہل فارس نے رفع التباس کے واسطے سین سے بھی بدل لیا ہے جیسے سد، صد۔ شست، شصت۔ چونکہ
سد بہ سین مہملہ بمعنی دیوار اور شست بہ سین مہملہ بمعنی نشانہ آتا ہے اور صد سو کے، شصت ساٹھ کے
معنی بھی دیتا ہے، اس وجہ سے اس معنی میں صاد مہملہ سے لکھنا شروع کر دیا۔" ۵۲

پھر اسی پس منظر میں اردو میں بھی یہ حروف آئے اور طوطا اور ناطہ جیسے الفاظ کو چھوڑ کر صرف عربی و فارسی الفاظ کے املا میں ان کو اختیار کیا گیا۔

عربی و فارسی الفاظ میں تو املا کے اختلاف سے معانی کا اختلاف ظاہر ہوتا ہی ہے، عربی یا فارسی اور اردو کے بہت سے الفاظ میں بھی املا کا
معانی کے اختلاف کو نمایاں کرتا ہے مثلاً لعل، لال ۔ عام، آم۔ جبل، جال۔ کثرت، کسرت وغیرہ۔ رفع التباس کے علاوہ ان حروف سے کچھ اور فائدے
بھی ہیں مثلاً ان کے ہونے یا نہ ہونے سے اشارہ مل جاتا ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ حساب ابجد میں جس کا استعمال تعلیم یا فنہ طبقے میں کئی طریقوں سے
ہے یہ حروف بہت کام دیتے ہیں۔ ان کے بغیر حساب ابجد کا کوئی تصوّر باقی نہیں رہ سکتا۔ ان میں سے بعض حروف علامت کے طور پر استعمال ہوتے
جیسے ع مصرع کی اور صہ منظوری، پسندیدگی اور درستی کی علامت ہے۔ ان حروف کی وجہ سے عربی و فارسی الفاظ کی طرح فقرے، ضرب الامثا
اشعار اور نثر کے اقتباسات اردو میں اصل کے مطابق لکھے جاسکتے ہیں۔ ان کو خارج کر دینے سے نئے اردو دانوں کے لئے موجودہ املا میں چھپی ہوئی کتا
اور لغات کا مطالعہ بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس طرح اگر املا میں آسانیاں ہوں گی تو زبان اور مطالعۂ زبان کی دشواریاں بہت بڑھ جائیں گی

اردو میں ان حروف کو برقرار رکھنے کے لئے یہ دلیلیں اپنی جگہ درست ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم صوت حروف کی وجہ سے ہر زبا
املا میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ لکھنے والا صوت پر بھروسا کر کے املا نہیں اختیار کر سکتا اور اکثر الفاظ کا املا الگ یاد رکھنا پڑتا ہے۔ اس پہلو کو مدّ
رکھتے ہوئے ڈاکٹر جعفر حسن نے "اساس رسم خط" میں ع ، ط، ث، ص، ح، ذ، ض اور ظ کو خارج کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ انجمن ترقی اردو
نے ۱۹۴۴ء میں جو اصلاح رسم خط کمیٹی بنائی تھی اس کے سامنے بھی یہ مسئلہ تھا۔ اس کمیٹی کی مجموعی تجاویز ناگپور میں انجمن کی تیسری کل ہند کانفرنس کی
کی ذیلی مجلس کے اجلاس منعقدہ ۱۲/ جنوری ۱۹۴۴ء میں پیش کی گئی تھیں۔ رسم خط کمیٹی کے میر مجلس ڈاکٹر عبد الستار صدیقی الہ آباد سے ریل کے تاخیر
چلنے کی وجہ سے نہ آسکے تھے۔ اجلاس کی صدارت عبد الرحمٰن صدیقی ایم۔ ایل۔ اے (کلکتہ) نے کی تھی۔ محمد ابراہیم خاں غنا، سکریٹری، مجلس استقبا
کانفرنس کی رپورٹ میں لکھتے ہیں :

"ایک اور اہم قرارداد یہ کی گئی کہ اصل تجاویز (مرتبہ راقم حروف) کی دفعہ پانچ کو از سر نو رائے کے لئے اخبار
'ہماری زبان' میں شائع کیا جائے کیونکہ کمیٹی کی رائے میں اس قسم کی اصلاح ضروری ہوتی جاتی ہے۔ یہ تجویز
حسب ذیل ہے :

عربی کے ہم آواز حروف جن کی تین اور چار شکلیں آتی ہیں، ان کو اردو تحریر میں گھٹا کر صرف دو
شکلوں پر اکتفا کرنا جائز قرار دیا جائے یعنی :

ث، س، ص میں سے ص کو اور ز، ذ، ض، ظ میں سے ض اور ز کو حذف کر دیا جائے یا جو لوگ
ان کی بجائے س اور ذ، ظ سے کام لیں ان پر حرف گیری نہ کی جائے۔ ایسے حروف کی باقی تین قسمیں (ا، ع۔
ت، ط اور ح، ہ) بدستور رہیں گی۔

اس آخری تجویز کی نسبت ہماری استدعا ہے کہ ناظرینِ اخبار اور دیگر اہل الرّائے حضرات ہمیں

اپنی رائے سے مستفید فرمائیں" ۵۳

ڈاکٹر جعفر حسن کی کوشش ایک ذاتی کوشش تھی۔ انھوں نے دوسروں کی رائے کی پروا کئے بغیر بیک جنبش قلم متعلقہ حروف کو خارج کر دیا۔ انجمن ...اردو کے لئے یہ مسئلہ اتنا آسان نہ تھا۔ مندرجہ بالا تجویز سے ظاہر ہے کہ خود اصلاح رسم خط کمیٹی نے صرف ص، ض اور ز کے حذف کرنے ...بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ساتھ دوسری صورت یہ رکھی تھی کہ جو لوگ ان کے بجائے س، ز اور ظ سے کام لیں ان پر حرف ...ی نہ کی جائے۔ کانفرنس کے مذکورہ اجلاس میں اتنی محدود سی اصلاح کو بھی نافذ کرنے کا فیصلہ نہیں ہو سکا بلکہ یہ قرارداد منظور کی گئی کہ ...تجویز کو از سر نو رائے کے لئے "ہماری زبان" میں شائع کیا جائے۔ اس سے پہلے یہ تجویز ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کے "ہماری زبان" میں ...ئع ہو چکی تھی۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے "اردو زبان اور اس کا رسم خط" (۱۹۴۶ء) میں اردو کے لئے دیوناگری یا رومن رسم الخط اختیار کرنے ...ویزوں کی پر زور مخالفت کرنے کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں کی اس تجویز کی بھی بھرپور تردید کی کہ اردو کے حروف تہجی سے آٹھ حروف یعنی ث، ح، ...ص، ض، ط، ظ اور ع خارج کر دیے جائیں۔ ان حروف کو برقرار رکھنے کے حق میں جو دلیلیں اور مثالیں دی جاتی ہیں وہ زیادہ تر انھیں کے ...وفکر کا نتیجہ ہیں۔ ان حروف کی وجہ سے اردو املا کی دشواری کو انھوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی بلکہ ان کے معنوی، لسانی، متعلقاتی، ...ئی اور بین الاقوامی پہلوؤں پر توجہ دلائی اور بتایا کہ ان حرفوں کے نکال دینے سے لفظوں کی صورت بگڑ جائے گی۔ ان کی رائے میں ان حروف ...خارج کرنے سے جو تبدیلی ہوگی وہ کسی حد تک ایک نیا رسم الخط اختیار کرنے کے برابر ہوگی:

> "اس طرح اردو رفتہ رفتہ وہ خصوصیتیں کھو بیٹھے گی جو ایک بلند پایہ علمی، ادبی اور معیاری زبان کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں اور جو ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور زباں دانوں کی صدیوں کی مسلسل کوشش سے اردو کو حاصل ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ کم مقدار میں وہ تمام نقصانات پہنچیں گے جو کوئی نیا رسم خط اختیار کرنے سے پہنچ سکتے ہیں" ۵۴

ڈاکٹر جعفر حسن اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی تجاویز کی ناکامی اور سید مسعود حسن رضوی ادیب کے عالمانہ استدلال کے منظر عام پر آنے کے بعد ...ید ختم ہو جانا چاہیے تھا یا نہیں، اس کا جواب دینا محال ہے کیونکہ قضیہ ختم نہیں ہوا۔ لیکن اس وقت تک اس مسئلے کے پیچھے صرف املا کی دشواری ...خیال تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ان حروف پر ایک خاص زاویۂ نگاہ سے وار کیا۔ ان کے ...مون "اردو صوتیات کا خاکہ" سے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> "ذ، ض، ظ، ث، ص وغیرہ
>
> یہ تمام حروف ہیں صوت نہیں۔ اردو رسم خط کے لئے ایک طرح سے وبال جان بنے ہوتے ہیں۔ عربی فارسی لسانی روایت کی دھاک ابھی تک اس طرح قائم ہے کہ اصلاح کی تمام کوششوں کے باوجود ان سے چھٹکارا نہیں مل سکا ہے" ۵۵

"مصمتوں کے سلسلے میں ان زائد حروف کا ذکر بھی ضروری ہے جو عربی سے لیے گئے ہیں اور جو ہمارے حروف تہجی اور نظام درس کے لئے پیر تسمہ پا بنے ہوتے ہیں۔ میری مراد ذ، ض، ظ، ط، ث، ص، ح وغیرہ سے ہے۔

صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مردہ لاشیں ہیں جسے اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے صرف اس لئے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے" ۵۶

اس مضمون میں عین کے بارے میں موصوف نے لکھا ہے:

"ع کی شکل ذرا مختلف ہے۔ ہر چند یہ قریب المخرج مصوتے میں ضم ہو جاتا ہے لیکن بعض جگہ ایک صوتی کھٹک بن کر اپنے اثرات ہمارے لہجے میں چھوڑ جاتا ہے۔" ے۷

لیکن عین کی اس جاں بخشی کی مدّت زیادہ نہیں رہی کیونکہ دوسرے مضمون "اردو حروفِ تہجی کی صوتیاتی ترتیب"، میں اس کی گردن بھی مار دی گئی۔ ملاحظہ ہو :

"مذکورہ بالا جدول سے عربی کی دوہری آوازیں (ث ، ح ، ط ، ظ ، ص ، ض ، ع ، ذ) غائب کر دی گئیں۔" ے۸

اس کے بعد موصوف اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میں عربی اردو کے تمدنی رشتوں اور تاریخی لسانیات کے مباحث میں اس وقت پڑنا نہیں چاہتا۔ صوتیات صرف بول چال کی زبان اور تلفظ سے غرض رکھتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ خالص صوتی نقطۂ نظر سے مذکورہ بالا آوازیں اردو والوں کے لیے بے معنی ہیں۔ عربی میں ان کا اختلاف صوتی اور معنوی دونوں لحاظ سے کارآمد ہے اور عرب ان کی ادائیگی میں فرق کرتے ہیں۔ اردو کا لہجہ اور تلفظ اب متعین ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے حروفِ تہجی کا نئے سرے سے جائزہ لینا ہوگا اور اس جائزے کے وقت صرف صوتیاتی معیاروں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔" ے۹

ڈاکٹر گیان چند نے پہلے تو عربی کے مخصوص حروف کو "دوسرے حروف کی دوہری آوازیں"، کہنے پر اکتفا کیا تھا ے۱۰ لیکن پھر الفیض ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے قول میں کشش دکھائی دی اور انھوں نے اس کو منطقی نتیجے تک پہنچا دیا۔ لکھتے ہیں :

"چونکہ یہ حروف کسی آواز کی نمائندگی نہیں کرتے اور اردو رسم الخط سیکھنے والوں کے راستے میں سنگِ گراں ہیں، ان سے پیچھا چھڑا لینا سب سے بڑی اصلاح ہوگی۔ یہ ذہن نشیں رہے کہ زبان کی اصلی اور بنیادی صورت ملفوظی ہے۔ تحریر کو تقریر کا تابع اور ترجمان رہنا چاہیے۔ ان مردہ لاشوں کے سپردِ خاک کیے جانے پر جو اعتراضات ہیں وہ مع جواب درج کیے جاتے ہیں۔" ے۱۱

ڈاکٹر رام آسرا راز جنھوں نے ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحریروں کے زیرِ اثر اردو اور ہندی کے لسانیاتی رشتوں میں رنگ بھرنے کی اچھی کوشش کی ہے، لکھتے ہیں :

"ان مردہ لاشوں کو سپردِ خاک کر کے اردو رسم الخط کی اصلاح کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔" ے۱۲

ڈاکٹر گیان چند نے ان مردہ لاشوں کو سپردِ خاک کیے جانے کا سب سے بڑا فائدہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

"ان حروف کے ترک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو پڑھنے والے عربی، فارسی اور ہندی الفاظ میں امتیاز نہ کر سکیں گے۔ اس کے لیے فارسی عطف و اضافت ہندی الفاظ کے ساتھ جائز کرتی ہوگی۔ کچھ عرصے بعد ہندی والے بھی عربی فارسی الفاظ کو شناخت نہ کر سکیں گے اور اس طرح ان الفاظ کو اپنی زبان میں نادانستہ طور پر کسی جھجک کے بغیر استعمال کر سکیں گے۔" ے۱۳

اقتباسات کا سلسلہ ذرا طویل ہو گیا لیکن یہ واضح کرنے کے لیے کہ اس مسئلے میں املا کی دشواری کے ساتھ صوتیات اور عربی و فارسی سے بیزاری کو کس شدّت سے داخل کیا گیا ان کا پیش کرنا ضروری تھا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں حروفِ تہجی کا از سرِ نو جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں اور اس میں صرف صوتیاتی معیاروں کو مدِّنظر رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ ایک تو عملی نقطۂ نظر سے یہ خیال بجائے خود پوری طرح درست نہیں ہے، دوسرے جس طرح سے انھوں نے عربی و فارسی رد یا دھاک اور عربی سے اردو کے لسانی رشتے کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر صرف صوتیاتی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

"میں عربی اردو کے تمدنی رشتوں اور تاریخی لسانیات کے مباحث میں اس وقت نہیں پڑنا چاہتا" سوال یہ ہے کہ اگر آپ اس وقت ان مباحث میں نہیں پڑنا چاہتے تھے تو پھر کب پڑیں گے۔ ان مباحث میں پڑنے کا یہی تو وقت تھا۔ اکثر رسم الخطوں میں مفرد آوازیں ایک سے زیادہ حرفوں سے ظاہر کی جاتی ہیں اور ایک آواز کے لیے ایک سے زیادہ حروف ہوتے ہیں۔ یہ محض ایک صوتیاتی مغالطہ ہے کہ کسی رسم الخط میں ایک صوت کے لیے صرف ایک حرف ہو سکتا ہے۔ اردو حروف تہجی کی صوتیاتی جدولیں ہم صوت حروف کو بھی دوسرے حروف کی دہری آوازوں کی حیثیت سے جگہ دینا چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ اردو اور ہندی کے قریبی رشتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود اہل اردو کو عام طور پر اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ وہ عربی اور فارسی سے اپنا لسانی رشتہ توڑ لیں۔ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو عرب ممالک سے دوستی ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا ایک نمایاں عنصر ہے۔ پھر عربی اور اردو کے لسانی رشتوں سے نفرت اور بیزاری کیوں؟ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

"اردو رسم الخط کے ذریعے سے صرف پاکستان اور افغانستان سے نہیں، پورے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ سے ہمارے تہذیبی روابط برقرار رہ سکتے ہیں۔"[14]

ڈاکٹر گیان چند کے اس تاثر سے اتفاق کرنا بھی محال ہے کہ ہندی دانوں میں بالعموم اردو کے عربی الاصل حروف اور الفاظ سے اتنی نفرت ہے کہ وہ اس کی موجودہ شکل کو برداشت نہیں کر سکتے۔ انھوں نے ایک اور جگہ اردو دانوں کو غیرت دلانے کے لیے لکھا ہے کہ ہندی میں لسانیات کے مطالعے کو بہت پہلے سے بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس علم کے ماہر بڑی تعداد میں موجود ہیں[15] اس کے بعد بھی یہ سمجھنا کہ محض املا کی تبدیلی سے وہ عربی و فارسی الفاظ کو پہچان نہ پائیں گے اور ہندی میں نادانستہ طور پر ان کو بغیر کسی بھڑک کے استعمال کر سکیں گے عجیب بات ہے۔ یہ اردو رسم الخط کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے یا ہندی دانوں کے لیے کوئی دھوکے کی ٹٹی بنائی جا رہی ہے۔؟

یہ صحیح ہے کہ ہندی میں سنسکرت آمیز ہندی اور شدھ ہندی کے علمبردار ہیں۔ وہ اردو دشمن نظریہ اور رویہ رکھتے ہیں اور اردو الفاظ کے ساتھ تعصب برتتے ہیں۔ اگر صرف انھیں لوگوں کو دیکھا جائے تو ہندوستان میں اردو کی بقا اور ترقی کی بات کرنا تحصیل حاصل ہے۔ لیکن عام طور پر یہ صورت نہیں ہے۔ اردو کے توسط سے ہندی میں عربی و فارسی الفاظ ہمیشہ سے داخل ہیں اور اب بھی بکثرت استعمال ہوتے ہیں، یہاں تک کہ عربی ترکیبیں مثلاً فی الحال، حتی الامکان اور عنقریب وغیرہ خوب چل رہی ہیں۔ بہت سے ہندی شعرا صرف اردو آمیز زبان میں شاعری نہیں کرتے، اردو کی ایسی اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں جو فارسی سے ماخوذ ہیں مثلاً غزل، رباعی اور قطعہ۔ فلموں کی زبان میں اردو کا دخل پہلے سے کم ہوا ہے لیکن اب بھی بہت زیادہ ہے۔ اکثر ان کی زبان ٹھیٹ اردو ہوتی ہے لیکن اس کو ہندی کا نام دیا جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی۔ کے ڈراموں اور بعض دوسرے پروگراموں کو جن کی زبان صاف طور پر اردو ہوتی ہے بڑے شوق سے ہندی کا نام دیا جاتا ہے۔ تعلیم کے مختلف سطحوں پر ہندی کے مشکل الفاظ کے معنی اردو کے عام فہم عربی و فارسی الفاظ میں بتائے جاتے ہیں۔ ہندی کے مروج لغات میں بھی اردو میں مستعمل عربی و فارسی الفاظ معانی میں درج کیے جاتے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے ہندی کے پرستار شاید یہ چاہتے ہیں کہ اردو دیوناگری رسم الخط اختیار کر لے یا ہندی میں ضم ہو جائے۔ اردو کی روایت کو اپنانے میں اگرچہ خلوص، نیک نیتی اور فطری کشش کو نظر انداز نہیں جا سکتا لیکن بعض کوششوں کی تہہ میں اردو کو ہندی میں ضم کرنے کا مقصد ہو سکتا ہے، خصوصاً اردو کو ہندی سے موسوم کرنے میں یہ مقصد صاف دکھائی دیتا ہے۔ سب سے بڑی خلش رابطے کی زبان کی ہے کیونکہ اس میدان میں اردو آج بھی ہندی کی تنہا حریف ہے۔ دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کا تقاضا صرف اردو سے نہیں تمام ہندوستانی زبانوں سے ہے۔ صحیح ہو یا غلط بڑی حد تک یہ ایک قومی اور سیاسی نقطۂ نظر ہے۔ لسانیات اور صوتیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ رسم الخط یا زبانوں کے محاسن و معائب سے بھی اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ محض ایک واہمہ ہے کہ اردو رسم الخط میں دیوناگری کے انداز پر ترمیم و تنسیخ کر لی جائے گی یا عربی الاصل حروف خارج کر دیے جائیں گے تو اردو سے ہندی کے انتہا پسندوں کی بھڑک دور ہو جائے گی۔ ہندی کے پرستار ہرگز اردو رسم الخط میں اس قسم کی اصلاحوں کے انتظار میں نہیں ہیں۔

آزادی کے بعد اردو نظم و نثر کا ایک اچھا خاصا حصہ دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا ہے۔ اس تجربے سے ہندی کے بعض اہل نظر اس

نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ دیوناگری رسم الخط اردو کے لیے پوری طرح موزوں نہیں ہے۔ ہندی کے معروف شاعر، ماہر تعلیم اور اترپردیش ہندی سنستھان کے نائب صدر ڈاکٹر شیو منگل سنگھ سمن نے ایک تقریر میں بالواسطہ اس بات کا اعتراف کیا ہے اور ایک ایسی بات بھی کہی ہے جو ہمارے موضوع سے براہ راست متعلق ہے :

"اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر سمن نے کہا کہ اردو کی نزاکت اور بانکپن کا احساس رکھنے کے باوجود اس طرح کی باتیں کرنے والوں پر حیرت ہوتی ہے۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے سوال کیا کہ اردو لفظ کثرت کو اگر دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے تو قاری اس کے معنی ورزش سمجھے یا زیادتی" ۱۶ے

ڈاکٹر گیان چند ان حروف کو ترک کرنے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آج کیفیت یہ ہے کہ جو حضرات لسانیات سے ذرا بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ ان حروف کو کلیۃً حذف کر دینے کے حق میں ہیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر محمد نصیرالدین اور امریکی ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر نے ان کے ترک کی سفارش کی ہے۔ لیکن اگلے وقتوں کے جو بزرگ حرف و صوت کے تعلق سے بے بہرہ ہیں، جو خمار رسوم و قیود کے سرگشتہ ہیں وہ اصلاح و ترقی کے ہر منصوبے کی طرح ان حروف کے ترک پر بھی چیں بجبیں ہو جاتے ہیں" ۱۷ے

ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا۔ محمد اکبرالدین صدیقی نے ٹائپ کے لیے ان کی بعض تجویزوں سے بحث کرتے ان کے ایک مقالے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

"اردو نامہ کے دوسرے شمارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب نے ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس میں ان کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے :

ہم صوتی حروف میں صرف ایک حرف باقی رکھا جائے۔ ط، ث، ص، ح، ض، ذ، ظ، ع خارج کر دیے جائیں تو ۱۳ جوڑوں یا ۲۰ فی صد کی کمی ہوگی لیکن یہ تجویز چند وجوہ کی بنا پر مناسب نہیں ہے۔ اس کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے" ۱۸ے

ڈاکٹر محمد نصیرالدین کے جس مضمون کے لیے قومی زبان (کراچی) یکم اپریل ۱۹۶۰ء، ص ۱۰ کا حوالہ دیا ہے وہ خود مضمون نگار کے نوٹ کے مطابق دسمبر ۱۹۴۵ء کے ساقی، (دہلی) میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ذہنی پس منظر املا اور ٹائپ کی دشواریوں کا ہے، نئے مفہوم میں لسانیاتی نہیں۔ انھوں نے ژ کو بھی ہم صوت حروف میں شمار کیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ ۱۹ے

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر ماہر لسانیات ہیں لیکن اہل زبان نہیں۔ ایک تو یہی خطرے سے خالی نہیں کہ اردو رسم الخط میں اصلاحیں کرنے کا کام ماہر لسانیات کو دے دیا جائے، دوسرے اگر وہ اہل زبان نہ ہو تو خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر بارکر کا طرز فکر اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے تشدید کے طریقے کو ترک کر کے مشدد حروف کو دو بار لکھنے کی تجویز بھی پیش کی ہے۔ ۲۰ے معلوم نہیں انگریزی رسم الخط کو صحیح، آسان اور صوتیات کے مطابق بنانے کے لیے انھوں نے کبھی کوئی تجویز پیش کی ہے یا نہیں اور اگر پیش کی ہے تو اس کا کیا انجام ہوا۔

لسانیات سے ذرا بھی واقفیت رکھنے والوں کا تو ذکر ہی کیا، اچھی خاصی مہارت رکھنے والے کئی اصحاب ان حروف کو ترک کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کو حرف و صوت کے تعلق سے بے بہرہ، اگلے وقتوں کے بزرگ اور اس طرح کے دوسرے القاب سے نہیں نوازا جا سکتا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کو اس تجزیے ہی سے اختلاف ہے کہ یہ حروف ہم صوت ہیں۔ انھوں نے انگریزی وغیرہ کے صوتی اور ملفوظی لغات کا ذکر کر کے یہاں تک لکھا ہے کہ :

"علم الاصوات کی مدد سے ہمیں بھی مذکورہ بالا عربی الاصل حروف کے مخارج و صفات بتا کر عام اردو

بولنے والوں کو ان کے صحیح تلفظ کی مشق کرانی چاہیے ۔ اس کے بجائے علم الاصوات کا حوالہ دے کر یہ کہنا کہ ان حروف میں ہم فرق نہیں کرتے ، اس لیے انھیں ترک کر دیا جائے میرے نزدیک بالکل ایسا ہے کہ ہم کہیں بہت سے ادبی الفاظ عام لوگ نہیں جانتے لہٰذا یہ الفاظ زبان سے خارج کر دیے جائیں ۔ علم روشنی دیتا ہے ، ہم اس سے تاریکی حاصل کرتے ہیں ۔ یہ امر افسوسناک ہے ۔" [۲۱]

اردو کے بعض اہل لسانیات کو شکایت ہے کہ اردو والوں کے ذہن پر صوت کے بجائے حرف کا تصور مسلط ہے ۔ غالباً اس کے جواب میں انھوں نے اپنے ذہن پر صوت کا تصور مسلط کر لیا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ زبان بنیادی طور پر تقریر ہے لیکن جب وہ تحریر کی منزل میں داخل ہوتی ہے تو لازمی طور پر اس کا سابقہ حرف سے پڑتا ہے ۔ اس کے علاوہ تقریر کا تعلق صرف اَن پڑھ لوگوں سے نہیں ، تعلیم یافتہ لوگوں سے بھی ہے ۔ اگر صوتیات صرف اوّل الذکر کی بول چال اور تلفظ تک محدود ہے تو وہ حروف اور املا کے میدان میں قدم ہی کیوں رکھتی ہے ۔ حروف اور املا کا تعلق تعلیم یافتہ لوگوں سے ہے ۔ علمی لیاقت کے اعتبار سے ان کے مختلف طبقات ہیں جن کو نظر انداز کر کے دونوں کا کوئی عملی تصور نہیں قائم کیا جا سکتا ۔ اردو میں عربی الاصل حروف عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ آتے ہیں اور انھوں نے تسلسل کے ساتھ اپنی جگہ برقرار رکھی ہے ۔ اردو کا ہر تعلیم یافتہ شخص اپنی تحریر میں ان کا لحاظ رکھتا ہے یا رکھنا چاہتا ہے ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے صوتیات فراموش کر سکتی ہے لیکن جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں کہ سائنس انھیں اندھا بنا دے وہ فراموش نہیں کر سکتے ۔ دراصل یہ صوتیات کا نہیں ، اس کے کورانہ اطلاق کا قصور ہے جس سے سب اہل لسانیات بھی متفق نہیں ہیں ۔ ڈاکٹر عصمت جاوید کے مطابق ان حروف کے بغیر اردو حروف تہجی مکمل نہیں ہو سکتے :

"عربی رسم الخط میں ث ، ص ، ذ ، ض ، ظ ، ط اور ح اپنے صوتی حوالے بھی رکھتے ہیں لیکن جب ان صوتیوں پر مشتمل الفاظ فارسی میں داخل ہوئے تو چونکہ اہل فارس ان کی ادائیگی پر قادر نہیں تھے اس لیے انھوں نے مماثل صوتیوں سے کام لیا لیکن تحریر میں ان حرفیوں کو بے صوت حرفیوں کی حیثیت سے قائم رکھا ۔ اور یہی الفاظ جب فارسی کے راستے اردو میں آئے تو ان کے ساتھ یہ بے صوت حرفیے بھی چلے آئے جن کے بغیر اردو حروف تہجی مکمل نہیں ۔" [۲۲]

ڈاکٹر عبدالستار دلوی بھی ان حروف کو خارج کرنے کے حامی نہیں ہیں ۔ حرف و صوت کے تعلق اور فرق کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بھی متوازن اور حقیقت پسندانہ ہے :

"ہر زبان میں حرف بڑی حد تک آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ تاہم ہر حرف صوتی علامت نہیں ہوتا ۔ ایسی غیر صوتی علامتیں مختلف زبانیں تاریخی و روایتی پابندیوں کے تحت استعمال کرتی ہیں اور زبانوں کے رسم خط میں بامعنی حیثیت رکھتی ہیں ۔" [۲۳]

"اصوات کے مطالعوں کے سلسلے میں حرف و صوت کے فرق کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے ۔ آواز تقریر یا بول چال میں بے معنی اکائی ہوتی ہے اور حرف کا تعلق تحریر سے ہے ۔ ہمارے بعض علما حرف و صوت کے اس بنیادی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا اپنی بحثوں میں اس فرق کو بھول جاتے ہیں ۔ نتیجتہً نہ صرف خود غلطیوں کا شکار بن جاتے ہیں بلکہ اس سے شدید قسم کے ذاتی اختلافات بھی پیدا ہو جاتے ہیں ۔" [۲۴]

یہ کچھ ایسے اہل لسانیات کی رائیں ہیں جو صوتیات سے مغلوب ہو کر اردو رسم الخط کو گردن زدنی قرار دینے سے گریز کرتے ہیں ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے مسائل پر ان کی رائے سو فیصدی درست یا قابل قبول ہے لیکن ہم صوت حروف کے متعلق ان کا رویہ توازن اور حقیقت پسندی سے خالی نہیں ۔ اہل لسانیات سے قطع نظر کر کے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے بعد دیگر اہل علم میں پروفیسر آل احمد سرور کی شخصیت بہت نمایاں ہے ۔ وہ بھی رسم الخط کی تبدیلی کے قائل نہیں ۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اردو رسم الخط کی پُرزور حمایت کی ہے ۔

درسی اور طباعتی ضرورتوں کے پیشِ نظر انھوں نے جو چند اصلاحیں تجویز کی ہیں ان کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اگر انھیں قبول کر لیا جائے تو "اردو کی خودمختار اور آزاد حیثیت برقرار رہے گی" اور "موجودہ روپ میں کوئی ایسی تبدیلی نہ ہوگی جس سے تحریر نامانوس ہو جائے"۔ ہم صوت حروف کے ترک کرنے کے وہ بھی خلاف ہیں۔ ان کی رائے دوٹوک بھی ہے اور دلچسپ بھی :

"کچھ لوگ س، ص، ث میں صرف ایک حرف اختیار کر لینے پر زور دیتے ہیں۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ جس طرح غالب کے ابتدائی کلام کے رنگ اور آرزو لکھنوی کے رنگ دونوں کو اردو کے دائرے سے خارج کرنے کو تیار نہیں، جس طرح ابوالکلام آزاد کے اسٹائل اور عبدالحق کے اسٹائل دونوں کے حسن کو مانتا ہوں، اسی طرح اُن عربی فارسی الفاظ کو جو ہماری زبان میں آ گئے ہیں بگاڑنے کا قائل نہیں۔ محبّت چھوٹی ہ سے لکھی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ میں محبّت کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں"[۲۵]

اتفاق سے پروفیسر آل احمد سرور کو بھی اگلے وقتوں کے ان بزرگوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا جو خمارِ رسوم قیود کے سرگشتہ ہیں اور اصلاح و ترقی کے ہر منصوبے پر چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں۔ وہ لسانیات کے ماہر نہ سہی، اتنا تو جانتے ہی ہوں گے کہ اردو میں ح اور ہ میں صوتی فرق نہیں ہے۔ محبت کو "چھوٹی ہ" سے لکھنے کے خلاف ان کے ردّعمل سے بخوبی واضح ہے کہ بعض اہل لسانیات کا یہ بلند بانگ دعویٰ کہ رسم الخط میں اصلاح صرف صوتیات کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے بڑی حد تک بے بنیاد ہے۔ اس میں تاریخ، رواج اور عادت ہی نہیں، لوگوں کے جذبات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اہل لسانیات میں اگر ڈاکٹر شوکت سبزواری کے استدلال کو چھوڑ دیا جائے تو اردو کے ہم صوت حروف کے مسئلے میں صوتیات کے کوئی خاص نکات و معلومات دخیل نہیں ہیں۔ ایک عام اردو داں بھی اسے بآسانی سمجھ لیتا ہے کہ یہ حروف ہم صوت ہیں جس کی وجہ سے املا میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اصلاح اس لئے ضروری ہے کہ صوتیات کے مطابق ہر صوتی اکائی کی نمائندگی صرف ایک ہی علامت کو کرنا چاہیے۔ اہل لسانیات بھی اگر تھوڑا سا غور کریں تو محض اس بنا پر اصلاح کے لیے بضد نہ ہوں کیونکہ ہم صوت حروف دوسری زبانوں کے حروف تہجی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک املا کی دشواری کا تعلق ہے سید مسعود حسن رضوی ادیب نے کچھ دشواریوں کا اعتراف تو کیا ہے لیکن ان کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ان کا خیال ہے کہ دشواریاں ہر رسم الخط میں ہوتی ہیں۔ آل احمد سرور نے دشواریوں کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا جس سے ظاہر ہے کہ وہ بھی انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ مناسب توجہ اور مشق کے بغیر کسی زبان کا صحیح املا نہیں سیکھا جا سکتا۔

اردو کے ماہرین زبان کو دیکھیے یا اہل لسانیات کو اتنی بات صاف ہے کہ ہم صوت حروف کے ترک کرنے پر اتفاق رائے نہیں ہے جبکہ اس طرح کے مسائل اتفاق رائے کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ جو حضرات ان حروف کو اردو حروف تہجی سے خارج کرانا چاہتے ہیں ان کے شدید اصرار یا اردو رسم الخط اور اردو دانوں پر لعن طعن کرنے سے ان کے موقف کو کوئی تقویت نہیں ملتی۔ بالفرض ان حروف میں سے کچھ یا سب کے ترک کرنے پر اتفاق رائے بھی ہو جائے تو ایک بڑا سوال یہ ہے کہ اس کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے۔ اصلاح کے مجوّزین نے اس اہم پہلو پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ بدقسمتی سے اردو کا کوئی ایسا آزاد اور نمائندہ ادارہ نہیں ہے جس کے فیصلے اس طرح کے بنیادی مسائل میں قبول عام کی سند حاصل کر سکیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں انجمن ترقیٔ اردو نے مولوی عبدالحق کی سرکردگی میں کسی حد تک یہ حیثیت حاصل کی تھی لیکن تقسیم کے بعد یہ صورت بھی نہیں رہی۔ مولوی عبدالحق پاکستان جانے کے بعد اس سلسلے میں عملی قدم نہیں اٹھا سکے۔ ہندوستان کی انجمن ترقیٔ اردو نے بھی کوئی نتیجہ خیز قدم نہیں اٹھایا۔ رفتہ رفتہ دونوں انجمنوں کی کتابیں، رسائل اور اخبار بڑی حد تک مروجہ املا میں شائع ہونے لگے۔ انجمن کی مخصوص اصلاحات کی ناکامی اور برّصغیر میں اردو کے تعلق سے لسانی صورت حال میں تبدیلی کے بعد یہ روش حقیقت پسندانہ بھی تھی۔

دونوں ملکوں میں اس وقت اردو کے سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری ادارے زیادہ تر سیاسی طرز فکر، اختراع پسندی اور

فنی طریقہ کار کے شکار ہیں۔ ان کی کارگزاریوں سے شبہ ہوتا ہے کہ ان میں ایسے حضرات دخیل ہوجاتے ہیں جنھیں اردو کی روایات، انفرادیت اور مزاج سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ ان سے نہ تو سنجیدہ اصلاحی تجاویز کی توقع کی جاسکتی ہے اور نہ ان کے فیصلے اردو دانوں کے لیے بالعموم قابلِ قبول ہوسکتے ہیں۔ اختلافِ رائے اور بے اعتباری کے ماحول میں کوئی ادارہ کسی ایک فرد یا کچھ ہم خیال افراد کے بھروسے پر ہم صوت حروف کو خارج کرنے کا ذمہ لیتا ہے تو یہ اردو املا میں حد سے زیادہ انتشار اور پریشانی کا باعث ہوگا۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی اور مکتبہ جامعہ نے ان حروف میں ابھی کوئی اصلاح نہیں کی ہے لیکن کچھ دوسری اصطلاحات کے نافذ کرنے میں اسی طرح کے طرزِ عمل کی وجہ سے آج کل اردو املا کچھ عجیب صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اس لیے اس طرح کی کسی کوشش سے اجتناب لازمی ہے۔

ان سطور میں ہم صوت حروف کے مسئلے پر اردو کے اہلِ علم کے خیالات کا تجزیہ کیا گیا۔ اگر انگریزی اور ہندی میں اردو کے مخالفوں کی تحریروں کو دیکھا جاتے تو ان حروف پر اعتراضات کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ ڈاکٹر حکم چند نیر کی محققانہ کتاب "اردو کے مسائل" سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر مونیر ولیمز نے ٹائمز آف لندن، مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۸۵۸ء میں اپنے ایک مراسلے میں اردو رسم الخط کی کوتاہیاں بیان کرتے ہوئے ان حروف پر اس طرح اعتراض کیا تھا:

"ذ، ز، ض، ظ ایک آواز کو ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ آوازوں کی نمائندگی دو یا تین حروف سے ہوتی ہے۔" ۲۶ے

گویا یہ مسئلہ اگر اور پہلے نہیں تو سوا سو سال قبل ایک انگریز نے اٹھایا تھا۔ اس کے بعد اس اعتراض کو اردو کے مخالفوں نے نہ معلوم کتنی بار دہرایا ہوگا۔ بعض اردو دانوں کو بھی ان حروف کی اصلاح کے تقاضے کو دہراتے ہوئے تقریباً نصف صدی ہوگئی۔ لیکن یہ "مردہ لاشیں" ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی مسئلے کو بار بار اٹھانے کے لیے آخر کتنا وقت دیا جاسکتا ہے۔ جس تجویز پر اتفاقِ رائے کا امکان نہ ہو اور جس کو عملی جامہ پہنانے کا طریقہ یا نظام مفقود ہو اس کو ناقابلِ عمل قرار دینے کے سوا چارہ نہیں۔ اگر یوں دیکھیے تو ان حروف کو سپردِ خاک کرنے کے بجائے ان کو سپردِ خاک کرنے کی تجویزوں کو ہمیشہ کے لئے دفن کردینا چاہیے۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اردو داں طبقہ آئے دن کی نکتہ چینی اور سرزنش کی وجہ سے ایک مدت سے ذہنی انحطاط اور سراسیمگی کا شکار ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ گڑے مردے اکھاڑنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ اس کی سخت ضرورت ہے کہ ان حروف کے بارے میں ایک مثبت فضا پیدا کی جائے۔

املا کے سلسلے میں عربی و فارسی کے حوالوں، لسانیات وصوتیات کی نکتہ آفرینیوں اور دوسری موشگافیوں سے گمان ہوتا ہے کہ شاید ہمارے اہلِ علم کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے کہ اردو کی درس و تدریس رفتہ رفتہ کس پستی اور انحطاط کا شکار ہوچکی ہے۔ اعلیٰ درجات کے طلبہ کی تحریریں دیکھ کر اکثر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے پچھلے درجات میں کس طرح سرخروئی حاصل کی ہے۔ املا کی کوتاہیاں صرف ہم صوت حروف تک محدود نہیں بلکہ دوسرے پہلوؤں پر بھی حاوی دکھائی دیتی ہیں۔ معترضین اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اردو رسم الخط کا سیکھنا مشکل ہے لیکن اس کا اصل سبب وہ بے اعتنائی ہے جو اردو رسم الخط سیکھنے اور سکھانے میں برتی جارہی ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں نشاندہی کی جاچکی ہے کئی حروف اہلِ عرب کے تلفظ میں بھی ہم صوت ہیں۔ ایران اور افغانستان میں تو ان حروف کے تلفظ کے سلسلے میں تقریباً وہی صورت ہے جو اردو میں ہے۔ لیکن ان ممالک میں یہ حروف کوئی مسئلہ نہیں ہیں۔ انگریزی اور ہندی وغیرہ میں بھی ہم صوت حروف ہیں لیکن ان کے اخراج کے لیے کوئی مہم نہیں چل رہی ہے۔ اردو رسم الخط کے سیکھنے اور سکھانے میں عدمِ اعتماد اور بے توجہی کا سدِّباب نہ کیا گیا تو کتنی بھی آسانیاں فراہم کی جائیں گی کارگر نہ ہوں گی۔ دوسری طرف ضروری اعتماد اور توجہ سے ہم صوت حروف کی دشواریاں بھی آسان ہوسکتی ہیں۔

حواشی

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، ص اور کچھ دوسرے حروف از نذر امام، صبحِ نو، پٹنہ، نذر امام نمبر، حصہ دوم، اپریل مئی ۱۹۷۲ء ص 59

حواشی

۲۔ فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، ص ۲۰۵

۳۔ رپورٹ تیسری کل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس، منعقدہ ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء، بمقام ناگپور، مرتبہ جناب ابراہیم علی خاں صاحب فتا، ۱۹۴۴ء، ص ۱۲۷، ۱۲۸

۴۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط از سید مسعود حسن رضوی ادیب، ۱۹۴۸ء ص ۴۷

۵۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ۱۹۷۱ء ص ۷

۶۔ ایضاً، ص ۹۔ ایک اور مضمون "اردو ایک ترقی پسند زبان" میں سنسکرت کو "ہند آریائی زبان کا مردہ بچہ" کہا ہے۔ (دیکھیے اردو زبان اور ادب از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ۱۹۷۴ء ص ۱۸۲) سنسکرت کے لیے یہ پیرایۂ بیان بھی مناسب نہیں

۷۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص ۹

۸۔ اردو زبان اور ادب، ص ۱۷۵

۹۔ ایضاً، ص ۱۷۵

۱۰۔ دیکھیے اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ از ڈاکٹر گیان چند جین۔ اردوئے معلیٰ، جلد سوم، شمارہ ۴۔۵، ص ۱۶۲

۱۱۔ اردو رسم الخط کی اصلاح۔ لسانی مطالعے از ڈاکٹر گیان چند، ۱۹۷۹ء ص ۱۴۷

۱۲۔ اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ از ڈاکٹر رام آسرا راز، ۱۹۷۵ء ص ۹۳

۱۳۔ اردو رسم الخط کی اصلاح۔ لسانی مطالعے از ڈاکٹر گیان چند، ص ۱۴۹

۱۴۔ اردو رسم الخط عملی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے از آل احمد سرور۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق ص ۲۵۴

۱۵۔ دیکھیے مقدمہ۔ لسانی مطالعے، ص ۱۱

۱۶۔ ہماری زبان، نئی دہلی، ۸ اپریل ۱۹۸۴ء۔ اس خبر میں مزید کہا گیا ہے کہ "ڈاکٹر سمن نے اس سلسلے میں گندی سیاسی چالوں کی مذمت کی اور کہا کہ اردو میں ہندوستان ہے اور ہندوستان میں اردو۔ اردو کی ترقی بحر حال ہونی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ ہندی کے قومی اور سرکاری زبان ہونے کے حامی ہیں۔"

۱۷۔ اردو رسم الخط کی اصلاح۔ لسانی مطالعے ص ۱۴۹

۱۸۔ کچھ رسم الخط کے بارے میں از محمد اکبر الدین صدیقی، قومی زبان، کراچی، یکم جنوری تا ۱۶ مارچ، ۱۹۶۲ء ص ۶۹

۱۹۔ ژ کو ہم صوت حروف میں شمار کرنے کی غلطی ڈاکٹر رام آسرا راز نے بھی کی ہے۔ دیکھیے ان کی کتاب اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ ص ۸۹

۲۰۔ پاکستان کے لیے رسم الخط۔ قومی زبان، کراچی، یکم مارچ تا یکم جون ۱۹۶۱ء ص ۲۸

۲۱۔ اردو صوتیے۔ اردو لسانیات از ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۱۹۷۵ء ص ۵۴۔ اسی کتاب میں "نظام اصوات و علامات" میں بھی انھوں نے ان حروف سے بحث کی ہے۔ دیکھیے ص ۳۹ تا ۴۳

۲۲۔ لسانیاتی جائزے از ڈاکٹر عصمت جاوید، ۱۹۷۷ء، ص ۹

۲۳۔ ابتدائیہ از ڈاکٹر عبدالستار دلوی۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص ۲

۲۴۔ اردو میں دخیل آوازیں از ڈاکٹر عبدالستار دلوی۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص ۴۳

۲۵۔ اردو رسم الخط عملی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے از آل احمد سرور۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص ۲۸۴

۲۶۔ اردو کے مسائل از ڈاکٹر حکیم چند نیر، ۱۹۷۷ء، ص ۴۶۔ "مراسلہ مطبوعہ ٹائمز آف لندن، ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء، بحوالہ مالویہ، مدن موہن شمالی مغربی صوبجات کی عدالتوں کا رسم خط اور پرائمری تعلیم (انگریزی) ۱۸۹۹ء، ص ۴۱۔۴۲"

○○

بشیر بدر

(۱)

ہم کو بے کار لئے پھرتے ہو بازاروں میں
ہم نہ یوسف ہیں نہ یوسف کے خریداروں میں

مُلک تقسیم ہوئے دل تو سلامت ہیں ابھی
کھڑکیاں ہم نے کھلی رکھی ہیں دیواروں میں

اک زباں جس کو غزل کہیے وہ مجرم ٹھہری
شاہزادی کو چُنا جائے گا دیواروں میں

اک حویلی میں مہکتے ہوئے پنچھی کی طرح
تیری آواز ابھی قید ہے درباروں میں

دھوپ کی آگ میں ہنسنے کی ادا کیا جانیں
جنگلی پھول کہاں آپ کے گلزاروں میں

دل میں سو غم ہیں تری یاد ہے تنہا تنہا
ایک اجلی سی پری پھرتی ہے بیماروں میں

عزت و شہرت و دولت ہیں ہوا کی مانند
لال، نیلے، ہرے اڑتے ہوئے غباروں میں

(۲)

اسی لئے تو یہاں اجنبی ہوں میں
تمام لوگ فرشتے ہیں آدمی ہوں میں

ضعیف بوڑھی جو پُل پر اُداس بیٹھی ہے
اسی کی آنکھ میں لکھا ہے زندگی ہوں میں

اگر وہ چاہیں تو زندہ جلا بھی سکتے ہیں
دعا کے ہاتھ حکومت کی بے بسی ہوں میں

ہے پکے عمروں کی اک بے زبان سی لڑکی
اسی کا رشتہ ہوں اور وہ بھی آخری ہوں میں

تمام رات چراغوں میں مسکراتی رہتی
وہ اب نہیں ہے مگر اس کی روشنی ہوں میں

کہیں میں اور تھا، مغرب کی جو اذاں نہ سُنی
اِن آنسوؤں میں فجر کی نماز بھی ہوں میں

ستارے راہ کے ہیں میر و غالب و اقبال
قلم ہوں بچے کا تختی نئی نئی ہوں میں

(۳)

سوچا نہیں اچھا بُرا، دیکھا سُنا کچھ بھی نہیں
مانگا خدا سے رات دن تیرے سوا کچھ بھی نہیں

دیکھا تجھے، سوچا تجھے، چاہا تجھے، پوجا تجھے
میری خطا میری وفا، تیری خطا، کچھ بھی نہیں

جس پر ہماری آنکھ نے موتی بچھائے رات بھر
بھیجا وہی کاغذ اسے، ہم نے لکھا کچھ بھی نہیں

احساس کی خوشبو کہاں، آواز کے جگنو کہاں
خاموش یادوں کے سوا گھر میں رہا کچھ بھی نہیں

بیٹھے رہے وہ دیر تک اِک شام کے سائے تلے
آنکھوں سے کیں باتیں بہت، منہ سے کہا کچھ بھی نہیں

دو چار دن کی بات ہے دل خاک میں سو جائے گا
جب آگ پہ کاغذ رکھا، باقی بچا کچھ بھی نہیں

ڈی-۱۲۰، شاستری نگر، میرٹھ- (یوپی)

دو کہانیاں

جوگندر پال ● ٢٠٤۔ مندا کنی انکلیو، کالکاجی۔ نئی دہلی ۔ ١٩

رفتگان

میں اپنی ننھی منی بیٹی کو جگنو کہا کرتا تھا۔ روشن ہوتی تو چار سُو وہی دکھائی دیتی تھی اور رجھ جاتی تو کیا مجال، سامنے بھی بیٹھی ہو تو کوئی ڈھونڈ نکالے۔ جگنو بڑی کھلنڈری تھی، اتنی، کہ ماچس کی ڈبیا میں بھی بند ہو کر رہ جاتے تو اتنی سی جگہ میں ہی سب کچھ بھول کر آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ اسے آنکھ مچولی کھیلنے کا خبط تھا، شاید اسی لئے مجھے کھٹکا لگا رہتا تھا کہ وہ کسی دن کھو جائے گی۔ کیا پتہ، کب حویلی سے نکل کر کس طرف چل پڑے اور ہزار سر پٹخنے پر بھی ہاتھ نہ آئے؟ اسی خوف سے میں حویلی کا باہری دروازہ پل بھر بھی کھلا نہ رہنے دیتا تھا۔

مگر ایک دن کیا ہوا کہ وہ حویلی کے اندر ہی اندر کہیں کھو گئی۔

میں نے چپہ چپہ چھان مارا مگر وہ وہاں ہوتی تو ملتی۔ میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ بند دیواروں کے باہر کیونکر ہو لی ہوگی ــــــ ہے تو وہ یہیں کہیں، مگر کہاں؟ ــــــ جگنو ــــــ جگنو ــــــ! ــــــ مجھے ڈر محسوس ہونے لگا کہ میرے چلاتے چلے جانے سے حویلی کی کھنڈر دیواریں ڈھے جائیں گی ــــــ جگنو!

اسی اثنا میں مجھے ایک عجیب و غریب واردات پیش آئی: میں جگنو کو بار بار پکارتے جا رہا تھا اور اسے ایک کے بعد ایک ہر کوٹھری میں ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک کوٹھری میں اچانک مجھے اس کی ذرا سی جھلک دکھائی دی۔ اس کے بعد میں جس کوٹھری میں بھی قدم رکھتا، وہیں وہ ایکدم کہیں سے برآمد ہوتی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کدھر روپوش ہو جاتی۔

اس کی ٹوہ میں بھاگتے ہانپتے آخر میں اس کوٹھری میں آ پہنچا جہاں اس کی قد آدم تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ یہاں بھی وہ یکلخت ٹمٹماتے ہوئے نمودار ہوئی اور ابھی میں اس کی طرف اپنی پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ جھٹ اپنی تصویر میں اتر گئی۔

میں نے لپک کر تصویر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

میری گرفت میں آتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی، ہنستے جا رہی تھی، اور میں اسے اپنے سینے سے بھینچے ہوئے تھا۔

چھوڑو! چھوڑو مجھے!

اس کی آواز کو اس کی کھنکھناتی ہنسی میں ڈوبتے ہوئے پاکر میرے وجود میں طربناک لہریں اٹھنے لگیں اور میں نے ڈھیلا ہو کر اپنی پیار بھری نظریں اس پر جھکا لیں۔

مگر اتنے میں ہی وہ پھر غائب ہو چکی تھی۔

جگنو! ــــــ

کوٹھری کے دروازے پر اس کی جھلک پا کر میں اس کی جانب بے تحاشہ بھاگا اور تا دیر اسی طرح بھاگتا بھٹکتا رہا اور جب اسکا

ان نہ ملا تو تھک ہار کر اپنی کوٹھری میں لوٹ آیا اور بستر پر بیٹھ کر اپنی خالی خالی آنکھیں دل پر ٹکا لیں۔
میں کافی دیر اسی طرح بیٹھا رہا اور پھر یکبارگی اسے اپنی آنکھوں میں بھرا پا کر چونک پڑا۔ جگنو میرے دل کی اوٹ میں چھپے چھپے سو گئی تھی
اس کی خوابیدہ ٹمٹماہٹ میری اترتی چڑھتی سانسوں میں جھول رہی تھی۔ دفور انبساط سے میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لینا چاہا،
اپنے آپ کو روک کر رہ گیا ـــــ نہیں، بے چاری کو آرام سے سویا پڑا رہنے دو۔ ○○

فیملی پلاننگ

اُن دونوں کی جان پہچان والوں میں ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ وہ ایک آدرش جوڑا ہے۔
شادی کے فوراً بعد انھوں نے ایک خوبصورت فلیٹ خرید لیا اور فلیٹ کا قرض چکانے کے لئے اس کی بیوی بھی کام کرنے لگی۔
وہ انکم ٹیکس کے دفتر میں انسپکٹر تھا۔ رشوت سے اسے سخت نفرت تھی اس سے بھی زیادہ نفرت اسے اس بات سے تھی کہ اُس کی بیوی کی
ی خواہش اَپوری رہ جاتے۔ اس سے اپنے کام نکلوانے والے لوگوں کا کہنا تھا کہ رشوت تو سبھی لیتے ہیں مگر وہ اتنا شریف ہے کہ پیسے وصول
لینے کے بعد جان کی بازی لگا دیتا ہے۔
اس کی بیوی کسی پرائیویٹ کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر کی پرسنل سکریٹری تھی۔ اسے اپنے اوباش باس کے لچھن قطعاً ناپسند تھے، پھر بھی وہ
کی ہر خواہش کے آگے یہ سوچ کر چپکے سے ہتھیار ڈال دیتی کہ نہ ڈالے تو گھر کا قرض کیونکر چکے۔
ہر روز شام کو جب وہ کام سے گھر لوٹتے تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہی بے اختیار بغلگیر ہو جاتے اور کھائے پئے بغیر گھنٹوں ایک
دسرے سے لپٹے پڑے رہتے۔
اُن دونوں نے اس وقت تک اپنا بچہ پیدا نہ ہونے دیا جب تک چار یا پانچ سال میں فلیٹ کا پورا قرض نہ اتر گیا، اور جس دن یہ
مارا قرض اتر گیا اُسی دن اُس کی بیوی نے اس کی باہوں میں پڑے پڑے اسے بتایا کہ وہ پیٹ سے ہے۔
یہ خوشخبری سن کر وہ خوشی سے پاگل ہوا تھا اور اس کی بیوی کو اس پر بے انتہا پیار آنے لگا کہ اسے اپنے حرامی بچے کی کتنی چاہ
ہ، اس کا باس تو یہ خبر سن کر گھبرا سا گیا تھا۔
اور پھر سونے سے پہلے ان دونوں نے سر جوڑ کر فیصلہ کیا کہ اب انھیں اپنے بچے کے خوشگوار مستقبل کے لئے فوری طور پر بیمے کے
سی ایجنٹ سے رابطہ کرنا چاہئے۔ ○○

بشر نواز

۱

اتنی قربت پر بھی وہ لگتا ہے اپنا کیوں نہیں
ربط کیا ہے میرا اس کا مجھ پہ کھلتا کیوں نہیں

تھا بدلنا راستہ تو ہم سفر کیوں بن گیا
ایک تھی منزل تو پھر منزل پہ ٹھہرا کیوں نہیں

وہ نہیں ہے آگ تو کیسے جلاتا ہے مجھے
وہ اگر پتھر نہیں ہے تو پگھلتا کیوں نہیں

غم نہیں وہ کیوں نہ ٹھہرا کیوں نہ ہنس کر بات کی
رنج یہ ہے اک نظر اس سمت دیکھا کیوں نہیں

کہتے کہتے کچھ، بدل دیتا ہے کیوں رخ بات کا
وہ خود اپنے آپ کے بھی ساتھ سچا کیوں نہیں

۲

تو ایک حرفِ وفا جو کہہ دے، اسے مکمل کتاب سمجھوں
بس اک تبسّم کو اپنی ساری محبّتوں کا جواب سمجھوں

نہ اب کسی جام کی تمنا نہ آرزو ہے کسی نشے کی
تری اداؤں پہ جھوم جاؤں تری نظر کو شراب سمجھوں

محبّتوں میں غم اور خوشی کا حساب توہین ہے وفا کی
تری طرف سے جو زخم پاؤں اسے مہکتا گلاب سمجھوں

بدل لیا ہے کسی نے چہرہ، کوئی پہن کر نقاب آیا
اور اس پہ ضد ہے یہ دوستوں کی، اسے بڑا انقلاب سمجھوں

سجے ہیں بازار ہر قدم پر، ہر ایک کے دام ہیں مقرّر
نہ لگ سکے جس کی کوئی قیمت اسی کو اب کامیاب سمجھوں

گزرتے موسم رمیدہ آہو کب آ سکی ہے پلٹ کے خوشبو
میں خود بھی شامل رہا ہوں جس میں اس کہانی کو خواب سمجھوں

● بتوسط: ایس۔ این خان۔ پوسٹ ماسٹر۔ جی۔ پی۔ او۔ بمبئی۔ ۱

اردو تحقیق کی موجودہ صورتِ حال

ڈاکٹر عابد پیشاوری ● شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

ڈاکٹر عابد پشاوری کا درج ذیل مضمون نومبر ۱۹۸۴ء میں موصول ہوا تھا، خیال تھا کہ ضخیم سالگرہ نمبر میں شامل ہو جائیگا لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر مجوزہ نمبر اعلان کے مطابق شائع نہیں کیا جا سکا مگر اب خاص نمبر کے رُوپ میں چند ماہ بعد شائع ہو سکے گا۔ یہ اہم مضمون انجمن اساتذہ جامعات کی ایک کانفرنس میں بہت پہلے پڑھا گیا تھا چونکہ اس مضمون کو لکھے ہوتے کافی عرصہ ہو گیا ہے لہٰذا مزید تاخیر کے پیشِ نظر ہم اسے عام شمارے میں شائع کر رہے ہیں کہ اس مختصر مگر اہم مضمون میں بیش تر بنیادی مسائل آج بھی مسئلہ بنے ہوتے ہیں اور حل طلب ہیں (ادارہ)

○

اُردو تحقیق کی موجودہ صورتِ حال بڑا بسیط موضوع ہے لہٰذا اس صورتِ حال کا جائزہ لینے سے پہلے اِک ذرا معذرت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے آج ہی ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کا خط ملا۔ ان کا کہنا ہے کہ صدر انجمن پروفیسر محمد حسن صاحب کی خواہش ہے کہ میں کانفرنس میں ضرور شرکت کروں اور اردو تحقیق کی موجودہ صورتِ حال پر مقالہ پیش کروں۔ میں چند مجبوریوں کے سبب کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکتا البتہ امتثالِ اَمر میں ایک مختصر سا مضمون لکھنے پر مجبور ہوں۔ چنانچہ یہ معروضات فی البدیہہ گھسیٹ دیے ہیں تاکہ صدر انجمن کے حکم کی تعمیل بھی ہو جائے اور کانفرنس میں جسمانی نہیں تو کم از کم معنوی شرکت ہی ہو جائے۔

اردو تحقیق کی رفتار میں تیزی موجودہ صدی کے تقریباً آغاز ہی سے آنے لگی تھی لیکن آزادی کے بعد یہ رفتار تیز تر ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے کہیں لکھا ہے کہ "اردو تحقیق آزادی کے بعد بَن کی آگ کی طرح پھیلی"۔ میں اسے جنگل کی آگ اس لئے نہیں کہتا کہ آگ کی لپیٹ میں جو کچھ آ گیا وہ جل بجھ کر راکھ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں آزادی کے بعد تحقیق کے پھیلاؤ کو تند و تیز سیلاب کہنا زیادہ موزوں سمجھتا ہوں اور آپ جانتے ہیں، جب سیلاب آتا ہے تو اپنی رو میں بہت کچھ بہا لاتا ہے جس میں خس و خاشاک کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔

دراصل اردو میں تحقیق کا فروغ یونیورسٹیوں کی بدولت ہے۔ آزادی سے پہلے کے سَندی تحقیقی مقالوں کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ آزادی کے بعد اس کے لئے سیکڑوں ہاتھوں کی انگلیاں بھی ناکافی ہوں گی۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، طوفان اپنی رَد میں زیادہ تر خس و خاشاک ہی کو لاتا ہے۔ تاہم اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اسی خس و خاشاک میں کچھ لعل و گوہر، کچھ جواہر ریزے بھی ہوتے ہیں اور عارف کو انھیں سے سروکار رکھنا چاہئے۔ دس بارہ سال پہلے، آج ہی کی طرح، انجمن اساتذہ کی لکھنؤ کانفرنس میں میرا ایک مضمون پڑھا گیا تھا "یونیورسٹیوں میں تحقیق کا معیار"۔ اس میں میں نے کہا تھا یونیورسٹی باہر محققین کے تمام تر اعتراضات کے باوجود اس معیار سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اہلِ یونیورسٹی ہی نے کئی پرانے مسلّمات کو توڑا ہے، مروّج نظریات کو بدلا ہے، اور یہ خوش آئند بات ہے۔

آزادی کے بعد یونیورسٹیوں میں بلا مبالغہ اتنے مقالے داخل کئے گئے ہیں کہ ان کی صحیح تعداد گنوانا تقریباً ناممکن ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر گیان چند نے مختلف اوقات میں کئی مضامین لکھے اور ان میں سیکڑوں مقالوں کے عنوان درج کئے تھے۔ البتہ وہ قطعی تعداد نہیں ہو سکتی کہ ہمارے پاس اس کی تحقیق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہاں ایک لمحے کے لئے میں مقالے کے تسلسل سے قطع نظر کر کے ایک بہت ہی اہم ضرورت

کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ یونیورسٹیوں میں بہت سا تحقیقی کام ہو رہا ہے لیکن جو کچھ نہیں ہو رہا اس میں سب سے پہلی ضرورت ربطِ باہمی کی ہے۔ انجمن اساتذہ کا ایک ترجمان ضرور شائع ہوتا ہے لیکن وہ یونیورسٹیوں میں جاری کاموں سے آگاہ کرنے میں ہماری کچھ زیادہ مدد نہیں کرتا۔ بعض رسائل میں کبھی کبھی مقالہ نما کے نام پر کچھ فہرستیں نظر آ جاتی ہیں۔ کچھ فہرستِ کتب، جنھیں رسالے کی شکل دے دی گئی ہے اس میں بھی گاہ گاہ ایسی فہرستیں شائع ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ میں اس فہرست سازی کی عملی دشواریوں سے بخوبی واقف ہوں۔ مثلاً آپ مختلف شعبہ ہائے اردو کو لاکھ لکھتے رہئے کہ وہ اپنے ہاں ہونے والے کاموں کی تفصیل فراہم کر دیں لیکن یہ کما حقہٗ ہو نہیں پاتا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ حال ہی میں غالباً یو۔ جی۔ سی نے ایک سرکلر جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یونیورسٹیوں میں پیش ہونے والے ہر مقالے کے خلاصے کی ایک نقل یو۔ جی۔ سی کو فراہم کی جائے۔ انھیں غالباً شائع کیا جائے گا یا ان کی بنیاد پر وضاحتی فہرستیں شائع کی جائیں گی۔ اگر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن یہ کام نہ کرے تو پھر انجمن اساتذہ کو ایسا کوئی منصوبہ بنانا چاہئے جس سے تمام یونیورسٹیوں میں مسلسل و مستقل رابطہ قائم ہو جائے اور ہر شعبے کو آئندہ کام کرنے اور کروانے کے لئے اپنے منصوبے بنانے میں مدد مل سکے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ کسی کو پوری طرح علم ہی نہیں ہوتا کہ کہاں کیا کام ہو گیا ہے، کیا ہو رہا ہے یا کیا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے بے جا تکرار ہوتی ہے۔

یہیں میں ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ یہ جو ہر سال سند کے لئے اتنے مقالے یونیورسٹیوں میں داخل کئے جاتے ہیں وہ آخر کہاں جاتے ہیں؟ ان میں بہت کم اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ اندازہ ہی نہیں لگ سکتا کہ کس موضوع میں تکرار کی ضرورت ہے یا مزید کام کی گنجائش ہے اور کس میں نہیں۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں کہ ہمارے یہاں وسائل اشاعت کی کمی ہے (اگرچہ یہ کمی ہے یقیناً کہ ناشرین کی کاروباری مصلحتیں آڑے آ جاتی ہیں) بلکہ منجملہ دیگر اسباب کے معیار کی کمی بھی ایک سبب ہے۔ کچھ یونیورسٹیاں سندی مقالے کے ممتحنین سے بہ صراحت یہ پوچھتی ہیں کہ آیا زیرِ نظر مقالہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں، لیکن بیشتر یونیورسٹیاں اس سے سروکار نہیں رکھتیں۔ پھر مقالے کی منظوری نامنظوری کا انحصار مقالہ نگار کی قابلیت یا صلاحیت پر نہیں، نگراں کے نام و مقام پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس اصول پر سختی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے کہ کوئی مقالہ، جب تک کہ وہ قابلِ اشاعت نہ ہو، منظور ہی نہ کیا جائے۔ اس ضمن میں ہر مقالے پر ممتحنین کی رائے کا ہونا ضروری ہو۔ منظوری کے بعد اگر خود یونیورسٹیاں اسے شائع کرنے کے موقف میں نہ ہوں تو ترقی اردو بورڈ یا اردو اکیڈمیوں جیسے ادارے، جو ہر سال کئی کتابیں شائع کرتے ہیں، اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ ان معیاری کاموں کو شائع کریں تاکہ ہم نہ صرف تحقیق کی صحیح رفتار سے واقف ہو سکیں بلکہ ہمارے پاس آئندہ تاریخ لکھنے کے لئے بنیادی مواد بھی جمع ہو جائے اور آئندہ کسی موضوع پر مزید کام کرنے کی گنجائش ہو تو اس کا بھی پتا لگ سکے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ دکن میں یا بہار میں یا بنگال میں کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو بیشتر صورتوں میں شمال کے دوسرے علاقوں تک اس کی خبر بھی نہیں پہنچتی، اِلّا ماشاءاللہ۔ یوں کہنے کو ہمارے یہاں "وضاحتی کتابیات" بھی شائع ہوتی ہے لیکن کب اور کتنی؟ پھر وہ انفرادی کوششیں ہیں اور ان میں بھی اقتصادی پہلو مانع رول ادا کرتا ہے۔ بہر حال اس طولِ بیانی کو جملۂ معترضہ سمجھئے اور ایک بار پھر وہیں لوٹ آیئے جہاں سے سلسلۂ کلام ٹوٹا تھا۔

یعنی ہر سال سند کے لئے بے شمار مقالے منظور کئے جاتے ہیں۔ ان میں ہر طرح کے مقالے شامل ہیں مثلاً قواعد و زبان، اصنافِ ادب، شخصیات، ترتیبِ متن وغیرہ۔ ان میں معیاری اور غیر معیاری کی تحقیق نہیں۔ سب سے کم توجہ موخر الذکر یعنی ترتیبِ متن کی طرف ہوئی یا ہوتی ہے۔ یہ ہے بھی بڑا مشکل کام۔ اور میرا خیال ہے کہ سند یا کسی اور لالچ سے ترتیب دیئے جانے والے متون سے فرار واقعی معیار کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کا پایۂ اسناد معتبر نہیں ہو سکتا۔ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ سب کے علم میں ہے کہ سند یا کسی اور لالچ کی خاطر ہمارے مستند محققین نے بھی جو متون ترتیب دیے ہیں، وہ یکسر نہیں تو بڑی حد تک غیر معیاری ہیں۔ ان کو بنیاد بنا کر نہ ہم اپنے سرمائے کا جائزہ لے سکتے ہیں، نہ کسی ادیب پر صحیح رائے دے سکتے ہیں اور نہ ہی ادب کی کوئی مستند و معتبر تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔

تاریخِ ادب کا ذکر آیا تو یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ہم اب تک ادب کی کسی جامع و مانع تاریخ سے محروم ہیں۔ ماضی میں اِکّا دُکّا شخصی کوششیں ہوئی تھیں لیکن وہ اب وقت کی ضرورت پوری کرتی ہیں نہ تاریخ کی۔ بعض حضرات یہاں جمیل جالبی کی جاذبِ نظر تاریخ ادب کا ذکر اُٹھا سکتے ہیں۔ مگر میرے خیال میں وہ تاریخ ہماری ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی۔ اگرچہ اب اس کی دوسری جلد بھی آگئی ہے جو بد قسمتی سے میں اب تک

نہیں دیکھ سکا، لیکن پہلی جلد میری نظر سے گزر چکی ہے۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص نظریے اور ملک کی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی جارہی ہے۔ اب ہمیں یہ مان لینے میں تامّل نہیں ہونا چاہئے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ اگرچہ زبان اردو ہی ہے لیکن ادب مختلف ہوگیا ہے (جسے وہ اسلامی ادب کا نام دے کر پاکستانی ادب مراد لیتے ہیں) چنانچہ دونوں ملکوں کی تاریخِ ادب میں جہاں بہت کچھ مشترک ہوگا وہیں نظریاتی بنیاد پر بہت سی ایسی باتیں بھی اس میں درآئیں گی جنھیں ادب کا کوئی سنجیدہ اور غیر جانبدار قاری قبول نہیں کرسکتا۔ میں صرف ایک مثال سے اپنی بات واضح کرتا ہوں۔ اردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں مختلف نظریے رائج ہیں۔ ہم سب کو بے تعصبی اور غیر جانبداری سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ لیکن جمیل جالبی صاحب کی تاریخ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اردو کے آغاز اور ارتقا کا تعلق صرف اس ملک سے ہے جس کا اپنا وجود اردو کی پیدائش سے بہت بعد کا ہے۔ جالبی صاحب کے نزدیک اردو پنجاب بلکہ پنجابی سے نکلی یا اردو سندھ میں پیدا ہوئی۔ اردو کی جنم بھومی سرحد کا کوہستانی خطہ ہے، اردو بلوچستان میں پیدا ہوئی۔ اب آپ ہی بتائیں اردو کہاں پیدا ہوئی، کس زبان، بولی، پراکرت یا اپ بھرنش سے نکلی؟ اس تاریخ میں ایک طرف تو بلوچی کو دراوڑی خاندان سے بتایا گیا ہے اور دوسری طرف اسے ایرانی خاندان کی زبان کہا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اردو کو پاکستانی اور اسلامی زبان ثابت کیا جائے۔ غالباً اس میں غلو آمیز نظریے کا بھی دخل ہے جس میں اردو کو آریائی شاخ سے کاٹ کر دراوڑی خاندان سے اس کا ناتا جوڑا گیا ہے مقصد کہنے کا یہ ہے کہ ہمیں ایک بے لاگ، منصفانہ اور معتبر تاریخِ زبان و ادب کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہیں قدیم متون جن کی تدوین اب تک خاطر خواہ طریقے پر نہیں ہوئی۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ ہم صفِ اوّل و دوم کے تمام شعرا کے کلیات و دواوین نیز نثری کارناموں کو ترتیبِ متن کے جدید اصولوں کے تحت مرتب کریں۔ اب تک شاید ایک بھی قدیم شاعر کا کلام تسلّی بخش طریقے سے مدوّن نہیں ہوا اگرچہ کچھ شعرا کا کلام کئی کئی بار مرتب ہوچکا ہے۔ آپ غالب کے کلام کو مستثنےٰ قرار دے سکتے ہیں اگرچہ میری نظر میں غالب کا کلام بھی الحاق داغلاط سے کلیتہً پاک نہیں (مثلاً موجودہ مثنوی پتنگ غالب کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔ چند اور اشعار بھی ہیں جن کی قرأت مشکوک ہے) لیکن پھر بھی اسے بڑی حد تک تسلّی بخش قرار دیا جاسکتا ہے۔ باقی آپ کو ایک سرے سے تمام شعرا کے دواوین و کلیات کو ایک منصوبہ بند طریقے سے مدوّن کروانا ہوگا۔

تذکرے ہمارے بنیادی مآخذ ہیں۔ اگرچہ قدما کی بدولت بیشتر تذکرے چھپ چکے ہیں تاہم تاحال چند غیر مطبوعہ ہیں مثلاً مجموعۂ انتخاب از شاہ کمال (ترقی اردو بورڈ نے چند سال پہلے یہ کام حیدرآباد کے کسی بزرگ کے سپرد کیا تھا، نتیجہ اب تک سامنے نہیں آیا) تذکرۂ مبتلا (جن کا واحد مخطوطہ گاندھی فیض عام کالج، شاہجہاں پور میں ہے) عیار الشعرا از خوب چند ذکا (اسے حال ہی میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ڈی۔ لٹ کے لئے مرتب کیا گیا ہے) تذکرۂ حیرانی لال بے جگر (جسے مالک رام صاحب ایک مدت سے مرتب کر رہے ہیں) برق کا ضخیم تذکرہ (جس کا واحد مخطوطہ شمس آباد کے ایک ذاتی کتب خانے میں ہے) جلوۂ خضر از صفیر بلگرامی (جو غالباً چھپا لیکن نایاب ہے) ان میں جن تذکروں کے خلاصے شائع ہوئے ہیں (یعنی کلام کا انتخاب نکال دیا گیا ہے) تذکرہ آزردہ، نا تمام مخطوطہ انھیں بھی غیر مطبوعہ ہی ماننا چاہئے۔ اس کے علاوہ جو تذکرے چھپ چکے ہیں لیکن ناتشفی بخش ہیں، ان سب کو بھی ازسرِ نو مرتب کرنا ہوگا۔ میں تذکرۂ ہندی از مصحفی کا ذکر کرسکتا ہوں جو دو مختلف نسخوں کی بنیاد پر دو بار چھپا لیکن اب تک صحیح تدوین کا منتظر ہے۔ (ترقی اردو بورڈ نے یہ کام راقم کے سپرد کرنا چاہا تھا لیکن معاملہ "دفتریات" کی نذر ہوگیا۔ ویسے یہ اب راقم کے زیرِ مشق ہے)

تذکروں کے سلسلے میں اب اِن کے ترجمے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے بیشتر تذکرے فارسی میں ہیں۔ اب فارسی کا چلن نہیں اب اردو کا طالب علم عام طور سے فارسی نہیں جانتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تمام تذکروں کا ترجمہ ماہرین سے کروایا جائے اور اصل فارسی متن کے ساتھ شائع کیا جائے۔ انھیں میں قواعد وغیرہ کی وہ کتابیں بھی شامل کرلیجئے جو فارسی میں ہیں۔ (دریائے لطافت کا ترجمہ ڈاکٹر حنیف نقوی یوپی اردو اکاڈمی کے لئے کر رہے ہیں) فارسی کا ذکر آیا تو یہیں تمام کلاسیکی شعرا کی فرہنگوں کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا۔ اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم اپنے تمام کلاسیکی شعرا کے کلام کی فرہنگیں شائع کریں کہ ان کی عدم موجودگی میں کئی متون کی تدریس میں نہ صرف دشواریاں پیش آتی ہیں بلکہ غلط تدریس بھی ہورہی ہے۔ میں سردست مثالوں سے احتراز کرتا ہوں۔

تاریخ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے لیکن تاریخ اسی وقت لکھی جاسکے گی جب سارا بنیادی مواد تیار ہو جائے۔ غالباً ترقی اردو بورڈ نے ابتدائی تاریخ لکھنے کا کام ڈاکٹر گیان چند کے سپرد کیا تھا جسے انھوں نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کے اشتراک سے مکمل کر لیا ہے لیکن اس کی اشاعت میں ابھی خاصا وقت لگے گا۔ کئی سال پہلے جین صاحب نے بورڈ کے لئے عام لسانیات پر ایک کتاب لکھی تھی جو آج تک نہیں چھپی اگرچہ اس کی کتابت، چارٹ اور نقشے سب تیار ہو چکے تھے (اسے دفتریات" یا دفتری خرافات کا کرشمہ کہئیے) اس سارے کام کے لئے الگ سے کوئی ادارہ ہونا چاہئے۔ سنا ہے گجرال کمیٹی نے دو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی سفارش کی تھی، ایک دکن میں اور ایک شمال میں۔ خدا جانے اس سفارش کا کیا ہوا؟ اگر یہ انسٹی ٹیوٹ قائم ہو جائیں تو تحقیق کا بنیادی کام شرمندۂ تکمیل ہو سکتا ہے۔

اب تحقیق تدریس کا موضوع بھی ہے۔ کئی یونیورسٹیوں میں ایم۔ فل یا ایم۔ لٹ کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اس سلسلے میں اصول تحقیق کی کوئی جامع کتاب نہیں ہے جو TEXT BOOK کا کام دے سکے۔ طلبہ کی ضرورتوں کو کسی حد تک عبدالرزاق قریشی مرحوم کا کتابچہ" مبادیات تحقیق" پورا کرتا ہے۔ اب یہ بھی OUT OF PRINT ہے۔ پھر یہ تشنہ بھی ہے۔ متنی تنقید (ڈاکٹر خلیق انجم) اصول تحقیق و ترتیب متن (ڈاکٹر تنویر علوی) ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ (رشید حسن خاں) سب جزوی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ انجمن اساتذہ کے ابتدائی چند جلسوں میں تحقیق کے موضوع پر کئی مقالے پڑھے جا چکے ہیں اور کم از کم دو (مقالات، دلی یونیورسٹی اور رہبر تحقیق، لکھنؤ یونیورسٹی) کو کتابی شکل میں دیکھنے کا شرف راقم کو بھی حاصل ہوا ہے۔ نام یاد نہیں لیکن اس موضوع پر ایک اور کتاب بھی میری نظر سے گزر چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان سب کو سامنے رکھ کر اور دوسری زبانوں میں دستیاب کتابوں سے مدد لے کر نیز رسائل میں اصولِ تحقیق سے متعلق بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کر کے ایک جامع کتاب مرتب کی جائے جو طلبہ اور اساتذہ دونوں کی ضرورت پوری کر سکے۔ (راقم کے منصوبوں میں یہ کام بھی شامل ہے)

ہمارے یہاں مختلف اصنافِ ادب پر بھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو اصناف کی تاریخ اور ارتقا کے سلسلے میں معاون ہو سکتی ہیں۔ ادب کی بعض علاقائی تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن اب تک تحقیق کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی، جس کی اشد ضرورت ہے۔ یہ منصوبہ بھی راقم السطور کے منصوبوں میں شامل ہے لیکن معلوم ہوتا ہے اس کے لئے وسائل اور وقت ابھی کافی مدت تک میسر نہیں آتے گا۔

اب تک ملک کے مشہور کتب خانوں کی مکمل وضاحتی فہرستیں بھی دستیاب نہیں ہیں اور یہ کمی بہت کھٹکتی ہے۔ پاکستان میں مشفق خواجہ صاحب نے جائزۂ مخطوطات اردو کی ایک جلد شائع کی ہے۔ دوسری جلد زیر طبع ہے۔ یہ منصوبہ ۱۳ جلدوں کا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسا ہی کوئی منصوبہ ہندوستان میں بھی بنایا جائے۔ اور کم از کم ہندوستان کے مختلف سرکاری، نیم سرکاری اور نجی کتب خانوں میں موجود مخطوطات کا جائزہ لیا جائے۔ خواجہ صاحب نے ہر قسم کے مخطوطات کو اپنے جائزے میں روا رکھا ہے، ہمیں فی الحال اپنے کام کو صرف ادب تک محدود رکھنا ہوگا۔ یہ بھی اکیلے آدمی کے بس کا کام نہیں لہٰذا یہ کام بھی کسی ادارے ہی کو ہاتھ میں لینا ہوگا۔

اب پورے ملک میں تعلیم کے ایک معیار پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تمام یونیورسٹیوں کا نصاب بھی مشترک ہو (میں مقامی ضروریات کو ملحوظ رکھنے کے خلاف نہیں ہوں البتہ مشترک معیار کو ضرور مدنظر رکھنا ہوگا) چند برس پہلے اس کے لئے کچھ کمیٹیاں بھی بنی تھیں (غالباً علاقائی سطح پر) انجمن کے موجودہ صدر ڈاکٹر محمد حسن نے انجمنِ اساتذہ کے کچھ اراکین کی میٹنگیں بھی منعقد کی تھیں اور کچھ کام بھی کیا تھا۔ میرے علم میں نہیں کہ آیا کوئی مشترک نصاب تیار ہوا تھا یا نہیں۔ اگر ہوا تھا تو اس کا کیا حشر ہوا۔ جب مشترک نصاب تیار ہو جائے تو اس کے لئے کتابوں کی تیاری کا مرحلہ آئے گا۔ ڈاکٹر حکم چند نیر غالباً اپنے طور پر یوپی اردو اکاڈمی کے لئے اس قسم کے انتخابات و نصابات تیار کر رہے ہیں۔ کچھ غالباً شائع بھی ہو چکے ہیں لیکن ضرورت منصوبہ بند طریقے پر کام کروانے کی ہے؛ اور اس کے لئے انجمن اساتذہ موزوں ترین ادارہ ہے۔

بس حضرات اس مختصر وقت میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ لغات و قواعد کے علاوہ ابھی اور بھی کئی ایسے گوشے رہ گئے ہونگے جن پر بہت کچھ کہا جا سکے۔ مجھے فی الوقت اجازت دیجئے۔ میں نے کچھ اشارے کر دیے ہیں۔ ان پر اضافے کے لئے اب صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

رفعت سروش

بے زنجیر قیدی

میں اکثر سوچتا ہوں ،
میں یہاں کیوں قید ہوں ،
یہ قیدِ بے زنجیر میری زندگی کا لمحۂ آخر نہ بن جائے
میں صبح و شام کی گردش سے تنگ آکر
کسی ایسے جزیرے میں ،
کسی ایسے ستارے میں ،
نہ جانے کیوں نہیں جاتا ،
جو بے موسم ہو ،
بے تغیر ہو ،
سب کچھ جہاں میرے اشارے پر ہی برپا ہو ،
مری یہ سوچ مجھ پر طنز کرتی ہے
میں کاہل ہوں ،
میں بزدل ہوں
مجھے جینا نہیں آتا
مجھے مرنا نہیں آتا
خدایا دے مجھے توفیق ،
میں اس قیدِ بے زنجیر سے چھوٹوں
میں اپنے آپ کو ڈھونڈوں ،
میں اپنے آپ کو پاؤں

ڈی۔۲/اے ، ڈی ڈی اے فلیٹس ، منیرکا
نئی دہلی ۶۷

اذر بارہ بنکوی

جشنِ زرّیں

مجھے بجھا دو
میں اک چراغِ حریمِ ہستی
ہر ایک موسم
ہر اک فضا میں
ہر ایک دل کی دبیز تہہ میں
خلافِ امید ضو فشاں ہوں

مری ضیا سے
سجے سجائے
سنہری شمعوں سے جگمگائے
تمام ایوانِ رنگ و رامش
نگار خانۂ تعیش
حریری پردوں کے کیف آور حصار میں روز و شب ، برابر
بساطِ زر پہ
بہ نامِ تہذیبِ عصرِ حاضر
شباب و مستی کا جشنِ زرّیں
ہر اک ہتھیلی پہ ساغرِ جم
برہنہ جسموں کا رقصِ پیہم
جوانیوں کے نشیلے سائے
نگاہ کی زد میں آ رہے ہیں
مجھے بجھا دو
کہ جہل پرور معاشرے میں
مجھے بجھا دو
کہ عہدِ نو کی اتھاہ ظلمت پرستیوں میں
چراغ کیا
آفتاب کم ہے

محلہ گڑھا امام بارہ ، بارہ بنکی یوپی

ٹرنک کال

اوپندر ناتھ اشک ● ۵ خسرو باغ روڈ، الہ آباد (یو پی)

افراد

گورنام	مشہور فلم پروڈیوسر۔ عمر ۴۵ برس
ہرنام	اس کا چھوٹا بھائی اور منیجر۔ عمر ۴۰ برس
کرِیٹ	مذاحیہ ایکٹر
ستیندر	عام اداکار
شری ہر	جوتشی
وکیل	کمپنی کا قانونی صلاح کار
پانڈے اور مشرا	لڑکی کے لئے بات کرنے والے
چپراسی	عمر ۵۵ برس
مقام	بمبئی کے مشہور فلم پروڈیوسر گورنام پنجوانی کا دفتر
وقت	حال کا

پردہ اٹھنے پر گورنام آرام کرسی پر لیٹا ہے اور مذاحیہ اداکار کرِیٹ
(جس نے اس کی تازہ فلم میں ایک چھوٹا سا رول لے رکھا ہے اور آئندہ
فلم میں بڑا رول پانے کی کوشش میں ہے) اس کے پاؤں دبا رہا ہے۔

گورنام : تم میری عادت بگاڑ دو گے کرِیٹ۔ میری زندگی میں ایسے دن بھی آئے ہیں، جب میں نے ہفتوں مہینوں سولہ سولہ گھنٹے کام کیا ہے، لیکن کبھی مجھے تکان محسوس ہوئی اور نہ میں نے کسی سے پیر دبوائے۔ (ہنس کر) اور جب سے تم کمپنی میں آئے ہو اور مٹھی چاپی کرنے لگے ہو، جسم بھی درد کرنے لگا ہے اور مجھے پاؤں دبوانے کی خواہش بھی محسوس ہونے لگی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم ادم پرکاش، آغا، کنہیا لال محمود کی طرح مشہور ایکٹر ہو گئے تو......

کرِیٹ : گورنام صاحب یہ سب تو مزاحیہ اداکار ہیں، بھگوان کرے میں ہیرو ہو جاؤں تو بھی ان قدموں کی دھول اپنے ماتھے پر لگانا اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ آپ نے مجھے بریک دیا ہے۔ میں آپ کو اپنے استاد اور بڑے بھائی کے برابر سمجھتا ہوں۔
اور بھی جوش سے پنڈلی دبانے لگتا ہے۔

گورنام : نہ جانے آج کندھے کیوں درد کر رہے ہیں۔

کرِیٹ : (جلدی سے اٹھ کر کندھے دباتے ہوئے) آپ کام بھی تو بہت کرتے ہیں گورنام صاحب۔ اس ساری انڈسٹری میں ایک بھی پروڈیوسر

نہیں، جو آپ کے مقابلے میں نصف کام بھی کرتا ہو۔ میں نے تو اسی لئے آپ کو اپنا آدرش بنا لیا ہے۔

تندہی سے کندھے دباتا ہے۔ ہرنام تیز تیز داخل ہوتا ہے۔

ہرنام : بھائی صاحب کیا یہ سچ ہے ؟

گورنام : کیا سچ ہے ؟

ہرنام : یہی جو میں سُن رہا ہوں۔

گورنام : کیا سُن رہے ہو ؟

ہرنام : بھابھی کو آپ نے ان کے میکے بھیج رکھا ہے ـــــ جموں ـــــ سال بھر سے اور .....

گورنام : سال بھر سے نہیں، مشکل سے نو مہینے .....

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

کرِٹ ذرا دیکھنا کون ہے ؟

کرِٹ : (کندھے دبانا چھوڑ کر فون کا چونگا اٹھاتا ہے) ہیلو .... ڈبل تھری، ڈبل فور، ڈبل فائیو ! .... کون صاحب بول رہے ہیں .... کھوسلہ صاحب (گھگھیاتی آواز میں) آداب .... آداب ! میں آپ کا پرانا خادم کرِٹ .... جی ہاں .... جی ہاں .... ابھی دیتا ہوں۔ (فون اٹھا کر گورنام کے پاس لے جاتے ہوئے) کھوسلہ صاحب کا فون ہے۔

گورنام : (فون کا چونگا لے کر) آداب عرض حضور کھوسلہ صاحب .... ہاں ہاں آپ کی مہربانی ہے۔ بس آخری ریل کی ایڈیٹنگ باقی ہے۔ میری بے انتہا خواہش ہے کہ ریلیز سے پہلے آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں .... ارے نہیں حضور، آپ تو خود فرمایا کرتے ہیں ـــــ بڑے سے بڑا پروڈیوسر نہیں جان پاتا کہ اس کی فلم ہٹ ہو گی یا فلاپ ! .... ہاں میری چار چار فلمیں ہٹ ہو گئی ہیں، لیکن پانچویں فلاپ نہیں ہو گی، اس کی کیا گارنٹی ہے ! .... اپنا زور تو حضور کھوسلہ صاحب محنت پر ہے۔ کامیابی یا ناکامی تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ ہاں۔ ہاں ٹھیک .... طے .... نہایت شکر گزار ہوں گا۔ آداب عرض !

ہرنام : (بڑے بھائی کے ہاتھ سے چونگا لے کر کرِٹ کو تھماتے ہوئے) کرِٹ اسے اُدھر رکھو۔ (گورنام سے) نو ماہ بھی بھابھی کو جموں گئے ہو گئے تو کم نہیں ہیں سُنا ہے۔ انہیں میکے بھیج کر آپ دوسری شادی رچانے کی فکر میں ہیں۔

گورنام : کون کہتا ہے ؟

ہرنام : کوئی بھی کہتا ہو۔ آپ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہئے، جھوٹ ہے ؟

ستیندر داخل ہوتا ہے۔

گورنام : کیا بات ہے ستیندر، گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔

ستیندر : میں ابھی فیمس سٹوڈیو سے آ رہا ہوں۔ سلوانا نے فلم ایڈٹ کرتے ہوئے میرے دو سین ہی گول کر دئے۔

گورنام : تم ان دونوں میں کانپ رہے تھے۔

ستیندر : وکرم نے جتنی بار کہا، میں نے ریہرسلیں دیں۔ جب تک اس نے او۔ کے نہیں کہا، میں نے بس نہیں کی۔

گورنام : ہاں، لیکن جیسے ہی وکرم کہتا ـــــ ٹیک (TAKE) کیمرا آن ہوتا۔ تم کانپنے لگتے۔ تمہاری خوشی کے لئے میں نے سین بڑھا دیا۔ تمہارا کلوز اپ شاٹ لینے کی ہدایت دے دی۔ لیکن افسر کے آتے ہی سپاہی اٹینشن (ATTENTION) میں ہو کر سیلوٹ مارے، کیمرے میں اس کا کلوز اپ ہو اور اس کا ہاتھ کانپتا دکھائی دے تب اس سین کو کاٹ دینے کے سوا کیا چارہ ہے۔ سلوانا نے نہیں، میں نے ہی اسے تلف کرنے کی ہدایت دی تھی۔

ستیندر : کچھ مناظر تو آپ دوبارہ شوٹ کرنے والے ہیں نا۔ اس سین کو بھی دری ٹھیک کر لیجئے گا۔ یقین دلاتا ہوں۔ اب کے ہاتھ ذرا نہیں کانپے گا۔

گورنام : دیکھیں گے .... تم کہتے تھے ____ وکیل اور پانڈے آج ہی آئیں گے ۔ کیا ہوا ان کو ؟ کیا وکیل نے کاغذات تیار نہیں کئے ۔

ستیندر : بس میں اُدھر ہی جا رہا ہوں ۔

گورنام : اور اس جیوتش آچاریہ کو کیا ہوا ۔ وہ کیوں نہیں آیا ؟

ستیندر : ادھر تو کرِٹ جانے والا تھا ۔

کرِٹ : جیوتشی جی نے آج آنے کو کہا تھا ۔ میں ابھی فون کرتا ہوں ۔ (دھیمے لہجے میں) یوں انھوں نے کہا تھا کہ پچھلے مہینے سے لے کر ایک سال اور اکیس دن تک آپ کے گھر لڑکا ہونے کا جوگ ہے ۔ شری ہری راج جیوتشی ہیں اور ان کی بات کبھی غلط نہیں ہوتی ۔

گورنام : ستیندر ! تم جاؤ ۔ اس معاملے کو دھر یا اُدھر کرو ۔ (کرِٹ سے) اور کرِٹ تم فون اٹھا کر باہر لے جاؤ ۔

کرِٹ فون اٹھا کر باہر جانے لگتا ہے ۔

اور ذرا ان جیوتش آچاریہ کا پتہ کرو ۔ فون نمبر تو یاد ہو گا تمہیں ؟

کرِٹ : جی یاد ہے ۔

گورنام : دیکھو چپراسی سے کہہ دو کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دے ۔ کوئی بہت ضروری فون آئے تو نمبر لے لے ۔ کہہ دے صاحب باتھ روم میں ہیں ابھی فون کریں گے ۔ غیر ضروری ہو تو ٹال جائے ۔

کرِٹ : جی بہت اچھا ۔

فون لے کر چلا جاتا ہے ۔

ہرنام : آپ مجھے بس اتنا بتا دیجئے بھائی صاحب کہ بھابھی میں خامی کیا ہے ؟ اتنی خوبصورت ، سمجھدار ، سلیقے اور سگھڑاپے والی ، شائستہ اور پڑھی لکھی خاتون ساری فلمی دنیا میں ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتی ۔

گورنام : میں کب کہتا ہوں ۔

ہرنام : تو ____

گورنام : تو ____

ہرنام : تو آپ کیوں یہ گناہ کرنے جا رہے ہیں ۔

گورنام : کیا بکتے ہو ؟

ہرنام : گناہ ہی نہیں ، یہ جرم بھی ہے ۔ آپ تو ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ فلمی دنیا میں آپ کی اس حیرت انگیز ترقی کا یہی راز ہے کہ آپ کبھی شراب اور عورت کے چکّر میں نہیں پڑے ۔

گورنام : اب بھی میں کسی چکّر میں نہیں ہوں ۔

ہرنام : چکّر میں ہونا اور کسے کہتے ہیں ۔ یہ ستیّن سالا جے کے میں دلّالی کرتا تھا ۔ یہاں آ کر آپ کے ایسا منہ لگا ہے کہ نہایت ہی غیر اہم معمولی سا اس کا پارٹ ہے اور اسے بھی ری ٹیک کرنے کے لئے آپ پر زور دے رہا ہے ۔ یہ سالے تو زندگی بھر ایکٹر نہیں بن سکتے ۔ لیکن اپنی غرض کیلئے آپ کو تو کسی نہ کسی گہرے گڑھے میں دھکیل سکتے ہیں ۔

گورنام : دیکھو ہرنام ! مجھے اس بمبئی میں رہتے پندرہ برس ہونے کو آتے ہیں اور جہاں میرے شروع کے ساتھی آج بھی فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں میں کامیابی کی چوٹی پر جا پہنچا ہوں ۔ اور تم دلّی میں کلرکی کرنے کے بجائے تین ہزار روپیہ ماہانہ پا رہے ہو ۔ تم اتنا سمجھ لو کہ اپنا بھلا بُرا ، فائدہ نقصان میں خوب سمجھتا ہوں ۔ یہ بھی کہ میں نہ کوئی گناہ کر رہا ہوں ، نہ کوئی جرم ۔ یاد رکھو کہ میں نے تمہاری شادی کر دی ۔ الگ فلیٹ دے دیا الگ کار لے دی ۔ تمہاری اپنی نجی زندگی میں کسی طرح کا دخل نہیں دیا ____ اس وقت بھی نہیں جب نینا کے قصّے کو لے کر تمہاری بیوی روتی ہوئی یہاں آئی تھی ....

ہرنام : اُسے محض وہم تھا۔ آپ جانتے ہیں۔

گورنام : تمہیں بھی محض وہم ہے اور یہ میں جانتا ہوں۔

ہرنام : معاف کیجئے گا بھائی صاحب! بھابھی کو میں ماں کے برابر مانتا آیا ہوں۔ میں تو میٹرک میں پڑھتا تھا، جب آپ کی شادی ہوئی تھی۔ بھابھی نے مجھے اپنے بچے جیسی محبت دی ہے۔

گورنام : مجھے بھی (قدرے ہنستا ہے) لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دس برس ہونے کو آتے ہیں میری شادی ہوتے اور میں نے اولاد کا منہ نہیں دیکھا..... یہ ساری زمین جائیداد، یہ فلیٹ، یہ سٹوڈیو، یہ کاریں، یہ فارم.....

ہرنام : میں سمجھتا ہوں بھائی صاحب۔ لیکن میں یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ بہت جلدی ناامید ہو گئے ہیں۔ جب آپ کی شادی ہوئی تو بھابھی صرف پندرہ برس کی تھیں۔ اور اب پچیس برس کی ہیں۔ کیا عمر گزر گئی ان کی ماں بننے کی؟ ڈاکٹر سب رنس.....

گورنام : ارے ان ڈاکٹروں۔ ڈاکٹروں کو کچھ نہیں آتا۔ ہے کوئی بمبئی کی مشہور لیڈی ڈاکٹر یا ایکسپرٹ ڈاکٹر جسے میں نے اُرملا کو نہیں دکھایا۔ کون سا ٹیسٹ ہے جو میں نے اس کا نہیں کرایا۔ سبھی کہتے ہیں کوئی نقص نہیں،... کوئی نقص نہیں تو بچہ کیوں نہیں ہوتا۔

ہرنام : نقص آپ میں بھی تو ہو سکتا ہے۔

گورنام : تم سمجھتے ہو کہ مجھ میں نقص ہوتا تو میں جان نہ پاتا۔ مجھے یقین ہوتا کہ مجھ میں نقص ہے تو میں دوسری شادی کرنے کی سوچتا؟

ہرنام : میں نے ڈاکٹر سب رنس سے پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ بظاہر اس سلسلے میں سب کچھ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ آدمی عورت کے پاس جاتا ہے۔ آدمی کو کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ مرد عورت دونوں مطمئن بھی ہوتے ہیں، لیکن....

گورنام : ڈاکٹر پاریکھ نے بہت اچھی طرح دیکھا ہے۔ نہایت باریکی سے معائنہ کیا ہے۔ میرے لاکھ انکار کے باوجود اس نے مجھے انجکشن لگا دئے۔ اس بات کو بھی سال بھر ہونے کو آیا ہے۔

ہرنام : آپ ذرا ڈاکٹر سب رنس سے مشورہ....

گورنام : مجھے کسی سب رنس اب رنس سے مشورہ نہیں کرنا۔ میرے ساتھ بے کار کی بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے بہتر ہوتا کہ تم آخری ریل بھی لے آتے۔ میں نے کھوسلہ صاحب سے فکس کیا ہے۔ کل گیارہ بجے انہیں گولڈی کے پروجیکشن ہال میں فلم دکھانی ہے۔

ہرنام : آپ نے مجھ سے راجیش کھنہ کے ہاں جانے کو کہا تھا ——— اگلی فلم کے لئے اس سے بات کرنے کے سلسلے میں۔

گورنام : ٹھیک ہے، تم اپنے کمرے میں جا کر فون پر اس کے سکریٹری سے بات کر کے ٹائم لے لو۔ وہ وقت دیدے تو آج رات ادھر چلے جانا۔ ابھی فیمس میں فون کرو۔ دیکھو اگر ایڈیٹنگ ختم ہو گئی ہو تو جا کر فلم لے آؤ۔

ہرنام : جی بہتر، لیکن میں نے جو عرض کیا ہے، اس پر ٹھنڈے دل سے غور کئے بغیر جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کیجئے گا۔ شادیاں تو، اب آپ طاقتور ہیں، دس کر سکتے ہیں۔ لیکن نبھاؤ مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں مُنّیجا کو۔ اسی چکر میں اس کی پہلی بیوی نے خودکشی کر لی اور دوسری نے اس کی زندگی وبال کر رکھی ہے۔

گورنام : تم میری فکر نہ کرو۔ اپنے کام دیکھو۔

ہرنام : میں آپ کو شکایت کا موقعہ نہیں دوں گا۔

چلا جاتا ہے۔ گورنام اُٹھ کر کچھ لمحے چپ چاپ کمرے میں ٹہلتا ہے۔ پھر کرسی پر آ بیٹھتا ہے اور بزر دباتا ہے۔ دوسرے لمحے چپراسی حاضر ہوتا ہے۔

چپراسی : حضور!

گورنام : ذرا کیرٹ کو بھیجو۔

چپراسی چلا جاتا ہے۔ دوسرے لمحے کیرٹ داخل ہوتا ہے۔

کپور ٹ : میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ شری ہری ضرور آئیں گے۔ میں نے ان کے فلیٹ پر فون کیا تو معلوم ہوا، کب کے چل چکے ہیں۔ اِدھر فون رکھا، اُدھر دروازے میں ان کے درشن ہوتے۔ (دروازہ ذرا سا کھول کر) آئیے جیوتشی جی !

شری ہری، شری ہری، کا جاپ کرتے ہوئے جیوتشی جی داخل ہوتے ہیں۔ نام تو ان کا مدن گوپال ہے، لیکن متواتر شری ہری، کا نام جپنے سے وہ خود شری ہری کہلانے لگے۔

گورنام : کہئے پنڈت جی، دیکھی ہماری کنڈلی !

شری ہری : آپ کا آدیش (حکم) ہو اور ہم نہ مانیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شری ہری... شری ہری.... بھگوان شاکشی (گواہ) ہے سات کنڈلیاں بننے کو پڑی تھیں۔ کھوسلہ صاحب کے ناتی کی کنڈلی بنانی ہے، روپیہ انہوں نے پیشگی بھجوا دیا ہے، لیکن ایک کشن کا اوکاش (فرصت) نہیں ملا۔ اور ان کے فون پر فون آرہے ہیں۔ کیا کروں، سارا دن تو لوگ آتے رہتے ہیں۔ رات گیارہ بجے سے پہلے تو اوکاش ہی نہیں ملتا۔ کل رات بارہ بجے آپ کی کنڈلی لے کر بیٹھا تو تین بجے اٹھا۔ شری ہری.... شری ہری.....

گورنام : کچھ بتائیے بھی مہاراج، شری ہری نے ہمارے بھاگیہ میں کیا لکھا ہے۔

شری ہری : فلم تو آپ کی ہٹ ہوگی۔ سَو میں پچیس پرسنٹ اپسوا۔ شری ہری.... شری ہری....

گورنام : یہ پچیس فیصدی کی رکاوٹ کیسے لگا دی مہاراج۔

شری ہری : بات یہ ہے کہ بھگوان شنی ذرا وکری (ٹیڑھا) ہے۔ میں اس کا جاپ کر دوں گا۔ آپ چنتا نہ کریں۔ یوں بھی ڈھائی تین مہینے کے بعد یہ سومیہ (اپنے آپ) سیدھا ہو جائے گا۔ فلم ایکدم ریلیز نہ کریں۔ شنی مہاراج کو ذرا سیدھے ہو لینے دیں۔ شری ہری... شری ہری.... اور جیسا میں نے نویدن کیا تھا، نیلم کی انگوٹھی....

گورنام : میں نے شہر میں اکیس سینما ہال بک کر رکھے ہیں۔ ایک ہی دن سب میں ریلیز ہوگی۔

شری ہری : تو... تو... آپ....

گورنام : کہئے کہئے !

شری ہری : بات یہ ہے کہ آپ کی کنڈلی میں کسی متر کے ہاتھوں لابھ کا جوگ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس فلم میں آپ کسی کو ساجھے دار بنا لیں۔

گورنام : ساجھے دار تو دس بن جائیں گے۔ چار چار ہٹ فلمیں بنا چکا ہوں۔ لیکن آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں ؟

شری ہری : بات یہ ہے کہ جس متر کو ساتھی بنائیں گے اگر اس کا سنیچر شکتی شالی ہوگا تو آپ کا وکری شنی کٹ جائے گا۔ اور بھگوان کی کرپا سے چاروں کھونٹ دِیے تا پھیرے گی۔ شری ہری... شری ہری....

گورنام : ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں تو....

شری ہری : لیکن جن جن سے بات کریں، ان کی کنڈلیاں بہانے سے لیکر مجھے دکھا دیں۔

گورنام : یہ کپور ٹ کہتا ہے کہ میری کنڈلی میں آپ نے کچھ اور بھی دیکھا ہے۔

شری ہری : بات یہ ہے کہ گرہوں کی ورتمان دِشا کا لیکھا جوکھا کرنے لگا تو یونہی سوریہ سنگھتا اٹھا کر بھلا دیش پڑھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ اس سال آپ کے گھر سنتان اُتپتی کا جوگ ہے۔ وہ بھی بالک کا۔ شری ہری.... شری ہری....

گورنام : (سرگوشی میں) میں پنڈت جی میں دوسری شادی کرنے کی سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دُودِ دھا تھی، سو آپ کی اس پیشین گوئی سے دور ہوگئی۔ ہو سکا تو میں آج ہی شام طے کر لوں گا۔ نہیں تو کل یقیناً !

شری ہری : پرنتو بیاہ کا جوگ تو....

سر کھجلانے لگتا ہے۔

گورنام : نہیں ہے کیا ؟
شری ہری : دھیان نہیں دیا۔ کنڈلی دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔
گورنام : کیا میری پتری آپ ساتھ نہیں لاتے۔
شری ہری : میں راستو میں (حقیقت) میں گھر سے سیدھا ادھر نہیں آیا۔ ڈائرکیٹر خنکر کے ہاں چلا گیا تھا۔ وہاں سے مہتہ صاحب کے یہاں چلا گیا۔ وہاں چٹرجی کے ـــــــ گھر سے سیدھا ادھر آتا تو....
گورنام : مجھے آپ کی رائے آج ہی، بلکہ ابھی چاہئے۔
شری ہری : تو ایسے کیجئے، مجھے سٹوڈیو کار میں بھیج دیجئے۔ میں جاکر کنڈلی دیکھتا ہوں۔ اور آپ کو فون پر بتا دیتا ہوں۔
گورنام : جائیے کِرِٹ آپ کو میری کار میں لے جائے گا۔ (کِرِٹ سے) کِرِٹ جیوتشی جی کو ذرا کار میں ان کے ہاں پہنچا دو۔
کِرِٹ : آئیے پنڈت جی۔
شری ہری : (چلتے چلتے ذرا رک کر) کہیں کچھ بات چل رہی ہے؟ لڑکی کی کنڈلی دیکھے بنا....
گورنام : وہ سب ہو جائے گا۔ آپ جوگ تو دیکھئے۔
شری ہری : ٹھیک ہے، میں گھر پہنچتے ہی پتری دیکھ کر آپ کو فون کرتا ہوں۔
گورنام : یہ لیجئے یہ ایک ہرا پتا رکھئے۔
شری ہری : (نوٹ لے کر جیب میں رکھتے اور گھگھیا کر ہنستے ہوئے) ارے بھگوان یہ پھر آ جاتا۔ ہیں ہیں... ہیں ہیں..... اچھا تو... چلوں!

جیوتشی جی ماتھے پر دونوں ہاتھ لے جاتے ہیں اور شری ہری، کا جاپ کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ گورنام میز پر ٹانگیں پسار کر پیچھے کو لیٹ جاتا ہے۔
چپراسی داخل ہوتا ہے۔

چپراسی : سرکار وکیل صاحب آتے ہیں۔
گورنام : ان کے ساتھ بھی کوئی ہے۔
چپراسی : وہی پانڈے جی اور مشرا جی ہیں، جو دو تین دن سے آ رہے ہیں۔
گورنام : بھیج دو اور کیتلی میں فوراً چائے کے لئے پانی چڑھا دو۔
چپراسی : پانی تو گرم ہے۔ ہرنام صاحب کے لئے چائے بن رہی ہے۔
گورنام : تو تین چار پلیٹوں میں بسکٹ رکھ کر چائے لاؤ۔
چپراسی : جی بہتر (دروازہ کھول کر) آئیے وکیل صاحب۔

شری برج رتن پانڈے اور درگا پرشاد مشرا کے ساتھ وکیل صاحب داخل ہوتے ہیں۔

گورنام : (کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے) آئیے... آئیے... تشریف رکھئے۔
وکیل : کاغذ تو میں نے رَت سب تیار کر دیتے ہیں۔ ان کو دکھا بھی دیتے ہیں۔ اسٹیمپ پیپر آپ کے نام سے خرید لئے ہیں۔ آپ ایک نظر دیکھ لیں تو میں اسٹیمپ پیپر پر معاہدہ ٹائپ کرا دوں۔
گورنام : دکھائیے۔

وکیل گورنام کو کاغذ دکھاتا ہے۔ گورنام خاموشی سے پڑھتا ہے۔ اس دوران چپراسی طشتریوں میں بسکٹ اور ردوسی گلاس سٹینڈز میں چائے کے گلاس ٹرے میں سجا کر لاتا ہے اور سب کے آگے رکھتا ہے۔

(معاہدہ پڑھنے کے بعد) کیوں پانڈے جی، آپ نے پڑھ لیا ؟

پانڈے : (قدرے ہنس کر) دیکھئے، اس سب کی ضرورت نہ تھی، لیکن میں نے کہا نا کہ لڑکی کے ماما نے اس کی ماں کو بہکا دیا۔

گورنام : ہاں ... ہاں ... وہ بجا ہے۔ ماما جی کو اس طرح سوچنا اور لڑکی کی ماں کا ڈرنا عین واجب ہے۔ ماما جی کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا اور کہتا۔ یوں تو جہاں تک شاستروں کا تعلق ہے ہندو وِواہ اٹل اور اٹوٹ ہے۔ شوہر ذات بدل لے تو بھی نہیں ٹوٹتا۔ لیکن جب سے نیا قانون بنا ہے، مردوں کو وہ پہلے کی سی آزادی نہیں رہی۔ طلاق کے بغیر دوسری شادی کو سرکار غیر قانونی مانتی ہے۔ نہ دوسری بیوی اور اس کے بچوں کو باپ کی جائداد میں کسی طرح کا قانونی حق ہی دیتی ہے۔ آپ زور نہ دیتے تو بھی میں یہ سب لکھا پڑھی کرتا۔ لیکن خیر معاہدے کا یہ رف ورشن آپ پڑھ لیں اور دیکھ لیں، کوئی بات رہ گئی ہو تو ....

پانڈے : نہیں جی، میں نے دیکھ لیا ہے۔ میں مطمئن ہوں۔

گورنام : مشرا جی کو دکھا دیا ہے ! یہ لڑکی کے پھوپھا ہیں، ان کی تسلی ہونا لازم ہے۔

پانڈے : ان کے سامنے ہی میں نے ساری باتیں وکیل صاحب کو لکھوائی ہیں۔

گورنام : تو آپ کب اس معاملے کو پکا کرنے کی سوچتے ہیں ؟

پانڈے : ہماری طرف سے آپ پکا ہی سمجھیں۔ ہمیں صرف لڑکی اور اس کے ہونے والے بچوں کے مستقبل کی فکر تھی۔ سو اس سب کا انتظام آپ نے کر دیا ہے .... اور ہمیں کچھ نہیں کہنا۔

گورنام : تو ....

پانڈے : تو آپ کا مطلب ہے کہ تلک ....

گورنام : ہاں ! میں بے حد مصروف آدمی ہوں، مجھے اپنی نئی پکچر ہی ریلیز نہیں کرنی ہے، نئی کا مہورت بھی کرنا ہے۔

پانڈے : تِلک کا کیا ہے۔ آپ کہئے تو آج یا کل ....

گورنام : آج، کل اور پرسوں —— تین ہی شامیں میری خالی ہیں۔ یعنی فی الحال —— دو گھنٹے بعد کیا صورتِ حال ہو گی، میں نہیں جانتا۔

پانڈے : کیوں مشرا جی، آج شام کو رکھ لیں۔ انتظام ہو جائے گا۔

گورنام : آپ کو کیا اہتمام کرنا ہے۔ آپ کو صرف چیزوں کی فہرست دینی ہے۔ میرا آدمی کار میں جا کر سارا سامان خرید وا دے گا۔ دو کاریں آپ کے ڈسپوزل پر ہوں گی۔ کتنے آدمی آئیں گے لڑکی کے ساتھ ....

پانڈے : کیوں مشرا جی ...

گورنام : کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم لڑکی اور اس کی ماں کو بھی یہ کاغذات دکھا دیں۔

پانڈے : میں سمجھتا ہوں، جو جو آپ کی سلیھ نے چاہا ہے، میں نے کانٹریکٹ میں درج کرا دیا .... تو بھی اگر آپ چاہتے ہیں .... کیوں گورنام صاحب؟

مشرا : بات یہ ہے کہ اگر لڑکی کے پتا زندہ ہوتے تو کوئی اڑچن نہ تھی۔ یہ عورتوں کا معاملہ ہے۔ میں لڑکی کا پھوپھا ہوں۔ پانڈے جی میرے دوست ہیں۔ کل کسی نے کچھ کہہ دیا تو سارا قصور میرے ماتھے منڈھ دیا جائے گا .... وکیل صاحب نے جو کاغذات تیار کیا ہے، وہ میں نے دھیان سے پڑھا ہے۔ اس میں لڑکی کو کہیں بھی 'بیوی' نہیں لکھا گیا۔ ہر جگہ اسے 'دوست' کہا گیا ہے۔

گورنام : یہ تو میں نے پہلے ہی پانڈے جی کو سمجھا دیا تھا۔ کہ وہ میری بیوی ہو گی۔ باقاعدہ پنڈت بلا کر، ہندو شاستروں کے مطابق، نو گرہوں کی پوجا اور سپت پدی کی رسم ادا کر کے شادی ہو گی۔ لیکن اگر کوئی شکایت کر دے، میری پہلی بیوی کا کوئی رشتے دار، یا میرا کوئی دشمن دعویٰ دائر کر دے تو لڑکی کو یہی کہنا ہو گا کہ اس نے میرے ساتھ شادی نہیں کی اور محض دوست کے ناتے میرے ساتھ رہتی ہے۔ اس بات کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کو کسی قسم کی شکایت ہو گی نہ تکلیف، اسی لئے باقاعدہ معاہدہ کیا جا رہا ہے۔

پانڈے : ہمیں یقین نہ ہوتا تو کیا ہم یوں بار بار آتے۔ اب آپ سے کیا کہیں۔ مشرا جی کی بات میں تھوڑی سچائی تو ہے ہی ... عورتوں کا معاملہ ہے

.... فلمی دنیا میں کام کرنے والوں کے سلسلے میں اس طرح کی جھوٹی سچی باتیں لوگوں میں مشہور ہیں .... اسی لئے شاید مشرا جی اپنے اوپر ذمّے داری لیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ لڑکی اور اس کی ماں کو یہ کاغذ دکھا دیا جائے۔

دکیل : دیکھئے میں آپ سے ایک بات صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ بُرا نہ مانئے گا۔ گورنام صاحب تو بادشاہ آدمی ہیں، لیکن میں ان کا وکیل ہوں۔ اور ان کے نفع نقصان کی تمام تر ذمّے داری میری ہے .... معاہدے پر دستخط بھلے ہو جائیں لیکن ان کاغذوں کی دستخط شدہ نقل آپ کو اسی وقت ملے گی جب آپ تلک دے دیں گے اور لڑکی شادی پر بیٹھ جائے گی ... آپ نے جتنی شرائط رکھیں وہ سب میں نے معاہدے میں شامل کر لی ہیں۔ لیکن کاغذ پر ان کا نام ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے ہاتھ سے معاہدے کی نقل اتار لیں اور ان کی ہلیچ اور لڑکی کی تشفی کرائیں۔ آج تلک ہو جائے، کل شادی، جھنجھٹ ختم۔ آپ کے سر سے لڑکی کا بوجھ اترے اور یہ بھی دوسرے کام میں ....

چپراسی فون لئے داخل ہوتا ہے۔

گورنام : کس کا فون ہے .... میں نے کہا تھا کہ میں فون پر اَیوے لے بل AVAILABLE نہیں ہوں ....

چپراسی : کیرٹ صاحب کا فون ہے ....

گورنام : (چپراسی کے ہاتھ سے چونگا لے کر) ہاں کیرٹ .... اچھا .... ذرا جیوتشی جی کو دو .... کیوں مہاراج .... کیتو دماغ کے گھر میں پڑا ہے .... کیا کہا .... نہیں ہو سکتا (اچانک سنجیدہ ہو کر) آپ پکّا ہی سوچتے ہیں .... نہیں آپ سے صلاح کئے بغیر کہیں، کچھ بھی پکّا نہیں ہوگا .... آپ فوراً اسی کار پر واپس آ جائیے .... اپنا پوتھا پتری سب ساتھ لیتے آئیے (ایک چور نظر پانڈے اور مشرا جی پر ڈال کر) مہورت وغیرہ نکالنا ہوگا نا ....

چونگا واپس چپراسی کو دیتا ہے۔ وہ اسے فون پر رکھ کر اسے لئے لئے باہر جانا چاہتا ہے۔

گورنام : فون یہیں رہنے دو۔

چپراسی فون میز پر رکھ کر چلا جاتا ہے۔

(پانڈے سے) ٹھیک ہے پانڈے جی۔ آپ لوگ اس معاہدے کی شرطیں نقل کر لیجئے اور لڑکی کی ماں اور خود لڑکی سے ڈسکشن کر کے مجھے اپنے فیصلے سے مطلع کیجئے۔ ابھی جیوتشی آتا ہے۔ میں اس سے بھی مشورہ کرتا ہوں کہ آج کا دن شبھ ہے یا کل کا؟ لڑکی کی پتری ذرا ابھی دوبارہ منگا دیجئے گا۔

پانڈے : ہم آپ کو دو گھنٹے میں پتہ دیتے ہیں (ہاتھ مسوستے ہوئے) اب کیا بتائیں آپ سے .... مشرا جی نے ان عورتوں کی تیخ لگا دی ورنہ میں تو ....

گورنام : ٹھیک ہے ... ٹھیک ہے، میں آپ کا انتظار کروں گا۔ گاڑی تو آپ کے پاس ہے نا ؟

پانڈے : جی ہاں۔

اچانک فون کی گھنٹی زور سے بجتی ہے۔ گورنام بزر دباتا ہے۔ دوسرے لمحے چپراسی حاضر ہوتا ہے۔ اس دوران پانڈے اور مشرا وکیل کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔

گورنام : (چپراسی سے) دیکھو کس کا فون ہے۔ یہ مت کہنا کہ میں یہاں بیٹھا ہوں۔

چپراسی چونگا اٹھاتا ہے۔

چپراسی : (فون میں) ڈبل تھری، ڈبل فور، ڈبل فائیو .... جی کہاں سے بول رہے ہیں؟ .... جی ایکسچینج سے؟ .... جموں سے ٹرنک کال ہے؟ .... جی دیر ہے میرے صاحب کو (چونگا گورنام کو دیتے ہوئے) صاحب جموں سے آپ کے نام کال ہے۔

گورنام : (چونگا لے کر) ہیلو .... جی ہاں بول رہا ہوں .... جی ہاں میں گورنام بول رہا ہوں .... (چونگا کان سے لگائے لگائے سیٹی بجاتا ہے پھر اچانک) ہیلو .... ہیلو .... (اور زور سے) ہیلو .... ممبئی .... میں گورنام بول رہا ہوں ... کون؟ .... (زور سے) ہیلو .... ہیلو .... ہیلو .... ہیلو ایکسچینج .... ایکسچینج (زور سے) آواز نہیں آ رہی .... ہیلو (فون ٹھیک ہو جاتا ہے، اس لئے عام لہجے میں بات کرتا ہے) ہاں میں گورنام بول رہا ہوں .... کون بینکی؟ .... مبارکباد .... ارے کاہے کی مبارک باد .... (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) کیا کہتے ہو .... کب؟ ... رات ہی! .... سب ٹھیک تو ہے .... مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اتنے مہینوں تک خبر کیوں نہیں دی؟ .... کیا بے وقوفی ہے؟ .... میں اسی وجہ سے

[باقی صفحہ ۴۸ پر دیکھئے]

مظفر حنفی

(۱)

گلاب کانٹوں سے کچھ استفادہ کرتے ہی
لہو تو، آبلہ پا، صرفِ جادہ کرتے ہی

قدم رُکے تھے ہمارے کہ تھم گئے دریا
اُٹھے بگولے، سفر کا ارادہ کرتے ہی

کنارِ آب، شہادت کا شوق تھا ہم کو
رقیب خیمہ کہیں ایستادہ کرتے ہی

مری بلا سے اگر ملو چھپتی نہیں شبنم
ستارے ٹوٹتے دامن کشادہ کرتے ہی

خفیف ہوتے ہیں احباب کیوں گِلہ کر کے
وفا سرشت ہے اپنی، اعادہ کرتے ہی

اُڑی وہ زُلف مری اُلجھنوں کے قصّے پر
جُھکی وہ آنکھ مرے ذکرِ بادہ کرتے ہی

کسی پہ پھول کھلائے کسی پہ زخم لگائے
کچھ انتظام ورق ہائے سادہ کرتے ہی

سحر تو خیر مظفرؔ ہر ایک شب کی ہے
مگر چراغ کی لَو کو زیادہ کرتے ہی!

(۲)

مداروں کی حفاظت میں انھیں پرواز کرنے دے
مجھے کچھ دیر اپنی گم رہی پر ناز کرنے دے

جَلا کر رشتۂ جاں کو، اُڑا کر گرد وحشت کی
چراغاں میں بگولے کو سفر آغاز کرنے دے

تجھے پھر سمتِ ممنوعہ بلاتی ہے، خدا حافظ
مجھے پھر جستجو کا سلسلہ تو اں در باز کرنے دے

اگر یہ مصلحت کی برف گلنے میں نہیں آتی
تو پیدا حرفِ حق سے شعلۂ آواز کرنے دے

اجازت ہو تو میں بھی سر جھکا دوں روک لوں نیزہ
کبھی نرغے میں اپنی حیثیت ممتاز کرنے دے

کہی بقراط شاعر پُر تکلّف شعر کہتے ہیں
مظفرؔ کو غزل میں دعوتِ شیراز کرنے دے

بررسی یا تفہیم

عقیل الغروی ● ہدایت گڈھ ایجوکیشنل کاؤنسل، ہدایت گڈھ مرزاپور (یوپی)

کسی شخصیت کے ابعاد کا باہم مربوط اور متحد ہو جانا اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ وہ شخصیت کسی تنظیم کی حامل ضرور ہے۔ چاہے وہ آپ اپنی شخصیت کی منظم ترجمانی نہ کر سکے ـــــــ اس کے اظہارات منتشر اور مکدّر ہونے کے باوصف اس کی شخصیت کی تنظیم یا "ذات کی تنظیم" کی غمازی کریں گے۔ البتہ اس صورت میں اس شخصیت کی سراغ رسی دو مرحلوں سے گزر کر ہوگی۔ پہلے اس کے اظہارات کی نفسیاتی تعبیر و تفسیر کرنی ہوگی، پھر ان تعبیرات کو ریاضیاتی سطح پر حاصل کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ "بررسی" واقعتہً دشوار ہے!

وہ شخصیتیں جو آپ اپنی منظم ترجمانی کے مسئلے سے بظاہر یا حقیقتاً دوچار ہوتی ہیں اور کسی "نظامِ فکر" سے روشناس کراتی ہیں وہ دراصل اوّل الذکر "مقامِ ذات" سے یا تو کم تر درجے پر ہوتی ہیں یا پھر اس سے بہت زیادہ بلند ہوتی ہیں، جب کہ بجائے خود وہ "مقامِ ذات" ـــــــ وجودیت کی بڑی ارفع اور پیچیدہ ترین منزل ہے! اردو کے بزرگ شعرا: انیس، غالب، اقبال، یگانہ، سیماب اور جمیل مظہری کی شخصیتوں تک اسی اعتبار سے رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔

اُردو تنقید نگاری میں فلسفیانہ شاعری کی تنقیدی پیمائش کے لئے آزادانہ اعتبارات کی جستجو نہ کر کے شخصیتوں اور افکار کو دوسری شخصیتوں اور ان کے افکار پر محمول کرنے کی روش چل پڑی، جو ظاہر ہے کہ تنقیدی پیمائش کا ثانوی مرحلہ ہے۔ پھر اس مرحلے سے بھی بہت کم ارباب نظر کما حقہٗ عہدہ برآ ہو سکے۔ اس لئے کہ اردو شاعری جب باقاعدہ تنقید سے دوچار ہوئی تو اسے بیشتر وہ ارباب نظر میسّر آئے جن کی آنکھوں میں اظہارات وافکار کے مغربی اقدار کا نور تھا، جب کہ خود اردو شاعری کم از کم اقبال سے پہلے تک مکمّلاً نہ صرف مشرقی افکار و اقدار پر مبنی رہی ہے بلکہ مغربی افکار و اقدار سے قطعاً آزاد بھی رہی ہے۔ اور اقبال کے بعد بھی ایک بڑی حد تک "مستغرب" ہو جانے کے باوجود مشرقی افکار و اقدار سے آزاد نہیں ہو سکی۔ اقبال یقیناً مغربی افکار و اقدار کے اعتبارات میں دریافت کئے جانے کے مستحق ہیں، اس لئے کہ وہ اس کے عالم تھے اور انھوں نے مشرقی فکر کے تسلسل میں غواصی نہ کر کے مغربی فکر کے تسلسل ہی میں اپنا تخلیقی سفر مکمل کیا تھا۔ لیکن میر، انیس، غالب سیماب و یگانہ کے افکار پر مغربی اقدار فکر کے ذریعہ رسائی حاصل کرنا نامناسب ہی نہیں بلکہ صریحی کج اندیشی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ اب تک اقبال کی طرح غالب کی فلسفیانہ تعیین و تقدیر نہ کی جا سکی۔ اور اس زد پر انیس تو ٹھہر ہی نہ سکے۔ جب کہ سیماب یگانہ پر اب تک کسی کی نظر ہی نہ پڑ سکی۔ جمیل مظہری تو ان کی آڑ ہی میں کھڑے ہیں۔

بہر حال، متذکرہ تنقیدی اعتبارات میں اردو کے کسی بھی بڑے شاعر کی فکریات پر مشرقی اقدارِ فکر کی تعیین اور مشرق کے اساطینِ فکر سے واقفیت کے بغیر کوئی نتیجہ خیز بحث بہر حال ناممکن ہے۔ غالب کے تعلق سے یہ بات اور بھی اہم ہے۔ اس لئے کہ غالب نے اپنے آپ کو فارسی ہی تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ عربی نثر کی "دعائے صباح" جیسی کلاسک کو فارسی نظم کا جامہ پہنا کر اپنے حدود کی پنہائی کا اشاریہ بھی قائم کر دیا ہے۔ بقول ناطق نجفی:

"اس مختصر سی دعا میں فلسفہ الہیات و طبعیات کا بیان اور ان افکار کا ادراک غالب نے کہاں تک کیا ہے.... یہاں سے غالب فہمی کے سلسلے میں ایک مستقل اور نیا باب کھل جاتا ہے کہ مفکر شاعر غالب پر ان

افکار کا انعکاس کہاں کہاں اور کتنا ہوا "

(دعائے صباح، تبصرہ، ناطق نجفی، کائنات ۱، ص ۴۸)

اُردو میں بھی ان کے کلام کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ براہِ راست اسی فکری تسلسل کا ایک حصّہ ہے جو شعریت کی سطح پر ابوشکور بلخی، فردوسی، نظامی، سعدی، خواجو کرمانی، خسرو اور جامی کس کس کے ہاں کس کس رنگ روپ میں نمو پذیر ہوا، لیکن یہ نہ پہچانا جا سکا کہ فلسفیانہ نظریہ سازی کے مراحل میں یہی ملّا ہادی سبزواری، میر فندرسکی، ملا صدرا اور میر باقر داماد سے ہوتا ہوا محقق طوسی، شیخ الرئیس بو علی اور ابن مسکویہ کے نظامِ فکر پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ غالب اور ایسے ہی دوسرے بڑے شعرا کے فکری اہم عناصر: وجودیت، تاریخی جدلیت، مادی حرکیت، ارتقا کی فلسفیانہ تخئیل، روحانیت کسی بھی عنصر کی تعبیر، تفہیم اور تشریح ——— انھیں مشرقی اساطینِ فکر کے افکار و اقدار کی روشنی میں کی جاسکے گی۔

یہ چند نام جو یہاں بطورِ مثال پیش کیے گئے، ظاہر ہے کہ مشرقی فکر کا بسیط و عمیق تسلسل بس انھیں تک محدود نہیں ہے۔ مشرقی اقدارِ فکر کی تلاش و جستجو میں بہت دور تک سفر کرنا پڑے گا۔ جس کے تناظر میں یہ شخصیتیں نشانِ راہ اور سنگِ میل قرار پائیں گی۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا یہ حوالے بھی تنقیدی پیمائش کے ثانوی مرحلے میں درپیش ہوں گے۔ پہلے تو کسی مفکر شاعر یا شاعر مفکر کو سمجھنے کے لئے ہمیں آزادانہ اعتبارات میں سفر کرنا پڑے گا۔ پھر ثانوی مرحلے میں اشعار کی توسیعی تفہیم کے سلسلے میں اضافی اعتبارات قائم کرنے کے لئے مربوط حوالوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔"

مجھے اس سے انکار نہیں کہ "فارسی شعری تفکیر" نے "سخن" کو اتنی باریکی دے دی ہے کہ بعض اشعار جو اپنی بنیادی تخئیل میں خالص فکری ہوتے ہیں، ان کی فکری گرفت ایسے ہی دوسرے اشعار کے تعارض کے بغیر دشوار ہوتی ہے۔ مثلاً غالب کا یہ سادہ پُرکار شعر، جو حقیقی طور پر وجودیت غالب کی شاعرانہ سراغ رسی پر دلالت کرتا ہے ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تخئیل سے نغمہ سنج   میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

حکیم صدرائے شیرازی کے اس شعر کو سامنے رکھے بغیر "وجودی فکر" تک ذرا مشکل سے رہنمائی کرتا ہے ؎

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار است   گوئی اثرِ بیشتر از باغ وجودام

اس مربوط اور دلچسپ حوالے کے ساتھ غالب ہی کے ہاں "احساسِ وجود" کی کچھ اور ندرتیں دیکھئے :

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے   لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم   اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ   پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے   جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں!

محولہ بالا چاروں شعر کسی نہ کسی جہت سے اپنی تخئیل کی گہرائی میں، غالب کی "وجودی فکر" کے غماز ہیں، اور، اگر آزادانہ تناظر قائم کیا جائے تو اسے "وجودیت" کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ ہائیڈگر، سارتر، کرکے گارڈ اور دوسرے وجودیت کے علمبرداروں کے بنائے ہوئے خاکے اور چوکھٹے سے الگ ہو، تو اسے رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ مشرقی وجودیت کے علمبردار ملّا صدرا کی بیان کردہ تعبیرات کی مدد لے کر اس کی تفہیم کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملا صدرا کی تعبیرات یا مشرقی تعبیرات اور مغربی تعبیرات میں فرق کیا ہے، ——— فرق دراصل، نظریے کی "حقیقت" اور "تحریک" کا ہے ——— زندگی ایک متحرک حقیقت ہے، بلکہ حقیقت متحرک ہوتی ہی ہے ——— حقیقت کبھی ایک رخی اثباتیت کے باوجود بھی ہمہ جہتی سے عاری نہیں ہوتی، لیکن جب کسی جُزئی حقیقت کے متعلق کوئی نظریہ تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں ہمہ جہتی باقی نہیں رہتی، تحریک میں اثباتیت کم اور نفی کا پہلو زیادہ ہوتا ہے، یہی نظریے کی "حقیقت" اور "تحریک" کا عرفانی پہلو بڑی اور چھوٹی شخصیتوں کی تشکیل

کرتا ہے ۔ ادراک و معرفت کی وہ منزل جو نظریے کو تحریک نہیں بننے دیتی، در اصل اس منزل سے بہت زیادہ بلند ہوتی ہے جو کسی جزئی حقیقت کے ادراک کو ایک تحریک کی شکل دینے پر اکساتی ہے ـــــ اس لئے کوئی ضروری نہیں کہ تحریکی فکر کا حامل کوئی شخص ایک "بلند مقام ذات" پر بھی فائز ہو اور نہ ہی یہ ضروری کہ ہے کوئی "بلند مقام ذات" پر فائز شاعر مفکر تحریکی مزاج کا حامل بھی ہو، ـــــ اب تحریکی مزاج کا حامل، مذکورالصدر اشعار کہنے کے ساتھ ہی اس کے برخلاف کوئی شعر نہیں کہہ سکتا ۔ یہ نہیں کہ کہتا نہیں بلکہ وہ اپنے کلام کے اس حصّے سے جسے وہ عام کرنا چاہتا ہے، اُس دوسرے حصے کو حذف کر دیتا ہے، جلا دیتا ہے، ضائع کر دیتا ہے ۔ لیکن ایک غیر تحریکی ذہن و مزاج کا شاعر جو حقیقت کی حرکیت پر نظر رکھتا ہے، جو زندگی کی بوقلمونیوں کا واقعی مشاہدہ کرتا ہے وہ اس کے برخلاف اشعار بھی کہتا ہے ۔ غالب ہی کی مثال لیجئے ۔ آخرالذکر شعر ؎

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے　　　جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

جو وجودیت کے ایک نادرستی پہلو کا حامل ہے، اسی کے فوراً بعد غالب نے دو شعر ایسے بھی کہے ہیں جو "وجودیت" کے اس پہلو کی نفی اور کسی اور سطح کی نشاندہی کرتے ہیں :

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں !
ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر　　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اردو تنقید کا المیہ یہ ہے کہ حالی کو اس کا بنیاد گزار تسلیم کر کے نقادوں نے بیشتر انھیں کے اسلوبِ تنقید سے کام لیا ۔ جبکہ حالی کے ہاں ادب کی تعبیر و تفہیم کی تخلیقی قدریں ناپید ہیں ۔

ہمارے لئے : غالب مشرقی تہذیب، ادبیات اور ادبی و اخلاقی فکریات کے آخری حامل ہیں، اقبال جدید اور مغربی تہذیب ادبیات اور فکریات کے پہلے انسان ہیں ـــــ غالب کو مغربی تہذیب اور اقدارِ فکر و ہنر سے محض سرسری واقفیت ہے، لیکن مشرقی تہذیب اور اقدارِ فکر و ہنر کے وہ غواص ہیں اور آخری بڑے نمائندے ہیں ۔ غالب ہی کی طرح حالی بھی مغربی تہذیب اور اقدار و افکار سے زیادہ گہری واقفیت نہیں رکھتے ۔ لیکن مشرقی تہذیب اور اقدار و افکار سے بھی حالی کی واقفیت اس سے زیادہ نہیں ! اس طرح غالب فہمی کے سلسلے میں حالی ہر حیثیت سے مبتدی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

ایسا بھی نہیں کہ اردو تنقید کے اوّلین مراحل میں ادب کی تعبیر و تفہیم کی ایسی مضبوط تخلیقی قدروں کی نمائندگی کی ہی نہیں گئی جن سے بیک وقت جمالیاتی اور نظری دونوں سطحوں پر فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا، بلکہ ہوا یہ کہ ایسی تحریروں کو غور سے پڑھا نہیں گیا، اس لئے کہ یقیناً ان تخلیقی اور کثیر الابعاد افکار و اقدار کا سمجھنا اور ان پر کوئی قابلِ لحاظ اضافہ کرنا دشوار تھا، اور ہے ۔ مثال کے طور پر مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات جس میں شیخ الرئیس بوعلی کے نظامہائے فکر سے فائدہ اٹھا کر ادب کی تعبیر و تفہیم کے اقدار اور تخلیقی مبانی کی نشاندہی کی گئی ہے ۔

مشرقی اور بالخصوص اسلامی اقدارِ فکر میں ارفع ترین قدر ـــــ یقین، وابستگی اور تفویض ہے ۔ جو ایک طرف طمانیتِ نفس اور آسودگیِ ذہن کی ضمانت ہے تو دوسری طرف عمل میں پیش قدمی کی راہ میں ارتکاز کا موجب بھی ۔ عظیم ترین اسلامی شعراء میں اس نوعیت سے طمانیت کو شعوری طور پر موجود ہے ۔ جس کی سادہ ترین مثال انیس کی مندرجہ ذیل رباعی ہے :

دنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں
کس راز سے خالق کے یہ آگاہ نہیں
باریک ہے ذکرِ معراجِ رسولؐ
خاموش کہ یاں سخن کو بھی تاب نہیں !

انیس اور غالب کے تعلق سے یہاں محمد رضا کاظمی کے یہ جملے دہرانا کچھ ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے۔

"محمد احسن فاروقی جب فکری عناصر کی کمی کی بنا پر انیس کو آفاقی شاعروں کے دائرے سے نکال رہے تھے تو انھیں وہ مقامات یاد نہیں رہے جہاں انیس فلسفیانہ تشنگی کے تصور کو بھی قریب نہیں آنے دیتے۔ آپ فیصلہ کریں کہ فلسفہ کی انتہا کہاں نظر آتی ہے۔ غالب کے یہاں جب وہ کہتے ہیں ؎

بزم ترا شمع و گل خستگی بو تراب
ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

یا مراثی انیس میں جہاں امام عالی مقام کہتے ہیں ؎

کوئی ہدیہ ترے لائق نہیں پاتا ہے حسینؑ
ہاتھ خالی ترے در پہ میں آتا ہے حسینؑ

غالب کے برعکس انیس ہمیشہ "سوز و سازِ رومی" میں مبتلا رہے۔ پیچ و تابِ رازی کی منزل ان کے لئے کبھی نہ آئی۔ رومی علومِ عشق کی تحریک میں رہے۔ رازی ہمیشہ عالمِ تشکیل میں رہے۔"

(محمد رضا کاظمی جدید اردو مرثیہ، ص ۴۲-۴۱ ط۔ کراچی)

اصل یہ ہے کہ اسی رجحانِ فکر نے مشرقی فکریات میں عشق کو فلسفہ بنا دیا، ایسا فلسفہ جس کی کوکھ سے پیدا ہونے والے ارتقاء کی فلسفیانہ تخلیل ہی سرمایۂ علم جدید ٹھہری!

"فکری اسلامیت"، میں یقین حق اور خیر ہے۔ اس کے برخلاف "شک"، باطل اور شر ہے۔ فکر کی حرکیت اور فعالیت کو حکمتِ اسلامی نے "شک" کے بجائے "شبہہ" کے سہارے قائم رکھا ہے جو "تامینِ فکر" کی بہترین صورت ہے۔ اس لئے کہ "شک" اور "شبہہ" میں بنیادی فرق انکاری اور اثباتی "اتجاہ" کا فرق ہے۔ فکر کے لئے "شک" منکر اور تخریب آگیں تحریک ہے۔ جب کہ "شبہہ" مثبت اور تعمیری ــــ یہ عام راسخ تفہیم کہ عقل و منطق کے لئے انکار و اثبات یکساں مسائل پیدا کرتے ہیں، فکری اسلامیات یا حکمتِ اسلامی کی اس تفہیم کو بے معنی اور بے اثر نہیں بنا سکتی، البتہ خود منطق کی مستقل حیثیت کو مشتبہ کر دیتی ہے۔

ایقان، شبہہ اور شک کے یہی تفہیمات، مشرقی یا اسلامی فکریات اور نظائر و بصائر کو اثباتی استحکام اور افادیت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ غالب کو بہ ہزار تفاوت ہم بہر حال "اثباتی استحکام" اور افادیت کوشی کے اسی پس منظر میں تلاش کرتے ہیں۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
ڈرنا لہائے زار سے میرے، خدا کو مان — آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

نہیں کی ردیف میں یہ دو شعر "تشکیک کی سوزش"، سے تافتہ ذہن کی اس ناگزیر حالت کا سراغ دیتے ہیں جو بالآخر اثباتی استحکام ہی میں افادیت اور آسودگی حاصل کر پاتی ہے۔ غالب کی یہ پوری غزل ان کے تشکیکی رجحان کے اسی ارفع ترین سطح کا پتہ دیتی ہے جہاں سے شاعر یا انسان کی طبیعت اپنے انکاری میلانات کی خود ہی نفی کرتی ہے، اور جہاں سے اثباتی اتجاہ قائم ہوتا ہے۔

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سال خریداری مئی ۱۹۸۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ کیلئے مبلغ ۴۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

خمار قریشی

اے بسا شہر یارِ لمحو...

کھینچ لو
پھولوں کی ڈالی کو
اٹھا لو گود میں
اے بسا شہر یدہ لمحو اب کوئی شکوہ نہ کرنا
اب گلے شکووں کا موسم لد گیا

اس طرف سے اُس طرف تک
گل دُمی نغمے اُٹے ہیں
اب تو اُس نے یہ کہا ہے
"ساعتیں کیوں بانجھ ہوتی ہیں
پیاس میں صحرا کی شدت کیوں یہ آئی ہے ؟
میں تو اب بھی چاہ کے پودے کو پانی دے رہی ہوں "

تم نے
سچ مچ اُس کو صحرا کے حوالے کر دیا ہے
اس کے سینے کو خلش سے
تشنگی سے
قہر سے
آوارگی سے بھر دیا ہے ۔

دریچہ کھول کے رکھنا نہ روشنی کرنا
میں گھر پہ آؤں گا شکووں کو ملتوی کرنا

میں اپنے جسم کے باہر طلوع ہوتا ہوں
تم اپنے قامتِ رعنا میں تیرگی کرنا

جو اُوب جاؤ تو یلغار بھی کرو اس پر
جو اُس کا قرب ضروری ہو دوستی کرنا

یہ کس کی چاہ میں لکھی گئی ہیں تحریریں
یہ کس کے شوق میں سیکھے ہو شاعری کرنا

سُنو ہر ایک کی باتیں بڑی توجہ سے
مگر جو دل کہے تم سے میاں وہی کرنا

● قریش چوک، گلبرگہ ۵۸۵۱۰۴

سروکار

ہندی: کملیشور
ترجمہ: جاوید اقبال ● روزنامہ، ادّت وانی، جگسلائی، جمشید پور - ۶

صبح ویسی ہی اُداس اور پھیکی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی سامنے والی سپاٹ، اونچی دیوار پر نظر گئی تھی۔ وہ رات کی بارش سے بھیگی ہوئی تھی۔ کپڑوں کی سیلن تو ورما کو بھی پریشان کرتی ہے۔ کھڑکی کے پاس اس بلند، سپاٹ دیوار کو دیکھ کر اسے یہی لگتا ہے گویا وہ جیل کی دیوار ہو.... اونچی اٹھی ہوئی.... جس میں صرف ایک کھڑکی ہے۔ اس کھڑکی سے کبھی کبھی ایک پہاڑی نوکر سر نکال کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔

ساتھ والے کمرے میں سونے والا ورما ہمیشہ اس سے پہلے جاگ جاتا ہے، مگر وہ بھی بستر نہیں چھوڑتا۔ نیچے گلی میں آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ بار جے پر اخبار پڑا ہوا تھا۔ مگر دونوں میں سے کسی کو بھی جلدی نہیں تھی۔

اس پرانی، سپاٹ دیوار پر سیاہ ڈرین پائپ چھپکلی کی طرح چپکے ہوئے ہیں۔ صلیب کی شکل میں۔ جوڑوں پر کچھ کوڑا نہ جانے کب سے اڑا ہوا ہے۔ اس کوڑے کی زبانوں سے ہمیشہ رال سی ٹپکتی رہتی ہے۔

کمرے میں بوسیدگی بھری رہتی ہے۔ کونے میں پڑے ہوئے کاغذوں کے ٹکڑے، گرد آلود کوڑے کے پھاہے، جو ہلکی سی ہوا سے رُوئی کی طرح بھٹکنے لگتے ہیں.... جن میں ایک آدھ بال ہمیشہ لپٹا رہتا ہے۔ الماری میں سیلن زدہ اخبار کے نیچے زنگ آلود ایک آدھ چھوٹا سکہ اور چابی پڑی ہیں۔ پھپھوندا اور پیلے دھبوں سے بھری ہوئی دو تین پرانی تصویریں ہیں۔ کچھ زنگ آلود آلپنیں اور سڑے ہوئے کونوں والی چند پرانی کتابیں ہیں، جن سے اب بدبو آنے لگی ہے۔

ورما اٹھ کر اب چائے بنانے لگا تھا۔ بھگونے میں پھٹا ہوا دودھ تھا۔ شاید نیبو پڑا ہو۔ اسٹول پر دو پیالے رکھ کر اس نے درشن کو بلایا۔ درشن چائے پینے کے لئے اٹھ آیا۔ چائے میں انھوں نے نیبو نچوڑ لیا۔ پھر کچھ کھانے کی تلاش میں درشن نے نظر دوڑائی۔ اسٹو جلا کر اس نے پھٹا ہوا دودھ گرم کیا۔

"پنیر کھاؤ گے؟" اس نے ورما سے پوچھا۔

ورما کے انکار کرنے پر وہ بھگونا لے کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا اور کچھ سوچتا ہوا سا پھٹا ہوا دودھ کھاتا رہا۔

"نکلو گے؟" اس نے ورما سے پوچھا۔

"کوئی کام تو ہے نہیں.... نکلنے کے لئے پیسے بھی نہیں ہیں۔" بولتے ہوئے ورما نے پرانے اخباروں پر نظر ڈالی۔ زیادہ نہیں تھے۔

"پیسے میرے پاس بھی نہیں ہیں۔" درشن نے بھگونا رکھ دیا تھا۔

"اُن بیس میں سے نکال لو۔" ورما نے کہا۔

درشن کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور ورما جیسے بار بار جان بوجھ کر اس کی تذلیل کرتا ہے۔ دسیوں بار وہ ان بیس میں سے ایک نوٹ نکالنے کی بات کہہ چکا ہے۔ دس دس کے وہ دونوں نوٹ جیبوں کے تینوں پن کئے ہوئے اس موٹی کتاب میں دبے ہوئے ہیں۔ اسی دن سے، جس دن درشن کی ماں انھیں چھپا کر اس کے تکئے کے نیچے رکھ گئی تھی۔ آج ماں یہ سب کرتی ہے!

"وہ مجھے نہیں لینے ہیں.... ایک وقت وہ تھا جب میری ماں نے ہی عدالت میں جا کر بیان دیا تھا کہ مجھ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے

ے کسی کام کی ذمہ داری ان کی نہیں ہے۔ مجھ سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہے اور سرکار جو چاہے، میرے ساتھ کرے۔"

پھر وہ پچھلی باتوں میں کھو گیا اور آہستہ سے بولا تھا۔ "پارٹی میں خود شامل ہوا تھا، اپنی مرضی سے..... تب میرے گھر والوں نے مجھے ر کے سامنے کتے کی طرح پھینک دیا تھا۔ میری زندگی یا موت سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اب اپنی زندگی سے انھیں میں کوئی سروکار ر کھنے دوں؟ ان کا رحم کیوں منظور کروں؟" کہتے کہتے اس کا چہرہ بگڑ گیا اور چہرے پر تمام سلوٹیں ابھر آئیں۔

"نوٹ نوٹ میں کیا فرق؟" ورما نے بحث کی تھی۔ "ان میں سے ایک خرچ کر دو۔ جب واپس دینا، دوسرا نوٹ ملا دینا۔"

"بچنے کی بات کرتے ہو۔" درشن بولا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کوئی کام نہیں تھا۔ کہیں کوئی آرڈر ملنے کی بات نہیں تھی۔ وہ پھر تھکا ماٹ پر لیٹ گیا سر کے نیچے دونوں ہاتھ دبا کر۔

تبھی اس کا کوئی دوست آ گیا۔ پرانی سیاسی زندگی کے دور کا۔ ایسے کئی دوست اس کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ مگر اتنے ہی ست خوردہ اور مایوس۔ اس کے کمرے میں کبھی کبھی لمبی بحثیں ہوتیں، جن میں وہ خود زیادہ حصہ نہیں لیتا تھا۔ باقی دوست جھگڑتے ے۔ انھیں کے درمیان ایک دن اس نے کہا تھا۔ "آزادی کے دو سال بعد ہی میرے پتا کانگریسی ہو گئے۔"

لیکن اس کا ان سے بھی کوئی سروکار نہیں رہ گیا تھا۔ وہ فائل نکال کر بیٹھ جاتا تھا۔ اس فائل میں وہ ڈاک لگایا کرتا تھا۔ وہ ڈاک بتیہ بک پوسٹ کی شکل میں چھاپے کی مشینوں کی فہرس لے کر آتی تھی۔ کچھ اور سلسلہ نہ دیکھ کر وہ لدھیانہ و امرتسر میں بننے والی ٹریڈل ینوں کو جیسے تیسے فروخت کرنے کا کام کمیشن پر کرتا تھا۔ اس میں بھی بہت سی قباحتیں تھیں۔ ضمانت نہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی کمپنی کا پکا ایجنٹ نہیں تھا۔ اس لئے اسے آرڈر بھی کبھی کبھار ہی ملتا تھا۔ زیادہ تر تو مشین کی خوبیاں سمجھانے کے بعد ہی اس کا سلسلہ ، جاتا اور خریدار براہ راست کمپنی سے باتیں کرنے لگتا۔ تب اسے بہت کوفت ہوتی تھی۔ آتا ہوا پیسہ کھو جاتا تھا اور آنے والے دن اندھیرے میں ڈوب جاتے تھے۔

اس کا دوست آیا تو اسے خوشی نہیں ہوئی۔ وہ بستر سے اٹھا بھی نہیں۔

"کہو سریندر!" ویسے ہی اس نے پوچھا۔

"سوچا تم سے ملتا چلوں۔" سریندر نے کہا اور لفافے سے چار کیلے نکال کر چارپائی کی پٹی پر رکھ دیے۔ "کھاؤ۔"

"کوئی لدھیانہ جانے والا ہو تو بتانا۔" درشن نے کہا۔

"کیوں؟"

"کچھ چیزیں گھر بھیجنی ہیں۔"

اور جیسے اس نے ان سب چیزوں پر نظر ڈالی۔ ویسے کا ویسا رکھا ٹیبل فین، سینڈل اور کتاب میں رکھے ہوئے دس دس کے نوٹ۔

"کوئی جائے گا تو بتاؤں گا۔" سریندر نے کہا۔ "چیزیں واپس بھیجنی ہیں۔؟"

"ہاں۔"

"تم اس طرح خود کو کیوں ستاتے ہو درشن؟"

"ستا تو مجھے وہ لوگ رہے ہیں جو یہ چیزیں بھیج دیتے ہیں! انھیں خود سوچنا چاہیے۔" درشن نے کہا۔ "تمھیں تو سب معلوم ہے سریندر!"

ر ان کا دھیان ڈرین پائپ پر چلا گیا تھا جس میں سے گندہ پانی آواز کرتا ہوا نالی کی پٹیا پر گر رہا تھا۔

"تمھیں یاد ہے سریندر اس کسان کانفرنس کی؟" درشن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنا پرانا بستہ نکال لیا تھا۔ جب بھی اسے آگے ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا تو وہ ماضی کی گود میں بیٹھ جاتا تھا۔ بیتے ہوئے کو جینے لگتا تھا۔

اس کے پرانے بستے میں بہت سارے خطوط اور اخباروں کے تراشے تھے۔ کچھ ٹائپ کیے ہوئے کاغذات جن میں ان کتابوں کے ودے تھے جنھیں ان کی پارٹی نے کبھی پاس کیا تھا.... جن کے ماتحت وہ زندہ رہتا رہا تھا۔ وہ سارے کاغذات، تجاویز کے مسودے

اور اخبارات کے تراشے پیلے پڑ کر موڑوں سے مردہ ہو چکے تھے۔

بستہ کھول کر اس نے کاغذات پلٹے تو وہ ریشمی پھول والا بلّا نکل آیا۔ "اسی کانفرنس کا ہے نہ ؟" کہتے ہوئے اس نے اس میں سے زنگ آلود سیفٹی پن نکال کر اپنی قمیص میں لگا لیا تھا۔

" بڑے اہم فیصلے ہوئے تھے اس کانفرنس میں !" سریندر نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

" وہ دھرم پال اب کہاں ہے ؟ کچھ پتہ ہے ؟"

" معلوم نہیں" کہتے ہوئے وہ ایک کاغذ پڑھنے لگا تھا۔ جیل سے رہائی کا حکم نامہ... کتنی ہیں ایسے تو... پڑھ کر وہ آہستگی سے مسکرایا تھا۔ کچھ دیر بعد سریندر اٹھ کر چلا گیا۔ درشن ویسے ہی لیٹا رہا۔ اوپر چھت کے کونے میں مرے ہوئے پانی کی شکلیں دیکھتا ہوا۔ الماری کھولتا ہے تو عجیب سی بھبھک آتی ہے۔ اخباروں میں خبریں ہیں۔ کتابوں میں بدبودار اوراق۔ کچھ بھی کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ تصویروں پر پیلے پیلے دھبے پڑ گئے ہیں، ان کے عکس دھندلے ہو گئے ہیں۔

اسے لگتا ہے جیسے سب کا ساتھ چھوٹ گیا ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں جس کے ساتھ بیٹھ کر وہ سب باتیں کرے اور وہ توجہ سے اس کی تکلیف کو سنے۔ ورما بھی نہیں سُنتا۔ سنتے سنتے اپنا کام کرتا رہتا ہے یا دانتوں سے ناخون کترتے ہوئے اپنی باتوں میں کھو جاتا ہے۔

طبیعت ہوئی کہ کہیں نکل کر چلا ہی جائے۔ مگر وہ جن وانی، پریس والا تو اس کا بے کار وہاں بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ کڑھتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے یہاں سے ٹیلیفون کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

"لڑکے دو چائے لانا" کہہ کر پریس کا مالک اچانک درشن کی جانب دیکھتا ہے اور وہ بتا دتی ڈھنگ سے غلطی درست کرتا ہے۔ "تین لانا" اور اپنے گاہک میں کھو جاتا ہے۔ درشن چائے کے لئے منع کر دیتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ان کی باتوں میں کچھ ساتھ دے، مگر باتیں اتنی اجنبی ہوتی ہیں کہ ان سے اس کا کوئی بھی تعلق قائم نہیں ہو پاتا۔

" تم درخواست دے دو... کوٹا مل جائے گا" پریس کا مالک کہتا ہے۔ اور اسے لگتا ہے کہ اگر کوٹا دینے والے افسر کا نام بھی وہ جانتا ہوتا اور اس وقت لے لیتا تو تیسری چائے کے لئے اس بے چارے کو ناٹک نہ کرنا پڑتا۔

سامنے رہنے والا میرٹھ کا گپتا اولاد کے لئے پریشان ہے.... وہ اسے اولاد پانے کی پوشیدہ ترکیبیں نہیں بتا سکتا.... اور نہ اتنے بڑے جھوٹ سے کھیل سکتا ہے کہ اس کے گھر میں دوست کی طرح آنے جانے لگے... اور صبح وشام کا کھانا بندھ جائے۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ وہ سب کیسے ہوتا ہے۔

اس کا گھر اور رشتہ داری بھی نہیں... اور نہ اتنا زور ہے کسی پر کہ بغل والے ٹیکسی ڈرائیور سردار کی لڑکی بنتو کے رشتے کیلئے کچھ بات کر سکے یا اسے کوئی مشورہ دے سکے۔

سڑک پر چکّی والا ہے وہ کبھی کبھی بات کرتا ہے "چار روپے اور چڑھ گئے گیہوں پر!" تب اس کا دل چاہتا ہے کہ کہے "تمہارے پاس تو پرانا اسٹاک ہے۔ پھر اس پر دام کیسے چڑھ گئے ؟" مگر وہ کہہ نہیں پاتا۔ الٹی باتیں کر سکنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ کیسے کہے کہ وہ کاغذ کا کوٹا دلوا سکتا ہے... کہ بھابھی میری ماں کے برابر ہے اور اس کے بچّہ ہو جائے گا... کہ بنتو کا رشتہ طے کرا دینا چٹکیوں کا کام ہے... کہ گیہوں پر قیمتوں کا چڑھنا بے معنی ہے۔

چاروں طرف جو کچھ ہے، وہ ایسا ہے جس سے صرف لڑا جا سکتا ہے، جیسے صرف ادھیڑ کر رکھا جا سکتا ہے لیکن یہ کرنا بھی اس کے بس میں نہیں رہ گیا ہے.....

جینے کے لئے ہر قدم پر وہ سمجھوتہ کیسے کرے ؟

اور تب وہ بہت اکیلا ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ ساری دنیا اس سے برسرِ پیکار ہے وہ بالکل اکیلا ہے اور دنیا کی ان ساری باتوں سے اس کا کوئی سروکار نہیں رہ گیا ہے۔

اس نے اپنا بستہ باندھ کر رکھ دیا۔ اٹھ کر وہ تیار ہوا۔ کپڑوں سے سیلن کی بو آ رہی تھی۔ اس نے داڑھی کو قرینے سے سجایا۔ جوتے کے تلے سوراخ تھا۔ کاٹ کر دفتی کا ٹکڑا ڈالا۔ تیار ہو کر کھڑا ہوا کہ ورما نے پوچھا "کس طرف جا رہے ہو ؟"

سوال نے اسے اور بھی لاتعلق کر دیا۔ کس طرف جائے گا ؟ کہیں کچھ ہے ؟ اور وہ چپ چاپ اس کے کمرے میں پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ ورما دوبارہ نہیں پوچھا۔

"تم کہیں جا رہے ہو ؟" اس نے خود سوال کیا۔

"ابھی تو نہیں" ورما نے جواب دیا اور نوکری کے اشتہارات میں الجھا رہا۔

درشن آ کر پھر ویسے ہی لیٹ گیا۔

اس وقت شام ہو رہی تھی جب ورما لوٹ کر آیا۔ بے حد گرمی تھی۔ کمرے میں روشنی نہ دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ درشن نہیں ہے۔ اس نے دروازہ کھولا اور بتی جلائی تو درمیان کے نیم وا دراز سے روشنی کی ایک لکیر درشن کے بستر پر لیٹ گئی۔

درشن بھی لیٹا ہوا تھا۔ ورما نے جا کر دیکھا... ویسے ہی پگڑی باندھے اور جوتے پہنے ہوئے۔ چہرے پر پسینہ تھا۔ پگڑی کے کنارے بھیگے ہوئے تھے۔ گردن کے پاس تکیہ گیلا تھا۔

اسے اس حالت میں دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ کہیں.... مگر سانس چل رہی تھی۔ شاید کوئی زہر.... گھبرا کر اس نے درشن کو پکارا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آستین سے منہ کا پسینہ پونچھ کر بولا: "کتنے بج گئے ہیں ؟"

"سات"

"اچھا" کہہ کر وہ گندے تولیے سے گردن پونچھتا ہوا بیٹھ گیا۔ پھر اباسیاں لینے لگا۔

"کہیں گئے تھے ؟"

"ہوں" درشن بہت کبیدہ خاطر تھا۔ ورما اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ درشن پھر لیٹ گیا تھا۔ کیل پر میلے کپڑے ٹنگے تھے۔ ان میں اندھیرا بھر رہا تھا۔ ایک پینٹ مردہ سانپ کی طرح لٹک رہی تھی اور درشن کی آنکھیں کسی پر ٹھہری ہوئی تھیں۔

"پھر لیٹ گئے ؟" ورما نے وہیں سے کہا۔

"میں باہر جا رہا ہوں" پسینہ پونچھتے ہوئے وہ ورما کے کمرے میں آ گیا تھا اور چلتے ہوئے اس نے اپنے کمرے پر کچھ اس طرح نظر ڈالی گویا اس سے اب کوئی مطلب نہ رہ گیا ہو۔ اس وقت اس کھڑکی سے پہاڑی نوکر نے جھانکا تھا اور بیڑی کا کش لے کر ٹونٹا گلی میں پھینک دیا تھا۔

"اس نوکر کو کبھی میں نے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا" چلتے چلتے درشن بولا تھا۔

"تمہیں نکلتے اس نے بھی نہیں دیکھا ہو گا" ورما نے کہا تھا تو وہ ہنس پڑا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو!" اور وہ سیڑھیوں کے نیچے اتر گیا تھا۔

ورما کو قدرے راحت ملی۔ جیسے جیتی جاگتی موت کہیں اور چل پڑی ہو۔ ہلکی سی پریشانی ہوئی۔ شاید وہ لوٹ کر آئے... شاید نہ آئے۔ مگر بہت رات گئے درشن لوٹ آیا.... ورما بہت فکر مند تھا.... جب سیڑھیوں پر اس کے گھسٹتے قدموں کی آہٹ سنائی پڑی تو اچھا لگا۔

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے گہری سانس لی تو اٹھ کر ورما نے روشنی کر دی۔

درشن بری طرح کیچڑ سے لتھڑا ہوا تھا۔ سر پر پگڑی نہیں تھی۔ وہ مبہوت سا دیکھتا رہا۔ آخر اس نے پوچھا "کیا ہوا درشن ؟"

"بتاتا ہوں!" درشن کے چہرے پر بدحواسی تھی۔ وہ اندر سے گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

اس نے کپڑے اتارے۔ کیچڑ میں سنے کپڑے وہ بالٹی میں بھگو آیا۔ کافی دیر تک وہ نہاتا رہا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ کچھ دیر بعد ورما کے کمرے میں آکر کھڑکی سے پیٹھ ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دونوں بازو پھیلا کر اس نے سلاخوں کو پکڑ رکھا تھا جس سے اس کے کاندھے کچھ اوپر اٹھ گئے اور پسلی کی ہڈی ابھر آئی۔

"بیٹھ جاؤ" ورما نے کہا۔

"نہیں، ٹھیک ہے" وہ بولا۔

"کیا بات ہو گئی؟"

"کچھ نہیں ...." درشن کی آواز ڈوبتی ہوئی سی تھی۔ "میں ادھر جمنا کے کنارے نکل گیا۔ وہ سنسان تھا۔ اس جگہ میں ایک بار گیا تھا... اُن کھنڈروں میں کوئی نہیں آتا۔ کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھکا، پھر جمنا کی طرف چلا گیا۔ کچھ دُور جا کر وہ رکا۔ پھر کافی دیر ٹہلتا رہا۔ شاید وہ مجھ پر شک کر رہا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھا سنسان پانی دیکھتا رہا...

تبھی دور سے ہلکی سی آواز آئی۔ وہ آدمی گم ہو گیا تھا....."

درشن اسی طرح سلاخوں کو پکڑے ہوئے بتا رہا تھا۔ "تبھی تیز بہاؤ میں کچھ ڈوبتا ابھرتا نظر آیا۔ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ جب تک میں کیچڑ پار کر کے ندی میں جاؤں وہ کئی ہاتھ آگے بہہ گیا تھا۔ آخر میں کود پڑا۔ کوئی ایک فرلانگ آگے میں اسے اتھلے پانی میں کھینچ لایا۔ وہ بے ہوش تھا"

"جیسے تیسے میں نے اسے کیچڑ تک کھینچا۔ تبھی ٹارچ کی روشنی چمکی۔ میں نے آواز دی تو وہ ٹارچ والا آدمی کیچڑ پار کرتا ہوا پاس آگیا۔ وہ 'ریور پولس' کا سپاہی تھا"

"مجھ میں سکت نہیں تھی۔ اس سپاہی نے سارا انتظام کیا۔ وہ آدمی اسپتال بھیج دیا گیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ بہت پانی پی گیا تھا۔ پولس نے بیان لیا۔ انسپکٹر پوچھنے لگا کہ میں اس وقت وہاں کیوں گیا تھا؟ بہت بدتمیز ہوتے ہیں پولس والے.... انھیں مطلب، پھر میں چلا آیا" اتنا کہہ کر درشن خاموش ہو گیا۔ سلاخوں پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی تھی۔ وہ چپ چاپ ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کہیں نہ دیکھ رہا ہو۔

"پتہ نہیں کیوں خودکشی کیوں.... ؟" ورما نے زیر لب کہا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد درشن بولا۔ "تم نہیں سمجھ سکتے"

اسی وقت وہ کھڑکی کھلی تھی۔ پہاڑی نوکر نے گردن نکال کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔ بیڑی کا ایک لمبا کش لیا تھا اور اپنے سامنے کی دیوار کو دیکھتے ہوئے بیڑی کا ٹوٹا کھڑکی کے کنارے سے رگڑتا رہا تھا۔ OO

بقیہ صفحہ ۲۷ ٹرنک کال

دوسری شادی کر لیتا... قہر تو ٹوٹ ہی جاتا.... ہاں بھگوان نے بھلا کیا.... تم لوگ بھی مبارک باد لو.... اپنی ماتاجی کو بھی مبارکباد دینا

.... زچہ بچہ تو ٹھیک ہیں.... دونوں کو میرا پیار دینا.... میں پہلی فلائٹ سے پہنچ رہا ہوں....

گورنام چونکتا واپس فون پر رکھ دیتا ہے۔ چہرہ کھلا پڑتا ہے۔ ہرنام آتا ہے

ہرنام : بھائی صاحب راجیش کھنہ سے وقت طے ہو گیا ہے۔ اس وقت میں فیمس جا رہا ہوں۔

گورنام : نہیں تم فیمس نہیں جا رہے۔ ابھی کار لے کر جاؤ۔ اور میرے لئے جموں کی پہلی فلائٹ میں سیٹ بک کرا دو۔

ہرنام : (حیران و ششدر) جموں۔

گورنام : تمہارے بھتیجہ ہوا ہے۔

ہرنام : (جوش سے دونوں باہیں پھیلاتے آگے بڑھتا ہے) بھائی صاحب !! ....

دونوں بھائی ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں، — پردہ گرتا ہے — O

اندر سروپ دت نادان

فسادی

قا سرپہ سورج
گر اندھیرا
ہ جانے آکر کہاں سے میرے قریب کوندا
ھر ایک نیزہ
گاہِ قاتل کی آگ پی کر
ہوا میں اُچھلا
مدائے قاتل کی گھن گرج نے
ھر آبروئے سکوت لوٹی
تجھے نہ چھوڑوں گا آج زندہ !"
جھے فسادی سمجھ کے شاید ہوا ہے تیرا مزاج برہم
گر میں مفسد نہیں ہوں بھائی . . ."
رے تکلّم سے درد پھوٹا
"تو کون ہو تم ؟"
زبانِ قاتل سے تیر چھوٹا
'میں شہرِ محنت کا بانکپن ہوں
میں راندۂ محفلِ سخن ہوں
میں گیت گاتا ہوں زندگی کے
بشر کی عظمت کے ، روشنی کے
میں شہرِ ذلّت کی ہر گلی سے گذر چکا ہوں
میں اس خدا کو بھی جانتا ہوں
جو تیرے نیزے میں جلوہ گر ہے
وہ شخص بھی ہے مری نظر میں
جو تیرے اندر
محبتوں کے چراغ لے کر
نہ جانے کب سے بھٹک رہا ہے .
وہ نیک انساں
جو میرے گیتوں کا دیوتا ہے . . ."
ابھی ادھورا تھا گیت میرا
کہ چشمِ قاتل سے اشک ڈھلکے
ہوئے حمائل مرے گلے میں وہ دست و بازو
جو شہرِ ذلّت کی آبرو تھے . . .
ہزار بل کھا کے رہ گیا وہ مہیب نیزہ
خدائے وحشت نے ڈرتے ڈرتے یہ آدمیت کا جشن دیکھا
عظیم سورج کی روشنی میں ہوا اضافہ !

● بی-۳/۲۶۹ ، پچھم وہار ، نئی دہلی ۶۳

قاضی حسن رضا

ہم تھے طلسمِ ہوش رُبا کی تلاش میں
دن ہو گیا تمام ہوا کی تلاش میں

سنتے ہیں آدمی کی خدا کو تلاش ہے
دنیا بھٹک رہی ہے خدا کی تلاش میں

خنجر کا ایک وار کہ سرخی چہار سمت
اَب کون جائے برگِ حنا کی تلاش میں

بستی میں جو ملا وہ مسیحا سے کم نہ تھا
اور اک ہجوم دستِ شفا کی تلاش میں

میں اُن کی جستجو میں بھٹکتا ہوں روز و شب
دیوار و دَر ہیں سیلِ بَلا کی تلاش میں

ہر موڑ پر صدائیں لگاتی ہے زندگی
میرے معاصرین قضا کی تلاش میں

گمنامیوں کو ڈھال بنائے رہو ابھی
شہرت کے ہاتھ ہوں گے رضاؔ کی تلاش میں

● قاضی پورہ ، کھنڈوہ ۔

رہ گذر

زیتون بانو ● مکتبہ ارژنگ، پوسٹ بکس نمبر ۳۲۳، پشاور (پاکستان)

"امّی! قیوم کی دادی مرگئیں" بوبی نے گھر میں گھستے ہی اطلاع دی۔

"کس کی دادی؟" میں نے ٹھیک سے نہیں سنا تھا، اس لئے حیران ہوئی۔

"امّی! قیوم کی دادی وہ جو ہمارے ہاں قرآن پڑھنے آتا ہے"

اور مجھے یاد آیا کہ قیوم جو ہمارے ہاں قرآن پڑھنے آتا ہے، اس کی ایک دادی بھی تھی۔ مجھے اپنے کمزور حافظے پر اس وقت غصہ آیا۔ جب میکانکی طریقے سے میرے منہ سے اِنا لِلّٰہ واِنا الیہ راجعون نکلا۔ ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ میں نے دل میں ترجمہ دہرایا۔

"بیٹے کیا وہ بیمار تھیں؟" میں نے اپنی تسلّی کے لئے پوچھا۔

"نہیں امی! وہ رات پانی کے جوہڑ میں گر کر مری ہیں"

"ارے! وہ کیسے؟" میں اور حیران ہوئی۔

"پتہ نہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں، میں نے بس اتنا دیکھا کہ لوگ آ رہے ہیں اور قیوم کی ماں اور باپ تو دہاڑیں مار مار کر رو رہے ہیں۔ قیوم بھی رو رہا ہے۔ لاش صبح ملی ہے، پانی میں تیر رہی تھی۔ ٹھہریے امّی! میں ابھی پوری معلومات کر کے آتا ہوں کہ کہاں اور کس جوہڑ میں گری تھیں اور کیسے گری تھیں"

بوبی گھر سے تیزی سے باہر نکلا، قیوم کی دادی کے ڈوب مرنے کی معلومات حاصل کرنے اور میں خیالات کے بھنور میں پھنس کر آہستہ آہستہ اپنے اندر ڈوبتی گئی۔

"بے چاری! یہ بوڑھی مائیں، یہ دادیاں، یہ نانیاں ہمیں کیوں اتنی جلدی بھول جایا کرتی ہیں۔ ابھی دیکھئے نا، کل پرسوں ہی کی بات ہے، میں بازار سے گرم کپڑے اور اون خرید کر گھر واپس آ رہی تھی، قیوم کی یہی دادی جو کل رات کسی جوہڑ میں گر کر ڈوب مری ہیں، گلی کے نکڑ پر بیٹھی کالی سیاہ ہانڈی سے زنگ لگے چھوٹے چمچے سے چھولے نکال نکال کر گندی سی پرچ میں ڈالتی جا رہی تھیں، ساتھ ہی ساتھ پاس بیٹھے بچوں سے باتیں بھی کئے جا رہی تھیں۔

"پتہ ہے یہ جو نو گز لمبا قد لئے ادھر ادھر پھر رہا ہے نا۔ یہ جو تمہارے دوست قیوم کا باپ ہے نا۔ میں اسے سیڑھی کہا کرتی تھی، میں اسے بانس بھی کہا کرتی تھی۔ یہ اتنا لمبا نہ ہوتا لیکن پتہ ہے اسے چھولے بہت پسند تھے۔ ایک بار آدھی رات میں اٹھا اور ضد کرنے لگا، میں چھولے کھاؤں گا۔ سخت گرمی تھی ہم باہر صحن میں سو رہے تھے میں نے اٹھ کر چھولے لگا دیے اور جب تھالی میں ڈال کر اسی طرح اوپر نمک چھڑکا جس طرح تمہارے لئے چھڑک رہی ہوں، تو پھر یہ سو چکا تھا۔ اور صبح جب اٹھا تو مچلنے لگا میں اب نہیں کھاتا، اب آسمان سے تارے بھی چلے گئے ہیں ابھی اسی وقت تارے لاؤں۔ اور جی بس رونے لگا۔ ضد کرنے لگا ____ لو بیٹے ____ کھاؤ، چھولے کھاؤ، دس گز لمبا قد نکالو، لیکن ماں کو گھر سے مت نکالنا۔ گھر سے میری طرح دھکے دے کر نکالی گئی ماں کو دوسرا کوئی بھی اپنے گھر جگہ نہیں دیتا۔ لو بیٹے بسم اللہ کرو ____"

اور جب وہ اس بچے کو چھولوں کی پڑیا پکڑانے لگی تو مجھ سے ان کی نظریں چار ہوتیں۔ "آؤ بیٹی تم بھی کھالو چھولے اچھے لگتے ہیں۔ نرم ہیں، میں کھٹائی نہیں ملاتی بچے ہیں نا گلے خراب ہو جاتے ہیں۔ لاؤ لاؤ نکالو چار آنے اپنے پوتے قیوم کو بھی مفت نہیں دیا کرتی، پیسے لے کر دیتی ہوں، لیکن پتہ ہے دو چار دانے چھولے زیادہ ڈال دیتی ہوں نا۔ پوتا جو ٹھہرا۔ ابھی سے مفت کھانے کی عادت پڑ گئی تو باپ کی طرح مفت خورا ہو جائے گا۔ جب چار بیٹیوں اور اس اکلوتے تو گبرے بیٹے کے ساتھ بیوہ ہوئی تو اسی طرح چھولے بیچ بیچ کر ان کو پالا اب جب کارخانوں کا مالک بن بیٹھا ہے تو مجھے جانے کس خانے میں پھینک ڈالا جواب یہ بھی بھول چکا ہے کہ اس کی ایک ماں بھی ہوا کرتی تھی۔"

اور میں ان کی کہانی سننے میں مگن تھی اور یہ بھی بھول چکی تھی کہ میں گلی میں قیوم کی دادی کی باتیں سننے کھڑی ہوں اور میرے ارد گرد بہت سارے بچے اکٹھے ہو چکے ہیں اور میں ان میں گھری ہوتی ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح اب قیوم کی دادی کے کسی جوہڑ میں گر کر ڈوب مرنے کی اطلاع پاتے پر خیالات میں گری ڈوبی سوچ رہی ہوں۔ معلوم نہیں بے چاری کا پاؤں پھسلا ہوگا، ان کو ٹھیک سے نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ جب پانی میں گری ہوں گی تو ہاتھ پاؤں تو مارے ہوں گے۔ چیخی ہوں گی۔ لوگوں کو مدد کے لئے پکارا بھی ہوگا۔ شہر کا علاقہ ہوتا تو آتے جاتے لوگوں میں سے کسی نہ کسی کی نظر پڑ ہی جاتی، لیکن یہ تو گاؤں ہے، شہر کے مقابلے میں رات جلد ہی پڑ تی ہے اور زیادہ خاموش اور پرسکون ہوا کرتی ہے، اور تبھی تو کسی نے اس بڑھیا کو پانی کے جوہڑ میں گرتے نہیں دیکھا۔ گاؤں میں دن بھی تو جلد ہی چڑھ آتا ہے فجر کی اذان سے بھی بہت پہلے اکثر گھروں میں چولہے گرم ہو جایا کرتے ہیں اور زندہ اور متحرک دھواں گھروں کی دیواروں سے اوپر اٹھتا اور غائب ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن قیوم کی دادی کا گھر سے ساری رات غائب رہنا کسی کو یاد نہیں رہا۔ اس بے چاری کا اپنا کوئی ایک ٹھکانہ بھی تو نہیں تھا۔ چار بیٹیوں میں سے کسی ایک بیٹی کے ہاں بھی رہنا اسے گوارا نہ تھا، جب کہ بیٹا زندہ تھا اور قالینوں کے ایک کارخانے کا مالک تھا لیکن وہ یہ بھول چکا تھا کہ اس کی ایک بوڑھی ماں بھی تھی اور اس کی بوڑھی ماں کی کچھ ضروریات بھی تھیں جو وہ چھولے بیچ بیچ کر پوری کر رہی تھیں۔

پتہ نہیں ہم ان بوڑھے بوڑھیوں کو کیوں اتنی جلدی بھول جایا کرتے ہیں شاید اس لئے کہ ہمیں سدا جوان ہی رہنا ہے اور کبھی بوڑھا نہیں ہونا۔

OO

بقیہ صفحہ ۵۵ قندیل، ٹفن اور خالی برتن

تو کوئی بھی اس سے یا اس کی بیوی سے اتنا قریب ہرگز نہ تھا کہ بے تکلف پہلی رات والی بات پوچھ سکے۔ اب کیا ہے کہ بعض لوگ یوں ہی دانشوروں کے تعلق سے بدگمانیاں پھیلاتے ہیں کہ ان کا سب کچھ دماغ کے اندر ہوتا ہے۔ اور یہ کہ آدمی ذہنی سطح پر جتنا نیچے اترتا جاتا ہے درجہ بدرجہ اس کے اندر کا آدمی بھی ذہن سے نیچے ناف کی طرف پھسلتا چلا جاتا ہے۔ کارخانۂ قدرت میں یوں بھی انتشار کی خوبصورتی ہے تو بھلا کون سی چیز ہے جو ٹھکانے پر کبھی جا سکتی ہے۔ انیس بیس کا فرق ان معاملوں میں رہتا ہی ہے۔ کیا دانشور کیا غیر دانشور اور کیا خالی خولی آدمی۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کے گلے سے خالی برتن والی ٹھن ٹھن کی آوازیں آتی ہیں تو اس میں بھی کچھ اتنی صداقت نظر نہیں آتی۔ غور کرنا پڑتا ہے بس۔ ذرا سی کوشش سے معنی نکل ہی آتے ہیں۔ مجھے تو اس کی بہت سی باتیں .....

اچانک مجھے اپنے گلے میں کچھ پھنسا پھنسا محسوس ہوا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرنا چاہا لیکن بے سود۔ مجھے لگا کہ آواز میرے اختیار سے باہر ہو گئی ہے۔ جیسے کسی نے حلق میں ٹیپ ریکارڈ فٹ کر دیا ہے۔ کہنا کچھ چاہ رہا ہوں، کہہ کچھ رہا ہوں۔ نفی کا تو سر ہی پٹ گیا ہے۔ بس ایک ہی رٹ، بار بار، وقفے وقفے سے۔

"جی ہاں جی ہاں ہاں جی ہاں جی!"

ٹفن اور قندیل والے ڈیڑھ فقیر: یہ بھی گیا OO

ف۔ س۔ اعجاز

بنا ترے کس کو راس ہے دنیا
یوں تو ہر لمحہ پاس ہے دنیا

جسم پورا کبھی نہیں ڈھکتی
کس قدر کم لباس ہے دنیا

آئینہ داریوں کے موسم میں
شیشۂ انعکاس ہے دنیا

ہم نے لکھا ہے جس کو رات کی رات
اُس کا اک اقتباس ہے دنیا

نرم تن اور کھُردرا ملبوس
درد ریشم، کپاس ہے دنیا

اے خدا امن و آشتی کے لئے
لہجۂ التماس ہے دُنیا

پھول جیسے اداس ہیں چہرے
برف جیسی اُداس ہے دنیا

رندِ مدہوش کی ہے سرمستی
آبگینوں کی پیاس ہے دنیا

اعجاز پرنٹرس، ۱۸۰۔ ذکریا اسٹریٹ کلکتہ ۳

رئیس الدین رئیس

جیب چھوٹی، ہاتھ لانبے، دل مگر خواہش زدہ
جیسے اک طائر کھلے آکاش میں بندش زدہ

کس کے مستقبل پہ یہ لکھا گذرتے وقت نے
ذہن میں ماضی پرستی جسم آسائش زدہ

کس کا سر ہے کس کے شانوں پر پتہ چلتا نہیں
آج ہر انسان ہے اس شہر میں سازش زدہ

مجھ کو میری محنتوں کا اور صلہ ملتا بھی کیا
شام نے ہاتھوں پہ میرے لکھ دیا بخشش زدہ

ہم تعلق کی زباں خاموش رکھتے ہیں مگر
لوگ اک مدت سے کہتے ہیں ہمیں رنجش زدہ

اس کے دل کا حال کن لفظوں میں لکھیں آئینے
سلب جس کی قوتِ گویائی لب جنبش زدہ

۱۰/۱۷۲۵، دہلی گیٹ، علی گڑھ

عباس دانا

قاتل کا حوصلہ بڑھے! ایسی نوید لکھ
مقتل کے در پہ اخون سے "خوش آمدید" لکھ

جو خواب پیاسے مرگئے! ان کو شہید لکھ
پھر نامراد وقت کو! ابنِ یزید لکھ

خوش ہوں! نجات پائی ہے اقیدِ حیات سے
تو میرے انتقال کو یومِ سعید لکھ

آنسو کو شہدِ جان کے پیتے ہیں گاہ گاہ
اس طرح غم نصیب مناتے ہیں عید لکھ

فنکار ہے تو! قیدِ روایات سے نکل
لکھنے کا شوق ہے تو! بہ طرزِ جدید لکھ

۵۔ فتح منزل، پرتاب نگر روڈ، بڑودہ۔
۳۹۰۰۰۴

قندیل، ٹفن اور خالی برتن

قدتحمید ● ۲۸۲ وجے اپارٹمینٹس، جیوس کالونی، سی ایس۔ٹی روڈ، کرلا (ویسٹ)، بمبئی ۷۰

شادی کے فوراً بعد اس کے تعلق سے عجیب طرح کی خبریں، افواہیں، سارے میں گشت کرتی رہیں۔ کافی دنوں تک 'وہ' بات گفتگو کا موضوع بنی رہی۔ ن زیادہ پڑھے لکھے لوگ جب اکٹھے ہوتے ہیں تو بہت زیادہ سنجیدہ موضوعات پر بہت زیادہ سنجیدہ انداز سے ہاتپ اور سگار کی زبان میں باتیں تے ہیں۔ پھر سنجیدگی سے اُکتا کر ہلکے پھلکے موضوع زیر بحث لے آتے ہیں۔ جیسے کہ اس کا معاملہ، جو بعد میں سنسنی خیز بنتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ہر روز نئی خبر ایک تازہ اضافے کے ساتھ ـــــ پورا دفتر کھلتا اور بند ہوتا رہا۔ دراصل ان لوگوں کی زد سے کوئی محفوظ نہیں۔ ہلکے پھلکے موضوع بھی ناک حد تک سنجیدہ بن جاتے ہیں۔ اب اس کے بارے میں جو بات چل پڑی تھی تو اس میں کتنی محض گاسپ تھی اور کتنی مقدار حقیقت کی تھی، یہ معلوم ادشوار ہو گیا تھا۔

' سُنا ہے وہ شادی کر رہا ہے !

کون وہ ؟ اور اب !

ہاں معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے۔

چہ میگوئیاں۔

دس برس پہلے جب وہ اس شہر پر نازل ہوا تو کتابوں کے ڈھیر میں دھنسا ہوا آدمی تھا۔ اوڑھنا بچھونا کھانا پینا سب کتابیں تھیں۔ ان سے بہت کم بولتا۔ آنکھوں سے، ہاتھ کے اشارے سے یا سر ہلا کر جواب دیتا۔

' فلاں صاحب کہاں ہیں ؟"

ایک سمت میں انگلی اٹھا دی۔

' پتہ ہے کب لوٹیں گے ؟"

نفی میں گردن ہلا دی۔

" اچھا تو چلتے ہیں۔"

بھنویں تن گئیں۔

چہ میگوئیاں۔

پھر جب ایک اجلی صبح وہ کتابوں کے انبار سے نمودار ہوا تو اس کی جھولی میں بے شمار لفظ تھے اور اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی ا۔ اپنی طویل خاموشی کا گویا ازالہ کرنے پر تل گیا تھا۔ لوگ بھونچکے حیرت زدہ آنکھیں پھاڑے اُس کو تکتے اور وہ بولتا رہتا۔ بولتا رہتا۔ دہی سوال خود ہی جواب خود ہی جواز خود ہی سبب، بے وجہ اور باوجہ ـــــ یک طرفہ ٹریفک۔ سرتا پا پوری شخصیت محض آواز خصیت۔ لفظوں کا غبار دور دور تک پھیلتا ہوا اور آواز کے بگولوں میں گھرا ہوا ایک منحنی جسم، لمبی گردن، حلقوں سے باہر جھانکتی ں سے گردش کرتی ہوئی آنکھیں ـــــ وہ بولتا رہا لوگ سنتے رہے، وہ بولتا رہا۔

اس کی جھولی کے لفظ ختم ہونے لگے۔

اس نے لفظوں کو دہرانا شروع کر دیا۔

پھر وہ کھوکھلا ہو گیا۔

- "سنا ہے حالات سنور گئے ہیں؟"
- "سنا ہے باندرے میں شاندار فلیٹ لے لیا ہے۔"
- "ٹیلی فون بھی آگیا۔"
- "اور کار بھی خرید لی ہے۔"

میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ میرے ساتھ ہر جمعرات کو نمودار ہونے والے وہ فقیر بھی —— ایک لمبے قد کا، دوسرا ٹھگنا —— اس طرح کہ وہ دونوں مل کر بھی دو نہیں صرف ڈیڑھ بنتے تھے۔ لمبے کے ہاتھ میں ایک ٹفن تھا۔ ٹفن کے اندر پتہ نہیں کیا تھا۔ جب ٹفن ہے تو ظاہر ہے کھانا ہی ہوگا۔ لیکن ڈھکن ہمیشہ مضبوطی سے بند رہنے کی وجہ سے اندر کیا ہے، معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ملی جلی خوشبوئیں بدبوئیں ٹفن کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ ٹفن کے اوپر مرادآبادی نقش کاری کے عجیب و غریب نمونے بنے ہوتے تھے۔ سر پر رکھا ہوا ہاتھ، دلاسہ دیتی آنکھیں، بیساکھیاں، الجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتی انگلیاں، استہزائیہ مسکراہٹ کے زہر میں بجھے ہوئے خمدار ہونٹ۔ ایک بے برگ و بار اور بے سایہ بڑا سا درخت ——

ٹھگنے کے ہاتھ میں ایک پرانا قندیل تھا۔ قندیل میں تیل تھا، نہ باتی اور نہ ہی اجالا —— اس کی دھوئیں سے اٹی ہوئی کالی چکٹ چمنی پر سفید چاک سے جلی حروف میں لکھا تھا "روشنی"، لیکن تحریر اتنی بجھی بجھی اتنی مدھم تھی کہ تیز بینائی والے کے لئے بھی اس کا پڑھنا دشوار تھا۔ یہ ڈیڑھ، اس کے بُرے دنوں میں قندیل اور ٹفن لے کر اس کی جھونپڑی میں جاتے تھے لیکن جب اس کے پیٹ کا کاسہ بدہضمی دفع کرنے کی گولیاں اور چورن طلب کرنے لگا تو خفا ہو گئے اور چوراہے پر آکر اس کے بارے میں ایسی ویسی باتیں کرنے لگ گئے۔ لطیفے بنانے لگے۔ ایک وہی کیا، جو بھی ان کے قندیل اور ٹفن سے بے نیاز ہوتا، اس کا یہ ڈیڑھ فقیر یہی حشر کرتے تھے۔ خیر، بات ان ڈیڑھ فقیروں کی نہیں، بات اس خاموش رہنے والے اور پھر بے تکان بولنے والے اور پھر خالی برتن کی طرح ٹھن ٹھن بجنے والے آدمی کی تھی —— لفظ ڈیڑھ عدد کا ذکر تو یوں آگیا کہ وہ بھی بہت سارے لوگوں کی طرح اس کا انتظار کر رہے تھے۔

بہت سارے لوگ، جن میں، میں بھی شامل تھا۔

پھر ایک دن میں نے کسی طرح اس کے نمبر معلوم کئے اور ملائے۔ دوسری طرف دیر تک گھنٹی بجتی رہی، ٹرنگ ٹرنگ ٹرنگ ٹرنگ، وقفے وقفے سے —— اور سارے میں گونجتی ہوئی گھنٹی کی بازگشت —— صدیاں ادھر سے ادھر ہو گئیں۔ بڑی دیر بعد کسی نے جھجکتے ہوئے ریسیور اٹھایا لیکن، کچھ بولا نہیں۔ میں نے کتنا چاہا کہ کچھ کہے، کچھ سنے، —— آخر دوست تھا وہ۔ اس کی سنگت کے کچھ لمحے تھے شریر بچوں کی طرح یادوں کی گلیوں میں بھٹکتے ہوئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ جو ہم آدمی آدمی کا دم بھرتے ہیں تو دراصل آدمی کچھ نہیں، بس کوئی وقت ہوتا ہے جو اپنے پیٹے میں لوگوں کو، چیزوں کو، باتوں کو لئے، ذہن کے کسی گوشے پر نشان چھوڑ جاتا ہے جس میں وقفے وقفے سے خارش ہوتی رہتی ہے۔ کچھ ایسی ہی بات تھی ورنہ مجھے کیا پڑی تھی فون کرنے کی۔ لیکن دوسری طرف سنّاٹے سائیں سائیں کرتے رہے اور میں نے مایوس ہو کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

لیکن مجھے اب بھی اس کا انتظار تھا۔

پھر ایک روز میں اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ دستک دی، اندر داخل ہوا تو پورا کا پورا فلیٹ خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میرے کان کسی آہٹ کو کسی چاپ کو ترستے رہے اور آنکھیں خلا میں کسی پرچھائیں کو بے سود تلاش کرتی رہیں۔ مجھے اس روز بھی مایوسی ہوئی۔

میں نے سوچا ایسے نہیں، کسی دن اچانک دھاوا بولنا چاہئے۔ اسے چوکنا کئے بغیر۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کو کسی طرح اس بات کا پتہ
جاتا ہے کہ میں اس تک آ رہا ہوں اور وہ چھپ جاتا ہے کہیں غائب ہو جاتا ہے؟ لہٰذا ایک رات میں وہاں چپکے سے گیا اس کے شاندار
ٹ کے شاندار دوہرے دروازوں پر میرے مشتاق ہاتھوں نے دستک دی ـــــ یکے بعد دیگرے دروازے وا ہوئے ـــــ
لیٹ کے اندر بے شمار ان جانے لوگوں کے بیچ گھرا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ کچھ بول رہا ہے لیکن عجیب بے لفظوں کی بولی تھی ـــ خالی
ے کی ٹھن ٹھن۔ اور اس پر بیک وقت "جی ہاں جی ہاں" کا مسلسل کورس۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس سے ملوں لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ اس بھیڑ
یلا کھڑا دیواروں کو تکتا رہا۔ عین سامنے دیوار پر آویزاں ایک بڑی پینٹنگ تھی۔ کہرآلود دلیس منظر میں گم ہوتی ہوئی آڑی ترچھی روشنی کی
یں۔ نیچے لکھا تھا "دستکیں دینے کا فن"۔ فوراً میری نظر تصویر سے پھسل کر اپنے ہاتھوں پہ پہنچ گئی اور میں نے جلدی سے دونوں
پتلون کی جیبوں میں ڈال دئے۔ اور دوسرے ہی لمحے اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس روز جو میں یہاں آیا تھا تو یہ بھیڑ اس روز بھی
طرح تھی۔ اور وہ آج ہی کی طرح ان میں گھرا ہوا تھا یا ان سب کو گھیرے ہوئے تھا۔
اب کی دفعہ نہ ملنے کی مایوسی اس پہلی والی کوشش میں ناکامی سے زیادہ شدید تھی۔ ہونی کے آگے کس کی چلتی ہے۔ میں الٹے قدموں
آیا۔
جمعرات کو چوراہے پر قندیل اور ٹفن والے ڈیڑھ فقیر کھڑے ہوتے تھے۔ ان کا انتظار تھا کہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔

"اس کی شادی ہونے والی ہے"
"اس کی جو ایسی حماقتوں پر جی کھول کر قہقہے لگاتا تھا!"
"یقین نہیں ہوتا"
"ـــــ دوستی کی حد تک تو وہ خوب ہے لیکن دروازے کے باہر والی دوستی۔ دروازے کے اندر والی دوستی کے لائق تو ہے ہی نہیں
زادہ ـــــ دوستوں کی ماں بہن کو ایسے دیکھتا ہے جیسے نظروں سے کر ڈالے گا۔ حالانکہ ہونا ہوا تا کچھ بھی نہیں اُس سے، ہیں جی"
"تو پھر یہ شادی وادی کی بات؟"

تم بھی تو بی بی حد ہو! اچھی خاصی پڑھی لکھی، دیکھنے دکھانے میں بھی بری نہیں، خود کماؤ پُوت ـــــ لیکن ہو نہ آخر لڑکی! گھر
نے کا کیڑا تم کو یوں کاٹا کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔ کس چکر میں پھنس گئیں تم ـــــ اب بھگتا کرو۔ خیر۔
بھی ابھی کچھ کہہ رہی تھیں؟ سناؤ تو کیا ہوا۔ اجی ہوتا کیا پہلی رات کو۔ جانے دیجئے کہتے شرم آتی ہے۔ نہیں کہو کہو شرمانا کیسا، سبھی
ہیں یہاں۔ ہاں تو ...
ساری رات کھڑکیوں کے پردے سرسراتے رہے۔ گیلی ہوائیں کسمساتی رہیں۔ باہر جیسے ایک دبے دبے طوفان کی سی فضا سا سے
اور اندر بیڈ روم میں ایک منقش تپائی پر کانسے کی بنی ہوئی گیان دھیان میں ڈوبے بدھ کی مورتی ـــــ اور بدھ کی مورتی
باہیں پسارے تناور برگد۔ دیوار میں شیشے کا ایک بڑا سا شوکیس اور شوکیس میں بے شمار سجی سجائی موٹی موٹی جلد والی
مادار کتابیں۔

اس کا کہنا ہے کہ وہ بالکل نہیں بدلا۔ اور مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ اس کا کہنا کچھ اتنا غلط بھی نہیں۔ اب اس میں اس کا کیا قصور
یکھنے والی آنکھیں اپنی تسلی کے بہانے ڈھونڈتی رہیں اور مختلف زاویوں سے اس کا ہیولیٰ تصویر کرتی رہیں ـــــ اور جو وہ والی بات
نا، پہلی رات والی، تو وہ بھی کچھ اتنی معتبر نہیں۔ جس شخص نے یہ بات کہی، غالباً ڈیڑھ فقیروں نے یا ان کے ہی مریدوں میں سے کسی نے،
[باقی صفحہ ۱۵ پر دیکھئے]

٥٩٩٩٩٩

مکتوبات

(آفنیٹ کا افتتاحی شمارہ ۱۹۸۵ کے متعلق)

تاثرات، تجاویز، تجزیے، دعائیے

مالک رام ——— سی - ۵۰۴، ڈیفنس کالونی نئی دہلی

شاعر کا تازہ شمارہ ملا - ماشاء اللہ بہت خوش ہو گیا - شاعر کی طویل علمی اور ادبی خدمات کے سفر میں یہ اقدام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے - کتابت، طباعت، مضامین کا تنوع - ظاہری شکل و صورت غرض ہر پہلو سے قابل فخر کارنامہ ہے - دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو تا دیر زبان و ادب اور ملک و ملت کی خدمت کی توفیق ارزاں فرمائے - (آمین)

سید نور الحسن ہاشمی ——— قطب پور، ڈالی گنج لکھنؤ

آفسیٹ کی چھپائی سے رسالے کی آب و تاب بہت بڑھ گئی ہے - سرورق بھی جاذب نظر ہے - مضامین اور منظومات بھی بہت سلیقے سے ترتیب دیئے گئے ہیں مقالات سب بصیرت افروز ہیں - مبارکباد پیش ہے -

ظ انصاری ——— ۳۲ - شیریں، تانہ دقلابہ پوسٹ آفس بمبئی ۵

تازہ شمارہ آیا - خوبصورت ہے، خوش سیرت ہے - مطبوعہ اہل بصیرت ہے - ترتیب میں جدت پائی - غزل نوازی میں شدت - انور سدید (پاکستان) نے ۱۹۸۴ء کی تحریروں تصنیفوں کا جائزہ جو دیا ہے وہ کئی دوسرے پرچوں میں چھپا ہے اور اس سے پتہ چلا کہ تقریر مقتصیر نے پورے سال لکھیاں مارنے کے سوا کچھ کیا ہی نہیں - چار انٹرنیشنل کانفرنسوں میں الگ الگ مقالوں کے علاوہ اس سال میرے ۵ مضامین نکلے - مطلب یہ کہ اپنے بارے میں آگاہی پھیلانا بھی خود ہماری ذمہ داری ٹھہری -

• جوگندر پال ——— ۴ ، ۲ مندا کنی - انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی ۱۹

شاعر کا آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ نہ صرف دیکھنے میں بے حد خوبصورت ہے بلکہ معنوی اعتبار سے بھی تم اس میں جو نئے رنگ بھر رہے ہو وہ قابل ستائش ہیں - مجھے امید ہے تمہاری انتھک کوششوں کے باعث ادب کے ٹھہرے ٹھہرے مقامات بڑے بارونق لگنے لگیں گے - خدا کرے تمہاری حوصلہ مندی کے اسباب ہوتے رہیں -

ضیا فتح آبادی ——— جے ۱۲/۵۹ راجوری گارڈن نئی دہلی

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آخر آپ نے ہری جھنڈی دکھا کر شاعر کو نئے راستے پر نئی منزل کی تلاش میں روانہ کر دیا - آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ ۱۹۸۵ء اس مبارک وقت کی یاد کو دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھے گا اور خدا نے چاہا تو وہ وقت بھی جلد آئے گا جب منزل مقصود شاعر کے قدموں میں ہوگی - میں اور میرے ساتھ ہندوستان کی تمام ادبی دنیا آپ کی کامیابی کے لئے دعا گو ہو -

مجھے یہ کہتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے کہ یہ جسے آپ عمومی افتتاحی شمارہ کہتے ہیں وہ بذات خود ایک خاص نمبر کی حیثیت کا مالک ہے - علامہ سیماب، اعجاز صدیقی، منظر صدیقی اور تاجدار احتشام صدیقی کی تصاویر سے بسم اللہ کر کے آپ نے سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے - پھر فانی، دل اور آرزو کی تحریروں سے اسے سجا کر آپ نے اس رشتے کو استوار کر لیا ہے جو شاعر کو ماضی میں ان اساتذہ سے رہا ہے - آپ چاہتے تو علامہ سیماب، اعجاز صدیقی اور منظر صدیقی کی تحریریں بھی پیش کر سکتے تھے - اعجاز صدیقی کی نظم "ترانۂ اردو" خوب ہے مگر آپ کی تجویز پر عمل کیا جائے گا یا نہیں یہ کہنا قبل از وقت ہے - "سرلی بانسری" کے تعلق سے کالیداس گپتا رضا کا مضمون معلومات افزا ہے - "تہہ خنجر" میں ادیس احمد دوراں نے جو باتیں کہی ہے وہ صداقت پر مبنی ہوتے ہوئے بھی انسان انسان میں دراڑ کو اور زیادہ وسیع کر سکتی ہے - شہریار نے پہلی غزل کے چوتھے شعر کو "کہ" بیانیہ سے شروع کر کے

بڑی جرأت مندانہ جدیدیت سے کام لیا ہے۔ پھر دوسری غزل کے آخری شعر میں "تجھ" بمعنی "تیرے" بھی بڑا لطف دے رہا ہے۔ عتیق اللہ نے مضمون ترقی پسند اُردو نگار دار غزل نہایت دیدہ ریزی سے قلمبند کیا ہے۔ کاش کہ وہ نارتش پرتا پگڈھی کو بھی کسی خانے میں رکھ پاتے اور لفظوں کی جادوگری میں اُلجھ کر نہ رہ جاتے۔ سبز سُرمئی سیاہ کے زیر نظمیں وغیرہ پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمیق حنفی دردِ دل کے بجائے دردِ زہ کا شکار رہے۔ وہ بڑے پیارے انسان اور شاعر ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں تا دیر تندرست رکھے۔ آمین۔ "فیض احمد فیض، ایوان وقت میں" اس انٹرویو کی افادیت سیاسی میدان میں ہے۔ میری ناچیز رائے میں شاعر کو فیض شاعر کا انٹرویو زیادہ مناسب و موزوں ہوتا۔ آپ کی پہلی غزل کے دوسرے شعر میں "جناب" اور تیسرے شعر میں "خاک و خون" محلِ نذر ہیں۔ اسی طرح دوسری غزل کے آخری شعر میں سلسلہ کو تیز کہنا کچھ زیادہ ہی جدّت کا حامل ہے۔ وفیات ۸۴ء۱۹ میں کچھ نام رہ گئے ہیں مثلاً بسمل حیرتی۔

بس اب تک یہی کچھ دیکھ پایا ہوں۔ میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان تمام تخلیقات میں معیار کی کوئی کمی ہے۔ اسلئے چاہونگا کہ میری بات کو اسی تناظر میں پڑھا جائے اور کسی قسم کا کوئی منفی اثر نہ لیا جائے۔

آخر میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال

عبدالقوی دسنوی ———————

شاعر کے "آنسیت کا افتتاحی شمارہ ۱۹۸۵ء" کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔

صورت، سیرت دونوں اعتبار سے نہایت پُر وقار شمارہ ہے۔ جی خوش ہوا۔ ابھی پورا رسالہ پڑھ نہیں سکا ہوں۔ صرف اُلٹ پلٹ کر ادھر اُدھر سے دیکھ سکا ہوں۔ یقین آگیا کہ انشاء اللہ آپ اور ناظر نعمان صدّیقی سلمہٗ کی محنتوں سے یہ رسالہ ترقی کی نئی سمتوں کی طرف بھی فاتحانہ بڑھے گا۔ اور ادب میں، ادبی صحافت کی تاریخ میں، نئے اور روشن نشانات چھوڑے گا۔

یہ دعویٰ بجا ہے کہ اردو کا یہ واحد ماہنامہ ہے جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں مقبول بھی ہے اور محبوب بھی ہے۔ اس کی یہ مقبولیت اور محبوبیت آپ کے بزرگوں کی محنت، ایثار اور اُردو سے لازوال محبّت کا نتیجہ ہے ——— دل کہتا ہے کہ آپ دونوں اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ اور جلد ہی یہ رسالہ عالمی شہرت حاصل کرے گا۔

اعجاز صاحب کی تصویر بار بار دیکھی اور دیر تک دیکھتا رہا۔ ہر بار نہ جانے ماضی کے کتنے اوراق نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔ اعجاز صدّیقی صاحب کتنے ہی روپ میں نظر آتے۔ شاعر کے مختصر دفتر میں کام کرتے ہوئے۔ مشاعروں میں کلام سناتے ہوئے۔ دوستوں میں اردو کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے۔ جلسوں میں اردو کے مسائل پر آوازیں بلند کرتے ہوئے۔ نوجوانوں کی ہمت افزائی کرتے ہوئے۔ جشن شاعر کی تیاریوں میں مصروف۔ کبھی سنجیدہ، کبھی رنجیدہ، کبھی فکر مند، کبھی حوصلہ مند، کبھی گفتگو میں مجسم "غزل" اور کبھی تیغ براں کی تیزی، کبھی شعلے کی لپک، کبھی مجسم للکار، کبھی ضبط و تحمل کی تصویر۔

دیر تک کھویا رہا، ماضی پر تڑپ اٹھا ——— اب ایسے لوگ کہاں جو اپنی تہذیب کے محافظ بن کر جیئیں۔ اپنی زبان کے خدمت گزار بن کر فخر کریں اور اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے وقف کر دیں۔

طویل مدّت تک شاعر کا بانکپن کے ساتھ نکلتے رہنا اسی مردِ مجاہد کا کارنامہ ہے۔ ورنہ اس دوران میں نہ جانے کتنے عاشقانِ اردو، ادبی صحافت کے میدان میں اپنے نئے رسائل کو فضاؤں میں لہراتے ہوئے اترے لیکن بہت دنوں تک وہ اس میدان میں ناسازگار حالات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ آخرکار ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور پھر ان کا نام و نشان ایسا مٹا کہ پھر دُور دُور تک اس کا اتا پتا نہ چلا۔

تاجدار احتشام کی تصویر نے بھی بہت سے زخم ہرے کر دیئے۔ اس خلوص کے پیکر کو کھونے کا ہمیں آج تک ملال ہے۔ وہ دوستوں میں اچھے دوست، خوردوں میں مشفق محترم، بزرگوں میں باادب مجسم نظر آتے تھے۔ جہاں بیٹھ گئے گھنٹوں کے لئے مجلس جما دی۔ مختلف موضوعات سے متعلق گفتگو چھڑ جاتی، بات سے بات نکلتی چلی جاتی، لیکن گفتگو کا آخری سرا "شاعر" کی زندگی اور اس کی بہتری کی فکر سے جا ملتا۔ "شاعر" کے لئے یہ کرنا ہے، شاعر کے لئے وہ کرنا ہے۔ اس کے لئے ایک اچھے دفتر کی ضرورت ہے۔ اس کا اپنا پریس ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ اشاعتی پروگرام پر بھی

روشنی ڈالی جاتی۔ اس تصویر کے ساتھ اُن کی بہت سی باتیں یاد آئیں۔ اور تڑپا گئیں۔ تازہ شاعر میں ان کی تحریر دیکھی تو ان کے خطوط کی تر و تازگی اور شگفتگی کی یاد آئی۔ واقعی وہ بڑے اچھے خط نگار تھے۔ اگر کوئی صورت پیدا ہو جائے تو ان کے خطوط ضرور شائع کیجئے۔

آج ہمّت کر کے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ایک شمارہ "اعجاز صدّیقی" نمبر کے لئے مخصوص کیجئے۔ ان کی وفات کو سات سال گزر گئے اور اب تک کوئی نمبر پیش نہیں کیا جا سکا۔

گوپی چند نارنگ ———— ڈی۔ ۲۵۲ سروودیئے انکلیو نئی دہلی

شاعر کا تازہ شمارہ ملا۔ دیکھ کر مسرّت ہوئی۔ شاعر کو آفسیٹ پر لانے کے لئے مبارک باد قبول کیجئے۔ وقت کی رفتار کا ساتھ دینے کیلئے یہ ضروری بھی تھا۔ خاص طور پر ایک ایسے ادبی جریدے کے لئے جو ۵۶ سال سے اردو کی خدمت کر رہا ہے، جس نے ہر موڑ پر صالح ادبی اقدار کا ساتھ دیا ہے، اور ادب میں تازہ خون کی اہمیت پر اصرار کیا ہے۔ شاعر کو ایک نمائندہ ادبی رسالہ بنانے کے لئے آپ شب و روز جو سعی کر رہے ہیں، تازہ شمارہ اس کا آئینہ دار ہے۔ علّامہ سیماب کی تصویریں، اعجاز صدیقی کا ترانۂ اردو، عکسی تحریریں اور کالیداس گپتا رضا کا "سریلی بانسری کا آخری تصحیح شدہ نسخہ" بے حد اہم ہیں۔ تخلیقی حصّہ بھی خاص نمبر کے شایانِ شان ہے۔ ابھی ابھی سریندر پرکاش کی کہانی جمنوۂ الفیم! پڑھی ہے۔ کیا بے پناہ کہانی ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کو آسانی سے ہضم نہیں ہو گی۔ سریندر کا فنی ارتقاء ابھی جاری ہے۔ شاعر کی نئی تاریخی اشاعت پر اپنے تمام رفقاء کو بھی میری طرف سے مبارک باد دیجئے۔

یوسف ناظم ———— ۱۹- نیو دیپ، پلاٹ نمبر ۱۱۳ باندرہ ریکلیمیشن باندرہ ممبئی ۵۰

تازہ "شاعر" مل گیا۔ وہ تو ملنا ہی تھا کیونکہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن "شاعر" ناغہ نہیں ہو سکتا۔ دیر ضرور ہوئی لیکن سجنے سجانے میں اتنی دیر تو ہونی ہی چاہیئے۔ ۵۶ سال کی عمر میں شاعر کے یہ ٹھاٹ باٹ۔ لیتھو سے آفسیٹ ایک بڑی تبدیلی ہے۔ گو کہ آفسیٹ پر کسی پرچے کا چھپنا اِن دنوں کوئی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ نہیں لیکن تبدیلی تو بہر حال ہے۔ یہ ایسی ہی تبدیلی ہے جیسے میٹر گیج کو براڈ گیج میں بدلا جاتے۔ کافی انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ اچھا خاصا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ میں چونکہ مرہٹواڑہ کا ہوں اس لئے مجھے اندازہ ہے کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ بہر حال مبارک ہو۔ آفسیٹ اصل میں خلعت شاہی ہے۔ شاعر میں سب خوبیاں تھیں بس ایک آفسیٹ کی کمی تھی۔ اب ذرا جمالیات پر زیادہ توجہ دیجئے مطلب یہ کہ کاغذ بھی ذرا دبیز استعمال کیجئے۔ (لحاف کی طرح نہیں) میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے آنکھوں کا سب سے اچھا علاج مطالعہ ہے۔ تلاوت کے لئے مطالعے ہی کا درجہ ہے اور وہ بھی اردو کتابوں کا مطالعہ بشرطیکہ وہ آفسیٹ پر اور روشن مجلّا کاغذ پر چھپی ہوں۔

اندر بھی کافی تبدیلیاں نظر آئیں۔ عتیق اللہ کا مضمون بے حد دلچسپ ہے اور میں سمجھتا ہوں انھوں نے رائے کے اظہار میں تامّل یا تکلّف سے کام نہیں لیا۔ نوری نستعلیق بھی بڑا کار آمد، مفید اور منفعت بخش مضمون ہے۔ ابھی تو پورا پرچہ پڑھنا ہے۔ خبروں اور مقالات کا حصّہ ضروری تھا۔ پاکستانی ادب سے متعلق مضامین البتہ میں نے پڑھے۔ انور سدید، ان دنوں ایسا معلوم ہوتا ہے پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں چھپ رہے ہیں۔ ہندوستانی ادب کا جائزہ لینا بڑا مشکل اور جان لیوا کام ہے۔ اس پر انھوں نے ہاتھ ڈالا۔ کمال کیا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ہمارے ہاں اردو ادب کے بارے میں انگریزی اخباروں میں تنقیدی مضامین چھپ جاتے ہیں۔ یہ گمراہ کن ہوتے ہیں۔ بجز اس کے کہ کوئی اردو دان انھیں لکھے۔

روزنامہ "جنگ" لاہور کے جمعہ ایڈیشن کی عکسی تحریریں چھاپ کر آپ نے پتہ نہیں ہمارے روزناموں کو متنبہ کیا ہے یا متوجہ۔ بہر حال جس نیت سے آپ نے یہ کام کیا اچھا کیا۔

آغا رشید مرزا کے انتقال کی خبر آپ ہی کے رسالے سے ملی۔ خدا مغفرت کرے۔ مجھے بھی ان سے نیاز حاصل تھا۔ اور خط و کتابت بھی تھی۔ جنوری ہی میں ان کا آخری خط موصول ہوا تھا۔ انھوں نے شگوفہ کے ہندوستانی مزاح نمبر کے تعلق سے کئی باتیں لکھی تھیں۔ حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد۔

جی چاہتا ہے آپ کے پرچے پر تبصرہ کر دوں۔ کر دوں ؟

شمس الرحمٰن فاروقی ______ ۸۵/II ڈی کا کانگر نئی دہلی

"شاعر" کا نیا روپ رنگ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خدا مبارک کرے۔ مشمولات کا معیار بھی غنیمت ہے۔ بعض چیزیں بہت اچھی ہیں۔

عمیق حنفی ______ اے - ۲۲۳ پنڈارہ روڈ نئی دہلی

"شاعر" کا آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ موصول ہوا۔ شاعر کو اس نئے لباس میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مبارک ہو۔
آپ نے میرے اتنے رشحاتِ قلم ایک ساتھ شائع کر دیئے۔
"سبز سرمئی سیاہ" کے مشمولات بس آپ کا خط آتے ہی بھیج دیئے تھے۔ بعض اصلاحیں نقل کرتے ہوئے کر نہ سکا تھا۔ مثلاً

) کا پہلا مصرع
کشاں کشاں نفسِ شیشہ گراں یوں نہ گذر (ص ۸۲)

) دوسرا مصرع
دنیا ہی مجھے گمنامی میں مرنے کا موقع بھی دے گی (ص ۸۲)

) پانچواں اور چھٹا مصرع
لکیر تھی کہ بال
داہنے سے بائیں اس کی چال
اور اس کے فوراً بعد یہ مصرع تھا جو نقل نہ ہوا، ہونا چاہیے تھا
بغیر حرف و لفظ کہہ رہی تھی دل کا حال (ص ۸۴)

) آخری شعر کا پہلا مصرع
کب تک عمیق اسپتال میں تم پڑے رہو گے (ص ۸۴)

) تیسرے شعر کا دوسرا مصرع
وہ سنگ ریزہ ہے حرفِ وفا فقط میں ہوں (ص ۸۵)

) مطلع کا دوسرا مصرع
بیانِ غم سے تسلی ملے ملے تو سہی (ص ۸۵)

قارئین "شاعر" سے گزارش ہے کہ اپنے اپنے شمارے میں یہ تصحیحات نقل فرمالیں، ورنہ خواہ مخواہ زبان و بیان اور وزن و آہنگ کی ان خامیوں
؛ مجھے بار بار شرمندہ ہونا پڑے گا۔ ان خامیوں کا ذمہ دار میں ہوں۔ قارئین سے معذرت کے ساتھ۔

بشر نواز ______

شاعر کا آفسیٹ افتتاحی شمارہ تم لوگوں کے عزائم اور سلیقے کا آئینہ دار ہے۔ پرچہ خوبصورت بھی ہے اور بھاری بھرکم بھی۔
فیض صاحب کا انٹرویو گو بکھرا بکھرا ہے تاہم اس سے فیض صاحب کی زندگی کے کچھ گوشے اور پاکستانی سیاست کے کچھ پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔
بنگلہ دیش اور پاکستان میں اردو کے تعلق سے اچھا خاصا مواد فراہم کر دیا ہے تم لوگوں نے۔
"نایاب تحریریں" کا سلسلہ اگر آئندہ بھی جاری رہ سکے تو اچھا ہوگا۔ البتہ عکسِ تحریر ذرا زیادہ واضح ہونا چاہیے اکثر شعر پڑھے نہیں جاتے۔
عتیق احمد اور عتیق اللہ کے مضامین کچھ اختلافات کے باوجود پڑھنے لائق ہیں۔ عتیق اللہ کا مضمون کسی طویل مضمون کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔
"۱۹۸۴ء ایک باب" کے تحت تم نے اچھی خاصی ڈائری مرتب کر دی ہے۔ کام محنت کا ہے لیکن وقت ضرورت بہت کام آ سکتا ہے۔
میرا خیال ہے کہ یہ سب عنوانات نئے ہیں انھیں مستقل بنا سکو تو شاعر کی اہمیت اور بڑھ جائے گی کہ یہ چیزیں تحقیق و تنقید میں مددگار ہوتی ہیں۔
نظمیں، غزلیں اور افسانہ حسبِ دستور ہیں۔

(باقی صفحہ ۶۳ پر دیکھئے)

رفتار ـــــــــ علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

○ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام فخرالدین علی احمد میموریل لکچر جو ۶ اپریل ۱۹۸۵ء کو ایوانِ غالب میں منعقد ہوا تھا پروفیسر آل احمد سرورؔ نے "اردو اور ہندوستانی تہذیب" کے موضوع پر اپنا عالمانہ لکچر دیتے ہوئے کئی اہم باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ "اردو کا رسم الخط بدلنے کے معنی ہیں اردو زبان وادب کے سارے سرمائے سے بیگانگی۔ ہماری سطحی سیاست نے اردو کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔"

مقالے کے اختتام پر صدرِ جلسہ جناب آنند نرائن ملاؔ نے کہا کہ "آج کا موضوع میرے نزدیک دو ٹکڑوں میں ہے: اردو اور ہندوستانی تہذیب۔ اس میں ایک ٹکڑا زائد ہے، میرے نظریئے کے مطابق اردو اور ہندوستانی تہذیب ایک ہی چیز ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے لئے اردو ویسی ہی ضروری ہے جیسے کسی اور چیز کے لئے زندگی کی ضرورت ہے۔ آج اردو زبان کے تحفظ کا خیال پہلے کرنا چاہئے اور اردو ادب کے تحفظ کا خیال بعد میں۔ اگر زبان کا تحفظ نہ ہوا تو ادب کا تحفظ کیا ہوگا۔ وہی زبان رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے جس کا عوام سے رشتہ ہے۔ اگر عوام سے رشتہ مضبوط نہیں تو وہ زبان سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔"

○ ندوۃ العلماء میں ۱۰ اور ۱۱ اپریل ۱۹۸۵ء کو ایک سیمینار منعقد ہوا جس کا موضوع تھا "اسلامی ادب میں تنقید نگاری"، "اسلامی ادب میں سوانح نگاری" اور "اسلامی ادب میں قصّے اور افسانے"۔ اس اہم سیمینار میں ہندوستان کی جامعات علی گڑھ، عثمانیہ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، جامعہ لکھنؤ اور دارالمصنّفین کے نمائندوں نے شرکت کی۔ حضرت مولانا ابوالحسن ندوی صاحب نے جلسے کی صدارت کی۔ موصوف نے اپنے صدارتی خطبے میں اسلامی ادب کو واضح کیا، انھوں نے ادب کو ایک زندہ حقیقت قرار دیا۔ جناب سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنّفین نے اپنی تقریر میں دارالمصنّفین کی خدمات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ "شبلی اکاڈمی" نے ادب یا سوانح اور تاریخ نویسی کے ذریعہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے مغربی تنقید نگاری کے ارتقاء کا جائزہ لیا اور مغربی ادب میں عصرِ جدید میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر سیّد راشد ندوی نے عربی زبان میں تنقید نگاری کے مختلف ادوار کے خصائص بیان کئے۔ ڈاکٹر سیّد ابراہیم ندوی کے مقالے کا عنوان تھا "النقد الاسلام"، جس میں عرب نقادوں پر مغرب کی تقلید کرنے پر نکتہ چینی کی گئی۔ تنقید نگاری کے موضوع پر جناب عبداللہ کوثی نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ جناب ضیاء الدین اصلاحی نے "اسلامی ادب میں سوانح نگاری" کے موضوع پر اپنا مقالہ سنایا۔

سیّد حامد صاحب (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے مدارس اسلامیہ خاص طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمات کی ستائش کی اور اس بات پر زور دیا کہ ان مدارس کو اپنے طریقۂ تعلیم میں مناسب تبدیلی کرنی چاہئے تاکہ یہ مدارس مسلمانوں کی ترقی میں اہم رول ادا کر سکیں۔

مولانا ابوالعرفان صاحب اور سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اہم مباحث میں حصّہ لیا جبکہ مولوی عبدالنور صاحب نے جلسے کی نظامت کی۔

○ ۲۷ اپریل غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتّب کردہ کتاب "غالب کے خطوط" پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر سروپ سنگھ نے کی اور کلیدی مقالہ ڈاکٹر کامل قریشی نے پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے پہلی بار خطوطِ غالب تاریخی ترتیب کے ساتھ جدید سائنٹفک انداز میں مرتّب کیا ہے جو آسان کام نہیں تھا۔ ہر مکتوب الیہ کے بارے میں معلومات، خطوں میں مذکورہ بعض واقعات، مقامات، شخصیات پر جو حواشی لکھے ہیں ان میں بھی کم جگر کاوی نہیں کی گئی۔ کتاب کا مقدمہ بھی خاصے کی چیز ہے اور اپنے طرزِ تحریر میں دلّی کے دبستانِ نثر

کی تمام اچھی خصوصیات کا حامل ہے۔ کامل قریشی کے مقالے کے بعد صدّیق الرحمٰن قدوائی، سیّد ضمیر حسن دہلوی، گوپال متّل، فہمیدہ بیگم، ارتضیٰ کریم اور شہاب جعفری نے "غالب کے خطوط" پر اظہارِ خیال کیا۔ جلسے کا اختتام صاحبِ صدر سردپ سنگھ کی تقریر پر ہوا۔

○ ۲۹ / اپریل اردو صحافت کی ۱۶۲ ویں سالگرہ کے موقع پر منعقدہ تقریب میں "آل انڈیا اردو پریس سوسائٹی" کا قیام عمل میں آیا۔ اس تقریب کی صدارت مشہور صحافی اور ادیب جناب جی۔ ڈی چندن نے کی۔ اس نئی سوسائٹی کا مقصد اردو صحافت کی پیشہ ورانہ اصلاح و ترقی ہوگا۔

اس تقریب کا اہتمام جشنِ اردو صحافت کمیٹی نے کیا۔ تقریب میں اعلان کیا گیا کہ سوسائٹی کی توسیع و ترقی کے لئے ایک ایڈہاک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے جو ملک کی دوسری ریاستوں کے صحافتی حلقوں سے رابطہ قائم کرے گی۔ اور سوسائٹی کے لائحہ عمل کے لئے ان کا اشتراک اور تعاون حاصل کرے گی۔ بزرگ صحافی حیات اللہ انصاری اس کمیٹی کے صدر ہوں گے۔ سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں جو چند امور شامل ہیں وہ یہ ہیں (۱) اردو اخبارات کے لئے اردو ہی میں کام کرنے والی ایک نیوز ایجنسی قائم کی جائے جس کے پاس اپنے ٹیلی پرنٹر ہوں (۲) اردو طباعت کی ٹکنالوجی میں اصلاح و جدید کاری کی جائے (۳) اردو صحافت کی درس و تعلیم کے لئے درس گاہیں قائم کی جائیں (۴) اردو ورکنگ جرنلسٹوں کے مسائل کا جائزہ لیا جائے اور ان کے مجموعی مفاد کی بہتری کے لئے تدبیریں کی جائیں۔

○ ۷/ مئی۔ بمبئی کے پریس کلب میں ایک ثقافتی تنظیم "ہریٹیج" کے زیرِ اہتمام حضرت امیر خسرو کی ۷۵۰ ویں سالگرہ کے موقع پر اس عظیم صوفی، شاعر، موسیقار اور فلسفی کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت مہاراشٹرا کے سابق وزیر ڈاکٹر رفیق زکریا نے کی۔ اس موقع پر مقررین میں ڈاکٹر ظ انصاری، موسیقار نوشاد، ایف ٹی خوراکی والا اور ایس۔ بی۔ کوتے وغیرہ شامل تھے۔

اس موقع پر خصوصی طور سے تیار کئے ہوئے دو کیسٹوں کا اجرا۔ ڈاکٹر رفیق زکریا کے ہاتھوں انجام پایا۔ ان کیسٹوں کو ڈاکٹر ظ انصاری نے اپنی بیس سال کی محنت، مطالعہ اور زرِ کثیر کے خرچ سے تیار کیا ہے جن میں انھوں نے امیر خسرو کے تخلیق کردہ گیتوں کو پانچ زبانوں میں پیش کیا ہے اور امیر خسرو کے دور کی دہلی کے معاشرتی اور سیاسی حالات کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ ۹۰ منٹ کے ان دو کیسٹوں میں ۷۰، ۷۵ سال کے طویل عرصے کو جس میں سیاسی اتھل پتھل، سماجی تبدیلیوں اور مختلف تہذیبوں کے سالقہ کا عمل اپنے شباب پر معلوم ہوتا ہے اس طرح کہ حضرت امیر خسرو کی ہمہ جہت شخصیت کے تمام خوبصورت رنگ ایک اکائی بنانے کے باوجود اپنی الگ الگ انفرادیت بھی بنائے رکھیں۔ ساتھ ہی پانچ ملکوں سے چھان پھٹک کر جمع کی ہوئی وہ موسیقی بھی جس کا رشتہ آج تک امیر خسرو سے چلا آتا ہے۔

دوسرا کیسٹ ۶۰ منٹ کا ہے جس میں ہندوستان، پاکستان، افغانستان، ایران اور سوویت ایشیا کے باکمالوں نے اپنا ہنر پیش کیا ہے اس میں خسرو کی ہندوی، فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ سنگیت کا رس بھی ہے اور ڈاکٹر ظ انصاری کی دل کو چھو لینے والی نرم و گرم کامینٹری۔ ان دونوں کیسٹ کی قیمت ۷۵ روپے ہے۔

انعامات واعزازات

○ لکھنؤ۔ ۱/ اپریل۔ اتر پردیش اردو اکادمی کی مجلسِ انتظامیہ نے سال ۱۹۸۴ء میں شائع شدہ اردو کتابوں پر تقریباً ایک لاکھ بیالیس ہزار روپئے کے مختلف انعامات دینے کا فیصلہ کیا۔ مذکورہ بالا رقم میں کتابوں کے علاوہ کاتبوں اور ناشر کے انعامات بھی شامل ہیں۔

اتر پردیش اردو اکادمی نے اس سال مجموعی ادبی خدمات کے سلسلے میں دس دس ہزار روپے کے دو خصوصی انعامات کے علاوہ اردو کی نمایاں خدمات کے لئے بھی ایک نیا انعام دینا طے کیا ہے۔

اس سال دس دس ہزار روپے کے دو انعامات۔ تین ہزار روپے کا ایک خصوصی انعام۔ تین تین ہزار روپے کے چار انعامات۔ دو دو ہزار

روپئے کے ۹ انعامات۔ ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپئے کے ۱۶ انعامات۔ ایک ایک ہزار روپئے کے ۳۵ انعامات۔ سات سو پچاس روپئے کے ۲۷ انعامات مجموعی طور پر دیئے گئے۔

۲۹ / اپریل۔ دلی اردو اکاڈمی کے سالانہ ایوارڈ برائے ۱۹۸۴ء ایوان غالب میں منعقدہ ایک جلسے میں اردو مصنفین کو دیئے گئے۔ اس تقریب کی صدارت دلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب ایم ایم کے دلی نے کی اور ایوارڈ بھی تقسیم کئے۔ خصوصی ایوارڈ جو دس ہزار روپے نقد ایک شال، شیلڈ اور توصیف نامے پر مشتمل تھا، مشہور صحافی اور افسانہ نگار جناب خواجہ احمد عباس کو پیش کیا گیا۔ باقی تین ایوارڈ جو پانچ پانچ ہزار روپے شال، شیلڈ اور توصیف نامے پر مشتمل تھے، صحافتی خدمات کے لئے رسالہ دین دنیا کے ایڈیٹر شوکت علی فہمی۔ تنقید و تحقیق میں نمایاں کارکردگی کے لئے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کو اور شاعری کے لئے جناب گلزار دہلوی کو پیش کئے گئے۔

مجموعی خدمات پر مذکورہ بالا چار ایوارڈز کے علاوہ ۱۴ کتابوں پر بھی انعامات دیئے جانے کا اعلان کیا گیا۔ ان انعامات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

تلامذۂ غالب، مالک رام، دو ہزار روپئے ○ تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر شارب ردولوی، دو ہزار روپے ○ شرار نغمہ، گوپال متل دو ہزار روپے ○ کتب خانہ داری، شہاب الدین انصاری، دو ہزار روپے ○ آتی گونج، قیصر زیدی، دو ہزار روپے ○ زوال شب کا منظر، کمار پاشی، دو ہزار روپے ○ جھوٹے وعدے سچے وعدے، علی باقر، دو ہزار روپے ○ بے شنکر پرشاد، ڈاکٹر حنیف کیفی دو ہزار روپے ○ محمد مجیب حیات اور خدمات، ڈاکٹر صادقہ ذکی، دو ہزار روپے ○ اردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء، ممتاز فاخرہ دو ہزار روپے ○ آواز دل، جولیس نحیف دہلوی، ایک ہزار روپے ○ دہلی کی چند تاریخی عمارتیں، زہرہ مشیر، ایک ہزار روپے ○ سنہری آنچ، واجدہ سحری، ایک ہزار روپے، ○ آفاقیات، ناشر نقوی، ایک ہزار روپے ○

دو ناشرین، مکتبہ پیام تعلیم اور انڈو پرشین سوسائٹی کو ان کی اشاعتی خدمات پر دو دو ہزار کے انعام کا اعلان کیا گیا۔

مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے اپنے ریاستی اور کل ہند بڑے پیمانے پر دو بڑے انعامات برائے ۱۹۸۴ء کا اعلان کر دیا ہے۔ کل بنگال ملیح آبادی ایوارڈ ۱۹۸۴ء مبلغ دس ہزار روپے، ڈاکٹر ظفر اوگانوی کو دیا گیا۔ اس سے قبل یہ ایوارڈ جناب ابراہیم ہوش، جناب لطیف الرحمٰن، جناب اعجاز افضل اور جناب سالک لکھنوی کو دیا گیا تھا۔

کل ہند پر دیز شاہدی ایوارڈ، برائے ۱۹۸۴ء مبلغ دس ہزار روپے ڈاکٹر خلیق انجم کو دینے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے قبل محترمہ قرۃ العین حیدر، جناب قاضی عبدالودود، جناب ظ انصاری اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو مذکورہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مغربی بنگال گورنر اردو خطاطی ایوارڈ برائے ۱۹۸۴ء (پانچ ہزار روپے کے) کے لئے ملک کے مختلف حصوں سے ۱۴ حضرات کی جانب سے ۲۷ نمونے موصول ہوئے۔ ملک کے نامور خطاط جناب خلیق ٹونکی نے جج کی حیثیت سے اکاڈمی کی دعوت پر خاص طور سے دہلی سے تشریف لائے اور پانچ ججوں کی مشتمل کمیٹی نے نمونوں کی جانچ کے بعد مندرجہ ذیل حضرات کے نمونوں کو مذکورہ ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ (۱) جناب عبدالرحمٰن ساجد اعظمی معرفت مدرسہ عربیہ امدادیہ مراد آباد (یوپی) (۲) جناب منشی عبدالمجید ۱۸۔ نیل مادھو سین تھرڈ لین کلکتہ۔ پانچ ہزار روپے کی رقم ان دو حضرات میں مساوی تقسیم کر دی گئی۔

وفیات

قیصر اندوری

اندور کے ممتاز شاعر اور مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کے ممبر جناب قیصر اندوری کا ۱۹/ مارچ ۱۹۸۵ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال

نیر صاحب ۱۹۰۴ء میں اندور میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدا میں ماہر کانپوری اور پھر واثق ٹونکی مرحوم سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔

عبداللہ فاروقی

رسالہ خاتونِ مشرق کے بانی ایڈیٹر اور ہندوستان کی جنگ آزادی کے پرانے سپاہی جناب عبداللہ فاروقی انتقال کر گئے۔ ان کی موت نہایت ہی دردناک حالت میں واقع ہوئی۔ مرحوم کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ انتقال سے ایک روز قبل وہ گھر سے نکلے اور واپس نہ لوٹے۔ دوسرے دن ان کا بے روح جسم مولانا ابوالکلام آزاد کے مزار کے پاس ملا۔ پولس نے لاوارث لاش سمجھ کر اوقاف کے سپرد کر دی اور اوقاف والوں نے متعلقین کے علم میں لائے بغیر تجہیز و تکفین کی رسم ادا کر دی۔

فاروقی صاحب ایک کہنہ مشق صحافی تھے۔ ان کا دل ملک و قوم کے درد سے معمور تھا۔ خصوصاً عورتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیم و تربیت سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی جو رسالہ "خاتونِ مشرق" کے اجراء کا سبب بنی۔ یہ رسالہ خواتین میں بے حد مقبول ہے جو اب فاروقی صاحب کے صاحبزادوں کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔

محمد شمس الدین تاباں

حیدرآباد کے بزرگ شاعر جناب شمس الدین تاباں کا ۱۰ اپریل کو دن کے ڈیڑھ بجے ۶۲ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم دو سال سے پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا تھے۔ آپ حضرت صفی اورنگ آبادی کے ممتاز شاگردوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ موصوف چار دہے تک اپنی شاعری سے زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ایک شعری مجموعہ "زنجیرِ دز نار" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

کتب و رسائل

ڈاکٹر سید حامد حسین کا تازہ مجموعہ مضامین "نثر اور اندازِ نثر" جو نثر کی تعریف و تاریخ کے علاوہ نثری اصناف اور اہم نثر نگاروں پر تحریر ۲ مقالوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوتی ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر حامد حسین کی جو کتابیں سامنے آئی ہیں ان میں "اردو شاعری میں تلمیحات و مصطلحات"، "اردو ترجمہ اسرارِ خودی" اور "تحقیق و حاصلِ تحقیق" قابلِ ذکر ہیں۔

●

"پسِ پردۂ شب"، اور "صورتِ حال" کے بعد حسین الحق کی دو نئی کتابیں "بارش میں گھرا مکان" (افسانوی انتخاب) اور "گم شدہ استعارے" (دو ناولٹ) ان کتابوں کو قاضی علی حق اکاڈمی، آمڈاری ہاؤس، شاہ بارون، سہسرام (بہار) سے منگوایا جا سکتا ہے۔

●

فاران نیوز ایجنسی کی پیش کش اخبار نرالی دنیا اردو اور پنجابی ایڈیشن جلد منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ مالیر کوٹلہ سے شائع ہونے والا تحریک اسلامی کا اولین اخبار ہے۔ اردو ایڈیشن پنجاب کے مسلمانوں کی آواز ہوگا۔ پنجابی ایڈیشن پنجابی مسلمانوں کے لئے دعوتِ فکر ہوگا۔ شرح چندہ۔ سالانہ ۲۴ ششماہی ۱۲ روپے اور فی کاپی ایک روپیہ۔ پتہ۔ نرالی دنیا (اردو پنجابی) ۶/ ۲۱۶۸ ملکو مالیر کوٹلہ ۱۴۸۰۲۳ (پنجاب)

●

جدید فکری رجحان کے سنجیدہ شاعر فرحت قادری کا دوسرا مجموعۂ کلام "شیشے اور پتھر" آفسیٹ کی خوبصورت طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آگیا ہے۔ صفحات۔ ۱۴۴، قیمت ۲۰ روپے۔ پتہ ظفر بک ڈپو جی بی روڈ گیا (بہار)

مشہور شاعر بدیع الزماں خاور کا نیا شعری مجموعہ "مراٹھی رنگ" شائع ہوگیا ہے۔ یہ خوبصورت شعری مجموعہ مراٹھی نظموں کے اردو تراجم پر مشتمل ہے اور اسے موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے معیاری طباعت کے ساتھ ڈیمائی سائز میں شائع کیا ہے۔ پتہ "مرکز ادب" ایف ۹۴۳ نزد مارکیٹ۔ پی او داپولی ۴۱۵۷۱۲ ضلع رتناگیری (مہاراشٹر)

●

آٹھویں دہائی کے منفرد اور نمائندہ افسانہ نگار ابنِ کنول کے افسانوں کا انتخاب "تیسری دنیا کے لوگ" قیمت ۲۰ روپے۔ پتہ کنول پبلی کیشنز، ۷ بی۔ بٹلہ ہاؤس جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

●

منیر سیفی کا شعری مجموعہ "اجنبی صدا"، منظرِ عام پر آگیا ہے۔ ڈیمائی سائز میں نہایت عمدہ سفید چکنے کاغذ پر۔ صفحات ۸۰، مجلد بمعہ دو رنگہ گرد پوش، قیمت ۲۰ روپے۔ رابطہ۔ سیّد امان اللہ، ۶، سرکلر روڈ پٹنہ ۸۰۰۰۰۱ (بہار)

●

نوجوان اور حساس افسانہ نگار سیّد احمد قادری کا خوبصورت اور اہم افسانوی مجموعہ "ریزہ ریزہ خواب"، آفسیٹ کی طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آگیا ہے۔ صفحات ۱۵۲ (ڈیمائی) قیمت ۲۵ روپے۔ اسی طرح اردو تنقید میں دستک دینے والے نئے ناقد سیّد احمد قادری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "فن اور فن کار" بھی شائع ہوگیا ہے۔ صفحات ۱۶۰ (ڈیمائی) قیمت ۲۵ روپے۔ یہ دونوں کتابیں مکتبہ غوثیہ، نیو کریم گنج گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار) سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

●

اندازے کا آئندہ شمارہ "پاکستانی کتب نمبر"، کی شکل میں ملاحظہ کیجئے، جس میں زیادہ تر پاکستانی کتب پر بے باک اور غیر جانب دارانہ تبصرے پیش کئے جائیں گے۔ پاکستان کے جن مبصرین کے تبصرے اس خصوصی شمارے کی زینت بن رہے ہیں، ان میں پروفیسر ممتاز حسین، مشفق خواجہ، نظیر صدیقی، محمد علی صدیقی، علی حیدر ملک، مظفر علی سیّد، شہزاد منظر اور کچھ دوسرے۔ ہندوستانی تبصرہ نگاروں میں پروفیسر سیّد محمد عقیل، اوپندر ناتھ اشک، ڈاکٹر محمود الحسن رضوی، علی احمد فاطمی، فخر الکریم اور رفیع اللہ وغیرہ۔ تنقیدی مضامین، بات چیت اور ایک خصوصی پیش کش کے ساتھ یہ شمارہ گزشتہ روایت سے انحراف کرتا ہوا نئی شکل و صورت اور ضخامت کے ساتھ بہت جلد منظرِ عام پر آرہا ہے۔ نگراں: سیّد محمد عقیل۔ ایڈیٹر: علی احمد فاطمی
پتہ:۔ انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز، ڈیویژن ۲۷۲ چک الہ آباد۔

بقیہ مکتوبات صفحہ ۵۹

پرچے کی ترتیب و تزئین سے سلیقہ شعاری کا اظہار ہوتا ہے۔

بہر حال یہ پرچہ کئی اعتبار سے اہم اور محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ میری طرف سے اس کامیاب شمارے کی مبارک باد قبول کریں

فہمیدہ بیگم ـــــــــــــ ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ، ویسٹ بلاک، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔

شاعر مطالعے میں رہتا ہے۔ نیا شمارہ جو آفسیٹ پر شائع ہوا ہے وہ بھی میں نے دیکھا ہے جو دلکش، دیدہ زیب اور معیاری ہے۔ اور ادب کی کساد بازاری کے دور میں آپ کے یہ حوصلے و عزائم قابلِ مبارکباد ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شاعر اپنی عظیم الشان روایات کو قائم رکھے گا اور روز افزوں ترقی کرتا رہے گا۔

شاعر نے اپنی عمر کے ۵۶ سال مکمل کر لئے ہیں جو خود ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ مرحوم سیماب اکبرآبادی اور مرحوم اعجاز صدیقی جیسے نام اس رسالے سے وابستہ رہے ہیں۔ ان مشاہیر کی قربانیوں کے نتیجہ میں یہ رسالہ وجود میں آیا۔ آپ کی یہ خواہش کہ رسالہ اپنی عمر کے سو سال پورے کرے ضرور پوری ہوگی۔ میری دعا ہے کہ شاعر کا جشن صدی آپ اپنی نگرانی میں منائیں۔

پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر نعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھاکر دوار، بمبئی ۲ میں چھپوا کر [illegible] سے شائع کیا

بمبئی

جلد ۔ ۵۶

شمارہ

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

SUPER
Vasmol
33

تیز اثر سوپر
وسمول ۳۳

● سفید بالوں کو شرطیہ تین دن میں قدرتی سیاہ بناتا ہے۔
● سوپر وسمول ۳۳ سائنٹفک طریقوں سے تیار کردہ چکنائی سے پاک بالوں کا تیل ہے جو سفید بالوں کو قدرتی سیاہی بخشتا ہے۔

ہائیجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۴۰۰۰۰۱
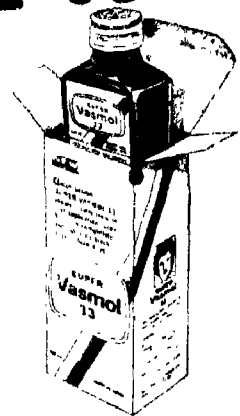
HYGIENIC RESEARCH INSTITUTE Post Box 1192, Bombay 400 001.

شاعر کی آئندہ اشاعتوں میں تجربوں نئے قدم
ایک شاندار جھلک

- علامہ اقبال کے خطوط پر مشتمل کتاب "جہاں دیگر" کے اہم خطوط علامہ کی تحریروں کے عکس کے ذریعہ
- مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی رباعیوں کا نایاب مجموعہ ترانہ
ایک مکمل کتاب ۔۔ شاعر کے صفحات پر ۔۔ ڈاکٹر نیر مسعود کا اہم مضمون ۔ یگانہ کے ادبی معرکے ۔ یگانہ کی تصویریں اور تحریروں کے عکس
- گوشہ حیات اللہ انصاری ۔۔۔ گوشہ حامدی کاشمیری اور کئی اہم ادبا و شعراء پر خصوصی مطالعے ۔

پرانی تحریروں کے عکس ، نایاب تصاویر ، اہم خطوط ، تاریخی حوالے نئے افسانہ نگار اور شعراء کا انتخاب ۔ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ

ہر شمارہ ایک خصوصی شمارہ جو سالانہ خریداروں کیلئے قطعی مفت

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

جرعات

آثار لفظ لفظ

مکتوبات

رفتار

چہرہ چہرہ یادیں

یہ صورت گر

یہ وقت اُردو والوں سے مخاطب ہے

اردو مخالف رویوں کے سلسلے میں جرعات کے تحت ہمیشہ ہی لکھا جاتا رہا ہے جس میں اردو والوں کی کارگذاریوں کا احتساب بھی کیا جاتا رہا ہے اور عمل کے راستوں کا تعین بھی۔ ایسے ہی ایک اداریے میں ان دریدہ ذہن اور متعصب مخالفین کے لئے سختی کے ساتھ احتجاج کیا گیا تھا جو اردو کو کسی بھی طرح کی مراعات دینے کے خلاف کام کرتے رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک اردو مخالف مہم کے سلسلے میں پرزور الفاظ میں مذمت کی گئی تھی جس میں اردو کو اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے خلاف الٰہ آباد ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ اتر پردیش میں اردو کو سرکاری درجہ دئے جانے کا مطالبہ کسی بھی پہلو سے غیر قانونی نہیں ہے بلکہ یہ مطالبہ قومی یک جہتی اور ہندوستان کے سیکولر مزاج کے عین مطابق ہے لیکن شاید مرکزی اور صوبائی حکومت اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود محض اس لئے خاموش رہنا پسند کرتی ہے کہ ان کے اختیار میں کچھ نہیں کیونکہ سیاسی بازی گری میں پس منظر میں رہنے والے ذہن زیادہ اہم ہوتے ہیں ورنہ تو یوپی کے ایک متعصب وزیر واسدیو سنگھ ہندی کے ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے یہ نہیں کہتے کہ :

"جو لوگ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کا مُنہ کالا کرکے انہیں سڑکوں پر گھمانا چاہئے۔ اور جو لوگ سرکاری اداروں اور خاص طور پر اتر پردیش اردو اکاڈمی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس مطالبے کی حمایت کر رہے ہیں انھیں کان پکڑ کے نکال دینا چاہئے"

یہ متعصبانہ گمراہ کن بیان صرف اردو کے خلاف ہی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے بنیادی مزاج کے خلاف بھی ہے۔ یہ بیان ایک ایسی حقیقت کے خلاف ہے جس کے بغیر ہندوستان کا کوئی تصور نہیں بنتا۔ واسدیو سنگھ کی حیثیت تو ایک وزیر سے زیادہ کچھ نہیں لیکن اس شخصیت کے پیچھے جو لوگ کام کر رہے ہیں یا جو ذہن اس ملک کی سالمیت کے لئے مسلسل خطرہ بن گئے ہیں ان کے خلاف سخت ترین کاروائی کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہئے جبکہ واسدیو سنگھ کا تعلق برسر اقتدار پارٹی سے بھی ہے جو اردو کے لئے مثبت رویوں کا اظہار کرتی رہی ہے۔

یہاں سوال واسدیو سنگھ کا نہیں ہے کہ ایسے افراد آزادی کے بعد سے اب تک اپنی جڑوں کے خلاف اشتعال انگیز بیانات دیتے ہی رہے ہیں بلکہ قابلِ مبارکباد وہ لوگ ہیں جنہوں نے مطالبات و بیانات کی سطح سے بلند آکر تحریر و تقریر کے فرسودہ دائرے سے نکل کر اپنے احتجاج کو عملی شکل دی ہے۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی کے ارکان نے اکاڈمی سے استعفے دے کر دوسروں کو جو تحریک و ترغیب دی ہے اس کو تقویت ملنی چاہئے اور یہ احتجاجی عمل صرف اتر پردیش ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں پھیلی ہوئی اردو اکاڈمیوں، اداروں اور انجمنوں سے وابستہ افراد کو اپنانا چاہئے جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے مالی تعاون حاصل کر رہے ہیں۔ احتجاج کی اس عملی صورت کو طاقتور تحریک کے روپ میں چاروں طرف سے ابھرنا چاہئے۔ واسدیو سنگھ اور ان کے بیان کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اردو والوں کو اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ ہمیں متحد ہوکر اپنی زبان کے چند ایک بنیادی مسائل کو کس طرح حل کرنا ہے۔ ہمیں اپنے احتجاج کو بکھراؤ سے بچاتے ہوئے عمل کی نئی جہتوں سے آشنا کرنا ہے کیونکہ اردو زبان کے تحفظ کی جنگ اب بہت پرانی ہوچکی ہے چنانچہ ہمارا طریقۂ کار بھی اب فرسودہ ہوچکا ہے۔ آج زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ ہمارے سامنے کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں اتحاد و عمل کے ناقابلِ یقین مظاہرے سامنے آچکے ہیں۔ ہمیں اپنی صفیں درست کرنے کی ضرورت ہے جہاں خوش فہمیوں، خود غرضیوں اور استحصالی رویوں کو اپنائے ہوئے دشمن بھی موجود ہیں۔

یہ وقت اردو والوں سے ایک بار پھر مخاطب ہے۔

منافق

ظاہر میں صلح کل ہیں اور سر بجنگ اندر
آئینہ ہیں سراپا اور دل ہے سنگ اندر

کھلتا ہے گفتگو سے انسان کا حال باطن
پہنچی ہوئی زباں سے ہے اک سرنگ اندر

ہر چند بے نیازی دکھلا رہے ہیں لیکن
اٹھتی ہے چپکے چپکے کیا کیا ترنگ اندر

دریا دکھا دکھا کے پیاسوں کو گھیرتے ہیں
رکھتے کمین میں ہیں لاکھوں نہنگ اندر

سفاکیاں سب انکی ہیں خوش غلافوں میں
صیقل اڑے تو جھلکے جو کچھ ہے زنگ اندر

لبیب تیموری

—— ۱۸۸۳ء دہلی ● ۱۹۴۵ء بمبئی ——

مرزا نظام شاہ لبیب تیموری کے شعری مجموعے آتشِ خنداں (مطبوعہ جاوید پریس کراچی ۱۹۶۰ء) سے یہ نظم منتخب کی گئی ہے۔ مرزا نظام شاہ لبیب، تیموری خاندان کی باقیات صالحات میں سے تھے۔ اس شعری مجموعے میں ۲۵۴ چھوٹی بڑی نظمیں۔ ۱۲۳ غزلیں، بچوں کے لئے، نظمیں، ۵ گیت اور رنغے اور متفرقات شامل ہیں۔ انتقال سے قبل جو غزل کہی تھی اس کے دو شعر درج ہیں۔

آنسو ڈھلکا، ٹپ سے گرا، پھر جیسے وہ تو کچھ بھی نہ تھا
شعلہ بھڑکا، سرد ہوا، پھر جیسے وہ تو کچھ بھی نہ تھا
ایک پرندے کا سایہ جو سطح زمیں پر چلتا تھا
جب تھک کے پرندہ بیٹھ گیا، پھر جیسے وہ تو کچھ بھی نہ تھا

یہ صورت گر

شفق — ذکاء الدین شایاں — اختر بستوی

سحر سعیدی — عارف محمود — محسن جلگانوی

حامد مجاز — نشتر اکبرآبادی — عارج میر

چہرہ چہرہ یادیں

پاکستان رائٹرز گلڈ (کراچی) کے ایک ادبی اجتماع منعقدہ دسمبر ۱۹۶۳ء کی ایک یادگار تصویر جس میں (پہلی صف میں) افضل صدیقی، سرشار صدیقی، محسن بھوپالی، یوسف بخاری، جمیل جالبی، اعجاز الحق قدوسی، کیپٹن انور، رفیق خاور، مظفر صدیقی (کرسیوں پر) ضیاء الدین برنی، ماہر القادری، اعجاز صدیقی، بیگم رفیق خاور، خدیجہ مستور (فرش پر) صبا لکھنوی وغیرہ کو پہچانا جاسکتا ہے۔

● قبلہ اعجاز صدیقی کے نام ماسٹر جگت سنگھ کے خطوط میں سے دو خطوط کی عکسی تحریریں قارئین شاعر کی نذر ہیں۔ ماسٹر جگت سنگھ نے اپنے ماہنامے، رہنمائے تعلیم (دہلی) کے ذریعہ اُردو زبان کی گرانقدر خدمت انجام دی تھی۔ رہنمائے تعلیم کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی خدمات دو، پانچ، دس برسوں کا قصہ نہیں بلکہ نصف صدی سے بھی زائد کی صحافتی داستان ہے۔ ماضی کے تاریخ ساز ادبی رسائل میں رہنمائے تعلیم کا شمار بھی کیا جاسکتا ہے۔

حمایت علی شاعر

ایک چھوٹی سی نظم

عمر کچھ ہو مگر یہ دل جاناں
وقت سے بے نیاز ہوتا ہے
لب پہ حرفِ سوال ہو کہ نہ ہو
دِل کا دامن دراز ہوتا ہے

آج ہی کہہ رہا تھا میں تم سے
تم کو مریم بنائے رکھوں گا
اک مقدس کتاب کی مانند
رحل پر ہی سجائے رکھوں گا

اور اب رحل بن گئی آغوش
اور اب ہم ہیں اور دلِ بیتاب
ہر تعین سے ہو کے بے پروا
میرے زیرِ مطالعہ ہے کتاب

○

جوشِ نمو میں سر جو اُٹھاتی ہیں ڈالیاں
پتے ہوا کی شہ پہ بجاتے ہیں تالیاں

اِس رقصِ بے خودی میں چھلک کر نہ گر پڑیں
شاخوں کے ہاتھ سے کہیں پھولوں کی پیالیاں

یہ کہہ کے اُڑ گئے ہیں پرندے درخت سے
کرتے رہو زمین پہ بیٹھے جگالیاں

گنبد کی طرح دوش پہ رکھے ہوئے ہیں سر
جسموں کے مقبروں میں دریچے نہ جالیاں

الفاظ کی منڈیر سے نیچے اتر کے دیکھ
بین السطور سے جو گذرتی ہیں نالیاں

وہ تو دکھا رہا ہے ہتھیلی میں سبز باغ
یاں آمدِ بہار کی ہیں خوش خیالیاں

● سی ۔ بی ۴۵ ، الفلاح سوسائٹی (ڈرگ کالونی) کراچی ۔ ۲۵ (پاکستان)

نیا افسانہ: علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر

گوپی چند نارنگ ● ڈی - ۲۵۲، سروودیا انکلیو، نئی دہلی - ۱۷

نیا افسانہ جس کی ابتدا اردو میں ۶۰-۱۹۵۵ء کے لگ بھگ ہوئی تھی، خیر سے اب اپنی جوانی کی منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ آج سے پانچ برس پہلے میں نے اپنے مضمون "اردو افسانہ: روایت سے انحراف اور مقلدین کے لئے لمحۂ فکریہ" میں بالخصوص اس طرف توجہ دلائی تھی کہ نئے افسانے نے بغاوت کی جو آگ روشن کی تھی، تقریباً چوتھائی صدی کے سفر کے بعد اب وہ آگ ٹھنڈی پڑنے لگی ہے اور نیا افسانہ ایک ایسے دوراہے پر آ گیا ہے، جہاں نئے سوال پیدا ہونے لگے ہیں کہ اب اس کا سفر کس سمت میں ہوگا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ نئی کہانی انحراف سے زیادہ اجتہاد اور انقطاع کے لمحوں کی پیداوار تھی۔ نئے افسانہ نگار فکر و احساس اور اظہار و اسلوب کے یکسر نئے مسائل سے دوچار تھے۔ ان کے دلوں میں ایک انجانا کرب اور نئی آگ تھی، جس کی وجہ سے نئے افسانے کا آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلنے لگا تھا۔ اردو میں پریم چند سے کر منٹو اور پھر بیدی تک حقیقت نگاری میں کچھ ایسی سطحیں تھیں، جن سے علامتی مفاہیم کا انکھوا پھوٹ سکتا تھا۔ لیکن باقاعدہ علامتی کہانی کا آغاز ۶۰-۱۹۵۵ء کے لگ بھگ پاکستان میں انتظار حسین اور انور سجاد اور ہندوستان میں بلراج مینرا اور سریندر پرکاش کی نسل سے ہوا، ان کے ساتھ ساتھ دوسرے افسانہ نگار بھی اور دیکھتے دیکھتے اردو افسانے کے زمین و آسمان بدل گئے۔ نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور تھا، یعنی حقیقت صرف وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو اسما و اشکال کی دنیا سے پرے حواس سے اوجھل رہتی ہے اور جسے لفظ کو محض نشان کے طور پر استعمال کرنے سے نہیں بلکہ لفظ کو استعارے اور علامت کے طور پر استعمال کرنے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ کہانی صرف شعوری یا منطقی رشتوں کا نام نہیں، اس میں لاشعور کی کارفرمائیوں کا بھی عمل دخل ہے۔ چناں چہ وقت کے منطقی رشتے اور زمان و مکاں کی تعبیریں مسترد قرار پائیں اور وقت کا تصور ایک تسلسل کے طور پر ابھر آیا۔ تخلیقی رویے کی اس بنیادی تبدیلی کے ساتھ ساتھ پچھلے دور کی سطحی رومانیت، کھوکھلی جذباتیت، اشتہاریت، برہنہ مقصدیت اور خارجیت سب زد میں آئے اور ان پر خطِ تنسیخ کھنچ گیا۔ نئی کہانی نے اپنی سب سے بنیادی پہچان تصورِ حقیقت اور اظہار کے پیرایوں میں تبدیلی سے کرائی۔ یعنی لفظ نرے لفظ نہیں تھے بلکہ ایسے استعاروں اور علامتوں کے طور پر استعمال ہونے لگے، جن کے مفاہیم کو منطقی طور پر PARAPHRASE کرنا ممکن نہیں۔ فرد کی فردیت، اس کے معمولی پن میں اس کی UNIQUENESS چھوٹے چھوٹے دکھ سکھ اور بنیادی صداقتیں، یعنی زندگی کی نوعیت و ماہیت، خوشی اور غم کی حقیقت، وجود کا اختیار اور جبر، جنس کی سچائی، عرفانِ ذات کی دہشت نیز طرح طرح کے موضوعات کی رنگا رنگی کہانی کی دنیا میں اپنی کیفیت دکھانے لگی۔ کہانی کی قدر شناسی کی سطح پر بڑی تبدیلی یہ آئی کہ موضوع سے چوں کہ ادب کی تشکیل نہیں ہوتی، اس لئے موضوع اور اظہار کے مل کر جو تخلیقی وحدت وجود میں آتی ہے، وہ افسانہ ہے۔ یوں ہندوستان اور پاکستان کے نوجوان باغی افسانہ نگاروں نے نئی فنی بلندیاں سر کیں اور بہت سے ایسے افسانے لکھے جو عہدِ جدید کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ناموں کے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہے کیوں کہ ایسے افسانوں پر بہت گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن پچھلے چند برسوں سے جو مسئلہ پریشانی کا باعث ہے، وہ یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد نئی کہانی کا جو منظر نامہ مرتب ہو رہا ہے اس میں بعض چیزیں صاف نہیں ہیں۔ نئی نسل کچھ تو تقلید کے چکر میں پڑ کر ادبِ لطیف اور انشائیے کو افسانہ سمجھ بیٹھی ہے، اور کچھ دوراہے پر "ٹھٹھکی ہوئی ہے" اور نہیں معلوم کہ کدھر جائے۔ افسوس کی بات ہے کہ نئی تنقید کو بھی اس بارے میں جو فرض ادا کرنا چاہئے، وہ ابھی اس سے عہدہ برا نہیں ہو پائی۔

میں نے اپنے مذکورہ مضمون میں آواز اٹھائی تھی کہ علامتی کہانی ہر فن کار کی کہانی نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ نئی کہانی میں بھیڑ چال شروع ہو جائے اور ہر شخص علامتی، تمثیلی کہانی لکھنے لگے۔ میں نے سوال اٹھایا تھا کہ "نئے افسانے میں نئے افسانہ نگار کی اصل بغاوت کس سے تھی، خطیبانہ رومانیت،

جذباتیت اور رفتار موالازدہ کہانی سے، سیاہ اور سفید کی سطحیت سے، متوسط طبقے کی کھوکھلی اخلاقیات سے، نظریہ بازوں کی اشتہاریت سے اور خارجی تقاضوں کے تحت زندگی کی ادھوری، سطحی، اور یک طرفہ ترجمانی سے، یا اجتماعی لاشعور کے نہاں خانوں میں پڑی بھولی بسری کتھا اور کہانی کی روایت سے بھی، جو انسانی زندگی کے صدیوں کے ارتقائی تجربوں کو پیش کرتی ہے اور فطرت کے بھیدوں کو فاش کرتی ہے؟" میرا معروضہ یہ تھا کہ وہ افسانہ نگار جن کے تجربے کی شدت یا احساس وشعور کی پیچیدگی اس کا تقاضا کرتی ہے تو وہ علامتی کہانی لکھیں گے ہی، ورنہ کیا ضرور ہے کہ وہ افسانہ نگار بھی جو سیدھی سادی کہانی لکھنے پر بھی قادر نہیں، وہ بھی علامتی کہانی کے چکر میں ایسی تحریروں کے انبار لگا دیں، جو کھینچ تان کر بھی نہ کہانی کہی جا سکتی ہیں اور نہ انشائیہ نہ کچھ اور۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں علامتی کہانی کے نام پر اس طرح کی بے مزہ تحریریں اتنی بڑی تعداد میں شائع ہوئی ہیں کہ مقلدین کی اس یلغار سے علامتی کہانی کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔

(۲)

راقم الحروف کی آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی اور اس پر بہت ہائے توبہ مچی۔ زیادہ تر رونا دھونا اس بات کا ہوا کہ گوپی چند نارنگ علامتی کہانی کی مخالفت کر رہا ہے اور اردو کہانی کو پرانی ڈگر پر لے جانا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات میرے معروضات کے بالکل برعکس تھی۔ اس سلسلے میں ایک بحث ہندوستان کے رسالہ "آہنگ" میں چلی۔ اسی نوعیت کا مضمون پاکستان میں انیس ناگی نے رسالہ "معاصر" (شمارہ ۲، سال ۱۹۸۳ء) میں لکھا۔ دونوں جگہ لکھنے والوں کے غیر ادبی تعصبات ان کی تحریروں میں در آئے۔ بیشتر اس کے کہ ان آرا سے بحث کی جائے اور اس بات کو جانچا جائے کہ کیا نئی علامتی کہانی کا کوئی رشتہ کتھا کہانی کی پرانی روایت سے ملتا ہے اور کیں کتھا کہانی کے علامتی تمثیلی عنصر سے نئے مفاہیم کے لئے استفادہ کیا جا سکتا ہے، نیز کیا حقیقت نگاری کی چھوڑی ہوئی راہ کو بھی نئے لطف واثر کے ساتھ اپنایا جا سکتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چار پانچ برسوں میں نئے افسانے کے حوالے سے جو کتابیں یا خاص خاص مضامین سامنے آتے ہیں، ان کو نظر میں رکھا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے چار پانچ برسوں میں دونوں ملکوں میں اردو افسانے پر خصوصی توجہ کی گئی ہے اور کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ رسالوں کے افسانہ نمبروں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ ہندوستان سے راقم الحروف کی مرتبہ اردو افسانہ: روایت اور مسائل (۱۹۸۱ء) شمس الرحمان فاروقی کی افسانے کی حمایت میں (۱۹۸۲ء)، مہدی جعفر کی نئے افسانے کا سلسلۂ عمل (۱۹۸۱ء) اور ڈاکٹر صادق کی ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ شائع ہوئیں۔ پاکستان میں فرمان فتح پوری نے اردو افسانہ اور افسانہ نگار (۱۹۸۲ء) مرزا حامد بیگ نے افسانے کا منظر نامہ (۱۹۸۲ء)، مرزا حامد بیگ اور احمد جاوید نے تیسری دنیا کا افسانہ (۱۹۸۲ء) اور شہزاد منظر نے جدید اردو افسانہ (۱۹۸۲ء) شائع کی ہیں۔ حال ہی میں مشی گن یونیورسٹی سے JOURNAL OF SOUTH ASIAN LITERATURE کا نہایت وقیع انتظار حسین نمبر شائع ہوا ہے (۱۹۸۳ء)۔ وارث علوی کے مضامین جواز اور اظہار میں فکشن پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح اوراق کے ایک حالیہ شمارے (مارچ اپریل ۱۹۸۴ء) میں ایک بحث شائع ہوئی ہے" علامتی افسانہ، ایک منفی رجحان"، محرک ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی، اور بحث میں حصہ لیا ہے پروفیسر ممتاز حسین، انتظار حسین، ڈاکٹر انور سدید، خالدہ حسین، اے خیام اور زاہدہ حنا نے۔ بیشتر شرکا نے علامتی کہانی کے حق میں رائے دی ہے اور تجربے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

قطع نظر اس بحث سے زیر نظر مضمون میں ہمارا مسئلہ وہ کشمکش ہے جو علامتی کہانی اور تمثیلی کہانی میں جاری ہے۔ شمس الرحمان فاروقی اور وارث علوی نے اس کشمکش اور الجھن کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے جس کی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ اس بارے میں وارث علوی کا کہنا ہے کہ تمثیلی کہانی، افسانہ نگاری کا اسفل طریقہ ہے اور اس کو رد ہونا چاہئے۔ یہ سلسلہ انھوں نے پچھلے کئی برسوں سے شروع کر رکھا ہے اور اس سے بڑا کنفیوژن پیدا ہو رہا ہے۔ اپنے مضمون "تین نئے افسانہ نگار: انور خان، سلام بن رزاق اور الیاس احمد گدی" (مطبوعہ جواز، جنوری۔ مئی ۱۹۸۳ء) میں ایک بات جو انھوں نے بار بار کہی ہے وہ علامت اور تمثیل کے رشتے کے بارے میں ہے۔ یہ تعریف عہد وسطیٰ کے ادب تک تو ٹھیک ہے، لیکن آج کے افسانے پر اس کی تطبیق کی جائے تو کئی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کے بعض بیانات دیکھئے:

"سوائے دو تین افسانوں کے سب تمثیلی اور استعاراتی ہیں جو جدید افسانے کا مروجہ طریقہ کار ہے... تمثیلی افسانے کو میں علامتی افسانہ اس لئے نہیں کہوں گا کہ جیسے وہ علامتی افسانہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ خشک ریت کا ایسا سراب ہے جس میں ان کا تخلیقی سوتہ دن بہ دن سوکھتا چلا جا رہا ہے" (ص ۲۸)

سلام جانتے ہیں کہ تمثیل لکھ رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی احساس ہے کہ تمثیل کو صاف ستھرے حقیقت پسندانہ اسلوب میں بیان کرنا چاہیے تاکہ اسے فنتاسی، انشائیہ اور ادبِ لطیف کے ناپسندیدہ اثرات سے محفوظ رکھ سکیں ... اس حد کے بعد ہی صحیح معنی میں علامتی افسانے کی کائنات شروع ہوتی ہے۔ اردو کا کوئی افسانہ نگار اس لکشمن ریکھا کو پار نہیں کر سکا۔ دو چار کہانیاں ایسی مل جائیں گی جو علامتی کہی جا سکتی ہیں، باقی سب تمثیل کے دائرے ہی میں حرکت کرتی ہیں جو فن کاری کا اسفل طریقۂ کار ہے کیوں کہ اس میں تخیل، مشابہت اور مثال کی دریافت اور اس کے بیان کی سطح سے بلند نہیں ہو جاتا۔ جب کہ حقیقت پسند اور علامتی افسانہ میں وہ ایک ایسی حقیقت کی تخلیق پر قادر ہوتا ہے جس کی آگہی کسی اور علم کے ذریعے ممکن نہیں۔" (ص ۲۸-۲۹)

وارث علوی کے اس طرح کے بیانات ان کے مغربی ادب اور مغربی علامت پسندی سے مرعوب ہونے کی چغلی کھاتے ہیں۔ اگر وہ اپنے فنی ورثے، اجتماعی لاشعور اور اپنے ادبی سرمایے کی روایت کو نظر میں رکھتے تو تمثیل کو اس طرح رد نہ کرتے۔ ان کے ایسے بیانات کی اس پر لوٹتی ہے :

"فن کار جب حقیقت نگاری اور علامت نگاری دونوں پر قادر نہیں ہوتا تو تمثیل، داستان، کتھا، حکایت اور پریوں کی کہانی کا آسان راستہ تلاش کرتا ہے۔ یہاں تخیل، فنتاسی میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ آرٹ کا ڈسپلن اور سوفسطائیت از کار رفتہ وسائلِ اظہار کی PRIMITIVE سادگی اور سادہ لوحی پر قربان کر دی جاتی ہے۔ جدید اردو افسانہ کا یہی المیہ ہے۔" (ص ۳۲)

وارث علوی کو شاید یہ معلوم نہیں کہ PRIMITIVE کہانیاں صرف سادگی اور سادہ لوحی کا اظہار نہیں۔ ان میں بھی انسانی تجربے صدیاں سمٹی ہوتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم REALISM کے چکر میں پڑ کر ان میں پوشیدہ معنیاتی خزانوں کو دیکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔

جہاں تک نئے افسانے کو انشائیہ اور ادبِ لطیف کے ناپسندیدہ اثرات سے محفوظ رکھنے کا سوال ہے تو ظاہر ہے کہ وارث علوی وہی بات کہہ رہے ہیں جو میں بار بار کہتا آیا ہوں، لیکن انھوں نے تمثیل، علامت، کتھا، اور حکایت میں جو گھپلا کیا ہے وہ یقیناً نئے افسانہ نگار کیلئے ... کا باعث ہوگا۔ اس سے ملتی جلتی بات باقر مہدی بھی کہہ چکے ہیں۔ ان کا بیان ہے :

"نئے افسانے کا مقابلہ ترقی پسند افسانے سے نہیں ہے، بلکہ داستانوی کہانی سے ہے جس کے نمائندے انتظار حسین ہیں۔"

صاف ظاہر ہے کہ باقر مہدی داستانوی کہانی کو نئی علامتی کہانی سے الگ کوئی چیز سمجھ رہے ہیں۔ یہی معاملہ بھائی وارث علوی کا ہے ورنہ وہ "تمثیل، داستان، کتھا، حکایت اور پریوں کی کہانی" کو ایک ساتھ بریکیٹ نہ کرتے، اور ان سب پیرایوں کو حقیقت نگاری اور علامت نگاری دونوں سے فروتر قرار نہ دیتے۔ پیشتر اس کے کہ مندرجہ بالا مقدمات پر تنقیحات قائم کی جائیں، اتنی بات تو واضح ہے ہی کہ ان حضرات کے نزدیک نئے افسانے میں تین دھارے بہ یک وقت رواں ہیں یعنی علامت نگاری کا افسانہ، حقیقت نگاری کا افسانہ اور داستانوی افسانہ (جس کو وارث علوی نے تمثیل، کتھا اور حکایت سے ملا دیا ہے) مزے کی بات ہے کہ وارث علوی باوصف اپنی شدید باغیانہ روش حقیقت نگاری کے افسانے کو علاوہ علامت نگاری کے دوسرے تمام افسانوی اسالیب پر ترجیح دے رہے ہیں، جن میں MYTHS بھی ہیں اور LEGENDS بھی اور تمثیلی داستانیں اور حکایتیں بھی۔ اس فریم ورک سے فکشن کا جو نظریہ سامنے آتا ہے، اس کی صحت یا عدم صحت کا اندازہ لگانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کا جو اطلاق وارث علوی نے افسانوں پر کیا ہے، اس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں اور نیز یہ کہ تمثیل اور علامت میں، جس طرح کہ وہ نئے افسانے میں برتی جا رہی ہیں، کیا واقعی وہ فرق موجود ہے جس پر وارث علوی زور صرف کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے ALLEGORY کی یہ تعریف ملاحظہ فرمائیے :

Lib ... Zakir ... Jamia ... J.

A method of representation in which a person, abstract idea, or event stands for itself and for something else. Allegory may be defined as estended metaphor. The term is often applied to a work of fiction in which the author intends characters and their action to be understood in terms other than their surface appearance and meanings. The most famous and the most obvious of such two-level narratives in English is Bunyan's Pilgrim's Progress. In Spencer's Faerie Queen, figures are actual characters and also abstract qualities. Parts of Dante's Divine Comedy and Tennyson's Idylls of the King are also allegorical.

(HARRY SHAW)

اس سے واضح ہے کہ تمثیل میں معنی کا دوہرا عمل کارفرما رہتا ہے اور کوئی شخص، شے یا واقعہ اپنا مفہوم بھی رکھتا ہے اور SURFACE معنی بھی دیتا ہے۔ تمثیل از کار رفتہ نہیں، اس کا وہ تصوّر از کار رفتہ ہے جس میں مجرد تصورات یعنی نیکی، بدی، خوف، ڈر، ستم، جفا، وفا کو شخصیایا جاتا تھا۔ ایسا اخلاقی اور روحانی مقاصد کے لئے تھا۔ لیکن ضروری نہیں کہ تمثیل صرف انھیں مقاصد کیلئے استعمال ہو۔ ROGER FOWLER نے بھی تمثیل کو EXTENDED یا EXTENDED METAPHOR کہا ہے۔ وہ ORWELL کے ۱۹۸۴ کو تمثیل کی بہترین مثال کہتا ہے۔ FOWLER نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ نئی تنقید اگرچہ تمثیل کے تئیں مخاصمانہ رویّہ رکھتی ہے (جس کی تقلید اردو میں وارث علوی کرتے نظر آتے ہیں) تاہم تمثیل اور علامت میں عملی سطح پر فرق کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ FOWLER کے الفاظ ہیں:

The common distinction between allegory and symbolism falsifies the facts of literary experience... The clear-cut distinction between 'the music of ideas' (Richards on Eliot) and the 'dark conceit' of allegory is harder to make in practice than in theory: Yeats A Vision systemitises and expoinds the mystery of his symbols much as Spencer did in The Faerie Queen. Cleanth Brooks in The Well Wrought Urn (1947) allegorises all the poems he explicates, so that they become 'parables about the nature of poetry' and Northrop Frye in The Anatomy of Criticism (1957) summed up this tendency by pointing out that all analysis was covert allegorizing.

LEWIS کی یہ رائے بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ تمثیل میں ضروری نہیں کہ اشیائے ظاہری و معنوی میں ایک اور ایک کی نسبت ہو۔ بالعم

ایہ جاتا ہے کہ تمثیل میں ذہنی تجریدات مثلاً نیکی، بدی، خوف، محبت کو ٹھوس جسم مہیا کیا جاتا ہے اور ایک اور ایک کی معنوی نسبت پیدا ہوتی ہے لیکن
ی نہیں۔ SYLVAN BARNET بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے:

There is an increasing tendency to blur the distinctic
between symbol and allegory, expecially when the writer
invented word (usually associated with allegory) has nc
clear equations.

مغربی مصنفین کے حوالے دینا میرے نزدیک ہرگز ضروری نہ تھا، لیکن وارث علوی انگریزی کے پروفیسر ہیں اور مغربی ادب میں اس قدر پیے
ے ہیں کہ بغیر ایلیٹ اور سارتر کے حوالے کے لقمہ ہی نہیں توڑتے ہیں FOWLER کا یہ کہنا شاید ان کو پسند نہ آئے گا کہ وہ تو تمثیل کو TEXTURAL
بجائے STRUCTURAL SYMBOLISM کا درجہ دیتا ہے۔ اسی کے الفاظ میں سنئے:

Allegory's distinctive feature is that it is a structur
rather that a textural symbolism: it is large-scale
exposition in which problems are conceptualised and
analysed into their constituent parts in order to be
stated, if not solved. The typical plot is one in whic
the 'innocent'--- Gulliver, Alice, the lady in Milton's
'Comus', K. in Kafka's The Castle--- is put through a
series of experiences, which add upto an imaginative
analysis of contemporary reality.

BARNET نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ علامت نگاری چوں کہ HIGER WORLD اور SUPER REAL کے
ں کی خبر لاتی ہے اس کا گہرا تعلق انسانی لاشعور ہے، اور چوں کہ اس کا گہرا تعلق انسانی لاشعور سے ہو سکتا ہے، اس کا گہرا معنوی رشتہ
IMAGE اور MOTIFS کی اس دنیا سے بھی ہے جنھیں ینگ ARCHETYPES کہتا ہے اور جو MYTH اور LEGEND میں
ہیں۔

اس وضاحت کے بعد کیا یہ بتانے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ وارث علوی کی THEORY OF FICTION کے مطابق،
رنئے افسانے کے جن تین پیرایوں کا ہم نے ذکر کیا تھا، وہ تین نہیں بلکہ اصلاً دو ہیں یعنی علامت نگاری کا افسانہ اور داستانوی افسانہ۔ یہ اگرچہ
الگ نظر آتے ہیں لیکن استعاراتی تفاعل یا SUBSURFACE معنیاتی رشتوں کی وجہ سے دراصل ایک ہیں۔ علامت نگاری کو چوں کہ لاشعور سے
کیا ہی نہیں جا سکتا، اس کو ان لاشعوری بھیدوں سے بھی الگ نہیں کیا جا سکتا جن کی بعض شکلیں پرانے قصے کہانیوں، کتھاؤں، داستانوں اور
ایتوں میں ملتی ہیں۔ اس لئے علامتی کہانی اور داستانوی کہانی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی تخلیقی رویّے کے دو اسلوبیاتی مظہر ہیں۔
یا فرق اسلوب بیان کا ہے، ذہنی تخلیقی رویّے کا نہیں۔ تاہم اس مقدمے کی توثیق اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اطلاقی نوعیت کو جانچا
پرکھا نہ جائے۔

(۲)

وارث علوی نے چوں کہ نئی کہانی کے سلسلے میں علامت اور تمثیل کا کھیلا سلام بن رزاق کی کہانیوں سے بحث کرتے ہوئے کیا ہے، اس لئے سب سے
پہلے میں سلام ہی کے افسانے "بجوکا" کو لوں گا جسے وارث علوی نے ان کا شاہکار افسانہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد انتظار حسین کی ایک تازہ کہانی

"نرناری" کو لیا جائے گا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ کیا واقعی اردو کی نئی کہانی میں علامت اور تمثیل کو الگ الگ خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے جیسا کہ بھائی وارث چاہتے ہیں۔ یا یہ کہ نئی کہانی میں علامت، تمثیل، کتھا اور داستان مل کر ایک نیا تخلیقی پیکر اختیار کر رہے ہیں جس کی قدر شناسی نہ کر سکنا دراصل اپنی بد توفیقی کا ثبوت دینا ہے۔ تیسرے یہ کہ حقیقت نگاری کی جس کہانی کو نظر انداز کرنے کی طرف میں نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں توجہ دلائی تھی اور وارث علوی بھی جس ضمن میں میرے ہمنوا ہیں (لیکن ان کی زیادتی یہ ہے کہ وہ اسے داستانوی کہانی کی خود ساختہ CATEGORY سے بلند درجہ دیتے ہیں) اس بارے میں شمس الرحمان فاروقی کا کہنا ہے کہ "سماجی حقیقت نگاری کی وہ کہانی جو تاریخی دستاویز کے طور پر پڑھی جا سکے، کلیتاً مسترد ہو چکی ہے"۔ اس مضمون کے آخر میں اس مقدمے پر بھی نظر ڈالی جائے گی اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ کیا واقعی سماجی حقیقت نگاری کی کہانی مسترد ہو چکی ہے، یا اس میں قصور بے چاری کہانی کا نہیں ہماری تنقید کا ہے؟ یعنی کیا ایسی کہانی کو منہدم ہونا چاہئے یا ایسی تنقید کو جو حقیقت نگاری کی کہانی کو سماجی دستاویز کے طور پر پڑھتی ہے۔ بہر حال اس کی موجودہ شکل کیا ہے، اور اس کے امکانات کیا ہیں، یہ دیکھنے کی شدید ضرورت ہے۔

آیئے اب سلام بن رزاق کی کہانی "بجوکا" کو لیں جس کی تعریف میں وارث علوی نے اپنی تنقید کے بہترین الفاظ ذبح کر دیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہ اردو فکشن کا ایک شاہکار افسانہ ہے، بجوکا نفسیاتی حقیقت نگاری کا افسانہ ہے لیکن حقیقت کا اظہار وہ بجوکا کی علامت کے ذریعے کرتا ہے جو تہہ دار اور معنی خیز ہے"۔ اس میں دو کردار ہیں، بیوی اور میاں۔ بیوی گاؤں چھوڑ کر شہر آتی ہے۔ شوہر اچھی ملازمت پر ہے۔ وہ اپنی بیوی کو خوب چاہتا ہے لیکن بیوی اس لئے خوش نہیں کہ اس کا شوہر اشوک اس کا بہت خیال رکھتا ہے، اسے کبھی روٹھنے یا ناراض ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ بیوی اپنی زندگی کی یکسانیت سے اکتائی ہوتی ہے۔ بار بار اسے گاؤں کے مناظر، پھولی ہوئی شفق اور پیپل پر شور مچاتی چڑیاں یاد آتی ہیں۔ شوہر اس کو بے حد پیار کرتا ہے لیکن وہ چاہتی ہے کہ وہ اسے بری طرح پیٹے اور اس کا بدن لہولہان کر دے۔ کہانی کے آخر میں میاں بیوی کے پہلی بار گاؤں جانے کا منظر ہے، جہاں بیچ کھیت میں بجوکا کھڑا ہے، بیوی کے دل میں بجوکا کو پتھر مارنے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے۔

یہ ہے وہ کہانی جسے شاہکار کا درجہ دیا گیا ہے اور یہ ہے وہ علامت جسے ہمارے معتبر نقاد نے "تہہ دار اور معنی خیز" کہا ہے۔ کہانی کے آخر میں یہ جملہ بھی ہے کہ "بجوکا کپڑے کا آدمی ہے جو ہلتا ڈلتا نہیں ہے مگر پرندے اس پتلے کو آدمی سمجھ کر دور رہتے ہیں"۔ گویا بجوکا کی علامت ایک مثبت تفاعل کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ اندر سے اگرچہ کھوکھلا ہے لیکن اس کی ظاہری ہیئت سے پرندے اور جانور فصل سے دور رہتے ہیں۔ یعنی وہ فصل کی رکھوالی کا مثبت فریضہ انجام دیتا ہے۔ کہانی میں علامت کی اس مثبت جہت کا دور دور تک کوئی جواز نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا ورنہ کہانی باطل قرار پائے گی۔ اشوک سے بجوکا کی صرف اتنی نسبت ضرور ہو سکتی ہے کہ وہ اندر سے کھوکھلا آدمی ہے لیکن اگر ایسا ہے بھی تو اس کا کھوکھلا پن خود اس کی ناخوشی یا چڑچڑے پن سے بھی ظاہر ہوتا۔ کہانی میں دور دور تک اس کا کوئی شائبہ نہیں۔ اگر کھوکھلا پن شبیہہ ہے مردانگی کی کمی کی، تو اشوک کی محض حد سے بڑھی ہوئی چاہت مردانگی کی کمی کا جواز پیدا نہیں کرتی کیوں کہ ایسا کسی دوسری نفسیاتی گرہ کی وجہ سے بھی ممکن نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ ایسے کردار سے بحث کرتے ہوئے وارث علوی، راجندر سنگھ بیدی کی مشہور کہانی "لاجونتی"، کو کیسے بھول گئے۔ لاجو کا مسئلہ یہی تھا کہ وہی سندر لال جو پہلے اسے ڈانٹتا، مارتا تھا، دوبارہ گھر میں بس جانے کے بعد وہ اسے اتنا چاہنے لگا تھا کہ روٹھنے کا موقع ہی نہ دیتا تھا گویا مرد اور عورت کے بیچ میں خون کے اصلی رشتے سے جو توازن پیدا ہوتا ہے، اس کا غائب ہو جانا صرف مرد کی نسائیت کی وجہ سے نہیں ہوتا، اس میں دوسرے نفسیاتی عوامل کا عمل دخل بھی ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ پوری کہانی میں افسانہ نگار نے بار بار گاؤں کی زندگی کی جھلک کو ریفرین کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ بیوی کی زندگی میں یکسانیت اور بوریت محض اشوک کی نسائیت کی وجہ سے نہیں بلکہ شہری تمدن کی میکانکیت کی وجہ سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اصلاً اس کہانی کی بھی توجیہہ ہے یہی اور اگر ایسا ہے تو بجوکا کی مطابقت اشوک سے غیر ضروری قرار پاتی ہے، اور علامت کی معنوی حیثیت صفر ہو جاتی ہے۔ نیز یہ بھی کہ جنسیات کا مبتدیانہ علم رکھنے والا شخص بھی اس بات کو جانتا ہے کہ کوئی ایسا کردار جو چاہتا ہو کہ اس کا مدمقابل اسے بری طرح پیٹے یا اس کا بدن لہولہان کر دے اور اتنا پٹنے کے بعد بھی وہ چیخے چلائے نہیں اور اسے احساس ہو کہ "پک کر مسیں مارتا پھوڑا

اچانک پھوٹ جائے اور سارا مواد بہہ نکلے“ نیز یہ کہ جب بھی وہ کھیت کے پاس سے گزرے، بڑے ہونے پر بھی بجوکا کو اسے پتھر مارنے میں
مزہ آتے، کیا یہ خاص نوعیت کا جنسی کردار نہیں۔ شاید خود افسانہ نگار اپنے ان جملوں کی معنویت سے پوری طرح باخبر نہیں۔ اگر وہ باخبر
ہوتا تو بیوی کی بوریت کی ساری ذمہ داری اشوک (بجوکا) کے سر نہ رکھتا لیکن اگر افسانہ نگار نے کردار کی تشکیل ان جملوں کی مدد سے سوچ
سمجھ کر کی ہے تو پھر بجوکا کی علامت نہ صرف باطل بلکہ لغو قرار پاتی ہے۔ گویا بوریت کی تمام تر ذمہ داری اشوک پر نہیں بلکہ خود عورت
کے جنسی رویے پر عاید ہوتی ہے۔ غرض شہری تمدن کی میکانکیت پر بھی جو زورِ قلم ہمارے افسانہ نگار نے صرف کیا ہے اس کی
چنداں ضرورت نہ تھی۔

ایسا نہیں کہ سلام بن رزاق کے پاس اچھی کہانیاں نہیں ہیں، ہیں اور ضرور ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں سماجی حقیقت نگاری
کے تحت ان کی ایک کہانی کا تذکرہ آئے گا جو میرے نزدیک ان کی اچھی کہانیوں میں سے ہے۔

(۴)

بجوکا کی نام نہاد علامت سے فراغت پانے کے بعد اب ذرا MYTH اور LEGEND داستان اور کتھا کے جھگڑے سے
بھی نپٹ لیا جائے، کیوں کہ اس سے بھائی وارث علوی بہت ناخوش معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں مدد انتظار حسین کے فن سے لینی ہوگی۔
یہ انتظار حسین کی ایک سامنے کی کہانی کو لیں جو ابھی سال بھر پہلے ”شب خون“ میں ”نرناری“ کے نام سے شائع ہوئی تھی (مارچ-اپریل ۱۹۸۲ء)
اس میں تین کردار ہیں، مدن سندری بیوی ہے، دھاول اس کا پتی اور گوپی بھائی ہے۔ پتی اور بھائی دونوں مندر کی انگنائی میں دیوی کی
مورتی کے سامنے بلی چڑھ جاتے ہیں۔ خون میں لت پت دو لاشیں پڑی ہیں، سر الگ، دھڑ الگ۔ مدن سندری روتی ہے، پیٹتی ہے،
دیوی کا گن گان کرتی ہے، بے بس ہو کر اسی تلوار کو اپنی گردن پر مارنے لگتی ہے تو دیوی پرسن ہو جاتی ہے۔ جا سر کو دھڑ سے ملا۔ میں نے
تیرے پتی اور بھیا کو جیون دان دیا۔ خوشی سے اس کی سدھ ماری جاتی ہے، اور جلدی میں بھیا کے دھڑ پر پتی کا سر اور پتی کے دھڑ سے
بھائی کا سر چپکا دیتی ہے۔ اپنی چوک کو ٹھیک کرنا ہی چاہتی ہے کہ دونوں جی اٹھتے ہیں اور بھائی اور پتی کا گھال میل ہو جاتا ہے۔ اب جو
پتی کے سنگ لیٹتی ہے تو وہ ہاتھ اور وہ بدن اسے انجانے لگتے ہیں۔ اسے چنتا ہوتی ہے کہ وہ بہن کس کی ہے اور پتنی کس کی؟ پھر پتی دبدا
میں پڑ جاتا ہے کہ وہ وہی ہے یا کوئی دوسرا اس میں آن جڑا ہے یا وہ کسی اور میں جا جڑا ہے۔؟ یہ دوہرا وسوسا کہانی میں چلتا رہتا ہے۔
اور اسی سے TENSION بنی رہتی ہے۔ آخر میں پرجاپتی اور اوشا کی مثال سے دونوں پر ان کی اصلیت کھلتی ہے۔

یہ کہانی علامتی ہے کہ تمثیلی۔ مدن سندری کون ہے؟ دھاول کون ہے؟ ظاہر ہے ان باتوں کا کوئی سادہ سا جواب آسان نہیں۔ یا
کہانی بھی ہے کہ نہیں۔ کسی بھی قاری سے پوچھیے۔ وہ کہے گا کہ بے شک یہ کہانی ہے۔ اس میں کردار ہیں اور واقعات ہیں۔ اور کرداروں اور
واقعات کے عمل در عمل سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ کہانی میں دیوی کا ذکر ہے۔ جس کے وردان سے دونوں کے کٹے ہوئے سر دھڑ سے جڑ جاتے
ہیں۔ کہانی کا مرکزی واقعہ MYTH اور LEGEND کا اثر لیے ہوئے ہے۔ بیانیہ کے واقعاتی بہاؤ کے باوجود یہ کہانی اساطیری فضا کی
وجہ سے حقیقت نگاری کی کہانی تو کہی نہیں جا سکتی۔ نیز اس میں کسی مجرد تصور یعنی نیکی، محبت، سچائی، خوف، وہم وغیرہ کو مجسم بھی نہیں کیا گیا،
اس لیے یہ تمثیل کی سادہ تعریف پر بھی پوری نہیں اترتی۔ تو پھر یہ ہے کیا؟ یعنی یہ تمثیلی کہانی بھی نہیں، حقیقت نگاری کی کہانی بھی نہیں، تو
کیا افسانہ نگار نے محض بیتال پچیسی کی نوعیت کا ایک پرانا قصہ سنا دیا ہے اور بس۔ لیکن ہمیں یہ سوال پوچھنے کا حق ہے کہ علاوہ اس
بیانیہ کے جو قصے کی ظاہری ساخت ہے، کیا کہانی کے داخلی ساختیوں میں کچھ اور معنوی رشتے بھی ہیں؟ سر دھڑ کے جڑنے کے بعد سب سے
پہلے مدن سندری وسوسے کا شکار ہوتی ہے۔ دن بھر کی تھکی ہاری مدن سندری جب سونے کے لیے دھاول کے سنگ آ لیٹتی ہے اور
بڑی چاہت کے ساتھ اس کی باہنوں میں آتی ہے تو اسے اچانک لگتا ہے کہ ”بدن کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔ یہ بدن تو خوب اس کا پہچانا تھا۔ جب
دونوں بدن ملتے تو کیسے گھل مل جاتے جیسے جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور وہ ہاتھ کیسی جانکاری کے ساتھ گرم بدن کے بیچ
تیرا کرتا جیسے اس کے سب بھیدوں کو اس نے بوجھا ہوا ہے، اور اس بجلی بھرے ہاتھ کے چھو جانے سے انگ انگ میں ایک لہر دوڑ جاتی

اور پورا بدن جاگ جاگ جاتا۔ پر آج تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بدن ایک دوسرے کو جانتے ہی نہ ہوں۔ کیا یہ وہی بدن نہیں جس سے رد رنگ کر وہ سویا کرتی تھی۔ چناں چہ ایک دفعہ بے قابو ہو کر وہ بول پڑی" یہ تو نہیں ہے" اور دھادل کی بانہوں سے نکل گئی۔

دھادل کی شخصیت یک لخت اجناتی ہو جاتی ہے اور مدن سندری وسوسے میں گھر جاتی ہے کہ وہ شخص جسے میں اپنا سمجھ رہی ہوں، اتنا اجنا کیوں ہے۔ ان جملوں کو غور سے دیکھنے سے یہ حقیقت کھل جانی چاہئے کہ افسانہ نگار شاید شخصیت کی پہچان IDENTITY کا سوال اٹھا رہا ہے۔ جنم جنم کا رشتہ، بدنوں کا گھل مل جانا اور پھر اجنا پن، یہ کوالف کیا یہ سوال نہیں اٹھا رہے کہ دھادل میں ایک ایسے کردار کا استعاراتی تفاعل پیدا ہو رہا ہے جس کی جانی بوجھی شخصیت یک لخت اجنا ہو گئی ہے یہ مت بھولئے کہ IDENTITY CRISIS اس لئے پیدا ہوا ہے کہ سر کسی کا ہے اور دھڑ کسی کا۔ دھادل چراغ جلاتا ہے اور مدن سندری سے کہتا ہے" ہوش کی دوا لے، لے دیکھ لے کیا میں نہیں ہوں" مدن سندری اپنے کیے پر شرمندہ ہوتی ہے۔" ہاں، ہے تو یہ تو ہی" لیکن جب وہ پھر اسے ہاتھوں میں لیتا ہے تو وہ احتجاج کرتی ہے" دھادل یہ ہاتھ تیرے نہیں ہیں" اور پھر اسے ساری تفصیل سناتی ہے کہ سر دھڑ کا گھپلا کیسے ہو گیا۔

انتظار حسین کے فن سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا شخص بھی آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ سر دھڑ کے اس گھپلے کے معنیاتی ساختیے کیا ہو سکتے ہیں۔ وہ تمام مفاہیم جو کسی بھی SUPER REAL سے تعلق رکھتے ہوں یعنی جو علامت کی کارفرمائی کی خاص کائنات ہے انھیں PARAPHRASE کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ استعارے کے توسیعی تصرف اور علامت کے معنیاتی کردار کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ معنی محسوس تو کئے جا سکتے ہیں حرفاً حرفاً بیان نہیں کئے جا سکتے۔ چناں چہ ہم بھی ایمائی طور پر صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کیا افسانہ نگار کسی ایسی ثقافتی شخصیت کی بات تو نہیں کر رہا ہے جس میں زمینی اثرات اور آسمانی اقدار کے باہم جڑنے سے ایک نئی شخصیت سامنے آ گئی ہو، لیکن یہ شخصیت ہنوز اپنی پہچان نہ کرا پا رہی ہو۔ اس کردار کا ایک اور علامتی پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہجرت کرنے والے جو متحرک سر تھے، قتل و خون کے ایک بھیانک (تاریخی) عمل سے گزرنے کے بعد وہ کسی دوسرے زمینی دھڑ سے جا لگے اور اب دونوں کے امتزاج سے ہنوز ایسی ثقافتی شخصیت وجود میں نہیں آئی جو دھادل ہو۔ مدن سندری، دھادل کو بار بار ٹھکرا دیتی ہے کیوں؟ یہ مدن سندری کون ہے جو یوں وسوسے میں گھر گئی ہے؟ اس کے علامتی تفاعل پر نظر کیجئے تو کیا مدن سندری ایسا معاشرہ تو نہیں جو IDENTITY CRISIS کا شکار ہو۔ انتظار حسین اتنا معمولی فن کار نہیں کہ یہیں پر کہانی کو ختم کر دے۔ دونوں میں جب بحث بڑھتی ہے تو دھادل فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے" اری مدن جس طرح ندیوں میں اُتم ندی گنگا ندی ہے پربتوں میں اُتم پربت سومیر پربت، اس طرح انگوں میں اُتم انگ مستک ہے۔ دھڑ کا کیا ہے۔ یہ تو سب ایک سمان ہوتے ہیں۔ مانو اپنے مستک سے پہچانا جاتا ہے۔ سو مستک کو دیکھ وہ میرا ہے"

کیا افسانہ نگار یہاں اس مکالمے کے داخلی ساختیوں میں ان نکتوں کی طرف اشارہ تو نہیں کر رہا ہے کہ زمینی رشتوں کا کیا ہے۔ دھڑ یعنی زمینیں تو سب ایک سی ہوتی ہیں۔ اصل چیز تو سر یعنی روحانی اور مذہبی اقدار ہیں۔ ثقافتیں اپنی مذہبی اقدار سے پہچانی جاتی ہیں۔ کیا یہ اس بنیادی سوال پر غور کرنے کی کوشش نہیں ہے کہ رہن سہن، طور طریقے، جمالیاتی احساس، موسیقی، راگ راگنیاں، فنون لطیفہ تو دھرتی کی دین ہیں، لیکن آسمانی اقدار کی وجہ سے رشتہ کہیں اور بھی جڑا ہوا ہے، اور یہ ایسی حقیقت ہے جو قائم ہو گئی ہے۔

بہر حال مدن سندری دھادل کی منطق سے قائل ہو جاتی ہے اور اس بات کو مان لیتی ہے کہ جس کا سر اسی کا دھڑ یعنی اب وہ دھادل کو دھادل مانے گی۔ لیکن ہوتے ہوتے خود دھادل دُبدا میں پڑ جاتا ہے۔ یعنی معاشرہ تو مان بھی لے، تاہم ثقافت کے بھی تو اپنے مطالبات ہو سکتے ہیں۔ دھادل اپنے انگ انگ کو دیکھتا ہے۔ ایک بار، دو بار، بار بار۔ ہے رام کیا یہ میں ہی ہوں۔ پھر وہم کی ایک اور لہر اٹھی۔ ایک میں ہی ہوں یا کوئی دوسرا مجھ میں آن جڑا ہے یا میں دوسرے میں جا جڑا ہوں تو میں اب سارا میں نہیں ہوں۔ وہ جتنا سوچتا اتنا ہی چکر میں پڑ جاتا" ایک کرتب یہ ہوا کہ وہ خون خرابے کے بعد جی اٹھا۔ یہ دونوں معاشروں کے دوبارہ زندہ ہو اٹھنے کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا کرتب یہ ہوا کہ سر کسی کا اور دھڑ کسی کا۔ یہ نئی ثقافتی شخصیت کی نمود ہے۔ رفتہ رفتہ دھادل کا دکھ بڑھتا گیا۔ اس کے اندر چور بیٹھا ہوا تھا بس ایک پھانس سی چبھتی رہتی کہ یہ تن

کسی اور کا ہے اور اسے اپنا پورا وجود اس کے بغیر ادھورا دکھائی دیتا۔ جو حضرات علامتوں، ان کے استعاراتی رشتوں اور مرئی لفظوں کے غیر مرئی معنوی انسلاکات کی جستجو کی لذت اٹھاتے ہیں، ان کے لئے کہانی کے ان حصّوں کی توضیح فضول ہوگی کیوں کہ جن کلیدی جملوں کو اوپر پیش کیا گیا، شاید ہی کوئی صاحبِ ذوق ہو جو ان مکالموں کے ایمائی معنوں سے لطف اندوز نہ ہو سکتا ہو۔ یہاں دھادل کے علامتی کردار کو مزید عمق دینے کے لئے انتظار حسین ایک حکایت بیان کرتے ہیں۔ کہانی کے اندر کہانی کی کیفیت سے ان کے فن میں ہم اکثر دوچار ہوتے ہیں، اور ایسا کہانی کے اصل علامتی مفاہیم میں مزید استحکام کے لئے ہوتا ہے۔ دھادل کو وہ راجکماری یاد آتی ہے جو ایک راکشش کی قید میں تھی۔ راکشش روز صبح راجکماری کی گردن مارتا اور اس کا سر چھینکے پر رکھ کر باہر نکل جاتا۔ دن بھر راجکماری کا دھڑ مسہری پر پڑا رہتا۔ سر چھینکے پر رکھا رہتا۔ اس سے بوند بوند خون ٹپکتا رہتا۔ شام پڑے راکشش جلّاتا دھاڑتا آتا۔ سر کو دھڑ سے جوڑتا اور راجکماری جی اٹھتی۔ دھادل سوچتا کہ راجکماری اگرچہ دُکھی تھی، اسے ایک سکھ تو تھا کہ سر بھی اپنا تھا دھڑ بھی اپنا تھا۔ کہانی کے آخر میں دھادل کی یہ جھنجھلاہٹ بڑھ جاتی ہے۔ جب کسی طرح یہ گتھی نہیں سلجھتی تو وہ دونوں ایک رشی کے پاس جاتے ہیں، اور اپنی رام کہانی سُناتے ہیں۔ رشی دھادل کو گھور کے دیکھتا ہے اور کہتا ہے "مورکھ کس دُبدا میں پڑ گیا۔ سو باتوں کی ایک بات ہے تو نَر ہے مدن سندری ناری ہے۔ جا اپنا کام کر۔" چناں چہ آنکھوں سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور بیچ جنگل سے گزرتے ہوئے دھادل مدن سندری کو ایسے دیکھتا ہے جیسے جُگوں پہلے پرجاپتی نے اُوشا کو دیکھا تھا۔ اُوشا پرجاپتی کی آنکھوں میں لالسا دیکھ کر بھڑکتی ہے بھاگتی ہے اور پھر لُپا ہو جاتی ہے۔ صاحبانِ ذوق کے لئے شاید اس وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ نَر کا کام ناری کے ساتھ بھوگ کرنا ہے اور ناری کا کام بھوگ کے لئے خود کو ارپن کرنا ہے، یعنی جا مدن سندری تیری مملکت ہے اور تو اس کا آنند لینے اور بھوگنے والا ہے۔ کس چکر میں پڑا ہے۔ یہ تیری دھرتی ہے۔ اس کے انگ انگ میں رچ بس جا اور اسے جی بھر کے بھوگ۔ یہ نَر ناری ہی کا رشتہ نہیں۔ جو رشتہ نَر ناری میں ہے وہ رشتہ فرد اور معاشرہ میں بھی ہے۔ نیز وہی رشتہ ثقافت اور زمین میں بھی ہے۔ ایک کا مقصد بھوگنا ہے دوسرے کا بھوگنے کے لئے خود کو فراہم کرنا ہے۔ کئی دوسرے معنوی ساختیے بھی کہانی میں کارفرما ہو سکتے ہیں یعنی ہجرت کی نوعیت بھی ایک اصل کے دوسری اصل میں جڑنے کی ہوتی ہے اور ثقافت کی تشخیص کا عمل جاری رہتا ہے۔ نیز خود ثقافتوں میں بھی آسمانی اور زمینی قدروں کے بیچ میں پیوندکاری ہوتی ہے اور تاریخ کے مختلف لمحوں میں یہ اختلاط نئے نئے سوال پیدا کرتا ہے اور نئی ثقافتوں سے نئی ہم آہنگیوں کے نئے سلسلے پیدا ہوتے ہیں۔

اب بتایئے کیا یہ کہانی صرف PRIMITIVE قصّہ کہانی ہے یعنی کیا اس میں کوئی علامتی مفاہیم نہیں۔ اس وضاحت کی ضرورت بھی اب باقی نہیں رہ جاتی کہ ایسی کہانیوں میں علامتی مفاہیم صرف ایک وسیلے سے پیدا نہیں ہوتے۔ کٹے ہوئے سر کا دھڑ سے جڑنا یا راکشش کا شہزادی کا سر کاٹ کر چھینکے پر رکھ کر باہر چلے جانا اور پھر شام کو اسے جوڑنا یقیناً تمثیلی پیرایہ ہے لیکن یہ کہانی محض تمثیلی نہیں۔ تمثیل اور تمثیلی پیرایے میں فرق ہے۔ تمثیلی پیرایہ علامتی معنی GENERATE کرتا ہے۔ کیا اوپر کے تجزیے میں قدم قدم پر یہ ثبوت فراہم ہوتا نہیں چلا گیا کہ مدن سندری اور دھادل محض تمثیلی کردار نہیں بلکہ ان کی علامتی معنویت بھی ہے۔ یوں یہ محض قصّے کے کردار بھی ہیں اور اگر کوئی ان سے صرف کہانی کی اوپری سطح پر لطف اندوز ہونا چاہے تو اس کی بھی گنجائش ہے تاہم یہ مرد اور عورت کے ایسے ARCHETYPES بھی ہیں جو مدِ مقابل کے وجود میں دوسرے وجود کی شناخت کرتے ہیں اور یوں اپنی شناخت کے عمل سے گزرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ سماجیاتی سطح پر یہ آج کے معاشرے اور ثقافت کی اس کشمکش کے آئینہ دار بھی ہیں جس سے فرد کا ذہن و شعور نبرد آزما ہے۔ اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نئے افسانے میں داستانوی افسانہ، علامتی افسانے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ نیز یہ بھی کہ علامت ہمارے لاشعور کو تمثیلی پیرایے ہی کے ذریعہ راس آتی ہے اور اردو کے نئے افسانے میں اکثر و بیشتر تمثیلی عنصر کے ساتھ باہم آمیز ہو کر آتا ہے۔ اس میں قدیم کتھا کہانی کی سادگی بھی ہے اور آرٹ ڈسپلن بھی۔ چنانچہ داستانوی یا تمثیلی کہانی کی الگ سے درجہ بندی غلط ہے، اور یہ اصلاً علامتی کہانی ہی کا ایک پیرایہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے علامتی تمثیلی کہانی کہا جا سکتا ہے۔

(۵)

اب اس حصّے میں اسلام آباد کے ایک ایسے افسانہ نگار کی کہانی کو لیتے ہیں جس کا کہنا ہے کہ "میں سچّی کہانی نہیں لکھنا چاہتا" لیکن وہ جھوٹی کہانی بھی نہیں لکھتا۔ وہ کہتا ہے "میں افسانہ لکھنا چاہتا ہوں" یعنی وہ سچی کہانی، جھوٹی کہانی اور افسانے میں فرق کرتا ہے۔ اس کا یہ بھی دعوا ہے کہ "تخلیقات کو میں نظریے کی کھونٹی سے نہیں باندھتا"، لیکن جس کے زیادہ کردار گرے پڑے مفلوک الحال اور بے توقیر لوگ ہی ہیں، خواہ وہ

کوئی فقیر ہو، علیا نائی ہو، صادو ترکھان ہو، شیدو مہترانی ہو، یا آگ میں گھری آگ زینان، جو اس قدر حسین ہے کہ محض آئینہ دیکھ کر وقت گزار سکتی ہے لیکن جب ایک بھینس اور گدھی کے عوض خرید لی گیا تھا۔ اس افسانہ نگار کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں "بند مٹھی میں جگنو"، "ماس اور مٹی" اور نیا مجموعہ "خلا اندر خلا" ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اسی آخری مجموعے میں ایک کہانی ہے "تماشا"۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کہانی پڑھ کر ہم دم بخود رہ جاتے ہیں یا سارا خون ذہن میں ایک نقطے پر سمٹ آتا ہے۔ اچھے شعر کا معاملہ نسبتاً اتنا مشکل نہیں، اچھی کہانی کے ساتھ بہت کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔ درد کے کئی ان دیکھے رشتے قائم ہو جاتے ہیں، اور دبی دبی ٹیس رہ رہ کر اٹھتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی سچی کہانی اور جھوٹی کہانی سے بچنے کے لئے محمد منشا یاد نے یہ افسانہ لکھا۔ بے شک یہ سچی کہانی بھی ہے، جھوٹی کہانی بھی نہیں اور جس طرح یہ لکھی گئی ہے، افسانہ بھی بن گئی ہے۔ یقین نہ آئے تو کہانی کے ان ساختیوں کو دیکھئے:

(۱) ایک مداری اور اس کا بیٹا تماشا دکھانے کے لئے نئی بستی کی تلاش میں سرگرم سفر ہیں۔

(۲) دریا کے کنارے چلتے چلتے اس پار انھیں بستی دکھائی دیتی ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کے لئے پل ہے نہ کشتی۔

(۳) دونوں دریا میں اترنا چاہتے ہیں تاکہ اسے پار کر سکیں لیکن بڑے کو رات کا بھیانک خواب یاد آجاتا ہے اور وہ فیصلہ کرتا ہے کہ آج کا دن ان کے لئے اچھا نہیں۔ دریا میں نہیں اترنا چاہئے۔

(۴) دریا کے کنارے کنارے وہ جتنا چلتے ہیں، دوسری طرف بستی کی مسجد کے اونچے مینار بھی چلتے نظر آتے ہیں اور پل بھی اتنا ہی دور نظر آتا ہے۔

(۵) اچانک کتوں کے بھونکنے اور مویشیوں کے ڈکرانے سے انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں قریب ہی کوئی دوسری بستی ہے۔ دونوں فیصلہ کرتے ہیں کہ رات اس بستی میں گزار لیں، صبح سویرے تازہ دم ہو کر پھر چلیں گے۔

(۶) لیکن یہ بستی عجیب بستی ہے۔ بڑا بانسری اور ڈگڈگی بجاتا ہے۔ لوگ جمع تو ہو جاتے ہیں لیکن مرد عورتیں نہیں صرف بچے۔ یہ بچے بھی عجیب بچے ہیں۔ ان کے بال سفید ہیں اور چہروں پر جھریاں ہیں۔ ساری بستی میں پورے قد کا کوئی آدمی نہیں۔

(۷) بڑا سب سے پہلے تین گولے نکالتا ہے اور باری باری پیالے اٹھا کر انھیں غائب کر دیتا ہے۔ پھر ایک کے بعد کئی تماشے دکھاتا ہے۔ خالی گلاس پانی سے بھر جاتا ہے اور بھرے ہوئے گلاس کو الٹا کرنے سے پانی نہیں گرتا۔ وہ خود کو سانپ سے ڈسواتا ہے۔ منہ کے راستے پیٹ میں خنجر اتار کر نکال لیتا ہے لیکن بچے تماشائی تالی نہیں بجاتے، داد نہیں دیتے۔ مداری پریشان ہو جاتا ہے۔

(۸) آخر میں وہ سب سے بڑے تماشے کا اعلان کرتا ہے کہ میں جمورے کے گلے پر چھری چلاؤں گا اور اسے ذبح کر کے دوبارہ زندہ کر کے دکھاؤں گا۔ اس پر بچے تماشائی زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں۔ بڑا حیران ہوتا ہے کہ عام طور پر تماشائی اس کھیل کو پسند نہیں کرتے اور اسے منع کر دیتے ہیں لیکن کیسے سفاک تماشائی ہیں کہ چھری چلانے کی بات سن کر تالیاں پیٹتے ہیں۔ جمورے کو الٹا کر اس پر چادر تان کر وہ چھری چلاتا ہے تماشائی زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں اور سکے پھینکتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا میدان خالی ہو جاتا ہے۔ بڑا جمورے کو آواز دیتا ہے۔ مگر جمورا کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ گھبرا کر چادر ہٹاتا ہے، کیا دیکھتا ہے کہ جمورا خون میں لت پت ہے اور اس کی گردن سچ مچ کٹی پڑی ہے۔

اوپر جو آٹھ ساختیے پیش کئے گئے، ان میں سے ہر ساختیہ باقی تمام ساختیوں کی مدد سے معنی حاصل کرتا ہے اور ہر ساختیہ میں کہانی کو کوئی دوسرا موڑ دینے کی گنجائشیں ہیں۔ افسانہ نگار کے لئے ہر شق میں ممکن تھا کہ وہ دوسری راہ اختیار کر لیتا اور پوری کہانی کا رخ بدل جاتا۔ مثال کے طور پر مداری اور اس کا بیٹا سفر میں ہیں۔ سفر کی ضد گھر ہے۔ انجان بستی کی طرف جتنا چلتے ہیں، اس کی طرف جانے والا پل اتنا دور ہوتا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پل پار کر لیتے اور انجانی بستی میں اتر جاتے، جس سے کہانی میں اسرار کی کیفیت ختم ہو جاتی اور لمحہ بہ لمحہ بھیدوں میں اترنے اور GORTESQUE

ے بھیانک انجام تک پہنچنے کا عمل رونما نہ ہوسکتا۔ پھر یہ کہ جس بستی میں وہ پہنچتے ہیں وہ عجیب الخلقت بونوں کی بستی ہے جہاں سب مداری ہیں۔ اس کا برعکس بھی دکھایا جاسکتا تھا لیکن کہانی میں وہ بات نہ بنتی جواب بنی ہے۔ اسی طرح ہر شق اور ہر کڑی کو لیا جاسکتا ہے جس میں معنوی جہات تراشنے اور کہانی کو مرکزیت دینے کی دوسری معنوی اور اظہاری گنجائشیں موجود ہیں۔ آخر میں مداری کے تماشے سے کچھ اور نتیجہ بھی برآمد ہوسکتا تھا لیکن جس اچانک صدمے سے موجودہ انجام قاری کو دوچار کرتا ہے اور ذہن پر ضرب لگا کر قاری کو ایک تحیر زا بھیانک سوال کی زد میں لاکر چھوڑ دیتا ہے، کیا وہ کسی دوسری طرح ممکن تھا؟

سامنے کی بات ہے کہ کہانی میں پلاٹ ہے۔ واقعات ارتقائی عمل سے گزرتے ہیں، ان میں وحدتِ تاثر ہے۔ زماں اور مکاں کی ترتیب منطقی ہے۔ کہانی میں کردار بھی ہیں، مداری، جمورا اور تماشائی۔ کردار، واقعات اور مکالمات سے جڑے ہوتے ہیں۔ کہانی میں نقطۂ عروج بھی ہے اور انجام بھی۔ تو کیا یہ روایتی کہانی ہے؟ لیکن اس کی ساخت کی جو شقیں اوپر پیش کی گئی ہیں ان کی روشنی میں شاید ہی کوئی ذی شعور آدمی یہ کہنے کی بات کرسکے کہ کہانی روایتی ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ روایتی کہانی نہیں ہے تو کیا یہ علامتی کہانی ہے؟ یا تمثیلی کہانی ہے؟ یا منشا یاد کے الفاظ میں "محض افسانہ" یعنی نہ سچی کہانی اور نہ جھوٹی کہانی۔ حق بات یہ ہے کہ ان سوالوں کا جواب اتنا سادہ نہیں جتنا عام طور پر سمجھا جاسکتا ہے لیکن اتنا دقت طلب بھی نہیں کہ اس کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ افسوس کا پہلو یہ ہے کہ بعض حضرات نے خانہ بندی بہت سخت کر رکھی ہے۔ آمد و رفت ممنوع ہے۔ دلیل و برہان نہیں اور تجزیہ تنقید سے مفقود ہے۔ اوپر کے دو تجزیوں سے تو اتنی بات بہرحال واضح ہوچکی ہے کہ اردو میں علامتی اور تمثیلی کہانی عملاً ایک دوسرے سے اتنی الگ الگ نہیں جتنی بالعموم سمجھی جاتی ہے۔ زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں صرف چند امور کی طرف اشارہ کروں گا۔

ساختیاتی نظام کے بعد کہانی کے عنصر کو دیکھئے۔ جب دوسرے کنارے پر بستی دکھائی دیتی ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لئے نہ پل ہے نہ کشتی، تو بڑا دیر تامل کر کے کہتا ہے"

"اللہ کا نام لے کر چل پڑتے ہیں پتر"،

لیکن پھر اسے رات والا ڈراؤنا خواب یاد آجاتا ہے اور وہ اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے۔ "کیسا خواب ابا"

"بہت ڈراؤنا خواب تھا پتر"

"کیا دیکھا تھا ابا؟"

"میں نے دیکھا جمورے کہ بہت بڑا مجمع ہے میں تماشائیوں کے درمیان کوڈیوں والے کو گلے میں ڈالے کھڑا ہوں۔ بچے تالیاں بجا رہے ہیں اور بڑے زمین پر بچھی چادر پر سکے پھینک رہے ہیں۔ اچانک کوڈیوں والا جسے میں نے تمہاری طرح لاڈ پیار سے پالا تھا میری گردن میں دانت گاڑ دیتا ہے اور اپنا زہر انڈیل دیتا ہے"

"پھر کیا ہوا ابا؟"

بڑا بتاتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ اور وہ اپنی رہی سہی طاقت جمع کر کے بیٹے کو پکارتا ہے۔ پھر اپنی ہی چیخ کی آواز سن کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ چاند ڈوب چکا ہے اور کتے رو رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تم ٹھنڈ کی وجہ سے سکڑے ہوئے ہو۔ میں نے تمہارے اوپر چادر ڈال دی جیسے اکھاڑے میں تمہارے گلے پر چھری چلانے اور تمہیں دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ڈالا کرتا ہوں۔ مگر رات کے اس اداس پہر میں مجھے اپنا چادر ڈالنے کا یہ انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا اور نیند اڑ گئی۔

کیا یہ خواب کہانی کا وہ مرکزی تمثیلیہ نہیں جس کے چاروں طرف کہانی بُنی گئی ہے۔ کہانی کے معنوی امکانات کو جس طرح اس خواب صورت حال نے گہرا کر دیا ہے، کیا کسی اور طرح ممکن تھا؟ اوّل تو اس میں بھیانک پن اور دہشت کی وہ فضا ہے جس کے گرد پوری کہانی نمو پاتی ہے۔ دوسرے اس میں اپنوں کے ہاتھوں سفاکانہ ہلاکت کا جو منظر ہے وہ ہر دوہری معنویت رکھتا ہے۔ کوڑیالے سانپ کو بڑے نے اپنی اولاد کی طرح لاڈ پیار سے پالا تھا لیکن وہی اس کی گردن میں دانت گاڑ دیتا ہے۔ یہاں موت اولاد سے باپ کی طرف ہے جب کہ کہانی میں اس سفاکانہ عمل کی قلب ماہیت ہوتی ہے اور چھری باپ کے ہاتھوں بیٹے کی گردن پر چلتی ہے۔ خواب کا دوسرا حصہ یعنی "رات کے اس اداس پہر میں مجھے اپنے چادر ڈالنے

کا یہ انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا''، کہانی کے انجام سے مربوط ہے۔ لیکن کہانی کا انجام بہر حال تحیّرزا اور غیر متوقع ہے۔
علاوہ خواب کی تمثیل کے کہانی میں دوسرے تمثیلی عناصر بھی ہیں۔ باپ اور بیٹا دریا کے کنارے کنارے چلتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ بستی کی مسجد کے مینار بھی چلتے رہتے ہیں۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی ہے مگر بستی پھر بھی اتنا ہی دور نظر آتا ہے۔
اسی طرح جس بستی میں پہنچتے ہیں وہاں کوئی بالغ نہیں، سب بچے ہیں۔ لیکن ان کے بال سفید ہیں اور ان کے چہروں پر جھریاں ہیں۔
اگرچہ ان کی عمریں زیادہ ہو گئی ہیں لیکن ان کے ذہن ناپختہ ہیں۔
گویا کہانی کی ساخت میں ایک نہیں تین شقیں سراسر تمثیلی ہیں۔ لیکن کیا اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کہانی محض تمثیلی ہے۔ لیکن یہ بات ابھی طے نہیں کی جا سکتی کیونکہ کہانی کے بہت سے دوسرے معنوی ابعاد پر ابھی ہم نے غور کیا ہی نہیں۔
بڑا کون ہے، چھوٹا کون ہے۔ کیا یہ صرف مداری اور اس کا بیٹا ہیں۔ یا اس پُراسرار تماشے کا حصہ ہیں جو اس کارزارِ حیات میں ہر روز ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ان کا سفر کیسا سفر ہے''۔ اندھیرے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ کیا یہ زندگی کا سفر تو نہیں۔ اندھیرا ماضی تو نہیں جو پیچھے چھوٹتا چلا جاتا ہے اور کیا سورج کا طلوع ہونا لمحۂ حاضر تو نہیں جس میں ہم وقت کے دریا کے کنارے کنارے چل رہے ہیں۔ باپ بیٹا یعنی قدیم انسان اور آج کا انسان دریا کو پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وقت کے دریا کو کس نے پار کیا ہے۔ انسان ہمیشہ ان دیکھی بستیوں کی کھوج میں مگن ہے لیکن وہ جتنا سفر کرتا ہے زندگی کے بھید اتنے گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو جاتی ہے لیکن زندگی کے بھید جتنے حل ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ گہرے بھی ہو جاتے ہیں۔

''عجیب بات ہے جمورے پُل آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے''
''اور بستی بھی ابا۔ مینار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں''
''عجیب بات ہے جمورے''
''بہت ہی عجیب ابا''
''یہ کوئی اسرار ہے پتر''
''میرا خیال ہے ابا، ہم ہر روز لوگوں سے مذاق کرتے ہیں، آج ہمارے ساتھ مذاق ہو رہا ہے''

بیٹا اپنے باپ کی مخلوق ہے۔ دونوں کر معاشرے کو رہ جاتے ہیں لیکن اب دونوں وقت کی ایسی منزل میں ہیں جہاں خود ان کے ساتھ بہت بڑا تماشا ہونے والا ہے۔ چلتے چلتے تھک جاتے ہیں۔ دونوں کے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں اور ہونٹوں پہ پیپڑیاں جم جاتی ہیں، تو بڑا کہتا ہے۔

''رک جا پتر۔ اس بار بستی تک پہنچنا شاید ہمارے مقدر میں نہیں''
''پھر کیا کریں ابا؟''
''واپس چلتے ہیں پتر''
''نہیں ابا، ہماری منزل تو اس پار کی بستی ہے''

صاف ظاہر ہے بیٹا جستجو میں باپ سے زیادہ گرم جوش ہے۔ نئی نسلیں اگر پچھلی نسلوں سے زیادہ پرجوش نہ ہوں تو پھر نئی نسلیں ہی نہیں۔ نئی نسل زیادہ ذہین اور برّاق بھی ہے۔ اس کا ثبوت دونوں کے مکالموں سے جگہ جگہ ملتا ہے۔ باپ یہ کہتا ہے۔

''نین وی ڈونگھی تلہ پرانا شیشعاں تاں تیّن ہیلے''

چھوٹا لقمہ دیتا ہے: ''میں وی جاناں جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے''

باپ بیٹے میں ایک رشتہ تو خالق اور مخلوق کا ہے دوسرا پرانی اور نئی نسل کا، ایک اور پہلو بھی ہے یعنی معاشرے اور نظام کا۔ اور شاید یہی پہلو کہانی کے مرکزی سوال سے زیادہ جڑا ہوا ہے۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ساری کہانی میں بھید کی فضا ہے۔ عجیب بستی کے قریب پہنچ کر بڑا اچانک ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بیری کے درخت کو دیکھا رہ جاتا ہے۔ جمورا مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر مارتا ہے۔ بیر چکھتا ہے اور تھوک دیتا ہے۔ بڑا کہتا ہے "رب خیر کرے بیری کے ساتھ دھر کونے، کوئی اسرار ہے پتر"

چھوٹا منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ بڑا کہتا ہے:

"ابابیلیں ہیں پتر"

"ہاں ابّا پورا لشکر ہے"

"دانہ دنکا ڈھونڈ رہی ہوں گی پتر"

"کیا پتہ کچھ اور ڈھونڈ رہی ہوں ابّا"

"اور کیا پتر؟"

"ہاتھیوں کو ابّا"

"نہیں پتر، یہ وہ ابابیلیں نہیں، یہ تو ہاتھیوں پر بیٹھ کر چہچہانے والی ابابیلیں ہیں"

"یہاں سے نکل چلیں ابّا، یہ ٹھیک جگہ نہیں"

قرآنِ حکیم کی روایت کی طرف اشارہ وسیع تر معنیاتی تناظر فراہم کرتا ہے۔ لیکن ابابیلیں یہاں خیر، نیکی اور رضائے الٰہی کی علامت نہیں، اس کا برعکس ہیں کیونکہ زندگی دراصل آسیب میں گھر گئی ہے۔ یہ جگہ واقعی ٹھیک جگہ نہیں۔ یاد رہنا چاہئے کہ کہانی کا عنوان "تماشا" ہے۔ یہ طنز یہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بستی جس میں مداری اور جمورا پہنچتے ہیں، آسیب میں گھری ہوتی ہے۔ کہیں سماج کسی ایسے وقت میں تو گرفتار نہیں ہو گیا، جہاں وہ خود اپنے آپ کو یا نظامِ اقدار کو یا عزیز ترین تصوّرات کو ذبح کئے دے رہا ہے۔ بڑا انتہائی دردناک لہجے میں آخر کیوں کہتا ہے:

"پتر جموریا، ڈگڈگی بجاتے بجاتے میرا بازو شل ہو گیا اور بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے میرا اندر سکھتاں (خالی) ہو گیا"

کیا یہاں تک پہنچتے پہنچتے بڑا ہمارے عہد کی علامت نہیں بن جاتا، جو اقدار کے کرائسس کا شکار ہے۔ یعنی ڈگڈگی بجاتے بجاتے جس کے بازو شل ہو چکے ہیں اور بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے جس کا باطن خالی ہو گیا ہے لیکن کسی پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ کیوں کہ ہر عمل کی معنویت جاتی رہی ہے۔ خواہ وہ تین لوگوں کا تماشا ہو، دو کے چار بنانے کا، جلتے ہوئے سگریٹ کو نگلنے کا یا رومال کے رنگ کو تبدیل کرنے کا۔ کوئی تصوّر اکسا تا نہیں بس تماشا ہو رہا ہے۔ ہر قدر بے مایہ اور بے آبرو ہو گئی ہے۔ چاروں طرف نظر آنے والے تماشائی سب نابخت ہیں۔ بستی میں اب پورے قد کا کوئی آدمی نہیں رہا۔ یعنی معاشرہ ایسے انسانوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے جو اقدار کی لذّت سے آشنا تھے اور اس کے شیدائی تھے۔ یہ اقدار روحانی بھی ہو سکتی ہیں اور سماجی، سیاسی بھی۔ اس عہد میں "بچے"، "کسی کو رہنے ہی نہیں دیتے"، "ٹھکانے لگا دیتے ہیں"۔ یہ بچے کون ہیں یعنی ذہنی اعتبار سے نابخت لوگ جنھوں نے آسیب زدہ بستی پر قبضہ کر رکھا ہے، اور سب بڑوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ آخری تماشا جمورے کو زمین پر لٹا کر، اس پر چادر ڈال کر گردن پر چھری چلانا ہے۔ باپ کا جو رشتہ اولاد سے ہوتا ہے، وہی معاشرے کا اپنے عزیز ترین تصوّرات سے ہے۔ جمورا خون میں کٹ پٹ ہے اور اس کی گردن بیچ میں کٹی پڑی ہے۔ کیا انسان کے ہاتھوں اپنی اقدار کا قتل نہیں ہو رہا ہے۔ کیا معاشرہ اپنے عزیز ترین تصوّرات کا خود قاتل نہیں؟ کیا ہماری عزیز ترین متاع خون میں کٹ پٹ نہیں پڑی ہے؟ کیا بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے انسان کا باطن خالی نہیں ہو گیا؟ اور کیا وہ آوارہ اور بے خانماں کو بہ کو سرگرداں نہیں؟

ہم نے اس کہانی کی روایتی، تمثیلی اور علامتی تینوں توجیہیں آپ کے سامنے رکھ دیں۔ اب آپ آسانی سے اس سوال کا جواب خود ہی پا سکتے ہیں کہ یہ کہانی روایتی ہے، تمثیلی یا علامتی۔ اتنی بات تو شروع کے ساختیاتی بیان کے بعد ہی واضح ہو گئی تھی کہ کہانی روایتی نہیں۔ دوسرے بیان سے یہ بات سامنے آئی کہ افسانہ نگار نے تمثیلی پیرایے کو بھی برتا ہے۔ تیسرے یعنی آخری بیان سے یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ کہانی کی پوری بافت از اوّل تا آخر علامتی ہے اور تمثیلی عنصر بھی اسی علامیت کا حصّہ ہے۔ یوں تو کہانی کو محض لغوی سطح پر بھی لیا جا سکتا ہے اور اس اعتبار سے بھی یہ لطف و اثر سے خالی نہیں

لیکن اس کے لطف و اثر کے تمام امکانات اسی وقت روشن ہو سکتے ہیں جب اس کے علامتی مفاہیم بھی نظر میں رہیں۔ علامتی مفاہیم کے کچھ اور پہلو بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ارتکاز کی خاطر ہم نے صرف ان پہلوؤں کو پیش کیا جو ہمارے نزدیک اظہار ی اعتبار سے زیادہ قابل قبول ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نئے اردو افسانے میں علامتی اور تمثیلی پیرایے بالکل الگ الگ نہیں ہیں۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ یہ الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ بالکل ہو سکتے ہیں اور اس کی مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں لیکن اردو کے نئے افسانے میں اکثر و بیشتر علامتی اور تمثیلی پیرایے مل جاتے ہیں اور تمثیلی عنصر اور وسائل سے علامتی ساخت کو خاصی معنیاتی تقویت ملتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا نئے افسانے کے تخلیقی مضمرات سے عدم واقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ حق بات یہ ہے کہ کہانی کا ڈھانچا یا اس کا اظہاری پیکر خواہ کچھ ہو، لیکن ضروری ہے کہ اس میں لطف و اثر ہو، وہ دلچسپی کو قائم رکھ سکے اور حظ و انبساط اور لطف و نشاط سے سرشار کر سکے۔ کیتھارسس جو سچے ادب کی پہچان ہے، اس کی اصلی توجیہہ بھی یہی جمالیاتی توجیہہ ہے۔ کہانی خواہ علامتی ہو یا تمثیلی یا ملی جلی حقیقت نگاری کی کہانی ہو، یا تجریدی کہانی ہو، یعنی شعور سے زیادہ لاشعور کو انگیز کرتی ہو، ضروری ہے کہ وہ کسی قیمتی تجربے سے آشنا کرے، یعنی اس کے اظہاری قالب میں یہ طاقت ہو کہ دل پر چوٹ پڑے یا ذہن پر ضرب لگائے، استعجاب میں غرق کر دے یا سوچنے پر مجبور کر دے یا زندگی کے بارے میں آگہی اور بصیرت کا کوئی نیا دریچہ کھول دے۔ یہ منصب کہانی کے جوہر کا ہے۔ علامتی یا تمثیلی پیرایے محض وسیلے ہیں۔ وسائل کچھ بھی ہو سکتے ہیں، اصل چیز "جوہر" ہے اور کہانی کے اسی جوہر کی حفاظت نئے افسانہ نگار کا سب سے بڑا فرض ہے۔

(۶)

اس بحث کے بعد اب دیکھئے کہ ہندوستان کے نئے افسانہ نگار حقیقت نگاری کی کہانی کو کس تخلیقی سطح پر برت رہے ہیں۔ اس کے لئے سلام بن رزاق کی کہانی "انجام کار" کو لیا جاتا ہے، جو پہلی بار ۱۹۷۴ء میں چھپی تھی اور جسے شاید اردو تنقید کے غلط رویوں کی وجہ سے مصنف نے اپنے مجموعے "ننگی دوپہر کا سپاہی" (۱۹۷۷ء) میں سب سے آخر میں جگہ دی ہے۔ مصنف نے پہلے اپنی علامتی کہانیوں کو لیا ہے۔ یہ کہانی چوں کہ حقیقت نگاری کی کہانی ہے، خود مصنف کی نظر میں اس کہانی کی اگر اہمیت ہوتی تو وہ شاید اس کو اتنا دور نہ پھینکتا۔ سات سال پہلے اس کہانی کو پہلی بار پڑھنے کے بعد مجھے توقع تھی کہ جدید نقادوں میں نہ سہی، کم از کم ترقی پسند نقادوں ہی سے کوئی اس کے تمام معنیاتی انسلاکات سے پردہ اٹھائے گا، کیوں کہ اس میں وہ تمام نسخے ہیں جو ترقی پسندوں کو دل سے مرغوب ہیں یعنی قانون، پولس، شراب، بدکاری کا اڈا اور سماجی ظلم میں پستا ہوا مظلوم غریب انسان۔ سلام بن رزاق کی کتاب پر تعریفی تبصرے تو بہت چھپے لیکن ان کی عمومی کیفیت وہی ہے یعنی محض موضوع اور مواد کی بنیاد پر تمغے عطا کرنے میں احباب نے فیاضی سے کام لیا ہے۔ کہانی کا ڈھانچہ سلام نے بڑی احتیاط سے تیار کیا ہے۔ کہانی میں ایک کلرک ہے جو کسی گندی بستی میں اپنی نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ ایک دن شام کو جب وہ گھر لوٹتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کے دروازے کے سامنے گندے پانی کی نکاسی کے لئے جو نالی بنی تھی، اس میں شامو دادا کا ایک چھوکرا دیسی شراب کی کچھ بوتلیں چھپا رہا ہے۔ اسکے اعتراض کرنے پر پہلے تو چھوکرا چلا جاتا ہے، مگر تھوڑی دیر میں شامو دادا کو بلا لاتا ہے۔ نوجوان، غنڈوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بحث بڑھ جاتی ہے اور چاقو نکل آتا ہے۔ قریب تھا کہ اس پر چاقو سے حملہ ہو کہ اس کی بیوی لپک کر اسے اندر گھسیٹ لیتی ہے اور دروازہ بند کر لیتی ہے۔ نوجوان کو یقین ہے کہ شامو دادا کا شراب کا دھندا غیر قانونی ہے اور قانون ضرور اس کی مدد کرے گا۔ وہ بیوی کے منع کرنے کے باوجود بچ بچا کر پولیس اسٹیشن جاتا ہے۔ رپورٹ لکھانا چاہتا ہے لیکن حوالدار اور کانسٹبل کی سطح پر اس کی شنوائی نہیں ہوتی۔ وہ ہمت نہیں ہارتا۔ بالآخر انسپکٹر کے سامنے جاتا ہے لیکن انسپکٹر کہتا ہے "مجھے اس کا افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ہم ابھی تمہارے ساتھ دو چار سپاہی روانہ کر سکتے ہیں اور اس کی مشکیں کسوا کر یہاں بلا سکتے ہیں مگر سوچو اس سے کیا ہوگا۔ وہ دوسرے ہی دن ضمانت پر چھوٹ جائے گا اور پھر تمہیں وہیں رہنا ہے۔" "مگر سر قانون" انسپکٹر کہتا ہے "قانون کی بات مت کرو۔ قانون ہم کو بھی معلوم ہے۔ پولیس تمہاری رپورٹ پر ایکشن لے سکتی ہے مگر چوبیس گھنٹے تمہاری حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتی"۔ اسے سمجھایا جاتا ہے "تم سیدھے سادے آدمی ہو۔ ہو سکے تو وہ جگہ چھوڑ دو، اگر وہیں رہنا چاہتے ہو تو پھر ان غنڈوں سے مل کر رہو"۔ وہ سکتے میں آ جاتا ہے۔ جتنی توقعات کے ساتھ آیا تھا، اب اتنی ہی ندامت ہوتی ہے۔ خاموشی سے اٹھ کر وہ تھانے سے باہر آ جاتا ہے۔ اپنے محلے میں داخل ہوتے ہوتے دیکھتا ہے کہ شامو کے اڈے پر دیسی ہی چہل پہل ہے اور گلاسوں کی کھنک اور پینے والوں کی بہکی بہکی گالیاں فضا میں تیرتی پھر رہی ہیں۔ وہ اپنے گھر کی طرف مڑنے کے بجائے شامو کے اڈے کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ غنڈے اسے دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ شامو لنگی اور بنیان پہنے باہر نکلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں اب یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ شامو

ٹی اوپر چڑھاتے ہوئے کڑک کر پوچھتا ہے۔ "اب کیا ہے" نوجوان نہایت پرسکون لہجے میں جواب دیتا ہے "پاؤ سیر موسمی اور ایک سادہ سوڈا"۔

ظاہر ہے یہ سماجی حقیقت نگاری کی کہانی ہے لیکن کیا واقعی ایسا ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے چند ضمنی باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے مثلاً
۱۹۷۰ء کے بعد کی نسل کو لفظوں کا جس طرح سے ہیضہ ہو گیا ہے اس کا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔ سلام کو بیانیہ پر قدرت حاصل ہے اور وہ بے ضرورت لفظ
ن نہیں کرتا۔ یہ وہ رشتہ ہے جو منٹو اور بیدی کے اثرات سے نئی نسل تک پہنچتا ہے۔ نئی نسل کے فن کار ان اثرات کے قائل تو ہیں لیکن نئی کہانی کے چکر
ں عام طور سے لفظوں کا بے جا صرف کرتے ہیں۔ بیس اکیس صفحے کی اس کہانی میں نوجوان افسانہ نگار نے بیانیہ کی تشکیل جس چابکدستی سے کی ہے وہ دیکھنے
ور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چوں کہ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں، میں اس کے ریلسٹ انداز کی صرف ایک آدھ مثال ہی دوں گا۔ گندی بستی کی منظر کشی
یانیہ کی جان ہے۔

"میں جیسے ہی گلی میں داخل ہوا، اس جانے پہچانے ماحول نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ٹین کی کھولیوں کے
چھجوں سے نکلتا ہوا دھواں، ادھر ادھر بہتی نالیوں کی بدبو اور ادھ ننگے بھاگتے دوڑتے بچوں کا شور،
کتوں کے پلّے، مرغیاں اور بطخیں۔ دو ایک کھولیوں سے عورتوں کی گالیاں بھی سنائی دیں جو شاید اپنے بچوں
یا پھر بچوں کے بہانے پڑوسنوں کو دی جا رہی تھیں"

اس طرح مکالموں میں غنڈوں کا لہجہ بھی احتیاط سے لایا گیا ہے۔ جب مرکزی کردار گھر میں بوتلیں چھپانے سے منع کرتا ہے تو شامو دادا کا چھوکرا پہلے
تھوڑی دیر تک اسے گھورتا ہے پھر کہتا ہے "اپن کو نہیں معلوم، دادا نے یہاں چھپانے کو بولا تھا" پھر نوجوان کے ڈانٹنے پر چھوکرا، پہلے تو بوتلیں اپنے
یلے جھولے میں رکھ لیتا ہے، لیکن جاتے جاتے مڑ کر کہتا ہے:

"ساب جاستی ہوسیاری دکھائے گا تو بھاری پڑے گا۔ یہ نہرو نگر ہے"

گندی بستی کا نام نہرو نگر طنز کا پہلو لیے ہوئے ہے اور یہ بھی ملاحظہ ہو کہ غنڈے اس کو سب سے محفوظ و مامون جگہ سمجھتے ہیں۔ سلام کے
حقیقت پسندانہ اسلوب کا ایک اور طاقت ور پہلو بیوی کے خوف اور گھبراہٹ کی تصویر کشی ہے۔ ایک طرف غنڈوں کی یلغار ہے۔ دوسری طرف نوجوان
کی اور قانون کے نظام پر اعتماد ہے، اور تیسری طرف بیوی کی سراسیمگی جو ہر روز رات کو سونے سے پہلے ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان گھر بدلنے
ذکر ضرور کرتی ہے۔ نوجوان کی غنڈوں سے آویزش و پیکار کے بیچ بیچ میں جس فنکارانہ چابکدستی سے پانی کے ہنڈوں، سنڈاس کی لائن، اور نل
جھگڑوں، زلیخا کے آٹا دھار مانگ کر لے جانے کی بپتا، اور ہر اتوار کے سرپھٹول کی جو تصویریں بار بار ابھرتی ہیں، وہ بستی کے گھناؤنے
ہوؤں کو فن کارانہ معروضیت کے ساتھ بے نقاب کرتی ہیں۔ کہانی کے اس سیدھے سادے ریلسٹ ڈھانچے کے سیدھے سادے معنی یہ ہیں کہ
انسان بدی کا مقابلہ کرنا بھی چاہتا ہے تو کر نہیں سکتا۔ موجودہ بدکار نظام میں جہاں پولیس غنڈوں کے ساتھ ملی ہوتی ہے، وہ بدی کے ساتھ مفاہمت
رکے رہنے پر مجبور ہے۔ یہ کہانی اگر اتنی سی بھی ہوتی تو اچھی تھی۔ لیکن حقیقت نگاری کے اسلوب میں ہوتے ہوئے بھی یہ کہانی صرف اتنی سی نہیں ہے۔ یہ اس سے
گے بھی جاتی ہے۔ یوں تو ہم جدیدیت کی موافقت اور اس کے رد میں خاصا زورِ بیان صرف کرتے ہیں اور اس کی شعلہ بکف بغاوت کی باتیں کرتے
ہوئے انتہائی ہیجان انگیزی کا شکار بھی ہو جاتے ہیں، لیکن نہیں دیکھتے کہ اس کے خاموش اثرات کتنے دور رس ہیں۔ یہ کہانی اگرچہ علامتی کہانی نہیں
ہے اور واضح طور پر حقیقت نگاری کی کہانی ہے، لیکن یہی کہانی اگر تیس پینتیس برس پہلے لکھی جاتی تو مقصدیت کی دلدل میں پھنسی ہوتی اور افسانہ
گار نے قدم قدم پر جذباتیت کے طوفان اٹھائے ہوتے اور قاری کے جذبۂ ترحم کو بیدار کیا ہوتا اور کچھ نہ کچھ پند و نصائح کے دفتر بھی ضرور کھولے
وتے۔ آج کا نیا افسانہ نگار خواہ وہ علامتی افسانہ نگار نہ بھی ہو، پھر بھی وہ حقیقت نگاری کے غیر تخلیقی، سماجیاتی اور جذبات زدہ رومانی رویّوں
ے خبردار ہو چکا ہے۔ آج اگر کہانی کے فنی اور ادبی تقاضوں کو سمجھا جانے لگا ہے تو نئی کہانی کا سفر غلط راہ پر نہیں تھا۔ یہاں شمس الرحمٰن فاروقی کی اس
ات کی وضاحت ضروری ہے کہ وہ کہانی جو تاریخی سماجی دستاویز کے طور پر پڑھی جا سکے، رد ہو چکی ہے۔ "انجام کار" آپ کے سامنے ہے۔ یہ ہمارے
معاشرے کے بدترین پہلوؤں کا طنزیہ ہے۔ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کہانی رد ہو چکی ہے۔ شاید شمس الرحمٰن فاروقی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ وہ تخلیقی رویے اور
تنقیدی رویے جو ادب کی قدر شناسی محض سماجیاتی دستاویز کے طور پر کرنا چاہتے ہیں، وہ رد ہو چکے ہیں یا رد ہو جانے چاہئیں۔ یہ سچ ہے کہ جدیدیت

کے اثرات اور کہانی کے باغیانہ شعور نے جو بنیادی طور پر ادبی اقدار کی بحالی کا شعور ہے، اُن غیر ادبی اور غیر تخلیقی رویّوں کو بے تنک رد کر دیا ہے جو کہانی کو وہ موضوع و مواد جانتے تھے۔ جدیدیت مثبت ہزار شیوہ [illegible] ہے۔ تحریکیں آتی جاتی [illegible] رہتی ہیں، رجحان پیدا ہوتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ لیکن جانے والا سیلاب نئی کھیتیوں کو سیراب کر جاتے ہیں اور نئی نسلوں کا [illegible] جاتے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں میں بائیں بازو کے فن کار بھی ہیں، سیاسی سماجی اور اخلاقی اسٹبلشمنٹ کے باغی ریڈیکل بھی [illegible] اور وہ فن کار بھی جو قدیم ثقافتی یا مذہبی اقدار کے سرچشموں سے فیضان حاصل کرتے ہیں۔

نیا افسانہ COMMITMENT کا افسانہ بھی ہے [illegible] اور نا وابستگی کا بھی۔ جیسے محض موضوع اور مواد کی بنا پر افسانے کے ادبی معیار کی ضمانت نہیں دی جاسکتی، اسی طرح وابستگی یا نا وابستگی بھی اس کے نئے پن کی واحد پہچان قرار نہیں پا سکتی۔ کہانی خواہ علامتی ہو یا حقیقت نگاری کی، میرا تقریباً [illegible] اصل مسئلہ اس کی گہری سطح یعنی معنوی سطحیت یا معنیاتی تہہ داری کا ہے اور جیسا کہ میں دکھا چکا ہوں یہ کام تخلیقی رویّے اور زبان کے استعمال [illegible] فاعل کا ہے، جو تمثیل کا بھی راز ہے اور علامت کا بھی، اگرچہ اس کی توسیع اور ترفع الگ الگ طور پر ہوتا ہے اور بہت کچھ فن کار کی اپنی ذہنی اور تخلیقی صلاحیت پر منحصر ہے۔ ایک نہایت معنی خیز علامت ایک معمولی فن کار کے ہاتھوں نہ صرف اپنا منہ چڑا [illegible] ہے بلکہ مہمل بن کے رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف حقیقت نگاری کی کہانی میں خواہ علامت کا استعمال شعوری سطح پر نہ ہو، تاہم اگر فن کار کو بیانیہ اور اس کے معنیاتی انسلاکات پر قدرت حاصل ہے تو اس میں سے از خود علامتی مفاہیم کی شعاعیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ کاش اتنی گنجائش ہوتی تو میں "انعام کا یہ ایک ایک موڑ سے اس کی مثالیں پیش کر سکتا تھا۔ مختصراً اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ بات محض قانون کی بے بضاعتی کو بے نقاب کرنے اور بدی سے مفاہمت کرنے کی نہیں۔ اس کا نفسیاتی پہلو یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بدی انسانی فطرت میں رفتہ رفتہ نفوذ کرتی ہے۔ ہمارے وجود میں خیر و شر دونوں ہیں۔ وہ نوجوان بدی کو بار بار ٹھکراتا ہے "گلی کی گندگی جب تک گلی میں تھی تو کوئی بات نہیں تھی مگر اب وہ گندگی میرے دروازے تک پھیل آئی اور یہ بات کسی بھی شریف آدمی کے لئے چیلنج ہے" اگرچہ بیوی بار بار کہتی ہے "جانے دیجئے، رکھ لینے دیجئے، اپنا کیا جاتا ہے"۔ لیکن نوجوان کا بدی سے مقابلہ جاری رہتا ہے۔ تھانے میں جاکر جو قانون کی پناہ گاہ ہے، ایک کے بعد ایک اسے اہانت آمیز سلوک کا سامنا ہوتا ہے اور ہوتے ہوتے نیکی کی فطری RESISTANCE کم پڑ جاتی ہے اور بالآخر بدی غالب آجاتی ہے۔

تیسری نفسیاتی جہت اور بھی ہے اور اس کا سررشتہ بھی پوری کہانی میں نوجوان کے کردار میں ملتا ہے۔ وہ معمولی طاقت اور معمولی وسائل کا انسان ہے۔ وہ جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا ہے۔ پیار سے سمجھا بجھا کر شامو کے چھوکرے کو بھگا دیتا ہے لیکن جب شامو دروازے پر آدھمکتا ہے تب بھی وہ چاہتا ہے کہ بحث نہ بڑھے، لیکن غنڈے اس کے سامنے گڑھ میں بوتلیں گاڑ دیتے ہیں۔ وہ غصے سے اندر ہی اندر کھولتا ہے، شامو کہتا ہے "ا! تو کیا کرے گا ہمارا تیری ماں کی... مادر... سالا۔ ایک جھاڑ میں مٹی چاٹنے لگے گا۔ تیرے قانون کی ماں کی!" پھر جا تو بھی نکل آتا ہے۔ اب بھاگنا بھی نہیں۔ بھاگنے کا مطلب ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پڑوسیوں کی نگاہوں میں مر جانا۔ چنانچہ جب بیوی اسے لپک کر اندر کھینچ لیتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے "میرا لاشعور بھی شاید اسی میں اپنی عافیت سمجھ رہا تھا... ندامت، غصہ اور خوف میری عجیب کیفیت تھی!" اب صرف بدلے کی خواہش باقی رہ گئی تھی۔ پہنچ کر بھی یہ بدلے کی خواہش پوری نہیں ہوتی۔ واپسی میں اڈے پر آکر بیٹھنے کا عمل محض بدی سے مفاہمت کا عمل نہیں ہے۔ یہ محض بدی کے فطرت میں نفوذ کر جانے اور نیکی کی RESISTANCE کے ختم ہو جانے کا عمل بھی نہیں ہے۔ اس میں IRONY کا لطیف پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ شاید ان حالات میں بدلہ لینے اور فتح مندی کے احساس سے سرشار ہونے کا واحد راستہ یہی تھا کہ اسی اڈے پر بیٹھ کر "پاؤ سیر موسمبی اور سادہ سوڈا کا آرڈر دیا جائے۔ تبھی تو یہ سنتے ہی شامو کے ہاتھ سے لنگی کے چھور چھوٹ جاتے ہیں۔ افسانے کے یہ جملے بے مصرف نہیں ہیں" چند ثانیوں کے لئے کیوں نہ ہو، اس وقت وہ (شامو) مجھے بہت بے بس نظر آیا۔ اور ان (غنڈوں) کی بے بسی کو دیکھ کر مجھے اندر سے راحت کا احساس ہوا"۔ کہانی کا آخری جملہ IRONY کے اس احساس کو اور بھی شدید کر دیتا ہے۔

چند سیکنڈ تک کوئی کچھ نہ بولا۔ میں نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں آگے کہا: "ایک پلیٹ بھنی ہوئی کلیجی بھی دینا!"

ظاہر ہے کہ کردار شکست و ریخت کے عمل سے گزرنے کے بعد تعمیرِ نو کی منزل سے گزرتا ہے۔ چوتھے یہ کہ اس کہانی کی وجودی معنوی جہت بھی ہو سکتی ہے، جس کے نشانات پورے بیانیہ میں ایک سے زیادہ مقامات پر روشن نظر آتے ہیں۔ کہانی شروع ہی اس طرح ہوتی ہے:

آج شام تو آفس سے گھر لوٹتے وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حالات مجھے اس طرح پیس کر رکھ دیں گے۔ میں چاہتا تو اس سانحے کو ٹال بھی سکتا تھا۔ مگر آدمی کے لئے ایسا کر سکنا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ کچھ باتیں ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کی حدود سے پرے ہوتی ہیں اور شاید ایسے غیر متوقع سانحات ہی کو دوسرے الفاظ میں حادثہ کہتے ہیں۔ جو بھی ہو، میں حالات کے غیر مرئی شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور اس سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔"

حالات کے جبر کی یہ زیریں لہر پوری کہانی کے باطنی احساسات میں جاری و ساری رہتی ہے۔ بیوی جانتی تھی کہ اس کا میاں کلرک ہے اور مالی حالت اچھی نہیں مگر پھر بھی ایک عام گھریلو عورت کی طرح ایک اچھے گھر کی خواہش کو وہ اپنے دل سے الگ نہیں کر سکتی، گندی بستی کے ماحول میں خاصی پریشانی تھی۔ "مگر صرف پریشانی سے کب کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے"۔ جب چاقو کھلنے کی آواز آتی ہے تو :

جسم میں سر سے پیر تک چیونٹیاں رینگ گئیں۔ میری انتہائی کوشش کے باوجود حالات میرے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ ایک لمحہ کو میں سر سے پیر تک کانپ گیا۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ اس قسم کی سچوئیشن سے دوچار ہوا تھا۔"

وہ کھولی میں رہنا نہیں چاہتا مگر رہنے پر مجبور ہے۔ وہ جھگڑا کرنا نہیں چاہتا مگر جھگڑا ہو جاتا ہے۔ وہ بے بسی سے بچنا چاہتا ہے مگر اسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ غصہ کرنا نہیں چاہتا لیکن غصے سے لرزتا ہے۔ وہ شامو کے دیسی اڈے کو برداشت نہیں کر سکتا لیکن سیخ کباب والے کی انگیٹھی کے کوئلے اس کے دل میں دہکتے ہیں۔ وہ تھانے جانا نہیں چاہتا لیکن جاتے پر مجبور ہے۔ وہ بے ہودہ کانسٹبل کو جو ہتھیلی پر تمباکو اور چونا ملتا نظر آتا ہے، قانون کا محافظ بنانا نہیں چاہتا لیکن اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ وجود کے جبر اور آزادی کے اختیار کی اس کشمکش سے نڈھال جب وہ تھانے سے نکلتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت یہ ہے: "نہیں مجھے کوئی کمپلین نہیں لکھوانی ہے"۔ وہ بالکل خالی الذہن ہے۔ نالیوں سے اٹھنے والی بدبو کے بھبکے اس کا استقبال کرتے ہیں، اور بالآخر وہ وجود کی اس ناگزیریت میں حلول کر جاتا ہے۔ گویا اس کہانی میں باوجود حقیقت نگاری کے پیرایے کے کئی معنوی ابعاد ہیں، جبکہ "بجوکا" میں جس کا ذکر پہلے آیا تھا باوجود علامت کے استعمال کے کہانی معنوی اعتبار سے کمزور اور تضادات کا شکار ہو گئی ہے۔ گویا جس طرح یہ ممکن ہے کہ حقیقت نگاری کی کہانی میں تہہ داری پائی جاتے، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ علامت نگاری کے باوجود کہانی کمزور اور بودی ہو۔

(۷)

باتیں سامنے کی تھیں لیکن جب مسئلہ گمبھیر ہو تو سامنے کی باتوں کو بھی مدلل بیان کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو بہر حال واضح ہو ہی چکا ہے کہ داستانوی افسانہ جس میں تمثیلی، استعاری، کتھا کہانی قصہ اساطیر سب شامل ہیں، علامتی تمثیلی افسانے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اب اس بات کو ذہنوں سے نکال دینا چاہئے کہ صرف علامتی افسانہ ہی نیا افسانہ ہو سکتا ہے، کیونکہ حقیقت نگاری کا افسانہ بھی اگر وہ حقیقت کی سطحی تعبیر پر مبنی نہیں اور معنوی تہہ داری کی بھی خبر دیتا ہے، تو وہ نئے کے ذیل سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس مضمون کے شروع میں ہم نے انیس ناگی کے اعتراضات کا ذکر کیا تھا۔ قطع نظر بعض فروعی باتوں کے اُن کے جس بیان سے یہاں تعرض ضروری ہے وہ یہ ہے :

"اردو میں نیا افسانہ لکھتے ہوئے کہانی سے گریز ریلسٹ اسلوب کی جبریت سے رہائی کی شکل ہے۔"

گویا وہ صرف سرریلسٹ افسانے ہی کو نیا افسانہ کہتے ہیں۔ مجھے اس بات کے تسلیم کر لینے میں کوئی تامل نہیں کہ سرریلسٹ طریقۂ کار کو برتنے کی کئی کوششیں نئے افسانے میں ہوتی ہیں۔ یہ وجود کی لاشعوری اور غیر منطقی سطحوں کی ترجمانی کا عمل ہے SURREAL کا اصل مطلب بھی یہی ہے کہ حقیقت سے ماورا حقیقت سے بعید۔ اس پیرایۂ بیان میں لفظوں کے بے ترتیب صرف اور CHANCE EFFECTS کو یا اُن جھلکیوں کو بہت دخل ہوتا ہے جو خوابوں کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ انیس ناگی نے افتخار جالب کے ساتھ مل کر لسانی تشکیلات کے نام سے جو تحریک چلائی تھی، اس کا حشر سب کے سامنے ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ بھائی لوگوں نے اردو بولنے والے معاشرے کی ذہنی افتاد، جمالیاتی مزاج اور ادبی روایت کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اکا دکا ایسی تجرباتی کوششوں میں کوئی خرابی نہیں، لیکن پورے ادبی قافلے کو مغربی تقلید کی کورانہ ڈگر پر ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

…بت کو نقصان ہی نہیں، معاشرتی اور قومی سطح پر بھی، جس کے آج کل بعض لوگ بہت بڑے نقیب بنتے ہیں، شدید طور پر ضرر رساں ہے۔ نئی کہانی کے
…تے ہوئے نہیں بھولنا چاہیے کہ زبان ہمیشہ پرانی ہوتی ہے۔ چند لفظوں کے داخل کرنے سے زبان نئی نہیں ہو جاتی۔ البتہ ہر عہد کا ادب یا ہر
جب احساس و تصور کی نئی کائنات کو دریافت کرنے کے عمل سے گزرتا ہے تو ان ہی پرانے لفظوں کے DEEP STRUCTURE تخلیقی عمل
سے بدل جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ عام لفظ بھی دراصل علامتیں ہیں جو کثرتِ استعمال سے اپنے مفاہیم میں محدود ہو جاتے ہیں۔ میں لسانیات سے
…تا ہوں اور اس بحث کو بہت دور تک لے جا سکتا ہوں، لیکن یہاں نہ وقت ہے نہ گنجائش۔ نہیں بھولنا چاہیے کہ لفظوں کی تعداد محدود ہے لیکن
…کے استعمال کے امکانات لامحدود ہیں۔ کروڑوں اربوں بار لفظوں کو برتا گیا ہے اور خدا جانے کتنے اربوں کھربوں بار جب تک یہ زمین اپنے
…لوم رہی ہے کسی بھی زبان کے لفظ اپنی نئی نئی شکلوں میں برتے جائیں گے SAUSSURE کا کہنا ہے:

> "زبان میں عملی سطح پر SIGNIFIANT اور SIGNIFIE کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا اور
> زبان میں کوئی SIGNIFIE نہیں ہے جس کا SIGNIFIANT نہ ہو۔ اس کا الٹ بھی صحیح
> ہے، یعنی کوئی معنی، کوئی تصور، کوئی مفہوم اس وقت تک اپنا وجود نہیں رکھتا جب تک اس کو اس کا اظہاری
> پیکر نہ مل گیا ہو، خواہ وہ باطنی طور پر تخیل کی وجہ سے ہو یا خارجی طور پر تقریر و تحریر کے ذریعے ہو۔"

حق بات یہ ہے کہ تخلیقی زبان میں SIGNIFIE ہرگز ہرگز DEFINABLE نہیں ہے۔ SIGNIFIANT جب خارجی سطح پر
…ہوتا ہے تو لفظ اور معنی میں بالعموم ایک اور ایک کی نسبت ہوتی ہے اور جب وہ خارجی کائنات سے پرے دیکھنے کیلئے یعنی SUPER REAL
HIGHER WORL… کے لئے استعمال ہوتا ہے تو استعارے کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے۔ علامت اسی استعاراتی عمل ہی کی توسیع شدہ
…ہے۔ واضح رہے کہ علامت کا یہ تصور ہم نے مغرب سے لیا۔ چنانچہ اگر خالص علامتی افسانے بہت کم لکھے گئے تو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ علامت کے اتنے
…کے باوجود ایسا کیوں ہے؟ زبان کے استعاراتی تفاعل کے کتنے دوسرے پیرایے ہماری زبان کے جسم میں خون کی طرح جاری و ساری ہیں۔ شاعری
…انہ، مجازِ مرسل، اشارہ، رمز، کنایہ سب اسی کے روپ ہیں، اور پھر خود استعارے کی بیسیوں اقسام ہیں۔ فکشن میں زبان کا یہی استعاراتی
…، اساطیر، تمثیلوں، کتھاؤں، کہانیوں اور حکایتوں میں ملتا ہے۔ کیا یہ محض ایک حادثہ ہے کہ صدیوں تک عوامی اور ملفوظی فکشن کے یہ پیرایے
…ے جمالیاتی احساس کے تقاضوں کو پورا کرتے رہے ہیں، اور زندگی کے بارے میں ہماری آگہی اور بصیرت کو بڑھا کر لطف و انبساط کا
…ن فراہم کرتے رہے۔ کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ان کا سب سے قدیم خزانہ پنچ تنتر کی کہانیاں تھیں جن کی اصل وقت کی دھند میں کھو چکی ہے۔
…بھدر کا جو نسخہ دوسری صدی عیسوی کا دستیاب ہے، اس کا اثر پوری دنیا کے افسانوی ادب پر پڑتا رہا ہے۔ سوم دیو کی "کتھا سرت ساگر"
…جلدوں میں ہے، اور نارائن کی "ہتوپدیش" بھی پنچ تنتر کی کہانیوں سے بالکل الگ نہیں۔ یہی حال پرانوں کی سینکڑوں ہزاروں کہانیوں کا ہے۔
…ان عادل کے بارے میں چھٹی صدی عیسوی میں پنچ تنتر کا ترجمہ پہلوی میں ہوا اور نویں صدی عیسوی تک اس کا عربی روپ "کلیلہ و دمنہ" کے نام
…ری اسلامی دنیا میں پھیل گیا۔ آگے چل کر اسلام ہی کی وساطت سے ان کہانیوں کا نفوذ یورپی ادب میں ہوا۔ بید پائے کی کہانیاں ہوں یا الف لیلیٰ
…ہے یا گلستان کی حکایتیں ان سب میں قدیم ہندوستانی روایت اسلامی ایرانی روایتوں کے پہلو بہ پہلو موجزن رہی ہے۔ یہی معاملہ پانچویں
…ل قبل مسیح جاتک کہانیوں کا ہے جو مہاتما بدھ سے متعلق ہیں، یا تیرہویں صدی عیسوی کی مثنوی رومی کی حکایات کا ہے جن میں دنیا بھر کے
…نوں کے نہایت وسیع سلسلے کہاں کہاں سے آکر عجیب و غریب روحانی و تخلیقی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس ساری روایت میں اس "خالص علامت"
…تصور نہ تھا جسے ہم نے ابھی چند دہائیاں پہلے مغربی ادب سے لیا۔ نہیں بھولنا چاہیے کہ افسانوی ادب کی ہماری صدیوں کی مہتم بالشان روایت
…ستعاراتی تفاعل کے تقاضے جن پیرایوں سے پورے ہوتے رہے ہیں ان میں ہمیشہ MYTH، LEGEND تمثیل، کتھا اور حکایتوں کا عمل
…رہا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ نیا افسانہ ان قصے کہانیوں کو جوں کا توں دہرانے سے اپنے عہد کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ البتہ اس
…خزانے سے اگر نئے نئے علامتی اور تمثیلی مفاہیم پیدا کئے جا سکتے ہیں جیسا کہ "نر ناری" کے تجزیے سے اوپر دکھایا گیا تو اس سے پریشان ہونے
…خالص علامت" کی دہائی دینے کی ضرورت کیا ہے؟ اس بات پر اصرار کرنے کی ضرورت ہے کہ فکشن میں اصل معاملہ پہلودار معنیات اور

[باقی صفحہ ۶۱ پر دیکھئے]

قیصر قلندر

سکوتِ رنگ خلاؤں کے پار اتر جائیں
نشاں سفر کا بنیں راہ میں ٹھہر جائیں

مزاجِ دل کو بھی راس آئی ہے نظر کی طرح
شراب، حُسن کی پی کر یہیں نہ مَر جائیں

بڑا عجیب سا موسم بڑی عجیب فضا
فرازِ درد سے اتریں تو ہم کدھر جائیں

بدن کے شہر سے نکلیں تو پھر نجات ملے
خطوط، زاویے، محراب سب سنور جائیں

قریبِ دل کے وہ یادوں کا رَت جگا ہوگا
حِصارِ شب کو جو توڑیں تو کام کر جائیں

گرفت ایسی ہے تیرے بدن کی خوشبو کی
رِہا ہوئے بھی تو ڈر ہے کہ ہم کدھر جائیں

ہَوا کچھ ایسی چلی لے گئی مہک کے نشاں
چمن چمن اسے ڈھونڈیں نگر نگر جائیں

● گلراز - ۱۹۸ - جواہر نگر، سری نگر (جموں کشمیر)

تاج سعید

کاجل سے سجی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے دل گھبراتا ہے
برہا کی لمبی راتوں میں، کوئی دُکھ کے گیت سُناتا ہے

یہ رنگ بھری برساتیں بھی، نِت جی کا روگ بڑھاتی ہیں
بادل کی گرج میں ہردے کا سکھ چین بھی مٹتا جاتا ہے

یہ تیز ہوا، تنہا سائے، سورج کی تپش اور دل کی دُکھن
راہوں کی خموشی میں کوئی آشا کا دِیا جلاتا ہے؟

پَت جھڑ کا سماں اِس رُت میں مجھے برہا کی اگن دکھلاتی ہے
بچھڑے ہوئے ساتھی کا سایا جب اپنے پاس بُلاتا ہے

سنگیت کے سُر جب ماند ہوئے محفل میں اندھیرا پھیل گیا
اِس اُجڑی محفل کی رونق اب کون بڑھانے آتا ہے

● مکتبہ ارژنگ، پوسٹ بکس نمبر ۲۴۳، پشاور (پاکستان)

رنگ رلیاں

اشفاق احمد ● داستان سرائے - ۱۲۱ سی ماڈل ٹاؤن - لاہور (پاکستان)

اس نے اپنی پشت پر ایک چھوٹے سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس دباؤ میں گرمی بھی تھی اور ٹھنڈک بھی، کچھ حجاب بھی تھا اور ذرا سی بے تکلفی بھی
طالب نے پیچھے مڑ کر دیکھا ایک چھوٹی سی لڑکی کندھے پر تولیہ ڈالے سر جھکائے کھڑی تھی۔

وہ ابھی کرشن نگر کی بڑی سڑک سے گلی کا موڑ مڑا ہی تھا کہ اس کی مڈبھیڑ محلے کے ننگ دھڑنگ بچوں کے ایک گروہ سے ہو گئی تھی جو ہاتھوں میں مٹی کے ڈھیلے اٹھائے ایک نالی کے دہانے پر چاند ماری کر رہے تھے۔ مئی کی چلچلاتی دھوپ میں ننگے پاؤں ننگے سر پسینے میں نہاتے ہوئے یہ بچے اس بلے کو اپنے ڈھیلوں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ جو ان کے خوف سے بھاگ کر اس غلیظ نالی میں آ گیا تھا۔ طالب نے آگے بڑھ کر دیکھا سیاہ کیچڑ میں سنے ہوئے بلے کی تھوتھنی سے سرخ سرخ خون بہہ رہا تھا ایک آنکھ کیچڑ کے لیپ نے بند کر دی تھی اور دوسری چھپے ہوئے لیمن ڈراپ کی طرح چمک رہی
طالب نے آگے بڑھ کر بچوں کو دھمکایا ان کے ہاتھوں سے ڈھیلے چھینے اور ان کے پیچھے زور زور سے تالیاں بجا کر انہیں دور دور بھگا دیا
پھر وہ نالی کے پاس بیٹھ گیا بلے نے باہر نکلنے کی تمام تر کوششیں بالکل ترک کر دیں اور نالی کے سوراخ میں عین نیچے دبک گیا۔ طالب نے اپنی آستین چڑھا بازو پر بندھے ہوئے تعویذ کو اوپر بغل تک کھسکایا اور پرمنٹ کیمرہ فوٹوگرافر کی طرح پوری باہنیں سوراخ میں گھسیڑ دی۔ بلے نے اس آہنی پنجے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر پوری مدافعت کی ٹانگیں اکڑا کر نالی کی دیواروں میں اڑا دیں۔ چوں چوں کا نالہ بلند کیا۔ منہ کھول کر کاٹنے کی کوشش بھی کی لیکن طالب نے اپنی جدّوجہد جاری رکھی اور بلے کی مدافعتی کارروائی کے باوجود اسے نالی سے نکال باہر تپتی ہوئی زمین پر ڈال دیا۔ بلے کانی آنکھ سے پہلے تو اس کی طرف دیکھا پھر پوستین جھٹکی اور آخر میں "سب اچھا" کا کاشن پا کر دُم دبا کر بھاگ گیا۔

نالی کے کنارے بیٹھے بیٹھے طالب نے اپنی پشت پر ایک چھوٹے سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ایک چھوٹی سی لڑکی کندھے پر تولیہ ڈالے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس نے سر سے پیر تک لڑکی کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے پاؤں کے پاس سلور کا ایک لوٹا پانی سے لبالب بھرا تھا اور اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ایک بند صابن دانی تھی پھر طالب نے کہنی تک لتھڑی ہوئی اپنی باہنہ کو دیکھا جس پر چمٹے ہوئے کیچڑ سے بال صفا کی بُو آ رہی تھی۔ لڑکی نے لوٹا اٹھایا اور اس نے اپنا بازو نالی پر کر دیا۔ لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھ کر صابن دانی اس کے پاؤں کے پاس رکھ دی اور خود لوٹا اٹھا کر جھک گئی۔ جب کورے مٹکے کے ٹھنڈے پانی کی دھار اس کی باہنہ پر پڑی اور اس نے پلاسٹک کی ڈبیا سے رنگ کا آدھا گھسا ہوا وہ صابن باہر نکالا جو ایکٹریسیں اپنے حُسن کے نکھار کے لئے استعمال کرتی ہیں تو بال صفا کی بُو اور تیز ہو گئی۔

دو مرتبہ صابن لگانے اور لوٹا بھر پانی بہانے کے بعد بھی جب طالب کی تسلّی نہ ہوئی اور اس نے بچّی کے کندھے سے تولیہ نہ اتارا تو سامنے کی کھڑکی سے آواز آئی۔

"رانی پانی اور لے جا"

طالب نے چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ سفید ململ کا کلیوں والا کرتا پہنے کھڑی تھی اور اس کے سینے پر چاندی کے بٹنوں کی زنجیر لٹک رہی تھی۔ طالب کو اپنی طرف اس طرح دیکھتے پا کر وہ ایک دم پلٹی اور اس کے جوڑے میں گندھے ہوئے موتیے کا ایک پھول ٹوٹ کر نیچے گرا۔ رانی پانی کا دوسرا لوٹا بھر کر لائی تو طالب نے پوچھا "یہ تمہاری کون ہیں؟" رانی نے سر نیوڑا کر اور گردن گھما کر کہا "میری باجی ہیں"

طالب نے کہا "بہت اچھی ہیں تمہاری باجی تمہیں مارتی وارتی تو نہیں ؟"

"نہیں" رانی نے کھلکھلا کر کہا "باجیاں بھی کوئی مارا کرتی ہیں" طالب نے کہا "میری باجی تو ـــــــ" اور پھر وہ ایک دم خاموش ہوگیا۔

رانی نے اٹھلا کر پوچھا "کیوں آپ کی باجی آپ کو مارتی ہیں کیا ؟"

طالب نے اپنے آپ سے کہا "ہاں بس ایک دفعہ مارا ہے اور عمر بھر کے لئے ہم سب کو مار کے رکھ دیا ہے" رانی نے حیران ہو کر پوچھا "پھر بھی آپ اپنی باجی سے بولتے ہیں ؟" طالب اٹھ کھڑا ہوا اور تولئے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولا "ہم تو اس سے بولتے ہیں پر وہ ہی ہم سے بولنا پسند نہیں کرتی" اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے رانی کا سر پیار سے سہلاتے ہوئے کہا "اپنی باجی سے کہنا" رانی نے اثبات میں سر ہلایا اور لوٹا اور صابن اٹھا کر اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

اس گھر کی پہلو والی گلی میں اس گھر کے پچھواڑے طالب کو جانا تھا۔ مضبوط اینگل آئرن کے فریم میں لہریا ٹین کی چادروں کو جکڑ کر بنا پھاٹک اندر سے بند تھا۔ اس نے پھاٹک ڈھکیلنے کی کوشش کی لیکن چادریں دھوپ کی حدت سے انگارہ سی گرم تھیں اور ان پہ ہاتھ رکھا جاتا تھا۔ طالب نے پھاٹک کو انگلی سے بجایا اور پھر پھاٹک پر لگی ہوئی بانس کی توسی سیڑھی میں عشق پیچاں کی بیل کو دیکھنے لگا جس میں اکا دکا کاسنی پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر پھاٹک کو بجایا اور برجی پر لٹکتی ہوئی نیم پلیٹ کو دھپا مار کر اس پہ سے گرد جھاڑی۔ تختی تپتپائی اور اس پر لکھے ہوئے "محمد حنیف اے ایل ایم" کے حروف دو چند، سہ چند بلکہ دہ چند ہو کر کانپے اور پھر اپنی جگہ جا بیٹھے۔

پھاٹک کھلا دو فٹ چوڑے تنگاف کے سامنے ایک سادھو کھڑا تھا۔

گیروے رنگ کی چادر گلے میں باندھے، کلائیوں میں مرتے منکوں کی مالا۔ پاؤں میں کھڑاویں۔ کانوں میں لاکھ کے بالے اس نے طالب کو آشیرواد دی اور پھر بڑے سادھارن طور پر کہا "کیا بات ہے بابا۔ کیسے آئے ؟"

طالب دیر تک بھونچکا کھڑا رہا۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آیا تھا لیکن یہاں کوئی سادھو نہیں تھا۔ اس دن گو حنیف اسے اس پھاٹک پر ہی لا تھا لیکن آثار بتلاتے تھے کہ یہ گھر ہی تھا کوئی مٹھ نہیں تھا۔ جب سادھو نے طالب کو اس طرح مورتی بنے دیکھا تو اس نے پھر بڑے پریم سے پوچھا "کہو بابا کس سے ملنا ہے ؟"

طالب نے گلا صاف کر کے کہا "جی مجھے حنیف صاحب سے ملنا ہے"

"تو اندر آؤ" سادھو نے کو ملتا کے ساتھ کہا "میاں دھوپ میں کھڑے کیوں حیران ہو رہے ہو" طالب اندر داخل ہوا تو سادھو نے پٹ پھیر کر زنجیر ڈال دی اور کھڑاویں بجاتا ہوا کوٹھری کی طرف چل دیا۔

مکانوں کی پشتوں کے درمیان گھری ہوئی یہ جگہ کوئی چار مرلے سے زیادہ نہ ہوگی۔ تین مرلے کا صحن تھا اور ایک کونے میں ایک کوٹھری تھی۔ پھاٹک کے پاس پانی کا نل لگا تھا جس کی نالی کیاریوں کو پانی دے رہی تھیں۔ صحن کے بیچوں بیچ کوئی دو دو فٹ چوڑی چوڑی روشیں تھیں اور چاروں پلاٹوں میں پانی میں ڈوبی ہوئی گھاس کہیں کہیں سے سر نکال رہی تھی۔ ان پلاٹوں کے کناروں پر موتیے اور گلاب کے پودے تھے جو دھوپ کی حدت سے سنولائے تھے۔ طالب دونوں روشوں کے کٹاؤ پر کھڑا دیر تک اس ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ گرمیوں کی سہ پہر تھی لیکن گرمی کا وہی عالم تھا جو ایک ڈیڑھ بجے دن کے ہوتا ہے۔ اس نے دھول میں اٹے ہوئے گلاب اور موتیے کے پھولوں کو دیکھا اور پھر ایک نظر کوٹھری پر ڈالی۔ سادھو دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب طالب اس کی طرف بڑھا تو وہ مسکرایا اور اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے الکھ نرنجن کا دھیما سا نعرہ مار کر اندر کوٹھری میں داخل ہو گیا۔

کوٹھری میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھجور کی چٹائی بچھی تھی اور اس پر حنیف، ایک اور نوجوان اور سادھو آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اندر اگر بتیاں سلگ رہی تھیں، روشنی بہت کم تھی اور باہر کے مقابلے میں یہاں بڑی ٹھنڈک تھی۔ طالب کو دیکھ کر حنیف نے اللہ ھو کا نعرہ مارا اور ذکر کرنا چاہنے لگا۔ طالب دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا تو سادھو نے کہا "بیٹھو بیٹھو بابا کھڑے

[illegible]

[illegible] رہا تھا۔ حنیف کے بدن پر چھوٹے چھوٹے گھنگھرو والا ایک لمبا سا کرتا تھا جو اس کی پنڈلیوں تک جھول رہا تھا۔ اس کے سر [illegible] والی ٹوپی تھی اور وہ چٹکیاں بجا بجا کر اور منہ سے چھا چھا چھا چھو کی آواز نکال کر گا رہا تھا۔

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم   مگر نازم بہ ایں قسمت کہ پیشِ یار می رقصم

[illegible] یا محمد قیصم کی تکرار کرتا تو دونوں ہتھیلیاں دیوار پر رکھ کر اپنا سر زور زور سے دیوار پر مارتا اور سارا کمرہ اس کی سر شوری سے [illegible] سادھو آنکھیں موندے کھڑی پہاڑی پر باز و جمائے گیان دھیان میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا اور داڑھی [illegible] تھی پسینے کے قطرے اس کے چہرے پر عیاں تھے پر وہ اپنی لگن میں سنسار سے ناطہ توڑ کر بیٹھا تھا۔

حنیف سجدے میں گر کر چٹائی کو دونوں ہاتھوں سے نوبت کی طرح بجا رہا تھا اور سانپ کے پھن کی طرح آدھا دھڑ زمین سے اٹھا [illegible] فریاد کر رہا تھا۔

بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہِ جانبازاں   بہ صد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم

[illegible] ورد کرتے کرتے وہ سجدے سے اٹھا اور کوٹھڑی میں پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔ پھر اس نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا اور اپنے چہرے [illegible] سے لال کر دیا۔ اچانک اس سیاہ فام نوجوان نے جو صرف ایک جانگیہ پہنے تھا تسبیح پر اپنا ہاتھ روک لیا اور آنکھیں کھول کر [illegible] کی طرف دیکھ کے بولا "بابو!"

علم خدا دی علم پڑھ دی اساں اکا مطالعہ یار دا اے
جنہاں بکول کے عشق کتاب ڈٹھی حرف دے سب دس والے
جنہاں یار دے، تاں دا سبق پڑھیا اوسکے جانہ صبر قرار دا اے
جیڑے ملاں نوں فکر نماز دا اے تے اینہاں عاشقاں طلب دیدار دا اے
الف اِن بن ان بن ان بن تکیں اک سمجھ اساڈڑی رمز میاں

[illegible] تینوں آرام سے بیٹھ کر۔ الف اَن بن اِن بن اُن بن تکیں اک سمجھ اساڈڑی رمز میاں کا ورد میٹھے اور سریلے بولوں میں کرنے لگے۔ طالب [illegible] یکم سم حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ اس ورد کی ہوک سے سارا کمرہ دچتہ وینا کی طرح آہیں بھرنے لگا۔ جب یہ ورد تھا تو سادھو [illegible] ہوا میں اٹھا کر حنیف نے کہا "بابا تیرے گھر بھگوان آتے ہیں" حنیف دونوں ہاتھ جوڑ کر طالب کے سامنے بیٹھ گیا۔ طالب گھبرا کر [illegible] آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کل اپنے دوست مسعود سٹینو سے مجھے ملائیں گے لیکن آپ اس کے دفتر پہنچے ہی نہیں۔"

حنیف نے سجدے میں گر کر کہا "مجھ سے بھول ہوئی سائیں۔ میں بھول گیا۔ میں تیرا گنہگار ہوں، تیرا دین دار ہوں۔ سارا [illegible] گنہگار ہوں۔"

طالب نے کھسیانہ ہو کر کہا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں آخر آدمی بھول بھی سکتا ہے۔"

"آدمی" حنیف نے ہنس کر کہا "سائیں جی آدمی! آ ہا ہا۔ گیانی جی آدمی کیا ہوتا ہے؟" اور وہ سیاہ فام نوجوان جو تسبیح پڑھ [illegible] دیوار سے ٹیک لگائے بولا "آدمی بہت بڑی چیز ہے۔ ہم تو آدمی کے پیر کی دھول بھی نہیں۔"

[illegible] نہیں نہیں۔ سادھو نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اس کے پھوڑے کہنیوں تک آگرے۔ پھر حنیف نے سادھو کے پیر [illegible] دیکھا۔"

[illegible] اس کا کندھا تھپک کر کہا "دیکھا دیکھا۔ من پر سن ہو گیا۔ کلپنا مٹ گئی۔ [illegible]

[illegible] سادھو کے پاؤں اسی طرح پکڑے ہوئے بولا [illegible]

سادھو نے آنکھیں بند کر لیں تو حنیف نے اس کے پگوں پر سر رگڑ رگڑ کر کہنا شروع کیا ؎

ساجن تیرے روسڑے موہے آدر کرے نہ کوئے ۔۔۔ دُر دُر کرن سہیلیاں میں تُر تُر تاکوں توئے

پھر اس نے ایک دم پلٹ کر کہا یہ میرے مادھو لال حسین نے فرمایا ہے۔ میرے لال حسین نے میرے لال بادشاہ نے۔ میں تُر تُر تاکوں توئے۔ طالب کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ اس دنیا میں ہے یا کسی اور جگ میں پہنچ گیا ہے۔ یہ لاہور ہے یا بندرابن۔ کاشی ہے یا کرشن نگر۔ جس دن وہ پہلی مرتبہ حنیف سے ملا تھا تو حنیف اچھا خاصا اس کی طرح آدمی تھا۔ اس کی جیب میں پلاس تھا کندھے پر پرسی۔ ٹی تار کا گچھا تھا اور اس نے نیلے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ چلتے وقت اس نے اپنا تعارفی کارڈ بھی طالب کو دیا تھا جس پر محمد حنیف اے ایل ایم لکھا تھا اور تھوڑی دیر کارڈ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد طالب نے ڈرتے ڈرتے اس سے اے ایل ایم کا مطلب بھی پوچھا تھا جو شاید غلطی سے ایم ایل اے کی بجائے اے ایل ایم چھپ گیا تھا۔ اس وقت حنیف نے بڑے دوستانہ طریق پر اس کا کندھا تھپک کر کہا تھا "نہیں اس کا مطلب اسسٹنٹ لائن مین ہے۔ اور میں واپڈا میں ملازم ہوں ۔۔۔۔ اس کے کوئی ایک ہفتہ بعد طالب نے حنیف کو بتی والے چوک کے کھمبے پر چڑھے فیوز لگاتے بھی دیکھا۔ پر اب تو اس کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔

طالب کو یوں حیرت میں ڈوبے دیکھ کر سادھو نے کہا "کیا بات ہے بابا۔ کیا چنتا ہے تیرے من کو؟"

طالب نے دل کڑا کر کے کہا "سادھو مجھ پر اس آشرم کا بھید نہیں کھلا"

گیانی نے دیوار سے ٹیک توڑ کر کہا جب تک من اور تن میں چھینا جھپٹی رہے گی یہ بھید ہی رہے گا۔ جب تک من کی کوک فریاد نہ ہوگی یہ کواڑ بند ہی رہیں گے۔ باباجی فرماتے ہیں کوک فریدا کوک توں جیوں ٹانڈا جوار، جب لگ ٹانڈا نہ گرے تب لگ کوک پکار۔ کوک پکار کا نام سُن کر حنیف فریاد کرنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ بہہ نکلا۔ اس نے روتے روتے طالب کا ہاتھ تھام کر کہا "سائیں میں کیا ہوں؟ کچھ بھی نہیں ہوں نا۔ یہ سب مایا ہے ناں، یہ وجود فانی ہے ناں..... بول سائیں..... بول..... تو آج اگر جلدی آجاتا تو تجھے اپنے پیر سے ملاتا..... کیوں گیانی جی؟" گیانی نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "بڑی تڑپ دے گیا ہے تیرا پیر..... تیرا کیا ہم سب کا پیر۔ ہائے ہائے نہ لاہور میں کوئی اسٹیشن ہوتا..... نہ گاڑی ہوتی..... نہ گاڑی ہوتی نہ رکتی..... نہ ہم پیر کی زیارت کر کے دل کو زخم لگاتے..... اک او نکار..... اک او نکار ۔۔۔۔"

پھر سادھو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا "میں مٹھ کو اشنان کرا دوں" حنیف نے اس کے پیر پکڑ کر کہا "نہ سائیں تیرے چاکر موجود ہیں تیرے گولے حاضر ہیں..... سادھو نے جھک کر اس سے اپنے پیر چھڑاتے ہوئے کہا "اوم شانتی شانتی" اور کھڑاویں پہن کر باہر صحن میں نکل گیا۔

حنیف نے گیانی کے آگے ہاتھ باندھ کر کہا "گیانی جی آج ان کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اس دھوپ میں یہ ہمارے یہاں آتے، مجھ سے بھول ہوئی جو میں وقت پر وہاں نہ پہنچ سکا یہ اس کا روپ ہے اور میری وجہ سے آپ کو..... اس بڑی سرکار کو تکلیف ہوئی" گیانی نے آنکھیں بند کر کے سر پیچھے ڈھلکا دیا اور کہا "پراچِشت پراچِشت توبہ استغفار ۔۔۔۔ سوچ بابا لوک تو نے کیا کیا ۔۔۔۔"

طالب نے کہا "نہیں جی مجھے تو کوئی ایسی تکلیف نہیں ہوتی، میں سارا دن اسی طرح تو مارا مارا پھرتا ہوں"

"ہائے ہائے، گیانی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا" ہمارا بابا لوک حضرت سینٹ فرانسس بھی تو اسی طرح مارا مارا پھرتا تھا۔ ولیوں کا ولی ..... بندوں کا بندہ..... بابا لوک تو مارا مارا پھرتا ہے تو تو بھی ولی ہے"

حنیف نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے اور بے خودی کے عالم میں بولا "میری ماں..... میری بی بی حضرت رابعہ بصری بھی تو اسی طرح ماری ماری پھری تھی..... حضور نے فرمایا ۔۔۔۔" گیانی جی نے ایک دم ٹوکا، "ناں ناں ناں حضور کا نام یہاں نہ لینا..... ہم دنیا کے کتے ۔۔۔۔ لوبھی ۔۔۔۔ مایا کے بندے نہ بابا لوک..... دل کا میل دور کر کے یہ نام لینا..... نہ بابا لوک نہ بابا لوک....."

حنیف نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اس پر رقت طاری ہو گئی۔

باہر نل سے پانی کے تیز دھارے کی آواز آنے لگی۔

گیانی نے کہا "سادھو رات کا جاگا ہے بابا لوک، آج رات اسے پھر شوٹنگ پر جانا ہے میں جا کے بگیا سینچتا ہوں"

حنیف نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر بٹھا لیا اور کہا "گیانی جی چاکروں کے ہوتے ہوتے مالک کام نہیں کرتے"

مالک" گیانی نے اپنے آپ کو دیکھ کر کہا مالک... میں مالک.... مجھے طعنہ دیتے ہو بابا لوک ٹھیک کہتے ہو.... ٹھیک کہتے ہو......"

اس نے پھر دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے رخساروں پر ڈھلکے اور پھر نیچے ڈھلک گئے۔

اب باہر سے سادھو کی آواز آرہی تھی۔ وہ کھڑتال بجا رہا تھا اور میرا کا بھجن مدھم سُروں میں گا رہا تھا۔ پانی کا دھارا اور تیز ہو گیا تھا اور باہر دھوپ کی روشنی منڈیروں پر جا پہنچی تھی۔ طالب نے ڈرتے ڈرتے گیانی کا زانو ہلایا گیانی نے آنکھیں کھول دیں۔

طالب نے پوچھا "گیانی یہ سب کیا ہے؟ میں کیا ہوں۔ تم کون ہو؟"

"یہ سب مایا ہے" گیانی نے آرام سے کہا "تم اینٹ پتھر کی دنیا میں ہو ——— ہم لوبھی ہیں کرودھی ہیں، اہنکاری ہیں"

طالب نے کہا "گیانی تم کہاں رہتے ہو؟ کس دیس سے آتے ہو۔ کیا کام کرتے ہو"

گیانی نے کہا "بابا لوک ہمارا گھر نہیں گھاٹ نہیں ——— کوئی دیس نہیں بھیس نہیں ——— ہم کوچ ہیں بابا لوک ——— ہردم آگے ——— ہردم آگے"

طالب نے پھر جھکتے ہوئے پوچھا "پھر تم کام کیا کرتے ہو گیانی؟"

"ہم چپراسی ہیں بابا لوک۔ اس ساتھ کی بستی میں نوکری کرتے ہیں ——— صاحب کا پھاٹک کھولتے ہیں بند کرتے ہیں۔ پر سچا صاحب ہمیں مُنہ نہیں لگاتا۔ میرے بابا جی فرماتے ہیں، تحریر اچنت کھوٹلا دان دکھ برھا دیھا دن لیف ایہہ ہمارا جیونا توں صاحب بیٹے دیکھ ——— طالب نے کہا "لیکن تم تو صوفی ہو ——— سالک ہو ——— بزرگ ہو ———"

گیانی نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا "ناں ناں ناں" اس نے چیخ کر کہا "ہم لوبھی ہیں، کامی ہیں، اہنکاری ہیں ——— تم اچھے ہو بابا لوک ہم اپنے اپنے چور چھپاتے پھرتے ہیں۔ تم ظاہر باطن ایک ہو"

طالب نے کہا "اور سادھو کا کیا نام ہے؟"

گیانی نے کان چھو کر کہا "سادھو سیّد زادہ ہے بابا لوک ہے اس کا نام نہیں لے سکتے ——— اس کا درجہ بہت بڑا ہے۔ جاؤ جاؤ بابا لوک باہر بگیا کی ہوا کھاؤ ——— من شانت کرو"

طالب نے اس کے قریب دو زانو ہو کر کہا "گیانی میں بھی اس آشرم میں داخل ہونا چاہتا ہوں ———" اس کا دل گیانی کے قدم چھونے کو چاہتا تھا لیکن اسے حوصلہ نہ ہوا۔

گیانی مُسکرایا ——— پھر ہنسا ——— اور دیر تک ہنستا رہا۔ باہر سادھو میرا کا بھجن گا رہا تھا اور اب اس پر حنیف کی خوبصورت قرآت غالب آنے لگی تھی۔ وہ خالص مصری لہجے میں سورۂ یٰسین کی قرآت کر رہا تھا۔

طالب نے ڈرتے ڈرتے گیانی کے پیر چھو کر کہا "سائیں!"

گیانی نے اپنے پیر پیچھے کھینچ لئے اور کہا "مایا ہے سب مایا بابا لوک ——— تم ٹھیک ہو، صحیح راستے پر ہو ———"

طالب نے کہا "گیانی میں جان دیدوں گا لیکن لیکن ——— اور پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

گیانی نے انگلی اُوپر اٹھا کر کہا "ایک!"

طالب نے دہرایا "ایک"

گیانی پھر بولا "ایک"

طالب نے کہا "ایک"

گیانی تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور ایک انگلی فضا میں کھڑی کرتے ہوئے بولا "

ایک اونکار، ست نام، کرتا پرکھ، نربھو نرویر، اکال مورت، اجونی گور پرساد جپ! آدیچ جگادیچ، ہے بھی سچ ہو بھی سچ!

اور پھر وہ اپنی انگلی کو فضا میں اسی طرح اٹھائے باہر آنگن میں نکل گیا۔

طالب کتنی دیر کوٹھری میں چٹائی پر بیٹھا اردگرد دیواروں کو تکتا رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو دھوپ جا چکی تھی۔ آنگن میں ٹھنڈک تھی اور گلاب اور موتیے کے دھلے دھلائے پھول مہک رہے تھے۔

سادھو اپنے گیروے رنگ کے ابرن میں پانی دبی گھاس میں بیٹھا خاموش جاپ کر رہا تھا۔ حنیف نل کے پاس اوندھے منہ لیٹا تھا اور اس کے تڑپنے سے بہت سا گارا اس کی پنڈلیوں پاؤں اور ہاتھوں سے چمٹا ہوا تھا۔ جہاں اس نے اپنا ماتھا بار بار زمین پر مارا تھا وہاں خون کا ایک بڑا سا دھبہ تھا۔ گیانی نل کے منہ پر پلاسٹک کی سبز ٹیوب چڑھائے، پودوں کا منہ دھلا رہا تھا اور گھروں کی عقبی دیواروں کو جوان کی بگیا کی چار دیواری بنائے تھیں پانی کے تریڑے سے ٹھنڈی کر رہا تھا۔ طالب چوبڑ کی روش پر دو زانو بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑوں پر دیواروں سے ٹکرانے والے چھینٹے آکر گر رہے تھے پر وہ خوش تھا۔ ایک طرح کی عجیب ٹھنڈک تھی جو اس کے دل و دماغ کو تازہ کر رہی تھی۔ اس میں جسمانی آسودگی کم تھی روحانی ٹھنڈک زیادہ تھی۔ اسے کچھ یوں محسوس ہونے لگا کہ اس جلتی جھلستی دنیا میں بس ایک ہی نخلستان ہے جہاں پیٹ بھر کر آدمی بڑے گہرے اور بڑے دیر پا دکھ سمیٹ سکتا ہے اور جن کی لذّت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ سیلی سیلی زمین کی کچّی کچّی ٹھنڈک اور پانی میں رچی ہوئی سُرخ سُرخ دیواروں سے پلٹ کر اس پر گرنے والے چھینٹے اسے اڑائے لئے جاتے تھے۔ اس زمین سے اوپر، پھاٹک کے اوپر، برجیوں کے اوپر اس چھجے کے اوپر وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے جوڑے کا گجرا ایک طرف سے کھل گیا تھا اور اس کے بٹنوں کی زنجیر چاند کی ٹھنڈی کرن بن کر اس کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔ طالب نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتا چلا گیا۔ وہ تصوّف کے غلام گردش میں ابو سعید ابوالخیر کی رباعی کی طرح منوّر تھی۔ طالب نے ہاتھ اٹھا کر کہا "یہ نروان ہے ــــــ" پانی کے شور میں گیانی کو کچھ سنائی نہ دیا تو طالب نے چلّا کر کہا "گیانی یہ نروان ہے گیانی کی نگاہیں ادھر اٹھیں تو اس نے چیخ مار کر ٹیوب چھوڑ دی اور" مایا ــــ مایا ــــ موہ، موہ کی چیخیں مارتا اندر کوٹھری میں گھس گیا۔ سادھو ہری جاپ کرتا اندر بھاگا اور حنیف بیخودی کے عالم میں لڑکھڑاتا ہوا طالب کے پاس سے گزر کر مٹھ میں چلا گیا۔

طالب کتنی ہی دیر تک بیٹھا ادھر دیکھتا رہا اور پھر منوّر غلام گردش میں اندھیرا چھا گیا۔

اندر تینوں تپسوی توبہ استغفار اور پراچشت میں مصروف تھے۔ ان کی آہوں اور کراہوں سے کوٹھری گونج رہی تھی۔ طالب اپنا سر زانو میں دبا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اب اس کا دل ملامت کر رہا تھا کہ اس نے بھی بھاگ کر مٹھ میں کیوں پناہ نہ لی وہ ٹھنڈک اور وہ تسکین اور سنساہٹ جو اس کے وجود کو نصیب ہوئی تھی اس سے کوسوں دور بھاگ چکی تھی اور وہ ایک مرتبہ پھر بھری دنیا میں اکیلا اور بے یار و مددگار ہو گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر صوفیوں میں سے کسی کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس وقت اپنے آپ سے بہت دور تھے۔

وہ پھر سر زانو میں دبا کر بیٹھ گیا اور اپنے کئے پر پچھتانے لگا۔ یوں بیٹھے بیٹھے کتنی ہی مدّت بیت گئی اور پھر جیسے اس نے اپنی پشت پر ایک چھوٹے سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا اس دباؤ میں گرمی بھی تھی اور ٹھنڈک بھی۔ کچھ حجاب بھی تھا اور ذرا سی بے تکلفی بھی۔ اس نے سر اٹھا کر اور پیچھے مڑ کر دیکھا، رانی سر جھکائے کھڑی تھی۔

طالب کی سُرخ سُرخ آنکھوں کو دیکھ کر وہ سہم سی گئی پھر حوصلہ کر کے بولی۔

" باجی آئی ہیں"

" کون؟" طالب نے تڑپ کر پوچھا۔

" باجی" اس نے وثوق سے کہا "میری باجی"

باہر چوبڑ کی روش پر، مٹھ کے پاس باجی سفید قمیص اور سفید دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی۔ بگیا میں اب موتیے کی خوشبو تیز ہو گئی تھی۔

اس نے سر اوپر اٹھائے بغیر کہا "میں نے کئی مرتبہ یہاں آنے کی ہمت باندھی لیکن مجھے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ آج آپ کو یہاں دیکھ کر میں نے یہ جرأت کر ہی لی میں ان سے ملنا چاہتی ہوں"۔

"کن سے" طالب نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

" ان میں سے کسی سے بھی، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان سے بات کر کے مجھے سکون نصیب ہوگا۔ مجھے ذہنی آسودگی میسر آئے گی اور ____ اور ____"

"لیکن" طالب نے بات کاٹ کر کہا "یہ لوگ آپ سے ہرگز نہیں ملیں گے۔ عورتوں سے بات کرنا ان کے مسلک میں نہیں۔ استری کے پاس پھٹکنا ان کے دھرم میں نہیں"۔

باجی نے التجا بھرے لہجے میں کہا "آپ ان سے درخواست تو کر دیکھیں ____ شاید ____ شاید ____ اور پھر اس نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

طالب نے کہا "مجھے معلوم ہے یہ آپ سے ہرگز بات نہ کریں گے"۔

باجی ہولے سے بولی "آپ کو دیکھ کر ایک ہلکی سی امید بندھی تھی وہ بھی ٹوٹ گئی" پھر اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا "پتہ نہیں یہ سب تجسس کی بنا پر ہے یا شاید نامانوس ماحول کی وجہ سے ____ مجھے ان سے ملنے کی بڑی آرزو تھی ____ اب بھی ہے ____ اور پتہ نہیں کب تک رہے گی ____ پتہ نہیں آدمی خود کب تک رہتا ہے۔ اماں کہتی ہیں تو بھی دیوانی ہے ____ چل رانی چلیں ____ وہ مڑنے لگی تو اندر سے حنیف کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے بابا ____ کون ہے؟"

طالب نے کہا "رانی کی باجی ہے۔ وہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہے"۔

" ہری ہر ____ ہری ہر ____" سادھو نے کہا "کیا بات ہے ماتا کیوں ملنا چاہتی ہو؟" باجی خاموش رہی تو سادھو نے پکار کر کہا "چنتا ماتا بولو۔

" بولو میری بہن ____ میری ماں ____ میری بیٹی کیا بات ہے؟" حنیف نے پوچھا۔

کچھ نہیں" باجی نے ہولے سے کہا کچھ نہیں"۔

گیانی نے پکار کر کہا "ماتا تو مایا ہے ____ تو قدم قدم پر چک پھیری دیتی ہے ____ ہم سادھو ہیں، درویش ہیں۔ ہم اس گرو کے چیلے ہیں جو اسی کی پہاڑیوں میں صلیب اٹھائے مارا مارا پھرتا تھا ____ بول مایا۔

" بول مایا" سادھو نے کہا "ہم تیرے ہاتھ جوڑتے ہیں ہمارے آشرم میں تیرا کیا کام" باجی سر جھکائے خاموش کھڑی رہی!

" بول چنتا منی" حنیف نے کہا "بول چنتا ماتا اگر تجھے پسند نہیں تو ہم یہ آشرم چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے ____ تو ماتا ہے۔

"تیری ہر آگیا کا پالن ہمارا دھرم ہے۔ سادھو نے کہا "ہم یہ آشرم چھوڑ دیں۔

" نہیں ____ نہیں" باجی نے رو کر کہا "نہیں میں یہاں پھر نہیں آؤں گی۔ اس آشرم میں پھر قدم نہیں رکھوں گی" یہ کہتے ہوئے وہ رانی کی انگلی تھام کر پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

طالب نے ڈرتے ڈرتے مٹھ میں قدم رکھا تو تینوں سادھوؤں کو سکتے کے عالم میں پایا، وہ کوٹھڑی کی دہلیز سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دور گرجے کا گھڑیال گونجنے لگا گیانی نے آنکھیں کھول کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور گمبھیر آواز میں کہنے لگا۔

اور اس شام طالب کو حنیف کے دوست مسعود سٹینو کے لئے حنیف سے تعارفی خط لینا تھا ____ وہ اسے لئے بغیر آشرم کا دروازہ آہستہ سے کھول کر اور دھیرے سے بند کر کے گھر چلا آیا۔

کوئی ایک ماہ بعد شیخوپورہ سے واپسی پر جب طالب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مسعود سٹینو کی امداد اور اس کا نصف سے زائد

کام سرانجام دے دے گی تو وہ ایک مرتبہ پھر حنیف کے دفتر گیا۔ لیکن حنیف سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ آشرم جانے سے وہ کتراتا تھا اسلئے اس نے ملاقات اگلے دن پر ملتوی کر دی۔ اگلے دن دفتر سے پتہ کر کے وہ سیدھا اس جگہ پہنچ گیا جہاں نئے سب اسٹیشن پر حنیف کی ڈیوٹی لگی تھی۔ لائن مین نے طالب کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر پوچھا "جناب کہاں سے تشریف لاتے ہیں؟"

"یہیں سے،" طالب نے کہا "لاہور سے۔"

لائن مین نے دو ذرا سے توقف کے بعد کہا "حنیف تو گھر چلا گیا چھٹی لے کر اس کی طبیعت خراب تھی۔"

"طبیعت خراب تھی" طالب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں بس طبیعت ہی خراب سمجھو ــــــ بادشاہ آدمی ہے" لائن مین نے مسکرا کر کہا۔

طالب کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ سیدھا آشرم جائے اور حنیف سے مسعود سٹینو کے نام چٹھی حاصل کر لے۔

ابھی کرشن نگر کی بڑی سڑک سے گلی کا موڑ مڑا ہی تھا کہ اس کی مڈبھیڑ رانی سے ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر شرارت سے رانی کا سر سہلایا اور کہا "موتنی اتنی دوپہر کہاں جا رہی ہو؟"

"دہی لینے" رانی نے سر جھکا کر جواب دیا۔ طالب نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا "باجی کا کیا حال ہے؟"

"وہ تو مر گئیں" رانی نے اپنی ٹھوڑی اپنے سینے میں پیوست کر لی۔

طالب کے سامنے اس تپتی دوپہر میں بجلی کا ایک کوندا تڑپا اور ساکت و جامد چھوڑ گیا۔ کتنی دیر تک رانی ہاتھ میں سلور کا کٹورا لئے کھڑی رہی۔ طالب نے اس کے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر پوچھا کیسے؟"

"ایک دن" رانی نے کہا "اسکول سے پڑھا کر آئیں۔ گھڑے سے ٹھنڈا پانی پیا اور بستر پر لیٹتے ہی ایک چیخ ماری ــــ اور باجی مر گئی ــــ"

○

بقیہ صفحہ ۴۲ لہو رنگ سویرا

رات سسک سسک کر رو رہی تھی اور میری آنکھوں پر پڑے ہوئے سرخ پردے آنسوؤں سے دھلتے جا رہے تھے مگر یہ احساس بے چین کئے رہا کہ میں نے ایک جنت اجاڑی ہے، ایک مستقبل تاریک کیا ہے، میں قاتل ہوں... میں...

صبح ہوئی تو میرے قدم دو منزلہ عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے، شاید وہ تمام رات جاگتی اور روتی رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں گالوں پر آنسوؤں کے داغ تھے اور بال بکھرے ہوئے...... مجھے دیکھ کر پل بھر کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک جاگی پھر اضمحلال چھا گیا۔

میں واپس آ گیا ہوں نیلو، باہر بہت تیز دھوپ ہے میرا وجود جھلس گیا ہے، مجھے اپنے آنچل میں چھپا لو نیلو، مجھے سایہ دو، پناہ دو، میری جنت واپس دے دو نیلو..... میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

وہ چپ چاپ کھڑی دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی، میں کل شام دلہن بنی اپنے شیام کی منتظر تھی مگر خبر ملی کہ شیام مر گیا... میرا شیام مر گیا... میں بیوہ ہو گئی، جانتے ہو تم..... اس نے جلتی ہوئی آنکھوں سے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اور تم... تمہاری انگلیوں کے پوروں سے خون ٹپک رہا ہے، آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں، تمہارے وجود سے خون کی مہک آ رہی ہے جاؤ چلے جاؤ یہاں سے، میں تمہیں نہیں پہچانتی، تم شیام نہیں ہو، شیام مر گیا... شیام مر گیا... وہ پھپھک پھپھک کر رو رہی تھی۔

میں کل رات مر گیا ہوں، میں نے باہر نکل کر سوچا، اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، اپنا ہاتھ دیکھا، میں کل رات مر گیا... میں چلنے لگا ایک سڑک سے دوسری سڑک، تیسری سڑک، چوتھی سڑک، میں چلتا رہا، چلتا رہا، پھر میرے قدم رکے تو خونخوار نظریں سوالیہ انداز میں مجھے گھور رہی تھیں۔

میں اقبال جرم کرنے آیا ہوں، اپنی موت کا اقبال جرم۔

اور دوسرے دن ریڈیو سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ پولیس نے انتہائی مستعدی سے ایک قاتل کو پکڑ لیا ہے۔ دوسرے کی تلاش جاری ہے۔

ندا فاضلی

آسمان کا ستارہ

میں برسوں بعد
اپنے گھر کو تلاش کرتا ہُوا
اپنے گھر پہونچا
لیکن میرے گھر میں
اب میرا گھر کہیں نہیں تھا
اب میرے بھائی اجنبی عورتوں کے شوہر بن چکے تھے
میرے گھر میں
اب میری بہنیں
انجانے مردوں کے ساتھ مجھ سے ملنے آتی تھیں
اپنے اپنے دائروں میں تقسیم
میرے بھائی بہن کا پیار
اب صرف تحفوں کا لین دین بن چکا تھا
میں جب تک وہاں رہا
شیو کرنے کے بعد
برش کریم، سیفٹی ریزر
خود دھو کر واپس اٹیچی میں رکھتا رہا
میلے کپڑے خود گن کر لانڈری میں دیتا رہا
اب میرے گھر میں وہ نہیں تھے
جو بہت سوں میں بٹ کر بھی
پورے کے پورے میرے تھے
جنھیں میری ہر کھوئی ہوئی چیز کا پتہ معلوم تھا
مجھے کافی دیر ہوگئی تھی
دیر ہو جانے پر ہر کھویا ہُوا گھر
آسمان کا ستارہ بن جاتا ہے
جو دور سے لبھاتا ہے
لیکن
پاس نہیں آتا ہے

دُعا

رخصت ہوتے وقت
اس نے کچھ نہیں کہا
لیکن ایرپورٹ پر اٹیچی کھولتے ہوئے
میں نے دیکھا
میرے کپڑوں کے نیچے
اس نے اپنے دونوں بچوں کی تصویر چھپا دی ہے
تعجب ہے!
چھوٹی بہن ہو کر بھی
اس نے مجھے ماں کی طرح دعا دی ہے۔

آئینہ

تم ایسے نہیں جی سکتے
جیسے تتلی اُڑتی ہے
جیسے پھول کِھلتا ہے
جیسے بچہ مُسکراتا ہے
تم ایسے نہیں مر سکتے
جیسے سُورج میں چاند جگمگاتا ہے
جیسے موسم میں موسم لہراتا ہے
جیسے دریا بادل بنتا ہے
اور بادل درختوں کی ہریالی میں چھُپ جاتا ہے
تم ہر روز آئینہ دیکھتے ہو
کالے اور سفید بالوں کے بیچ
آئینے نے تمہارے وقت کو تقسیم کر دیا ہے
اس نے تمہاری سانسوں کو موت کے خوف سے بھر دیا ہے
پہاڑوں سے اترتی ندی
سبزہ میں کھیلتی خوشی
جنگلوں میں بولتی خاموشی
اب تمہاری نہیں ہیں
تم اکیلے ہو
تمہیں پتھر بننے کو دیا ہے
تم نے پتھر سے آئینہ تراش لیا ہے۔

شرط

تم فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو
ضرور رہو
لیکن یاد رہے
جنگ کے دوران تمہارا ملک جو کہے گا
وہ سچ ہوگا
اور اس سچ کے لئے
تمہیں اپنی جان سے کھیلنا ہوگا
تمہارے دوستوں
اور دشمنوں کی فہرست
سیاستوں کی طرح بدلتی رہے گی
جنگ کے بعد
تم امر شہید بھی ہو سکتے ہو
اور بیوقوف بھی

۱۰۳ امرا پارٹمنٹس، ڈانڈپارہ آ کھار (ویسٹ) بمبئی ۵۲

لہو رنگ سویرا

شفق ● کبیر گنج سہسرام ۔ ۸۲۱۱۱۵ (بہار)

وقت کا احساس فنا ہو گیا تھا۔

ہم جس جگہ تھے وہ سورج سے دُور تھی، اندھیرا بھی نہیں تھا، کوئی بلب بھی روشن نہیں تھا مگر ہم اتنے اطمینان سے محوِ سفر تھے جیسے ہمارے سروں پر سورج ہو یا پھر تیز روشنی والا بلب۔۔

یہاں پر بھی ہمیں بھاری بوٹوں کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی مگر ہم اتنے مطمئن تھے جیسے چہل قدمی کے لئے نکلے ہوں۔

تربیت کے دوران ہمیں بتایا گیا تھا، خوف تمہاری کامیابی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے اور یہ احساس تب تک ہے جب تک تمہیں اپنے ہونے کا یقین ہے، اگر تم خود کو مقصد میں ضم کر دو تو یہ احساس فنا ہو جائے گا اور مقصد پر ایمان ہی تمہارا نصب العین ہونا چاہئے باقی چیزیں ثانوی ہیں۔

میری سوچ پہ میرے ہم سفر کے ذہن میں ٹرانسمٹ ہو رہی تھی، اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میرے قدموں سے قدم ملا کر چلتے ہوئے کہنے لگا۔

پہلے تمہاری داہنی آنکھ کا گوشہ سُرخ ہوا ہوگا، پھر دھیرے دھیرے پوری آنکھ سرخ ہو گئی ہو گی میرا مطلب ہے تمہیں ہر چیز سُرخ نظر آنے لگی ہو گی اور تم گھبرا کر ڈاکٹر کے پاس دوڑے گئے ہو گے اور ڈاکٹر نے نسخہ لکھا ہو گا کہ .....

میں چپ رہا، اس نے بھی اپنا جملہ مکمل کرنے کی کوشش نہیں کی، کچھ دیر تک ہم خموشی سے چلتے رہے۔

ایک سازش کے تحت ہماری انفرادیت ختم کر دی گئی اور ہمارے گلوں میں غلامی کا پھندا ڈال کر حکم ملا، اپنی غلامی کی حفاظت کرو، اور ہم اپنی غلامی کے تحفظ کے لئے اپنے خون سے ہولی کھیلتے رہے، کھیلتے رہے، بہت دن ہو گئے، شاید جُگ بیت گیا مگر اب . . .

میں کہا جا رہا ہوں ـــــ ؟ میں نے چڑھائی کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا لیکن دوز راستہ ختم ہونے والا تھا۔ آگے ایک پُر خطر راستہ، کڑی دُھوپ، جھلسا دینے والے لُو کے تھپیڑے اور تعاقب کرتی ہوئی پرچھائیاں، سروں پر وزنی بوٹوں کی دھمک اور پتھر کے دل میں نازک ریشوں کی تھرتھراہٹ۔

پرسوں جب نیلم سے ملاقات ہوئی تو نہ جانے کیوں اس کا چہرہ گلابی ہوا جا رہا تھا، پلکیں جھکی جا رہی تھیں اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

کیا بات ہے ـــــ ؟ میں نے حیرت سے دیکھا، تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔؟

میں... تم ..... وہ ہکلا کر رہ گئی، دیر تک سینڈل کی نوک سے گھاس کُریدتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔

تم جلدی سے کتابیں ختم کر لو کہ تنہائی کے ناگوں نے ڈس ڈس کر سارا بدن نیلا کر دیا ہے۔

مم مگر...... میری آنکھیں سُرخ ہو گیئں ہیں۔

نہیں ..... وہ خوف سے زرد ہو گئی، یہ تم نے کیا روگ لگا لیا۔ مجھ سے کہا ہوتا، مجھے بتایا ہوتا ؟ تم مجھے غدّار سمجھو گے مگر میں امن پسند ہوں، چھوٹا سا گھر اور گھر کی خوشیاں ہی میرا نصب العین ہیں اور میں نے کوئی بھی خواب تمہارے بغیر نہیں دیکھا، مجھ سے وعدہ کرو کہ....

مگر میں چپ چاپ سُلگتی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔

تمہاری آنکھوں کا رنگ نہیں بدلا ہے، یہ سب موسم کا اثر ہے، چلو یہاں سے دُور بہت دُور چلے جائیں، میں تمہیں موسموں سے بچاؤں گی، اپنے آنچل میں چھپا لوں گی، وہ رونے لگی، پھر پتہ نہیں کون سی رُت آئے، اگر تمہارے بعد بہار بھی آئی تو میرا مقدر تپتے ہوئے صحرا کی ریت پر ننگے پاؤں چلنا ہوگا، آج میں تم سے وعدہ لے کر جاؤں گی۔

میں اس سے کیسے وعدہ کر لیتا کہ تبدیلی بتدریج ہوئی تھی، ختم کرنے کے لئے کتابیں کھولتا تو حرف ناچتے، مُنہ چڑاتے اور عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لیتے، کچھ لکھنا چاہتا تو جو کچھ لکھتا اسے پڑھ کر خود میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، اتنی نفرت اتنی آگ، پھر میں اس سے ایسے وعدہ کر لیتا کہ میرے دوست شیر کا شکار کرتے اور میں بزدل بنا جھاڑیوں میں مُنہ چھپائے رہتا۔

ہماری دیرینہ آرزو تھی کہ ہمارا سب کچھ ہمارے لئے ہوتا، مگر کہیں سے کوئی لہر ہی نہیں اُٹھتی تھی اور غلامی کا عرصہ اتنا طویل ہو گیا تھا کہ اس کی طرف دھیان ہی نہ جاتا ..... ہم سفر زینے طے کرتے ہوئے لکھ رہا تھا، مگر تاریخ خود کو دہرانے کے عمل میں ہے اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو.....

زینے ختم ہو گئے، دروازے کی کنڈی کھلی تو ہم وقت کی گرفت میں آ گئے، تیز چمکتی ہوئی دھوپ، گرم ریتیلی ہوا۔

کچن سے مچھلی تلنے کی خوشبو آ رہی تھی اور نسوانی آواز کچھ گنگنا رہی تھی، پل بھر کے لئے کچن کے دروازے پر سرخ ساڑی لہرائی اور ہم محتاط قدموں سے باہر نکل آئے، کمپاونڈ میں الیون پٹیپک ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

زندگی بھر پہرہ دیتے رہو، ہم آتے جاتے رہیں گے اور تم ہاتھ ملتے رہو گے، ہم سفر اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

میں نے آہنی گیٹ کھولا اور اسکوٹر سڑک پر آ گیا۔

آفتاب کندھے پر جھک گیا تھا مگر اب بھی آگ برس رہی تھی سڑکیں اور گلیاں سنسان تھیں، لوگ اب تک گھروں میں چھپے ہوئے تھے مگر دو منزلہ عمارت کی بالکونی میں سبز ریشمی پیراہن والی دوشیزہ کے بال ہوا سے اڑ رہے تھے اس نے گرل سے پیشانی ٹکا رکھی تھی، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ ہولے ہولے کانپ رہے تھے اور شیشے سی چمکتی گہری نیلی آنکھیں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔

جی چاہا ہاتھ ہلا کر وِش کروں کہ ہم سفر کی غراہٹ سُنائی دی۔

محتاط رہو کہ ہم انتہائی خطرناک مہم پر نکلے ہیں اور ہمارے عقب میں بھاری بوٹوں کی چاپ، تو کیوں کسی کو مصیبت میں ڈالو گے؟

میں اس وقت سبز پیراہن کو دیکھتا رہا جب تک سڑک سیدھے چلتی رہی، پھر میں نے سر جھٹک کر خود کو مہم سے ہم آہنگ کرنے کے لئے سوچا۔

یہ ہماری پہلی مہم ہے اگر ناکام ہو گئے تو ؟

ناکامی کی صورت میں ہم تمہیں پہچاننے سے انکار کر دیں گے کہ ہمارے کسی ساتھی کے ناکام ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہدایت دینے والے نے وقتِ رخصت کہا تھا، تمہیں ہر حال میں کامیاب ہونا ہے چاہے خود کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے، اس طرح بھی ہماری فتح ہو گی کہ اگر ایک کے بدلے ایک کا حساب بھی رکھا جائے تو آخر میں صرف ہم ہوں گے اور ہمارے بچے ...

میں نے احتیاط سے جیب ٹٹولی، گھڑی دیکھی اور مطمئن ہو گیا، ابھی ہم وقت کے اندر ہیں۔

اسکوٹر تیزی سے راستہ طے کرتا رہا، پوسٹ آفس کچہری بینک اور اسکول کی عمارت، چھٹی ہوئے دیر ہو چکی ہے چپراسی گیٹ بند کر رہا تھا، چلڈرن پارک، تیزی سے گزرتی ہوئی دُکانیں، جانے پہچانے راستے، کئی موڑ مڑنے کے بعد اسکوٹر رک گیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر بچی ٹنکل ٹنکل لٹل اسٹار گا رہی تھی۔

ہم نے گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا، کوئی غیر فطری بات نہیں تھی دوسرے ہی لمحے ہم برق رفتاری سے اندر گھستے چلے گئے۔

بچی ابھی تک اسکولی لباس میں تھی اور رقص کے انداز میں کھڑی ہوئی گا رہی تھی اور چائے کی میز پر بیٹھا ہوا جوڑا ہنس رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر بچی چپ ہو گئی، ہنستے ہوئے مُنہ کھلے کے کھلے رہ گئے، ان کی خوفزدہ نظریں ہمارے پستول پر جمی ہوئی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے گولیاں چلیں، دو چیخیں گونجیں، خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ سینوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ٹیبل کی طرف جھکے پھر کرسیوں پر سے اُلٹ گئے۔

بچی ابھی تک اسی انداز میں ساکت تھی جیسے اسٹیچو ہو، کرسیوں کے پاس پڑے ہوئے جسم پھڑک رہے تھے خون تیزی سے پھیل رہا تھا۔

ایکشن..... ہم سفر نے جیب سے ہاتھ نکالا اور کھٹاک کی آواز کے ساتھ چاقو کا پھل چمکنے لگا پھر وہ جھکا اور چاقو کا پھل مرد کے پیٹ میں اتار کر سینے تک چیرتا چلا گیا، میں سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔

ایکشن ..... ہم سفر میری طرف دیکھ کر غرایا مگر میرے بدن میں حرکت نہیں ہوتی، میری نظریں بچی پر جمی ہوئی تھیں جس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، مگر اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں زمین پر پڑی لاشوں پر جمی ہوئی تھیں۔

جب ہم پلٹے تو بچی کی دلدوز چیخ سُنائی دی، میں نے مڑ کر دیکھا وہ ماں کی لاش پر جھکی ہوئی اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ممی ممی، پاپا، پاپا...

ہم سفر نے دروازے پر دی کا نشان بنایا اور اسکوٹر گھرگھرا کر اسٹارٹ ہو گیا۔

تم نے دوسرا عمل پورا نہیں کیا ؟

اس کی ضرورت نہیں تھی، میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

ہمیں حکم کی تعمیل کرنی تھی ضروری غیر ضروری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں چپ رہا، ایک جیب ہارن بجاتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی، میں نے مضبوطی سے ہم سفر کی کمر تھام لی، گھڑی بھر کے لئے اسکوٹر کے ہینڈل پر گرفت ڈھیلی ہوتی، گاڑی لہرائی، جیپ گزر گئی، اسکوٹر سنبھل گیا اور پلک جھپکتے ہم اس علاقے سے دور نکل آئے۔

اسکوٹر روک دو ــــ میں نے ہم سفر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

مگر ہمیں وہاں پہنچ کر رپورٹ کرنی ہے۔

ریڈیو سے سب کو معلوم ہو جائے گا۔

مگر ہمارا فرض... ہمارا کامیاب مشن۔

تم چلے جاؤ، میری طبیعت خراب ہو رہی ہے، میں کچھ دیر تک پارک میں ٹہلوں گا۔

بے وقوف... اس نے جھنجھلا کر گاڑی روک دی، جانا ہے تو گھر جاؤ اس طرح راہ میں.....

میں خوش کیوں نہیں ہوں ــــ؟ اس کے جانے کے بعد میں نے پیدل چلتے ہوئے سوچا، مجھے خوش ہونا چاہئے کہ میں نے اپنی پہلی مہم کامیابی سے سر کر لی اور اب فخر سے کہہ سکوں گا۔ قوم کی خدمت میں میرے قدم کسی سے پیچھے نہیں۔

میری نظروں میں وہ منظر کیوں منجمد ہو گیا ہے۔ ؟ کانوں میں بچّی کی چیخیں کیوں گونج رہی ہیں ممی ممی، پاپا،

رات ہو گئی، دوکانیں جگمگانے لگیں اور رنگین آنچل سڑکوں پر پھیل گئے، میں چلتا رہا، بے مقصد چلتا رہا یہاں تک کہ میرے پیروں نے چلنے سے انکار کر دیا۔

میں نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کیں تو بچی کی چیخیں اور تیز ہو گئیں وہ منظر اور زیادہ واضح ہو گیا، اسٹیچو بنی ہوئی بچی کرسیوں کے پاس تڑپتے ہوئے جسم اور بہتا ہوا خون، ماں کو اٹھانے کی کوشش کرتی ہوئی بچی اور بے نور آنکھیں .....

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے خدا یہی انتقام ہے، انھیں شیروں کا شکار کرنا ہے جن کے ناخن بھی نہیں دانت بھی نہیں یہاں تک جبڑا بھی نہیں جو مدافعت بھی نہیں کرتے، جن کی آنکھوں میں خوش آئند خواب ہے، بچی کا مستقبل ہے اور گھر کی جنّت، ہماری اعلیٰ کمان کو ان سے خطرہ ہے، مگر کیسا خطرہ ؟ کیا یہ فریب نہیں، معصوم ذہنوں کو ورغلانے کی سازش نہیں ؟ قصور کس کا ہے اور سزا کسے دی جا رہی ہے میری آنکھوں کا رنگ بدل رہا تھا۔

وہ بچے اور بچیاں جو اسٹیچو بنی اپنی آنکھوں سے خونی ڈراما دیکھ رہی ہیں آنے والے دنوں میں ان کا جذبۂ انتقام آگ کا طوفان بن جائے گا، پھر جنگ مسلسل جنگ، انتقام مسلسل انتقام، دیوانوں کا خواب ہمیں کس جہنّم کا ایندھن بنا رہا ہے۔

[باقی صفحہ ۷۳ پر دیکھئے]

ظفر صہبائی

(۱)

آدمی ہے کام غائب
زندگی کا نام غائب

پاؤں سڑکوں پر گھسیٹو
گھر میں بھی آرام غائب

ہر طرف اشیاء ہی اشیاء
جیب خالی دام غائب

جانے کیا موسم ہے گھر میں
صبح غائب، شام غائب

جرم ہونے کی خبر ہے
جرم کا انجام غائب

روپیہ ذہنوں کا مرکز
رب ندارد، رام غائب

(۲)

ہوا سے بھرے بادباں یاد ہیں
سمندر میں کچھ کشتیاں یاد ہیں

یہ کچھ نغمگی جو طبیعت میں ہے
ابھی بلبلوں کے بیاں یاد ہیں

محبت کے رنگوں کو بھولا نہیں
بدن پر لکھی سرخیاں یاد ہیں

گھنی چھاؤں سارے درختوں میں تھی
مسافر کو سب مہرباں یاد ہیں

فقط رنگ و خوشبو صبا ہی نہیں
جو دل میں گڑیں برچھیاں یاد ہیں

ظفر جیسے تازہ ہے ہر سانحہ
کہ جلتی ہوئی بستیاں یاد ہیں

● باری اینڈ کمپنی، موتیا پارک، بھوپال

اختر بستوی

میں بھی گویا شہر میں اک پیکرِ تشہیر ہوں
جلتے بجھتے قمقموں کی خوشنما تحریر ہوں

ہوں میں اپنی ذات کے گھیرے میں پابندِ مقام
آسکوں اس سے اگر باہر تو عالمگیر ہوں

بن گیا ہوں یوں ضمیرِ وقت پر اک بوجھ سا
جیسے میں آفاق کے دل کی کوئی تقصیر ہوں

مجھ سے یہ ٹوٹے ہوئے ذرّے کی قوّت نے کہا
خاک ہو کر بھی زمانے کے لئے اکسیر ہوں

نالۂ اقبال سمجھے ہیں مجھے اہلِ ادب
میں مگر اختر جو سچ پوچھو تو آہِ میر ہوں

● شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور (یوپی)

فلسفۂ وجودیت اور سارترے

ہائیڈن کیرتھ :
ترجمہ : ذکاء الدین شایاں ● نزد سٹی اولڈ پوسٹ آفس، بکاریا - پیلی بھیت (یوپی)

امریکی ضمیر میں وجودیت اس طرح داخل ہوئی جیسے کوئی ہاتھی اندھیرے کمرے میں ـــــ اس کے توڑ پھوڑ کا خاصا عمل رہا۔ اور اس کے اندر لوگوں نے فطری طور پر دخل اندازی کی جبلّت کو غلط سمجھا ـــــ یہ کیا ہو سکتا ہے ؟ ـــــ شاید تباہ کرنے والا کوئی انجن ؟ ـــــ جنگِ عظیم کا باقی ماندہ کوئی ٹینک ؟ ـــــ اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد جب روشنی کی گئی تو دیکھا کہ وہ "صرف" ایک ہاتھی تھا۔ ہر شخص ہنسنے کہنے لگا کہ ضرور شہر سے کوئی سرکس گزر رہا ہوگا۔ لیکن نہیں ـــــ جلد ہی لوگوں نے محسوس کر لیا کہ ہاتھی وہاں ٹھہرا ہوا تھا اور قریب آنے پر انہوں نے دیکھا کہ اگرچہ حقیقتاً وہ عجیب الخلقت نووارد ہاتھی ہے لیکن وہ اجنبی نہیں۔ وہ اسے بہت دنوں سے جانتے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء تک یہی فضا تھی۔ اور اس کے فوراً بعد تمام "وجودیت" کی اصطلاح عام ہو گئی۔ اس سے غرض نہیں کہ اس اصطلاح کے کیا معنی تھے، اس کا مفہوم "لیفٹ بینک" کے کیفوں میں جنگِ عظیم کے بعد کی پیدا کردہ زندگی ہی سے وابستہ تھا ـــــ یعنی، وہ رائج ہوئی جین پہننے والے بدنام نوجوان اور ان کے ساتھی، وہ غازہ و زینت سے محروم سیاہ موزوں والی لڑکیاں، جو بے تحاشہ سگریٹ نوشی میں مبتلا تھیں اور کسے معلوم اس کے علاوہ کون سی دیگر حماقتوں میں آلودہ تھیں ؟ ـــــ اور ان سب کا نمایاں رہنما یہی سارترے تھا جس نے NAUSEA اور WALLS جیسی قابلِ نفرت کتابیں تصنیف کیں۔ چنانچہ اہلِ دماغ حضرات نے فیصلہ دیا، یہ کیا خرافات ہے ! اس مضحکہ خیزی اور وہم باطل کو یک لخت رد کر کے خود کو محفوظ کرنا ضروری ہے۔

اسی دوران وجودیت کے متن اور خصوصاً سارترے کے فن پارے سنجیدہ ذہنوں میں جاگزیں ہوئے۔ اور ترجموں کے ذریعہ پڑھے جانے لگے۔ جس کا نتیجہ امریکہ کے دانش ورانہ استحکام پر شدید حملے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ایک طرف "نیو تھامسٹ"، اور دوسرے معلّم الاخلاق فلسفی وجودیت کی بے حرمتی سے چونک پڑے، جو قدر کی رسمی منصوبہ بندیوں سے متعلق تھی اور دوسری جانب اثبات پرست حضرات اور تجزیہ نگار مفکّرین وجودیت کے اس اقرار سے مشتعل ہو گئے جو عقلی گردہ بندیوں کو ترک کرتی ہے اور ضمیر کے غیر عقلی عمل پر یقین رکھتی۔ خصوصیت کے ساتھ ان دونوں محاذوں سے کئے جانے والے زبردست حملے نے بڑے جوش اور تیز نشتریت کے ساتھ جہاں تہاں اس مقبولیت کے استقبالی حلقے بھی پیدا کر دیئے۔ یہ بات، کہ حملہ آوروں کے مقابلے میں استقبال کرنے والے وجودیت کے بارے میں اطلاع یافتہ تھے، مسئلوں کی مدد نہیں کرتی۔

اس میں شک نہیں کہ بتدریج اور پھر تیزی کے ساتھ وجودیت نے ان معاونین کو جیت لیا جو سنجیدگی سے اُسے اختیار کئے ہوئے تھے۔ کسی کا قول ہے کہ وجودیت ایک محض فلسفہ ہے ـــــ اگرچہ قطعی فلسفہ ـــــ جسے لاکھوں لوگوں نے آزادانہ حیثیت سے محض زندگی کی ہنگامیت کا جواب دینے کے لئے ایجاد کیا ہے۔ سارترے، جیسپرس اور کامیو کی تخلیقات کی طرف پہلی مرتبہ آنا، اکثر درحقیقت کسی شخص کے ان ذاتی گہرے خیالات و جذبات ہی کا مطالعہ کرنا تھا جو درستگی اور صحت کے ساتھ بیان کئے گئے تھے۔ واقعتہً وجودیت ایک فلسفہ ہی ہے۔ کیونکہ طویل انداز میں یہ ان لوگوں کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے جو فلسفیانہ تنظیموں میں تربیت یافتہ ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر یہ عام انسانی رویّوں میں ایک تبدیلی کا نشان بھی ہے جس نے ہماری تہذیب کے ہر رُخ کو منقلب کر دیا ہے۔

انسانی روح کی عظیم تحریکات کو ہم نے ماورائیت اور رومانیت جیسے نام دئے ہیں۔ ان میں اگر ہم وجودیت کی اصطلاح کو دلیل کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کریں، تو معلوم ہوگا کہ یہ نام گمراہ کر رہا ہے۔ وجودیت کی بہت سی شاخیں ہیں، اسی لئے نمائندہ وجودی تخلیق کاروں نے متفق ہو کر اس اصطلاح سے گریز کیا ہے۔ وہ اپنے وجودی ہونے سے انکار کرتے ہیں اور وہ خود کو عام جوش و احتجاج میں شامل کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہم ان کو وجودی ہی کہتے رہتے ہیں۔ اور ہم ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ جب تک ہم متفقہ حیثیت سے تسلیم شدہ اس اصطلاح کو خاص لفظ کی صورت میں استعمال کرتے رہیں گے اس کا یہ نشان دہی کرنا بہتر ہوگا جو کہ متخالف دلچسپیوں کو مجتمع کرتا ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ولیم بیرٹ اپنی مایۂ ناز تصنیف IRRATIONAL MAN میں وضاحت کر چکا ہے کہ اب جس کو ہم "وجودی نبض" کہتے ہیں وہ ابراہام اور ایوب کی اساطیر کے عصر سے ہم رشتہ ہے۔ یہ یونانی فلسفیوں EURIPIDES اور AESCHYLUS کے ڈراموں کے بعد یونانی بائزنٹائن تہذیب کے راز میں منعکس ہے۔ اور یہ ایک ایسی ڈوری ہے جو ہمیشہ موجود اور بالادست رہتی ہے اور جو وسطی یورپی روایات سے لپٹی ہوئی ہے۔ بسااوقات، یعنی چرچ فادرز، آگسٹائن، GNOSTICS، ABCLARD پاسن اور اس کے آگے غیر معمولی PSCAL اور رومانی روایات (جس کے معیار کو ایک صدی بعد انہوں نے اختیار کیا) اور اسی تعلق کے ساتھ مشرق میں تمام مذہبی فلسفیانہ رویے خصوصاً بدھ اور TAOIST کے شہ پارے ہمیں مغرب کے عقل پرستانہ مباحث کے مقابلے میں انسانیت کے حقیقی وجود سے اکثر زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں۔

لیکن اسلاف کی ان مشابہتوں کے باوصف، وجودیت کے جدید تصور کو جھٹلانا ہماری بڑی غلطی ہوگی۔ مختصراً یہ کہ فلسفیانہ صداقت کی صورتیں اختیار کر لیتی ہے، کیونکہ زمانے بدل جاتے ہیں اور انہیں کے ساتھ انسانی فرد تیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اپنے تمام مذہبی، فلسفیانہ اور ادبی و فنی اظہارات میں آج ہم جسے وجودیت کہتے ہیں، وہ گزشتہ صدی کے تین عددوں کی مخصوص اور نمایاں راستی سے ابھری ہے۔ دو فلسفی سورن کیرکیگار اور فیڈرچ نطشے اگرچہ ایک نسل کے فاصلے پر رہتے تھے لیکن انھوں نے آزادانہ طور پر تخلیقی کام کئے۔ وہ ایسی سطحوں پر پہنچے جو قطعی ایک دوسرے کی مخالف تھیں۔ کیونکہ کیرکیگار نے گہرائی کے ساتھ "مسیحی خدا" کے تصور کو پایا جبکہ نطشے پوری طرح اس سے منکر تھا۔ لیکن دیگر حیثیتوں سے وہ مشابہ تھے۔ انہوں نے تنہائی، دُکھ اور تشکیک اور منفرد شخص کی قسمت کا مشترکہ تجربہ کیا۔ تیسرے بڑے نابغہ ناول نگار دستو وسکی کی تخلیقات میں بھی یہی نمایاں رجحانات تھے، خصوصاً اس کے دو ناول THE BROTHER KARAMAZOO اور NOTES FROM UNDERGROUND سے ادب میں وجودیت کے شعور کی قابلِ قدر بہار جھلکتی ہے۔

شروعات کی ان تشریحوں کے سلسلے میں ہماری صدی نے بہت محنت اور عقل صرف کی ہے۔ یہ کہنا رسمی ہوگا کہ ہمارے عہد کے نمائندہ وجودی فلسفی مارٹن ہیگر، کارل جیسپرس، گیبریل مارسیل اور بلاشک و شبہ سارترے ہیں۔ لیکن بہت سے دوسرے ــــ جس میں مخالفانہ رویّہ رکھنے والے جیسے A.N.WHITEHEAD اور NIKOLA BERDYAEV' MARTIN BUBER' JOSE ORTEGAR مفکرین شامل ہیں ــــ بھی وجودی وابستگی کے خاص عناصر سے متاثر ہوئے۔ شعوری یا غیر شعوری سطح پر ادب میں اکثر اور بہت سے مخصوص مصنّف وجودیت پرست تھے۔ حقیقتاً یہ روایت، ارتقاء کے اس خط پر بہت مضبوط، تھی جو کافکا، MALRAUX' UNAMUNO لارنس اور کامیو اور فاکنز کی تحریروں میں واضح تھی۔ خود شعوری وجودیت کے مراکز سے دُور اور منحرف رابرٹ فراسٹ جیسا فنکار HESSE بھی اس صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس کی یہ نظمیں مثلاً STOPPING BY THE WOOD اور SENSUS TALKER کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تب آخر وہ کیا چیز ہے، جس نے اتنے وسیع دیرلیق اثرات مرتب کئے؟

یہ کوئی نہیں جانتا ــــ کوئی شخص بھی اس کو بیان میں قلم بند نہیں کر سکتا۔ اگرچہ بشمول سارترے کافی تعداد میں لوگوں نے اس کی کوشش کی۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وجودیت گزشتہ عقلی استحکامات کے اندر کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ یہ زندہ تجربے کا آزادانہ ابلاغ ہے۔ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے لازمی رجحانات نمایاں ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ وجودیت تعقّل پرستی سے مبرّا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وجودی حضرات عقل کے عمل سے انکار کرتے ہیں بلکہ وہ محض اس مُصر ہوتے ہیں کہ اس کے حدود کو پہچانا جائے۔ ان میں اکثر لوگ غالباً یہ سوچتے ہیں کہ ان کے تصوّرات یقیناً مستند ہیں، اگرچہ وہ عقلی نہیں اور وہ اصطلاحات کے درمیان فرق پر زور دیتے ہیں۔ خاص طور پر وجودیت اس تمام عقلی روایت کی مخالف ہے جو دونوں نشاطِ ثا کے زمانوں سے جاری ہے۔ اور جو دو سو سال پیشتر ہیگل کی "آفاقی عقلیت" میں بامِ عروج پر پہنچی۔ ہیگل کی تحریر مشکل ہے اور اکثر ابہ آلودہ ــــ لیکن اس کا مقصد "آخری حقیقت" کو "مثالی تعقّل" کے ساتھ ایک ضابطے میں باندھنا تھا، جو کہ منفی یا مخالف تر رجحانات کو بلندی بخش دے۔ یہ عظیم الشان کارنامہ تھا ــــ اپنی رنگا رنگیوں اور بوقلمونیوں میں علامتی ــــ اور اس نے انسا کے تخیلات کو اس درجہ بہ جبر گرفتار کر لیا کہ آج اس کے اثرات "عملی" اور علمی دنیاؤں میں ہر جگہ غالب ہیں۔ لیکن کچھ لوگوں خصوصاً کیرکیگار نظر میں دماغ کی الوہیت انسانی تجربے پر اثر انداز نہیں تھی ــــ درد، خوشی، تشک، وجدان، ذاتی غم اور ناامیدی ــــ یہ عق درجہ بندیوں کی اصطلاحات میں داخل نہیں کئے جا سکتے تھے۔ فرائڈ سے بہت پہلے کیرکیگار وجود کے اندر پوشیدہ طاقتوں سے باخبر تھا ــ وہ طاقتیں جنھوں نے صرف اپنے ہونے سے تمام عقلی، اثباتی اور رجائی توہّمات کو برباد کر دیا تھا۔

"ہیگلیت" "تاریخ اور جماعت کا فلسفہ تھی۔ "آخری حقیقت" نمایا کرتے ہوئے ــــ جس کی طرف تمام تاریخ ہمیشگی کے ساتھ ا کرنے والے تجزئے کے طریقۂ کار میں رواں دواں رہتی ہے ــــ ہیگل نے مثالی دماغ کی عظیم اکائی میں انسانی شعور کو غوطہ دیا۔ لیکن ا وجود پرست کے لئے، جو یہ اصرار کرتا کہ حقیقت وہی ہے جسے اس نے تجربے کے ذریعہ محسوس کیا ہے، یہ بے معنی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ ظا اور جابر بھی ہے ــــ وجودی جانتا ہے کہ "ذات" پوشیدہ اور تہہ نشین نہیں۔ بلکہ یہاں وہاں دکھ سہتے ہوئے وجود کی شکل میں موجو د اور خیال کا کوئی بھی نظام جو اس غم پر غالب ہونا چاہتا ہے، ظلم آمیز ہے۔ کیرکیگار شدید زور دیتے ہوئے اپنی بات دہراتا ہے" لوگوں اژدحام جھوٹ ہے"، سچائی کامل ذات یا وجود کے اندر ہی ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔

پھر بھی، وجود پرست جب اپنے اندرون کا مشاہدہ کرتا ہے، تو وہ کیا پاتا ہے؟ ــــ کچھ بھی نہیں ــــ جب وہ اپنی پیدائش پیچھے اور موت سے آگے غور کرتا ہے تو صرف ایک طرح کے خلاء کو دیکھتا ہے۔ تمام علم، تمام یادداشت اور تمام جذبہ کو بر طرف کرتے ہ وہ اپنی انا کے غار کو محسوس کرتا ہے جو کسی الیکٹران کے نیوکلیئر کی مانند بے شکل اور تصوّر کی حدوں سے پرے ہوتا ہے۔ اور تاریکی اور کے فلسفیوں کے مثل وہ یہ سوال کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے ــــ کچھ نہ ہونے کے بجائے یہاں کچھ کیوں ہے؟ ــــ خلاء کے بدلے یہ دنیا اور کائنات کیوں؟ ــــ اپنی ذات کی بے معنویت پر پوری طرح توجہ کے ساتھ سوچتے ہوئے اور حقیقت کی غار بی سطح کو نما کرتے ہوئے وہ وجود پرست کچھ نہیں کو کچھ نہ ہونے یعنی "نابودگی" NOTHINGNESS کے تصوّر میں بتدریج بدلتا ہے۔ یہی واقعتاً انسانی ا کی حقیقی تکمیل ہے۔ نابودگی ہی ایک طاقت، ایک بنیاد، ایک حقیقت کی طرح ــــ ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت ایک حقیقت ہے۔ ا بطن سے انسان کی ناامیدی ہی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ (اگر اس میں ہمّت ہے) اس کا وجودی وقار بھی جنم لیتا ہے۔

اسی سے انسان کے مقابل وجود پرست کی مخالفت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ (وجود پرست شخص) غیر انسا ہوتا ہے، بلکہ اس کے قطعی مختلف اس کا مکمل معاملہ فردِ واحد کے تقدّس اور تاثر سے ہوتا ہے۔ لیکن وہ زور دیتا ہے کہ آدمیوں کو "نا کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اس کائنات میں، جس کی بنیاد نابودگی پر ہے، حقیقت کا بشری نظریہ (جو کہ نشاطِ ثانیہ سے انیسویں صدی تعقّل آمیز رہا ہے اور انسانیت نوازی کی خصوصیات واضح کرتا ہے) صاف صاف غیر محفوظ ہے۔ یہ انسان ــــ جو حقیقہ کے اسٹیج پر مرکزی کردار ہونے کے بجائے، ایک ایسا عقلی حیوان ہے، جس کے لئے غیر عقلی دنیا خلق کی گئی ہے ــــ دراصل ا اتفاقی حادثہ ہے، ایک بعد کا مہماتی نو وارد ہے جس کی زندگی اتفاقات کے زیرِ اثر ہے۔ اور اس کا ثبوت بیان کے ساتھ خود عقل اور ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء سے فراہم ہو جاتا ہے۔ درختوں، پتھروں اور ستاروں کا معاملہ جو بھی ہو، اس تعلق سے سوچ سمجھ رکھنے و انسان انھیں کے مانند ہے جو حقیقت کا غیر ضروری حصّہ ہے۔ اور وہ اس کے تمام اعمال ایک گرفت کے تحت ہستی کی جانب جھکتے

جو کہ حقیر اور کمزور ہے۔

اس سے پرے عمومیت کو ختم ہونا چاہئے۔ ہر عظیم وجودی مفکّر حماقت اور نابودگی کی صورت میں فردِ واحد کی بحالی کی طرف اپنا راستہ الگ بناتا ہے۔ سارترے بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ لیکن واضح طور پر وجودیت، جو غم اور ناامیدی کے ساتھ مقابلے سے عبارت ہے، ہمارے عہد ہی کا فلسفہ ہے۔ اگرچہ یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ اس کے سب سے بڑے شباب کے زمان و مکاں ہماری صدی کے وسطی دہائیوں کے یورپ ہی میں تھے۔ یہ ان لوگوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، جو ایسے سماجی خلاء، غیر عقلی ایذا دہندگی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی قنوطیت اور کابوسی تخیل کے درمیان زندگی گزار چکے ہوں۔ لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ اگر وجودیت گراہم گرین ANDRE MALRAUX اور ARTHUR KOESTLER کی دنیا میں پھلی پھولی تو اس کی ابتدا ڈکنس، بالزک اور پشکن کی دنیا میں ہوتی۔ کیر کیگار اور نطشے دونوں ہی نے ان حالات میں زندگی بسر کی جسے باہری دنیا والوں نے کم سے کم غیر آرام وہ انصاف میں تولا۔ اندرونی تلاش کے ضمن میں انھوں نے جن انسانی حالت کی حیثیتوں کا سراغ لگایا، وہ تاریخ کے ڈراموں کے مقابلے میں زیادہ گہرائی سے جڑ پکڑے ہوتی تھیں۔

دستو دسکی نے لکھا تھا ـــــ "دکھ ضمیر کا منبع ہے ـــــ" لیکن یہ دکھ خیالات و احساسات کی موجودگی میں کہیں پرے ہے۔ اپنے طور پر سارترے نے مکمل سادگی کے ساتھ تحریر کیا ـــــ "ناامیدی کی دوسری سمت زندگی شروع ہوتی ہے ـــــ"

وجودیت کے لئے سارترے نے کلاسیکی اعتبار سے فرانسیسی ذہن تیار کیا ہے۔ جیسا کہ امریکہ کے لوگوں نے اسے سمجھا، سارترے اگر رہنما نہیں، تو وہ حقیقتاً ان رہنماؤں کا ایک نمائندہ ضرور ہے۔ اور اس کی راستی، مصنّف کی حیثیت سے اُس کا فن، اُس کی کاٹ اور تیزی اور جدّت نے کسی فلسفی کے مقابلے میں اُس کے قارئین کا وسیع حلقہ اس کے لئے فتح کیا ہے، جس سے وہ مستقلاً زندگی بھر لطف اندوز ہوتا رہا۔ اُس نے اپنے فن پاروں کو خصوصیت کے ساتھ فرانسیسی ذہنیت سے ہم کنار کیا ـــــ یعنی ماورائی لَے کے بدلے نفسیاتی لہجے کی جھنکار زیادہ ـــــ بیان کی سچّائی کے ساتھ ـــــ کیونکہ DESCARTES نشاطِ ثانیہ کی عقلیت کا نمائندہ تھا ـــــ سارترے ایک وجود پرست ہے جس نے CARTESIAN روایت میں اپنا عمل شروع کیا۔ کسی سراغرسانی کی ابتدا کے وقت وہ COGITO کی شکل ڈھالتا ہے۔ یعنی ذات، "جو کچھ کہ وہ ہے"، اور ذات جو "جو کچھ کہ وہ ہے"، کو دیکھتی ہے، اس دوہری حیثیت سے عموماً وہ روشن ترقّیات کے ساتھ دوسری دوہری حیثیتوں کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس کو پیشہ ور فلسفی ہی تمام تر اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن سارترے نے در حقیقت نطشے کے قول میں اضافہ کیا ہے "وہ میں کسی فلسفی کو اسی وقت اعزاز دیتا ہوں جب وہ مثالی ہو ـــــ" وہ خود ایک مثال تھا۔ اور اپنی مثالیت کی تعریف اور اس کے عمل درآمد کرنے کے لئے گہرے دکھوں میں مبتلا رہا تھا ـــــ یعنی ـــــ صحافت میں، ناول میں، ڈرامے میں، سیاسی اشتغال میں اور درس و تدریس میں ـــــ فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سارترے کون تھا۔؟

جے پال سارترے پیرس میں سنہ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوا۔ اس کی پرورش اس کی ماں کے خاندان SCHWEITZERS میں ہوئی۔ البرٹ اس کا بڑا چچیرا بھائی تھا۔ اس کی تربیت دادا کی زیرِ نگرانی ہوتی رہی جس نے BERLITZ جیسی اس زمانے کی زبانوں کے طریقۂ تعلیم کو ایجاد کیا۔ حقیقت میں سارترے نے اپنے دادا کے کتب خانے میں زیادہ وقت گزارا جس سے وہ لکھنے کی طرف مائل ہو گیا۔ جیسا کہ خود اس نے اظہار کیا ہے کہ وہ بوریت سے اکتا کر تصنیف کی جانب آیا تھا۔ اس نے اتفاق سے فرانس اور جرمن کی یونیورسٹیوں میں فلسفے کو پڑھا۔ اسی کے ساتھ اس نے LE HAVRE میں بھی تعلیم حاصل کی۔ جس کو اس نے NEUSEA ناول میں BONVILLIE کی مثال پیش کیا۔ یہ اس کا پہلا مکمل ناول ہے۔ جب یہ سنہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تو اس پر بہت لعن طعن کی گئی۔ خاص طور پر علمی حلقوں میں اسے برا کہا گیا۔ لیکن نئی نسل کے قارئین نے اس کا استقبال کیا۔ اور یہ اس کے دوسرے ابتدائی ناولوں میں زیادہ کامیاب رہا۔ پھر جنگ چھڑ گئی۔ سارترے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ایک موقع پر گرفتار ہو کر جیل گیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد بیماری کے سبب وہ رہا کر دیا گیا۔ اور پھر وہ پیرس لوٹ آیا۔ یہاں "اکوپیشن"، کے تحت اُس نے بہت سے ڈرامے لکھے۔ اُس کا پہلا عظیم فلسفیانہ

[باقی صفحہ ۱۶۱ پر دیکھئے]

شارق جمال

میں اکیلا ہی تھا آج بھی دُور تک
لے گئی تھی مجھے بے خودی دُور تک

تجھ سے ناآشنا تھا میں چلتا رہا
پائی میں نے کہاں آگہی دُور تک

مُسکراتے ہیں حالات کے زخم سب
آج ہے درد کی چاندنی دُور تک

آئینے عکس کس کا دکھاتے ہمیں
شہر میں دیکھی بے چہرگی دُور تک

لے گئی گُلستاں سے خزاں کی خبر
دشت میں پھول کی پنکھڑی دُور تک

کوئی منزل نہ تھی میں بھٹکتا رہا
پیچھے پیچھے رہی زندگی دُور تک

ایک ایسا سفر بھی ہے میرے لیے
راہ میں ہوں گے سب اجنبی دُور تک

دائرے میں روایت کے محصور ہے
دیکھ سکتا نہیں آدمی دُور تک

مجھ سے شارق تھی اس دہر میں ہر طرف
روشنی دیر تک ما روشنی دُور تک

عظیم بکرا سلاٹر ہاؤس، مومن پورہ، ناگپور۔

سحر سعیدی

سورج کے مُنہ پہ شب کا اندھیرا اچھال کے
خوش ہو رہا ہوں دل سے یہ حسرت نکال کے

پھُولوں سے رَس ہواؤں سے خوشبو نکال کے
خاکے بنا رہا ہوں ترے قدّ و قال کے

ہر سمت آرزوئیں تمنّائیں جا بہ جا
رکھنا زمینِ دل پہ قدم دیکھ بھال کے

شاید ہے زندگی کا یہی نقطۂ عروج
چرچے بہت ہیں شہر میں میرے زوال کے

شاید کوئی نجات کی صورت نکل سکے
آیا ہوں نیکیوں کو سمندر میں ڈال کے

الفاظ چل پڑے ہیں معانی کی کھوج میں
بکھرے پڑے ہیں ذہن میں پیکر خیال کے

کب تک سحرؔ یہ ہجر کی راتوں کے تذکرے
پھر لوٹ کر نہ آئیں گے یہ دن وصال کے

۱-۱۸-۱۷، ٹوٹلی کی مسجد، چیلی پورہ، اورنگ آباد

محسن جلگانوی

سب مال و زر فساد میں بلوائی لے گ
اک سر بچا تھا وہ بھی میرے بھائی لے گ

بھوکے پرندے، سوکھے جزیرے دل سے آ
لوٹے تو شہرِ سنگ کی رُسوائی لے گ

آپس کا مسئلہ تھا مگر ردّ و قدح
کیا کیا تاثرات تماشائی لے گ

چھوتے ہی پانیوں کو تو لگتی ہے آگ
موسم گئے تو ساری مسیحائی لے

جو بانٹتے تھے شہر میں خیرات کر
ہم سے ملے تو اپنی شناسائی لے

محسنؔ دُعا کے واسطے اٹھتے نہیں ہیں
آسیبِ شر تمام توانائی لے گ

۱۸/۸۶۷، ریلوے بلڈنگ، ساؤتھ لالہ گوڑا، س

بغیر بنیاد کی عمارت

عارف محمود ● ۹۲/۱۴۰، پروہ ہیرامن، کانپور (یوپی)

ایک زوردار دھماکا ہوا اور پاس پڑوس کی ساری عمارتیں جاگ پڑیں۔ تجسّس، خوف، اندرونی مسرت اور رنج کے ملے جلے جذبات ہر چہرے سے عیاں تھے۔ اندھیرا ہونے کی بنا پر دھماکے کی صحیح وجہ سے سب بے خبر تھے۔ لیکن پھر بھی ہر عمارت اپنے طور پر قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ ایک بہت ہی قدیم عمارت نے اپنی پڑوس کی ایک نسبتاً کم عمر عمارت کو جھڑک دیا۔ "تم اس کے انجام پر ہنس رہی ہو اور مجھے اس کی جواں مرگی پر افسوس ہے"۔ کیا کہا! وہ تم سے جلتی تھی؟ جلتی تو مجھ سے بھی تھی بلکہ مجھے تو وہ سرے سے ہی عمارت ماننے کو تیار نہ تھی۔ ہاں تمہاری یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہ مغرور تھی اس کو یہ بھی خیال نہیں تھا کہ میں عمر میں اس سے سیکڑوں سال بڑی ہوں۔ اچھا نیند مت خراب کرو سو جاؤ ابھی بہت رات باقی ہے۔ صبح اس کا حشر دیکھیں گے۔ کیا کہا نیند نہیں آرہی ہے؟ وہ تو مجھے بھی نہیں آرہی ہے۔ لیکن ذرا خاموش رہو اور مجھے اس کی چند روزہ زندگی پر غور کرنے دو۔ اس کی تعمیر میں کس قدر لوہا اور سمینٹ استعمال ہوا تھا۔ اف فوہ۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ کسی نقشہ اور مشینوں کی مدد کے بغیر ہماری جیسی نہ جانے کتنی عمارتیں تعمیر ہوگئیں اور سیکڑوں سال بعد بھی ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہیں۔ برا نہ ماننا بہن تم عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی ہو لیکن تمہاری تعمیر میں بھی نفرت اور غرور کا مسالہ استعمال ہوا تھا۔ جب تم نے گھٹنوں کے بل چلنا شروع کیا تھا اسی وقت تم غرور سے اپنا سر اونچا رکھتی تھیں۔ سر اٹھا کر چلنا بری بات نہیں لیکن غرور سے سر اٹھانا بہت ہی چھوٹی بات ہے۔ مجھکو دیکھو کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ویسی کی ویسی ہی ہوں۔ غرور تو مجھ کو کرنا چاہئے کہ ہر نو آموز معمار جب فن عمارت گری سیکھتا ہے تو میری ہی تاریخ پڑھتا ہے۔ مجھ کو زخمی کر کے میرے خون اور گوشت کی پرکھ کرتا ہے اور پھر اپنے طور پر نئی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ میرے درپہ جبیں سائی کئے بغیر کوئی اچھا معمار بن ہی نہیں سکتا۔ لیکن میں غرور نہیں کرتی میں تو اپنے جسم پر ہزاروں زخم لے کر بھی ان نئے معماروں کو راہ دکھاتی ہوں۔ میں تو تمہاری پیدائش کے وقت سے ہی تم سے خوش تھی کہ تم نے فن عمارت گری میں نئی راہیں تلاش کیں۔ تم نے ہمکو مزید حسین بنانے کے لئے ہمارے گرد بنے ہوئے بڑے بڑے پائیں باغوں کے چھوٹے چھوٹے گلدانوں میں مقید کر دیا۔ تم نے ہمارے اونچے اونچے بے مصرف دروں کو نفیس جالیوں سے ڈھک کر قد آدم کر دیا۔ تم نے ہماری دیواروں پر کھدے ہوئے روایتی قصے کہانیوں کی جگہ قدرتی مناظر سجائے اور ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہزاروں واقعات کی صحیح تصاویر آویزاں کیں۔ کہ وہ وقت کا تقاضا تھا۔ تو کیا یہ سب مجھ کو برا لگا تھا؟ بالکل نہیں بلکہ میں تو بہت خوش تھی کہ یکسانیت سے نجات ملی۔ میں خود اپنے بچوں کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن نہیں اس حقیقت کے باوجود درپردہ تم میری مخالفت کرتی رہیں اور پھر شاید تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اصل جڑ کو چھوڑ کر تم پنپ نہیں پاؤگی اسی لئے جب چند سر پھرے نوجوان معماروں نے بغیر بنیاد کی عمارتیں تعمیر کرنے کی کوششیں کیں اور ان کی کوئی خاص پذیرائی نہ ہوئی تو تمہاری بقیہ چاہنے والوں نے ہم سے سبق حاصل کیا اور وہ پھر راستے پر آگئے۔ ارے! دیکھا باتوں باتوں میں تم نے میری نیند بھی اڑا دی۔ مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کیا کہا؟ مندروں میں ناقوس بھی بج رہا ہے۔ ہاں سن رہی ہوں۔ اور وہ دیکھو سامنے پرانے گرجا گھر کی کھڑکیوں سے روشنی جھانکنے لگی ہے۔ شاید بوڑھا پادری اندر مشعل جلا رہا ہے۔ ہاں میں کیا کہہ رہی تھی۔ اب تو حافظہ بھی کمزور ہونے لگا ہے۔ بات غرور کی تھی۔ تم نے بھی بچپن سے ہی نفرتوں کے جذبے کے ساتھ چلنا سیکھا اور

پھر جب تم پر جوانی آئی تو ایک بار تو میں بھی ڈگمگا گئی تھی ۔ بہن میں نے کہہ دیا تا کہ فن تعمیر میں نئی باتوں سے مجھ کو نفرت نہیں۔ ترقی پسندی، جدت اور نیا پن تو ہر ذی شعور کو اچھا لگے گا۔ لیکن عمارت، عمارت تو لگے ۔ ؟ اب تم ہی بتلاؤ۔ جب یہ سامنے والی عمارت بن رہی تھی تو میں تو خیر چپ تھی لیکن تم نے بڑا واویلا مچایا تھا کیوں کہ تمہارے چاہنے والے سب نئے پن کی تلاش میں ان کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ جو میرے تھے وہ تمہارے ہوئے اور پھر تم کو بھی چھوڑ کر اس کے ہو گئے۔ ہاں تو اس وقت تمہاری ہی رائے تھی کہ یہ نو تعمیر چیز نہ جانے کیا ہے اور جب میں نے تم کو بتلایا تھا کہ وہ معمار جو اس کو بنا رہا ہے وہ اس کو عمارت کے نام سے پکارتا ہے تو تم کس قدر ہنسی تھیں ۔ جیسے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ ہاں میرا بھی یہی خیال تھا۔ بلکہ میں تو ابھی تک اس کو عمارت ہی ماننے کو تیار نہیں تھی پھر بھی پڑوسی ہونے کے ناطے میں نے اپنے خیالات کی باغیانہ روش کو کچل کر اس کو عمارت کا نام دے دیا تھا۔ ارے ہاں خوب یاد آیا جب اس کے خدوخال کچھ نمایاں ہونے لگے تھے تو تم ہی نے تو کہا تھا کہ یہ شاید کوئی گنبدِ بے در ہے۔ یا پھر سانچی کا استوپ ہے جس کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ ارے تم تو پھر ہنسنے لگیں۔ ہنسی تو مجھے بھی آ رہی ہے ۔ ہم دونوں کتنی دیر اس دن بحث کرتے رہے تھے کہ یہ عمارت نہیں ہے ۔ اگر عمارت ہوتی تو داخلے کا دروازہ تو ہوتا۔ اور پھر میں نے تم کو یہ کہہ کر قائل کیا تھا کہ کبھی عمارت تو ماننا پڑے گی کیوں کہ اس میں ہماری تمہاری طرح بنیادیں بھی ہیں۔ سمنٹ، کنکر، پتھر اور لوہا بھی ہے اب یہ الگ بات ہے کہ اس کی تعمیر میں اس قدر جدت روا رکھی گئی کہ داخل ہونے کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے ۔ تو چلو دیکھتے ہیں آخر لوگ اس کے اندر کیسے داخل ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ دن آیا کہ اس عمارت نے اپنی پہچان بنانے کے لئے اپنا ایک نام رکھا تو کس قدر روشنیاں ہوئی تھیں ۔ کتنے بڑے بڑے معمار اکٹھا ہوئے تھے۔ ہم تم نہیں بلائے گئے تھے کیونکہ ہم ان کی نگاہوں میں ایک سڑی گلی چیز تھے ۔ حالانکہ ہماری تعمیر ان ہی لوگوں نے کی تھی جو فن تعمیر کی بنیاد مانے جاتے ہیں۔ ارے یہی سامنے والی عمارت کا معمار جب عمارت گری سیکھ رہا تھا تو میں نے ہی اس کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اور پھر یہ اس قابل ہوا کہ چھوٹی چھوٹی عمارتیں بنانے لگا لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا اس نے اپنی بنائی ہوئی وہ تمام عمارتیں توڑ ڈالیں کیوں کہ بقول اس کے وہ اس کے دورِ جہالت کی نشانیاں تھیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس کی پہچان ان ہی عمارتوں سے باقی ہے ۔ دیکھا باتیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ بات ہو رہی تھی جشن کی۔ ہاں تو اس دن بڑی چہل پہل تھی۔ وہ معمار جو کبھی ہمارا دم بھرتے تھے اس دن وہاں نظر آ رہے تھے کیونکہ مشہور تھا کہ جو اس عمارت کو مکمل عمارت نہ کہے گا وہ جاہل کہا جائے گا۔ اس لئے ہر شخص شدومد کے ساتھ اس کوشش میں لگا تھا کہ اسے عمارت ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دے ۔ لیکن مزہ تو تب آیا جب عمارت میں داخلے کی کوشش کی گئی۔ کوئی کھڑکی سے داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا تو کوئی جالیوں سے اور کسی نے روشندان پر نگاہیں جما رکھی تھیں ۔ چند لوگ کمند لگا کر چھت پر چڑھ گئے لیکن یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ "اوپر سے بھی کوئی راستہ نہیں" اور پھر اس معزز معمار کو دعوت دی گئی کہ جو اس عجوبہ کا خالق تھا۔ اس نے پہلے تو تمام شرکاء کی عقل پر ماتم کیا اور پھر قبل مسیح سے لے کر موجودہ دور تک کے تمام عجائبات کا مختصر جائزہ پیش کیا اور پھر عمارت کے اندر داخل ہونے کا راستہ دکھلایا۔ لوگوں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعروں سے ساری محفل گونج گئی ۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ محفل برخواست ہونے کے بعد لوگ جب ٹولیاں بنا بنا کر واپس ہو رہے تھے تو ہر شخص اس بات پر متفق تھا کہ عمارت کے خالق نے اتنی لمبی چوڑی تمہید کے بعد جو راستہ دکھلایا تھا وہ پھر گم ہو چکا تھا۔ اور سب نئے سرے سے اسے تلاش کرنے کی دھن میں غرق تھے ۔ تم سُن رہی ہو یا سو گئیں ؟ ارے ادھر کیا دیکھ رہی ہو۔ اب صبح ہونے والی ہے۔ سامنے سے آنے والے شاید اسی کا سوگ منانے آ رہے ہیں۔ آؤ اب خاموشی سے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

لوگ جوق در جوق آنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں سے یا تو جدید معمار تھے یا پھر فن معماری کے مبتدی تھے۔ وہ سب عمارت کے گرنے کی وجہ تلاش کرنے لگے۔ عمارت گری ضرور تھی لیکن کہاں سے گری تھی یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کیونکہ باہر سے سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اب وجہ ڈھونڈنا بڑا مشکل کام تھا۔ پھر بھی ہر شخص اسی طرح سے قیاس آرائیاں کر رہا تھا جس طرح اس کے افتتاح کے موقعہ پر لوگ عمارت کے داخلے کا درنا تلاش کر رہے تھے۔ آخر سب تھک ہار کر بیٹھ گئے ۔ اور پھر اس کے خالق کی تلاش ہوئی کہ وہ خود آ کر اس کے گرنے کی وجہ پر روشنی ڈالے۔ اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اب لوگوں کو تشویش ہوئی۔ سب نے اس کا نام لے لے کر آوازیں لگائیں۔ بڑی دیر کے بعد ایک نحیف سی آواز

[باقی صفحہ ۵۲ پر دیکھئے]

حامد مجاز

آخری زوال

کتنی بار تمہیں ٹوکا تھا
گر جاؤ تو
مر جاؤ گے
تم نے بات کہاں مانی تھی
کیسے لوٹ کے اب آؤ گے
سورج کا پل ٹوٹ چکا ہے!

بوجھ

لہو کی سوچ پر سائے
سسکتے بادبانوں کے
شکستہ خواب سے چہرے
دراڑیں تشنہ کامی کی
کوئی سورج اٹھاتا ہے
پٹخ دیتا ہے گھبرا کر!

تکلّم

جمود، ٹھہراؤ ـــــ تعطّل
حروف گفتنی ہے
بولتے ہیں
رات کی
خوابیدہ باہوں میں
عدم نا آشنا
لب بستہ خوابوں کے
دریچے کھولتے ہیں ـــــ !

بلاوا

تیری آواز کا پنچھی
نگاہوں کو جگاتا ہے
نئے منظر اگاتا ہے
مجھے تیرگی آمیز دیواریں
عبث مجھ کو بلاتی ہیں
اندھیروں سے، حصاروں سے
مجھے اب واسطہ کیا ہے
بگولے کھا گئے ہوں گے نقوشِ پا کو بھی میرے!

● ۱/۹۰۲-۴-۲ (کاچی گوڑا) حیدر آباد

عارج میر

گفتگوئے روز و شب

بڑھ رہا ہے روز و شب ناخون کی صورت عناد
تیرتا ہے آسمانوں پر خلا ر
خوشبوؤں کو مسخ کرتی
شورشِ گردِ کثیف

کرسیوں پر ڈیرا ڈالے بیٹھتی سرگوشیاں
ریشہ ریشہ گتھیوں کو کھولتی ہیں انگلیاں
لمحہ لمحہ رقص کرتے خیر و شر
شہد کے چھتنار سے
اڑتی پھرتی مکھیاں

● وارڈ ۹۰۶-۴۴۴۴ ضلع امراؤتی (مہاراشٹر)

نافری وہیل کی سائیکل

کلادھر :
ندی سے ترجمہ : صفدر امام قادری ● قادری منزل ۔ بتیا ، چمپارن ، بہار

ان دنوں وہ کافی تکلیف میں ہے ۔ ادھر چند برسوں سے اس کی حالت بد سے بدتر ہوتے ہوئے بدترین ہوگئی ہے ۔ ایک طرف شہر میں
.نے والے صاحبانِ فکر و نظر کی کارکردگی کو نئی اسپرٹ دینے کے لئے اس کی ضرورت شدید طور سے محسوس کی جاتی تو دوسری جانب غیر مختتم
مجثوں ، کلفتوں اور زمانے سے چلی آ رہی گڑ کی ، سے وہ اب ادبا ہی نہیں ، ٹوٹ بھی چکا ہے ۔ اب تو دن بھر بیڈوس کی دوکان پر بیٹھا دھار کی تمباکو
اتے پان میں اپنے آپ کو ممکنہ حد تک مشغول رکھتا ..... کبھی ادب کبھی سیاسی بحران پر اور جب فارم میں آجاتا تب عالمِ انسانیت کی حالتِ شکستہ
لیشان اپنے چہرے کو کسی ایک زاویہ میں سمو کر افق کے نہ ختم ہونے والے سلسلے پر غور و فکر کرتا رہتا جیسے اپنی آنکھوں میں ابلنے والے نمکین
لی سے کائنات کی تمام تر تکالیف کو دھو ڈالنا چاہتا ہو ۔ لے دے کے ایک بھرپور انسانی مجسمہ تیار کر لیا تھا اس نے .....

گزشتہ کئی برسوں سے تقریباً درجنوں فیلڈوں میں کچھ نہ کچھ وہ کرتا ہی رہا ہے لیکن مستقل مزاجی کی بات نہ آسکی ۔ اس کا کہنا ہے :
ب نیچر ہر پل نیا ہوتا رہتا ہے ، بدلتا رہتا ہے ، جب زندگی بنیادی طور پر ٹھہراؤ قبول نہیں کر سکتی تب پھر کسی نوکری یا حصولِ زر کے لئے
مستقل طور سے سوچنا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ؟ جب ہر لمحے کا حساب عالمِ بالا میں ماقبل تحریر شدہ ہے تو پھر .....

میں ابھی ابھی لوٹا ہوں ۔ دن بھر کی تھکان نہ جانے کہاں کھو گئی ہے اور کچھ بچا ہے تو اس کی بھولی بسری یادیں ۔ تبھی اوشا ایک ہاتھ میں چائے
، گرم پیالی ، دوسرے ہاتھ میں شاید مقامی اخبار ، ہونٹوں پر پہلی سی مسکراہٹوں کی تازگی اور آنکھوں آنکھوں میں بیت گئی رات ، گنگناتی ہوئی چلی جاتی
ہے ۔ مجھے اس کا گنگنانا ایک ماقبل متعارف اپناپن کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے ۔ اور میں مجبور ہو جاتا ہوں پوچھنے کے لئے کہ یہ گیت ..... ٹیبل پر پڑے
قامی اخبار کی جانب اشارہ کر کے وہ کچن کی طرف بڑھ جاتی ہے اور میں جاتے ، سگریٹ اور ساتھ میں مقامی اخبار میں چھپے ہوئے گیت کے
شبدوں کی سیڑھیوں سے ماضی کی طرف لوٹنے میں اناپاس بنے حالات سے کچھ زیادہ مسرت محسوس کرنے لگتا ہوں ۔ دراصل کچھ دیر کے لئے
مجھے فخر ہونے لگتا ہے کہ ایسی شیریں تحریر کا خالق میرا .....

دراصل انسانی زندگی میں جوانی کے دنوں کی یادیں شاید ٹانک کی طرح کام کرتی ہیں اور کیسے کیا ہوتا ہے ، میں نہیں جانتا لیکن
یہاں تک محسوس کرتا ہوں ، پچھلی زندگی ، وہ بھی اسکول کالج کی ، یاد کرتے ہی ہم اپنی حالیہ زندگی میں کچھ ایسا ویسا ضرور پاتے ہیں جس پر
تفصیل سوچ وچار کا مطلب ہے ، خدا کے وجود کو تسلیم کر لینا ..... بار بار مان لینا !

ہاں ، تو میں اس کے بارے میں بتا رہا تھا ، ایک لیک سے ہٹی ہوئی شخصیت ۔ کب پڑھتا ، کیسے پڑھتا ، یہ تو میں بہت دنوں تک نہیں
جان سکا لیکن کلاس میں سب سے آگے بیٹھنے والا ۔ ہر سبجکٹ کو صحیح ڈھنگ سے سمجھ کر اس پر اپنی اوریجنل اور بنیادی فکر ، اپنی بھرپور لاجک
ے منوا لینے والا ..... ہر کسی کے لئے بہ آسانی حاصل اور پھر اڑ گیا تو اڑ گیا ۔ ہاں ، ہاں اس نے اپنے خوبصورت اندازِ فکر اور اپنی صاف
دلی سے نہ صرف ڈاکٹر معرا کو چپ رہنے پر مجبور کر دیا بلکہ ڈاکٹر گھوش ال جیسا بین الاقوامی شہرت رکھنے والا انسان بھی اس کے حلقۂ اثر میں
تے بغیر نہ رہ سکا ۔ کہاں تک سُنائیں ——— استادوں کے نجی مسئلے بھی اسے ہی سلجھانا ہوتے اور طالب علموں سے تو اسے آپ ہر وقت
محور دیکھ ہی سکتے تھے ۔ کل ملا کر اسے جاننے والے ، ہم سبھی کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ اس سے چاہتے تھے ....

آنرز کا امتحان ٹلتا گیا اور وہ پٹری سے اتر گیا۔ بی۔ اے پاس کرنے سے پہلے اسے بیوی پاس کرنی پڑی اور یہی اس کی زندگی کے لئے زلزلہ ...... اس کا کہنا تھا کہ ہر حالت میں ایک تعلیم یافتہ آدمی کو ایک تعلیم یافتہ بیوی ملنی چاہئے...... اور اسے کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ...... اور آپ جانتے ہیں ـــــ اُسے بیوی ملی تو بس، بھولی بھالی گائے۔ ہاں، تو اسے آنرز میں کلاس نہیں ملنی تھی، نہیں ملی۔ ایم۔ اے ہمارے ساتھ نہیں کیا۔ بعد میں اس نے کیا کیا، میں پانچ سات برسوں سے کچھ نہیں جانتا تھا۔

میں دن میں لان میں بیٹھا شاگردوں کو کچھ بتا رہا تھا تبھی وہ ہاتھ میں کچھ کاغذات لئے نظر آیا۔ چند لمحوں کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ ہو سکا جب میں ایک نظر میں پہچان کر بھی اسے نہیں پہچاننا چاہتا تھا۔ دراصل میں اس کے لئے قطعی تیار نہ تھا کہ مجھے وہ یہاں اور اتنی بے ترتیب حالت میں ملے گا۔ اس کی نظر ادھر نہیں تھی اور میں اپنے آپ کو روک نہیں سکا، پیچھے سے دھر دبوچا۔ اس غیر متوقع اور اچانک ملاقات سے اور وہاں مجھے استاد کے روپ میں دیکھنے پر اب وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ایک منٹ میں وہ اپنے بارے میں کہنے لگا: ’میں، جہاں تم چھوڑ آئے تھے، وہیں ہوں۔ اس بیچ کا وقت سائیکل پر ضرور گزرا لیکن فری وہیل نہیں رہنے کی وجہ سے میں لاکھ پائڈل مارتا رہا، ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکا ہوں۔ ہاں، البتہ کچھ گھس ضرور گیا ہوں...... خیر، اب گھر پر رہتا ہوتا ہے، کھیتی کسانی...... سوچا، لاء کر لوں، شاید کبھی پریکٹس کر سکوں...‘ دس منٹ میں اس کا کام اختتام پذیر ہوا۔ اب اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں گی، کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ میں دو ڈھائی برسوں تک وہاں پروفیسری کرتا رہا لیکن اس سے پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔

اور آج برسوں بعد اسے اچانک دیکھ کر بہت بڑا جھٹکا لگا ہے۔ بالکل مریل سا، کالا کلوٹا، دبلا پتلا آدمی، جسے آدمی ماننے کی مجبوری ہی ہے۔ جاڑے کی شام، شہر کا مین روڈ، بھارت پریس کے سامنے ٹھنڈ سے سکڑتی ہڈیوں کو سستے کمبل میں چھپانے کی کوشش ناکام۔ افق کی آغوش میں گھورتی اس کی آنکھیں۔ وہ پردیز کے انتظار میں کھڑا ملا ہے ـــــ جلد ہی واپسی کی میری مجبوری کے باوجود جیپ روک کر اس سے چپکنے میں مجھے جو روحانی تسکین حاصل ہوئی ہے، میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ دراصل یہ سب محسوس کرنے کی چیزیں ہیں..... ...... مجھے اس کی آنکھیں اب بھی نظر آرہی ہیں۔ بالکل معمولی، خاموش، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ...... مجھے فوراً پہچاننے کے لئے بے چین تھیں بالآخر اسے پہچانا ہے۔ اسے یہ جان کر آج کتنی خوشی ہوئی ہے کہ میں اس کے ضلع میں ڈپٹی کلکٹر بن کر آگیا ہوں...... میں اپنی خوشی کو لفظوں کے تنگ حصار میں نہیں باندھ سکتا‘..... اپنے صاف، سہج اور سادہ اندازِ بیان کی عادت کی وجہ سے آج وہ اپنے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ پایا، ”یار، میں تو سٹر رہا ہوں!“

رات کا معاملہ ہے۔ دور جانا ہے۔ میں نے ممکنہ کوششیں کی ہیں کہ وہ آج کم از کم ابھی میرے ساتھ چلے تاکہ پہلے تو جم کر اسے دیکھ سکوں۔ رات بھر خوب خوب باتیں کر دوں۔ میں بہت چاہ کر بھی اسے اپنے ساتھ نہیں لا پایا ہوں۔ دراصل برسوں سے چلی آرہی اس کی گردش کی کہانی اس کی زبانی سننے کی مجھے بے پناہ خواہش ہے..... دوسرے دن کبھی ملنے کی بات ہو گئی اور وہ چلا گیا ـــــ جاتے جاتے اپنی دو تازہ ترین تخلیقات میرے سپرد کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اس کا دوست ہونے کے ناطے میں اس کی نظمیں سمجھ سکتا ہوں...... لیکن آپ مجھے معاف کریں گے، اس کی نظمیں میں بار بار پڑھ چکا ہوں اور ہر بار پڑھنے کے لئے مجبور ہوں !!! ○○

بقیہ صفحہ ۵۰ بغیر بنیاد کی عمارت

بقیہ صفحہ ۵۰

آئی گر“ میں عمارت کی بنیاد کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہی ایک چیز ایامِ جہالت کی نشانی تھیں اور یہ سامنے والی پرانی عمارت ہمیشہ مجھ پر طنز کرتی رہتی تھی کہ تم نے سب کچھ جدید کر لیا لیکن بنیاد تو پرانی ہی ہے۔ تو میں نے سوچا کہ آج اس کی بنیادیں بھی ہٹا دوں۔ اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اب یہ عمارت ڈھیر بن کر رہ گئی ہے اور میں اس کی بنیاد کے نیچے دبا پڑا ہوں“۔ لوگوں نے غور سے اس کی مصیبت کی کہانی سنی۔ کچھ نے افسوس کیا۔ پھر ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ اور کچھ اس کی کراہوں میں شامل ہو گئے لیکن اس کی مدد کرنے سے وہ سب بھی معذور تھے کیونکہ عمارت کے اندر جانے کا کوئی دروازہ ہی نہیں تھا اور بغیر اندر داخل ہوئے فن کار کو اس کی قید سے کوئی نجات نہیں دلا سکتا تھا۔ کہن سال عمارت یہ ماجرا دیکھ کر اتنی زور سے ہنسی کہ اس کے سارے اعضاء ہل گئے لیکن وہ اب بھی اپنی بنیاد پر کھڑی تھی۔ ○○

فریاد آزر

سراغ بھی نہ ملے اجنبی صدا کے مجھے
یہ کون چھپ گیا صحراؤں میں بلا کے مجھے

میں اس کی باتوں میں غم اپنا بھول جاتا مگر
وہ شخص رونے لگا خود ہنسا ہنسا کے مجھے

اسے یقین کہ میں جان دے نہ پاؤں گا
مجھے یہ خوف کہ روئے گا آزما کے مجھے

میں اپنی قبر میں محوِ عذاب تھا لیکن
زمانہ خوش ہوا دیواروں پر سجا کے مجھے

ہوا نے بیچ میں دیوار کھینچ دی ورنہ
نقوش ملنے لگے تھے تری صدا کے مجھے

یہاں کسی کو کوئی پوچھتا نہیں آزر
کہاں پہ لائی ہے رنگیں ہوا اڑا کے مجھے

● شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

نشتر اکبرآبادی

چہرہ بدل کے لوگوں نے دھوکہ دیا مجھے
دن میں چراغ لیکے نکلنا پڑا مجھے

ہر شخص چل رہا تھا لئے کانچ کا بدن!
لوگوں کا رکھ رکھاؤ تماشہ لگا مجھے

محسوس یہ ہوا مرے دامن میں کچھ نہیں!
احساس اپنے علم کا جب بھی ہوا مجھے

کچھ دیر کے لئے مجھے حیرت میں ڈال دے
آنکھوں میں انتظار سجا کر دکھا مجھے

میں نیلے آسمانوں میں داخل نہ ہو سکا
آواز دور سے کوئی دیتا رہا مجھے

● ۳۹۹ - سنٹرل اسٹریٹ، کورہ گلی، پونا ۴۱۱۰۰۱

شمس الحسن

محنت کش دنیا ہوں صلہ کچھ بھی نہیں ہے
مجرم ہوں مگر میری سزا کچھ بھی نہیں ہے

بچوں کی ہنسی چھیننے والوں سے یہ پوچھو
کیا کھیل رلانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

کیا جانئے برباد ہوئے کتنے گھرانے
پھر بھی یہ خبر ہے کہ ہوا کچھ بھی نہیں ہے

سنتے ہیں ابھی گاؤں کے پانی میں مزہ ہے
شہروں میں جو ملتا ہے مزہ کچھ بھی نہیں ہے

پھولوں پہ مہکنے کا ہے الزام سراسر
بے وقت کے موسم کی خطا کچھ بھی نہیں ہے

● بتوسط، ڈاکٹر صادق، 152A/A9 شالیمار باغ
دہلی ۳۳

مکتوبات

(آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ ۱۹۸۵ کے متعلق)

تاثرات، تجاویز، تجزیے، دعائیں

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ——— بیروباری، گوہاٹی (آسام)

رسالہ شاعر اپنے اجراء سے لے کر اب تک اردو ادبیات کو نوبہ نو سمت و افق دیتا رہا ہے اور برصغیر ہند و پاکستان کا یہی واحد جریدہ ہے جس نے غالباً عمر خضر حاصل کرلی ہے۔ آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ جو دراصل ۱۹۸۵ء کے پہلے تین ماہ کے شماروں پر محیط خصوصی شمارہ ہے متعدد اعتبار و لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ادارتی نوٹ میں شاعر کے صحافتی سفر کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ برادرم اعجاز مرحوم سے دوستانہ مراسم در وابطے کے توسط سے میری جذباتی وابستگی اس رسالہ سے رہی ہے لہٰذا مجھے اتنا کچھ معلوم ہے کہ اس کے پس منظر ہی پر دو تین مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ انگریزی ادبیات کی درس و تدریس نیز انگریزی اور تقابلی ادبیات کے سکالرز کی نگرانی کرتے ہوئے ایک عمر گزر گئی ہے مگر بایں ہمہ اردو، فارسی ادبیات سے عشق رہا، ایسا عشق جس نے مجھے ہمیشہ پریشانی و سراسیمگی میں مبتلا رکھا۔ اس پہلو کا ذکر صرف درج ذیل شعر پر دھیان جانے سے کر رہا ہوں ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

ایک خاص نقصان کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا۔ مملکت اردو بھی منقسم ہو چکی ہے ورنہ اتر پردیش کی اردو اکاڈمی مجھے اسمیہ نہ سمجھتی۔ اردو کی بدولت اب میں آسام میں یوپی کا آدمی ہوں اور یوپی اردو اکاڈمی مجھے اسمیہ سمجھتی ہے۔ یہ جملہ معترضہ غالباً عمر زیادہ ہو جانے سے پیدا ہونے والے ذہنی و قلبی انتشار سے عبارت ہو سکتا ہے۔ سیماب مرحوم، اعجاز مرحوم، منظر صدیقی مرحوم کے فوٹو دیکھ کر میں خیالات میں کھو گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ سب کے سب مجھ سے مخاطب ہیں۔ تاجدار مرحوم کا فوٹو دیکھ کر افسوس ہوا، وہ تاجدار دو تین سال کی عمر کا تاجدار جس کو میں نے دیکھا تھا مرحومین میں شامل دیکھ کر افسوس ہوا۔ مجھے اپنے وہ بچے اور اپنی شریک حیات جو اگست ۸۲ء کے لینڈ سلائڈ میں جاں بحق ہو گئے تھے، سب کے سب شاعر کے صفحات پر نظر آنے لگے۔

اعجاز صدیقی کی نظم ترانۂ اردو فی الواقع ایسا ترانہ ہے جس کے صوت و لحن سے اردو کے جلسے شروع کئے جائیں۔ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" بے محل ہو کر رہ گیا ہے۔ اردو مجالس کے لئے ترانۂ اردو خاصا اہم ہے اور قومی یکجہتی کا بھی آئینہ دار ہے۔

مشاہیر کے خطوط کے فوٹو اسٹیٹ کا شائع کرنا بھی اہم اقدام ہے۔ افتتاحی نمبر میں فانی بدایونی کا خط بنام حضرت سیماب اکبرآبادی دستور الاصلاح سے متعلق ہے۔ فانی نے تخلیق لہٰذا پر جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ سو فی صد درست ہے۔ صرف ایک صاحب ایسے تھے جو اس کتاب کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے، یعنی حضرت ابر گنوری صاحب۔ غالباً ۴۲ء ۴۳ء کے دوران اس کے جواب میں اصلاح الاصلاح لکھ ڈالی۔ چندوسی ضلع مرادآباد کے حکیم صدیق احمد نامی سہوانی کے مطب میں ایک دن ایک صاحب کتب در بغل آگئے۔ جب کتاب کا ذکر چھڑا تو نامی صاحب نے اور میں نے ۱۵۔۲۰ منٹ کی بحث و تمحیص میں ابر صاحب کے تمام تر اعتراضات کو کج فہمی سے عبارت ثابت کر دیا۔ نامی صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ابر صاحب آپ صرف مصرعے کہہ سکتے ہیں، شعر نہیں، شعر اور فن شعر دونوں تک آپ کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔

دل شاہجہاں پوری کے کلام کی عکسی تحریر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ استاذی آثر لکھنوی سے دل صاحب کے خاصے مراسم تھے۔

ں غزل کا یہ شعر ؎

دیکھنا طغیانیٔ بحرِ محبت دیکھنا　　ڈوب کر ابھرے تو خود ٹکرا گئے ساحل سے ہم

مجھے دلؔ صاحب کا یہ شعر بہت پسند ہے ؎

جاتے جاتے کس نظر سے اس نے دیکھا کیا کہوں　　دل کے افسانے میں اک ٹکڑا نیا شامل ہوا

کارامروز۔ کی ایک نظم "شاعر کا مذہب" سیمابؔ مرحوم کی بڑی کامیاب نظم ہے۔ دراصل کلامِ سیمابؔ سے "انسانِ کامل" کا ایک واضح تصور ابھرتا ہے جس پر ایک مبسوط کتاب ہی لکھی جا سکتی ہے۔ انسانِ کامل کا تصور ٹیگور کے UNIVERSAL MAN کے تصور سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔ اقبال کا "مردِ مومن" آمرانہ جاہ و جلال کا حامل ہے۔ ملحوظ رہے، تنقید حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ میرا خیال آپ کے خیال سے مختلف بھی ہو سکتا ہے اور کبھی آپ سے اتفاق بھی کر سکتا ہے۔ یہ بات یہاں کہنے کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر چونکہ خالی اقبال کبھی اقبال کے صاف شفاف چہرے پر مولویانہ داڑھی لگانا چاہتے ہیں اور کبھی غریب کی زنار پوشی کرنے لگتے ہیں ایسے مضمرات ذہنی و قلبی کے حامل بزعم خود ناقد کذا کذا پر بڑی جلدی اتر آتے ہیں لہٰذا عرض یہ ہے کہ سیمابؔ کے "انسانِ کامل" کے ذکر کو اقبال کے کلام کی تنقیص نہ سمجھا جائے ؎

انسان خود نمائی میں گر مبتلا نہ ہو　　راہِ طلب میں ایک قدم بھی خطا نہ ہو

(منظرؔ صدیقی)

"سریلی بانسری کا آخری تصحیح شدہ نسخہ" بڑا عالمانہ اور محققانہ مضمون ہے۔ جناب کالی داس گپتا رضاؔ بغیر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کئے ہوئے تحقیق کے جملہ صرف و نحو سے واقف ہیں اس پر رشک ہونے لگتا ہے۔ یہاں، یہ بات جو سو فی صد حقیقت ہے بتا تا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ اردو، ہندی، سنسکرت، فارسی وغیرہ کے تحقیقی مقالے کم از کم نوے فی صد معیار سے گرے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔

عتیق اللہ صاحب کا مضمون "ترقی پسند آوان گارد اور غزل" اچھا مضمون ہے مگر آوان گارد (صحیح یہی ہے مگر "ی" کھینچ کر نہیں پڑھی جاتی) پر "ترقی پسند" کا پیوند لگایا گیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔ ساتھ ہی آفاقیت، لسانی دباؤ وغیرہ اصطلاحیں تشریح طلب رہ گئیں۔ سالگرہ نمبر میں عالمی ادب پر میرا مضمون غالباً یہ بتا سکے گا کہ یہ بھی گمراہ کن ادبی اصطلاح ہے۔ اردو والے اور ہندی والے بھی بالعموم ایسی باتوں پر توجہ صرف کرنا گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ یوسف ناظم صاحب نے اپنے مقالہ "فروغ کی سمت میں" میں بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں۔ "فیض احمد فیض ایوانِ وقت میں" مرحوم سے انٹرویو پر محیط ہے مگر نہ جانے کیوں احساس یہ ہوتا ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ تحریف کی گئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ روا شیا پر نبی سماجی در و بست کو صحیح تناظر میں وہی سمجھ سکتا ہے جو اشتراکی ہو۔ لیبل لگانے کو ترقی پسندی کا لیبل کوئی بھی چسپاں کر لے مگر وہ افتراق و انتشار ہی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

'عنوان کے بغیر' طنزیہ ہے، ایسا طنزیہ جو دردؔ کی حالات نیز خود احتسابی سے عبارت ہوتا ہے اور بیرون گرد و پیش کا احاطہ کرتا ہوا اچلا جاتا ہے۔ اس نوعیت کے طنز کو انگریزی ادبیات میں UNCONSCIOUS HUMOUR کہتے ہیں جو عالم سرخوشی سے گزرتا ہوا UNCONSCIOUS SATIRE لاشعوری طنز میں فنا فی الکیف ہو جاتا ہے۔ کاش تاجدار کی عمر نے وفا کی ہوتی۔

برادرم اعجاز کے بعد مجھے خدشہ تھا کہ ان کے خاندان سے شاعری یک لخت رخصت ہو جائے گی۔ عزیزم افتخار شعر کہتے ہیں یہ تو علم تھا مگر اتنا اچھا کہتے ہیں میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ بغیر فعل استعمال کئے غزل کا شعر کہنا معمولی کام نہیں ہے ؎

سوال حیرت جواب حیرت　　ہے لمحہ لمحہ عذاب حیرت

مطلع کے بعد تین اشعار میں "افعال مخفی" کا التزام ہے، اور قابلِ داد ہے۔

پاکستان میں اردو، دل چسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ اس کے بعد مشمولہ قومی زبان کا نفاذ اور ہمارے تنفس کا مسئلہ" اور

حرف شکایت" مضامین نے دماغ کو غالب کے ایک شعر کی جانب دھکیل دیا ؎

توقع جن سے تھی کچھ خستگی میں داد پانے کی　　وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

"اردو نامہ" معلوماتی ہے۔ ویسے ہندوستان میں زیادہ تر مجالس و مذاکرات "نشستند و گفتند و برخاستند" ہی پر محیط ہو کر رہ جاتے ہیں اور شرکا کے سامنے بس ایک ہی نصب العین ہوتا ہے "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"، کیا کہا جائے اور کتنا کہا جائے ؎

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

غالباً اتر پردیش اردو اکاڈمی کے ارباب اقتدار بھول گئے۔ میں ممتاز حسین صاحب کے حکم سے ادبی نشست میں شامل ہوا۔ مجھے حضرت علی میاں ندوہ آنے کو کہتے ہیں اور میں وہاں پہنچ جاتا ہوں بلکہ میں ایک اعتبار سے ندوی ہی ہو گیا ہوں۔

مدتوں بعد ممتاز حسین صاحب سے مقبول احمد لاری کے درِ دولت پر ملاقات ہوئی اور مجھے شامل نشست ہونا پڑا۔ جوش سیمینار کے انعقاد پر راستے میں آزاد صاحب اور ڈاکٹر قمر رئیس صاحب مل گئے، میں اس سیمینار میں بھی شامل ہوا تھا۔ مفتی صاحب نے اسٹیج پر آ کر فرمایا تھا کہ وہ آئندہ مجھے ضرور مدعو کیا کریں گے کیونکہ میں بریلی یو پی کا ساکن ہوں اور لکھنؤ سے مدتوں جذباتی وابستگی رہی ہے لہٰذا اتر پردیش والوں کے صرف و نحو سے میں بخوبی واقف ہوں۔ اس پر ایک مضمون کسی روزنامے کو دوں گا۔ اردو اکاڈمی غلط روی کا شکار ہے۔

فخرالدین میموریل کمیٹی اور ایوان غالب وغیرہ سے فخرالدین احمد مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، بالخصوص یہ کہ وہ آسام میں فرماتے تھے کہ میں اسمیہ ہوں، میری مادری زبان اسمیہ ہے۔ آسام سے باہر ہوتے ہی وہ اپنی مادری زبان اردو بتلانے لگتے تھے۔ مرحوم کو میں گوہاٹی سے جانتا تھا۔ مجھے ان کی یہ دو رخی سیاست پسند نہیں آتی۔ اسم ساہتیہ سبھا (آسامی زبان کی اکاڈمی، آسام کا تلفظ ریاست میں اسم ہے) کے متعلق عہدہ داران نے مجھ سے تفصیلات طلب کی تھیں کیونکہ ان سب کو میری بات سن کر استعجاب بھی ہوا اور حیرت بھی ہوئی۔

الغرض آفسیٹ پر مطبوعہ یہ پہلا شمارہ بھی خصوصی نمبر ہے اور آپ اسی کو URDU YAEAR BOOK 1985 کہہ سکتے ہیں۔ سال گزشتہ کے دوران اردو ادبیات کی پیش رفت کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔

برق سلطانپوری ________ سی گل، سی اپارٹمنٹس، فلیٹ نمبر ۲- ۱۰۶، آف کارٹر روڈ، باندرہ بمبئی ٥٠

آفسیٹ پر چھپا ہوا شاعر کا پہلا شمارہ دیکھا۔ سادہ پر وقار اور دیدہ زیب۔ اور یقیناً یہ تمہاری سلیقہ مندی کی آخری منزل نہیں ہے۔ مضامین بھی ہمیشہ کی طرح اپنی ایک سطح رکھتے ہیں۔

یہ خط تاخیر سے اس لئے مل رہا ہے کہ میں تقریباً سوا مہینے سے کراچی میں تھا، وہاں خاصی ادبی ہنگامے رہے اور کچھ پر لطف انکشافات بھی ہوئے، مثال کے طور پر پورے ۳۰ سال بعد جس مشاعرے میں شرکت کے لئے میں گیا تھا وہ 'بیادِ فیض' منعقد ہوا تھا۔ کپڑے کے بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے جن پر فیض کی بڑی بڑی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ سارا ماحول خاصا پر تمکنت اور فیض کے شایان شان تھا۔ ان کی تصویروں کے نیچے ان کے مختلف اشعار لکھے ہوئے تھے ان میں ایک میرا شعر بھی لکھا ہوا دیکھا گیا ؎

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ　　جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

جب کہا گیا کہ یہ ان کا نہیں مجھ ناچیز کا شعر ہے تو اس پر خاصی بحث رہی، یہاں تک کہا گیا کہ خود انڈیا کے ریڈیو سے یہ شعر فیض کے نام سے پڑھا جا چکا ہے۔ جب مجھے اس عام غلط فہمی کا علم ہوا تو میں نے مناسب جانا کہ اگرچہ جس غزل کا یہ شعر ہے وہ میں ۱۹۶۲ء میں کراچی کے 'یادِ جگر' کے مشاعرے میں پڑھ چکا ہوں مگر اسے دوبارہ پڑھوں کہ وہ نوجوان نسل جو آج سامع کی حیثیت سے کثرت کے ساتھ مشاعرے میں موجود ہے اسے بھی صحیح بات معلوم ہو جائے۔ چنانچہ میں نے غزل پڑھی اور بعد میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے مجھ سے کہا کہ مجروح صاحب یہ شعر آپ کے منہ سے سن کر ہم لوگ حیرت میں آ گئے اور آپ کو شاید یاد ہو کہ جس وقت آپ نے یہ شعر پڑھا ہم سب حیرت زدہ اور خاموش تھے کہ یہ شعر جسے ہم مختلف مظاہروں میں برسوں سے 'نعرۂ انقلاب' کی جگہ استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں، پاکستان کا نہیں ہندوستان کا ہے۔ مشاعرے کے دوسرے دن ہم لوگوں نے خاصی تفتیش کی، آخر کار مطمئن ہوئے۔

اسی طرح میرے بعض دوسرے اشعار بھی لوگوں کی بالخصوص نوجوانوں کی زبان پر ہیں مگر میرے نام سے نہیں۔ بہت ہی کم لوگ ہوں گے جو ان اشعار کو میرے نام سے جانتے ہیں :

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر　　لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار　　رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

دو محفلوں میں تواتر کے ساتھ یہ انکشاف بھی ہوا کہ میری مشہور غزل جس کا مطلع ہے :

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے　　ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

ساحر کے نام سے مشہور ہے، اور میاں! ایسا کیوں نہ ہو جب مجھے اپنے اہل قلم سے بھی زیادہ سے زیادہ سب و شتم کا ہی تحفہ ملا ہے تو باہر کے لوگ بھی کسی اچھے شعر کو میرے نام سے کیسے منسوب سمجھ سکتے ہیں۔

خود اپنے ہندوستان میں جو تاریخ ترقی پسند غزل کی ۴۵ء سے ۵۱-۵۲ء تک تنہا میں نے ان حالات میں لکھی جب شاعری کے مدّاحین میں غزل گوئی ایک ہیچ کام سمجھا جاتا تھا اس وقت یہ سرکردہ حضرات کہاں تھے! مگر اس تاریخی حقیقت سے کتنے ہی سہل پسند واقف نہیں ہیں خود شاعر کے آفسیٹ پر چھپے ہوئے اس پہلے ہی پرچے میں عتیق اللہ صاحب کا مضمون "ترقی پسند آواں گارد اور غزل" شائع ہوا ہے۔ آواں گارد کا مطلب تو میں نہیں سمجھ سکا کہ غزل کی تہذیب سے اس کا کیا رشتہ ہے مگر اس میں مجاز، سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، جذبی، احمد ندیم قاسمی کا نام عنوان کے طور پر تھے پھر آگے چل کر ترقی پسند غزل کو "ارتکاز اور تطہیر کے عمل" (اور خدا جانے کیا کیا) سے گزارتے ہوئے جو نام آتے ہیں وہ فیض، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اور مجاز کے نام ہیں۔ اگرچہ آگے چل کر ضمناً کہیں پر انھوں نے مجھ پر بھی رحم فرمایا ہے، مگر غزل گویوں کی ان دو فہرستوں میں علی سردار جعفری تک کا نام ہے اور نہیں ہے تو صرف میرا نام۔ اب اسے میں اپنے اہل قلم حضرات کی تاریخی بے بصری کہوں یا سہل انکاری کہ جو ایک رسم ترقی پسند غزل کے سرکردہ ناموں کی فہرست سے میرے نام کو الگ رکھنے کی عام ہو گئی ہے، اسی رسم کہنہ کے مریض ہمارے عتیق اللہ صاحب بھی ہیں۔ یہی کیوں بلکہ ابھی میں نے پروفیسر عقیل صاحب کا ایک مضمون دیکھا جس میں دوسروں کے نام میری لفظیات ہبہ کر دی ہیں مثلاً "فرازِ دار"۔ بہر حال ان حضرات کو یہ علم و خبر مبارک ہو، ظاہر ہے کہ یہ بیچارے وہی لکھیں گے جو جانتے ہیں۔ شکر ہے کہ ابھی علی سردار جعفری، ظ انصاری، کیفی اعظمی اور اس سن و سال کے بہت سے حضرات زندہ ہیں جو اس تاریخی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔

جملہ معترضہ ذرا لمبا ہو گیا۔ بات کراچی کے ادبی ماحول کی ہو رہی تھی، میں نے وہاں ایک گروہ اچھے غزل گویوں کا تو وہ دیکھا جو جانا پہچانا جاتا ہے اور جن کی عمریں ۴۰ - ۴۵ تک کے دائرے میں ہیں مگر ایک گروہ اور ہے ان نوخیزوں کا جنھیں نہ تو مشاعروں میں پوچھا جاتا ہے اور نہ اخبار و رسائل ہی میں انھیں کوئی جگہ ملتی ہے۔ ٹی۔ وی اور ریڈیو کا تو سوال ہی کیا۔ مگر ان میں کئی ایسے ہیں جو بہت اچھا کہتے ہیں اور انہیں نظر انداز کر دینے کو وہاں کے اہل قلم کی ادبی قساوت قلبی ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان میں بعض تو نظمیں بھی کہتے ہیں اچھی نظمیں، مگر ابھی ان پر فیض کا اسلوب طاری ہے لیکن اگر وہاں کے خاصانِ ادب ان کی ہمت افزائیاں کرتے رہیں تو انھیں اپنے منفرد راستے دریافت کر لینے میں دیر نہ لگے گی۔

میں ان کے کلام کے نمونے لایا ہوں اور ایک تعارفی مضمون کی شکل میں 'شاعر' کو بھیجوں گا اور اگر تم انھیں اپنے ماہنامے میں جگہ دو گے تو ان نوجوانوں کے ساتھ ایسا نیک سلوک ہو گا جو خود پاکستان والے بھی ان کے ساتھ اب تک روا نہیں رکھ سکے ہیں۔

شاعر کے اگلے پرچے کے لئے پاکستان کے ایک اچھے شاعر پیرزادہ قاسم کے کچھ متفرق اشعار بھیج رہا ہوں اور اسی سطح کے ایک اور شاعر عالمتاب تشنہ کی ایک غزل۔ رسید سے مطلع کرنا۔

غزل

عالمتاب تشنہ

گنتی میں بے شمار تھے کم کر دئے گئے　○　ہم ساتھ کے قبیلے میں ضم کر دئے گئے

پہلے نصابِ عدل ہوا ہم سے انتساب — پھر یوں ہوا کہ قتل بھی ہم کر دیے گئے
پہلے لہو لہان کیا ہم کو شہر نے — پھر پیرہن ہمارے علَم کر دیے گئے
ہر دَور میں رہا یہی آئینِ منصفی — جو سر نہ جھک سکے وہ قلم کر دیے گئے
اس دَورِ ناشناس میں ہم سے عرب نژاد — لب کھولنے لگے تو عجم کر دیے گئے
تشنہ جو لفظ مصلحتاً ہم نہ کہہ سکے — دیوارِ وقت پر وہ رقم کر دیے گئے

اشعار

پیرزادہ قاسم

○

اب حصارِ شہرِ دل توڑ کر بھی دیکھو تم — بستیوں کے باہر بھی بستیاں بہت سی ہیں
ہم تو مثالِ برگ ہیں اپنا قیام و کوچ کیا — کل تھے شجر کے دوش پر آج ہوا کے ساتھ ہیں
ہزار سبز سہی رائیگاں سی لگتی ہے — وہ شاخ جس پہ کبھی آشیاں بنا ہی نہیں
عجب ہنر ہے کہ دانشوروں کے پیکر میں — کسی کا ذہن کسی کی زباں لئے پھرتے
خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا — پھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا
بس یونہی کچھ گماں سا تھا کوئی پسِ سخن بھی ہے — درد جو لب کشا ہوا مجھ کو یقین آ گیا
دن بھر ئیں اور کارِ زمانہ لیکن شام ڈھلے — ساتھ مرے گھر آجاتا ہے ایک انجانا غم
شکستِ دل میں بھی اک زندگی نظر آئی — دیا بجھا تو ہمیں روشنی نظر آئی
اتنی سفّاک سماعت بھی غضب ہے کہ جہاں — بات پوری بھی نہ ہو اور ہاتھوں میں پتھر آجائیں
مطلوبِ تماشہ کو سروادیِ فرقت — جب تک نظر آیا نظر آتے ہی رہے ہم

قمر رئیس ——— سی-۱۶۶، وویک وہار، دہلی ۳۲

شاعر کا آفسیٹ کا شمارہ ملا۔ دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ یہ تمنا کا دوسرا قدم ہے۔ آپ کی اس کامیابی اور شادمانی میں، میں ہی نہیں شاعر کے تمام قارئین شریک ہیں۔ شاعر اب اپنی زندگی اور ہمہ گیر مقبولیت کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔

اس شمارہ میں عمیق حنفی کی خوبصورت نظمیں جو ان کی شاعری کا نیا موڑ ہیں اور عتیق اللہ اور عتیق احمد کے مضامین اس شمارہ کی جان ہیں۔ کئی چیزیں پڑھی ہوئی ہیں جیسے شہریار کی غزلیں۔ نیفی کا انٹرویو اور انور سدید کا ۱۹۸۴ء کا جائزہ۔ افسانہ کا حصّہ بے حد کمزور ہے سریندر پرکاش کی کہانی نہایت توجہ سے پڑھنے کے باوجود بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ اب اس طرح کی تجریدی اور لایعنی کہانیوں سے مرعوب ہونے کا دور ختم ہو چکا ہے لیکن تعجب ہے کہ آپ اب بھی مرعوب ہیں۔ گزشتہ چند سال سے رشید امجد کی ساری کہانیوں" کا مضمون ایک ہی ہوتا ہے اگر ان کو کہانی کہا جائے۔ ان کا تازہ مجموعہ "پت جھڑ میں خود کلامی" میں نے حال ہی پڑھا۔ ان انشائیہ نما کہانیوں میں کچھ ایسی شعری خوبیاں ضرور ہیں جو ان کے معاصرین میں کہیں نظر نہیں آتیں لیکن ان سب کا مضمون ایک ہی ہے۔ انسان کی ازلی مجبوری، بے بسی، ناتوانی مادی ترقی کے سارے دعوں کے باوجود اسکی بہیمت درماندگی و بے دست و پائی یہ جدید تصوف کی وہی صورت ہے جو قرۃ العین حیدر کے ناولوں، افسانوں میں ملتی ہے۔

غیاث احمد گدی کے ناول کے بارے میں ابھی کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا۔

اپنے ایک پچھلے خط میں ایک تجویز میں نے رکھی تھی پتہ نہیں وہ آپ کے زیر غور ہے یا نہیں۔ ویسے اردو کے عالمی منظر نامے کا سلسلہ اچھا ہے۔

ست پرکاش سنگر ——— ۳۰۹۳-سیکٹر ۲۸-ڈی، چنڈی گڑھ

شاعر کا آفسیٹ پر چھپا ہوا شمارہ نہایت حسین اور دلکش ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر از حد مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ آپ نے جناب اعجاز صدیقی صاحب مرحوم کی قائم کردہ روایات کو مزید آگے بڑھانے میں نمایاں کام کیا ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ آپ کی سرپرستی میں شاعر دوگنی ترقی کرے

اور آپ اپنے عزم راسخ میں شاندار کامیابی حاصل کریں۔

مظہر امام ——— ڈائرکٹر دوردرشن، سری نگر (کشمیر)

شاعر کا خصوصی شمارہ (آفسیٹ پر افتتاحی شمارہ) موصول ہوا۔ معنوی حسن کو حسن صورت نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ شاعر کا ہر قدم آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ مجھے بے تکلفی سے عرض کرنے دیجئے کہ شاعر کے معیار کی جو سطح گزشتہ دو تین سال کے عرصے میں دیکھنے میں آئی ہے وہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ بلند ہے۔ اس شمارے میں بعض مشاہیر کا عکس تحریر دے کر آپ نے دلچسپی کا ایک سامان مہیا کر دیا ہے۔ آپ اور ناظر نعمان صدیقی دونوں جس لگن، محنت اور خوش ذوقی سے کام کر رہے ہیں اس کا صلہ ضرور ملے گا۔ شاعر کا یہ نیا انداز ہم سب کو مبارک ہو۔

بلراج کومل ——— اے۔ ۱۳۹، کالکاجی، نئی دہلی

شاعر کا تازہ خصوصی شمارہ ملا۔ دلآویز۔ شاندار اور آراستہ۔ شاعر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ آپ کی کوششوں سے شاعر کو نیا مقام اور مرتبہ ملا ہے۔ آپ نے شاعر کی عظیم روایت کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔ میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

سید محمد عقیل ——— شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

نیا شاعر ملا۔ وہ جو میر انیس نے کہا تھا کہ "نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ..." تو شاعر دیکھ کر میں نے 'نام' کی جگہ 'کام' کر لیا ہے۔ بھئی کیا خوبصورت نمبر نکالا ہے۔ مشمولات بھی خوب اور گٹ اپ وغیرہ کا کیا کہنا۔ مسئلہ یہ ہے کہ کب تک اسی آب و تاب کے ساتھ؟ مگر آپ چلا لیں گے کہ آپ شاعر کو اپنی وراثت سمجھتے ہیں۔ بہر حال مبارک باشد۔

پرکاش فکری ——— پراس تولی ڈورنڈہ، رانچی

شاعر کا تازہ شمارہ جو آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ بھی ہے، اردو کی ادبی صحافت کی صبح روشن کی دلیل ہے۔ تمام مشمولات بے حد اچھے ہیں۔ اردو دنیا کی مختلف سرگرمیوں کی تفصیل بہم پہنچا کر آپ نے یہ یقین کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہماری زبان سرگرم اور زندہ رہنے پر مُصر ہے اور یہ اس یقین کا کرشمہ ہے کہ آپ نے آفسیٹ جیسے مہنگے سودے کا فیصلہ کر لیا۔

دعا گو ہوں کہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں آپ کو بھلے ہی مشکلات کا سامنا ہو لیکن مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور شاعر کا ہر آئندہ شمارہ مثالی شمارہ ہو۔

تفضیل جعفری ——— بی۔ ۲۳۔ ۳، اگروانگر، جے پی روڈ، اندھیری ۵۸

آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ چند دنوں پہلے ملا، خدا کرے کہ شاعر کو بہتر سے بہترین بنانے کے سلسلے میں آپ کی انتھک کوششیں بار آور ثابت ہوں۔ آپ نے بڑی خوش سلیقگی سے پرچہ ترتیب دیا ہے۔ مجھے نایاب تحریریں والا حصّہ بطور خاص پسند آیا۔ ہمارے بیشتر نئے لکھنے والوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ اپنے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کر سکیں، کم از کم اسی بہانے تھوڑا بہت پڑھ لیں گے۔ افسانوی حصّہ بھی بہت اچھا ہے۔ سریندر پرکاش نے جس طرح جمہورہ العزیم ۲ میں انسانی صورت کا تجزیہ کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے بشرطیکہ غور سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ذاتی طور پر میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ پاکستانی رسائل و اخبارات سے اتنی ڈھیر ساری چیزیں نقل کی جائیں لیکن اگر اس میں کوئی تجارتی پہلو پوشیدہ ہے یا عام قارئین اس وطیرے کو پسند کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اعتراض کرنا ویسے بھی عملی کام کرنے کے مقابلے میں بہت آسان ہوتا ہے۔

فرحت قادری ——— ۱۲۔ سیوا نگر، گیا

"شاعر" کا آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ کافی دیدہ زیب اور مشمولات کے اعتبار سے بڑا قیمتی ہے، کیونکہ اس میں بہت سے تاریخی حقائق اور ماضی کی بیش تر یادگار چیزیں شامل ہیں۔ کسی ایک شمارے میں اردو ادب کے اتنے سارے قیمتی سرمائے کو یکجا کر دینا یقیناً بڑا کام ہے۔ اس اعتبار سے یہ شمارہ "یادگار نمبر" کی حیثیت رکھتا ہے ——— اور اس بڑے کام کو دیدہ ریزی اور نفاست کے ساتھ انجام دینے کا سہرا بلاشبہ آپ کی جاں فشانی، لگن اور بہترین صلاحیتوں کے سر ہے۔ میری طرف سے اس عظیم کارنامے پر مبارکباد قبول فرمائیں

بیر رضوی ـــــــــــــ ۱۹۵۷ ۔ ترکمان گیٹ ۔ دہلی ۔ ۶

شاعر کا افتتاحی آفسیٹ شمارہ ملا۔ اس نئی منزل کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے آپ کو کافی دقتوں کا سامنا ہوگا لیکن آپ جس ثابت قدمی کے
تھ "شاعر" کو ترتیب دے رہے ہیں اس سے یہ توقع ہے کہ مشکلیں سہل ہو جائیں اور ہوا کے رخ بھی بدل جائیں۔

در پرتاپ نیر ـــــــــــــ ۱/۱۵، میجر شیو دیو سنگھ مارگ، سول لائنز، لدھیانہ (پنجاب)

شاعر کا خصوصی نمبر ملا۔ بہت اچھی کاوش ہے۔ شکل و صورت بھی بدل گئی ہے اور مواد بھی قابلِ تعریف ہو گیا ہے۔ ہم لوگ کیا اور ہماری
ماکیا؟ اصل میں تو یہ اللہ کی مہربانی ہے اور دادا جان، بابو جی کی کرم فرمائیاں اور دعائیں شاملِ حال ہیں۔ کاش وہ زندہ ہوتے اور
ی آنکھوں سے یہ خوشنما منظر دیکھتے۔

اور بھی نئے نئے عنوانات شامل کیجئے۔ ایسی شروعات کیجئے جس میں قارئین بھی حصہ لے سکیں۔ خالص ادبی نہج سے ہٹ کر کیا اس میں کچھ
مانہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً مذہب، سائنس، سیاست وغیرہ۔ نگار خالص ادبی رسالہ تھا پھر بھی نیاز صاحب اس میں مذہب اور سائنس کے
ضوعات زیرِ بحث لاتے تھے قارئین اور ادبا بھی اس بحث میں حصہ لیتے تھے۔

اور یہ جرعات صرف اردو کی ذاتِ شریف سے متعلق نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بھی ہو اور ہر برننگ ٹاپک پر بھی ہو یا چھوٹے چھوٹے پیراگراف
، تین چار اہم واقعات پر لکھا جا سکتا ہے۔

قلم کاروں کی تصاویر کے ساتھ ساتھ، اہم ادبی سیمیناروں، اجتماعات اور ادبی فیچرز وغیرہ پر فوٹوز / اسکیس تو خوب رہے گا۔

بقیہ صفحہ ۲۸، نیا افسانہ علامت تمثیل اور کہانی کا جوہر

ماراتی نظام کا ہے، خواہ وہ کسی بھی پیرایے سے زیرِ دام لایا جا سکے، اور یہ بات فن کار کی ذاتی تخلیقی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ کس پیرایے کا استعمال
سطح پر کرتا ہے۔

آخر میں یہ بات بھی خاطرنشان رہنی چاہئے کہ افسانے کے بھی کچھ اپنے صنفی تقاضے ہیں۔ "نری علامت نگاری" کے چکر میں پڑ کر انھیں یکسر فراموش
ما اور مہمل نگاری اور ہذیان گفتاری کا شکار ہو جانا بھی کوئی قابلِ فخر بات نہیں۔ افسانے یا کہانی کی تعریف میں کتابوں کے صفحے کے صفحے بھرے ہوئے
لیکن یہ بات نظر انداز کر دینے کی نہیں کہ بہ حیثیت ایک صنف کے کہانی کا اپنا ایک جوہر ہے۔ اسے کہانی کا KERNEL کہئے یا متو، یہ جوہر
زماً افسانے میں ہونا ہی چاہئے۔ اس جوہر کی حفاظت میں ہمارے اساطیر، کتھاؤں، اور حکایتوں نے صدیاں کھپا دیں۔ اس جوہر کا کلیتہً
زد کر دینا دراصل خود اپنے رد کو دعوت دینا ہوگا۔ شاید اسی جوہر کے جمالیاتی فشار کے لاشعوری تقاضوں کی بنا پر ہمارا نیا افسانہ اتنا علامتی نہیں
ماتمثیلی ہے، اور تمثیلی ہوتے ہوئے استعاراتی تفاعل کی معنیاتی تہہ داری سے بے نیاز نہیں۔ چنانچہ افسانہ خواہ علامتی تمثیلی ہو یا حقیقت نگاری
ہو، اگر وہ کہانی کے صنفی جوہر سے تہی دامن نہیں، اور اظہار کے گہرے معنیاتی تفاعل سے ذہن و شعور کی نئی سطحوں کو پیش کرتا ہے۔ نیز آج کے نئے
مائل سے بھی بے تعلق نہیں، تو وہ یقیناً نیا افسانہ ہے اور ایسے افسانے میں بغاوت کا شعلہ کبھی بجھ نہیں سکتا۔ ○○

بقیہ صفحہ ۷۴ فلسفۂ وجودیت اور سارتر

بارہ BEING AND NOTHING ۱۹۴۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جنگ کے اختتام تک وہ جنگ کی پیدا کردہ تمام فرانسیسی دانشوروں
نسل کا امام مشہور ہو چکا تھا ـــــ اس کے بعد سارتر کے ادبی مشاغل گہرے ہو گئے۔ اس نے ناول، مختصر افسانے، ڈرامے،
ہلی اور فلسفیانہ مضامین، سوانح اور بہت سے سیاسی اور صحافتی نگارشات، پمفلٹس اور منشور وغیرہ تصنیف اور مرتب کئے۔
ہ ہمارے عہد کا سب سے بڑا ذہین فرانسیسی ادیب کہلاتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ کیونکہ مزاح، علم، بحث و مباحثے
لفظی اور مناظرہ کے جوش میں اس کا کوئی ثانی نہیں ـــــ ○○

رفتار ـــــــ علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

● اہم افسانہ نگار اقبال مجید کے افسانوں کا نیا مجموعہ حلفیہ بیان شائع ہوگیا ہے۔ منتخب افسانوں کا یہ گراں قدر مجموعہ آپ کی توجہ کا منتظر ہے۔ پتہ:۔ نصرت پبلشرس، حیدری مارکیٹ امین آباد پارک۔ لکھنؤ۔

● گاندھی پیس فاؤنڈیشن نے انگریزی اور ہندی کے علاوہ اب اردو میں بھی ماہنامہ گاندھی مارگ کی رسمِ اجراء کا فیصلہ کیا ہے۔ صالح بنیادوں پر یہ تعمیری ذہنیت کی آبیاری "گاندھی مارگ" کا اوّلین مقصد ہے لہٰذا ایسے مضامین اس میں جگہ پاسکیں گے جن کا کچھ نہ کچھ تعلق ہماری قومی زندگی کے مسائل اور ان کے حل سے ہوگا۔ آپ سے گزارش ہے کہ تاریخی، سیاسی، معاشی، تعلیمی، ثقافتی اور سماجی پہلوؤں سے متعلق اپنے غیر مطبوعہ مضامین ارسال فرمائیں۔ "گاندھی مارگ" میں شامل کئے گئے مضامین کا مقدور بھر نذرانہ دیا جائے گا۔ پتہ:۔ ڈاکٹر رضی احمد، ایڈیٹر گاندھی مارگ (اردو) گاندھی سنگھرالے، پٹنہ، (بہار)

● جہاں استاد فصیح الملک داغ دہلوی کے دبستان کے متعلق شعرا حضرات کا ایک تذکرہ نقوشِ داغ کے نام سے مرتب کیا جارہا ہے جو شاگردانِ داغ یعنی شاگردوں اور آگے ان کے شاگردوں کے حالات اور ان کے نمونۂ کلام پر مشتمل ہوگا۔ اس تذکرہ کی مجوزہ ضخامت تقریباً پانچ سو صفحات ہوگی۔ حالات اور نمونۂ کلام کے ساتھ تصویر بھی شاملِ تذکرہ کی جائے گی۔ اس سلسلے میں متعدد حضرات سے مطلوبہ مواد فراہم ہو چکا ہے اور زیرِ کتابت ہے۔ خاندانِ داغ سے نسبت رکھنے والے شعرا حضرات سے التماس ہے کہ اگر وہ اس تذکرے میں شامل ہونے کے متمنی ہوں تو اس پتہ پر خط لکھ کر تفصیلات طلب فرمائیں۔ ساحر ہوشیار پوری:۔ ۲۲۶۹، سیکٹر ۲۸، فرید آباد ۱۲۱۰۰۳۔

● نئے اور ابھرتے ہوئے افسانہ نگار مشتاق مومن کے افسانوں کا اوّلین مجموعہ رت جگوں کا زوال شائع ہوگیا ہے۔ ۱۴ افسانوں پر مشتمل ڈیمائی سائز کی کتاب کی قیمت بیس روپے ہے۔ ناشر:۔ نیوراسٹرس پبلی کیشنز ۱۹/۲۹۸، مرچ مینشن، لال بہادر شاستری مارگ، کرلا ممبئی ۷۔

● گزشتہ دہائی میں جن چند ناموں نے اپنے افسانوں سے اردو دنیا کو متوجہ کیا ہے ان میں ایک نمایاں نام آنند لہر کا ہے۔ انحراف ان کے ۲۷ افسانوں پر مشتمل ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ جن لوگوں کو نئے اردو افسانوں میں کہانی پن کی تلاش ہے انہیں آنند لہر کے افسانوں کو ضرور پڑھنا چاہئے جن میں عصری صداقتوں کو تخلیقی فن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی قیمت ۳۰ روپے۔ پتہ:۔ العطش پبلی کیشنز، الیف ۷۷ گورڈہ بخشی نگر، جموں۔

● نئی نسل کے شاعر خالد سعید کا پہلا شعری مجموعہ شب، رنگ نمو شائع ہوگیا ہے۔ صفحات ۱۱۲ ڈیمائی، قیمت ۱۵ روپے۔ ناشر:۔ پیش رفت پبلی کیشنز، مسلم چوک، گلبرگہ (کرناٹک)

● جریدہ "راجندر سنگھ بیدی فن و شخصیت نمبر" تاج سعید کی بے طرح کوششوں کا ثمر ہے۔ ۴۰۰ صفحات میں شامل مواد کے ذریعہ راجندر سنگھ بیدی مرحوم کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے اس طرح ہندو پاک میں بیدی سے متعلق یہ ضخیم ترین کتاب اردو کے بہت بڑے اور منفرد افسانہ نگار کی شخصیت اور فن کا تفصیلی مطالعہ پیش کرتی ہے جس کے لئے تاج سعید اور زیتون بانو داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ خودنوشت، خاکے، مضامین، بات چیت، خطوط، نقدِ ادب، ڈراما اور فلم، بیدی کے دس افسانے اور ان کا مطالعہ، بیدی کی گم شدہ تحریریں، بیدی کے چند منتخب مضامین۔ ان ابواب کے ذریعہ سے راجندر سنگھ بیدی کو پوری طرح ابھارنے کی بھرپور سعی کی گئی ہے۔

ہندو پاک کے نئے پرانے مشاہیر قلم کاروں کی یکجائی نے اس ضخیم کتاب کو مستند و معتبر بنا دیا ہے۔ قیمت ۶۰ روپے۔ پتہ مکتبہ ارژنگ، پوسٹ بکس نمبر ۳۲۳، پشاور (پاکستان)

● سہ ماہی نیا دور (کراچی) خاص نمبر مارچ ۱۹۸۵ء (شمارہ ۸۰-۷۹) شائع ہوگیا ہے۔ اس خاص نمبر میں ۱۷ افسانے ایک خاکہ دو شاعر کے تحت اختر الایمان اور شاذ تمکنت کی کئی نظمیں غزلیں۔ ۶ قطعات، ۲ گیت، ایک نظم۔ محمد حسن عسکری مرحوم کے ۱۳ خطوط۔ پانچ مضامین جن میں "روایتی غزل کے بارے میں" سلیم احمد "عرشی رامپوری کی خود نوشت تحریریں۔ اکبر حیدری کاشمیری" "کچھ فراق کے حوالے سے۔ شمیم احمد" اور "نئی تنقید جمیل جالبی" قابل ذکر ہیں۔ جدید عالمی شاعرے کے باب میں دو جدید جاپانی شعراء کی ۱۹ نظموں کے ترجمے۔ ایک جدید چینی شاعر کی چار نظمیں۔ ۹ روسی شعرا کی ۱۲ نظمیں۔ ایک جدید جرمن شاعر کی ۱۵ نظمیں۔ ۳ انگریزی شعرا کی ۴ نظمیں شامل ہیں ۵ نئی مطبوعات پر متوازن تبصرے۔ اسی طرح اپنی سابقہ روایت کے مطابق نیا دور کا یہ خاص نمبر بھی اور وقیع ہے۔ ۴۰۸ صفحات (ڈیمائی) کے خاص نمبر کی قیمت ۴۰ روپے ہے۔ پتہ:۔ پاکستان کلچرل سوسائٹی، پی آئی بی کالونی کراچی ۵ (پاکستان)

● "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" طاہر مسعود کے ان انٹرویوز کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف وقتوں میں اردو ادب کے مشاہیر ادبا و شعرا سے کئے تھے۔ عہد حاضر کے ۲۴ فن کاروں میں فیض احمد فیض، غلام عباس، سلیم احمد، مجنوں گورکھپوری، احمد علی، قدرت اللہ شہاب، آل احمد سرور، ممتاز مفتی، شوکت صدیقی، انتظار حسین، منیر نیازی، جمیل الدین عالی، جمیل جالبی، مشفق خواجہ وغیرہ شامل ہیں۔ انٹرویوز کے ساتھ ہر ادیب کا مختصر تعارف اور اس کی تصنیفات کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ان ممتاز ادبی اور غیر ادبی شخصیات کے وضاحتی اور تردیدی خطوط بھی شامل کئے گئے ہیں جو کسی انٹرویو کے ردّعمل کے طور پر موصول ہوئے تھے۔

۴۳۶ صفحات کی اس گراں قدر اور خوبصورت کتاب کی قیمت ۴۰ روپیہ ہے۔ پتہ:۔ مکتبہ تخلیق ادب ایس، ون، ۱۲ سلور آباد کراچی ۲۷ پاکستان۔

● وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام۔ خطوط کا یہ تازہ ترین مجموعہ جو ۶۹ خطوط پر مشتمل ہے جسے خود مکتوب الیہ یعنی انور سدید نے مرتب کیا ہے۔ یہ اہم کتاب کئی اعتبار سے قابل مطالعہ ہو جاتی ہے کہ اس میں شامل دلچسپ اور معلوماتی خطوط میں ادب، ادیب، ادبی تناظر اور کتابوں کی شعاع ریزی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی کتاب کے شروع میں تقریباً ۶۰ صفحات پر محیط نہایت ہی جامع مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انور سدید نے اردو انگریزی خطوط نگاری کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے وزیر آغا کے خطوط کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ کتاب میں دس یادگار تصاویر بھی شامل ہیں جن میں وزیر آغا مرکزی کردار کے طور پر موجود ہیں۔ خطوط کا یہ اہم انتخاب 'وزیر آغا ایک مطالعہ' کے سلسلے کی کڑی ہے۔

مشہور آرٹسٹ موجد کے بنائے ہوئے خوبصورت سرورق اور دو سو آٹھ صفحات کی کتاب کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔ پتہ:۔ مکتبہ فکر و خیال، ۱۷۲ اسٹیل بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور (پاکستان)

وفیات

حافظ یوسف دہلوی

ماہنامہ شمع اور شمع گروپ کے بانی مشہور صحافی حافظ یوسف دہلوی ۲۴ مئی کو ۸۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ کئی سال سے علیل تھے۔ ماہنامہ شمع اردو کا وہ فلمی اور نیم ادبی رسالہ ہے جس نے اردو زبان کی عظمتوں میں اضافہ کیا اور اردو رسائل کے لئے قدم قدم سنگ میل ثابت ہوا۔ حافظ یوسف صاحب نے اپنی زندگی کے سخت ترین مراحل سے گزرتے ہوئے رسالہ شمع کا اجراء کیا اور پھر اس رسالے کو کامیابی کی منزلوں تک لے جاتے ہوئے کئی اور موضوعاتی رسالے جیسے کھلونا، بانو، شبستان، مجرم اور شمع (ہندی) جاری کئے۔ یہ تمام رسائل نہایت ہی کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ اتنی کامیابی کے ساتھ شمع اور اس کے کئی دوسرے رسائل کا شائع ہونا بذات خود ایک صحافتی تاریخی کارنامہ ہے جو مرحوم یوسف دہلوی

کی انتھک محنتوں کا ثمر ہے جس میں ان کے صاحبزدگان یونس دہلوی، ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی کی بھرپور معاونتیں بھی شامل ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

جید عالم، دانشور، ادیب اور مشہور صحافی مدیر ماہنامہ برہان، مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۲۴ رمئی ۱۹۸۵ء کو کراچی (پاکستان) میں انتقال کر گئے۔ مولانا ایک عرصہ سے علیل تھے۔ گزشتہ سال مئی کے وسط میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے انتقال اور اس کے دو ماہ بعد اپنے بڑے صاحبزادے عمر سعید کی وفات نے انھیں بے حد رنجیدہ کر دیا تھا مختلف امراض کا سلسلہ اور ان کے علاج وغیرہ نے آخر مثانے کے سرطان کی صورت اختیار کر لی۔ مثانے میں پتھری بھی ہو گئی تھی۔ نقاہت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ آپریشن کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے علی گڑھ کے ڈاکٹروں نے بھی سرطان کا خدشہ ظاہر کر دیا تھا۔ جنوری میں ان کی صاحبزادی مسعودہ سعید اپنے ہمراہ کراچی لے گئیں۔ ۲۴ رمئی کو افطار سے ذرا قبل مولانا وضو کر کے اپنے کمرے کی طرف واپس ہو رہے تھے کہ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم کو دارالعلوم کورنگی میں حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی کے ذاتی احاطۂ قبور میں ان کے قریب ہی آرام کے لئے جگہ ملی ہے۔ اس مختصر سے قبرستان میں صرف علماء و صلحا کی ہی قبریں ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۱۹۰۸ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد ڈاکٹر محمد ابرار حسین ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے اور پھر آگرہ ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ مولانا کا تعلق ہندوستان کے اہم ترین دینی، علمی اور تہذیبی اداروں سے رہا۔ وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ، دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی سربراہی اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کے پروفیسر یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں نے مرحوم کو وزٹنگ پروفیسر کے طور پر اعزاز بخشا۔ اس طرح دنیا کے بیشتر ممالک میں ہوئے ڈھیروں علمی مباحثوں، سیمیناروں اور علمی و دینی کانفرنسوں میں حصہ لیا۔

ندوۃ المصنفین اور ماہنامہ برہان (۱۹۳۸ء) سے وہ آخر وقت تک وابستہ رہے۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف اپنا علمی وقار بلند کیا بلکہ ندوۃ المصنفین کو شہرت بھی دلوائی۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کے تعاون سے سعید صاحب نے اس ادارے کو ہندوستان کا بلند ترین علمی و دینی ادارہ بنا دیا تھا۔

مولانا نے یوں تو بہت لکھا اور ہر موضوع پر لکھا لیکن برہان کے "نظرات" کی جو اہمیت و حیثیت ہے وہ ایک ضخیم اور مستقل کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ تحریروں میں بے باکی، عمیق مطالعہ و مشاہدہ اور بے پناہ خود اعتمادی نے مرحوم کو ایک ایسی انفرادیت بخشی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ جس شعبہ سے وابستہ ہوئے اسے عروج و وقار عطا کیا۔ مولانا کو بے شمار اشعار اردو، فارسی اور عربی کے یاد تھے جن کا استعمال وہ اپنی تقریر و تحریر میں برجستہ طور پر کرتے تھے۔ اس طرح ان کے وہ تبصرے بھی اہم ہیں جو مختلف کتابوں پر کئے گئے اور برہان کے ہزاروں صفحات میں محفوظ ہیں۔

مولانا سعید اکبر آبادی کی درج ذیل تصنیفات قابل ذکر ہیں۔

(۱) عثمان ذوالنورین (۲) وحی الٰہی (۳) مسلمانوں کا عروج و زوال (۴) فہم قرآن (۵) کتاب دینیات (۶) مولانا عبیداللہ سندھی اور انکے ناقد (۷) صدیق اکبر (۸) خطباتِ اقبال پر ایک نظر (۹) الرق فی الاسلام (اسلام میں غلامی کی حقیقت) (۱۰) نقشۂ الصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت۔

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری جون ۸۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔
از راہِ کرم آئندہ کیلئے مبلغ ۴۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ اُمید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء
بانی ۔ علامہ سیماب اکبر آبادی (مرحوم)
بہ یادگار ۔ اعجاز صدیقی (مرحوم)
اشاعت کا ۵۶ واں سال ● علمی، ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

جلد ۔ ۵۶ ◎ شمارہ ۔ ۷

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زر سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالک غیر سے
۴۰ روپے	۱۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

قیمت: ● چار روپے

فون: ۳۵۹۹۰۳۰۱

ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶،
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کی تازہ کتابیں

۱ــــ کشمیر میں اُردو ـــ (ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان کی ابتدار، ترقی و ترویج پر تین جلدوں میں لکھی گئی پروفیسر عبدالقادر سروری کی جامع تواریخ)

مرتب: محمد یوسف ٹینگ

روپے پیسے

○ قیمت تین جلد ــــــ 51 / 15

۲ــــ کشمیری زبان اور شاعری ـــ (مشہور کشمیری شاعر جناب عبدالاحد آزاد کا لکھا گیا کشمیری زبان و ادب پر تنقیدی جائزہ)

○ قیمت تین جلد ــــ 50 - 58

۳ــــ لل دھد ـــ مشہور کشمیری شاعرہ لل دھد کے کلام کا منظوم اُردو ترجمہ

○ قیمت ــــــ 50 - 13

۴ــــ ہمارا ادب جموں و کشمیر نمبر ـــ ریاست کی تاریخ، تمدن، ثقافت اور فنونِ لطیفہ پر پُرمغز مقالات کا مجموعہ

○ قیمت مکمل پانچ جلدیں ــــ 75 - 90

۵ــــ دیوانِ غنی ـــ غنی کشمیری کے فارسی دیوان کا دوسرا ایڈیشن

○ قیمت ــــــ 50 - 22

۶ــــ کلیاتِ شیخ العالمؒ (کشمیری)

قیمت ـــــ 15/=

کتاب گھر کلچرل اکادمی

مولانا آزاد روڈ سرینگر

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

سفر نامہ

طنز و مزاح

بساط سخن

جرعات

بازیافت

بہ صورت گر

چہرہ چہرہ یادیں

آثار لفظ

رفتار

اَدبی رسائل، قاری، قلم کار اور مسائل

اردو میں باقاعدہ شائع ہونے والے ادبی رسائل بہت کم ہیں
ان کی تعدادِ اشاعت بے حد مایوس کن ہے
ان ادبی رسائل کو ہر سطح پر نظرانداز کرنے کی کوششوں میں خود دار دوالے شامل ہیں
ادبی رسائل چوتھے درجے کی چیز بن کر رہ گئے ہیں
عصری ادب کے سب سے بڑے ترجمان اپنے مسائل میں بے طرح ہانپ رہے ہیں
ہندوستان بھر کی اردو اکاڈمیوں کے پاس کوئی ایسا خانہ نہیں ہے
جہاں ادبی رسائل کو کوئی جگہ دی جاسکے
سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے بھی ادبی رسائل کو کچھ نہیں ملتا
اردو اکاڈمیوں اور اپنے اپنے اداروں سے نئے رسائل شائع کرنے کا عمل
پہلے سے شائع ہونے والے تسلیم شدہ ادبی رسائل کے مسائل میں
اضافے کا سبب بنا ہے
ادبی رسائل شائع ہونے چاہئیں لیکن نئے رنگ و روپ
اور نئے اسلوب کے ساتھ ورنہ تو پہلے سے شائع ہونے والے
ادبی رسائل اپنے مسائل سے جوجھتے ہوئے ان سے بہتر کام کر رہے ہیں۔
اردو مخالفین کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے
محکمہ ڈاک و تار کی ناقص کارکردگی
ڈاک سے رسائل اڑانے والے چور
اور مانگ کر پڑھنے والے
ہندوستان کے بعض صوبے تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی سرگرم ہیں

کہ تمام تر احتیاط کے باوجود رسائل اپنے قارئین تک نہیں پہنچ پاتے
اور خریداروں کا نزلہ ادبی رسائل پر گرتا ہے
ادبی رسائل کے نامعلوم خریدار اور ادبی رسائل کے درمیان
پل کا کام کرنے والے کتب فروش کسی بھی رسالے کی زندگی ہوتے ہیں
لیکن یہ زندگی ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔
اس کی وجوہ کئی ایک ہیں
براہِ راست رسالہ منگوانے والے کبھی بھی حساب کتاب کے چکر سے نہیں نکل پاتے
ادبی رسائل افواہوں اور خوش فہمیوں کی زد پر رہتے ہیں
جو لکھنے والے وہی پڑھنے والے
صرف اپنا لکھا ہوا پڑھنا ورنہ رسالے کو نظرانداز کر دینا
ادب کو صرف ادیب ہی پڑھتے ہیں عام قاری کا ادب سے کیا واسطہ
اردو رسم الخط آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے
اردو تعلیم اپنے بنیادی مسائل سے اوپر نہیں اٹھ سکی ہے
زبان کا معاش سے کوئی تال میل نہیں ہے
اردو زبان صرف شاعری اور وہ بھی غزل تک محدود ہو گئی ہے
دو چار بڑے اور اہم ادبی رسائل مسائل کے بھنور سے باہر نہیں آسکے ہیں
یہ اور ان جیسی نہ جانے کتنی توجہ طلب باتیں ہیں جو مسلسل
سوال بنی ہوئی ہیں
کیا آپ کے پاس ان مسائل کا عملی حل ہے ؟

۲۹۵

مرحلے

ہو گئے کس قدر چمن تاراج — رات لیتی رہی سحر سے خراج
تاکجا آرزوئے بادہ و ساز — دیکھ صیّادِ وقت کا انداز
تاکجا عشرتِ غزل خوانی — دیکھ یہ آنسوؤں کی طغیانی
پھر فروزاں ہے آتشِ نمرود — زندگی ہے نہ زندگی کا سرود
دیکھ یہ شعلہ زارِ دیر و حرم — لہلہاتا ہے موت کا پرچم
دیکھ یہ شورگاہِ دار و رسن — ہر قدم پر حیات کا مدفن
بجلیاں ہیں شرر فشاں کیا کیا — اس زمیں پر ہیں آسماں کیا کیا
خون بہتا ہے شاہراہوں پر — جم گیا ہے لہو نگاہوں پر
کیا اندھیرا ہے انقلابوں کا — اُڑ گیا رنگ آفتابوں کا
آدمی اب خدا سے ہے مایوس — ٹمٹماتے ہیں زیست کے فانوس

دام افگن ہیں زلزلے کتنے!
ہیں ابھی اور مرحلے کتنے!

●

یہ نظم افسر سیمابی احمد نگری (م - ۲، دسمبر ۱۹۶۶ء) کے شعری مجموعے "خاورستان" (اگست ۱۹۵۱ء، ص ۳۳۶) سے لی گئی ہے۔ افسر مرحوم کو اقبالِ ثانی کہا جاتا تھا۔ "خاورستان" کو 'شاعر' کے صفحات پر نایاب کتابوں کی اشاعت کے تحت شائع کیا جائے گا۔
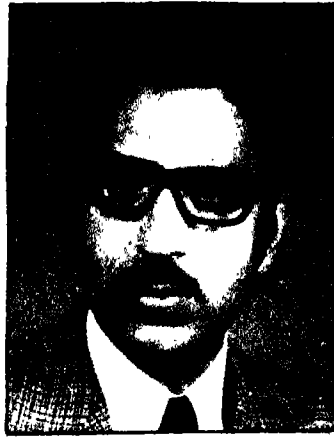
یہ صورت گر

رتن سنگھ

حامدی کاشمیری

محسن زیدی

مصور سبزواری

احمد یوسف

ممتاز راشد

سلیم شہزاد

دلیپ سنگھ

ظفر ہاشمی
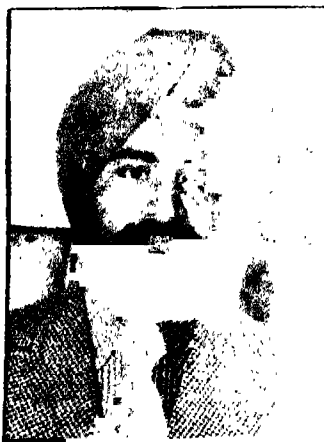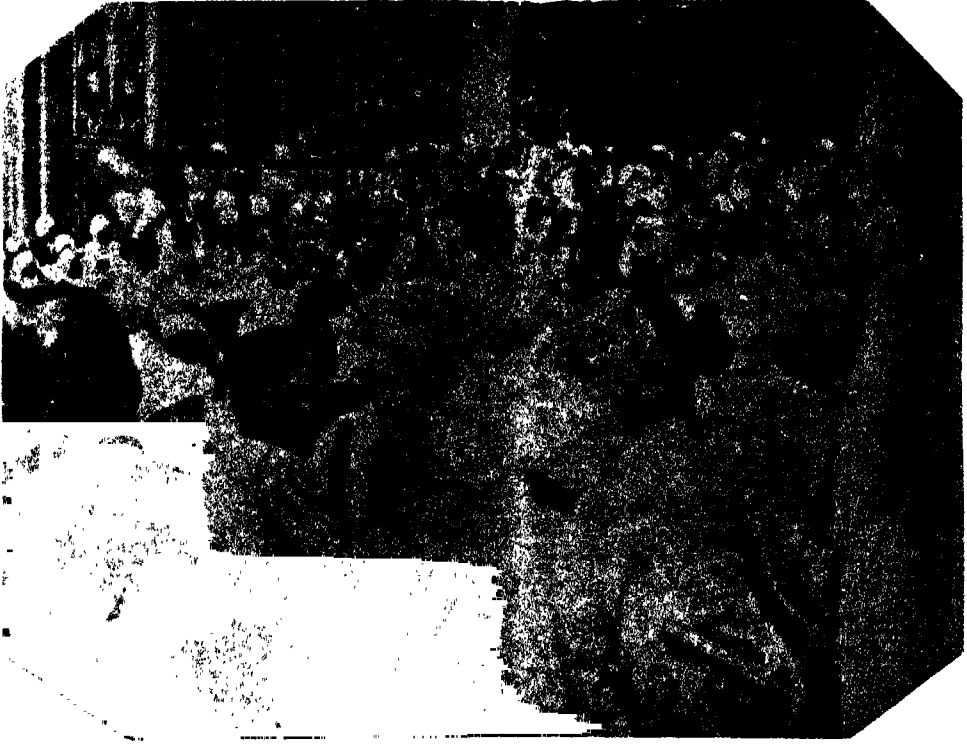
شاہی مسجد لاہور میں علامہ اقبال جنگ طرابلس کے موقع پر اپنی مشہور نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" سناتے ہوئے۔ تصویر میں علامہ اقبال (ٹائی لگائے ہوئے) کی ٹوپی اُوپر کی طرف نمایاں ہے۔ یہ تصویر "نیرنگ خیال" لاہور ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء اقبال نمبر ص ۵۸۴ (مدیران بدرالدین حسن، حکیم یوسف حسن) سے لی گئی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے چار استاد

داغ دہلوی — مولانا میر حسن — آرنلڈ — میگ ٹھگرٹ

محسن زیدی

(۱)

مسلط پھر سے ہو جائے اندھیرا یہ نہیں ہوگا،
بجھا دے پھر کوئی شمعِ تمنا یہ نہیں ہوگا

یہ کس رستے پہ آ نکلے کہ منزل ہو گئی اوجھل
کسی سے پوچھ لیں منزل کا رستا یہ نہیں ہوگا

ہمارے سامنے تصویرِ قاتل پھرتی رہتی ہے
کھلی آنکھوں سے ہم کھا جائیں دھوکا یہ نہیں ہوگا

اب اس ترکِ تعلق کو مقدر ہی سمجھ لیجے
ہمیں تسلیم ہے اُس کا بھی منشا یہ نہیں ہوگا

نہ شورِ نعرہ ہائے ہو، نہ زنجیروں کی جھنکاریں
ہمیں شک ہے جنوں والوں کا صحرا یہ نہیں ہوگا

جو دیکھا تو ہر اک منظر وہی دیکھا ہوا نکلا
یہی سنتے رہے اب کے تماشا یہ نہیں ہوگا

کواکب اصل میں کیا ہیں ہمیں معلوم ہے محسن
یہ بازی گر ہمیں دے جائیں دھوکا یہ نہیں ہوگا

(۲)

جب ٹیس بھی زخموں میں اشکوں میں روانی تھی
دل پہ نہ تھا بار اتنا ایسی نہ گرانی تھی

رات اپنی طبیعت میں کچھ اتنی روانی تھی
پتھریلی زمیں کو بھی چھو دیتے تو پانی تھی

معدوم ہوئے جب ہم رہتا وہ نمایاں کیا
پہچان جو تھی اپنی اُس کی بھی نشانی تھی

معلوم نہ ہو پایا کیا بیت گئی اُس پر
شیشے کی کہانی تو پتھر کی زبانی تھی

اظہارِ معانی کو درکار نہ تھے دفتر
جتنی سی حقیقت تھی اتنی سی کہانی تھی

دل ملتا بھی کیا اُس سے جب بُعد تھا ذہنوں میں
بس اُس سے تعلق کی اک رسم نبھانی تھی

محسن تھی نمائش سب اُوپر سے نئے پن کی
گوشے میں تو ہر دل کے تصویر پرانی تھی

(۳)

حسرتِ تخت و تاج اور ہے کچھ
لیکن اپنا مزاج اور ہے کچھ

کیا بھروسا بدلتے موسم
رنگِ گل کچھ تھا آج اور ہے

پاس داری یہاں نہیں چلتی
اس نگر کا رواج اور ہے کچھ

خوش نہ ہو ہم جو ہو گئے خامو
صورتِ احتجاج اور ہے

کام چلتا نہیں ہے مرہم سے
زخمِ دل کا علاج اور ہے کچھ

سوچتا اور اداس ہو جا
حال ہی دل کا آج اور ہے

اک زمانہ تھا ہم مزاج تھے ہم
اب تو اس کا مزاج اور ہے کچھ

شعر کہنا ہے ایک فن محـ
دفتری کام کاج اور ہے

۲۶۴، سیکٹر ۴ - آر - کے پورم
نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۲

شاعری میں علامت کا عمل

ڈاکٹر حامدی کاشمیری ● ۲۹۴ جواہر نگر۔ سرینگر (کشمیر)

آسکر وائلڈ نے فرانس کے علامت نگاروں سے متاثر ہو کر ۱۸۹۳ میں سلومی شائع کیا، یہ ایک علامتی ڈرامہ ہے، ادبی مورخوں نے لکھا ہے کہ اس ڈرامے کو علامتی تکمیلیت سے ہمکنار کرنے میں وائلڈ کے کئی علامت پسند احباب نے، جن میں پال فورٹ، سٹوارٹ پرل، مارسل سکواب اور اڈولف ایٹی وغیرہ شامل ہیں، اصلاحیں اور مشورے دئے ہیں۔ وائلڈ کے فرانسیسی علامت پسندوں سے متاثر ہونے کے بظاہر اسی عمومی نوعیت کے واقعے پر توجہ کرنے سے علامت نگاری کے بارے میں دو غور طلب باتیں سامنے آتی ہیں، ایک یہ کہ انیسویں صدی کے اواخر میں بودلیر، میلارمے، ورلین اور رمبو کی علامتی شاعری کو انگریزی شعراء اور ادباء مثلاً آرتھر سائمنز، جیمز جوائس، ایلیٹ اور ایڈتھ سٹویل وغیرہ نے ایک نئے شعری رجحان پر محمول کر کے اس کی ترویج میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا، یہ رویہ انگریزی علامتی شاعری کے تاریخی تناظر میں جذباتی زیادہ نظر آتا ہے اور حقیقت پسندانہ کم، اسلئے کہ خود انگریزی میں شیکسپیر کا میکبتھ۔ ولیم بلیک کی The Sick Rose اور The Tiger ورڈس ورتھ کی لوسی نظمیں یا کولرج کی معرکہ آرا نظمیں اپنی علامتی خاصیت اور قوت تسلیم کروا چکی تھی، اس لئے تقلید و اکتساب کا یہ گرم جوشانہ رویہ نمائشی ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے اور روایت کے شعور کی نفی کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس علامت نگاری بحیثیت تحریک دم توڑ گئی۔ لیکن ادب کی ایک حرکی روایت کے طور پر موجودہ صدی میں بھی نئی قوت کے ساتھ اپنی ناگزیریت کا احساس دلاتی رہی۔ یہ مسلم ہے کہ کسی تخلیق کو ارادی سعی یا احباب کے مشوروں سے علامتی بنانا تو درکنار، اس کے وجود کو اصلیت سے ہمکنار کرانا بھی ناممکن ہے۔ اصل میں عام طور پر شاعروں اور نقادوں بشمول آسکر وائلڈ نے علامت نگاری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ خاصے الجھا دینے والے ہیں، وہ علامت نگاری کو حصولِ مقصد یعنی اظہار ذات کا وسیلہ سمجھتے رہے ہیں، جب کہ یہ خود مقصد ہے، مثلاً ایڈمنڈ ولسن کو لیجئے، وہ علامت نگاری کو شاعر کے شعوری رویئے کے تابع قرار دیتا ہے، اور اس مفروضے کا اعادہ کرتا ہے کہ شاعر کسی خیال یا تجربے کو علامت کا لباس پہناتا ہے Axels Castle میں وہ لکھتا ہے:

But the symbols of the symbolist school are usually chosen arbitrarily by the poet to stand for special ideas of his own---- they are a sort of disguise for these ideas.

لہٰذا علامت کی صحیح کارکردگی کو سمجھنے کے لئے اس کے انفرادی اور خود مکتفی کردار کی تفہیم لازمی ہے، علامت کو بالعموم تخلیقی زبان میں برتی جانے والی دیگر شعری ترکیبوں یعنی تشبیہہ، استعارہ اور پیکر کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔ کوئی لفظ یا پیکر جب اپنے ظاہری معنی کے علاوہ کسی گہرے، وسیع اور تہہ دار معنی کو پیش کرے۔ تو وہ علامت کا درجہ حاصل کرتا ہے، گویا علامت شعری ہنرمندی سے زبان کے ایک مخصوص استعمال کے طریقے سے تشکیل پاتی ہے۔ اس طرح سے روایتی اور ذاتی علامتوں میں تفریق کی گئی ہے، روایتی علامتیں منطق، ریاضی، تاریخ، دیومالا اور مذہب وغیرہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ یہ اور اس نوع کی دیگر علامتیں مثلاً قومی پرچم، صلیب اور انگوٹھی وغیرہ ایسے خیالات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جو مختلف تمدنی اکائیوں کی نمائندگی کرنے والی قوموں یا فرقوں میں مروج ہوتے ہیں، اور ان کی تفہیم میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ ان کے علاوہ ایسی تمام علامتیں روایتی کہلاتی ہیں، جو ادب میں ایک مدت تک مستعمل رہ کر معانی کی حد بندیوں کا شکار ہو جاتی ہیں، اردو شاعری میں گل و بلبل اور ساقی و میخانہ کی مثال سامنے کی ہے، انگریزی میں عیسائیت، گرجاؤں اور مذہبی

رسوم سے متعلق علامتیں اس ذیل میں آتی ہیں، ان کے برعکس ذاتی علامتیں شاعر خود تخلیق کرتا ہے، یہ اس کے خیال یا تجربے کی نمائندگی کرتی ہیں، ایڈمنڈ ولسن ذاتی علامت کے اس مروّجہ تصور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے :

And symbolism may be defined as an attempt by carefully studied means --- a complicated association of ideas represented by a medley of metaphors --- to communicate unique personal feelings.

ایڈمنڈ ولسن کے اقتباس ہٰذا سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامت مخصوص شخصی جذبات کو خوب سوچ سمجھے گئے ذرائع سے پیش کرنے کی سعی کرتی ہے۔ خیال اور علامت کے باہمی رشتے کے بارے میں کم و بیش ایسے ہی خیالات کا اظہار دوسرے نقادوں نے بھی کیا ہے۔ اقبال حدیث خلوتیاں کو رمز و ایما میں پیش کرنے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ غالب مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے بادہ و ساغر کو ناگزیر سمجھتے ہیں، ایک جدید نقاد Martin Turnell علامت کو ایک تکنیکی ترکیب device قرار دیتا ہے، وہ اپنے ایک مقالے میں لکھتا ہے :

The use of symbols is simply one aspect of language; the mistake lies in trying to invest them with some sort of transcendental significance instead of regarding them as a technical device for imaginative experience.

علامت کو ایک تکنیکی ترکیب قرار دینے کا یہ رویّہ، جو بہت عام رہا ہے، نہ صرف علامت کی اصلیت اور اس کے تفاعل کے بارے میں صحیح اور معلوم علم عطا کرنے میں حارج ہے بلکہ تخلیق شعر کے عمل کو بھی میکانکیت کا پابند کرتا ہے، جس طرح تخلیق شعر میں لسانی تجسیم کا عمل کوئی علٰحدہ، عاید کردہ یا کلیتاً شعوری سعی کا عمل نہیں، یعنی شاعر متعیّنہ تجربات کو شعوری عمل سے الفاظ کا جامہ نہیں پہناتا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ تجربہ جب اپنی شناخت کروانے پر آمادہ ہوتا ہے، تو وہ اپنی مخصوص، لازمی اور فطری لسانی صورت میں ڈھل جاتا ہے، اور یہی لسانی صورت اس کی اصلیت بھی ہے اور اس کی شناخت بھی، اسی طرح شعر کا علامتی نظام شعوری کد و کاوش سے سوچا سمجھا گیا، مماثل یا عاید کردہ قالب نہیں ہے، جس میں تجربے کو ڈھالا جاتا ہے، اگر ایسا کیا جائے تو شاعر نہ صرف علامت ہی کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہوگا، بلکہ اپنے شعری عمل کے استناد ہی کو مشکوک بنائے گا، اقبال نے شعوری طور پر اپنے بعض خیالات کی نمائندگی کے لئے شاہین کی علامت کا انتخاب کر کے، اور اس کے اوصاف کو گنا کر کوئی مفید مطلب کام انجام نہیں دیا ہے۔ اس کے برعکس بودلیر کی نظم The Swan میں راج ہنس کی علامتی حیثیت نظم کے کلّی وجود سے مربوط ہے، اور کسی منصوبہ بندی یا شعوری انتخاب کو ظاہر نہیں کرتی۔ البتہ تخیل کی سخت سطح میں راج ہنس کا گرفتار ہو کے مرجانا ایک مربوط علامتی تجربہ ہے، جو متعیّنہ خیال سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، یاد رہے کہ تجربہ کو علامتی نہیں بنایا جاتا، تجربہ اصلاً علامتی ہوتا ہے، یہ تجربے کی خاصیت ہے، جو اسے علامتی یا غیر علامتی بناتی ہے، ظاہر ہے جب شاعر کا تخلیقی شعور غیر معمولی شدّت اور پیچیدگی کا حامل ہو تو اسے تشبیہاتی اور استعاراتی انداز کے بجائے علامتی اسلوب میں ہی پیش کیا جا سکتا ہے، یہ شعر کا علامتی نظام ہی ہے، جو اس کے اندر پنپنے والے متحرک اور متنوع تجربے کے موثر اظہار کی ضمانت فراہم کرتا ہے، اور یہ علامت نگاری ہی ہے، جو ایک بڑے اور چھوٹے شاعر میں تفریق کرنے میں مدد دیتی ہے، معمولی دل و دماغ کے شعرا اپنے سطحی اور عمومی تجربات کو غیر علامتی انداز میں بے نقاب کرتے ہیں، اردو کے سینکڑوں شعرا اس کی مثال ہیں، اس کے برعکس، عہدِ ماضی میں میر اور غالب اور موجودہ صدی میں میراجی، ناصر کاظمی، بانی، وزیر آغا اور براج کومل کی شاعری اپنے علامتی کردار کی بنا پر تجربات کی گہرائی اور پیچیدگی کا احساس دلاتی ہے، جس قدر شاعر کی عصری حسیّت میں فعالیت ہوگی، اور جس قدر وہ لاشعوری تجربات تک رسائی رکھتا ہو اسی قدر اس کی شعری شخصیت تہہ دار، پیچیدہ اور روزنی ہوگی، لامحالہ اس کے تجربات کی لسانی تجسیم علامتی ہوگی، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعر کے باطن میں پلنے اور پنپنے والے یہ تجربات فی نفسہٖ علامتی ہوتے ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ان کا لسانی اظہار بھی علامتی ہوتا ہے، چونکہ تجربے کی یہ علامتیت غیر دائمی، پیچیدہ اور سیّال ہوتی ہے اس لئے والیری نے اسے موسیقی سے مشابہ کیا ہے، ایسا تجربہ روایتی اصناف، مروّجہ بحور و اوزان اور لفظیات سے بھی انحراف

کرتا ہے، اور آزاد لسانی تجسیم پر اصرار کرتا ہے۔

پس ظاہر ہوا کہ علامتی طریقۂ کار کوئی تکنیکی ترکیب یا حربہ نہیں، جس سے کام لے کر شاعر اپنے اشعار کو علامتی رنگ عطا کرتا ہے، بلکہ یہ نظم کے صورت پذیر لسانی وجود کی شناخت ہے، جو شاعر کی علامتی فکر کے بغیر ممکن نہیں۔

شاعری کی علامت کاری کے بارے میں مروجہ غلط فہمیوں کے دو خاص اسباب نظر آتے ہیں، ایک کا تعلق شعری تجربے کی نوعیت سے ہے، اور یہ مختلف ادوار میں رہا ہے، یہ نظریہ کہ شاعر کی زندگی کے کسی مشاہدے یا موضوع کو علیحدہ سے متعین کر کے اس کے لئے کوئی لسانی اظہار وضع کرتا ہے، محل نظر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس طرح سے شاعری کی گئی ہے، انگریزی میں کلاسیکی دور کی شاعری کے بعد وکٹوریہ عہد کی شاعری اس کی مثال ہے، لیکن اس بات سے انکار نہیں کہ اس نوع کی موضوعی شاعری مخفی معنویت کے امکانات کی نفی کرتی ہے، وہ خود ہی اپنا زیاں کرتی ہے، وہ خود ہی اپنا اعلان نامہ بن کر انسلاکاتی اسراریت سے محروم ہو جاتی ہے، اس کے برعکس وہ شعری عمل جو کسی طے شدہ یا معینہ موضوع سے انحراف کر کے شاعر کے باطنی التہاب کے زیر اثر، شعور اور لاشعور کی حد فاصل کو پگھلا کر، اس کے تخلیقی سرچشموں پر انحصار کرتا ہے، اور غیر متعینہ، بے نام، تہہ دار اور اجنبی تجربات کو متشکل کرتا ہے، سچی شاعری کو انگیخت کرتا ہے، اس نوع کی شاعری معنویت کے بجائے معنویت کے انسلاکات پر عادی ہو جاتی ہے، اور زماں و مکاں سے ماورا ہو جاتی ہے، کولرج اور غالب کی شاعری اس ضمن میں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے، ایسی شاعری، شاعر کے داخلی تخلیقی وجود کی نیرنگیوں تضادوں، الجھنوں اور تہہ داریوں کی تطبیق کا کام کرتی ہے، اور شاعر کے تخلیقی وجود کا پتہ دیتی ہے، جو بقول غالب "خزینۂ راز دو عالم" کا درجہ رکھتا ہے، یہ اس کی زندگی کے شعوری تجربات کے ساتھ ساتھ صدیوں کے نسلی تجربوں کی آماجگاہ ہوتا ہے، تخلیقی عمل کے تحت یہ سارے متضاد اور مختلف النوع تجربے باہمی ربط و ترکیب سے گزر کر نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں، یہ عمل کیونکر واقع ہو جاتا ہے؟ اس کے بارے میں کسی قطعیت سے کچھ کہنا ممکن نہیں، تاہم جدید نفسیات نے اس ضمن میں بعض معنی خیز اشارے ضرور کئے ہیں۔ فرائڈ نے شاعری اور خواب کی مماثلت کے پیش نظر خواب کے عمل کا تجزیہ کر کے شعری عمل کی تفہیم کے لئے آسانی پیدا کی ہے، اس کے نزدیک خواب کی تشکیل، خواب دیکھنے والوں کی زندگی کی خواہشوں، حسرتوں اور توقعوں کے ترکیبی عمل کے نتیجے میں ہوتی ہے، یہ بقول فرائڈ Condensation کا عمل ہے، بعینہٖ شاعر کے داخلی تجربات بھی اس کی زندگی کے مختلف النوع اور متضاد و توقعات، اشخاص، اس کی خواہشوں اور حسرتوں کی انضمامی صورت میں مرتکز ہوتے ہیں، یہ انضمامی عمل شعری تجربے کے لسانی عمل میں بھی مترشح ہوتا ہے Frederick C.Prescott نے زبان کے انضمامی عمل کے بارے میں لکھا ہے:

Each word will be apt to have two, three or even many meanings or implications, corresponding to the multiple associations of the mental imagery which it represents. The language, like the imagination mental picture like the vision or the dream of the poet shows condensation.

فرائڈ خواب کی ماہیت کا تجزیہ کرتے ہوئے repression کا بھی ذکر کرتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ خواب میں شعوری اور لاشعوری تصورات ذہنی دباؤ کے تحت ایک دوسرے میں مدغم ہو کر نئی صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، ایسا ہی عمل شاعری میں بھی واقع ہو جاتا ہے،

اس لئے شاعری میں تجربے کی علیحدگی یا اکہرے پن یا اس کی معینہ صورت کی کوئی گنجائش نہیں، یاد رہے کہ شاعر کے دل و دماغ پر جو اثرات مرتسم ہوتے رہتے ہیں، وہ نقش سنگ نہیں بلکہ موج آب ہیں، ——— متحرک، تغیر پذیر اور وسعت آشنا، یہ ایک دوسرے میں ضم ہونے کی خاصیت کو ظاہر کرتے ہیں، اور علامتی پیچیدگی پر محیط ہو جاتے ہیں۔

شاعری کی علامتیت کے بارے میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ شاعری کو حقیقی زندگی سے بلا واسطہ منسلک کیا جاتا ہے، ممکن ہے یہ معمولی درجے کی سماجی یا سیاسی شاعری کے بارے میں درست ہو، مگر اعلیٰ درجے کی علامتی شاعری خارجی حقیقت سے انقطاع کر کے داخلی حقیقت کا سراغ پانے کی سعی کرتی

ہے، یہ صحیح ہے کہ شاعر دیدہ وا رکھتا ہے اور مشاہدۂ حقیقت کرتا ہے، اس کا شعور بیدار ہوتا ہے اور گرد و پیش کی حقیقتوں سے متاثر ہوتا ہے، لیکن خارجی حقیقت سے اس کے اس تعلق کو تخلیقیت کے لاشعوری عمل سے مربوط کرنا درست نہیں، تخلیقی عمل کے تحت شاعر کا خارجی حقیقت سے رشتہ برائے نام رہ جاتا ہے، وہ تمام تر داخلی وجود کی مخفی قوتوں پر انحصار کرتا ہے اس کے لئے اس کا داخلی تخلیقی وجود ہی ایک لازوال سرچشمۂ شعر بن جاتا ہے، اور جس قدر اسے اس داخلی سرچشمے تک رسائی ہوتی ہے، اسی قدر وہ خارجی حقیقت کی عدم معنویت، انتشار، سطحیت اور یک رنگی کا احساس کرتا ہے اور اس سے علیحدگی اختیار کرتا ہے۔ اسے شعری دنیا سے باہر کی حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں رہتا۔ وہ ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے، جو موجودہ دنیا سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی، یہ عدم سے وجود کا سفر ہے۔ اس عمل میں خارج اور داخل میں کسی رشتۂ باہم کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، موجودہ صدی میں اقبال، فیض یا اختر الایمان خارج اور داخل میں رشتۂ باہم قائم کرنے سے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیتے، بیشتر صورتوں میں یہ رشتہ قائم بھی نہیں ہونے پاتا، اور حقیقت اور تخییل آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، میر اور غالب کے یہاں خارج اور داخل میں کسی مفاہمت کو استوار کرنے کی ضرورت ہی نہیں، نہ ہی ان میں کسی دوئی کا خطرہ لاحق ہے، کیونکہ وہ خارج سے کنارہ کشی کر کے داخل ہی کے ہو رہتے ہیں، اور نتیجے میں غیر مختتم علامتی ذخائر پر تصرف حاصل کرتے ہیں، یہ دراصل اپنے شعری وجود کو علامتی پیکروں میں دریافت کرنے کا تخلیقی عمل ہے، ایٹس کے نزدیک لمحۂ تخلیق میں ایک اصلی خود رفتگی Trance کی حالت پیدا ہوتی ہے، جس میں ذہن، ارادے کے دباؤ سے نجات پاکر، علامتوں میں منکشف ہو جاتا ہے۔

نفسیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس خیال کی صحت مسلّم ہو جاتی ہے کہ شعری تجربہ خارج سے انقطاع کر کے ایک مخصوص ذہنی کیفیت کی پیداوار ہے، فرائڈ اس کی وکالت کرتا ہے، اسی طرح یونگ جسی پیکروں (Archetypes) میں صدیوں کے انسانی تجربے تقلبی صورت میں دیکھتا ہے کولرج نے علامت کی شناخت کے لئے "عام میں خاص کے نیم روشن نفوذ" کا ذکر کر کے اِس حقیقت کا اقرار کیا ہے کہ علامت من مانے طریقے سے یا خارجی زندگی سے من وعن نہیں لی جاتی بلکہ تخییلی طور پر عمومی اشیاء میں مخصوص معنوی امکانات کے لئے فضاسازی کا کام کرتی ہے۔ سوسن لینگر بھی علامت کی تخلیق کے لئے ایک مخصوص ذہنی صورتِ حال کو لازمی سمجھتی ہے، اور وہ اس کے لئے منطق اور مشاہداتی عمل کی نفی کرتی ہے، سوسن لینگر کے علامت کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے فاروقی نے لکھا ہے کہ "بعض علامتیں شعوری عمل سے بھی معرض وجود میں آتی ہیں"۔ Four Quartet کی علامتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں " اس طرح کی علامتوں کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ غیر شعوری یا خود کار عوامل کے ذریعے ہی وجود میں آسکتی ہیں " فاروقی آگے چل کر کبلا خان کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا استرداد کرتے ہیں کہ علامتی تخلیق خواب کی کیفیت میں پیدا ہوسکتی ہے، وہ اسے دو حیثیتوں سے غلط قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "کیونکہ اگر بفرض محال کبلا خان ساری کی ساری خواب کی سی کیفیت کی مرہونِ منت ہے، (یعنی خود کار تحریر رکھتی ہے)
> تو اور ہزاروں نظمیں ایسی ہیں، جن کی تخلیق میں خواب کا شائبہ تک نہیں ہے، ظاہر ہے کہ شیکسپیر نے "کنگ لیئر" یا ملارمے
> نے "راج ہنس" والی سانٹ یا غالب نے اپنی غزلیں خواب میں تو نہیں لکھی تھیں، علاوہ بریں کولرج افیون کا استعمال
> مسکن Sedative کی حیثیت سے اور اپنے بے قرار ذہن کو سکون پہنچانے کے لئے کرتا تھا نہ کہ مہیج
> (Stimulant) کی حیثیت سے"

فاروقی کا یہ کہنا قابل فہم ہے کہ کبلا خان کے علاوہ ہزاروں نظمیں ایسی ہیں، جن میں کبلا خان کے خلاف خواب کا شائبہ تک نہیں، لیکن اِس سے یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ ایسی ہزاروں نظمیں اگر اعلیٰ درجے کی ہیں، تو وہ علامتی نوعیت کی ہوں گی، اور تخلیق کار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت جسے ایٹس خود رفتگی سے موسوم کرتا ہے۔ کی پیداوار ہوں گی، یہ کیفیت کولرج کا خواب نہ سہی، خواب یا محویت کے مماثل تو ہوسکتی ہے، یہ بات مسلّم ہے کہ بڑے شعرا بالعموم ایک مخصوص تخلیقی کیفیت، جو ذہنی استغراق کی کیفیت ہے۔ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، چنانچہ مختلف شعرا کی مختلف کیفیتیں رہی ہیں، یونان میں یہ عقیدہ مروّج رہا ہے کہ شاعر کسی غیبی قوت کے زیر اثر شعر کہتا ہے، ظاہر ہے شیکسپیر کا ڈرامہ "کنگ لیئر" یا ملارمے کی "راج ہنس" یا غالب کی غزلیں کسی شعوری منصوبہ بندی کے بجائے ایسی ہی کسی استغراقی کیفیت کی مرہون ہیں جو خواب ہی کی کیفیت ہے، فاروقی کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ کولرج افیون کا استعمال مسکن کی حیثیت سے اور اپنے بے قرار ذہن کو سکون پہنچانے کے لئے کرتا تھا، لیکن یہ بات قطعیت سے کیونکر کہی جاسکتی ہے کہ وہ اسے

کا کام نہ لیتا تھا، ہوسکتا ہے کہ انھوں اسے ذہنی سکون پہنچانے کے ساتھ ساتھ مہمیز کا کام بھی کرتا رہا ہو، اس ضمن میں رامبو کی مثال دی جاسکتی ہے، وہ منشیات سے اپنے ہوش حواس زایل کر کے علامتی لاشعور تک رسائی حاصل کرتا تھا، ایٹس جاگتے خوابوں اور جادو کے توسط سے لاشعوری ذہنوں کا سراغ پانے کی کوشش کرتا تھا، بہرحال، میرا یہ خیال ہے کہ شاعر علامتوں کا انتخاب شعوری طور پر کر کے اپنے تصورات کو پیش نہیں کرتا، علامتیں بنائی نہیں جاتیں، ڈھونڈی نہیں جاتیں، عاید نہیں کی جاتیں، علیحدگی میں وجود نہیں رکھتیں، یہ تجربے کی ساخت میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہ خود تجربہ ہیں:

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز بے حقیقت ہے شیخ کیا جانے

تخلیقی کیفیت میں شاعر باطنی دنیا میں وارد ہوتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دنیا میں قدم رکھتے ہی اس پر سارے اسرار بے نقاب ہوجاتے ہیں تخلیق کے معجزہ کار عمل میں شاعر کے اندرون میں مختلف، متضاد اور تہہ دار تجربے جو بے نام اور نادیدہ ہوتے ہیں، شعور کی سطح زیریں میں لسانی اظہاریت کے لئے بے تاب ہوتے ہیں، شاعر کا لسانی شعور، جادوئی انگیختگی سے، تجربے کی علامتی اظہاریت کے نامعلوم امکانات پر حاوی ہوجاتا ہے واقعہ یہ ہے کہ تجربے کی لسانی تکمیلیت تک شاعر کے علم میں یہ بات نہیں ہوتی کہ اس کے تجربے کی نوعیت کیا ہے۔ غالب نے لکھا ہے:

زخمہ بر تار رگِ جاں میزنم کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

پس یہ کہنا صحیح نہیں کہ علامتیں کسی خیال کے اظہار کے لئے چُنی جاتی ہیں یا تراشی جاتی ہیں۔

شعر کے علامتی عمل کے تحت، باطنی وجود میں کسمساتے ہوئے وقوعات اپنے منفرد وجود پر اصرار کرتے ہیں اور تقابل کے مرہون نہیں ہوتے، اس لئے کہ تقابل تشبیہاتی ہو یا استعاراتی تجربے کی آزاد نمو پذیری پر روک لگاتا ہے، علامتی تجربے کی خاصیت یہ ہے کہ تمام حد بندیوں کی نفی کرتا ہے اور لامتناہی ہوجاتا ہے، یہ ضرور ہے کہ یہ تجریدیت سے لاتعلق ہو کے پیکریت یا شئیت کی جانب راغب ہوتا ہے، اور خواب سے اس کی مماثلت کی ایک وجہ یہ بھی ہے، خواب میں ہر جذبہ یا کیفیت شکل پذیر ہوجاتی ہے، اسی طرح تخلیق شعر کے عمل میں جذبہ اپنے معروض یا پیکر میں متشکل ہونے کے حاوی میلان کو ظاہر کرتا ہے، ایلیٹ نے اسے معروضی تلازمہ کا نام دیا ہے، لیکن اگر وہ اس سے یہ مراد لیتا ہے کہ شاعر اپنے داخلی جذبے کے لئے خارج سے معروض کو اخذ کرتا ہے، تو وہ غلطی پر ہے، شاعر خارج سے اشیاء مثلاً درخت، گلاب، ہوا یا سمندر کو نہیں لے آتا، یہ معروض یا پیکر اسے داخلی دنیا میں ہی ملتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ ان کی شکل بدل جاتی ہے، چنانچہ اندر سے اُگا ہوا درخت حقیقی درخت کے ہرگز مشابہ نہیں ہوتا، یہ معروض کسی متعینہ معنی سے بھی سروکار نہیں رکھتا، اس لئے ان کی تعبیر کا عمل غیر معتبر اور غیر مفید ہوجاتا ہے، آرچ بالڈ میکلیش نے اسی لئے کہا ہے:

A poem should not mean
But be

اہمیت معنی کو نہیں، بلکہ نظم کو حاصل ہے، پس ظاہر ہوا کہ علامتی شاعری ایک پُراسرار صورتِ حال کو ابھارتی ہے جس کی اجنبیت اور وسعت مسلّم ہوتی ہے، ملارمے نے لکھا ہے کہ "یہ پُراسرار عمل ہی ہے جو علامتیت کی تشکیل کرتا ہے"، میکلیش نے ایک جگہ لکھا ہے "فن تجربے کے حوالے سے تجربے کی تنظیم ہے جس کا مقصد تجربے کی شناخت ہے"، ذیل کے اشعار میں آئینہ، زنجیر اور شعلہ اسی نوع کی پُراسرار علامتی صورتِ حال کی تخلیق کرتے ہیں:

مُنہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

شب اک شعلہ دل سے ہوا تھا بلند تن زار میرا بھسم کر گیا

شاعری میں علامتی صورتِ حال کا ادراک کرنا نقاد کا بنیادی کام ہے، یہ ستاروں سے آگے نادیدہ جہانوں کا سفر ہے، اور سفر ہی اس کا حاصل ہے ——— منتہائے سفر۔ اس طرح سے علامتیت حقیقت کی جبریت سے نجات پانے کا ایک موثر شعری وسیلہ بن جاتی ہے، غالب اس نکتے سے آگاہ ہیں، وہ ایک ایسی آگہی، جسے وہ فنا سے موسوم کرتے ہیں، کے آرزومند ہیں، جو غلط خیالوں کی آلائشوں صورتوں کے ظاہری جلووں اور آئینہ کے زنگار کو دُور کر دے:

کو فنا تا ہمہ آلائش پندار برد
از صور جلوہ و از آئینہ زنگار برد ○○

عمیق حنفی
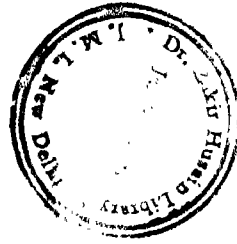
شو شروع کرو

اندھیرا ہو چکا
ہال بھر چکا
سیٹیاں بجنے لگیں
تماشائی بے چین ہیں
شو شروع کرو

پنکھے بند
ہوا رکی ہوئی
چھوڑی ہوئی سانسیں
اندر کھینچی جانے لگیں
پنکھے چلاؤ
بتیاں جلاؤ

جب پردے پر کچھ نہیں ہوتا
ہال میں ہونے لگتا ہے
پھر ہال سے کود کر
باہر بستی میں پھیل جاتا ہے
پردے پر کچھ ہونے دو
شو شروع کرو

کچھ نہ ہونے کا احساس
کچھ نہ کرنے کا احساس
کسی کام میں
کسی سوچ میں
شریک نہ ہونے کا احساس
قاتل ہے
جان لیوا
گھٹن

ڈھشنگ ڈھشنگ
ونگ تا ونگ
ٹرنگ ٹرنگ ٹرنگ
ناز انداز
رقص آواز
پردے پر روشنی کا ارتکاز
دھیان بٹاتا ہے
سچائی سے سپنوں میں لے جاتا ہے
شو شروع کرو

نوحہ

پہلی فرصت میں لکھوں گا
میں تمہارا ماتمی گیت
تم مرو تو !
تم اگر سو بھی گئیں
ایک ابدی نیند
گیت کی کڑیاں
کھن کھنا کر اٹھا دیں گی تمہیں

گیت میں
چاروں ہوائیں
سات ساگر
اور ساتوں آسماں
سُر ملا کر گا رہے ہوں گے
("رو رہے ہوں گے" بھی کہہ سکتی ہو تم)
تم کو پھر سے جینے کی دعوت بھی دے گا
ان کی آوازوں کا سوز
گُن گُن
گُن گُن
گنگنائیں کی دشائیں
لیکن اے ضعیفہ
اے بزرگ
اے مری بوڑھی زمیں
اے مری مرحومہ ماں

ان کی باتوں میں نہ آنا
پھر سے مت جی اٹھنا

ماتمی گیتوں کا مقصد
مرنے والوں کو جلانا تو نہیں
جینے والوں کو رلانا ہوتا ہے

طواف

اپنے جسم کو چھوڑ کے جب میں نکلتا ہوں
ہلکا پھلکا اک مشتِ پر
چمکیلے پنکھ پھیلا کر
اُڑتا رہتا ہوں اپنی لاش کے اُوپر
گھر چھپر دیوار و در کی حالت پر
سوچتا رہتا ہوں روتا رہتا ہوں
ریگزار درد میں
اشک بوتا رہتا ہوں
نبض کی بے بسی
اور دل کی خامشی پر

اچھا ہوتا ہے
کچھ دیر چکر لگا کر
اپنے جسم کا کر کے طواف
لاش میں پھر لوٹ آتا ہوں
ریشہ ریشہ جنبشیں پھر پھیل جاتی ہیں
اس بوسیدہ گھر میں پلٹ کر
پھر گھبرا گھبرا جاتا ہوں

اے - ۲۲۳ بنڈارہ روڈ نئی دہلی ۳

ایڈیٹ

رتن سنگھ ● ریڈیو کشمیر، سرینگر (کشمیر)

وہ لال بتی کے ہرا ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔
اسے سڑک کے اس پار جانا ہے۔
اس کے سامنے کناٹ پلیس کی گول چکردار سڑک پر سفید پٹی سی کھنچی ہے، جس پر سے ہوتے ہوئے پیدل چلنے والے سڑک کو پار کر سکتے ہیں۔
لیکن لال بتی ہے کہ ہری نہیں ہو رہی۔
وہ لال سے پیلی ہوتی ہے۔ پیلی کے بعد اسے ہرا ہونا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ وہ لال سے پیلی اور پیلی سے پھر لال ہو جاتی ہے۔ ہری نہیں ہوتی۔
پتہ نہیں سرکٹ نہیں بنتا۔
یا ہرا بلب ہی خراب ہے۔
کوئی وجہ تو ضرور ہوگی کہ بتی ہری نہیں ہوتی۔
اور وہ سڑک کے اسی پار کھڑا ہے۔
پیدل چلنے والوں کے لئے جب بتی ہری ہوتی ہے تب دونوں طرف سے آنے والی تیز رفتار گاڑیوں کے لئے بتی لال ہو جاتی ہے۔ بتی کے لال ہوتے ہی گاڑیاں پیدل چلنے والوں کی پٹی سے کافی دور لکیر کھڑی ہو جاتی ہیں اور اس طرح پیدل چلنے والے آسانی سے سڑک پار کر لیتے ہیں۔
لیکن بتی ہری نہیں ہو رہی۔
اور وہ انتظار کر رہا ہے۔
اس کے سامنے سے تیز رفتار گاڑیاں، اسکوٹر، موٹر سائیکل زن سے نکلے جا رہے ہیں۔ ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر۔
اور وہ انتظار کر رہا ہے۔
لیکن پیدل چلنے والے باقی لوگ بتی کے ہرا ہونے کا انتظار نہیں کر رہے۔ بتی چاہے لال ہو یا پیلی۔ جب بھی انہیں موقعہ ملتا ہے، جب بھی تیز گاڑیوں کا ریلہ ذرا سا رُکتا ہے یا آہستہ ہوتا ہے، یا دو گاڑیوں کے درمیان فاصلہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو وہ دوڑ کر آدھی سڑک پار کر لیتے ہیں۔ وہاں تھوڑی دیر رُکتے ہیں، دائیں بائیں دیکھتے ہیں اور پھر باقی سڑک بھی اسی طرح پار کر لیتے ہیں۔
ہاں! کون لال بتی کے ہرا ہونے کا انتظار کرے۔
زندگی کی اس تیز دوڑ میں کس کے پاس اتنی فرصت ہے۔
لیکن وہ کھڑا ہے۔
انتظار کر رہا ہے کہ کب بتی ہری ہو اور وہ سڑک پار کرے۔
اور بتی ہری نہیں ہو رہی۔
سب لوگ چلے جا رہے ہیں۔

اور وہ کھڑا ہے۔

کبھی کبھی اس کا دل کرتا ہے کہ لال بتی کی پرواہ نہ کرے۔ اور دوسروں کی طرح آگے بڑھ جائے۔ سڑک کے اُس پار سے ہی پارلیمنٹ اسٹریٹ شروع ہو جاتی ہے، جہاں وہ کام کرتا ہے۔ وہ کام کرتا ہے تو اسے اپنے مالک سے تنخواہ ملتی ہے۔ تنخواہ ملتی ہے تو وہ اس روپے سے وہ اس مکان کا کرایہ دیتا ہے جس میں وہ اپنے پریوار کے ساتھ رہ رہا ہے۔ اسی پیسے سے وہ مہینے بھر کا راشن خریدتا ہے، آٹا، گھی، چاول، دال، چینی، گڑ، شکر۔ اسی پیسے سے وہ اپنے بیوی بچوں کے، سب کے کپڑے خریدتا ہے، اسی پیسے سے بچوں کے لئے کتابیں آتی ہیں، شادیاں اور دوسری مٹھائیاں آتی ہیں۔ اس لئے اس کے لئے سڑک کے اس پار جانا نہایت ضروری ہے۔

لیکن وہ کیا کرے؟ بتی بدستور لال ہے۔ وہ ہری ہو ہی نہیں رہی۔ اور موٹریں، کاریں اور اسکوٹر ہیں کہ تیزی سے اس کے سامنے سے بھاگتے جا رہے ہیں۔

آخر اس کے دماغ میں آیا کہ سڑک تو مجھے کسی نہ کسی طرح پار کرنی ہی ہوگی۔ کیونکہ اگر اس نے سڑک پار نہ کی اور وہ اپنے کام پر نہیں گیا تو اسے پیسے نہیں ملیں گے۔ پیسے نہیں ملیں گے تو اس سے اس کا مکان چھن جائے گا۔ وہ اور اس کا پریوار کہاں رہیں گے؟ راشن نہیں خریدے گا تو وہ سب کھائیں گے کیا۔ اور کپڑوں کے بغیر تو اور بھی مشکل ہے۔ کیا اس جگہ جہاں وہ قمیص پینٹ پہنے کھڑا ہے، کپڑے نہ ہونے پر ننگا کھڑا ہو سکے گا۔ شاید نہیں۔ تب تو اس کے ارد گرد چاروں طرف لال بتیاں جل اٹھیں گی۔ اور وہ کسی طرف بھی نہیں جا سکے گا۔ اس لئے اسے سڑک پار کرنی ہی چاہئے۔

اس نے ہمت بٹوری۔

اپنے سامنے ان لوگوں کو سڑک پار کرتے دیکھا جو لال بتی کی پرواہ کئے بغیر سڑک پار کر رہے تھے۔ جین پہنے ہوئے ایک کالج کا لڑکا اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پار کر گیا۔ اس کے پیچھے ایک نئی بیاہی جوڑی بھی نکل گئی۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے بھی جا رہے ہیں اور سڑک بھی پار کر رہے ہیں۔ بیچ میں پہنچ کر انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ بھی پکڑ لئے اور سڑک کے پار ہو گئے۔ وہ اچار بیچنے والا چھوٹا سا لڑکا بھی ابھی اس طرف تھا۔ اب اس طرف پہنچ گیا۔

تو کیا میں اس چھوٹے بچے سے بھی گیا گزرا ہوں۔

اس نے ایک دفعہ پھر ہمت بٹوری۔

ابھی اس نے ایک ہی قدم آگے بڑھایا تھا کہ اسے لگا جیسے تیز دوڑتا اور چنگھاڑتا ہوا اونچا سا پہاڑ اس کے اوپر چڑھا آ رہا ہو۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

بڑے زور کی بریک لگی تھی۔

ایک تیز رفتار گاڑی ایک چیخ کے ساتھ اس کے پاس آکر رک گئی تھی۔

وہ اس کی لپیٹ میں آتے آتے بچا تھا۔

اگر وہ جلدی سے اچھل کر دو قدم پیچھے نہ ہو گیا ہوتا، تو اس وقت زخمی ہو کر اس کار کے نیچے تڑپ رہا ہوتا۔

وہ تو کہئے جان بچ گئی۔

لیکن ابھی تک اس کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ پلک جھپکنے میں کیا ہو گیا تھا۔ اسے تو صرف لال بتیاں ہی اپنے چاروں طرف چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اور لگتا تھا کہ جتنے بھی آدمی چلتے چلتے رک گئے تھے ان کی آنکھیں لال بتیاں بن کر اس کی طرف غصے سے دیکھ رہی تھیں۔

اتنے میں اس کے کانوں میں کار والے کی آواز پڑی:

"ایڈیٹ، دیکھتا نہیں۔ تمہارے لئے لال بتی ہے۔ پھر بھی گھسے چلے آ رہے ہو۔ تھوڑا صبر نہیں ہوتا ان لوگوں سے۔ ابھی گاڑی کے نیچے آ جاتا تو خود تو مرتا ہی ہمارے لئے بھی مصیبت کھڑی کر دیتا۔

اور پھر اس کے کانوں میں گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی، جو ایڈیٹ ایڈیٹ کہتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ پھر سڑک کے اسی پار کھڑا ہے۔

تھوڑی دیر پہلے ہوئے حادثے کا اثر ابھی اس کے ذہن پر ہے۔ لیکن پھر بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کیا کرے؟

واپس لوٹ جائے۔

اگر گھر کے راستے میں بھی کوئی لال بتی ہوئی تو کیا ہوگا۔ اور اگر گھر پہنچ بھی گیا تو بیوی بچوں سے کیا کہے گا :

" لال بتی کی وجہ سے سڑک پار نہیں کر سکا "

بیوی سُن کر کہے گی " ایڈیٹ "

لڑکا ہنسے گا۔ کہے گا۔ میرا ڈیڈی ایڈیٹ ہے۔

مالک مکان کو کرایہ نہیں دوں گا، بغیر پیسے لئے راشن لینے جاؤں گا تو وہ بھی کہیں گے۔ ایڈیٹ۔ ایڈیٹ۔

اور وہ ایڈیٹ بنا اب بھی سڑک کے اِس پار کھڑا ہے۔ بتی اب بھی لال ہے۔ یا پیلی۔ ہری نہیں ہو رہی۔

اس لئے پتہ نہیں ابھی اسے اور کتنا انتظار کرنا پڑے۔

بقیہ صفحہ ۶۸۔ ہر لمحہ بڑھتی خاموش رات

کئی سالوں کی قید کے بعد وہ کل رہا ہوگا۔ مسرّت، گھبراہٹ اور جوش کے ملے جلے جذبات کے تحت وہ پریشان ہو چکا تھا۔

وہ مستطیل اس قدر پھیل چکا تھا کہ سیل میں اتنی جگہ بھی باقی نہیں تھی کہ وہ اور پھیل سکے۔ آسمان جیسے اس سے قریب تر ہونے لگا تھا۔

خوف سے گم صم کھڑا شدّت کے ساتھ وہ یہی چاہ رہا تھا کہ رات یُوں ہی چپ چاپ گزر جائے اور مستطیل کے پھیلنے کا عمل صبح تک رُکا رہے۔

باہر ــــ صاف اور شفاف آسمان پر ستارے جھلملانے لگے تھے۔

رات کسی عجیب کائناتی مخاصمت کے زیر اثر تاریک اور خوبصورت نظر آ رہی تھی ــــ جب کہ ــــ آزادی کے حصول کے محض تصوّر سے ہی خوفزدہ ہو کر وہ تنہا کھڑا رہا۔

اور ــــ

اس کے جسم پر کپکپی سی طاری تھی ! ○○

اِس میں ہر وہ چیز شامل ہے

جو ایک اچھے ٹانک میں ہونی چاہیے ... بلکہ اِس سے بھی زیادہ !

سنکارا الکحل سے پاک

لازمی بُنیادی عناصر، وِٹامنز اور قدرتی جڑی بوٹیوں کا نادِر مرکّب

سنکارا واحد ٹانک ہے جس میں ۲۰ لازمی عناصر کے علاوہ چھ وٹامنز اور جڑی بوٹیوں کی کثیر مقدار پائی جاتی ہے، جو آپ کے جسم کو خون اور قلب، جگر، عضلات اور ہڈیوں کو مضبوط بناتی ہیں۔
اس کے باوجود سنکارا بازار میں دستیاب ٹانکوں میں سب سے کم قیمت ہے۔
سنکارا کو روزمرہ کی عادت بنائیے۔

جسم کو کب سنکارا کی ضرورت ہوتی ہے؟

- کمزوری اور نقاہت میں،
- بھوک کی کمی میں۔
- جراثیم کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے،
- وزن کم ہونے پر،
- اضطراب اور تھکن میں وغیرہ۔
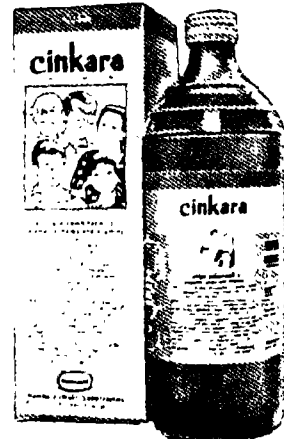
مصوّر سبزواری

(۱)

جھلس چکے ہیں تمام رستے فغانِ اشجار گونجتی ہے
ہوا کے کاسہ میں تیری اب تک ہنسی کی جھنکار گونجتی ہے

تری خموشی منافقت کا سکوتِ مبہم نہیں تو پھر کیا؟
کہ مظہرِ خود سپردگی میں نوائے انکار گونجتی ہے

ہمارے باطن کے روز و شب میں پڑے ہیں بے حرف و صوت ان کہی کیوں؟
درونِ دیوار بھی نہیں کوئی خالی دیوار گونجتی ہے

صعوبتوں کا سفر کسی دن نڈھال ناقے کو تھام لے گا
شگفتگی کی فصیل شاید دھویں کے اس پار گونجتی ہے

کھلی ہیں پتھریلی رزم گاہیں بکھر چکا زخم زخم لشکر
فریبِ چارہ گری کی خاطر ندائے کہسار گونجتی ہے

نہ جانے کس کربلا کی جانب قدم برابر رواں دواں ہیں؟
سماعتوں کے نگر میں پھر روشنی کی تلوار گونجتی ہے

(۲)

فیصلے تھے وقت کا پھر بے اثر کیسے ہوئے؟
سچ کی پیشانی پہ ہم جھوٹی خبر کیسے ہوئے؟

ٹھیک کہتا تھا وہ ضائع کر دے اس تصویر کو
دیکھتے ہی دیکھتے صرفِ نظر کیسے ہوئے؟

تم کو اندیشے تھے میری ہمرہی سے کس قدر
اس پسندیدہ سفر میں بے سپر کیسے ہوئے؟

جن پہ تھی بارِ سماعت پھول کھلنے کی صدا
آج وہ وحشی ہوا کے ہمسفر کیسے ہوئے؟

خونِ دل کو رزق کرنے کا جو فن لائے تھے ساتھ
شہرِ کاروبار میں وہ بے ہنر کیسے ہوئے؟

جھک گئے کاندھے کبھی کے ہجرتوں کے بوجھ سے
سخت حیرانی ہے طے اتنے سفر کیسے ہوئے؟

پوسٹ آفس نوح، ضلع گڑگاؤں (ہریانہ)

علامہ اقبال کے نودریافت خطوط

مرتب :- افتخار امام صدیقی

۱۹۸۲ء میں سفرِ پاکستان کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کے کئی اہم غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں جو کتابی شکل میں جلد شائع ہونے والے ہیں۔ اپنے مشاہیر کے بارے نئی باتوں کے تحقیقی انکشافات کے لئے علم وادب کے شائقین ہمیشہ ہی سے متجسس رہے ہیں۔ مجھے بھی اشتیاق ہوا کہ میں ان غیر مطبوعہ خطوط کو دیکھوں ان کا مطالعہ کروں۔ اسی دوران روزنامہ "جنگ" (کراچی) کے اقبال ایڈیشن ۲۱ اپریل ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں علامہ اقبال کے چند اردو اور انگریزی خطوط کے عکس شائع کردیے گئے۔ یہ خطوط علامہ اقبال نے اپنے ایک پرستار اور برِّصغیر کی مشہور شخصیت مولانا راغب احسن (۲۲ جنوری ۱۹۰۴ء گیا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۷۵ء کراچی) کے نام تحریر کئے تھے۔ خیال تھا کہ میں ان خطوط کو شاعر کے "پاکستان میں اردو ادب نمبر" میں شامل کروں گا لیکن مجوزہ نمبر کی اشاعت میں تاخیر نے ان خطوط کو محفوظ رکھا۔ اسی دوران ان خطوط کو جناب محمد فرید الحق نے ۱۹۸۳ء میں (گردیزی پبلشرز ۲۲۲/۶ اسلام گنج، لاس بیلا ہاؤس کراچی ۵ پاکستان) مرتب کرکے شائع کردیا۔

فرید الحق صاحب پیشہ کے لحاظ سے وکیل ہیں لیکن پاکستان کی ملی سیاست کے نشیب و فراز کے چشم دید گواہ بھی رہے ہیں۔ مولانا راغب احسن مرحوم اور علامہ اقبال ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ بعینہ مولانا راغب احسن مرحوم اور فرید الحق صاحب کے درمیان بھی رشتۂ موانست تھا۔ اسی سبب سے مولانا نے اکابر برِّصغیر کے اپنے نام آئے خطوط فرید صاحب کے حوالے کر دینے کی تاکید فرمائی۔ اس طرح علامہ اقبال کے مکاتیب کا یہ مجموعہ فرید صاحب کے توسط سے منظرِ عام پر آسکا۔

مولانا راغب احسن اس صدی کے صفِ اوّل میں برِّصغیر کی "مسلم سیاست" میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ وہ آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ (۱۹۳۱) کے بانی تھے۔ اس کے علاوہ وہ کلکتہ مسلم لیگ کے بانی ہونے کے علاوہ کل ہند جمعیت العلماء اسلام (۱۹۴۵) کے بانی بھی تھے۔ اپنی خدمات کے سبب وہ ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے۔ راغب صاحب نے اقبال اکاڈمی کی تجویز بھی پیش کی تھی یہ ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔

علامہ اقبال کے خطوط کے دس بارہ مجموعے اب تک ترتیب دیے جاچکے ہیں لیکن "اقبال ـــــ جہانِ دیگر" اس اعتبار سے قابلِ ذکر ہے کہ علامہ نے راغب صاحب کو بعض کلیدی اہمیت کے خطوط تحریر کئے ہیں جن سے علامہ اور راغب صاحب کے مابین قربتوں کا احساس و اعتماد ابھرتا ہے نیز بعض وہ مسائل جو علامہ کے فکری رویّوں میں سوال بن کر ابھرتے تھے ان کی صراحت مزید معلومات فراہم کرتی ہے۔

"اقبال ـــــ جہانِ دیگر" میں اردو کے ۲۵ اور انگریزی کے ۱۸ خطوط شامل ہیں لیکن شاعر میں جن اردو اور انگریزی خطوط کے عکس دیے جارہے ہیں وہ روزنامہ جنگ (۲۱ اپریل ۱۹۸۲ء) سے لئے گئے ہیں۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیان تحریر کئے گئے یہ اہم خطوط ایک ایسا ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں جو اسلامی معاشرت، اسلامی نظام، عالمی سیاست، عصری بحران اور خود علامہ کے ذہن میں پھیلی ہوئی پیچیدگیوں اور ان سے ابھرتے والے مفروضات کی افہام و تفہیم اور علامہ کی فکر کے ارتقائی عمل کی نشاندہی کرتے ہیں۔

"اقبال ـــــ جہانِ دیگر" چونکہ ہندوستان میں نہیں ملتی اور یہ خطوط اردو کے ایک عظیم شاعر کے تحریر کردہ ہیں اور اردو زبان و ادب کا گراں قدر سرمایہ بھی لہٰذا قارئینِ شاعر کی نذر ہیں ـــــ اردو اور انگریزی کے یہ خطوط اقبال شناسی میں معاون ہوں گے۔

اقبال — جہانِ دیگر

شاعرِ مشرق کے نودریافت خطوط

محمد علی صدیقی ● اے۔ ۵۹۲، بلاک جے، نارتھ ناظم آباد، کراچی (پاکستان)

یہ مضمون جناب محمد فرید الحق کی کتاب "اقبال۔ جہانِ دیگر" کا دیباچہ ہے شاعر میں شامل دس اردو انگریزی خطوط کے متعلق میں نے اپنے ابتدائیہ میں بعض ضروری حوالے دیدیئے ہیں اس کے باوجود جناب محمد علی صدیقی کا یہ دیباچہ یہاں اس لئے شائع کیا جارہا ہے کہ اس میں پوری کتاب میں شامل خطوط کے بارے میں تاریخی تجزیے اور حوالے موجود ہیں، اسطرح یہ دس خطوط اور کتاب میں شامل جملہ خطوط کے بارے میں قارئین اپنے طور پر محاکمہ کرسکتے ہیں (افتخار)

علامہ اقبال کے شارحین کی مجبوری یہ ہے کہ ان کا معاملہ ایک ایسے مفکر سے آپڑا ہے جو وقت کے سیل بلاخیز سے پریشان اور آزردہ ہونے کی بجائے اسے اپنی مضبوط گرفت سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ اقبال کی جملہ تحریروں میں حقیقت تک پہنچنے کے لئے معصومانہ تڑپ کا وفور موجزن نظر آتا ہے بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اقبال کی فکر میں ارتقائی سفر میں تضادات پاکر حیران وششدر رہ جاتے ہیں لیکن جیسے ہی حیرانی حاوی ہونے لگتی ہے ہمیں کسی نہ کسی تحریر کے ذریعے "حیرانی" کی گرہ کھلتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ مکاتیب اقبال شاعر اور مفکر اقبال کی الجھنوں کی تہہ تک رسائی میں اس حد تک معاون ہوتے ہیں کہ اقبالیات کے دلدادگان کے لئے غیر مطبوعہ خطوط کا ہر مجموعہ یا ان خطوں کے بارے میں ہر تحریر اقبال فہمی میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

فرید الحق صاحب نے "اقبال۔ جہانِ دیگر" میں بعض ایسے خطوط پیش کردیے ہیں جنہیں فکر اقبال کی تفہیم میں نمایاں اہمیت حاصل ہوچکی ہے۔

فرید الحق صاحب پیشہ کے لحاظ سے وکیل ہیں موتمر عالم اسلام پاکستان کے سکریٹری جنرل کے عہدہ پر طویل عرصہ تک فائز رہ چکے ہیں اور ملی سیاست کے نشیب و فراز کے چشم دید گواہ رہے ہیں۔ مولانا راغب احسن مرحوم اور علامہ اقبال کے مابین خصوصی رشتہ موانست تھا بعینہٖ مولانا راغب احسن مرحوم اور فرید الحق صاحب بھی ایک دوسرے کے ساتھ اس درجہ شیر و شکر ہوئے کہ انہوں نے انکی خواہش کے مطابق اپنے نام اکابر برصغیر کے جملہ خطوط فرید الحق صاحب کے حوالے کرنے کی تاکید فرمائی۔ موجودہ مجموعہ مکاتیب اس رشتہ موانست کا ثمرہ ہے اور یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اس مجموعہ مکاتیب کی اشاعت جہاں فکر اقبال کے بعض گوشوں کو زیادہ منور کرے گی وہاں علامہ اقبال کے بارے میں بعض مفروضات کو قرار واقعی خد و خال عطا کرسکے گی۔

علامہ اقبال نے اپنے درجنوں ہم عصروں کے نام خطوط تحریر کئے جن میں قائداعظم، اکبر الٰہ آبادی، سید انور شاہ کشمیری، مولانا شیخ غلام قادر، مولانا گرامی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، خواجہ حسن نظامی، عبدالرحمٰن چغتائی، مس فارقوہرسن، پروفیسر عمرالدین، عطیہ بیگم، مہاراجہ کشن پرشاد، مولوی عبدالحق، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، میاں محمد شریف، جسٹس عبدالرشید، محمد دین فوق، رشید احمد صدیقی، سر راس مسعود، مولانا شوکت علی، خواجہ غلام السیدین، مسعود عالم ندوی، پروفیسر نکلسن، علامہ مصطفےٰ المراغی، چوہدری نیاز علی، ذوقی، خان نیاز الدین، نذیر نیازی، سراج الدین پال، شیخ عبداللہ، اسلم جیراجپوری، اور مولانا راغب احسن کے علاوہ متعدد دیگر حضرات کے نام آتے ہیں" اقبال۔ جہانِ دیگر" اس لحاظ سے اہم کتاب ہے کہ یہ اقبال اور مولانا راغب احسن کے مابین ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۷ء تک کے عرصہ پر محیط خط و کتابت کے ایک بڑے حصہ کا احاطہ کرتی ہے۔ علامہ اقبال کے ساتھ جن دیگر حضرات کی مراسلت سامنے آچکی ہے اس میں خان نیاز الدین، نذیر نیازی، عطیہ بیگم، قائداعظم، سرکشن پرشاد اور مولانا گرامی کے نام مکتوبات نے بوجہ اہمیت پائی۔

میری ناقص رائے میں علامہ اقبال کے مکاتیب کے دس گیارہ مجموعے ترتیب دیئے جاچکے ہیں۔ "اقبال۔ جہانِ دیگر" اس لحاظ سے اہم مجموعہ مکاتیب ہے کہ اقبال نے راغب احسن مرحوم کے نام۔ حسن کلیدی اہمیت کے مکاتیب تحریر کئے جن سے علامہ اقبال اور مولانا راغب احسن کے مابین قریبی تعلقات کی نوعیت ہویدا ہوتی ہے اس مجموعہ مکاتیب میں بعض ایسے خطوط بھی شامل ہیں جن سے مولانا راغب احسن پر غیر معمولی اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض مسائل کے بارے میں علامہ اقبال کی مبہم آراء زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ ایسے مکاتیب بھی شامل ہیں جو کانی چونکا دینے والی تحریریں سمجھی جائیں گی حالانکہ

علامہ اقبال جیسے مفکر کی عظمت کا راز ہی یہ ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حقائق سے بدکنے کی بجائے ان سے آنکھیں چار کرتے ہیں اور اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے نہیں جھجکتے۔ اگر دیکھا جائے تو یہی وہ کمال ہے جس نے علامہ اقبال کے سیاسی فیصلوں کو بے پایاں اہمیت بخشی ہے۔ علامہ اقبال اپنے ہم عصروں کے برخلاف زیادہ واقعیت پسند ثابت ہوتے ہیں وہ اپنے سابقہ خیالات کو محض اس سبب سے سینہ سے لگائے نہیں پھرتے کہ وہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ثابت قدم رہنا چاہتے ہیں علامہ اقبال مستقبل کے ساتھ زیادہ بہتر طور پر معاملت کی اہمیت کے پیشِ نظر صحیح سے صحیح تر کی سمت گامزن رہتے ہیں وہ بیک وقت موضوعیت پسند اور نتائجیت پسند ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دونوں اوصاف ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح چمٹے ہوئے ہیں کہ ایک وصف دوسرے وصف کا پردہ بن جاتا ہے جب کوئی شخص علامہ اقبال پر تضادات کے الزامات لگاتا ہے تو وہ علامہ اقبال کے ارتقائی عمل اور اپنے فکری جمود میں یک گونہ مطابقت ڈھونڈنا چاہتا ہے اگر معاملہ صرف یہیں تک محدود رہ سکتا تو کوئی مضائقہ نہ ہوتا لیکن بعض قارئین اپنے جمود یا فکری سانچوں کو علامہ اقبال کی متحرک فکر پر بند باندھنا چاہتے ہیں افراد کے ساتھ اس نوع کے مذاق نے تاریخ کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھنے کے رجحان کو اس درجہ تقویت دی ہے کہ اب روز بروز علامہ اقبال اور ان کے متعدد شارحین آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً علامہ اقبال کا ایک خط مورخہ ۶ مارچ ۱۹۳۴ء قدرے سنسنی خیز ثابت ہوگا۔ لیکن قائدِ اعظم کے نام علامہ اقبال کی خط و کتابت بہت سی الجھنوں کو صاف کر دیتی ہے۔

اس مجموعے میں شامل ہونے والے مکاتیب سے اندازہ لگایا جاسکے گا کہ علامہ اقبال نے روزنامہ "اسٹار آف انڈیا" (کلکتہ) میں ایڈورڈ تھامسن کے تبصرے کے بارے میں کس لئے وضاحت فرمائی تھی۔

جیسا کہ ہم واقف ہیں کہ جناب راغب احسن ان پرستارانِ اقبال میں سے تھے جنھوں نے "نیرنگ خیال" کے اقبال نمبر (۱۹۳۲ء) میں اقبال اکاڈمی کے قیام کی تجویز پیش کی تھی ان کے خیال کے مطابق اس اکاڈمی کی "اساسی وجہ زیست اقبال کے کام اور پیام کی تفسیر و تبلیغ اور اس کے آثار و اخبار کی جمع و ترتیب ہوگی اور مقصود عمومی اسلامی کلچر کی حفاظت کا ارتقا ہوگا" انہوں نے سوال کیا تھا کہ "میں ملّتِ اسلامیہ سے جس میں اقبال پیدا ہوا تھا یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے سرسید، قاسم، شبلی، اجمل، جوہر اور اقبال کے کام اور پیام کو نسل در نسل قائم رکھنے ان کو مستقل تحریکات بناتے اور اس مطلب کے لئے منتظم ادارت کی بنا ڈالنے میں کچھ کیا ہے؟ حالانکہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک عالمگیر ملّت ہے انسانیت کا مداوا اور دنیا کی تقدیر ہے۔"

افسوس کہ آج مولانا راغب احسن مرحوم کی یاد دھندلا سی گئی ہے بہت کم حضرات واقف ہیں کہ وہ اس دہائی کے تیسرے اور چوتھے عشرہ کے مسلم برصغیر کے جوانوں کے محبوب رہنما تھے وہ آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ (۱۹۳۱ء) کے بانی تھے، علاوہ ازیں وہ کلکتہ مسلم لیگ کے بانی ہونے کے علاوہ کل ہند جمعیت علمائے اسلام (۱۹۴۵ء) کے بانی بھی تھے اور اپنی بے ریا اور مخلص خدمات کے سبب ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے انھیں نہ صرف علامہ اقبال کا اعتماد حاصل تھا بلکہ وہ قائدِ اعظم کے اعتماد پر بھی پورے اترے تھے قائدِ اعظم نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا "لاکھوں لوگ ہیں جو میرے لئے سرگرمی سے کام کرتے ہیں لیکن ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم لیگیوں میں صرف ایک راغب احسن ہیں جو اسلام اور پاکستان کے لئے اصولِ محبت میں مجھ پر بیباکی کے ساتھ تنقید کرنے کی جرأت کرتے ہیں وہ تحریکِ پاکستان کے زندہ ضمیر ہیں مجھے راغب احسن پر فخر ہے (دہلی ۱۵ جون ۱۹۴۶ء)

افسوس کہ جب مولانا راغب احسن نے تین سال قبل کراچی میں وفات پائی تو انھیں ایک ایسے بھولے بسرے زمانہ کی یادگار بھی نہ سمجھا جاسکا۔ حسرت موہانی اور راغب احسن جیسے با اصول سیاستداں اب صرف مثالوں کے کام آتے ہیں اور بس اگر مولانا راغب احسن مرحوم کے ساتھ سرد مہری کے سلوک سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اب قومی خدمات کا اعتراف بھی دولت و حشمت کی بنیاد پر مضبوط تعلقاتِ عامہ کا رہینِ منت ہو کر رہ گیا ہے افسوس کہ راغب احسن مرحوم کی موت ٹریفک کے حادثات میں مرنے والے گمنام شہریوں کی موت بن کر رہ گئی۔ فرید الحق صاحب قابلِ ستائش ہیں کہ انھوں نے مولانا راغب احسن مرحوم کیلئے روا رکھی جانے والی سرد مہری کا مذاق اس طرح اڑانے کی ٹھانی کہ راغب احسن مرحوم کے نام علامہ اقبال کے گرانقدر خطوط کی یکجائی کا بیڑا اٹھایا ہر چند کہ مولانا راغب احسن مرحوم کے نام علامہ اقبال کے خطوط کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ بس معاملہ ختم ہوا لیکن پھر بھی جو کچھ ہمارے مطالعہ میں آرہا ہے وہ بسا غنیمت ہے کاش اس نوع کے مزید خطوط منظرِ عام پر آئیں اور ایک دور کی خالصتاً نجی (پرائیویٹ) مراسلت، اعلیٰ تر قومی مفاد میں سب پر عیاں ہو جاتے کاش یہ خطوط مولانا راغب احسن کی زندگی ہی میں شائع ہو جاتے لیکن مولانا اس درجہ بے لوث اور خود دار تھے کہ وہ ان خطوط کی اشاعت سے درگزر کرتے رہے۔ بہر حال مولانا راغب احسن کے خطوط ہمارے سامنے ہیں اور یہ توقع کی جانی چاہئے کہ ان خطوط کی مدد سے نہ صرف اقبال شناسی

اضافہ ہوگا بلکہ اس کتاب کی طباعت کے بعد راغب احسن شناسی کی ابتدا ہوگی۔

یہ خطوط علامہ اقبال کی زندگی کے اہم دور سے متعلق ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں ۱۹۲۷ء برصغیر میں سائمن کمیشن کی آمد ۱۹۲۸ء نہرو رپورٹ ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کی گول میز کانفرنسیں ۱۹۳۱ء آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور ۱۹۳۲ء تیسری گول میز کانفرنس (اور جاوید نامہ کی اشاعت) کے سال ہیں علامہ اقبال ۱۹۳۳ء میں فرانس، ہسپانیہ اور افغانستان کے دورے پر تشریف لے گئے تھے ۱۹۳۴ء کے اوائل (جنوری) سے علامہ اقبال کی طویل علالت کا آغاز ہوتا ہے ۱۹۳۵ء میں "بال جبریل" کی اشاعت عمل میں آئی۔ علامہ ۱۹۳۶ء میں برقی علاج کے لئے بھوپال تشریف لے جاتے ہیں ۱۹۳۵ء برصغیر کے لئے نئے آئین کی منظوری کا سال بھی ہے انہوں نے قائداعظم کے نام ایک مکتوب میں مسلم برصغیر کے سیاسی مستقبل کے بارے میں ایک لائحہ عمل پیش کیا۔ علامہ کی زندگی میں ۱۹۳۸ء آخری سال ثابت ہوا۔ مجھے توقع ہے کہ قارئین علامہ اقبال کے بارے میں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۸ء تک کے عرصہ کے بارے میں مندرجہ بالا چند معلومات کو اپنے ذہنوں میں تازہ کریں گے آخر ان خطوط سے بہرہ ور ہونے کا حق اس نسل کو بھی حاصل ہے جس کے لئے یہ معلومات کسی حد تک مفید ہو سکتی ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ یہ 'معلومات' ناکافی ہیں لیکن یہ معلومات ایک ایسا "ڈھانچہ" فراہم کرتی ہیں جس کی مدد سے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۷ء کے عرصہ پر محیط خطوط میں مرقوم بعض نکات واضح ہو جاتے ہیں علامہ اقبال اس عرصہ میں سیاسی نوعیت کے سوالات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے ۱۹۳۵ء تک کے "آئین نو" کے زمانہ کے پس منظر میں اس نوع کے سوالات خود بخود اہم ہو جاتے ہیں علامہ اقبال ۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء کے خط میں کیا خوب لکھتے ہیں کہ:

"دنیا اس وقت ایک نئی تشکیل کی محتاج ہے، جمہوریت فنا ہو رہی ہے سرمایہ داری کے خلاف ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے تہذیب و تمدن بھی ایک کشمکش میں مبتلا ہے ان حالات میں آپ کے خیال میں دنیا کی جدید تشکیل میں اسلام کیا مدد کر سکتا ہے اس مبحث پر اپنے خیالات مفصل لکھئے"

مسلمانوں کے مابین سیاسی اختلافات کے بارے میں ایک مراسلہ (۹ راگست ۱۹۳۴ء) میں لکھتے ہیں:

"میں خود ان سیاسی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نالاں ہوں اس واسطے نہیں کہ ہر موقع پر انھوں نے میری مخالفت کی ہے بلکہ اس واسطے کہ اس کیریکٹر اور سیرت کے لوگ مسلمانوں میں کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ ...."

علامہ اقبال اسلام میں ملکیت کے مضمون کی بابت ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۴ء کے مراسلے میں رقم طراز ہیں:

"اسلام کے نزدیک ملکیت صرف اللہ کی ہے مسلمان صرف اس چیز کا امین ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے میری رائے میں اگر کوئی مسلمان اپنی پرائیویٹ زمین وغیرہ کا غلط استعمال کرے تو حاکمیت اسلامیہ کا حق ہے کہ وہ اس سے باز پرس کرے"

"اسلام کے معاشی نظام کی طرف کسی نے (شاید سوائے شاہ ولی اللہؒ کے) توجہ نہیں کی اب اس زمانہ میں معاشرتی نظام اسلام کی تفصیلات کی ضرورت ہے کیونکہ لوگ موجودہ زمانے کے اقتصادی سوالات کی وجہ سے عقائد مابعد الطبیعات میں دلچسپی نہیں لیتے۔ بحیثیت مذہب کے اسلام کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کے معاشرتی نظام کی فضیلت زمانہ حال کے نظاموں پر ثابت کی جائے۔ یورپ اور اسلام کی رقابت ہمیشہ رہی ہے مگر اس سے پہلے اسکا انتہائی نقطہ حروب صلیبیہ تھا اب یورپ اور اسلام کی جنگ تلواروں کی نہیں بلکہ معاشرت کے تقاضوں کی ہوگی . . . . ."

اس مجموعے میں ایک تاریخی خط بھی شامل ہے جس میں علامہ اقبال نے "پاکستان اسکیم" کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے علامہ اقبال نے اس مراسلے میں چوہدری رحمت علی کی "پاکستان اسکیم" سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے عجیب بات ہے کہ علامہ اقبال ایک طرف ۱۹۳۰ء کے تاریخی خطبہ الٰہ آباد کی وجہ سے یاد کئے جاتے ہیں، اور دوسری طرف قائداعظم کے نام ۱۹۳۷ء کے اہم تاریخی مراسلہ کے لئے بھی لیکن علامہ اقبال ۱۹۳۴ء میں مولانا راغب احسن کے نام اپنے تاریخی مراسلے میں ایک مختلف موقف اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں بہرحال تاریخ کے طلبہ کے لئے حقائق "مقدس" ہونے چاہئیں تاہم حقائق کی تاویل آزادانہ طور پر کی جانی چاہئے۔ علامہ اقبال کے لئے ہمارے دلوں میں موجزن احترام کا تقاضا ہے کہ ہم ان کے ذہنی ارتقاء کا مکمل طور پر ساتھ دیں نامکمل دائروں کی تخلیقی طور پر تکمیل اپنی جگہ بجا مشغلہ سہی گستاخی نفسیات کا بنیادی مسئلہ یہی ہے لیکن معروضی تاریخی مطالعہ ہمارے تعصبات اور خواہشات کے لئے گنجائشیں نکالنے کے خلاف ہے علامہ اقبال کی عظمت کا تقاضا ہے کہ ہم ان کی فکر کے ارتقائی عمل کے ساتھ انصاف کریں علامہ اقبال بہر صورت، ایک عظیم مفکر ہیں لیکن وہ بھی ایک انسان تھے سیدھی اور منحنی سطریں کھینچ سکتے تھے ان کی بڑائی کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ انھوں نے واقعتاً ایک ایسا معرکہ سر کیا کہ ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم نے انھیں اسلامی دنیا کا عظیم ترین فلسفی قرار دیا۔ ڈاکٹر شریعتی کی تصنیف "ما و اقبال" فکر اقبال اور ایرانی انقلاب کے باہمی رشتوں کی کلیدی کتاب ہے اقبال اور وہ زندہ رہیں گے "اقبال جہان دیگر" بھی

(باقی صفحہ ۶۶ پر دیکھئے)

(1)

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M. A., Ph. D.
Barrister-at-Law,
Lahore.

8th Ap. 1933

I have great pleasure in testifying to the great ability of Mr. Raghib Ahsan M.A. of Calcutta. He is one of the most promising youngmen I have ever met; and if he finds an opportunity of prosecuting his studies in Sociology in Europe, I am sure, he will prove a most valuable asset to Islam & India.

Mohammad Iqbal
Bar-at-Law
Lahore

۸/اپریل ۱۹۳۳ء

میں بہت مسرت کے ساتھ جناب راغب احسن ایم۔اے۔ کلکتوی کی لیاقت تامہ کی تصدیق کرتا ہوں، وہ ان چند نوجوانوں میں سے ہیں، جنھیں میں نے حد درجہ لائق پایا ہے اور جن سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مستقبل میں اپنے جوہر دکھائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انھیں یورپ میں علم عمرانیات کے مطالعہ کا موقع مل سکے تو وہ اسلام اور ہندوستان کے لئے بہت قیمتی اثاثہ ثابت ہوں گے۔

محمد اقبال
بار ایٹ لاء
لاہور

(۲)

Dr. Sir Muhd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D.
Barrister-at-Law
Lahore

ڈیر راغب صاحب۔ السلام علیکم

۳۰ مئی [illegible]

محمد اقبال

ڈیر راغب صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ اشار کی حالت پہلے سے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ وہاں چلے گئے ہیں جہاں بھی جو خلوص و محبت کرتا تھے ہے زندہ، اور اپنی تمام قوتوں کو اسلام کی خدمت و حفاظت کے لئے وقف کردو اس وقت یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ کیونکہ اکابر امت یعنی علماء و صوفیا کا پیشہ اب وہ نہیں جو ان کے اسلاف کا تھا نئے تعلیم یافتہ گروہ کے نزدیک منافقت سب سے بڑا اصول زندگی کا ہے اور وہ تمام معاملات میں اسی پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ ذلیل ہوں گے اور حق آخر کار غالب آئے گا۔ اگر میری زندگی میں نہیں تو آپ کی زندگی میں غالب آئے گا۔ میں ایک تجویز پر مدت سے غور کر رہا ہوں۔ ممکن ہے اب وہ تجویز عملی صورت اختیار کرلے۔ اگر ایسا ہوا تو آپکو بھی اطلاع ہو جائے گی۔

میمورنڈم تیار کرکے بھیج دیا گیا ہے۔ میرے انگلستان نہ جانے کے متعلق آپ کا خیال صحیح نہیں۔ یہ بات زبانی کہوں گا خط میں لکھنے کی نہیں۔ ممکن ہے میں جولائی کے آخر میں یورپ کا سفر کروں کیا عجب کہ آپ بھی ساتھ ہوں۔ اگر امسال نہ گیا تو آئندہ سال انشاء اللہ العزیز۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب — نہ میکدے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

محمد اقبال

(۳۰)

(۲)

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A. Ph.D.
Barrister-at-Law.
Lahore.

۱۲ نومبر ۳۳ء

ڈیر راغب صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے، جس کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔ میں گزشتہ اتوار کابل سے براہ غزنی و قندھار واپس آیا۔ سوموار سے بخار میں مبتلا ہوں۔ امیر نادر شاہ کی شہادت ایک ناقابل برداشت صدمہ میرے لئے ہے اور یقیناً ساری دنیائے اسلام کے لئے۔ یہ بڑا دیندار اور خدا پرست بادشاہ تھا۔ کابل میں اس کے متعلق ایسی حکایات مشہور ہیں کہ ان کو سن کر صدیقؓ اور فاروقؓ یاد آتے ہیں۔ جمعہ کی نماز ان کے ساتھ میں نے کابل کی جامع مسجد میں ادا کی۔ ان کے محل میں ایک روز عصر کی نماز ان کی امامت میں ادا کی۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

مجھے امید ہے کہ افغانستان دوبارہ کسی انقلاب میں مبتلا نہ ہوگا۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں بادشاہ کی شہادت پرائیویٹ عداوت کا نتیجہ ہے، اور غالباً جنرل غلام نبی خان کے قتل سے اس کا تعلق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ لوگ امان اللہ خان کی واپسی چاہتے ہیں غلط ہے۔ واللہ اعلم۔ دوران قیام افغانستان میں وہاں کے نوجوانوں میں اسلامی خیالات اور افکار کی اچھی تخم ریزی ہوئی۔ زیادہ گفتگو اس امر کے متعلق پھر کبھی ہوگی۔

محمد اقبال

۱۲ نومبر ۳۳ء

ڈیر راغب صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے، جس کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔ میں گزشتہ اتوار کابل سے براہ غزنی و قندھار واپس آیا۔ سوموار سے بخار میں مبتلا ہوں۔ امیر نادر شاہ کی شہادت ایک ناقابل برداشت صدمہ میرے لئے ہے اور یقیناً ساری دنیائے اسلام کے لئے۔ یہ بڑا دیندار اور خدا پرست بادشاہ تھا۔ کابل میں اس کے متعلق ایسی حکایات مشہور ہیں کہ ان کو سن کر صدیقؓ اور فاروقؓ یاد آتے ہیں۔ جمعہ کی نماز ان کے ساتھ میں نے کابل کی جامع مسجد میں ادا کی۔ ان کے محل میں ایک روز عصر کی نماز ان کی امامت میں ادا کی۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

مجھے امید ہے کہ افغانستان دوبارہ کسی انقلاب میں مبتلا نہ ہوگا۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں بادشاہ کی شہادت پرائیویٹ عداوت کا نتیجہ ہے، اور غالباً جنرل غلام نبی خان کے قتل سے اس کا تعلق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ لوگ امان اللہ خان کی واپسی چاہتے ہیں غلط ہے۔ واللہ اعلم۔ دوران قیام افغانستان میں وہاں کے نوجوانوں میں اسلامی خیالات اور افکار کی اچھی تخم ریزی ہوئی۔ زیادہ گفتگو اس امر کے متعلق پھر کبھی ہوگی۔

محمد اقبال

(۳۲) (۵)

لاہور ۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۴ء

ڈیئر راغب صاحب ۔ السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے ۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ الٰہ آباد میں ہیں اور اپنے ایک خط کے جواب کا جو میں نے آپ کے نام الٰہ آباد کے پتے پر لکھا تھا منتظر تھا ۔ آج آپ کے خط سے آپ کے مصائب کا حال معلوم کر کے بہت صدمہ ہوا ۔ اس سے پہلے اخباروں میں بھی حالات دیکھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قہر الٰہی کی مفصل داستان ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ۔ خدا تعالیٰ فضل کرے اور آپ کو اور تمام مصیبت زدوں کو اطمینان عطا فرمائے ۔

لاہور میں بھی ۱۵ جنوری کو زلزلہ آیا تھا مگر اس قدر خفیف تھا کہ بہت سے لوگوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوا ۔

اے فلک چشم تو بے باک و بنا خوف ہنوز
می شناسم کہ تماشائے دگر می خواہی

جس کتاب کا اشتہار آپ نے انقلاب میں دیکھا ہے اس کا حال مجھے معلوم نہیں ۔ ایک صاحب میاں اکبر علی وکیل ہیں انہوں نے ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے جس میں کوئی خاص بات نہیں ۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ اس کتاب کا نام کیا ہے ۔ بہرحال اگر آپ کو اکبر علی صاحب کی کتاب مطلوب ہو تو میں بھیج دوں گا ۔ غالباً اس کی ایک کاپی مصنف نے مجھے بھیجی تھی ۔

میں آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوں ۔ سورۃ الرحمٰن کا ورد ہر روز کرنا چاہیے ۔ گھر کے سب لوگ پڑھا کریں تو اور بھی بہتر ۔

محمد اقبال

Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

(۴)

لاہور ۲۰ رمئی ۱۹۳۴ء

ڈیئر راغب صاحب ۔ السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے ۔ میں ابھی تک گلے کی تکلیف میں مبتلا ہوں ۔ میں آپ کے لئے دُعا کروں گا ۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں خدا کے قریب ہیں ۔ اپنی اپنی مصیبتوں کی وجہ سے ۔ اس واسطے اُمید ہے کہ دونوں کی دُعا قبول ہوگی ۔ یہاں کے احباب ایک اُردو روزنامہ نکالنے کی فکر میں ہیں ۔ کیا آپ اس اخبار کی ادارت کی ذمہ داری لے سکیں گے ۔ اگر ایسا ہو تو جلد مطلع کیجئے ۔ نیز یہ بھی لکھئے کہ کم سے کم کس قدر تنخواہ آپ کو قبول ہوگی جو لوگ اخبار کے لئے روپیہ دیں گے ان کا مقصد تجارتی نہیں ہے بلکہ اگر اخبار میں نفع ہوا تو وہ سب کا سب اخبار ہی کے لئے ہوگا اور اس سے اسی کو تقویت دی جائے گی ۔ نفع کی صورت میں ایڈیٹوریل سٹاف کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا ۔ بہرحال آپ کا جو خیال ہو اس سے جلد آگاہ کیجئے ۔ ایران نہ جا سکوں گا ۔ ستمبر و اکتوبر کے مہینوں میں رہوڈز لیکچر لکھنے میں مصروفیت ہوگی ۔

محمد اقبال

Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D.
Barrister-at-Law
Lahore

6th Mar. 1934

My dear Raghib,

I think it best to write to Fazl Rahimtoola & I will do so. But you shd. ask Mr. Shafee Daudi to write a letter & send it on to me. It shd. be signed by both of us.

I hope you will send me your detailed views about Democracy & Capitalism as soon as possible.

I am enclosing two copies of Edward Thompson's (a well-known literary man in England) review of my book. It is interesting in many ways, & you may like to publish it in your paper. Please send the other copy to the Star of India (Calcutta).

Please also note that the author of this review confuses my scheme with 'Pakistan'. I propose to create a Muslim Province within the Indian federation; the 'Pakistan' scheme proposes a separate federation of Muslim Provinces in the North West of India outside the Indian federation

and directly related to England.
Do not fail to point it out in your introductory comment & draw the attention of the Editor of the Star of India also to this point.

Hoping you are well
Yours Sincerely
Muhammad Iqbal

۶ مارچ ۱۹۳۴ء

عزیزمن راغب،

میرا خیال ہے کہ یہ بات زیادہ مناسب ہوگی کہ میں فاضل رحمت اللہ سے سلسلہ جنبانی کروں اور یہی کروں گا۔ لیکن آپ شفیع داؤدی صاحب سے فرمائیں کہ وہ اپنا خط تجویز فرما کے مجھے ارسال کر دیں اور خط پر ہم دونوں کے دستخط ہوں گے۔

مجھے توقع ہے کہ آپ مجھے جمہوریت اور آئین کے بارے میں اپنے خیالات سے جلد از جلد آگاہ کریں گے۔

میں اس خط کے ساتھ اپنی کتاب کے بارے میں ایڈورڈ تھامسن کا تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ ایڈورڈ تھامسن انگلستان کی مشہور ادبی شخصیت ہیں۔ یہ تبصرہ مختلف وجوہات کی بنا پر دلچسپ ہے اور شاید یہ تبصرہ آپ کے جریدہ میں اشاعت کے لئے مناسب ہی رہے، دوسری کاپی "اسٹار آف انڈیا" (کلکتہ) کو روانہ کر دیجیے۔

براہ کرم نوٹ فرما لیں کہ اس تبصرہ کا مصنف اس مغالطہ کا شکار ہے کہ جیسے میری تجویز "پاکستان کی اسکیم" سے تعلق رکھتی ہے۔

جہاں تک میری[1] تجویز کا تعلق ہے، وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے جبکہ پاکستان اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علیحدہ ہو اور انگلستان سے براہ راست وابستہ ہو۔

آپ اپنے تعارفی کلمات میں اس نکتہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ "اسٹار آف انڈیا" کے مدیر کی توجہ بھی اس نکتہ کی جانب منعطف کروا دیجیے گا۔

خدا کرے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

---

[1] علامہ اقبالؒ کی مراد خطبہ الہ آباد (۱۹۳۰ء) میں پیش کردہ اسکیم سے ہے۔

(A) Private and Confidential

Lahore

13th August, 1937,

Dear Raghib Sahib,

Your scheme of Arab Federation seems to be good. But in a matter like this mere book knowledge is of very little help. A very accurate knowledge of ~~accounts~~ local conditions based on personal observation and a correct estimate of facts and figures is absolutely necessary. An outsider cannot go beyond making only a general suggestion such as Federation of Arab States. This suggestion is already before the Arabs. How it should be worked out in detail is a matter which, as I have said above, requires accurate knowledge of actual facts.

I do not know whether your paper has noticed a statement recently issued by Sir Mohammad Yakoob. It is a very unwise statement especially at the present moment and must be severely criticised by Muslim Press. Sir Mohammad Yakoob advises Moslems to ~~make~~ settle matters with non-Muslims in their individual provinces without any reference to the position of Muslims as an All India minority.

Such an advice coming from a Muslim at a time when the Congress provinces are wholly ruled and directed by the Congress policy is most mischievous, and

is suspected an inspired one. People here generally fear that in view of rapidly changing world situation and the possibilities of a war either in Europe or in the Far East, the government of India's attitude towards the Communal Award is also changing. In order to please the Hindus they may get the Communal Award abrogated by their Muslim agents in the various Muslim provinces. It is unfortunate that there is no Muslim politician in India whose eyes have a correct vision of future of Islam and Muslims in India. It is necessary for the Muslim press to ruthlessly to unmask ~~unravel~~ both the Congress and the ~~Muslims~~ Govt of India which is now seeking an alliance with its old enemy.

Yours sincerely

Mohammad Iqbal

ذاتی اور خفیہ

لاہور — ۱۳ اگست

عزیزم راغب،

عرب فیڈریشن کی بابت آپ کی تجویز اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن ایسے معاملات میں "کتابی علم" پر انحصار چنداں مددگار ثابت نہیں ہو پاتا۔ مقامی صورت حال کی درست معلومات بہم ہونے کے ساتھ ساتھ حقائق کا صحیح جائزہ اور ذاتی مشاہدہ ضروری ہوتا ہے۔

عرب ریاستوں کے وفاق کی بابت تجویز ایک ایسا شخص ہی پیش کر سکتا ہے جو عرب دنیا کے لئے "بیرونی" یا اجنبی ہو۔ اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ امر از بس ضروری ہے کہ حقیقی حالات کا صحیح جائزہ لیا جائے۔ مجھے علم نہیں ہے کہ آپ کے جریدہ نے اس بیان کا نوٹس بھی لیا ہے یا نہیں۔

موجودہ حالات کے پیش نظر یہ بہت غیر دانشمندانہ بیان ہے اور مسلم پریس اسے آڑے ہاتھوں لے گا۔ سر محمد یعقوب نے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے جو مشورہ دیا ہے اس کی حیثیت کسی ایسے مشورہ جیسی نہیں ہے جو من حیث القوم ہندوستان کی مسلم اقلیت کے لئے دیا جا سکتا ہو۔ یہ مشورہ ایسے وقت دیا گیا ہے جب کانگریس راج کے صوبوں میں کانگریسی پالیسی کی عمل داری ہے۔ یہ مشورہ خاصہ شرارت آمیز ہے اور اغلباً کسی کے ایما پر دیا گیا ہے۔

یہاں یہ خیال عام ہو چلا ہے کہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے نتیجہ میں یورپ یا مشرق بعید میں جنگ ناگزیر ہو چکی ہے اور ایسی صورت میں کمیونل ایوارڈ کے بارے میں حکومت ہندوستان کا رویہ بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ حکومت ہندوستان ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر اپنے مسلمان ایجنٹوں کے ذریعہ مختلف مسلم صوبوں میں کمیونل ایوارڈ منسوخ کروا سکتی ہے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہندوستان میں فی الوقت ایک بھی ایسا مسلم سیاستداں موجود نہیں ہے جس کی آنکھیں اسلام کے مستقبل اور ہندوستان کے مسلمانوں پر مرکوز ہوں۔ مسلم پریس کے لئے ضروری ہو چلا ہے کہ وہ کانگریس کے ساتھ حکومت ہندوستان کو بھی بے جگری کے ساتھ بے نقاب کرے۔ چونکہ حکومت اپنے پرانے دشمن کے ساتھ اتحاد کے لئے کوشاں ہیں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

(۹)

لاہور ۔ ۲۰ جون ۳۶ء

ڈیئر راغب احسن

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ جو کچھ آپ نے لکھا ہے سب کچھ میرے خیال میں ہے بلکہ ایک بیان لکھا ہوا موجود ہے جسے میں اخبار میں بھیجنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے معرض التوا میں ڈال دیا کہ یہ بیان زیادہ تفصیل کے ساتھ پارلیمنٹری بورڈ کی طرف سے شائع ہو۔ مسٹر جناح غالباً کل آئیں گے۔ آپ نے اچھا کیا جو ان کو خط لکھ دیا۔ امید ہے کہ ان کو آپ کا خط مل گیا ہوگا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ آپ کے خط میں کوئی ٹکٹ ملفوف نہ تھی۔

محمد اقبال

Dr. Zakir Husain Library
J.M.I. New Delhi

(۱۰)

لاہور

۲۵ جولائی ۱۹۳۷ء

ڈیئر راغب صاحب

آپ کے جملہ خطوط مل گئے ہیں۔ لاہور کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلسہ کل شام یعنی سوموار کی شام کو ہونے والا ہے۔ افسوس کہ میں علالت کی وجہ سے جلسہ میں حاضر نہیں ہو سکوں گا مگر میری طرف سے ایک بیان اس جلسہ میں پڑھا جائے گا جس کی ایک نقل آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اپنے اخبار میں اس بیان کو شائع کر سکتے ہیں۔ لندن کے بعض اکابر کو بھی میں نے پرائیویٹ خطوط مسئلہ فلسطین کے متعلق لکھے ہیں۔ والسلام

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

محمد اقبال

ممتاز راشد

١

ہلکا کبھی پڑے گا اُبھر جائے گا کبھی
تو وہ نشہ نہیں جو اُتر جائے گا کبھی

میں اُس کا آئینہ ہوں تو دیکھے گا وہ ضرور
وہ میرا عکس ہے تو سنور جائے گا کبھی

جینا پڑے گا اپنی ہی خاموشیوں کے ساتھ
وہ شخص تو صدا ہے بکھر جائے گا کبھی

کتنا حسین ہے یہ مری تشنگی کا خواب
دریا جو بہہ رہا ہے ٹھہر جائے گا کبھی

راشد کبھی نہ ختم ہو کوششوں کی آرزو
پھر بھی یہ وقت گذر جائے گا کبھی

٢

بن نہیں پایا جو میرا ہم سفر کہنا اُسے
میں نہیں آؤں گا اب کے لوٹ کر کہنا اُسے

عمر جیسے راستے کا بوجھ بن کر رہ گئی
کس قدر مہنگا پڑا ہے یہ سفر کہنا اُسے

سارے منظر بہہ چکے ہیں وقت کے سیلاب میں
مٹ گیا جو کچھ لکھا تھا ریت پر کہنا اُسے

چل دیا وہ صرف آنکھوں میں اندھیرے چھوڑ کر
جاتے جاتے لے گیا میری نظر کہنا اُسے

تیز ہو رفتار تو مٹتے کہاں ہیں فاصلے
منزلیں ملتی نہیں ہر موڑ پر کہنا اُسے

پہلے اپنے ساتھ چلنے پر اُسے راضی کرو
پھر ہواؤں میں چراغوں کا سفر کہنا اُسے

جب وہ بچھڑا تھا تو خالی ہاتھ کب رخصت کیا
دے گیا ہے شعر کہنے کا ہنر کہنا اُسے

٣

جنگل، آنسو، دریا اُن آنکھوں کے نام
میرے سفر کا قصہ اُن آنکھوں کے نام

میری نیندیں جن آنکھوں نے چھینی ہیں
میرا ہر اک سپنا اُن آنکھوں کے نام

گیتوں کی ہر چھایا اُن پلکوں جیسی
غزلوں کا ہر چہرہ اُن آنکھوں کے نام

کچھ بھی کہو لگتا ہے بات ادھوری ہے
شعر کہے ہیں کیا کیا اُن آنکھوں کے نام

آج سے اُن کے سارے منظر میرے ہیں
آج سے ہر اک رشتہ اُن آنکھوں کے نام

دنیا کا جو حصہ ہے دنیا جانے
میرا ہر اک حصہ اُن آنکھوں کے نام

٢٨ - اے - پریم بائی ٹرسٹ بلڈنگ ، درگاہ اسٹریٹ ، ماہم ، بمبئی ١٦

عروجی لمحے

احمد یوسف ● کمرشیل ایمپوریم، صدرگلی، پٹنہ (بہار)

اس وقت اس وین کا ملنا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

میں ٹی وی پر فیچر فلم ادھوری چھوڑ کر اٹھ آیا تھا۔ میرے عزیز نے بڑی مشکلوں سے مجھے جانے کی اجازت دی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ ابھی پونے آٹھ بجے ہیں، تمہارے یہاں سے بڑا میدان کوئی آدھ گھنٹے کی راہ ہے، گویا میں سوا آٹھ بجے تک ٹمپو اسٹینڈ پہنچوں گا، اور وہ بھی اس صورت میں کہ رکشا فوراً مل جائے۔ اگر وقت ساڑھے آٹھ سے ذرا بھی آگے بڑھا تو مجھو بڑا میدان حشر کا میدان بن جائے گا۔

میرے عزیز کے پاس اپنا اسکوٹر تھا، اس لئے وہ اس مسئلے کو پورے طور پر اپنی گرفت میں لینے سے قاصر رہا۔ وہ تو بس اتنا ہی جانتا تھا کہ شہر میں ٹمپو کی کمی نہیں، اور کبھی کبھی تو شاہراہوں پران کا وہ تانتا بندھتا ہے کہ لگتا ہے، وہ سب ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں، یا جیسے کوئی فوج میدان چھوڑ کر بھاگ رہی ہے۔

لیکن ہوا وہی جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں بڑے میدان پہنچا تو ½ ۸ بج چکے تھے اور ٹمپو کے لئے بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔

برسات کے دن تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے تیز بارش ہوئی تھی، اور اب بھی ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اسٹینڈ پر ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ میرا پاؤں بھی کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔

مجھے صدر گنج جانا تھا، جس کے بعد چوک سرائے گنج کا اسٹاپ آتا ہے۔ اسٹینڈ پر بے شمار لوگ پورب کی طرف نظر جمائے کھڑے تھے، اور جو بھی ٹمپو ادھر سے آتا دکھائی دیتا، اس کی طرف دوڑنے کو تیار ہو جاتے، اور جونہی وہ رکتا، درجنوں سواریاں اس کی جان سے لپٹ جاتیں۔ اس وقت ٹمپو ڈرائیور کئی طرح کے جھوٹ بولتا۔ کچھ سواریوں سے کہتا کہ انجن گرم ہو گیا ہے، اس لئے ٹمپو ابھی نہیں جائے گا۔ کچھ کو کہتا کہ اب گاڑی بند کرنا ہے، اور کچھ کو یہ کہہ کر ٹالتا کہ گاڑی ہسپتال سے آگے نہیں جائے گی، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہاں ٹمپو کا انتظار کرنے والوں میں بیشتر کی منزل چوک سرائے گنج ہے۔

ایسا ہی ایک ٹمپو یہاں اسٹینڈ پر کھڑا تھا۔ ڈرائیور نے سیٹ الٹ دی تھی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ انجن آرام کر رہا ہے) لیکن اس پر بھی سواریاں بھری تھیں۔ میں جب پہنچا تو پیچھے ایک سیٹ خالی تھی، بیٹھنا چاہا تو ٹمپو والے نے اوپر کی ترکیبوں میں سے وہ ترکیب استعمال کی، جس کا سیریل نمبر مجھے یاد نہیں، لیکن وہ یہ تھی کہ ٹمپو ہسپتال کے آگے نہیں جائے گا۔ حیرت تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو کچھ ہی لمحے پہلے بھاگ دوڑ کے بعد اس میں ایک سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہوں گے، بار بار ڈرائیور کے کہے ہوئے پر صاد بنا رہے تھے۔ انہیں اب قطعی یاد نہیں رہا تھا کہ زیادہ نہیں بس دس پانچ منٹ پہلے وہ بھی وہی غم جھیل چکے ہیں، جو اب میں جھیل رہا ہوں۔

اتنے میں ایک ٹمپو پورب سے آتا دکھائی دیا۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑنے کو تیار ہوئے، لیکن وہ فرّاٹے بھرتا ہوا آگے کو نکل گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے سوچا اب وہ کہیں سناٹے میں رکے گا، وہاں سواریوں کو اتارے گا، اور جو بھی قسمت کے تیز، چوک سرائے گنج جانے والے اس مقام پر ملیں گے، وہ انہیں بٹھا لے گا۔ اور اگر کچھ جگہیں خالی رہ گئیں تو پھر آہستہ چلاتے ہوئے ٹمپو کو اسٹینڈ تک لائے گا، اس انداز میں کہ انجن بند نہیں ہوگا، اور تب دھکم پیل میں جو لوگ ٹمپو میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، انہیں لیکر تیزی سے پورب کی طرف نکل جائے گا

دراصل کبھی تو بازار خریدار کا ہوتا ہے اور کبھی دوکاندار کا ــــــ ٹمپو کے بازار کا بھی یہی حال ہے۔ ایک وقت وہ ہوتا ہے کہ ٹمپو والوں کو سواری کی تلاش ہوتی ہے اور سواری نہیں ملتی، اور جو سواری ملتی ہے وہ اچھی سے اچھی جگہ کی طلبگار ہوتی ہے، اور دوسرا وقت وہ ہوتا ہے جب سواریاں خراب سے خراب جگہ کے لئے بھاگ دوڑ کرتی ہیں، لیکن وہ جگہ بھی انہیں نہیں ملتی ــــــ تو یہ لمحہ ٹمپو والوں کا تھا، وہ اس وقت آسمان پر تھے اور ہم سب زمین پر۔

تب ہی ایک منی بس آئی، جو ایک طول طویل راستہ طے کر کے اسٹیشن روڈ سے چوک سرائے گنج کی طرف جانے والی تھی۔ لوگوں نے آسمان کا رنگ دیکھا، پھر اپنے اپنے دلوں میں کچھ حساب کیا۔

"مجھے فلاں مقام تک جانا ہے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ یہ گاڑی فلاں مقام پر رُکے گی۔ وہاں سے میری منزل......"

ایک بار پھر وہ آسمان کا رنگ دیکھتے۔ اس بار کے دیکھنے میں یا تو اوپر والے سے چپکے چپکے مخاطبت کا انداز ہوتا "روک دے اس بارش کو!" یا ممکن ہے بارش ہی سے سوال کر رہے ہوں "آخر کب تک رُکنے کا ارادہ ہے؟"

لیکن وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو کنڈکٹر کے اس اعلان کے باوجود کہ گاڑی اسٹیشن روڈ سے جائے گی، بلا سوچے سمجھے بس میں گھس گئے۔ یہ انداز بے خطر کود جانے والوں کا تھا۔

ٹمپو آتے رہے اور لوگوں کی بھاگ دوڑ جاری رہی۔ میں نے بھی دو ایک بار بھیڑ کے ساتھ دوڑ میں حصّہ لیا، لیکن ہر بار نتیجہ صفر نکلا، اور تب میں نے فیصلہ کیا کہ گھنٹے دو گھنٹے یہیں انتظار کیا جائے کہ اس کے بعد تو یہ بھیڑ چھٹ جائے گی اور پھر ٹمپو والے خود میری خوشامد کریں گے۔

اتنے ہی میں کہیں سے یہ وین نمودار ہوئی، بالکل ہی بدرنگ سی، بدگوارہ سی۔ اور جونہی یہ بس اسٹینڈ پر رُکی اس کے کنڈکٹر نے بآواز بلند اعلان کیا ــــــ "سرائے گنج چوک کے دو دو روپئے"

ہر چند کہ اس وین کے ساتھ پچاس پیسے فاضل کی علت لگی ہوئی تھی، پھر بھی خاصے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ میں بھی لائن میں لگ گیا۔

سب سے آگے والے شخص نے پوچھا ــــــ "ہسپتال کا کتنا لوگے؟"

اس پر کنڈکٹر نے زور سے کہا "ہر جگہ کے دو دو روپئے۔ ہر جگہ کے دو دو روپیے"

دریافت کرنے والے نے کنڈکٹر سے کوئی بحث نہیں کی، اور چپکے سے وین میں جا بیٹھا۔

تب پندرہ سولہ مسافروں والی وین میں کنڈکٹر نے پچیس چھبیس افراد کو بھر لیا۔ یعنی سولہ افراد اگر وین پر سوار ہیں، تو دس افراد ان کے سر پر، بالکل یہی کیفیت تھی۔ اور ایسے میں کنڈکٹر نے کوئی شاعری بھی نہیں کی۔ یعنی یہ کہ دلّی میں اگر کنڈکٹر منی بس میں بہت زیادہ مسافروں کو بھر لیتا ہے تو ان کے اس طرح کے احتجاج پر کہ ــــــ

"اور کتنی سواریاں لوگے؟ اب جگہ کہاں ہے؟"

وہ جواب دیتا ہے۔ "جگہ تو دل میں ہونی چاہئے!"

یہ کنڈکٹر ایسا خوش مذاق بھی نہیں تھا۔

اب وین چلنے کو تیار تھی، اور کنڈکٹر دیکھ رہا تھا کہ دو ایک سواریاں اور بھی لی جا سکتی ہیں یا نہیں؟ اس نے گنا تو کل چھبیس افراد ہوتے۔ پھر کنڈکٹر نے گیٹ سے لگی ہوئی سیٹ کے مسافروں کو کہا۔ "ذرا آپ لوگ دب جائیں تو ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ نکل جائے!"

اس پر وہ بگڑ گئے۔ "کہاں جگہ ہے، بکواس کر رہے ہو!"

تب اس نے کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر سے جو وین میں سب سے پہلے داخل ہوا تھا، کہا ــــــ "بھائی صاحب ذرا آپ ہی دب جائیں!"

یہ سُن کر وہ بھڑک اٹھا ــــــ "پہچانتے نہیں ہو۔ پسنجر سمجھتے ہو؟"

یہ دو چھوٹے چھوٹے بول، جو خاصے تہہ دار تھے بےحد کارگر ثابت ہوئے۔

یعنی میں کیا ہوں مجھے پہچانو ــــــ میں تو پسنجر (یعنی عام پسنجر) سے بالاتر کوئی شئے ہوں۔ جب 'غنڈے' میں کوئی حسن نہیں رہا تو وہ 'ہیرو' ہو گیا اور پھر ایک ایسا دور آیا کہ 'ہیرو' نے اپنے سارے رنگ 'رنگدار' کو سونپ دیئے۔ تو یہ شخص 'رنگدار' تھا۔

کنڈکٹر دب سا گیا، اور دوبارہ اس نے کچھ نہیں کہا۔

تب ایک شور اٹھا ـــــ 'سخت بدبو ہے'۔

پھر ایک طرف گھٹن کی شکایت ہونے لگی۔

"کھڑکی کھولو ـــــ کھڑکی کھولو"

باہر اب بھی بوندیں پڑ رہی تھیں، پھر بھی گھٹن اور بدبو کے سبب کھڑکی کے شیشے کسی قدر کھسکا دیے گئے۔ تب تازہ ہوا کا ایک جھونکا آیا، جو پانی کی کچھ بوندیں بھی اپنے ساتھ لایا، لیکن اس گھٹن اور تعفن کے مقابلے میں یہ مصیبت کم تھی۔

کسی نے کہا ـــــ "کوئی شخص اپنے جوتوں میں غلاظت لگا لایا ہے"

تب ہی سبھوں نے بیک زبان کہا ـــــ "گاڑی کیوں نہیں چلاتے ـــــ گاڑی چلاؤ"

اس پر ڈرائیور نے کنڈکٹر کو آواز دی ـــــ "ابے دینو کیا کہتا ہے"

"ہاں اسٹارٹ کرو استاد"

وین چلی تو سبھوں نے اطمینان کی سانس لی۔ جو کھڑے تھے وہ بھی یہ سوچ کر خوش ہوئے کہ اب جلد ہی یہ مصیبت ختم ہونے والی ہے۔

اندر روشنی نہیں، لیکن باہر سے جو تھوڑا سا اُجالا آرہا ہے، اس میں لوگوں کے خد و خال نظر آرہے ہیں۔

کنڈکٹر نے ایک بار پھر اعلان کیا۔

"گاڑی سراتے گنج چوک تک جاتے گی۔ کرایہ دو روپئے ہوگا۔ جو سواریاں بیچ میں اتریں گی، انہیں بھی دو روپئے دینا ہوگا"

اس پر سواریوں نے کچھ نہیں کہا۔ اور کنڈکٹر نے اس بار بھی یہی سمجھا کہ لوگوں کو اس کی شرطیں منظور ہیں۔ جب پہلی بار اس نے یہ اعلان کیا تھا، تو اس وقت بھی لوگوں کی خاموشی سے اس نے یہی نتیجہ نکالا تھا۔

باہر اب بھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔

ایک طرف دو ایک افراد آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں۔

"جس کو موقع ملا اس نے کاٹا"

"....اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر...."

"کوئی سرا تو درست ہوتا"

وین کی رفتار تیز ہے۔ دس پندرہ منٹ گزر چکے ہیں۔ لوگوں کی بے اطمینانی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہے، کیونکہ اب انہیں اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ جلد ہی وہ اپنی اپنی منزلوں پر پہنچ جائیں گے۔

اتنے میں ایک مسافر نے کنڈکٹر سے گاڑی روکنے کو کہا۔ گاڑی رکی تو کھڑے ہوئے مسافروں نے نیچے اتر کر اس کے لئے راستہ صاف کیا۔

نیچے اتر کر اس شخص نے کنڈکٹر کو ایک روپیہ دیا، تو اس نے کہا "ایک روپیہ اور دیجئے"

مسافر زور سے بولا ـــــ "پسنجر سمجھتے ہو، ایک روپیہ یہاں کا کرایہ ہے، وہ دے رہا ہوں۔

تب وین کے مسافروں کو پتہ چلا کہ یہ وہی شخص ہے جو گیٹ کے قریب والی سیٹ پر کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا۔

کنڈکٹر نے ڈرائیور کو آواز دی ـــــ "استاد یہ بابو جی صرف ایک روپیہ دے رہے ہیں"

اس پر ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے انہیں مخاطب کیا۔

"ارے بابو جی دو روپئے پر بات طے ہوئی ہے، جھنجھٹ نہ کیجئے"

مسافر پوری طاقت سے دہاڑا ـــــ "تم لوگ مجھے پسنجر سمجھتے ہو، دھاندلی کرتے ہو"

تب ہی گاڑی میں بیٹھے مسافروں نے ہنگامہ شروع کر دیا ـــــ "ارے گاڑی اسٹارٹ کرو، سخت گرمی ہے"

باہر کنڈکٹر کہہ رہا تھا ـــــ "تو آپ روپئے نہیں دیں گے بابو جی"
لیکن وہ شخص ایک ہی جملہ رٹ رہا تھا۔
"پسنجر سمجھتے ہو؟ یہاں تک کا یہی کرایہ ہے"
اندر مسافر شور مچا رہے ہیں ـــــ "گاڑی چلاؤ، بڑی گھٹن ہے"
ڈرائیور نے کنڈکٹر کو آواز دی۔
"دینو بیٹا چھوڑ دے۔ لعنت ہے ہم پر سو بار لعنت ہے"
گاڑی چل کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور کہہ رہا ہے ـــــ "اب یہ دھندا چھوڑ، کوئی عزّت نہیں ہے اس میں"
ادھر گاڑی میں بیٹھے کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔
"انصاف کی بات ہے"
"روز کا کام ہے"
"آخر فاضل کیوں؟"
شاید یہ گفتگو ڈرائیور اور کنڈکٹر تک نہیں پہنچی۔

کچھ دور آگے چل کر پھر دو مسافروں نے گاڑی رکوائی اور انہوں نے بھی ایک ایک روپیہ نکال کر کنڈکٹر کو دئے۔ تو کنڈکٹر نے کہا "دو دو روپئے دیجئے، بات طے ہو چکی ہے"

اس پر وہ لوگ کنڈکٹر سے الجھ پڑے "کیا ایک گاڑی میں دو ریٹ رکھو گے؟ ابھی سبھوں کے سامنے وہ آدمی ایک روپیہ دے گیا ہے"
کنڈکٹر نے کہا ـــــ "اس کی بات چھوڑ دیجئے، آپ اپنی بات کیجئے"
لیکن وہ لوگ اڑ گئے۔

تب ڈرائیور نے کنڈکٹر کو آواز دی "دینو، چھوڑ بیٹا چھوڑ۔ مقدّر ہی خراب ہے۔ ہم لوگ نہ آتے تو ابھی اسٹینڈ پر کھڑے ٹاپلے کھاتے رہتے"
پھر گاڑی چل پڑی۔ ڈرائیور کنڈکٹر سے کہہ رہا تھا۔
"ہم پہ خدا کی مار ہے۔ یہاں عزّت کی دو روٹی کمانا بہت مشکل ہے۔ چوری چکاری کرو اور خوش رہو"

اب گاڑی ڈیڑھ روپئے کرائے والے علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ ایک صاحب اترے تو انھوں نے کنڈکٹر کو ڈیڑھ روپئے دیے پر کنڈکٹر نے ان سے پچاس پیسے اور مانگے۔

وہ بپھر گئے ـــــ "ہم ہی ایک گدھے رہ گئے ہیں کہ فاضل پیسے دیں سب پسنجر سے ایک طرح کا سلوک کرو"
ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔ غصّے میں بھرا وہ بول رہا ہے۔
"ختم کرو اب اس کام کو۔ کوئی اور کام دیکھیں۔ یہاں تو ایک سے ایک رنگدار کا سامنا ہے"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد ڈرائیور پھر چھڑ گیا ـــــ "دینو لعنت ہے ہم پر سو بار لعنت ہے۔ کل سے گاڑی نہ نکالنا۔ بھیک مانگیں گے سسرے"

لیکن استاد تم نے تو کل بھی یہی بات کہی تھی، اور میں جانتا ہوں کہ کل بھی یہی بات کہو گے"۔ دینو کی زبان سے سچّی بات نکل گئی۔
تب ہی میرا اسٹاپ آگیا۔ میں نے جیب سے دو روپئے نکال کر کنڈکٹر کو دیے تو اس نے پچاس پیسے واپس کرتے ہوئے کہا۔
"بابو جی جب سبھی ڈیڑھ روپئے اور ڈیڑھ روپئے دے رہے ہیں تو آپ سے فاضل کیوں لیں؟"
ادھر ڈرائیور اپنی سیٹ پر مستقل بڑبڑا رہا ہے۔
"لعنت ہے ہم پر، سو بار لعنت ہے"

○○

ظفر ہاشمی

آزاد غزل

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi
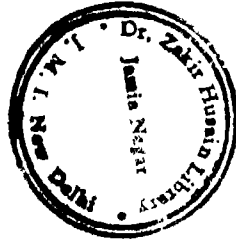
بدلیاں ، پُروائیاں ، انگڑائیاں ،
دوریاں ، بے تابیاں ، بے چینیاں ، چنگاریاں ،
لمس ، خوشبو ، رات ، سناٹا ، ہوا ، موسم ، بہار ،
قہقہے ، موسیقیاں ، شہنائیاں ،
باغ ، مینا ، پھول ، پھل ، گل رنگ ، شام ،
پیڑ ، پودے ، کونپلیں ، ہریالیاں ، شادابیاں ،
میز ، پردے ، کرسیاں ، یادیں ، کلنڈر ، آرزو ،
چٹکیاں ، سرگوشیاں ، تنہائیاں ،
ایک گلشن ، ایک موسم ، ایک رنگ ،
غنچہ ، غنچہ ، شاخ ، شاخ ، نیلی ، پیلی ، تتلیاں ،
جستجو ، خاموشیاں ، گہرائیاں ، لہریں ، سمندر ، وسعتیں ،
پیار ، ارماں ، ولولے ، طوفان ، ساحل ، کشتیاں ،
قرب ، پہلو ، کہکشاں ، جگنو ، ظفر ،
پُھلجھڑی ، قوس و قزح ، رنگینیاں ، ہتابیاں ،

● ای - ۲۰ ، دھتکڑی ورکرس فلیٹ ، پی اور بسٹو پور ، جمشید پور

سلیم شہزاد

غزلیہ

کوئی رہ گزر پتھروں میں
کہ درپیش ہے پھر سفر پتھروں میں

ندی ، پیڑ ، گھر ، لوگ ، سب سنگ صورت
ہیں پتھر کے سب بحر و بر پتھروں میں

ہے سنگاب میں چاند کا عکس پتھر
رواں سنگ کشتی ، نہ جانے کدھر پتھروں میں

نہیں سنگ پیکر فقط برگ و بار و گل اس کے
ہوا سنگ سایہ شجر پتھروں میں

وہیں تو مقید ہے شہزادیٔ ہفت گل ، شہر افسوں کے ظلمات میں ہے
جو گھر پتھروں میں

نہ جانے ہے کس بد دعا کا سیہ سنگ آسیب ان پر
کہ پتھر ہوئے لوگ سب سر بہ سر پتھروں میں

ہے اپنی ہی آواز کے دائروں کی اسیری
صدا بے اثر پتھروں میں ۔

● ۳۲۳ ، منگل وار وارڈ ، مالیگاؤں ، ناسک ،

تم کو دیکھیں .....

ہرچرن چاولہ ● MOLLEFARET-50 A OSLO 7, NORWAY

ہم نے شاعر کے پاکستان میں اردو ادب نمبر کا اعلان کیا تھا جس سے ہند و پاک ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی اردو برادری نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا تھا۔ اعلان کے بعد سے مسلسل اصرار اور تقاضے بڑھ رہے تھے کہ اس نمبر کو جلد شائع ہونا چاہئے۔ لیکن جیسا کہ شاعر اپنے خصوصی نمبروں کی ایک شاندار تاریخی روایت رکھتا ہے اور تمام سابقہ خصوصی نمبر اجتہاد و اختراع کے بے مثال رنگوں سے سجے ہوئے ہیں لہٰذا "پاکستان میں اردو ادب نمبر" کی ترتیب و تہذیب کے دوران اس نمبر کا خاکہ بنتے بنتے ایک اہم پروجکٹ کی صورت اختیار کر گیا۔ اس نمبر کو بہر حال شائع ہونا ہے مگر کب یہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس نمبر کے لئے موصولہ تخلیقات میں بہ طورِ خاص "سفرنامے" بھی شامل تھے۔ نمبر کی اشاعت میں تاخیر کے سبب ہم بعض اہم سفرناموں کا سلسلہ اس شمارے سے شروع کر رہے ہیں تاکہ یہ سفرنامے مزید تاخیر کی نذر نہ ہو سکیں۔ قارئین کی دلچسپی بنی رہے اور وہ فن کار جنہوں نے سفرنامہ لکھنے کا وعدہ کیا ہوا ہے، انھیں تحریک و ترغیب مل سکے۔ ادبی رسائل میں سفرناموں کی تجدید اور سفرناموں پر مشتمل کتابیں شائع ہونے لگیں ——— (ادارہ)

○

یہ تصویر بہت تازہ ہے۔ اتنی کہ لگتا ہے جیسے کل ہی میں نے اسے دواؤں کے محلول سے نکال کر گیلا گیلا یادوں کے البم میں چسپاں کیا ہے۔ پاکستان ایمبیسی نئی دہلی میں منیر احمد شیخ، جو بہت اچھے کہانی کار بھی ہیں، کی الوداعی پارٹی میں ملک رام۔ بلراج کومل۔ جوگندر پال۔ قاضی سلیم۔ گلزار [illegible]شی دہلوی۔ یونس دہلوی اور ایمبیسی کے دوسرے لوگ اور ان کے دوستوں سے ملاقاتیں۔ دوسرے دن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ہاں [illegible]ت میں محمود ہاشمی۔ شمس الرحمان فاروقی۔ قاضی سلیم۔ امرتا پریتم اور پاکستان کے مشہور و معروف شاعر اور نیشنل بنک آف پاکستان [illegible]اچی کے Executive vice President جمیل الدین عالی سے بھینٹ۔

"عالی صاحب۔ چاولہ صاحب آپ کا پاکستان دیکھنا چاہتے ہیں۔" نارنگ صاحب ہمیں ملاتے ہوئے کہتے ہیں۔

"دیکھیں۔ ضرور دیکھیں۔ کون منع کرتا ہے صاحب۔ وہ جواب دیتے ہیں پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہتے ہیں۔ "جب پروگرام بن جائے تو مجھے اطلاع کر دیجئے گا۔"

"اتنا آسان ہے؟" میں سوچتا ہوں مگر دوسرے دن سب کچھ میری سوچوں سے ہزار گنا آسان ہو جاتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ صرف لاہور دیکھو۔

"میں لاہور دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو نا۔ کون منع کرتا ہے۔" میرے پرانے دوست اور کرم فرما سی۔ ایل۔ بترہ چیف ڈائرکٹر گرینڈلے اکیڈیلکز، نئی دہلی کہتے ہیں۔

"پیسے کی تنگی اور ٹکٹ کی غیر موجودگی روکتی ہے۔" میں کہتا ہوں۔

"لنگڑا بہانہ ہے۔" وہ گھنٹی بجاتے ہیں اور اپنے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ مسٹر سیٹھی کو بلواتے ہیں۔ "کل ہی چاولہ صاحب کے لئے ایئر ٹکٹ کا بندوبست کر دو۔ دہلی۔ لاہور۔ دہلی۔" وہ حکم دیتے ہیں۔ بترہ برادرز پانچ بھائی ہیں۔ پیسے کے بھی شاہ ہیں اور دل کے بھی بادشاہ۔ بڑے سی۔ ایل۔ بترہ ہیں اور سب سے چھوٹے انل بترہ۔ سی۔ ایل۔ بترہ میرے ہم عمر ہوں گے مگر میری دوستی انل سے لگی تھی۔ کوئی بیس سال پہلے۔ اسی ناطے سی۔ ایل۔ صاحب مجھے چھوٹے بھائی کا سا پیار دیتے ہیں۔

دوسرے دن گیارہ بجے جوں ہی میں آصف علی روڈ پر گرینڈ لے الیکٹریکلز کے دفتر میں داخل ہوتا ہوں۔ مسٹر سیٹھی میرے ہاتھ میں PIA کا واپسی ٹکٹ تھما دیتے ہیں۔ "پرسوں ہفتہ کی فلائٹ ہے۔ واپسی اگلے ہفتہ کو۔" وہ بتاتے ہیں۔

چل پہلوان۔ اب اڑنے والی جادوئی دری تو ہاتھ آچکی ہے۔ دیر کس بات کی۔ میں تیاریاں شروع کر دیتا ہوں۔ دوپہر کو عالی صاحب کے ہوٹل 'ہنس'، نئی دہلی کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔ جواب ملتا ہے۔ "وہ تو کہیں گئے ہیں۔ کوئی پیغام ؟"

" ان سے کہئے۔ میں مسمی ہر چرن چاولہ کل PIA کی فلائٹ سے لاہور پہنچ رہا ہوں۔" میں پیغام نوٹ کرواتا ہوں۔

تیرہ مارچ ۱۹۸۲ء سارا دن تیاریوں میں گزر جاتا ہے۔ شام کو پھر فون ملاتا ہوں۔ جواب ملتا ہے۔ عالی صاحب تو ہوٹل چھوڑ کر چلے گئے۔ سوچا رہ جاتا ہوں میرا پیغام انھیں ملا یا نہیں۔ میں لاہور کس کے پاس جاؤں گا۔ وہاں مجھے کون جانتا ہے مگر میں پوری طرح تیار ہوں۔ کچھ لوگوں کے پتے ضرور میرے پاس ہیں مگر اطلاع کسی کو نہیں دے پایا۔ اتنے تھوڑے وقت میں کوئی بھی نہ دے پاتا۔ سوچتا ہوں چھلانگ تو لگاؤں کا ہی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ایک چھلانگ ۱۹۴۷ء میں بھی سیدھی دس منزلہ بلڈنگ سے لگائی تھی۔ ارادہ خودکشی کا تھا مگر نیچے ریت سے بھرا ٹرک گزر رہا تھا میں سیدھا اس میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اس ٹرک نے نہ صرف میری ٹانگوں کو ٹوٹنے سے بچایا تھا بلکہ ٹھیک جگہ بھی پہنچا دیا تھا اور میں اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ناروے کی دھرتی پر نہ صرف ٹک گیا تھا بلکہ پھل پھول بھی رہا تھا۔

تین بجے لاہور پہنچوں گا۔ بہت دن باقی ہوگا۔ انتظار حسین کو فون کروں گا۔ نہیں ملے گا۔ محمد طفیل ایڈیٹر 'نقوش' تو ملیں گے۔ عالی صاحب نے شاید کوئی بندوبست کیا ہوگا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لاہور میں ہوں گے۔ ہر سال باقاعدگی سے راکھی بھیجنے والی میری بہن تسنیم تو رہتی ہی لاہور میں ہیں۔ (راکھی ہندوؤں کا ایک تہوار ہے اس دن بہن بھائیوں کی کلائی پر راکھی باندھتی ہیں اور بھائی بہنوں کی طرف سے اپنے فرائض نبھانے کا وعدہ دہراتے ہیں۔ ایک ہندو رانی نے ہمایوں کو راکھی بھیج کر اپنی ریاست پر چڑھ آنے والے دشمن کے خلاف مدد مانگی تھی اور ہمایوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی بہن کی مدد کو دوڑ پڑا تھا۔ یہ تاریخی سچائی ہے مگر یہ کہانی تاریخ کے صفحات پر کہیں نہیں ملتی اور بھی ایسی کئی اچھی باتوں سے تاریخ کے صفحات کورے ہیں) ابھی ایک ماہ پہلے ہی تو تسنیم کا خط مجھے ناروے میں ملا تھا۔ وہ اور اس کی دونوں بچیاں مجھے اور میں انھیں دیکھنے کو ترستے ہیں۔ میں یہ سب کچھ سوچ کر شیر ہو گیا ہوں جیسے گھر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں مگر لاؤڈ سپیکر پر اناؤنسمنٹ مجھے پھر شیر سے بکری بنا دیتی ہے۔ "PIA کی فلائٹ ابھی لاہور سے نہیں چلی۔ قریب پانچ گھنٹے لیٹ ہو جائے گی۔"

PIA کی خوبصورت گڑیا سی ایئر ہوسٹس ہیں لاؤنج کے اسٹال سے کچھ کھا پی لینے کی دعوت دے رہی ہے۔

" اب کیا ہوگا۔" سوچوں کی مکھیاں میرے ذہن پر ہر طرف سے حملہ کر دیتی ہیں۔ شام آٹھ نو بجے پہنچا تو کس کو فون کروں گا۔ کون ملے گا۔ کوئی ملے گا بھی یا نہیں۔ گھبراہٹ چاروں طرف سے مجھے برچھے چبھو رہی ہیں اور میں ڈٹا ہوا ہوں۔ اب تو آگے ہی بڑھوں گا۔ پیچھے ہٹنا مرد کا کام نہیں۔

لاہور کا ہوائی اڈہ۔ شام کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت۔ کسٹم پر لمبی سی لائن میں میں کتنا اکیلا ہوں۔ ہر کسی کو کوئی نہ کوئی Receive کرنے آیا ہوا ہے یا ہر کوئی اپنے دیس آیا ہے مگر کیسا مذاق ہے کہ میں اس دھرتی کی مٹی سے جنما یہاں پردیسی ہوں اور کتنا اکیلا اور اداس۔ ایک جنٹل مین لائن میں کھڑے کچھ لوگوں سے آہستہ آہستہ کچھ پوچھ رہے ہیں۔ شاید ہندوستان سے آنے والا کوئی ان کا واقف یا دوست نہیں آیا۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں پوچھتے شاید وہ مجھے میرے مہندی لگے سنہرے بالوں اور سرخ و سفید رنگ کے ساتھ یورپین سمجھتے ہیں۔ لوگ دس دس بیس بیس روپے کی انگریزی ہیر ڈائی سے بال کالے کر کے ہندوستانی یا پاکستانی رہتے ہیں۔ میں اپنے بالوں پر چار آنے کی ہندوستانی مہندی لگا کر انگریز ہو گیا ہوں۔ تھوڑی دور جا کر وہ صاحب لوٹ آتے ہیں۔ "آپ ہر چرن چاولہ تو نہیں ؟" ان کا چھوٹا سا سوال میرے سر سے فکر کی چار منوں

گٹھری اتار لیتا ہے۔ کیونکہ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میں ہی ہرچرن چاولہ ہوں۔

" میں نیشنل بینک آف پاکستان۔ برانچ ایر پورٹ، لاہور کا منیجر سلیم مخدوم ہوں۔ عالی صاحب کراچی جانے سے پہلے میری ڈیوٹی لگا گئے ہیں کہ آپ کو Receive کرلوں اور آپ کے رہنے کا بندوبست کر دوں۔ یہ مسٹر محمد یونس ہیں میرے اسسٹنٹ"۔ میں دونوں سے ہاتھ ملاتا ہوں۔

پھر بندوبست یہ ہوتا ہے کہ مجھے انڈس ہوٹل، مال روڈ۔ لاہور کے کمرہ نمبر ۲۰۹ پر چھوڑنے کے لئے ٹیکسی کے تیز رفتار پہیے لاہور کی سڑکوں کو مختصر کر رہے ہیں۔

چودہ مارچ ۱۹۸۲ء دوسرے دن صبح قریبی مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر قرآن خوانی کی مدھر اور میٹھی آواز سے میری جاگ کھلتی ہے۔ حاجاتِ ضروری۔ نہانا دھونا اور ناشتہ سے فارغ ہو کر میں انتظار حسین۔ تسنیم بہن۔ محمد طفیل کو فون ملاتا ہوں مگر فاصلے کم نہیں ہوتے۔ مجبوراً میں تیار ہو کر باہر مال روڈ پر نکل آتا ہوں۔ لاہور بہت بڑا شہر ہے مگر لاہور اتنا چھوٹا شہر کہ میں اسے صرف انڈس ہوٹل اور فیروز سنز کے ڈیڑھ سو گز فاصلے سے زیادہ نہیں جانتا۔ میں صرف یہی چند گز کا فاصلہ ہی طے کر پاتا ہوں۔ یہاں سے ہماری اوسلو کی لائبریری سو کتابیں منگواتی ہے تو صرف تیس چالیس ہی مل سکتی رہی ہیں مگر یہاں ان کے ہاں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ مسٹر خورشید السلام اور مرزا عبدالحمید بیگ کی مدد سے میں کچھ نئی فہرستیں تیار کرتا ہوں مگر میں اس مقصد کے لئے تو یہاں آیا نہیں۔ میں پھر سارے فون ٹرائی کرتا ہوں مگر ٹیلی فون دل شکنی کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو سرگودھا ٹیلی فون کرتا ہوں تو ان کا نوکر جواب دیتا ہے۔" وہ فارم پر گئے ہوئے ہیں"۔

" کب آئیں گے ؟"

" دس بارہ دن بعد"۔

" فارم پر ڈاکٹر صاحب کا کوئی فون ؟"

" جی نہیں ہے"۔

میں مسٹر خورشید السلام سے کہتا ہوں "کیا آپ مجھے میانوالی کا ویزا دلوا سکتے ہیں ؟"

" کوشش کرتا ہوں"۔ وہ لاہور کے بارسوخ آدمی ہیں۔ اپنی سی ہر کوشش کر دیکھتے ہیں پھر کہتے ہیں۔ "مشکل ہے"۔

" تو میرا یہاں ایک ہفتہ ٹھہرنا بھی بہت مشکل ہے۔ آپ پہلی فلائٹ سے میری واپسی بک کروا دیجئے"۔ میں اپنا PIA کا واپسی ٹکٹ انکے سامنے دھر دیتا ہوں۔

" آپ مایوس نہ ہوں"۔ وہ کہتے ہیں۔ "شام کو پاک ٹی ہاؤس میں انتظار حسین اور دوسرے ادبا و شعرا۔ سب آپ کو مل جائیں گے"۔

" ٹھیک ہے مگر آپ میری واپسی تو بک کروا ہی دیجئے اور پہلی فلائٹ سے"۔

دوپہر کو انڈین ایئر لائنز کی بدھ وار کی پرواز سے میری واپسی بک ہو جاتی ہے۔ چل خسرو گھر آپنے شام بھئی چودیس۔

مسٹر خورشید السلام اپنی کار پر مجھے پاک ٹی ہاؤس چھوڑ گئے ہیں۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف ایک میز کے ارد گرد چار دل ریش کچھ دوسرے سننے والوں کے ساتھ ایک دائرہ بنائے بیٹھے ہیں۔ جن میں انتظار حسین کو پہچاننا ذرا بھی مشکل نہیں۔ ان کا تازہ فوٹو دو ماہی الفاظ" علی گڑھ کے سرورق پر کچھ ہی ماہ پہلے دیکھ چکا ہوں۔ میں ان کی طرف بڑھتا ہوں۔" آپ انتظار حسین ہیں نا ؟"

" وہ حیران نظروں سے میری جانب دیکھتے ہیں۔ شاید انہوں نے میرا فوٹو کہیں نہیں دیکھا۔" میں ہرچرن چاولہ ...... ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ....."

" اوہ۔ آیئے آیئے۔ وہ مجھے پاس والی کرسی پر بٹھا لیتے ہیں۔ کسی کو یقین نہیں آرہا ہے کہ میں ہرچرن چاولہ ہی ہوں۔ اسکول میں مجھے مسلمان کو کر پنڈت دیدپال پیریڈ میں اندر نہیں آنے دیتا تھا۔ تقسیم کے وقت مجھے کسی نے بھی ہندو نہیں سمجھا اور میں بازاروں، گلیوں اور گاڑیوں ندناتا پھرا۔ ۱۹۶۲ء میں سری نگر (کشمیر) گیا تو وہاں مجھے میری بیوی کا کشمیری بولنے فرینڈ سمجھا گیا۔ ناروے آیا تو نارویجین ہو گیا۔ ہائے چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب۔

آہستہ آہستہ شک اب یقین میں بدلنے لگا ہے تو پاک ٹی ہاؤس میں میں ہی بحث کا موضوع بن گیا ہوں۔ میرے لئے چائے آگئی ہے۔ کوئی

پوچھ رہا ہے "چاولہ صاحب۔ کیسے آنا ہوا ؟"

• وطن کی محبت کھینچ لائی ہے۔ مرنے سے پہلے ایک بار میانوالی دیکھنے کی تمنا ہے مگر...." میں نے میانوالی کا ویزا پاس نہ ہونے کی ساری کہانی سنا دی ہے۔

• یہ میانوالی کے اجمل نیازی ہیں" ایک دبلے پتلے مگر خوبصورت نقوش کے نوجوان مجھ سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ میری آنکھیں یقین نہیں کر رہی ہیں کہ ان کے سامنے کوئی میانوالی کا جوان کھڑا ہے۔ میانوالی کے جوان کو دیکھنے سے تو پگڑی گرا کرتی تھی۔ میری آنکھوں کے شک کو پڑھ کے وہ میانوالی زبان میں مجھ سے پوچھ رہے ہیں "چاولہ صاحب۔ تُساں میانوالی دے ہو؟"

چار لفظوں کا یہ فقرہ خالص پنجابی بھی ہو سکتا ہے مگر اسے اگر کوئی میانوالی کا شخص بولے تو اس کا لہجہ جُدا ہوگا۔ نیازی کے لہجے میں وہی الگ بات ہے جو پنجابی اور سرائیکی کو جدا کرتی ہے۔

کچھ مزید باتیں۔ کچھ سوالات۔ کچھ نظریں۔

یہ انور سدید ہیں۔ یہ الطاف قریشی ہیں۔ یہ سعادت سعید ہیں۔ یہ حسن رضوی۔

انور سدید کے مجھ سے عشق کے قصے مجھ تک ناروے میں بھی پہنچتے رہے ہیں۔ اب ان کا محبوب ان کے سامنے بیٹھا ہے اور وہ سوچ رہے ہیں کہ وہ خواب تو نہیں دیکھ رہے۔ یہی حال میرا بھی ہے۔

اصغر ندیم سید نے مجھے دو خط لکھے تھے اور مجھ سے دو ہی جواب پائے تھے۔ دو خطوں نے ہمیں دو دو ہزار میل قریب کر دیا مگر باقی فاصلہ ناقابلِ عبور لگتا تھا مگر اب ہم آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ "میں اصغر ندیم سید ہوں"

میں ہاتھ بڑھاتا ہوں مگر آنکھیں نایقینی کے اندھے شیشے سے انہیں دیکھ رہی ہیں۔ کیا سچ مچ میں اصغر ندیم سید سے ہاتھ ملا رہا ہوں۔ شاید وہ بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہیں۔

کچھ کھسر پھسر۔ کچھ باتیں۔ کچھ جُڑے ہوئے سُر

• چاولہ صاحب۔ کل اسی وقت آپ یہیں تشریف لا سکتے ہیں؟ ہم چائنیز میں آپ کے ساتھ ایک شام رکھنا چاہتے ہیں" سعادت سعید۔ حسن رضوی۔ اجمل نیازی اور اصغر ندیم سید مجھ سے کہہ رہے ہیں "ویسے آپ ٹھہرے کہاں ہیں۔ ہم خود ہی آپ کو لے آئیں گے"

• نہیں۔ میں خود ہی آ جاؤں گا۔ پاس ہی تو ہے۔ انڈس ہوٹل" میں کہتا ہوں۔

اجمل نیازی کہتے ہیں۔ میں صبح آپ کو ملنے آؤں گا" "خوش آمدید" میں انہیں اپنا کمرہ نمبر بتاتا ہوں۔

سب باہر نکل آتے ہیں۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہیں اور کل ملنے کا وعدہ کر کے اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں مگر انتظار حسین میرے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ مجھے اِدھر ہی جانا ہے۔ وہ سب کا حال پوچھتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ بلراج کومل۔ جوگندر پال۔ بلراج مینرا۔ رام لعل۔ میں صرف رام لعل نارنگ صاحب اور جوگندر پال سے ہی مل کر آ سکا ہوں مگر میں انہیں سب کی خیریت کا حال دے رہا ہوں۔ انہوں نے کون سی تفتیش کرنی ہے۔ مجھے یہ جھوٹ ضرور بولنا چاہیئے۔

پندرہ مارچ ۸۲ء لاؤڈ سپیکر پر وہی قرآن خوانی کی میٹھی مدھر آواز۔ وہی معمول۔ وہی صبح کا ٹوسٹ، مکھن، جام اور چائے کا ناشتہ۔

حسبِ وعدہ پورے نو بجے میں اجمل نیازی کو اپنی کھڑکی سے نیچے مال روڈ پر آتے اور ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھتا ہوں اور ناشتہ سے ہاتھ روک دروازے پر جا کھڑا ہوتا ہوں۔

وہ بڑی مشکل سے چائے کا آدھا پیالہ قبول کرتے ہیں شاید آپسی باتوں کے درمیان انہیں کسی چیز کا دخل پسند نہیں۔ پوچھ رہے ہیں۔ حسب نسب شہر میانوالی میں ہمارا محلہ؟ میں انہیں سب کچھ بتا رہا ہوں۔ یہ بھی کہ مجھے اپنے بچپن کا وہ واقعہ ابھی تک یاد ہے جب داؤد خیل میں ایک مولوی صاحب آئے تھے اور مسجد میں روزانہ ان کے وعظ ہوا کرتے تھے۔ عین مندر میں بھی ان ہی دنوں ایک سادھو مہاراج آئے تھے جو ہر روز کتھا سناتے تھے۔ پھر گلیوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ پھیریاں نکلتی تھیں۔ ہندو کیرتن گاتے تھے اور مسلمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ..... قیت اللہ گاتے پھرتے تھے۔ ہم دونوں بھائی بھی گھر میں گاتے تھے۔ میں گاتا تھا.... لل اللہ اور میرے بڑے بھائی جواب میں گاتے تھے.... رسول اللہ۔ اور نیت اللہ

ہم اکٹھے مل کر گاتے تھے۔ یہ شاید اب بھی غلط ہو۔ ٹھیک الفاظ کچھ اور ہوں۔ تب تو ہم بہت ہی الفاظ کو گڈمڈ کر کے بے معنی بنا دیتے تھے۔ محض آواز کو ہی پکڑ پاتے تھے مگر آواز بھی ہماری اتنی کن سری تھی کہ ایک دن والد صاحب نے ہمیں ڈانٹ کر کہا۔ "بے وقوفو۔ تمہاری آواز پھٹے ڈھول کی سی ہے تو کم از کم چپ تو رہ سکتے ہو"۔ مگر کیا ہم چپ ہو گئے ـــــــ نہیں۔

داؤ دفین کے اپنے اسکول ماسٹر محمد خان کو میں نے اپنے باپ سے بھی زیادہ پیار دیا۔ جب میرے والد مرے تھے تو میں اتنا نہیں رویا تھا مگر جب میرے بھائی صاحب نے ماسٹر محمد خان کی موت کی خبر....

یہ بتاتے ہوئے میرا گلا بھر آیا ہے اور میں دہاڑیں مار کر رونے لگا ہوں۔ میں آنکھیں دھونے اندر باتھ روم کے واش بیسن کی طرف بڑھ گیا ہوں۔ آنکھیں دھو کر باہر آیا ہوں مگر رُلاہٹ نے پھر مجھے بے حال کر دیا ہے۔ ایک بار پھر اٹھ کر مجھے اندر جانا پڑا ہے۔ واپس آیا ہوں تو اجمل نیازی کہہ رہے ہیں۔ "اچھا میں اب آپ سے دوسری باتیں کروں گا"۔

اور انھوں نے اب اپنی باتوں کا رُخ میری افسانہ نگاری کی طرف موڑ دیا ہے ـــــــ میں نے انھیں اپنے دونوں افسانوی مجموعے 'عکس آئینے کے' اور 'ریت سمندر اور جھاگ' کے علاوہ ناول 'درندے' کی ایک ایک کاپی پیش کی ہے۔

" مجھے اپنی بہن سے ملنے جانا ہے۔ وہ علامہ اقبال روڈ پر رہتی ہیں" میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

" میں پہنچا آتا ہوں" وہ میرے ساتھ ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے ہوئے کہتے ہیں۔ شاید وہ لاہور میں رہنے والی میری بہن کو دیکھنا چاہتے ہیں ـــــــ تھوڑی سی پریشانی اور تلاش کے بعد ہمارا تھری وہیلر آخر ہمیں ڈاکٹر بٹ کی کوٹھی کے سامنے پہنچا دیتا ہے۔ تسنیم بٹ، دہلی میں رہنے والی دونوں بہنوں کی طرح بڑی باقاعدگی سے مجھے پچھلے چھ سال سے راکھی بھیج رہی ہیں۔ دہلی والی بہنوں کو اس عرصے میں میں چھ بار مل چکا ہوں۔ لاہور سے میں ہر لحاظ سے خالی ہاتھ لوٹ آؤں مجھے کوئی دُکھ نہ ہو گا مگر تسنیم کو نہ ملوں تو میری آتما تمام عمر مجھے کوستی رہے گی۔ میں بہنیں بنانے کے معاملے میں بہت کنجوس رہا ہوں۔ نبھانے میں بہت فراخ دل۔ اسی لئے ماجائی دو بہنوں کے علاوہ ایک ہی بہن بنا سکا ہوں۔ تسنیم۔

تسنیم سے میری باقاعدہ خط و کتابت رہتی ہے۔ فوٹوز کا بھی آدان پردان ہوا ہے مگر مل ہم پہلی بار رہے ہیں۔ تسنیم نے آدھے منٹ سے بھی کم عرصے میں مجھے پہچان لیا ہے اور بھائی صاحب، کہہ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے ایک بزرگ کی طرح اس کے سر پہ ہاتھ رکھا ہے۔ اجمل نیازی حیرانی سے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ تسنیم اپنی ننھی منی بچی کو بتا رہی ہیں۔ یہ تمہارے نار دے والے چاچا ماما جی ہیں۔ ننھی پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھتی ہے۔ میں اسے بلاتا ہوں تو بلا جھجک میری گود میں آ جاتی ہے۔ بچے کتنے من کے سچے ہوتے ہیں۔ دراج درلی کے سپیشلسٹ کو تیا ساڑھی ایمپوریم نئی دہلی سے میں نے ایک سلکن ساڑھی اور ایک فراک خریدا تھا۔ میں وہ تسنیم کو دیتا ہوں۔ فراک دیکھ کر وہ کہتی ہیں۔ یہ تو بڑی پر فٹ آئے گا۔ تھوڑی سی دیر میں ایک ٹرے میں وہ چائے، نمکین اور فروٹ کی پلیٹیں بھر کر لے آتی ہیں۔ اجمل نیازی میرے ساتھ چائے پی کر اور اجازت لے کر چلے جاتے ہیں۔ شاید وہ جان گئے ہیں کہ میں یہاں سے جلدی نہیں اٹھ پاؤں گا۔ تسنیم کہہ رہی ہیں۔ بڑی اسکول گئی ہوئی ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد آئے گی تو آپ سے مل کر اور فراک پہن کر بہت خوش ہو گی۔ "آپ امی جی سے ملئے تب تک میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں ـــــــ وہ مجھے باہر لے جاتی ہیں۔ پچھلے آنگن میں کنی کنی میٹھی میٹھی دھوپ میں ان کی ساس لیٹی دھوپ سینک رہی ہیں۔ میں ان سے باتیں کرنے لگتا ہوں۔ انھوں نے ہندوؤں کو برت کر دیکھا ہے۔ ان کی پڑوسی رہی ہیں۔ ان کے پاس بے انتہا واقعات اور حالات کے قصے ہیں۔ لاہور کی دھوپ کسی سچے ہمدرد کی طرح علیل زندگی کی دکھ بھری جگہوں پر ٹکوری کرتی محسوس ہو رہی ہے۔

فراک تو بڑی کو مل جائے گا۔ ننھی کو کیا ملا۔ میں سوچتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں۔ "ٹافیاں کھاؤ گی"

وہ میرے پاس آ کھڑی ہوتی ہے۔ میں اسے اٹھا لیتا ہوں اور باہر گلی میں نکل آتا ہوں۔ اسے ٹافیوں کی دوکان ضرور معلوم ہو گی۔ بچے اور ٹافی کی دوستی بہت پرانی ہے ـــــــ دیکھتا ہوں تسنیم بہن کے دیور بھی ساتھ آ رہے ہیں۔ وہ مجھے سید ھا ٹافیوں کی دوکان پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ اقبال روڈ کے پتری ٹریفک کی وجہ سے شاید ابھی ننھی کو ٹافیوں کی دوکان کی راہ معلوم نہیں۔ ویسے بھی وہ ابھی بہت ہی پیاری ننھی سی، گڑیا سی بچی ہے۔

باہر گلی میں کوئی بھی سبزی والا گزرتا ہے تو تسنیم بھاگ کر کوئی نہ کوئی چیز خرید لاتی ہیں شاید وہ ہر بار محسوس کرتی ہیں کہ کچھ اور زیادہ ہونا چاہئے۔ کہیں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ میں انہیں بہت عرصہ پہلے، جب میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پاکستان جا سکوں گا۔ کبھی لکھا تھا کہ میں پورو بکشیر رہا ہوں ——
—— تسنیم بار بار کہتی ہیں کہ ہوٹل سے اپنا سامان اٹھا لاؤں اور آرام سے ان کے ہاں ٹھہروں گھر میں بڑے پیار اور خلوص سے منع کر دیتا ہوں۔ وہ جگہ سنٹرل ہونے سے مجھے وہیں زیادہ سہولت ہے۔ میں کہتا ہوں۔ اسی لئے آج ہی سب کچھ وہ مجھے کھلا لینا چاہتی ہیں —— میں بھی جانتا ہوں آج کا آدھے سے زیادہ دن میرا یہیں گزرے گا۔

میں کچن میں ان کے ساتھ آ بیٹھا ہوں۔ وہ ناروے میں رہنے والے اپنے بھائی کے متعلق پوچھتی ہیں۔ میں اس کے حالات خیریت سے انھیں مطلع کرتا ہوں۔

• بھائی صاحب۔ آپ کا خط تو باقاعدہ آتا رہتا ہے مگر ان کے خطوں کو بہت ترسنا پڑتا ہے۔" وہ کہتی ہیں۔" اللہ انہیں جہاں رکھے خوش رکھے۔"

• انھیں پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ ہر وقت کتابوں سے گھرے رہتے ہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں۔ ملنسار اور اچھے دوست۔" میں کہتا ہوں۔

• ننھی کیسی ہے؟" وہ اپنی مہینہ بھر پہلے جنمی بھتیجی کے متعلق پوچھتی ہیں اور بھابھی؟"

• بالکل ٹھیک۔ ہم مل آئے ہیں۔ بھیا بہت خوش ہیں۔ بچی بہت پیاری ہے۔"

کھانا بہت لذیذ ہے۔ گوشت مچھلی کے بغیر ایک مسلم گھر کا کھانا بھی اتنا لذیذ ہو سکتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے مگر یہ سچ ہے کہ تسنیم کو کھانا بنانے میں ملکہ حاصل ہے۔ آپ پوچھیں گے۔ میں کیسے جانتا ہوں اور میں آپ کو ایک ہی سوال سے لاجواب کر ڈالوں گا۔ ماں اور بہن کے ہاتھ کا کھانا کبھی کسی کو لذیذ نہ لگا ہو۔ ایسی کوئی مثال ہے آپ کے پاس۔

بڑی آ گئی ہے۔ اس نے فوراً مجھے پہچان لیا ہے۔" ماما جی۔"

فراک بالکل اس پر فِٹ آئی ہے۔ وہ بہت خوش ہے۔ میں تسنیم بہن۔ بچیوں، ان کے انکل اور تسنیم کی ساس کے کچھ تو ڑے اتارتا ہوں۔ تسنیم کہہ رہی ہیں۔" بھائی صاحب۔ آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔"

آرام کہاں۔ آنکھیں بند کرنے کو جی ہی نہیں مانتا۔ دل چاہتا ہے۔ دیکھتا رہوں۔ بچیوں کو۔ بہن کو۔ کاش ان چار دنوں میں راتوں کو کہیں دور بھگا سکتا یا اُلّو، جیسے ناروے میں عالم فاضل پرندہ مانا جاتا ہے اور لوگ اس کی تصویریں یا بُت لائبریریوں اور اپنے پڑھنے کے کمروں میں لگاتے ہیں، کی طرح راتوں کو بھی آنکھیں کھلی رکھ کے سب کچھ دیکھ سکتا تو لاہور کو دیکھنے کے لئے میرے پاس ڈبل وقت ہوتا۔

سہ پہر کے چار بج رہے ہیں۔ اب مجھے جانا چاہئے۔ تھوڑا سا وقت فیروز سنز پر اور کتابیں دیکھنے کے بعد، مجھے شام کو پاک ٹی ہاؤس بھی پہنچنا ہے۔ میں بہن اور اس کی ساس سے اجازت طلب کرتا ہوں۔ تسنیم میرے اتنے جلدی جانے پر خوش نہیں معلوم ہوتیں۔ مجبوراً کہتی ہیں۔ آپ کو بھائی صاحب چھوڑ آئیں گے۔ ان کے چہرے سے بڑی آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے کہ انہیں میرا اتنی جلدی چلے جانا منظور نہیں —— ان کے دیور اپنی سوزوکی پر مجھے مال روڈ پر فیروز سنز کے شوروم پر چھوڑ جاتے ہیں۔

شام میں پاک ٹی ہاؤس تھری وہیلر پر پہنچتا ہوں۔ ڈرائیور کو کرایہ ادا کرنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو پرس غائب ہے۔ گم نہیں ہوا۔ آتے ہوئے ہوٹل میں سوٹ بدلا تھا۔ کوٹ کی جیب میں رہ گیا۔ میں ڈرائیور کو روک کر اندر جاتا ہوں۔ آٹھ دس لوگ کھڑے ہیں۔ مجھے سب جانتے ہیں (میں بھی ادیبوں کے چہرے پہچانتا ہوں) مگر میں ان میں سے کسی سے واقف نہیں۔" کیا بات ہے چاولہ صاحب؟"

ان میں سے ایک میری پریشانی تاڑ کر اور مجھے بار بار باہر دیکھتے دیکھ کر سوال کرتے ہیں۔

" پیسے —— پیسے بھول آیا ہوں۔ باہر ڈرائیور کو کرایہ ادا کرنا ہے۔" دل میں شرمندہ بھی ہوں۔ کوئی کیا سوچے گا مگر کوئی بھی ایسا نہیں سوچتا جیسا میں سوچ رہا ہوں۔

" آپ فکر مت کیجئے۔ آپ اب ہمارے ساتھ ہیں۔ چلئے ہم پیسے ادا کر دیتے ہیں۔ آپ کو اور بھی ضرورت ہو تو لے لیجئے۔"

انڈس ہوٹل سے پاک ٹی ہاؤس قدموں کا ہی تو فاصلہ ہے۔ تھوڑے سے پیسے بنتے ہیں جو وہ بخوشی ادا کر دیتے ہیں مگر میں —— مگر میں جانے کیا سوچے جا رہا ہوں۔ ہاتھ پیسے لینا یا مانگنا میرے لئے کتنا مشکل کام رہا ہے۔ اب میں وہ واپس کیسے ادا کروں گا۔ یہ میں کیوں سوچ رہا ہوں"

کیا سوچ رہا ہوں۔

چائنیز لنچ ہوم پاس ہی ہے۔ جہاں میرے اعزاز میں حلقۂ اربابِ ذوق پاکستان شاخ لاہور کا خصوصی اجلاس بلایا گیا ہے۔

صدارت : انتظار حسین

گفتگو : ہرچرن چاولہ کے بارے میں : اجمل نیازی

مضمون : وزیر آغا۔ اصغر ندیم سید۔ انور سدید۔ محسن رضوی

سکریٹری : سعادت سعید

خطبۂ صدارت : انتظار حسین

قرار داد ....

وزیر آغا کا کل تک پتہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ ہم گلے ملتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ "آپ کیسے ؟"

" کل فارم سے نکلا۔ ڈرائیور سے کہا۔ گھر (سرگودہا) چلو۔ مین روڈ پر آیا تو جانے کیا دل میں آئی۔ کہا۔ "چلو لاہور۔ بس لاہور آ گیا۔ یہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ تم آئے ہو۔ بس رُک گیا۔ دل سے دل کو راہ والی بات سچی ہوتی ہے نا" وہ کہتے ہیں۔

" ہاں شاید ٹیلی پیتھی اسے ہی کہتے ہیں" میں کہتا ہوں " آپ نہ ملتے تو میں خود کو آدھا ادھورا ہی محسوس کرتا رہتا۔ میں نے کل سرگودہا آپ کے گھر ٹیلی فون کیا تھا تو آپ کے نوکر نے کہا۔ آپ فارم پر گئے ہوئے ہیں"

" اچھا۔ اس نے آپ کو یہ بتایا کہ میں فارم پر گیا ہوا ہوں۔ کمال ہے"

" اس نے کہا۔ آپ دس بارہ دن تک لوٹیں گے "

" ارے۔ آپ سے یہ بھی کہا کہ میں دس بارہ دن تک لوٹوں گا " وہ زور سے ہنستے ہیں۔" میں ٹیلی فون کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میں وزیر آغا بول رہا ہوں تو کہتا ہے۔ وزیر آغا گھر پر نہیں ہیں۔ میں دوبارہ بتاتا ہوں کہ میں وزیر آغا ہی بول رہا ہوں تو جھنجلا کر کہتا ہے۔ صاحب آپ سے کہہ تو دیا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اور وہ ٹیلی فون بند کر دیتا ہے۔ بار بار یہی ہوتا ہے۔ یار تم واقعی خوش قسمت ہو کہ تمہیں اس نے جواب بھی دیا اور ٹھیک اطلاع بھی دی۔ ہے نا کمال "

چہرے۔ کیمرے۔ قہقہے۔ مصافحے۔ چالیس پچاس کے قریب لوگ ہوں گے۔ سعادت سعید کہہ رہے ہیں۔ یہ اجلاس اتنا اچانک بلانا پڑا ہے کہ اتنے ہی لوگ آ سکے۔ پہلے پتہ ہوتا تو دو ڈھائی سو سے کم کیا ہوتے۔ یہاں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ ملتی بلکہ کسی اور بڑی جگہ کا بندوبست کرنا پڑتا۔

انور سدید نے اپنے مضمون میں کہا کہ میں نے جب پہلی بار چاولہ کا نام سُنا تو سوچا۔ کوئی اکبر الہ آبادی کا ہرچرن داس ہوگا مگر جب میں نے نقوش میں ان کا افسانہ 'بادشاہ' پڑھا تو فوراً دل نے کہا۔ ارے یہ تو واقعی ہرچرن چاولہ ہیں (دھنپت رائے نہیں، پریم چند ہیں)

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے ۔۔۔ کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم۔ اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے ۔۔۔ بلا دقت میں بن جاؤں تیری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سُنائی ۔۔۔ کُجا عاشق، کُجا کالج کی بکواس
کُجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت ۔۔۔ کُجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے ۔۔۔ ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی ۔۔۔ مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس

...... از : اکبر الہ آبادی

ڈاکٹر وزیر آغا بتا رہے ہیں۔ ہرچرن چاولہ کے افسانوں میں میانوالی کی دھرتی اور زبان کا رنگ اتنا گہرا اور خوبصورت انداز ......

جیلانی کامران اور مبارک احمد صاحب نے بھی جدید افسانے کی کروٹوں پر بات کی ہے۔

اصغر ندیم سید پڑھ رہے ہیں "ہر چرن چاولہ اور میں نے بچپن ایک ساتھ گزارا ہے۔"
سید اور میری عمر میں بیس سال کا فرق تو ہوگا ہی۔ پھر بھی ہم نے بچپن ایک ساتھ کیسے گزارا مگر میں سید صاحب کے بچپن کا ساتھی ہوں۔ کیونکہ میرے خون کو چاہ بوہڑ والا (ملتان چھاؤنی) کی ان ہی گلیوں کی ہواؤں نے صاف کیا ہے۔ جن میں اصغر ندیم سید بھی کھیلے کودے ہیں۔ اب آپ حیران ہوتے رہیے۔ میں آگے بڑھتا ہوں اور بھی بہت سوں نے میرے بارے بہت کچھ کہا ہے اور خود مجھے بھی ایک طویل افسانہ 'گھوڑے کا کرب' کے دونوں حصے پڑھنے ہیں۔

وقفۂ سوالات:

سب سوچ میں گم ہیں کہ مجھ سے کیا پوچھیں۔ سب کچھ تو انور سدید صاحب کھل کر کہہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے میرے طویل افسانے کو تین فقروں میں سمیٹ دیا ہے۔ خود میرے پاس بہت کچھ ہے مگر پھر بھی میں تہی دامن ہوں۔ صبح میرے ذہن کے پرتے پر لکھے تمام نوٹ کہیں دوسری جگہ پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔

—— میں نے ڈبل ہجرت کی ہے۔ پاکستان سے بھارت اور بھارت سے ناروے۔
—— اِبسن کا ڈرامہ ڈک ہیم (گڑیا کا گھر)
—— ناروے کے ہزار کرونے کے نوٹ پر ابسن کی تصویر ہے۔
—— Knut Hamsun کو نٹ ہمسن نہیں، کنوت ہامسن کہنا چاہیے۔ اس کا مشہور معروف ناول slut (سلت) اردو میں 'بھوک' کے نام سے منتقل ہو چکا ہے۔

نومئی سے تیرہ مئی ۱۹۷۸ء میں ناروے کے بہت بڑے اسٹیج ایکٹر ROLS SAND نے اِبسن جوبلی منانے کے موقع پر ابسن کا میک اپ کرکے ابسن کا روپ بھرا تھا اور وہ پورے پانچ دن اِبسن ہاؤس سے براستہ King Palace اوسلو کی مشہور سڑک کارل یوہان گاتے سے گزرتا ہوا گرینڈ ہوٹل میں اپنی ریزرو سیٹ پر آکر بیٹھتا رہا۔ خود اِبسن عین اسی وقت اپنی اسی سیٹ پر آکر بیٹھا کرتا تھا۔ ان دنوں کارل کال گاتے گانے پر اسے دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں فوٹو اتارے جاتے ہیں۔ میں نے بھی اِبسن کے ساتھ اپنی کچھ تصاویر اور ایک مووی فلم اتروائی تھی۔

—— نارویجین ادب میں نئے مشہور نام Knut Faldbakken Novel E-18، Gunnar Muri، John Bull, Ebba Husland, Osker Stein Bjorlykke وغیرہ ہیں۔
—— نارویجین ادب، نارویجین لوگوں کی طرح ٹھنڈا اور یخ بستہ ہے۔
—— لوگ کہتے ہیں Among the believers نے V.S. Naipaul کو دیکھ کر اپنے آپ کو نوبل پرائز کا حق دار بنا لیا ہے مگر سلمان رشدی کا Midnight Children بھی کافی توجہ کھینچ رہا ہے۔
—— سعید انجم نے 'سب اچھا ہوگا' لکھ کر سب اچھا ہونے کی بشارت دی ہے۔
—— ناروے میں ہندوستانی دو پرچے نکالتے ہیں 'پریچے' اور 'پہچان'۔ 'پہچان' زیادہ اپنی طرف راغب کرتا ہے۔
—— اوسلو میں دو ادبی محفلیں باقاعدگی سے جمتی رہتی ہیں۔ ادبی سنگت اور ساہتک وچار سبھا۔
—— اردو میں سید مجاہد علی کا 'کارواں' ہی صرف ناروے سے نکلنے والے اردو اخبارات اور رسائل میں قابلِ ذکر ہے۔ اردو انگریزی اور نارویجین زبان کا ملا جلا سہ ماہی Immigranten اپنے ڈھنگ کا منفرد رسالہ ہے۔
—— فارن وومن گروپ۔

اپنے ہاں ناسٹلجیائی ادب۔ جاتک کتھائیں۔ بودھی ستوا۔ اسطیری۔
پانی مرا نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی تلیوں میں جمع ہو گیا ہے۔ دریا اترتا ہے تو چھوٹی چھوٹی تلیاں بن جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے جدا جدا آنکھوں سے آسمان کو تکتی ہوئی۔ بچے ان میں نالیاں بنا کر انہیں پھر ایک ندی کی صورت رواں کر دیتے ہیں۔ فن کار بھی بچے کا سا سچا دل رکھ

اسے یہ کھیل جاری رکھنا چاہیئے۔

رشید امجد : ریت ریت لفظ

لفظ جو ریت ہو گیا ہے۔ ہاتھ ہی نہیں آیا۔ آتا ہے تو بکھر بکھر جاتا ہے۔ بے معنگی، بے اثری۔

فکر تونسوی سے ملا تو وہ بولے۔ بھئی ہم تو تھک گئے ہیں۔ لوگ سو کھی واہ واہ کرتے ہیں۔ پرنالہ وہیں گرتا ہے، گرتا رہے گا۔

رام لعل میانوالی سے لائے ہوئے وہاں کی زبان میں ٹیپ شدہ گیت سُن سُن کر ناچ رہے تھے۔

جوگندر پال اور ستیش بترہ کے ساتھ پوری شام، ساری رات اور دوسری صبح نے تمام اردو افسانوی ادب کا جائزہ لے ڈالا۔
دوسرے دن جوگندر پال کے ساتھ تھوڑا سا وقت ان کے گھر پر گزرا۔ کتابوں، رسالوں کے ڈھیر کے بیچ۔ میں ان کے تین چار ان ڈبوں تک بھی پہنچ گیا جن میں چنے کے مرونڈے۔ گولیاں۔ پنیاں اور بسکٹ بھرے ہوتے تھے۔ مجھے پہلے سے پتہ تھا کہ یہ سب کھانے کی چیزیں ضرور انکی کتابی دنیا کے پڑوس میں مل جائیں گی۔ لکھتے ہوئے کئی ادیب چرتے چگتے رہنا پسند کرتے ہیں۔ سچ ہے خالی پیٹ عشق نہیں سوجھتا۔

اصغر ندیم سید کی کہانی 'پانی کی موت'، سلطان سبحانی کی 'میرا کھویا ہوا ہاتھ' ''
یہ سب کچھ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کے پاس پوچھنے کو کچھ نہیں۔ کیا میں اتنا حسین ہوں کہ میرے حُسن کے لشکارے نے ان کی آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ خیر جو بھی ہے، سو ٹھیک ہے فکر کیوں کروں۔
آج میرے بارے میں بہت سوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ ہر طرف سے میری ہی تعریف کے پہلو نکلتے ہیں اور بھگوان قسم میں نے جہاں بالکل نہیں بنایا۔ اتنے بڑے جہاں کا ایک تنکہ بھی بنانے میں میرا ہاتھ نہیں۔ پھر آپ میری تعریفیں میرے ہی مُنہ سے کیوں سُننا چاہتے ہیں۔ اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کیجئے۔ مجھے پھر آپ کی کچہری میں کھڑا ہونا ہے۔

ایک صاحب اپنے چار پانچ رسالے مجھے پکڑا رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں۔ ہمارے لئے بھی لکھئے۔
فضل من اللہ ایک سوالنامہ برائے انٹرویو روزنامہ 'جسارت'، کراچی میرے ہاتھ میں تھما رہے ہیں۔ ضرور لکھئے گا ہم 'جسارت' میں چھاپیں گے۔

سعادت سعید "جنگ" لاہور کا ادبی سیکشن کا صفحہ مجھے دے رہے ہیں۔" دیکھئے۔ ہم نے فراق کو آپ سے کہیں زیادہ پیار اور عزت دی ہے ——— اردو غزل کی صدیوں تک یاد رہنے والی آواز۔ فراق گورکھپوری۔ ان کی موت غزل کے دبستان کی موت ہے ———
وزیر آغا کہہ رہے ہیں۔" آج جہاں جاتے ہو جاؤ مگر تمہارا کل سارا میرا ہے۔ صبح گیارہ بجے آکر لے لوں گا۔ کہاں ملو گے ——؟"
میں پل بھر سوچتا ہوں۔ پھر کہتا ہوں۔" فیروز سنز مال روڈ پر۔"
یادداشت کی گاگر کتنی چھوٹی ہے اور پیار بھرے چہروں کا ٹھاٹھیں مارتا ساغر کتنا طویل و عریض۔ اس ساغر میں پیار و خلوص کے جوار بھاٹے نے میرے حواس معطل کر دیے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کیا بھولوں کیا یاد کروں۔ ڈائری لکھنے کی عادت نہیں۔ راہ چلتے کیسے لکھوں۔ گھر پہنچتے ہی نیند کی پریاں کسی دوسری دنیا میں لے جاتی ہیں۔
پروفیسران حسن رضوی۔ اجمل نیازی اور سعادت سعید نے یہ راس رچائی تھی۔ ابھی ان کا دل نہیں بھرا۔ وہ ایک اور میٹھی سی شرارت بُنتے ہوتے ہیں۔" آپ کا انٹرویو ریکارڈ کریں گے۔"
یارو مجھے بچاؤ۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ غلام الثقلین نقوی اور انور سدید منجدھار میں چھوڑ گئے۔ بھئی تمہارے بس میں ہوں۔ اپنے اغوا میں ایک سچے معشوق جیسی میری اپنی مرضی کا دخل تو نہیں۔
سعادت سعید کا گھر پاس ہی ہے۔ ہم پیدل ہی وہاں پہنچتے ہیں۔ ان کی سٹڈی بہت دلکش ہے۔ کتابیں رسالے میری کمزوری ہیں۔ میں انہیں پڑھ سکوں یا نہیں مگر ایک بڈھے ٹھرکی کی طرح کتابی پیکروں سے گھرا رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے گھر کی چھوٹی سی لائبریری میں ساٹھ فی صدی کتابیں، میں ابھی تک نہیں پڑھ پایا۔ مگر کوئی انہیں ہاتھ لگالے تو میرا دل گھٹنوں میں جا بیٹھتا ہے۔ کبھی کسی بوڑھے نے اپنی جوان بیوی

کی طرف کسی کا دیکھنا برداشت کیا ہے ؟

خود سعادت سعید علم کا خزانہ ہیں۔ انھوں نے بہت زیادہ پڑھا ہے۔ شعر، افسانہ، تنقید وہ ہر میدان کے شہ سوار ہیں۔ وہ اپنے کچھ مسودات مجھے دکھا رہے ہیں۔ روپ ریکھا سے ہی جج کر سکتا ہوں کہ جب وہ کتابی صورت میں آئیں گے تو بہت جوان اور خوبصورت لگیں گے مگر اجمل نیازی ہنستے ہوئے کہہ رہے ہیں "چاولہ صاحب۔ آپ دس سال بعد بھی آئیں گے تو یہی مسودہ آپ کو دکھائیں گے۔ ہر کسی کو دکھاتے ہیں۔ کتابی لباس ان کے اِس جنم میں تو شاید ہی اِن کے مسودات کو نصیب ہو"

حسن رضوی زور سے ہنستے ہیں جیسے اپنی ہنسی سے اجمل نیازی کے سچ کو سچا ثابت کر رہے ہوں۔ "واقعی یہ بہت بڑا ظلم ہے" میں کہتا ہوں۔ "اپنے آپ پر۔ قارئین پر جو اتنے اچھے مواد سے محروم رکھے جا رہے ہیں۔ سعادت سعید صاحب۔ آپ کو یہ سب ضرور ہی چھپوانا چاہئے۔"

وہ خاموشی سے سُن لیتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے پہلے بھی سُنتے ہی رہے ہیں۔

وہ اپنے ریکارڈر میں ٹیپ سیٹ کر رہے ہیں "چاولہ صاحب۔ آپ کا انٹرویو ریکارڈ کریں گے"

" بصد شوق۔ مگر سیاسی نہیں" میں کہتا ہوں۔

" کیا ہمیں اپنی کھال عزیز نہیں" وہ کہتے ہیں۔ سب ہنستے ہیں۔ میں بھی شامل ہو جاتا ہوں۔

انٹرویو خالص ادبی ہے۔ میرے بارے اور میرے تخلیقی کام کے بارے۔ بہت زیادہ، سب کچھ جان لینے کی خواہش ہر سوال میں پنہاں ہے۔ "آخری سوال مگر سیاسی" حسن رضوی کہتے ہیں۔

" میں آپ کو پوچھنے کا حق دیتا ہوں مگر جواب دینے یا نہ دینے کا حق اپنے پاس محفوظ رکھتا ہوں" میں کہتا ہوں۔

سوال: ہماری گورنمنٹ نے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کی پیش کش کی ہے مگر آپ کی گورنمنٹ نے ....."

جواب: پرانی بات ہے۔ جنگ بُری چیز ہے۔ اسے کون پسند کرے گا"

کھانا ویجیٹیرین ہے۔ سادہ ہے مگر لذیذ ہے۔ ہر چند چاولہ کو خوش کرنا ہو تو کھانا مزدورانہ اور ذائقہ بادشاہانہ ہونا چاہئے۔ سو ہے۔

سعادت سعید اپنی سوزکی پر مجھے انڈس ہوٹل چھوڑ جاتے ہیں۔ ابھی وقت بہت ہے۔ تسنیم بہن کے ہاں کیوں نہ نکل چلوں۔ صبح اجمل نیازی کے ساتھ بڑی مشکل سے گھر تلاش کیا تھا۔ بہتر ہے انھیں پہلے رِنگ کر لوں مگر ٹیلی فون شرارتیں کر رہا ہے۔ لگتا ہے بہن بھائی کو یہ ظالم ملنے نہیں دے گا۔ باہر بادل گرج رہے ہیں، بجلی چمک رہی ہے۔ شاید بارش ہو گی ———— نیند اے نیند۔ مجھے چار پانچ بار تو اور کوشش کر لینے دے مگر تُو، جو مجھ پر میری بیس سالہ ریلوے کی رات کی نوکریوں میں ظلم ہوتا رہا ہے، کا بدلہ لینے پر تُلی ہوئی ہے۔ اور تُو شاید یہ بھی جانتی ہے کہ ہمارے ٹیلی فونوں کے پیچھے جو بندے ہیں۔ انہیں ابھی بندہ بننا ہے۔

سولہ مارچ ۸۲ء وہی معمول ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ آج ذرا ناشتہ آنے میں دیر ہو گئی ہے۔ میں دو بار گھنٹی بجا چکا ہوں۔ گھڑی دیکھتا ہوں۔ کافی وقت ہے کیوں نہ باہر جا کر مال روڈ کی تھوڑی سی سیر کر آؤں مگر میری بیوی نے بیڈ ٹی پلا پلا کر مجھے انگریز بنا دیا ہے۔ میں سو فی صدی ہندوستانی ہوں مگر اس معاملے میں پورا انگریز۔ کبھی عادت کی مجبوری ہے اور عادتیں تو اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر آنکھوں سے مال روڈ کی سیر کرنی شروع کر دی ہے۔ سنجے دھرت راشٹر کو کوروکشیتر میں ہو رہی جنگ مہابھارت کا سارا حال اپنی دِوے شکتی سے دہلی میں بیٹھ کر سُناتا تھا۔ میں مال روڈ کے انڈس ہوٹل کی کھڑکی سے سارا لاہور دیکھ رہا ہوں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ کاریں بھی اور کھڑ کھڑاتی سائیکلیں بھی۔ سوٹڈ بوٹڈ جنٹل مین بھی اور مولانا قسم کے لوگ بھی۔ شلواریں، کرتے اور پگڑیاں مجھے سارا مغربی پنجاب گزار کر میانوالی پہنچا دیتی ہیں۔ سندھ ویسا ہی چاندی کا دریا ہے، کالا باغ کا پُل ویسے ہی بادل گرجاتا ہے جب اس پر سے کوئی گاڑی گزرتی ہے۔ داؤد خیل اب بھی پہاڑوں اور ریگستانوں کے درمیان ڈاگر زمین پر واقع ہے۔ اب بھی وہاں کے گبھرو ایک ہاتھ میں تیل پلائی ڈانگ، دوسرے میں بنسری اور پاؤں عورتوں کی فیشن ایبل گرگابیاں پہنتے اور چاندنی راتوں میں کانوں پہ ہاتھ رکھ کر دوہڑے

گاتے ہیں تو بوڑھوں کے جسموں میں بھی جوانی کے انجکشن لگ جاتے ہیں ـــــــ یہ دنیا میری اپنی ہے۔ اس میں کسی کا دخل نہیں۔ اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔

"کھٹ کھٹ" دروازہ کھلتا ہے۔

"ناشتہ صاحب!"

میں یادوں کے موتی کسی قیمتی زیور کی طرح ذہن کی مخملی ڈبیہ میں بند کر لیتا ہوں۔ یہ خزانہ میرا اپنا ہے۔ آپ اس کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ وہ بھی تب، جب میں خود دکھانا چاہوں۔ آپ یہ مجھ سے چھین نہیں سکتے۔ چرا نہیں سکتے۔

انارکلی کی سیر میرے لئے لاہور اتنا ہی سُندر ہے جتنا پہلے تھا۔ میں پیدا تو ہوا تھا مگر ابھی آنکھیں پوری طرح نہیں کھولی تھیں۔ ۱۹۵۵ء میں میں نے لاہور صرف چار دن کے لئے دیکھا تھا۔ اپنے ایک میانوالی کے کتب فروش دوکاندار رشتہ دار کے ساتھ۔ وہ چاروں دن کتابیں خریدتا رہا تھا میں کتابیں پڑھتا رہا تھا لاہور کی کتابیں ویسے بھی شروع سے ہی خوبصورت رہی ہیں۔ خوبصورت سرورقوں، مضبوط جلدوں اور شفاف چکنے کاغذوں کے ساتھ سڑکوں پر آتی تھیں تو میرے جیسا کتابوں کا دیوانہ اور جوانی چڑھتا، نیا نیا عاشق قیس سے مجنوں بن جاتا تھا۔ اور میرا مزاج تو لڑکپن سے عاشقانہ رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ... راولپنڈی کو میں اب دیکھوں تو ایک ایک انچ کی تبدیلی نوٹ کر سکتا اور گنوا سکتا ہوں۔ اسے میں نے تالاب کی مچھلی کی طرح کونہ کونہ چپہ چپہ دیکھا ہے ـــــــ سنگم پبلشرز۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ سنگ میل پبلی کیشنز اور کتابوں کی اور دو تین دوکانوں پر میں نے بہت سی اچھی اچھی کتابیں دیکھ کر ذہن میں ان کی ایک لسٹ مرتب کر لی ہے۔ کتنی بہترین کہانیاں یہاں میسر ہیں۔ ہر موضوع پر اچھی اچھی کتابیں نظر آتی ہیں۔ اب کی بار جب اپنی لائبریری کو نئے ٹائیٹلز تجویز کروں گا تو ان میں یہ ضرور شامل کر لوں گا۔ شکریہ مسٹر خورشید السلام۔ مسٹر مرزا اور مسٹر بٹ۔ دھنیہ باد۔ گلزار محمد قریشی صاحب۔ جانے کیوں آپ کے میٹھی مسکان اور پُر نور چہرے پر مجھے فرشتوں جیسا تقدس نظر آتا رہا ہے۔

انارکلی، انارکلی! تیرا سلیم کہاں ہے۔ تجھے مار کر بھی شہنشاہ اکبر نہ مار سکا اور تو اپنے اصلی نام سے اب بھی زندہ ہے جبکہ تیرا جھوٹا عاشق تیرے حسن کا لوبھی بھونرا سلیم، اپنے اس نام سے زندہ نہ رہ سکا۔ نام بدل کر وہ کیا سے کیا ہو گیا یہ دوسری بات ہے۔ مگر انارکلی ایک بات تو تجھے ماننی ہی پڑے گی تو نے ایک سلیم کی محبت کھو کر کئی سلیموں کی محبت جیت لی۔ اے محبت زندہ باد!

انارکلی میں تیرا اس صدی کا سلیم تلاش کر رہا ہوں۔ یادوں کے محل میں تیرا موجودہ عاشق جانے کس حصے میں جا گزیں ہے۔ یاد آیا ادارہ فروغ اردو۔ ایبک روڈ۔ انارکلی۔ نقوش پریس۔ علم و ادب کے پروانے نے تیرے حُسن کو کتنے چاند لگائے ہیں۔ محمد طفیل (ایڈیٹر نقوش) جسے پیاروں نے محمد نقوش بنا دیا ہے۔ اور جسے انہوں نے بڑی خوشی اور فراخدلی سے قبول کر لیا ہے۔ بھگوان کرشن تیرے پیار کے کتنے نام ہیں۔ حضرت محمدؐ تجھے پیار سے کتنے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایبک روڈ کتنی تنگ ہے مگر میری منزل مقصود کتنی فراخ ہے۔ طفیل صاحب کو اپنے پریس سے لاکھوں کی آمدن ہو سکتی تھی۔ ہوتی بھی ہوگی مگر خدمت اردو ادب کے جنون نے انہیں کھنکتے ہوئے کروڑوں سکوں تک نہیں پہنچنے دیا مگر ادب کے دریاؤں کا شناور بنا کر کروڑہا دلوں کا راجہ بنا دیا ہے۔

محمد طفیل: میں نے جوان جہان، مست اور خوش طبع چہرے کا تصور کیا تھا۔ یہ تو سوچوں میں ڈوبا ہوا ادھیڑ عمر کا چہرہ ہے۔ آج کل یہاں اوسلو کے ایک سینما میں دنیا کے بہترین فلم ڈائرکٹروں کی چیدہ فلموں کا مہینہ منایا جا رہا ہے۔ دنیا کے اچھے اور حقیقت پسند ڈائرکٹروں میں جہاں (انگمار برگ مان) Ingmar Bergman سویڈن کے فلم ڈائرکٹر کا نام سرفہرست آتا ہے وہاں بنگالی فلموں کے کئی ورلڈ ایوارڈ یافتہ ڈائرکٹر ستیہ جیت رے کا نام بھی ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ آج کل جگہ جگہ بہت بڑے بڑے پوسٹر یہاں، وہاں اور دکھائی جانے والی فلموں کی فہرست نیچے درج ہے، وہاں اوپر ستیہ جیت رے کی ایک بہت بڑی تصویر ہے جس میں وہ گہری سوچ میں ڈوبے بیٹھے ہیں۔ ان کی فلمیں پاتھیر پنچالی۔ اپراجیتا اور اپور سنسار دیکھ کر لگتا ہے کہ انہیں کسی نے بہت گہرائی میں ڈوب کر تخلیق کیا ہے۔ اگر میں ستیہ جیت رے کی فلموں کی گہرائی کا رشتہ ان کے

چہرے کی گہری سوچ سے جوڑ رہا ہوں تو مجھے محمد طفیل کے سوچوں میں ڈوبے چہرے کو بھی نقوش کی تخلیق کے کرب کی گہرائیوں کے آئینے میں دیکھنا ہوگا اور جب میں طفیل صاحب کو اس زاویے سے دیکھتا ہوں تو مجھے ان کا سوچوں میں ڈوبا ہونا جسٹی فائڈ لگتا ہے۔ شاید انھوں نے اپنی ساری تازگی، رونق اور خوش طبعی اپنی تخلیقات کے چہروں پر اتار دی ہے۔ وہ اپنی طویل و عریض میز سے ادھر بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ میں نے تو بس صرف نام ہی بتایا تھا۔ یادداشت کی بھٹی کے الاؤ ان کے ابھی تک تیز ہیں ورنہ نقوش کے صفحات پر ملے تو ہمیں ایک زمانہ ہو گیا ہے ـــــ دفتر ہے کہ.... کھاد کو مت دیکھو، پھولوں کو دیکھو جو اس نے پیدا کئے ہیں۔

جائے۔

" آپ نے اتنا عرصہ نقوش کے لئے نہیں لکھا!"

" اب لکھوں گا۔ ضرور لکھوں گا۔ ہاں یاد آیا۔ افسانہ 'گھوڑے کا کرب' دونوں حصے میرے پاس ہیں۔ نارویجین زبان میں چھپ چکا ہے۔ اس پر ناروے کے بہت بڑے مشہور و معروف پینٹر، آرٹسٹ الف ادس نے السٹریشن کے لئے پونے دو صفحے کی تیس بائی پینتیس سینٹی میٹر کی پینٹنگ بنائی تھی۔ وہ پینٹنگ ہی ہزاروں کی بک گئی اور اسے اوریجنل حاصل کرنے والوں کی لائن لگ گئی تھی۔ خود مجھے اس کہانی کا چار ہزار روپیہ معاوضہ ملا تھا۔ ہندی میں اسے 'سارلیکا' دہلی نے چھاپا اور اردو میں 'مفاہیم' گیا نے۔ پاکستان میں یہ افسانہ ابھی تک کہیں نہیں چھپا۔ میں اس کی تمام بیک اسٹوری کے ساتھ ہی پیش کر دیتا ہوں۔ بیک اسٹوری بتا کر میں اپنے آپ میں ہوا بھر رہا ہوں اور سرخرو بھی ہو رہا ہوں کہ میں نے سب سچ سچ بتا دیا ہے۔ اسے کچی کنواری کہانی تو نہیں کہا۔

" ضرور ضرور۔ عنقریب افسانہ نمبر نکال رہا ہوں۔ اس میں شامل کر لوں گا۔" وہ کہتے ہیں۔

" مگر ایک کاپی بذریعہ ہوائی ڈاک مجھے ناروے بھجوانی ہوگی۔" افسانہ دیتے ہوئے میں کہتا ہوں۔

وہ کچھ بھی نہیں کہتے صرف میری طرف دیکھتے ہیں اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ غلط بات کہہ دی ہے مگر اس کے لئے ذمہ دار میں نہیں، وہ لوگ ہیں جنہوں نے میری کہانیاں چھاپ کر بھی مجھے دو چار روپے کے رسالے کے لئے ترسایا ہے ـــــ طفیل صاحب سے ان کی ساتوں کتابوں آپ، جناب، محترم، مکرم، معظم، صاحب اور محبی کے نام میں نے ایک کاغذ پر لکھوا لئے ہیں۔ ہماری لائبریری میں ان کی تین یا چار کتابیں ہیں۔ چیک کر کے باقی بھی منگوا لوں گا۔

نقوش پریس سے نکل کر اور باہر آ کر میں وقت دیکھتا ہوں۔ ساڑھے دس ہو گئے۔ گیارہ بجے آغا صاحب سے ملنے کا پروگرام ہے۔

فیروز سنز کے طویل و عریض شوروم میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام الثقلین نقوی، سلیم آغا قزلباش (ڈاکٹر وزیر آغا کے فرزند اور 'سرگوشیاں' کے مصنف) اور صابر لودھی (خاتون افسانہ نگار فرخندہ لودھی کے شوہر) کتابوں کی دنیا میں خود بھی بہت بڑی کتاب کی طرح الگ نظر آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا تعارف کرواتے ہیں۔" یہ سلیم آغا ہیں!"

'سرگوشیاں' کی ایک جلد مجھے ناروے میں مل چکی ہے۔ تعارف پہلے ہی مکمل ہے۔ اب صرف ہاتھ ملانا باقی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لگتا ہے جیسے میں جوان وزیر آغا سے ہاتھ ملا رہا ہوں۔ نقوی صاحب سے پہلے ہی کل ملاقات ہو چکی ہے ـــ مصافحہ ـــ یہ صابر لودھی ہیں۔

وہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہتے ہیں" میری بیوی فرخندہ لودھی بھی آپ سے ملنے کی خواہشمند ہیں۔ ویسے میں بھی آپ کا مداح ہوں۔"

" وہ کہاں ہیں۔ ملایئے نا۔ میں نے انہیں خط لکھا تھا۔ انہوں نے جواب نہیں دیا۔" ان کا مجموعہ 'آرسی' پڑھنے کے بعد میں نے انہیں خط لکھا تھا اور قلمی دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا تھا۔ مسٹر لودھی کہہ رہے ہیں" شاید انہوں نے آپ کے خط کا جواب دے دیا ہے!"

" میں قریب ایک ماہ سے باہر ہوں شاید پیچھے خط پہنچا ہو۔" میں کہتا ہوں۔

باہر آتے ہیں تو ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ بھوک چمکنے لگی ہے۔" کھانا پہلے کھا لیا جائے۔" وزیر آغا پوچھتے ہیں۔

" انور سدید کب آ رہے ہیں؟" میں پوچھتا ہوں۔ کل ہی بات ہوئی تھی کہ وہ ایک بار پھر مجھے ملنا چاہتے ہیں اور کھانا انھوں نے ہمارے

ساتھ کھانا تھا۔

"وہ آپ سے ملنا چاہتے تھے گجران کی بس ایک بجے جا رہی تھی۔ وہ اپنے شہر کوٹ اَدو چلے گئے۔" وزیر آغا بتاتے ہیں۔

ہم مال روڈ کے شانوکس ریسٹورنٹ، کی مرمریں سیڑھیاں اتر رہے ہیں۔ شان و شوکت میں یہ شاہانہ ریسٹورنٹ یورپ کے کئی ریسٹورنٹوں سے میلوں آگے ہے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے میں ڈاکٹر وزیر آغا سے آہستہ سے کہتا ہوں "کبھی خیال رہے۔ میں پیور ویجیٹیرین ہوں"

وہ سب کو سُنا کر بڑی خوش دلی سے کہتے ہیں "ہم نے پاکستان اسی لئے بنایا تھا کہ گوشت جی بھر کر کھا سکیں گے" ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ اتنے سنجیدہ مضامین کے لکھنے والے آغا صاحب میں مزاح کی کتنی حِس ہے کہ کوئی ان کے ساتھ پندرہ دن رہ جائے اور ان کے خود ساختہ چھوٹے چھوٹے مذاقوں کو نوٹ کرتا رہے تو طنز و مزاح کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار ہو سکتا ہے۔

سالوشؔ کی دوکان بہت اونچی ہے اور پکوان اس سے بھی کئی گنا اونچے۔ کام و دہن کی آزمائش ہے اور میرے دانت ابھی بالکل جوان ہیں۔ جگوان قسم۔ آغا بھائی۔ میں نے تمہارے مذاق کو اتنا ہی انجوائے کیا ہے جتنا دوسروں نے۔ پھر تم یہ فلاسفی کیوں بگھار رہے ہو کہ خدا نے انسان کو گوشت خور نہیں بنایا ورنہ اسے گوشت کھانے کو لمبے لمبے دانت عطا کرتا اور چیرنے پھاڑنے کو پنجے۔ یہ تو انسان کو جب گوشت کا چسکہ پڑا تو اسے کاٹ کر نرم حصے نکال کر، بھون کر اور مرچ مسالہ لگا کر نرم اور چبانے کے قابل بنایا۔

اب ہم ایک خوبصورت کئی منزلہ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ میں آغا صاحب سے پوچھتا ہوں "نقوی صاحب کہاں گئے۔ ابھی تو ہمارے ساتھ تھے"

"وہ لفٹ سے آئیں گے" وہ جواب دیتے ہیں۔

"میرا گاؤں" کو جو قلم کار لکھ رہا ہے۔ وہ تو گاؤں کی گلیوں میں دھمالیں مچاتا، ناچتا کودتا، گاتا جھومتا نوجوان نظر آتا ہے۔ یہ کون سے نقوی ہیں جو چار منزلوں کی سیڑھیاں بھی نہیں چڑھ سکتے۔ سوچتا ہوں خیال کی دنیا کتنی حسین اور جوان ہوتی ہے۔ اتنی حسین جو شاید خود خدا بھی نہیں بنا سکتا۔ تخیل میں فن کار اس خالق سے بھی کئی گنا آگے نکل جاتا ہے۔

کشور ناہید کا دفتر۔ ویسا ہی جیسا ہمارے ہاں کے کسی بڑے آفیسر کا ہو سکتا ہے۔ وہ پاکستان نیشنل سینٹر کی ڈائرکٹر ہیں اور بہت اچھی شاعرہ بھی۔ بہت ہنس مکھ اور خوش طبع مگر باتیں مردوں جیسی کرتی ہیں۔ تن کر کھڑی ہوتی ہیں تو لگتا ہے جیسے جُون بدل کر مرد کا چولا پہن لیا ہو۔ ان سے ملتے ہوئے لگتا ہے جیسے صنفِ نازک کی سب ادائیں اور نزاکتیں انھوں نے دور کہیں دل کی گہرائیوں میں اتار رکھی ہیں اور جو صرف بوقتِ ضرورت ہی وہ نکال کر چہرے کی پلیٹ پر سجا کر کسی خاص اپنے کو پیش کرتی ہوں گی۔ کام کرنے والی عورتیں آس پاس اتنی بھوکی نظروں کے درمیان کب تک اپنے جسم کی اداؤں کو ایک لذیذ خوراک بنا کر تھالی میں سجائے پھر سکتی ہیں۔

"چاولہ صاحب۔ آپ کیا پئیں گے؟" وہ پوچھتی ہیں۔

"صرف آپ کو دیکھوں گا" میں دل میں کہتا ہوں کیونکہ مجھے عورت کا یہ غیر جھوٹی موٹی سا روپ بہت پسند ہے۔ "صرف سادہ پانی" مگر آتا ہے کوکا کولا۔ وہ بوتلیں کھول کھول کر سب کے سامنے رکھتی جاتی ہیں۔ "پی لو یار۔ کوکا کولا ہی سہی۔ اسے ہی ہمارا پانی سمجھ لو"

کوکا کولا پیتے ہوئے اور کچھ یاد کرتے ہوئے میں کہتا ہوں "میں نے کہیں آپ پر ایک خاکہ پڑھا ہے"

"ان پر خاکے لکھے بھی گئے ہیں۔ ان کے خاکے اڑائے بھی گئے ہیں" آغا صاحب برجستہ کہتے ہیں۔ ہنسی کا پھر ایک بھرپور فوارہ چھوٹتا ہے مگر وہ مسکراتی ہوئی شیر جوان کی طرح تنی کھڑی ہیں۔

"آپ وہاں لائبریری میں صلاح کار ہیں۔ آپ ہماری کتابیں منگوایا کیجئے نا" وہ کہتی ہیں۔

"منگواتا رہتا ہوں۔ آپ کی ایک کتاب بھی ہمارے پاس ہے" میں جواب دیتا ہوں۔ "مشکل صرف یہ ہے کہ چند ایک کیٹلاگس کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ چناؤ کا دائرہ بہت محدود ہے پھر بھی"

"میں آپ کو کچھ پتے دیتی ہوں۔ ایک بار انھیں لکھئے۔ کیٹلاگس آپ کو ملتے رہیں گے" وہ ایک کاغذ پر لکھنا شروع کر دیتی ہیں۔

"شکریہ" کا غذ لیتے ہوئے میں کہتا ہوں۔

ہماری دائیں اور واپڈہ کی شاندار عمارت ہے۔ اس کا نقشہ ایک انگریز انجینئر نے بنایا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی خوبصورت

بہت تیزی سے لاہور کی سڑکوں پر دوڑ رہی ہے۔ وہ اپنے ڈرائیور کو علامہ اقبال روڈ پر لے چلنے کو کہہ رہے ہیں۔

روزنامہ "جنگ" کا دفتر۔ ہرچرن چاولہ ہاتھ ملاتا جا۔ تو بھلکڑ آدمی ہے۔ اتنے ناموں کو یاد نہیں رکھ سکے گا۔ اس لئے بہتر ہے

سلام علیکم۔ والیکم اسلام۔

'جنگ' نے انقلابی بات یہ کی ہے کہ اس کی کتابت اب کسی ماہر کاتب سے نہیں فوٹو ٹائپ سیٹ کمپیوٹر انجام دے رہا ہے۔ اخبار کا یہ کام ساری اردو صحافت کی تاریخ میں ایک بے نظیر اقدام ہے۔ جو اخبارات اور کتابوں کی اشاعت کے کام کی کایا پلٹ کر رکھ دے گا۔ اردو کتابت کی یہ انقلابی تبدیلی پاکستان کے ہی دو سائنسدانوں محمد جمیل مرزا اور مطلوب الحسن سید نے انجام دی ہے۔ اس فوٹو ٹائپ سیٹنگ سے کتابت اور طباعت کا کام بے حد آسان اور کئی گنا زیادہ تیز رفتار ہو جائے گا۔ جس سے ناشرین کے کئی ایک مسائل کا خاتمہ ہو جائیگا —— یہ چیز ہے جو دکھانے مجھے یہاں لایا گیا ہے۔

ہم ایک کمرے میں مختلف ٹائپوں پر بیٹھے لوگوں کو کام کرتا دیکھ رہے ہیں۔ جو کچھ ٹائپ کیا جا رہا ہے۔ اسے مشین ایک پٹی پر سوراخ بناتی اپنے حافظے میں نوٹ کرتی جا رہی ہے۔ یہی سوراخوں والی پٹی جب کمپیوٹر مشین کے حوالے کی جائے گی وہ ان تمام فقروں کو دہرا کر ان کے نیگٹو اتار لے گی۔ چلئے۔ اب ڈارک روم۔ ان نیگٹوز کو پازیٹو میں منتقل ہوتا دیکھئے۔ ڈارک روم کی لال اندھی تبیوں میں ہم کچھ نہیں دیکھ سکتے مگر دانیوں کا محلول سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ اور روشنی ہونے پر ہمیں بھی دکھا سکتا ہے۔ اس تمام کارگذاری کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بہت زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ پھر بھی جو کچھ میں سمجھ پایا ہوں۔ وہ یہی ہے۔ اور یہ روزنامہ 'جنگ' کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ دنیا کا ہر کام ہو سکتا ہے اور جو بھی کسی کام پر دماغ سوزی اور محنت کرتا ہے وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے۔ جس ڈھونڈا تس پایا۔ بالکل ٹھیک کہا ہے مگر شہرت ہمیشہ پہل کرنے والے کے حصے میں آتی ہے اور یہی کام 'جنگ' نے کیا ہے۔ اردو calligraphy کا سہرا اسی کے سر بندھے گا۔

'جنگ' کا یہ کارنامہ دیکھنا میرے لئے ایک نئے تجربے سے کم نہیں —— جنگ کے دفتر میں مجھے حسن رضوی بھی نظر آتے ہیں مگر معروفیت کی وجہ سے ہم صرف ہنسی کے پھول ہی ایک دوسرے کی طرف اچھال سکے ہیں۔

وہاں سے نکل کر جانے کون کون سے بھول بھلیاں راستوں سے مڑتے ہم ایک پرانی بلڈنگ میں پہنچتے ہیں۔ یہ روزنامہ "امروز" کا دفتر ہے۔ طویل راہداریوں، برآمدوں اور ان میں پڑی الماریوں سے بچتے بچاتے تنگ راہوں سے گزرتے ہم ایک کمرے میں پہنچتے ہیں۔ ان سے ملئے۔ "اظہر جاوید"

اظہر جاوید رسالہ 'تخلیق' کے ایڈیٹر بھی ہیں اور ایک اچھے شاعر بھی۔ روزی اخبار کی نوکری سے کماتے ہیں اور رسالہ نکالنا اور شاعری کرنا شغل ہے۔ یہاں سے نکل کر ہم 'شیزان' جائیں گے۔ یہ مال روڈ کا ایک ہائی کلاس ریسٹورنٹ ہے۔ راستے میں کسی جگہ صابر لودھی کہتے ہیں: "مجھے یہیں اتار دیجئے۔ میں فرخندہ کو لے کر 'شیزان' پہنچ جاؤں گا۔"

کار روک کر انھیں اتار دیا جاتا ہے —— میں اور آغا صاحب "شیزان" میں داخل ہوتے ہیں۔ آغا صاحب مجھے ساتھ لئے دور سامنے کونے میں بیٹھے ایک شخص کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ ان سے ملئے۔ "عارف عبدالمتین"

"افسانہ نگار ہرچرن چاولہ" ہم ہاتھ ملاتے ہیں۔

'عارف عبدالمتین'، 'عارف عبدالمتین'۔ میرے ذہن میں اس نام کی چکی سی چلنے لگی ہے۔ نہیں نہیں۔ میں یہ یاد نہیں کر رہا ہوں کہ یہ نام میں نے کہاں سنا ہے۔ میں کیسے پاکستان کے اتنے بڑے شاعر کے نام سے ناواقف ہو سکتا ہوں۔ میں تو وہ خاص بات یاد کر رہا ہوں جس نے اس نام کو میرے ذہن میں دھڑیئے کی طرح گانا شروع کر دیا ہے۔ کچھ تو کہوں۔ عارف صاحب میں نے .... سب کچھ یاد ہے۔

ان کے کئی اشعار بھی ذہن میں محفوظ ہیں مگر وہ خاص بات ذہن کی سلیٹ سے صاف ہے جس پر میرا دماغ ان کے نام کی گرد ان کئے جارہا ہے۔ وہ بات جو وہاں یاد نہ آسکی۔ اب یادوں کو اس کاغذ پر منتقل کرتے یاد آگئی ہے۔ میں نے اپنے ناول 'چراغ کے زخم' کا نام ان ہی کی ایک نظم 'چراغ کا گھاؤ' سے متاثر ہو کر رکھا تھا ؎

میری رُوح کے سنگریزوں کو کس نے چُنا ہے
ہر اک شخص میرے لہو سے ابھرتی ہوئی روشنی کے سہارے
تمناؤں کے نارسا، سنگدل فرش سے
خود اپنے ہی صد پارہ احساس کی کرچیاں چُن رہا ہے
میں کس سے کہوں اور کیسے کہوں
کہ میں اپنے قدموں سے لپٹے ہوئے اس اندھیرے سے تنگ آ گیا ہوں۔

غلام الثقلین نقوی صاحب۔ عارف عبدالمتین صاحب۔ آغا صاحب اور میں ایک دوسری بڑی میز پر آ گئے ہیں۔ پیسٹری کیک ٹرے سٹینڈ اور چائے کا سارا سامان ہمارے درمیان رکھ دیا گیا ہے۔ باتیں۔ باتیں، بے انتہا باتیں۔ صابر لودھی فرخندہ لودھی کو لئے آ گئے ہیں۔ وہ سب کو ادھر اُدھر کرتی میرے پاس آ بیٹھی ہیں اور ہم یوں باتیں کرنے لگے ہیں جیسے مدتوں ساتھ ساتھ رہے ہوں اور ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہوں۔

" میرے خط کا آپ نے جواب نہیں دیا" میں گلہ کرتا ہوں۔

" ہاں۔ سستی ہو گئی۔ بس لکھنے ہی والی تھی۔ آپ کے خط سے میرا بہت بڑا نقصان بھی ہو گیا" انھوں نے بھی شکوہ کرنے کی راہ ڈھونڈ نکالی ہے۔

" وہ کیسے ؟" میں حیران ہو کر پوچھتا ہوں۔

" آپ نے میرے افسانوں کی بہت زیادہ تعریف کر دی ـــ میں اکڑ گئی۔ لائبریری میں جہاں میں کام کرتی ہوں، اپنے آفیسر سے جھگڑا مول لے بیٹھی"

" سچ۔ یہ تو عجیب بات ہو گئی۔ میں کہتا ہوں۔

" کسی بات پر باس نے کہا۔ میں اپنے قلم سے تمہیں لاہور سے باہر نکال سکتا ہوں۔ میں نے کہا۔ میں بھی قلم کار ہوں۔ مگر آپ سے مختلف۔ میرے لکھے کو لوگ پسند کرتے ہیں اور آپ کے لکھے پر.... نتیجہ لاہور سے باہر ٹرانسفر۔ مگر جنگ ابھی جاری ہے۔ میں نے شکست نہیں مانی"

میں پیسٹری کا اسٹینڈ ان کی طرف کرکے گھماتا ہوں" کھائیے"

وہ ایک پیسٹری اٹھا کر کہتی ہیں" نفتی نفتی" اور آدھا ٹکڑا میری پلیٹ میں رکھ دیتی ہیں۔

خالد محمود۔ بیدار سرمدی۔ سعید آسی اور اظہر جاوید بھی ہماری محفل میں موجود ہیں۔ میں اپنا کیمرہ کسی کو پکڑاتا ہوں کہ میرا ان سب کے ساتھ ایک فوٹو لے لے۔ دو چار فوٹو اور لئے جاتے ہیں۔ میں نے کچھ فوٹو الگ سے خود بھی لئے ہیں۔ سب کی کوشش اور خواہش یہ ہے کہ میں ہر فوٹو میں خود بھی موجود رہوں۔ فرخندہ لودھی بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھتیں۔ وہ ہر فوٹو میں آنا چاہتی ہیں۔ کوئی صاحب کہتے ہیں" صنف نازک ہونے کا فائدہ اٹھا رہی ہو"

وہ صرف مسکرا کر رہ جاتی ہیں مگر اپنی جگہ نہیں چھوڑتیں ـــــ فوٹوؤں کے بعد سعید آسی میرے سامنے ایک کاغذ رکھ کر کہتے ہیں۔ "چاولہ صاحب کچھ لکھ دیجئے"

میں کچھ دیر سوچتا ہوں۔ پھر لکھ دیتا ہوں" میرا سپنا سچ ہو گیا"

باہر بارش بڑے زور سے ہونے لگی ہے۔ ہم باہر برآمدے میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ پہلے کون بھیگے۔ میں دوڑ لگاتا ہوں اور سیدھا سامنے کھڑی کار میں بیٹھتا ہوں۔ فرخندہ۔ صابر۔ نقوی صاحب اور آغا صاحب بھی آ جاتے ہیں۔ صابر صاحب اور آغا صاحب اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ نقوی صاحب۔ میں اور فرخندہ پچھلی سیٹ پر۔ ذرا سی دیر میں ہی کار مجھے انڈس ہوٹل کے دروازے پر پہنچا دیتی ہے۔ اترنے سے پہلے میں سب سے ہاتھ ملاتا ہوں۔ فرخندہ بڑے خلوص سے کہتی ہیں" خط لکھیے گا"

"نہیں پہلے آپ میرے خط کا جواب دیجئے۔ تب سلسلہ چل پڑے گا"

"وہ تو شاید انھوں نے دیدیا ہے" صابر لودھی کہتے ہیں۔

"ہاں شاید آپ کو dedicate کیا ہوگا۔ آپ بھیجنا بھول گئے" میں مذاقاً کہتا ہوں۔ اس لئے بھی کہ وہ خود ہی مان چکی ہیں کہ وہ سستی کر گئیں اور جواب نہ دے سکیں۔

اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے اچانک مجھے یاد آتا ہے کہ دلّی سے لائی ہوئی ایک خوبصورت چنی میرے بریف کیس میں پڑی ہے۔ اسے نکال کر فرخندہ کو دیتا ہوں۔ اور نیچے اترنے کو دروازہ کھول لیتا ہوں۔

آغا صاحب کہتے ہیں "اگر ہو سکا تو کل ہوٹل پہ ملنے آؤں گا ورنہ ایئرپورٹ پر ملاقات ہوگی"

میں ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں۔ ایک بیرہ سلام کر کے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا ہے۔ وہ پوچھ رہا ہے" صاحب کھانا لاؤں؟" کمرے میں پہنچ کر میں پوچھتا ہوں "کیا کیا بنا ہے؟"

وہ سب چیزوں کے نام لیتا ہے۔ میں اپنی پسندیدہ اشیاء کا آرڈر دے دیتا ہوں۔ کھانا میز پر لگا کر وہ کھڑا رہتا ہے۔

"صاحب یہ بہت اچھا ہوٹل ہے۔ کسی قسم کا ایسا ویسا کام نہیں۔ کوئی گڑبڑ نہیں۔ آپ کو کیسا لگا؟"

"بہت اچھا۔ سروس بھی بہت اچھی ہے" سروس کی تعریف سن کر وہ برتن اٹھاتا رک جاتا ہے۔ کچھ دیر برتن ہاتھ میں لئے کھڑا رہتا ہے۔ میں سمجھ جاتا ہوں۔ ستر روپے اس کی طرف بڑھا کر کہتا ہوں "تم لوگ آپس میں بانٹ لینا" وہ خوش ہو کر سلام کرتا ہے اور باقی برتن سمیٹنے لگتا ہے۔

آج نیند لانے والی رات اور بات بہت دور ہے۔ یہ لاہور میں میری آخری رات ہے۔ کل میں نے اُڑ جانا ہے۔ میں تسنیم بہن کا نمبر ملانے کی کوشش کرتا ہوں مگر ٹیلی فون ہر بار عجیب و غریب راگنی گا کر میرا منہ چڑا دیتا ہے۔ بے شرم، بد لحاظ کہیں کا۔

سترہ مارچ ۸۲ء اشنان پانی۔ صبح کا ناشتہ۔ سامان سمیٹ کر میں سوٹ کیس ہاتھ میں لئے سیڑھیاں اترتا ہوں تو بیرہ میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیتا ہے۔ میں کمرے کی چابی ریسپشن پہ پکڑاتا ہوں "صاحب کیسا لگا؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟؟" کلرک پوچھتا ہے۔

"نہیں بہت اچھا وقت گزرا"

میں اپنا اٹیچی اٹھا لیتا ہوں۔ بیرہ میری طرف دیکھتے ہوئے سیلوٹ مارتا ہے" میں پوچھتا ہوں، تمہیں پیسے مل گئے۔ کل میں نے....."

اچانک وہ بیرہ سامنے آجاتا ہے جسے کل میں نے ستر روپے پکڑاتے تھے۔ کہتا ہے "وہ تو صاحب ہم تینوں نے بانٹ لئے"

"اوکے۔ اوکے۔ ٹھیک ہے" میں سو کا نوٹ تڑوا کر اپنا اٹیچی لانے والے بیرے کو بیس روپے پکڑا دیتا ہوں"

"صاحب سلام" ایک اور آدمی میرا سوٹ کیس اٹھا لیتا ہے۔ میں سو فیصدی مزدور ہوں مگر اس کے جیب میں پانچ روپے، جو میں آج ڈالنے کے قابل ہوں، کیسے ڈالوں ورنہ فیروز سنز تو یہاں سے سُو سوا سُو گز سے زیادہ دور نہیں وہ کہاں جائیں گے؟"

"یہیں فیروز سنز تک" میں جواب دیتا ہوں۔ وہ میرا سوٹ کیس اٹھاتے میرے ساتھ چل پڑتا ہے۔

فیروز سنز پہ مولانا گلزار محمد صاحب کے پاس میں اپنا سوٹ کیس اور بریف کیس رکھ دیتا ہوں۔ اور خورشید السلام صاحب سے لفٹ مانگ کر ٹریفک پولیس آفس میں واپسی کی رپورٹ درج کرانے چلا جاتا ہوں۔

واپس آتے ہوئے ڈرائیور پوچھتا ہے "صاحب لاہور کیسا لگا؟ کیا کیا دیکھا؟"

"بس ادیبوں، شاعروں اور دوستوں سے ملتا رہا۔ دیکھ تو کچھ خاص نہیں سکا"

"تو چلئے۔ راستے میں میوزیم ہے۔ وہ دکھاتے دیتا ہوں"

عجائب گھر لاہور کی عمارت باہر سے بڑی دِلکش ہے۔ اندر اور بھی زیادہ دلچسپی کے سامان ہیں۔ پرانے زیورات۔ برتن۔ کپڑے دروازے کھڑکیاں پینٹنگس۔ پرانے سکے۔ ٹکٹیں اور میڈل۔ ہندو، بدھ اور جین گیلری۔

پینٹنگس میں مجھے صادقین، امرتا شیر گل اور شاکر علی کا فن بہت پسند آیا۔ استاد اللہ بخش کی پینٹنگ ہل جوتتے ہوئے کسان کے سامنے تو میں کافی دیر محویت کے عالم میں کھڑا رہا ــــــ کتابوں کے سیکشن میں کتاب دشنو پران از دارا شکوہ نے مجھے کافی impress کیا۔ ایک بہت بڑا قرآنِ حکیم جو تقریباً دو فٹ بائی ڈیڑھ فٹ سائز کا ہوگا، بھی بہت دیر میری توجہ کا مرکز رہا۔ اسے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فقیر سیّد نورالدین کو بطورِ تحفہ دیا تھا ــــــ ایک جگہ بھگوان کرشن کی ایک بہت ہی خوبصورت سفید مرمر کی مورتی نظر آئی۔ بنسری کو تھامنے اور ہونٹوں سے لگانے کے لئے اس کے ہاتھ ابھی تک اسی پوز میں لٹکے ہوتے ہیں مگر انگلیوں میں سے بنسری غائب ہے اس لئے دلوں کو موہ لینے والی مدھر تانیں دم توڑتی محسوس ہوتی ہیں ــــــ میوزیم میں دیکھنے کو بہت کچھ ہے مگر وقت کم ہے۔ آج مجھے ڈیڑھ بجے فلائی کرنا ہے۔ میں لپکتا ہوا میوزیم کے باقی حصے دیکھتا باہر نکل آتا ہوں۔

فیروز سنز پر مسٹر خورشید السلام مجھے ایک پرزہ پکڑاتے ہیں۔

محبی چرن صاحب! (ہائے ان لفظوں میں کتنا پیار ہے)
انڈس میں اور پھر یہاں حاضر ہوا۔ تھوڑی دیر میں پھر کوشش
کروں گا۔ آخری بار بغلگیر ہونے کی حسرت ہے۔

محمد اجمل نیازی

ابھی میں یہ سطور ہی پڑھ رہا ہوں کہ اجمل نیازی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ آجاتے ہیں۔ میں دونوں سے گلے ملتا ہوں۔ دونوں بھائی جیسے "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" کی صورت بنے دن بدن سوکھتے جا رہے ہیں۔ میں مذاقاً کہتا ہوں۔ نیازی بھائیو اور نہیں تو کم از کم میانوالی قلعے کی تو لاج رکھو۔ کھایا پیا کرو۔" ہم تینوں ہنس پڑتے ہیں۔

مسٹر خورشید السلام کہتے ہیں "چاولہ صاحب! نوائے وقت سے سرمدی صاحب آپ کا انٹرویو لینے آئے تھے۔"

"کہاں ہیں؟" میں پوچھتا ہوں۔ میں سرمدی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں مگر ان کے انٹرویو سے بھاگنا چاہتا ہوں۔

"ابھی بلاتا ہوں" وہ فون کا چونگا اٹھا کر کہتے ہیں۔

"انہیں دفتر سے بلا لیں گا؟ رہنے دیجئے۔ اب مجھے ایئر پورٹ کے لئے چل پڑنا چاہیئے" میں پھر نیازی برادرز سے محوِ گفتگو ہو جاتا ہوں۔

ٹیکسی کہاں سے ملے گی کتنی دیر میں ایئر پورٹ پہنچائے گی۔ ڈرائیور پیسے کے لالچ میں کہیں لمبا راستہ پکڑ کر مجھے لیٹ تو نہیں کر دے گا۔ یہ سب خیالات مجھے دوڑا رہے ہیں۔ اور میں نیازی برادرز کے ساتھ بے تکی باتیں کئے جا رہا ہوں۔ اتنے میں خورشید السلام صاحب کہتے ہیں۔ میں نے سرمدی صاحب کو فون کر دیا ہے وہ دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔

"خورشید صاحب۔ آپ نے ظلم کیا۔ اب وقت کہاں ہے" میں کہتا ہوں اور وقت گزارنے کے لئے نیازی صاحبان کے ساتھ شو روم کا ایک اور چکر لگا لیتا ہوں۔ شاید کوئی اور نئی کتاب ہاتھ لگ جائے جو میں نے ابھی تک نہ دیکھی ہو۔ اور واقعی ایک ایسا موتی ہاتھ لگ جاتا ہے۔ یہ تو مجھے سب سے پہلے دیکھ لینا چاہیئے تھا۔ نقوش کا "ادبی معرکے"۔

کل ہی تو طفیل صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دہلی میں مجھے 'نقوش' باقاعدگی سے بھجوانا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ غالب نمبر کی چاروں جلدیں وزنی تقریباً تین یا چار کلو بھی بھجوائی تھیں اور اپنی لکھی ہوئی کتاب 'جناب' اور 'محترم' (قلمی خاکے) بھی۔ غالب نمبر دہلی میں مجھ سے ایک بہت بڑے لیڈر اور منسٹر نے مانگے تھے تو میں نے دینے سے صاف انکار کر دیا تھا حالانکہ اس منسٹر سے مجھے کسی دوسری جگہ بہت زیادہ فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ جانے وہ 'ادبی معرکے' مجھے دینا کیوں بھول گئے۔ فیروز سنز پر ایک جلد کی قیمت نوّے روپے تھی۔ میں نے ہاتھوں ہاتھ وہیں سے دو جلدیں خرید لی ہیں۔

نیازی صاحب پوچھ رہے ہیں "چاولہ صاحب۔ آپ احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملے؟ وہ بیمار ہیں۔"

• ارے وہ بیمار ہیں۔ انہیں تو میں نہیں مل سکا۔ اچھا میں انہیں فون ہی کئے لیتا ہوں" میں کہتا ہوں۔

میں فون ملاتا ہوں۔" قاسمی صاحب ہیں؟"

• جی میں بول رہا ہوں"

" میں ہرچرن چاولہ بول رہا ہوں۔ صرف تین دن پہلے ہی یہاں آیا ہوں" میں جیسے کسی بڑے آفیسر کے روبرو کھڑا جواب دہی کر رہا ہوں۔

• وہ تو سارا لاہور جان چکا ہے" وہ کہتے ہیں۔

• آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔ سنا ہے آپ بیمار تھے"

" اب کچھ ٹھیک ہوں"

" میں ابھی دہلی کے لئے پرواز کر رہا ہوں ورنہ ضرور حاضر ہو کر نیاز حاصل کرتا۔ بس آپکو سلام کرنے اور آپکی خیریت جاننے کو فون کر لیا۔

• شکریہ۔ پھر کبھی سہی۔ جب بھی آئیے۔ ضرور ملئے گا" وہ کہتے ہیں۔

سرمدی صاحب ایک فوٹوگرافر کو ساتھ لئے دس کی بجائے آٹھ منٹ میں پہنچ گئے ہیں۔ شاید پر لگا کر آتے ہیں مگر گھڑی کی سوئیوں نے اپنا چکر پل بھر کو بھی نہیں روکا ہے۔" چاولہ صاحب آپ کا انٹرویو لینا تھا" وہ کہتے ہیں۔

" دیکھئے بھائی صاحب۔ اس کے لئے بیس پچیس منٹ کا وقفہ درکار ہوگا اور میں وقت کی دولت سے بالکل نادار ہوں" میں گھڑی دیکھتے ہوئے کہتا ہوں۔ ابھی مجھے خورشید السلام صاحب۔ مرزا صاحب۔ بٹ صاحب۔ قریشی صاحب۔ آپ سے اور میانوالی کے نیازی بھائیوں سے گلے ملنا ہے اور آپ شاید جانتے ہوں گے کہ میانوالی کے لوگ گلے لگتے ہیں تو آسانی سے نہیں چھوڑتے۔ پورا بندے کا بندہ اندر اتار لیتے ہیں۔ دل کی گہرائیوں میں اور اسے پتہ ہی نہیں چلتا۔ یہاں تو دو اور ایک کا مقابلہ ہے۔ پھر وہ گوشت خور اور میں پیور ویجیٹیرین"

شکر ہے سرمدی صاحب نے محسوس کر لیا ہے کہ انٹرویو واقعی اس وقت نہیں لیا جا سکے گا۔ لیا بھی تو سوالات کچھ اور جوابات کچھ۔ مگر ان کے فوٹوگرافر نے ان کے اشارے پر میرے کچھ شاید دو فوٹو ایسے ہی میرے انجانے میں کسی بھی پوز میں لے لئے ہیں۔ مجھے تو فلیش گن کی چمک سے ہی پتہ چلا ہے کہ میں قید ہو گیا ہوں۔ دو پوز انہوں نے مجھے کتابوں میں گھرا اور ایک کتاب پڑھتا اور دوسرا حاضرین سے باتیں کرتے لیا ہے۔ کہتے ہیں آپکا کل کا دیا ہوا وہ ٹکڑہ "میرا سپنا سچ ہو گیا" میرے پاس ہے۔ آپ کے فوٹو کے ساتھ اسے ہی چھاپ دوں گا۔ سمجھئے وہی انٹرویو ٹھہرا"

سب سے گلے مل کر میں باہر روڈ پر آ گیا ہوں۔ سب گلے مل چکے ہیں مگر پھر سب روڈ پر باہر میرے ساتھ آ گئے ہیں۔ ہاتھ پھر ملائے گئے ہیں۔ گلے پھر ملا گیا ہے۔ تھوڑی دور ہی ایک ٹیکسی وہیلر اجمل نیازی نے روک لیا ہے۔ ڈرائیور کو سمجھا رہے ہیں کہ سواری معزز مہمان ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ انھوں نے پیسے بھی چکا دیئے ہیں۔" سولہ روپے"

الوداع دوستو! بہت یاد آؤ گے۔ میں تمہیں لوٹ کر لئے جا رہا ہوں مگر دولت تمہاری میں نے ایسی لوٹی ہے جو لٹتی جاتی ہے تو اور بڑھتی جاتی ہے پیار کی دولت۔

واقعی میں لیٹ ہو گیا ہوں۔ ڈرائیور کو پیسے دینے کیلئے جلدی میں پرس نکالتا ہوں تو وہ عینک کو بھی جیب سے ساتھ کھینچ لاتا ہے۔ ٹوٹا تو نہیں مگر ایک شیشہ فریم سے نکل کر اور پہیہ بن کر تھری وہیلر کے نیچے چلا گیا ہے جیسے بچہ روٹھ کر چارپائی تلے گھس جاتا ہے تو ہاتھ نہیں آتا بھی میرا رکنا اب مشکل ہے۔ تلاشِ بسیار کے بعد منا کر اسے باہر نکالتا ہوں۔ بیس روپے ڈرائیور کے حوالے کر کے سلام کر دیتا ہوں اور وہ بھی سلام کیلئے ہاتھ ماتھے تک لے جاتا ہے۔

ایئرپورٹ پر اینٹرنس (Entrance) کے باہر ڈاکٹر وزیر آغا اور سلیم آغا مل جاتے ہیں۔ جلدی میں میں ہاتھ ہی ملا پاتا ہوں مگر وہ کھینچ کر مجھے گلے لگا لیتے ہیں۔ دیری ہو جانے کا احساس انھیں بھی ہے" رام لعل۔ نارنگ صاحب۔ جوگندر پال۔ بلراج کومل۔ تکر تونسوی سب کو میرا سلام پہنچانا"

ہاتھ لہراتا ہوا میں کاؤنٹر کی طرف بھاگتا ہوں۔ دل بھرا ہوا ہے۔ آنکھیں نم ہیں۔ یہاں سے میں نے کیا پایا ہے، کیا کھویا ہے جو دل اداس ہے۔ شاید سارے کا سارا دل ہی کھو دیا ہے۔ لگتا ہے۔ اب اس مکان کی دیواریں رو رہی ہیں جس میں وہ مکین تھا۔ ○○

سرفراز شاکر

کیا کٹا دن کہ اک پہاڑ گیا
رات کی نیند کو اکھاڑ گیا

اُسکو کچھ کہنا چاہتا تھا میں
وہ مگر پہلے ہی سے تاڑ گیا

بکھرے کاغذ کے ٹکڑے کہتے ہیں
پھر کوئی آج خط کو پھاڑ گیا

تھا یہاں اک لدا پھندا سا پیڑ
کوئی آیا اُسے اُجاڑ گیا

تھا س شبنم گُلاب اور مہک
ایسے دامن کو کون جھاڑ گیا

کاٹ لے انگلیاں کہ وہ شاکر
ت پھر کیاریاں بگاڑ گیا

اندرون سیوا نجی گیٹ
جودھپور

ضمیر درویش

دروازے کھلے رہتے ہیں اور ڈر نہیں لگتا
جس دن سے لٹا ہے مرا گھر، گھر نہیں لگتا

تم جب سے نہیں بھیری ہوئی بھیڑ میں شامل
پتھر کی طرح کوئی بھی پتھر نہیں لگتا

محسوس یہ ہوتا ہی نہیں گرم لہو ہے
جب تک کسی رگ پر کوئی نشتر نہیں لگتا

مشکل تو یہی ہے کہ ہے معصوم سا ہر شخص
چہرے سے یہاں کوئی ستمگر نہیں لگتا

ہر چند کسی اور کے پیروں پہ کھڑا ہے
وہ اب بھی مرے قد کے برابر نہیں لگتا

میں آ کے ترے شہر میں جھک جاتا ہوں اتنا
کھڑکی ہو کہ دروازہ کہیں سر نہیں لگتا

تھک کر کسی پتھر کو بنا لیتا ہے تکیہ
یعنی کہیں درویش کا بستر نہیں لگتا

گنبد والی مسجد، دسردل
مرادآباد (یو۔پی)

راشد جمال فاروقی

آنسو بھی تھے آنکھوں میں تو خونِ ناب نہیں تھے
ہنستے ہوئے چہرے تھے کہ شاداب نہیں تھے

ساون تو بہت برسا مگر پیاس غضب تھی
گیلے تو ہوئے کھیت پہ سیراب نہیں تھے

جب خود ہی زمیں بچھ گئی کیا دوش کسی کا
کچھ ایسے بھی منہ زور تو سیلاب نہیں تھے

سب کھو کے بھی کچھ کھونے کا احساس نہیں تھا
سب پا کے بھی کچھ پانے کو بیتاب نہیں تھے

اخلاص کے گوہر ہوں کہ اخلاق کے موتی
ہرچند کہ کمیاب تھے نایاب نہیں تھے

اے - ۱۵۲۸ - آئی - ڈی - پی ایل
دیر بھدر (دھرہ دون) یوپی

معذرت نامہ

دلیپ سنگھ
۴/۵۹، راجندر نگر۔ نئی دہلی - ۵۰

یہ ایک خط کا جواب ہے جو مجھے بلیماران دلّی کے کسی نسیم صاحب نے لکھا ہے۔ اپنے خط میں نسیم صاحب مجھ پر بہت برسے ہیں، خوب گالیاں دی ہیں، ایسی گالیاں جنہیں کھا کر میں بہت بدمزہ ہوا۔ مجھے انھوں نے اور باتوں کے علاوہ گرہ کٹ کا بھائی چور کہا ہے۔ صرف گالیوں پر اکتفا کیا ہوتا تو شاید میں برداشت کر جاتا۔ لیکن انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں کبھی ان کے ہتھے چڑھ گیا تو میری ہڈی پسلی برابر کر دیں گے۔

نسیم صاحب نے اپنے خط میں بڑے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کئے ہیں۔ کچھ اس وزن کے الفاظ جو عبادت بریلوی صاحب اپنے تنقیدی مضامین میں کیا کرتے ہیں۔ ان کے وزن دار الفاظ سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ پہلوان قسم کے آدمی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے آدمی کے دل میں میرے لئے پرخاش کا خیال رہے اس لئے میں اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔

میرا خط پڑھنے سے پہلے نسیم صاحب کی ناراضگی کا پس منظر دیکھ لیجئے۔ کچھ مہینے پہلے مرزا عبدالودود کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "گٹھلیوں کے دام" شائع ہوا تھا۔ مرزا اپنی کتاب میرے پاس لائے تھے کہ میں اس پر تبصرہ کر دوں۔ وہ تبصرہ دلی کے رسالہ "گھاٹ" میں شائع ہو گیا۔ نسیم صاحب نے وہ تبصرہ پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "گٹھلیوں کے دام" مزاحیہ ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ چنانچہ بیس روپے میں انھوں نے یہ کتاب خرید لی۔ جب کتاب پڑھی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ ٹھگ لئے گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کتاب پڑھ کر انہیں یوں لگا جیسے کسی نے ان کی جیب کاٹ لی ہو، جس میں بیس روپے تھے۔ اور چونکہ انہوں نے یہ کتاب میرے تبصرے کی بنا پر خریدی تھی اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ میں اس جیب کترے کا رشتہ دار ہوں۔

" نسیم صاحب آپ کے خط کو پڑھنے سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کو کتاب پڑھنے کی تمیز تو شاید ہے۔ تبصرہ پڑھنے کی ہرگز نہیں ہے۔ میں نے یہ ہرگز نہیں لکھا کہ یہ کتاب مزاحیہ ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ میں جانتا ہوں میں نے یہ بھی نہیں لکھا کہ مرزا عبدالودود کی کتاب بالکل واہیات چیز ہے۔ لیکن اگر میں اس طرح لکھتا تو مرزا اسی طرح میرے خون کے پیاسے ہوتے جیسے آج آپ ہیں۔ اور ماشاءاللہ انکی صحت آپ کی صحت سے کسی لحاظ میں کم نہیں۔

آیئے میں آپ کو تبصرہ پڑھنا سکھاؤں۔ میں نے لکھا تھا کہ "مرزا عبدالودود نے بہت ہی قلیل مدّت میں مزاح نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنا لی ہے" آپ نے سمجھا میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مرزا جب مزاح کے میدان میں داخل ہوئے تو وہاں پہلے سے موجود مزاح نگاروں نے اپنی اپنی نشست چھوڑ کر ان کی خدمت میں گزارش کی کہ حضور یہ کرسیاں دراصل آپ ہی کے لائق ہیں۔ تشریف رکھئے نسیم صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں نے تو تبصرے کی زبان میں یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ مرزا نے مزاح نگاروں کی صف میں بالکل ایسے جگہ بنائی ہے۔ جیسے ریل کے ایک بہت ہی بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ایک نیا مسافر اپنی جگہ بناتا ہے۔ یعنی دروازہ بند پاکر پہلے انہوں نے کھڑکی سے بستر اور صندوق پھینکا۔ پھر اسی رستے خود کود پڑے۔ بستر کسی کے سر پر پڑا صندوق نے کسی اور کو زخمی کیا۔ ایک دو مسافر ان کے بوجھ کے نیچے دب گئے۔ ایسا بھونچال آنے پر لوگ خود ہی ادھر اُدھر سرک گئے اور اس طرح مرزا نے اپنی جگہ بنا لی۔

میں نے لکھا تھا کہ "مرزا نے ابھی ابھی اس دشت میں قدم رکھا ہے۔ اس دشت کی سیاحی کے لئے تو عمر پڑی ہے۔" آپ سمجھے میں کہنا

ہوں کہ ان کا قدم پڑتے ہی اس دشت میں پھول اُگ آئے ہیں۔ جب وہ پوری عمر اسی دشت میں قدم رکھے رہیں گے تو یہ دشت نشاط باغ بن جائے۔
حضور میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو مرزا کو بڑے پیار سے یہ مشورہ دے رہا تھا کہ بھیا اس دشت کی سیاحی کے لئے عمر پڑی ہے۔ ابھو سے اس میں کیوں کود رہے ہو۔ بیس پچیس سال اور صبر کرو۔ جب کوئی اردو پڑھنے والا نہیں رہے گا تو آپ شوق سے اس دشت کی سیاحی کرتے رہنا تاکہ کوئی آپ کی اس بے راہ روی پر اعتراض ہی نہ کر سکے۔

میں نے لکھا ہے کہ "مرزا کا لکھنے کا انداز ریسی (RACY) ہے"۔ آپ نے سمجھ لیا کہ ان کے انداز بیان میں وہی روانی ہے جو ریس کے گھوڑوں میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک خوبصورتی ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ تیزی سے منزل تک پہنچنے کی آرزو۔ نہیں صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ ریسی (RACY) سے میرا مطلب گھوڑ دوڑ ہی سے ضرور تھا لیکن ان گھوڑوں کی دوڑ سے نہیں جو بمبئی کے مہالکشمی میدان میں دوڑتے ہیں۔ بلکہ ان گھوڑوں سے تھا جو تانگوں کے آگے جتتے ہیں۔ اور جو سڑکوں پر پیدل اور سائیکل سوار لوگوں کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور اگر اَڑ جائیں تو ایسے اڑتے ہیں کہ کوچوان کا چابک بھی انہیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔

میں نے لکھا تھا کہ "کتاب کے تمام جملے مصنف کی محنت کے آئینہ دار ہیں"۔ آپ سمجھے میرا مطلب یہ ہے کہ مصنف نے ایک ایک جملے پر وہ محنت کی ہے جو ایک ذہین لڑکا اپنے امتحان کی تیاری میں کرتا ہے۔ تاکہ وہ کلاس میں اوّل آ سکے۔ نہیں صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میرا اشارہ اس محنت کی طرف تھا جو ایک دھوبی ایک گندے کھیس میں سے میل نکالنے کی کوشش میں کرتا ہے۔ یعنی پتھر پر مار مار کر۔ اتنے زور سے مارنے کے باوجود کھیس پھٹ جاتا ہے پر میل نہیں نکلتا۔

میں نے لکھا تھا کہ " مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی"۔ آپ نے سمجھا کہ یہ کتاب یوں بکے گی جیسے متھرا کے پیڑے۔ یا ناگپور کے سنگترے یا بمبئی کی بھیل پوری۔ نسیم صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اردو کی کوئی کتاب اِن معنوں میں ہاتھوں ہاتھ نہیں لی جاتی۔ یہ ہمیشہ ہاتھوں ہاتھ دی جاتی ہے۔ یعنی کتاب کو آپ خود شائع کرتے ہیں اور پھر اسے آپ دوسرے ادیبوں کو ہاتھوں ہاتھ بانٹتے ہیں۔ وہ بھی کچھ اس طرح کہ اِس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ یعنی وہ بھی آپ کو اپنی کتابیں اسی طرح پیش کریں۔

جہاں تک مرزا کی کتاب "گٹھلیوں کے دام" کا تعلق ہے۔ میرا مطلب یہ بھی نہیں تھا۔ جب میں نے لکھا کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی تو میرا مطلب تھا کہ پبلشر سے یہ کتاب سیدھے ردّی والے لے جائیں گے۔ وہاں سے یہ لفافے بنانے والوں کے ہاتھ جائے گی۔ وہاں سے یہ حلوائیوں کے ہاں جائے گی اور وہاں سے یہ گاہکوں کے پاس پہنچے گی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اتنی سی بات سمجھ کیوں نہیں پائے۔ خیر بیس روپے خرچ کرنے کے بعد تو سمجھ گئے ہوں گے۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں نے تبصرے میں مرزا کے مضامین میں سے کچھ ایسے فقرے نقل کئے ہیں جو بہت خوبصورت اور معنی خیز ہیں۔ ان سے آپ کو دھوکہ ہوا کہ شاید ساری کتاب ہی خوبصورت ہو گی۔

ایسے کتنے فقرے میں نے نقل کئے تھے ؟ کل چار۔ اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ انہیں کتاب میں سے ڈھونڈنے میں مجھے کتنی ریاضت کرنی پڑی۔ تقریباً پوری رات میں کتاب کو کھنگالتا رہا تب کہیں جاکر یہ فقرے ہاتھ لگے.... ویسے ایک گزارش کر دوں کہ دو سو صفحے کی کتاب میں دو چار جملے تو اچھے نکل ہی آتے ہیں۔ بھائی جان وہ گھڑی جو کئی سال سے بند پڑی ہو وہ بھی دن میں دو بار صحیح وقت بتا سکتی ہے۔

آپ کی شکایت ہے کہ میں نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ " میں تمام اردو داں حضرات کو اس کتاب کے مطالعے کی پرزور سفارش کروں گا"۔ جی میں نے ضرور لکھا ہے۔ لیکن آپ کو یہ تو دیکھنا چاہئے تھا کہ سفارش کرنے والے کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ میں تو دن میں سیکڑوں لوگوں کو سفارشی خط دیتا رہتا ہوں۔ کبھی وزیر نشر و اشاعت کے نام، کبھی وزیر تعلیم کے نام، کبھی شہر کے میئر کے نام کہ اس کو ریڈیو کا اسٹیشن ڈائرکٹر بنا دو۔ اس کو کالج کا پرنسپل بنا دو۔ اس محلے میں پانی کا نل لگوا دو لیکن آج تک میرے سفارشی خط والے لوگوں کو کسی نے سرکاری دفتر کے قریب نہیں گھسنے دیا۔ میری سفارش پر لگے ہوئے نل سے کسی نے پانی نہیں پیا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ نے میری سفارش کیوں مان لی۔

تبصرہ کو جلدی ختم کرتے ہوئے میں نے لکھا کہ " میں مصنف اور قاری کے درمیان کھڑا نہیں رہنا چاہتا"۔ نسیم صاحب آپ

اِس کا مطلب یہ سمجھ کہ کتاب اتنی دل چسپ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ قاری جلد سے جلد اس کا مطالعہ شروع کردے اور اس سے لطف اندوز ہو نہیں جناب میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو قاری بھی اس کتاب کو پڑھے گا مصنف کی گردن پر ہاتھ ڈالنا چاہے گا۔ قاری کے کتاب پر پہنچتے ہی مار پیٹ ہوگی۔ اس لئے میں جلد از جلد راستے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ اس مار پیٹ میں میری پگڑی اترے۔

اب صرف اتنی سی بات رہ گئی کہ تبصرے اس طرح کیوں لکھے جاتے ہیں کہ آپ جیسا سیدھا سادھا قاری ان کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اس سلسلے میں عرض ہے۔ کہ تبصرے کا یہی اصول ہے۔ اور یہ اصول میں نے نہیں بنایا۔ ایک عرض اور کردوں کہ جب مرزا صاحب اپنی کتاب میرے پاس تبصرے کے لئے لائے تھے تو ساتھ ہی برفی کا ایک ڈبہ بھی لائے تھے۔ برفی بڑی اعلیٰ قسم کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی خوشبو نے کتاب کے بارے میں میری رائے میں مداخلت کی ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ اچھے جہیز کے ساتھ ایک معمولی لڑکی ایک اچھی دلہن بن جاتی ہے اور ساس سسر کے علاوہ دولھا میاں کو بھی خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ تبصرہ نگاری میں اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے تو محض برفی کی وجہ سے۔

امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ تبصرہ کس طرح پڑھا جاتا ہے۔ یقین مانئے بیس روپے میں یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو بندہ معافی کا خواستگار ہے۔"

آپ کا خیر اندیش

تبصرہ نگار ○

بقیہ صفحہ ۲۷ اقبال۔ جہانِ دیگر

ایک زندہ کتاب ثابت ہوگی کم از کم اس وجہ سے بھی کہ اس کتاب میں ایک ایسا مراسلہ موجود ہے جو اقبال فہمی کو صحیح خطوط پر استوار کرنے میں معاون ثابت ہوگا کیا عجب کہ جب قائدِ اعظم کے مکاتیب اقبال (۱۹۴۳ء) کے پیش لفظ میں یہ لہجہ اختیار کیا ہو تو اس کے پسِ پشت کچھ ضروری تاریخی وجوہات کارفرما ہوں قائدِ اعظم لکھتے ہیں:

"مسلم لیگ کی یہ بڑی کامیابی تھی کہ اس کی رہنمائی (مسلمانوں کے) اکثریت و اقلیت دونوں طرح کے صوبوں نے بالآخر قبول کی اس کام کی انجام دہی میں سر محمد اقبال کا بہت نمایاں حصہ تھا اگرچہ اس وقت یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں تھی۔۔۔۔" کیا قائدِ اعظم نے اس تحریر میں ایک اہم بات کہی ہے؟ جی ہاں ○○

شاعر کے چند گراں قدر خصوصی نمبر

ایک شمارہ ۸۰ء کے نام ● قیمت ۱۰ روپے

قومی یکجہتی نمبر ● قیمت ۱۵ روپے

افسانہ نمبر ۸۱ء ● قیمت ۱۲ روپے

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع ◎

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری جولائی ۸۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ کیلئے مبلغ ۴۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ اُمید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

ہر لمحہ بڑھتی خاموش رات!

انگریزی : پیرتیش نندی
ترجمہ : ایس۔ ایم حیات
تامل ناڈو پبلک سروس کمیشن، اناسلائی مدراس

وہ سیل میں اکیلا بیٹھا تھا۔

میلی خاکستری مستطیل نما دیواریں اسے سورج کی گرمی، لُو اور اس کے انجانے مستقبل تک پھیلی ہوئی تاریک راتوں سے پناہ بخش رہی تھیں۔ آہنی سلاخوں سے چھن کر آنے والی روشنی سے جو دو قدم لانبے اور تین قدم چوڑے رنگین دھبّے کی شکل میں سیل کے فرش پر پھیلتی تھی وہ دِنوں کی گنتی اور موسموں کی تبدیلی کا اندازہ لگاتا رہتا تھا۔ حالانکہ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں یہ جیل کاٹ رہا ہے اور اس کی سزا کی میعاد کیا ہے۔ وہ گزرتے دنوں کا روشنی کے اس مستطیل نما دھبّے سے اندازہ ضرور لگا لیا کرتا تھا۔

روشنی کا یہ مستطیل نما دھبّہ صبح کو نیلا ہوتا۔ دوپہر کو سیندور کی سُرخی کا رنگ دھار لیتا۔ شام کے دھندلکے میں عنبری رنگ اختیار کر لیتا اور رات کو مطلق سیاہ نظر آتا۔ ایک روز رات کو جب اس نے آسمان پر ستاروں کو ٹمٹماتے دیکھا تو اسے پہلی بار اس حقیقت کا علم ہوا کہ ستاروں کا انکا اپنا بھی ایک رنگ ہوتا ہے۔ اس آہنی مستطیل پر سے ہو کر فضا میں پرواز کرتی ہوئی چڑیوں کو وہ دن بھر بیٹھا دیکھتا رہتا... بیرونی دنیا سے گویا اسکا اتنا ہی رابطہ تھا۔ رات کو وہ ستاروں کے جُھرمٹ کو پہچاننے کی کوشش کرتا اور ایک حد تک انہیں پہچان بھی جاتا۔

بعض اوقات جب دن کافی منوّر ہوتا تو روشنی کے اس مستطیل نما دھبّے کو وہ اپنے سیل کے فرش پر منعکس پاتا۔ اس کے ذریعہ وہ نیلے آسمان پہ محوِ پرواز پرندوں کے عکس کا نظارا کرتا۔ شکروں اور مرغابیوں کو اوپر سے نیچے جھپٹا مارتے دیکھتا۔ بعض اوقات وہ خود سر اور سرکش رام چڑیا کو بجلی کی چمک کی طرح غوطہ مارتے دیکھتا ـــــ اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی آزادی کا خواب دیکھنے لگتا۔

ایک دن بہار کی پہلی تیز جھڑی کے بعد اس نے دیکھا کہ سیمنٹ کے بھُورے فرش پر پانی میں دُھلے اس آہنی مستطیل نما روشندان کا عکس قدرے پھیلا ہوا ہے۔ اس نے دیکھا کہ آسمان کے نیلے پس منظر میں اِس سرے سے اُس سرے تک پھیلی شاخ پر نازک اور چھوٹی چھوٹی سبز پتّیاں پھوٹ پڑی ہیں اور چڑیاں اس شاخ پر پھُدک پھُدک کر اڑنے لگی ہیں۔

جب شام کا دھندلکا فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا زمین پر اتر آیا اور آسمان پر خاموشی کی چادر سی تن گئی تو وہ مستطیل اس سیل کے فرش پر بدستور موجود تھا۔ اس نے اس مستطیل کے ذریعہ دیکھا کہ تاریکی سے اٹے آسمان پر چڑیاں قطار در قطار اپنے گھونسلوں کی طرف محوِ پرواز ہیں۔ اور رات کسی تائب گنہگار عاشق کی طرح گھر واپس آ چکی ہے۔

سنتری کے اس کے کھانے کی پلیٹ لئے سیل میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے زمین پر پھیلے اس مستطیل کو چٹائی تلے ڈھانپ دیا تھا۔ یہ مستطیل اس کی آزادی کا وسیلہ تھا اس کا تحفظ وہ دل و جان سے کرنے لگا تھا۔ اس احتیاط کے ساتھ وہ اسے چھپائے رکھتا کہ جیل کے عملے کے افراد کی نگاہ اس پر نہ پڑے۔

آسمان کئی رنگ بدل چکا تھا۔ راتوں کے بعد کئی صُبحیں آ چکی تھیں۔ بہار کی شان و شوکت کو پُرجوش گرمی نے کھدیڑ دیا تھا لیکن وہ مستطیل اس سیل کے فرش پر بدستور قائم رہا۔

کبھی کبھی اس مستطیل کی آہنی سلاخوں سے وہ باہر جھانکتا اور دیکھتا کہ دُور ـــــ بہت دُور ـــــ آسمان محوِ سفر ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ

محتاط اور ہوشیار رہتا۔ جب بھی وہ مستطیل سے زیادہ قریب ہوجاتا اس کا سر جھکنے لگتا اور باہر کا خالی پن اس کی آنتوں میں داخل ہوجاتا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی آزادی کا خواہاں تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اپنے سیل کے فرش پر بنا یہ مستطیل ہی اس کی رہائی کا واحد راستہ ہے۔ وہ مستطیل جو آسمان کی لامحدود پنہائیوں سے جا ملتا ہے۔ وہ آسمان ــــــ اس کا اپنا آسمان ــــــ دن میں دو مرتبہ جب کہ سنتری سلاخوں کے دروازے کو تھوڑا سا کھولتا اور کھانے کی پلیٹ کو لاپروائی اور سختی کے ساتھ اس سیل کے اندر سرکا کر دوبارہ بند کر دیتا یہ اس مستطیل کو اپنی چٹائی تلے ڈھانک دیتا۔ زمین پر پھیلے اس آسمان کو تکتے ہوتے وہ اپنے حصّے کا کھانا کھا لیتا اور پلیٹ کو آہنی دروازے کی سلاخوں کے ذریعہ باہر رکھ دیتا تاکہ سنتری دوبارہ سیل کا دروازہ نہ کھول دے اور زمین پر اتر آتے اس کے اپنے آسمان کو نہ دیکھ لے ــــــ اکثر وہ اس سیل سے فرار ہوجانے کا منصوبہ باندھتا لیکن ایک ڈر اس کے ذہن سے چمٹا ہوا تھا اور اس مستطیل کے باہر چھلانگ لگانے کی اہمیت اس میں مفقود ہو چکی تھی۔ وہ اپنے اطراف گھیرے کھڑی دیواروں کی بلندی سے ڈرنے لگا تھا۔ ان دیواروں کے ہوتے ہوتے کوئی بھی آسمان میں چھلانگ لگانے کی بات کیونکر سوچ سکتا ہے ــــــ لیکن حیرت یہ تھی کہ ایک دن جوں ہی اس نے مستطیل تک پہنچ کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو راستہ میں کوئی دیوار حائل نظر نہیں آئی اس کے سامنے صرف آسمان ہی پھیلا ہوا تھا ــــــ لامحدود نیلا آسمان ــــــ وہ خوفزدہ ہوکر اپنے آپ میں سمٹ گیا اور محسوس کرنے لگا کہ سیل کی چہار دیواری میں وہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ اس دن سے اس نے مستطیل سے قریب ہوکر باہر جھانکنا ہی ترک کر دیا تھا۔ اپنے سیل کے ایک کونے میں بیٹھا رہتا اور اس مستطیل کے ذریعہ آسمان کی طرف تکتا رہتا۔ اس کے دل میں ایک خواہش سی اُبھرتی کہ ایک نہ ایک دن کسی طرح وہ اس سیل سے رہا ہوجائے۔

ایک دن اسے احساس ہوا کہ اس سے کوئی لاپروائی سرزد ہوتی ہے اس نے دیکھا کہ سنتری کے کھانا لے آنے کے کچھ ہی پہلے اس نے مستطیل کو چٹائی تلے چھپا دیا تھا لیکن چٹائی کے ایک سرے سے اس مستطیل کا ایک کونہ باہر نکل پڑا تھا۔ رات کا کھانا لے آنے سے پہلے اس نے اس مستطیل کو پھر سے دیکھا۔ چٹائی کے ایک سرے سے چند ستارے جھانکنے لگے تھے۔ تبھی اسے یہ احساس ہوا کہ مستطیل کی جسامت بڑھنے لگی ہے۔ مہینوں اس سیل میں اس کے ساتھ رہ کر اس تبدیلی سے وہ واقف نہیں ہوا تھا۔ وہ اگر محتاط نہ رہے اور ہوشیاری سے کام نہ لے تو ایک نہ ایک دن جیل کا کوئی بھی افسر اس مستطیل کو ضرور دیکھ لے گا۔ یہ اسکی خوش قسمتی تھی کہ آج تک کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

اب وہ زیادہ ہوشیار رہنے لگا۔ وہ ہمیشہ اس مستطیل کو ایک خاص زاویہ کی صورت میں ڈھانکے رکھتا تاکہ چٹائی سے باہر نکلا حصّہ بھی ڈھک جاتے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی یہ کوشش بے سود ہے۔ بالآخر اس نے معاملہ تقدیر کو سونپ دیا۔

تقدیر نے یاوری کی۔ فرش پر پھیلے اس مستطیل کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اگر کسی نے دیکھا بھی تو یہی سمجھا کہ آسمان سے چھن کر آنے والی روشنی کا عکس ہے اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔

وہ مستطیل پھیلتا ہی رہا ــــــ بڑا اور بڑا۔ اب اسے راتوں میں زیادہ سے زیادہ تارے نظر آنے لگے تھے۔ دن بھر آسمان پر ہر لمحہ بنتے بگڑتے رنگوں کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اب وہ بے حد محتاط رہنے لگا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ مستطیل کی سلاخوں کا درمیانی فاصلہ دن بدن بڑھنے لگا ہے۔ اور اس کا مستطیل کے قریب پہنچنا خطرے سے خالی نہیں۔ ہوسکتا ہے وہ باہر گر پڑے۔ اس ڈر کے ساتھ اس نے سیل میں اِدھر اُدھر گھومنا بھی بند کر دیا اور ایک محفوظ کونے میں دبکا بیٹھا رہتا۔ صرف اسی وقت دروازے کے قریب آتا جب اسے کھانے کی پلیٹ دی جاتی۔ یہاں تک کہ اپنے پلنگ کو جو مقابل کی دیوار سے زنجیر سے بندھا ہوا تھا اس نے بڑی مشکل کے ساتھ ایک کونے میں منتقل کیا۔

دن گزرتے گئے۔ ہفتے اور مہینے بیتے۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ سیل میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک محفوظ کونے میں پنجوں کے بل کھڑا رہا تبھی سیل کے دروازے پر لگے آہنی تالے میں گھومتی چابی کی آواز سنائی دی اور ایک ہاتھ جس میں کھانے کی پلیٹ تھی اندر داخل ہوا۔ پھر ایک آواز سنائی دی۔ کل صبح تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ پھر دروازہ اس پر بند کر دیا گیا۔ تاریک سیل کے ایک کونے میں خطرناک انداز میں اپنا توازن برقرار رکھتے ہوتے وہ پنجوں کے بل کھڑا مارے خوف کے تھرّانے لگا تھا۔ شام ڈھل چکی تھی اور وہ جان چکا تھا کہ وہ رات اسے اسی سیل میں گزارنی ہوگی۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر دیکھئے)

رفتار ـــــ علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

لکھنؤ۔ اردو رابطہ کمیٹی کے زیرِ اہتمام اردو دوستوں، مختلف ادبی تنظیموں اور سیاسی جماعتوں نے اردو اکاڈمی کے دفتر کے سامنے تین گھنٹے تک پُر امن احتجاجی مظاہرہ کرتے ہوئے صدر اردو اکاڈمی کا پُتلا نذرِ آتش کیا اور مُردہ باد کے نعرے بھی لگائے۔ یہ مظاہرہ یوپی کے ایک وزیر واسدیو سنگھ کے اردو کے خلاف اشتعال انگیز بیان اور اکاڈمی کی عاملہ کے ممبران کے استعفیٰ کی واپسی کے خلاف احتجاج کے طور پر کیا گیا۔ اس مظاہرے میں اس بات پر زور دیا گیا کہ جب تک اردو کو یوپی میں دوسری سرکاری یا نیم سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جاتا اکاڈمی کی رکنیت نہ قبول کی جائے۔ اردو رابطہ کمیٹی کے کنوینر رام لعل، نائب چیئرمین ملک زادہ منظور احمد اور کنوینر عباس ردولوی کی زیرِ قیادت اس مظاہرے میں مظاہرین کی مجموعی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ تھی جن میں مشہور ادبا، شعرا، فن کار اور اردو کے بہی خواہ شامل تھے۔

اردو رابطہ کمیٹی یوپی کے تمام اضلاع میں رائے عامہ ہموار کرے گی اور اس کے بعد کاؤنسل ہال کے سامنے ایک بہت بڑا مظاہرہ کیا جائے گا۔

کانپور۔ ینگ ساہتیہ سمیلن کے زیرِ اہتمام منشی پریم چند جینتی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے ریاستی وزیر غذا واسدیو سنگھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو زبان کے لئے کہا کہ:

- موجودہ آئین کی موجودگی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔
- اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، یہ برٹش سامراج کی دین ہے۔ انگریزوں ہی نے ہندوستانیوں پر اردو تھوپی تھی۔
- اگر حکومت نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے کر ہندی پر تھوپنے کی غلطی کی تو یہ بات ناقابلِ برداشت ہوگی۔
- حامیانِ اردو ملک میں لسانی بنیاد پر بدنظمی پھیلانا چاہتے ہیں۔ ملک ایک بار تقسیم ہوچکا ہے اور اب زبان کی بنیاد پر مزید تقسیم کردینا چاہتے ہیں۔
- اس وقت اردو داں اور اس کے حامی ملک کے وفادار ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آنے والی نسل وفادار ہوگی۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ اور ادارۂ تحقیقات اردو کے باہمی تعاون سے "بہار کے افسانہ نگاروں کا سہ روزہ کنونشن" لائبریری کے آڈیٹوریم میں ۲۰/ جولائی ۱۹۸۵ء کو منعقد کیا گیا جس میں بہار کے ۲۴ افسانہ نگاروں نے حصّہ لیا۔ کنونشن کی صدارت پروفیسر محمد محسن اور افتتاح جناب کلام حیدری نے کیا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں خدا بخش لائبریری کی کارکردگی پر روشنی ڈالی اور کنونشن کی غرض و غایت بیان کی۔ جو افسانے پڑھے گئے ان پر مکمل کر بحث ہوئی۔ کلام حیدری صاحب نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے چند بنیادی سوال اُٹھائے۔ اس بحث میں احمد یوسف، علی امام، اشین مظفر پوری، قاسم خورشید اور قمر جہاں نے حصّہ لیا۔

۲۸/ جولائی ۱۹۸۵ء کی شام کو بستی حضرت نظام الدین کے غالب اکیڈمی ہال میں مرحوم عزیز لکھنوی کی پچاسویں برسی کے موقع پر ایک نہایت ہی سنجیدہ اور پُروقار تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ تقریب عزیز یادگار کمیٹی کی جانب سے منائی گئی۔ جلسہ کا انعقاد جناب ذہین نقوی سکریٹری غالب اکاڈمی کی استقبالیہ تقریر سے ہوا۔ اس کے بعد مشہور شاعر آنند نرائن ملا نے ڈاکٹر مسعود حسن رضوی کی کتاب "عزیز لکھنوی ـــــ حیات اور کارنامے" کا اجرا کیا اور عزیز لکھنوی کے فن اور شخصیت پر مختصر مگر بھرپور روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے عزیز لکھنوی کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا۔ کرشن موہن اور ابرار کرتپوری نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس جلسے کی صدارت کرنل بشیر حسین زیدی نے کی۔ جلسہ کا دوسرا دور محفلِ مشاعرہ تھا جس کی صدارت بھی کرنل بشیر حسین زیدی نے کی اور نظامت کے فرائض مشہور شاعر مخمور سعیدی نے انجام دیے۔

دہلی اردو اکادمی نے ماہنامہ شاعر کی تاریخ ساز علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کو سراہتے ہوئے دو ہزار روپے کی خصوصی گرانٹ دی ہے

کتب و رسائل

● **غالب کے خطوط** (جلد دوم) غالب کے تمام خطوط کی سائنٹفک ترتیب و تدوین کے عظیم تحقیقی پروجکٹ کے سلسلے کی یہ دوسری جلد ہے۔ جلد اوّل کی طرح جلد دوم میں بھی ڈاکٹر خلیق انجم نے بے پناہ تلاش و جستجو کے ساتھ غالب کے ۲۷۵ خطوط کی تدوین کی ہے۔ ۲۲ خطوط کے عکس دیے ہیں۔ متن کے ماخذ اور تمام خطوط کی تفصیلات مع سنین دی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں ۸۸ صفحات پر مشتمل حواشی دیے گئے ہیں۔ ضخامت ۹۷۰ صفحات قیمت ۷۵ روپے
پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، رائوز ایونیو نئی دہلی۔

● **مراۃ المعرفت**۔ سرزمین کوکن کے علاقے بانکوٹ کے ایک بزرگ شاعر عارف سیمابی بانکوٹی کا اوّلین شعری مجموعہ ہے۔ کلاسیکی شاعری کا یہ خوبصورت مجموعہ کوکن رائٹرس گلڈ شاخ نیر دہلی (کلینیا) کے زیرِ اہتمام موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولہ مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ ضخامت ۲۰۶ صفحات۔ قیمت چالیس روپے۔ پتہ: عارف سیمابی بانکوٹی، بانکوٹ ۴۱۵۲۰۱ ضلع رتناگیری (مہاراشٹر)

● **غزلیاتِ غالب کا عروضی تجزیہ**۔ یہ کتاب غزلیاتِ غالب کا مکمل عروضی تجزیہ فراہم کرتی ہے جسے صغیر النسا بیگم نے نہایت ہی دیدہ ریزی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ مصنفہ نے جہاں فنِ عروض کے بارے میں بنیادی تفصیل دی ہے وہیں تقطیع کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ ان ۹ بحروں اور مزاحف بحروں میں غالب کی غزلوں کو علٰحدہ علٰحدہ ترتیب دیا ہے جن بحروں میں غالب نے طبع آزمائی کی ہے۔ غزلیاتِ غالب کی بحروں کے زحافات پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد ہر غزل کی پوری پوری تقطیع دی گئی ہے۔ ضخامت ۴۵۲ صفحات۔ قیمت ۷۵ روپے۔ پتہ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی۔

● **شبستان** (فیض نمبر) شبستان اردو ڈائجسٹ نے عالمی شہرت یافتہ شاعر فیض احمد فیض پر ایک نہایت ہی وقیع اور دیدہ زیب خاص نمبر شائع کیا ہے۔ ۳۲۴ صفحات کے اس خوبصورت نمبر میں فیض احمد فیض کی شخصیت اور فن کے تمام گوشوں کو مشاہیر اہلِ قلم کے مضامین کے ذریعہ ابھارا گیا ہے۔ رنگین اور سادہ تصاویر نے اس نمبر کو اور زیادہ باوقار بنا دیا ہے۔ نمبر کے آخر میں فیض کے تمام شعری مجموعوں میں سے ایک معیاری انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس اشاعتِ خاص کی قیمت ۱۵ روپے ہے۔ پتہ: شبستان اردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی۔

● **مسندِ صدارت سے** یہ مشہور و معروف شاعر ضیا فتح آبادی کے ان خطبات کا مجموعہ جو انھوں نے گزشتہ تیس برسوں میں مختلف مشاعروں اور جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے تحریر کئے اور پڑھے۔ اس کتاب میں ۲۵ خطبات شامل ہیں جسے ہم اردو شعر و ادب کا منظر نامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ فی زمانہ اپنی نوعیت کی اہم کتاب جو تاریخِ ادب اردو میں تحقیق معاونت بھی کر سکتی ہے۔ ضخامت ۱۲۶ صفحات، قیمت ۱۵ روپے۔ پتہ: بزم سیماب جے ۵/۲۱، راجوری گارڈن نئی دہلی۔

● **اردو زبان**۔ ماہنامہ اردو زبان سرگودھا کا تازہ شمارہ جو خاص نمبر کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ایک نعت، آٹھ غزلیں اور ایک افسانہ شامل ہے لیکن یہ خاص نمبر انور سدید کے ایک طویل ترین مقالے "غلطیہائے مضامین" کو ۱۳۰ سے بھی زائد صفحات میں سمیٹے ہوئے۔ یہ مقالہ ماہنامہ "جواز" (مالیگاؤں) میں وزیر آغا پر شائع شدہ نفیس جعفری کے ایک طویل مضمون کا بھرپور جواب ہے۔ اس خاص شمارے کی قیمت ۱۵ روپے ہے۔
پتہ: ماہنامہ اردو زبان، ریلوے روڈ، سرگودھا، (پاکستان)

● **نقش بر آب**۔ نئی نسل کے حساس فن کار فیروز عابد کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ جس میں وہ ۱۱ افسانے شامل ہیں جو مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو کر پسند کئے جا چکے ہیں۔ ۹۶ صفحات کی اس خوب سیرت کتاب کی قیمت ۲۰ روپے ہے۔ پتہ بیت القاسم ۱/H-۳/۱۲، ٹھورا بگان لین، کلکتہ ۹۔

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی ۔ علامہ سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

بہ یادگار ۔ اعجاز صدیقی (مرحوم)

اشاعت کا ۵۶ واں سال ● علمی، ادبی و تہذیبی ماہنامہ

بمبئی

جلد ۔ ۵۶ شمارہ ۔ ۸ ۔ ۹

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالک غیر سے
۴۰ روپے	۱۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

قیمت : ● سات روپے

فون ۰۱ ۳۵۹۹۰۴

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶،
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

اردو زبان کے
بزرگ شاعر
منشی عبدالکریم شفقؔ
کا
اوّلین شعری مجموعہ
سی پارۂ دل
شائع ہوگیا ہے

انتخاب و پیشکش ● عبدالاحد سازؔ ○ ترتیب و تدوین ● نظام الدین نظامؔ

قیمت: ۱۱ روپے

کلاسیکی شاعری کا یہ خوب سیرت مجموعہ درج ذیل پتوں پر دستیاب ہے

کچھی میمن جماعت خانہ، کامبیکر اسٹریٹ، بمبئی نمبر ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، جے جے ہسپتال، بمبئی ۳

شمارہ ۵

خیال، لفظ، لمحے

میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں اور شدت سے محسوس کر رہا ہوں اسے بیان کرنا چاہتا ہوں جو میرے لئے مشکل تو نہیں کیونکہ میرے پاس الفاظ کی کمی نہیں ہے، بے شمار الفاظ ہیں میرے پاس، کام کے بے کام کے، فالتو، بے رس، بے روح، اچھے، برے، کھردرے، کھوٹے، ہر طرح کے الفاظ۔ میں اپنا مافی الضمیر اپنے آپ میں اور اپنے اطراف بکھرے ہوئے الفاظ میں ادا کر سکتا ہوں۔ خیال، لفظ اور لمحہ، ایک دنیا ہے۔ ایسی دنیاؤں کی تخلیق پر میں قادر ہوں کیونکہ مجھے ایک ہی نعمت عطا ہوئی ہے جس کا میں آزادانہ طور پر استعمال کر سکتا ہوں، نہ مجھے کسی کا خوف ہے اور نہ کوئی مجھے ٹوکنے والا، میں بہ آسانی ہر لمحہ کو الفاظ کی سوغات دیتا رہتا ہوں۔ میں الفاظ کے تمام کھیل جانتا ہوں —— میں الفاظ کا خدا ہوں —— لیکن !!

میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں اور شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں اس کا بارہا اظہار کر چکا ہوں۔ کل کائنات میرے اظہار کی گونج میں سما گئی ہے لیکن مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میرے خیال کی ترسیل نہیں ہو سکی ہے۔ کیا خیال الفاظ میں اور الفاظ لمحوں میں گڈمڈ ہو گئے ہیں؟ کہیں لفظ مجھ پر حاوی تو نہیں ہو گئے ہیں؟ کہیں لفظ لمحوں کی سازش نے میرے خیالات کا اغوا تو نہیں کر لیا ہے؟ میرے خیالات کا قتل تو نہیں کر دیا ہے؟ یا خیال، الفاظ اور لمحوں میں اب کوئی ارتباط نہیں رہا ہے اور تینوں الگ الگ سمتوں میں گامزن ہیں —— کچھ ہوا ضرور ہے ورنہ مجھ میں یہ خواہش سر کیوں ابھارتی کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، یا تو میں نے کچھ کہا نہیں ہے، اگر کہا ہے تو اس کا رد عمل کیوں نہیں ہوا —— مجھے سب کچھ میکانکی کیوں لگ رہا ہے۔ لفظ حاوی ہو گئے ہیں یا بے معنی ہو گئے، یا پھر لفظ رہے ہی نہیں سب ایک شور میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ تو کیا میں شور میں کہیں گم ہو گیا ہوں یا لفظ لمحوں نے مجھے بے نام کر دیا ہے —— آخر ماجرا کیا ہے؟

دراصل میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں اور شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں اس کا اظہار چاہتا ہوں لیکن لفظ لمحوں کے بغیر یہ ممکن نہیں کیونکہ مجھے اپنی ہر بات کہی ہوئی اور سنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میری شاعری، میرا ادب، میری کتابیں اور رسالے، میری تقریریں، میری گفتگو، سب کچھ کہا ہوا، سنا ہوا ہر طرف لفظ ہی لفظ بکھرے ہوتے ہیں۔ میں لکھ رہا ہوں کہ الفاظ میرے پاس ہیں، میں بول رہا ہوں کہ الفاظ میرے پاس ہیں، ہر پل، ہر لمحہ میں الفاظ بکھیر رہا ہوں۔ صبح سے شام اور پھر صبح تک ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو مجھے بہائے لئے جا رہا ہے۔

شاید یہ شور الفاظ ہی کا ہے کیونکہ لفظ لفظ تصادم ہے ابھرنے والی آوازیں ہی شور پیدا کر رہی ہیں۔ ایک بے پناہ شور۔ چہار سمتوں سے ابل ابل کر آنے والے الفاظ ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ایک جنگ ہے، خیال، لفظ اور لمحوں کے درمیان۔ جنگ تو ہر محاذ پر ہو رہی ہے، قدم قدم جنگ، سانس سانس جنگ، اور یہ سب کچھ لفظ لمحوں کے سبب ہو رہا ہے۔ سب کچھ غلط ملط ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ میرا آج میرے کل سے مختلف ہوگا۔ الفاظ میری مدد کریں گے، مجھے میرے کل سے ملائیں گے۔ میں اپنے سارے سچے خیال، الفاظ اور اظہار کے ذریعہ اپنے عدم تحفظ کے خوف کو غاروں میں چھوڑ آؤنگا۔ وقت میرا رہبر ہوگا اور لمحے میرے ساتھی۔ میرا رہبر، میرے ساتھی اور الفاظ مجھے یہاں تک تو لے آئے لیکن جو کچھ میں اپنے پیچھے چھوڑ دینا چاہتا تھا وہ سب کچھ نئی نئی شکلوں اور ہیئتوں میں میرے ساتھ ساتھ چلا آیا ہے۔ میں نے اپنی مسلسل تقسیم کو اپنے لئے مفید ہی جانا تھا کہ الفاظ مجھے تقسیم ہو جانے کی صلاح دے رہے تھے۔ میں حدوں اور پناہ گاہوں میں پھیلتا ہوا الفاظ کے سہارے سہارے یہاں تک آ گیا ہوں۔ مجھے اپنا یہ ارتقائی سفر بے حد اچھا لگا ہے لیکن جو کچھ میں اس سفر میں چھوڑ آیا تھا بھول آیا تھا وہ مجھے واپس ملنے لگا ہے —— میں الفاظ کا خدا ہوں لیکن میں نے ضروری الفاظ کم اور غیر ضروری الفاظ زیادہ بکھیرے ہیں۔ اب الفاظ میرے خدا ہیں۔ میں سوچتا ہوں تو الفاظ میں، لکھتا ہوں تو الفاظ میں، بولتا ہوں تو الفاظ میں، الفاظ مجھ پر حاوی ہو گئے ہیں۔ چہار سمتوں سے شور ابل رہا ہے، خاموشی کو نیست و نابود کر دیا گیا ہے۔ اب خاموشی کہیں بھی نہیں ہے۔ شاید کبھی تھی بھی نہیں۔

میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں اور شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں اس کا اظہار یا تو میں کر چکا ہوں اور اگر نہیں تو میں اظہار کرنا چاہتا ہوں لیکن لفظ لمحوں کے بغیر۔ مجھے نئے لفظ چاہئیں۔ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے الفاظ میرے خیال کی ترسیل نہیں کر سکیں گے کیونکہ ان الفاظ کے تمام مفاہیم پرانے، فرسودہ اور کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں ورنہ تو کوئی نیا خیال، مجھ میں کہاں سے آ جاتا۔۔۔

(دستخط)

دل اہل دل گریہ کے لیے ہوتا ہے
کیوں بے سبب آنسوؤں سے منہ دھوتا ہے
لا حل نہیں عقدۂ جمع و ثبات جہاں
جب موت یقینی ہے تو کیوں روتا ہے

یہ روح نہ بند غم سے آزاد ہوئی
دم بھر بھی نہ طبع آہ رو شاد ہوئی
خالی نہ رہی ہمارے دل کی بستی
امید گئی تو یاس آباد ہوئی

یہ رباعیاں کلیات جگت موہن لال رواں بہ عنوان روح رواں سے لی گئی ہیں۔ جگت موہن لال رواں (پ ۱۸۸۹ء۔م ۱۹۳۴ء) شاگرد رشید عزیز لکھنوی) لکھنؤ کے نامور وکیل تھے۔ روح رواں مارچ ۱۹۲۸ء میں نامی پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی۔ اس کلیات میں رواں مرحوم نے ۱۹۰۳ء سے مارچ ۱۹۲۷ء تک کا کلام شامل کیا ہے۔ ۲۱۲ صفحات کی اس کتاب میں عزیز لکھنوی مرحوم کا ۴۵ صفحات پر محیط مقدمہ ۳۴ طویل و مختصر نظمیں۔ ۵۷ غزلوں کے ۵۵۳ سے بھی زائد اشعار ۱۵ متفرق اشعار ۲۰ طویل و مختصر قطعات اور ۱۶۲ رباعیاں شامل ہیں۔ یہ کلیات کتب خانہ کالی داس گپتا رضا میں محفوظ ہے۔ (افتخار)

یہ صورت گر
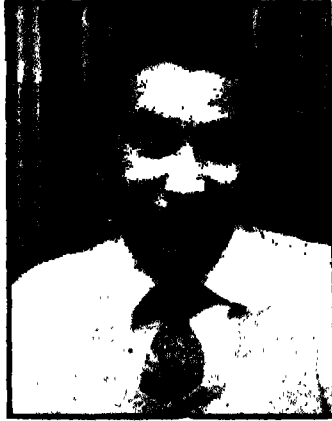
شمس الرحمٰن فاروقی

اقبال مجید

نیر مسعود

حمید الماس

رَونق نعیم

اوم کرشن رَاحت

حقیر آستانی

انور مینائی
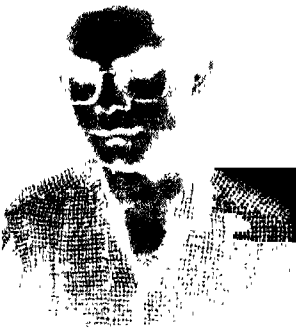
محسن خان

چہرہ چہرہ یاد ہیں

جشنِ سی سالہ شاعر ۱۹۶۰ء کی دو یادگار تصویریں۔ تصویر نمبر ایک میں (دائیں سے بائیں) چند مانوس چہرے جو نمایاں ہیں۔ ماہرالقادری، محی الدین قادری زور، خلیل الرحمٰن اعظمی، شفا گوالیاری، سراج الدین ظفر، سکندر علی وجد، حامد الانصاری غازی، نکیم مرزا حیدر بیگ اور ڈاکٹر رفیق ذکریا۔ مائک پر محترمہ قزلباش۔

تصویر نمبر ۲ میں (دائیں سے بائیں) محوی صدیقی، محی الدین قادری زور، شفا گوالیاری، سکندر علی وجد، مخدوم محی الدین، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، حامد الانصاری غازی، ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ نشاط، عزیز قیسی، شاہد صدیقی۔

Omer Khyam Challenged.
(as far as Poetical Art is concerned)

The modern India's Urdu Poetry (combined with philosophy & artistic beauty) advancing towards the goal of perfection, promises to appeal to the western nations.

Meerza Yagana

Sub Register
Lahur (Dec)

The 22nd Nov 1933.

مکرم ہائے بندہ زاد لطفکم۔ سلام شوق۔ ترانہ کی
ایک کاپی ارسال کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ آپ کوئی
داد طلبی مقصود ہے بلکہ اس امر پر غور کرنے کے لئے کہ لکھنؤ کو
بدنام کرنے والے لکھنویوں نے اردو کے ان نام لیواؤں کو
دنیائے ادب سے مٹا دینے کی ہوس میں ایڑی چوٹی کا زور
لگایا اور جتنا مادی نقصان پہنچانا ان کے امکان میں تھا
اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر آخر منہ کی کھائی ؏

چراغی را کہ ایزد برفروزد
کسے کو تف زند ریشش بسوزد

مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی [illegible]
لاتور دکن ۲۲ر نومبر ۳۳ء

"یہ دونوں تحریریں یگانہ کی رباعیوں کے مجموعے ترانہ (اشاعت ۱۹۳۳ء) کے اس نسخے میں شامل ہیں جو انھوں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کو ۱۱ر نومبر ۱۹۷۵ء کو ارسال کیا تھا۔ انگریزی تحریر الگ ایک پرچے پر لکھ کر کتاب کے ساتھ نتھی کی گئی ہے۔ اردو تحریر ادیب کے نام یگانہ کا خط ہے جو کتاب کے اندرونی سرورق سے پہلے والے اس ورق کی پشت پر لکھا گیا ہے جس پر یگانہ کی تصویر چھپی ہے۔ دونوں تحریریں ۲۲ر نومبر ۱۹۳۳ء کو لکھی گئیں۔
ترانہ کے اس نسخے کی رسید میں ادیب نے یگانہ کو جو خط لکھا اس کے جواب میں یگانہ نے بھی ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو انھیں ایک طویل خط لکھا۔ یہی خط غالب شکن کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا جو یگانہ کے ادبی معرکوں کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔"
یگانہ کی یہ دونوں تحریریں اور ان کے متعلق معلومات ڈاکٹر نیر مسعود کے شکریے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں (افتخار)

شمس الرحمٰن فاروقی

رباعیاں

کیں جو بھی بھلانے کی مساعی لکھتا
افسانۂ لمحاتِ وداعی لکھتا
کاہیدگیِ روح و تبِ خوں کا بیاں
ممکن ہوتا تو میں رباعی لکھتا

خارِ آہن ہوں برگِ زر ہو جاؤں،
سوکھی کھیتی ہوں چشمِ تر ہو جاؤں
ہلکا سا ترے پاؤں پہ یہ چوٹ کا داغ
میں چوم لوں اس کو تو امر ہو جاؤں

تجھ ہرے سے روشن ہیں ملاقاتوں رنگ
تجھ آنکھ سے برسے ہیں برساتوں رنگ
دل چیر کے میرا کبھی دیکھا ہوتا
کس طرح اچھلتا ہے لہو راتوں رنگ

سُستی پر بنیاد نہ ہونے دینا
مقصود کو برباد نہ ہونے دینا
اے دشتِ خلا کا عزم کرنے والے
سیمرغ کو آزاد نہ ہونے دینا

● ڈی II / ۸۵، کاکا نگر، نئی دہلی - ۳

افتخار امام

کچھ یگانہ اور ترانہ کے بارے میں

سب سے پہلے تو یہ چند وضاحتیں ضروری ہیں کہ شاعر میں نایاب و کمیاب کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ کیا ہے اور کیوں۔ ظاہر ہے کہ ادبی رسائل کے لئے یہ ایک بالکل ہی نیا تجربہ ہے۔ ایک ایسا تجربہ جس کے نتائج کچھ بھی ہو سکتے ہیں خصوصاً شاعر جیسے غیر تجارتی ادبی رسالے کے لئے تو یہ تجربہ کئی اعتبار سے جرأت مندانہ ہی کہلائے گا۔ جبکہ ادبی رسائل فی زمانہ بعض بنیادی مسائل کے ساتھ جوجھتے ہوئے اپنے محدود وسائل میں پھنسے ہوئے ہیں یا پھر فرسودگی کا شکار ہیں۔ شاعر کے اپنے وسائل بھی محدود ہیں اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کا علم ہے لیکن ابتدا ہی سے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ شاعر کا ہر شمارہ معیاری، متنوع اور تازہ کار معلوم ہو، شاعر عصری ادب کا رفتار پیما کہلائے۔ شاعر ایک مستحکم صحافتی ادبی روایت ہے اور ہم اس روایت کو منہدم کرنے کے بجائے اسے روشن بہت روشن رکھنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ اسی سعیٔ پیہم سے ابھرنے والے نئے سلسلے کی اولین پیشکش آپ کے سامنے ہے۔

اردو زبان و ادب کے تاریخی تسلسل میں بے شمار کتابیں اور مخطوطات موجود ہیں اور پرانی کتابوں کی اشاعت اور مخطوطات کی تحقیق و تدوین کا کام سب ضرورت ہوتا رہتا ہے تاہم ہر دور میں بعض وہ کتابیں بھی تخلیق و طبع ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ کسی نہ کسی طور زندہ و باقی رہتی ہیں۔ کردار، حوالوں میں، تنقیدی مضامین میں، گفتگو میں، تحریکات و روایت میں، نئی نسل کے لاشعور میں یا پھر عصری ادب میں جذب ہو کر نئے ادب کی تخلیقی قوت بن جاتی ہیں مگر ایسی کتابیں کم ہی ہوتی ہیں لیکن کیا ایسی اہم کتابیں ہمیں ہر دور میں دستیاب ہیں؟ کیا ہمارے ناقدین اور محققین ایسی کتابوں کی از سرِ نو ترتیب و تدوین کی طرف رجوع ہوتے ہیں؟ قدیم ہوتی ہوئی شخصیتیں اور کتابیں تاریخ کا حصہ بن کر امر ہو جاتی ہیں لیکن غیر معمولی شخصیتیں اور کتابیں پھر بھی کم رہتی ہیں۔ کیا ہمارے یہاں ماضی کے کارنامے کی تلاش و جستجو حیات اور کارنامے محدود ہو گئی ہے کہ جیسے چاہا اس چوکھٹے میں سجا دیا یا پھر محض تحقیقی خانہ پری کے لئے کسی قدیم مگر معمولی شاعر، ادیب، اخبار، کتاب یا رسالے کی گرد جھاڑنے کو کارنامہ قرار دیدیا کہ تحقیق برائے تحقیق سے آگے ان کی کوئی اہمیت و افادیت ہی نہ ہو۔ سوال تو یہ ہے کہ نئی نسل کو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ نئے ادب پر ان کاموں کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ نئی زبان کی تشکیل میں اس نوع کی تحقیق کیا معاونت کرے گی؟

شاعر کے حالیہ شماروں میں قبلہ اعجاز صدیقی مرحوم کے منظوم تذکرۂ شعراء "بساطِ سخن" کا سلسلہ شروع کیا گیا تو فن کاروں کے کوائف کی تدوین کی تلاش و جستجو کا سلسلہ بھی شروع ہوا، بظاہر تو یہ لگا کہ کام آسان ہے کہ ہمارے محققین نے پہلے ہی سے بڑے بڑے کارنامے انجام دے رکھے ہیں لیکن جب ان کارناموں کی چھان پھٹک شروع کی تو معلوم ہوا کہ ہم ایسے طالب علموں کو اس دشت کی سیاحی کے لئے خود بھی محقق بننا پڑے گا کیوں کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ جو لوگ ابھی حیات ہیں اور کچھ کام کر رہے ہیں ان پر بھی تحقیقی کام ہو رہا ہے کہ اگلے وقتوں میں جو کچھ ہوا سو ہوا آج کے کاموں میں بھی قیاس کا دخل ممکن ہے۔ "بساطِ سخن" کی ترتیب کے دوران یہ خیال بھی آیا کہ شعراء کو کچھ اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ماہ بہ ماہ ایک تاریخی تسلسل بنتا چلا جائے اسی تاریخی تسلسل میں "مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی" بھی سامنے آئے کیوں کہ ۱۸۸۴ء ان کا سالِ پیدائش ہے اس طرح ۱۹۸۴ء ان کی پیدائش کا صدی سال ہے۔ خواہش ہوئی کہ "بساطِ سخن" کے تحت یگانہ ہی کو پیش کیا جائے۔ ساتھ ہی اہم نایاب و کمیاب کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی ہمارے خاکوں میں شامل تھا۔ یگانہ کی کتابوں میں ان کی رباعیوں کا مجموعہ ترانہ میں بہت پہلے پڑھ چکا تھا اور میرے حافظے میں ترانہ کی بعض رباعیوں کے عکس بھی موجود تھے۔ اتفاق سے یہ کتاب مجھے اپنے کتب خانے میں آسانی کے ساتھ مل گئی چنانچہ فیصلہ کیا کہ ایک مکمل کتاب کے اشاعتی سلسلہ کا آغاز ترانہ ہی سے کیا جائے۔

ترانہ اور یگانہ یعنی کتاب اور صاحبِ کتاب کے انتخاب سے کئی سوال ابھر آئے، کئی واقعات ذہن میں در آئے کیوں کہ یگانہ کے ذکر کے ساتھ ان سے وابستہ واقعات اور معرکوں کا ابھر آنا ناگزیر ہے اور یگانہ کی شاعری کو اسی تناظر میں دیکھا اور پرکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن میرے ذہن میں ترانہ کے ساتھ ایسا کوئی تناظر نہیں تھا اور نہ ہی ماضی کے تلخ واقعات کو تازہ کرنے کا کوئی مقصد۔ یگانہ چونکہ اردو شاعری کا ایک اہم نام ہے اور ترانہ

یگانہ آرٹسٹ کا ایک خوب صورت فن پارہ لہذا نئی نسل کے لئے اسی کتاب کی تدوین کو مناسب سمجھا۔

یگانہ ایک ایسے تخلیق کار کا نام ہے جس نے اپنی شاعری کو مروجہ اسلوب اور ڈکشن سے الگ کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ میرا خیال ہے کہ ہر ذہین فن کار اپنے اندرون میں بے پناہ تخلیقی قوت رکھتا ہے لیکن ایسی قوت جو بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف کرتی ہے۔ جو اپنا راستہ آپ بناتی ہے۔ یگانہ کی شعری شخصیت کا تیزابی لہجہ دراصل ان کی مخصوص ذہنی ساخت ہی کا نتیجہ ہے۔ شاعری اور شخصیت کی یہ مطابقت معاصر زندگی کو اپنی پوری سچائی کے ساتھ پیش کرتی ہے اگر فن کار زندگی کی تمام تر پیچیدگیوں کو اپنے آپ میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسے اپنے پورے شعری ورثے کا ادراک ہو اور فن پر پوری گرفت ہو۔

یگانہ کی ذہنی ساخت کو جن محرکات و عوامل نے تشکیل دیا تھا اور وہ جس شدت آمیز انتہاپسندانہ مزاج کے اسیر ہو گئے تھے اس نے انھیں تا عمر پریشان رکھا۔ انھوں نے جو بھی ادبی معرکے سر کئے یا غالب شکن کہلائے تو یہ سب کچھ ان کی شخصیت اور ان کے شعری قد کو بڑھاتا ہے لیکن میں اس بحث سے قطع نظر صرف یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ کسی بھی چیز کی شدت آمیز نفی دراصل اس کا اثبات ہی ہے۔ غالب کے سلسلے میں یگانہ کا نام آنا ضروری ہے اور سچ پوچھئے تو کسی غالب رجحان سے انحراف کا عمل ہی نئے رجحان کو جنم دیتا ہے۔ یگانہ جیسے ذہین فن کار کے سامنے اگر کوئی شاعر اپنے پورے قد کے ساتھ تھا تو وہ غالب ہی تھے۔ اس سے غالب کی فطرت میں تو کوئی کمی آج بھی نہیں آئی یا یہ کہ یگانہ غالب کے ہم پلہ شاعر ٹھہرے لیکن ذہانتوں کے فن کارانہ تصادم نے اردو شاعری کو یگانہ جیسا شاعر ضرور دیا اور ذہانتوں کا یہ تصادم اردو شعر و ادب کو کئی بڑے نام دے چکا ہے۔ ہم یہ بحث تو کر سکتے ہیں کہ یگانہ نے اپنے ہم عصروں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ان کے بارے میں کیا کچھ لکھا۔ غالب کے خلاف کس طرح کی رباعیاں تخلیق کیں۔ ان کی انا پرستی نے کیا کیا گل کھلائے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم جس یگانہ کی شاعری کو سراہتے ہیں، پسند کرتے ہیں، منفرد جانتے ہیں، وہ شاعری انہی رزم آرائیوں کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن سچ تو یہ بھی ہے کہ یگانہ کی شاعری کو ان کی رزم آرائیوں کے تناظر تک محدود کر دینے سے ہم اسے بڑی شاعری نہیں کہہ سکیں گے۔ یگانہ کی شاعری پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ کم ضرور ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ تاہم ان کی شاعری کا مطالعہ اس نہج سے نہیں ہوا کہ یگانہ نے اپنی شاعری میں کون کون سے نئے جہان آباد کئے ہیں، ان کی کل شعری کائنات کتنی ہے؟ ان کا اپنا عصر ان کی شاعری میں کس قدر سمٹ آیا ہے۔ کل کے حوالے سے آج کو اگر سمجھا جا سکتا ہے تو کیا ان کی شاعری ہمارے عصر کا ساتھ دے سکے گی؟ اور آئندہ کے کیا امکانات ابھرتے ہیں۔ سچی اور اپنی شاعری کی تازہ کاری کتنا پھیلاؤ لئے ہوئے ہے؟ یگانہ کا ان کے ہم عصر شعراء کے ساتھ تقابلی مطالعہ وغیرہ۔

ترانہ کی نئی ترتیب و تدوین کا فیصلہ میرے لئے کئی طرح کی الجھنوں کا باعث بنا مثلاً یہ کہ کیا اس طرح کسی مصنف یا اس کے ورثاء کی اجازت کے بغیر کوئی کتاب تحقیق کا موضوع بن سکتی ہے؟ جبکہ ترانہ ۱۹۳۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی اور یگانہ کے ورثاء اب بھی پاکستان میں موجود ہیں۔
میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر نیر مسعود سے استفسار کیا تو انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ:

"مرزا یگانہ کے پسماندگان میں صرف ایک بیٹی ہندوستان میں ہیں، ان کا نام مریم ہے اور قیام پونہ میں ہے۔ ان کے شوہر ابن علی صاحب کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ پتہ مجھے معلوم نہیں۔ باقی اولادیں پاکستان میں ہیں (میرے علم میں دو لڑکے اور ایک لڑکی وہاں ہیں)" (۱۳/جون ۸۵ء)

ظاہر ہے کہ یہ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ میں پونہ میں مریم صاحبہ کی تلاش کرواتا۔ پھر یہ کہ ترانہ کو مکمل طور پر شائع کرنے کے بجائے ایک جامع انتخاب پیش کرنے کا ارادہ تھا ایسا محض اس لئے بھی کرنا تھا کہ ترانہ اپنی اشاعت کے بعد کافی موضوع بحث بنا تھا۔ رباعیوں کا یہی مجموعہ ترانہ، غالب شکن جیسی کتاب کا سبب بھی ہوا تھا۔ یہی نہیں کہ اس میں غالب پر کئی طنز آمیز رباعیاں شامل ہیں بلکہ بعض ایسی رباعیاں بھی رکھی گئی ہیں جن سے اس وقت کے لوگوں نے زبردست اختلاف کیا تھا لیکن ترانہ کا انتخاب کرنے سے کسی مکمل کتاب کا تصور نہیں بن رہا تھا۔

ترانہ ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر ستمبر ۱۹۳۳ء میں اردو بک اسٹال، بیرون لاہوری دروازہ لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ چھوٹے سائز کے اس مجلد کتاب کے اندرونی سرورق کے بعد ایک باریک کاغذ لگا ہوا ہے اور اس کے بعد والے دبیز کاغذ پر یگانہ کی تصویر چھپی ہے تصویر کے نیچے ٹائپ میں "میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی" لکھا ہوا ہے اور انگریزی میں THE ARCH ARTIST POET OF INDIA چھپا ہوا ہے۔ ۱۱۲ صفحات کے اس مجموعے میں ۲۰۵ رباعیاں شامل کی گئی ہیں۔ چار صفحات میں "مغالطہ" دیا گیا ہے۔ ص ۱۴۴ تا ۱۷۷ فارسی رباعیاں ہیں۔ مزاحیہ کے

عنوان سے ۱۸۰ تا ۱۰۲ تک رباعیاں شامل ہیں۔ کتاب کے آخری سرِ ورق پر دو کتابوں کے اعلان شائع ہوئے ہیں، ڈرامے چند از نور محمد عرا الٰہی (مصنفین ناٹک ساگر) "چہیتا بھائی" از فہیم بیگ چغتائی۔ یہ دونوں اشتہار اردو بک اسٹال کی طرف سے دیئے گئے ہیں جو ترانہ کے ناشر ہیں۔

ترانہ میں شامل رباعیوں میں ہندی آمیز لہجہ نمایاں ہے، گاڑھے عربی، فارسی الفاظ کے بجائے آسان اور نرم الفاظ و تراکیب کا استعمال زیادہ ملتا ہے۔ نامانوس اور غیر مستعمل الفاظ بھی ملتے ہیں۔

یگانہ کے یہاں زبان و بیان کی غلطیاں اور فنی خامیاں کم سے کم ملتی ہیں کہ انہوں نے محاورے، کہاوتیں، روز مرّہ تراکیب، نئے نئے الفاظ او ان کی شکست و ریخت کے عمل سے اپنی شعری کائنات کو سجایا ہے۔ اس کے باوجود ترانہ میں شامل بعض رباعیاں توجہ طلب ہیں جن میں غیر مانوس الفاظ کا استعمال غیر تخلیقی اور اُکھڑا اُکھڑا معلوم ہوتا ہے۔ میں اگر ترانہ کا انتخاب کرتا تو کم از کم ساٹھ رباعیاں انتخاب سے خارج کر دیتا کیونکہ یہ رباعیاں ترانہ میں شامل دوسری رباعیوں کے معیار کو کم کرتی ہیں جیسے رباعی نئی لگن، دھن کے پکے، دونوں پلّے بھر گئے، عید پیچھے مرٹا، جنم بھر جہنم تو رہتا غدر کا سر نیچا، چلتی گاڑی میں، یوں ہی سہی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ترانہ کا اب تک صرف ایک ہی ایڈیشن شائع ہو سکا ہے اور اب ۵۲ سال کے بعد شاعر کے ذریعہ اس کی تدوین عمل میں آئی ہے۔ ترانہ کے علاوہ یگانہ کی جو رباعیاں مشفق خواجہ صاحب نے اپنے رسالے "تخلیقی ادب ۲" (۱۹۸۰ء) میں شامل کی تھیں وہ بھی علٰحدہ سے اسی شمارے میں دی جا رہی ہیں۔ یگانہ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے متعلق مشفق خواجہ صاحب نے جو تفصیل دی ہے وہ یوں ہے:

> "یگانہ کے کلام کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ چاروں مختصر مجموعے ہیں۔ ان میں بھی بہت سا کلام مشترک ہے۔ مجموعی طور پر ان مجموعوں میں جو کلام ملتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔ اردو غزلیات۔ ۱۰۱، فارسی غزلیات۔ ۱۶۹، اردو رباعیات۔ ۲۴۳ (غالب شکن میں ۲۳ رباعیات ایسی ہیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں) فارسی رباعیات ۔ ۱۵، مثلّث ۔ ۲، اردو نظمیں ۔ ۲، فارسی نظم ۔ ۱ ۔
>
> یگانہ کی ۶ بیاضیں اور کچھ متفرق مسودات میری نظر سے گذرے ہیں، ان میں سے چار بیاضیں گنجینہ کی طباعت سے پہلے کی ہیں اور ۲ بعد کی جن میں آخری عمر تک کا کلام ہے۔ میں نے ان بیاضوں کا مطبوعہ کلام سے مقابلہ کیا تو بہت سا ایسا کلام دستیاب ہوا جو یگانہ کے کسی مطبوعہ مجموعے میں شامل نہیں۔"

مشفق خواجہ صاحب نے "تخلیقی ادب ۲" میں جو غیر مطبوعہ کلام شائع کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے: ۱۵ مکمل نامکمل غزلیں، ۱۳۱ رباعیاں، ۴ نظمیں، ۴۷ متفرق اشعار۔ غیر مطبوعہ کلام کے متعلق جو مزید معلومات فراہم کی ہیں وہ یہ ہیں:

> "میرے پاس یگانہ کا جو غیر مطبوعہ اور غیر مدوّن کلام ہے اس کا ایک حصّہ باوجوہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ یگانہ کی کچھ اور بیاضوں کی موجودگی کا مجھے علم ہے جن میں غیر مطبوعہ کلام ہے، لیکن میں ان سے استفادہ نہیں کر سکا۔"

مشفق خواجہ صاحب نے گنجینہ کے اس قلمی نسخے کی اطلاع بھی دی ہے جو جناب مالک رام (دہلی) کے پاس محفوظ ہے اور جسے یگانہ نے ۱۹۵۱ء میں مرتّب کیا تھا۔ اس قلمی نسخے سے خواجہ صاحب نے استفادہ کیا ہے اور وہ چار غزلیں "تخلیقی ادب ۲" میں شائع کی ہیں جو اس سے قبل غیر مطبوعہ تھیں۔ میں نے بساطِ سخن کے تحت تصانیفِ یگانہ کی تحقیقی تفصیل دے دی ہے۔

ترانہ کی تدوین کے سلسلے میں میں نے جب کالی داس گپتا رضا صاحب سے استفسارات کئے تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے مفید مشوروں سے نوازا بلکہ یگانہ کے شعری اور نثری مجموعوں کے بعض ایڈیشن بھی دکھائے۔ غالب شکن ۱۔ اور غالب شکن ۲ مجھے غالبیات کے سلسلے میں اہم معلوم ہوئیں۔ خیال ہے کہ آئندہ کبھی رضا صاحب کے شکریے کے ساتھ اس کتاب کو بھی شاعر کے صفحات پر پیش کر دیا جائے گا۔ ترانہ کی اشاعت کے سلسلے میں محترم سردار جعفری، محترم ظ انصاری اور بھائی ندا فاضلی نے بھی اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور ہمّت افزائی کی۔ ظاہر ہے کہ شاعر کے صفحات پر اس کتاب کی اشاعت ایک ادبی نوعیت کا کام ہے اور مجھے امید ہے کہ اردو شعر و ادب کے قارئین میری اس کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، اسے سراہیں گے تاکہ ادارۂ شاعر آئندہ بھی اسی نوعیت کے ادبی کاموں کی تدوین کر سکے۔

OO

ترانہ

یعنی

مرزا یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی کی رباعیات کا مجموعہ

ناشر

ہندوستان بھر کے علمی و ادبی اداروں کے

واحد نمائندے

اُردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور

ستمبر ۱۹۳۳ء قیمت عہ

مغالطہ

میرے نظریہ زندگی کی نسبت عام طور پر لوگ اِس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ زندگی کے تلخ تجربات نے میری نظریہ حیات میں (خدانخواستہ) ایسی افسردگی پیدا کردی ہے جس سے میری طبیعت ہر وقت مکدر رہتی ہے۔

مگر یہ قیاس حقیقتِ حال سے بعید ہے۔ پست ہمتوں کا ذکر نہیں۔ مَردوں کے لئے تو زندگی کے تلخ تجربے کڑوی دوا کا حکم رکھتے ہیں۔ جو اصلاح مزاج کے لئے اک ضروری چیز ہے طبیعت کا مکدر رہنا اور نظریہ حیات میں افسردگی پیدا کرنا تو کجا یہی تلخی و ترشی تزکیہ نفس کا آلہ بن کر انسان کو سچی مسرتوں سے شاد کام بناتی ہے۔ مسرتیں بھی وُہ جو نجاستوں سے پاک و صاف ہوتی ہیں۔ مگر پاک اور ناپاک مسرتوں میں فرق کرنا بھی ہر اک کا کام نہیں ہے۔

قدرت کے خزانے سے جسے ایسی پاک و پاکیزہ مسرت نصیب ہو وہ زندگی سے بیزار کیوں ہونے لگا۔ اس کے نظریہ حیات پر افسردگی کیوں چھانے لگی؟

زندگی کے تلخ تجربوں سے دوچار ہونا اور بات ہے اور زندگی سے بیزار ہو جانا اور بات ہے۔ میں کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہوا۔ ہاں دل جب تک زندہ ہے زمانے کے سرد و گرم سے متاثر ہونا اک قدرتی امر ہے مگر اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ تلخ تجربات سے نظریہ حیات میں بھی تلخی پیدا ہو جائے اور انسان زندگی جیسی نعمت سے آزردہ ہو جائے۔ دل اک ترازو ہے جس کے پلّے ہوا کے جھونکوں سے آن کے آن اِدھر اُدھر جھک تو جاتے ہیں۔ مگر پھر تھوڑی دیر میں توازن برابر ہو جاتا ہے۔

صدق و صفا، مہر و وفا کی دیوی (یگانہ بیگم) کو خداوند عالم نے جس کا رفیق زندگی بنا کر حقیقی مسرتوں سے بہرہ ور فرمایا۔ اس کی روحانی زندگی (مادی کش مکش کے ہاتھوں) تلخ کیوں ہونے لگی؟ یہ صحیح ہے کہ مادی کش مکش نے مجھے آزمائشوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میری محترم شریک زندگی کی والہانہ محبت اور وفادارانہ دلجوئی نے میرے دماغی توازن کو اتنا سنبھالے رکھا کہ میں سخت سے سخت امتحان میں کامیاب رہا۔ یگانہ بیگم کے دم سے جو بھی روحانی مسرت مجھ ایسے بے نوا کو حاصل ہے وہ شاہوں کو تو کیا دنیا کے معدودے چند خوش نصیبوں ہی کو مل سکتی ہے۔

زندگی کی کامیابی اور ناکامی محض اعتباری حیثیت رکھتی ہے لوگ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے مجھے ناکام یا نا شاد جو چاہیں سمجھ لیں۔ مگر میں اس حقیقی مسرت اس آسودہ ضمیر کی روشنی میں اپنے تئیں کیوں ایسا سمجھ لوں۔ حق تو یہ ہے کہ کامیابی کا کوئی واحد معیار قائم نہیں کیا جا سکتا جو سب کے نزدیک مسلّم ہو۔ اپنے اپنے مذاق اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق ہر شخص کامیابی یا ناکامی کا معیار قائم کر لیتا ہے۔ کوئی مدبرانہ اور عیارانہ زندگی کو کامیاب سمجھتا ہے۔ کوئی شاہانہ زندگی کو کوئی مجاہدانہ اور فاتحانہ زندگی کو مایۂ ناز جانتا ہے۔ کوئی پیمبرانہ و مصلحانہ زندگی کو۔ کوئی شاعرانہ و فلسفیانہ زندگی کو وغیرہ وغیرہ۔ اس اختلاف مذاق پر نظر رکھ کر اس شخص پر غور کرو۔ جس نے کبھی سنہری یا چیپر کھٹ کا منہ نہ دیکھا بلکہ کھرے پلنگ یا بورئیے پر پاک و پاکیزہ محبت کی فضا میں زندگی بسر کر دی اور حسب توفیق ایزدی اپنے آرٹ کے ذریعہ سے پیام وجدانی پہنچا کر فرائض انسانی بجا لایا اور اس طرح سکون قلب کی دولت حاصل کی۔ اگرچہ جسمانی آرام و آسائش سے بے بہرہ رہا) تو پھر اس کی زندگی ناکام کیونکر کہی جا سکتی ہے۔ وہ زندگی سے بیزار اور اسکا نظریۂ حیات تلخ و ناگوار کیوں ہوگا؟

اہل نظر کے دل و دماغ پر جس نے اپنے آرٹ کا سکہ بٹھا دیا۔

حاسدانہ شورشوں کے ہجوم میں جس نے اپنا لوہا منوا لیا۔ اپنے کیریکٹر کا نیزا اپنے حریفوں کے کیریکٹر کا امتحان لے کر جو اپنی آن بان پر قائم رہا۔ اپنے طرز زندگی اور اپنے ترانۂ وجدانی سے برادران وطن خصوصاً طبقۂ شعرا کو غلامانہ ذہنیت سے آزادی کا سبق دے کر بہتیروں کو اپنی زندگی میں زنجیر تقلید سے آزاد ہوتے دیکھ لیا۔ دوستوں کا کیا ذکر جس نے دشمنوں کے دلوں کو بھی اپنی یاد سے خالی نہیں چھوڑا تو چشم تحقیق ایسی زندگی کو ناکام کیونکر کہہ سکتی ہے۔ کامیاب زندگی تو وہی ہے کہ دنیا سے اٹھ جانے پر بھی جس کی یاد دوست و دشمن کے دلوں کو گرماتی رہے

رباعی

حیران ہو کیوں راز بقا مجھ سے پوچھ
میں زندہ جاوید ہوں آ مجھ سے پوچھ
مرتے ہیں کہیں دلوں میں بسنے والے
جینا ہے تو موت کی دوا مجھ سے پوچھ

میرزا یگانہ لکھنوی سب رجسٹرار۔ عثمان آباد (دکن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترانۂ نیم شبی

ساجن کو سکھی منا لو۔ پھر سو لینا
سوتی قسمت جگا لو۔ پھر سو لینا
سوتا سنسار سننے والا بیدار
اپنی بیتی سنا لو۔ پھر سو لینا

(اٹھو سکھی پھر سو لینا)

دل کی آواز

دکھتا ہوا دل ٹٹول لینے والا
آنکھوں آنکھوں میں تول لینے والا
دل کی آواز گوش دل سے سن کر
کیا ہے کوئی درد مول لینے والا؟

۷

(میرا خدا کچھ اور ہے)

درد اپنا کچھ اور ہے دوا ہی کچھ اور
ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا ہے کچھ اور
ایسے ویسے خدا تو بہتیرے ہیں
میں بندہ ہوں جس کا وہ خدا ہی کچھ اور

۸

(حجابِ معنی)

یوسف کو اس انجمن میں کیا ڈھونڈتا ہے
ہنگامۂ ما و من میں کیا ڈھونڈتا ہے
نیرنگِ تماشا ہے حجابِ معنی
تصویر کے پیرہن میں کیا ڈھونڈتا ہے

۹

(معمائے ہستی)

کیوں مطلبِ ہستی و عدم کھل جاتا
کیوں رازِ طلسم کیف و کم کھل جاتا
کانوں نے جو سن لیا وہی کیا کم ہے
آنکھیں کھلتیں تو سب بھرم کھل جاتا

۱۰

(رازِ فردا معلوم)

اندھوں کی طرح ٹٹولنا کیا معنی
گونگے کی بولی بولنا کیا معنی
فردا معلوم و رازِ فردا معلوم
پھر پردۂ غیب کھولنا کیا معنی

۱۱

(دھوکا توہئی)

بدلے گی ہزار رنگ دُنیا توہئی[1]

بہلاتے ہیں دل ہم بھی تماشا توہئی

پردہ ہردم یوں ہی بدلتا جائے

دھوکا ہی تو ہوتے دو دھوکا توہئی

[1] ہئی مخفف ہے نہیں ہی کا۔ گو کہ روزمرہ میں بھی مستعمل ہو اور ہے ہی' غیر فصیح و متروک ہے۔ اسی طرح "ہم ہی" کی جگہ "ہمیں" بولتے ہیں۔ اور یہی فصیح ہے۔

۱۲

عالم کیا ہے؟

(ایک وسعتِ موہوم کے سوا کچھ بھی نہیں!)

صبحِ ازل و شامِ ابد کچھ بھی نہیں

اک وسعتِ موہوم ہے حد کچھ بھی نہیں

کیا جانئے کیا ہے عالمِ کون و فساد

دعوے تو بہت کچھ ہیں سند کچھ بھی نہیں

۱۳

(طلسمِ زندگی)

صیادِ ازل کی شعبدہ کاری ہے

آزادی کیا؟ عین گرفتاری ہے

اسرارِ طلسمِ زندگی کیا کہئے

یہ رات کٹی تو کل کا دن بھاری ہے

۱۴

(حباب اک ٹھیس کا مہمان ہے)

ہر موج ہوا ہے درپئے دل شکنی

ہر سانس پہ کرتی ہے قضا خندہ زنی

کھاتا کب تک حباب دُنیا کی ہوا

وہ ٹھیس لگی کہ دل تو کیا دم پہ بنی!

۱۵

LIFE
IS A BALANCE OF
OPPOSING FORCES

(زندگی ایک ترازو ہے جو متضاد قوتوں کو سادھے ہوئے ہے)

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیاتِ فانی کیا ہے
جھونکا کھا نے سنبھلتے رہنے کے سوا

۱۶

(زندہ دل)

دل ہو زندہ تو بارِ خاطر کیوں ہو
دردو غم ناگوارِ خاطر کیوں ہو
باقی ہو دماغ میں اگر بوئے اُمید
پیراہنِ جان غبارِ خاطر کیوں ہو

۱۷

(موت کی دوا)

حیراں ہے کیوں رازِ بقا مجھ سے پوچھ
میں زندہ جاوید ہوں آ مجھ سے پوچھ
مرتے ہیں کہیں دلوں میں بسنے والے؟
جینا ہے تو موت کی دوا مجھ سے پوچھ

۱۸

(مُردہ دل)

دِل جو مُردہ تو زندگانی بھی حرام
پیری کا ذکر کیا جوانی بھی حرام
افسانۂ عمر جاودانی بھی حرام
آبِ حیوان کہاں کا؟ پانی بھی حرام

۱۹

(دِل کیا ہے؟)

دل کیا ہے؟ اِک آگ ہے دُہکنے کیلئے
دُنیا کی ہوا کھا کے بھڑکنے کیلئے
یا غنچۂ سربستہ چٹکنے کے لئے
یا خار ہے پہلو میں کھٹکنے کے لئے

۲۰

(دل کیا ہے؟)

دل کیا ہے اندھیرے کا اُجالا تہِ خاک
عالم نظر آتا ہے نرالا تہِ خاک
گزرینگے نگاہوں سے ہزاروں جلوے
سوتا ہی رہیگا سونے والا تہِ خاک

۲۱

(دل کی انوکھی دُنیا)

جب عالمِ ایجاد نے صورت پکڑی
مجموعۂ اضداد نے صورت پکڑی
آباد ہوئی دِل میں انوکھی دُنیا
کیا درد خداداد نے صورت پکڑی

۲۲

(دردِ دل سلامت)

دُنیائے دَنی مجھ سے عداوت رکھے
جھوٹی سچی ہزار تہمت رکھے
تیرے دم سے ہے اپنی دُنیا آباد
اے درد! خدا تجھے سلامت رکھے

۲۳

(تحفۂ درد)

دل کو پہلے ٹٹول لیتا ہوں میں
پھر تحفۂ درد مول لیتا ہوں میں
آثارِ زلال و دُرد و مستی و خمار
آنکھوں آنکھوں میں تول لیتا ہوں میں

۲۴

(چلتے پھرتے مُردے)

دُنیا کے مزے میں ڈوب کر کیا ترتے
آنکھیں رکھتے تو کیوں گڑھے میں گرتے
لو دیکھ لو اب عیش پرستوں کی دُسا[1]
مُردے دیکھے نہ ہونگے چلتے پھرتے

[1] دسا یعنی درگت ٹھیٹھ محاورہ ہے ؎

۲۵

(آگے آگے اُمّید پیچھے پیچھے اجل)

واللہ یہ زندگی بھی ہے قابل دید
اِک طرفہ طلسم ہے جس کی نہ شنید
منزل کی دھن میں جھومتا جاتا ہوں
پیچھے تو اجل ہے آگے آگے اُمید

۲۶

(دشتِ غربت کے مزے)

دُنیا کے مزے ہیں کس قیامت کے مزے
صحرا کی گھنی چھاؤں ہیں جنت کے مزے
کچھ دیر تو بیٹھتے چلو سایہ میں
کیا یاد کروگے دشتِ غربت کے مزے

۲۷

(نظام عالم نظام غفلت)

دُنیا کی ہوا کیا ہے پیامِ غفلت
یہ عالم رنگ و بو مقامِ غفلت
بیداری موہوم ہی قانونِ حیات
بدلا ہے نہ بدلے گا نظامِ غفلت

۲۸

(عالمِ ہستی موجِ سراب)

تھمنے کا نہیں قافلہ موجِ سراب
کٹنے کا نہیں مرحلہ موجِ سراب
آغاز نہ ہی آغاز ہے۔ انجام کجا!
عالم ہے عجب سلسلۂ موجِ سراب

۲۹

(اعجازِ ہنر)

واللہ یہ دُنیا بھی عجب دُنیا ہے
ہر رنگ میں وہ کشش کہ دل کھنچتا ہے
مُنہ بولتی۔ جیتی جاگتی تصویریں
اعجازِ ہُنر ہے یا کوئی دھوکا ہے

۳۰

(بو نہ ہو تو رنگ کیا)

سنتا ہوں کہ ہر رنگ میں ہی تو موجود
ہر بو میں ہے معرفت کا پہلو موجود
وہ رنگ بھی کیا رنگ ہے ما شا اللہ
جسمیں کوئی خوشبو ہے نہ بدبو موجود

۳۱

(کیا عبادت سجدہ پر موقوف ہے)

تعظیم تری کرتے ہیں سب آنکھوں سے
پیدا ہے نشۂ ادب آنکھوں سے
سجدہ نہ کریں کسی کی پوجا نہ کریں
ثابت ہو مگر دردِ طلب آنکھوں سے

۳۲

(مذہب کے سوا بھی اک راہ ہے)

ہے اور بھی اک راہ مذہب کے سوا
منطق کے سوا، علمِ مذبذب کے سوا
باز آ گئے منزل سے۔ کہاں کی منزل!
مطلب نہیں کوئی ترکِ مطلب کے سوا

۳۳

(نعرۂ ہو)

مطلوب ہے خواجہ کوئی احسان تازہ
اس دردِ طلب کا کوئی درمان تازہ
کلمہ سے غرض ہے نہ بھجن سے مطلب
اک نعرۂ ہو سے کر دے ایمان تازہ

۳۴

(ترکِ منزل)

مطلب نہیں کوئی ترکِ منزل کے سوا
مقصد نہیں کوئی ترکِ باطل کے سوا
کعبہ کا ہوا میں نہ صنم خانے کا
سر جھک نہ سکا کہیں درِ دل کے سوا

۳۵

درد طلب کی پرواز

مرمر کے مسافرِ سرِ منزل پہنچا
پہنچا تو سہی مگر بہ مشکل پہنچا
دیکھے کوئی اس دردِ طلب کی پرواز
دل ایک تڑپ میں تا درِ دل پہنچا

۳۶

(سرگشتگی)

دل کے ہاتھوں خراب ہوتے ہی بنی
افتاد بڑی جیسی سہتے ہی بنی
ہم تیری تلاش میں کہیں کے نہ رہے
کعبہ کو بھی خیرباد کہتے ہی بنی

۳۷

(دل سے دل تک)

زنجیر سے ہونے کا نہیں دل بھاری
ہوں پاؤں میں کتنے ہی سلاسل بھاری
کعبہ کا سفر ہی کیا ہے؟ گھر سے در تک
دل سے دل تک مگر ہے منزل بھاری

۳۸

(منزل کی لگی)

ہر گام پہ استخارہ کرتے نہ بنی
تھی دل سے لگی کنارہ کرتے نہ بنی
دیوانہ بتائے کیا کدھر جاتا ہے
منزل کی طرف اشارہ کرتے نہ بنی

٣٩

نئی لگن

پھر کوئی نئی لگن لگی ہے شاید
ہاں ہاں تیرِ برہن لگی ہے شاید
دل پریم کے ساگر میں بیتاب ہے کیوں
تازہ کوئی ڈگن[1] لگی ہے شاید

[1] مچھلی کا شکار کرنے کو ڈور میں جو کانٹا باندھا جاتا ہے اُسے ڈگن کہتے ہیں۔

٤٠

(پھول نہیں کانٹے ہی سہی)

ہاں اے دل ایذا طلب آرام نہ لے
بدنام نہ ہو مفت کا الزام نہ لے
ہاتھ آ نہ سکے پھول تو کانٹے ہی سہی
ناکام پلٹنے کا کبھی نام نہ لے

٤١

(دُھن کے پکّے)

پروانے کہاں مرتے بچھڑتے پہنچے
دیوانہ صفت ہوا سے لڑتے پہنچے
پیاس آگ میں کُود کر بجھانے والے
دُھن کے پکّے تھے گرتے پڑتے پہنچے

٤٢

(پروازِ مشتِ خاک)

یاد آ گئی آوازِ دلِ گم گشتہ
ملنے لگا پھر سازِ دلِ گم گشتہ
پہنچا ہے کہاں خاک کا پتلا اُڑ کر
اللہ ری پروازِ دلِ گم گشتہ

۴۳

(دیارِ اُمید)

وہ دل جسے کہتے ہیں دیارِ اُمید
آئینۂ صد نقش و نگارِ اُمید
شاید تیری جلوہ گاہ عالی ہے وہی
جس گھر میں ہے جلوہ گر بہارِ اُمید

۴۴

(جلوۂ ظرف و مظروف)

دل میں آبیٹھے درد پہلو ہو کر
پھر اپنے تئیں دکھا دوں میں تو ہو کر
آئینہ میں کیا دیکھتا ہے رنگ اپنا
مجھ میں تو سما دیکھ ذرا بو ہو کر

۴۵

(دونوں پلّے بھر گئے)

اپنی حد سے گذر گئے اب کیا ہے
منجدھار سے پار اتر گئے اب کیا ہے
اے شوقِ وصال اے تمنّائے سکون
دونوں پلّے تو بھر گئے اب کیا ہے

۴۶

(عیشِ مہیّا کیوں کھوئیں!)

رونا ہے بدا جنہیں وہ جم جم روئیں
جب عیش مہیّا ہو تو ہم کیوں کھوئیں
فردا معلوم و رازِ فردا معلوم
رات اپنی ہے پھر کیوں نہ مزے سے سوئیں

۴۷

یادِ شباب

(عید پیچھے ٹر!)

نشہ نہ سہی یہ دردِ سر کیا کم ہے
نظارۂ حسن رہگذر کیا کم ہے
اب تک تازہ ہے یادِ ایامِ شباب
اپنے لئے عید پیچھے ٹر کیا کم ہے

۴۸

(کیا کروں کیا نہ کروں)

کعبہ کی طرف دُور سے سجدہ کرلوں
یا دَیر کا آخری نظارہ کرلوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دُنیا
اک اور گنہ کرلوں کہ توبہ کرلوں

۴۹

(دادِ حسن دیتی ہی بنی)

ڈرتے ڈرتے گناہ کرلیتا ہوں
دزدیدہ سہی نگاہ کرلیتا ہوں
کیا کیجئے دادِ حسن دیتے ہی بنی
دُکھتے ہوئے دل سے آہ کرلیتا ہوں!

۵۰

(ہر کمالے را زوالے)

حسن اپنی نظر سے گر چلیگا کہ نہیں
ہاتھ اپنے زوال پر ملیگا کہ نہیں
دورِ فلک انتقام لیگا کہ نہیں
چڑھتا ہوا دن کبھی ڈھلیگا کہ نہیں؟

۵۱

(پیامِ زیرِ لب)

دزدیدہ نگاہی کا سبب کیا کہئے
بیگانگیِ حُسنِ طلب کیا کہئے
دل کے گاہک ہیں کیا سیانے گاہک
انداز پیامِ زیرِ لب کیا کہئے!

۵۲

(مستِ شباب)

وہ مست کہ بے پئے چھلکتا جائے
نشہ میں شباب کے بہکتا جائے
آئینہ کا سامنا کرے گا کیونکر
اپنے سایہ سے جو بھڑکتا جائے

۵۳

(جنگِ زرگری)

پوشیدہ ادائے دلبری کیا کہنا
ظاہر میں وہی کج نظری کیا کہنا
دشمن کی خوشی کیواسطے آپس میں
یہ پردہ جنگ زرگری کیا کہنا!

۵۴

(مزاجِ حسنِ شاہانہ)

پھر جوشِ غضب کو تھام لیتے ہی بنی
پھر چشمِ کرم سے کام لیتے ہی بنی
مُنہ سے تو نہ پھوٹے آپ ماشاءاللہ
آنکھوں سے مگر سلام لیتے ہی بنی!

۵۵

(جہنّم پھر جہنم نہ رہتا)

ہنگامۂ عیش جان جوکھم ہی سہی
آخر میں بلا سے تلخیٔ غم ہی سہی
عید اپنی منا لیتے محرم ہی سہی
مل جاتے کہیں آپ جہنم ہی سہی

۵۶

(بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا تھا)

مخمورِ مئے شباب ہو لینا تھا
کم سے کم ایک نیند سو لینا تھا
دامانِ ہوس کہیں بھگو لینا تھا
بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا تھا

۵۷

(حُسنِ طلب)

منہ تکتے ہیں دُور سے سبب کچھ نہ سہی
اک حسنِ طلب تو ہے طلب کچھ نہ سہی
بندہ کہو۔ خادم کہو۔ جو کچھ بھی کہو
آگے تھے ہمیں سب کچھ اب کچھ نہ سہی

۵۸

(خزاں کی بہار)

پیراہنِ تن ہے گو غبار آلودہ
ہے دامنِ دل مگر بہار آلودہ
کچھ نشۂ رنگ و بو ہے اب تک باقی
شاہد ہے مری چشم خمار آلودہ

۵۹

(افسردہ دلوں کو کیا گناہوں کا مزہ)

دم زندہ دلی آج تک بھرتے ہیں
کیوں زندگیٔ گزشتہ پر مرتے ہیں
افسردہ دلوں کو کیا گناہوں کا مزہ
دل بہلاتے ہیں غم غلط کرتے ہیں

۶۰

(گھٹتی کے سمے میں بڑھنا کیسا)

پیری کی ہوس ہزار منتر پڑھتی
گھٹنے کے سوا عمرِ رواں کیا بڑھتی
جھونکے ہیں فنا کے کیا نہیں پا کوئی
مرجھائی ہوئی بیل منڈھے کیا چڑھتی

۶۱

(اتنا نہ ہنسو)

دیکھے ہیں بہت چمن اُجڑتے بستے
کیا کیا گل پیرہن لُٹے ہیں سستے
اے زندہ دلانِ باغ اتنا نہ ہنسو
آنسو بھی نکل آتے ہیں ہنستے ہنستے

۶۲

(رات بسنے کی ہے دیر)

یارانِ چمن آگ برسنے کی ہے دیر
روؤ گے بہت برق کے ہنسنے کی ہے دیر
پھولوں سے لدی ہوئی دلھن کیا جانے
اِن تازہ گلوں پہ رات بسنے کی ہے دیر

۶۳

(ہوا پلٹنے کی ہے دیر)

یارانِ شباب رات کٹنے کی ہے دیر
بجھتا ہے کنول ہوا پلٹنے کی ہے دیر
محفل میں جھومتے رہو گے کب تک
آنکھیں کھلنے کی دل اُچٹنے کی ہے دیر

۶۴

(فکرِ انجام خارِ پیراہن)

فکرِ انجام خارِ پیراہن ہے
یہ رنگ یہ بو غبارِ پیراہن ہے
نازک ایک ایک تارِ پیراہن ہے
دو دن میں خزاں بہارِ پیراہن ہے

۶۵

(حسنِ دو روزہ)

سورج کو گہن میں نہیں دیکھا شاید
ہاں چاند کو گہن میں نہیں دیکھا شاید
اے حسنِ دو روزہ پہ اکڑنے والو
یوسف کو کفن میں نہیں دیکھا شاید

۶۶

(کیا لے کے چلے)

دُنیا سے چلے کوئی تو کیا لے کے چلے
اک تحفۂ دردِ بے دوا لے کے چلے
یا دشمن و دوست کی دُعا لے کے چلے
یا کچھ نہ سہی نام خدا لے کے چلے

۶۷

(دنیائے دُنی کا آسرا کیا)

دُنیائے دُنی کا آسرا لینا کیا
باطل کے آگے سر جھکا لینا کیا
ناحق احسانِ ناخدا لینا کیا
بندے کے تئیں خدا بنا لینا کیا

۶۸

(مردوں کو یہ دُنیا کیا چھلتی)

مردوں کو یہ دُنیائے دُنی کیا چھلتی
سر پھوڑ چلے کوہکنی کیا چلتی
معلوم ہے فرہاد پہ جو کچھ گذری
ٹل جائے قیامت شدنی کیا ٹلتی

۶۹

(نامرد بنا کر چھوڑتی ہے دُنیا)

جس باگ پہ چاہے موڑتی ہے دُنیا
کستی ہے کبھی جھنجوڑتی ہے دُنیا
پائے ہمت کو توڑتی ہے دُنیا
نامرد بنا کے چھوڑتی ہے دُنیا

۷۰

(نفس کو قابو میں رکھنا)

اے ہمتِ مردانہ دکھا دے وہ کمال
کہتے ہیں جسے جہادِ نفس اہلِ کمال
بہتر ہے دیو کو پکڑ لے زندہ
قابو میں کرلے نفس کو مار نہ ڈال

۷۱

مفلس کی جوانی - جاڑوں کی چاندنی
خواجہ سرا کی دولت دو کوڑی کی

مفلس کو مزہ زیست کا چکھنے نہ دیا
اِس نقدِ شباب کو پرکھنے نہ دیا
دنیا سے لپٹتے تو لپٹتے کیوں کر
پُٹھے پہ کبھی ہاتھ تو رکھنے نہ دیا

۷۲

(دُنیا کا مارا پانی نہ مانگے)

دُنیا نے جسے اپنے شکنجے میں کسا
چھوٹا نہ کبھی موت کے پنجے میں پھنسا
پانی بھی نہیں مانگتا اِس کا مارا
سوتا ہے پڑا جیسے ناگن کا ڈسا

۷۳

(بے وفا دُنیا)

شاہوں کو نگاہوں سے گرا کر مارا
شہزادوں کو دربدر پھرا کر مارا
دُنیا سے لپٹنے والے بے موت مرے
ایک ایک کو کیا دِھرا دِھرا کر مارا

۷۴

(گردشِ ایام)

مُردوں کو کشاں کشاں لئے پھرتی ہے
پھرتے ہیں جہاں جہاں لئے پھرتی ہے
منہ موڑ کے لکھنؤ سے پہنچے ہیں دکن
تقدیر کہاں کہاں لئے پھرتی ہے

۷۵

(پیارا لکھنؤ)

اے لکھنؤ! اے دیارِ دور افتادہ
اے جانِ من اے بہارِ دور افتادہ
اب دُور سے اِس خاک کو سجدہ کر لے
میں کون ہوں؟ اک مزارِ دور افتادہ!

۷۶

(وہ آستانہ بھولا)

وہ گھر وہ در وہ آستانہ بھولا
وہ گل وہ چمن وہ آشیانہ بھولا
وہ لحن وہ نغمہ وہ ترانہ بھولا
وہ دَور وہ عہد وہ زمانہ بھولا

۷۷

(کششِ لکھنؤ)

اے پائے طلب ہوا پہ سبقت لے چل
اِس وادیٔ وحشت سے سلامت لے چل
وہ جانِ وفا نہ جانے کس حال میں ہے
لے چل مجھے لکھنؤ امانت لے چل

۷۸

(کچھ نہ ہُوا)

گھر چھوڑ جو دربدر ہوا کچھ نہ ہوا
بیکار کا دردِ سر ہوا کچھ نہ ہوا
فانوس کے باہر نہ لگی شمع کی لو
جب دھیان اِدھر اُدھر ہوا کچھ نہ ہوا

۷۹

(اِدھر نہ اُدھر)

کعبہ سے ہے آج اپنا سفر اور طرف
میں اور طرف ہوں راہبر اور طرف
کیسے حرم و دیر ادھر ہوں نہ اُدھر
دل اور طرف کو ہے نظر اور طرف

۸۰

(فکرِ بلند)

منزل ہی نہیں کوئی ٹھہرنے کیلئے
عالم عالم ہے سیر کرنے کیلئے
ہر پست و بلند ہے گزرنے کیلئے
یہ پاؤں ہیں کیا زمیں پہ دھرنے کیلئے

۸۱

(سب کی سنتا اپنی نہ کہتا)

دل کعبہ بُت خانہ نما کیوں نہ ہوا
ہاں محرم بیگانہ نما کیوں نہ ہوا
سُنتا سب کی مگر نہ کہتا اپنی
فرزانہ دیوانہ نما کیوں نہ ہوا؟

۸۲

(اپنا روئے دل اور طرف ہے)

ہو گی کسی رہنما کو منزل کی خبر
پوچھے کوئی ناخدا سے ساحل کی خبر
ہم اس کی نظر کے دیکھنے والے ہیں
وہ کون؟ جو رکھتا ہے ترے دل کی خبر

۸۳

(منزل کی نہ پوچھ)

منزل کی خبر کسے ہے منزل کی نہ پوچھ
منجدھار میں بہتا چل ساحل کی نہ پوچھ
کیا جانئے کس گھاٹ لئے جاتا ہے
آنکھیں جو دکھائیں دیکھ لے دل کی نہ پوچھ

۸۴

(پہلے گمراہ تو ہو)

امکان طلب سے کوئی آگاہ تو ہو
منزل کا ترے دل سے ہوا خواہ تو ہو
چل پھر کے ذرا دیکھ جھجکتا کیا ہے؟
مل جائے گی راہِ راست گمراہ تو ہو!

۸۵

(کھویا ہی نہیں تو پانا معلوم)

منزل کا پتا ہے نہ ٹھکانا معلوم
جب تک نہ ہو گم راہ پہ آنا معلوم
کھو لیتا ہے انساں تو کچھ پاتا ہے
کھویا ہی نہیں تو نے تو پانا معلوم

۸۶

(مجھے چین کہاں؟)

آرام سے سوتا ہے کوئی محل میں
منگل کوئی گاتا ہے پرے جنگل میں
میں ماہی بے آب مجھے چین کہاں؟
اک موج پریشاں ہوں عجب ہلچل میں

۸۷

(ستم ظریفیٔ فطرت)

دیکھوں کب تک گلوں کی تشنہ لبی
فطرت کا گلہ کروں تو ہے بے ادبی
پیاسے تو ہیں جانِ بلب مگر ابرِ کرم
دریا پہ برستا ہے زہے بوالعجبی!

۸۸

(ساون کی ہوا)

بادل امڈا فلک پہ بجلی کڑکی
ساون کی ہوا سے آگ دل کی بھڑکی
خلوت میں بجز شمع ابھی کوئی نہیں
پروانوں کی شام ہی سے پسلی پھڑکی

۸۹

(پروانہ دیوانہ)

دیوانہ ہے پروانے کا مذہب کیا ہے
مطلب سے ہے مطلب اور مطلب کیا ہے
وہ جل کے صدا شمع کو ہنگام سحر
مطلب تھا جبھی تک آپ سے اب کیا ہے؟

۹۰

پھول وہی جو مہیسر چڑھے

دیوانہ کیوں تیری نظر پر نہ چڑھے
پروانہ وہ کیا جو شمع کے سر نہ چڑھے
کس کام کا وہ خار جو دیں نہ گڑے
وہ پھول ہی کیا ہے جو مہیسر نہ چڑھے

ے "پھول وہی جو مہیسر چڑھے" اک مثل ہے یعنی پھول کی معراج یہی ہے کہ دیوتا پہ چڑھایا جائے جو دیوتاؤں پہ چڑھایا نہ گیا وہ پھول کس کام کا؟

۹۱

(دِل کی سُنائی سُن کر)

سر دھنتے تھے اسرارِ معانی سن کر
پروانہ و شمع کی کہانی سن کر
جا پہنچے یگانہ کون سے عالم میں
چپ لگ گئی کیوں دل کی سُنائی[۱] سُن کر

۱؎ سُنائی بمعنی "خبرِ مرگ"

۹۲

(فطرت کی مستانہ روی)

کوئی تجھ کو پکارتا جاتا ہے
کوئی ہمّت ہی ہارتا جاتا ہے
کوئی تہ کو سدھارتا جاتا ہے
دریا ہے کہ موجیں مارتا جاتا ہے!

۹۳

(زمانے کا دھارا)

دھارا ہے زمانے کا رواں بے سروپا
پھرتے ہیں زمیں و آسماں بے سروپا
کیا جانئے کس منزلِ موہوم کی دھن
کھینچے لئے جاتی ہے کہاں بے سروپا!

۹۴

(کیا چال چلے ہیں)

موجوں سے لپٹ کر پار اُترنے والے
طوفانِ بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

٩٥

(بھنور میں کود پڑتے ہی بنی)

کشتی آخر اجل سے لڑتے ہی بنی
لڑنے کو لڑے مگر بچھڑتے ہی بنی
کاغذ کی ناؤ میں جہاں آگ لگی
گھبرا کے بھنور میں کود پڑتے ہی بنی

٩٦

(سنگدلوں کا انجام)

گرداب بلا میں سب ہیں گھرنے کیلئے
آخر کو ہیں دن سب کے پھرنے کیلئے
کیا کہئے مگر سنگدلوں کا انجام
پتھر کہیں ڈوبتا ہے ترنے کیلئے

٩٧

(غرور کا سر نیچا)

آپ اپنی بلاؤں میں کیوں گھرتا ہے
خشکی میں ڈوب کر کوئی ترتا ہے
کیا باؤ کے گھوڑے پہ اڑا پھرتا ہے
جھونکا کھاتے ہی منہ کے بل گرتا ہے!

٩٨

(جمہور کی پیروی کیا؟)

کیوں مذہب جمہور سے ہم باز آئے
رازی کی سمجھ میں خاک یہ راز آئے
آنکھ ایسی تو ہو کہ حق کو پہچان سکے
کان ایسے تو ہوں کہ دل کی آواز آئے!

۹۹

(انوکھا پُتلا)

وہ دِل جسے لاگ ہو کسی سے نہ لگاؤ
اِک خاک کا ڈھیر ہے جہاں چُونپ[1] نہ جاؤ
ٹھنڈی[2] مٹی کا اِک انوکھا پتلا
پہلو میں ہمیں کو دیکھ لو دُور نہ جاؤ

[1] چونپ یعنی ولولہ، اُمنگ۔ چاؤ یعنی شوق، ارمان ۔
[2] دل گرمانے یا رجھانے والی باتوں پر بھی جس شخص میں جوش یا ابال پیدا نہ ہو سکے کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بس ٹھنڈی مٹی کا بنا ہوا ہے ۔

۱۰۰

خاک سے پاک

پتلا مٹی کا خاک ہوگا کہ نہیں
پیراہنِ عمر چاک ہوگا کہ نہیں
آلودہ رنگ و بوئے مستانہ سہی
دل خاک میں مل کر پاک ہوگا کہ نہیں؟

۱۰۱

(حکمت بالغہ)

دل کو حد سے سوا دھڑکنے نہ دیا
قالب میں رُوح کو پھڑکنے نہ دیا
کیا آگ تھی سینے میں جسے فطرت نے
روشن تو کیا مگر بھڑکنے نہ دیا!

۱۰۲

(زندگی دردِ دل سے ہے)

دل زندہ ہے درد مغتنم ہے جبتک
آباد ہے گھر ہجوم غم ہے جبتک
بھڑکے ہیں تو کیا آپ سے اِک لاگ تو ہے
دم بھرتے رہینگے دم میں دم ہے جبتک

۱۰۳

(یہ دُنیا دیکھی بھالی ہے)

پیاری دُنیا کے چاؤ دیکھے ہیں بہت
ٹیڑھے سیدھے سبھاؤ دیکھے ہیں بہت
کیا پیرِ فلک تاؤ دکھاتا ہے مجھے
اِن آنکھوں نے تاؤ بھاؤ دیکھے ہیں بہت

۱۰۴

(دل پہ رکھ لو تو کوئی مشکل نہیں)

مردوں کا اصول جان لینے کی ہے دیر
دشوار کو سہل مان لینے کی ہے دیر
منجدھار تو کیا ہے آگ میں کود پڑیں
کچھ بھی نہیں دل میں ٹھان لینے کی ہے دیر

۱۰۵

(تدبیر بھی کوئی چیز ہے)

کیا مفت کا بہتان خدا پر باندھا
کیا گردشِ تقدیر کا چرخہ باندھا[1]
فطرت کیا ساتھ دیتی نامردوں کا
جیتے مردے کو کون دیتا کاندھا؟

[1] باندھنا بھی شروع کر دینا۔ چلانا۔ مگر محاورہ میں چرخہ باندھنا بھی جھگڑے رونا۔ گلے شکوے کرنا۔

۱۰۶

(تقدیر بڑی چیز ہے)

دیوانہ کارِ التجا کیا جانے
خود اپنے ارادوں کے سوا کیا جانے
تقدیر کے چکر میں جو آیا ہی نہ ہو
وہ بندۂ تدبیرِ دعا کیا جانے؟

۱۰۷

(تقدیر تقدیر)

ہم پلّہ تھے دو گل کوئی چھوٹا نہ بڑا
کانٹوں میں تُلا کوئی نگاہوں میں ترُا[1]
کھلتا نہیں کیا جانے کیا پھیر پڑا
پروان چڑھا کوئی گھورے پہ سڑا

[1] ترُا یعنی تُلا ۔

۱۰۸

(اوّل بآخر)

مہماں نہ سہی ایک مسافر ہی سہی
دل رکھ لے بلا سے بارِ خاطر ہی سہی
ساقیِ ازل ہم بھی ترے دَور میں ہیں
اوّل نہ سہی تو سب سے آخر ہی سہی

۱۰۹

(تقاضائے فطرت)

پھولوں کو ہوا کھا کے مہکتے ہی بنی
بلبل کو مہک پا کے چہکتے ہی بنی
سبزہ پہ چڑھا رنگ لہکتے ہی بنی
دل میں بھی دَبی آگ دہکتے ہی بنی

۱۱۰

(تقاضائے شوق)

بوسہ نہیں بوسے کا مزا لیتا ہوں
جھوٹی سچی ہوس بجھا لیتا ہوں
چلتا نہیں زور اُن سے لپٹے کیونکر
مُنہ دیکھ کے بس ہونٹ[1] چبا لیتا ہوں

[1] غصہ ہو یا شوق دونوں حالتوں میں ہونٹ چبانے کا تقاضائے فطرت ہے ۔

۱۱۱

(یادِ وطن)

اللہ ری تصور کی یہ رنگین نظری
غربت میں بھی دل جلوں کی کھیتی ہری ہری
کروٹ کروٹ ہے لہلہاتی جنت
جب تک ہے ہوائے لکھنؤ سر میں بھری

۱۱۲

(علی سے بیعت طلبی؟)

یاروں کی وہ سازش وہ خلافت طلبی
اسلام کے پردے میں حکومت طلبی
افسوس ید اللہ سے یہ بے ادبی
کس دن کے لئے علی سے بیعت طلبی؟

۱۱۳

(مشاہدہ غائب)

منظور نہیں کسی کی خاطر نہ سہی
ہوتے نہیں خود بزم میں ظاہر نہ سہی
آئینہ در آئینہ تمہیں دیکھ لیا
غائب ہی سہی بلا سے حاضر نہ سہی:

مشاہدہ حاضر تو یہ ہے کہ کوئی شخص روبرو کھڑا ہو اسے دیکھ رہے ہیں مشاہدہ غائب یہ ہے کہ شخص کا عکس پہلے اک آئینہ میں پڑا پھر اس آئینہ کا عکس دوسرے آئینہ میں پھر دوسرے کا تیسرے آئینہ میں یہ مشاہدہ تو ہے مگر مشاہدہ غائب

۱۱۴

(ہنگامۂ عشق)

دیوانے ترے غضب کی رفتار چلے
آئینہ بغل میں مارے بازار چلے
اللہ نگہبان ہے خود بینوں کا
ایسا نہ ہو گاہکوں میں تلوار چلے

۱۱۵

(اعجازِ ندامت)

کچھ دردِ نہاں کی مہربانی ہو جائے
دل میں پیدا ذرا روانی ہو جائے
پھر چشمِ ندامت کا دکھا دوں اعجاز
پتھر بھی خدا چاہے تو پانی ہو جائے

۱۱۶

(قطعہ)

گرم ہے حسن کا بازار خدا خیر کرے
مست ہیں کافرِ دیندار خدا خیر کرے
آنکھ لڑنے لگی دیوانوں سے دیوانوں کی
چل نہ جائے کہیں تلوار خدا خیر کرے

۱۱۷

(توبۂ بے ندامت)

آنکھیں ہیں تو انکارِ حقیقت مشکل
دل میں ہے مزہ تو ترکِ لذت مشکل
دیوانۂ عشق کیا کرے گا توبہ!
توبہ آسان مگر ندامت مشکل!

۱۱۸

(مر چکے اپنے حساب)

کرنا جو کچھ تھا کر چکے اپنے حساب
بھرنا جو کچھ تھا بھر چکے اپنے حساب
دل ہی نہ رہا تو موت کا ڈر کیسا
مرنا برحق ہے مر چکے اپنے حساب

۱۱۹

(پیٹ کا ہلکا منصور)

کیوں کھول دئے رازِ ازل کے ناحق
پھندے میں پھنسے آپ اجل کے ناحق
ہاں کیوں نہ اُٹھے شورِ انا الحق پہ فساد
بڑ مار اُٹھے پیٹ کے ہلکے ناحق

۱۲۰

(میں ہی میں ہوں)

آئینہ حق ہوں خود پسندی کیسی
دیوانہ ہوں اپنا ہوشمندی کیسی
عالم میں جدھر دیکھئے میں ہی میں ہوں
پستی کِسے کہتے ہیں بلندی کیسی؟

۱۲۱

(رنگِ محبت)

دل نشہ میں سرشار نظر آنے لگا
ویرانہ بھی گلزار نظر آنے لگا
کیا جانے محبت نے چڑھایا کیا رنگ
عالم گل بے خار نظر آنے لگا

۱۲۲

(بھٹکنے والے نہ تھکے)

باز آگئے تیری راہ تکنے والے
تھک تھک کے ہوئے ہیں ڈھیر تھکنے والے
پانی کیا ہے ہوا بھی تھم جاتی ہے
تھکتے نہ تھکے مگر بھٹکنے والے!

۱۲۳

(راستا دے کاگا)

دکھ درد کے ماروں کا نصیبہ جاگا
گھر بولتا ہے آج دَلِدّر بھاگا
دن کاٹتے ہیں گن گن کے اسی دن کیلئے
ساجن آتے ہیں راستا دے کاگا!

۱۲۴

مُنہ چاہیئے کھِل کھِلانے کیلئے

دل تھا غنچہ مگر کھِلنے کے لئے
ہنستوں کو دیکھ کر ترسنے کیلئے
کھِلنے کی ہوس میں اور چہرا بگڑا
منہ چاہیئے کھِل کھلا کر ہنسنے کیلئے

۱۲۵

(لکھنؤ مجھ سے ہے)

یارانِ چمن یہ رنگ و بو مجھ سے ہے
تم سے کیا ہوگا لکھنؤ مجھ سے ہے
میں جانِ سخن ہوں بلکہ ایمانِ سخن
دُنیائے ادب کی آبرو مجھ سے ہے

۱۲۶

(میری سُنتے تو سر دھنتے)

گذری ہے بہارِ عمر تنکے چنتے
آتشکدۂ شوق میں جلتے بھنتے
یارانِ چمن گاتے ہیں اپنی اپنی
میری سُنتے تو دیر تک سر دھنتے!

۱۲۷

(دُنیا فانی مگر یگانہ باقی)

وُہ دَور نہ رہا نہ وہ زمانہ باقی
ہر اور کوئی دن یہ فسانہ باقی
کیسا ادبار اور کہاں کا اقبال
دُنیا فانی مگر یگانہ باقی

۱۲۸

(روتے دیر نہ ہنستے)

بادل کو لگی کھلتے برستے کچھ دیر
دل کو نہ لگی اُجڑتے بستے کچھ دیر
بچوں کی طرح موم ہوا ہوں ایسا
روتے کچھ دیر ہے نہ ہنستے کچھ دیر

۱۲۹

(وُہ سانس لے کہ غنچۂ دل کھِلے)

راگ اور کوئی چھیڑ کہ لذت بھی مِلے
بیکار ہیں سب بادِ مخالف کے گلے
ٹھنڈی آہوں سے دل نہ ٹھنڈا ہو گا
وہ سانس تو لے غنچۂ دل جس سے کھِلے

۱۳۰

(قناعت کیسی)

بخشش کِسے کہتے ہیں عنایت کیسی
ملک اپنا ہے مال اپنا اجازت کیسی
قدرت کا خزانہ ہے تصرف کیلئے
تقدیر کے ٹکڑوں پہ قناعت کیسی

۱۳۱

(شاعر کو فلسفی کیا پائیگا)

وہ جوش وہ اضطراب منزل میں کہاں
وہ شوق طلب تھکے ہوئے دل میں کہاں
شاعر کی تہ کو فلسفی کیا پہنچے
منجدھار کا زور شور ساحل میں کہاں؟

۱۳۲

(دامِ آزادی)

ہوں صید کبھی اور کبھی صیاد ہوں میں
کچھ بھی نہیں بازیچۂ اضداد ہوں میں
مختار مگر اپنی حدوں میں محدود
ہاں وسعتِ زنجیر تک آزاد ہوں میں

۱۳۳

(خدا رحم کرے)

ہنگامۂ شوق و آرزو سے مجبور
دُنیا کی ہوائے چار سو سے مجبور
گلچیں کی تمنا پہ خدا رحم کرے
گل ہیں پروازِ رنگ و بو سے مجبور

۱۳۴

(تاجِ فنا)

ہر سانس ہے بازیچۂ امواجِ فنا
ہر ذات ہے آمادۂ معراجِ فنا
کیا شوکتِ شاہانہ ہے ماشاءاللہ
بے تاج کے اوپر اور اک تاجِ فنا!

۱۲۵

(امتحانِ صبر)

مشکل کوئی مشکل نہیں جینے کے سوا
خاموش لہو کا گھونٹ پینے کے سوا
کھلتے ہیں جبھی جوہرِ تسلیم و رضا
جب کوئی سپر ہی نہ ہو سینے کے سوا!

۱۲۶

(کس خواب کی تعبیر ہیں ہم)

ہیں خاک برابر مگر اکسیر ہیں، ہم
غالب کے پیر۔ ثانی میر ہیں، ہم
دُنیائے ادب تھی منتظر مدت سے
معلوم ہے کس خواب کی تعبیر ہیں ہم!

۱۲۷

(کوئی اور حسین ہو بھی تو کیا)

دُنیا میں کوئی اور حسیں ہو بھی تو کیا
پردے میں کوئی پردہ نشیں ہو بھی تو کیا
عالم میں جدھر دیکھئے میں ہی میں ہوں
حُسن اپنے سوا اور کہیں ہو بھی تو کیا

۱۲۸

(یگانہ ہوں میں)

مہمان ہے تو صاحبِ خانہ ہوں میں
آئینہ حُسن جاودانہ ہوں میں
مجھ سا کوئی دوسرا نہ تجھ سا کوئی
یکتائے جہاں تو ہے یگانہ میں ہوں

۱۳۹

(ہاں ایسے ہی منہ پہ بانکپن کھپتا ہے)

اقلیمِ سخن نام مرا چھپتا ہے
کیوں لکھنؤ اپنے بھاڑ میں تپتا ہے
تصویر یگانہ آپ بول اٹھے گی
ہاں ایسے ہی منہ پہ بانکپن کھپتا ہے!

۱۴۰

(پاؤ رتی باون تولے)

کیوں شرح کا دفتر کوئی احمق کھولے
ہے یہ وہ سخن کہ اپنے منہ سے بولے
کانٹوں کا تلا ہوا لگا ہوں میں بچا
لے تول لے پاؤ رتی باون تولے

۱۴۱

(گدائے شاہانہ مزاج)

دنیا کا خود اصلاح پہ آیا نہ مزاج
رخ کیا کرتا گدائے شاہانہ مزاج
دیوانوں نے دیوانوں کا پایا نہ مزاج
کیوں راہ پہ آتا دلِ دیوانہ مزاج

۱۴۲

(حیاتِ ابدی)

کس دھن میں کوہکن نے تیشہ باندھا
سر پھوڑ کے خود موت کا آگا باندھا
قدموں سے لپٹ گئی حیاتِ ابدی
کیا عشق کے سر اجل نے سہرا باندھا!

۱۴۳

(زحمتِ بیداردلی)

آساں نہیں موت کی آہٹ لینا
گہوارۂ بیخودی میں کروٹ لینا
بیداردلی ہے اور اُلٹی زحمت
اچھا نہیں اپنے سر یہ جھنجھٹ لینا

۱۴۴

(دُعا مانگنے والا تو کون)

بیدرد دوا مانگنے والا تو کون؟
کیوں میرے سوا مانگنے والا تو کون؟
ہنستا ہوں خود اپنے حال پر میرے لئے
رو رو کے دُعا مانگنے والا تو کون؟

۱۴۵

(مردہ پرستوں کا مذہب)

اِن مردہ پرستوں کا ہی مذہب کیسا
ہر حال میں بدحال یہ مشرب کیسا
کل تک تو اِسی کل سے آزردہ تھے
گذرے ہوئے کل کا ذکر خراب کیسا

۱۴۶

(لاکھوں شیطان پر ایک انسان بھاری)

کافر کا مسلماں سے بس کیا چلتا
دیوون کا سلیماں سے بس کیا چلتا
لاکھوں شیطان پر ایک انسان بھاری
شیطان کا انسان سے بس کیا چلتا

۱۴۷

(اللہ رے ہیں)

مے کیا ہے؟ خونِ دل بھی پی کر نہ چھکا
جی بھر کے بُرا کام کوئی کر نہ سکا
مجھ کو کوئی مجھ سے پوچھے۔ اللہ رے ہیں
وہ میں کہ گناہ کرتے کرتے نہ تھکا

۱۴۸

(جتنی ضرورت اتنی قیمت)

ہاں فکرِ رسا دیکھ بڑا بول نہ بول
گنجینۂ راز اندھی نگری میں نہ کھول
جس کی جتنی ضرورت اتنی قیمت
ہیرا کبھی کنکر ہے کبھی ہے انمول!

۱۴۹

(خبر آزادی)

رہنے کا نہیں بندِ درِ آزادی
دیتی ہیں ہوائیں خبرِ آزادی
دروازۂ زنداں درِ توبہ تو نہیں
ہاں اَلمدد اے دردِ سرِ آزادی

۱۵۰

(ذرا تھاہ تو لیں)

سنتا نہیں ناخدا پکاریں کب تک
پوچھیں کب تک پتا بچاریں کب تک
غوطہ ہی لگا دیکھیں ذرا تھاہ تو لیں
منجدھار میں ہاتھ پاؤں ماریں کب تک

۱۵۱

(عقل کے اندھے)

کِس کام کا دل جو ہو خبر سے خالی
منہ میں ہے زباں مگر اثر سے خالی
اِن عقل کے اندھوں پہ خدا رحم کرے
آنکھیں دو دو مگر نظر سے خالی

۱۵۲

(پرکھنے والا تو کون؟)

ہم ایسوں کا درد رکھنے والا تو کون؟
یہ لذتِ تلخ چکھنے والا تو کون؟
کیا دل کو ٹٹولتا ہے اندھوں کی طرح
ٹوٹا ہی سہی پرکھنے والا تو کون

۱۵۳

(پھانسی ہی سہی)

بیدرد بلا سے قصّہ کوتہ کر دے
پیمانہ اسیروں کا لہو سے بھر دے
پھانسی ہی سہی حکم رہائی نہ سہی
کب سے لٹکے[1] ہیں بال باندھے بیٹھے

[1] بال باندھے غلام لٹکے ہیں یعنی معلق ہیں۔ اُن کے مقدمہ کا کوئی فیصلہ نہیں ہو چکتا۔

۱۵۴

(موجود کو معدوم سمجھنا مشکل)

دُکھ درد کو موہوم سمجھنا مشکل
مشکل ہے یہ مفہوم سمجھنا مشکل
اپنی ہستی غلط نہ اپنی بیتی
موجود کو معدوم سمجھنا مشکل

۱۵۵

(جس کی دوا نہ دعا)

دُنیا سے اُٹھتے ہیں دل کی دل ہی میں لئے
کس کام کی زندگی کہ ناکام جئے
وہ درد دیا جس کی دوا تھی نہ دُعا
دل تجھ سے لگایا تھا اسی دن کے لئے

۱۵۶

دُکھ کے دم سے سکھ کا مزا

ہاں جب ہی مزا کہ دوست دشمن ہو جائے
ہر پہلوِ خوب و زشت روشن ہو جائے
سکھ میں جو سواد ہے تو دُکھ کے دم سے
سکھ ہی سکھ ہو تو پھر اجیرن ہو جائے

۱۵۷

(کبھی تو مراد بر آتی)

اے بادِ مراد! آہ تیرے چلتے
اِک عمر کٹی ہے خاک منہ پر ملتے
اِس شوخیٔ رفتار پہ جی کیوں نہ جلے
دِل کے بدلے کبھی تو گھی[1] کے جلتے

[1] دل جلنے کے بدلے کبھی گھی کے چراغ بھی جلتے ۔ مراد بر آتی ۔

۱۵۸

(رہائی)

زندانِ بلا سے خاک اُڑا کر چھوٹے
یارانِ ہوس کا جی چھڑا کر چھوٹے
دیوانوں سے کچھ بس نہ چلا یاروں کا
دِل توڑ کے زنجیر تڑا کر چھوٹے

۱۵۹

(دِھرانے والا تو کون؟)

کیوں پیرِ فلک دِھرانے والا تو کون
چل! خاک بسر پھرانے والا کون
ٹھہرا ہے ہوا پہ آشیانہ اپنا
گر جائے گا خود۔ گرانے والا تو کون؟

۱۶۰

(دلّی کی زبان)

دلّی کی زبان لکھنو کیا جانے
میرؔ و مرزاؔ کی گفتگو کیا جانے
دل درد سے خالی ہو تو کو اس فضول
خاموش! زبانِ عشق تو کیا جانے

۱۶۱

(حُسنِ پنجاب)

پنجاب سے ایمان سلامت لائے
اب جائیں گے کیا۔ جان رہے یا جائے
وہ حُسن کا عالم کہ الٰہی توبہ
توبہ ہوئی۔ اب سے آئے گھر سو آئے

۱۶۲

(عِیدمنانے کے مزے)

کیا جانے کوئی عید منانے کے مزے
جبتک نہ اُٹھائے دل لگانے کے مزے
اے عید منانے والو مجھ سے پوچھو
روٹھے ہوئے دوست کو منانے کے مزے

۱۶۳

(تلخی و خوشی توام)

یک موج نشاط صبحدم برخیزد
صد خندۂ تلخ از دلم برخیزد
در عین بہار نخل غم برخیزد
تلخی و خوشی ہر دو بہم برخیزد

۱۶۴

(آئینہ یک دگرے)

پنہاں نتواں داشت ز صاحب نظرے
گوید چہ عجب ز مبتدایم خبرے
از درد خدا داد نگاہم سرشار
ایں دیدہ و دل آئینہ یکدگرے

۱۶۵

(ہر چشم زدن عالم دیگر دارد)

پیراہن تن عالم دیگر دارد
یوسف بہ کفن عالم دیگر دارد
گم گشتہ تماشا بتماشائے دگر
ہر چشم زدن عالم دیگر دارد

۱۶۶

(عذابِ عمرِ ابدی)

از چشمۂ حیواں دمِ آبے نکشم
واز میکدۂ خضر شرابے نکشم
شام و سحرم مرگ و حیاتِ دگرے
از عمرِ ابد رنج عذابے نکشم

١٦٧

(از خود خبرے میخواہم)

گم گشتہ ام از خود خبرے میخواہم
پروانہ صفت بال و پرے میخواہم
آتش بزنم بدیں سیہ خانۂ دل
زیں خانۂ تاریک ۔ درے میخواہم

١٦٨

(از خاک پاکم گردان)

سرگشتہ بدیں طلسم خاکم بنگر
بسیدرد ۔ بحال دردناکم بنگر
آغاز خوش انجامم ۔ دانم زکجاست
خاکم بنگر، زخاک پاکم بنگر

١٦٩

(از گناہم مپرس)

یاد آمدہ آنچناں گناہے کہ مپرس
دارم ز دلِ خویش گواہے کہ مپرس
تا سنگ بر آئینہ امید زدم
دزدیدہ ام بسینہ آہے کہ مپرس

١٧٠

(کشتۂ تدبیر خویش)

ایں سادہ دلاں ہلاک تدبیر خود اند
نامحرم خندہ ہائے تقدیر خود اند
از حکمِ قضا بخاک و خون غلطیدہ
دیوانہ صفت کشتۂ شمشیر خود اند

۱۷۱

(جستجویت غلط است)

شوقت غلط است و آرزویت غلط است
فکرت غلط است و جستجویت غلط است
جولانیِ گردباد بے مرکزِ ہیچ
سودائے سیرِ چارسویت غلط است

۱۷۲

(به درِ نگشوده)

تا چند فریبِ نظرِ نگشوده
تا کے ہوسِ بال و پرِ نگشوده
دارد چہ عجب از پسِ پرده خبرے
خاموش نشستنے به درِ نگشوده

۱۷۳

(چہ اتّفاق افتاده)

تا شیشۂ آرزو ز طاق افتاده
ناگاه بجان و دل نفاق افتاده
بر کام و دہن چہ اتفاق افتاده
شیرینی و تلخی ز مذاق افتاده

۱۷۴

(پا برکاب)

دورانِ شباب و ہائے ہو پا برکاب
ہنگامہ شوق و آرزو پا برکاب
ایں ناز و نیازِ من و تو پا برکاب
گل پا برکاب و رنگ و بو پا برکاب

۱۷۵

(نتواں باز آمد)

شعلہ ز شرارت نتواں باز آمد
پروانہ ز فطرت نتواں باز آمد
انسان کہ مرکب است از جہل و خطا
از جرم محبت نتواں باز آمد

۱۷۶

(از دستِ یگانہ)

کاریست کہ از دستِ یگانہ شدنی است
ایں مرد کہ یکتائے زمانہ شدنی است
برباد دہد دفترِ پارینہ را
غالب پس امروز فسانہ شدنی است

۱۷۷

(آزادی من ننگِ گرفتاری من)

دیوانہ صفت جوش و خروشم بنگر
ہنگامۂ شوقِ خام جوشم بنگر
آزادی میں ننگ گرفتاری من
در سایۂ گل قفس بدوشم بنگر

۱۷۸

(حسرتِ رہائی)

کیا فصلِ بہاری کی خبر نے مارا
یا بوالہوسی کے دردِ سر نے مارا
یارا شکستہ پر ہیں کتنے بیتاب
کس کی آوازِ بال و پر نے مارا؟

۱۸۰

(لنگوٹی ہی سہی)

تقدیر پہ کیا زور ہے کھوٹی ہی سہی
بوٹی نہ ملی تو روکھی روٹی ہی سہی
چرخہ تو چلائے جاؤ گاندھی جی کا
دھوتی نہ سہی تن پہ لنگوٹی ہی سہی

۱۸۱

(حاصلِ زندگی)

آتا نہیں کچھ گرہ سے کھونے کے سوا
دولت کے نشے میں بھنگ ہونے کے سوا
دو دن کی زندگی کا حاصل کیا ہے
کھانے پینے لپٹ کے سونے کے سوا

۱۸۲

(ہیرا پھیری ہی سہی)

ڈر کیا ہے بلا سے رات اندھیری ہی سہی
کچھ ہو نہیں سکتا تو دلیری ہی سہی
پھرتے ہیں ترے کوچے میں اٹے گہلے[1]
چوری نہ سہی تو ہیرا پھیری ہی سہی

[1] اٹے گہلے پھرتے ہیں یعنی اینڈے اینڈے پھرتے ہیں

۱۸۳

(دل میں کوئی چور رہے)

کیا نفس میں زور ہے ابھی تک باقی
کیا کوئی لنگور ہے ابھی تک باقی
کیوں کان کھڑے ہوتے ہیں آہٹ پاکر
دل میں کوئی چور ہے ابھی تک باقی

۱۸۴

(گستاخیٔ شوق)

نازک بانہیں مروڑ ڈالوں نہ کہیں
قابو پا کر جھنجھوڑ ڈالوں نہ کہیں
ترسا ہوا میں ہوں تمہیں ڈر لگتا ہے
منہ چومتے ہی بھنبھوڑ ڈالوں نہ کہیں

۱۸۵

(چلتی گاڑی میں)

دلّی سے اُدھر وہ غیرتِ حور چلا
میں نشۂ شوق میں اِدھر چور چلا
چلتی گاڑی میں منہ چڑھانا اس کا
میں دُور سے دانت پیستا گھور چلا

۱۸۶

(آئی پہ چوکنا کیا؟)

ہر عید کو اِک دلھن نئی کیوں کرتا
دو دن کی جوانی میں کئی کیوں کرتا
ہاں موت کو آغوش میں لیتے ہی بنی
خود آئی تو آئی پہ گئی کیوں کرتا

لے آئی پہ گئی کیوں کرتا یعنی آئی پر کیوں چوکتا؟

۱۸۷

(دڑھیالا بندرا)

نخاس سے خلعت کوئی منگوا لیتا
یا چوک سے جوڑا کوئی سنگوا لیتا
حجلہ میں ڈٹا ہے شیخ کفنایا ہوا
داڑھی کی طرح کفن بھی رنگوا لیتا

۱۸۸

(جنم لنڈورا)

پامال ازل تھا دل تو کیونکر جڑتا
کس دل سے بھلا چمن کی جانب مڑتا
کلیاں بھی نہ پھوٹیں پر پرواز کجا
کس بل پہ کوئی جنم لنڈورا اڑتا

۱۸۹

(یوں ہی سہی)

قربانی کا حکم ہے چلو یوں ہی سہی
گردن پہ کسی غریب کا خون ہی سہی
نیت ہے بخیر اپنی تو پروا کیا ہے
بکرا نہ سہی موٹی سی اک جوں ہی سہی

۱۹۰

(بلال حبشی)

عاشق ہوں ترا کالا کلوٹا ہی سہی
سچا نہ سہی بلا سے جھوٹا ہی سہی
صد پارۂ دل میں ہیں یہ جلوے کس کے؟
آئینہ پھر آئینہ ہے ٹوٹا ہی سہی

۱۹۱

پردہ اُٹھ گیا تو نظر کیوں نہ اُٹھے

جب اُٹھ گیا پردہ تو نظر کیوں نہ اُٹھے
لڑ جائے نظر تو شور و شر کیوں نہ اُٹھے
انسان ہے انسان فرشتہ تو نہیں
شیطان چڑھا سر پہ تو سر کیوں نہ اُٹھے

۱۹۲

گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز

منبر پہ جناب جب کبھی ریز کریں
جو بات کریں مضحکہ انگیز کریں
انگور حلال اور مئے انگور حرام
گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز کریں

۱۹۳

(سنجیدہ مزاج اور ایسے مکار)

کھوٹے تو بہت دیکھے کھرے کم دیکھے
دل دیکھے مگر درد بھرے کم دیکھے
سنجیدہ مزاج - اور ایسے مکار
ایسے مکار مسخرے کم دیکھے

۱۹۴

(یہ اونٹ کس کل بیٹھے)

دیوانے ترے پہاڑ اوجھل بیٹھے
جنگل میں منا رہے ہیں منگل بیٹھے
کعبہ میں ہے شیخ بلبلا تا پھرتا
دیکھیں تو سہی یہ اونٹ کس کل بیٹھے؟

۱۹۵

(خوب مرے)

بہتیرے جوانان خوش اسلوب مرے
بے موت بھسم ہو گئے یا ڈوب مرے
مرنا اس کا کہ مر کے زندہ ہو جائے
مرنے کو مرے ہم بھی مگر خوب مرے

١٩٦

(ٹیڑھے مرزا)

شاہوں سے مری کلاہ ٹیڑھی ہی رہی
بدمغزوں سے رسم و راہ ٹیڑھی ہی رہی
ٹیڑھے مرزا کو کون سیدھا کرتا
سیدھی نہ ہوئی نگاہ ٹیڑھی ہی رہی

١٩٧

(ہنسنے والوں کی صورت ہی سہی)

دل تنگ نہ ہو تنگ خیالوں کی طرح
جوتے بھی کھاؤ تر نوالوں کی طرح
کھسیانی ہنسی ہنس کر کرو دل خالی
صورت ہی بنا لو ہنسنے والوں کی طرح

١٩٨

(گنواروں سے اُلجھنا کیا)

بیہودہ نگار سے اُلجھتے کیوں ہو
اس ناہموار سے اُلجھتے کیوں ہو
آزاد کو کہتا ہے بُرا کہنے دو
کیوں ایسے گنوار سے اُلجھتے کیوں ہو

١٩٩

(زنگی کافور)

دل جن کا علیل رائے بھی اُن کی علیل
باطن میں آزر اور بظاہر ہیں خلیل
اندھے جو ذلیل کو سمجھتے ہیں عزیز
شیطان کو عجب نہیں جو کہہ دیں جبریل!

۲۰۰

(دیوانی ہنسی)

اندھی نگری کے رہنے بسنے والے

نظارۂ معنی کو ترسنے والے

ٹوٹے ہوئے دل کی نغمۂ دلکش پر

دیوانی ہنسی ہنستے ہیں ہنسنے والے

۲۰۱

(ہارے تو چلے ناپارے)

پیارے صاحب سُنو تو پیارے صاحب

کھسیانے نہ ہو شرم کے مارے صاحب

خود ناچ تو آتا نہیں آنگن ٹیڑھا

ہارے تو سدھارے ناپارے[1] صاحب

[1] اودھ میں ایک بستی کا نام ہے ناپارہ۔ جب کوئی شخص ہار کر شرمندہ اور کھسیانا ہو جاتا ہے تو اس پر یہ مثل کہی جاتی ہے "ہارے تو چلے ناپارے"

۲۰۲

(ادوائن کے توتے)

تقلید کے پھندے ہیں گلے میں جن کے

واللہ قدم رکھتے ہیں کیا گن گن کے

رفتار میں تیزی ہے نہ پرواز بلند

شاعر تو نہیں توتے[1] ہیں ادوائن کے

[1] سست رفتار شخص پر ادوائن کے توتے کی پھبتی کہی جاتی ہے جس طرح توتا پلنگ کی ادوائن پر دھیرے دھیرے قدم رکھتا ہے وہی حال تقلید پیشہ شاعروں کا ہے۔

۲۰۳

(استادِ ازل کے شاگردِ رشید)

استادِ یگانہ بے گرے کیوں ہوتے

آپ اپنی نگاہوں میں گرے کیوں ہوتے

استادِ ازل کے ہیں جو شاگردِ رشید

غالبؔ کی طرح بے سُرے کیوں ہوتے

۲۰۴

(شورِ طفلانہ)

دیوانوں کے یہ زور نہ دیکھے نہ سُنے
نادانوں کے یہ شور نہ دیکھے نہ سُنے
جھنڈے پہ چڑھانے کو چڑھاتے ہیں مگر
غالبؔ سے چچا چور نہ دیکھے نہ سُنے

؎ چچا سعدی اور چچا غالب میں بڑا فرق ہے۔

۲۰۵

(چار جز کے دیوان کی خیر)

اب کون مناتا ہے قرآن کی خیر
ہاں چاہیئے چار جز کے دیوان کی خیر
غالبؔ پہ جو ایمان نہ لائے کافر
پھر جان کی خیر ہے نہ ایمان کی خیر

۲۰۶

(دُنیا کو غلط سبق پڑھانے والے)

غالبؔ کو میرؔ سے بڑھانے والے
چوروں کو بانس پر چڑھانے والے
اندھوں کو اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے
دُنیا کو غلط سبق پڑھانے والے

۲۰۷

(غالب کے چچا)

چنگیزی لہو ہے اپنی رگ رگ میں سچا
مجھ سے جو تنے تو منہ کی کھاؤ گے بچا
غالبؔ کو چچا بنا کے چھوڑا میں نے
غالبؔ میرے چچا - میں غالبؔ کا چچا!

۲۰۸

(یگانہ کون)

بھونڈا پن ہر مذاق غالب میں رچا
مرزا کا کمال اپنی نظر میں نہ جچا
محفل میں ہے اب رنگ یگانہ غالب
وہ کون یگانہ ؟ وہی غالب کے چچا!

۲۰۹

(ارے واہ رے میں)

کس منہ سے کہوں کیا ہوں میں ارے واہ رے میں
آفت ہوں بلا ہوں میں ارے واہ رے میں
بھاری ہیں بڑے بڑوں پہ مردہ اپنا
غالب کا چچا ہوں میں ارے واہ رے میں

۲۱۰

(نئی سوجھتی ہے)

استادوں کے ساتھ دل لگی سوجھتی ہے
نشہ میں خودی کے دور کی سوجھتی ہے
غالب کے چچا بنے ہو ماشاء اللہ
جو سوجھتی ہے یار نئی سوجھتی ہے

(میرزا یگانہ)

ڈرامے چند :- از محمد عبدالرحمن نور الٰہی مصنفین ناٹک ساگر
سات ایک ایکٹ مذاقیہ ڈراموں کا مجموعہ جو بنیا گھروں
تھیٹروں اور سکولوں اور کالجوں کی ڈرامیٹک کلبوں میں
سٹیج کرنے کے لئے بہترین ہیں حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲؍

چہیتا بھائی :- از مرزا فہیم بیگ چغتائی
ایک نہایت ہی دردناک اور سبق آموز قصہ جو سچے اور
اصل واقعات پر مشتمل ہے۔ زبان سلیس اور شستہ انداز
بیان از حد دلچسپ۔ حجم ۱۶۶ صفحات۔ قیمت ۱۲؍

اردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور
کتبہ محمد صدیق الماس رقم
عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر

یگانہ کے معرکے

نیرّ مسعود ● "ادبستان" دین دیال روڈ۔ لکھنؤ۔ ۳

میرزا یگانہ چنگیزی ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ آئے تھے[1]۔ یہ شہر انہیں پسند آیا اور انہوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس بائیس سال کی تھی اور وہ نہ یگانہ تھے، نہ چنگیزی۔ اس وقت وہ مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی تھے۔ مشاعروں میں ان کا کلام پسند کیا جاتا تھا، لیکن لکھنؤ کی ادبی فضا پر اس وقت صفی، ثاقب، عزیز وغیرہ چھائے ہوئے تھے جنھوں نے لکھنؤ کی روایتی غزلیہ شاعری سے کسی قدر انحراف کر کے غالب کی تقلید اختیار کی تھی۔ ان مقبول عام شاعروں کی خوشنودی حاصل کئے بغیر کسی بیرونی شاعر کا لکھنؤ کے ادبی میدان میں قدم جمانا دشوار تھا۔ لیکن یاس عظیم آبادی کے تیوروں سے بہت جلد ظاہر ہونے لگا کہ انہیں ان شاعروں کی کوئی خاص پروا نہیں اور وہ ان کے مقابلے میں شہر کے پرانے استادوں کو زیادہ مستند سمجھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے شاد عظیم آبادی کا شاگرد ہونے کے باوجود لکھنؤ میں میر انیس کے نواسے پیارے صاحب رشید سے اپنی چند غزلوں پر اصلاح بھی لی۔ اس سے لکھنؤ کی فضا میں ایک کشیدگی سی پیدا ہوئی اور یاس پر اعتراضات ہونے لگے کہ ان کی زبان ٹکسالی اور مستند نہیں ہے۔ ۱۹۱۲ء تک یاس کے اس پہلے ادبی معرکے کی داغ بیل پڑ چکی تھی[2]۔ ۱۹۱۴ء میں انہوں نے "نشترِ یاس" کے نام سے اپنا دیوان شائع کیا جس میں پرانے استادوں نواب بہادر علی خاں انجم، مرزا اوج (فرزند مرزا دبیر)، جاوید، علی محمد عارف اور فصاحت لکھنوی (فرزند امانت لکھنوی) کی تعریفی رائیں شامل تھیں۔ یاس نے ان رایوں کو درج کرنے کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا

"لکھنؤ کے اساتذہ سچ پوچھئے تو یہی ہیں جن کی رائیں درج کی جاتی ہیں"

اس کے علاوہ انہوں نے "ماہیتِ شاعری" کے عنوان سے اس دیوان کا مقدمہ لکھا اور اس کے آخر میں مزید ایک نوٹ لکھا جس کے چند فقرے یہ ہیں:

"کوئی وجہ نہیں کہ یاس کو... لکھنؤ اہلِ زبان نہ مانے۔ جب خاندانی شعراء اور اہلِ زبان نے مان لیا تو معاصرین حال اور آئندہ نسلوں پر فرض ہے کہ یاس کی زبان اور اجتہادی تصرفات سے سند لیں... مگر لکھنؤ کے اکثر نافہم دوسروں کے حقوق کو نہایت بے دردی سے پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اہلِ انصاف کی نگاہوں میں خود ذلیل ہوتے ہیں"

اس طرح یاس نے گویا یہ دعویٰ کر دیا کہ ثاقب، عزیز وغیرہ کو ان کی پیروی کرنا چاہئے۔ جواب میں ان کی ہنسی اڑائی گئی۔ "نشترِ یاس" کی قیمت آٹھ آنے (موجودہ پچاس پیسے) تھی اور یاس نے اس کے کچھ شعروں پر ایک، کچھ پر دو اور کچھ پر تین صاد بنا کر اہلِ نظر کو ان شعروں کی طرف خاص طور پر متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ منصور نگر لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں جو آرزو لکھنوی کے شاگرد شفق لکھنوی کے زیرِ اہتمام ہوا تھا، صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی ظریف لکھنوی نے جو ہزل پڑھی اس میں یہ ہجویہ اشعار بھی تھے:

---

[1] "آیاتِ وجدانی" طبع سوم۔ اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء صہ ۸

[2] ایضاً "میرزا یگانہ کا دورِ مقابلہ تو لکھنؤ میں ۱۹۱۲ء سے شروع ہو چکا تھا" صہ ۲۷۹

شاعروں نے نہ لیا کیوں اسے زٹل سمجھے ـــ میرے دیوان کی آٹھ آنے جو قیمت دیکھی[1]

سندیں دے کے بناتے ہیں مجھے سب شاعر — لکھنؤ والوں کی سنجیدہ ظرافت دیکھی؟

انکھڑیاں پھاڑ کے رہ رہ گیا وہ شوخ نظر — میرے اشعار پہ جب صاد کی کثرت دیکھی

ہے مرے مُنہ میں زباں، اہلِ زباں ہوں، میں ظریف — آپ نے میرا تصرف میری جدت دیکھی؟

اسی مشاعرے میں عزیز لکھنوی کی غزل کے اس شعر پر بڑی تعریفیں ہوئیں :

دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے — میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی

لیکن یاس نے روزنامہ "ستارہ" میں اس شعر کا سخت مضحکہ اڑایا اور "قیامت دیکھی" کی ایسی ایسی تاویلیں کیں کہ یہ شعر ہزل کا شعر بن کر رہ گیا۔ اب یاس اور ان کے حریفوں کی باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ یاس نے ایک اشتہار شائع کیا جس میں انھوں نے عزیز وغیرہ کو شاعر ماننے سے انکار کیا تھا۔ اس کے جواب میں آس تخلص کے ایک فرضی شاعر کی طرف سے فارسی میں رجز کے طور پر یاس کی ایک ہجو چھپوا کر چوک میں تقسیم کی گئی۔ اس ہجو کے کچھ شعر یہ ہیں :

جہان پہلوان آس پُر دل منم — بہ گردانِ معنی مقابل منم

نماید اگر روئے خود ہجو تیر — بہ دل یاس را دیدہ دوزم بہ تیر

کہ در قلبِ مومن دہ گنجد ہراس — بود در دلِ کافراں جائے یاس

دلِ کافراں ہجو دوزخ بود — ز دوزخ بچہ یاس مطلع بود

بہ قرآں کہ خواندیم لاتقنطو — تفو بر رُخِ یاس اینک تفو

بہ نامِ خداوند بالا و پست — کنم یاس را نیست ہر جا کہ ہست

اس کے علاوہ یاس کی ایک غزل کے شعروں پر فحش مصرعے لگائے گئے جو صفدر مرزاپوری لکھنؤ میں لوگوں کو سناتے پھرتے تھے۔

اسی زمانے (۱۹۱۴ء) میں یاس نے علم عروض پر ایک کتاب "چراغ سخن" لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عروض دانی میں اُن کے حریف ان سے پیچھے ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے نامانوس وزن میں یہ تین شعر کہہ کر ایک اور شخص کے ذریعے صفی، عزیز اور ثاقب کے پاس اظہار رائے کے لئے بھجوائے :

تنہا وہ کیوں زیرِ خاک سوتے ہیں آرام سے — کانوں پہ رکھتے تھے ہاتھ جو موت کے نام سے

دُنیا کی آرزو نہ دین کی آرزو — اڑتے ہیں ہوش ایسے اب گردشِ ایام سے

جلوۂ معنی کجا دیدۂ حیراں کجا — باز آ اے یاس[2] اس آرزوئے خام سے

صفی اور عزیز نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن ثاقب نے ان شعروں کی بحر اور وزن وغیرہ کے بارے میں اپنی رائے لکھ بھیجی۔ اب یاس نے ایک مضمون "میاں ثاقب کی عروض دانی" شائع کیا اور اس میں ثاقب کی رائے کی غلطیوں پر گرفت کی۔ ثاقب نے اس مضمون کا جواب لکھا تو یاس نے "میاں ثاقب کی ڈھٹائی"

---

[1] یہ ہزل ظریف کے کلیات "دیوانجی" (مرتبہ صفی لکھنوی، امیریہ دار التصنیف و التالیف، لکھنؤ ۱۹۴۷ء) میں شامل ہے (ص ۹۹) لیکن اس میں "آٹھ آنے" کی جگہ "آدھ آنے" چھپا ہے اور صفی نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے :

"اس شعر میں حکیم کے دیوان کی طرف اشارہ ہے۔ حکیم ایک شاعر تھے اور ان سے بہت لوگ مزاح کرتے تھے۔ جب ان کا دیوان چھپا تو یار لوگوں نے ٹکے سیر بیچنا شروع کر دیا اور انھوں نے بگڑ بگڑ کر گالیاں دینا شروع کیں۔"

ظاہراً "آدھ آنے" صفی کا تصرف اور یہ حاشیہ اصلیت کو چھپانے کی کوشش ہے۔ لیکن ممکن ہے مشاعرے میں (جہاں یاس بھی موجود تھے) "آدھ آنے" ہی پڑھا گیا ہو اور یہ بھی ظاہر کیا گیا ہو کہ ان شعروں میں "نشترِ یاس" کی طرف اشارہ نہیں ہے ——— بہرحال لکھنؤ میں یہ شعر یاس کی ہجو کے طور پر اور "آٹھ آنے" کے ساتھ مشہور ہوئے۔ (نیر مسعود)

[2] یاس بتاتے ہیں کہ "مقطع میں یاس کی جگہ کچھ اور لکھ دیا تھا" ("چراغ سخن"، طبع ثانی مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۲۱ء، ص ۱۳۸)

کے عنوان سے جواب الجواب لکھا۔ اس کارروائی سے یاس کو یہ جتانا مقصود تھا کہ ان کے حریف عروض کی باریکیوں سے ناواقف ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

"یہ استفتا جناب صفی و عزیز و ثاقب کے پاس بھیجا گیا تھا کہ ان اشعار کی تقطیع کر کے بھیج دیجئے۔ جناب صفی و عزیز نے تو بالکل سوں کھینچی۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں تھے ہی نہیں۔ تاکیدی خطوط بھجوائے گئے مگر جواب ندارد۔ میاں ثاقب نے جواب لکھ مارا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میاں ثاقب کا جواب ان اصحاب ثلاثہ کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ تینوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ عروض دانی ان ہی لوگوں پر ختم ہے" [1]

(الناظر، فروری ۱۹۱۶ء، ص ۳۵)

اس معرکے کے چند ماہ بعد لکھنؤ کے اخبار "اودھ پنچ" (شمارہ ۱۲۵ اپریل ۱۹۱۸ء) میں "سیف زبان لکھنوی" کے نام سے ایک مضمون "ادبی دنیا کا انقلاب" چھپا جس میں یاس کی ایک غزل کے چار شعروں پر اعتراض کئے گئے۔ اس غزل کا مقطع ہے :

نہ چھپا پر نہ چھپا جوہرِ عالی نسبی　　　یاس مٹنے پہ بھی خاکِ درِ مے خانہ بنے

اس مقطع پر یہ فقرہ چست کیا گیا تھا کہ اس سے شاعر کے خاندان کا پتہ چلتا ہے۔ اور اس پر جو مصرعے لگائے گئے تھے ان سے یاس کے والدین کی منقصت نکلتی تھی۔ یاس کا خیال تھا کہ یہ مصرعے جوش ملیح آبادی نے لگائے ہیں جو عزیز کے شاگرد تھے۔ یاس کو یہ بھی یقین تھا کہ سیف زبان لکھنوی دراصل ناطق لکھنوی ہیں جنھوں نے عزیز کے کہنے پر یہ اعتراضی مضمون لکھا ہے، چنانچہ انہوں نے میرٹھ کے رسالہ "نظارہ" میں ان اعتراضوں کے جواب دینے کے ساتھ عزیز لکھنوی کے کلام پر جوابی اعتراض کر دیے۔ جھگڑا زیادہ بڑھتے دیکھ کر جوش نے عزیز اور یاس میں صلح کرانے کی کوشش کی جو ناکام رہی اور بالآخر یاس نے عزیز لکھنوی کے خلاف ایک پوری کتاب شائع کر دی جس کا نام انھوں نے "شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز" رکھا۔

اہلِ لکھنؤ کے ساتھ یاس کے اس ادبی معرکے میں ذاتیات کی آمیزش شروع ہی سے دونوں طرف تھی اور تحریروں میں تنقید سے زیادہ تضحیک کا انداز نمایاں تھا، خصوصاً یاس کے لہجے میں بڑی جارحیت تھی، مثلاً عزیز کے اس شعر پر :

شوقِ اذانِ صبح میں بستر لگاتے ہوں　　　کعبے کی چھت پہ سونے کا ساماں کئے ہوئے

یاس کا تبصرہ یہ ہے :

"اہاہاہا! کعبے کی چھت پہ! کیا کئے ہوئے؟ سونے کا ساماں کئے ہوئے، بستر لگائے ہوں! واہ رے مصرع واہ، ترا کیا کہنا! کوئی نحوی غلطی ہو تو سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ دہقانی بدمذاقی، کوئی سمجھائے تو کیونکر۔ ذرا بلندیٔ تخیل تو دیکھئے۔ میاں عزیز کو کعبے کی چھت پر سونے کا شوق چرایا ہے۔ کسی بادشاہ نے ایک دفعہ کعبے کی چھت پر سے کشتی کا قصد کیا تھا، آج ایک لکھنوی تکیے نے وہیں معراج کی ٹھانی ہے۔ کسی حاجی سے پوچھنا چاہئے کہ کعبے کی چھت پر سونا چہ معنی دارد؟ کیا کوئی منطق ایسے خرد ماغوں کو اس مصرعے کی لغویت ذہن نشین کرا سکتا ہے؟ نہ معلوم اس گومتی والے کے دماغ میں کہاں کا کوڑا بھرا ہوا ہے" [2]

(شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز، ص ۱۱۲)

صفی، عزیز، ثاقب بہرحال لکھنؤ کے متین اور معزز لوگ تھے اور اس معرکے میں وہ براہِ راست یاس سے الجھے بھی نہیں، یاس کے بظاہر یک طرفہ حملوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کی فضا ان کے خلاف ہو گئی اور ان کے بدخواہوں کی تعداد بہت بڑھ گئی، یہاں تک کہ ان کو روزگار سے محروم اور افلاس کا شکار ہونا پڑا اور وہ وقت کی روٹی کے لئے اپنے ذخیرے کی کتابیں تک بیچنا پڑ گئیں۔ مگر انہوں نے دبنے کے بجائے اپنے تیور اور کڑے کر لئے۔ پہلے وہ "مرزا یاس عظیم آبادی" تھے، پھر "مرزا یاس عظیم آبادی لکھنوی" ہوئے، پھر مرزا یاس یگانہ لکھنوی عظیم آبادی" اور آخر "میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی" ہو گئے۔ [3]

---

[3] ۱۹۲۰ء میں پٹنہ کے ایک مشاعرے میں، یاس اور فصاحت لکھنوی شرکت کے لئے گئے تھے۔ وہاں یاس نے ایک فخریہ قطعہ پڑھا جس کا مقطع تھا :

جان سے بڑھ کر سمجھتے ہیں مجھے یاس اہلِ دل　　　آبروئے لکھنؤ خاکِ عظیم آباد ہوں

مشاعرے سے واپس آکر یاس نے روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ میں یہ قطعہ چھپوا دیا جس کے جواب میں اہلِ لکھنؤ کی طرف سے ان کی ہجویں کہی گئیں اور یاس نے حریفوں کو مزید چڑانے کے لئے قطعے میں ایک یہ شعر بڑھا دیا : ؎ لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دو سہرے میرے سر۔ اک تو استادِ یگانہ دوسرے داماد ہوں۔ (یاس کی شادی لکھنؤ ہی کے ایک خاندان میں ہوئی تھی) یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مرزا امراد بیگ کے قلم سے یہ فقرہ لکھا گیا ہے: "یاس کے ساتھ یگانہ تخلص کرنے کی بنیاد غالباً یہیں سے پڑتی ہے" (آیاتِ وجدانی، طبع اول، شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۲۷ء ص ۱۵-۲۱۴)

ان معرکوں کے شروع میں سید محمد احمد بیخود موہانی یگانہ کے ساتھ تھے بلکہ ان کی پشت پناہی کر رہے تھے جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ لکھنؤ کے ان شاعروں کے ساتھ بیخود کے تعلقات بھی یگانہ ہی کی طرح کشیدہ تھے۔ انقر موہانی کے مندرجہ ذیل بیان سے اس کشیدگی کی نوعیت واضح ہوتی ہے :

"لکھنؤ میں ایک مشاعرہ تھا جس میں بیخود کو بھی مدعو کیا گیا تھا انہوں نے اس میں ایک شعر یہ پڑھا تھا :

ناکامیوں میں گذری بدنامیوں میں گذری   عمر عزیز گذری کب خامیوں میں گذری

اتفاق سے اس مشاعرے میں لکھنؤ کے مایۂ ناز استاد سخن مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی بھی موجود تھے۔ انہوں نے مذکورہ شعر کو اپنے اوپر حملہ سمجھا۔ پھر کیا تھا، تمام جلسہ بیخود کو قہر کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جب بیخود کو معلوم ہوا کہ ان کا شعر حملہ سمجھا گیا تو انھوں نے اخلاقاً معذرت چاہی اور اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، مگر معذرت قابل قبول نہ ہوئی اور اس وقت کے تمام شعراء ان سے در پردہ کاوش و کینہ رکھنے لگے اور یہ کینہ عمر بھر اُن کے دلوں سے دُور نہ ہوا۔ وہ بیخود کو اپنا حریف اور محسود ہی سمجھتے رہے۔ مگر مرحوم نے جب اپنی اخلاقی معذرت کو بھی مسترد ہوتے دیکھا تو اپنے خود اعتمادی پر پہلے سے بھی زیادہ مستقل ہوگئے۔ درمیانی حضرات نے لاکھ چاہا کہ وہ باقاعدہ کسی اجتماع میں اپنے برگشتہ حریفوں سے از سرِ نو ارتباط و اتحاد قائم کرلیں مگر وہ مزید خوشامد پر راضی نہ ہوتے۔ پھر تو یہ شعر ان کی ہر غزل کا پیش طرح مطلع بن گیا۔ جب بھی کسی مشاعرے میں وہ غزل پڑھتے تو پیش طرح اشعار میں اس شعر کو ضرور پڑھتے تھے۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر بعض نے ان سے مقاطعہ بھی کر لیا تھا جہاں وہ جاتے تھے بیخود کو مدعو ہی نہ کیا جاتا اور جہاں بیخود ہوتے وہاں وہ جانے سے محترز رہتے" [1]

مقاطعہ کی یہی صورت یگانہ کے ساتھ بھی اختیار کی گئی۔ اس کی کچھ تفصیل مندرجہ ذیل بیان سے معلوم ہو سکتی ہے :

"۵ / نومبر ۱۹۲۲ء کو الٰہ آباد میں پنڈت مدن موہن ناتھ رینہ ... نے ایک مشاعرہ کیا جس میں مرزا صاحب (یاس) اور لکھنؤ کے قریب قریب تمام مشاہیر مثلاً صفی، عزیز، ثاقب، ناصری، ناطق... جمع ہوئے تھے۔ مرزا صاحب کا بائیکاٹ پہلے تو لکھنؤ ہی کی سرزمین تک محدود تھا مگر ان غیرت دار لکھنویوں نے جب یہ دیکھا کہ آج الٰہ آباد میں مرزا صاحب کا سامنا ہوا جاتا ہے ... تو ... سب ... نے متحد و متفق ہو کر صاحب مشاعرہ سے کہہ دیا کہ اگر مشاعرے میں مرزا یاس کو قدم رکھنے کی بھی اجازت دی گئی تو ہم سب کے سب مشاعرے سے اٹھ کر چلے جائیں گے ... صاحب مشاعرہ نے ... بہت منت سماجت کی، مگر ان ... لکھنویوں نے ... ایک نہ سُنی۔ جب مرزا صاحب کو یہ حال معلوم ہوا کہ میزبان بے چارہ اس کش مکش میں مبتلا ہے تو آپ نے انھیں بلا کر یہ فرمایا کہ آپ میرے لئے کوئی غم نہ کریں، میں مشاعرے میں شریک نہ ہوں گا، جھگڑا ختم ہے۔ چنانچہ صاحب مشاعرہ نے ایسا ہی کیا۔ اور مرزا صاحب مشاعرے میں شریک نہ ہوئے ...

ناواقفوں کو یہ دھوکا دیا جاتا ہے کہ ہم لوگوں نے تو مرزا یاس کا بائیکاٹ نہیں کیا بلکہ مرزا صاحب خود لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے، سید جالب نے لکھنؤ میں جو اک مشاعرہ کیا تھا جس میں اہل لکھنؤ جمع تھے وہاں سے مرزا یاس صاحب یہ کہہ کر اٹھ آئے تھے کہ ہم اہل لکھنؤ کے سامنے غزل پڑھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ کہہ کر ناواقف پبلک کو یہ باور کرانا مقصود ہوتا ہے کہ ہم نے مرزا صاحب کو بائیکاٹ نہیں کیا بلکہ وہ خود سید جالب کے مشاعرے سے اٹھ کر چلے آئے تو ہم نے بھی الٰہ آباد کے مشاعرے میں مرزا صاحب کو بائیکاٹ کر دیا۔ مگر یہ کس قدر جھوٹ اور سفید جھوٹ ہے کہ مرزا یاس نے

---

[1] بحوالہ "بیخود موہانی : حیات و شاعری" از سید سکندر آغا، لکھنؤ ۱۹۷۷ء صفحہ ۴۲-۴۳

یہ شعر "کلیات بیخود" (نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۲ء) میں اس طرح ہے :

خود کامیوں میں گذری، ناکامیوں میں گذری : عمر عزیز گذری اور خامیوں میں گذری (صفحہ ۱۱)

سیّد جالب کے مشاعرے سے خود اہلِ لکھنؤ کا بائیکاٹ نہ کیا۔ سیّد جالب کا مشاعرہ تو ۱۹۲۱ء میں ہوا ہے۔ کیا ۱۹۲۱ء تک اہلِ لکھنؤ نے مرزا صاحب کا بائیکاٹ نہیں کیا تھا؟ مرزا صاحب کا بائیکاٹ تو ۱۹۲۱ء سے بہت پہلے ہو چکا ہے یعنی اس سے چار پانچ سال پہلے جب مرزا یاسؔ کیننگ کالج کے مشاعروں میں مدعو ہوتے تھے۔ اسی وقت سے بلکہ اس کے پہلے سے مرزا صاحب کا بائیکاٹ قائم ہے۔ کیننگ کالج میں جس سال مرزا صاحب کو دعوت دی جاتی تھی اس سال صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، محشرؔ، ان لوگوں میں سے کوئی بھی مشاعرے میں نہ جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک کیننگ کالج کے طلبہ نے لکھنؤ والوں کا بیجا دباؤ نہ مانا، ایک سال کا مشاعرہ مرزا صاحب کے لئے وقف کر دیا اور ایک سال حضراتِ لکھنؤ کے لئے۔ کیننگ کالج کے علاوہ اور مشاعرے جو ان حضراتِ لکھنؤ کے زیرِ اثر ہوا کرتے تھے وہاں بھی مرزا یاسؔ مدعو نہ کئے جاتے تھے۔" [1]

ان لکھنوی شاعروں کی انجمن "معیار الادب" کا اس وقت بڑا زور تھا۔ ظاہراً اسی انجمن کے مقابلے پر بیخودؔ اور یگانہ نے مل کر "انجمن خاصانِ ادب" قائم کی۔ بیخودؔ اس کے صدر اور یگانہ سکریٹری تھے۔ ممبروں میں سائلؔ دہلوی، رنجورؔ عظیم آبادی، مولوی فضل علی حیدر آبادی، نجم آفندی، پیرزادہ عبدالمجید غازی آبادی، شیخ احمد علی کامل لکھنوی، سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ، سیّد سرفراز حسین خبیرؔ لکھنوی وغیرہ کے نام شامل کئے گئے تھے [2] لیکن بیخودؔ اور یگانہ کا ساتھ زیادہ دن تک نبھ نہ سکا اور آخر یگانہ بیخودؔ کے بھی مخالف ہو گئے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان معرکوں میں ان کو بیخودؔ کے سپاہی کی حیثیت سے ان کی ہدایتوں پر چلنا گوارا نہ تھا، دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیخودؔ مرزا غالبؔ کے پرستار تھے اور یگانہ اپنے حریفوں کی ضد میں غالبؔ سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ لکھنوی شاعروں کے ساتھ معرکے میں انہیں محسوس ہوا کہ مرزا غالبؔ کا اثر نہ صرف ان شاعروں پر بلکہ ہمہ گیر ہے لہذا انھوں نے غالبؔ اور غالبؔ پرستوں کو بھی نشانہ بنا لیا اور اس زد میں بیخودؔ بھی آ گئے جنھیں انھوں نے "غالبؔ کا دُل چٹا"، "مولوی ٹھینگا موہانی" اور "رحمی ٹٹو" کے خطاب دینے کے علاوہ اتنے ہی سخت لفظوں میں یاد کیا۔

یگانہ کی غالبؔ دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی مخالفت جو پہلے لکھنؤ تک محدود تھی اب ہندوستان گیر ہو گئی۔ بعض بہی خواہوں نے انہیں غالبؔ پر حملے کرنے سے روکا بھی، لیکن اس سے یگانہ اور مشتعل ہو گئے۔ اپنی رباعیوں کے مجموعے "ترانہ" کے آخر میں انھوں نے غالبؔ کی ہجو میں کچھ رباعیاں شامل کر دیں۔ جب ان کے ایک دوست پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے ان رباعیوں کے شمول کو خلافِ مصلحت قرار دیا تو یگانہ نے جواب میں انھیں ایک بہت طویل خط لکھا جس میں غالبؔ پر طرح طرح کے حملے تھے۔ پھر انھوں نے اس خط کو "غالب شکن" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا، پھر اس کو مزید سخت اور مفصّل کر کے "غالب شکن دو آتشہ" کے نام سے چھاپا [3] اور غالبؔ کے خلاف کچھ اور رباعیاں کہہ کر کتاب میں شامل کر دیں۔ اس سلسلے کی بعض رباعیاں بہت چبھتی ہوئی تھیں اور خاصی مشہور ہوئیں، مثلاً

خاصہ نہ سہی بلا سے کُھرچن ہے بہت ۔۔۔ تن ڈھکنے کو صاحب کا اُترن ہے بہت
دلّی کا تخت اُلٹ گیا ٹھینگے سے ۔۔۔ نوشہ کے لئے خلعت و پنشن ہے بہت

تلوار سے مطلب ہے نہ کھانڈے سے غرض ۔۔۔ مومن سے سروکار نہ ٹانڈے سے غرض
رنگوں میں دم توڑتا ہے شاہ ظفرؔ ۔۔۔ غالبؔ کو ہے اپنے حلوے مانڈے سے غرض

شہزادے پڑے فرنگیوں کے پالے ۔۔۔ مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے
واللہ گریباں میں منہ ڈال کے دیکھ ۔۔۔ غالبؔ کو وطن پرست کہنے والے

---

[1] "شہرتِ کاذبہ"، ص ۵۵

[2] "خطوطِ بیخودؔ" (بہ نام مسعود حسن رضوی ادیبؔ) مرتبہ سیّد نائر حسین کاظمی۔ لکھنؤ، ۱۹۷۷ء ص ۷۷

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے مضمون "میرزا یگانہ (بہ حوالۂ ادیبؔ)" از نیر مسعود، مشمولہ دو ماہی "اکاڈمی" لکھنؤ۔ یگانہ نمبر۔ جنوری فروری ۱۹۸۵ء

کیوں کیا ہوئے وہ بہادری کے جوہر — سو پشتوں کی سپہ گری کے جوہر
پنشن کے لئے دلّی سے کلکتے تک — دکھلانے چلے ہو شاعری کے جوہر

غالب کی شاعری پر یگانہ کی تنقید کا خلاصہ انھیں کے لفظوں میں یہ ہے :

"غالب کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال دقّت پسند شاعر جو بسا اوقات اپنے اوٹ پٹانگ تخیلات کی بھول بھلیاں میں گم ہو جایا کرتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے شرا بھی ہے۔ پرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے۔ مضمون چرانے کو چراتا ہے مگر ہضم نہیں کر سکتا، تصرّف کی قدرت نہیں رکھتا، چوری کھل جاتی ہے۔ زبان ایسی گونگی کہ نفسِ مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کر سکتا، ٹھونس ٹھانس کے تک بندی کر لیتا ہے۔" [1]

لکھنؤ کا معرکہ یگانہ نے اپنے خیال میں سر کر لیا تھا، اس لئے کہ صفی، ثاقب، عزیز کی مقبولیت وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو گئی تھی جسے یگانہ اپنا کارنامہ سمجھتے تھے۔ غالب پر اپنی تنقیدوں کا اثر بھی انھوں نے یہ قرار دے لیا کہ اب غالب سے اندھی عقیدت کا دور ختم ہو گیا ہے، لیکن وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ خود انھیں لکھنوی شاعروں بلکہ غالب سے بھی بڑا شاعر تسلیم کر لیا جائے۔ اور اپنی اس کوشش میں کامیابی کا وہ اپنے آپ کو بھی یقین نہ دلا سکے۔ ناکامی کے اس احساس نے ان کو اور بھی مشتعل کر دیا اور اب وہ شمشیر برہنہ ہو گئے۔ ابھی وہ اپنے لکھنوی حریفوں کے زوال سے پوری طرح آسودہ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ اردو کی شعری فضا میں کچھ اور نام گونجنے لگے۔ یہ تھے اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی۔ اور یگانہ کو محسوس ہوا کہ اُن کا نام ان ناموں کے پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ غصّے سے بے قابو ہو گئے۔ اصغر کو "گنوار گونڈوی عینک فروش"، جگر کو "نابغہ مرادآبادی" اور جوش کو "جوش خاں" کا نام دے کر انھوں نے ان شاعروں پر سخت سے سخت حملے کئے۔ ان معاصروں کی شاعری پر اُن کے اعتراضات خالص تنقیدی نقطۂ نظر سے قابلِ غور ہو سکتے تھے لیکن ان کے لہجے کی برافروختگی اور ناشائستگی نے ان کی تنقید کی سنجیدگی اور وزن کو ختم کر دیا، مثلاً جوش کے بارے میں ان کی یہ رائے خاصی نپی تلی ہے :

"وہ زیادہ سے زیادہ جوشیلے، رنگیلے، چٹکیلے، بھڑکیلے الفاظ نظم کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ شعر بن گیا، مگر کم سے کم الفاظ، سادہ، سہل و برجستہ الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔"

لیکن جس مضمون میں یگانہ نے یہ رائے ظاہر کی ہے اس کا عنوان انھوں نے "زیٹ زپٹ" رکھا ہے اور اس میں اس طرح کے فقرے بھی ہیں :

"شاعرِ انقلاب کہیں سے سُن بھاگے ہیں کہ قطبِ شمالی میں آفتاب کی حرارت برائے نام تھوڑی دیر تک رہتی ہے وہاں سردی کے سوا گرمی کا نام نہیں، اس لئے آپ نے لیلیِٰ حیات کے گیسو سے قطبِ شمالی کے دامن میں آگ لگا دی۔ شاباش!"

اور اصغر گونڈوی کی شاعرانہ شہرت کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں :

"وہ اک گنوار جاہل شخص جسے شاعری سے کوئی نسبت صحیح نہیں، بے کاری کے زمانے میں چھ مہینے گھر بیٹھا رہا اور اسی چھ مہینے کے "مشغلۂ بے کاری" کے بعد بادن گز کا شاعر بن کر نکل آیا اور علی گڑھ کے پھندیت اسے ایسا لے اڑے کہ دورِ حاضر کے بہترین شعرا میں شمار ہونے لگا۔ اسی کو کہتے ہیں بے پر کی اڑانا :

دنیائے ادب کی ایسی کایا پلٹی — کالا کوّا بھی بن گیا شیرازی
دیکھو تو علی گڑھ کی یہ بالغ نظری — چیل اُڑتے جو دیکھیں تو کہیں بھینس اڑی"

---

[1] "غالب شکن" دفتر آتش آرمی پریس دیال باغ آگرہ ۱۹۳۵ء ص ۲

یگانہ کے یہ حملے بھی قریب قریب یک طرفہ رہے۔ کبھی کبھی ان کی تنقیدوں کا جواب دے دیا جاتا تھا لیکن لکھنؤ میں ان کے پہلے ادبی معرکے نے جو گرما گرمی پیدا کی تھی وہ اب پیدا نہیں ہو رہی تھی اور ان کے حملوں سے ان کے تازہ حریفوں کی صف میں کوئی انتشار نظر نہیں آتا تھا۔ یہ صورتِ حال یگانہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، لیکن ابھی اس معرکے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ زمانہ اور آگے بڑھ گیا اور ترقی پسند تحریک نے ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یگانہ اس تحریک پر حملہ آور ہوئے ترقی پسند ادب کو "ادبِ خبیث" کا نام دے کر انھوں نے فیض، راشد وغیرہ پر برسنا شروع کیا اور یہ رباعی کہی:

قدریں ہی بدل گئیں تو غیرت کیسی	پھر کیوں نہ گدھوں سے ہو حماقت ایسی
سر تو نیچے ہے اور ٹانگیں اوپر	ہت تیرے ننئے ادب کی ایسی تیسی

انھیں معرکوں میں یگانہ کی نظر اقبال پر بھی پڑی اور ادبی دنیا میں اُن کا دبدبہ دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہو گئے، اور اگرچہ "شہرتِ کاذبہ" میں وہ غازی الدین بلخی کے نام سے یہ جملہ لکھ چکے تھے:

"ابوالمعانی مرزا یاس، علامہ اقبال اور حضرت اکبر الٰہ آبادی کے کارنامے اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو کہ شاعری کا مرتبہ کتنا بلند ہو چکا ہے۔"

لیکن اب انھوں نے اقبال کا نام "اکبال" رکھا، اُن کی زبان اور بیان کی تضحیک کی، ان کی تعریف میں لکھے جانے والے فقروں کا مصداق خود کو ٹھہرایا اور ان کے مصرعے "یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ" پر یوں تنقید کی:

پنجاب کا وہ جس نے خدا بھی مارا	ایسا صیاد ہو تو پھر کیا چارہ
یزداں بھی شکار ہو گیا بے چارہ	کیا خوب چڑی مارنے کپا مارا[1]

اس میں شک نہیں کہ یگانہ اپنے بیشتر حریفوں سے زیادہ پڑھے لکھے اور بہتر تنقیدی شعور کے مالک تھے۔ ان کا انگریزی کا مطالعہ بھی اچھا تھا اور ان کی تحریروں[2] میں ملٹن، فریڈرک، رابرٹسن، رچرڈز، ڈرائیڈن، کولرج، شیلے، شیکسپیر، ڈاکٹر جانسن، بیلی، بیکن، ارسطو وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں، لیکن ان کی آتش مزاجی، لہجے کی گرمی اور بے محل خودستائیوں نے ان کی تنقیدوں کو متانت سے محروم کر دیا۔ ذیل میں ان تحریروں کے کچھ نمونے دیے جا رہے ہیں جن سے یگانہ کے ادبی مزاج کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ اور تنقیدی نگاہ کے مختلف زاویوں کا اندازہ ہوتا ہے

حسرت: "آپ نے اپنے مضمون میں مولانا حسرت موہانی کی مدح میں کچھ ویسے ہی مضحکہ انگیز غلو سے کام لیا ہے جیسے غالب کی مدح میں حواس باختہ بجنوری کی بکواس... حسرت موہانی سے میں بھی واقف ہوں۔ ایک اوسط درجے کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جھان کتنی؟ بڑا شاعر ہونا تو بڑی بات ہے، حسرت تو حضرت آرزو کو بھی نہیں پہنچتے۔"
(آیاتِ وجدانی طبع سوم) ص۱۹۱)

حسرت موہانی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا، بہت بڑا غزل گو یا رئیس المتغزلین ٹھہرانا ظاہر ہے کہ محض مضحکہ انگیز پروپیگنڈا ہے۔ ان کی شاعری تو کچھ ایسی بلند تو ہے نہیں، البتہ بعض غیر شاعرانہ وجوہ کی بنا پر انھیں چمکانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ کوئی شریف آدمی خواہ کتنا ہی خوش مزاج ہو اور بہت سے حج وج بھی کر چکا ہو، یہ کیا ضرور ہے کہ ان کی خوبیوں کے پیشِ نظر وہ اک بڑا شاعر بھی بنا دیا جائے؟" (ایضاً ص۱۹۴)

---

[1] مکاتیب یگانہ مشمولہ "خطوطِ مشاہیر بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب" مرتبہ نیر مسعود، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء

[2] ان تحریروں میں وہ مضامین اور خطوط بھی شامل ہیں جو یگانہ نے خود اپنے نام سے لکھے اور "آیاتِ وجدانی" اور "شہرتِ کاذبہ" کے وہ معاصرانہ تبصرے بھی شامل ہیں جو میرزا دار بیگ چغتائی اور غازی الدین بلخی کے نام سے لکھے گئے۔ یہ بھی یگانہ ہی کے قلم سے تھے اور وہ اپنے احباب سے اس حقیقت کو چھپاتے بھی نہیں تھے۔ (نیر مسعود)

فراق گورکھپوری: "یہ دیکھ کر کہ غزل کی اہمیت کا آپ کو کافی اندازہ ہے، میں آپ کی قدر کرتا ہوں، مگر اس کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ محض انگریزی لٹریچر پر اکتفا کر کے (ایرانی لٹریچر سے بے خبر رہ کر) فنِ غزل پر کوئی تبصرہ کتنا "سنسنی خیز" تو ہو سکتا ہے مگر پایۂ اعتبار کو نہیں پہنچتا۔" ایضاً صفحہ ۱۹

"فنِ شعر و سخن پر کوئی صحیح محاکمہ کرنا آپ کے بس کی بات نہیں کیونکہ آپ کچھ فیشن کی رو میں بہہ بھی جاتے ہیں۔ انگریزی لٹریچر میں آپ کا مطالعہ کتنا ہی وسیع ہو، جب تک آپ ایرانی لٹریچر کے ماہر نہ ہوں گے کبھی اردو شاعری پر صحیح محاکمہ نہ کر سکیں گے۔" (ایضاً صفحہ ۱۹)

جگر مراد آبادی: " اُف یہ تیغ آزمائیاں توبہ — تیری نازک کلائیاں توبہ
آستینوں کا وہ چڑھا لینا — گوری گوری کلائیاں توبہ

گوری گوری کلائیاں توبہ! یہ ہے لکھنؤ کے یکے تانگے والوں کی شاعری، یکہ ہانکتے جاتے اور شعر موزوں کرتے جاتے ہیں۔ یہ خدا کی دین ہے۔" (مضمون "جگر کی شاعری جاپانی مال")

" ہوئے اور پھر جنابِ جگر — پی پلا کر بیرائیاں توبہ
دوسرا مصرعہ نہایت برجستہ، مگر جگر تو ایک ہی مصرعے کا شاعر ہے، مصرع پر مصرع لگانا آتا نہیں۔" (ایضاً)

" نابغہ (جگر) نے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے "مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے، تضاد نہیں۔" اس بلند آہنگی سے اس شخص کی شہرتِ عامہ کے سبب لوگ دھوکا کھا جائیں تو عجب نہیں، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ زندگی اور شاعری میں "بالکل مطابقت" قابلِ فخر جبھی ہو سکتی ہے کہ خود اپنا طرزِ زندگی کوئی قابلِ فخر اہمیت رکھتا ہو۔ محض لاابالی زندگی (جس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں نہ ہوں) اور شاعری میں بالکل مطابقت ہوئی بھی تو کیا، اور یہ ممکن ہی نہیں کہ شاعر کی شاعری اور اس کی زندگی میں "بالکل مطابقت" ہو سکے، کیونکہ وہ آپ بیتی بھی کہتا ہے اور جگ بیتی بھی... لاابالی زندگی کی اہمیت ہی کیا؟ اک مطلق العنان غیر ذمہ دارانہ زندگی کے ساتھ کسی نے اپنی شاعری کو "بالکل مطابق" بنا بھی لیا تو یہ کون سا کمال ہے:
ایں متاع ست کہ ہر بے سر و پائے دارد" (مکتوب یگانہ بنام فراق)

جوش ملیح آبادی: " میں آج سے بہت پہلے کسی موقعے پر کہہ چکا ہوں کہ جوش کا کلام پرکھنے کے قابل ہی نہیں۔ محض الفاظ کی بے معنی نمائش ہوتی ہے، مگر میں نے ان کی کچی باغیانہ شاعری کے خلاف کبھی ایسا حکم نہیں لگایا۔ مذہب، معاشرت اور سیاست کے خلاف جوش کی باغیانہ نظمیں ان کی شاعرانہ قابلیت اور قومی خدمت کا روشن ثبوت ہیں، البتہ شعر و ادب کو آرٹ کی حیثیت سے اور ہندوستان کی نسوانی عظمت کو اخلاقی حیثیت سے ان کی نظم بازیوں نے بڑا نقصان پہنچایا جو قابلِ افسوس ہے۔ لکھنؤ کی رعایتِ لفظی کم از کم الفاظ کا اک کھیل تو تھی۔ کچھ نہ کچھ معنوی تعلق کی خاطر رعایتِ لفظی کا کھیل کھیلا جاتا تھا، اور وہ کھیل اک کھلاڑی کا ہوتا تھا، اناڑی کا پھوہڑپن نہ تھا۔ مگر جوش کے ہاں وہ کھیل بھی نہیں ہوتا، بے ضرورت ٹھونس ٹھانس ہوتی ہے، محض نمائش کے لیے، وہ بھی بے ہنری کے ساتھ۔" (جوش کی نظم "دخترانِ حوا کا کورس" پر تنقید)

"جوشؔ کی عادت ہے کہ وہ شان دار بھاری بھرکم فینسی الفاظ معنی و مفہوم میں اضافے کے لئے نہیں محض دکھاوے کے استعمال کیا کرتے ہیں جنھیں عبارت سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا۔" (مضمون "زیٹ زیٹ")

ترقی پسند ادب : "نئے اسلوب کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو :

بادِ صبا کے ہلکوروں میں تند ہوا تبدیل ہوئی
پھول کھلے (یہ گویا دوسرا مصرعہ ہے، تھو)
مستی چھائی (یہ گویا تیسرا مصرعہ ہے، تھو)
مرجھائے کنول شاداب ہوئے
میں ہوں بے دل
مایوس
ایک
بچارا

یہ سب گویا آٹھ مصرعے ہیں۔ انھیں تلے اوپر لکھ کر ایک بند قرار دیا گیا ہے اور گویا اک گاؤدم سی شکل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ گویا شاعری کا اسلوب بدل رہا ہے! تھو!" (مضمون "ادبِ خبیث")

فیض احمد فیض : "خدا جانے فیضؔ کون صاحب ہیں، مگر "ترقی پسند" ہیں دیکھئے یوں "شاعری" فرماتے ہیں :
(۱) بول کہ لب آزاد ہیں تیرے (۲) بول زباں اب تک تیری ہے (۳) بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے (۴) بول کہ سچ زندہ ہے اب تک (۵) بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے بول بول، ارے بول بول۔ جی ہاں، یہ ہے گویا شاعری اور ترقی پسند شاعری۔ نہ تال کی نہ سم کی نہ شعر کی۔ دیکھئے خبردار اسے نثر نہ سمجھئے۔ یہی تو انقلابی شاعری ہے۔ اسی میں تو ملک کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔ تھو!
کیا واقعی یہ کوئی سنجیدہ فعل ہے یا تمسخر۔ کیا واقعی کوئی باحواس آدمی نیک نیتی کے ساتھ ان ٹوٹے پھوٹے بولوں کو سچ مچ شعر کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ یہ تو ایسے اکھڑے اکھڑے بول ہیں کہ نثر کی حیثیت سے بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ کیا کوئی نیچے درجے کا طالب علم اس قسم کے بولوں پر سو میں پانچ نمبر بھی پا سکتا ہے؟ کیا ان میں پھوہڑپن کے سوا کوئی ادبی سلیقہ پایا جاتا ہے؟" (ایضاً)

اقبال : "سیمابؔ صاحب کہتے ہیں ڈاکٹر اقبالؔ کے بعد پنجاب کا ادب آوارہ ہو گیا۔ مگر ڈاکٹر اقبالؔ کے بعد کیا معنی؟ ان کے انتقال کو چھ سات سال ہوئے ہیں۔ آوارگی و گمرہی تو ان کی زندگی ہی میں پھیل چکی تھی اور انھیں کی بے توجہی سے بڑھتی گئی۔ انھوں نے کوئی بزرگانہ ہدایت، کوئی روک تھام نہیں کی۔ اقبالؔ کو ادبِ اردو کی کوئی ایسی پروا تو تھی نہیں۔ دیکھا دیکھی انکی امت بھی بے پروا و مطلق العنان ہو گئی۔ ان کا مرکزِ توجہ تو حجاز تھا، ہندوستان سے محبت کیوں ہوتی؟
ادبِ اردو کی نگہداشت ڈاکٹر اقبالؔ کا مقصدِ زندگی تھا ہی نہیں۔ وہ تو اک مذہبی اور سیاسی آدمی تھے۔ اسی میں وہ پھنسے رہے۔ اردو شاعری کے لئے جس باقاعدہ اکتسابِ فن کی ضرورت ہے اس کی طرف سے چشم پوشی کر کے گمراہی کا بیج تو ڈاکٹر اقبالؔ ہی بو گئے۔ ان کی بے پروائی سے نااہلوں کی جرأتیں بڑھتی گئیں۔ ادب کے اصول و ضوابط توڑ پھوڑ کر

بدنظمی پھیلا دی گئی۔ یہ نتیجہ ہوا جدید نظم بازی کا۔" (ایضاً)

یگانہ: "مغروروں کے مقابل میرزا یگانہ کا غرور مسلم سہی مگر کسی سچے اور حقیقی شعر کے مقابل مرزا صاحب نے کبھی اپنے تئیں مغرور نہیں پایا خواہ وہ کسی کا شعر ہو۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ بھوپال میں بہزاد لکھنوی کی زبان سے یہ شعر سن کر:

آمری کائناتِ دل، میری بہارِ زندگی — آکہ میں یہ نہ کہہ سکوں مجھ کو خدا نہ مل سکا

دیر تک روتے رہے۔ طبعی جنگ جوئی کے ساتھ دل میں اتنا سوز و گداز بھی ودیعت ہوا ہے۔ اسی طرح وہ جگر مراد آبادی کو جیسا کچھ سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں مگر سچے شعر کے ساتھ کبھی بے انصافی نہیں کی۔ جگر کا یہ شعر اکثر مرزا صاحب کو تڑپاتا رہتا ہے:

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر — جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں" (آیات طبع سوم صفحہ ۲۸)

"واضح رہے کہ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے حضرت نیاز کی تائید تو ہوتی ہے، اور یہ محض اس وجہ سے کہ میں نے ان کے اعتراضات کو صحیح سمجھا، مگر جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ کبھی مجھ پر نیاز صاحب کی جنبہ داری کا شبہ نہیں کر سکتے۔ مجھ سے نیاز صاحب کے کوئی خاص تعلقات نہیں اور جو کچھ تعلق ہے بھی وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے برعکس میرے اور جوش کے ذاتی تعلقات خوش گوار ہیں اور رہیں گے، مگر ان خوشگوار تعلقات کا اثر شعر و ادب پر نہیں پڑ سکتا۔... اتنا کہہ جانے کے بعد یہ بھی کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کی نظمیات کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں جس میں پنجاب اور دکن بھی شامل ہے، جوش کی ٹکر کا ناظم کوئی نہیں۔ اب رہا شعر، تو یا درکھیے حقیقی شعر کے میدان میں

غالب کے چھپا کے آگے سب ڈھینڈس ہیں،" ؎۱ ("دختران حوا کا کورس" پر تنقید)

"سچ تو یہ ہے کہ اس صدی میں یگانہ کے سوا اور کسی کو شاعر سمجھنا محض خود فریبی ہے۔" (آیات طبع سوم صفحہ ۸۸)

آخر یگانہ لڑتے لڑتے بوڑھے ہو گئے اور اب ان کے زیادہ تر حملے خالی جانے لگے۔ اپنی تنقیدوں کے ردِعمل میں جس عام اشتعال کی انھیں تمنا تھی وہ پیدا نہیں ہوتا تھا اور زمانہ انھیں فراموش کرنے پر تلا ہوا تھا۔ تب، عمر کے آخری دور میں، انھوں نے اپنے قلم کا رُخ ایک نئی سمت پھیر دیا۔ پہلے انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کے متعلق قاضی عبدالودود کا بیان ہے:

"تخلیقی ادب؎۲ جلد ۲ کراچی میں میرزا یگانہ: شخصیت اور فن" نام کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ بہت کچھ ہے لیکن یہ نہیں کہ انھوں نے ایک ضخیم کتاب اسلام کے خلاف لکھی تھی۔ یہ دو دار کا داس (شملہ) کے پاس ہے۔ اس کی وصیت تھی کہ آکسفورڈ بھیج دی جائے تاکہ وہاں اس کا ترجمہ شائع ہو، مگر شملہ نے وصیت پر عمل چند سال قبل تک تو نہیں کیا تھا۔ بعد کا حال معلوم نہیں۔ پوری کتاب تھی۔" ؎۳

؎۱ یہ یگانہ کی اس رباعی کا چوتھا مصرعہ ہے:

شاعر تو ہیں بہتیرے مگر جیبکس ہیں — کچھ ان میں ہیں خام جوش کچھ کورس ہیں
غالب غالب اسے کہاں کے غالب — غالب کے چھپا کے آگے سب ڈھینڈس ہیں

؎۲ مرتبہ مشفق خواجہ۔ ناشر عصری مطبوعات، کراچی۔ ۱۹۸۰ء

؎۳ مکتوب قاضی عبدالودود بنام نیر مسعود۔ مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۸۱ء تا ۱۷ فروری ۱۹۸۲ء (مرقومہ بالا عبارت مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

یگانہ پر اپنے مضمون "یہ تیس برس کا قصہ ہے"[۱۱۵] میں شعلہ نے اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، لیکن شعلہ کے نام یگانہ کے خطوں[۱۱۶] کے مندرجہ ذیل فقرے بہ ظاہر اسی کتاب (یا کتابوں) سے متعلق ہیں، اگرچہ شعلہ نے حواشی میں اس کی وضاحت نہیں کی ہے:

۱۔ "میرا MANUSCRIPT کہاں ہے، کس حالت میں ہے؟" (ص ۵۲۳)

۲۔ "میرے مسودات اب یورپ بھیج دو یا کوئی تجویز پیش کرنا چاہو تو کرو۔" (ص ۵۲۳)

۳۔ "یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ تمہیں۔ و ر م کی نقل رکھنے کی بھی فکر ہے۔ ہاں یہی ہونا چاہیے۔ مگر اس کے متعلق میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس سے بھی نقل کراؤ اپنے سامنے بٹھا کر نقل کراؤ۔ یہ کاغذات اُسی کے حوالے نہ کرو کیونکہ یہ کاغذات ایسے تو ہیں نہیں، اور جس کو دو، چار صفحے سے زیادہ نہ دو۔ پورا مسودہ ہرگز نہ دو۔ چار پانچ جو ایک نشست میں نقل ہو سکیں اتنے ہی دو۔ اب دوسری بات یہ ہے کہ نقل کرنے والا ایسا ہو جو صحیح نقل کر سکے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی...[۱۱۷] سے یہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ میرے خیال میں لشیشر پرشاد منوّر لکھنوی کو ہموار کرکے اُن سے یہ کام لے سکو تو لے لو۔ میں جانتا ہوں وہ میرے ہمدرد ہیں، بہی خواہ ہیں۔ مگر یہ فقط میرا اک خیال ہے۔ کام تو تمہیں اپنی رائے پر کرنا ہے، اپنے بھروسے کے آدمی سے کام لینا۔ نقل میں کچھ غلطی رہ جائے گی تو اسے میں درست کر دوں گا۔ الغرض ان مسوّدات کو یورپ بھیجنا ضرور ہے۔" (ص ۵۲۴۔۲۵)

۴۔ "معلوم نہیں میرے مسودات کہاں ہیں۔ اب انھیں جلد OXFORD بھیج دو اور مجھے اطلاع دو۔ اپنے پاس رکھنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔" (ص ۵۲۶)

۵۔ "میرے مسوّدات کی نقل لینے کی جو کوشش تم نے کی، امید ہے اب یہ کام انجام پا جائے گا۔" (ص ۵۲۶)

۶۔ پڑھ کر اطمینان ہوا کہ مسوّدات کے بارے میں تم ضروری تدبیریں کر رہے ہو۔" (ص ۵۲۶)

اسی کے ساتھ یگانہ نے پیغمبرِ اسلام کی طرف رخ کیا۔ بہت پہلے وہ انھیں اپنا "استادِ اعظم" لکھ چکے تھے اور ایک ایسی نعت بھی کہہ چکے تھے جو اردو کی بہترین نعتوں میں شمار ہونے کے لائق ہے:

اے آئینۂ انوارِ ازل   اے جلوہ گہہ ہر حسن عمل
ہے دیر سے ٹھنڈا دل کا کنول   دیدار دکھا پردے سے نکل

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

جانِ جہاں مقصودِ دوعالم   فرش نشیں اور عرش کا محرم
اشرفِ انساں افضلِ آدم   خاک کا پتلا نورِ مجسم

---

۱۱۵ مشمولہ تحقیقی ادب ۲   ۱۱۷ مطبوعہ نقل میں اس جگہ نقطے لگا دیے گئے ہیں۔ غالباً یہاں پر لفظ "مسلمان" ہوگا۔ (نیر مسعود)

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

آشفتہ بیانی سُن تو سہی — کچھ دردِ نہانی سُن تو سہی
ہاں میری زبانی سُن تو سہی — یہ رام کہانی سُن تو سہی

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

دیوانہ ہوں لیکن مستِ وِلا — گم گشتہ منزلِ سہو و خطا
کچھ دھیان نہ کر جو ہوا سو ہوا — گمراہ کو شمعِ جمال دکھا

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

اب اسی ہستی کی شان کے خلاف یگانہ نے کچھ رباعیاں کہیں۔ لیکن اپنے ادبی معرکوں کو مذہبی معرکے میں تبدیل کرنے کی یہ کوشش انھیں راس نہ آئی۔ ان رباعیوں کے ردِعمل میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور لکھنؤ میں ۳۱؍ مارچ ۱۹۵۳ء کو بڑی رسوائی کے ساتھ اُن کا جلوس نکالا گیا جس کے تین سال کے اندر ۴؍ فروری ۱۹۵۶ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ اس طرح یہ آخری معرکہ اسی مرحلے میں ختم ہوگیا، حالانکہ یگانہ نے اور مرحلوں کی بھی تیاری کرلی تھی۔ اسلام کے خلاف ان کی کتاب کے متعلق جن خطوں کے اقتباس اوپر دیے گئے ہیں وہ سب خط جلوسِ رسوائی کے بعد لکھے گئے تھے۔ علاوہ بریں ان کے سامان میں سے قرآنِ مجید کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس کے حاشیوں پر انھوں نے اس کے اسلوب اور معانی پر اپنے اعتراضات نوٹ کیے تھے اور اس صحیفۂ آسمانی کے خالق کے ساتھ بھی قریب قریب ویسا ہی لہجہ اختیار کیا تھا جیسا "صحیفۂ وِلا" کے مصنف عزیز لکھنوی کے ساتھ اختیار کرچکے تھے۔ ○○

WITH BEST WISHES

Mahomed Haji Adam & Co.

FOR **EXCLUSIVE RAYMOND'S SUITINGS**

84, Chakla Street, Bombay-400 003.
Phone: 323166/349347 Cable: WOOLCORNER

میرزا یگانہ

غیر مطبوعہ رباعیاں

میرزا یگانہ چنگیزی کی درج ذیل ۱۳۱ رباعیاں تخلیقی ادب ـ ۲ (کراچی پاکستان ۔ ۱۹۸۰ء، ۵۲۷ ص، مرتبہ مشفق خواجہ) سے لی گئی ہیں مشفق خواجہ صاحب کی تحریر کے مطابق :

" یگانہ کی ۶ بیاضیں اور کچھ متفرق مسودات میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں سے چار بیاضیں گنجینہ کی اشاعت سے پہلے کی ہیں اور دو بعد کی جن میں آخر عمر تک کا کلام ہے۔ میں نے ان بیاضوں کا مطبوعہ کلام سے مقابلہ کیا تو بہت سا ایسا کلام دستیاب ہوا جو یگانہ کے کسی مطبوعہ مجموعے میں شامل نہیں ہے۔" (تخلیقی ادب ـ ۲ صفحہ نمبر ۴۴۴)

"یگانہ کا غیر مطبوعہ کلام" کے تحت جو مواد دیا گیا ہے اس میں یہ ۱۳۱ رباعیاں بھی شامل ہیں۔ ترانہ کو پیش کرتے ہوئے ان رباعیوں کا شائع کرنا بھی ضروری سمجھا گیا کیوں کہ ہندوستان میں اب تک یہ رباعیاں کہیں بھی شائع نہیں ہوئی ہیں اور یگانہ کی شعری شخصیت کی تدوین و تفہیم کے لئے ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی از سر نو تاریخی ترتیب کے لئے بھی یہ رباعیاں اہم ہیں۔ (افتخار)

●

آندھی اُٹھ کر پہاڑ کے دامن سے
ہاتھی کو اُڑا لے گئی کجلی بن سے
پامال کرے کون سی طاقت اُس کو
پتّیا تا پھرے جو اپنے ہلکے پن سے

○

کیا جانے کوئی کدھر کدھر جانا ہو
جانے وہی جس نے حق کو پہچانا ہو
منزل اپنی ہے اور جادہ اپنا
رہبر دیکھے تو کتنا کھسیانا ہو

○

ہر رنگِ شباب اپنی طرف کھینچتا ہے
ہر حُسنِ حجاب اپنی طرف کھینچتا ہے
آپ ایسے کہ جنبش نہیں کرتے ورنہ
ہر دامِ سراب اپنی طرف کھینچتا ہے

○

مردانِ خدا کسی کے آگے نہ جھکے
دل شعلۂ غم سے پھک رہا تھا پھُکے
جادہ اپنا ہے اور ارادہ اپنا
دھارا کیا پتھروں پہاڑوں سے رُکے

○

ایسا نہ ہو یہ حُسن مصیبت ہو جائے
یہ گرمیِ بازار اک آفت ہو جائے
اچھا ہے ڈھل چلی جوانی اُن کی
سورج نہ ڈھلے تو پھر قیامت ہو جائے

○

اتنا سادہ تو کوئی انسان بنے
محفل میں قدم رکھتے ہی نادان بنے
گہرے اتنے کہ تھاہ دیتے ہی نہیں
بیٹھے ہیں جو کھوئے ہوئے انجان بنے

○

لڑتے ہی نگاہ دل دھڑکنے نہ لگے
نیتِ معصوم کی بھٹکنے نہ لگے
دل کے اندر دبی ہوئی چنگاری
دنیا کی ہوا کھا کے بھڑکنے نہ لگے

○

کیوں ساری خدائی میں اب اندھیر نہ ہو
ایمان پلٹتے بھی کوئی دیر نہ ہو
جاتی رہے بھوک پیاس جلوہ ایسا
دیکھے تو کبھی چشمِ ہوس سیر نہ ہو

○

مردانِ عمل کو اجر کی پروا کیا
خود ذوقِ عمل اجر ہے اندیشہ کیا
دنیا میری بلا سے خوش ہو کہ نہ ہو
میں اپنے سے خوش ہوں تو غمِ دنیا کیا

○

سکھیوں میں سہیلیوں میں ہنس لینے دو
پھولوں میں دو گھڑی تو لس لینے دو
بادل ہے گھرا ہوا برس لینے دو
ہاں دل کو ذرا اور ترس لینے دو

○

لڑتے ہی نظر پینگ بڑھا لیتا ہوں
اُلٹا سیدھا سبق پڑھا لیتا ہوں
دل کی باتوں کو سنگ دل کیا سمجھیں
دو باتوں میں مدعا اوپر چڑھا لیتا ہوں

○

انسان کی صحبت آدمی چاہتا ہے
زندہ رہتا ہے زندگی چاہتا ہے
دل ہے چنگا تو پھر گنواروں سے بھی
ہنسنے بولنے کو جی چاہتا ہے

○

پردہ کوئی رکھتا نہ طلب رکھتا ہوں
ہاں ایک کھٹک سی روز و شب رکھتا ہوں
مجھ کو کوئی دعا نہیں تیرے سوا
دل میں وہ درد منتخب رکھتا ہوں

ظالم کو بھی دیوانہ ہنسا دیتا ہے
اندازِ ستم گری بھلا دیتا ہے
چھوتا ہے زنجیر تا ہے، حیرت تو یہ ہے
پتھر بھی اگر ہو تو گدگدا دیتا ہے

کیا کہیئے زمیں کتنی ہے زر کتنا ہے
سب کچھ ہی جنجال مگر کتنا ہے
دولت کو ڈھونڈتے ہو؟ یہ تو دیکھو
دولت کے ساتھ دردِ سر کتنا ہے

○

کل تک تو وہی ہم تھے وہی دنیا تھی
دل میں پنہاں مگر نئی دنیا تھی
دیکھا کرتے تھے خواب آزادی کا
آج آنکھ کھلی تو دوسری دنیا تھی

○

اندھوں کو مبارک ہو یہ دیوانہ روی
کیا جانیں یگانہ کی وہ بیگانہ روی
دریا ہوں میں صحرا کا بگولا تو نہیں
دیوانہ روی بھلی کہ مستانہ روی

○

کہنے کو تو کعبہ بھی خدا کا گھر ہے
دیکھا تو وہی اینٹ ہے یا پتھر ہے
حق کا مرکز ہے حق شناسوں کے لئے
یہ سینۂ بے کینہ عجب مندر ہے

○

ایسا نہ ہو حق کا سامنا ہو جائے
سارا یہ طلسمات ہوا ہو جائے
کیا کرتا ہے پیچ پہ جان دینے والے
یاروں کا مزا نہ کرکرا ہو جائے

○

سارے جھگڑوں سے پا گیا چھٹکارا
دل ہے خالی تو کیا کرے بے چارا
فرہاد کا دردِ سر اٹھاتا کیوں کر
گھسیارے کا بنا رہا گھسیارا

○

ناپاک نظر واہ کہاں گڑتی ہے
کس گند میں کم بخت پڑی سڑتی ہے
ننگے کی طرف دیکھ کے ہنسنا کیا خوب!
جب دیکھو نظر بُری جگہ پڑتی ہے

○

کیوں مردِ مدافعانہ رفتار چلے
چلتا ہے تو چنگیزی تلوار چلے
جولاں گہِ ہستی کا یہی ہے دستور
میداں اس کا ہے جو پہلے مار چلے

○

درشن کچھ بھی نہیں مگر نام بڑا
لیلیٰ کو کبھی آپ سے پالا نہ پڑا
کیا حُسن ہے واہ کیا مسیحائی ہے
مُردہ بھی تمہیں دیکھ کے ہوتا ہے کھڑا

○

زخمی ہو کر زمیں پہ سردار گرا
باڈی گارڈوں کا بال بیکا نہ ہوا
اس پر بھی ہے یاروں کو وفا کا دعویٰ
واللہ وفا یہ ہے تو کیا ہوگی دغا؟

○

وہ حُسن ہے کیا جس میں نہ ہو خوئے وفا
دل ڈھونڈتا ہے دل میں ہو پہلوئے وفا
اربابِ ہوس کی دل لگی کیا؟ وہی رنگ
مستوں کی غذائے روح کیا؟ بوئے وفا

نیرنگیِ دنیا سے وفا چاہتا ہے
سادہ لوحی تو دیکھو کیا چاہتا ہے
دیکھیں کس کس کو راس آتی ہے یہاں
ہر نخلِ ہوس نشو و نما چاہتا ہے

○

آئے گی قدم با قدم آتے آتے
ظالم تجھے کیا دیر قیامت ڈھاتے
نیرنگِ جمال پر چڑھا رنگِ جلال
دنیا ہی بدل گئی پلک جھپکاتے

○

ہوتا کوئی پہلو میں بٹھانے والا
آغوشِ محبت میں اُٹھانے والا
دل آپ ہی آپ گدگدائے بھی تو کیا
جب تک نہ ہو کوئی گدگدانے والا

○

کافر کوئی اپنا ہے نہ دیں دار اپنا
اچھا نہ سہی کوئی خریدار اپنا
ٹیکا ہے نہ گھٹا ہے یہاں ماتھے پر
سیرت اپنی ہے اور کردار اپنا

○

تخریب جسے کہتے ہیں اہلِ غفلت
عارف کی نظر میں ہے سراسر حکمت
کیوں آگ نہ برسے کیوں نہ بھونچال آئے
نیت جیسی ہو جس کی ویسی برکت

○

جلوؤں کو یہ تکرار رہا کرتی ہے
آنکھ اپنی گنہگار رہا کرتی ہے
وہ صبح کا عالم تھا یہ شب کا عالم
نظارے پہ یہ مار رہا کرتی ہے

○

دل ہے بنیادِ عالمِ کون و فساد
دل ہی نہ رہا تو زندگانی برباد
تھے دشمن و دوست سب اسی کے دم سے
دونوں پہلوئے زندگی تھے آباد

○

ڈہکاتی ہے کیا کیا یہ لگاوٹ کی نظر
تیکھی چتون کبھی یہ میٹھے تیور
جب دیکھتا ہوں تمہیں تو جی چاہتا ہے
کچا کھا جاؤں جیسے مولی گاجر

○

کھلتے ہیں علم سے بشر کے جوہر
پاکیزہ سرشت و بدگہر کے جوہر
جب اٹھ گیا پردۂ جہالت ناداں
کھلتے پھر کیوں نہ خیر و شر کے جوہر

○

آوازے کسی پہ کسنے والا تو کون؟
ہالے پیتے ہیں مے ترسنے والا تو کون
الست مچاتے ہیں اُدھم شام و سحر
ہم زندہ دلوں پہ ہنسنے والا تو کون

○

زاہد تو ہے اپنے رنگ میں مست الست
میں بھی اپنے خیال میں ہوں حُسن پرست
کیا یوسفِ نادیدہ کی تعریف کروں
وہ نکہت پیرہن کہ اندھا بھی ہو مس

رہ کے گا کوئی کیا دلِ آگاہ کی راہ
دیوانے کی یا چور کی یا شاہ کی راہ
منزل ہے وہی سب کی مگر کیا کہئے
کھوٹی ہوئی کیوں بندۂ درگاہ کی راہ

○

دیوانۂ عشق کو نصیحت توبہ
وہ عقل کی باتیں، وہ حماقت توبہ
جذبہ کسی جذبے سے ہی مٹ سکتا ہے
نفرت سے بدل گئی محبت توبہ

○

جی چاہے تو دل لگائیے بسم اللہ
آشوب کوئی اٹھائیے بسم اللہ
دل کی دنیا میں ہو کا عالم کیوں ہے
سوتے فتنے جگائیے بسم اللہ

○

ناموسِ اسرار نہ سن لے کوئی
دیکھو پسِ دیوار نہ سن لے کوئی
شوریدہ مزاج سر پٹکنے نہ لگیں
زنجیر کی جھنکار نہ سن لے کوئی

○

ہر گام پہ تازہ گل کھلاتے چلئے
ہر روز کوئی فتنہ اٹھاتے چلئے
فطرت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے اگر
ہر وقت بگاڑتے بناتے چلئے

○

اڑتے ہیں بہادروں نے کیا کیا جھنڈے
کیا کیا کوڑے چکھائے کیا کیا ڈنڈے
تھی ہمو خطا جوشِ عمل کے دم تک
جب دم نہ رہا تو پڑ گئے خود ٹھنڈے

○

دنیا سے الگ بیٹھے ہو دامن جھاڑے
بکھرائے ہوئے بال گریباں پھاڑے
دیکھے تو یہی پھر بھی نہ بیچا چھوڑا
گھر چھوڑ کے جا بیٹھے کہاں پچھواڑے

○

سنتے ہی رہیں ہم تو عدو کیوں نہ جلے
ایسی زندہ دلی کہاں تک نہ کھلے
یہ وہ جیسے تو ہی سنئے یا نہ سنئے
خندہ ایسا کہ سات گھر ٹھٹکے لے

○

در در خدا چاہے تو کروٹ بدلے
پیدا ہو تڑپ مردہ دلی کے بدلے
غم کے نہیں زندہ دلی کے آثار
یارانِ قفس سے شرط کوئی بدلے

○

ال مجھ پہ توجہ ہے خدا خیر کرے
ناکردہ گنہ گار بھی بے موت مرے
کی کوئی پرستش ہی نہ بھائی یوں سے
کرتا بھی ڈرے اور نہ کرتا بھی ڈرے

○

بامن کی یہ ایک دھن کیا کم ہے
پاپی ہی سہی مگر یہ گن کیا کم ہے
پریم کی دیوی کا پجاری ہوں میں
گن کوئی نہیں مگر یہ گن کیا کم ہے

پرچھائیں سی پردے پہ دکھاتا کیوں ہے
امکانِ ہوس کو آزماتا کیوں ہے
میں یہ نہیں کہتا کہ پلٹ آئے شباب
بھولا ہوا خواب یاد آتا کیوں ہے

○

گزرا ہوا وقت ہاتھ کیوں کر آئے
پودا مرجھا گیا تو پھل کیا لائے
پھر کیوں جھوٹی تسلیوں کی خاطر
چوکا اک بوند کا گھڑے ڈھلکائے

○

پستی سے بلندی پہ جو چڑھتا جائے
ہر خطرے پہ لاحول ہی پڑھتا جائے
ایسے کو سہارا نہ ملے کیسا معنی
گرتا پڑتا جو آگے بڑھتا جائے

○

آپ اپنی جگہ شرم سے جو گڑ جائے
اس پر بھی کوئی ترس نہ اس کو آئے
میرا تو خدا ایسا نہ ہوگا بخدا
بندے کی خطا بندے کے منہ پر لائے

○

واعظ کو مناسب نہیں رندوں سے تنے
منبر پہ لتاڑ دیں اگر دل میں ٹھنے
اچھے ہیں یگانہ یا برے، جیسے ہیں
یاروں نے بنا دیا کہ خود ایسے ہی بنے

○

قیمت میں ہیں بدگہر اہالی سے سوا
نکیوں کے ہیں بول، فکرِ عالی سے سوا
جی جانتا ہے طنزِ یگانہ کے مزے
گالی تو نہیں مگر ہے گالی سے سوا

○

مرزا کا قدم غلط نہ پڑتے دیکھا
ناحق کبھی یاروں سے نہ لڑتے دیکھا
سیدھے سے آدمی تھے بالکل سیدھے
جھکتے کبھی دیکھا نہ اکڑتے دیکھا

○

ناکامیوں سے حوصلہ ہوتا نہیں پست
بدنام سہی حال میں اپنے ہیں مست
لکھی تھی میرزا یگانہ کے لئے
باطن کی فتح اور ظاہر کی شکست

○

کیا کہئے یہ دنیا ہے دنی کے مارے
کیونکر پنپیں گے بد دلی کے مارے
اربابِ خرد عزم دہ و دست بدل
ناچے ہیں سبک مغز خوشی کے مارے

○

سنتا ہی نہیں زمانہ کیا کہتا ہے
دل ہے اپنا وہ اپنے خوش رہتا ہے
دیوانہ تو دیوانہ اسے کیا پروا
دھارا تہذیب کا کدھر بہتا ہے

○

بننے کی ہوس میں کوئی انسان نہ بنے
ہستی نہ بگڑ جائے تماشا نہ بنے
فطرت کا تقاضا تو یہی ہے واللہ
انسان بنے آدمی ہوتا نہ بنے

سینہ کافر کا چاک کر ڈالیں گے غصہ دم بھر میں پاک کر ڈالیں گے
بچے کے بل پہ اکڑتا ہے چنگیزی ہم بچے کو کچل کے خاک کر ڈالیں گے

یہ تیزی طبع، اُف یہ تیز رفتاری دس بیس پہ جاتے ہو خود کو بھاری
یہ زور ہے، کیا زعم ہے ماشاءاللہ آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری

اک وہ ہیں پھرا کرتے ہیں اکڑے اکڑے اک ہم کہ شکنجے میں پڑے ہیں جکڑے
بے چارہ جو در در سے ہو خود دست بدل کس ہاتھ سے ظالم کا گریباں پکڑے

پیدا ہوئے فاختہ اُڑانے کے لئے دولت ہاتھ آئی ہے لٹانے کے لئے
آزاد تو آزاد انہیں کیا پروا کھانے کیلئے ہیں کہ بلبلانے کے لئے

اللہ رستہ بتانے والے باز آ لوٹا چرخہ چلانے والے باز آ
کل جگ میں ہوس فضول ست جگ کی الٹی گنگا بہانے والے باز آ

نیت ہے بخیر بول اپنا بالا سادہ سی بات جس کا مطلب سیدھا
چولھا مُلّا کا چاہے اوندھا ہو جائے رندوں کا پیالہ تو نہ ہوگا اوندھا

کچھ قدرِ ہنر ہے نہ کوئی قیمتِ فن بن پڑنے کی بات ہے کہاں کی جیدّن
ڈفلی بھی عجیب ناچ نچا دیتی ہے منڈھتی ہے تو خوب بجتی ہے ٹھنک ٹھن

ہوگا کوئی شریف عالی گوہر میں تو نہ شریف ہوں نہ اعلیٰ افسر
عزت جو مٹائے سے کسی کے مٹ جائے ایسی عزت پہ مارتا ہوں ٹھوکر

ایسا نہ سمجھیو کوئی تھیلا ہوں میں دُھن کا پکا ہوں گو اکیلا ہوں میں
دم کیوں نہ بھروں پھر من علی کا ہر دم معلوم ہے کس گرو کا چیلا ہوں میں

مٹتے مٹتے ہے اب تک اتنا کس بل جمہور کی ذہنیت کو دیتا ہوں کچل
چنگیز بچہ ہوں شیخ چلی تو نہیں تاریخ پکارے ہے ہمیں "گریہٗ مغل"

سوتا ہوں ترے ساتھ ارے واہ رے میں روتا ہے رتن ناتھ ارے واہ رے میں
دیکھا جو مجھے مہری کے رستے بھاگا پالا ہے مرے ہاتھ ارے واہ رے میں

زندہ ہے ادب تو قوم مرنے کی نہیں روشن ہے آفتاب سے گردتے زمیں
مرزا کا ذکر خیر کرنے والا آخر یہ ٹریجڈی ہے یا فتح مبیں

بستا اپنے ہی دیس میں کیوں نہ بسے بے چارہ غریب کیا کہے کس سے کہے
رہنا ہے یہیں اچھی بُری سہنا ہے دل میں ان کی جگہ رہے یا نہ رہے

کچھ دن تو رہا فتح کا سودا سر میں ہلچل سی مچ گئی زمانے بھر میں
لوٹا تو سہی، لوٹ کے لے جائیں کہاں دلّی کیوں کر سمائے ان کے گھر میں

تصویر عمل یہ چشم بینا ہم ہیں ظاہر ہے کہ لاشریک تنہا ہم ہیں
کام اپنا ہے، شوق اپنا ہے، ڈھب اپنا ہے اپنی ڈیوٹی کے کارفرما ہم ہیں

دُنیا میں وہ مزار ہا بھی تو نہیں اس باغ میں اب بوئے وفا بھی تو نہیں
پھولوں سے پھلوں سے جھک گیا ہوں ایسا چکھنا معلوم، سُونگھتا بھی تو نہیں

ممکن نہیں سب کے سب تونگر ہو جائیں تقدیر کے دائرے سے باہر ہو جائیں
ہے ایک کا رنج دوسرے کی راحت خوش کون رہے جو سب برابر ہو جائیں

عاشق ہی نہیں ہوس کے بندے بھی ہیں اندھوں سے سوا عقل کے اندھے بھی ہیں
اک وہ ہیں کہ دوست سے گلے ملتے ہیں پرچھائیں پر دوڑیں ایسے تو بھی ہیں

ہاتھ آئے گا کیا سہل نیا مال کہیں ہر ایک سے چل سکتے ہو یہ چال کہیں
معلوم ہے تم ایک ہی بیہودہ ہو پہلے مجھے کتر نہ لو گال کہیں

محفل تری بدرنگ نہ ہو جائے کہیں اس رنگ میں پھر بھنگ نہ ہو جائے کہیں
ثابت ہے ترا جلوۂ بے رنگ مگر اندھوں میں کوئی جنگ نہ ہو جائے کہیں

مجھ کا تیرا کبھی نہیں چھکنے کا انداز تو دیکھو کوئی مُنہ تکنے کا
کیوں کر ممکن ہے حُسن سے مُنہ پھیرے مارے سے کبھی دل نہیں مر سکنے کا

کیا کیا حرم و دیر میں آوارہ پھرا بندہ اپنی نظر سے پھر بھی نہ گرا
ماحول سے جنگ پر تُل کیوں نہ رہے رہتا ہے جو ہر طرف گُناہوں سے گھرا

افسانۂ حسن و عشق دہرا لیتا — بچوں کی طرح سے دل کو بہلا لیتا
کیا کیجے اب وقت کچھ ایسا آیا — خالی مل مل کے ہاتھ گرما لیتا

دروازہ نہ کیوں بند ہو روزی کا — دھندا چل نکلا آتش افروزی کا
کس نے ہڑتال کا پڑھایا تھا سبق — خمیازہ اٹھاؤ اب بدآموزی کا

کیوں ذوقِ نظر طعنۂ غفلت سہتا — جی میں اپنے نہ جانے وہ کیا کہتا
جب حسن و شباب ہو سراپا دعوت — دل کو کب تک کوئی مسوسے رہتا

گٹھے ہو یار، پھبتیاں یاروں کی — چلتی نہیں ہیں چٹکیاں یاروں کی
دیوانہ بن گئے میں بھی اک کام کروں — کہئے تو اڑا دوں دھجیاں یاروں کی

آندھی طوفان سر سے گزرے ہر چند — خاطر میں نہ لایا کوئی دشوار پسند
ثابت قدمی کا راز کیا پوچھتے ہو — گھبراتا ہی ہوگا جتنا کہ بلند

مٹی میں نہ مل جائے عداوت ساری — برباد نہ ہو جائے یہ آتش بازی
صدمہ پہنچا کے دیکھ لو میں کیا کہوں — پتھر میں بھرا کیا ہے، اک چنگاری

نغمہ بھی کوئی وجد میں لاتا نہیں اب — کیسا ہی مزا ہو دل کو بھاتا نہیں اب
اللہ اللہ یہ وقت بھی آ پہنچا — پیاری صورت پہ پیار آتا نہیں اب

کیا ہو گئی، وہ حسن کی رنگت نہ رہی — بس رنگ ہی رنگ ہے طراوت نہ رہی
روکھے پھیکے سے پیٹ بھر لینا کیا — کیا لذتِ عیش جب طبیعت نہ رہی

بازار میں جب ایک بھی گاہک نہ رہا — دکھتے دل سے کسی نے کیا خوب کہا
آغاز وہ تھا حسن کا انجام ہے یہ — ساری وہ رنگ و بو ہوا ہو گئی کیا

یاروں کا گلا ہے اور دشمن کی چھری — بنتی نہیں کچھ بات بجز "خانہ پُری"
کس دل سے یگانہ کو بھلا دے کوئی — واللہ قلم کی مار ہوتی ہے بُری

زم زم سے گناہوں کا ہے دھونا اچھا — یا در پہ ندامت سے ہے رونا اچھا
مہمل ہے یہ سب، دل تو یہی کہتا ہے — دوزخ میں گھس کے پاک ہونا اچھا

دو کھر ہو سماج پر، حکومت پہ کھلے — جس کا دھندا کبھی چلائے نہ چلے
راس آئے نہ مذہب نہ سیاست ہی پھلے — بے چارہ غریب شاعری لاد نہ لے

کچھ معنی و مطلب سے نہ آگاہ ہوا — حق چھوڑ کے باطل کا ہوا خواہ ہوا
استاد سے منہ موڑ کے کیا پھل پایا — پڑھ پڑھ کے کتاب اور بھی گمراہ ہوا

چھٹ بھیوں کی شاعری کا یہ زور یہ شور — ایسوں کو کہے گا کون میدان کا چور
شاعر ہیں یا مشاعروں کے ٹھیکے — سن پائی کوئی "طرح" لگانے لگے زور

غیرت ہی نہیں تو جاؤ جہنم میں پڑو — جوتے غیروں کے کھاؤ آپس میں لڑو
کیوں خاکِ وطن کو کر رہے ہو ناپاک — آباد کرو جیل الگ ہٹ کے سڑو

پڑھتا ہے کوئی شعر، کوئی سنتا ہے — منہ تکتا ہے کوئی، کوئی سر دھنتا ہے
اربابِ نگاہ رولتے ہیں موتی — اندھا نقاد کنکری چنتا ہے

چنگیز کا پوتا ہوں علیؑ کا بندہ — بندے کو تو آتا نہیں لندا پھندا
میت ہے پڑی یار الیکشن میں چلے — جاتے نہیں چھوڑ دیتے چلتا دھندا

نقاد چغد ہے کہ گدھا ہے کیا ہے — اندھا ہے کہ نیت کی خطا ہے کیا ہے
آیات و ترانہ دیکھ کر بھی نہ کھلا — آئینہ بھیا الٹا تو ہے کیا ہے

ایسے میں سویرا ہے بھگا لے جاؤ — اردو ہو کہ فارسی بچا لے جاؤ
او بولا پدھارنے والوں کا — تشریف کا ٹوکرا اٹھا لے جاؤ

بالغ ہونے کی کیا دوا چاہتے ہیں — کیا آج ہی سب کام کیا چاہتے ہیں
شاعر بن جائیں دس برس کے اندر — دیکھو تو یہ خام کار کیا چاہتے ہیں

بھگو نے کہا، کہاں میسر ہے دہی — سیروں پی جاتے دہی ہو کہ کڑھی
لا جاتے جو رام پور کا پس خوردہ — دو لقمے میں چھٹ جائے پھپھوندی منہ کی

کہتے ہیں شہیدوں نے شہادت پائی — ٹھنڈے ٹھنڈے سدھارے راحت پائی
کیا کہئے مگر اس کی خوشی کا عالم — منہ موڑ کے حق سے جس نے دولت پائی

گردشِ انقلاب، یہ فتنہ گری   کیا ساری خدائی ہے خبیثوں سے بھری
ندھی، طوفان، مذلزلے جاگ اٹھے   شیطان نے سنائی واہ کیا خوش خبری

بے کار ہے اے دوست زمانے سے گلہ   دیتے ہیں بہادری بہادر کو صلہ
حاصل ہے کسے عزت و ذلت کا شرف   جو لکھنؤ کے ہاتھوں یگانہ کو ملا

ہتا ہے دلیس میں تو بسنا سیکھو   مرنے کے لئے کمر کو کسنا سیکھو
ونے کا جو وقت آئے تو ہنس کر ٹالو   ہنسنا نہیں آتا ہے تو ہنسنا سیکھو

انساں وہی انساں ہے سعید الدارین   دکھ درد پہ اوروں کے جو ہو خود بے چین
کس منہ سے کہوں کہ میں ہوں تیرا بندہ   بندہ تیرا ہے ایک الطاف حسین[1]

ں منہ سے کہوں قہرِ خدا نے مارا   یا خلقِ خدا کی بد دعا نے مارا
سا انگریزا اور کہاں کا چنگیز   تجھ کو تو بزرگوں کی خطا نے مارا

آئینۂ اسلاف ہوں یہ کیا کم ہے   وہ صاف نہیں صاف ہوں یہ کیا کم ہے
گاندھی نہیں، آجن نہیں، آزاد نہیں   میں بندۂ الطاف[1] ہوں یہ کیا کم ہے

طرت کا تقاضا ہے بشر سے لغزش   میدانِ عمل میں ناموروں سے لغزش
یدا کتنے ہیں، کتنے معنی پنہاں   کب تک نہ ہو اربابِ نظر سے لغزش

دیکھو صغریٰ[2] یہ حال میرا کیوں ہے   منہ میری طرف سے تم نے پھیرا کیوں ہے
چاروں جانب تھیں چار شمعیں روشن   آج ایک طرف گھر میں اندھیرا کیوں ہے

ل جب ہے مزہ قدرِ عمل پہچانے   دشمن بھی مرے قلم کا لوہا مانے
زیب بھی کرتا ہوں برائے تعمیر   میں کون سے بھید میں ہوں تو کیا جانے

غیروں کو ستایا نہ عزیزوں سے لڑے   زور اتنا مگر کسی سے بھاری نہ پڑے
کہتے ہیں مہاراج[3] بڑے آدمی ہیں   ہم ایسے سرپھروں سے کیا ہوں گے بڑے

نی طاقت کہاں سے کوئی لائے   سو مرتبہ اندر آئے، باہر جائے
ں پہ یہ ستم جب آئے، ٹھوکر کھائے   ایسی بیہودہ نوکری؟ باز آئے

جگر مرادآبادی

جو میں نے کہا وہ بھی وہی کہنے لگا   دو باتیں سن کے تیسری کہنے لگا
میں نے کبھی فارسی تو دیکھا دیکھی   کالا کوا بھی فارسی کہنے لگا

ہ اور بھی جانور رفاقت کے لئے   تا کا مگر آپ ہی کو خدمت کے لئے
نساں سے جدا رہ نہیں سکتا کتا   انسان بنا کتے کی صحبت کے لئے

چھٹ بھیوں کا اندازِ فلاطونی کیا؟   میرے آگے فریب موزونی کیا؟
منگل اتوار والے کالے کوے   تو کیا وہ "کموڑیا" بدایونی[4] کیا؟

بجا ڈھیلا ہے اکڑی اکڑی بیٹھک   کس بل پہ کرے گا فتح ایسا مردک
ادت ہے جیسے کموڈ پہ بیٹھنے کی   اکڑوں بیٹھے گا وہ کس پر کب تک

یہ کس نے بتائی رسم و راہِ ادبی   میدانِ سخن میں یہ مبارز طلبی
کالا کوا بھی گاتا پھرتا ہے غزل   کیا فیضِ یگانہ ہے نہ ہے بوالعجبی

پ اپنی مثال ہے لکھنؤ کا ہر فرد   عورت وہ مرد مار، وہ نازک مرد
اب بہادر کی نزاکت دیکھی   سارنگی سن کے ہوگیا کان میں درد

غالبیات

بگڑی تو عزیزوں سے بنائے نہ بنی   یوں مر کے دکھا دیتے ہیں جب جی میں ٹھنی
وہ ٹھاٹھ کچھ اور ہی تھا یہ شان کچھ اور   غالب شکنی کہاں، کہاں خود شکنی!

دل لکھنؤ میرزا یگانہ سے تنا!   بگڑا ہوا کھیل پھر بنائے نہ بنا
یدانِ ادب مار چلا چنگیزی   چت ہوگئے تم، پون بھی ہریالا بنا

انگریز پچڑ میں کہیں آتے ہیں جناب   کیا دور تھا آجاتا کوئی اور عتاب
کیا عبد وفادار بنے تھے مرزا   کیسا سوکھا ملا قصیدے کا جواب

---

[1] حضرت سیدی و مولائی مولوی الطاف حسین صاحب بی۔ اے، ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ۔ (یگانہ) [2] رباعی جوامِ صغریٰ کی یاد میں ۱۹۰۹ء میں بمقام عثمان آباد کہی گئی تھی۔ اس پیاری بچی کی یاد اب تک دل کو تڑپاتی ہے۔ (یگانہ) [3] مہاراجہ کشن پرشاد شاد [4] فانی بدایونی

ےمرزا سے پہلے رشتہ جوڑا پھر گومتی والوں ہی کا کڈو پھوڑا
لی والوں کو کیا اچھوتا چھوڑا! غالب کا بت بتاؤ کس نے توڑا؟

ہزن کے روپ میں رہبر یہ کیا؟ غالب کا پٹیت ایسا سخنور یہ کیا؟
اللہ یگانہ نے عجب کام کیا سیاں[1] کے بھیس میں ہیمبر یہ کیا؟

رب زدہ بیدھوں کو نہ یوں چمکار دو چمکار کو کب مانتے ہیں پھٹکار دو
زورِ قلم ملا ہے کس دن کے لئے! مار ذمار دو غلبچیوں کو مار دو

رحیں لکھنے دو یوں ہی دن کاٹنے دو انبار لگانے دو گڑھے پاٹنے دو
یات و ترانہ کا مزا کیا جانیں غالب کے سگوں کو ٹھیکرا چاٹنے دو

با مطلب مرہٹوں پہ کیسی بیتی یا غدر کے پرکٹوں پہ کیسی بیتی
بر دیکھنا ہے قلم سے چنگیزی کے غالب کے دلچٹوں پہ کیسی بیتی

کیوں کیا ہوتی وہ ہیٹ بسر کی تیزی غالب کے بھندیت، نیم ٹر کی تیزی
ناک اُلٹی چھری سے پونچھ لی یاروں کی کیا پوچھو ہو میرے "پارکر" کی تیزی

دِل کتوں کے چٹنی ہوئے پستے پستے بہ بہ گئیں غم سے آنکھیں برستے برستے
کیا لاگ غلبچیوں سے رکھتا ہے قلم تیز اور ہوا جاتا ہے گھستے گھستے

مرزا کو فلاطوں سے سوا پاؤ گے سقراط و ارسطو کا چچا پاؤ گے
غالب کو غلبچی کی نظر سے دیکھو ایسا نہ کرو گے تو خطا پاؤ گے

حافظ کو بھی اپنا پیشوا کہنے لگے غالب کو بھی اپنا ہی سگا کہنے لگے
اپنی ہی جماعت میں گھسیڑا کیا خوب دیکھا جسے ڈانڈگا[2] چچا کہنے لگے

---

[1] سیاں، لکھنؤ کا مشہور شہدہ مگر صاحبِ ایمان (یگانہ)
[2] ڈانڈگا، دکنی لفظ بمعنی لمبا تڑنگا، موٹا تازہ۔

اِس میں ہر وہ چیز شامل ہے
جو ایک اچھے ٹانک میں ہونی چاہیے ... بلکہ اِس سے بھی زیادہ!

سنکارا الکحل سے پاک
لازمی بُنیادی عناصر، وِٹامنز اور قدرتی جڑی بوٹیوں کا نادِر مرکّب

سنکارا واحد ٹانک ہے، جس میں ۲۷ لازمی عناصر کے علاوہ جیسے وٹامنز اور جڑی بوٹیوں کی کثیر مقدار پائی جاتی ہے، جو آپ کے جسم کو قوی، اور قلب، جگر، عضلات اور ہڈیوں کو مضبوط بناتی ہیں، اس کے باوجود سنکارا بازار میں دستیاب ٹانکوں میں سب سے کم قیمت ہے۔
سنکارا کو روزمرہ کی عادت بنایئے۔

جسم کو کب سنکارا کی ضرورت ہوتی ہے؟
- کمزوری اور نقاہت میں،
- بھوک کی کمی میں،
- جراثیم کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے،
- وزن کم ہونے پر،
- اضطراب اور تھکن میں وغیرہ۔

تاج محل چائے (کراچی میں قیام کے چند روز)

اقبال مجید ● آل انڈیا ریڈیو . شملہ ہاؤس . بھوپال

امرت سر، اٹاری اور لاہور کے درمیان جو ریل کی پٹری بچھی ہے اس پٹری کے بائیں اور دائیں جانب پتھروں سے ذرا پرے میں بہت غور سے زمین کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اب بھی کوئی لاش پڑی رہ گئی ہو۔ شاید اب بھی کوئی ہاتھ کوئی سر یا خون آلود کپڑے پڑے رہ گئے ہوں۔ اس راستے کے بارے میں اور اس پٹری کے بارے میں مجھے اتنا ہی معلوم ہے جتنا منٹو کے وہ افسانے بتاتے ہیں جو تقسیم کے بعد فسادات پر لکھے گئے تھے اور جنھیں پڑھ کر مجھے اب صرف اتنا ہی یاد تھا کہ اُدھر سے ادھر جو گاڑی آتی تھی وہ لاشوں سے پٹی ہوتی۔ ڈبوں کی چھتوں پر جو لوگ بیٹھ کر سرحد پار کرتے انھیں گاڑی روک کر راستے پر پٹری کے دائیں اور بائیں گرا لیا جاتا اور ذبح کر دیا جاتا۔ دونوں طرف کے مسافروں پر یہی گزری تھی۔

مگر یہ تو ۸۴ء کے جون کا ابتدائی ہفتہ تھا۔ پٹری کے دونوں طرف ہندوستانی کھیتوں کے مانند پاکستانی کھیتوں سے فصل کاٹی جا چکی تھی۔ وہی بھینسیں جو ادھر گردن اٹھا اٹھا کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہماری شور مچاتی ریل گاڑی کو کبھی کبھی حیرت میں دیکھ لیا کرتی تھیں ویسی ہی بھینسیں اُدھر بھی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ دھوپ کی تمازت سہتے سہتے چرواہوں کے دہکے جھلسے ہوتے چہرے۔ ہاتھ میں وہی روایتی لاٹھی یہ ضرور تھا کہ کوئی کوئی ان میں سے گھٹنوں سے نیچی پٹھانی قمیص اور شلوار پہنے ہوتے دکھائی دیتا۔ داگھا کے اسٹیشن پر پاکستانی سپاہیوں کا عملہ نظر آیا۔ ذرا دیر کو گاڑی رکی۔ انجن سے ڈرائیور کو باہر ہاتھ نکال کر میں نے کسی کو کوئی چیز دیتے ہوتے دیکھا۔

کیا تھا ——— ؟

بروک بانڈ کی تاج محل چائے ——— کا ڈبہ ! شاید آدھا کلو چائے کا ڈبہ تھا۔

تاج محل ——— جسے تمہارے پرکھے وہاں چھوڑ آئے ہیں۔ یہ تاج محل ابھی اور کچھ دن تمہارا ناسٹلجیا بن کر تمہیں ستاتا رہے گا۔ اور تاج محل کی تصویر بنے ہوتے ڈبے میں پیک کر کے کوئی بھی چائے کی پتی تمہیں پلائی جائے تم کچھ پلوں کے لئے اپنا مکان بدل دو گے آگرے کی گلیاں۔ جمنا کی موجیں، تاج بی بی کے روضے کی ٹھنڈی محرابیں اس کے مرغزاروں کی خوشبوئیں تمہاری گرم گرم چائے کی پیالی میں بس جائیں گی۔ تم ایک ہلکی سی سسکی کا اندر ہی اندر گلا گھونٹ کر اپنے جوان بچے سے کہو گے "ذرا پاسپورٹ آفس چلے جانا اور پتہ کر لینا کہ ہمارے پاسپورٹ کا کیا ہوا ——— ؟" تمہارا لڑکا جواب دے گا۔

" پاپا دو تین بار آپ پاسپورٹ رینو کروا چکے ہیں، ایک بار چلے بھی جائیے۔"

مکان اور زمان ——— زمان اور مکان ——— !

پاسپورٹ !

ویزا ———

تاج محل چائے ———

لاہور آگیا ——— دو رنگ کے قلی۔

ایک وہ جو سبز وردیاں پہنے تھے جیسے لکھنؤ میں محرم کے زمانے میں منت رکھنے والے امام کے فقیر۔

دوسرے وہ قلی جو ہندوستان میں بھی ہوتے ہیں اور پاکستان میں بھی۔

پلیٹ فارم پر وہی بھیڑ وہی آوازیں۔ وہی بھاگ دوڑ ویسی ہی دکانیں۔

اس پلیٹ فارم کو پاکستانی پلیٹ فارم کیوں کہہ دیا گیا تھا ——— ؟

سامنے آغا سہیل اور ابصار عبدالعلی کھڑے ہیں۔ آؤ اقبال مجید تم آ گئے۔ گلے لگ جاؤ۔ جلدی کرو اقبال مجید مسکرائے گلے لگے دل کی دھڑکنوں میں ابھی تیزی آتے گی ہم فرطِ جذبات سے تمہیں بھینچیں گے۔ ٹھنڈا کوک پلائیں گے۔ سگریٹ کے کئی پیکٹ تمہاری جیبوں میں بھر دیں گے ——— کیا؟ تمہیں لاہور رکنے کا ویزا نہیں ملا۔ لیکن کراچی کیسے جاؤ گے گاڑیوں میں رش ہوتا ہے ایک دن کے لئے ٹرانزٹ ویزا پر رک جاؤ کل چلے جانا۔ چلو سپروائزر سے مل کر سب کی سیٹ ریزرو کرا دیں گے دوپہر کا ایک بج رہا ہے۔ ابصار کا تین بجے ایک ضروری اپائنٹمنٹ ہے اسے وہاں پہنچنا ہے پھر شام کو کچھ لوگ پاکستان سے ہندوستان کے لئے سوار ہو رہے ہیں انھیں سی آف کرنا ہے۔

آغا سہیل ہمارا سامان ابصار کی گاڑی میں رکھوا رہے ہیں، ابصار ہمارا اور ہمارے بیوی بچوّں کا ریزرویشن کرا رہے ہیں ——— یہ وہ نسل ہے جس نے نہ جانے کتنے آنے والوں اور جانے والوں کا سامان ڈھویا ہے۔

اور یہ آغا سہیل ہیں!

لکھنؤ ——— حسین آباد کی پشت پر آباد ایک ٹوٹا پھوٹا محلّہ۔ ایک چھوٹا سا گھر دُبلا پتلا ژولیدہ عمر حیران پریشان سا ایک لڑکا ٹوٹی پھوٹی سی سائیکل پر اپنے چھوٹے لڑکے کو آگے بٹھائے چلا جا رہا ہے۔ عمر مشکل سے ۲۴ سال۔ یہ ہے آغا سہیل۔

لاہور ——— ایف۔ سی کالج کے کیمپس میں ایک کشادہ سا مکان۔ خوبصورت اور سادہ سا ڈرائنگ روم، فرج، ٹی وی، ٹیلیفون، ہونہار تعلیم یافتہ اولادیں بڑی لڑکی کی شادی کے موٹے موٹے البم ——— یہ دوسرا آغا سہیل ہے۔

فاصلۂ مکانی

فاصلۂ زمانی

مگر ——— مگر آغا سہیل کی آنکھیں! وہی خوابیدہ سی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئیں۔ وہی خاکسارانہ لہجہ ——— وہی رفاقتیں ———

——— مت سہل ہمیں جانو

مت سہل ہمیں جانو

آغا سہیل ٹیلیفون پر بیٹھے ہیں۔ میرے بچےّ بیگم آغا سہیل اور ان کے بچوّں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہیں۔

ٹیلیفون پر آغا سہیل برابر ڈائل گھما رہے ہیں۔ انور سجاد کی تلاش ہو رہی ہے۔ جمیلہ ہاشمی سے باتیں ہو رہی ہیں۔

بھارت سے اقبال مجید آئے ہیں۔ کل لاہور چھوڑ دیں گے۔ ہاں صبح میں ان کو لا سکتا ہوں جی ہاں آپ کی گاڑی ہمیں لینے آ جائے گی تو کیا کہنے ——— ہم ضرور آئیں گے ——— سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

لو بات کرو کشور ناہید بول رہی ہیں۔

میں ریسیور ہاتھ میں لیتا ہوں۔ اُدھر سے ایک خوبصورت آواز اور پرکشش لہجہ۔

میں نے کشور ناہید کو کبھی نہیں دیکھا۔ مگر آواز کے ذائقے سے محسوس ہوا کہ کوئی شیریں بدن بول رہا ہے۔

"آپ شاعر ہیں۔ میں تو نثر کا آدمی ہوں۔ پتہ نہیں آپ مجھ سے ملنا پسند کریں گی؟"

"جی آج کے زمانے میں نثر اور نظم کا فرق ہی کیا رہ گیا ہے۔ یہ تو پرانی باتیں ہیں۔ آپ کو لاہور کا ویزا لے کر آنا تھا۔ بہرحال کراچی جا کر لاہور کا ویزا اگر دہ لیں۔ کوئی دقت ہو تو مجھے اطلاع کریں میں کوشش کروں گی۔ یہاں قیام ضروری ہے جیسے ہو سکے تو سب مل جائیں گے!"

"نوازش! میں ضرور کوشش کروں گا۔ آداب!"

رات کو منیر نیازی سے بات ہوئی۔

صبح وہ بھول گئے کہ رات کس سے بات ہوئی تھی ——— رات گئی بات گئی۔ مگر اس شام کو وہ واحد لاہور کی شام تھی جو میرے حصے میں آئی تھی

بس اسی شام انور سجاد سے ملاقات ہوئی ۔ جمعہ کا روز تھا انور سجاد اس دن کلینک نہیں کرتے اور اپنا وقت بچوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ اور قارئین مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ انور سجاد نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ ہفتہ میں ایک بار آنے والی وہ قیمتی شام انھوں نے اپنے بچوں سے چھین کر مجھے دے دی اور اقبال مجید نے انھیں کیا دیا ؟ کراچی کے جلسوں میں گالیاں کہ پاکستان کے اخبار ایسا ہی بتاتے ہیں ؟ (اس باب میں مجھے فی الحال کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ موضوع آگے کہیں وضاحت کے ساتھ آنے والا ہے) ..... مگر صاحب آگے کیوں ؟ معاملہ یہیں کیوں نہ ختم کر دیا جائے ۔ ؟

ہوا یہ کہ علی حیدر ملک صاحب کے مکان پر جلسہ ہوا وہاں مجھ سے نئے افسانے کے بارے میں چند سوالات کئے گئے۔ میں نے نئے افسانے کے مفرر جحانات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا کہ ایسی جدید کہانیاں جو کہانی کو مکڑ جال بناتی ہیں کہانی کہلانے کی مستحق نہیں۔ ملک صاحب بولے "یہ کام تو ہندوستان میں خوب ہوا ہے۔ مثلاً بلراج مینرا کی کہانیاں ۔ میں نے کہا ہندوستان کی ہی کچھ تخصیص نہیں پاکستان میں انور سجاد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ احمد ہمیش بھی کم نہیں۔ افسوس کہ اس بات کی رپورٹنگ بہت غلط ڈھنگ سے کی گئی اور اس سے یہ تاثر بنتا ہے کہ شاید میں بلراج مینرا اور انور سجاد کو سرے سے افسانہ نگار ہی نہیں مانتا۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ بلراج مینرا کی جن کہانیوں کی قدر میرے دل میں پہلے تھی آج بھی ہے یہی حال انور سجاد کا ہے۔

در اصل ہوتا یہ ہے کہ کسی فن کار کے فن کی خوبی اس کی تحریروں کے غالب رجحانات سے مقرر کی جاتی ہے۔ اردو افسانے میں علامتی اور تجریدی طرز تحریر کے تجربوں میں جو نام پیش پیش رہے ان میں دو چار کو چھوڑ کر باقی لوگ یک رُخے رہے ہیں۔ جن دو چار کو میں چھوڑنا چاہتا ہوں ان میں انور سجاد بھی ہیں۔ بلراج مینرا کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اس کی ایک کہانی بڑی وزنی ہے۔ نام ہے " وہ " اس نے کمپوزیشن والی جو کہانیاں بنائی ہیں۔ ان میں وہ باوجود پوری ایمانداری کے مُنہ کے بل گرا ہے ۔ اور اس میں اس کی تکنیک کا پہلو شامل نہیں ہے بلکہ تجربات کرنے والوں کا یہ مقدر ہوتا ہے ۔ یہ بات میں علی حیدر ملک اور اپنے دوسرے دوستوں کو نہیں سمجھا سکا۔ بلراج مینرا نے پچھلے چند برسوں سے کچھ نہیں لکھا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سوچ کر لکھتا ہے۔ کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا یا کچھ بھی نہ لکھنا دونوں ہی باتیں کسی کے پچھلے لکھے کی قدر و منزلت کو نہ تو کم کر سکتی ہیں اور نہ ہی بڑھا سکتی ہیں۔

انور سجاد سے ملاقات ہوتی ۔ اس جملے میں ملاقات کا لفظ زائد ہے یار سا لکھ دیا گیا ہے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انور سجاد کو دیکھا . . . اور دل کی دل ہی میں رہ گئی ۔

ڈاکٹر سلیم اختر تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھے ۔ مزے مزے کی باتیں کرتے رہے ۔ مجھے لگا کہ وہ ایک اچھی یادداشت کے مالک ہیں اور جب انھیں کوئی بات اپنے حافظہ میں محفوظ کر لینا ہوتی ہے تو کافی دیر کے لئے وہ خاموش ہو جاتے ہیں ۔ باتوں باتوں میں مجھے ایک بار یہ شبہ ہوا کہ شاید وہ میری کسی ایک بات کو اپنے حافظہ میں محفوظ کر لینا چاہتے ہیں کاش میں نے وہ بات انور سجاد سے کہہ دی ہوتی ۔ آج بھی اس کا پچھتاوا ہے اناڑی اور کھلاڑی میں یہی فرق ہے۔

دوسرا دن ــــــ آج دوپہر مجھے کراچی کے لئے سوار ہونا ہے ۔ ناشتہ کے بعد ہم بیٹھے ہی تھے کہ جمیلہ ہاشمی کی گاڑی آگئی ــــــ جمیلہ صاحبہ بڑے خلوص سے ملیں۔ شالی میں سجا ہوا ناشتہ اور منصور پسالن کے زیر تحریر ناول پر گفتگو۔ جمیلہ ہاشمی کی تحریر کا میں پہلے ہی سے مدّاح تھا ان کی شخصیت کا بھی قائل ہونا پڑا ۔

میں لاہور چھوڑ رہا ہوں ــــــ وا حسرتا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب سے فون پر بھی بات نہ ہو سکی ۔ آغا سہیل کو اس المیہ کے بعد بھی کہ میں قاسمی صاحب سے ملے بغیر لاہور چھوڑ رہا ہوں یہ شرمندگی نہ ہوئی کہ اس کے پاس گاڑی نہیں ہے ۔ وہ ویسے ہی ڈھینٹ بنا ہوا ابصار عبدالعلی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ مان لو کہ ابصار کسی وجہ سے نہ آپائے تو یہ قافلہ اسٹیشن کیسے پہنچے گا کہ گاڑی کا وقت اب قلیل ہے ۔ مگر سہیل شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ جس طرح گمراہوں کے لئے خدا نے زمین پر پیغمبر اتارے ہیں اسی طرح بے کاروں کے لئے ابصار عبدالعلی بس وہ ضرور آئیں گے۔ اور یہی ہوا کہ ابصار آئے اور مع گاڑی کے آئے ۔ ابصار نے چلتے چلتے ہمیں اپنی رسید دی یعنی وہ چند کتابیں جو انھوں نے پاکستان منتقل ہونے کے بعد بچوں کے لئے لکھی تھیں۔ اور ہمیں یقین ہو گیا کہ امین آباد کی سڑکوں پر بے قرار گھومنے والا ابصار جو اس وقت بھی بچوں کے ادب کا شیدائی تھا اور بچوں کا ایک رسالہ نکالنے میں بھی منہمک تھا آج بھی زندہ ہے ۔

گاڑی چلی ــــــ کراچی کی جانب ۔ خدا کی بستی میں ہمارا پہلا سفر۔ دونوں دوست نظروں سے اوجھل ہوئے تو یہ احساس ہوا کہ یا خدا یہ کیسی گاڑی ہے۔ بچوں کو ہندوستانی کاڑیوں کے خارجی ٹیم ٹام کی برتری کا جو احساس ہوا تھا اس احساس کو انھوں نے دھیرے دھیرے لفظ دینا شروع کئے جون کی گرمی ــــــ ہم ابھی پنجاب میں ہی تھے ۔ امرتسر سے پہلے کسی اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تھی تو ہم نے دیکھا تھا کہ کچھ لوگ دیوانہ وار

صدائیں لگا لگا کر لوگوں کو رضاکارانہ طور پر ٹھنڈا پانی پلا رہے تھے۔ بچوں نے جب وہ پانی پیا تو بتایا کہ وہ شربت ہے۔ میٹھا اور بہت ٹھنڈا شربت۔ ہمیں اپنے پنجاب کی یہ ادا بڑی پیاری لگی۔ بچے دھوپ میں دوڑ دوڑ کر مسافروں کو مفت شربت پلا رہے تھے شربت سے ان کے ڈونگے بھر رہے تھے۔ مگر لاہور سے چلے ہوئے ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا اور ہم اس قوم کی سرزمین پر چل رہے تھے جس کے یہاں پیاسے کو پانی پلانا ایک مذہبی فریضہ تھا۔ ہم نے دیکھا ہر آدھے گھنٹے بعد لوگ ہمارے ڈبے میں بالٹیوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی سوڈے کی بوتلیں لے کر داخل ہوتے مسافروں کی پیاس کو جی بھر کر سیراب کرتے اور چلے جاتے۔ یہ بات الگ ہے کہ ہر بوتل کی قیمت ڈھائی روپئے ہوتی ——— ہم کل چھ افراد تھے۔ کراچی پہنچتے پہنچتے ہم ستر روپے کی بوتلیں پی چکے تھے تشنگی ہنوز برقرار تھی۔ ہمیں امرتسر کے پاس والے ریلوے اسٹیشن کے ان بچوں کی خاکساری یاد آئی جو شربت کو بھی شربت کہتے شرما رہے تھے بلکہ ٹھنڈا پانی کہہ کر مفت مسافروں کو پلا رہے تھے۔

واہے گرو دا خالصہ واہے گرو دی فتح

لاہور سے کراچی ایک طویل سفر ہے۔ درمیان میں کئی چھوٹے چھوٹے اسٹیشن پڑے لیکن راستے کے یہ شہر بس ہندوستان کے مضافاتی علاقوں سے زیادہ بڑے نہیں۔ کم سے کم ان کے پلیٹ فارم اور وہاں کی بجھی بجھی سی نقل و حرکت سے یہی اندازہ ہوتا تھا ——— سندھ کے علاقے سے گاڑی گزرنے کی سند ہمیں ان ریت کے ذرّات سے مل چکی تھی جو ہمارے بدن پر چپکی ہوئی تھی۔ دوستوں کا ساتھ کیا ہوا کھانا ختم ہو چکا تھا اور اب ہمیں دال روٹی کی فکر تھی مگر مرغ و ماہی کے دیس میں دال روٹی کہاں ؟ پگڑیاں باندھے ہوتے بیرے بارہ روپے کا ایک کھانا دے رہے تھے ہمیں اپنے یہاں کی ساڑھے چار روپے والی تھالی بہت یاد آئی۔ اور اس سے بھی زیادہ امرتسر کے اسٹیشن کے غریب نواز چھولے بھٹورے کہ ڈھائی روپے میں پیٹ بھر جاتا تھا۔ خمیری روٹی اور آلو کی ٹکیوں پر گزر بسر کی اور گاڑی چلتی رہی کہ چلتی کا نام گاڑی ہے۔

اور پھر کراچی آیا۔

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔

کراچی کیا آیا کہ ہم کڑھائی گوشت ہو کر رہ گئے۔

پہلی بات تو یہ کہ کہاں بھوپال کا پیارا پیارا موسم۔ کراچی نے تو ہمیں بھون دیا۔ دوسرے یہ کہ اسٹیشن پر اترتے ہی حسن عابد نے ہمیں اپنی تحویل میں اس طرح لیا جیسے پاکستانی کڑھائی، گوشت کی بوٹیوں کو اپنی تحویل میں لے لیتی ہے اور اس وقت تک نہیں چھوڑتی جب تک ایک ایک ریشہ گل نہیں جاتا۔ ہمارے سارے سرالی عزیز منہ دیکھتے ہی رہ گئے اور ہم کراچی کی سڑکوں پر ٹیکسیوں میں آٹو رکشا میں بسوں میں اور کبھی پیدل یہاں سے وہاں اور ادھر سے ادھر لڑھکتے رہے جس طرح کڑھائی میں گوشت لڑھکتا ہے۔ ہمیں حسن عابد نے بارہ مسالوں کی آمیزش سے اور اس کے دوستوں نے خوشبودار بگھار دے کر کچھ اس طرح پیالوں میں گرم گرم SERVE کیا کہ چکھنے والوں کو ذائقہ کی شکایت کا موقع نہ ملا۔

لو بھائی ——— دیکھ لو ——— یہی پاکستان ہے ———!

یہ وہ ملک تھا جو آج سے ۴۵ سال پہلے اس وقت وجود میں آیا تھا جب لکھنؤ کے نشاط سنیما میں فلم شہنائی لگی تھی اور اس کا یہ گانا سڑکوں پہ گایا جا رہا تھا

مار کٹاری مر جانا پہ انکھیاں کسی سے ملانا نا۔

اس ملک میں بھی انسان مجبور محض تھا۔ بے بس تھا۔ نامرادیوں، محرومیوں، ناکامیوں اور مایوسیوں کے ڈیرے یہاں بھی جگہ جگہ پڑے تھے۔ کیونکہ یہاں بھی عاملوں اور گنڈہ تعویذ کرنے والوں کے ناموں اور پتے ٹھکانوں سے جگہ جگہ شہر کی دیواریں بھری پڑی تھیں۔

دلبر زیدی۔

جی ایم شاہ۔

اور نہ جانے کتنے ——— محبت میں ناکامی ہو تو ہم سے ملئے آپ کا محبوب آپ کے قدموں میں ہوگا۔

کاروبار اور ملازمت میں ترقی کے لئے ہم سے ملئے۔ شرطیہ کامیابی۔

کام پورا نہ ہونے پر ہدیہ واپس۔

دشمن زیر نہیں ہوگا ——— ؟ ہمارے پاس آیئے۔ کلیجہ کٹ کٹ کر نہ گرے تو دام واپس۔

وہی دلوں میں حسد اور نفرتوں کے ریگ زاروں سے گزرتا ہوا پیپ اور خون کا دریا۔ یہاں بھی جنگ ہوتی ہے اور جوان لڑکیاں بیوہ ہوتی ہیں۔ یہاں بھی منافرت اور منافقت میں قتل ہوتے ہیں یہاں بھی محبت ہوتی ہے یہاں بھی رقیب ملتے ہیں۔ غربت و افلاس سے ٹوٹے ہوئے ارادے یہاں بھی کوڑیوں کے مول اپنے کو بیچ دیتے ہیں اور یہاں بھی ہر دل میں ایک ELDORADO ایک سونے کے شہر کا خواب خوابیدہ ہے کیونکہ بغیر انکھیاں ملائے زندگی میں مزہ نہیں۔ اس لئے انکھیاں مل جاتی ہیں اور انکھیاں مل جاتی ہیں تو راتوں کی نیند اور دن کا چین چھن جاتا ہے۔ آرزوؤں اور تمناؤں سے مفر ممکن نہیں، (مارکٹاری مرجانا پے انکھیاں ....)

اس لئے اے ہندوستان تو آتنا جان لے کہ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا۔ اس لئے کہ پاکستان میں بھی لوگ مرتے ہیں اور کیوں لوگ مرتے ہیں اسلئے کہ نشاطِ کار سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ اور جہاں نشاطِ کار ہوگا وہاں دلبر زیدی بھی ہوں گے گنڈے بھی ہوں گے اور تعویذ بھی ہوں گے۔ اس لئے اے میرے پیارے جنت نشاں ہندوستان وہاں بھی سب کچھ وہی ہے کہ جو تیرے پاس ہے تیرے وزیروں کے ہوں تیرے منتر اور تیرے جاپ، وہی پیر جو دلبر زیدی کے ہیں تیرا بھی نشاطِ کار وہی ہے جو ان کا ہے کیونکہ

اہلِ سیف آتے رہے اہلِ کتاب آتے رہے ایں جناب آتے رہے اور آں جناب آتے رہے

دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا ——— کیونکہ ——— مارکٹاری مرجانا پے انکھیاں کسی سے ملانا نا

کراچی کا پہلا ادبی جلسہ۔

بھائی علی حیدر ملک کی رہائش گاہ۔

میں بھارت کے افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہو رہا ہوں ———

مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں۔ پاکستان میں مجھے کون نہیں جانتا ——— اگر پاکستان میں حسن عابد نہ ہوتے تو محمد علی صدیقی بھی نہ ہوتے راحت سعید بھی نہ ہوتے۔ اگر سبط اختر کراچی نہ آئے ہوتے تو کراچی میں جون ایلیا اور زاہدہ حنا بھی نہ ہوتیں۔ میں اس مملکتِ خداداد میں آتا اپنے عزیزوں میں ٹھہرتا اور کڑاہی گوشت کھا کر دو چار ضیافتوں کے بعد بدہضمی کا شکار ہو کر واپس چلا جاتا۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے لوگ آتے ہیں کھاتے ہیں ٹی وی دیکھتے ہیں اپنی بساط بھر خریداریاں کرتے ہیں کپڑے بنواتے ہیں، لنڈا کا مال خریدتے ہیں کسٹم کے قوانین کی خلاف ورزیاں کرتے ہیں اور پھر کسٹم پر گڑگڑاتے ہیں اور صلوات برنی بھیجتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں۔ تھوڑے سے آنسو تھوڑے سے قہقہے تھوڑے سے کپڑے چند اشیاء مقروض ہو کر آتے ہیں مقروض کر کے چلے جاتے ہیں۔

کراچی کا پہلا جلسہ ——— ۱۱ر جون ۸۲ء وقت شام سات بجے۔

بہار کے علی حیدر ملک کا دولت خانہ۔

پھل، ٹھنڈا پانی ——— پھر چائے ——— مخلوط محفلیں بند کرو ——— جلسے میں الطاف گوہر بھی موجود ہیں۔

شہزاد منظر بانئے اردو افسانے سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ پوری محفل میں وہ تنہا آدمی تھے جو اردو افسانے کی جانب خاصے سنجیدہ نظر آ رہے تھے اتنے سنجیدہ کہ آخر وقت تک AT EASE نہیں ہو پا رہے تھے۔ اچھے آدمی ہیں۔ بہار کے ایجول کی ایک ادا ہمیشہ سے بہت معصومانہ ہے ان کی نظر ہمیشہ نتائج پر رہتی ہے۔ فیصلے سننا اور فیصلے کرنا ان کا ایک بے زور مگر محبوب مشغلہ ہے۔ اس طرح وہ اپنا لہو گرم رکھتے ہیں۔ علی حیدر ملک نے پاکستان کے ایک نئے افسانہ نگار آصف فرخی کا تعارف کرایا۔ ہم نے ان کا افسانہ سنا اور ان کے مجموعے "آتش فشاں پر کھلے گلاب" بھی ہم کو دیا گیا۔ علی حیدر ملک نے بڑی محبت کا برتاؤ کیا اور عزت بخشی۔ لاہور میں آغا سہیل نے ہمیں کراچی کی ادبی فضا کے بارے میں اشارتاً کچھ BRIEF کر دیا تھا۔ اور اپنے گھر سے ٹیلیفون لگا کر محمد علی صدیقی سے بات بھی کرا دی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ محمد علی صدیقی صرف ڈان کے کالم نویس، بیدار ذہن اور روشن ضمیر صحافی ہی نہیں ہیں بلکہ ادب پر ان کی خاصی گہری نظر ہے اور ان کے تنقیدی مضامین سے ان کے صحت مند VISION کا سکہ بھی بیٹھ چکا ہے مگر ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ٹیلیفون پر اتنی بھاری بھرکم آواز میں بولنے والا محمد علی اتنا نرم اور گداز ہے اتنا سادہ اور دلنواز ہے اتنا خلیق اور مہربان

بامروّت اور متوازن ہے کہ متوازن ہونا بڑا مشکل فن ہے کہ ہمارے یہاں بہت سے لوگ اس نعمتِ خداداد سے محروم ہیں کیونکہ یہ دولت اگر نہ ہو تو آدمی باقرمہدی بن جاتا ہے۔ (مجھے معلوم ہے میرے لکھے کا باقرمہدی برا نہ مانیں گے کیونکہ وہ غیر متوازن ہوتے ہوتے بھی کچھ لوگوں کے لئے بہت پیارے ہیں)

کراچی میں چودہ پندرہ اور سولہ جون ہمارے لئے بڑے اہم تھے۔ انہیں دنوں میں آنندی کے خالق غلام عباس سے میری ملاقات ہوئی۔ غلام عباس مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں۔ ہم نے انھیں لوگوں کو پڑھ کر سر دُھنا ہے اردو افسانہ کو جس تقدیس کے ساتھ طنز کی تہذیب ان بزرگوں نے بخشی ہے وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ عباس صاحب کے گھر پر میری انور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ممکن ہے لوگ انور کو بھول چکے ہوں۔ مگر یہ وہ نام ہے جس نے کسی زمانے میں دو ہی تین سہی مگر بڑے بانکے افسانے لکھے ہیں۔ انور صاحب سے جب میں نے ان کے افسانوں کا ذکر کیا تو وہ حیرت میں پڑ گئے۔ اور تڑپ کر بولے "آپ مجھے جانتے ہیں؟ آپ نے مجھے پڑھا ہے۔؟"

عباس صاحب نے ہمیں اپنے افسانوں کے مجموعے جاڑے کی چاندنی سے نوازا۔ ان کے ہاتھ کی لکھی کتاب پر دو سطریں اور ان کی دستخط میرے لئے ایک بیش بہا انعام ہے۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

۱۴ / جون کو ہماری ملاقات کراچی کے مشہور آرٹسٹ آزر زوبی سے ہوئی۔ جن لوگوں نے سن ۵۸ کے آس پاس کراچی سے نکلنے والے ایک خوبصورت اور معیاری سہ ماہی شعور کو دیکھا ہے وہ اس کی تزئین سے ضرور متاثر ہوں گے۔ آزر صاحب اپنے اسٹوڈیو میں تھے وہاں ہم نے ان کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں دیکھیں۔ انھوں نے ہمیں اپنی دراز سے سعادت حسن منٹو کے ہاتھ کا لکھا ان کے افسانے کا ایک مسودہ بھی دکھایا۔ اور شعور کی چند پرانی کاپیاں بھی عطا کیں۔

اسی روز ہم شوکت صدیقی سے ملے۔ شوکت صدیقی جو کبھی لکھنؤ میں ہوتے تھے اور انھوں نے تا نتیا لکھا تھا اور جو راتوں کو دو دو بجے تک کمال احمد صدیقی کے ساتھ امین آباد سے رکاب گنج اور رکاب گنج سے امین آباد کے چکر لگا کر ایک دوسرے کو اس کے گھر پہنچایا کرتے تھے ——— لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں "چُگّی بازی" کا لفظ شوکت صدیقی نے ہی چلایا تھا۔ بھیّا شوکت صدیقی اب جبکہ تم کراچی کے ایک پرسکون علاقے میں اپنی کمائی کے کشادہ مکان میں بیٹھ کر خدا کی بستی لکھ رہے ہو اور تمہارے وجیہہ چہرے پر گھنی اور موٹی موٹی بھنوں کے بال سفید ہونے لگے ہیں تو اے شوکت بھائی تمہارا ایجاد کیا ہوا وہ معصوم سا لفظ اب جوان ہو گیا ہے۔ اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ اردو ادب میں اب انٹرنیشنل چگی باز بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ اور وہ فکشن جسے تم لوگوں نے اپنی بصیرت اور شعور کا خون دے کر پالا پوسا تھا وہی فکشن اب ان انٹرنیشنل چگی بازوں کے گھر کے غسل خانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ان چگی بازوں نے ادب کے بڑے بڑے ڈگری یافتہ انجینیروں کو خرید لیا ہے جو اپنے مالک کے غسل خانے میں رنگ بھر رہے ہیں اور چگی باز ان زر خرید انجینیروں کو منہ مانگے معاوضے دے رہا ہے۔ بھیّا شوکت اب ان چگی بازوں کو صاف نظر آ رہا ہے کہ زبان تو ختم ہو ہی چکی تھی اردو ادب کا بھی چل چلاؤ ہے کہ یہ بے چاری اب صرف ریاستی اردو اکاڈمیوں کے نام نہاد سکریٹریوں کے کھونٹے میں پڑا رہ گیا ہے ——— اس لئے ——— اس لئے جس قدر ممکن ہو سکے کما لو۔ جہاں سے بھی جیسے بھی مل سکے گھسیٹ لو۔ افسوس قدرت نے سب کو سب کچھ نہیں دیا ہے مگر جس کو جو دیا ہے وہ اسی سے کام نکال رہا ہے۔ بھیّا سب بہت ہوشیار ہو گئے ہیں ——— ادب نے جن لوگوں سے کمایا وہ تو بھوکے مر گئے۔ پریم چند کرمچ کا جوتا پہنتے تھے اور بیڑی پیتے تھے۔ کچھ نے ادب کو کما کر دیا اور کچھ ادب سے کما رہے ہیں۔ جو ادب ساز تھے وہ بھلا دیے گئے۔ جو ادیب ساز ہیں ان کا بول بالا ہے۔ اس لئے . . . .

ادھر نہ دیکھو
جو کج کلاہ صاحبِ حشم تھے
جو اہلِ دستار محترم تھے
ہوس کے پُرپیچ راستوں میں
کلاہ کسی نے گرو رکھ دی
کسی نے دستار بیچ دی ہے ——— فیض احمد فیض

یہ پندرہ جون کی رات ہے ڈان کے ایڈیٹر احمد علی خاں صاحب اور ان کی بیگم ہاجرہ مسرور نے ہمیں کھانے پر بلایا ہے ۔ ہم ایک چائنیز ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ہمارے ساتھ محمد علی صدیقی حسن عابد اور راحت سعید بھی ہیں چائنیز کھانے میز پر لگے ہیں۔

" ہاجرہ صاحبہ آپ نے ہمیں جو عزت بخشی اور جو وقت دیا اس کے لئے تو ہم آپ کے شکرگزار ہیں لیکن ایک سوال بار بار کرنے کو جی چاہتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ آپ نے لکھنا کیوں بند کر دیا "

" اچھا ہوگا کہ یہ سوال نہ کیجئے اور کھانا کھائیے "

ہم نے کھانا کھایا رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ شام اچھی تھی۔ کھانا غنیمت تھا۔ احمد علی خاں مہربان تھے۔ ہاجرہ میزبان تھیں اب اس کے بعد اور کیا چاہئے تھا۔

محمد علی صدیقی کو خبر ملی کہ عتیق اللہ بھی ہندوستان سے آتے ہوئے ہیں اور یارانِ طریقت میں شرفِ باریابی چاہتے ہیں ۔

غرضیکہ عتیق اللہ لائے گئے اب ہمارے پروگراموں کی لے تیز ہو گئی تھی۔ افسانہ نگار اور نقاد ایک ساتھ مل کر جلسوں میں یلغار کر رہے تھے۔ میں اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر گلشنِ اقبال میں حسن عابد کے گھر پر ڈیرا ڈال چکا تھا۔ جون ایلیا اور زاہدہ حنا اب ہم سے زیادہ قریب ہو چکے تھے۔ ہائے سبط اختر ۔ وائے سبط اختر ، تم کہاں ہو؟

جون ایلیا —— زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا —— زاہدہ حنا (کاش ہم پہلے ملے ہوتے)

عجیب شاعر ہے ! عجیب انسان ہے ۔ جون ایلیا ۔ پہلے اسکا ایک شعر سن لیجئے نہیں تو کھو جاتے گا خیالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ۔

شعر یوں ہے :

نظر پہ بار ہو جاتے ہیں منظر جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو

دبلا پتلا بے قرار سایہ شاعر آنکھوں میں ذہانت کی چمک پیار بھرا لہجہ ، درد مندی سے بھرا دل ، دن دن بھر ہم دونوں ساتھ رہے۔ کئی شامیں ہماری ساتھ گزریں۔ کبھی اس کے گھر پر کبھی حسن عابد کے ڈرائنگ روم میں قالین پر دراز ہیں۔ دونوں خاموش ہیں مگر دونوں جیسے کچھ بول رہے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے جتنا کچھ بولنا ضروری تھا اتنا کچھ ہم بغیر بولے بول رہے تھے۔ سمجھ رہے تھے اور متاثر ہو رہے تھے ایک دوسرے سے ۔ جون کا ایک شعر اور یاد آ گیا :

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے میں دستاویز پر لکھا ہوا نہیں ہوں

جون کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک لمحہ کو بھی خود سے مکر نہیں پایا ہے ۔ وہ جس خمیر سے بنا ہے وہ اس وصف سے خالی ہے ۔ یہ تنہا شخصیت ہجرت کا بدتر المیہ ہے ۔ بھیا جون تمہاری خدمت میں اپنے بزرگ محترم رئیس امروہوی کا ایک مصرع نذر کرتا ہوں ؎

صرف تخلیق علاجِ غمِ تنہائی ہے

۱۶ ؍ جون شام ۶ بجے کراچی پریس کلب میں جلسہ ہوا ۔ کہتے ہیں اس کلب میں ہر کس و ناکس کے لئے جلسہ نہیں ہوتا ۔ ہم نے اپنا ایک افسانہ پڑھا عتیق اللہ نے ہندوستان میں اردو افسانے پر تقریر کی ۔ جلسہ کی صدارت چھابڑہ صاحب کر رہے تھے ۔ بھارت کی کونسلیٹ کے فرسٹ سکریٹری وشوناتھن صاحب موجود تھے ۔ چھابڑہ صاحب کہہ رہے تھے ۔

" ہم جرنلسٹوں نے اپنے خون کی قربانیاں دے کر پریس کلب کو ایک آزاد مملکت کا درجہ دلایا ہے آپ حضرات یہاں بلا تکلف پوری آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں "

جلسہ کے خاتمہ پر دوشیزہ اور پندرہویں صدی ڈائجسٹ کے چیف ایڈیٹر سہام مرزا صاحب ہم لوگوں کو لینے کے لئے آ گئے ۔ جون ، زاہدہ ، راحت ، حسن عابد ، محمد علی صدیقی وغیرہ کا قافلہ ہمارے ساتھ گاڑیوں میں بھر کر چلا ۔ چرغے کی دکان پر گاڑیاں کچھ دیر کو رکیں۔ سہام مرزا صاحب نے اپنے گھر پر ایک پر تکلف ڈنر کا انتظام کیا تھا ۔ گرم گرم چرغہ موٹر میں رکھوایا گیا ۔ مرزا صاحب کی بیگم صاحبہ نے جس محبت سے کھانے کا اہتمام کیا تھا اور خلوص سے مہمان نوازی فرمائی اس کو میری بیگم تو اکثر یاد کرتی ہیں ۔ ہم ڈھیر سارے ڈائجسٹ اپنے ساتھ لائے

بھارت میں ہاٹ کیک کی طرح پسند کئے جاتے ہیں ۔

ہمارے سارے پاکستانی عزیز ہم سے ناخوش تھے۔ ہم نے ان سے لاکھ لاکھ کہا کہ حسن عابد ہمارا یار جانی ہے، ہم پاکستان میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے وہ غریب اہمارا پی۔ آر۔ او بنا ہوا ہے اور ہماری اتنی توقیر بڑھا رہا ہے اور یہ اسی کی ذات کا تبرک ہے کہ ہم پاکستان کے ادبی جلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے ہیں مگر ہماری یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی وہ لوگ یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ ہم پاکستان میں ان کے علاوہ کسی اور کو بھی وقت دے سکتے ہیں ۔

ایک شام، کلفٹن کا ویران اور مغموم ساحل۔ سمندر کی ہوائیں، زاہدہ، جون، حسن، محمد علی اور ہم۔ زاہدہ تم اداس کیوں ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ تم ایسے ملک میں رہ رہی ہو جہاں صبح تا شام لاکھوں بار خدا اور رسول کا نام لیا جاتا ہے۔ جہاں ٹی وی پر اذانیں گونجتی ہیں، جہاں لاکھوں قرآن شریف روز ختم کئے جاتے ہیں۔ اور جہاں ——— اور جہاں بازار میں فٹ پاتھ پر رکھی ہوئی پینے کے پانی کی ٹنکیوں پر دھرا ہوا المونیم کا چھوٹا سا ڈونگا لوہے کی زنجیر سے باندھ کر رکھا جاتا ہے کہ مبادا کوئی اٹھا نہ لے جائے۔ صدیوں کی انسانی تہذیب نے کیا کیا؟ ایک ڈونگا بھی آزاد نہ کرائی۔

زاہدہ یہ ڈونگا کب آزاد ہو گا ——— پلیز زاہدہ !

۲۱/جون ——— مہران رائٹرس گلڈ۔

حضرت رئیس امروہوی۔ حضور آپ کے دیدار کی بڑی تمنا تھی ——— خوشا یہ وقت آپ کے قدموں میں بیٹھنے کا ارمان پورا ہوا۔

شان الحق حقی۔ (بہت دنوں سے ہم آپ کا نام پڑھ رہے تھے جناب۔ ان خوبصورت تحریروں کے خالق سے آج ملاقات بھی ہو گئی)

اختر فیروز۔ عالیہ امام۔ پار تھا سارتھی اور بہت سے لوگ۔ لان میں لگی ہوئی کرسیاں۔ چہرے، بہت سے چہرے۔ بہت سا پیار۔ قرآن خوانی، استقبالیہ تقریر، افسانہ، شاعری اور عتیق اللہ کی تقریر۔ بھارت میں کیا ہو رہا ہے۔ اردو کا کیا حال ہے۔ ادبی رجحانات کیا ہیں؟

ڈاکٹر شاہد الوری۔ ایک خوبصورت فریم میں جلسہ کا قطعہ تاریخ ہمیں پیش کر رہے ہیں۔ ان سادہ لوح پیاروں کی محبتوں کا ہمارے پاس کیا کوئی جواب ہے؟ تصویریں کھنچ رہی ہیں ۔

۲۲/جون ——— سعیدہ گزدر ——— کی رہائش گاہ ——— ایک سادہ سی ملاقات۔

سعیدہ صاحبہ آپ کی کھلی کھلی، آنکھوں میں کس درد کا پڑاؤ ہے جس نے آپ کی پوری شخصیت کو ایک وقار بخش دیا ہے ۔

۲۳/جون ——— رمضان شروع ہو چکے ہیں۔ عالیہ امام نے ہم سب کو افطار اور جلسہ کی دعوت دی ہے۔ پاکستان کا رمضان ہمیں یہ دیکھ کر کچھ حیرت بھی ہوئی اور کچھ خوشی بھی کہ پاکستان کا ہر مسلمان افطار کرتا ہے۔ عالیہ کی قیام گاہ پر جلسہ۔ عالیہ نے عہد کر رکھا ہے کہ وہ لکھنؤ والے اقبال مجید کو نہیں پہچانیں گی۔ لکھنؤ یونیورسٹی حضرت گنج ریڈیو اسٹیشن، احتشام حسین کے مکان پر ادبی جلسے کسی تعلق سے بھی نہیں پہچانیں گی ——— عالیہ نے اچھی تقریر کی۔ مقرر وہ ہمیشہ سے اچھی ہیں ۔

اور پھر دوسرے دن کی شام۔ شان الحق صاحب نے کراچی بوٹ کلب میں ہمیں ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ وہ ہمیں گاڑی میں لے کر بوٹ کلب میں داخل ہو چکے ہیں۔ مگر کچھ پریشان پریشان سے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔

"حقی صاحب کیا معاملہ ہے۔ آپ کچھ ......"

"ہاں بھائی ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔" وہ دھیمے سے بولے۔ "میں بھولے سے چپلیں لے کر آگیا ہوں اور کلب میں اس کی اجازت نہیں۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر لگی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور اپنی چپلیں درگملوں کے پیچھے چھپا دیں کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ افطار کا وقت ہو چکا تھا۔ ایک اٹنڈنٹ آیا۔ حقی صاحب نے اسے بتایا کہ کھانا کھانا ہے مگر پہلے کچھ ٹھنڈا ہو جائے۔ اٹنڈنٹ نے وضاحت کی کہ آٹھ بجے سے پہلے کوئی سروس ممکن نہیں ہے کیونکہ ابھی بیرے روزہ افطار رہے ہیں ——— حقی صاحب ہم لوگوں کو لے کر اٹھے گاڑی میں بٹھایا اور جم خانہ کلب لے آئے۔ بیرے سے کہا ان لوگوں کو ٹھنڈا پلاؤ اور خود موٹر لیکر اپنی چپلوں سے گلو خلاصی کرنے گھر چلے گئے جب تک ہم لوگوں نے کوک لیا شان الحق صاحب جوتے پہن کر آ گئے۔ آٹھ بجے جب ہم لوگ بوٹ کلب میں ڈنر لے رہے تھے حقی صاحب اپنی پہیلیاں سنا رہے تھے۔ امیر خسرو کی پسندیدہ اس صنف کو آج لوگ بھلا چکے ہیں۔ حقی صاحب کی پہیلیوں سے مزہ آگیا۔

کراچی کی آدھی آبادی راحت سعید نامی ایک آدمی کو تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کراچی جانے والوں کو ان کی زیارت ضرور کرنا چاہئے۔ اس کے کئی فائدے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ان کے پاس جتنی بڑی گاڑی ہے اتنا ہی بڑا اخلاق اور خلوص بھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان سے یہ خطرہ بالکل نہیں ہے کہ کچھ سنائیں گے۔ نہ تو افسانہ نہ شاعری اور نہ تنقید۔ انھوں نے ساری آلائشوں سے اپنے کو محفوظ رکھا ہے۔ تیسری خوبی ان میں یہ ہے کہ یہ ایک بہت ہی خلیق اور مہربان بیوی کے شوہر ہیں جو بہت اچھے اچھے کھانے تیار کرتی ہے اور چہرے پر شکن لائے بغیر کھلاتی ہے۔ آخری بات یہ کہ پی۔ آئی۔ اے میں ایک ذمّہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ اس لئے ہر وقت آپ پر مسلّط بھی نہیں رہتے۔ اس کے علاوہ بھی ان میں لاتعداد خوبیاں ہیں ایک بار مل کر دیکھئے۔ آزمائش شرط ہے ——

کراچی کے اردو اخبارات کے بارے میں اپنا تاثر بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اخبارات کی کتابت اور طباعت وغیرہ تو بہترین رہتی ہی ہے اس کے ساتھ ان کا رنگ و روپ بھی بڑا پُرکشش ہوتا ہے۔ علمی ادبی اور ثقافتی خبریں باقاعدہ ہفتہ وار چھپتی ہیں اور اخبار کا خاصا حصّہ تصاویر سے مزیّن ہوتا ہے۔ ہمارے جلسوں کی روداد وں تصاویر اور انٹرویوز کی تعداد دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کراچی کا اردو پریس بھارت سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کی پذیرائی بڑے خلوص سے کرتا ہے —— جوگندر پال، رام لعل، ڈاکٹر محمد حسن، قاضی عبدالستار اور قمر رئیس وغیرہ ہم سے پہلے یہاں آچکے تھے اور اخبارات کی زینت بن چکے تھے۔ افتخار امام ان دنوں کراچی میں ہی پچھلے ایک آدھ ماہ سے موجود تھے اور اپنے ثقافتی دورے میں مصروف تھے۔ افتخار امام دُھن کے پکے آدمی ہیں اعجاز صاحب کی یہ یکسوئی انھیں ورثے میں حاصل ہوئی ہے۔ کراچی میں صہبا لکھنوی صاحب کا افکار اور بمبئی میں شاعر پابندی سے نکل رہا ہے۔ صہبا صاحب قابلِ تعریف ہیں لیکن اعجاز صاحب کے بعد شاعر کو زندہ رکھنا یقیناً افتخار صاحب کی لگن کا نتیجہ ہے جو بھارت میں اور بھی دشوار ہے۔ جہاں بہت سے پرچے نکل نکل کر بند ہو چکے ہیں۔ صہبا صاحب سے مل کر جی بہت خوش ہوا۔ وہ تن تنہا پرچہ قائم رکھنے کا جان لیوا کام کر رہے ہیں آفرین ہے ان کے حوصلے اور ارادے پر۔ کراچی میں ان کا دفتر ایک انجمن بن کر رہ گیا ہے۔ بھارت سے آنے والے ادیب یہاں بھی ایک لمحہ قیام کر کے اور ایک پیالی چائے پی کر یا سیخ کباب کھا کر آگے بڑھتے ہیں (مجھے تو صرف چائے ملی تھی)

مظہر جمیل صاحب کے مکان پر ایک شام

چورنگی پر نہاری اور سفید سفید خستہ روٹیاں۔

محمد علی صدّیقی کا فاروق ہوٹل میں گرم گرم تکّہ۔

ایک بجے رات عتیق اللہ نے ہم سبھوں کی تصویریں کراچی کی سڑکوں پر کھڑے کر کے کھینچیں —— پتہ نہیں وہ تصویریں ہمیں کب ملیں گی

۲۸ جون کی اُداس رات —— لسبیلا پر یاروں سے گلے لگے

کل واپسی ہے۔

واپسی

کیسے پیارے پیارے لوگ چھوٹ رہے ہیں۔

یہ ہوشمند لوگ۔

یہ زندہ لوگ۔

یہ محبتوں کے بیکراں سمندر میں ڈوبے ہوئے لوگ۔

یہ لوگ وہاں بھی ہیں اور یہاں بھی۔

یہ اُداس اور چوٹ کھائے ہوئے لوگ۔

یہ اپنی آنکھوں میں مستقبل کے چھلکتے ہوئے نرم نرم خوابوں کو بساتے لوگ۔

یہ اپنی صلیبوں سے اتر کر خائف اور بے دم سے لوگ۔

یہ لوگ وہاں بھی ہیں اور یہاں بھی۔

یہ اپنی انا میں جلتے سلگتے اور ناراض ناراض سے لوگ۔

(باقی صفحہ ۱۱۹ پر دیکھئے)

حمید الماس

اجنبی سائے

سب لہو میں تر بہ تر ہیں
اجنبی سائے جو میرے ساتھ آئے ہیں
مری تنہائیوں کی ناتواں آنکھوں پہ شاید بار ہوں سائے
یہ ریگِ بد دُعا ہیں یا
غبارِ رہزنی ہیں یا
وہ تارے ہیں
جو نکلے ہیں فلک کی سلطنت سے برطرف ہوکر
یہاں محفوظ ہیں
ان کی دریدہ سی قبائیں
بند دروازے کے پیچھے
میں اکیلا رو رہا ہُوں
اور سارے لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں
اُس طرف

ہم آزاد ہیں

جہاں میں ہوں وہیں
وہیں میرے مقابل میں
کوئی نوحہ کناں ہے
سوچتا ہوں
میں اُسے لپٹا کے سینے سے
تسلی دوں
بجھا دو شعلۂ آہ و فغاں کو
سرد آہوں سے
نشیلی رُت ہے
پلکیں نیند سے بوجھل ہیں
رگ رگ میں
سرایت کر رہا ہے رات کا جادو
گراں ہے نیم خوابی
بڑھ رہا ہے میری جانب رینگتا سایہ
وہ میرا گم شدہ مہتاب ہے یا
میرا ثانی ہے۔

ڈور نمبر - ۱۳۵۵، ہاؤسنگ بورڈ کوارٹرس فوان بلاک، جیا نگر، بنگلور ۱۱

متوازی لکیریں

اوم کرشن راحتؔ

۱۵۲/ایل ۵ - فرید آباد ٹاؤن شپ ۱۲۱۰۰۱

میں جب پہلے روز اپنے نئے کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلی تو میرے کانوں میں پچھلے ہفتے ہوئے انٹرویو لینے والے افسر کے فقرے گونجنے لگے "کام بہت مشکل ہے۔ تم کو کتنی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جنسی مریضوں سے مل کر ان کی بیماریوں کی تہہ تک پہنچنا اتنا آسان نہیں۔ ایک لڑکی ہونے کے ناطے یہ کام اور بھی دشوار ہے۔ ہاں ایک بات تمہارے حق میں جاتی ہے کہ تم ڈاکٹری کا امتحان دے کر آئی ہو" شاید افسر کو وہ سفارشی چٹھی یاد آگئی تھی جو میں انٹرویو سے ایک روز پہلے اس کے گھر دے کر آئی تھی۔

میں کل رات ہی سے ان فارموں کا مطالعہ کر رہی تھی جنھیں مجھے مریضوں سے ملنے کے بعد پُر کرنا تھا۔ میں انھیں پڑھ پڑھ کر ہی پریشان ہو رہی تھی۔ کارپوریشن کو یہ کام مرکزی سرکار نے سونپا تھا۔ مرکزی سرکار کو اس سروے کے آنکڑے اگلے تین مہینوں میں مطلوب تھے کیوں کہ اسے یو۔ این۔ او کی جانب سے جنسی بیماریوں کی روک تھام اور علاج کے لئے بہت بڑی رقم ہاتھ لگنے کی اُمید تھی اور مجھے اس جھونپڑیوں کے پھیلے سمندر کو کھنگالنا تھا جو بڑی بڑی بلڈنگوں کے متوازی حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔

میرے ساتھ دو ڈاکٹروں اور ایک چپراسی کی تقرری اور بھی ہونا باقی تھی لیکن فی الحال یہ کام مجھے آج ہی سے اکیلے شروع کرنا تھا۔ چلتے چلتے میرے قدم بار بار رک رہے تھے لیکن میں اپنی ہمّت بٹورتی ہوئی اس اتھاہ سمندر کے کنارے پہنچ گئی جہاں سے مجھے اپنی زندگی کی کشتی کے بادبان کھولنے تھے۔ میرے جھجکتے ہوئے ایک جھونپڑے کی طرف قدم بڑھاتے۔ اندر سے کوئی عورت زور زور سے چلّا چلّا کر کہہ رہی تھی "اری بول حرام زادی۔ کہاں سے خرید لائی ہے یہ بیماری۔ سب دھندا چوپٹ ہوگیا اب کہاں سے کراؤں گی تیرا علاج۔ یہاں تو روٹی تک کے لالے پڑے ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے تو تیری قیمت چکائی تھی۔ بلّا اب سوّر کے بچّے پیدا کر۔ کیسے حرامی ہاتھ پر ہاتھ مار کے چھ سو روپے لے گیا۔ اپنی بہن کا یار کہتا تھا کنواری ہے۔ کنواری ہوتی تو لالہ اپنے دو سو روپے واپس مانگنے نہ آتا۔ کُتّے کی اولاد بیماری کی پوٹلی پھینک گیا ہے میرے یہاں۔ اب پڑی سڑتی رہ۔ مجھ سے نہیں ہوگا تیرا علاج۔ میں اپنا پیٹ پالوں کہ تیرے لئے دوا دارو جُٹاؤں" وہ عورت چلّانے کے ساتھ ساتھ کسی کو پیٹے بھی جارہی تھی۔

یہ باتیں سُن کر میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ اِردگرد کی جھونپڑیوں والے اس مارپیٹ اور گالی گلوچ سے بے نیاز اپنے روزمرّہ کے کاموں میں مشغول تھے۔ کسی کو اس مارپیٹ اور بُڑھیا کے چلّانے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں یہیں سے لوٹ جاؤں۔ میں سوچنے لگی کہ خواہ مخواہ میں نے نوکری کرلی۔ پچھلے دنوں کارپوریشن والوں کا اشتہار دیکھ کر میں نے درخواست بھیج دی تھی۔ ڈاکٹری کے امتحان کا نتیجہ نکلنے میں کچھ مہینے باقی تھے۔ گھر میں بے کار پڑے رہنے سے نوکری کر لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر درخواست دے دی تھی اور میرے ماموں کہیں سے سفارش بھی ڈھونڈ لاتے تھے۔ اور مجھے اپنی اُمید کے برعکس نوکری مل بھی گئی تھی۔ میں ہمّت کر کے جھونپڑے میں داخل ہوگئی۔ کچّی دیوار پر لگے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر میں پریشان ہوگئی۔ میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میری آنکھوں سے شاید ایک آدھ آنسو بھی بہہ نکلا تھا کیونکہ کاجل میرے گالوں پر ایک خفیف سی لکیر چھوڑ گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور آئینے کے بغل والے دروازے سے میں دوسرے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ایک بُڑھیا جس کے اوپر کا جسم بالکل ننگا تھا اپنی پھٹی پرانی دھوتی کو اپنی مرجھائی ہوئی چھاتیوں پر لپیٹ کر قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "کون ہو تم یہاں کس لئے آئی ہو؟" میں بغیر جواب دئے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی جھونپڑے کے دائیں کونے میں دبکی بلک رہی تھی۔ سامنے دیوار پر

ہنومان کی چھوٹی سی تصویر لگی تھی، اور تصویر کی بغل میں کھونٹی پر پیلے رنگ کی ریشمی قمیض اور نیلے رنگ کی جینز لٹک رہی تھی جہاں وہ لڑکی دبکی بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ہی چولہے میں ایک لکڑی سلگ رہی تھی۔

بڑھیا پھر چلائی "کون ہو تم۔ کیا کام ہے تمہیں۔ یہاں کس لئے آئی ہو؟"

میں نے جھونپڑے کے دوسرے کونے میں بچھے ٹاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا "میں ڈاکٹر ہوں"

یہ سنکر بڑھیا کا غصہ قدرے کم ہوا۔ اس نے ہنومان کی تصویر کی طرف دیکھا جیسے میرا اچانک وہاں پہنچ جانا اسی کی کرپا سے ہو جیسے بھگوان نے اس کی فریاد سن لی ہو۔ اپنے جذبات پر قابو پاکر وہ پھر رُکھائی سے بولی "تم کو کس نے بھیجا ہے ادھر۔ تم کو ہمارا کیسے پتہ چلا"

"میں تم لوگوں کے دکھ درد ہی تو دور کرنے آئی ہوں" میں نے ملائمیت سے کہا "میں ڈاکٹر ہوں"

یہ سنتے ہی اس نے میرے پیر پکڑ لئے اور لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر جی اسے جلد ٹھیک کر دو، میری تو اب یہی جمع پونجی ہے یہ ٹھیک نہ ہوئی تو ہم بھوکوں مر جائیں گے"

"کیا ہوا ہے اسے" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"وہی ڈاکٹر جی وہی، جو پیشہ کرانے والیوں کو اکثر ہوتا ہے"

"یہ تمہاری بیٹی ہے کیا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

"کہاں ڈاکٹر جی میرے تو دو بیٹے تھے، دونوں سیانے ہوئے تو کپڑا مل میں کام کرنے لگے ادھر ڈیڑھ سال سے ملوں میں ہڑتال چل رہی ہے اور ان کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ لڑکوں کے بجائے لڑکیاں ہوتیں تو اسے کیوں مول لیتی" وہ پھر اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

ایک دن صبح سویرے جب میں اس خون اور پیپ کے سمندر میں اتری تو کمیٹی کے نل کے پاس ایک آدمی منجن کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر زور سے کھانسا اور جب میری نظر اس کی طرف اٹھی تو اس نے زمین پر تھوکتے ہوئے سامنے جھونپڑے کے باہر بکری باندھتے ہوئے شخص سے مخاطب ہو کر کہا "آگئی صبح صبح۔ یہ سالی کبھی شام کو تو آتی نہیں ورنہ محبت کے دیوتا کا پرشاد اسے بھی چکھا دیتے" ان جملوں نے مجھے پریشان کر دیا اور میں گلی کی نالی کے گندے پانی سے بچتی اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی تو وہ دونوں آدمی قہقہہ مار کر ہنس دیے اور میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔

اسی طرح میں ہر روز تھکی ہاری۔ روہانسی گندی گالیوں اور دکھ درد کا پلندہ لے کر گھر پہنچتی۔ ہر روز میں دوسرے دن کام پر نہ جانے کا تہیہ کرتی۔ میں سوچتی جیسے سارے کا سارا ملک ایک بڑا ہسپتال ہے جس میں دکھ ہیں، بیماریاں ہیں، درد ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ کچھ دنوں بعد میں نے بہت پریشان ہو کر اپنی ماں سے کہہ دیا "ماں میں نے یہ نوکری جاری رکھی تو میں ذہنی مریض بن جاؤں گی۔ مجھ سے زندگی کا گھناؤنا پن اور نہیں دیکھا جاتا" اور میں ماں کے سینے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ میں ڈاکٹری کے آخری سال میں پڑھ رہی تھی کہ پتا جی کا انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں جو جمع پونجی تھی ان کی طویل بیماری میں صرف ہو چکی تھی۔ جیسے تیسے ماں نے ایک سال تک میری پڑھائی کو جاری رکھا۔ میرے تین چھوٹے بہن بھائی اب میری ہی طرف دیکھ رہے تھے اور میں جلد سے جلد گھر کی اقتصادی حالت کو مزید بگڑنے سے بچانا چاہتی تھی۔

ماں کے سمجھانے بجھانے پر میں نے ایک دن پُر شدہ اور خالی فارموں کا پلندہ افسر کی میز پر رکھ کر اپنا استعفیٰ تھماتے ہوئے کہا "سر آپ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ یہ کام بہت مشکل ہے اور ایک لڑکی ہونے کے ناطے ــــ"

"ہاں بیٹی یہ کام متوسط طبقے کے خاندانوں کی لڑکیوں کے بس کا نہیں۔ تم کسی دن بھی آکر اپنی سترہ دنوں کی تنخواہ لے جانا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم یہ کام نہیں کر پاؤ گی وہ تو تم سفارش ہی ایسی ڈھونڈ لائی تھیں کہ میں انکار نہ کر سکا" افسر نے پُر شدہ فارموں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

تین مہینے بعد میرے امتحان کا نتیجہ نکلا۔ میں اپنے کالج میں اوّل نمبر پر آئی تھی۔ ماں کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق آگئی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کا روٹھا ہوا کھلنڈرا پن شاید پھر من گیا تھا اور وہ گھر کے آنگن میں ان کے ساتھ کھیلنے کے لئے لوٹ آیا تھا۔ میرے ماموں جب یہ خوشخبری لے کر ہمارے ہاں آئے تھے تو ساتھ ہی شہر کے بہت بڑے کلینک میں میری پارٹ ٹائم تقرری کا خط بھی لائے تھے۔ یہ کلینک شہر کے نئے ابھرتے ہوئے POSH علاقے میں تھا۔ اس علاقے نے ہماری نظروں کے سامنے دھرتی سے سر نکالنا شروع کیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کو چھونے لگا تھا۔ فلیٹ نئی نویلی دلہنوں کی

طرح سجنے سنور نے لگ گئے تھے اور چمکیلی کاروں والے نئے نئے رئیس لوگ وہاں آ کر بس بھی گئے تھے۔ ہم کالج آتے جاتے راستے میں اس علاقے کو دیکھ دیکھ کر اکثر حیران ہوا کرتے تھے کہ آخر دیہ ان لوگوں کے پاس آتا کہاں سے ہے یہ اخبار وں والے ملک کی کون سی غریبی کا رونا رویا کرتے ہیں۔ ہزاروں فلیٹوں کا کئی کئی لاکھ روپوں میں بک جانا اور چلکیوں میں جدید ساز وسامان سے لیس ہو جانا یہ سب ہماری فہم سے بالاتر تھا جس طرح یہ فلیٹ ہماری دسترس سے باہر تھے۔

ہسپتال کی انٹرن شپ کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر جب میں پارٹ ٹائم نوکری کے لئے اپنے ایئر کنڈیشنڈ کلینک میں پہنچتی تو میری ہسپتال کی تھکن یوں دور ہو جاتی جیسے بارش ہونے کے بعد پیڑوں سے گرد وغبار دھل جاتا ہے۔ نئے پودے کی طرح مجھ میں زندگی عود کر آتی۔ یہاں ایسے مریض آتے جو بیمار ہوتے ہوئے بھی بیمار نہ ہوتے بلکہ ایسا لگتا جیسے تفریح طبع کے لئے یا نرسوں کے چہرے کی شگفتگی کا لطف اٹھانے کے لئے ادھر بھی نکل آتے ہوں۔ سر درد، دل کی دھڑکن کم خوابی اور زکام جیسی چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے لئے وہ بے دریغ پیسہ پھینک کر چلے جاتے۔ لڑکیاں اپنی ماؤں کے ساتھ اپنے جسم کے اعضا کی پرابلم لیکر آتیں جیسے وہ میڈیکل کلینک نہ ہو بلکہ بیوٹی سلون ہو۔ سُرخ سُرخ چکنے گالوں، بدلیتی سینٹوں سے مہکتی مائیں اپنی جوان بیٹیوں سے بھی زیادہ دلکش دکھائی دیتیں۔ خاص معاملات میں میری فیس دے کر اپنے ہاں بلوا کر کہتیں "ڈاکٹر جی ذرا دیکھئے اسے۔ دو مہینے اوپر ہو گئے ہیں۔ میں نے کئی بار پوچھا ہے کہ اگر کچھ ایسی ویسی بات ہے تو صاف صاف مجھے بتا دے۔ یہ میری تو سنتی نہیں آپ ہی پوچھ دیکھئے اس کے پتا جی کو پتہ چل گیا تو ——— ویسے تو وہ بہت آزاد خیال کے ہیں لیکن ڈاکٹر جی یہ ہماری بلڈنگ والے باقی لوگ بہت کمینے ہیں ان کے کان میں بھنک پڑ گئی تو اس کی شادی میں تھوڑی سی مشکل آ پڑے گی۔" اور ایسی باتیں سُن کر میں حیران رہ جاتی۔

ایک شام جب میں ایک ایسے ہی مریض کو دیکھنے کے لئے بلڈنگ میں گئی تو اندر سے آ رہی آوازوں نے میری روح کو جھنجھوڑ دیا۔ بہت پہلے سُنے ہوئے جملے یہاں بھی اسی طرح دہرائے جا رہے تھے۔

"کہاں سے خرید لائی ہے یہ بیماری، اگر تیرے بھیا کو پتہ چل گیا تو گھر سے نکلنا بند کر دے گا، ہزار بار منع کیا ہے کہ آوارہ لڑکوں کے ساتھ نہ گھوما کر سچ سچ بتا یہ بیماری کہاں سے لگا لی ہے۔ میرا خیال ہے وہ جو آتا ہے انکم ٹیکس کمشنر کا لڑکا اپنی کار میں تجھ سے ملنے، یہ اسی کی کار

"نہیں ——— وہ نہیں ہے ممی" کسی نے غصے سے کہا۔

"تو اور کون ہے۔ سچ بتا دے بیٹے کون ہے وہ۔ بتا دے میری اچھی بیٹی" عورت بولی۔

"وہ ——— کالرا انکل ہیں نا ———"

"بکواس بند کر، میں اچھی طرح جانتی ہوں ان کو، انھیں نہیں ہے ایسی کوئی بیماری" وہ عورت اس کی بات کاٹ کر بولی۔

یہ باتیں سُن کر میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں اب پھر گھبرائی لیکن ہمت کر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اندر بیش قیمت ریشمی ساڑھی میں ملبوس ایک جوان عورت نے اپنے سینے کے ابھاروں کو ساڑھی کے پلّو سے ڈھانپتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا" آیئے ڈاکٹر جی میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔" میں صوفے پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی نیم عریاں لباس میں دیوان پر گاؤ تکیئے کا سہارا لئے بیٹھی کوئی جاپانی کھیل کھیل رہی تھی۔ کمرہ خوش سلیقگی سے سجایا گیا تھا۔ ایک کونے میں تراش کا سنگِ مرمر کا مجسمہ پڑا تھا۔ میں کمرے کے پردوں کو دیکھنے لگی جو بہت خوبصورت تھے۔

عورت نے مسکراتے ہوئے کہا" امپورٹڈ ہیں ڈاکٹر جی میری بہن ابھی ابھی امریکہ سے لوٹی ہے۔"

"کیسے یاد کیا آپ نے" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں ڈاکٹر جی ——— نہ جانے اسے کیسی بیماری لگ گئی ہے، مجھے تو ڈر لگ رہا ہے" اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اب بھی ہماری گفتگو سے بے نیاز اپنے کھیل میں محو تھی۔

"کون سی بیماری" میں نے پوچھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر کا دروازہ بند کر کے سرگوشی کے عالم میں بولی "ڈاکٹر جی اس کے اوپر کے ہونٹ پر سفید سفید باریک پھنسیاں سی نکل آئی ہیں۔ دیکھئے ذرا۔"

میں لڑکی کے پاس اٹھ کر گئی تو لڑکی نے قہر آلود نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

(باقی صفحہ ۱۱۹ پر دیکھئے)

نصیر پرواز

آئینے اثبات کے عکسِ نفی تک آگئے
ہم جہاں روشن ہوئے بے چہرگی تک آگئے

آؤ ان سے تجربوں کی وسعتیں ہی مانگ لیں
جو روایت کے اجالے اس صدی تک آگئے

ڈوبتے سورج نے اگتی شام کا بوسہ لیا
رات کے سائے سسکتی چاندنی تک آگئے

کس طرح آخر بچاتے آندھیوں سے بستیاں
جتنے بھی موسم تھے آنکھوں کی نمی تک آگئے

وہ کہیں اپنے ہی احساسات کا سایہ نہ ہو
ہاتھ پھیلائے ہوئے جس روشنی تک آگئے

ہم نے اپنے جسم کو خوابوں کا پیراہن دیا
اور پھر ہونٹوں کی نادیدہ ہنسی تک آگئے

سوچتے یہ ہیں کہ آنکھوں میں ہے تصویروں کا زنگ
جانتے یہ ہیں دیارِ زندگی تک آگئے

کیا کہیں روکا نہیں لفظوں کی خوشبو نے انھیں
لوگ کیسے ذہن و دل کی بے حسی تک آگئے

اور کب تک روح میں پالوگے یہ تنہائیاں
خوف کے بے جسم سائے تو سبھی تک آگئے

رفتہ رفتہ ساری دنیا سے یقیں اٹھتا گیا
دھیرے دھیرے ہم بھی آخر گمرہی تک آگئے

جگمگاتے بام و در پرواز جب بجھنے لگے
ہم بھی اپنی ذات کی کم مائیگی تک آگئے

بی/۱۰۹۲/۲۔ این، گوند پورہ، بھوپال

رونق نعیم

فقیہہ شہر تھا خانہ خراب کیسے ہوا
بتاؤ اتنا بڑا انقلاب کیسے ہوا

مرے ہی نام کی خوشبو ہے اس کی مسند پہ
مرے خلاف وہ عزت مآب کیسے ہوا

خلا میں تیر چلا اور نہ تیغ ہی چمکی
لہولہان مگر آفتاب کیسے ہوا

کسے پسند نہ تھا کون بن گیا سیلاب
یہ شہرِ صوت و صدا زیرِ آب کیسے ہوا

اب اس سوال کے ہونٹوں کی پیاس کیسے ڈھلے
وہ ایک جوئے رواں تھا سراب کیسے ہوا

صدائے "کوہِ ندا" کھینچتی ہے کیوں اس کو
اسی کا نام سرِ انتخاب کیسے ہوا

یہ خوش کلام فرشتوں کے شہر میں رونق
کسی کا سانس بھی لینا عذاب کیسے ہوا

، جواہر لال نہرو روڈ پوسٹ رانی گنج ۷۴۴۳۳۲، ویسٹ بنگال

کترن

عبید قمر ● گوگک پور پٹنہ ۲

شپ۔ شپ ——— وہ جب دُکان پر پہنچا، ماسٹر اکرام کی قینچی تیزی سے چل رہی تھی۔ رنگ برنگے کترن کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ بغل ہی میں ایک گندہ سا تھیلا کترن کو نگلنے کے لئے منہ پھاڑے جیسے ہانپ رہا تھا۔ تھیلے کا پیٹ یوں تو کافی پھولا ہوا تھا مگر لار کی مانند منہ سے لٹکتے کترن کے دھاگے اس کے حریص ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔

چشمے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے ماسٹر صاحب نے اسے دکان کے اندر آنے کی دعوت دی۔ جگہ کی تنگی کی بنا پر سکڑا سمٹا سادہ ٹھیک تھیلے کے کھلے منہ کی زد پر بیٹھتے وقت جیسے اندر ہی اندر سہما جا رہا تھا۔

ایک عرصے سے 'دیل فنڑ' میں بے روزگار تماشائی کی حیثیت سے ایک دو گھنٹے بیٹھنا اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ جب بھی وہ دکان سے باہر نکلتا مختلف رنگوں کے ٹوٹے ٹوٹے دھاگے اور کترن کے ٹکڑے اس کے لباس سے چمٹ جاتے جنہیں الگ کرنے میں اسے عجیب الجھن محسوس ہوتی۔ پھر فوراً ہی وہ اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرنے لگتا۔

لیکن آج ——— آج اس تھیلے سے پہلی بار سامنا ہونے پر ——— ہمیشہ یہ تھیلا شاید کسی کونے کھدرے میں چھپا ہوتا تھا۔ مگر آج . . .

تھیلے کو گھورتے ہوئے اس نے جیسے سراسیمہ لہجے میں ماسٹر صاحب سے دریافت کیا۔

"بھئی یہ کترن آخر کس مصرف میں لائی جاتی ہے ؟"

ماسٹر صاحب نے اسے نظر دالی نظروں میں یوں ٹٹولا جیسے اس کی شخصیت بھی کترن سے مشابہ ہو۔ پھر مسکراتے ہوئے بولے۔

"آج آپ کچھ سیریس موڈ میں نظر آ رہے ہیں۔ یکایک کترن سے کیونکر الجھ پڑے۔ ویسے جناب کترن کا کام کیا۔ بس اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنا یا پھر کسی گوشے میں پڑے سڑتے رہنا۔ پھر....."

یکایک اس کی بھاری آواز گونجی ——— "ہاں! اور پھر اس گڑھ نما تھیلے کی نذر ہو جانا"، اس جملے کی ادائیگی میں اس کا لہجہ خاصا طنز آمیز تھا۔ لیکن اپنی اس جھنجھلاہٹ کو سمجھنے سے وہ خود بھی قاصر تھا۔

ماسٹر صاحب حیرت زدہ لہجے میں بولے ——— "کیوں بھئی، آپ اس تھیلے پر خفا ہو رہے ہیں یا پھر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی"

اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے ہنس کر کہا ——— "ارے بھئی، میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا کہ آخر کچھ تو کام لیتے ہونگے آپ ان کترن کے ٹکڑوں سے ؟"

"دیکھئے صاحب میری دکان میں تو یہ صرف استری گرم کرنے کے لئے کوئلے جلانے کے کام آتے ہیں۔ ویسے خاص ایام میں غریب عورتیں اپنے بچوں کے ذریعہ اکثر منگوا بھیجتی ہیں" یہ کہتے ہوئے ماسٹر صاحب نے ایک چٹخارہ آمیز قہقہہ بلند کیا۔ ساتھ ہی مشین پر بیٹھے اپنے تینوں شاگرد ان سے نظریں بچا کر اسے مسکراتی آنکھوں سے تاڑنے لگے۔

وہ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یکایک اٹھتے دیکھ کر ماسٹر صاحب نے چلتی قینچی روک دی اور کہنے لگے۔

"ارے بھائی آپ کا چہرہ تو یوں بجھ گیا جیسے میں نے آپ کی تضحیک کی ہو یا میرے کہنے کا انداز کافی ناگوار گزرا ہو۔ معاف کیجئے گا میں ذرا

مذاق کے موڈ میں تھا۔ ہاں جناب، تو کترن بچّوں کے بھی مصرف میں آتی ہے یعنی بچّوں کے کھلونے اور .....''

وہ اب دُکان سے باہر آچکا تھا دکان ہی کے چبوترے پر لب سڑک بیٹھتے وقت ماسٹر صاحب کا آخری جملہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ "عجیب موڈیل آدمی ہو یار تم بھی!"

اس پر اب بھی ایک جھنجھلاہٹ سی طاری تھی۔ پھر جیسے وہ اداسی کے ساگر میں ہچکولے کھانے لگا۔ شپ۔ شپ۔ شپ۔ شپ ——— قینچی کی ابھرتی آواز اس کے ہوش و حواس کو جکڑ رہی تھی اور نظریں بے خیالی میں سڑک کا طواف کر رہی تھیں۔ کاریں، بسیں، ٹیکسیاں، رکشے، موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں کے علاوہ بھی پیدل چلنے والوں کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ اس کی نظریں ایک سیدھے سادے راہ گیر کی طرف اٹھ گئیں۔

یکایک ایک کار گندے پانی کا چھینٹا اڑاتی تیزی سے گزر گئی اور بے چارہ راگیر لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنے آپ کو نہیں بچا پایا تھا۔ کپڑے جھاڑتا، بدبداتا ہوا وہ بار بار اسی سمت دیکھ رہا تھا جدھر اب کار کی بجائے ایک بھاری بھرکم بس چلی جا رہی تھی۔ اب راہ گیر ٹریفک کے رش سے بچتا بچاتا گندے نالے کے کنارے کھڑا اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا کہ وہ دُکان کے چبوترے سے اتر کر تیزی کے ساتھ راہ گیر کی طرف بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

" دیکھو پیچھے نالا ہے، سنبھلو ورنہ گٹر میں گر جاؤ گے"

پھر وہ راہ گیر کے بڑھتے قدموں کے ساتھ ساتھ دُکان کی طرف چلنے لگا۔ دُکان پر پہنچتے ہی راہ گیر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے ماسٹر صاحب کو آواز دی ——— "ماسٹر صاحب ——— کترن، کترن۔ تھیلا، وہ آپ کا گڑنما تھیلا"

شاید وہ راہ گیر کے کپڑوں پر لگے دھبّوں کو صاف کرنے کے لئے ماسٹر صاحب سے کترن طلب کر رہا تھا۔

یکایک ہنگامی ماحول کے پیدا ہو جانے پر ماسٹر صاحب گھبرا کر دُکان سے باہر نکل آئے پھر معاملے کی نوعیت سمجھ کر بولے ——— "ارے بھئی، ان کو نل پر لے جائیے تاکہ پہلے یہ گندگی تو دھولیں"

مگر بھیڑ اکٹھی ہونے سے پہلے ہی راہ گیر گرفت ڈھیلی پڑتے ہی تیزی سے ایک جانب لپک گیا۔

وہ غم و غصّہ کی آگ میں سلگتا ماسٹر صاحب کے پیچھے پیچھے دُکان میں داخل ہوا۔ اور سامنے رکھی قینچی اٹھا کر غیر شعوری طور پر چلا دی جیسے بوجھل فضا کو کترنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ماسٹر اکرام اس کے ہاتھ سے قینچی لیتے ہوئے بولے ——— "ارے ارے بھئی آخر یہ ——— اس قینچی نے کیا کیا ہے۔ آپ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے؟"

وہ گمبھیر لہجے میں بولا ——— ارے جناب یہ قینچی ہی تو اچھے بھلے بے داغ کپڑے کو کترن میں بدل دیتی ہے۔ اور ——— اور پھر آپ کا گڑنما تھیلا اسے ....."

ماسٹر صاحب کچھ دیر تک تو کم فہمی کے عالم میں اس کے تمتماتے چہرے کو تکتے رہے پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بات بدلنے کے سے انداز میں کہنے لگے۔

"اچھا جناب کترن سے متعلق ایک بھیانک واقعہ آپ کو سُناتا ہوں" لفظ بھیانک نے جیسے اس پر جادوئی اثر کیا ہو اس نے سامنے پڑے گندے تھیلے کو ہاتھ سے کنارے کیا اور ماسٹر صاحب کے قریب آکر بیٹھتے ہوئے متجسّس نظروں سے انھیں گھورنے لگا۔

ماسٹر صاحب سمٹے سمٹائے اب خود بھی مشین کا ایک پرزہ نظر آرہے تھے۔ مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ کے درمیان لڑکھڑاتی آواز میں یوں گویا ہوئے۔

" بھئی ایک بار ایسا ہوا کہ میں استری گرم کرنے کے لئے کترن سے کوئلے سلگا رہا تھا ہوا بہت زوروں کی چل رہی تھی کترن کا ایک جلتا ہوا ٹکڑا ہوا کے سہارے جیسے اڑتا چلا گیا۔ یہاں سے کچھ دور پر پہلے لوہے کا کارخانہ ہوا کرتا تھا اسی لئے کچھ نہ کچھ پٹرول سڑک پر گرا ہی جایا کرتا تھا۔ تو جناب یہاں سے وہاں راستے پر شعلہ سا لپکنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لوہے کا کارخانہ شعلوں کی زد میں آیا ہی چاہتا تھا کہ ....."

"ہاہاہا۔ ہاہاہا" جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ماسٹر صاحب اس کے غیر متوقع قہقہوں کی زد میں آگئے۔ وہ ماسٹر صاحب کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا ——— "یعنی کترن بھی اگر ....."

اور جملہ پورا کئے بغیر آنکھوں میں عقاب کی سی چمک لئے چشم زدن میں وہ دُکان سے باہر تھا۔ OO

م - اخلاف

مجھے تقدیر کے ماروں میں لکھنا
مگر اُس کے پرستاروں میں لکھنا

بگولوں سے مجھے منسوب کرنا
اُسے ساون کی پھہاروں میں لکھنا

وہ ہے خوشبو ہی خوشبو رنگ ہی رنگ،
گلوں کو اُس کے نظاروں میں لکھنا

سرِ محفل زباں کھلوانے والو
نہ تم مجھکو دل آزاروں میں لکھنا

مری مجبوریاں تم سے ہیں مجھکو
تم اپنے جبر کے ماروں میں لکھنا

نہ یہ لکھنا کہ بجھ کر راکھ ہوں میں
مجھے خاموش انگاروں میں لکھنا

وہ حق گو چڑھ گیا سولی پہ آخر،
یہ سرخی کل کے اخباروں میں لکھنا

زمانہ جو بھی دے اخلاف کو نام
تم اپنے نازبرداروں میں لکھنا

۱۸۳ - کٹرہ عبدالغنی - فتح پور - (یوپی)

حامد جعفری

منزلِ جذب سے کب اُس کا گذرنا معلوم
حیرتِ دید کو بس ایک تماشا معلوم

رابطہ خلق سے رکھنا تو ضرورت ٹھہری
یوں جو دشوار ہوا جینا کسے تھا معلوم

شہر میں جس سے فقط رسمِ شناسائی تھی
اجنبی دیس میں مل کر ہوا اپنا معلوم

ہر شفق رنگ شبیہ میں ترا پیکر جھلکے
جھٹپٹا شام کا ہو آنکھ کا دھوکا معلوم

طاقِ نسیاں پہ کچھ یادوں کے پژمردہ گلاب
آج پائے تو ہوا دل کا سلیقہ معلوم

صدر شعبۂ تاریخ، سیفیہ کالج بھوپال،

سین حقیں آستانی

نگاہِ بشر زاویئے ڈھونڈتی ہے
یہ دنیا نئے سلسلے ڈھونڈتی ہے

کہانی بشر کی پُرانی ہے مانا،
مگر نت نئے حاشیئے ڈھونڈتی ہے

اگر راستے منزلیں ڈھونڈتے ہیں،
تو منزل نئے راستے ڈھونڈتی ہے

تھکے ہارے راہی تھکی ہاری راہیں
یہ تہذیب تو فاصلے ڈھونڈتی ہے

چلو تو سہی دو قدم اور دیکھو
کہ ہر رہ گذر قافلے ڈھونڈتی ہے

حقیر آپ کی یہ پریشاں طبیعت
یقیناً نئے حادثے ڈھونڈتی ہے

۲۰۲، گولڈ گراؤن، جے۔ پی روڈ، اندھیری ویسٹ بمبئی

شکستہ مکان

محسن خان ● کنول ہار - ملیح آباد - لکھنؤ

میں گہری نیند میں تھا اور خواب دیکھ رہا تھا ایک دھندلا دھندلا سا خواب ——— کہ اِدھر میں کھڑا ہوں اُدھر وہ ہے اور ہمارے درمیان ایک آہنی دیوار ——— جو اونچی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اسی درمیان ایک چیخ بلند ہوئی اور میرے دھواں دھواں خواب سے گزرتی ہوئی دور تک پھیلے ہوتے اندھیروں میں مدغم ہو گئی۔

میں جلدی سے اٹھا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ محبوس کمرہ تھا اور گاڑھا اندھیرا خوف کی مانند میرے اطراف پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس گاڑھے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا۔ تنگ و تاریک کمرہ روشن ہو گیا۔

شبینہ نوید کو اپنے کلیجے سے لگائے بیٹھی تھی اور مضطرب تھی۔ نوید ماں کی گود میں سمٹا ہانپ رہا تھا جیسے دور ——— بہت دور سے دوڑ کر آیا ہو۔ اس کی پیشانی بھیگی ہوئی تھی۔ اور آنکھیں وحشت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ خلا میں دیکھ رہا تھا جہاں دُور دُور تک محض سنّاٹا اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹے؟" شبینہ نے نوید سے پوچھا تو نوید پہلے سے زیادہ سمٹ گیا اور اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں جیسے کوئی انتہائی بھیانک شے اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی ہو۔ شبینہ نے نوید کو ایک بار پھر بھینچ لیا اس زور سے کہ جیسے اس کے وجود کے ساتھ ایک ہو جانا چاہتی ہو پھر اس نے سر اٹھا کر دور آسمان کی طرف دیکھا اور کچھ دیر کے بعد بولی۔

"دیکھا آپ نے؟"

میں نے آسمان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ دور تک، اندھیروں میں ڈوبا ہوا بے معنی خلا رکھا اور پرہول سنّاٹا۔ اندھیرے کی دبیز چادر نے آسمان کا کونا کونا ڈھانپ رکھا تھا کہ چاند ستارے سب بس طرف ہو گئے تھے۔

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ کیا تم نے کچھ دیکھا؟" میں نے شبینہ سے پوچھا تو اس نے سامنے انگلی اٹھائی اور سرگوشی میں کہا۔

"ہاں ——— اُدھر بجلی سی چمکی تھی!"

"ہنہ! موسم کا کیا ——— اور پھر دیکھنے کی کوشش کرو گی تو کچھ نہ کچھ نظر آ ہی جائے گا!"

میں نے کہا اور مڑ کر تکیئے کے نیچے سے سگریٹ، ماچس نکالنے لگا۔

خاموشی چھائی ہوئی تھی اور تیز روشنی میں دھواں پھیل رہا تھا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے موقعوں پر ہم نوید کو آنٹی اوشا کے گھر میں سُلا دیا کریں!" شبینہ نے مجھ سے پوچھا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"کیوں ——— کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟" شبینہ نے دوبارہ سوال کیا۔

میں نے سر اٹھا کر شبینہ کی طرف دیکھا وہ بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں کی چمک آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے لیکن ...!"

میں نے سگریٹ سُلگائی اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ "آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

"کیا آنٹی اور شا کے مکان کے اوپر آسمان نہیں ہے ؟" میں نے شبینہ کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

"ہے تو لیکن ــــ ان کا مکان ہمارے مکان سے پختہ ہے۔" شبینہ نے جواب دیا۔

شبینہ کے اس جواب پر نہ جانے کیوں میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر یہ مسکراہٹ بے معنی ہو کر سگریٹ کے دھوئیں کی مانند آہستہ آہستہ اندھیروں میں گھل گئی۔

کچھ توقف کے بعد میں نے شبینہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم صحیح کہتی ہو۔ آنٹی اور شا کا مکان پختہ ہے۔ ہم نوید کو وہاں سلا بھی سکتے ہیں اور وہ وہاں محفوظ بھی رہے گا لیکن ــــــ ہم کہاں جائیں گے ؟ اگر کسی دن طوفان آگیا اور ہمارا مکان زمیں بوس ہو گیا تب کیا ہو گا ؟ نوید کی زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ نوید کو مکان کے گرنے سے زیادہ طوفان کے آنے کا خوف رہتا ہے۔ جب طوفان آئے گا تو کیا آنٹی اور شا کے گھر میں رہ کر نوید کو اس کا علم نہ ہو گا ؟ کیا آنٹی اور شا کے مکان کے روشندانوں سے ہوا کے ساتھ گرد نہیں آئے گی، کھڑکیوں کے شیشے نہیں ٹوٹیں گے ؟"

"تو پھر کیا کیا جائے ؟" شبینہ نے بہت شکستگی کے ساتھ کہا اور نوید کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے۔

پھر گھنگھور بادل چھا گئے۔ تیز تیز ہوائیں چلنے لگیں اور میرے شکستہ مکان نے زمیں بوس ہو کر ہمیں تہہ خاک کر دیا۔ ہر طرف ایک سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں یہاں رہنا ہی نہیں چاہئے۔"

شبینہ نے خاک و خون کے ملبے سے نمودار ہو کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت شبینہ کی آنکھوں میں دُور تک بجلیاں چمک رہی تھیں اور سیاہ بادل امڈ رہے تھے۔

"پھر کہاں جائیں۔ کس شہر میں جا کر رہیں۔ کیا تم نے کوئی ایسا مکان دیکھا ہے یا اس کے متعلق سُنا ہے جس کے فراز میں آسمان نہ ہو جو گرد و غبار اور گرم ہواؤں کی دسترس سے باہر ہو۔ جس کی چھت پر اولے نہ برستے ہوں ؟

"اگر ہم فولادی مکان بھی بنوالیں تو بے اماں ہی رہیں گے کہ زمین بھی تو پھٹ سکتی ہے اور ہمیں زمین پر ہی رہنا ہو گا۔"

میرے اس جواب پر شبینہ خاموش ہو گئی مگر دیر تک خاموش نہ رہ سکی کہ اس نے طوفان کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور شدّت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

"لیکن ہمیں کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ آخر ہم کب تک اس طرح خوف میں مبتلا رہیں گے اور ہمارا بچہ کب تک ڈراؤنے خواب دیکھتا رہے گا ؟"

شبینہ نے میرے سامنے ایک نہایت پیچیدہ سوال رکھ دیا۔ ایک ایسا سوال جو زندگی کی طرح تلخ اور موت کی طرح بھیانک تھا۔

میں نے زیادہ دھواں کھینچتے اور آگ بھڑکاتے ہوئے، شبینہ کی طرف دیکھا وہ بے چینی کے ساتھ میرے جواب کے انتظار میں تھی۔

"ہم کچھ نہیں کر سکتے شبینہ، ہم بہت مجبور ہیں۔ ہمیں اسی طرح جینا ہو گا۔ آسمان رنگ بدلتا رہے گا۔ بادل یوں ہی آتے رہیں گے۔ ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی اور ہم روزانہ اسی طرح اپنے خوفزدہ بچّے کو تھپکیاں دے دے کر سُلاتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ ایک دن یہ شکستہ مکان ہمیں ہماری قبروں کی طرح ڈھانپ لے گا۔

میں نے جہاز سے چھوٹے ہوئے اس مسافر کی طرح سوچا جو بہت دور تک پیرنے کے بعد تھک کر پھر اس جزیرے پر لوٹ آیا ہو۔ اس جزیرے پر ــــ جس کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا لامتناہی سمندر ہو اور گہرا سناٹا۔

"اب سو جاؤ بہت رات ہو گئی ہے۔" میں نے اسی جزیرے پر کھڑے کھڑے شبینہ سے کہا اور سفید چادر پیروں سے سر تک تان لی۔

صبح جب ہم بیدار ہوئے تو روشنی پھیل چکی تھی۔ شبینہ نے میری طرف دیکھا پھر آسمان کی طرف، اور بولی۔

"دیکھئے آسمان تو بالکل صاف ہے۔"

"ہاں ــــ ابھی تو صاف ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر یکدم ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ میں کچھ سوچنے لگا اور شبینہ بھی اُداس ہو گئی ○○

آزاد اٹاوی

راہ میں آگ کا دریا ہے اُبھرنے والا
موم زادہ ہے مگر پار اترنے والا

خوبیٔ عظمتِ کردار کے باقی ہیں نقوش
آج بھی زندۂ جاوید ہے مرنے والا

کس قدر خوفِ حوادث کا اثر ہے دل پر
ڈر گیا اپنی ہی پرچھائیں سے ڈرنے والا

بے خبر، اپنی حفاظت تو کرے گا کب تک
ک بن کر ہے فضاؤں میں بکھرنے والا

لربا پھول سے چہروں کو بتاؤں کیسے
ارزاروں سے گذرتا ہے گذرنے والا

شۂ ظلمتِ دوراں میں چھپا بیٹھا ہے
شنی بن کے فضاؤں میں بکھرنے والا

ل اُٹھی ہے پرندوں میں اڑانوں کی اُمنگ
ستِ صیاد پروں کو ہے کترنے والا

ایس این کا ہے کٹرہ نیرل خاں اٹاوہ (یوپی)

انور مینائی

حاصلِ نشاطِ سرمدی تخلیق کی تشکیل تک
پھر دھند سی پھیلی ہوئی ابلاغ سے ترسیل تک

نقطے، لکیریں، دائرے سب تو ہیں معنی آفریں
تم ہو اگر اہلِ نظر پہونچو ذرا تفصیل تک

الفاظ میں ڈھل کر بھی جو مفہوم سے خالی رہیں
میں اُن خیالوں کو بھلا لے آؤں کیا ترسیل تک

خود مرتعش ہو جائیں گی گونگی فضائیں بھی ذرا
پہنچے تمہارے ہاتھ کا پتھر تو کوئی جھیل تک

شاید اندھیروں میں کہیں گم ہوگئی ہیں خواہشیں
اب ذہن میں روشن نہیں امکان کی قندیل تک

کیا میرے "میں" کا پیکرِ فانی بکھر جائے گا خود
انور مرے جذبات کے ایوان کی تشکیل تک

الامین۔ انجمن ہائی اسکول کولار ۱۰۱ ۵۶۳

انصار راہی

تشنگی ضبط سے باہر ہے گلا تر کر دے
اے خدا اب تو سرابوں کو سمندر کر دے

اس نگر کے ہیں سبھی لوگ اگرچہ پتھر
میں ہی کیوں شیشہ رہوں مجھکو بھی پتھر کر دے

اپنے اسلاف کی مانند چمکتا ہی رہوں!
میرے کردار کو کچھ ایسا منور کر دے

مجھکو تالاب کے پانی سا نہ رکھ قید خدا
بخش دے وسعت و گیرائی سمندر کر دے

غم اگر تیری عطا ہے تو میں خوش ہوں لیکن
مجھکو تھوڑی سی مسرت بھی میسر کر دے

۱۶/۱۳۳ داؤد پورہ، برہانپور (ایم۔پی)

زیب غوری (مرحوم) ایک نظر میں

(۲)

موضوعِ سخن بہت عالی ہی رہے گی
جو طرز نکالوں گا مثالی ہی رہے گی

اب مجھ سے یہ دنیا سراسر مانگ رہی ہے
کمبخت مرے آگے سوالی ہی رہے گی

وہ نشۂ غم ہو کہ خمارِ مئے بیدار
دل والوں کے چہرے پہ بحالی ہی رہے گی

اب تک تو کسی غیر کا احساں نہیں مجھ پر
قاتل بھی کوئی چاہنے والی ہی رہے گی

میں لاکھ اسے تازہ رکھوں دل کے لہو سے
لیکن تری تصویر خیالی ہی رہے گی

اس دل پہ ٹھہرنے کا نہیں زیبؔ کوئی نقش
یہ آنکھ کسی رنگ سے خالی ہی رہے گی

(غیر مطبوعہ) زیب غوری

- **نام:** احمد حسین خاں غوری
- **تخلص:** زیبؔ
- **تاریخ پیدائش:** ۱۹۲۸ء
- **تعلیم:** بی۔ اے
- **ملازمتیں:** وکٹوریہ مل (کانپور) سعودی ایرلائنس (بمبئی)
- **مقام:** بیت الرشیدہ، ناظر باغ، کانپور
- **شعری مجموعے:** زرد زرخیز ۱۹۷۴ء
  چاک ۱۹۸۵ء کراچی (پاکستان)
- **انتقال:** یکم اگست ۱۹۸۵ء کراچی (پاکستان) (عارضۂ قلب کے سبب)
- **پسماندگان:** نجمہ خانم غوری (اہلیہ)
  موسیٰ محمد غوری، شاداب رشیدی غوری
  جواہر خانم غوری، حسنہ خانم غوری

زیب غوری (مرحوم) کے متعلق درج بالا معلومات جناب تسکین زیدی (کانپور) نے فراہم کی ہیں جس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں (ادارہ)

زیب غوری

۱

ن ہے بے کیف، بے گناہوں سا
کشادہ شراب گاہوں سا

چھ فقیرانہ بے نیازی بھی
چھ مزاج اپنا بادشاہوں سا

ل ، درمیکدہ سا واسب پر
ر بھی رکھتے ہیں خانقاہوں سا

ب پہ کھلتے نہیں مگر مرے شعر
ل ہے کچھ تری نگاہوں سا

یا ہے بیان میں کیوں کر
وخم سارا تیری راہوں سا

نفس میں شراب کی سی مہک
ہوا میں نشہ گناہوں سا

اجلی پہاڑیوں پہ زیب
اُترا ہے جلوہ گاہوں سا

۲

اُس کے قرب کے سارے ہی آثار لگے
ہوا میں لہراتے گیسوئے یار لگے

دل بھی کیا نیرنگ سراب آرزو ہے
رونق دیکھو تو کوئی بازار لگے

میں گھبرا کر تجھ کو پکاروں تو یہ فلک
آنگن بیچ بہت اُونچی دیوار لگے

اک بے معنی محویت سی ہے شب و روز
سوچو تو جو کچھ ہے سب بیکار لگے

میری انا افتادگی میں بھی کیا ہے زیب
کوئی ہاتھ بڑھائے تو تلوار سے لگے

۳

کوئی گھٹا یا لائے بام سی لگتی ہے
شام نہیں ہے لیکن شام سی لگتی ہے

دیکھتے ہی آنکھوں میں آجاتا ہے سرور
حنا ترے ہاتھوں میں جام سی لگتی ہے

موسم گل بھی ، باد صبا بھی ہے لیکن
نکہت گیسو میرے نام سی لگتی ہے

اب میں اس کو کس غم سے تعبیر کروں
یہ شب بھی مجھ کو بے نام سی لگتی ہے

عجب اسیری عجب ہے یہ آزادی بھی
کھلی فضا ہے لیکن دام سی لگتی ہے

زیب کواڑے جب برسوں کے بند کھلیں
تازہ ہوا بھی اک انعام سی لگتی ہے

زیب غوری بنام افتخار امام

Zeb Ghori

98/33
BAITUR RASHIDA
NAZIR BAGH,
KANPUR-208001.

۱/۶/۸۵

پیارے افتخار امام، سلام علیک

میں یہاں کراچی اپنے خسر صاحب کی عیادت کے لئے، تمہاری بھابی اور بچوں کے ساتھ آیا تھا اور یہاں پہونچتے ہی خود بیمار ہو گیا۔
دل کے دو دورے پڑے اور یہاں دل کے سب سے بڑے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ایک طویل مدت تک مسیحاؤں کے
ناز اٹھاتا رہا۔ تجزیہ یہ ٹھہرا کہ متواتر دو دورے پڑنے سے دل زخمی ہو گیا ہے، اور علاج کے ساتھ ساتھ آرام کی
سخت ضرورت ہے۔ میں تو سمجھتا تھا راکھ کا ڈھیر ہوگا چلو سینے میں ٹوٹا پھوٹا دل ہے تو۔

گھر جانے کی اجازت ملی تو سخت ہدایتوں کا اتنا بوجھ تھا کہ بستر سے اٹھنے کی نہ اجازت تھی اور نہ سکت۔ تمہاری بھابی نے
بیوگی کے خوف سے ہدایات کی بجا آوری میں اتنا ظالمانہ رویہ اختیار کر لیا کہ میں کروٹ بدل کر اس دنیا کو حقارت سے
دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تو آرام کی اس بے جا فراوانی سے کب کا مر گیا ہوتا یہ تو کہو ڈاکٹروں کو میری بے بسی پر رحم آ گیا
اور انہوں نے بستر پہ لیٹے لیٹے شعر کہنے کی اجازت دے دی۔ پھر تو دل سے وہ طوفان اٹھا کہ بس۔ غزلوں کا ڈھیر لگا دیا
میں نے سوچا کیا خبر پھر موقع ملے نہ ملے "اب چاک" میرا دوسرا مجموعہ کافی ضخیم ہو جائے گا۔ (گنجائش نکال سکو تو
خود بنا بنوا کے "چاک" کا اشتہار دے دیا کرو)

زیادہ تکان برداشت نہیں کر سکتا لیکن چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہوں، بلکہ یوں کہوں کہ چل پھر رہا ہوں،
ادھر دو انڈو پاک مشاعرے اور ایک صرف ہندوستانی شعراء کے اعزاز میں مشاعرہ بھی Attend
اور تمہیں یقیناً یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہر مشاعرہ میں چار پانچ غزلیں پڑھنا پڑیں۔ سمجھ میں نہیں آتا
قرب قیامت ہے کہ میں اب گھٹیا شعر کہنے لگا ہوں۔ مجھ ایسے سنجیدہ شاعر کی اتنی مقبولیت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی
میری عیادت کو جتنے بھی احباب آئے، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر تقی، ڈاکٹر جمیل اختر، ڈاکٹر حنیف فوق
سرشار صدیقی، حسن اکبر کمال، نسیم درانی وغیرہ ہم تو ہندوستان کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر ضرور چلا
اور تمہارا اور "شاعر" کا ذکر ناگزیر نکلا۔ اسلم فرخی ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کی تازہ
شمارہ میں میری دو غزلیں آئی ہیں اور یہ پرچہ آفسٹ پر نکلا ہے۔ اب کہ پرچہ

98/33
BAITUR RASHIDA
NAZIR BAGH,
KANPUR-208001.

Zeb Ghori

۲

بڑا خوشگوار اثر چھوڑا ہے۔ نسیم درانی بتا رہے تھے کہ شاعر، جواز اور آہنگ ان کے پاس باقاعدگی سے آتا ہے۔ یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ شب خون جن لوگوں کے پاس پہونچنا چاہیے وہاں بھی نہیں پہونچ پاتا۔ فاروقی بتا رہے تھے کہ ہر پرچہ وہ پاکستان کے مختلف ادبی مراکز کو بھیجتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا پھر پرچے کیوں نہیں پہونچ پاتے، مشاعروں میں تقریباً سبھی سے ملاقاتیں رہیں اور یہ شکوہ سب کو تھا۔

بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ شاعر کی باقاعدگی کے ساتھ اس کا بھی چرچا عام ہے کہ تمہاری اپنی ذاتی کوششوں نے پرچے کے معیار و اعتماد کو بڑھایا ہے، میری مبارک باد قبول کرو۔

ایک بات ضمناً کہتا چلوں اور وہ بھی اس لئے کہ میرے تمہارے درمیان کوئی عام رسم درکار نہیں ہے۔ ہمارے درمیان کوئی نہج ایسا ضرور ہے جہاں ہم ایک دوسرے کے خلوص و دوستی پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ ہاں تو میں تم پر واضح کر دوں کہ جو بھی غزلیں میں تمہیں بھیجتا ہوں وہ غیر مطبوعہ ہوتی ہیں اور میں انھیں ہندوستان کے کسی رسالہ کو نہیں بھیجتا، لیکن یہ قید ہندوستان کے باہر کے رسائل پر نہیں ہے ——— بین الممالک میں رسائل کی ترسیل اتنی محدود و قلیل ترین ہے جسے شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔ مجھے امید ہے کہ ان حالات کے پیش نظر تم میرے اس [illegible] کو گوارا کر لوگے۔

میں اپنے بیٹے شتاور کو دو چار روز میں تنہا ہی کانپور واپس بھیج رہا ہوں، اس کے ایم اے فائنل کا امتحان سر پر ہے۔ اسی کے حوالے تمہارا یہ خط کر دوں گا جسے وہ کانپور سے پوسٹ کر دے گا کہ اس طرح نسبتاً تم کو یہ خط جلد مل جائے گا۔

پرچہ تو تم نے کانپور کے پتہ پر بھیج دیا ہوگا، افسوس میں ابھی تک تمہارا تازہ شمارہ دیکھ نہیں سکا۔ میں ابھی کراچی سے کانپور تک کے اتنے طویل سفر کی تکان برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں امکان یہی ہے کہ مجھے یہاں ابھی مزید ایک آدھ ماہ لگ جائے گا۔

میں اپنا یہاں کا پتہ لکھے دے رہا ہوں۔ تم نے خط بھیجا تو میری عیادت بھی ہو جائے گی جو ضروری بھی ہے اور جو تقویت مجھے حاصل ہوگی اس کا کیا ذکر۔

اپنے گھر میں حسب مراتب سلام و دعا کہنا۔ خدا حافظ! تمہارا

زیب غوری

1/6/85

ZEB GHORI
R 142 SECTOR B/15
NORTH KARACHI (PAKISTAN)

مکتوبات

یوں تو ہمیں شاعر کے متعلق خاصی بڑی تعداد میں خطوط موصول ہوتے ہیں۔ لیکن جب سے شاعر نئے رنگ و روپ کے ساتھ اشاعت پذیر ہو رہا ہے، خطوط کی تعداد میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اس سے شاعر کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے ہم اپنے بے شمار قارئین کے شکر گزار ہیں کہ وہ نہ صرف شاعر پسند کر رہے ہیں بلکہ خطوط کے ذریعہ اپنے مفید مشوروں سے بھی نواز رہے ہیں۔ ہم اپنے ان قارئین سے بہ طورِ خاص معذرت خواہ ہیں جن کے خطوط اب تک اس کالم میں شائع نہیں ہو سکے ہیں خصوصیت کے ساتھ آفسیٹ کے افتتاحی شمارے پر بہت بڑی تعداد میں خطوط موصول ہوتے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ شاعر کے صفحات محدود اور ہماری خواہشیں کائنات بھر، پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ شاعر کے قارئین خطوط کا سلسلہ برابر جاری رکھیں تاکہ ان کے خطوط کی روشنی میں شاعر کو مزید دلچسپ، معیاری اور متنوع بنایا جا سکے۔ تاہم آپ سے گذارش ہے کہ مکتوبات کے لئے تو تعریفی خطوط کے بجائے مسائلی اور موضوعاتی خطوط ہی ارسال کیجئے، مختصر مگر جامع۔

ذیل میں ہم گزشتہ شماروں پر موصول ہوتے خطوط میں سے چند ایک اہم خطوط شائع کر رہے ہیں تاکہ نئے پرانے شماروں پر موضوعاتی و مسائلی گفتگو کا ایک سلسلہ بنا رہے

(ادارہ)

شہنشاہ مرزا ——————— ۸۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ

آفسیٹ کا افتتاحی کا شمارہ "شاعر" کی ۵۷ سالہ زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ سیمابؔ اکبرآبادی اور اعجاز صدیقی صاحب کی یادوں سے معطر اس شمارے میں گزشتہ روایت سے انحراف کا دلکش احساس ہوتا ہے۔

اس شمارے میں کالی داس گپتا صاحب کا مضمون بہت اہم ہے، جس میں انھوں نے "سریلی بانسری" کے تصحیح شدہ نسخہ کا حوالہ دیا ہے اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے "سریلی بانسری" کے ایڈیشن کو فوٹو آفسیٹ کے ذریعہ شائع کیا ہے۔ دراصل اکاڈمی کو یہ کتاب ڈاکٹر افضال احمد ایڈوکیٹ نے فراہم کی تھی، جو حضرت انگر مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ اس کتاب کی رائلٹی بھی انھوں نے ہی وصول کی ہے۔ اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ آرزو مرحوم نے اپنی اولادوں کی طرف سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوتے، انگر مرحوم کو ہی اپنا تمام کلام سپرد کر دیا تھا اور یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہی اسے شائع کرانے کے مجاز ہیں۔ اس ضمن میں اکاڈمی کی توجہ اس سمت بھی مبذول کرائی گئی تھی کہ آرزو صاحب کے خلف اصغر منیر آرزو کاظمی ابھی بقیدِ حیات ہیں، اور انھیں ہی آرزو صاحب کے کلام کی رائلٹی ملنی چاہئے جسے اکاڈمی نے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوتے معاہدہ کے مطابق افضال صاحب کو رائلٹی کی رقم ادا کر دی تھی۔ اکاڈمی نے اب تک آرزو صاحب کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اور جن کی رائلٹی افضال صاحب کو دی جا چکی ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) سریلی بانسری (۲) جہانِ آرزو (۳) نشانِ آرزو (۴) فغانِ آرزو (۵) متفرقات آرزو (۶) نظامِ اردو۔ چنانچہ بمبئی میں ایک گندی چال میں آرزو صاحب کے حقیقی صاحبزادے اور ان کی اولادیں مفلوک الحالی کی زندگی گزار رہے ہیں (اور آرزو صاحب کے شاگرد کے صاحبزادے جو محمود بھی صاحب تردِت ہیں) لکھنؤ کی ایک آرام دہ کوٹھی میں اکاڈمی سے حاصل کردہ رائلٹی کی رقم مزے سے اڑا رہے ہیں۔ یہ تماشا صرف اردو میں ہی دیکھنے کو مل سکتا ہے۔

اس شمارے میں شامل دوسرے مضامین تشنگی کا احساس دلاتے ہیں۔ عتیق احمد نے جدید افسانہ کو سمجھے بغیر ہی اس پر مضمون لکھ مارا ہے۔ اس مضمون سے یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ ان کی نگاہ میں جدید [illegible]

ضد ہے۔ "نیند نہیں آتی" (سجاد ظہیر) "قید خانہ" (احمد علی) اور غالیچہ (کرشن چندر) کے متعلق وہ کیا کہیں گے؟ کیا ترقی پسندوں کے لکھے یہ افسانے جدید اور علامتی نہیں ہیں۔؟

عتیق اللہ کا مضمون ویسے تو کافی محنت سے لکھا گیا ہے، لیکن وہ تشنہ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۰ء کے بعد ترقی پسند غزل کی صورتِ حال پر وہ ضمناً ہی اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ دراصل یہ موضوع ایک طویل اور مبسوط مقالے کا متقاضی ہے، نہ کہ ایک مختصر مضمون کا۔

شاعر کے اس شمارہ میں شامل دونوں افسانے اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں، کہ اس نوعیت کے افسانے 'شاعر' نے کم ہی شائع کئے ہیں۔ سریندر پرکاش کا تازہ افسانہ ان کے گزشتہ اہم افسانوں 'بجوکا' ' بازگوئی' اور 'بن باس' ۱۹۸۱ء کی یاد تازہ کرتا ہے۔ سریندر پرکاش کے ان افسانوں میں عصری حسیت، تمثیل اور علامت کے پیکر اور خالص بیانیہ انداز میں یوں جلوہ گر ہوتی ہے کہ آج کا انسان ان کہانیوں کو "آپ بیتی" کی حیثیت سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ رشید امجد کا افسانہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ اس میں اپنے پسندیدہ اسلوب نثر کا شاعری کے قریب سے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

گدی کی ناول کے پہلے باب کے متعلق کچھ کہنا اس لئے بے معنی ہے کہ یہ محض پہلا باب ہے۔ نوری نستعلیق کے متعلق جمیل نقوی صاحب کا مضمون معلوماتی ہے۔ شعری حصہ میں بلراج کومل اور عمیق حنفی کی تخلیقات متاثر کرتی ہیں۔ زیب غوری، شہریار اور نشتر کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ فیض کا طویل انٹرویو اگرچہ شائع شدہ ہے، لیکن بہت اہم ہے۔ اس کے علاوہ یورپ۔ بنگلادیش اور پاکستان میں اردو کی صورتِ حال پر مضامین بھی معلوماتی ہیں۔ خاص طور پر بنگلادیش میں اردو کی حالتِ زار کے متعلق ایوب جوہر کا مضمون ان لوگوں کے لئے بصیرت افروز ہو سکتا ہے جو کسی زبان کو ان علاقوں میں زبردستی تھوپنے کے طرفدار ہیں جہاں اس کا کوئی حلقہ نہیں۔ انور سدید صاحب کا "اردو ادب ۱۹۸۳ء" اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے محدود ماخذات کے باوجود اسے اپنی حد بھر بامعنی بنانے کی کوشش کی ہے۔ جو کام انور سدید نے تنہا سر انجام دیا ہے، وہ تنہا ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔

شاعر کے اس خصوصی شمارہ سے اس کا نیا سفر شروع ہوا ہے، یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں آگے ہی بڑھتا رہے گا، پیچھے مڑ کر دیکھنے کا سوال ہی نہیں اٹھے گا۔

سید یحیٰ نشیط ———— کالی (ودلستھان) ۴۴۵۲۲۹

افتتاحی شمارے کو دیکھ کر کلماتِ تحسین بے اختیار زبان سے نکلے اور پہلی فرصت میں میں نے اس کے اوراق الٹ کر تمام مضامین کی سرخیاں اور مصنفین و شعراء کے نام دیکھ لئے تاکہ بعد میں اپنی مذاق کے مضامین پڑھنے میں سہولت ہو۔ اللہ سے یہی دعا ہے کہ شاعر اسی طرح مسلسل ترقی کرتا رہے۔ آپ کی مسلسل کوششیں، مستحکم ارادے اور بڑھتے ہوئے اقدام واقعی قابلِ تعریف ہیں جو شاعر کو زندہ و پائندہ رکھے ہیں۔ خلوص و لگن کی اس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔

حسنِ ترتیب نہایت ہی دلکش ہے اور معیار بھی اونچا ہے، ورنہ شاعر کے پچھلے کچھ شمارے اس کے متعینہ معیار سے تھوڑے پست ہو گئے تھے۔ اس شمارے میں سریندر پرکاش کی کہانی "جمہورہ الفریم" نہایت مشکل لیکن انسان کے ارتقاء کی داستان ہے۔ آپ کے فٹ نوٹس اسے سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ عتیق اللہ صاحب کے مضمون "ترقی پسند آوازیں اور اردو غزل" میں سردار جعفری اور فیض کے نام غزل گو شعراء کی فہرست میں دیکھ کر چونکنا پڑا۔ فیض احمد فیض کا انٹرویو کچھ نئی باتیں تو پیش کرتا ہے لیکن پر وقار نہیں۔ پاکستانی ادباء و شعراء کا تعاون آپ کو مل رہا ہے یہ نہایت مستحسن ہے۔

آرزو لکھنوی سے متعلق افتتاحی شمارے کے (ص ۱۷ تا ۲۵) صفحات نہایت قیمتی اور اہمیت کے حامل ہیں جو دورِ جدید کے مشہور محقق کالیداس گپتا رضا کے مضمون، آرزو کی تحریروں کے عکس اور مرحوم کی دو غیر مطبوعہ غزلوں سے مزین ہے۔ ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی کے ذریعہ دستیاب ہوئی ان غزلوں میں دوسری غزل (جو شاعر کے صفحہ ۲۵ پر درج ہے) میری اپنی دانست میں عروضی سقم لئے ہوئے ہے، جن کی وجہ سے ماہر فن کہنہ مشق استاد سخن علامہ آرزو لکھنوی کی شاعرانہ شخصیت مجروح ہو سکتی ہے۔ یہ بہر حال نا ممکنات میں سے ہے۔ کہ آرزو جیسا پختہ گو

عروضی داں ہو۔ ۵ اشعار کی غزل میں ڈھیر ساری غلطیاں کرے، ہاں! یہ ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس جو غزلیں تحریری شکل میں ہیں ان میں کتابت کی غلطیاں راہ پا گئی ہوں۔ کم سواد کاتبوں کے کرتب قدیم مخطوطات میں بہت سارے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر مجاہد حسین نہایت ذمہ داری سے تصحیح کر دیتے یا ایک ناقدانہ نظر ہی اس غزل پر ڈال دیتے تو یہ غلطیاں غزل میں در نہ آتیں۔

میرے اپنے عجز اور کوتاہ علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اس غزل کا عروضی جائزہ لینے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ غزل بحر متدارک مقطوع مبنی مضاعف کے وزن پر تقطیع ہوتی ہے۔ اس بحر میں فَعْلُنْ فَعِلُنْ۔ فَعِلُنْ کا وزن سالم رکن "فاعلن" بر زحاف قطع کا عمل کرنے سے بنا ہے اور از روئے عروض فَعْلُنْ (بسکون عین) اور فَعِلُنْ (بہ کسر عین) بحر متدارک میں متبادل ارکان سمجھے جاتے ہیں اور ان کا اختلاط اس بحر میں جائز ہے۔ متقارب میں درست نہیں۔
نیچے اس اوزان پر آرزو لکھنوی کی غزل کی تقطیع کی جا رہی ہے۔

فَعِلُن فَعِلُن	فَعْلُن فَعِلُن	فعلن فَعِلُن / فَعْ لُن	فاعلان فع	اصل مصرع
جو بِ ٹھ کِ دل	سِ اکِ لِ مِ ہو	تی ہیں یہ با	تیں کَ بھی کَ بھی	جو بیٹھ کے دل سے اکیلے میں ہوتی ہیں یہ باتیں کبھی کبھی
دکھ درد جہا ں	میں روز کِ ہیں	سکھ چین کِ را	تیں کَ بھی کَ بھی	دکھ درد جہاں میں روز کے ہیں سکھ چین کی راتیں کبھی کبھی
تارے تُ گھٹا	میں چھپ جائیں	تو چاند مرے	گھر اُتر پڑے	تارے تو گھٹا میں چھپ جائیں تو چاند مرے گھر اتر پڑے
ہوتی تو ہَ لے	کن ہوتی ہیں	ایسی برسا	تیں کَ بھی کَ بھی	ہوتی تو ہیں لیکن ہوتی ہیں ایسی برساتیں کبھی کبھی
غم خوار بَ نے	سودائی کا	اتنی فرصت	ہے بھلا کیسے	غم خوار بنے سودائی کا اتنی فرصت ہے بھلا کیسے
بے کار کِ با	تیں لاکھوں با	رر کام کِ با	تیں کَ بھی کَ بھی	بے کار کی باتیں لاکھوں بار اور کام کی باتیں کبھی کبھی
پورا مصرع خارج از وزن				چھائی ہوئی غم کی گھٹاؤں میں اتنی سی چمک ہے امید کی بھی
برسات مِ جے	سے ہوتی ہیں	اُجیالی را	تیں کَ بھی کَ بھی	برسات میں جیسے ہوتی ہیں اُجیالی راتیں کبھی کبھی
اُک تاکِ کُ ئی	پُ چھے ہِ گَ[1] کِ ہو	آرزو[2] آخر	چپ ہو کیوں / چپ کیوں ہو	اُکتا کے کوئی پوچھے ہی گا کہو آرزو آخر چپ ہو کیوں / چپ کیوں ہو
یہ سی دھے سا	دھے مَعْذُرَتْ بھی	کر جات ہ گھا	تیں کَ بھی کَ بھی	یہ سیدھے سادھے معذرت بھی کر جاتے ہیں گھاتیں کبھی کبھی

بحر متدارک مقطوع مبنی مضاعف کے وزن پر کی گئی اس تقطیع سے غزل کے اشعار میں یہ سقم دکھائی دیتے ہیں

(۱) مطلع کے مصرعہ اوّل کے صدر (سے اکیلے میں) اور چوتھے شعر کے مصرعہ ثانی کی ابتدا (پوچھے ہی گا) میں فَعْلُنْ فَعِلُنْ کے بجائے فَعِلُنْ فَعْلُنْ کا استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بحر کی روانی میں فرق آ گیا ہے۔
(۲) تیسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں (لاکھوں بار اور) میں "اور" کی ار کی تخفیف کر کے "بار" کی "ر" سے جوڑ دی گئی ہے۔
(۳) چوتھے شعر کا اول مصرع خارج از وزن ہے۔
(۴) پانچویں شعر کے پہلے مصرعہ میں کئی حروف حذف کرنے پڑے پھر بھی "فع" کی جگہ خالی رہ گئی۔ اسی مصرعہ میں اگر "چپ ہو کیوں" کی جگہ "چپ کیوں ہو" کر دیا جائے تو سبب خفیف کی کمی پوری ہو جائے گی۔

اُمید کہ ان اسقام کی نشاندہی باعثِ دل شکنی نہ ہوگی۔

پرکاش تیواری ______ ڈی۔ ۵۱، پٹیل دھام، سردار پٹیل مارگ، نئی دہلی

آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ چلئے اپنے دل کی کوئی بات تو پوری ہوئی۔
یوں تو مقالات، نظمیں، کہانیاں اور غزلیں وغیرہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہیں مگر ایک بات جو نئے ذہنوں کو مسلسل پریشان کئے ہوئے ہے وہ یہ ہے

کہ نہ جانے کیوں کچھ پرانے موضوعات اور کچھ پرانے ادیبوں اور شاعروں پر بار بار لکھا جا رہا ہے جیسے ان کے علاوہ اردو زبان و ادب میں کوئی اور موضوع نہیں ان کے علاوہ اور لکھنے والے نہیں ہیں۔ یہ بات کئی برسوں سے محسوس کی جا رہی ہے کہ نئے لکھنے والوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔
ایک طرف تو اردو والے اردو زبان کے ساتھ ناانصافی کا ڈھول پیٹ رہے ہیں اور دوسری طرف نئے لکھنے والوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی جا رہی ہے جبکہ ان کے ساتھ اردو زبان و ادب کا مستقبل وابستہ ہے۔ اور یہ دیکھ کر تو اور بھی رونا آتا ہے کہ دیارِ غیر سے کوئی تیسرے یا چوتھے درجہ کا بھی ادیب یا شاعر ہندوستان آتا ہے تو اس کو اس طرح سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے کہ لگتا ہے انھیں کے نام سے ہی ہماری اردو زبان اور ادب باقی ہے اور یہاں اردو زبان میں کوئی اور لکھنے والا ہے ہی نہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہمارے کچھ ادیب و شاعر باہر سے آنے والے اردو ادیبوں اور شاعروں کے دلال ہیں۔
اس لئے جناب سے گزارش ہے کہ آپ شاعر کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے نئے لکھنے والوں پر بھی مضامین وغیرہ لکھواتے رہئے اور انھیں برابر جگہ دیتے رہئے۔ تاکہ ایک طرف تو ان نئے فن کاروں کی حوصلہ افزائی ہو اور یہ تازہ کار ذہن معیاری ادب تخلیق کرنے میں کوشاں رہیں اور دوسری طرف اردو زبان کی ترقی کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ یہاں مجھے اپنے بچپن کی ایک بات یاد آ رہی ہے کہ جب ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد ہم اسکول میں داخل ہوتے تو ہندی مضمون عام طور پر بچوں کو دلایا جانے لگا اور امتحان میں بچوں کو کافی رعایتی نمبر دے کر پاس کیا جاتا تھا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ بچوں میں ہندی کا چلن عام ہو اور ہندی بھاشا پروان چڑھے۔ جیسا کہ ہم نے بعد میں دیکھا ایسا ہی ہوا۔ شاعر نے ہمیشہ ہی نئے قلم کاروں کی سرپرستی کی ہے اس میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے لیکن آفسیٹ والے شمارے میں نئے ذہن کو نظرانداز کیا گیا ہے۔

محمد امین ——————— مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۷، اسندری موہن ایونیو کلکتہ

ماہنامہ شاعر کے شمارہ نمبر ۴، ۱۹۸۵ء میں "رفتار" (علمی، ادبی اور تہذیبی خبرنامہ) کے عنوان کے تحت ایک خبر مغربی بنگال اردو اکاڈمی سے متعلق شائع کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "اردو کو آرڈی نیشن کمیٹی کے وفد سے وزیر اعلیٰ مغربی بنگال شری جیوتی باسو نے اپنے چیمبر میں انتہائی غصے کے عالم میں کہا کہ میں اردو کو مغربی بنگال میں کسی قیمت پر دوسری زبان قبول نہیں کروں گا۔"
اس سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ آپ نے خبر کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور اردو کو آرڈی نیشن کے موقف کی تشہیر کر کے وزیر اعلیٰ مغربی بنگال کی اردو نوازی کو مجروح کرنے کی سازش کی گئی ہے۔ اس کے برعکس حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت مغربی بنگال نے کبھی اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا وعدہ نہیں کیا تھا بلکہ بنگال کے چار علاقوں ——— کلکتہ، مٹیابرج، آسنسول اور اسلام پور سب ڈویژن میں اردو کو مخصوص سرکاری کاموں میں استعمال کرنے کا اعلان کیا تھا جس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ نیز اردو کی ترویج و اشاعت کے کاموں میں پیش پیش ہے۔ مغربی بنگال واحد ریاست ہے جہاں کسی قسم کا لسانی تعصب یا تنگ نظری نہیں ہے۔ بالخصوص بایاں محاذ کی حکومت اردو کے معاملے میں معقول پالیسی پر چل رہی ہے۔
حکومت مغربی بنگال کے خلاف جو سیاسی ہتھکنڈے استعمال کئے جا رہے ہیں ان میں اردو داں عوام کو بدظن کرانے کی مہم بھی شامل ہے۔
اس حقیقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کو آرڈی نیشن کے مطالبات کی حمایت کانگریس (آئی) نے کی تھی مگر ریاستی اسمبلی کے اجلاس میں کانگریس (آئی) نے اردو کو آرڈی نیشن کمیٹی کی حمایت کی تردید کی اور اس کا مغربی بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ بذاتِ خود مسترد کر دیا۔ حکومت مغربی بنگال آج بھی اپنے موقف پر قائم ہے کہ جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی آبادی دس فیصد یا اس سے زیادہ ہوگی وہاں اردو کا استعمال مخصوص سرکاری کاموں میں کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ سارے بنگال میں مذکورہ بالا چار علاقوں کی نشاندہی ہوئی تھی اور سارے مغربی بنگال میں اردو بولنے والوں کی آبادی صرف ڈھائی فیصد ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اس حقیقت کی روشنی میں واضح کر دیا ہے کہ یہ مطالبہ کس طرح منظور کیا جا سکتا ہے جبکہ دوسری زبانوں مثلاً ہندی، نیپالی، سنتھالی اور اڑیہ والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور وہ بھی اس طرح کا مطالبہ کر سکتے ہیں جس سے مغربی بنگال کی لسانی اقلیتوں میں بدگمانی پیدا ہو جائے گی اور لسانی کشیدگی کو ہوا ملے گی۔

ضیا فتح آبادی ——— جے ۱۹۱۸ راجوری گارڈن نئی دہلی

جناب مظہر امام اور جناب حسن نعیم کا نام ان شعرا میں لیا جاتا ہے جو نئی نسل کو متاثر کر رہے ہیں۔ میرے استاد محترم علامہ سیماب اپنے زمانے کے مجتہد تھے اور میں بھی اجتہاد میں کسی قدر یقین رکھتا ہوں اس لئے مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مظہر امام صاحب نے "اقتباس" "شناس" کے ساتھ قافیہ "خاص" بھی صرف کیا ہے جسے صوتی اعتبار سے درست کہا جاسکتا ہے جبکہ حسن نعیم صاحب نے "بندہ" "کھندہ" کے ساتھ "زندہ" کا قافیہ بھی روا رکھا ہے ایسا شاید اس لئے کیا گیا ہے کہ صوتی اعتبار سے "بندہ" اور "زندہ" میں کوئی فرق نہیں۔ اعراب کی بات اور ہے اور تجربے یا اجتہاد میں اعراب کو اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ محمود سعیدی صاحب کی نہایت کامیاب غزل کے چھٹے شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ "کہ" استعمال ہوا ہے ویسے اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی مگر مجھے یاد پڑتا ہے کہ علامہ جوش ملسیانی نے بیانیہ "کہ" کے اس طرح استعمال کو غیر فصیح قرار دیا ہے لیکن یہ استادوں کی باتیں ہیں اور وہی بہتر جانتے ہیں۔ ظہیر غازی پوری صاحب کی غزل کا ایک مصرعہ ہے "لب پہ میرے آگئی تھی برگِ غول پیکر کی بات" یہ برگِ غول پیکر کی ترکیب میری ناقص سمجھ سے بالا ہے۔ ایک لفظ ہے "اماں" بمعنی پناہ۔ عام طور سے میں نے دیکھا ہے کہ اس کا نون ترکیبی صورت میں تو بولتا ہے جیسے "امان اللہ" مگر جب اسے تنہا استعمال کیا جاتا ہے تو نون خاموش رہتا ہے جیسے "نہ کہیں جہاں میں اماں ملی۔ جو اماں ملی تو کہاں ملی" (اقبال) مگر جناب ایم قمرالدین صاحب نے اپنے ایک شعر میں اسے یوں کہا ہے ؎

میں اپنی کئی حقیقتوں کو   خوابوں کی امان دے رہا ہوں

ممکن ہے میری معلومات محدود ہوں۔ کماریاشی صاحب کی نظم "اگنی پریکشا" سادہ ضرور ہے مگر اس میں طنز بہت تیکھا اور تیز ہے۔ اخترالایمان صاحب کے انٹرویو میں سچائیاں بھی ہیں اور گہرائیاں بھی مگر یہ کیا کہ وہ کوئی بات ترقی پسندوں کے خلاف سُن ہی نہیں سکتے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کو شاعر کا خراج عقیدت زمانے کی اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ آپ نے غالب و حالی کی تحریروں کے عکس دئے ہیں کیا علامہ سیماب کی تحریر آپ کے پاس نہیں جس کا عکس آپ دے سکیں۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو اندرونی ٹائٹل پر جہاں بانی اور بیادگار کا ذکر ہے وہاں ان کے اسمائے گرامی کیساتھ ان کے چہرے بھی رکھ دئے جائیں تو یاد کی تازگی میں اضافہ ہو جائے گا اور اب یہ کوئی مشکل کام نہیں۔

حیات افتخار ——— شعبۂ ادب، تامل یونیورسٹی، تنجاور (تامل ناڈو)

"سید سلیمان ندوی کے متعلق خصوصی مضامین شائع فرما کر آپ نے ایک دیرینہ کمی کو پورا کیا ہے۔ عام طور پر ان کی رسائی مذہبی حلقوں تک ہی محدود ہو چکی ہے۔ ایسے میں آپ نے ادبی طبقے کو ان کی علمی و ادبی خدمات سے واقف کرانے کا جو بیڑہ اٹھایا ہے اس کے لئے آپ لائق صد ستائش ہیں۔ اس سلسلے میں عبدالقوی دسنوی اور ڈاکٹر حامد اللہ ندوی دونوں ہی کے مضامین بے حد معلوماتی ہیں خصوصی طور پر ڈاکٹر حامد صاحب کا مضمون اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے مولانا موصوف کی سیاسی و علمی خدمات کو جامعیت کے ساتھ مختصر سے مضمون میں نہ صرف سمویا ہے بلکہ اس کے اختتام پر ابوالاعلیٰ مودودی کا رشتہ سرسید، شبلی اور سلیمان ندوی سے جوڑ کر ایک نیا انکشاف کیا ہے۔ ویسے میں اس بحث میں پڑے بغیر کہ یہ کہاں تک درست ہے بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ سرسید نے جس سائنٹفک نثر کی بنیاد رکھی تھی اس کی تجدید ابوالاعلیٰ مودودی نے کی اور اس شان سے کی کہ اس معاملے میں ان کا ثانی دور دور تک نظر نہیں آتا۔ مولانا موصوف کی شخصیت اور کارناموں پر اس نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہوئے اگر خصوصی مضامین شائع کئے جائیں تو یہ عین ادبی خدمت متصور کی جائے گی۔ ویسے ان کے متنازعہ فیہ سیاسی خدمات کے ذکر سے پہلو تہی کی جائے تو بہتر ہی ہوگا۔

افسانوی گوشے کے متعلق عرض ہے کہ اقبال متین کا افسانہ "دریدہ" بے حد پسند آیا۔ افسانے کو جس دلچسپ ڈھنگ سے انھوں نے آگے بڑھایا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے اور اختتام سے ایسے لگتا ہے کہ جیسے انہوں نے ملک کے موجودہ حالات خصوصاً دہشت پسندی کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا ہے۔ موجودہ حالات کے پس منظر میں ایک بیدار اور حساس ذہن پر کیا قیامت گزرتی ہے اسے بھی انھوں نے افسانے کی فضا کو بوجھل کئے بغیر نہایت ہی لطیف انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک طویل مگر عمدہ افسانے کی اشاعت پر مبارکباد۔

رفتار ——— علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

کتب و رسائل

● **دھوپ، سایہ اور میں** ہند و پاک کے مشہور شاعر وقار واثقی کا تیسرا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۱۵ روپے پتہ ۱۵۲۵، رسول آباد، شاہ عالم، احمد آباد (گجرات)

● **تعارف** (سہ ماہی) نئے رجحانات کا ادبی منظر نامہ تعارف" شاہد ساگری کی ادارت میں بہت جلد منظر عام پر آ رہا ہے، زرِ سالانہ ۲۰ روپے۔ قلم کار حضرات اپنی نگارشات سے نوازیں۔ پتہ: تعارف، ندیم اسٹورس ۱۱ فاروق کیمپ، بھوپال۔

● **جانچ اور پرکھ** معروف مصنف سردار احمد علیگ کے دل نشیں اسلوب میں لکھے گئے دس مقالات کا گرانقدر مجموعہ قیمت ۲۰ روپے پتہ: دفتر اکائی، سیڑھی والا گھر کرہ، شہاب خاں اٹاوہ (یوپی)

● **ایک شمارہ شفیع مشہدی کے نام** مشہور و معروف افسانہ نگار ڈرامہ نویس اور شاعر شفیع مشہدی کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ماہنامہ سہیل (گیا) کی ایک ادبی پیش کش اردو کے مشاہیر قلم کاروں کے مضامین سے مزین ایک قابلِ مطالعہ دستاویز صفحات ۱۲۵ قیمت ۶ روپے۔

● **شاہین** فنی آداب اور تہذیبی اقدار سے مزین، ادارہ شاہین کے زیر اہتمام شائع ہونے والا سالانہ مجلہ شاہین کا پانچواں شمارہ اقبال نمبر منظر عام پر آگیا ہے۔ قیمت ۵ روپے۔ پتہ: ادارہ شاہین لائبریری، شاہو نگر، جلگاؤں (مہاراشٹر)

● **خوشبو** نئی نسل کے جواں فکر شاعر عباس دانا کا اولین شعری مجموعہ خوشبو شائع ہو گیا ہے۔ طالب نقاش کا ترتیب دیا ہوا شعری مجموعہ عصری حسیت کا شعری شعور عطا کرتا ہے۔ صفحات ۱۳۰ پتہ: ۵ فتح منزل بمقابل سیتہ دیوکیمیکل، پرتاب نگر روڈ، بڑودہ (گجرات)

● **ابجد** نئی نسل کے منفرد اور تازہ کار شاعر مظفر ایرج کا شعری مجموعہ ابجد اپنے آپ میں نئی شعری روایت اور لفظ و معنی کے عصری رنگ و روپ لئے ہوئے ہے۔ ایک قابل مطالعہ کتاب جو جدید انسان کا منظر نامہ بھی ہے۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۳۰ روپے پتہ کہکشاں نوگام، سری نگر ۱۹۰۰۱۵ (کشمیر)

● **جو کہا نہیں جاتا** عظیم اقبال کے ۱۹ طبع زاد افسانوں کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ دیدہ زیب، سرورق، معیاری کتابت و طباعت صفحات ۱۱۲ قیمت ۲۵ روپے۔ پتہ: گنج I، بیتیا ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

وفیات

شاذ تمکنت

ہند و پاک کے ممتاز شاعر شاذ تمکنت ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء کی سہ پہر میں انتقال کر گئے۔ شاذ مرحوم جن کا پیدائشی نام مصلح الدین تھا، ۳۱ جنوری ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء کے لگ بھگ شاعری شروع کی اور پھر اپنے مزاج، شخصیت اور منفرد ہوتے ہوئے لہجے نے انھیں عصری اردو شاعری میں ایک بلند مقام عطا کر دیا۔ نظم و غزل دونوں ہی اصناف میں انھوں نے اپنی شعری شخصیت کی تشکیل کی اور جو کچھ کہا اس میں اپنا پن ضرور سمویا۔

شاذ تمکنت کی شاعری اپنا قاری اور سامع بہ آسانی پیدا کر لیتی ہے۔ شاعری میں نیم کلاسیکت اور عصری روانی لہجہ، جذب کی سی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی ان کی شاعری ہی کی طرح تھا، دھیما، غنودگی آلود لہجہ جو پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔

شاذ مرحوم کے تین شعری مجموعے تراشیدہ ، بیاض شام اور نیم خواب شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں ورق انتخاب کے عنوان سے ان تینوں مجموعوں سے ایک انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے۔

انور صابری

۱۳ر اگست کی شام کو ۶ بج کر ۲ منٹ پر علامہ انور صابری کا ۸۰ سال کی عمر میں ان کے وطن مالوف دیوبند میں انتقال ہو گیا۔

علامہ انور صابری اپنی شخصیت اور شاعری دونوں ہی سے بے حد متاثر کرنے والے تھے۔ کیا شاعری اور کیا تعلقات، محفل کی جان ہو جانا اور بہت دور تک رسوخ رکھنا، یہ ان کا خاصہ تھا۔ شاعری میں بیانیہ اور موضوعاتی نظموں کے ذریعہ وہ بڑے سے بڑے ہجوم کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ کوئی موقع ہو، موضوع ہو، علامہ کو ولولہ انگیز نظمیں کہہ لینے کا ملکہ حاصل تھا۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے حصول میں علامہ کی فکر انگیز نظموں نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

ملک گیر شہرت کے حامل انور صابری، شاعر، عالم اور پیر کی حیثیت سے بہت فعال رہے لیکن انھوں نے کبھی اپنے کلام کو کتابی شکل نہیں دی۔ بلا مبالغہ ہزاروں نظمیں اور غزلیں ان کے شعری سرمائے کے طور پر موجود ہوں گی کیوں کہ مرحوم نہایت ہی زود گو اور پُر گو شاعر تھے۔

پسماندگان میں بیوہ، تین لڑکے اور چار لڑکیاں شامل ہیں۔

بیگم آصفہ مجیب

مشہور ادیب اور دانشور پروفیسر محمد مجیب مرحوم کی بیوہ بیگم آمنہ مجیب کا ۱۲ر جولائی کی صبح پونے ۹ بجے ہولی فیملی ہسپتال دہلی میں انتقال ہو گیا۔ موصوفہ پچھلے دو تین برسوں سے علیل تھیں۔ چند ماہ پیشتر ہی مجیب صاحب کا انتقال ہوا تھا۔

۱۹۰۷ء میں پیدا ہونے والی بیگم آمنہ صاحبہ کو اردو زبان سے بے حد لگاؤ تھا، انھیں بچوں کی نفسیات سے خصوصیت کے ساتھ دلچسپی تھی۔ آسان اور سلیس زبان میں وہ دل پذیر نثر لکھتی تھیں۔ ان کی یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) پرندے اور دوسرے افسانے (۲) خرگوش کی چال (بچوں کے لئے) (۳) جیب اور داب (بچوں کے لئے) (۴) اس نے کیا کرنا تھا (بچوں کے لئے)

ناظم انصاری

مشہور طنز و مزاح نگار شاعر ناظم انصاری کا ۲۴ر اگست کو دہلی ناگپور سفر کے دوران ٹرین میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم دہلی کے دو اہم مشاعروں میں شرکت کر کے اپنے بھانجے کے ساتھ آندھرا پردیش ایکسپریس سے واپس ہو رہے تھے کہ سفر کے دوران نیند کا ایسا غلبہ طاری ہوا کہ وہ پھیل کر ایک مستقل نیند بن گیا۔

ناظم انصاری ۲ر جنوری ۱۹۲۹ء کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ گھریلو اور کاروباری معروفیات مانع رہیں۔ مرحوم کے بڑے بھائی محمد حنیف (حنیف بک ڈپو) نے ان کی تربیت اور آسائشوں کی فراہمی میں بڑا اہم کردار ادا کیا کئی طرح کے کاروبار کے بعد ۱۹۶۵ء سے پرنٹنگ پریس ہی ان کے معاش کا ذریعہ بنا۔

ناظم انصاری گزشتہ پندرہ برسوں سے ہندوستان کے طول و عرض میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں اپنے ظریفانہ کلام اور اندازِ پیش کش کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔ ہر بڑا مشاعرہ ان کی شمولیت کے بغیر ادھورا تھا۔ نہایت ہی مخلص، پرہیزگار، سادہ اور دردمند انسان تھے یہی وجہ تھی کہ موجودہ دور کے مشاعروں میں در آنے والی لعنتیں ان کو چھو کر بھی نہیں گزری تھیں وہ سب کے ساتھ شامل بھی اور ہر ایک سے الگ بھی۔

ان کے کلام کا مجموعہ گر کبھی کے پھول ۱۹۸۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔
پسماندگان میں بیوہ ایک لڑکی اور چھ لڑکے شامل ہیں۔

اظہارِ غم ان کے لئے بھی..........

انور رشید (افسانہ نگار ۲۹/جولائی) رضا چکدیوی (شاعر ۲/جولائی) انور حسین انور (شاعر ۷/اگست) کامل فتح پوری (شاعر ۱۹/اگست) جوگیشور دیال نشتر۔ اطہر لکھنوی۔ رفعت لکھنوی۔ توکل حسین منیر سلطان پوری۔

بقیہ صفحہ ۹۶ تاج محل جائے

یہ اپنی محرومیوں کو خود فراموشیوں کے دلدل میں چھپاتے ہوئے لوگ۔
یہ مسکین / چالاک / خود غرض / بے نیاز / ظالم / رحم دل / سر پھرے / مصلحت پسند / لوگ!
یہ لوگ وہاں بھی ہیں اور یہاں بھی۔
ان دونوں لوگوں کے درمیان دو پٹریاں ہیں جو ساتھ ساتھ چلتی ہیں مگر مل نہیں پاتیں۔
انھیں علیحدہ علیحدہ پٹریوں نے مجھے یہاں سے وہاں پہنچایا تھا اور یہی پٹریاں مجھے واپس لارہی تھیں۔
ان پٹریوں پر لاکھوں کروڑوں لوگ ادھر سے ادھر دوڑتے ہیں۔
پٹریاں جو ساتھ ساتھ چلتی ہیں مگر مل نہیں پاتیں۔ ○○

بقیہ صفحہ ..۔ متوازی لکیریں

"میری نند کو بھی ایسی ہی بیماری لگی تھی، وہ بہت چلاتی تھی۔ بہت تکلیف تھی اسے۔ ویسے میری اور اس کی سبھی سہیلیاں تو اسے جوانی کی نشانی ـــــ خیر ان کی بات چھوڑ دیئے میں ایک ایک کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ کمینیاں کہیں کی۔ سب کی سب پھنس چکی ہیں اس بیماری میں ـــــ "ڈاکٹر جی اسے ٹھیک کر دیجئے پیسے چاہے جتنے بھی خرچ ہو جائیں اس کی پرواہ نہیں۔ میری معصوم بچی" اس نے لڑکی کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور وہ لڑکی جھلّا اٹھی اور غصّے سے بولی" ممّی"

"ڈاکٹر جی اگر یہ تکلیف سے روئے گی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا، اسے ایسی دوا دیجئے کہ بیماری یہیں دب جائے سُنا ہے کوئی جاپانی دوا آگئی ہے بازار میں" اس نے وثوق سے کہا۔

میں نسخہ لکھ کر اور اپنی فیس لیکر باہر بالکونی میں آئی جہاں اُونچی اُونچی بلڈنگیں قطار اندر قطار میرے سامنے ایک سمندر کی طرح پھیلی ہوئی تھیں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے ہاتھوں میں میڈیکل بکس نہیں بلکہ پُرانا خالی فارمول والا پلندہ ہے جسے میں نے لوگوں سے ملنے کے بعد پُر کرتا ہے۔ ان آنکڑوں کو بھرتا ہے جواب پھر جمع کرنے ہیں۔ مجھے ایک اور سمندر کو کھنگالنا ہے جو جھونپڑیوں کے سمندر کے متوازی حدِ نظر تک پھیلا ہوا ہے۔ میرا دماغ پرلے نہیں کس پار رہا ہے کہ اس دنیا کے جرائم۔ اس بپھرے ہوتے سمندر کی لہریں اوپر سے نیچے کی طرف جارہی ہیں کہ نیچے سے اوپر کی طرف۔ ○○

◎ زرِ سالانہ ختم ہونیکی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری اگست ستمبر ۸۵ء کے ساتھ ختم ہو چکا ہے ازراہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۴۸ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ اُمید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے مزید نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

● پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر لعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دہیں سے شائع کیا ●

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

بہ یادگار اعجاز صدیقی (مرحوم)

اشاعت کا ۵۶واں سال

علمی، ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ۵۶ — شمارہ ۱۰

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زر سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالک غیر سے
۴۰ روپے	۱۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۲۵۰ روپے ہندوستانی

قیمت ۴ روپے

فون:- ۳۵۹۹۰۴

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس

بمبئی - ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶

بمبئی - ۴۰۰۰۰۸

درسِ دیوالی

دیتی ہے انگنت چراغوں کی روشنی
پیغامِ خوشحالی، تسکین و اطمینان، راحت و آسودگی
اتحاد، بھائی چارگی و محبت کے رشتے
ہوتے ہیں مستحکم اس دیوالی سے

ہم سبھوں کی جہد سے ہو سکتی ہے نیست و نابود
تفرقہ بازی، دغابازی و عیاری کی تاریکیاں
کرکے دیوالی میں خوش اخلاقی، خوش مزاجی و ملنساری
کا چراغاں
اس روشنی کا پھیلاؤ۔
بنا سکتا ہے، دیش باسیوں کو آسودہ حال
یہی ہے غرض و غایت دیوالی کی

نشر: اطلاعات و رابطۂ عامہ، حکومت مہاراشٹر

شمارہ ۵

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

سفر نامہ

بساطِ سخن

جرعات

آثار لفظ لفظ

بازیافت

چہرہ چہرہ یادیں

بے صورت گر

رفتار

اردو اکاڈمیاں ادبی رسائل کی طرف بھی توجہ دیں

اردو میں ماہنامہ رسائل کی تاریخ "خیر خواہ ہند" [۱۸۳۶ء] سے ملتی ہے اور اب ۱۹۸۶ء میں اس کو ڈیڑھ سو سال مکمل ہو جائیں گے۔ ان ڈیڑھ سو برسوں میں اردو کے بے شمار علمی و ادبی ماہنامے نکلے اور بند ہو گئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جنھوں نے ادبی رسائل کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہر دور میں ادبی ماہناموں کے اپنے مسائل رہے ہیں۔ لیکن اب جب کہ ہم بیسویں صدی کے اختتام پر ہیں اور ارتقاء کی بے شمار منزلوں سے گذر چکے ہیں۔ لہٰذا ایک صدی قبل کے مسائل اگر آج بھی باقی ہیں تو اس پر بے انتہا حیرت ہوتی ہے اور افسوس بھی۔

اردو کے ادبی رسائل کی موجودہ صورت حال نے اس احساس کو زیادہ شدت دی ہے کہ آج جب اردو کے نام پر سالانہ لاکھوں کروڑوں روپے پانی کی طرح ضائع ہو رہا ہے۔ چند گنے چنے ادبی ماہنامے اپنے بنیادی مسائل میں اور زیادہ گھر گئے ہیں۔ وہ ادبی رسائل جن کی علمی و ادبی خدمات کسی گراں قدر کتاب یا شخصیت سے کم نہیں۔ وہ ادبی رسائل جو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں سب سے زیادہ معاون ہوئے جن سے نامور قلم کاروں نے شہرتیں حاصل کیں۔ ادبی رسائل سے گذر کر وہ اپنی شناخت بنا سکے۔ اور کسی مقام تک پہنچے۔ اب اکیسویں صدی سے قریب ہوتے ہوئے بھی انیسویں صدی کے اوائل سے باہر نہیں آسکے ہیں۔ اس کی ایک دو نہیں بلکہ متعدد وجوہ ہیں۔ جن کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

دسمبر کے آخر میں دہلی اردو اکاڈمی اردو صحافت کے موضوع پر کل ہند ورکشاپ سیمینار کر رہی ہے جس میں اردو کے ادبی رسائل کے مسائل بھی ایک موضوع ہے۔ اپریل ۱۹۷۹ء میں یوپی اردو اکاڈمی نے اسی موضوع پر ایک معیاری سیمینار کا انعقاد کیا تھا جس میں بیس سے بھی زائد مدیرانِ جرائد نے شرکت کی تھی۔ اور مقالے پڑھے تھے۔ اس موقع پر ادبی رسائل کی ایک کل ہند تنظیم کی تجویز بھی رکھی گئی تھی۔ اور ایک ایڈہاک کمیٹی بھی بنا دی گئی تھی۔ لیکن بات تجاویز سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ اب جب کہ اردو صحافت پر کل ہند سطح کا سیمینار ہو رہا ہے تو جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر دہلی اردو اکاڈمی کو بنیاد بناتے ہوئے اور کرناٹک اردو اکاڈمی کی قابل تقلید مثال دیتے ہوئے یہ کہا جائے کہ ہندستان بھر کی اردو اکاڈمیاں چند ایک مستحق ادبی رسائل کے لیے کوئی ٹھوس قدم اٹھائیں۔ ادبی رسائل کی کسی کل ہند تنظیم کو تشکیل دیں۔ اردو اکاڈمیاں جو بھی اہم کام اردو کے لیے اس کے ادب کے لیے کر رہی ہیں۔ ان میں ادبی رسائل کی اعانت اور سرپرستی کو مقدم سمجھیں ادبی رسائل کے مسائل پر سیمینار منعقد کریں۔ صوبائی اور مرکزی سطح پر ادبی رسائل کے لیے بھرپور کوشش کریں۔ اپنے وسائل سے ادبی رسائل کو ہر ممکنہ فائدہ پہنچائیں تاکہ وہ چند ادبی رسائل جن کی اپنی خدمات بھی ہیں ایک نئی زندگی کو جی سکیں۔

دہلی اردو اکاڈمی چونکہ اردو صحافت کے موضوع پر سیمینار کر رہی ہے اور دہلی سے قدیم ترین رسالہ "دہلی سوسائٹی" [۱۸۴۶ء] وغیرہ سے علمی و ادبی رسائل کی ایک شاندار تاریخ بھی بنتی ہے۔ چنانچہ کیا ہی اچھا ہو کہ اس سیمینار و ورکشاپ ہی سے ادبی رسائل کے لیے تعمیری عملی کاموں کا آغاز کیا جائے اور ہندوستان کی دیگر اردو اکاڈمیاں اس سلسلے کو آگے بڑھائیں۔

بازیافت

لفظ	زبان	صفحہ	معنی	تذکیر و تانیث	شاعر	شعر ثبوت	
شوق	ع	۴۰۶	بڑھی ہوئی خواہش	مذکر	امیر	امیر اتنا ہوا ثابت کشاکش سے محبت کی	مسافر کو لئے جاتا ہے کھینچے شوق منزل کا
شوکت	"	۴۲۶	بروزن رغبت - ہیبت - دبدبہ - قوت رعب داب جاہ و جلال	مونث	انیس	اللہ رے شوکت شرفائے دہ بجا کی	اسلام کا لشکر تھا کہ قدرت تھی خدا کی
شوہر	ف	۵۱۱	خاوند - خصم	مذکر	تسلیم	زال دنیا نہیں دو دن بھی کسی کی پابند	اک خاوند زنا لیتی ہے شوہر اپنا
شہ	"	۳۰۵	بادشاہ	"	امیر	تم بھی نکلو اپنے گھر سے اے شہ اقلیم حسن	تختِ گردوں پہ شہِ خاور برآمد ہو گیا
			اشارہ - اشتعال - کشت جو شطرنج کے بادشاہ کو لگتی ہے۔	مونث	امیر	شہ جو پائی نگہِ شاہِ ظفر پیکر کی	آبرو چھین لی اشکوں نے مرے گوہر کی
شہاب	ع	۳۰۸	بکسر اول - وہ چمکتا ہوا ستارہ جو آسمان سے گرتا یا آسمان پر ادہر اُدہر آتشبازی کی طرح جاتا ہوا نظر آتا ہے	مذکر	دبیر	یاں مہر کے نیچے میں شہاب فلک آیا	کی رد و بدل نیزی کی خوب اسکو تھکایا
شہاب	ف	۳۰۸	ایک رنگ کا نام ہے جو سرخ ہوتا ہے	"	اشک	کون کہتا ہے اس میں آب بھرا	حوض میں آ کے سب شہاب بھرا
شہادت	ع	۴۱۰	راہِ خدا میں قتل ہونا - مارا جانا -	مونث	انیس	مژدہ یہ سن کے چہرہ پہ سرخی سی چھا گئی	گویا کہ ابتدا رنگ شہادت جما گئی
"	"	"	گواہی -	"	داغ	حشر میں تجھ سا جفا کار، خدا سا منصف	دل سا انصاف طلب اور شہادت میری
شہباز	ف	۳۱۵	بڑا باز - ایک شکاری پرندہ ہے۔	مذکر	انیس	گیا اڑ ارخش کہ طاؤس لعبدنا ز اڑا	دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اڑا
شہپر	ف	۵۰۷	پرندوں کا اڑنے والا پر	"	ناسخ	ذکر پرواز تو کیا تنگ ہوا ایسا یہ چمن	جھاڑ بھی سکتے نہیں ہم کبھی شہپر اپنا

اردو زبان کا ایک بے نظیر لغت معین الشعراء مصنفہ غلام حسین خان، آفاق بنارسی مرحوم۔ یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی صحت کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہے کہ وہ کس زبان کا ہے، مذکر ہے یا مونث، نہ صرف یہی بلکہ اساتذۂ ماضی و حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔ سائز ۱۸×۲۳/۴ مجلد، کاغذ دبیز اور چکنا حجم ۳۸۶ صفحات۔

معین الشعراء ایک نایاب لغت ہے جس کا اشتہار شاعر (آگرہ) کے ۱۹۳۹ء کے شماروں میں دیا جاتا رہا تھا۔ لغت کے ایک صفحے کی معلومات کا عکس شاعر (آگرہ) کے شمارہ اکتوبر ۱۹۳۹ء سے لیا گیا ہے۔
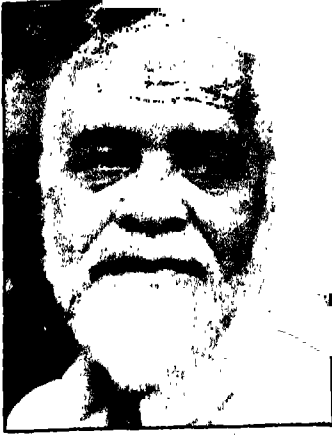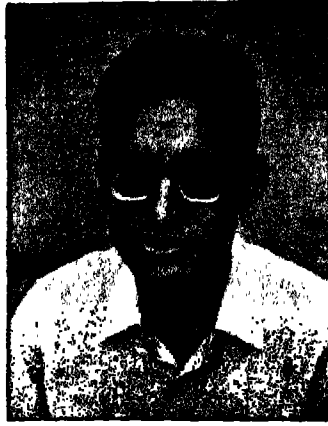
یہ صورت گر

سردار جعفری

گیان چند

خلش بڑودوی

شاہد انصاری

ناز قادری

مہدی ٹونکی

ساغر پالنپوری

عالم خورشید

ہلال فرید
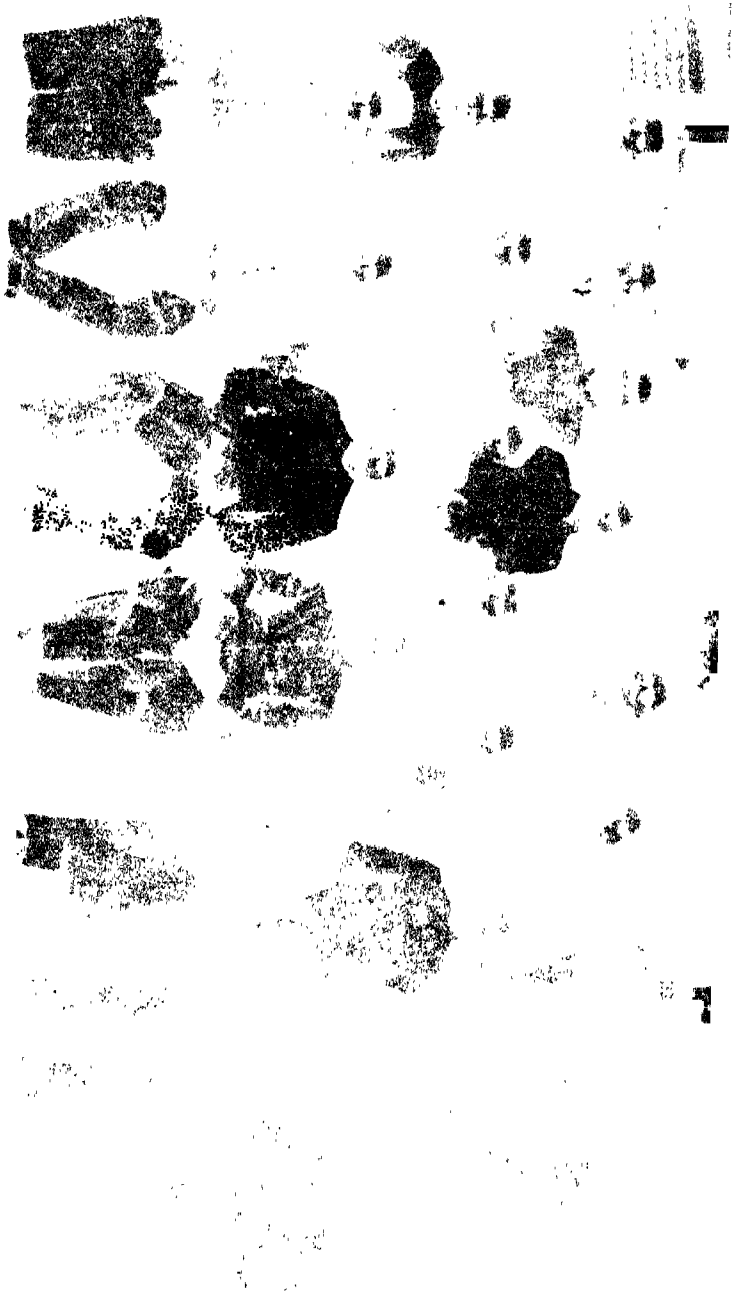
بزم ادب بھساول کے زیر اہتمام ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کے ایک کل ہند مشاعرے کی یادگار تصویر نشستوں پر (بائیں سے دائیں) منشی عباس (سکریٹری)، پروفیسر شور (علیگ)، ماہر القادری ، قدیر لکھنوی ، بہزاد لکھنوی، شفیق جونپوری ، اقبال صفی پوری،

قطار اول (بائیں سے دائیں) بے دھڑک اندوری ، آباد لکھنوی ، قمر بھساولی ، طالب لکھنوی ، شکیل بدایونی ، خمار بارہ بنکوی ، نظم اکبرآبادی ، شوق ماہری کھنڈوی ، — قطار دوم (بائیں سے دائیں) ادیب مالیگانوی ، نور احمد خاں ، ادیب سہارنپوری ، مجروح سلطانپوری ، سیٹھ عبدالکریم ، سیف بھساولی محمد ابراہیم اور عتیق احمد عتیق

(بہ شکریہ سیف بھساولی ، بمبئی)

دل شاہجہانپوری (پ ۱۸۷۵ء — م ۱۹۵۹ء) بنام اعجاز صدیقی

سردار جعفری

چہرے

یہ بیکس و بیقرار چہرے
صدیوں کے یہ سوگوار چہرے

مٹی میں پڑے دمک رہے ہیں
ہر دن کی طرح ہزار چہرے

لیجا کے انھیں کہاں سجائیں
یہ بھوک کے شاہکار چہرے

افریقہ و ایشیا کی زینت
یہ نادر روزگار چہرے

غازے سے سفیدے سے رنگین
اِس دَور کے داغدار چہرے

پھیکے ہیں فروغِ زر کے باوصف
تابندہ ہیں خاکسار چہرے

گذرے ہیں نگاہ و دل سے ہوکر
ہر طرح کے بے شمار چہرے

مغرور انا کے گھونسلوں میں
بیٹھے ہوئے کم عیار چہرے

ناقابل التفات آنکھیں
ناقابل اعتبار چہرے

شہرت سربلند آسماں پر
چھٹتے ہوئے سے انار چہرے

پل بھر میں مگر دھواں دھواں سب
پل بھر میں فقط غبار چہرے

سونے کا چڑھا ہوا ہے پانی
اشارے شاندار چہرے

پہنے ہیں نقاب پارسائی
جنت کے کرایہ دار چہرے

ان سب سے مگر حسین تر ہیں
رندوں کے گناہ گار چہرے

ہنستے ہوئے نیزہ و سناں پر
وہ شبنم نوک خار چہرے

چپکے چپکے سُلگ رہے ہیں
آتش گرِ بہار چہرے

اُمید کی شمع سے فروزاں
شائستہ انتظار چہرے

سیتا محل فلیٹ نمبر ۱۰ - پہلا منزلہ بھومن جی پیٹیٹ روڈ - بمبئی ۲۶

غالبؔ کے بعض غیر متداول اُردو اشعار کا زمانۂ فکر

کالی داس گپتا رضا

۲-۱-اے، جل درشن، ۲۳، اے، چوتھا منزلہ، نیپنسی روڈ بمبئی - ۶

دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) جناب امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کا عظیم کارنامہ ہے۔ غالبیات پر تحقیق کرنے والے اس سے ہمیشہ استفادہ کرتے رہیں گے۔ عرشی صاحب نے یہ دیوان کچھ اس طرح مدوّن کیا ہے کہ بہت سی دوسری خوبیوں کے ساتھ غالبؔ کے کلام کا عہدِ تخلیق بھی، ماخذوں کی نشاندہی کے سبب سے، ایک حد تک متعیّن ہو گیا ہے۔ تاہم بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن کا عہد معلوم نہیں ہو سکا۔ میں نے ذیل میں ایسے اشعار کا زمانۂ فکر متعیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔ روایتیں بیشتر وہی ہیں جو نسخۂ عرشی میں بیان ہوئی ہیں مگر کوشش کی گئی ہے کہ اصل ماخذوں کو بنظرِ خود دیکھ لیا جائے اور اگر ہو سکے تو اپنے کتب خانے سے ان کو مزید تقویت پہنچائی جائے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ اس کے بعد نتائج کے لئے میں نے نئے ماخذوں اور اپنے فہم ہی پر بھروسا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے اور خاص طور پر ان مقامات سے، جہاں میں نے قیاس سے کام لیا ہے، ہر دانشور کو اختلاف کا حق حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون غالبؔ پر ایک بڑے کام کا پیش خیمہ ہے۔ اس لئے آپ کی مثبت یا منفی رائے کے بغیر کام سرے نہیں چڑھ سکتا۔

اب اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ پہلے غالبؔ کے اشعار دیے جاتے ہیں اور بعد میں اشعار کے زمانۂ فکر کے تعین کی کوشش میں اپنے معروضات پیش کروں گا۔

ہاتفِ غیب سُن کے یہ چیخا　　ان کی تاریخ، میرا تاریخا

جناب احسن مارہروی مرحوم نے اپنی کتاب "مکاتیب الغالب" (ص ۳۵) پر لکھا ہے:

> "راقم الحروف (احسن مارہروی) سے مرزا کی اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت صاحب نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ کی ولادت کس سنہ میں ہوئی اور یہ بھی اطلاع دی کہ میری ولادت لفظ "تاریخ" سے نکلتی ہے۔ جس کے عدد ۱۲۱۱ھ ہوتے ہیں۔ مرزا نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا۔ ہاتفِ غیب الخ ـــــــــ"

جناب صاحبِ عالم مارہروی، جن کی مرزا بہت عزت کرتے تھے، مرزا سے ایک سال پہلے پیدا ہوئے اور تین سال بعد فوت ہوئے یعنی ان کی ولادت ۱۲۱۱ھ کو اور وفات ۱۲۸۸ھ کو ہوئی۔ صاحبِ عالم، ان کے صاحبزادے شاہ عالم اور عبدالغفور سرورؔ (جن کے خطوں میں صاحبِ عالم کے کئی خط شامل ہیں) کے نام کے خطوط جو آج تک دستیاب ہوتے ہیں وہ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۶ء تک کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ یہ شعر ان خطوں میں درج نہیں۔ ہو سکتا ہے انھیں دنوں میں کبھی لکھا گیا ہو گر خط محفوظ نہ رہا ہو۔ اس لئے اس شعر کو ۱۸۵۸ء کے بعد کا اور ۱۸۶۶ء سے پہلے کا کہا ہوا ہی کہا جا سکتا ہے۔

تھا تو خط، پر، نہ تھا جواب طلب　　کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

شعر چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام کے خط میں لکھا ہے۔ خط پر تاریخ درج نہیں مگر قرائن سے پتا چلتا ہے کہ یہ ۱۸۶۲ء کا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "غالب کے خطوط"، جلد دوم ص ۶۱۱، مرتبہ خلیق انجم۔

خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا　　ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا

یہ شعر "مکتوبات امیر مینائی" مرتبہ مولوی احسن اللہ خاں ثاقب صفحہ ۱۲ کے حاشیے سے ماخوذ ہے۔ ثاقب نے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے بارے میں متن میں لکھا ہے "نواب ناظم کا پہلا دیوان جو عرصہ ہوا چھپا تھا اور اب کم یاب ہے، مرزا غالب کا دیکھا ہوا ہے۔"

حاشیے میں لکھا ہے "خاکسار کو جولائی ۱۹۰۸ء میں خوابیدگانِ نزہت گاہ تقدس کی توجہ اور (رباعی)

فرخندہ جہان بے مثالی — ممدوحِ ادانی و اعالی
پرایۂ صدق و مایۂ فضل — شمس العلماء جناب حالی

کا اشتیاقِ زیارت پانی پت لے گیا۔ میں ایک روز یہ مسودہ ان کو سنا رہا تھا۔ جب اس مقام پر پہنچا تو مولانا نے فرمایا کہ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ فرماتے تھے کہ ایک روز مرزا غالب نے مجھے یہ مطلع سنایا۔ میں نے بہت تعریف کی، تو فرمایا کہ "بھیا میں تو یہ شعر ناظم کو دے چکا، مطلع خوشی جینے کی الخ" اس کے قطع نظر کہ یہ شعر دیوان ناظم (نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور) میں شامل نہیں، یہ کوئی ایسی تخلیق نہیں جس پر شیفتہ یا غالب سر دھنتے۔ نواب رام پور (ناظم) ۱۸۶۵ء میں فوت ہوئے۔ اس لئے شعر یقیناً اس سے پہلے کا ہے۔

دیوانِ ناظم مطبوعہ ۱۲۷۸ھ ص ۲۱۹ پر سلام کے مقطع کا پہلا مصرع دیکھئے

"ہم کیا ہیں ناظم اور ہمارا سلام کیا"

شعر سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن اس مصرع کا اسلوب وہی ہے جو شعر کے مصرعِ ثانی کا ہے۔

دو رنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی ہیں سب — کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی — روزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا
وہ مُرغِ بے خزاں کی صعوبت سے بے خبر — آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

یہ شعر نواب علاؤالدین احمد خاں مرحوم والیِ لوہارو کی بیاض سے لئے گئے تھے۔ قیاس چاہتا ہے کہ کلام ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے، اگر بعد کا ہوتا، تو اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ ایک ایک دو دو شعر لکھے نہ ملتے بلکہ پوری غزلیں یا زیادہ اشعار مندرج ملتے۔ شعروں کے قافیے اور ردیفیں ظاہر کرتے ہیں کہ یہ التزام سے کہی ہوئی پوری غزلوں میں سے ہیں۔

نواب علائی ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ پندرہ بیس سال کی عمر میں یہ اشعار ان کے ہاتھ لگے ہوں گے۔ واللہ اعلم

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قُل — کچھ ہے جوگ مایا اور دیبی
نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا — مگر ہاں، نام کو اورنگ زیبی

دیبی سے مراد کالی دیوی ہے۔ جس کی پوجا ہزاروں برسوں سے ہو رہی ہے۔ دلّی میں اس دیوی کا مندر ۹ میل دور تغلق آباد کی طرف ہے۔ جوگ مایا کا مندر مہرولی میں ہے جہاں ہفتہ وار میلہ لگتا ہے۔ مہرولی ہی میں ساون میں پھول والوں کی سیر کے نام سے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر میلہ لگتا تھا اور اب بھی لگتا ہے۔ ظاہر ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب مغلیہ سلطنت کا نام و نشان مٹ گیا، تو اس میلے کو شاہی سرپرستی حاصل نہ رہی۔ اس لئے یہ میلا اس جوش سے جاری نہ رہا مگر اسے ہندوؤں نے سہارا دیا اور خواجہ صاحب کے مزار کے ساتھ انھوں نے اپنی توجہ جوگ مایا کے مندر کی طرف مبذول کر لی۔ چنانچہ سید احمد دہلوی (فرہنگ آصفیہ جلد اوّل) لکھتے ہیں "غدر کے بعد سے اس میلے نے اور بھی ترقی کی یعنی خاص اہلِ ہنود کی طرف سے بدھ کے روز جوگ مایا پر ایسے ہی دھوم دھڑکّے سے پنکھا چڑھنا شروع ہو گیا۔ سات سات اور نو نو پنکھے آگے پیچھے ہوتے ہیں ..."

یہ قطعہ اسی عہد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لئے اس کا زمانۂ فکر ۱۸۵۹ء کے قریب ہو سکتا ہے۔

ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں   بزم شادی ہے فلک، کاکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو   ہے تو کشتی میں، و لے بحر رواں ہے سہرا

یہ شعر مولانا مہر نے اس قلمی نسخۂ دیوانِ غالب سے نقل کئے ہیں، جو بیگم مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں دہلوی کی ملکیت میں تھا۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ انھوں نے "بیاضِ علائی" میں بھی انھیں دیکھا ہے۔ بظاہر یہ اس پورے سہرے کے دو شعر ہیں جو مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب شاگرد غالب (۱۸۴۰ء تا ۱۸۶۹ء) کی شادی پر کہا گیا۔ ثاقب کے سب سے بڑے صاحبزادے مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں ۲۳/ دسمبر ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے شادی مارچ ۱۸۶۱ء یا اس سے پہلے ہوئی ہوگی۔ شادی نواب شمس الدین احمد خاں والیٔ فیروز پور جھرکا کی نواسی سکندر جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔

۱۔ اِک دن بگولا سا جو کچھ میں، جوشِ وحشت میں   پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اِک طائرِ مجروح پر بستہ   ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ "او گمنام، آخر ماجرا کیا ہے؟   پڑا ہے کام تجھکو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا   تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا "میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں   پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے
اُسی کے زُلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو   نہ مطلب کفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے
بچشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا   کہ جل کر ہو گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے

۲۔ ایک اہلِ درد نے سُنسان جو دیکھا قفس   یوں کہا "آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب
بال و پَر دو چار دکھلا کر، کہا صیّاد نے   "یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

یہ قطعہ رسالۂ مخزن اپریل ۱۹۰۷ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا:

"تھوڑے دن ہوئے میجر سیّد حسن صاحب بلگرامی سے تذکرۂ شعراء ہو رہا تھا۔ جس میں انھوں نے غالب کا ایک قطعہ سُنایا۔ قطعہ کے عمدہ ہونے میں کیا شک ہے مگر اس کے ساتھ ہی ان کے اس بیان نے کہ یہ قطعہ ان کے والدِ مرحوم سے ان کو پہنچا اور اب تک غالب کے کسی کلام میں شائع نہیں ہوا، اس کی خوبی زیادہ کر دی۔ میں نے ان سے لکھ لیا۔ اور ان کی اجازت سے مخزن کو بھیجتا ہوں ——— شیدا از کیمبرج"

مولانا نظامی بدایونی مرحوم نے اپنی شرحِ دیوانِ غالب ص ۲۸۴ میں اس قطعے اور قطعہ نمبر ۲ کے متعلق لکھا ہے کہ:

سب سے پہلے ان قطعات کا اضافہ طبع سوم میں اس ریمارک کے ساتھ ہوا تھا کہ بعض نقادانِ سخن ان قطعات کے طرزِ بیان کو حضرتِ غالب کے رنگ سے جداگانہ سمجھتے ہیں۔ اس پر طبعِ سوم کے ناظرین میں سے بعض اہل الرائے حضرات نے شکایت کی کہ ان قطعات کو دیوانِ غالب میں جگہ دینا غالب کے کلام کی توہین کرنا ہے۔ ہم نے نواب عماد الملک (میجر سیّد حسن بلگرامی کے بھائی) سے ان کے متعلق دریافت کیا۔ وہ فرمانے لگے کہ وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کے مصنفہ ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک بزرگ سے سُنے تھے، جو ان کو غالب سے منسوب کرتے تھے ممکن ہے یہ غالب کا ابتدائی کلام ہو۔

یعنی (۱) شیدا نے ان اشعار کو میجر سیّد حسن صاحب بلگرامی سے لیا اور سیّد حسن صاحب کو یہ ان کے والد صاحب سے پہنچے اور (۲) نظامی بدایونی صاحب کے دریافت کرنے پر سیّد حسن صاحب کے بھائی نے تصدیق کی کہ انھوں نے انھیں اپنے ایک بزرگ سے (اپنے والدِ مرحوم سے نہیں) سُنا تھا اور اس لئے وہ یقین کے ساتھ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کے مصنفہ ہیں۔ "ممکن ہے یہ غالب کا ابتدائی کلام ہو"۔

قطع نظر اس کے کہ یہ روایت خاصی ضعیف ہے، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ بیانیہ قطعہ (اور اس کے بعد کا صدائے عندلیب، والا قطعہ بھی) غالب کے ہم عصروں، ذوق و مومن، کے ان بیانیہ قطعوں کے سامنے بھی کم مایہ ہے۔ جنھیں ہم غالب کی عظمت سے مرعوب ہو کر کوئی مقام دینے سے جھجکتے ہیں۔ دونوں کے یہاں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ذوق

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی ہو سو مہینے
نہ تھی شب، ڈال رکھا تھا اک اندھیرا — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
کہا جی نے مجھے، یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا — تری آواز مکے اور مدینے

مومن

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ سب جسے — کہتے تھے مومن اور بہت دیندار تھا
کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں — جو تھا سو اس کو دیکھ کے زار و نزار تھا
بیمار کر دیا شبِ ہجرِ بتاں نے آہ — کیا ہو گئے وہ روز کہ پرہیزگار تھا
یا تو ہمیں ڈراتے تھے خورشید حشر سے — یا اپنے سر پہ داغ جنوں شعلہ بار تھا
اختر شماریِ شبِ غم نے بھلا دیا — جتنا خیالِ پُرسشِ روزِ شمار تھا

(وغیرہ وغیرہ)

اگرچہ غالب بیشتر غزل ہی کے شاعر تھے، تاہم انھوں نے قصیدے اور مثنوی میں بھی کم و بیش اپنے قائم کردہ معیار کو قائم رکھا ہے۔ ایسے قطعات ؎

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اے شہنشاہِ آسماں اورنگ

میں بھی انھوں نے اپنی طبیعت کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ سید حسن بلگرامی صاحب کے فراہم کردہ قطعات اسی عہد کی پیداوار ہیں جس عہد میں غالب نے "ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی"، والا کلام تخلیق کیا تھا، یعنی ۱۸۰۷ء اور زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۰ء۔

گاتی تھیں تمرو کی بیگم تمنا ہا یا ہو — دودھ میں پکے تھے شلغم تمنا ہایا ہو

مولوی احتشام الدین مرحوم نے اپنے مضمون "غالب کے بعض غیر مطبوعہ اشعار اور لطیفے" (ماہِ نو فروری ۱۹۵۰ء) میں لکھا ہے "یہ مطلع بھی مرزا کی ایک مہمل غزل کا ہے، جو بچوں کے جھولے میں گانے کے لئے موزوں فرمائی تھی ..." ظاہر ہے کہ یہ چوچلے مرزا کو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی سوجھ سکتے تھے۔

جو حدِ تقویٰ ادا ہو رہے، تو اپنا مذہب یہی ہے، غالب — ہوس نہ رہ جائے کوئی باقی، گناہ کیجے تو خوب کیجے

رام پور رضا لائبریری کے نسخۂ تذکرۂ گلزارِ سخن مولفہ جگن ناتھ فیض کے، جو ۱۹۰۸ء میں نولکشور پریس میں طبع ہوا ہے، صفحہ ۲۹۷ پر غالب کا تذکرہ ہے۔ اس صفحے کے زیریں حاشیے میں کسی چنی لال عاصی نے مطالعہ کرتے وقت غالب کے تحت یہ شعر لکھا ہے۔ یہ غالب کے اس مشہور شعر کی پہلی روایت معلوم ہوتی ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگران کردہ گناہوں کی سزا ہے

اگر اسی نتیجے کو صحیح مان لیا جائے تو یہ شعر جو حدِ تقویٰ... الخ ۱۸۲۱ء سے پہلے کی تخلیق قرار پائے گا کیونکہ ناکردہ گناہوں الخ والا شعر نسخۂ بھوپال اکتوبر ۱۸۲۱ء میں موجود ہے۔

آپ نے مَسّنی الضُّر کہا ہے تو سہی — یہ بھی، یا حضرتِ ایوب گلا ہے تو سہی

رنجِ طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر؟ — ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی

ہے غنیمت کہ بامید گزر جائے گی عمر — نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

دوست گر کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری — نہ سہی لیک تمنائے دوا ہے تو سہی

غیر سے دیکھئے، کیا خوب نباہی اس نے — نہ سہی ہم سے، پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں — کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آ جائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی غالب — شہرۂ تیزیٔ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

یہ غزل مولانا مہر نے غالب ص ۳۰۴ (طبع اوّل) میں دیوانِ غالب کے مخطوطہ بیگم تاباں (حاشیہ ص ۱۰۰) سے نقل کی ہے۔ نیز یہ رسالہ آج کل دہلی بابت ۱۵ جون ۱۹۴۲ء میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

بقول مولانا مہر مرحوم، غزل، مخطوطہ بیگم تاباں کے حاشیے پر درج تھی، اور مخطوطہ بیگم تاباں "بظاہر رام پور والے قلمی نسخہ کی نقل معلوم ہوتا تھا"، نسخۂ رام پور ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا تھا، لہٰذا مخطوطہ بیگم تاباں اس کے بعد کتابت ہوا اور یہ غزل اس کے بھی بعد حاشیے میں اضافہ کی گئی۔ ارمغانِ غالب، میں اسے ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء کی تصنیف کہا گیا ہے۔ مقطع سے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غزل یا ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کہی گئی ہو گی یا پھر آخری عمر میں۔

تھو! تو بہ کرو، تم کیا ہو؟ جب اِدبار آتا ہے — تو یوسف سا حسیں بکنے سرِ بازار آتا ہے

یہ شعر مولوی احتشام الدین صاحب دہلوی کے محولۂ قبل مضمون سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ مطلع انہیں ایک صاحب وجیہہ الدین خاں کی مملوکہ بیاض میں ملا تھا، اس بیاض میں مرزا صاحب کی غزل "کہا ہے تو سہی"، "رہا ہے تو سہی"، بھی درج تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس کے ساتھ کوئی دوسرا شعر نہیں ہے۔ وجیہہ الدین خاں نے غزلِ مذکور کے ہاتھ آنے کی حکایت یہ بیان کی ہے کہ ان کے والدِ ماجد مرحوم نے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے کلام کو اپنی بیاض میں لکھنے کی استدعا کی۔ مرزا نے فرمایا کہ یہ غزل دیوان میں طبع ہونے سے رہ گئی ہے۔ تم لے جاؤ۔ غالباً اسی کے ساتھ یہ مطلع بھی عنایت ہوا ہو گا، کیونکہ اس بیاض میں غالب کے نام سے درج ہے اور کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں پایا جاتا"۔

میں نے "کہا ہے تو سہی" والی غزل کو بعد از ۱۸۵۷ء قیاس کیا ہے۔ لہٰذا غالب کے عنایت کردہ ایک ہی موقع پر ایک ہی بیاض میں لکھے ہوئے اشعار کو اسی عہد میں شمار کرنا چاہیے۔ مگر میرا خیال ہے کہ غالب کم از کم اس بڑھاپے میں یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد "تو سرِ بازار برائے فروخت آتا ہے"، یا "سرِ بازار بکنے کے لئے آتا ہے"، کو "بکنے سرِ بازار آتا ہے" نہ کہتے۔ مطلع یقیناً ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کا ہے۔ اسے ابتدائی کلام یعنی ۱۸۱۶ء سے بھی پہلے کا قرار دینا چاہیے۔

اگر ہوتا تو کیا ہوتا، یہ کہیے — نہ ہونے پر ہیں یہ باتیں دہن کی

یہ شعر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے رسالۂ اردوئے معلّٰی دہلی کے غالب نمبر حصّہ دوم ۱۹۶۰ء میں چھاپا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میرے ایک بزرگ تھے سیّد عنایت حسین صاحب جو بھوپال میں ملازم تھے۔ نواب صدیق حسن خاں سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ نواب صاحب کے بھائی سیّد احمد حسن (متوفی ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء) غالب کے شاگرد تھے اور عرشی تخلص کرتے تھے۔ سیّد عنایت حسین صاحب نے اپنے منتخب اشعار کی ایک بیاض چھوڑی ہے۔ اس میں پہلے عرشی یہ شعر لکھا ہے:

کہیں کچھ ہے، دُعا دو گالیوں کو — بنا لی بات باتوں میں دہن کی

اس کے بعد غالب کا یہ شعر درج کیا ہے۔ اگر ہوتا الخ۔
عرشی کا انتقال ۱۸۶۰ء میں ہوا۔ اگر اس نے اپنے استاد کی غزل پر غزل کہی ہوگی تو یقیناً ۱۸۶۰ء سے پہلے کہی ہوگی۔

نسخۂ سوزشِ دل، درخورِ عتاب نہیں — سرِ سودا زدہ، آتشکدۂ تاب نہیں
ہمت و حوصلۂ سوزشِ شبنم معلوم — قلزمِ اشک، نمِ دیدۂ خوناب نہیں
پرسشِ عشق سے ہے ان کو فراغت مقصود — ہدیۂ پارۂ دل، نازشِ جلباب نہیں
ہمت و شوقِ طلبگاریٔ مقصود کہاں — برقِ خرمن زنِ بیتابیٔ سیماب نہیں
گلشنِ ہستیٔ عالم، ہے دبستانِ نشاط — نقشِ گل، رونقِ بے مشقیٔ طلاب نہیں

اس غزل کا پہلا اور تیسرا شعر سب سے پہلے رسالۂ الناظر لکھنؤ بابت مارچ ۱۹۲۹ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا، "مولوی عبدالرزاق صاحب ایڈیٹر رسالۂ تحفہ حیدرآباد دکن، مولف کلیاتِ اقبال نے عرصہ ہوا از راہِ کرم الناظر میں شائع ہونے کے لئے اشعارِ بالا ارسال فرمائے تھے اور ان کے متعلق اپنے گرامی نامے میں تحریر فرمایا تھا کہ ــــــــ "یہ شعر بھوپال کے مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں، اور نہ کہیں چھپے ہیں۔ میرے کتب خانے میں دیوانِ غالب کے مختلف نسخے ہیں۔ ایک نسخہ نولکشور کا مطبوعہ ہے۔ اس کے حاشیے پر اشعارِ بالا اس تقریب کے ساتھ کسی صاحب نے لکھے ہیں کہ مرزا غالب کے قلمی دیوان سے یہ غزل نقل کی گئی۔ دو شعروں کے علاوہ غزل کے اور شعر بھی ہیں، لیکن بیدرد جلد ساز نے حاشیہ کاٹ دیا ہے۔ جس کے سبب بعض مصرع بالکل کٹ گئے ہیں اور بعض پڑھے نہیں جاتے کہیں اور پتا چلے، تو بقیہ اشعار بھی ارسال کر دوں گا۔"

بعد ازاں یہ شعر ماہِ نو فروری ۱۹۵۲ء مع چند اضافوں کے اس تمہید کے ساتھ چھپے "پچھلے صفحے پر غالب کی جو مبینہ غزل درج ہے، ہمیں جناب ناظر عالم نے حیدرآباد دکن سے ارسال کی ہے۔ موصوف نے اس سلسلے میں ایک خط بھی لکھا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کس حد تک مستند ہے۔"

خط میں ناظر عالم صاحب نے اس غزل کی دریافت اور ضائع شدہ حصّوں کے بارے میں عبدالرزاق راشد صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے۔ موصوف نے کہا کہ:

"میاں داد خاں سیاح شاگرد مرزا غالب کے ایک رشتہ دار ظفر یاب خاں ریاست حیدرآباد کے صیغۂ تعمیرات میں ملازم تھے۔ آج سے چالیس بیالیس سال پہلے رسالہ ادیب نکالتے تھے۔ خاں موصوف کے کتب خانے میں ایک مجلّد کتاب ملی جس کے اندر دیوانِ غالب اور دیوانِ ذوق کے علاوہ ناسخ، آتش، آباد کا کلام تھا۔ دیوانِ غالب کے ایک حاشیے پر "غزلِ غیر مطبوعہ غالب دہلوی، عنوان سے ۹ شعر لکھے تھے مگر کسی بیدرد جلد ساز نے جلد بناتے وقت حاشیے کا ایک حصہ اس بری طرح کتر دیا تھا کہ چار مصرعے کٹ گئے۔ جو اشعار اور مصرع باقی تھے، ان کی نقل کر لی گئی اس تحقیق کے لئے کہ یہ کلام مرزا غالب ہی کا ہے۔ ظفر یاب خاں ایڈیٹر ادیب سے رجوع کیا گیا خاں صاحب موصوف نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ غالب کے سوا ایسے شعر اور کون تصنیف کر سکتا ہے ..."

تحقیق کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ حضرت استاذی علامہ نظم طباطبائی شارح غالب سے رجوع کیا جائے موصوف نے غزل دیکھ کر فرمایا "یہ یقینی مرزا غالب کا کلام معلوم ہوتا ہے۔"

جو چار شعر جلد ساز کی غلطی سے کٹ گئے تھے، ان کے مصرع ہائے ثانی یہ ہیں ؎

شبِ تاریک خیالِ دلِ مہتاب نہیں
شمع یہ، زیب دہِ مجلسِ احباب نہیں
تارِ تمکین، حریفِ سرِ مضراب نہیں

غم ہی اک چیز ہے دنیا میں جو کمیاب نہیں

تک پہلے مصرعے نہ مل جائیں ان مصرعوں کو متن سے خارج کر دینا ہی مناسب ہوگا۔

اس غزل کا انداز وہی ہے جو نسخۂ امروہہ بخطِ غالب کی غزلوں کا ہے، اس لئے اسے زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۶ء کا فکر کردہ کہہ سکتے ہیں۔ تقابل کیلئے وزن کی ایک غزل نسخۂ امروہہ سے دیکھئے۔ وہی بھاری بھرکم الفاظ اور ترکیبیں، وہی دُور کی کہنا اور فہم وادراک سے اونچا اُڑنا اس حد تک کہ شعر مہمل ہو کے رہ جائے، ذیل کی غزل دیوانِ غالب کے کسی اور نسخے میں شامل نہیں، لہٰذا اصل رنگ میں ہے ؎

وہ فلک رتبہ کہ بر توسنِ چالاک چڑھا	ماہ پر ہالۂ صفت، حلقۂ فتراک چڑھا
نشۂ مے کے اتر جانے کے غم سے، انگور	صورتِ اشک بہ مژگانِ رگِ تاک چڑھا
بوسۂ لب سے ملی طبع کو کیفیتِ خال	مے کشیدن سے مجھے نشۂ تریاک چڑھا
میں جو گردوں کو بمیزانِ طبیعت تولا	تھا یہ کم وزن کہ ہم سنگِ کفِ خاک چڑھا
اے (اسد) واشدنِ عقدۂ غم گر چاہے	حضرتِ زلف میں، جوں شانہ، دلِ چاک چڑھا

دونوں غزلوں میں ایک بات اور بھی مشترک ہے وہ یہ کہ پرانی زبان استعمال ہوئی ہے۔ غزل زیرِ بحث کے ایک مصرع میں "تارِ تمکین" بہ اعلانِ نون آیا ہے اور ال میں دی ہوئی میں میں جو گردوں کو بمیزانِ طبیعت تولا (یعنی میں تولا) میں "نے" تولا کی جگہ آیا ہے۔ اس سے اس بات کا امکان زیادہ ہو گیا ہے کہ دونوں غزلیں ب ہی عہد کی ہیں۔ ○○

"شاعر کے لئے نایاب تصویریں، تحریریں اور خطوط ارسال کیجیے۔ ہم آپ کے شکریے کے ساتھ انھیں شائع کریں گے اور بہ حفاظت آپ تک پہنچا دیں گے۔"

نامی انصاری

(۱)

ِاظہارِ سرِ لوح و قلم بھی ہوگا
دشِ دل پہ جو گذرے گا، رقم بھی ہوگا

ف گھر پہ ہی جمے گی نہ غموں کی محفل
کا جھگڑا ہے، سرِ کوئے صنم بھی ہوگا

طلب یہ ہے کہ دھرتی پہ ترے پاؤں ہیں
ِغم سر پہ زیادہ ہے، تو کم بھی ہوگا

وپ ہی دھوپ سرِ بامِ فلک کیوں ہوگی
گوشے میں کہیں ابرِ کرم بھی ہوگا

ں نہ بھر نہ بکھر خود کو بتاؤں کیسے
دچ اپنی ہے تو احساسِ الم بھی ہوگا

دیِ ہجر کو طے کر لیا تنہا میں نے
نہ سوچا کہ ترا نقشِ قدم بھی ہوگا

نک دبے آب زمیں سبز بھی ہوگی نامی
مٹی سے بہاروں کا جنم بھی ہوگا

(۲)

دل پہ چبتا ہے جس طرح نشتر لگا
لفظِ بے معنی نہ میرے سر لگا

آڑے ترچھے وار تو خالی گئے
کوئی چر کا مجھ پہ اب کھل کر لگا

خون کے چھینٹوں سے کچھ ہوتا نہیں
بے نوا لفظوں پہ آبِ زر لگا

کشتِ جاں سرسبز بھی ہو جائے گی
پہلے دل میں تخمِ بار آور لگا

موجِ دریا پھر بہا کر لے گئی
جب کنارے پر کوئی پتھر لگا

جنگلوں میں خامشی سی خامشی
بستیوں میں رن پڑا، لشکر لگا

جاگنے والوں میں نامی تم بھی تھے
کیا تمہیں بھی قاتلوں سے ڈر لگا

نازؔ قادری

طلسم، خواب و خیال تک تھا
مرا یقین احتمال تک تھا

عجیب تھا دردِ نارسائی
صدا بہ صحرا سوال تک تھا

چراغ آنکھوں میں جل رہے تھے
سکوت، شامِ ملال تک تھا

دیارِ شب کا اداس منظر
طلوعِ حسنِ زوال تک تھا

تبسمِ دل نواز بھی نازؔ!
لبِ گلِ پائمال تک تھا

۷۱/۹۷ ، پریڈ کانپور

شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفرپور (بہار)

دھرتی بندھن

جیتندر بلّو ● 1, ALFRED ROAD ALTON, LONDON-W-3-6 LH ENGLAND.

اُس کی آنکھ پھر کھل گئی تھی۔ بوڑھی اوستھا میں ایک بار آنکھ کھل جائے، تو لاکھ کوشش کرنے پر بھی آنکھ نہیں لگتی۔ بستر پر دراز شخص خود سے اُلٹی سیدھی باتیں کرتا ہوا کروٹیں بدلتا رہتا ہے یا چھت کی کڑیاں گنتا ہوا تمام رات گزار دیتا ہے۔ اگر نیند کی دیوی دوبارہ مہربان ہو بھی جائے، تو یہی لگتا ہے کہ سونے والا قسطوں میں سو رہا ہے اور قسطوں میں جاگ رہا ہے۔ بلونت سنگھ کا جیون بھی انہی کیفیات سے گزر رہا تھا۔ رات کے کسی پہر بھی جب اس کی آنکھ کھل جایا کرتی، تو وہ بتّی جلا کر سب سے پہلے گھڑی پر نظر ڈالا کرتا تھا، محض یہ جاننے کی خاطر کہ پو پھٹنے میں کتنی دیر باقی ہے اور کب اسے اجالے کی پہلی کرن دکھائی دے گی۔ اجالا اس کی آنکھوں کو بڑا ہی بھلا لگتا تھا۔ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی روشنی کو پا کر اُسے احساس ہوتا تھا کہ وہ اجنبی دھرتی پر اکیلا نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اجالا ہے، ہوا ہے، آکاش ہے، ہریالی ہے، چرند پرند ہیں۔ اندھیرے سے وہ اتنا خوف کھایا کرتا تھا کہ اس کے تصوّر سے ہی اس کے چہرے کی جھرّیاں مزید گہری ہو جایا کرتی تھیں اور بوڑھی کمزور آنکھیں بالکل ہی ماند پڑ جاتی تھیں۔ سندھیا کے سمے اندھیرے کی ہلکی سی لکیر، جو درجہ بدرجہ گہری ہوتی چلی جاتی تھی، اسے دیکھ کر وہ سوچا کرتا تھا کہ اب وہ گھڑی آن پہنچی ہے کہ خود بخود اس کے پاؤں جانے مانے راستوں سے ہوتے ہوتے اپنی رہائش گاہ کی طرف اُٹھ جائیں گے اور وہ اگلی صبح تک گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر رہ جائے گا۔ جاڑے کے مختصر دن تو اسے اور بھی پریشان کر ڈالتے تھے۔ تیسرے پہر ہی اندھیرا کہیں سے وارد ہو کر اسے بھری دنیا سے الگ تھلگ کر ڈالتا تھا۔ اس سمے طرح طرح کے خیالات اسے ستایا کرتے تھے کہ روٹیوں کی خاطر اسے کتنا کچھ قربان کرنا پڑ گیا ہے۔ اس کا مقدر اسے کہاں سے کہاں لے آیا ہے۔ وہ اِدھر کا رہا ہے نہ اُدھر کا، ترشنکو[1] کی طرح بیچ میں لٹک کر رہ گیا ہے۔ شاید یہ پچھلے جنم کے کچھ بُرے کرم تھے، جن کا خمیازہ اسے پردیس میں بھگتنا پڑ رہا ہے ـــــــ لیکن آج آنکھ کھلنے پر نہ تو اس نے اٹھ کر بتی جلائی اور نہ ہی گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ ڈرا ڈرا سا بستر پر بیٹھا اکھڑے ہوئے سانس لیتا ہوا متواتر اندھیرے کو گھورے جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے ایک خواب دیکھا تھا اور خواب بھی ایسا کہ اس کی آتما تک سہم گئی تھی۔ ماتھے سے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں صاف کر کے وہ سوچ ساگر میں ڈوب گیا۔ وہ خود بھی حیران تھا کہ ڈیڑھ دو سال کی مدت کے بعد آج اچانک امرنا تھ اسے خواب میں پریشان کرنے کیوں چلا آیا ہے۔ وہ اچھا بھلا سپنا دیکھ رہا تھا ـــــــ وہ کھلے آکاش تلے پارک کی بنچ پر بیٹھا ڈبل روٹی کے نہایت ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کبوتروں کی طرف اچھال رہا ہے۔ وہ اسکے ارد گرد نیم دائرہ بنائے بڑی چابکدستی سے ٹکڑے چگ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اس کے پیروں میں لوٹ رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اس کا دل ہی نہیں، دماغ کا ہر کونہ بھی خوش ہے۔ اچانک مسز ولسن اسے اپنے کتے کے ہمراہ آتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اکثر اسے ڈاکٹر سمتھ کی کلینک پر ملا کرتی تھی۔ وہ اس کے قریب آن کھڑی ہوتی ہے اور رسماً اس کا حال پوچھنے کے بعد اس کی کمر کے درد کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔

وہ مسز ولسن کو بتاتا ہے کہ یہ درد تو اب جاتے جاتے جائے گا۔ تیس سال تک دیوہیکل مشینوں پر کام کرنے کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اس پر وہ سوگوار ہو کر بولتی ہے "صنعتی معاشرہ اس کے علاوہ دے بھی کیا سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ معاً غائب ہو جاتی ہے اور شگفتہ پھولوں

---

[1] ایک ہندو دیومالائی کردار

کی کیاریوں سے امرناتھ نمودار ہوتا ہے۔ لمبا، اونچا، موٹا تازہ، بھیانک صورت۔ اسے دیکھتے ہی کبوتروں کے رنگ بدل جاتے ہیں اور وہ پھڑ پھڑاتے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ امرناتھ اس کے برابر بیٹھ کے کہتا ہے۔

"یہ درد تو تمہاری موت کا سندیسہ ہے۔ تمہارا وقت بے وقت ڈاکٹر کے پاس جانا اس بات کی دلیل ہے کہ تمہیں زندگی سے بے پناہ محبت ہے لیکن موت پر کس نے فتح پائی ہے میرے دوست۔ ایک روز تمہیں بھی جانا ہوگا ——— لیکن جانے سے پہلے میری ایک بات پلّے سے باندھ لو۔ بھول کر بھی پردیس میں پران نہ تیاگنا۔ آخری سانس اپنے دیس میں جا کر لینا ——— آدمی کا انتم سنسکار اپنی بھومی پر نہ ہوا تو اس کی آتما یگوں تک بھٹکتی رہتی ہے۔ میری طرف دیکھو جب سے میرا دیہانت ہوا ہے، میری آتما بھٹک رہی ہے اور جانے کب تک بھٹکتی رہے گی"!

بلونت سنگھ کا چہرہ برف کی طرح سفید پڑ جاتا ہے۔ وہ بولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن آواز گلے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے

"دیر مت کرو واپس لوٹ جاؤ۔ تمہارے مرنے میں اب زیادہ دن نہیں رہے"!

وہ کھل کر چیخنا چاہتا ہے لیکن کمزور چیخ کے ساتھ ہی خواب ٹوٹ جاتا ہے۔

اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

اس کی سانسیں جب معمول پر آگئیں، تو وہ اپنے ارد گرد کمبل اوڑھ کر بھاری دل کے ساتھ بستر سے اٹھا اور دیواروں کا سہارا لیتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ گھر سونا تھا، خاموش تھا۔ لیکن اب سونا پن اسے پریشان نہیں کرتا تھا۔ جب سے اس کی بیوی کا دیہانت ہوا تھا، وہ سونے پن سے، خاموشی سے ہولے ہولے مانوس ہوتا چلا گیا تھا اور آگے چل کر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بذاتِ خود ان کا حصہ بن کر رہ گیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیا واقعی اس کا انت آگیا ہے؟

رات کے پچھلے پہر دیکھا ہوا خواب تو ہمیشہ سچ ثابت ہوتا ہے۔ بزرگ تو یہی کہا کرتے تھے۔ پھر شاستروں میں بھی کچھ ایسا ہی لکھا ہے کہ منش جب سویا ہوا ہوتا ہے، تو اس کی آتما جاگ رہی ہوتی ہے اور اس کا سمبندھ سرشٹی کی آتما سے ہوتا ہے، جو سمپورن ستیہ پر قائم ہے۔ اس کا دل ڈوب گیا اور آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے ہونٹوں پر "ست گرو نانک مہر کر، مجھے شکتی دے" کے شبد اپنے آپ ابھر آئے۔ حالانکہ موت سے اس کا سمبندھ اتنا ہی گہرا تھا، جتنا زندگی سے وہ جانتا تھا کہ ایک روز اسے موت سے آنکھیں چار کرنا ہوں گی۔ اس نے خود کو اس وقت کے لئے تیار بھی کر رکھا تھا۔ لیکن دل میں ایک نامکمل خواہش تھی، جس کی کسک ہلکے ہلکے دھوئیں کی طرح اس کے سینے میں اٹھا کرتی تھی اور وہ سر تھام کر سوچا کرتا تھا کہ اس نے جیون میں جو کچھ بھی حاصل کیا ہے، وہ سب اکارت تھا، بے معنی تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو کہیں سے وہ شام ابھر کر اس کے سامنے پھیل گئی۔

برسوں پہلے کی بات ہے، گلابی جاڑے کے نیم خنک دن تھے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ امرناتھ کے گھر دعوت پر مدعو تھا۔ عورتیں ایک کمرے میں بیٹھیں اپنا دکھ سکھ بانٹ رہی تھیں اور مرد لاؤنج میں بیٹھے پی پلا رہے تھے۔ میز پر گلاسوں کے درمیان کباب، فش اور چکن کی پلیٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن پر امرناتھ کے مردانہ ہاتھوں کی موٹی موٹی انگلیاں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں۔ جس رفتار کے ساتھ وہ کھائے چلا جا رہا تھا اور جس تیزی کے ساتھ اس کے جبڑے چل رہے تھے بلونت سنگھ کو دیکھ کر ہنسی آگئی اور وہ مذاق کئے بنا نہ رہ سکا۔

"کچھ مہمان کا بھی خیال کیا کرو۔ کھا کھا کر ہاتھی کی طرح پھیلتے جا رہے ہو ——— اس عمر میں زیادہ کھانا ٹھیک نہیں"۔

"او یار کیا فرق پڑتا ہے۔ اب تو اپنا چل چلاؤ ہے۔ آدمی کو خوب کھانا پینا چاہئے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ لوگ جب میرے جنازے کو کندھا دیں، تو ہر کسی کو میرے وزن کا احساس ہو اور ہر کوئی کہے کہ امرناتھ خوب آدمی تھا۔ کھا پی کر مرا ہے"!

بلونت سنگھ اس کی زندہ دلی پر ہنس دیا تھا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر نیم سنجیدہ ہو گیا۔ بولا۔

"مگر یہاں تو جنازے کو کندھا نہیں دیا جاتا۔ یہاں تو جنازہ گھر سے CEMETRY تک بڑی شان سے موٹر کار میں جاتا ہے"!

"اور رہنے دے یار جب اپنی آنکھ بند ہو جائے گی، تو کیا پتہ چلے گا کہ اپنا جنازہ کندھوں پر جا رہا ہے یا موٹر کار میں؟"

یہ کہہ کر اس نے گلاس اٹھایا اور بچی کھچی شراب غٹا غٹ حلق سے اتار گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے گلاس ہونٹوں سے الگ کیا، تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی تھی، چہرے پر عجیب سا خوف تھا، جو بڑھتی عمر کے ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے اور آخری ہچکی لینے پر ہی ختم ہوتا ہے۔

دونوں خاموش، افسردہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر جاننا چاہ رہے تھے کہ ان میں موت سے خوف زدہ کون زیادہ ہے۔ لیکن جلد ہی امرناتھ نے اپنا موڈ بدلا اور ہوا میں ہاتھ چلاتے ہوئے بولا۔

"چھوڑ یار ایسی باتوں کو۔ ایسی باتیں من کو اُداس کر دیتی ہیں۔ تو اپنی سُنا۔ اب تو تُو ریٹائر ہونے والا ہے۔ یہ بتا آگے کیا سوچا ہے؟"

"سوچنا کیا ہے۔ ہم نے تو کب کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ رہی سہی زندگی اپنے دیش میں جاکر گزاریں گے۔"

"خیال بُرا نہیں ہے۔" امرناتھ نے دھیمے پن سے کہا۔ پھر کہیں دُور دیکھ کر بولا۔ "کبھی میں بھی تیری طرح سوچا کرتا تھا کہ ریٹائر ہونے پر واپس لوٹ جاؤں گا اور اپنا بڑھاپا وہاں بڑے آرام سے گزار دوں گا۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ میں نے ٹھیک ہی کیا جو واپس نہیں گیا۔"

بلونت سنگھ کے چہرے پر کئی سوال ابھر آئے تھے۔

"اور یار دیکھا جائے تو ہم لوگوں کے لئے اب وہاں رکھا ہی کیا ہے۔ ساری عمر تو ہم نے باہر کاٹ دی وہاں جو اپنے رشتہ دار اور جان پہچان کے لوگ تھے۔ ان میں بہت سے تو مر کھپ گئے ہیں اور جو تھوڑے بہت رہ گئے ہیں، وہ بھی جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ بعد کی نسل سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ اب تو وہاں جاکر ہم بالکل ہی اکیلے ہو جائیں گے۔"

"لیکن من کو شانتی تو مل جائے گی۔ ہمارا انتم سنسکار تو اپنی دھرتی پر ہوگا۔"

امرناتھ پر گہرا ردّعمل ہوا تھا اور وہ گہری سوچ میں ڈوب کر کہیں دُور نکل گیا تھا، پلٹا، تو بالکل الگ ہی شخص لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی اجنبی ہو، جو ابھی ابھی باہر سے وارد ہوا ہو اور اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا ہو۔ انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

"یہ بات اکثر مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔ میرا اندر دن بھی اکثر مجھ سے پوچھتا رہتا ہے کہ آدمی کا آخری سنسکار اگر اپنی دھرتی پر نہ ہو، تو کیا اس کی آتما چولا نہیں بدلتی؟ اسے چین نہیں ملتا؟ لیکن میں یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا بجھا لیتا ہوں کہ بھاگیہ کے خلاف کون جا سکتا ہے۔ اگر میری موت پردیس ہی میں لکھی ہے تو وہ ضرور ہو کر رہے گی۔"

"لیکن میں تو کسی بھی قیمت پر یہاں مرنا نہیں چاہتا۔ میں تو وہیں جاکر مروں گا۔" بلونت سنگھ کی آواز میں خود اعتمادی تھی، عزم تھا۔ "یقین کرو اپنی دھرتی، اپنی مٹی مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بُلاتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں، اپنی دھرتی میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ اس کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے لیکن میں مجبور ہو کر رہ گیا ہوں۔ اپنی اولاد یہاں بس چکی ہے۔ اس سے دور رہنے کو من نہیں مانتا۔"

"اولاد کا تمہیں مجھ سے زیادہ تجربہ ہے۔ بچوں کی شادی ہو جانے پر جب ان کی اپنی اولاد ہو جاتی ہے، تو وہ اپنے ماں باپ سے برائے نام ہی جڑے رہتے ہیں۔"

امرناتھ گہرا ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور آکر چلے گئے تھے۔ فوراً ہی اس کا ہاتھ بوتل کی طرف بڑھ گیا جانداراسا پیگ بنا کر بولا۔

"تو کچھ بھی کہہ لے بلونت سیاں۔ اولاد آخر اولاد ہوتی ہے۔ پردیس میں اس کا بڑا آسرا ہوتا ہے۔ بڑا سہارا ہوتا ہے۔"

"میں مانتا ہوں۔ لیکن اس اولاد کا کیا فائدہ، جو سرے سے نہ مجھے سمجھتی ہے، اور نہ میں اُسے۔ لگتا ہے کہ ہم الگ الگ دنیا کے باشندے ہیں، جو غلطی سے اس جنم میں مل بیٹھے ہیں۔ یقین کرو یہاں کے پانی نے میرے بچوں پر ایسا اثر چھوڑا ہے کہ وہ کالے انگریز بن کر رہ گئے ہیں۔"

بلونت سنگھ کی آواز میں بلا کا کرب تھا، تلخی تھی، شکایت تھی۔ دونوں خاموش اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے کہ ان کی اولاد کو حالات نے، وقت نے، زمانے نے کتنا بدل دیا ہے۔ وہ ان کے قریب ہوتے ہوئے بھی ان سے کتنے دور ہو گئے ہیں۔ لیکن جلد ہی امرناتھ نے تھک ہار کر اُکتا کر کہا۔

"یار بلونت کوئی اور بات کر۔ ایسی باتیں من کو راکھ کر دیتی ہیں، تو دارو دشارو پی اور صحت بنا۔"

بادلِ نخواستہ ان کے ہاتھ اپنے اپنے گلاس کی طرف بڑھ گئے تھے۔

بیتے ہوئے دن اور گزر رہی ہوئی باتوں نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔ اس نے کمبل کے ایک کونے سے آنکھوں کے کونے صاف کئے۔

اس کی ذہنی حالت بھی عجیب ہو چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے امرناتھ کو جیتا جاگتا دیکھ کر اسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس گھر کے کسی کونے میں موجود ہے کچھ ہی دیر میں آکر اس سے ہمکلام ہوگا اور دریافت کرے گا کہ اسے ریٹائر ہوتے تو عرصہ بیت گیا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ ابھی تک یہیں موجود ہے؟ وہ کون سی بات ہے جو اس کے پاؤں میں بیڑی بن کر رہ گئی ہے؟ بلونت سنگھ نے صوفے کی پشت پر سر ٹیک دیا، ایک گہرا سانس بھرا اور آنکھیں موندتے ہی خود کو ماضی کے جنگل میں کھڑا پایا —— ریٹائر ہونے پر وہ کتنا خوش تھا۔ تیس سال کی کڑی محنت کے بعد وہ ایکا ایکی آزاد ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی بھی خوش تھی اور ابھی وہ اس خوشی کو ہضم بھی نہ کر پائے تھے کہ اچانک اس کی بیوی اسے اکیلا چھوڑ کر پرلوک سدھار گئی۔ وہ اندر باہر سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ آسمان کا رنگ بھی اس کی نظر میں بدل گیا تھا اور وہ یہی محسوس کیا کرتا تھا کہ قدرت نے اس کے بڑھاپے کا واحد سہارا چھین کر اسے اپاہج کر ڈالا ہے۔ رہی سہی زندگی اسے پہاڑ کی طرح لگ رہی تھی، جسے تن تنہا بسر کرنا بڑا ہی کٹھن کام تھا۔ اس کے بیٹے بیٹیاں، جو سب کے سب شادی شدہ تھے اور اپنی اپنی سنتان کے ساتھ اپنا اپنا گھر آباد کر چکے تھے، ماں کے مرنے پر کافی روئے دھوتے تھے۔ باپ کے متعلق بھی کافی فکرمند ہو گئے تھے۔ ہر کسی کا ضمیر اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ ان حالات میں اپنے زخم خوردہ باپ کو اکیلا نہ چھوڑے بلکہ اسے اپنے ساتھ رکھ کر اس کی دیکھ بھال کرے۔ لیکن ایسا قدم اٹھانے پر ہر کسی کے ذہن میں یہ ڈر بھی بیٹھا ہوا تھا کہ ان کا باپ پرانے وقتوں کا آدمی ہے۔ اس کی سوچ سمجھ، رہن سہن اور لائف اسٹائل ان سے ذرا بھی میل نہیں کھاتا۔ یقیناً ان کی ذاتی زندگی میں خلل پیدا ہوگا اور ان کی PRIVACY جاتی رہے گی۔ لہٰذا ہر کوئی ایک دوسرے کو دیکھتا ہوا اس انتظار میں تھا کہ کون اپنے لب کھول کر اتنی بڑی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ اس کے بڑے بیٹے خشونت کے لب کچھ کچھ ضرور ہلے تھے لیکن پھر وہ بھی دوسرے لبوں کی طرح خاموش ہو کر رہ گئے تھے۔ بلونت سنگھ ذرا بھی مایوس نہیں ہوا تھا، بلکہ وہ تو افسوس کی سطح سے کب کا بلند ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی سنتان نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی ہے، وہاں آدمی منفرد پہلے ہے اور آدمی بعد میں۔ وہ منفرد ہر سانس، ہر قدم پر محض اپنے لئے جیتا ہے اور اپنے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ وہ اوروں کی طرف دیکھتا ضرور ہے، لیکن صرف دیکھنے کی حد تک ورنہ اس کا اوروں کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایک بار تو اس کی باقی ماندہ ہمت نے ایسا جوش مارا کہ وہ سوچنے لگا کہ جس قسم کی زندگی وہ یہاں جی رہا ہے، ویسی ہی زندگی وہ اپنے دیش میں جا کر بھی جی سکتا ہے پھر کیوں نہ وہ واپس لوٹ جائے؟ جہاں اسے اپنی مرضی کے مطابق مرنے کی مکمل آزادی تو ہوگی۔ لیکن جب اسے اپنی ڈھلتی ہوئی عمر، گرتی ہوئی صحت، کمر اور جوڑوں کے درد کا احساس ہوا، تو اس کا سارا جوش بھاپ کی طرح اڑ گیا تھا اور وہ یہ سوچ کر تڑپ اٹھا تھا کہ کیا لوگوں کو بہتر زندگی کا لالچ اس لئے پردیس میں کھینچ لاتا ہے کہ ان کے تن کو اپنی مٹی بھی نصیب نہ ہو۔ یہ احساس اس کی شخصیت پر یوں پھیل گیا تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، گھومتے پھرتے اپنی آخرت کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ کبھی اسے احساس ہوتا تھا کہ بے گانی دھرتی پر دم توڑنے سے اس کی آتما چولا نہیں بدل پائے گی اور وہ آوارہ ہو کر خلاؤں میں بھٹکتی پھرے گی اور کبھی اسے یہ احساس یقین دلاتا تھا کہ اس کی آتما چولا تو ضرور بدل لے گی، لیکن کسی دوسری جون کے روپ میں۔ اس قسم کے وچار اسے اداس کر ڈالتے تھے اور وہ ان سے وقتی فرار پانے کی خاطر خود کو لائبریری کی کتابوں میں گم کر ڈالتا تھا یا گردوارے میں جا کر گھنٹوں سیس جھکاتے بیٹھا رہتا تھا۔ جب کبھی اس کا من کسی سے بات کرنے کے لئے تڑپ اٹھتا تھا، تو وہ پارک میں اپنی جان پہچان کے لوگوں سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ وہ اس کی طرح ریٹائرڈ، پنشن یافتہ اور موت کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ان میں سفید بھی تھے اور رنگدار بھی۔ ان سے بات چیت کر کے وہ خود کو بہت ہی اکیلا محسوس کیا کرتا تھا۔ حالانکہ گفتگو کا موضوع ایک ہی ہوا کرتا تھا اور وہ گھوم پھر کر کوئی نئی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ بڑھاپا، اکیلا پن اور جسمانی تکلیفیں۔ سبھی بزرگ اس بات سے سہمت تھے کہ بڑھاپا ان سرد ملکوں میں گردن کی طرح ہے اور آدمی کو عمر کا سورج ڈھلنے سے پہلے ہی اس جہان کو چھوڑ دینا چاہئے —— ایک شام وہ پارک سے اپنی چھڑی کے سہارے ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا گھر پہنچا ہی تھا کہ اس نے گھر کے دروازے پر اپنے بڑے بیٹے خشونت کو کھڑا پایا قریب ہی اس کی ڈاٹسن کار بھی کھڑی تھی۔ اپنے باپ کی ابتر حالت دیکھ کر اسے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ یکبارگی اس کی آنکھوں میں وہ دن گھوم گئے تھے، جب اس کا باپ کبھی صبح، کبھی شام فیکٹری سے لوٹا کرتا تھا۔ اونچا قد، بھرے بھرے بازو، ابھرے ہوئے گال اور مسکراتا چہرہ۔

لیکن اب تو وہ کیا سے کیا بن گیا ہے۔ ہاتھ میں چھڑی، آنکھوں پر موٹا چشمہ، بدن سے ماس ساتھ چھوڑتا ہوا اور کمر میں ہلکا سا خم۔ اس نے آگے بڑھ کر اعتراماً باپ کو سہارا دیا اور اسے گھر کے اندر لے جاتے ہوئے سوچنے لگا کہ بڑھاپا کتنا خطرناک، کتنا کربناک، کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اگر دیکھ بھال کے لئے کوئی موجود نہ ہو، تو آدمی بالکل ہی ناکارہ اور بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ کہیں آنے جانے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ بلونت سنگھ نے اپنے بدن کے اِرد گِرد اپنے بیٹے کے مضبوط ہاتھوں کی پکڑ محسوس کی، تو اس کا لمس پاتے ہی اسے جھرجھری سی ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے عجیب سی خوشی کا احساس بھی ہوا کہ وہ مرکر بھی نہیں مرے گا، بلکہ اپنے بیٹے کے وجود میں زندہ رہے گا۔

باپ بیٹا، دونوں چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں بھرتے ہوئے دن بھر کی تھکن دور کر رہے تھے۔ خشونت نے چائے ختم کر کے پیالہ میز پر رکھا۔ فکرمند، اُداس، کچھ سوچتا ہوا۔ پھر بڑی گمبھیرتا سے بولا۔

"ڈیڈی۔ آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ آپ کی صحت بھی کافی گر گئی ہے۔ پھر یہاں آپ کی دیکھ بھال کے لئے کوئی ہے بھی تو نہیں —— کیوں نہیں آپ OLD PEOPLE'S HOMEE میں رہنے کے لئے چلے جاتے۔"

بلونت سنگھ کی نیم وا آنکھیں ایکا ایکی کھل گئی تھیں۔ اس نے چونک کر اپنے بیٹے کو یوں دیکھا تھا، گویا اس نے بھری بزم میں اپنے باپ کو بے عزت کر ڈالا ہو۔ لیکن اس نے اکھڑنے کی بجائے پیار سے ایک نظر اپنے بیٹے کو دیکھا، پھر مسکرا کر طنزاً بولا۔

"اب تو کبھی کبھار تم لوگ مجھ سے ملنے چلے آتے ہو۔ پھر تو کرسمس پر ہی ملنے آیا کرو گے؟"

"نہیں ڈیڈی۔ ہم وہاں بھی آپ سے ملنے آیا کریں گے —— اگر آپ وہاں رہیں گے تو آپ کو ہر طرح کا آرام ملے گا۔ آپکی دیکھ بھال ٹھیک طریقے سے ہوگی۔ آپ کو MEDICAL ATTENTION ملے گی۔ پھر وہاں آپ کی عمر کے کئی دوسرے لوگ بھی ہوں گے، جن میں آپ کا دل بھی بہل جاتے گا اور آپ خود کو اکیلا محسوس نہیں کریں گے۔"

"لیکن خشونت" اس نے کربناک آواز میں کہا۔ "وہاں رہنے سے جو دکھ میرے اندر ہے، وہ کم تو نہیں ہوگا۔"

خشونت لاجواب ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنے باپ کے دکھ سے خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دیش جہاں اس کے باپ نے آنکھ کھولی تھی، اپنا ہوش سنبھالا تھا، آج بھی اس کی سانسوں میں بستا ہے۔ آج بھی وہ اس دیش کی پرانی روایات اور عقیدوں کے سہارے زندہ ہے اور اُنہی کے مطابق اپنے جیون کا انت چاہتا ہے۔ بلونت سنگھ نے اپنی سفید داڑھی کھجائی، نیم وا آنکھوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا، پھر دھیرے سے بولا۔

"میں جانتا ہوں اب مجھے یہیں مرنا ہے۔ اسی گھر میں۔ لیکن میرے گزر جانے پر بڑے بیٹے ہونے کے ناطے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا، جو میں نے تمہاری ماں کے لئے کیا تھا۔"

خشونت اسے دیکھتا رہ گیا۔

"مجھے جلانے کے بعد میرے پھول اِنڈیا ضرور لے جانا اور انھیں گنگا کے پوتر پانی میں بہا دینا۔ اسی میں میری مکتی ہے۔ ورنہ میری آتما جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھرے گی۔"

خشونت ایک لمبی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ سارا سلسلہ غیر مہذب، غیر عقلی اور غیر فطری تھا۔ وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ آدمی کے مرنے پر اس کی دنیا اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ہر طرح کے دکھ سکھ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ آواگون، یہ آتما کا بھٹکنا اور یہ پانی سے مکتی حاصل کرنا محض کتابی باتیں ہیں، دیو مالائی کہانیاں ہیں۔ جن کی نیوکلیر دور میں، مادّی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں، کوئی وقعت نہیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بول اٹھا۔

"ڈیڈی۔ اگر پانی ہی سے مکتی حاصل ہوتی ہے، تو انڈیا جانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں بھی RIVER THAMES ہے چاروں طرف سمندر ہے۔ یہ کام یہاں بھی ہو سکتا ہے۔"

"نہیں خشونت نہیں۔" بلونت سنگھ نے قدرے اکھڑ کر کہا۔ "تمہیں کیا پتہ، ہمارے شریر کی ہڈیوں کا گنگا کے ساتھ کیا سمبندھ ہے۔

بھگیرتھ نے اپنے پرکھوں کی آتماؤں کو مکتی دلانے کی خاطر ہزاروں سال تپسیا کی تھی۔ تب کہیں گنگا دھرتی پر آنے کے لئے تیار ہوئی تھی اور جب اس کے پوتر پانی نے بھگیرتھ کے پرکھوں کی ہڈیوں کو چھوا تھا، تو ان کی آتماؤں کو مکتی ملی تھی!!

خشونت یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ اس کے باپ کا وشواس اس بوڑھے درخت کی طرح ہے، جس کی جڑیں اپنی دھرتی میں اس حد تک پھیل جاتی ہیں کہ انھیں اکھاڑنا تو درکنار، کاٹنا بھی مشکل ہوتا ہے اور وہ اس حق میں بالکل نہیں تھا کہ اس کا باپ عمر کے جس موڑ پر پہنچ چکا ہے، وہاں اس کے اندھ وشواس کو جھنجھوڑا جائے، ریزہ ریزہ کیا جائے۔ اس نے ایک نظر اپنے باپ کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے بڑا ہی قدیم، لیکن معصوم، سادہ اور نادان لگا۔ ایک بار تو اس کے من میں آیا کہ اٹھ کر اپنے باپ سے لپٹ جائے لیکن جانے کس جذبے کے تحت وہ رک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر ایمانداری سے بولا

"ٹھیک ہے ڈیڈی۔ جب وقت آئے گا تو میں دیکھوں گا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا ہے لیکن آپ کے وشواس کا خیال مجھے ضرور رہے گا!!"

بلونت سنگھ اس کے جواب سے زیادہ خوش نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی جدید سوچ اور بدلتے ہوئے رویوں سے خوب واقف تھا۔ کہیں وقت آنے پر اس کی سوچ اسے فرض نبھانے سے گمراہ نہ کر ڈالے؟ یہ خیال ایک گہرے شک کی صورت میں بدل کر اس کے ذہن میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور وہ چند ہی منٹوں میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔

اس احساس کے ساتھ ہی وہ ماضی کے گھنے جنگل سے نکل آیا۔ آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا، جو اسے کھڑکی سے دکھائی دے رہا تھا، اس کی رنگت دھیرے دھیرے بدلتی جا رہی تھی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ اپنے ارد گرد پھیلتی ہوئی تازہ روشنی کو دیکھ کر اسے بڑا سکون ملا، بڑا ہی آنند ملا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ روشنی اس کے اندر اترتی چلی جا رہی ہے اور وہ ہر طرح کے دکھ سے آزاد ہو گیا ہے۔ اس نے زیر لب ست گرو نانک، تیرا ہی آسرا کہا اور پھر زندگی کا ایک اور دن گزارنے کے لئے صوفے سے اٹھ بیٹھا۔ ○○

ترجمہ:- سلطان احمد ساحل

سیریا:- محمد مل معقول

"دہلیز سے جنت تک"

اس وقت
جب غمگین بارش
میرے غمگین چہرے کو بھگو رہی ہے
میں پھول کی سیڑھی کا خواب دیکھتا ہوں
جو جھکی ہوئی پیٹھوں اور
گھٹنوں پر ٹیکی ہوئی ہتھیلیوں کی بنی ہے
تاکہ میں جنت تک چڑھ جاؤں
اور تلاش کروں
کہ ہماری آہیں اور منتیں کہاں جاتی ہیں ؟
جانِ من
ساری آہیں اور منتیں
سارے گلے اور شکوے
لاکھوں ہونٹوں اور دلوں سے اٹھتی ہوئی
ہزاروں برسوں اور صدیوں سے لگاتار
جنت میں کہیں نہ کہیں تو بادلوں کی طرح
اکٹھا ہوں گی ۔!
شاید میرے الفاظ اس وقت
عیسیٰ کے نزدیک ہوں
تو اے جانِ من
ہم جنت میں ہونے کا انتظار کریں !!!

پنجابی:- راج بیر

"کہیں نہ پہنچنے والی سڑک"
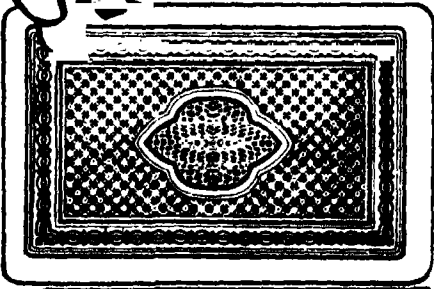
دیکھو ! میں سخت بیمار ہوں
آرام اور علاج کی سخت ضرورت ہے
پیدائشی بھوکا، پیاسا اور ننگا ہوں
بھٹک رہا ہوں جنگلوں اور کھنڈروں میں
اپنے وطن کو جاتے ہوئے ۔
سرحد کی تلاش میں،
دنیا کے کسی بھی ملک کا باشندہ
کوئی بھی نمائندہ
مجھے بھارت کی نشاندہی کرے گا ۔
ویسے مجھے علم ہے کہ
جس طرف کوئی بھی اشارہ کرے گا ۔
خلا کی ہر ایک شئے گر کر
زمیں میں دھنس چکی ہوگی
اور ادھر انسانیت
جل کر راکھ ہو چکی ہوگی ۔!!!

"وہ چاہتے ہیں !!"

وہ تو یہاں تک چاہتے ہیں
کہ دھوپ کا کوئی بھی ٹکڑا
زمیں پر چپکا نہ رہے !
اُجالے کا کوئی بھی ٹکڑا
دھرتی سے لپٹا نہ رہے !
سورج کو روک لیں
گودریج کی الماری میں
اور چاند کو ایر بیگ میں تہہ کر لیں
وہ چاہتے ہیں
کہ ہوا کو بھی مٹھی میں دبا لیں
اور پیڑوں کے پتوں کے ہلنے کا بھی
کوئی وقت مقرر کر دیں
پانی جیسا کوئی بھی رقیق بہہ نہ سکے
آزاد
پنچھی کی حسب معمول اُڑان کو
لائسنس کا محتاج بنا دیں
لیکن ! اس بات پر وہ قطعی شرمندہ نہیں
کہ وہ کیا چاہتے ہیں ؟

بتوسط:- محمد منصور، سی ۴، ٹسکو ورکرس فلیٹ، پوسٹ: گول موری، جمشید پور ۸۳۱۰۰۳

اُردو کے ہم صوت حروف

ڈاکٹر گیان چند

اے - ۱۵ - اسٹاف کوارٹرس - سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد - ۳۴

رسالہ شاعر جلد ۵۶ شمارہ ۵ - ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کا ایک مضمون "اردو کے ہم صوت حروف" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس سے پہلے رسالہ آہنگ بابت ستمبر ۱۹۸۴ء میں ان کا ایک مضمون "دو چشمی ہے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ دونوں میں راقم الحروف کا ذکر ہے۔ چونکہ میں ذاتی تعلقات اور علمی اختلافات کو الگ الگ رکھتا ہوں اس لئے اپنی تحریروں سے ان کے اختلاف کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ایک زمانے سے میں نے صوتیات پر لکھنا بند کر دیا ہے۔ میں نے ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

"اب اس موضوع پر کچھ لکھوں گا نہیں۔ لسانیات سے جی بھر گیا۔ میری محدود معلومات تھیں اب ان میں اضافہ نہیں ہو رہا جس کے معنی رفتہ رفتہ اندوختہ ختم ہو جائے گا۔"

میرا یہ خط نقوش خطوط نمبر جلد سوم بابت اپریل مئی ۱۹۶۸ء میں ص ۶۲۴ پر شائع ہوا ہے۔ میں ڈاکٹر سحر کے آہنگ کے مضمون کے بعد خاموش رہا کیونکہ اپنے دوسرے تصنیفی کاموں میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اب جبکہ شاعر میں ان کا مضمون آیا ہے میں نے محسوس کیا کہ مجھے مختصراً دونوں کے بارے میں اپنا تبصرہ پیش کر دینا چاہیے۔ آہنگ کے مضمون سے متعلق میں نے لکھ کر آہنگ کو بھیج دیا ہے۔ شاعر کے مضمون کے بارے میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اس موضوع پر بہت دیر سے لکھا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں جن حضرات کے مضامین کا حوالہ دیا ہے وہ کم از کم اُنیس سال پرانے ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۶ء تک کے، بلکہ بعض اس سے بھی پیشتر کے۔ میں اب بھی اردو رسم الخط سے زائد ہم صوت حروف کو خارج کرنے میں نقصان کے مقابلے میں فائدے زیادہ دیکھتا ہوں۔ ان حروف کی وجہ سے اردو املا اور ہجے قیاسی نہ رہ کر سماعی بن گئے ہیں۔ اکثر الفاظ کے ہجے فرداً فرداً یاد کرنے پڑتے ہیں۔ میں نے اپنی موجودہ یونیورسٹی میں نہ صرف ایم۔ اے بلکہ پی۔ ایچ۔ ڈی تک کے دو ایک طلبہ کے یہاں عربی حروف کے مختلف ہجے دیکھے ہیں۔ کئی سال ہوئے ڈاکٹر محمود دہلی سے بات چیت کے دوران میں نے کہا کہ فلاں فلاں ریڈر اس قابل ہیں کہ انھیں پروفیسر بنا دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ان سب کے یہاں تحریر میں املا کی غلطیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر ایک ریڈر کا خط دکھایا جنھیں میں بہت قابل سمجھتا تھا اور جن کے خط میں عربی حرف کی غلطی تھی۔ عربی کے ہم صوت حروف کو خارج کرنے سے یہ مصیبت تو دور ہو جائے گی۔

انیسویں صدی کے وسط سے پہلے اردو کتابوں میں یائے معروف و مجہول میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ اس عہد تک کے مخطوطات میں ک اور گ دونوں پر ایک مرکز لگایا جاتا تھا۔ ہائے ہوز اور ہائے مخلوط کو حسب خواہش ادل بدل کر لکھ دیا جاتا تھا مثلاً گھر اور گہر دونوں کو کبھی گھر اور کبھی گہر لکھا جا سکتا تھا۔ اُس وقت میں ان حروف کے املا کی اصلاح پر بھی اعتراض ہو سکتا تھا کہ اس سے پرانی کتابیں بے کار ہو جائیں گی لیکن یہ تعین مفید رہی۔ عام قارئین میں کتنے آدمی پرانی کتابیں پڑھتے ہیں۔ ہر اصلاحِ املا کے بعد پرانی کتابوں کو جب بھی چھاپا جاتا ہے تو نئے املا کے ساتھ۔ جہاں تک ہم صوت حروف کے ہٹانے سے التباس کا سوال ہے یہ واضح ہو کہ زبان کا استعمال تقریر میں تحریر کی نسبت بدرجہا زیادہ ہوتا ہے۔ اگر سیاق کے باعث ہم تقریر میں التباس نہیں کرتے تو تحریر میں کیوں کریں گے۔ کونسا لفظ کس زبان سے آیا ہے اس کے جاننے میں عام قاری کو دلچسپی نہیں۔ کم از کم نئی نسلوں کو نئے املا سے کوئی وحشت اور اجنبیت نہ ہوگی۔ دراصل ہم صوت حرو

کو خارج کرنے کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں قدامت پسندی اور روایت پرستی ہے ؎

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

میں اپنے سابقہ مضامین میں ہم صوت حروف کے خلاف دلائل دے چکا ہوں۔ ان کا تفصیلی اعادہ غیر ضروری ہے۔ میں بھی اس موضوع پر اس لئے خاموش ہو گیا کہ ان کا ترک صوتیاتی اعتبار سے کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو، ہے ناقابلِ عمل۔ انگریزی، فرنچ، جرمن زبانوں کے خط میں صامت SILENT حروف کی بھرمار ہے۔ برنارڈ شا انگریزی ہجا کی اصلاح کے لئے ترکہ چھوڑ گیا تھا کہ اس کی مدد سے تحقیق کرکے صحیح ہجا اور املا وضع کیا جائے۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔ امریکیوں نے ہجے میں محض یہ اصلاح کی کہ COLOUR اور METRE کو COLOR، METER لکھنے لگے لیکن WALK کا L یا NIGHT کا GH خارج نہ کرسکے۔ اگر ان جدید ذہن والی اقوام کا یہ حال ہے تو اہلِ اردو سے کسی انقلابی تبدیلی کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ حشو ہم صوت حروف کو ترک کرنا میرا ذاتی عقیدہ ہے لیکن چونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا اس لئے اب میں کسی سے اس ترک و اخراج کا مطالبہ نہیں کرتا۔

ڈاکٹر سحر نے بیس پچیس سال قبل کی تحریروں کو مدِّ نظر رکھا ہے لیکن اس کے بعد کے ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی کے املا نامے (مئی ۱۹۷۴ء) کا ذکر نہیں کیا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین اس کمیٹی کے صدر اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خاں اس کے ممبر تھے۔ املا نامہ کے مرتب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تھے۔ اس کتابچے میں ذیل کے رہنما اصول موجود ہیں۔

(۳) کوئی تبدیلی ایسی تجویز نہ کی جائے جو اردو کی تاریخ، اس کے مزاج اور سماجی ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے ناقابلِ عمل ہو۔

(۴) اردو کے ہم آواز حروف اردو کی لسانی میراث کے اجزا بن چکے ہیں۔ انھیں کی بدولت ہزاروں الفاظ کی بیش بہا دولت ہمیں ودیعت ہوتی ہے جو ہماری زبان کا جزوِ لاینفک ہے۔ ص ۲۶ — ۲۵

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سفارشات کتابی شکل میں پہلے چھاپ دی گئیں اور ان پر غور کرنے کے لئے آٹھ دس آدمیوں کی کمیٹی بعد میں بلائی گئی۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ مختلف سفارشات پر تبصرے پیش کئے گئے جنھیں ۹۳ صفحوں پر سائیکلو اسٹائل کرکے بھیجا گیا۔ یہ اوراق آج بھی میرے پاس ہیں۔ مختلف تبصروں میں اس ننگِ اسلاف کے تبصرے کثرت سے اور سب سے پہلے درج ہیں۔ ان میں میں نے یا کسی دوسرے رکن نے اردو کے ہم صوت حروف کا مسئلہ نہیں اٹھایا کیونکہ انھیں خارج کرنا ناقابلِ عمل تھا۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"ایک تو یہی خطرے سے خالی نہیں کہ اردو رسم الخط میں اصلاحیں کرنے کا حق ہر ماہر لسانیات کو دے دیا جائے..." ص ۱۹۔

اصلاحیں کرنے کا حق ایک بات ہے اور اصلاح کے بارے میں تجویز کرنا دوسری بات۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ چونکہ رسم الخط، حروف تہجی اور املا کا مقصد کسی زبان کی آوازوں کو صحت سے قلم بند کرنا ہے اس لئے جو شخص ان آوازوں کی نوعیت سے ناواقف ہو یعنی جس نے صوتیات (مع فونیمیات یا فونالوجی) نہ پڑھی ہو اسے رسم الخط اور املا پر نہیں لکھنا چاہئے۔ اگر وہ لکھے گا تو کہیں نہ کہیں لغزش کر جائے گا مثلاً منڈانا، مانند، مینڈک، سانپ جیسے الفاظ میں وہ صحیح صحیح نہیں جان سکتا کہ کہاں مصمتہ 'ن' ہے اور کہاں غنائی مصوتہ۔ وہ تو سب کو نونِ غنہ کی ایک لاٹھی سے ہانکے گا۔

واضح ہو کہ لسانیات کی شاخ صوتیات میری یا کسی کی جاگیر نہیں۔ میرا صوتیات کا مطالعہ محدود ہے لیکن رسم الخط اور املا کو سمجھنے کی حد تک کافی ہے۔ جو ان موضوعات پر لکھنے کے خواہاں ہوں انھیں صوتیات کی مبادیات کا جاننا ضروری ہے۔ مشکل یہ ہے کہ صوتیات محض کتابوں سے نہیں پڑھی جاسکتی، اسے استاد سے سیکھنا ضروری ہے۔ رسم الخط پر لکھنے کے خواہش مند حضرات دو بار مہینے میں اس کا درس لے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کو لیجئے۔ مجھے شک یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے صوتیات محض کتابوں سے پڑھی تھی، کسی استاد سے درس لے کر نہیں۔ فونیات کا ایک اہم تصور فونیم کا ہے جس سے متعلق لسانیات کی شاخ کو فونیمیات PHONEMICS کہتے ہیں۔ فونیم کا ترجمہ صوتیہ کیا گیا۔

صوت اور صوتیے کا فرق قدرے تکنیکی اور دشوار ہے۔ یہاں اسے قطع کیا جاتا ہے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ ایک اچھے رسم الخط کے حروف کو اس زبان کے صوتیوں یعنی فونیموں کی نمائندگی کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنے ایک[1] مضمون میں ع، ح وغیرہ کو صوتیہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں جن جوڑوں الیم، علیم اور ہال، حال وغیرہ کی مثال درج کرتے ہیں اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ وہ فونیمات کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے۔ وہ حروف کی بنا پر صوتیے طے کرتے ہیں۔ صوتیہ بننے کے لئے اس کا صوت ہونا ضروری ہے۔ اپنے جوابی[2] مضمون میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان کے اس غیر سائنسی رویّے کی سختی سے گرفت کی۔

ڈاکٹر سحر لکھتے[3] ہیں کہ اکثر عرب ممالک میں ض، ظ اور ذ، کو دال کی طرح اور ث کو تھ کی طرح آدا کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ خیال بھی غلط ہو جاتا ہے کہ ہائیت (ہکاریت) صرف ہند آریائی یا ہندوستانی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔

مجھے ان بیانات پر حیرت ہوتی ہے۔ واضح ہو کہ غیر زبان کی جو آوازیں ہماری زبان میں نہیں ہوتیں ہم جب ان آوازوں والے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں تو اپنی زبان کی اس سے مماثل ترین آواز سے بدل لیتے ہیں۔ ہمارے اعضائے نطق غیر زبان کی اجنبی آواز کو ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ ستم یہ ہے کہ ہمارے کان بھی ان اجنبی آوازوں کی گرفت نہیں کر سکتے۔

یہ واضح ہے کہ جن آوازوں کی ادائیگی میں مخرج کا ذرا سا بھی اختلاف ہو وہ آوازیں مختلف ہوتی ہیں۔ ہمارا سامعہ ان کے اختلاف کی تمیز کر سکے کہ نہیں، اہلِ زبان اس نازک فرق کی گرفت کر سکتے ہیں۔ غیر اہلِ زبان نہیں کر پاتے مثلاً انگریزی کے d، t ہرگز ہمارے ٹ، ڈ نہیں، ان سے بالکل مختلف ہیں۔ انگریزی کے ان مصمتوں کو ادا کرنے کے لئے زبان کی نوک اوپری مسوڑھے کو چھوتی ہے جبکہ ٹ، ڈ کے لئے الٹ کر اوپر کے تالو کو چھوتی ہے۔ میں نے ریڈیو میں بی۔ بی۔ سی کی انگریزی خبروں کو توجہ سے سن کر دیکھا۔ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی کا T،D ہمارے ٹ، ڈ کی طرح ہے لیکن انگریزی کا اہلِ زبان ہمارے انگریزی تلفظ کو سن کر فوراً پہچان جائے گا کہ ہم کوئی اور آواز بول رہے ہیں۔ اسی طرح THE، THINK جیسے الفاظ میں TH ہرگز ہمارے تھ، د نہیں۔ آخر الذکر بندشی مصمتے ہیں جن میں زبان اوپری دانت کو چھو کر سانس کا اخراج بالکل بند کر دیتی ہے جب کہ انگریزی TH کی دونوں آوازیں صفیری ہیں یعنی ہماری نوکِ زبان اوپری دانت کو چھوتی نہیں، قدرے فاصلے پر رہ کر سانس کا اخراج ہونے دیتی ہے۔ چونکہ ہم انگریزی کی ان آوازوں کو ادا کرنے پر قادر نہیں اس لئے انھیں اپنی مانوس آوازوں کی طرح بدل لیا ہے اور ہمارے ناقص سامعہ کو اس کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔

اپنا ایک تجربہ پیش کرتا ہوں۔ میں ایک بار امریکہ گیا نیویارک میں اسٹیمر کی سروس شہر کے اطراف سمندر اور دریا میں چار پانچ گھنٹہ سیر کراتی ہے۔ اس سروس کا نام ہے سرکل لائن۔ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ پیدل ساحل پر واقع چھوٹے سے بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں دو جاپانی نژاد جوان امریکیوں سے پوچھا کہ سرکل لائن کا کون سا راستہ ہے۔ میں نے انگریزی ہی بار بار کہا۔ ان میں سے ایک نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہاں جانا چاہتے ہیں!" میں نے جھلّا کر الگ الگ ہجے کر کے کہا C-I-R-C-L-E L-I-N-E امریکی نے ہنس کر سکڑتے ہوئے زوردار انگریزی لہجے میں کہا۔ سرکل لائن۔ ہم بھی ادھر ہی جا رہے ہیں۔ یہی راستہ ہے، اور ہم سے آگے جاتے ہوئے وہ بار بار مڑ کر ہماری طرف ہنس کر دیکھتا تھا۔ وہ میرے ر، ک کو اس لئے نہ سمجھ سکا کہ میرا مخرج اور طریقِ تلفظ انگریزی سے مختلف تھا۔

اردو میں عربی کے مخصوص حروف اور ان سے مماثل اردو کی آوازوں کا مخرج ذیل میں درج کرتا ہوں تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ تمام آوازیں مختلف ہیں۔ انھیں سمجھنے کے لئے صوتیات کی بنیادی معلومات ضروری ہے۔

حلق میں انگریزی حرف V کی طرح دو صوتی تار ہوتے ہیں۔ سانس ان کے بیچ سے گزر کر آواز پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ تار کشادہ رہے

---

[1] شوکت سبزواری: اردو کے صوتیے۔ اردو نامہ شمارہ ۱۵، جنوری تا مارچ ۱۹۶۴ء ص ۴۷

[2] ڈاکٹر نارنگ: اردو کی آوازیں۔ اردو نامہ شمارہ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۶ء ص ۴۸

[3] ... شمارہ ۵۔ ۱۹۸۵ء ص ۱۱

ان کو غیر معیتی یا غیر مسموع VOICE LESS کہتے ہیں۔ اگر یہ تار تنگ ہو کر نزدیک آجائیں تو ان کے بیچ سے گزرنے والی آواز زیادہ زور کی ہوتی ہے اسے معیتی یا مسموع VOICED کہتے ہیں۔

اگر کسی مصمتے کو ادا کرنے کے لئے مُنہ یا حلق کے کسی حصّے میں سانس کو پہلے پوری طرح بند کر لیا جائے اور اس کے بعد یکایک رہا کیا جائے ایسے مصمتے کو بندشی STOP کہتے ہیں۔ اگر مُنہ یا حلق میں سانس کو پوری طرح نہ روک کر سانس کو کسی باریک راستے سے نکلتے رہنے دیں ایسے مصمتے کو صفیری FRICATIVE کہتے ہیں۔

اب پہلے عربی آوازوں سے مماثل اردو آوازوں کا مخرج دیکھئے۔

زبان کو اوپری دانت سے چھو کر سانس بند کیا جائے اور پھر رہا کیا جائے تو ایسی غیر معیتی آواز 'ت' اور معیتی آواز 'د' ہوتی ہے۔ اگر عمل میں سانس کی مقدار معمول سے زیادہ چھوڑی جائے تو تھ، دھ ادا ہوں گے۔

اگر زبان کو اوپری مسوڑے کے سامنے لایا جائے اور سانس کو باریک راستے سے گزارا جائے تو اس سے غیر معیتی صفیریہ 'س' اور معیتی صفیریہ 'ز' ادا ہوتا ہے۔

اب عربی مصمتوں کو لیجئے۔ ان کا مخرج صوتیات کی کسی اردو کتاب میں نہیں ملتا۔ میں نے سرسوتی سرن کیف کی انگریزی کتاب سے لیا ہے۔ [۵۱]

ث، ذ اگر دونوں دانتوں کے بیچ کے حصّے کے سامنے نوکِ زبان کو لایا جائے اور سانس کو باریک راستے سے گزارا جائے تو غیر معیتی صفیریہ 'ث' اور معیتی صفیریہ 'ذ' ادا ہوتا ہے۔ اگر نوکِ زبان کو بین دندانی مقام کے بجائے اوپری دانت کے سامنے باریک راستے سے گزاریں تو انگریزی کا غیر معیتی صفیریہ TH (THINK) اور معیتی صفیریہ TH (THE) ادا ہوتا ہے۔ اردو 'تھ' اوپر کے دانت کو چھونے والا غیر معیتی بندشی مصمتہ ہے جس میں سانس کی مقدار زیادہ چھوڑ کر اسے ہکاری بنا لیا جاتا ہے۔ مغربیوں نے عربی کے بین دندانی ث کو اپنا اوپری مسوڑے والا صفیریہ th سمجھا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر ایک غلطی کی دوسری غلط نقل کر کے اسے اپنا 'تھ' سمجھ بیٹھے۔ ث اور تھ کا فرق ایک بار پھر واضح کر دوں ث کو ادا کرنے کے لئے نوکِ زبان دونوں دانتوں کے بیچ کے خط کے سامنے پہنچتی ہے لیکن چھوتی نہیں۔ ہوا کو خارج کرتی رہتی ہے۔ تھ کو ادا کرنے کے لئے نوکِ زبان اوپری دانت کو چھو کر ہوا کا راستہ مسدود کر دیتی ہے اس کے بعد زبان کو یکایک ہٹا کر اور بہت زیادہ مقدار میں سانس کو رہا کر کے تھ ادا کرتی ہے۔ ث اور تھ دونوں غیر معیتی ہیں۔

ط، ض زبان کے پچھلے حصّے کو کھینچ کر اور پیچھے کی طرف لے جایئے۔ زبان کی نوک اوپری مسوڑے سے چھو کر ہوا کا راستہ بند کیجئے اور پھر چھوڑیے تو غیر معیتی لثوی (مسوڑے سے متعلق) بندشی مصمتہ ط اور معیتی ض ادا ہو گا۔

ص، ظ زبان کے پچھلے حصّے کو مندرجہ بالا طریقے سے کھینچ کر پیچھے لے جایئے۔ نوکِ زبان کو اوپری مسوڑے کے سامنے لایئے لیکن چھویئے نہیں، ایک باریک سا راستہ رہنے دیجئے اور اس میں سے سانس رہا کیجئے اس طرح غیر معیتی صفیریہ ص اور معیتی صفیریہ ظ ادا ہو گا۔

ح، ع زبان کی جڑ کو پیچھے کی طرف لے جایئے۔ حلق کے اوپری حصّے کو بہت تنگ کر کے باریک راستے سے سانس باہر جانے دیجئے اس طرح غیر معیتی آواز ح اور معیتی آواز ع ہے۔ واضح ہو کہ عربی ح ہائے ہوّز سے مختلف ہے۔

ہ، ہائے ہوّز اور عربی ہمزہ حلق کے نچلے حصّے کو تنگ کر کے سانس خارج کیجئے تو صفیری ہائے ہوّز ادا ہوتی ہے۔ اس میں اور حائے حطّی میں دو فرق ہیں۔ اوّل الذکر کا مخرج آخر الذکر سے نیچے ہے۔ نیز آخر الذکر یعنی حائے حطّی کو ادا کرنے کے لئے زبان کے پچھلے حصّے کو کھینچ کر اور پیچھے کو لے جانا پڑتا ہے۔

اگر حلق کے نچلے حصّے کو بالکل بند کر کے سانس رہا کیا جائے تو عربی ہمزہ ادا ہو گا۔ یہ آواز اردو میں نہیں۔ اردو کا ہمزہ اس سے بالکل مختلف ہے

---

۵۱ SARASWATI SARAN: INDIA'S NATIONAL WRITING, P P 35-36
MUNSHI RAM MANOHAR LAL, DELHI, AP. APRIL 1969

ربی ہمزہ مصمتہ اور اردو ہمزہ مصوتہ ہے۔

صوتیات میں اکثر غیر معیتی اور معیتی مصمتوں کے جوڑے دیے جاتے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ ہمارے رسم الخط میں عربی کے مخصوص حروف کے بورے ان کے نام، ہیئت اور حروفِ تہجی میں مقام صحیح نہیں۔ اردو اور عربی کی نزدیکی آوازیں اس طرح گروہ بند کی جائیں گی۔

بندشی مصمتے — ت ، د
ط ، ض

صفیری مصمتے — ث ، ذ
س ، ز
ص ، ظ
ح ، ع
ہ (ہائے ہوز)

عرب ممالک میں ان سب کا تلفظ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اردو میں یہ ہمارے بعض مصمتوں کے مثنیٰ بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ مختلف عرب ممالک میں ان حروف اور بعض دوسرے حروف کا تلفظ یکساں نہیں، بدلتا رہتا ہے۔ مصر کی عربی سعودی عرب کی عربی سے بہت مختلف ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ عربی میں گ نہیں ہوتا لیکن مصر میں ج کا تلفظ گ ہے۔ جمال عبدالناصر کو گمال عبدالناصر کہتے ہیں۔ شام کی GOLAN HEIGHTS پر اسرائیل نے قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ گولان دراصل جولان ہے۔ ترکی میں (جو عرب ملک نہیں) ک کی آواز چ ہے، وہ اللہ اکبر کو اللہ اچبر کہتے ہیں۔ عرب ممالک میں رہ کر واپس آنے والے ہندوستانی علمار نے مجھے بعض حروف کا اختلافی تلفظ بتایا۔ اس وقت مجھے تفصیل یاد نہیں۔ بہر حال اوپر جو تلفظ اور مخرج دیا گیا ہے وہ سعودی عرب کا ہے۔

یہ خیال کس نے ظاہر کیا ہے کہ ہائیت ہند آریائی زبانوں کے علاوہ نہیں پائی جاتی۔ اوستا میں 'گھا' تھا، جیسا لفظ تھا انگریزی میں THINK میں تھ نہیں لیکن انگریزی میں P, T, B جب کسی لفظ کے شروع میں آتے ہیں تو انھیں ہائے مخلوط کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے مثلاً PIN کا تلفظ پھن ہے لیکن لفظ کے درمیان اور آخر میں ہائیت کا اضافہ نہیں کیا جاتا یعنی SPIN کی P 'پ' ہے پھ نہیں۔

اردو میں ع کی کوئی امتیازی آواز نہیں۔ ابو محمد صاحب شعرا اور شورہ یا تعالیٰ اور تالا سے ع کی جداگانہ آواز کا استدلال کرتے ہیں لیکن ان الفاظ کے جوڑوں میں تلفظ کا فرق اس لئے ہے کہ جوڑے کے پہلے لفظ میں ایک آواز مزید ہے۔ ان میں ع الف متحرک یا آ کی آواز دے رہی ہے۔ شعرا برابر ہے شُ + اُ را کے اور تعالیٰ برابر ہے تَ + آ لا کے۔ تعالیٰ کے جزو عالیٰ اور آلا میں عا اور آ کے تلفظ میں ذرا بھی فرق نہیں۔ شعرا اور تعالیٰ میں تین تین صوت رکن SYLLABLES ہیں جب کہ شورہ اور تالا میں محض دو دو ہیں۔ صوت رکن کا تصور بھی صوتیات کے مطالعے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ کوئی انگریزی کا ایم۔ اے اگر صوتیات سے ناواقف ہے تو وہ انگریزی کے مختلف الفاظ میں صوت رکنوں کی صحیح تعین و تفہیم نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر سے میری دوستی کی عمر ایک تہائی صدی کے قریب ہے۔ یہ جزوی علمی اختلاف مزاج المومنین سمجھئے ○○

زرِ سالانہ ختم ہونیکی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری اکتوبر ۸۵ء کے ساتھ ختم ہو چکا ہے ازراہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۴۸ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ اُمید ہے کہ آپ تجدیدِ خریداری سے مزید نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

خلش بڑودوی

میری آنکھوں میں سمائے ترا چہرہ بن کے
کوئی تو رنگ دکھا دے، مجھے گہرہ بن کے

کوئی کیا آئے کسی کو نہیں آنے دیتا
دل کے دروازے پہ بیٹھا ہے وہ پہرہ بن کے

لوگ مخلص بھی ہوں، سچے بھی ہوں، ہمدرد بھی ہوں
تب کہیں رہتا ہے ماحول سنہرہ بن کے

اب تو دینا ہی پڑے گا مجھے دنیا کو جواب
اس طرح اب نہ جیا جائے گا بہرہ بن کے

کہیں نغمہ، کہیں خوشبو، کہیں کرنیں، کہیں رنگ
وہ کبھی سامنے آتا نہیں چہرہ بن کے

مری بستی میں بھی کچھ لوگ ہیں راون جیسے
اس طرف بھی کوئی دن آئے دسہرہ بن کے

کوئی کردار، نہ معیار، نہ ایثار، نہ پیار
رہ گیا آج کا انسان اکہرہ بن کے

زندگی اس کی خلشؔ اب بھی سکھی ہو نہ سکی
پھول پامال ہوئے مفت میں سہرہ بن کے

● یاقوت پورہ - بڑودہ

شفیق انجمؔ سہوانی

تھی شکلِ بے نظیر، دلِ بے مثال میں
پریاں کہاں سے آ گئیں، جامِ سفال میں

پوچھو نہ مجھ سے میری تباہی کی داستاں
یارائے لب نہیں، دلِ شوریدہ حال میں

واپس کیا گیا ہے مجھے لوحِ عرش سے
انسان کا کمال ہے، شانِ زوال میں

میں اختیارِ فکر و عمل مانگتا رہا
قسمت سمٹ کے آ گئی دستِ سوال میں

غارِ شہود، عکس گہہ غیب ہے شفیقؔ
سو، سو کے جاگتے رہو، خواب و خیال میں

● ریڈر، شعبہ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ساغر پالنپوری

ہر پھول لپکتا ہوا شعلہ دکھائی دے
سارا چمن ہی آگ کا دریا دکھائی دے

رہتی کہاں ہے لمحہ بھی ساکن یہ کائنات
ہر سمت خیر و شر کا تماشا دکھائی دے

اُن سوختہ زمینوں میں اُگتا نہیں اناج
ہر ذرہ جن کا حرفِ تمنا دکھائی دے

شہتیر اپنی آنکھ کا دیکھیں تو خود ذرا
جن کو ہماری آنکھ میں تنکا دکھائی دے

ساغرؔ کو دوستوں میں بھی دیکھو تو یوں لگے
جیسے کوئی ہجوم میں تنہا دکھائی دے

● اشوک لاج، مرانڈا، پالم پور (ہماچل پردیش)

- خواتین تانبی لگائیے اور جھولا دُور کیجئے۔
- ولادت ٹالنے سے ماں کی صحت اچھی رہتی ہے اور بچّہ کی اچھی پرورش ہوتی ہے
- تانبی ــ پانچ منٹ میں راحت تین سال تک
- ماہواری کے ایام، زچگی اور وضعِ حمل کے بعد تانبی استعمال کی جا سکتی ہے
- تانبی کی وجہ سے کپڑے اور برتن دھونے نیز گھر کے کام کاج میں تکلیف نہیں ہوتی۔
- بچّے کی خواہش پر تانبی نکالی جا سکتی ہے
- خواتین کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کے جسم میں تانبی بٹھائی گئی ہے
- کسی بھی دواخانے، سرکاری دواخانے اور ابتدائی صحت کے مراکز اور سماجی بہبود کے مراکز پر تانبی مفت بٹھائی جاتی ہے۔
- تانبی بٹھانے والی خواتین کو مالی امداد کے طور پر ‎=/۹‎ روپئے دیئے جاتے ہیں۔
- استقرارِ حمل کی مدت بڑھانے کے لئے تانبی نہایت آسان اور کارگر طریقہ ہے۔

فیملی ویلفیئر سینٹر کے اشاعتی ادارہ کی شاخ بمبئی نمبر ۴۰۰۰۰۱ نے شائع کیا

پاکستان کی یاترا

جوگندر پال ● ۲۰۴، مندا کنی انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی - ۱۹

جب میں کینیا میں تھا تو برطانوی پاسپورٹ پر کئی مرتبہ بے روک ٹوک پاکستان ہو آیا تھا لیکن ادھر ساتویں دہے کے اوائل میں جب واپس ہندوستان آگیا تو میں نے محسوس کیا کہ پاکستان کے پڑوس میں پہنچ کر میں دراصل وہاں سے ناقابلِ یقین حد تک دُور ہو گیا ہوں۔ دُور دراز برطانوی جزیرہ سے تو پاکستان اتنا قریب ہے کہ ناشتہ یہاں کیجئے اور لنچ کے وقت تک آرام سے وہاں جا پہنچئے۔ مگر نیکسٹ ڈور ہندوستان سے یہ ملک خوابوں سے بھی پرے سرک جاتا ہے، ان دونوں پڑوسی ملکوں کی ہم عصر تاریخ میں شبہات کی اتنی گنجائش روا رکھی گئی ہے کہ ان کی سرحدیں تو ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں مگر یہ خود اتنے دور کہ گمان میں بھی ملاقات نہ ہو۔

مجھے پاکستان گئے ہوئے بیس سال سے بھی اوپر ہو چکے تھے، اب میں وہاں جانے کی اُمید بھی ترک کر چکا تھا مگر اس دوران میری ملاقات ایک ہم قلم پاکستانی افسر سے ہو گئی۔ منیر احمد شیخ دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ میں پریس کونسلر تھے، میری درخواست دیکھ کر پہلے تو انھوں نے ایک دفتر شاہ کی حیثیت سے مجھے بتایا کہ پاکستان جانے کی اجازت صرف اُنہی لوگوں کو دی جاتی ہے جو وہاں ایمرجنسی میں اپنے سگوں سے ملنے جانا چاہتے ہوں، لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے اندر بیٹھا ہوا ادیب دفتر شاہ کو دھکیل کر باہر آنکلا اور مجھے بڑی ہمدردانہ فہم سے سمجھانے لگا، کسی پاکستانی سے آپ کا خون کا رشتہ نہ سہی مگر خیالات کیا خون سے کم گاڑھے ہوتے ہیں؟ اس عظیم شخص نے غالباً اپنی نجی ذمّہ داری پر مجھے اور میری بیوی کو اس وقت کراچی، اسلام آباد، لاہور اور میرے مولد سیالکوٹ کے لئے ویزا فراہم کرادیا۔ میں نے پاکستان جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور اپنے سفر کے بارے میں کئی احباب کو خطوط بھی لکھ ڈالے، جس کا سب سے پہلے جواب آیا وہ تھی راحیلہ، میرے کالج کے ایک دوست کی بیٹی، اس نے اپنی چٹھی میں اپنا، اپنے دو چھوٹے بھائیوں اور ایک بہن کا بڑی محبت سے تعارف کرایا۔ اور لکھا کہ ہم سب اس بات پر بہت شادماں ہیں کہ ہمیں پہلی بار کسی ہندوستانی سے ملاقات کا موقع ملے گا۔

میں نے اس کی یہ سطریں دوبارہ پڑھیں۔ آخر اُس کے لئے کس بات کی اہمیت زیادہ ہے، اس بات کی، کہ میں اس کے والد کا ایک قریبی دوست ہوں یا اس کی، کہ اسے زندگی میں پہلی بار ایک ہندوستانی کی میزبانی کا موقع حاصل ہوگا۔ میں نے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دینا چاہا کہ ہم پاکستان اور ہندوستان کے پرانی پیڑھی کے لوگ، جو ابھی کل تک اتنے میل جول سے رہتے تھے، اب اپنی اولاد کے لئے اتنے اجنبی بن چکے ہیں۔ چونکہ اب ہمارا رابطہ ان سے ٹوٹ چکا ہے اور ہمارے بچّوں نے ہمارے تعلق سے صرف قصّے کہانیاں ہی سُن رکھی ہیں اس لئے اس قسم کے واقعہ پر وہ اپنا تجسّس ـــــ زیادہ سے زیادہ ہمدردانہ تجسّس ـــــ ہی ظاہر کر سکتے ہیں اور یہی تو وہ کرتے ہیں، اور کیا کریں!

۱۶ر اپریل ۱۹۸۲ء کو جب میں اور میری بیوی کراچی جانے کے لئے ہوائی جہاز میں سوار ہوئے تو معاً مجھے ۱۹۶۳ء کے سفر کی یاد آگئی ہمارا ارادہ تھا کہ نیروبی سے بمبئی آتے ہوئے چند دن کے لئے کراچی میں قیام کریں گے۔ عدن میں ہمارے جہاز میں کچھ میکانکی خرابی پیدا ہو گئی اور اعلان کیا گیا کہ ہماری فلائٹ چند گھنٹے تاخیر سے پہنچے گی لہٰذا ہمارے میزبان یہ سمجھ کر گھر لوٹ گئے کہ اب تو کل صبح ہی ہمیں اُتاریں گے لیکن ہوا یہ کہ ہم خلافِ توقع رات کے دو بجے ہی کراچی پہنچ گئے۔ بڑی طوفانی رات تھی اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی ضعیف ماں تین چھوٹے بچّوں اور بیوی کو لے کر کہاں جاؤں؟ میں ہوٹل کے بارے میں پوچھ تاچھ کر رہا تھا کہ یک لخت مجھے خیال آیا کہ نیروبی میں ہمارا

باجی، کے بڑے بھائی سوسائٹی کے ایریا میں رہتے ہیں۔ یہ باجی ایک مسلم خاتون تھیں جنھیں ہم اپنی بہن کا ہی درجہ دیتے تھے۔ انھوں نے اکثر
ذکر کیا تھا کہ کراچی میں ان کے بڑے بھائی رہتے ہیں۔ میں اور میری بیوی ابھی باجی کے بھائی کے پتہ کی تفصیل یاد کر ہی رہے تھے کہ ٹیکسی ڈرائیور
نے بتایا سوسائٹی ایریا آگیا ہے۔ وہ بڑا وسیع علاقہ تھا۔ میں نے ڈرائیور کو باجی کے بھائی کا بلاک بتایا لیکن اس بلاک میں ان کے مکان کا
نمبر ہمیں یاد نہ آیا، مجھے محسوس ہوا کہ ہماری پریشانی دیکھ کر وہ وسیع بلاک بھی اس طوفانی فضا کے ساتھ مل کر ہمارا مذاق اڑا رہا
ہے۔ یکایک میری نظر کونے کے ایک مکان پر پڑی جو باجی کی دی ہوئی تفصیل سے ملتا جلتا تھا۔

باجی کے بڑے بھائی ایک عمر رسیدہ اور شفیق انسان تھے جنھوں نے ہماری پریشانی کا قصہ سن کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں
ان کے گھر کا راستہ دکھایا۔ پھر انھوں نے لذیذ و گرم چائے سے ہماری تواضع کی، ہماری باتوں کو پوری توجہ سے سنا اور پھر ہمیں آرام
کرنے کا مشورہ دیا۔

اس واقعہ کے بعد مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ جس باریش بزرگ نے ہمیں اپنا مہمان بنایا تھا وہ باجی کے بڑے بھائی نہ تھے لیکن
میں نے کبھی باجی کو خط لکھ کر اپنا شبہ دور کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کیونکہ میرے نزدیک وہ شریف شخص دنیا کے ہر انسان کا بڑا بھائی
ہے۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ وہ اسے ہمیشہ زندہ رکھے تاکہ وہ طوفانی راتوں میں راستہ بھٹکے ہوئے مسافروں کو پناہ دیتا رہے۔

اب ہم تاروں کی سی روشنی سے جگمگاتے شہر کراچی کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ اس چراغاں کو دیکھ کر مجھے جو لطف حاصل ہوا اس سے
میں سمتوں کا احساس کھو بیٹھا۔ ہمارا جہاز نیچے اتر رہا تھا مگر مجھے محسوس ہوا گویا ہم آسمان کی طرف جا رہے ہیں جو ہمارے استقبال میں چراغوں
سے آراستہ کیا گیا ہے۔

کراچی میں میرا میزبان تھا صہبا لکھنوی، جو پاکستان کے مشہور ادبی ماہنامے "افکار" کا مدیر، مہتمم، مالک اور چپراسی سبھی کچھ ہے
اپنے اس ہمدمِ دیرینہ کو میں نے ویسا ہی پایا جیسے وہ سدا تھا۔ بڑی توانائی سے خرابیٔ صحت کو قائم رکھے ہوئے اور لگاتار باتیں کرتے ہوئے
سوچوں میں غلطاں، ہر ماہ کے اواخر میں جب 'افکار' کا تازہ شمارہ زیرِ اشاعت ہوتا ہے تو اس کی کیفیت بعینہٖ ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی
کوئی جیتا جاگتا بچہ پیدا کرنے سے پہلے ماں کی، میں اس کی محبت و خلوص اور خدمت گزاری کا وہ جذبہ کبھی نہیں بھول سکتا جس کا اظہار
اس نے ۱۹۶۲ء میں والدہ مرحومہ کے لئے کیا تھا۔ ایر پورٹ پر اس نے میرا تعارف اپنے بہنوئی احمد صاحب سے کرایا تو میں بڑی گرمجوشی
سے ان کی طرف بڑھا۔ مجھے یہ گمان گزرا تھا کہ اس نے 'علی' کہا ہے یعنی محمد علی صدیقی جو 'ڈان' میں ادبی کالم لکھتا ہے۔ صدیقی کا شمار اردو
کے ان معدودے چند سچے نقادوں میں ہوتا ہے جن کے نزدیک تنقید بھی تخلیقی شرکتوں سے عبارت ہو۔ اسی کے خط سے میرا حوصلہ بڑھا
تھا اور میں نے مزید تاخیر کئے بغیر پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے تحریر کیا تھا 'یہ ایسی گھڑی ہے جب ہمارے دونوں ملکوں
کے ادیبوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہند و پاک میں بے تامل آمد و رفت اور روابط کی فضا پیدا کریں'۔

کراچی میں بے شمار بستیاں ہیں جن کے نام ہندوستان کے شہروں یا یہاں کی بڑی بڑی سڑکوں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں اور ان میں
جو لوگ آباد ہیں انھیں آج بھی مہاجرین کہا جاتا ہے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے جب وہ یہاں آئے تھے تو مادرِ وطن کے ان مقاموں
کے نام ان کے دلوں پر ثبت تھے، اس طرح وہ مقامات بھی ان کی ہجرت کے وقت وہاں سے اٹھ کر ان کے ساتھ چلے آئے، ان سے مل کر
مجھے یہ محسوس ہوا کہ شہر یا قصبے از خود کسی جگہ قائم نہیں رہتے، وہ تو انہی کے ساتھ رہتے ہیں جنھوں نے انھیں آباد کیا تھا۔ اگر یہی مہاجرین
آج ہندوستان میں لوٹ کر آئیں تو وہ محسوس کریں گے کہ اب کے وہ اپنے گورکھپور، بارہ بنکی یا لکھنؤ کو کراچی میں چھوڑ آئے ہیں۔
شاید یہی وجہ ہے کہ جب مجھے کراچی میں اہالیانِ گورکھپور کے ایک مشاعرہ میں افسانہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا گیا جسے میرے دوست
اور اردو کے ایک معروف شاعر و نقاد انجم اعظمی نے منعقد کیا تھا، تو مجھے محسوس ہوا گویا میں گورکھپور پہنچ گیا ہوں ـــــ گورکھپور
جو وہاں کے لوگوں کی زندگی اور معاشرت کے لحاظ سے گورکھپور کی روایات کا علم بردار ہے۔ اس کے برعکس پچھلے سال جب مجھے یہاں
ہندوستان کے گورکھپور جانے کا اتفاق ہوا تو یہاں سکھوں کی ایک بستی میں قیام کر کے مجھے معلوم ہوا کہ میں شاید پنجاب کے کسی ٹھیٹھ قسم کے

قصبہ میں آگیا ہوں۔ میرے میزبان نے مجھے گرو گرنتھ صاحب میں شبد پڑھ کر سناتے۔ انھوں نے مجنوں گورکھپوری کا نام تک نہیں سنا تھا جن سے میری کراچی میں گورکھپوریوں کے مشاعرہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ مشاعرہ میں اہالیان گورکھپور نے مجنوں کو اپنی پلکوں پر بٹھایا اس لئے نہیں وہ بذاتِ خود اتنے مشہور و معروف ناقد ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ گورکھپور کی ایک عظیم الشان شخصیت ہیں۔

انہی دنوں ہندوستان کے تین دیگر ادیب بھی کراچی پہنچے ہوئے تھے ـــــ شاذ تمکنت، جگن ناتھ آزاد اور گوپی چند نارنگ۔ انجمن مصنفین پاکستان کی جانب سے مہمان ادیبوں کے اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا گیا جس میں مجھے اکثر ادیبوں سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ اردو افسانہ کے دوستوں اس استقبالیہ میں موجود تھے۔ "آنندی" کے غلام عباس اور ابوالفضل صدیقی، جن کے افسانوں میں دیہی زندگی کی اتنی اچھی عکاسی ہے کہ ان کی کہانیوں کے دیہات اصل دیہات سے بھی اصلی لگتے ہیں۔ مجھے ان دونوں کی ملنساری نے بہت متاثر کیا۔ سحر انصاری کے علاوہ جوش شستہ حلیے کے نہایت حساس شاعر ہیں، میری ملاقات "ہائے اللہ" کی ہاجرہ مسرور سے بھی ہوئی۔ انھوں نے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ہال کے اسٹیج پر جب ادھیڑ عمر کا ایک خوبرو شخص میری جانب جھکا تو میں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا اتنی گرم جوشی سے غالباً اس لئے، کہ میں ان کا نام ٹھیک طرح سے نہیں سن پایا تھا۔ بعد میں جب کلام پڑھنے کے لئے ان کا نام پکارا گیا تو مجھے اس بات پر خاصی خفت محسوس ہوئی کہ میں نے پہلے ان کا نام ٹھیک طرح سے کیوں نہ سنا۔ منیر نیازی جیسا سچا شاعر محض اپنا نام تو نہیں ہوتا ہے۔ مجھے تو اسے سونگھ کر ہی پہچان لینا چاہئے تھا۔

میرے عزیز دوست پروفیسر عتیق احمد پاکستان میں ماہرِ پریم چند کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے دوسرے دن کچھ ممتاز ادیبوں کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تاکہ میں ان سے ملاقات کر سکوں۔ پروفیسر ممتاز حسین نے دورانِ گفتگو اردو زبان کی تغیر پذیر کیفیات کا تنقیدی جائزہ لیا اور انھیں حق بجانب قرار دیا۔ 'خدا کی بستی' کے مشہور تخلیق کار شوکت صدیقی نے مجھے اپنے ایک زیرِ تحریر ناول کے بارے میں بتایا جس میں ان کے مفرور کردار گرفتاری کے ڈر سے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس کے باعث تمام ملک کی موجودہ صورتِ حال کی عکاسی کے لئے از خود ایک وسیع بنیاد تیار ہو گئی ہے۔ مشفق خواجہ جنھوں نے ادھر تنقید و تحقیق میں بڑا اہم کام کیا ہے، نہایت دلچسپ گفتگو کرتے ہیں مگر سلیم درانی جو 'سیپ' کے ایڈیٹر ہیں، غالباً یہ طے کئے ہوئے تھے کہ وہ گفتگو میں صرف بغور سننے کی حد تک حصہ لیں گے۔

اسی روز شام کو جمیل جالبی نے وہاں آئے ہوئے ہندوستانی ادیبوں کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا جس میں میں شریک نہ ہو سکا۔ کیونکہ اسی شام کو مجھے کہیں اور جانا تھا، جالبی غیر معمولی صلاحیتوں کے ادیب ہیں اور آج کل اردو ادب کی تاریخ کئی جلدوں میں مکمل کر رہے ہیں میرے دوست محمد علی صدیقی اور شفیع عقیل نے جو ایک حساس شاعر اور کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ "جنگ" کے میگزین سیکشن کے مدیر ہیں اور 'جنگ' کے لندن میں مقیم اسٹاف میں سے ایک ذہین، نوعمر صحافی وقتِ معیّنہ پر مجھے لینے آئے۔ ہم سب زدبی کے ہاں آگئے۔ زدبی پاکستان کے ایک نہایت ذکی الحس مصوّر ہیں اور بہت مقبول ہیں۔ انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی تصاویر کی ہی طرح وہ خاموشی کی زبان میں اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ سبھی احباب بڑی بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ علی کے ہاں حسبِ معمول اپنے خیالات کے اظہار میں وسعتِ قلبی نظر آتی تھی۔ شفیع اگرچہ دیکھنے میں مطمئن اور سہل پسند لگتے تھے لیکن تحقیق و باریک بینی ان کا امتیازی وصف ہے۔ برطانیہ سے وارد ہوئے نوجوان میں تشکیک کا جذبہ نمایاں تھا اور ان کے شکوک بعض اوقات غصے کی سرحد میں داخل ہو لیتے تھے۔ جہاں تک زدبی اعظم کا تعلق ہے وہ بزبانِ خاموشی اپنی پوری ترسیل کا اہتمام کئے ہوئے تھے۔ ان سبھی لوگوں کو ہندوستانی زندگی اور ادب کی اچھی معلومات تھیں لیکن پھر بھی وہ بہت کچھ جاننے کے مشتاق تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ جنوبی ایشیا کو "امن کا علاقہ" قرار دے دیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان جو ان کے مقابلے میں کہیں بڑی طاقت ہے، پاکستان کی طرف زیادہ اعتماد کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ پاکستان میں میرے قیام کے نصف آخر میں بھی ـــــ میں وہاں تقریباً تین ہفتہ رہا ـــــ ایسے کئی مواقع آئے جب مجھے احساس ہوا کہ پاکستان کے عوام میں ہندوستانی عوام سے ویسا ہی تعلق خاطر ہے جیسا کہ رشتہ داروں کے لئے عموماً ہوتا ہے اور اگر ہمارے رہنما دونوں ملکوں کے درمیان آشتی کی فضا تیار کرنے کے لئے سوجھ بوجھ سے کام لیں تو وہ بہت خوش ہوں گے۔

یبوں کے ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ ہمیں اپنی سرحد وطن کی دونوں طرف بلند و بالا سایہ دار درختوں کی ضرورت ہے ۔ تنے بلند و بالا کہ دونوں طرف اپنا گھنا سایہ ڈال سکیں۔

میری ملاقات ایک ایسے عجیب و غریب شخص سے بھی ہوئی جس کا سر تلاشِ محبت کی دیرینہ کشمکش میں رو پہلی ہو چکا تھا۔ انھوں نے یسیقی، ادب اور مذہب سبھی معاصر فنونِ لطیفہ کا انسانی آوازوں اور کیمرا سلائڈوں کی مدد سے بڑا باقاعدہ ریکارڈ ترتیب ے رکھا ہے۔ لطف اللہ خاں اصلاً مدراس کے رہنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ محض اپنے ذاتی شوق کی تکمیل کی غرض سے وہ اتنا ہم کام انجام دے رہے ہیں جو آگے چل کر فنی شہ پاروں کے ایک قومی ذخیرہ کی شکل اختیار کر لے گا اور جس سے اس برّصغیر کی قافتی سرگرمیوں کے ارتقاء کے مستند شواہد فراہم ہو سکیں گے۔ جب انھوں نے میرا ایک افسانہ میری آواز میں ریکارڈ کرنے ور اپنے آئینہ خانہ کے لئے ایک فوٹو سلائڈ بنانے کی فرمائش کی تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں اور میری بیوی کئی گھنٹے خاں صاحب کے ہاں رہے اور اس دوران بیگم خان نے ہمیں شاندار لنچ کھلایا۔ اس کے بعد وہ دونوں ہمیں ہاجرہ مسرور کے گھر لے گئے۔

میری بیوی نے ہاجرہ کو بتایا کہ اس نے خواتین کی پوشش سے متعلق پاکستان میں رائج نظریہ کے پیشِ نظر دو چار بار خاص طور سے لوائے ہیں۔ ہاجرہ نے یہ بات تسلیم کی کہ اس قسم کا مسئلہ وہاں اٹھا ضرور ہے لیکن ساتھ ہی بڑے زوردار لہجے میں یہ بھی کہا کہ ہم نے ردوں کی رعونت کی ایسی سخت مخالفت کی کہ انھیں شکست کھانی پڑی۔ دراصل حال ہی میں جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ پاکستانی واتین کو قومی زندگی سے ہٹا کر چولھے چکّی میں لگا دیا جائے تو ایک صوبہ کے گورنر کی بیوی نے یہ اعلان کیا کہ میں اس قسم کی کسی بھی ارروائی کی سب سے پہلے مخالفت کروں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکام کو یہ بیان دینا پڑا کہ تعلیم یافتہ خواتین کو برانگیختہ کرنے والی کسی ارروائی میں حکومت کا ہاتھ نہیں۔ اسلام آباد میں اور بعد میں لاہور میں بھی میری ملاقات متعدد ادیباؤں سے ہوئی اور میں نے سوس کیا کہ ان میں غیر معمولی صلاحیت اور عزم ہے اور وہ بھرپور طریقہ سے زندگی میں حصّہ لینے کا تہیّہ کر چکی ہیں خواہ وہ 'چادر' وڑھتی ہوں یا نہیں۔ مجھے زہرہ جمال، کشور ناہید، پروین عاطف، فریدہ حافظ، کہکشاں ملک اور جمیلہ ہاشمی ان خواتین میں سے نہیں لگیں وموقع فراہم ہونے پر اپنی صلاحیتوں کا کامل ثبوت دینے سے گریز کریں۔ میں نے نئی نسل کی لڑکیوں کے تعلق سے بھی یہی محسوس کیا کہ نھوں نے کیوں کر اپنی زندگی کے لئے عظیم الشان منصوبے تیار کر رکھے ہیں۔

ہاجرہ کے یہاں سے ہم پریس کلب گئے جہاں مجھے 'اردو فکشن کے جدید رجحانات' پر تقریر کرنی تھی۔ میری اس تجویز پر ان کے ثبت ردّ عمل سے مجھے خوشی ہوئی کہ افسانہ کے وسائل ــــــ نئے وسائل بھی ــــــ مثلاً علامت، تجرید، بے معنویت یا محض بیانیہ بذاتِ خود بے ضمیر ہوتے ہیں اور اسی لئے نئے حوالے میں وہ اکثر اظہار کا فنی ذریعہ نہ ہو کر محض اشتہار بن کر رہ گئے ہیں۔ جس طرح ہرے کے نقوش باطن کے مظہر ہوتے ہیں، بعینہٖ کسی افسانے کی کوئی ہیئت بھی اس کے اندر سے اُگنی چاہیئے۔ سہولتی اور میکانکی فروضوں سے کہانیوں میں دم نہیں آتا۔ اگر افسانے کو حقیقت سے ہم آہنگ کرنا مقصود ہے تو یہ ضروری ہے کہ افسانہ نگار اپنے ماحول سے وابستہ ہو اور اسے اپنی شرکتوں سے پیدا شدہ اضطراب اور تناؤ سے لکھنے کی تحریک ہو۔

پریس کلب میں منعقد جلسہ میں ہندوستان سے وارد شعراء تے جن میں جگن ناتھ آزاد، شاذ تمکنت اور افتخار امام تھے، اپنا تازہ ترین لام پیش کیا اور سامعین سے دادِ تحسین وصول کیا۔ جب ناظمِ جلسہ نے آزاد کو جن سے حاضرین بخوبی واقف معلوم ہوتے تھے، 'جوگندر ٔزاد' کہا تو آزاد نے کھڑے ہو کر مزاحاً دریافت کیا 'میں کسے قصوروار ٹھہراؤں آپ کو یا جوگندر پال کو، جن کے آتے ہی میرے نام کا 'ج' یک بیک 'جو' میں تبدیل ہو گیا؟' ابھی انھوں نے اپنی غزل پڑھنی شروع بھی نہ کی تھی کہ سامعین میں سے آواز آئی ــــــ 'ترنم سے' ــــــ آزاد اپنی غزل ترنم سے ہی پڑھتے ہیں لیکن انھوں نے ہنستے ہوئے پوچھا 'کیا میری غزل اتنی ناقص ہے کہ میں اسے ترنم سے پڑھوں؟'

یہاں مجھے احمد فراز سے مل کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ فراز عوامی شاعر ہیں۔ بہت کم سخن ہیں اور اپنی غزل ایسے دھیمے لہجے میں سناتے ہیں جیسے غزل کے مفہوم سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی آواز کو دبانے پر انھیں جو قدرت حاصل ہے اس سے سامع کو یہ احساس

ہوتا ہے کہ انسان کی آزادی کی خواہش کو دبایا جا رہا ہے اور یہی ان کی شاعری کا عام موضوع ہے۔ جلسہ کے اختتام پر پریس کلب کے سکریٹری نے کلب کے بارے میں ایک مختصر سی تعارفی تقریر کی اور بتایا کہ یہ کلب کیونکر ملک بھر میں بجا طور پر "جزیرۂ آزادی" کہلاتا ہے۔

اس مختصر تفصیل کو سن کر مجھے مسرت ہوئی لیکن ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی گزرا کہ ہم نے اپنی آزادی کو محض چند الفاظ یا خیالات کے چھوٹے چھوٹے جزیروں تک ہی کیوں محدود کر رکھا ہے۔ آزادی کو ہم اپنی زندگی کا ایک جز کیوں نہیں بنا پاتے؟ انسان کے ذمّہ دارانہ ردّعمل کا تصوّر تو تبھی ممکن ہے جب اسے آزادی کو اپنی روزمرّہ کی واردات بنا پانے کے مواقع میسّر آتے رہیں۔

صہبا لکھنوی نے مجھے محویت کے عالم سے نکالا اور یاد دلایا کہ ہمیں جمیل الدین عالی کے یہاں جانا ہے۔ عالی اردو دوہے کے جادوگر ہیں۔ حالانکہ وہ بیمار تھے اور گولیاں کھا کر سو گئے تھے۔ تاہم انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ہمارے وہاں پہنچنے پر انھیں بیدار کر دیا جائے۔ میں یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا کہ باوجود شدید تکلیف کے وہ ہمیں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائے وہ ایک فنکار ہی نہیں بلکہ فنونِ لطیفہ کے سرپرست بھی ہیں۔ اسی دوران سید انور بھی جو پاکستانی ادبی حلقوں میں "کمانڈر" کہلاتے ہیں، آ گئے، ان کے ساتھ غلام عباس پروفیسر عتیق احمد اور ڈاکٹر فوق کے علاوہ برکاتی بھی تھے جن کی نرم اور مہذب مسکراہٹیں فوراً ان کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ غلام عباس سے گفتگو کرتے وقت مجھے وہ اپنے افسانوں کی طرح بڑے پیارے اور سادہ لگے۔ کمانڈر مجھے بحیثیت افسانہ نگار بہت عزیز ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے پیشہ کا لحاظ رکھتے ہوتے بحرِ ظلمات میں بے دھڑک داخل ہو کر تلاشِ حق کرتے ہیں جبکہ ننھے فرشتے بے چارے اپنے دبیز پردوں سے ڈھکی ہوئی کھڑکیوں میں بیٹھے دور سے ہی جھانکتے رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنا ناول "ایک اور سومناتھ" تحفتہً دیا جس کے پہلے خالی صفحہ پر انھوں نے ایک خط اس توقع سے لکھا تھا کہ اگر اس کو پڑھ کر ہندوستانی قاری خفا ہوں تو میں ان کا دفاع کروں۔ انھوں نے مجھے آگاہ کیا کہ ناول ابتداءً ہندوستان دشمن لگ سکتا ہے، لیکن اگر آپ اسے بغور پڑھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ مخالفت ہندوستان کی نہیں، جنگ کی کی گئی ہے اور غالباً اسی وجہ سے انھوں نے اپنے پاکستانی نقادوں کی شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انھوں نے میری امن کی چاہ کو جہاد کے تصوّر کی مخالفت سے تعبیر کیا ہے۔

انجم اعظمی کے ہاں رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اور صہبا کوئی نصف شب کے آس پاس گھر واپس آئے۔ دن بھر کی معروفیت سے ہم خاصے تھک چکے تھے۔ لیکن وہاں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ علی حیدر ملک، شہزاد منظر اور ممتاز احمد خاں میرے منتظر ہیں۔ وہ روزنامہ "جسارت" کے لئے افسانہ پر میری گفتگو ریکارڈ کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے مجھے اغوا کرنے آئے تھے دراصل میں نے خود ہی ان سے کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ مجھے ناوقت اغوا کر کے لے جائیں تو گفتگو کے لئے ٹائم نکل آئے گا۔ لہٰذا اب انھوں نے یہ ہمت کی اور مجھے اپنی ٹیکسی میں اڑا کر کراچی ائیرپورٹ پر لے آئے۔

جب ہوائی اڈہ کے اسکائی روم میں وہ اور نوجوان رحمٰن شریف اور اے خیام بھی پہنچ گئے تو ہم نے گفتگو شروع کی۔

علی حیدر ملک نے مجھ سے پوچھا "پرانی پیڑھی کے ترقی پسندوں اور نئی نسل کے جدت پسندوں اور آپ کے درمیان کس قسم کے اختلافات رہے ہیں؟"

میں نے جواب میں انھیں بتایا کہ "سچے ادیب کے لئے یہ فطری امر ہے کہ وہ کسی بھی وقت اس تحریک سے تجاوز کر جائے جس کی نشوونما میں اس کو دخل رہا ہے یا جس کا وہ بانی بھی رہا ہے۔ یہی ایک ایسی دلیل ہے جس کی بنا پر اکثر تخلیق کاروں کے باہمی اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ پریم چند، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس اور اشفاق احمد سے ہمارا ذاتی نظریات کی بنا پر کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، ان کے افسانوں "کفن"، "گنڈاسہ"، "آنندی" اور "گڈریا" پر کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں۔"

میں نے انھیں بتایا کہ "بہترین ترقی پسند ادیب یہ بخوبی جانتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ تخلیق کیا ہے، اس میں اچھی تصانیف کیوں ہمیشہ اچھی قرار دی جائیں گی اور بری تصانیف کیوں بری۔ مشکل ان غیر ادیب اور تحریک زدہ ادبا کے باعث پیش آئی جنھوں نے عمداً یا اندھادھند ادیبوں کے بعض حلقوں میں بے محل غلط فہمیاں پیدا کر کے انھیں آمنے سامنے کی صفوں میں بانٹ دیا۔ ان

حالات میں ان ادیبوں نے جو ادب اور زندگی کی صداقتوں پر کھلا ایمان رکھتے تھے اپنے آپ کو تحریک کی کٹھ مُلّائیت سے بچاتے رکھا لیکن میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ اس طرح پیدا شدہ حالات کا ان بدعنوان رہنماؤں، دفتر شاہوں اور تاجروں نے فوراً فائدہ اٹھایا جو خود کو جدت پسند کہتے تھے اور ایسے افسانوں کو مقبولیت بخشنے کی کوشش کر رہے تھے جس میں کسی کو کچھ پیش نہیں آتا اور جو بے معرف شہری اسالیب اور مخصوص محاوروں کی مشق اور نمائش کا سماں باندھے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے نئے ادیبوں کو مرعوب اور گمراہ کرنے کی غرض سے مغرب کی ادبی اصطلاحوں کا بے تکا استعمال کیا اور جو بھی ذرائع انہیں فراہم ہوتے انھیں کام میں لا کے انھوں نے ماحول میں بھگدڑ سی مچا دی تاکہ تخلیق کار بوکھلا بوکھلا کر ان کی پناہ گاہوں میں جمع ہوتے چلے جائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مفاد پرستوں کی بدنیتی اور نیم الذہنی کا بھرم بالآخر کھلنے لگا اور نئی نسل کے سچے لکھنے والوں نے بھی اپنے پیش رو تخلیق کاروں کے مانند نعروں اور کلیشوں سے متاثر ہونے سے انکار کر دیا اور ایسے اور واردات کو افسانوی اسالیب کی بنیاد قرار دیا۔

میرے نوجوان دوست صبح کوئی ساڑھے چار بجے مجھے صہبا کے مکان پر چھوڑ گئے۔ میں فوراً ہی سو گیا اور شاید سویا ہی رہتا لیکن جب کراچی کے روزنامہ "جنگ" کے ابوراشد انٹرویو کے لئے آئے تو میری بیوی نے مجھے جگا دیا۔ جب تک میں تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آتا "دوشیزہ" کے مدیر صہبا مرزا اور محمد علی صدیقی بھی پہنچ چکے تھے۔

آج سہ پہر کو مجھے کراچی سے اسلام آباد کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میرے ذہن پر مختلف سوالات مسلّط تھے ـــــ ابوراشد سے ہونے والی گفتگو، کراچی سے روانہ ہونے سے پیشتر پولیس کو اطلاع اور احباب نے مجھے جو کتابیں تحفہ میں دی تھیں انھیں ابھی بنڈلوں میں باندھنا باقی تھا ـــــ تاہم میں جلدی میں "جنگ" کے لئے انٹرویو دینے بیٹھ گیا۔ ابوراشد کے سوالات کو چھوٹے چھوٹے جوابوں میں سمیٹتے ہوئے مجھے کئی بار دھچکوں کا احساس ہوا مگر میں نے گاڑی کی رفتار میں کمی نہ کی۔ صہبا مرزا میرا انتظار کئے جا رہے تھے کہ کب انٹرویو ختم ہو اور وہ مجھے اپنی روانگی کا اندراج کروانے پولیس کے دفتر میں لے جائیں۔ انھوں نے مجھے اور میری بیوی کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ بیگم صہبا بہت ہی متواضع خاتون ہیں، "دوشیزہ" کی ادارت کرتی ہیں اور اس طرح نہ صرف اپنی پیاری سی بچّی کی پرورش کرتی ہیں بلکہ اپنے شوہر کے "شوق زادہ" کی بھی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہیں۔

اب وقت آگیا تھا کہ میں رختِ سفر باندھوں۔ میں نے اپنے سفری صندوق کے ایک ایک کونے کو ایک ایسے جذبے سے بھر لیا جسے اپنی اس یاترا کے یادگار کے طور پر عمر بھر عزیز رکھوں گا۔ یہاں آکر مجھے واقعی بڑی اپنائیت کا احساس ہوا۔ یہ وہ ملک ہے جہاں کے باشندے میری ہی زبان ـــــ اردو میں خریدتے، بیچتے، سوچتے، گاتے، ہنستے اور روتے ہیں۔ ہندوستان میں تو میرے بیشتر دور اور قاری مجھے ترجمہ کے ذریعہ سے جانتے ہیں، مگر یہاں کے لوگ مجھے میری طبع زاد تصانیف سے ہی جانتے ہیں۔ ان کا رابطہ مجھ سے براہ راست ہے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے اسٹیشن جا رہے تھے تو میری ایک طرف عتیق احمد اور دوسری طرف برکاتی بیٹھے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اسی دوران برکاتی نے میری جیب میں کوئی چیز رکھ دی۔ جب میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ لفافہ کھولا تو اس میں سے پانچ پاکستانی روپے برآمد ہوئے۔

"یہ کیوں؟"

"کہیں کام آئیں گے۔" انھوں نے دبے لہجے میں کہا "آپ گھر سے اتنی دور جا رہے ہیں، کہیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

جب پاکستانی ریل گاڑی 'تیز گام' اسٹیشن سے چلی اور رفتار پکڑنے لگی تو میری بیوی نے مجھ سے پوچھا "جب دو آزاد ملک ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے ہیں تو کیا یہ لازم نہیں کہ وہ آپس میں جنگ کرنے سے گریز کریں؟"

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ آزادی کے بعد ہمارے دونوں ملکوں نے اپنی اپنی آزادی کے آلات کا استعمال مسلسل تین بار جنگ کرنے کے لئے کیا ہے۔ لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم نے باہمی محبت کی ناکامیوں سے جھلا کر یہ جنگیں کی ہوں؟ کچھ بھی محبت میں جان لینے کا اقدام غیر فطری ہے۔

"بپتا کی رات" کے مصنف حسن منظر اپنی فیملی کے ساتھ ہم سے ملنے کے لئے حیدر آباد سندھ کے اسٹیشن پر ہمارا انتظار کر رہے تھے، حیدر آباد سندھ۔ کراچی سے دو تین گھنٹے پرے ہی واقع ہے۔ میرا دوست اور میں ابھی گلے گلے مل پاتے تھے کہ تیز گام نے روانگی کی سیٹی بجا دی اور میں منظر کا ہاتھ چھڑا کر واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔

(۲)

۲۲/اپریل ۱۹۸۲ء کی شام کو ہم اسلام آباد پہنچے۔ رشید امجد سے میں کئی بار مل چکا تھا ——— اس کی کہانیوں میں! اور مجھے یقین تھا کہ میں اسے پلیٹ فارم پر دیکھتے ہی پہچان لوں گا اور یہی ہوا بھی ——— ایک گول مٹول چہرے کے پہلو میں ایک دراز قامت نوجوان کو رکتی ہوئی گاڑی کی طرف نظریں دوڑاتے پا کر میں ایک دم سمجھ گیا کہ یہ رشید امجد اور احمد داؤد ہیں۔ ان کو بھی یہ پتہ لگاتے میں چنداں دقت نہ ہوئی کہ میں میں ہی ہوں۔ دونوں نئی پیڑھی کے بہت نمایاں افسانہ نگار ہیں اور میں سمجھتا ہوں انھیں مجھ سے اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا مجھے ان سے۔

راولپنڈی اور اسلام آباد ایسے ہی ہیں جیسے دہلی اور نئی دہلی۔ تاہم پنڈی اگرچہ بہت گنجان آباد ہے، پھر بھی وہاں اتنی بھیڑ نہیں جتنی دہلی میں ہے۔ اسلام آباد تو حال ہی میں پیدا ہوا ہے اور ابھی اس کے پھلنے پھولنے کے دن ہیں جبکہ نئی دہلی سالہا سال کی شہریت کا بوجھ اٹھا اٹھا کر کافی بوڑھا ہو چکا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جو بھیڑ بھاڑ ہندوستان کے دارالخلافہ میں نظر آتی ہے وہ مجھے کراچی میں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہندوستان کے شہروں میں بڑی بڑی صنعتوں کا جال پھیلتا جا رہا ہے جس کے نتیجے کے طور پر دیہات کے لوگ کثیر تعداد میں شہروں کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ بات پاکستان میں اس حد تک نہیں ہے۔ پاکستان کا انحصار خصوصاً زراعت، چھوٹے پیمانے کی صنعت اور خلیج کے ممالک میں مقیم پاکستانیوں کے پیسے پر ہے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ عام طور پر خوش حال ہیں۔ احمد داؤد نے کسی بحث کے دوران مجھ سے کہا "آپ ہمیں بڑی موٹی قیمتوں پر اپنا سارا مال بھیجتے رہیں، آپ بناتے رہیں اور ہم کھاتے رہیں، ٹھیک ہے نا! ؟" پھر وہ ایک دم فکرمندی سے پوچھنے لگا "لیکن اگر آپ اپنی ہر شے برآمد کر دیں گے تو آپ کے غریب عوام کیا کھائیں گے؟ ——— نہیں! ——— ذرا سا رک کر وہ پھر بولا" مجھے اہلِ دولت کی فکر چنداں نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ وہ روٹی کی بجائے اپنی دولت کھاتے رہتے ہیں، سوال آپ کے غریبوں کا ہے"

میرے نوجوان دوست کا طنز برمحل تھا۔ اپنے اپنے زرِ مبادلہ کی حالت بہتر بنانے کے لئے ہمارے ترقی پذیر ممالک میں اس قدر جوش و خروش ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ آکسیجن کو بھی اس ہوا سے علیحدہ کر دیں جس میں ان کے عوام سانس لیتے ہیں۔

پنڈی میں میں نے رشید امجد کے ہاں قیام کیا۔ اس نے بتایا کہ مغربی پنجاب میں رہائشی مکانات کا مسئلہ کبھی درپیش نہیں رہا کیونکہ سبھی ہندو اور سکھ اپنے مکانات پاکستانی شہریوں کے استعمال کے لئے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے وہاں سے چلے گئے تھے۔ رشید امجد جس مکان میں رہتا ہے وہ کسی زمانے میں ہندوؤں کا مندر تھا ——— میں اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا ——— جو کہ ایک وسیع ہال تھا جہاں کبھی متعدد بھگت کرشن کتھا سننے کے لئے جمع ہوتے ہوں گے ——— مجھے سانولے بھگوان کی وہ قربان گاہ دکھائی دی جسے دیکھ کر معاً مجھے خیال آیا کہ بے چارہ بھگوان اس فضا میں کس قدر تنہا ہے۔ میں نے وہاں مجتمع احباب کے سامنے اپنے تاثرات بیان کئے اور افسانے کی بُو محسوس کرتے ہوئے اس کے پیچھے نامعلوم کدھر نکل گیا ——— میں نے دیکھا کہ راولپنڈی کی سڑکیں اور گلیاں اب بالکل پاکستانی ہو چکی ہیں لیکن ابھی تک ان کے وہی پرانے نام ہیں۔ رشید امجد جس گلی میں رہتا ہے، وہ اب بھی نانک پورہ کہلاتی ہے۔ احمد داؤد کا مکان موہن پورہ میں ہے حالانکہ کنہیا اُسے چھوڑ کر کبھی کے جا چکے ہیں، وہاں سے آگے کا علاقہ پہلے کی ہی طرح گوال منڈی کے نام سے مشہور ہے ——— یہاں ہندوستان میں سڑکوں کے نام جو انگریزوں کے ناموں پر رکھے گئے تھے، بڑی تیزی سے بدل دیے گئے۔ ہمارے اس جوش و خروش کے پیچھے شاید حب الوطنی کا جذبہ اتنا کارفرما نہ تھا جتنی نفرت کے اظہار کی بے تابی یا پھر سیدھی ریاکاری۔ ہماری دیسی ناموں سے جانی جانے والی سڑکوں پر آج جو کالا دھندا ہوتا ہے اتنا انگریزوں کے راج میں بھی نہ ہوتا تھا۔ اصل میں معاصرانہ حقائق سے چشم پوشی کر لینے سے بات نہیں بنتی بلکہ ان کے باوصف زندگی کی بازآبادکاری کا اقدام کئے جانے سے برتر مستقبل کے مناظر آنکھوں میں آتے ہیں۔

جس دن میں راولپنڈی پہنچا، اسی دن شام کو محمد منشا یاد نے جو حکومتِ پاکستان کا ایک سینئر رابطہ افسر ہے، ہمیں کھانے پر مدعو کیا۔ میں اس کا افسانہ "پانی میں گھرا ہوا پانی" پڑھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔ اس دعوت سے اس کا یہ مقصد تھا کہ میری ملاقات 'شہرِ افسانہ' کے سبھی ادیبوں سے ہو جائے۔ ان سے ملتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ گویا میرے ہی دل و دماغ سے برآمد ہو کر میرے سامنے آ گئے ہیں ممتاز مفتی ستر پار کر چکے ہیں۔ اپنے کرداروں کے مانند بڑے تازہ دم، دلچسپ اور باتونی ہیں، زہرہ جمال اوروں کو کچھ اس طرح انہماک سے سنتی ہیں کہ خاموشی کے باوجود بڑی پُرگو معلوم ہونے لگتی ہیں۔ خوش رو اور خوش پوش منصور قیصر اپنی کہانیوں کے چھوٹے چھوٹے شریر جملوں کے مانند پھلجڑیاں چھوڑ رہے تھے۔ پروین عاطف اگرچہ بیمار تھیں لیکن پھر بھی آ گئیں۔ جب ان سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ پاکستان کب واپس آئیں تو وہ سمجھ گئیں کہ چونکہ وہ آئے دن باہر جاتی رہتی ہیں اس لئے دراصل یہ پوچھا جا رہا ہے کہ اب کب جا رہی ہیں۔ مفتی صاحب بھی ہاکی کی اس کھلاڑی سے بال چھیننے کے لئے آگے بڑھے اور 'فاؤل' کی دھمکی کے باوجود کھیلتے چلے گئے۔ تینوں نوجوان ادیب مرزا حامد بیگ، افتخار راہی، اور احمد داؤد فنی مسائل کا باب کھولے ہوتے تھے اور رخسانہ صولت شاید ان کی مدد کی خاطر ان سے اپنے سوال پوچھ رہی تھیں۔ فریدہ حافظ نے لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ 'مشرق' میں اپنی 'اسلام آباد کی ڈائری' کے لئے مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا اور میری بیوی سے گفتگو کر رہی تھیں۔ یاور اپنا کیمرہ لئے کوئی ایسا موزوں زاویہ تلاش کر رہا تھا جہاں سے ہم سب اس کی تصویر میں سمٹ آئیں اور رشید امجد دل ہی دل میں شاید بقیہ اوقات کے لئے میرا پروگرام ترتیب دینے میں مصروف تھا۔

حالانکہ میں اردو سے متعلق اردو ہی میں بحث کرنے کا عادی ہو گیا ہوں یا پھر انگریزی کا استعمال کرتا ہوں لیکن جیسا کہ سیالکوٹ میں کالج کے زمانے میں کیا کرتا تھا۔ اب میں بھی ان پرانے وقتوں کے مانند اسلام آباد کے ساتھی ادیبوں سے اردو کے بارے میں پنجابی میں گفتگو کرنے لگا اور ایسا کرنا مجھے اچھا لگا۔ پنجابی ادیب اپنی اردو تصانیف میں بھی مقامی الفاظ و محاوروں کا آزادانہ استعمال کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اردو میں پنجابی کے الفاظ قطعاً غیر موزوں نہیں لگتے بلکہ ان الفاظ کی بدولت معانی میں مقامی رنگ بھر آنے سے ان کی تصانیف بڑی فطری اور دل نشیں معلوم ہونے لگتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جب بعض لوگوں نے اس رجحان سے اردو کے معیار کے پست ہو جانے کی شکایت کی تھی تو 'نقوش' کے مدیر محمد طفیل نے برجستہ کہا تھا جس دلہن کو پنجاب اتنی محبت سے اپنے گھر لے آیا ہے، اسے اب اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ ہمارے مقامی محاوروں کو ہماری ہی طرح اپنا لے۔"

حلقۂ اربابِ ذوق پنڈی کی جانب سے جو ایک ادبی ادارہ ہے، مجھے ایک افسانہ پڑھنے اور بات چیت کے لئے ایک خصوصی جلسہ میں مدعو کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر جمیل ملک نے کی۔ مشہور اردو شاعر ناصر زیدی نے روزنامہ 'حریت' میں جو رپورٹ شائع کی اس کے مطابق جلسہ اس اعتبار سے بھرپور تھا کہ اس میں اسلام آباد اور پنڈی کے سبھی مکاتیبِ فکر کے قابلِ ذکر شاعر، ادیب اور دانش ور ایک طویل عرصہ کے بعد جمع ہو گئے تھے، جب میں جلسہ میں پہنچا تو پروفیسر نظیر صدیقی فوراً اٹھ کر آئے اور مجھے گلے لگا لیا، سالِ گزشتہ جب وہ دہلی آتے ہوئے تھے تو ہم نے اکٹھے ہی قمر رئیس کے یہاں سالِ نو کا استقبال کیا تھا اور وہ ساری رات بڑی جوش آفریں رہی تھی۔

جلسہ میں مجھ سے جو سوالات کئے گئے، ان کا جواب دینے کے لئے میں نے اردو افسانہ کے ارتقاء کی روداد بیان کی نئی زندگی کی مانند اس کی کہانیاں بھی اسی صورت تازہ دم رہیں گی جب ان کے کردار اور بشرے اور حرکات و سکنات سے بھی عصرِ نو کی آہٹوں کا احساس ہوتا رہے گا، اردو کہانی نے روز افزوں زندگی کی بھرپور عکاسی کے لئے کبھی تبدیلیوں سے گریز نہیں کیا ——— اسلوب کے تعلق سے یہ بات ابھر کر آئی کہ کہانی لکھنے کے اتنے ہی طریقے ہیں جتنے سبھی لوگ، کوئی جیسے بھی اپنی کہانی سنا لے، مگر یہ ضرور ہے کہ اسے سن کر یہ لگے، یہ کہانی گویا صرف اسی طرح ہی کہی جا سکتی تھی۔ اور اس کا یہی انداز اس کا اصل انداز ہے اور زندگی کے کسی اصل واقعہ کے مانند یہ پہلی اور آخری بار ہو گئی ہے ——— ایک اور سوال کے جواب میں مجھے چیخوف کے افسانہ 'بورنگ اسٹوری' کے بوڑھے پروفیسر کا سہارا لینا پڑا، "کسی واقعہ کو اگر آرٹ کی سطح پر بیان کرنا مقصود ہو تو اسے پڑھتے ہوئے قاری کو قطعاً یہ شک نہیں گزرنا چاہئے کہ لکھنے والا اسے دانستہ کسی مخصوص نتیجے کی طرف لانا چاہ رہا ہے، افسانے میں بھی زندگی کی طرح یہ بھرم ہر صورت بنا رہنا چاہئے کہ اسے 'کیا' نہیں جا رہا ہے،

بلکہ وہ ہو رہا ہے ـــــــ اور جو ہو رہا ہے اسے کرداروں نے آپ ہی کیا ہے اور اس طرح وہ اپنے ہی کئے کو بھگت رہے ہیں۔ حسن عباس رضا نے جو "خیابان" کے ایڈیٹر ہیں، مجھ سے معلوم کرنا چاہا کہ بنگالی ادب میں احتجاج کی صدا اتنی نمایاں کیوں ہے؟ میں نے جواب دیا "شاید اس لئے کہ وہاں کے لوگ صدائے احتجاج کے سہارے جی رہے ہیں۔" جب احتجاج سے متعلق مزید وضاحت کے ساتھ گفتگو شروع ہوئی تو میں نے کہا، اگر کوئی ادیب یہ ظاہر کرنے کی غرض سے تمام دنیا سے ناراض رہتا ہے کہ اسے اپنی ذات سے محبت ہے تو اس کا رویہ دراصل احتجاج کے بجائے خود اطمینانی سے عبارت ہے۔ ایک اور سوال میں یہ پوچھا گیا کہ کیا افسانہ کے روایتی تصور کا تتبع کرنا بے معنی نہیں؟ میں نے سوال کرنے والے کی رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ اگر روایت کے غیر ضروری عناصر حذف کر دیتے جائیں تو اس سے افسانہ کے فن میں یقیناً نکھار آئے گا، تاہم محض کسی فینسی آئیڈیا سے متاثر ہو کر کسی پھلتے پھولتے درخت کو کاٹ پھینکنا کسی بھی لحاظ سے عقل مندی تصور نہیں کی جائے گی۔ میری تجویز یہ تھی کہ اگر کسی بات کی ایمان داری کے ساتھ نفی کی جائے تو نفی کرنے والے کو کم سے کم اتنا تو علم ہونا چاہئے کہ وہ کس شئے کی نفی کر رہا ہے۔

ہمارے یہاں احتجاج کی بیشتر صورتیں بے ذہن ہونے کے باعث کھوکھلی لگتی ہیں، حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ نوعمر لوگ انسان کی طویل تر عمر اور اس لحاظ سے اس کے برتر شعور و ادراک کی نمائندگی کر پائیں۔ پیش روؤں کو جذب کرنے کے عمل میں کسی نئے دور کے سیاق و سباق میں بعض امور کی نفی ناگزیر ہوتی ہے۔

ہندوستان ہی کی طرح پاکستان میں بھی پیشہ ور نقاد کسی بھی تخلیقی فن کار کو جمانا یا اکھاڑ پھینکنا اپنا خصوصی حق سمجھتے ہیں۔ وہ کسی بھی ادبی تصنیف کو ہمدردانہ نظر سے دیکھنے کی بجائے خارجی وجوہات، نجی تعصبات یا چند بندھے ٹکے عام اصولوں کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ اس قسم کے نقاد سبھی جگہ ـــــ کہیں چوری چھپے اور کہیں کھلم کھلا ـــــ ایسے ہنگامی حالات پیدا کر دیتے ہیں جو تخلیقی ادب کے فن کاروں کو یہ اعلان کرنے پر مجبور کریں کہ ہم آپ کی ادبی سلطنت کے وفادار شہری ہیں۔ پاکستان میں اردو کے قاریوں میں جو کراچی سے کوئٹہ اور پشاور تک پھیلے ہوئے ہیں، ایسے سچے اور مخلص ادیبوں کی کمی نہیں جو اس قسم کی ادبی ریشہ دوانیوں کی مخالفت نہ کرتے ہوں، لیکن یہاں ہندوستان میں صاحبِ اقتدار لوگوں کی ادبی سازشیں جو تباہی بپا کرتی ہیں اس کا سدِّ باب کرنے والا کوئی نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں اردو الگ الگ پاکٹوں تک محدود ہے جس سے سازشوں کا راز افشا نہیں ہو پاتا اور یوں مشکوک لوگوں کی ساکھ جُوں کی توں بنی رہتی ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ ان پاکٹوں میں بھی اردو داں طبقہ بہت چھوٹا ہے، بلکہ چھوٹا ہو نے کے علاوہ اتنا مایوس، بے بس اور دل برداشتہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اس کی مخالفت پہ کمربستہ نہیں ہوتا۔ کئی غیر رسمی جلسوں میں مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ پاکستان کے نوعمر ادیب ادب کے میدان میں وابستہ مفاد اور ریشہ دوانیوں کی ڈٹ کر مخالفت کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔

کیا ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پاکستانی ادیبوں کو اپنے اظہارِ خیال کی مکمل آزادی ہے؟

یہاں اگر میں ان بنیادی امور کا تذکرہ نہ کروں جو ایک سچے فن کار کے اظہارِ خیال کی آزادی میں مضمر ہیں تو شاید آپ کو یہ احساس ہو گا کہ میں اصل مسئلہ سے چشم پوشی کر رہا ہوں۔ اولاً ادیب کو آزادی نہیں بلکہ آزادی کی صعوبت عزیز ہوتی ہے۔ تخلیق کار کو کسی خاص واقعہ کو خارجی اعتبار سے دیکھ کر اس پر اپنا فیصلہ صادر کرنا نہیں ہوتا، وہ تو اپنے ہی اندر میں ایک ایسی دنیا کی تخلیق نو کرتا ہے، جس میں جو کچھ بھی رونما ہوتا ہے وہ دراصل اس کے ساتھ پیش آ رہا ہوتا ہے، وہی ظالم بھی ہوتا ہے اور وہی مظلوم بھی۔ اس معیار کے مطابق وہ اپنی تخلیق کے ذریعے محض اظہار پر ہی قانع نہیں ہو جاتا بلکہ لکھ کر اپنی دانست میں اپنے اطراف کی دنیا میں ترمیم کی سعی بھی کر رہا ہوتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اگر ایک طرف اسے آزادیٔ اظہار کے بغیر چارہ نہیں تو اس سے بھی زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ سدا سبھی کے دُکھ درد میں شریک ہونے پر آمادہ رہے اور دوں کے آلام میں اس غیر ارادی شرکت کے چاہ کے بغیر اسے ارادی طور پر اپنی آزادی کی وسعتوں کو محدود کر دینے کی ترغیب رہے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تخلیقی فن کار اپنے معاشرے کا ہی ایک جزء ہے اور اپنے آپ کو معاشرتی قوانین کا پابند گردانتا ہے تو بعض حالات میں نوبت یہاں تک پہنچ سکتی ہے کہ وہ ایک شخص کی اقلیت کی حیثیت سے یعنی تنِ تنہا بھی رہنے پر مجبور ہو، اس تناظر میں مطلق العنانیت ہو یا جمہوریت، سفاک اکثریت کے نمائندے اس پر کسی بھی وقت پابندیاں عائد کر سکتے ہیں پس جس آزادی کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ کسی جامد عقیدہ

سے عبارت نہیں بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے آزادی ایک لچک دار تصور ہے جس کے بغیر آدم کے روئیے آدمیت سے عاری ہونے لگتے ہیں۔

جن لوگوں کو اپنے آپ کو محض قلمی طور پر ادیب منوانا ہوتا ہے، وہ اکثر مراعات، اقتدار اور شہرت کے موقعوں کی تاک میں لگے رہتے ہیں، لیکن انسانی ابدیت کے خواب دیکھنے والے ادبا جانتے ہیں کہ خون میں لت پت ہوئے بغیر نئی زندگی کو جنم نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے سچے ادیب ہر ایک ملک میں معدودے چند ہوتے ہیں۔ پاکستان کے سچے تخلیق کار بھی ہر نوع کے تعصبات سے آزادی کی جدوجہد میں جٹے ہوتے ہیں، وہ نجی تعصبات، جن کی محبوبیت سے ان کے باطن کی پسپائی کا احتمال ہو اور وہ بھی، جو انھیں خارجی طور پر ہانک لے جانے میں لگے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا ایک ادھیڑ عمر کے معالج اور بائیں بازو کے نظریہ کے شاعر ہیں اور جمیل آذر کو ہر بات ایک پورا انشائیہ بن کر سوجھتی ہے۔ ان دونوں کے یہاں ڈنر پر مجھے جمیل ملک، احمد ظفر، شفیع آہوجا، اعجاز راہی، مرزا حامد بیگ اور سجاد شیخ سے پھر سے ملنے کا موقع ملا، یہ سبھی نام اردو ادب کے معروف ناموں میں ہیں، یہ ممکن ہے کہ ان کے درمیان مختلف موضوعات پر ایک دوسرے سے سخت اختلافات ہوں لیکن ان میں ادب کے لئے یکساں محبت ہے جو انھیں ایک دوسرے سے جوڑے ہوتے ہے۔ بے شک ادیبوں کے ادبی محاسن کا سب سے اچھا تعین ان کی تصانیف ہی سے کیا جاتا ہے لیکن انھیں ان کے شخصی رویوں سے پرکھنا بعض اوقات بہت بھلا لگتا ہے۔ اگر ہمیں کسی ادیب کو ایک فرد کی حیثیت سے بھی جاننے کا موقع ملتا رہے تو ہمیں اس کی ان تحریروں کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے جو ابھی غیر نوشتہ ہیں اور اسے اپنے گھیرے میں لئے ہوتے ہیں۔

سجاد شیخ بے پناہ انسان دوستی کے حوالے کا ایک نام ہے، میں نے دیکھا کہ وہ ہمہ وقت اردو اور پنجابی اشعار کی خوش نویسی میں مشغول رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے بہ کمال محبت ایک فائل بھی پیش کیا جس میں ان کی خوش نویسی کے نمونے مجتمع ہیں۔ جمیل آذر کے ہاں رات کے کھانے کے بعد اعجاز راہی بڑی اپنائیت سے مجھے اپنے گھر لے گیا کہ میں اس کے بیوی بچوں سے مل سکوں، کسی غیر کے من میں یہ بات کیوں کر آ سکتی ہے؟ افسانہ نگار جمیل زبیری کا حال ہی میں کراچی سے اسلام آباد تبادلہ ہوا تھا، وہ زندگی کے معمولی واقعات کی عکاسی کر کے ان کا غیر معمولی تاثر نمایاں کرتے ہیں۔ میری ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ حسن عباس رضا کے یہاں مجھے احمد فراز سے دوسری مرتبہ ملنے کا موقع ملا۔ وہیں فیضی سے بھی ملاقات ہوئی جن سے ملنے کے لئے صہبا لکھنوی نے مجھے خاص طور سے کہا تھا۔

رشید امجد اور ان کی بیگم ہمیں فاروق علی کے ہاں لے گئے جو 'پاکستانی ادب' کے چار جلدوں پر مشتمل انتخاب کی تالیف میں امجد کے معاون ہیں۔ علی اور ان کی اہلیہ ہیں تو یو پی کی، لیکن اب دونوں مکمل طور پر پنجابی لگتے ہیں، پنجابی محاورہ کے استعمال میں وہ مجھے ہم دونوں سے بہتر لگے۔ حالانکہ ہم سرزمینِ پنجاب میں ہی پیدا ہوتے تھے لیکن ہماری بیشتر زندگی صوبۂ پنج دریا سے دور بیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ بیرونی ممالک میں جا کر بس جاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ اسی سرزمین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ لہٰذا انھیں اس دھرتی کے باسیوں سے مختلف تصور کرنا غیر انسانی فعل ہے۔ اگر ان لوگوں کو کبھی کبھار اس مقام کی یاد آئے جہاں وہ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے، تو یہ امر غیر فطری نہیں، غیر فطری تو یہ ہوگا کہ وہ یکسر بے ماضی معلوم ہوں۔

پنڈی میں ہمارے قیام کے آخری دن شام کو ہم رشید امجد اور رخسانہ کے ساتھ دامنِ کوہ گئے جو وہاں کا ایک پہاڑی مقام ہے، میں ہلکے کپڑے پہنے ہوتے تھا اس لئے مجھے یکایک کپکپی چھوٹ گئی اور میں نے کہا کہ یہاں تو بڑی سردی ہے۔ رشید امجد نے فوراً جواب دیا: "ہے نا؟" اس کے لہجے میں کشمیری کانگڑی کی سی گرمی تھی۔ امجد دراز قد نوجوان ہے جیسے یوکلپٹس کا درخت کشمیر کے پہاڑوں سے اکھاڑ کر کسی میدانی علاقہ میں نصب کر دیا گیا ہو، اس کی باتوں میں جو طفلی تمنا تھی اسے میں نے اسی دم محسوس کر لیا۔ وہ کہہ رہا تھا ـــــ ہمارے نباتات داں یہاں ایک ایسی فضا تیار کرنے کے لئے کوشاں ہیں جس سے یہاں بھی ویسی ہی برف باری ہونے لگے گی جیسی" ـــــ اس کا گلا رندھ گیا۔

"جیسی کشمیر میں" میں نے اس کی مدد کے لئے فقرہ پورا کیا۔

رشید امجد کے یہاں پہنچ کر میں ایک ایسے موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے مسافر اپنے گھر کی جانب مڑ جاتا ہے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ

...بیٹی سعدیہ بڑی معصومیت سے میری بیوی کے ساتھ کھیل رہی ہے اور اپنے متعلق اسے سب کچھ بتا رہی ہے۔ مجھے یہی لگا جیسے میری بیوی
...وں میں بیٹھی اپنی نواسی سے ہم کلام ہے۔ اس قسم کی ایک اور واردات داؤد سے وابستہ ہے جو بظاہر بڑا ضدی ہے۔ میری بیوی سے باتیں
...نے ہوتے اس کی آواز اتنی فراواں ہونے لگی گویا اپنی ماں سے باتیں کرتے ہوئے اس کا ذہن کھلتا جا رہا ہو، وہ اسے نامعلوم کہاں کہاں
...لیتے پھرا۔ محمد منشا یاد نے ان دنوں محض اس وجہ سے اپنے کئی پروگرام ملتوی کر دیئے کہ مجھے اپنے قیام سے متعلق سرکاری کارروائی میں کوئی
...انی نہ ہو۔ اپنے دوستوں کے ساتھ ان کے گھروں میں رہنا، گلیوں میں گھومنا، کسی سڑک کے کنارے پان کھانے کے لئے رک جانا، کسی پڑی
...نورانی میں بات چیت کے لئے بیٹھ جانا اور اس طرح بغیر کسی جھجک یا رکاوٹ کے ان سب سے ملاقات کرنا ـــــ یہ سب باتیں ایسی ہیں جنھوں نے
...حسوس ہی نہ ہونے دیا کہ میں اپنے گھر سے باہر آیا ہوا ہوں۔

(۳)

لاہور کی دل فریبی سے متاثر ہوئے بغیر رہنا ناممکن ہے۔ ان دنوں جب میں سیالکوٹ میں رہتا تھا تو ہم سبھی دوست کہا کرتے تھے کہ جس نے لاہور نہیں
...وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہم میں سے کوئی بھی لاہور جانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ پانچویں دہے کے اوائل کے وہ شب و روز
...یاد آ رہے ہیں جب میں میرے کالج سیالکوٹ میں پڑھتا تھا۔ لاہور کی جن یادگاروں سے مجھے دل چسپی تھی، ان میں چند ہیومن مانومینٹ بھی تھے
...لکوٹ کے جابر علی شاہ نے جو آج کل اتنا جید عالم ہو گیا ہے کہ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے، مجھے 'ادبی دنیا' لاہور کے
...مولانا صلاح الدین کے پاس لے چلنے کی پیش کش کی۔ مولانا وہ افق تھے جہاں سے متعدد ادبی ستارے طلوع ہوتے تھے۔ جابر اورینٹل کالج،
...اپنے داخلہ کے سلسلہ میں ان سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ لاہور کے اس عظیم فرزند سے ملاقات کرنے اور انھیں اپنا کوئی افسانہ دکھانے کے
...سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ چنانچہ ہم دونوں مولانا کے یہاں گئے مگر ان کے دفتر میں داخل ہوتے ہوتے فرطِ تعظیم سے مجھ پر کچھ اس طرح
...اہٹ کا دورہ پڑا کہ انھیں سلام کیے بغیر ہی ایک کونے میں جا بیٹھا۔ مولانا اور جابر محوِ گفتگو رہے، اور میں چپ چاپ اپنے افسانہ کے صفحات کو جیب
...روڑتا رہا۔ ان کی گفتگو ختم ہونے پر میں جابر کے ساتھ دفتر سے باہر نکل آیا اور نکلتے ہوئے پھر مولانا کو سلام کرنا بھول گیا۔ ہم اپنی دل پسند
...شخصیتوں کے لئے جو ادب و احترام رکھتے ہیں کیا اس کا یہ اثر بھی ہوتا ہے کہ ان کی موجودگی میں ہم اپنی سدھ بدھ ہی کھو دیں؟ برسوں بعد میں نے جب
...یہ مولانا کو سنایا تو وہ آبدیدہ سے ہو گئے اور مجھے گلے لگانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر اس مرتبہ میری بدقسمتی یہ تھی کہ اپنے پورے ذہنی
...ن کے باعث بوکھلانے کی ہزار خواہش کے باوجود ذرا بھی بوکھلا نہ پا رہا تھا۔ لاہور سے میرا جو تعلقِ خاطر تھا یہ محض اس کا ایک سرا ہے۔

اپنی شناخت کے لئے 'اوراق' کا تازہ شمارہ بہت ہی نمایاں انداز میں ہاتھ میں لئے ہوئے حیدر قریشی لاہور ریلوے اسٹیشن پر میرا
...ار کر رہے تھے، مجھے انھیں پہچاننے میں کچھ دقت لگی کیوں کہ میرے ذہن میں ان کی ایک الگ تصویر بنی ہوئی تھی، کوئی بڑا پکا اور سنجیدہ شخص
کے بال حصولِ علم میں سفید پڑ چکے تھے۔ لیکن وہ تو کوئی اور ہی نکلے۔ ایک ہنس مکھ نوجوان، جو علم کو اس طرح اٹھائے ہوئے تھا جیسے کوئی اپنے
...یر بچے کو۔ حیدر قریشی خان پور سے مجھ سے ملنے آئے تھے جو لاہور سے خاصی دوری پر واقع ہے۔

جب ہماری ٹیکسی وزیر آغا کے مکان میں داخل ہوئی تو ہم نے ایک اور گاڑی کی آواز سنی جو ہمارے پیچھے پیچھے پہنچی تھی، یہ وزیر آغا تھے جو
...دھے اپنے گاؤں سے آ رہے تھے۔

وزیر آغا سہ ماہی 'اوراق' کے ایڈیٹر ہیں جو ادیبوں کی کئی نسلوں کو انسپائر کرتا آیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک نہایت اہم تخلیقی
...کار اور نقاد بھی ہیں مسلسل کئی روز ان کی صحبت میں رہ کر ـــــ میرا خیال ہے کہ ـــــ مجھے ان کی معمول کی زندگی اور روزمرہ میں ان کے
...ری ردِ عمل کا تجزبی جائزہ ہونے لگا۔ اس قسم کی معلومات مخصوص تخلیقی عوامل میں کسی بھی ادیب کے غیر معمولی ردِ عمل کی اساس کو پرکھنے میں اکثر
...معاون ثابت ہوتی ہیں مگر ان کا یہ نظریہ کلیہ کی حیثیت نہیں رکھتا، اگر یہ صحیح ہوتا تو انگریزی شاعری میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور اردو میں ـــــ مجھے
لکھنے میں کوئی تامل نہیں ـــــ وزیر آغا جیسے نادر مظاہر سے ہم کیوں کر روشناس ہوتے؟ دونوں اپنے تخلیقی کارناموں کے باوصف اپنے اپنے
...کو اپنی کھال کے مانند بڑے فطری انداز میں پہنے ہوتے ہیں۔ ذوقِ شعری کے لئے شاعر میں جنون کی کیفیت کو لازم قرار دینے کے قدیم تصور

کا اطلاق کسی جگر مراد آبادی پر تو ہوسکتا ہے لیکن آج کسی مثالی شاعر کی یہ واردات بعید از قیاس نہیں کہ عرفان کی زیریں لہروں تک اس کی رسائی — اپنی شعوری سطح سے بخوبی ہوتی رہے، بلکہ یہ گمان غالب ہے کہ اس واردات کے بغیر نئے تناظر میں اس کا شعری تجربہ ادھورا رہ جائے۔ میرے خیال میں وزیر آغا کی تخلیقی برتری کے عوامل بھی ان کے شعری شعور کی بدولت ہی اپنی تکمیل کرتے ہیں۔

اسی دن شام کو وزیر آغا مجھے ذوالفقار احمد تابش کے مکان پر لے گئے جو ادیبوں کا اڈا ہے۔ تابش بہت محبت سے پیش آئے، تارڑ، یوسف، کامران اور سلمان بٹ سے تو ملاقات ہوئی ہی، جو اپنی سیر و سیاحت اور اس سے جنے افسانوں کے لئے مشہور ہیں، میری ملاقات "اداس نسلیں" کے خالق عبداللہ حسین سے بھی ہوئی جو اپنی دختر کی شادی کے سلسلہ میں لندن سے فیصل آباد آئے ہوئے تھے۔ پچھلی بار جب میری ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی تو وہ مجھے ایسے اور بجنل فن کار لگے تھے جو نئے افکار کے اَیڈونچر میں مسلسل سرگرداں رہتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ وہ مجھے بہت سمجھدار اور سنبھلے ہوئے شخص لگے۔ اتنے سنبھلے ہوئے، کہ کھل ہی نہ پائے۔ میرا خیال ہے ہم ایک دوسرے سے مل نہ پائے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ میں ہی خود سے نہ مل سکا۔ اگر ہم کسی سے اسی روپ میں ملنا چاہتے ہیں جس روپ میں ہم نے اس کا تصور کر رکھا ہو تو اصل میں ہم اپنے آپ سے ہی ملنے کے متمنی ہوتے ہیں۔

وحید قریشی میرے بہت پرانے دوست ہیں، کالج میں مجھ سے دو سال آگے تھے اور علم کے لحاظ سے کئی سال آگے۔ اس وقت وہ لاہور میں اورینٹل کالج میں پرنسپل ہیں۔ انھوں نے میرے وہاں پہنچنے کے دوسرے دن ہمیں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ میرا ارادہ وہ سارا دن سیالکوٹ میں گزارنے کا تھا، میرے نیروبی کے دو پرانے شاگردوں، نثار اور ادریس نے پیش کش کی کہ وہ ہم دونوں کو اور ہمارے ساتھ روشن جاوید کو اپنی گاڑی میں سیالکوٹ لے جائیں گے۔ یہ دونوں اب پاکستان میں آ بسے ہیں۔ روشن جاوید میرے کالج، سیالکوٹ میں میرا پرانا ہم جماعت اور نہایت عزیز دوست ہے۔ کار میں بیٹھے ہوئے ادریس اور نثار کی میری طرف پشت تھی، وہ دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں ان دونوں کے اس زمانے کے چہرے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس صدی کے چھٹے دہے کے اوائل میں وہ نیروبی میں میرے طالب علم تھے۔ چند نکمے اور شریر طلبا کے چہرے میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے ابھر آئے، لیکن محنتی اور خاموش لڑکوں میں سے کسی ایک کی بھی شکل نہیں ابھری۔ جب میں نے نثار اور ادریس کو بڑے اعتماد سے بتایا کہ مجھے یاد ہے تم بڑے محنتی تھے اور پڑھائی میں بڑی خاموشی اور بھرپور دلچسپی لیتے تھے تو وہ دونوں ہنس دئے۔ مجھے لگا کہ وہ شاید مجرمانہ احساس سے ہنس رہے ہیں یا شاید اپنے پرانے استاد کی معصومیت اور ضعیف الاعتقادی پر۔ میں مسٹر چپس (Mr. Chips) نہیں ہوں لیکن پھر بھی میرے دل میں ان کے لئے بے پناہ محبت پیدا ہوتی۔ وہ آج کتنے بڑے، کتنے سمجھدار نکل آئے ہیں کتنا اچھا ہوا کہ وہ مجھ سے کہیں بہتر استاد — زندگی — کی پناہ میں چلے گئے۔

سیالکوٹ کو جانے والی سڑک بڑی ناہموار تھی، اس پر متعدد موڑ تھے اور قدم قدم پر بھاری بھیڑ، لیکن نثار نے بڑی مہارت سے گاڑی چلائی اور ہمیں اس شہر میں پہنچا دیا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ جب ہماری کار گندم منڈی سے گزر رہی تھی جہاں میرے والد دن بھر اپنی چھوٹی سی دکان پر بیٹھے ہوئے کھیوڑا کے نمک کے ڈھیر توڑتے رہتے تھے تو میں اس دکان کو پہچاننے کے لئے ایسا بے تاب ہوا تھا کہ میری آنکھیں میرے آگے آگے دوڑنے لگیں — یہ! ..... نہیں، شاید وہ ..... نہیں، وہ بھی نہیں۔ اگرچہ دیکھنے میں ان دکانوں کی پوری قطار اسی مانوس اور محبوب بھدے پن سے کھڑی تھی، مگر مجھے اپنی دکان نہیں مل رہی تھی، پھر اچانک وہ مل گئی۔ ایک صاحب اب بھی یہاں نمک ہی بیچتے ہیں، لیکن ان میں اور میرے سورگ باشی بھائیا جی میں بڑا فرق ہے۔ یہ صاحب کہیں زیادہ خوش حال ہیں، ان کی دکان میں کچھ نوکر چاکر بھی ہیں۔ نہیں، یہ میرے بھائیا جی سے ناواقف ہیں۔ ارد گرد کا تمام ماحول آشنا ہونے کے باوجود مجھے اجنبی سا لگا، وہی سڑک جو اس زمانے میں خاصی کشادہ لگتی تھی، اب بہت تنگ معلوم ہوئی۔ میں اسی سڑک پر چل کر بھائیا جی کے لئے ہر روز کھانے کا ڈبہ لایا کرتا تھا۔

جب ہم اس چھوٹی سی گلی میں داخل ہوتے جہاں ہم رہا کرتے تھے تو مجھے معاً یاد آیا کہ اس گلی کے نکڑ ہی سے مجھے اپنے مکان کی حد نظر آ جاتی تھی۔ جب بھی میں اپنے مکان پر تالا پڑا دیکھتا، پڑوس میں کسی بھی چاچی کے گھر آزادانہ چلا جاتا اور اپنے ہی گھر کے مانند وہیں کھانا کھا لیتا، کھیلتا، سو جاتا، جو جی چاہتا کرتا۔ ہمارے مکان ایک دوسرے سے ایسے سٹے ہوئے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے یہاں چھتوں چھتوں پہنچ جایا کرتے تھے،

کوئی ہمہ وقت اپنے گھر کے اندر ہی ہو تو اندر جانے کے لئے بیرونی دروازے پر دستک کیوں دے ؟ ہم یہاں دو مکانوں میں رہے —— ایک وہ، جسے ہم نے اس وقت بیچ دیا تھا جب میں بارہ سال کا تھا اور دوسرا پہلے کے ٹھیک سامنے تھا جہاں ہم تبھی سے پانچ روپے ماہانہ کرایہ پر رہا کرتے تھے۔

نامعلوم گلی اتنی سنسان کیوں تھی۔ میں اپنے پرانے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ مکان کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ اچانک مجھے اپنے یکسر بچھڑ جانے کا احساس ہوا، اس ماحول میں اپنا آپ اجنبی معلوم ہونے لگا۔ دروازے پر دستک دیتے ہوئے میں نے اپنے لڑکپن کا تصور کیا اور مجھے لگا کہ اندر سے وہی لڑکا —— وہی پرانا میں دروازہ کھول رہا ہوں۔

'جی' ؟ اس لڑکے نے اس طرح پوچھا، گویا مجھ سے قطعاً ناواقف ہو۔

میں دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا، پتہ نہیں میں اس قدر گھبرا کیوں گیا تھا —— چلو —— میں نے اپنی بیوی سے کہا —— آؤ اب واپس چلیں۔

لاہور واپس آتے ہوئے مجھے لگا میرے پرانے ہم جماعت اصغر سودائی کا چہرہ گیند کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ٹپّے کھا رہا ہے۔ میں ان کے، اعجاز بٹ اور ملک کے ساتھ زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکا کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ ہمیں لاہور میں وحید قریشی کے ہاں ڈنر پر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ لاہور جانے والی سڑک تک آنے سے پہلے شہر کے تنگ راستوں میں بیسیوں موڑ پڑے جن سے گزر کر میں گویا اس خواب ناک فضا سے باہر آگیا۔

کھلے راستہ پر پہنچ کر نثار نے چین کی سانس لی اور اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے کہا ' بڑا ہی گندا شہر ہے '؛

"لیکن ایک زمانے میں یہ بہت صاف ستھرا تھا"، رؤف جاوید نے میری طرف سے دفاع کیا؛ "آج کل میونسپلٹی کو جاروب کش نہیں مل پاتے کیوں کہ پہلے کی تنخواہوں پر وہ آنے کو تیار نہیں۔"

ہم ٹھیک وقت پر وحید قریشی کے یہاں پہنچ گئے جہاں مجھے ایک جانی پہچانی شکل نظر آئی جس پر اب عمر کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے —— محمد خان ! —— میں نے آگے بڑھ کر اپنے یار کو گلے لگا لیا۔ خان کے بڑے بھائی طفیل ہوشیار پوری بھی وہاں موجود تھے اور 'نقوش' کے محمد طفیل بھی، جنھیں ان کی صحافتی اہمیت کے اعتراف میں ان کے مدّاح 'محمد نقوش' بھی کہتے ہیں۔ خاکہ نویسی میں وہ کسی بھی شخص کی لفظی تصویر چند ہی الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ الفاظ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں کھلواڑ کرتے ہوئے چلے آتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پڑھنے والے کے ذہن میں بھرپور تصویریں ابھرنے لگتی ہیں۔ انھوں نے مجھے یاد دلایا کہ ہم پہلی بار دہلی میں کرشن چندر کے یہاں ملے تھے۔ عطاء الحق قاسمی بھی وہاں موجود تھے جو بعد کی پیڑھی کے بہت اچھے طنز نگار ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے اُن لوگوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا جو بلند آہنگ حاضر جوابی کو ہی طنز کا درجہ دے دیتے ہیں، طنز کی باریکیوں کے تعلق سے اگرچہ اُن کی شکایت اپنی جگہ بے جا نہ تھی، پھر بھی طنز خود مردانہ صفت ہے اور اس اعتبار سے اس کا بلند آہنگ جو کارگر ساتھ عین مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لاہور میں جن دیگر ادیبوں سے میری ملاقات ہوئی، ان میں اشفاق احمد بھی تھے جو اردو کے مشہور افسانہ "گڈریا" کے خالق ہیں، جس کشتی کو کبھی وہ تن تنہا کسی جان لیوا بھنور میں بے دھڑک اتار لے جاتے تھے، آج اسے مزے مزے سے یاروں کی رفاقت میں دھیمے پانیوں میں بہاؤ کی سمت کھیتے ہیں اور اس طرح ان کا ہنسنا کھیلنا اچھا لگتا ہے۔ کشور ناہید کے کلام کو سمجھنے سمجھانے کے لئے ایک محفل منعقد ہوئی جس میں ہم نے یکے بعد دیگرے کوئی درجن بھر مضامین سنے۔ ایسی صورتِ حال میں جبکہ دو ہی گھنٹے میں دس بارہ مضامین کی پیش کشی کا پروگرام ہو، ان مضامین پر ہمدردانہ اور سنجیدہ بحث کا ماحول نہیں بن پاتا اور نہ ہی سامعین اس کو کھلے کھلے سن کر جذب کر پاتے ہیں۔ کشور بے شک ایک اچھی شاعرہ ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی محفلوں کا ماحصل شاعری کو تہوار کی طرح منانا نہیں بلکہ اسے کھو جنا ہوتا ہے۔ کسی تخلیق کار کی ناکامیوں کی نشاندہی بھی ہمارا دھیان اس کے ہمہ گیر وِیژن کی طرف لے جاتی ہے جس کے باعث وہ شاید آئندہ

دقتوں میں بے محل ہونے سے بچا رہے۔ انسانی فکر کے ارتقا میں بڑھاپے کی ناکامیوں کے احساس سے بھی آنے والے لوگوں کی شرکتوں کا باب نہیں ٹوٹتا۔

جمیلہ ہاشمی مجھے کچھ پریشان و تنہائی کی شکار سی لگیں حالانکہ عبدالعزیز خالد بھی تنہا تھے لیکن وہ اپنے آپ کو ایک جلوس کے مانند اٹھائے ہوئے سے لگتے تھے۔ میں ابھی احمد ندیم قاسمی سے ملنے جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ مجھے شیزان ہوٹل میں منعقد ایک استقبالیہ میں مل گئے۔ ایک عرصہ سے بیمار رہنے کے سبب وہ بہت کمزور نظر آ رہے تھے۔ ان سے متعلق میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ نقادوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کے افسانوں میں واقعات پودوں کی طرح غیر محسوس طور پر نشوونما پاتے ہیں۔ پیرزادہ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے فن میں عجیب و غریب اور کراماتی انداز سے عدم موجود ہیں اور ان کا یہی کمال انھیں اپنے معاصرین سے ممیز کرتا ہے۔ منٹو کی خودنمائی تھی کہ اس نے یہ کہہ کر قاسمی کو ہدفِ تمسخر بنایا کہ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے بس یہی ایک بات سوجھتی ہے، بڑا شریف آدمی ہے ——— عیاری اور خودپسندی سے کسی صحافی کو تو کوئی ہنگامی فائدہ پہنچ سکتا ہے، لیکن ایک تخلیقی فنکار کے لئے اس کی سادگی اور خودسپردگی ہی وہ اوصاف ہیں جن کی مدد سے وہ ان گہرائیوں تک اتر سکتا ہے جن میں پودوں کی بھرپور نمو ممکن ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بحیثیت افسانہ نگار منٹو کی اپنی خصوصیات ہیں، تاہم 'گنڈاسا' لکھنے کے لئے قاسمی کو اپنی ہی مخصوص سادگی درکار تھی۔ قاسمی کے کردار دھرتی کے سچے لعل ہیں اور اپنی کہانیوں کے سارے اسباب آپ ہی پیدا کر کے اپنی طرف بے اختیار متوجہ کرتے ہیں۔

انور سدید نقاد بھی ہیں اور تخلیقی انشائیہ نگار بھی، وہ بڑی دور سے چل کر مجھ سے ملنے لاہور آئے۔ ہم عمر فکر و احساس میں ان کی شرکتوں کے اٹوٹ باب سے ادب کی بستی میں جمالیاتی تہذیب کا سماں بندھ گیا ہے۔ ہم تین چار روز ساتھ رہے، اور یہ دن مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ غلام الثقلین شاید اب اپنے رسمی پیشہ سے کنارہ کشی ہو چکے ہیں۔ ان کا ناول 'میرا گاؤں' حال ہی میں شائع ہوا ہے، اس میں پاکستانی دیہی زندگی کی بڑی سچی عکاسی کی گئی ہے۔ اپنے افسانوں کی ہی طرح وہ خود بھی بڑے حساس، سادہ مزاج اور کھرے ہیں۔ میرا ایک پرانا ہم جماعت رفیق محمود بھی مل گیا جو اس وقت لاہور کے معروف گورنمنٹ کالج میں شعبۂ انگریزی کا صدر ہے۔ جب ہم کالج میں ساتھ تھے تو وہ ہمیں اردو کے سوا کسی اور زبان میں بولنے ہی نہ دیتا تھا لیکن اب اس کا خیال ہے کہ اردو سے وہ محض فلرٹ کیا کرتا تھا اور اس کی پہلی اور آخری محبت کا حق صرف پنجابی کو پہنچتا ہے۔ ابھی ہماری ملاقات کو بمشکل پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ اس نے مجھے اسی طرح ڈانٹنا شروع کر دیا جیسے کالج کے دنوں میں کیا کرتا تھا۔ اس کی ڈانٹ کی کڑواہٹ مجھے پہلے کے مانند ہی برگشتہ آور محسوس ہوئی۔

انور سجاد سے میری ملاقات ایف سی کالج کے احاطہ میں ڈاکٹر سہیل آغا کے مکان پر ہوئی۔ وہ بڑے بے چین اور خاموش سے تھے۔ ڈاکٹر سہیل نے مجھے وہاں لاہور کے روزنامہ 'جنگ' کے لئے اردو کے جدید افسانوی ادب پر انٹرویو کے سلسلہ میں مدعو کیا تھا۔ انٹرویو میں ان کے علاوہ اسرار زیدی اور ڈاکٹر سلیم اختر بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر اختر شاید 'نوائے وقت' کے لئے پہلے ہی میرا انٹرویو لے چکے تھے جس میں عطاء الحق قاسمی اور امجد الاسلام امجد جو ایک جدید شاعر ہیں، شریک تھے۔

میں نے پاکستان میں جو اخبارات دیکھے ان سے مجھے احساس ہوا کہ ادب کو بھی خبروں کی طرح قابلِ مطالعہ بنایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے اخبار سیاست پر ہی ساری توجہ مرکوز کرتے ہیں مگر پاکستانی اخبارات میں ادبی سرگرمیوں اور ان کے اثرات پر کافی مواد رہتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ سیاسی دور کی آمد پر پاکستان میں یہ ادبی رجحان برقرار نہیں رہے گا لیکن میرا خیال ہے کہ وہاں ادب میں عوام کی دلچسپی اتنی بیدار ہو چکی ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں جب بھی کوئی اخبار ادبی خبروں کا حصہ شائع کرنا بند کر دے گا تو اس کی اشاعت پر اس کا اثر خوشگوار نہ ہوگا اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہونا غیر مستحسن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب روزمرہ کا ایک برتر حصہ ہے۔ مجلسی تناظر میں اسے کسی نہ کسی مقام پر اپنی ریل پیل کا اہتمام کرنا ہی چاہیے تاکہ یہاں سے وہ انحطاط کو فروغ دینے والی قوتوں پر بڑے اعتماد سے حملہ کر سکے، جہاں تک ہندوستانی معاشرے کا تعلق ہے اس میں مذہبی رجحانات بھی کارگر نہیں رہے، اور یہی حالات اگر اخباروں میں انحطاط پذیر سیاست دانوں کے بارے میں خبریں شائع کرنے کے بجائے پریس جیسے ذرائع کو ادب اور ثقافت کی مقبولیت کے لئے کام میں لایا جا سکے تو اس اقدام کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے

پاکستانی روزناموں میں ادبی پہلو کے اس توانا رجحان نے چند مسائل بھی پیدا کر دیئے ہیں مثلاً کسی کتاب، ادبی ماہنامے یا سہ ماہی کے مقابلے میں کسی روزنامے میں موافق تنقیدی تبصرے شائع کروانا بہت آسان ہے۔ مصنفوں کی قصیدہ خوانی کی اس روایت کے باعث ان کے ادبی محاسن کے صحیح تعین میں الجھاؤ پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ اگر کسی روزنامے کے پاس موزوں ادبی مشیر نہیں ہیں یا اس کا مقصود پست پیشہ ورانہ مفادات سے جڑا ہوا ہے تو اس کے ذریعے ادب ضمیر اور عبارت کا نہیں، اشتہار کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا نے 'اوراق' کے بہار نمبر میں اپنے اداریے میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ روزناموں میں جو غیر ذمہ دارانہ طریقے سے ادبی تبصرے کئے جاتے ہیں ان کا انسداد کیوں ضروری ہے۔ اسی طرح صہبا لکھنوی نے بھی شکایت کی تھی کہ روزانہ صبح جب اخبار ہاتھ میں لیتا ہوں تو یہی خدشہ رہتا ہے کہ نا معلوم آج کس بے قصور ادیب کی کردار کشی کی گئی ہے کیونکہ اخبار والوں کا منشا تو یہی ہوتا ہے کہ ادبی کالم میں کوئی ایسی خبر شامل ہو جس سے قاری کو اپنا ناشتہ چٹ پٹا لگے۔ یہ مسائل خاصے پیچیدہ ہیں لیکن یہ پیچیدگی کاروباری لوگوں کی پیدا کردہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرض کا علاج کیا جائے، نہ کہ اس کی، کہ مریض کو زہر دے کر ہلاک کر دیا جائے۔ صحافت کی صحت مند ادبی روایات سماج کے اخلاقی ڈھانچے کی بہتری کے لئے بڑے اہم رول کی گنجائش روا رکھتی ہیں۔

ہندوستان کے لئے روانہ ہونے سے ایک روز پہلے مجھے جدید ادب اور زندگی سے متعلق کئی امور پر اپنے چند دوستوں کے ساتھ کھل کر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ صفدر میر جو 'پاکستان ٹائمز' میں سماجی موضوعات پر تبصرے لکھتے ہیں اور جن کا شمار اردو کے ممتاز شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ شہزاد احمد جو ایک ماہر منتظم اور نہایت حساس اور باشعور شاعر ہیں اور میرے میزبان وزیر آغا بھی اس گفتگو میں شریک تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر دانش ور دوستی کو ہی اپنا مطمع نظر بنائیں تو نظریاتی ہم آہنگی مہذب لوگوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب نہیں لا پاتی، جتنا ان کے آپسی اختلافات۔

دوسرے دن وزیر آغا اور کشور ناہید مجھے اور میری بیوی کو خدا حافظ کہنے کے لئے واگھا سرحد تک ہمارے ساتھ آئے۔ محمد علی صدیقی نے مجھے لکھا تھا 'میرے لفظوں پر نہ جاؤ یہاں آکر دیکھو، ہمیں تم سے کتنی محبت ہے۔ یہاں پہنچ کر جہاں بھی جاؤ گے، یہی محسوس کرو گے کہ اپنے ہی گھر آ گئے ہو ——— سچ یہی ہے کہ وہاں جا کر میں گویا گھر ہی پہنچا، تاہم مجھے یہ فکر لاحق ہے کہ نئی پیڑھی کی راحیلہ نے مجھے اس وجہ سے پاکستان آنے کی دعوت کیوں دی تھی کہ وہ زندگی بھر کسی ہندوستانی سے مل نہیں پائی۔ کیا ہم اس کے باوجود پاکستان اور ہندوستان کی نئی نسلوں کو ایک دوسرے سے دور رکھیں گے کہ قدرت نے ان دونوں کے مقدر میں پڑوسی بن کر رہنا لکھا ہے؟ ○○

"شاعر کے لئے عطیات و اشتہارات، تا عمر خریداری اور سالانہ خریداروں کی فراہمی میں ہمیں آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔"

شاعر کے چند گراں قدر خصوصی نمبر

ایک شمارہ ۸۰ء کے نام ● قیمت ۱۰ روپے ● قومی یک جہتی نمبر ● قیمت ۱۵ روپے

افسانہ نمبر ۱۹۸۱ء ● قیمت ۱۲ روپے

اظہار مسرت

تجدید

وہ بات اور تھی
جب گیلی، سوندھی مٹی پر
(بھیگی ہوئی شام میں) کھپریل کے تلے بیٹھے
ہم اپنی ماں کی محبت بٹورنے کے لئے
قلم، سیاہی، تختی میں میل رکھتے تھے
(عجیب وقت تھا) کیا کھیل رکھتے تھے!
یہ بات اور ہے ....

....
اب زاویے بدل چکے ہیں سبھی
نئے افق سے ابھرتی ہوئی نئی تنویر
نئے خیال کی پیغامبر بن کر
نئے وجود کے پیکر میں ڈھل گئی
لیکن ؟
شعور و نطق کی قدریں تو اب بھی قائم ہیں
(ہے جسم و روح میں اک دائمی نسبت)
ہم اپنی فطرتِ اشرف بدل نہیں سکتے۔
وہ ماں کی ممتا ہو
یا مادری زباں کا جہاد!!

● فتح پور، شیخاواتی ۳۳۲۳۰۱

مرغوب علی

انتظار

سب کہتے ہیں
جو وقت گیا وہ کب آیا
جو شام ڈھلی جو رات گئی
سانسوں کے رتھ جو بات گئی
جو رنگ اڑا جو خواب لٹے
سورج، دھرتی، مہتاب لٹے
جو بازی کھا کر مات گرے
جو پھول گرا جو پات گرے
جو سنگی ساتھی چھوٹ گئے
جن سے سب رشتے ٹوٹ گئے
وہ کب آئے
سب کہتے ہیں کب آئے وہ
میں سنتا ہوں سر دھنتا ہوں
پر تیرے لوٹ کے آنے کے
لمحے، پل، چھن
دن گنتا ہوں

● ۴۹، دھرم داس، نجیب آباد۔
۲۴۶۷۶۳۔ یو۔ پی

عصمت مظفری

جسم کی ہستی

پاؤں چلتے ہیں
ہاتھ ہلتے ہیں

آنکھ مصروف خواب و بیداری
ناک کو بوئے گل سے الفت ہے
کان سنتے ہیں نغمہ و آواز
ذہن کو سوچنے کی عادت ہے
دل کو بس اختلاط کی لت ہے

جسم کا عضو عضو اے عصمت
اپنی اپنی روش میں کھویا ہے
ایک لذت کی آنچ ہے جس پر
ٹکڑا ٹکڑا بدن کا سویا ہے

ایسی لگتی ہے جسم کی ہستی
دور ــــ جلتی ہو جیسے اک بستی

● ایکسٹنشن آفیسر، بی ایس، بوتھ، ضلع عادل آباد (آندھرا پردیش)

اِس گھر کے پاگل لوگ

مہدی ٹونکی ● مُبارک منزل ، پانچ بتی ، ٹونک

میں اب تک یہی سمجھتا آرہا تھا کہ جو لوگ گندے رہتے ہیں، پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں، چیزوں کو توڑتے ہیں، پتھر برساتے ہیں، لوگوں کو مارتے ہیں، ایسے لوگ پاگل ہوتے ہیں۔ لیکن لوگوں کا یہ نظریہ جو میں نے بھی اپنے اوپر لاد رکھا تھا، مشاہدے پر غلط ثابت ہوا۔ اصل میں، جب ایک انسان دوسرے لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کے بجائے، ان کے عادات و اطوار اپنانے کے بجائے، انہی کے غور و فکر کے دھارے میں بہنے کے بجائے، ایک جُدا راستہ اختیار کرتا ہے، ایک نئی نکر لے کر بھیڑ سے الگ ہونے کا پرچم بلند کرتا ہے تو بھیڑ کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے اور اسے پاگل قرار دیدیتے ہیں۔ یا یہ کہئے کہ کسی ایک آدمی کا بھیڑ کے خیالات سے اتفاق نہ کرنا پاگل پن کہلاتا ہے۔

میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ گھر کے لوگ میری حرکات و سکنات کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میری باتوں پر دُکھی ہوتے ہیں۔ مجھ میں ذہنی خرابی بتاتے ہیں۔ اصل میں گھر کے لوگ مجھ سے اس لئے ناراض ہوتے ہیں کہ میں انہیں حقیقت سے آشنا کراتا ہوں، صحیح بات کہتا ہوں۔ وہ باتیں جنکو گھر کے افراد چھپاتے ہیں، بتادیتا ہوں۔ گھر کے ان لوگوں کی ناقص عقلیں دنیا داری میں اتنی کھو گئی ہیں کہ صحیح بات سمجھنے اور دیکھنے سے محروم ہو گئے ہیں اور جب میں ان کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتا ہوں تو وہ میری صحیح الدّماغی پر شک کرتے ہیں۔ میں اس گھر میں منڈلا رہی آفتوں کو دیکھ کر فکر مند ہوں میں اس گھر کے ایک ایک فرد کا غور سے مطالعہ کرتا ہوں تو پاتا ہوں کہ ہر فرد، ایک دوسرے سے ڈر رہا ہے، ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہا ہے۔ گھر کا ہر ممبر اپنی مطلب پرستی میں لگا ہوا ہے اور جب میں ان کو ٹوکتا ہوں، بُرے نتایج سے آگاہ کرتا ہوں تو وہ مجھ پر ناراض ہوتے ہیں، مجھے پاگل کہتے ہیں۔

یہی دیکھیئے نا ـــــــ اس دن پاپا ڈرائنگ روم میں بیٹھے اپنے دوستوں کے ساتھ ملک کے حالات پر بحث کر رہے تھے۔ میں ایک طرف بیٹھا ایک ایک کی صورتیں دیکھ رہا تھا سب ہی کو اس بات کا غم کھاتے جا رہا تھا کہ اس ملک کا حشر کیا ہوگا؟ ہر طرف انتشار ہے، بدامنی ہے، کہیں ڈاکے پڑ رہے ہیں تو کہیں عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں۔ مخالف پارٹیاں آئے دن ہڑتالوں، مظاہروں اور بندھ میں حصّہ لے کر ملک کے انتظام کو درہم برہم کر رہی ہیں۔ رشوت خوری اور بے ایمانی کا بازار گرم ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے حکومت بے دست و پا ہو چکی ہے۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔ پولیس لوگوں کی آنکھیں پھوڑ رہی ہے، گھروں کو لوٹ رہی ہے لیکن کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ طالب علم آئے دن ہڑتالیں کر رہے ہیں، اپنے استادوں کی بے عزّتی کر رہے ہیں۔ یونیورسٹیاں غنڈے طلباء کے کارناموں سے آئے دن بند ہو رہی ہیں۔ نہ حکومت انہیں سزا دے رہی ہے اور نہ والدین اپنی اولاد کو روک رہے ہیں۔

اچانک میری نظر کھونٹی پر ٹنگے پاپا کے کوٹ پر گئی۔ ایک چڑیا ان کی جیب سے کاغذ نکال رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں چڑیا کو اُڑاتا اس نے اپنی چونچ سے کاغذ کھینچ کر گرا دیا۔ میں نے جلدی سے کاغذ اٹھایا۔ یہ کاغذ یونیورسٹی سے آیا تھا جس میں میرے بڑے بھائی پر الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے مل کر لیکچرر کو مارا، سامان کو توڑا پھوڑا اور یونیورسٹی کے کام کاج میں رکاوٹ ڈالی۔ چونکہ یہ پہلے بھی کئی بار ایسی حرکتیں کر چکے ہیں اس لئے ان پر دو سو روپیہ جرمانہ کے علاوہ ایک ماہ کے لئے یونیورسٹی سے نکالا جاتا ہے اور دوبارہ داخلہ کے وقت اچھے چال چلن کے لئے پاپا سے ضمانت چاہی گئی تھی۔ میں نے وہ کاغذ پاپا کے سامنے رکھ دیا۔ کاغذ کو دیکھتے ہی پاپا نے مجھے گھورا اور بھنّا کر بولے

"عجیب پاگل ہے۔ ہر کسی کا کاغذ اٹھا کر مجھے دے دیتا ہے ـــــ چلو جاؤ یہاں سے ــ"

اب اس جھوٹ پر مجھے غصّہ آئے یا نہیں ؟

میرا دوسرا بڑا بھائی بھی مجھ سے نالاں ہے۔ مجھ سے گھبراتا ہے میں جب اس کے کمرے میں جاتا ہوں تو وہ مجھے بھگا دیتا ہے۔ اب اس میں میرا کیا قصور کہ جو میں دیکھتا ہوں وہ کہہ دیتا ہوں۔ اصل میں میرا یہ بڑا بھائی اس گھر کی مہترانی سے محبت کرتا ہے۔ گھنٹوں اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے سڑک پر گھروں سے گندگی لاتے ہوئے، جھاڑتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ میں نے اکثر ان دونوں کو اکیلے میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دن جب کہ تعطیل تھی ہم سب دوپہر کے کھانے کے لئے میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں میرا یہ بڑا بھائی کمرے میں داخل ہوا۔ میں ان کی صورت دیکھتے ہی چلّا یا ۔

"ارے بھائی میاں کا منہ کالا!"

میری اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ بھائی میاں نے جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر ہاتھ کو دیکھا کہ کیا واقعی ان کا منہ کالا ہو گیا ہے ؟

میں نے پھر کہا" ارے امّی بھائی میاں کا منہ تو اس قدر رنگ گیا ہے کہ چھٹائے بھی نہیں چھوٹ رہا ـــــ!"

"یہ کیا بد تمیزی ہے؟" بھائی میاں نے مجھے ڈانٹا" میں تو مسجد میں سے نہا کر آ رہا ہوں ـــــ"

"کمال ہے" میں حیرت سے بھائی میاں کا کالا منہ دیکھتے ہوئے بولا۔ مسجد کے پانی سے بھی کالک نہیں چھوٹی ـــــ ؟"

بھائی میاں جلدی سے اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ بس ـــــ تب ہی سے وہ مجھ سے گھبراتے ہیں۔

میری بڑی بہن یاسمین باجی بھی مجھ سے کتراتی ہیں۔ مجھے اپنے کمرے میں داخل ہونے نہیں دیتیں۔ وہ اس گھر میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔ جب انہوں نے کالج میں داخلہ لیا تھا تو ان کے لئے شادی کے بہت پیغام آتے تھے۔ مگر ہماری امّی نے ہر ایک سے صاف صاف کہہ دیا تھا ـــــ نہیں بھئی نہیں۔ ہماری یاسمین تو بڑی ہونہار ہے۔ ابھی تو وہ آگے اور پڑھے گی ـــــ اور ابھی ویسے اس کی عمر ہی کیا ہے ؟

اصل میں ہماری امّی اور پاپا چاہتے تھے کہ یاسمین باجی کے لئے کوئی ڈاکٹر ملے، انجینئر آئے، کوئی اعلیٰ افسر آئے یا کوئی بہت پیسے والا پڑھا لکھا بزنس مین ہو۔ لیکن کوئی نہیں آیا۔ اسی انتظار میں یاسمین باجی نے ایم۔ اے کر لیا، ڈبل ایم۔ اے کر لیا اور اب پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کر رہی ہیں۔ دوبار آئی۔ اے۔ ایس کے امتحان میں فیل ہو چکی ہیں۔ یاسمین باجی جتنی خوبصورت آج سے پانچ سات سال پہلے تھیں، اب اتنی خوبصورت نہیں رہیں ۔ اس کا احساس انھیں بھی ہے۔ اسی لئے تو جب کوئی مہمان آتا ہے تو وہ لیپ پت کر نزاکت سے مہمان کے پاس جاتی ہیں۔ اتنی نزاکت اور احتیاط سے بولتی ہیں جیسے ان کی آواز باریک کانچ کا گلاس ہو، ذرا سا دھکّا لگا اور ٹوٹا۔

یاسمین باجی اب مہمانوں سے خوش نہیں ہوتیں۔ کیونکہ اب مہمان، رشتہ دار انہیں مانگنے نہیں آتے بلکہ چھوٹی بہن زرینہ باجی کو دیکھنے آتے ہیں۔ میں نے اکثر یاسمین باجی کو ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مایوس چہرہ لٹکاتے دیکھا ہے۔ اب ان کی دلچسپی ہمارے ہمسایہ کلّن خاں قصائی میں بڑھ گئی ہے۔ اس پرکشش نوجوان قصائی سے یاسمین باجی کو میں نے اکثر اشارے کنایے کرتے ہوئے، شرماتے ہوئے، پرچے پھینکتے ہوئے دیکھا ہے۔ کلّن خاں قصائی بہت مالدار ہے۔ ہر وقت بنا ٹھنا رہتا ہے۔ روزانہ کئی بھینسے کاٹ کر عرب کھینچتا ہے۔

ایک دن ہم سب آنگن میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یاسمین باجی جو باہر گئی ہوئی تھیں گھر میں داخل ہوئیں۔ وہ تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں کہ پاپا نے آواز دی" بیٹیا یاسمین ـــــ ذرا یہ فائل میرے کمرے میں رکھ دینا ـــــ"

جب وہ ہمارے قریب آئیں تو میری ناک تیز بدبو کی وجہ سے سن سنا گئی۔ دماغ پھٹنا گیا۔ میں چیخ اٹھا ـــــ" ارے امّی ـــــ یاسمین باجی کے پاس سے تو سڑاندھ آ رہی ہے !"

"بیٹے ـــــ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے ؟" امّی چلّائیں" کیا تجھے اس کے پاس سے قیمتی سینٹ کی اتنی تیز خوشبو نہیں آ رہی ہے ؟"

"نہیں امّی ـــــ سچ کہہ رہا ہوں۔ بالکل سڑے گوشت کی بدبو یاسمین باجی کے جسم سے آ رہی ہے !"

"چپ رہ" امّی نے ڈانٹا۔ یاسمین باجی کچھ کہے بنا سراسیمہ چہرہ لئے تیزی سے واپس مڑ گئیں اور میں دیر تک سوچتا رہا کہ آخر میرے ماں باپ

اتنی تیز سڑاندھ کو کیوں محسوس نہیں کر سکے ؟

اور جب سے اختر بھائی مرے ہیں مجھے کالی زبان والا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اختر بھائی ہمارے چچا کی دوسری بیوی جو چمارن تھیں ان کے لڑکے تھے۔ پہلے یہ لوگ بہت غریب تھے۔ کچا گھر تھا، اختر بھائی بی ایڈ کرنے کے بعد ٹیچر بن گئے۔ یاسمین باجی کے لئے انہوں نے اپنی امی کے ہاتھ شادی کا پیغام بھیجا۔ اس وقت تو ہماری امی، سوتیلی چچی کے سامنے کچھ نہیں بولیں، یاسمین باجی کے اور آگے پڑھنے کا بہانہ کر کے انہیں ٹال دیا لیکن ان کے جانے کے بعد امی لال پیلی ہو گئیں۔

"حرام زادی ـــــ کُتیا۔ پیغام لے کر آئی ہے۔ یہ بھی دھیان نہیں رہا کہ کس منہ سے شریف گھرانے میں جاؤں ؟ بدذات کے دماغ ہی سڑ گئے ہیں۔ لو بھلا ـــــ کمینی ذات کو اپنی اصل نسل کی بیٹی دوں گی ـــــ ہونہہ"

پھر اختر بھائی کوئی ٹیکنیکل کام سیکھ کر عرب چلے گئے۔ وہاں جاتے ہی ان کے دن پھر گئے۔ دو سال میں ہی ان کا کچا گھر تین منزلہ پختہ مکان میں تبدیل ہو گیا۔ آٹھ سال میں کئی دکانیں، دو پختہ مکان اور ڈھیر ساری زمین خرید لی۔ چھوٹے بھائی نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا جس کا اب آخری سال ہے۔ دونوں بہنوں کی شادی اونچے گھرانے میں دھوم دھام سے کردی۔ اب جو اختر بھائی بن ٹھن کر ہمارے یہاں آتے تو امی، پاپا ان کے قدموں تلے بچھ گئے۔ جب بھی وہ واپس جانے کا کہتے تو ہماری امی، پاپا کے چہروں پر رنج چھا جاتا ـــــ "بیٹا ابھی تو کچھ دن اور ٹھہرو۔ پھر تو دو ڈھائی سال بعد آنا ہوگا ـــــ"

اصل میں امی، پاپا کی مرضی تھی کہ اختر میاں یاسمین باجی کو مانگ لیں لیکن اختر میاں کے کسی ارادے کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ یاسمین باجی اب سنور کر اختر میاں کے پاس آتیں اور ان کے سامنے بیٹھ کر میٹھے میٹھے انداز میں دنیا بھر کی معلومات کا پٹارہ کھول دیتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سے زیادہ کوئی قابل ہے ہی نہیں۔ پاپا چپ چاپ اور امی کام کا بہانہ کر کے دونوں کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر چلی آتیں اور میں سوچتا ـــــ یا اللہ ـــــ یہ کیسی تبدیلی ہے۔ پہلے تو امی، اختر میاں کو یاسمین باجی کی ہوا تک نہیں لگنے دیتی تھیں اب یہ حال ہے کہ خود ہی پیش کر رہی ہیں۔"

اور جب ایک دن اختر میاں نے بمبئی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو امی کو تشویش ہوئی کہ کہیں اختر میاں بمبئی سے ہی پھر سے عرب کے لئے نہ اُڑ جائیں۔ انہوں نے جلدی سے کہا" ارے ہم تو تمہاری وجہ سے یاسمین کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے منانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

میں دنگ رہ گیا امی کی اس جھوٹ پر ! ایک تو یاسمین باجی کی سالگرہ منائی ہی نہیں جاتی دوسرے یہ کہ یاسمین باجی کڑکڑاتے دسمبر میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس چلچلاتی مئی میں سالگرہ کیسے ؟

"ارے کب ہے سالگرہ ؟" اختر میاں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پندرہ مئی کو"

"تب تک تو میں آ بھی جاؤں گا"

"آپ نہیں آئیں گے" یاسمین باجی نہایت ہی دلکش ادا سے بولیں۔

"ارے نہیں بھئی۔ میں تمہاری سالگرہ میں ضرور آؤں گا" اختر میاں انار کی طرح کھل اٹھے۔

"آپ ضرور آئیں گے نا ـــــ پکا وعدہ ـــــ" ہاتھ بڑھاتے ہوئے یاسمین باجی پھول لگے گلاب کی ڈالی کی طرح جھک گئیں۔

"بالکل پکا وعدہ ! میں ضرور آؤں گا" اختر میاں یاسمین باجی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے موم کی طرح پگھل گئے۔

"جانے والے کبھی لوٹ کر واپس نہیں آتے" اچانک میری زبان سے نکلا۔ میں خود نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کیوں ہوا۔

"چپ رہ بدزبان" امی لرز گئیں۔ سب پر سکتہ طاری ہو گیا" دیکھا ہر کچھ کہہ دیتا ہے ـــــ دیوانہ ـــــ"

لیکن اس میں میرا کیا قصور کہ واقعی اختر میاں لوٹ کر واپس نہیں آئے۔ ٹرین حادثہ میں مارے گئے۔ کئی دنوں تک ہمارے گھر میں ماتم چھایا رہا۔ امی آنسوؤں سے روتی رہیں۔ اور یاسمین باجی کی آنکھیں سوجی رہیں۔ اور میں سوچتا رہا ـــــ اس کمین ذات کے لئے اتنا دکھ کیوں ؟

تھوڑے دنوں بعد امی کہتی سنائی دیں کہ اختر میاں کا چھوٹا بھائی قدوس جواب ڈاکٹر ہے یاسمین کو مانگ لے تو ہم خوشی خوشی دے دیں گے۔

چاہے وہ عمر میں یاسمین سے چھوٹا ہی سہی۔

میری چھوٹی بہن زرینہ جو کالج میں پڑھتی ہے، رکشہ کے آنے سے دو گھنٹہ قبل تیاری میں مصروف ہو جاتی ہے۔ بالوں کو نئے نئے صابنوں سے دھوتی ہے۔ نت نئے تیل لگاتی ہے۔ چہرہ پر مشین سے مالش کرتی ہے۔ بالوں کو اُکھیڑ اکھیڑ کر بھنویں سجالی ہیں۔ بھنویں کیڑے باریک کترن ہو کر رہ گئی ہیں۔ رنگ برنگے، نت نئے کپڑے پہن کر مہکتی ہوئی رکشہ میں جاتی ہے اور میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ میری بہن علم حاصل کرنے جا رہی ہے یا اپنے حسن و جسم کی نمائش کرنے؟

میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ جب نالندہ یونیورسٹی میں کسی طالب علم کو داخلہ دیا جاتا تھا، چاہے وہ کسی ریاست کا راجکمار ہی کیوں نہ ہو، تو اس کا سر منڈوا دیا جاتا تھا اور اس کو ایک کشکول دے دیا جاتا تھا کہ وہ صبح و شام بستی میں جا کر بھیک مانگے اور اپنی روٹی خود حاصل کرے۔ اس طرح طالب علم کی خودی مٹ جاتی تھی اور علم حاصل کرنے کی پیاس بڑھ جاتی تھی۔ مگر اب ـــــــ؟ پتہ نہیں ایسی تعلیمات اب کالجوں میں کیوں نہیں دی جاتی۔

کسی نے برنارڈ شا سے پوچھا تھا کہ آپ کی نظر میں سب سے اچھا مذہب کون سا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ سب سے اچھا مذہب، اسلام ہے لیکن اس کے پیروکار سب سے زیادہ خراب ہیں۔

واقعی برنارڈ شا نے بہت صحیح جواب دیا تھا۔ ہمارا گھر پوری طرح اسلامی ہے۔ گھر کے تمام افراد کے نام اسلامی ہیں۔ گھر میں جگہ جگہ اللہ، رسول کے نام کے طغرے لٹکے ہوتے ہیں۔ کمروں میں قرآن شریف کی آیتیں لکھے کیلنڈر آویزاں ہیں۔ گھر کے سب لوگ لاؤڈ اسپیکر سے گونجتی اذانوں کو بڑے احترام سے سنتے ہیں۔ امی سر پر دوپٹہ ڈال لیتی ہیں۔ اذان کے بعد پاپا آنکھیں بند کر کے ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگتے ہیں ـــــــ بس! رمضان کا بڑا احترام و اکرام ہوتا ہے۔ پورے مہینے بہت اچھے کھانے پکتے ہیں۔ پڑوسیوں کو کھانا بھیجا جاتا ہے۔ گھر میں جب کسی کا روزہ ہوتا ہے تو اس دن خاص اہتمام ہوتا ہے۔ روزہ دار مریض کی طرح پڑا رہتا ہے دل بہلانے کے لئے ریڈیو، ٹیلیویژن یا ٹیپ ریکارڈر دن بھر چلتا رہتا ہے۔ ویسے ہم لوگ رمضان میں قطعی فلم نہیں دیکھتے ہیں۔ پورا مہینہ بہترین قسم کے کھانوں، مشروبات اور کپڑوں کی سلائی وغیرہ میں خیر و خوبی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ ہاں ان دنوں پاپا بہت مذہبی ہو جاتے ہیں۔ پابندی سے روزانہ اگربتیاں سلگا کر فریم میں آویزاں قرآن شریف کی آیتوں، کعبہ شریف اور مدینہ منورہ کی تصویروں پر دھواں دیتے ہیں۔ اسلام کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ بڑے فخر سے کہتے ہیں ـــــــ سب سے اچھا مذہب اسلام ہے جس نے ذات پات، اُونچ نیچ کی تفریق اور تعصبات کو ختم کیا۔ سب کو میل جول کے ساتھ رہنے کی تعلیم دی خاص طور سے مسلمانوں کو تو آپس میں اتحاد اور بھائی چارے کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے۔ ایک دوسرے کو دُکھ یا نقصان پہنچانے کے لئے سختی سے منع کیا ہے۔ ہمارے پاپا وصلی میں لگی اس آیت کو بار بار پڑھتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

بے شک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلاح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

لیکن ایک بار ہمارے پاپا اور چھوٹے چچا میں زمین جائیداد کے بٹوارے میں جھگڑا ہو گیا معاملہ عدالت میں پہنچ گیا۔ جب ایک دن ہمارے چچا زمین پر قبضہ کرنے گئے تو ہمارے بڑے بھائی سے جھڑپ ہو گئی۔ انھوں نے غصہ میں لاٹھی سے حملہ کر کے چچا کی ٹانگ توڑ دی۔ جب یہ کارنامہ گھر آکر پاپا کو سُورما کی طرح سُنایا تو پاپا، ممّی بہت خوش ہوئے، پاپا کہنے لگے "اچھا کیا ـــــــ مردود کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دی ہوتی ـــــــ"

اور اچانک مجھے پاپا کی دی ہوئی تعلیم اور وہ وصلی یاد آگئی جسے پاپا بار بار پڑھتے ہیں۔

"بنّے ـــــــ" اچانک پاپا گرجے "پاگلوں کی طرح کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ چل یہاں سے ـــــــ"

"لو سُنو پاگل کی باتیں" امّی کہنے لگیں "جو ہماری جائداد ہڑپ لے بھلا وہ ہمارا بھائی کہاں سے ہوا ـــــــ بنّے کا تو واقعی دماغ خراب ہو گیا ہے"۔

میں ان کی محفل سے اٹھ آیا۔ مجھے مہاتما بدھ کا ایک قصّہ یاد آ گیا ـــــــ ایک بار مہاتما بدھ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا "مجھے کچھ تعلیم دیجئے ـــــــ مجھے کچھ تعلیم دیجئے ـــــــ"

مہاتما بدھ نے استغراق توڑا، آنکھیں اس پر مرکوز کیں اور کہا "سارے عالم کے لئے خیر و عافیت اور بھلائی چاہو ـــــــ"

"کیا اپنے پڑوسی کے لئے بھی ـــــــ" وہ آدمی ایکدم بول اٹھا۔

"ہاں ـــــــ سب کے لئے"

"مہاتمن!" وہ آدمی بولا "میں سب کے لئے بھلائی چاہ سکتا ہوں مگر اپنے پڑوسی کے لئے نہیں کیونکہ اس سے میری لڑائی چل رہی ہے ــــ"
سچ تو یہ ہے کہ آدمی چاہے مہاتما بدھ کے زمانے کا ہو یا محمدؐ کے زمانے کا ہو یا اس زمانے کا، اس کا حرص و فریب، لالچ اور دغابازی میں رتّی بھر کی کمی نہیں آئی ہے اور اس کی یہ برائیاں کبھی بھی ختم نہیں ہوں گی چاہے کتنے ہی مہاتما بدھ آجائیں چاہے کتنے ہی عیسیٰؑ اور موسیٰؑ پیدا ہو جائیں۔
مجھے کئی دنوں سے کھانے کا مزا بُرا لگ رہا تھا۔ کبھی روٹی کڑوی لگتی تھی تو کبھی سبزی میں سے بدبو آتی۔ کبھی کبھی تو سبزی میں مجھے چھوٹے چھوٹے کیڑے دکھائی دینے لگتے۔ جب میں نے یہ بات امّی کو بتائی تو وہ غصّہ ہو گئیں۔ دھیرے دھیرے یہ بدبو، کڑواہٹ اور کیڑے بڑھنے لگے۔ میں پریشان ہو گیا۔ ایک دن سب کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا۔ روٹی سونگھی تو وہی بدبو۔ سبزی پر نظر ڈالی تو وہی چھوٹے چھوٹے کیڑے دکھائی دیے۔ جب میں نے مُنہ بنا کر شکایت بھری نظروں سے امّی کو دیکھا تو سہم گیا۔ وہ غضبناک آنکھوں سے مجھے ہی گھور رہی تھیں۔ بھائی بہن ہنسنے لگے۔ اتنے میں پاپا آگئے۔ انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈّی امّی کو دی جسے انہوں نے جلدی سے اپنے بلاؤز میں اڑس لیا۔ ایک دم مجھے اپنی سبزی میں چھپکلی بلبلاتی نظر آئی۔
"امّی چھپکلی" میں چیخ مار کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سبزی بھری پیالی کو دُور پھینک دیا۔ پیالی کا شوربہ پاپا اور امّی کے کپڑوں پر جا گرا۔ دوسرے ہی لمحہ پاپا مجھ پر پل پڑے۔
"حرامی ــــ سوّر ــــ میں تم لوگوں کے لئے دن رات محنت کر کے، اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہوں، اور تو کھانے کو ایسے پھینک رہا ہے جیسے میری کوئی حرام کی کمائی ہو ــــ"
مار کھانے کے بعد میں دیر تک نیچی نظریں کئے یہ سوچتا رہا کہ مجھے پاپا کی کمائی میں کیڑے کیوں نظر آتے ہیں؟
اور ایک دن مجھے اپنی اس بیماری کی وجہ معلوم ہو گئی۔ ایک رات کھانے پر گھر کے سب افراد جمع تھے۔ مجھے روٹی اور سبزی میں وہی بدبو اور کیڑے نظر آتے۔ لیکن پاپا کی حلال کمائی کا خیال آتے ہی مجبوری سے چھوٹے چھوٹے نوالے چبانے لگا۔ اتنے میں پاپا بیگ لئے کمرے میں داخل ہوئے ڈائننگ ٹیبل کے نیچے سے کرسی کھینچ کر امّی کے پاس بیٹھ گئے۔ پاپا کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ انہوں نے بیگ میں سے نوٹوں کی ایک گڈّی نکالی اور امّی کو دے دی۔ دوسری گڈّی نکالنے کے لئے انہوں نے پھر بیگ میں ہاتھ ڈالا اور جیسے ہی امّی نے نوٹوں کی گڈّی کو اپنے بلاؤز میں رکھا چھپاک سے ایک موٹی چھپکلی میری سبزی کی پیالی میں آگری۔ میں نے گھبرا کر کرسی پیچھے سرکائی اور چیخنا چاہا لیکن پاپا کی خشمناک آنکھوں کو دیکھ کر اپنی چیخ کا دم گھونٹ دیا" چھپ ــــ کل ــــ لی ــــ"
بھائی بہن ہنسنے لگے۔ پھر جب میں نے پاپا کے چہرے سے نظریں ہٹا کر امّی کو دیکھا تو مجھے اُن کے پھولے ہوئے بلاؤز میں سانپ نظر آیا۔ ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے میں پھر اس بار اپنی چیخ نہیں روک سکا،" امّی ــــ سانپ!"
امّی نے جلدی سے گردن جھکا کر اپنے بلاؤز کو دیکھا پھر ساڑھی کا پلّو اس پر ڈالتے ہوئے پاپا سے کہنے لگیں" اجی! اس نے تو اب بہت پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ ــــ اچھا خاصا لڑکا پاگل ہو گیا ہے"!
مجھے حیرت ہوئی۔ امّی کے بلاؤز میں سانپ بیٹھا ہوا ہے اور وہ اطمینان سے باتیں کر رہی ہیں! میں نے پاپا کو دیکھا وہ مجھے غصّے سے گھور رہے تھے بہن بھائی ہنس رہے تھے۔ مایوس ہو کر میں نے اپنی پیالی کو دیکھا، سبزی میں چھپکلی اب بھی بلبلا رہی تھی۔ روٹیوں میں بدبو اور بڑھ گئی تھی، میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر مجھے یہ راز بھی معلوم ہو گیا کہ جب جب بھی پاپا، ممّی کو روپیوں کی گڈّی لا کر دیتے ہیں تو اس دن کھانے میں چھپکلی کیوں آ ٹپکتی ہے؟ زیادہ کیڑے، زیادہ کڑواہٹ اور زیادہ بدبو کیوں بڑھ جاتی ہے۔
پہلے مجھے امّی کا جسم بہت ہی اچھا لگتا تھا۔ سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ اچھی جگہ مجھے امّی کی گود ہی لگتی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے، جب میں چھوٹا تھا، کسی کو آنکھوں سے پہچانتا نہیں تھا تو اس وقت بھی امّی کو ان کے جسم کی خوشبو سے، ان کے لمس سے پہچان لیا کرتا تھا۔ ان کی گود میں پہنچتے ہی مجھے بے پناہ سکون اور بے انتہا راحت ملتی تھی۔ ان کی پیاری پیاری چھاتیوں کو جب میں مُنہ میں لیتا تھا تو میرے جسم میں دودھ کے بجائے طاقت اور سرور کی لہریں بہنے لگتی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ پیتے ہی جاؤں لیکن امّی مجھے بھوکا ہی چھوڑ دیا کرتی تھیں۔ اپنے دودھ کے بجائے ڈبّے کا دودھ دیدیتیں۔ اور جب امّی نے اپنا دودھ پلانا بالکل بند کر دیا تو مجھے بہت رونا آیا مگر میرے رونے کا کسی پر بھی اثر نہیں ہوا۔

آخر صبر کر کے رہ گیا۔ للچائی نظروں سے امّی کی چھاتیوں کو دیکھا کرتا۔ جب بھی امّی مجھے پیار سے اپنے سینے سے لگاتیں تو مجھے بہت زیادہ سکون ملتا۔ لیکن جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا اور امّی نے اسے اپنی خوبصورت چھاتی سے اسے دودھ پلایا تو مجھے اپنے اس چھوٹے بھائی پر بہت غصّہ آیا۔

کچھ سالوں سے میں، اپنی امّی میں غیر معمولی تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں ماں کی آنکھوں میں ممتا کی چمک کے بجائے مطلب اور حرص کی پیاس پا رہا ہوں۔ ان کے برتاؤ میں شفقت اور پیار کے بجائے جھوٹ، مکر و فریب اور خود غرضی جھلکنے لگی ہے۔ اور جب سے ان کا سینہ پھولنے لگا ہے مجھے ان کے سینے میں سانپ بیٹھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے جسم سے سانپ کی بُو آتی ہے۔ امّی کی چھاتیاں اب مجھے دودھ بھرے کٹورے معلوم نہیں ہو کر زہر بھرے پیالے دکھائی دیتی ہیں۔ جب وہ سب سے چھوٹے بھائی کو دودھ پلاتی ہیں تو مجھے بھائی کے جسم میں دودھ کی دھار کے بجائے زہر کی دھار جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور جب یہ چھوٹا بھائی دودھ پی کر مجھے دیکھتا ہے تو میں ڈر جاتا ہوں۔ مجھے بھائی کا رنگ کالا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی زبان سانپ کی طرح لپلپاتی اور آنکھیں سانپ کی ہی طرح تیز چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے تو اب ماں میں ہی نہیں سارے گھر میں، گھر کے سب افراد میں پراسرار تبدیلیاں دکھائی دینے لگی ہیں۔ گھر میں آسائش اور آرام کی چیزیں بڑھ گئی ہیں لیکن مجھے ان پر جگہ جگہ خون کے چھینٹے نظر آتے ہیں۔ میں ان چیزوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ میں اپنے بہن بھائیوں کے چہروں پر محبّت، ہمدردی اور ایثار کے جذبات کے بجائے کدورت، حرص و ہوس اور ریاکاری کے رنگ چڑھتے ہوئے پا رہا ہوں۔ ان کی آنکھیں ہر وقت تلاش و جستجو میں کھوئی رہتی ہیں۔ جب یہ لوگ ایک دوسرے کی چیزیں لینے کے لئے آپس میں لڑتے ہیں، ایک دوسرے کی بُرائیاں کرتے ہیں، گروپ بازی کرتے ہیں، اپنے عیبوں کو چھپاتے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے چھپکلی میں ڈوبا ہوا کھانا سب میں اثر کر رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ان کے اندر کوئی بدروح، کوئی سازش پنپ رہی ہے۔ میں انہیں تشویشناک نگاہوں سے، خوف سے دیکھتا ہوں۔

ایک رات، میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا لاؤ تھسے سے متعلق ایک کتاب پڑھ رہا تھا مجھے فلسفہ اور نفسیات کی کتابیں بہت پسند ہیں۔ پاپا، امّی صوفے پر بیٹھے آرام سے باتیں کر رہے تھے اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کمرے کی دیواریں ترچھی ہو رہی ہیں۔ میں نے جلدی سے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر دیواروں کو دیکھا وہ بالکل ٹھیک تھیں۔ میں پھر کتاب پڑھنے لگا۔ مجھے دیواریں پھر ٹیڑھی ہوتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ میں نے چونک کر امّی، پاپا کو دیکھا، وہ باتوں میں مشغول تھے۔ دیواریں سیدھی کھڑی تھیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا میں دیواروں پر نظر جمائے رہا۔ امّی، پاپا ہم بہن بھائیوں کے مستقبل کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

پاپا کہہ رہے تھے "امجد اس سال اچھے نمبروں سے ایم۔ اے پاس کر ہی لے گا اُسے آئی۔ اے۔ ایس کے کمپٹیشن میں بٹھائیں گے۔ کچھ لے دے کر انٹرویو میں بھی پاس کروا دیں گے۔ نجیب بی۔ ایس۔ سی کر لے گا تو اسے میڈیکل کالج میں داخلہ دلا دیں گے ——"

امّی بولیں" ہاں —— یاسمین بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کرے گی تو کسی کالج یا یونیورسٹی میں لکچرر ہو جائے گی۔ زرینہ کا خیال بھی ڈاکٹری پڑھنے کا ہے۔ بی۔ ایس۔ سی کے بعد اسے بھی ڈاکٹری کرا دیں گے۔ رہے یہ تین بچّے ——"

" ابھی اب کیا فکر ہے" پاپا نے جلدی سے کہا" اپنے پاس اللہ کا دیا اتنا موجود ہے کہ ہر ایک بچّہ خوب تعلیم حاصل کر لے گا، اچھے عہدے پا لے گا ——"

اچانک مجھے چھت ٹوٹ کر گرتی ہوئی دکھائی دی۔ میں چیختا ہوا بھاگا " امی چھت گری —— پاپا چھت گری ——"

جب آنگن میں پہنچ کر خوف و دہشت سے امّی، پاپا کو دیکھا تو وہ ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ امّی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور کہنیاں ٹیبل پر ٹکا رکھی تھیں۔ پاپا تشویشناک نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ دونوں کی حالت سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ میرے لئے بے حد فکرمند ہیں —— بیٹے کو کیا ہو گیا ہے۔ اس پاگل کا علاج کہاں کرائیں —— ؟

ایک دن کی بات ہے مجھے لائبریری میں کتاب جمع کرانا تھی۔ آنگن میں امّی، پاپا بیٹھے تھے میں کتاب لینے کے لئے بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کم وقت میں اوپر پہنچنے کے لئے بیچ کی ایک ایک سیڑھی چھوڑ رہا ہوں اگر آگے کی دو یا تین سیڑھیاں نہیں ہوں تو کیا میں اسی طرح چھلانگیں بھرتے ہوئے آگے کی تیسری یا چوتھی سیڑھی پر پہنچ جاؤں گا؟ اگر اس کے آگے بھی دو تین سیڑھیاں نہیں ہوں تو —— تو —— تو...؟

یہ سوچتے ہی میرے پاؤں لرزنے لگے۔ پھر ایک دم خیال آیا ——— جیسے اب تک طے کی گئیں سیڑھیاں میرے پیچھے نہیں ہیں۔ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے مجھے خیال ہوا کہ سیڑھیاں نہ میرے آگے ہیں اور نہ میرے پیچھے۔ بس ایک سیڑھی موجود ہے جس پر میرا ایک پاؤں ٹکا ہوا ہے لیکن اگلی سیڑھی جس کے لئے میرا دوسرا پاؤں بڑھا ہوا ہے، ہے ہی نہیں۔ بس ——— یہ سوچتے ہی توازن بگڑ گیا میں لڑکھڑا کر سیڑھیوں پر گر پڑا اور نیچے کی طرف لڑھکنے لگا۔ لیکن اسی وقت مجھے گرد یجیف کا ایک تجربہ یاد آیا۔

گرد یجیف نے ایک گانے کی دھن تیار کی تھی جس پر ناچنے والی منڈلی کو تیز گھومتے ہوئے رقص کرنا تھا۔ جب تک دھن بجتی رہتی ناچ منڈلی ناچتے ہوئے تیز گردش کرتی رہتی اور جیسے ہی گرد یجیف اشارہ کرتا دھن بند ہو جاتی اور ناچ منڈلی ایک دم تھم جاتی۔ خوب مشق کرانے کے بعد گرد یجیف نے لوگوں کے سامنے اسٹیج پر اس رقص کا مظاہرہ کیا۔ موسیقی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ رقص عروج پر پہنچ گیا۔ ناچ منڈلی موسیقی کے زیر و بم میں اتنی غرق ہو گئی کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ ناچتے ناچتے اسٹیج کے بالکل کنارے پہنچ گئی ہے۔ لوگوں کو امید تھی کہ اب موسیقی بند ہونے والی ہے، اب بند ہونے والی ہے لیکن گرد یجیف نے آرکیسٹرا کو بند کرنے کا اشارہ کرنے کی بجائے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ منڈلی کا ایک ایک رقاص اور رقاصہ تیز گردش کرتا ہوا اونچے اسٹیج پر سے نیچے فرش پر آ رہا۔ ناظرین چیختے ہوئے ان کے پاس پہنچے تو حیرت زدہ رہ گئے۔ کسی بھی رقاص یا رقاصہ کو ذرا سی بھی چوٹ نہیں لگی تھی اور گرد یجیف اسٹیج پر کھڑا ہنس رہا تھا۔

سیڑھیوں پر گرتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچا ——— میں فرش پر بچھے قالین پر لوٹیں لگا رہا ہوں اور جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا میں نیچے زمین پر پڑا ہوا ہوں اور امّی، پاپا میرے جسم کے حصّوں کو غور سے ٹٹول رہے ہیں۔ میں کہیں سے بھی زخمی نہیں ہوا تھا۔ پاپا نے پوچھا۔ "بیٹے ——— تیرے لگی تو نہیں؟"

اور میرے منہ سے نکل گیا "گرد یجیف ———"

دوسرے ہی لمحے پاپا نے مجھے مارنا شروع کر دیا "مردود نے اُلٹی سیدھی کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنا دماغ خراب کر لیا ہے اور اب ہمیں بھی پریشان کر رہا ہے۔ سوٗر ——— اب تیرے پاس ایسی کتابیں دیکھیں تو مار مار کر بھرتہ بنا دوں گا!"

میں حیرت سے پاپا کو دیکھتا رہا کہ انہیں کیا ہو گیا ہے؟ انہیں تو مجھ سے پوچھنا چاہئے کہ اتنی بلندی سے لڑھکتے ہوئے گرنے کے بعد بھی تو زخمی کیوں نہیں ہوا؟

اب کیا بتاؤں؟ مجھے تو اس گھر سے وحشت ہونے لگی ہے۔ گھر کے لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ لوگ میرے ہر کام کو شبہ کی نگاہوں سے کیوں دیکھتے ہیں۔ میری باتوں کو دیوانے کی بڑ کیوں قرار دیتے ہیں؟ میں صحیح اور سمجھداری کی بات کہتا ہوں تو یہ کیوں ناراض ہوتے ہیں؟ کیوں غصہ ہوتے ہیں؟ میں اب اس گھر کے لوگوں سے ڈرنے لگا ہوں۔ ان کے پاس بیٹھنے سے گھبرانے لگا ہوں۔ ان سے کچھ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ہر وقت سہما سہما سا رہتا ہوں۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ میں دوسری منزل کے چھجّے پر کھڑا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ جیسے ہی ریلنگ پر لگا ریلنگ نیچے گرنے لگی۔ میں نے جلدی سے اسے پکڑا تو اس کی اینٹ میرے ہاتھ میں آ گئی۔ گھبرا کر امّی، پاپا کو دیکھا جو آنگن میں گھاس پر ٹہل ٹہل کر باتیں کر رہے تھے۔ اب امّی، پاپا سے کیا کہوں؟ وہ مجھ پر چلّائیں گے، ناراض ہوں گے۔ اس میں میرا کیا قصور؟ گھر کی طرف تو انہیں توجہ دینا چاہئے۔ چھت گرنے کو ہے، دیواریں ٹیڑھی ہو رہی ہیں۔ اینٹیں اپنی جگہ چھوڑ رہی ہیں اور امّی، پاپا بے فکر ہیں۔ مجھے دھیان آیا ——— اگر ابھی انہوں نے میرے ہاتھ میں اکھڑی ہوئی اینٹ دیکھ لی تو وہ مجھے ماریں گے۔ جلدی سے میں نے اینٹ کو اس کے مقام پر جمایا اور بھاگ کر اپنے کمرے میں پہنچ کر ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے اس گھر کو تباہی و بربادی سے محفوظ رہنے کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔

لیکن آج تو حد ہو گئی۔ غصّے کے مارے اس وقت میرا بُرا حال ہے۔ جی چاہتا ہے چیخ چیخ کر کہوں۔ ہاں ہاں ——— میں پاگل ہوں، پاگل ہوں۔ مجھے گھر سے نکال دو۔ مجھے پاگل خانے بھیج دو۔ میں بھی اب اس گھر میں رہنا نہیں چاہتا۔ پاگل میں نہیں بلکہ تم سب لوگ ہو۔ تمہیں اپنے گھر پر منڈلا رہی تباہی و بربادی نظر نہیں آ رہی۔

لیکن میری چیخیں ہونٹوں کے بند دروازے سے ٹکرا کر واپس لوٹ رہی ہیں اور دماغ کی چھت کو توڑ رہی ہیں۔ میں خون سے بھرا ہاتھ لئے کھڑا امّی، پاپا کو دیکھ رہا ہوں۔ امّی میری فکر کر کے رو رہی ہیں اور پاپا تشویشناک نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

بات یہ ہوئی کہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں اپنے بستر میں رضائی اوڑھے لیٹا تھا۔ مجھے صبح سے ہی بخار تھا۔ ابھی ایک گھنٹہ قبل پیشاب کے لئے باہر نکلا تھا تو آسمان بالکل صاف تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ واپس آ کر بستر میں لیٹ گیا۔ امّی، پاپا اسی کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے باہر ٹین شیڈ پر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ میں نے منہ پر سے رضائی ہٹائی اور آواز پر دھیان دیا۔ بارش کی آواز غائب۔ میں نے رضائی منہ پر ڈھانک لی۔ تڑ۔ تڑ۔ تڑ ٹین شیڈ پر پانی برسنے کی آواز پھر سنائی دی۔ جلدی سے میں نے منہ پر سے رضائی ہٹائی۔ سامنے کی کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں کو دیکھا، ان میں سے باہر ہلکا اندھیرا نظر آیا۔

"امّی۔ کیا بارش ہو رہی ہے؟"

امّی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر دھیرے سے کہا "نہیں بیٹے نہیں ——"

میں نے رضائی پھر منہ پر ڈال لی لیکن اس بار پھر بارش کی تیز آواز کانوں میں آ گھسی۔ میں نے رضائی ہٹا کر امّی سے کہا "امّی —— پانی برسنے کی یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ دیکھیں تو ——"

"بیٹے سو جاؤ —— پانی نہیں برس رہا ہے"

میں نے اب رضائی نہیں اوڑھی۔ آنکھیں پھاڑے غور سے آوازیں سننے لگا۔ واقعی پانی برسنے کی آواز تھی۔ امّی، پاپا مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اپنے اوپر سے رضائی پھینکی اور پلنگ پر سے اتر گیا۔ جیسے ہی بند دروازہ کھولا، باہر گہرا اندھیرا دکھائی دیا۔ آسمان کی طرف دیکھا دُھلے ہوئے نیلے بادل چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ایک سمت سے سُرخ بادل تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے آسمان پر چھا گئے۔ پھر پانی زوروں سے پورے گھر پر برسنے لگا۔ حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ پانی لال رنگ کا تھا۔ میں آگے بڑھا اور اولتی میں سے گرتے لال پانی کو ہاتھ میں لے لیا۔ میرا ہاتھ لال ہو گیا۔ جیسے یہ پانی نہیں خون ہو۔

میں چیخ اٹھا "امّی، پاپا —— دیکھئے خون کی بارش ہو رہی ہے"

اچانک امّی نے اپنے ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور ہچکیوں سے رونے لگیں "—— اے میرے اللہ —— میرے ننّھے میاں کو کیا ہو گیا ہے؟ کتنا اچھا تھا! کتنا ذہین تھا یہ! ہر کلاس میں پہلی پوزیشن لاتا رہا۔ اب اس کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ بہکی بہکی، پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگا ہے۔ اے میرے معبود —— تو اسے اچھا کر ——"

اور میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے سوچ رہا ہوں —— کون پاگل ہے؟ میں یا اس گھر کے لوگ ——؟ OO

بقیہ مکتوبات صفحہ ۶۲

بول چال میں ہم روزانہ کئی بار میز، کرسی اور کمرہ بولتے ہیں لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ تینوں الفاظ اردو نے اطالوی زبان سے اخذ کئے ہیں۔ میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ کسی بھی زبان کے صرف وہی الفاظ لئے جائیں جو اردو میں رواں دواں ہوں اور جن کو باعتبار تلفظ استعمال کرنے سے اردو تحریر اور عبارت میں زور پیدا ہو کر جان پڑ جائے۔ نارنگ اسالیب کی بات تو کرتے ہیں مگر مقالے کے اندر انگریزی کے دقیق الفاظ (اردو داں حضرات کے لئے)، انگریزی مصنفین کے نام اور ان کی تحریروں کے استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اعصاب پر بھی مغربی ادب اور اس کی علامت پسندی کچھ کم سوار نہیں ہے۔

"اگر آپ شاعر کے خریدار ہیں تو اپنا زرِ سالانہ بروقت ارسال کیجئے۔ اپنے بقایاجات کی ترسیل پر توجہ دیجئے۔"

ارشد عبدالحمید

اک نئی صبح کی منزلوں کے لئے مجھ کو اذنِ سفر دے رہا ہے ابھی
بند کھڑکی کے اکلوتے سوراخ سے روشنی کا جو سکّہ گرا ہے ابھی

گاؤں میں دھوپ پنگھٹ سے ہوتی ہوئی سبز کھیتوں کی وادی تلک آ بھی گئی
اور مرا شہر اخبار تھامے ہوئے چائے کے گھونٹ ہی بھر رہا ہے ابھی

زخم خوردہ اڑانوں کے انجام پر شب کے اندھے سمندر میں کھو جائے گا
مشرقی کوہساروں کی دہلیز سے دھوپ کا جو پرندہ اُڑا ہے ابھی

یوں کھلے عام چاہت کے دیپک نہ رکھ، میرا گھر دوستوں کے محلّے میں ہے
پاک دامن ہے تیری محبّت کی لو اور یہاں غیبتوں کی ہوا ہے ابھی

آرزوؤں کے دالان خاموش ہیں، خواب کے سارے کمرے ہیں سوئے ہوئے
دل کی سونی حویلی میں ارشدؔ مگر یاد کا اک دیا جاگتا ہے ابھی

● جے پور ڈیولپمنٹ اتھارٹی، جے پور (راجستھان)

ہلال فرید

خواہشوں کی کونپلوں کا ماجرا کہتے ہوئے
آج پھر آئی ہوا اک مرثیہ کہتے ہوئے

میرے اپنے لب لگا جیسے میرے اپنے لب نہ ہوں
ہنس رہا ہوں خون کو رنگِ حنا کہتے ہوئے

گھر کہیں پر تیرگی نے روشنی کو ڈس لیا
ہم نے دل کے خوف کو پوجا خدا کہتے ہوئے

میں بھی آخر کب تلک یوں حوصلہ دیتا اسے
اک بلا کے شور کو رقصِ ہوا کہتے ہوئے

میرے اس چہرے کے پیچھے اور اک چہرہ نہ ہو
سوچ لے اک بار مجھ کو باوفا کہتے ہوئے

● بی - ۸ میڈیکل کالونی - اے - ایم - یو - علی گڑھ

شکیل جمالی

یہ سارا شہر اتنا معتبر کیوں لگ رہا ہے
مجھے بن باس لیتے وقت ڈر کیوں لگ رہا ہے

یہ کیسی بے بسی گھر کر گئی ہے میرے دل میں
یہ طائر اس قدر بے بال و پر کیوں لگ رہا ہے

فرشتہ تو یہاں کوئی نہیں ہے دور تک بھی
مجھے اپنے غلط ہونے کا ڈر کیوں لگ رہا ہے

گرفت اس کی مرے بازو پہ اتنی سخت کیوں ہے
مجھے اس سے بچھڑ جانے کا ڈر کیوں لگ رہا ہے

یہ بے ترتیبیاں کس جرم کی پاداش میں ہیں
ثمر میرا پرائی شاخ پر کیوں لگ رہا ہے

● ڈھالی بازار، چاند پور - ۲۴۶۷۲۵ (یوپی)

عالم خورشید

بکھرتے ٹوٹتے لمحوں کی داستاں ہوں میں
ورق ورق مجھے پڑھنا کہ بے زباں ہوں میں

نہ کوئی راستہ میرا نہ کوئی منزل ہے
ندی کی لہر میں پتوں کا کارواں ہوں میں

مری پناہ میں صحراؤں کے مسافر ہیں
سلگتی دھوپ میں برگد کا سائباں ہوں میں

ڈرا رہی ہے مجھے بادلوں کی سرگوشی
گلی میں اونگھتا مٹی کا اک مکاں ہوں میں

بکھیر دے گی مجھے چند ساعتوں میں ہوا
کسی چراغ سے اٹھتا ہوا دھواں ہوں میں

جو جھک کے دیکھو تو پیروں کی دھول ہوں خورشیدؔ
اٹھاؤ سر تو بہت اونچا آسماں ہوں میں

● معرفت ڈائرکٹر آف اکاؤنٹس (بی)
ایکزی بیشن روڈ، پٹنہ (بہار)

مکتوبات

ارشد عبدالحمید ——— جے پور ڈیولپمنٹ اتھارٹی۔ جے پور

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوگیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے سرورق کا ڈیزائن تبدیل نہیں کیا ہے۔ "شاعر" کے سرورق نے ہمیشہ ہی متاثر کیا ہے۔ امید ہے کہ آفسیٹ تکنیک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اور خوبصورت ڈیزائن بھی پیش کریں گے لیکن خدارا سرورق پر تصاویر ہرگز نہ دیجئے گا۔

"جرعات" میں آپ نے "زبان، رسم الخط، ادب اور فن کار" کا موضوع بنایا ہے۔ آپ کا یہ جملہ کہ ... "یہ بدنصیب زبان ہندوستانی سیاست کا دوسرا نام ہوگئی ہے..." حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ مغربی بنگال، بہار اور یوپی کے وزرائے اعلیٰ کے بیانات اس کا روشن ثبوت ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ ... "اگر ہمارے پاس کہنے کے لئے کچھ ہے تو اس کے اظہار میں شدّت کیوں نہیں ہے ....؟" اس ضمن میں میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کا مسئلہ ہے۔ آج کا ادیب ادب کی تخلیق محض اس لئے کر رہا ہے کہ اسے شہرت حاصل کرنی ہے۔ ٹی وی اور ریڈیو پر واہ واہی لوٹنی ہے۔ مشاعروں سے شہرت اور پیسہ کمانا ہے۔ رسائل میں چھپ کر ادبی تاریخ میں اپنا نام درج کروانا ہے۔ مجھے اعتراض یہ نہیں ہے کہ ادیب شہرت اور پیسہ کیوں چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام تک پہنچنے کے لئے اسے ان سبھی MEDIAS کا سہارا لینا ہی پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کی زندگی کے لئے پیسہ بہت اہم ہے۔ لیکن ان MEDIAS کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ادیب کو ادب کے معیار سے ہٹ کر عوام کے معیار پر اتر آنے کو مجبور کر دیتے ہیں اور ادیبوں کا جواب یہ ہوتا ہے کہ پبلک کی ڈیمانڈ ہے صاحب.....!

جہاں تک اظہار میں شدت نہ ہونے کا سوال ہے، جو فن کار ادب کو ادب کے لئے تخلیق نہیں کرتے بلکہ تجربات کے خارزاروں سے گزر کر احساس کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو بلا تکلف تخلیق میں ڈھال لیتے ہیں، ان کے یہاں ہمیں اظہار میں شدت بھی نظر آئے گی۔ سوال یہ ہے کہ ادیب میں تخلیق کے لئے وہ خلوص اور وہ جذبہ تو پیدا ہو جو اس شدت کے لئے اشد ضروری ہے۔

آپ نے صفحہ ملاٹ پر تخلیق کار حضرات کی تصاویر بھی شائع کی ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ان تصاویر کو مجموعی طور پر ایک ہی صفحہ پر شائع نہ کرکے اگر تخلیق کار کی تخلیق کے ساتھ ہی شائع فرمائیں تو میرے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

مولانا حالی اور مرزا غالب کی عکسی تحریریں نایاب ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک (راجستھان) میں ابوالفضل، امیر خسرو، بہادر شاہ ظفر اور دیگر تاریخی شخصیتوں کے قلمی مخطوطات محفوظ ہیں۔ ممکن ہو سکا تو میں ان نادر مخطوطات کے فوٹوگراف آپ کو ارسال کر دوں گا۔

ایک مشورہ اور ..... شاعر کے مضامین اور افسانے اگر آپ پہلے کی مانند ہی دو کالموں میں شائع فرمائیں تو بہتر ہوگا۔ ایک کالمی صفحات کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے۔

حامدی کاشمیری ——— ۲۹۶ - جواہر نگر - سری نگر (کشمیر)

نارنگ صاحب کا مضمون انتہائی زوردار، پُرمغز اور دلچسپ ہے۔ انھوں نے بعض متنازعہ مسائل پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ نارنگ صاحب کی تنقید عام ڈگر سے الگ ہے، وہ لسانیاتی اور ہیئتی بنیادوں پر افسانوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ پیشِ نظر مقالے میں ان کا یہ طریق نقد انتہائی غیر جانبداری اور معروضیت کے ساتھ نمایاں ہے۔ نارنگ صاحب کی بحیثیت ناقد ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں ایک سطر بھی زائد یا غیر ضروری نہیں لکھتے۔ وجودیت والا مضمون بھی معلوماتی ہے۔ منظومات کا معیار بھی اچھا ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ شاعر ظاہری حسن و نفاست ہی کے لحاظ سے اب جاذب نظر نہیں ہے بلکہ مندرجات کے اعتبار سے بھی خوب سے خوب تر ہو رہا ہے۔

نامی انصاری ــــــــــــــ ۹۷/۷۱ پریڈ، کانپور

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ بہت صاف ستھرا اور وقیع ہے۔ اس مرتبہ طباعت کافی بہتر ہے اور امید کہ آئندہ اور بھی بہتر ہوگی۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر کا مضمون "اردو کے ہم صوت حروف" خاصے کی چیز ہے۔ اردو لسانیات سے میری شناسائی ناقابل لحاظ ہے مگر اردو زبان و ادب کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ سحر صاحب نے اس معاملے کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جب انگریزی جیسی کثیرالاستعمال اور ساری دنیا میں بولی جانے والی اردو زبان میں حروف تہجی کی صوتیات میں اتنا گھٹالا ہے مگر اس کے باوجود امریکہ میں کی گئی معمولی ترمیمات کو بھی قبولیت عام نہیں مل سکی تو پھر اردو کے دو صوتی حروف میں ترمیم سے کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے حواشی نمبر ۱۸ میں "بحرحال" لکھا ہے۔ آپ ان کے تحریر کردہ مسودے میں دیکھئے کہ یہ لفظ موصوف نے کس طرح لکھا ہے اور اس کی وضاحت اگلے شمارے میں کر دیجئے تو اچھا ہے گا (مسودے میں "بہرحال" لکھا ہوا ہے، یہ کتابت کی غلطی ہے۔ افتخار)

خانزادہ عبدالواسع خان ــــــــــــــ نانال والا بلڈنگ ۔ ۱۱ میسو تنتر ویریساورکر مارگ ماہم بمبئی

شاعر کے شمارہ نمبر ۶ میں شری گوپی چند نارنگ کا تنقیدی مقالہ "نیا افسانہ: علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر" میرے سامنے ہے۔ مقالے میں زیر بحث مسئلہ تو صرف اتنا ہے کہ آیا اردو عصری افسانہ علامتی کہانی ہے یا تمثیلی۔ لگتا ہے نارنگ کے ذہن پر علم الاساطیر آثار قدیمہ کی طرح ثبت ہے۔ کیوں کہ دھارمک کتھاؤں کا تعلق قدیم ترین ہندوستانی تہذیب سے ہے۔ چنانچہ نارنگ فطری طور پر ان سے بدرجہ اتم متاثر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اساطیر محض سیدھی سادھی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ ایسا انمول سرمایہ اور قیمتی ورثہ ہیں جن میں قدیم ہندوستانی افسانوی ادب کی مہتم بالشان روایات میں استعاراتی تفاعل کے تقاضے مختلف پیرایوں میں کارفرما ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں صدیوں کے انسانی تجربوں کا نچوڑ بھی موجود ہے۔ وہ اساطیر سے علامتی اور تمثیلی مفاہیم پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں اور انہیں ان میں کہانی کا جوہر یعنی افسانے کا مرکزی خیال ملتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عصری اردو افسانہ نگار اساطیر کی قدر و منزلت کو وقت کے دھندلکوں میں کھو بیٹھنے کے سبب ان میں پوشیدہ معنوی خزانوں سے بے بہرہ ہے اور اس ساری کی ساری روایت میں اس کے پاس "خالص علامت" کا کوئی اپنا تصور نہیں ہے جسے اس نے حال ہی میں چند دہائیوں قبل مغربی ادب اور روایات سے لیا ہے اس لئے ایسی اجنبی جنس کے لئے پریشان ہونے اور دہائی دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ان کے یہاں نیا افسانہ علامتی سے زیادہ تمثیلی ہے ــــــ انھوں نے بالخصوص انتظار حسین کے افسانے "نرناری" اور بالعموم سلام بن رزاق کی کہانی "انجام کار" کو اپنی تنقید کی بنیاد بنایا ہے مگر چاہتے ہیں کہ آج کا ہر افسانہ نگار انتظار حسین بنے اور صرف "نرناری" لکھے تاکہ قارئین اساطیر کی عظمت سے واقف ہو سکیں۔

مقالہ پڑھتے ہی نارنگ کے دل کی بات معلوم ہو جاتی ہے۔ ان کی تنقید براہ راست وارث علوی اور سرسری طور پر باقر مہدی کی طرف ہے۔ اگر کوئی انگریزی لکھنے، پڑھنے اور پڑھانے کی وجہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مغربی ادب اور اس کی علامت پسندی کو ترجیح دیتے ہوئے اساطیر کو محض داستانوی کہانیاں کہے اور آج کے افسانہ نگار کو تمثیل رد کرنے پر زور دے تو نارنگ کو انہی کے الفاظ میں "پریشان ہونے اور دہائی دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے"۔ یہ کچھ ایسی ہی بات ہو جائے گی کہ دور حاضر میں جب کہ انسان چاند اور دیگر سیاروں پر جانے کے لئے بے چین ہے کوئی یہ کہے کہ جٹ اور ہوائی جہاز کے سفر میں کیا دھرا ہے۔ پیدل چلو یا زیادہ سے زیادہ کسی جانور یا بیل گاڑی پر سوار ہو کر سفر کرلو۔ مختصر افسانے بھی تو انگریزی روایات کی دین ہیں۔ جدید افسانہ نگار اور قاری کے پاس اس مشینی، برق رفتار اور آلام و مصائب کی دلدل میں دھنسی ہوئی مشکل زندگی کے دور میں اتنا وقت کہاں کہ وہ اساطیر کی گنجلک جھاڑیوں میں الجھی ہوئی داستانوی کہانیوں میں مغز پاشی کرے۔ یہ تو اگلے آسودہ وقتوں کے آسودہ دماغوں کی غذا اور تضیع اوقات و تفریح طبع کا بہترین ذریعہ تھیں۔ آج غم روزگار کے چکر میں مبتلا پریشان دماغ عصر حاضر کی مختصر کہانیوں میں زندگی کے مسائل کا حل پاکر محظوظ اور مطمئن ہوتا ہے۔ جوں جوں زندگی کے مسائل بڑھتے اور الجھتے گئے انسان مصروف تر ہوتا گیا۔ وقت کی کمی بڑھتی گئی داستانیں ناولوں میں اور ناول مختصر کہانیوں میں بدل گئے۔ جدید افسانہ نگاروں کو ادب برائے حیات اور ادب برائے ملک و قوم کی تخلیق پر مجبور ہونا پڑا۔ کچھ ایسی ہی روایات پر مبنی سلام بن رزاق کی کہانی "بجوکا" کو وارث علوی عصر حاضر کے افسانہ نگاروں کے لئے مشعل راہ قرار دیتے ہیں۔ اسے وہ علامتی کہانی کہتے ہیں اور تمثیلی کہانی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے یہاں علامت نگاری میں حقیقت نگاری کا راز پوشیدہ ہے کیونکہ اساطیر محض داستانوی

کہانیاں ہیں جن میں علامت نگاری کا فقدان ہے ۔ لغت میں بھی اساطیر کو خرافات ، خیالی ، فرضی اور دیو مالا کہا گیا ہے ۔ ایسی صورت میں افسانہ نگار کے لئے اساطیر میں زندگی کی سچائی اور حقیقت تلاش کرنا کار دارد ہے ۔

تنقید کو حرفِ آخر یا فتوے کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ۔ ایک دوسرے کے خیالات کبھی کبھار ہی بڑی مشکل سے مل پاتے ہیں کیونکہ اختلافِ رائے فطرتِ آدم ہے ۔ پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا ۔ سچ پوچھئے تو سارا عالم آئینہ ہے ۔ افسانہ نگار کا بنیادی فرض یہ بنتا ہے کہ زندگی کو آئینۂ عالم میں جس صورت میں دیکھے ہو بہو اسی شکل میں عوام کے سامنے اس کی عکاسی کر دے ۔ میرے خیال میں عصری اردو افسانے کو نئی سمتیں دینے اور بہت سے الجھے ہوئے سوالات کا حل نکالنے کی بجائے نارنگ اپنے مقالے میں وارث علوی پر براہِ راست تنقید کی کلی کھینچنے اور سرسری طور پر باقر مہدی کو بھی کانٹوں میں گھسیٹنے میں زیادہ مصروف نظر آ رہے ہیں ۔

گو نارنگ مغربی ادب اور اس کی علامت پسندی سے گریزاں ہیں لیکن اپنے مقالے کو مستند بنانے میں انگریزی مصنفین کی جو تحریریں پیش کی ہیں وہ بھی تو آخر مغربی مختصر کہانیوں سے متعلق ہیں ۔ تحریریں انگریزی میں پیش کر دی ہیں ۔ ان کا ترجمہ دینا چاہئے تھا ۔ مقالے میں کم و بیش ۴۲ الفاظ انگریزی ہجے کے ساتھ استعمال کئے ہیں جن میں کچھ کو تو بار بار دہرایا گیا ہے ۔ ان کی جگہ بہ آسانی اردو کے ہم معنی الفاظ فراہم کئے جاسکتے تھے ۔ تقریباً ۱۰ انگریزی الفاظ باعتبار تلفظ اردو رسم الخط میں بھی استعمال کئے ہیں ۔ ان کی جگہ بھی اردو کے ہم معنی الفاظ مل سکتے تھے ۔ انگریزی اسمہائے خاص ، الفاظ اور تحریروں کا بکثرت استعمال اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ نارنگ نے یہ مقالہ وارث علوی ، باقر مہدی اور کسی حد تک گنے چنے انگریزی داں قارئین کے لئے لکھا ہے ۔ بے چارہ صرف اردو داں افسانہ نگار اور قاری لغت لے کر انگریزی الفاظ کے معنی تلاش کرنے سے تو رہا ۔ ہمارے یہاں صرف اردو داں افسانہ نگار بھی ہیں اور قارئین میں تو بلاشبہ اکثریت اردو جاننے والوں کی ہے کچھ بھی لکھنے سے قبل اکثریت کا خیال و لحاظ لازمی ہے ۔ بیسں ٹونک کی مثال پیش کرتا ہوں ۔ وہ بہت اچھے شاعر ہیں مگر ان پڑھ ۔ گھر پر یا سر راہ اگر شعر ہو جاتا تو فوراً پنسل کاغذ (جسے وہ ہمیشہ پاس رکھتے تھے) اسی وقت جو بھی اردو لکھنے والا مل جاتا اس کے سامنے بڑھا کر کہتے ۔ پیارے ! (ٹونک میں ایک دوسرے کو پیارے کہہ کر پکارنے کا رواج ہے) شعر ہو گیا ہے ۔ لکھ کر دینے کی زحمت گوارا کریں ۔ اسم خاص یا ایسے انگریزی الفاظ جنھیں اردو نے اپنا لیا ہے انگریزی میں ہجے کے ساتھ یا باعتبار تلفظ اردو رسم الخط میں لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ جیسے نارنگ نے مغربی مصنفین   وغیرہ یا انگریزی رسالے
کے نام انگریزی میں ہجے کے ساتھ لکھ دئے ہیں ۔ بہتر ہوتا اگر پہلے وہ باعتبار تلفظ انھیں اردو رسم الخط میں لکھتے اور ساتھ میں ہجے کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھ دیتے ۔ اردو داں قارئین کو اس سے سہولت ہو جاتی ۔ دقیق اور مشکل الفاظ ہجے کے ساتھ انگریزی میں لکھنا مناسب نہیں ہے جو نارنگ نے اپنے مقالے میں کیا ہے ۔ کچھ ایسے انگریزی الفاظ ہجے کے ساتھ پیش کر رہا ہوں جنہیں اردو نے اپنا لیا ہے جیسے وہ اسی کا ایک حصہ بن گئے ہیں ۔ اور اردو مصنفین باعتبار تلفظ بلا پس و پیش انھیں صرف اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں جنہیں صرف اردو داں حضرات بھی خوب جانتے اور سمجھتے ہیں بلکہ اس طرح لکھنے سے تحریر میں خاصہ زور پیدا ہو جاتا ہے ۔ ذیل میں چند انگریزی الفاظ مشتے نمونہ از خروارے باعتبار تلفظ پیش کر رہا ہوں ۔

اسمبلی ، بم ، بس ، کالج ، بریکٹ ، کلچر ، کامیڈی ، سنیما ، کار ، کورٹ ، کمپیوٹر ، کارپوریٹر ، کارپوریشن ، کونسلر ، چانسلر ، چیرمین ، ڈگری ، ڈاکٹر ، ڈائرکٹر ، ڈرائیور ، ڈاکرانٹ ، انجنیر ، فیملی ، فرنیچر ، فلم ، فوٹو گرافر ، فوٹو ، گلاس ، انٹیگریٹی ، انٹرنیشنل ، جج ، ججمنٹ ، لکچرار ، لٹریچر ، لیڈی ، ماسٹر ، موٹر ، ممبر ، میڈم ، میڈیسین ، مشین ، مجسٹریٹ ، نوٹ ، نیشنل ، پرفیسر ، پی ۔ ایچ ۔ ڈی ، پلین ، پارلیمنٹ ، پٹرول ، پلیٹ فارم ، پروڈیوسر ، پیراگراف ، رجسٹرار ، ریڈر ، ریسٹورنٹ ، سگنل ، اسٹیشن ، اسکول ، سوری ، سکریٹری ، شپ ، ٹیچر ، ٹیلر ، ٹرائل ، ٹیسٹ ، ٹریجڈی ، تھیسس ، ٹرین ، ٹکنک ، ٹکنالوجی ، یونیورسٹی ، تھیٹر ، وار ، رائٹر ۔ اسی قبیل کے مزید بے شمار الفاظ ہیں جو اردو میں رائج ہیں اور عام فہم ہیں ۔

صرف انگریزی ہی نہیں اردو نے یہ احسان تقریباً دنیا کی ہر زبان پر ان کے الفاظ اپنے اندر سمو کر کیا ہے ۔ مثلاً روز مرہ کی عام

[باقی صفحہ ۵۸ پر دیکھئے]

رفتار ــــــــ علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

کتب و رسائل

● **گھاس میں تتلیاں** ہندو پاک کے مشہور و معتبر نقاد اور شاعر وزیر آغا کا ایک اور خوب صورت شعری مجموعہ جس میں ۲۹ غزلیں ۷۱ نظمیں اور ۳ طویل نظمیں شامل ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ مصور موجد کے بامعنی خوبصورت سرورق کے ساتھ یہ شعری مجموعہ قدم قدم شعری نور کے دائرے میں اپنے قاری کو لئے چلتا ہے۔ صفحات ۱۳۶۔ قیمت ۳۰ روپے۔ پتہ: مکتبہ فکر و خیال، ۲ ۱۷۔ ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور (پاکستان)

● **نوائے عصر** (دوماہی) شاہ پور، ضلع گلبرگہ (کرناٹک) سے شائع ہونے والا ایک نیا ادبی جریدہ جس کے کئی شمارے اب تک شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ مدیر۔ انیس صدیقی۔ پتہ محلہ عادل پور، شاہ پور ۵۸۵۲۲۳ گلبرگہ (کرناٹک)

● **جواز** (ماہنامہ) اردو کا مشہور ادبی ماہنامہ جواز کا تازہ ترین شمارہ ایک ضخیم خاص نمبر ہے جس میں شعر و ادب کے متعلق معیاری مواد کی سماتی نے اسے ۱۹۸۵ء کی گراں قدر ادبی دستاویز بنا دیا ہے ۴۷۶ صفحات کے اس خصوصی شمارے میں ۱۷ اہم مقالات (جس میں ۴۷ صفحات پر محیط وارث علوی کا "بحث انگیز مضمون" فکشن کی تنقید کا المیہ بھی شامل ہے) ۵۶ مشاہیر شعراء کی نظمیں، غزلیں، ۶ تراجم ۲۰ افسانے ۴ ڈرامے محاسبہ کے تحت ۱۲ اہم کتابوں پر طویل و مختصر تبصرے۔ باز دید، کم و بیش، خبرنامہ، آخری صفحہ۔ عصری ادب کے اس رفتار پیما کی قیمت ۴۰ روپے ہے۔ مدیر سید عارف، معاون الورث ط پتہ، مدیر جواز، ایم اے روڈ، نیا پورہ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ (مہاراشٹر)

● **اسلوب** (ماہنامہ) مشفق خواجہ کی زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ اسلوب کا تازہ ضخیم شمارہ خصوصی تخلیقی ادب ۴ ہے۔ ۵۲۸ صفحات میں اردو اور غیر ملکی زبانوں کا معیاری ادب پیش کیا گیا ہے۔ جمیل الدین عالی کا منظوم ڈراما، ۱۲ معیاری افسانے، ۱۶ شعراء کی نظمیں غزلیں، ہرمن ہیسے، جیلانی بانو اور یگانہ پر گوشے، ۲۹ صفحات پر مشتمل، ساقی فاروقی کی نئی نظمیں غزلیں اور دو اہم مضامین۔ مشاہیر نقاد کے ۴ فکر انگیز مقالے۔ عالمی ادب کے تحت مایاکوفسکی اور ولیم کوپر کی تخلیقات۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے تین مضامین ناول پر جس کا ترجمہ مظفر علی سید نے کیا ہے۔ اور آخر میں محمد حسن عسکری بنام آفتاب احمد کے تحت ۸۷ طویل و مختصر خطوط اور ان دو حضرات کے "ادب کی موت کا اعلان" اور "ادب کی موت" پر دو مضامین دیے گئے ہیں اس خاص نمبر کی قیمت ۶۰ روپے ہے۔ پتہ: ماہنامہ اسلوب ۳ ڈی ۹/۱۴ ناظم آباد کراچی ۷ (پاکستان)

● **خواب کا در بند ہے**۔ نئی شاعری کے معتبر شاعر شہریار کا چوتھا شعری مجموعہ "خواب کا در بند ہے" شائع ہو گیا ہے۔ ۱۹۸۵ء کی ایک معیاری کتاب جو عصری اردو شاعری کا منظرنامہ بھی ہے۔ دیدہ زیب سرورق، صفحات ایک سو چالیس۔ قیمت پچاس روپے۔ تقسیم کار ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڈھ۔

● **سحر نما**۔ چار دہائیوں کے شعری مزاج اور فکری رویوں کی شناخت۔ معروف شاعر عشرت قادری کا نیا مجموعہ کلام سحر نما جسے مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی نے نہایت نفاست کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شائع کیا ہے۔ ڈیمائی سائز ۱۱۲ صفحات قیمت ۱۵ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مرکز ادب، ایم ایل بی کالج روڈ۔ بھوپال ۱۱

● **لمحہ لمحہ جاگی رات**۔ انحراف اور حرف مکرر کے بعد مشہور شاعر یعقوب راہی کا منتخب شعری سفرنامہ "لمحہ لمحہ جاگی رات" شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۲۵ روپے۔ ملنے کے پتے۔ مکتبہ جامعہ لیمٹیڈ؛ پرنس بلڈنگ بمبئی نمبر ۸، ۱۲-۴۰-۱ بھوانی نگر، مرولی، بمبئی ۵۹۔

● **تھکا ہوا دن** ۔ اردو افسانے کی ایک معتبر آواز الیاس احمد گدی کے افسانوں کا نیا مجموعہ "تھکا ہوا دن" جلد شائع ہو رہا ہے ۔
پتہ :۔ صبا پبلی شرز ، جھریا ، (بہار)

● **الف سے قطب مینار** ۔ بلا عنوان کے بعد شیخ رحمٰن اکولوی "الف سے قطب مینار" منظرعام پر آگیا ہے ۔ صفحات ۱۲۴ ۔
قیمت : دس روپے ۔ پتہ : جاوید عزیزی نیوز پیپر ایجنٹ ۔ پھلواری گلی ۔ آکولہ ۔ [مہاراشٹرا]

● **افکار** [فیض نمبر] ماہنامہ "افکار" کراچی (پاکستان) کا نیا شمارہ "یادِ فیض" ۴۸۰ صفحات میں ایک جامع خصوصی شمارہ جس میں فیض کے مستند حالات ، فیض کے اعزازات اور ان پر تحقیقی کام ، تین غیر مطبوعہ آٹوگراف ، بیروت سے آخری خط ، یادگار قلمی تحریریں ۔ غیر مطبوعہ نادر و نایاب تصویریں ۔ غزلیں ، نظمیں ، منتخب اشعار ، انٹرویوز ، تحریروں کے عکس وغیرہ ۔ قیمت : دس روپے ۔ مدیر : صہبا لکھنوی ۔ پتہ : مکتبہ افکار ، رابسن روڈ ، کراچی [پاکستان]

○ **پٹنہ** ۲۲ / اکتوبر ۱۹۸۵ء ۔ تاریخ تحریک آزادی کے لیے ایک نادر تحفہ ، وہابی تحریک پر ایک نادر مسودہ کی اشاعت ۔ (شائع کردہ کلاسیکل پبلیشنگ کمپنی (نئی دہلی) نادم بلخی صاحب [ڈاکٹر حسن گنج] کے توسط سے خدا بخش لائبریری میں اس نادر مسودے کا اضافہ ہوا ہے ۔ یہ مسودہ مشہور مورخ فصیح الدین بلخی مرحوم کی تصنیف ہے ۔ بلخی مرحوم تاریخ مگدھ اور کئی دوسری درجن بھر کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ان کی وفات ۱۹۶۲ء میں ہوئی ۔ بلخی مرحوم کا وہابی تحریک پر یہ کام آزادی کے کچھ ہی دنوں بعد مکمل ہو گیا تھا ۔ لیکن ان کی زندگی میں اس مسودے کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی تھی ۔ امید کہ وہابی تحریک پر کام کرنے والوں کے لیے اس کتاب سے بہت قیمتی مواد ملے گا ۔

○ **بھاشا وبھاگ** ۔ [محکمۂ السنہ] پنجاب سرکار کی طرف سے " پنجاب کے اردو نثر نگار " عنوان کے تحت ایک جامع و مفصل کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔ اس کی اشاعت اردو زبان میں ہوگی ۔ اور بعد ازاں اس کی ہندی ، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں تراجم شائع کرنے کا بھی پروگرام ہے ۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک اہم دستاویز ہوگی ۔ پنجاب سرکار کی طرف سے اس کتاب کی تیاری کی تمام تر ذمہ داری اردو کے معروف قلم کار ڈاکٹر کیول دھیر کو سونپی گئی ہے ۔ اس کتاب میں اردو زبان کے ان تمام نثر نگاروں کو جمع کیا جائے گا جو بھارت یا غیر ممالک میں کہیں بھی قیام پذیر ہیں یا تھے ۔ لیکن جن کا تعلق سرزمینِ پنجاب سے ہے ۔ اس کتاب میں قلم کاروں کے حالاتِ زندگی ، تصاویر ، ادبی خدمات ، تخلیقات کی مکمل تفصیل اور ان کے فن و شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا جائے گا ۔ پنجاب کے نئے اردو قلم کاروں کو بھی اس میں مناسب نمائندگی دی جائے گی ۔ اردو ادب میں نثر کے کسی بھی شعبے سے [افسانہ ، ناول ، ڈراما ، انشائیہ ، تحقیق و تنقید] تعلق رکھنے والے پنجاب کے اردو نثر نگاروں سے گذارش ہے کہ وہ اپنے بارے میں مکمل تفصیلات فراہم کریں ۔ پتہ :۔ ڈاکٹر کیول دھیر ۔ ۲۰ ۔ چشمہ پارک ، ماڈل گرام ، لدھیانہ [پنجاب]

○ بزمِ احباب دہلی اور دوسری انجمنوں کے زیر اہتمام عمان میں ہندستان کے سفیر جناب آئی اے سجاد کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا ۔ سجاد نے اپنی تقریر میں بتایا کہ عمان میں اردو مشاعرے اور بیت بازی بے حد مقبول ہیں ۔ ہندستانیوں اور پاکستانیوں کے علاوہ خود عمان کے باشندے بھی کاروبار میں اردو کا استعمال کرتے ہیں ۔ سجاد صاحب نے عمان کی اقتصادی ، سماجی اور تنظیمی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی ۔

○ ۲۶ / اکتوبر ۱۹۸۵ء کو نیو ایرا ایجوکیشن سوسائٹی اندھیری (بمبئی) کے زیر اہتمام انجمن خیر الاسلام ہال مدن پورہ بمبئی ۸ میں بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کی خصوصی نشست سے خطاب کرتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت میں جناب ریاض احمد خان نے مسرت کا اظہار کیا کہ بچوں کے ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ٹھوس قدم اٹھایا گیا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے چند اخبارات و رسائل قابل مبارک باد ہیں جو بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو بچوں تک پہنچا رہے ہیں ۔ اپنی افتتاحی تقریر میں جناب عبداللہ کمال نے کہا کہ بچے ملک و قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں مستقبل کا دار و مدار بھی بچوں پر ہوتا ہے ۔ لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت اور ان کے مطالعے کے لئے بہترین ادب ضروری ہے ۔"

● پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر نعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دہلی سے شائع کیا ●

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

بہ یادگار اعجاز صدیقی (مرحوم)

اشاعت کا ۵۶واں سال

علمی، ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ۵۶ شمارہ ۱۱

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زر سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالک غیر سے
۴۰ روپے	۱۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

قیمت ۳ روپے

فون: ۳۵۹۹۰۴

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس

بمبئی - ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۶

بمبئی - ۴۰۰۰۰۸

کتابیں ہی کتابیں

نیشنل بک ٹرسٹ نے انگریزی اور ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری بڑی زبانوں میں اہم اور معلوماتی موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ مشترکہ ادب کی اشاعت بھی کی ہے۔ ٹرسٹ کی مطبوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ٹرسٹ کے اشاعتی پروگرام میں بچوں کے ادب کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یقیناً ہر قاری کے لئے ٹرسٹ کی مطبوعات میں اس کی پسند کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ اُردو کی مطبوعات میں سے چند درج ذیل ہیں۔ ٹرسٹ کی کتابیں ملک بھر میں اُردو کے تمام کتب فروشوں، پبلی کیشنز ڈویژن کے اسٹالوں اور این بی ٹی بک شاپس سے مل سکتی ہیں۔

کتاب	مصنف / مرتب	مترجم	قیمت
عوامی ترسیل	از: آر۔ کے۔ جوشی	مترجم عرفان صدیقی	قیمت ۲۵—۱۹ روپے
آپ اور آپ کی غذا	از: کے۔ ٹی۔ اچایا	″ من موہن تلخ	″ ۲۵—۱۴ روپے
آدرش ہندو ہوٹل	از: بھبھوتی بھوشن بندوپادھیائے	″ اشرف عابدی	″ ۲۵—۱۹ روپے
درد کے رشتے	از: میرجی انارائے	″ بلراج ورما	″ ۰۰—۲۰ روپے
عصری ملیالم کہانیاں	مرتب: ایم۔ مکندن	″ عبدالحق	″ ۵۰—۱۸ روپے
اُردو افسانے	مرتب: رضیہ سجاد ظہیر	(نیا ایڈیشن)	″ ۰۰—۱۱ روپے
اُردو طباعت و اشاعت کے مسائل	مرتب: انور کمال حسینی		″ ۰۰—۷ روپے
آزادی کی چھاؤں میں	از: بیگم انیس قدوائی		″ ۵۰—۱۳ روپے
پریم چند کے مختصر افسانے	مرتب: رادھا کرشن (نیا ایڈیشن)		″ ۵۰—۱۸ روپے
امیر خسرو	از: غلام سمنانی		″ ۷۵—۹ روپے
ٹیپو سلطان	از: بی شیخ علی	مترجم: ظفر احمد نظامی	″ ۵۰—۸ روپے

بچوں کے لئے

کتاب	مصنف	مترجم	قیمت
ہم ہندوستانی	از: مہروجے واڈیا	مترجم: ایس۔ اے۔ رحمٰن	۵۰—۲ روپے
منیا نے پایا سونا	از: جگدیش جوشی	″	۵۰—۲ روپے
چھوٹی سی ایک لہر	از: ایس۔ چندراورکر	″	۵۰—۲ روپے
کتابوں کی انوکھی دنیا	از: سیموئل اسرائیل	مترجم: سید احسان الرحمٰن	۵۰—۲ روپے
دمدار کہانی	از: ایم۔ سی۔ گیبریل	″ انیس مرزا	۵۰—۲ روپے
مہابھارت	از: کے۔ کٹمب راؤ	″ تعظیم احمد	۵۰—۲ روپے
جنگل میں تالاب	از: اوما آنند	″ عابدہ بیگم	۵۰—۲ روپے
جانوروں کے ایک نگہبان کی مہیں	از: ای۔ آر۔ سی۔ داودیدار	″ امر سنگھ	۵۰—۲ روپے
عقلمند اور چالاک	از: کلا ٹھیرانی	″ صادقہ ذکی	۵۰—۲ روپے
کائناتی تحفہ	از: موہن سندر راجن	″ خالدہ ناہید	۵۰—۲ روپے
گلی محلے کے کھیل	از: ملک راج آنند	″ اوما گپتا	۵۰—۲ روپے
بس کی سیر	از: دلی کن نن	″ ایس۔ اے۔ رحمٰن	۵۰—۲ روپے
یہ دنیا پیاری پیاری	از: جینتی منوکرن	″ اُردو تحریر: سعدیہ رحمٰن	۵۰—۲ روپے
دس کہانیاں	مرتب: سراج انور		۰۰—۴ روپے
بھارت کے بہادر بچے	از: سگرن سریواستوا	مترجم: سعید الرحمٰن	۵۰—۲ روپے
عیدگاہ (نیا ایڈیشن)	از: پریم چند		۵۰—۲ روپے
گوتم بدھ	از: نیلا جارج	مترجم: سید ضمیر حسن	۵۰—۲ روپے

زیر طبع

کتاب	مصنف / مرتب	مترجم
منتخب قومی شاعری	مرتب: سردار جعفری	
پنجاب ادب اور ثقافت	از: ایس۔ ایس۔ بیدی	مترجم: اسلم پرویز
آوارہ مسیحا	از: وشنو پربھاکر	″ راشد سہسوانی
تاریکیاں	از: بھیشم ساہنی	″ شہلا نقوی
سکھ دھرم اور سیکولرزم	از: کرتار سنگھ دگل	″ زبیدہ عان

فہرستِ کتب اور دیگر تاجرانہ معلومات کے لئے لکھیں

ڈائریکٹر، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا (شعبہ سیلز اینڈ مارکیٹنگ)، اے ۵، گرین پارک، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

جرعات

دُوسرا سِرا کوئی نہیں

سوال یہ ہے کہ ادب کیا ہوتا ہے؟ ادب سے وابستہ لوگ کیا ہوتے ہیں؟ وہ ادب کیوں تخلیق کرتے ہیں؟ وہ ادب کے ذریعے دنیا کو کیا دینا چاہتے ہیں۔ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ ان کی سوچ کا دائرہ کتنا وسیع ہوتا ہے۔ ان کی خاموشی، ان کی گفتگو اور الفاظ، ان میں کوئی ربط ہوتا ہے کہ نہیں؟ اگر زندگی کی افہام و تفہیم ان کا مقصد ہے تو پھر عملی سطح پر اس تفہیم سے ان کا کتنا تعلق ہے؟

سوال یہ ہے کہ آج کا ادب زندگی سے کتنا قریب ہے۔ ردّ و قبول کی کشمکش سے اس ادب کا کتنا تعلق ہے؟ یا تضادات کو متنوع پیکر دینے میں ادب کہاں تک کامیاب ہے۔ ادب اور ادیب کے درمیان تناسب و توازن باقی ہے یا پھر ان کے درمیان کوئی فاصلہ آگیا ہے۔ ادب اور قاری کے درمیان جو مضبوط رشتہ ہوتا ہے وہ بکھر رہا ہے یا مضبوط تر ہو رہا ہے۔

سوال یہ بھی ہے کہ اردو زبان کے جو مسائل ہیں اسی کے تناظر میں ادب بھی تخلیق ہو رہا ہے تو کیا اردو میں اب کوئی بڑا ادب تخلیق نہیں ہو رہا ہے؟ کیا ادب اور ادیب کے سارے مسائل زبان سے جڑے ہوتے ہیں؟ تب پھر معاملہ بے حد الجھا ہوا ہے اور اس الجھاؤ کا دوسرا سِرا کوئی نہیں۔ بات زبان کی اس کے ادب اور ادیب کی ہے لیکن اس مثلث میں قاری نہیں ہے۔ قاری تو اب تماشائی کی صف میں بھی نہیں رہا۔ یہاں ایک مسئلہ یہ بھی تو ہے کہ اردو کا معاملہ ہندوستان کی تمام بڑی علاقائی زبانوں سے مختلف ہے۔ اگر کسی علاقائی زبان میں کوئی ادبی رسالہ شائع ہوتا ہے، اخبار شائع ہوتا ہے یا کوئی کتاب بازار میں آتی ہے تو اس کا بے پناہ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اپنی زبان اور اس میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل اور کتابوں کی پذیرائی کا عمل اردو زبان سے قطعی مختلف نوعیت کا ہے۔ ایک علاقہ اور اس کی رابطے کی اپنی زبان میں ادب اور ادیب کے مسائل وہ نہیں ہوں گے جو اردو والوں کے ہیں۔ اردو والوں کو اپنی زبان کے علاوہ علاقائی زبان، انگریزی اور ہندی سے بھی رشتہ قائم کرنا ہوتا ہے لیکن کسی بڑی علاقائی زبان بولنے والے کے ساتھ یہ مسئلہ ہو بھی سکتا ہے تو وہ اتنا اہم نہیں ہوگا۔ لیکن اردو زبان تو ہر محاذ پر اپنے مسائل میں بکھر رہی ہے۔ اس کے ادبا، شعرا اور قلم کاروں نے محض ادب کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے کہ انہیں صرف اور صرف ادب ہی تخلیق کرنا ہے چاہے قارئین موجود ہوں یا نہ ہوں، زبان باقی رہے یا نہ رہے۔ کسی بھی بڑی زبان کے فروغ و استحکام میں بنیادی امر تعلیم اور پھر ذریعہ معاش ہے تاہم ہندوستان کے کئی بڑے صوبے اردو زبان کے لئے ناسازگار ماحول بناتے ہوتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں خود اردو والوں کا کردار کیا ہے؟

لیکن یہ سارے بنیادی مسائل فی الحال تو پس منظر بن گئے ہیں اور پیش منظر میں ادیب اور ادب کے علاوہ کچھ نہیں، مشاعرے، سیمینار، انعامات، مالی تعاون کے سلسلے۔ سنجیدہ ادب پڑھنے والے قارئین تو کم سے کم ہیں خود ادب کا کاروبار کرنے والے کب اپنے ادبی رسائل اور اپنی زبان کی اہم کتابیں پڑھتے ہیں؟ ہمارے بہت سے معروف ترین ادبا و شعرا کو اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ وہ کچھ پڑھیں اور یہ معاملہ ایک طرح سے صحیح بھی ہے کہ جب بغیر پڑھے شہرتیں اور عزتیں مل جاتی ہیں تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ضرورت اور وقت کے تال میل سے کوئی تعمیری بات بنتی ہے لیکن جب ضرورت اور وقت کی سمتیں الگ الگ ہو جائیں تو صورتِ حال قطعی دوسری ہو گی اور اردو زبان اور اس کا ادب قطعی دوسری صورتِ حال میں ہانپ رہے ہیں۔ اردو کے سارے اہم لوگ مختلف آستانے سجائے ہوتے معروف ہیں۔ کام ایک ہی ہے لیکن عمل کی صورتیں مختلف ہیں۔

مختصر لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی ساری سرگرمیاں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شعبۂ اردو اور اردو اکاڈمیوں کے گھر آنگن تک سمٹ گئی ہیں۔

۸۶

گرام سدھار

کسان کا بھجن — صبح کی دعا

اے صبح کی چمکانے والے بھگوان مجھے بھی چمکا دے | دے جوت مجھے بھی سورج کی اور سارے بن میں پھیلا دے
تو داتا ہے دونوں جگ کا مختار ہے تو داتا ہے تو | میں اپنے گھر خوش خوش جاؤں اے دینے والے اتنا دے
دھرتی تیری آکاش ترا کھیت ترے میدان ترا | گر حکم نہ ہو داتا تیرا یہ مٹی مجھ کو پھل کیا دے
میں بے بس ہوں میں بیکس ہوں میں کچھ بھی نہیں تو سب کچھ ہے | رکھ لاج مری لاچاری کی بادل مایا کے برسا دے

تو مور چکور کو دیتا ہے پنچھی اور ڈھور کو دیتا ہے
تو ہر کمزور کو دیتا ہے مجھ کو بھی دیا میں حصہ دے

ग्राम-सुधार

सुबह की दुआ — किसान का भजन

ऐ ? सुबह के चमकाने वाले 'भगवान' मुझे भी चमका दे।
दे जोत मुझे भी सूरज की और सारे बन में फैला दे॥
तू दाता है दोनों जग का मुख्तार है तू, दाता रहे तू।
मैं अपने घर खुश खुश जाऊं, ऐ! देने वाले इतना दे॥
धरती तेरी, आकाश तेरा, यह खेत तेरे मैदान तेरा।
गर हुक्म न हो दाता तेरा यह मिट्टी मुझको फल क्या दे॥
मैं बेबस हूं, मैं बेकस हूं, मैं कुछ भी नहीं तू सब कुछ है।
रख लाज मेरी लाचारी की, बादल माया के बरसा दे॥
तू मोर चकोर को देता है, पंछी और ढोर को देता है।
तू हर कमज़ोर को देता है, मुझको भी दया में हिस्सा दे॥

سیماب اکبرآبادی کی ایک نایاب تصنیف بن بنسی (گیت گرام سدھار) کے صفحے کا یہ ایک عکس ہے۔ یہ کتاب ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں کل دس گیت شامل ہیں۔ گیتوں کا یہ مجموعہ ترقی دیہات کے موضوع پر عام فہم زبان میں ہے۔ اس میں جو گیت شامل ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں: کسان کا کھیتی، رہائش کا طریقہ، مویشی، گرام سدھار، زراعت و تجارت، ورزش، علم اور گیان، شام کا گیت (کسان کی پرارتھنا)۔ اس کتاب کو سید نثار حسین زیدی ڈپٹی کلکٹر ڈیولپمنٹ آفیسر ضلع ایٹہ نے ڈسٹرکٹ گزٹ پریس ایٹہ میں چھپوا کر شائع کیا۔ اپنے موضوع پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے۔

چہرہ چہرہ یاد ہیں

چیکوسلواکیہ اور ہندوستانی ادیبوں کا ایک اجتماع منعقدہ لا بیلا ہوٹل (بمبئی) ۱۹۶۶ء کی دو یادگار تصویریں۔ پہلی تصویر میں راجندر سنگھ بیدی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے۔ دوسری تصویر میں جو چہرے نمایاں ہیں ان میں دائیں قطار میں عصمت چغتائی اور بائیں قطار میں کرشن چندر، باقر مہدی اور اعجاز صدیقی کو دیکھا جا سکتا ہے۔

گفتار چو حق ہو، مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود، دار می شود

جنابِ والا نے، "جدید ادب" کے نام سے، ایک معیاری جریدے کا اجرا کیا ہے، مبارک ہو۔

آپ کی یاد آوری کے شکریے کے بعد، عرض ہے کہ "جدید ادب" کے لیے، میں اپنا جدید کلام پیش نہیں کر سکوں گا۔

خوف اس بات کا ہے کہ اگر میں ایسا کروں گا تو آپ کو بھی عذاب میں گرفتار کر دوں گا، اور آپ کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس لیے کہ حق گوئی اس قدر تلخ ہوتی ہے کہ آج کل کا پاکستان اسے برداشت نہیں کر سکے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آپ کا جریدہ ناگہاں بند ہو جائے گا اور مجھ کو سولی پر چڑھا دیا جاوے گا۔

مجھے امید ہے کہ آپ اگر اپنے اور میرے، دونوں کے خیر خواہ ہیں، تو میرے اس جواب سے ناخوش نہیں ہوں گے۔

مخلص
جوش

(۵۱ سی) ای ۶/۳ - ایسٹ (۶۱) اسلام آباد
۹/۸/۸۱

جوش ملیح آبادی (شبیر حسن خان جوش پ ۵/دسمبر ۱۸۹۶ء - م ۲۲/فروری ۱۹۸۲ء)
بنام حیدر قریشی (مدیر جدید ادب خان پور (پاکستان)

ئ افسانوی روایت

ڈاکٹر خورشید سمیع ● شعبۂ کیمسٹری - ایم - آئی - ٹی - مظفرپور (بہار)

کائنات کی ہر حقیقت متحرک ہے اور مشکل یہ ہے کہ انسان کا ذہن اتنا سست رفتار ہے کہ کوئی بھی حقیقت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب وہ حقیقت
جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ حقیقتوں کا صحیح ادراک، شعور اور ان کی صحیح تفہیم، دراصل حقائق کی تبدیلی کا صحیح ادراک، شعور اور
ل صحیح تفہیم ہے۔ یہ بات سائنسی حقائق کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ معاشی، معاشرتی، سماجی، سیاسی اور تاریخی حقائق کے ساتھ بھی ہے اور یکساں
پر ہے۔ ہمارے احساسات کا ان تبدیلیوں سے گہرا تعلق ہوتا ہے کہ احساسات خلا میں معلق لٹکتے نہیں رہتے بلکہ کسی نہ کسی ٹھوس حقیقت کی بنیاد
لے ہوتے ہیں اور جب حقیقت بدلتی ہے تو احساسات میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے اور انسان اپنے اندر اندر خود کو بدلتا ہوا محسوس کرنے لگتا
اور پھر رفتہ رفتہ اس کا نقطۂ نظر بھی بدلنے لگتا ہے۔ انتہائی پرکشش بات، بے کیف اور بے مزا معلوم ہونے لگتی ہے اور انتہائی بے کیف اور
زایات، پرکشش۔ تاریخ سیاسی حقائق کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے لیکن وہ احساسات جو ان حقائق سے وابستہ ہوتے ہیں، احاطۂ تحریر میں نہیں آتے،
یہیں ایک فن کار کا، کام نکل آتا ہے۔ وقت کا یہ طویل اور لامتناہی سفر، گرد اڑاتا ہوا، تیز رو بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ہر وہ شے جو ایمان اور ایقان کی
نک تھی، آج متزلزل ہوتی جا رہی ہے اور نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب ہمیں کسی پر بھی اعتبار نہ رہا، نہ خدا پر اور نہ صنم سنگ بدن پر، نہ
اپر اور نہ جفا پر، نہ مذہب پر اور نہ سائنس پر ــــــ غرض بے اعتمادی، بے وفائی اور بے مہری کی اس سرد اور ٹھٹھری ہوئی فضا میں،
یہ سوچنے بیٹھے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ میں نے بہت پہلے کہیں لکھا تھا کہ آج کے دور کا المیہ یہ نہیں کہ، ہمیں خدا پر یا مافوق الفطرت ہستیوں
ایمان نہ رہا، بلکہ المیہ یہ ہے کہ ہمیں، انسان پر، انسانیت پر، اور اس کی عظمت پر ایقان اور ایمان نہیں رہا یا دوسرے لفظوں میں، ہمیں خود پر
پنے آپ پر بھروسہ نہیں رہا اور مشکل تو یہ ہے کہ یہ صورتِ حال اب صرف عام انسانوں کی ہی نہیں، ان فن کاروں کی بھی ہے، جو کبھی شاید، موت کی
ھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی مسکرا دیا کرتے تھے۔

بہر حال! فن ابدی ہے اور ذاتی طور پر، مجھے فن پر بڑا بھروسہ ہے کہ میں تو یہ مان کر چلتا ہوں کہ ہر شے غلط اور گمراہ ہو سکتی ہے مگر فن نہیں۔
ن یہی بات ہر فن کار کے دل میں اتر سکے اور وہ یہ جان سکے کہ وہ خود بھی اپنی ذات میں ایک چھوٹا موٹا سا خدا ہے اور ایسا خدا جس کی تخلیق
سے کبھی منحرف نہیں ہو سکتی۔

تمہید کے یہ چند سطور، ان تمام نئے شاعروں اور نئے افسانہ نگاروں کے لئے ہیں، جن کے قلم کی جنبش مستقبل کے شاہکار کی ضامن ہو سکتی ہے
لیکہ انہیں فن پر بھروسہ ہو، اور پھر اپنے آپ پر ــــــ اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اقبال کے اس شعر کو مشعل راہ بناتے ہیں کہ

نہیں مایوس ہے اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ۔۔۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اردو کی افسانہ نگاری کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے، وہ ابھی نم ہے اور کٹھن آزمائشوں اور تجربوں کی چلچلاتی دھوپ میں تپنے کے باوجود، ابھی تک
، نم ہے، اور اتنی زرخیز کہ نئے ناموں میں ایک نہیں کتنے ہی نام ایسے نکل آتے ہیں جنہیں فضا ساز گار ملی تو عجب نہیں کہ یہ محشر خیال بن جائیں اور مجھے اس
م نہیں کہ نئے افسانے تغیرات کے سانچے میں ڈھلیں گے کہ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ ہر سیال، سانچے سے گزر کر ہی، پختگی کی منزل کو پہنچتا ہے۔

رہی بات افسانوں میں نئے رجحان کی، تو یہ کچھ نئی بات نہیں کہ اردو افسانہ نگاری کی ابتدا ہی دو واضح رجحانات سے وابستہ اور پیوستہ ہے۔

اور حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کی رو، دونوں ہی رجحانات کے ساتھ ساتھ رہی ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ایک واضح رجحان، ان فن کاروں کا تھا، جنہوں نے پریم چند کی اتباع کو فرضِ اولین سمجھا اور دوسرا رجحان ایسے منفرد فن کاروں کا تھا، جو، ان باتوں سے متاثر ہونے کے باوجود، تخیل پرستی اور رومانیت کی کھلی فضا میں سانس لیتے رہے۔ منٹو کی مثال سامنے کی ہے، جسے بدنصیبی سے ترقی پسندوں نے ترقی پسندی کی کاٹ سمجھا، اور نئے نقادوں نے جنسی موضوعات پر لکھنے والا افسانہ نگار —— اور بہ اعتبار نتیجہ صورتِ حال کچھ ایسی ہو گئی کہ ؎

واعظِ تنگ نظر نے مجھے کافر سمجھا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

نفسیاتی دبستان کے وہ نقاد، جو فرائڈ کی عینک سے دیکھتے ہیں، ممکن ہے، منٹو کی تخلیقات کو، جنسی تشنگی کی تحریک سے وابستہ کریں اور خود فریبی کے لئے جواز بھی فراہم کرنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ سچ ہے کہ منٹو کے یہاں جنس ایک ردِ عمل کے سوا کچھ بھی نہیں اور سچ تو یہ بھی ہے کہ منٹو کی تخلیقات کے کمزور پہلوؤں اور اس کے منفی رجحان کو، الگ کر کے دیکھئے تو اس کا فن ترقی پسندی سے کچھ الگ نہیں۔ منٹو فطرتاً ضدی تھا اس لئے انفرادیت پسند بھی تھا، یا انفرادیت پسند تھا اس لئے ضدی بھی تھا اور ضدی آدمی وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو شاید سوچا بھی نہیں جا سکتا اور یہی سبب تھا کہ وہ چونکا دینے والی صفت کا حامل بن گیا کہ وہ ایسی باتیں لکھ جاتا تھا اور شاید حقیقی زندگی میں کر بیٹھتا بھی تھا، جو سوچی بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ اب رہی بات منفی رجحانات کی، تو یہ منفی رجحانات منٹو کی ادائیں ہیں کہ منٹو کے منفی کرداروں میں بھی، مثبت پہلو اور انسانیت کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ انسانی نفسیات کے یہی پیچ و خم ہیں، جو اسے اپنے معاصرین سے ممتاز کرتے ہیں کہ اس کے کردار متضاد رجحانات سے عبارت ہونے کے باوجود، جیتے جاگتے ہوئے لگتے ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ کردار نگاری میں منٹو کا جواب نہیں۔ اب رہ جاتی ہے اخلاقی اور غیر اخلاقی رجحانات کی بحث تو یہاں پر مجھے صرف اتنی سی بات کہنا ہے کہ زندگی کے مسائل اتنے سہل بھی نہیں ہوتے جتنے کہ اخلاقیات کے اصول ہوتے ہیں اور منٹو نے زندگی کے مسائل کو سامنے رکھ کر، فن کی تخلیق کی تھی، اخلاقیات کے مسائل کو سامنے رکھ کر نہیں کہ منٹو واعظ نہ تھا اور فنکار تھا اسی لئے وہ واعظ کے لہجے سے گزر کر، آدمی کے لہجے میں باتیں کرتا رہا A MAN SPEAKING TO MEN اس کے فن کا طرۂ امتیاز ہے اور پھر یہ وصف، تو شاید صرف اسی کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہے کہ وہ غیر اخلاقی پہلوؤں کے توسط سے ہمیں اخلاقیات کا درس دیتا تھا۔

منٹو کی ادبی زندگی کا آغاز ہی "عالمگیر" کے روسی ادب نمبر سے ہوتا ہے۔ جو روس کے انقلابیوں اور دہشت پسندوں سے متعلق ہے۔ منٹو پر اشتراکی ادیب باری صاحب کا بڑا گہرا اثر تھا۔ اس نے اپنا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے۔" دسویں جماعت میں دُنیا کا نقشہ نکال کر، ہم کئی بار خشکی کے راستے سے روس پہنچنے کی اسکیمیں بنا چکے تھے۔" (گنجے فرشتے۔ منٹو صـ۱۰۱) منٹو اور اس کے ساتھیوں نے امرتسر کی دیواروں پر جو اشتہار لگایا تھا، اس کی عبارت تھی "مستبد اور جابر حکمرانوں کا عبرت ناک انجام روس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام۔ زاریت کے تابوت میں آخری کیل" (گنجے فرشتے۔ منٹو۔ صـ۱۰۱) منٹو پر روسی ادیبوں کا بھی بہت ہی گہرا اثر تھا۔ گوگول، ترگنیف، چیخوف، گورکی کے افسانوں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ، منٹو نے ان فن کاروں کا بہ نظرِ امعان جائزہ لے کر ان کے فن پر مضامین بھی لکھے ہیں۔" سرخ انقلاب" کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں، منٹو نے لکھا تھا کہ "اشتمالیت نے روسی عورت کو اس کی صدیوں کی غلامی سے رہا کر دیا ہے۔" (منٹو کے مضامین صـ۲۶۴) گورکی پر جو مضمون منٹو نے لکھا تھا، اس میں سے ایک بے حد خوب صورت اقتباس دیکھئے کہ اس اقتباس کی روشنی میں آپ منٹو کے فن کو بھی سمجھ سکیں گے۔

"گورکی افسانہ لکھنے سے پیشتر چاروں طرف نگاہ دوڑا کر حقیر سے حقیر واقعات کو بھی فراہم کر لیتا ہے کہ شاید وہ کسی جگہ کے لئے موزوں ہوں۔ شوربے کی تلخی، مرد کے بوٹ سے چمٹی ہوئی برف، کسی عورت کے بالوں میں اٹکے ہوئے برف کے گالے، لکڑیاں کاٹتا ہوا لکڑہارا، دہقانوں کی بھدی گفتگو، پیانو کے چھڑتے ہوئے پردے، سنترہ کی آنکھوں میں حیوانی جھلک، بازاروں میں اڑتی ہوئی کیچڑ، کارخانوں کے بلند دودکشوں کا سیاہ دھواں، ان تمام کم حقیقت اور مہمل چیزوں کے اجتماع سے اس کا دستِ فکر ایسے مناظر پیش کرتا ہے جو اپنے اندر اثر پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔" (منٹو کے مضامین صـ۲۱)

یہ نظر اتنی گہری ہے کہ جزئیات میں سے کوئی جزو ایسا نہیں، جو آنکھوں سے اوجھل رہ جاتے۔ اور دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ منٹو کی نظر اتنی گہری ہے کہ یہ خوب صورت مناظر ہی نہیں، بد صورت اور کریہہ مناظر بھی کیمرے کی فلم کی طرح محفوظ کر لیتی ہے اور یہ باتیں جب ایک VIRTUAL MEMORY کی طرح، فن میں ڈھلتی ہیں تو یہ زندگی کی عکاسی نہیں کرتیں بلکہ زندگی کا ایک ایسا انوکھا التباس ILLUSION پیش کرتی ہیں، جو بد صورت مناظر اور تلخ حقائق کے ساتھ ساتھ ان نفسیاتی پیچ و خم کی تشریح اور تعبیر لئے ہوئے ہوتا ہے، جس کا تعلق نہ صرف فن کار کی اپنی سائیکی PSYCHE سے ہے بلکہ ان کرداروں کی سائیکی سے بھی ہے، جن کا وہ فنی سطح پر مطالعہ کر رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ منٹو کے پیش کردہ بد صورت مناظر بھی بد صورت نہیں لگتے کہ وہ بد صورتی کو ایک چیلنج مانتا ہے اور اس سے نبرد آزما رہتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے دلوں کی دھڑکنیں سنتا ہے اور پھر ان دھڑکنوں کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اس طرح جذب کر لیتا ہے کہ وہ اس کی اپنی دھڑکن بن جاتی ہے اور یہی دھڑکن، پلاٹ کی روح ہے، جو فن کار کی روح کے ساتھ ساتھ دھڑکتی ہے۔ میں ترقی پسندی پر زور دینا چاہتا تو منٹو کا افسانہ "نیا قانون" پیش کر دیتا۔ لیکن وہاں تو سیاسی شعور خام ہے اور منگو کوچوان کی زبان سے کہے گئے فقرے، منٹو کے سیاسی ردّ عمل کا ترجمان نہیں ہیں اور کوچوان کے سیاسی ردعمل کے ترجمان ہیں۔ لیکن "ہتک" میں سوگندھی کا کردار کیا ہے؟ سوا اس کے کہ سماجی نظام نے مسخ کر کے، اسے گندگی اور غلاظت کے ڈھیر پر پھینک دیا ہے اور پھر "کالی شلوار" کی سلطانہ بھی اسی کی ایک قسم ہے جو گناہوں میں زندگی گزارنے کے باوجود، مذہبی رسومات پر عمل پیرا ہے۔ اور اسے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا اور سچ تو یہ ہے کہ شاید اسے اس کی فکر بھی نہیں کہ اسے تو بس یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ محرّم میں اس کے پاس ایک کالی شلوار ہونا ہی چاہئے ـــــ منٹو نے فحاشی یا عریانی نہیں پھیلائی کہ اس میں پھیلانے کی بات بھی کیا ہے کہ یہ تو ویسے بھی سماج میں پھیلی ہوئی تھیں اور ہیں۔ منٹو کا قصور (اگر یہ قصور مانا جائے) تو صرف اتنا ہے کہ منٹو نے انہیں برافگندہ نقاب کیا کہ یہ سماج کی وہ تلخ حقیقتیں تھیں اور ہیں جنھیں نظر انداز کرنا، ایک حسّاس فن کار کی دیانت داری کے خلاف تھا اور منٹو کا یہ شدید احساس ہی تھا، جس نے ان کچلے ہوئے، مسلے ہوئے اور دبے ہوئے لوگوں کی مسخ شدہ اور پراگندہ و پامال زندگی پر لکھنے کے لئے اسے مجبور کیا، کہ وہ اس درد کی شدّت کو محسوس کرتا تھا جو احساس کی شدت کے سبب وجود میں آتی ہے، ہر چند کہ وہ انہیں افسانوں میں یہ کہنا بھی چاہ رہا ہے (اور شاید نہ کہہ سکا ہے) کہ زندگی کبھی پامال نہیں ہو سکتی اور اگر ہو بھی جائے جب بھی زندگی کی خوشبو اور اس کا حُسن کبھی پامال نہیں ہوتا۔

رہی بات معترضین کی ـــــ تو معترضین کی خدمت میں وہ بڑی معصومیت سے کہتا رہا کہ جنھیں یہ باتیں پسند نہیں آتیں، انہیں اسے بدلنا چاہئے یا بدلنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ خود منٹو کے الفاظ میں ـــــ "اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔ اگر اسکا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہئے۔ ویشیا کو مٹا دیئے، اس کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا۔" (مجھے کچھ کہنا ہے۔ منٹو کے مضامین ص ۲۹۷)
منٹو واقعی ایک دیانت دار ادیب تھا اور اسی لئے سماج میں پھیلے ہوئے جنسی مظالم کو موضوعِ سخن بناتا رہا کہ جنسی مسائل دراصل استحصال کے خلاف بھرپور اظہار ہیں۔ منٹو نے جنسی مسائل کی روشنی میں دیکھا تھا کہ خرمنِ امن و سکون جل چکا ہے اور صبحِ وطن، شامِ الم سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ وہ خود کو، محض اس لئے نیا لکھنے والا مانتا ہے کہ وہ پرانے لکھنے والوں سے الگ ہے اور ذہنی و فکری دونوں ہی سطحوں پر الگ ہے کہ پرانے لکھنے والوں کے سامنے ایک ہی مقصد تھا ـــــ ہندوستان کی آزادی کا مقصد اولہ نصب العین۔ پریم چند کا سوزِ وطن اور کتنے ہی افسانے اس کی مثال ہیں۔ لیکن آزادی کے بعد کا المیہ یہ بھی ہے کہ آزاد تو تھے مگر افراتفری ہمارا مقدر تھی۔ خود منٹو کے الفاظ میں:

"دُنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے۔ ہندوستان میں جہاں آزادی کا ننّھا مُنّا بچّہ غلامی کے دامن سے اپنے آنسو پونچھ رہا ہے۔ ایک افراتفری سی مچی ہے۔ اس شورش میں ہم نئے لکھنے والے اپنے قلم سنبھالے کبھی اِس مسئلے سے ٹکراتے ہیں کبھی اُس مسئلے سے۔" (سویرا (لاہور) شمارہ ۱ "ہمارے مسائل"۔ سعادت حسن منٹو)

یہاں یہ ٹکڑا "دنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے" بے حد بلیغ اور فکر انگیز ہے کہ یہ سچ ہے کہ ۱۹۴۷ء تک، دنیا، شاہی اور سامنتی جبر و ستم کے مرحلوں سے گزر کر، بورژوا انقلاب کے بعد، متحدہ ریاست کے نشیب و فراز سے گزر چکی تھی۔ عالمی جنگ کے بعد ایشیا اور افریقہ کی قومیں سامراجی غلامی کی زنجیریں توڑ رہی تھیں۔ ایسے ہی نازک لمحے میں ہندوستان کی آزادی کا منصوبہ تیار ہوا اور برطانوی استعماریت

کی آخری چال کامیاب ہوگئی۔ مذہبی اور لسانی تعصبات اور اختلافات کو شہ دے کر تقسیمِ ہند کے لئے جواز فراہم کیا گیا اور بہ اعتبارِ نتیجہ دو جعلی ہوتی سیاسی لکیروں کے سہارے ملک کا بٹوارہ کر دیا گیا۔

اور اس طرح صبحِ آزادی کا اجالا، داغ داغ ہوگیا۔ ظلمت و نور کی اس دھندلی فضا میں، ہم نے ملک کی باگ ڈور سنبھال تو لی، لیکن تذلیل کے وہ شرمناک داغ مٹا نہ سکے، جو ہمارے برطانوی آقا اور ان کے غلامانِ وفادار، ہمارے وطن کی خوبصورت اور چاندی سی چمکتی ہوئی پیشانی پر لگا چکے تھے۔ ملک کے بٹوارے نے ایک نہیں کئی مسائل کو جنم دیا۔ لاکھوں، کروڑوں انسان بے گھر ہو گئے۔ چاروں طرف نفرت اور انتقام کے شعلے لپٹیں مارنے لگے۔ فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اٹھے۔ مذہب اور سیاست کے نام پر، انسانیت کچلی جانے لگی۔ ایسی زہر آلود اور مسموم فضا میں ہمارے لکھنے والوں کا قافلہ سرحدیں پار کرتا ہے۔ ایک جانب کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی، لاہور سے چل کر، سرحد پار کر رہے تھے اور دوسری جانب سعادت حسن منٹو اور انتظار حسین سرحد پار کر کے لاہور جا رہے تھے۔ اس بے وطنی اور بے زمینی کی عجیب و غریب صورتحال کا اظہار، افسانوی ادب میں، بڑی شدت سے ہوا ہے۔ یہاں تک کہ کرشن چندر جیسے ترقی پسند افسانہ نگار کے یہاں بھی وطن کی جدائی کا شدید احساس ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لاہور کی گلیوں کی یادوں سے یہ کہانی معطر بھی ہے اور جدائی کے اشکوں سے منور بھی۔

"لاہور میں لاہوری گیٹ کے اندر ایک چوک ہے، چوک متی۔ اس چوک متی کے اندر ہماری گلی تھی یہ ایک تنگ و تاریک گلی تھی۔ پرانے گھروں میں کچھ نئے لوگ آ گئے ہیں اور پرانے لوگوں نے کچھ نئی بستیاں آباد کر لی ہیں۔ لیکن جو، جو، جہاں، جہاں گیا ہے، اپنی گلی ساتھ لیتا گیا ہے۔ یہ گلی جس کا آسمان تنگ ہے اور کمرے تاریک ہیں بڑی روشن امیدوں والی گلی ہے۔ یہ گندی گلی، میلی گلی، اجلی گلی، کمزور گلی، بہادر گلی، بدبودار گلی، مہکتی ہوئی گلی، ان پڑھ گلی، کتابوں سے بھری ہوئی گلی، یہ میرے سینے میں ہمیشہ آباد رہتی ہے۔ جب کبھی انسانیت میں، میرا ایمان ڈگمگانے لگتا ہے۔ میں اس گلی کی خاک کو اپنی آنکھوں سے لگا لیتا ہوں اور پھر زندہ ہو جاتا ہوں کیونکہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ جتنے انسان ہیں، وہ سب اسی گلی میں رہتے ہیں اور جتنے آسیب ہیں، وہ اس گلی سے باہر رہتے ہیں۔"

(لاہور کی گلیاں۔ کرشن چندر)

یہاں گلی اور اس کی صفتوں کی تکرار ہے اور مسلسل ہے اور شدت سے ہے۔ ماضی کی تخیلی بازیافت کی یہ معصوم سی کوشش، دل کو چھو لینے والی ہے کہ یہاں یادوں کی نوعیت صحت مند ہے اور ماضی اور گم شدہ معاشرے کے تہذیبی اور جذباتی رشتوں کے شکست و ریخت سے وابستگی کے باوجود، روشن مستقبل اور تعمیر کے شدید احساس سے معمور ہے۔

اسی طرح "بستی" میں بھی کئی افسانے وابستہ نظر آتے ہیں ہر چند کہ یہاں بھی ماضی کی تخیلی بازیافت کا مسئلہ ہے کہ ان میں ذاکر بھی ہے جو ہندوستان میں اپنی چھوڑی ہوئی محبوبہ کی خیریت اپنے ہندو دوست سریندر سے دریافت کرتا ہے۔ دیکھنے والی بات صرف اتنی ہے کہ یہاں صابرہ گم شدہ محبوبہ نہیں، بلکہ گم شدہ ہندوستانی ماضی کی علامت ہے۔ مگر انتظار حسین کے فن کی نوعیت، ہجرت یا ترکِ وطن کے مسئلے کو لے کر چلنے کے باوجود، بے حد پیچیدہ ہے کہ ان کے یہاں جڑوں کی تلاش کا مسئلہ پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے اور ۱۹۴۷ء کے ترکِ وطن کا سلسلہ، ہجرت کے قدیم مذہبی واقعات کا تسلسل قرار پاتا ہے۔ خود ان کے الفاظ میں ـــــ "۱۹۴۷ء کی ہجرت، تو ان ہجرتوں کے پس منظر میں ہے، جو مسلمانوں کی تاریخ میں ہوتی رہی ہیں۔" اور انتظار حسین کی کہانیاں، اس عنوان ماضی پرستی کے انفعالی جذبے پر رقص کناں ہو جاتی ہیں۔ ماضی پرستی کی گنجائش تنقید کے نفسیاتی دبستان میں بطورِ خاص یونگ JUNG اور اس کے متبعین کے یہاں بہ درجہ اتم ہے۔ انتظار حسین نے تنقید کی اس جہت پر توجہ تو کی ہے۔ لیکن بڑی چابکدستی سے یونگ کے غیر مذہبی تعینات اور نسلی اور تہذیبی علا[illegible]وں کو، مذہبی علامتوں میں بدل بھی دیا ہے۔ یونگ کے یہاں اس بات پر بے حد زور دیا گیا ہے کہ استدادِ زمانہ کے ہاتھوں مدفون [illegible] دوں کی تلاش کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کہاں کہاں فن پاروں میں کوئی RACIAL ARCHE TYPE پروجیکٹ ہوا ہے کہ اس RACIAL ARCHE TYPE کی تلاش کئے بغیر، فن کی تشکیل یا تخلیق ممکن نہیں۔ پس انتظار حسین نے داستانوں کو موضوعِ سخن بنا ڈالا لیکن داستانوں کے آرکی ٹائپ کی از سرِ نو تخلیق

RE-CREATION سہل نہ تھی۔ لہٰذا الٹ پلٹ کر، وہی باتیں پیش ہونے لگیں اور پھر ہمارے نقادوں نے استادی کے جوہر دکھانے شروع کر دیئے
ر انتظار حسین کے افسانوں کو سامنے رکھ کر ایسی ایسی دُور از کار تشریحات پیش کیں کہ ایسا لگا کہ انتظار حسین کے افسانوں سے متعلق تمام تر تجسیمی علامتیں ہماری اپنی علامتیں ہیں اور اردو ادب نے اس عنوان گویا کہ اپنی MYTH دریافت کر لی ہے ———— حالانکہ ادب کا وہ حصّہ جہاں ———— ARCHETYPAL PROJECTION مل سکتا ہے اردو میں ہونے سے رہا کہ اس کا تعلق از منۂ قدیم کی زبانوں سے ہوگا، جیسے سنسکرت، پالی، پراکرت وغیرہ۔ پھر کیا ہے کہ از منۂ قدیم کی اساطیر اور تجسیمی علامتیں مذہبی نہ ہوں گی بلکہ تہذیبی اور PAROCIAL ہوں گی۔
ژنگ کو رہبر بنانے والے افسانہ نگار یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ تب اردو ادب کو اپنی حد میں تسلیم کرنا ہی ہوگا۔ میں یہ بات جانتا ہوں کہ ژنگ کے قول کے مطابق اجتماعی لاشعور، ہر فرد کے شعور اور لاشعور کے پس پردہ کارفرما ہے اور میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ یونگ کے متبعین شاعری میں بار بار وجود میں آنے والی بعض شعری امیجز، علامات اور بے حد قدیم معانی و مفاہیم کی صدائے بازگشت ہمہ دم سنتے رہتے ہیں اور اسے اجتماعی لاشعور محرک سے وابستہ بھی کرتے ہیں لیکن یہ ایک عجیب بحث ہوگی کہ یہاں انسانی نفسیات سے کہیں زیادہ قبائلی اور وحشیانہ دور کی ابتدائی اور قدیمی زندگی زیرِ بحث چلی آئے گی اور انتھروپولوجی ANTHROPOLOGY کی وسیع معلومات درکار ہوگی کہ قدیم اساطیری کہانیوں کا تعلق انسان کے وحشیانہ اور قبائلی دور کی زندگی سے ہوا کرتا ہے بقول یونگ، یہی وہ دور ہے، جب ہم اپنے ذہنوں کی قدیم صورتِ حال کو سمجھ سکتے ہیں۔ اب جہاں تک MYTH کا سوال ہے تو کیا ہے کہ وائیکو VICO کے قول کے مطابق MYTH ایک شاعرانہ اندازِ بیان ہے (شاید یہی سبب ہے کہ یہ کہانیاں، شاعری سے قریب ہو جاتی ہیں) یہ دراصل ایک ایسی زبان ہے، جو دورِ قدیم، میں، انسانوں کی واحد زبان تھی، اس کے اپنے اصول و ضوابط ہیں اور اپنے منطقیانہ دلائل بھی ہیں ———— لیکن ایک بات اور ذہن نشین رہے تو بہتر ہے کہ فرائڈ اور یونگ کے نظریات میں اختلافات شدید ہیں۔ بودکن BODKIN نے ان اختلافات کو یوں اجاگر کیا ہے۔

"THE DIFFERENCE BETWEEN THE TWO SCHOOLS (OF FREUD & JUNG) LIES IN JUNG'S BELIEF BUT A SYNTHETIC OR CREATIVE FUNCTION DOES PERTAIN TO THE UNCONSCIOUS THAT WITHIN THE FANTASIES ARISIRNG IN SLEEP OR WAKING LIFE, THERE ARE PRESENT INDICATIONS OF NEW DIRECTIONS OR MODES OF ADOPTION WHICH THE REFLECTIVE SELF, WHEN IT DISCERNS THEM, MAY ADOPT AND FOLLOW WITH SOME ASSURANCE THAT ALONG THESE LINES IT HAS THE BACKING OF UNCONSCIOUS ENERGIES."

[ARCHETYPAL PATTERNS, BODKIN PP 73]

بہرحال انتظار حسین کی دو اہم کہانیاں ہیں ———— "آخری آدمی" اور "زرد کتّا" ———— "آخری آدمی" ان لوگوں کی کہانی ہے جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔ قرآنِ پاک میں البقرہ میں اس واقعے کا ذکر ہے۔ یہاں الیاسف آخری آدمی ہے، جو چالاک ہے اور مکاری کرتا ہے۔ بہ اعتبارِ مجموعی یہ کہانی نسلِ انسانی کے روحانی زوال کی ایسی داستان ہے، جہاں مذہبی واقعے کو توڑ مروڑ کر افسانوی علامت نگاری کی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی فضا انجیلِ مقدس کی ہے اور یہاں داستانوی اثرات نمایاں ہیں۔ اسی طرح "زرد کتّا" میں بزرگانِ دین کے ملفوظات اور داستانوں کی زبان ملتی ہے اور یہاں زوال کے عمل سے متعلق جدّوجہد کی ناکام کوشش ہے۔ انتظار حسین کی ایک اور اہم کہانی ہے "کشتی" جہاں قدیم سامی اور اسلامی روایات کے علاوہ ہندوستانی دیو مالائی داستانوں کی از سرِ نو تخلیق RE-CREATION کی ایک کوشش بہرحال ہے۔ یہاں قرآنِ پاک سے، عہد نامۂ عتیق سے، قصص الانبیاء سے، توریت اور ویدوں سے، پُرانوں اور شاستروں سے، غرض تمام مذہبی اور اساطیری روایات سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ کہانی ہجرت کے احساس سے شروع ہوتی ہے کہ کشتی سفر میں ہے اور سفر کا گہرا رشتہ ہجرت سے ہے

جو انتظار حسین کی کہانیوں کا اہم محرک اور موضوع بہر حال رہا ہے۔ نوحؑ کا بیٹا کنعان یا سام، کشتی میں نہ آیا اور غرقِ طوفان ہوا۔ کنعان کا ذکر "کشتی" میں یوں آتا ہے کہ تنہا مرجانا، ہجوم کے ساتھ زندگی گزارنے سے بہتر ہے۔ بہر حال! انتظار حسین کی اکثر کہانیوں کی بیشتر باتیں، یہ طے ہے کہ قدیم مذہبی اساطیر سے وابستہ ہیں اور داستانوں کے آرکی ٹائپ کی از سرِ نو تخلیق کی کوشش ——— جسے کامیابی یا ناکامی کی سند وہی دے سکتے ہیں جنہوں نے یونگ کو اپنا رہبر اور رہنما تسلیم کر لیا ہے۔

اب آئیے پاکستان ہی کے ایک دوسرے افسانہ نگار کی باتیں کریں، جس کی آواز اپنے عہد کی نمائندہ آواز معلوم ہوتی ہے اور توجہ چاہتی ہے ——— روئے سخن ہے انور سجاد کی جانب ——— تو کیا ہے کہ انور سجاد کی کہانیوں میں یوں تو ایک نمائندہ رجحان واضح طور پر اکثر نظر آتا ہے لیکن ان کی کہانی "کونپل" بہ طورِ خاص خوب تر کی مثال کہی جا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہانی زندگی کے تلخ حقائق سے وابستہ ایک ایسی کہانی ہے، جس کا تعلق افسانہ نگار کے ملکی، سماجی اور سیاسی حالات سے ہے۔ اندازِ بیان استعاراتی ضرور ہے مگر اس کی وجہ بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں کہ واقعی یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی ایسا متبذل دور بھی آتا ہے، جب اپنے خیالات کا برملا تو کیا، اشاروں اور کنایوں میں بھی اظہار ممکن نہیں رہ جاتا اور ہر فنکار طوق و سلاسل اور دار و رسن کی کٹھن آزمائشوں کو جھیلنے کا یارا نہیں رکھتا۔ ایسے ہی نازک لمحوں میں، استعاروں کی زبان، افسانوں کی زبان بن جاتی ہے لیکن اب اسے کیا کیجئے کہ میری نظر میں یہ بھی شکستِ فصلِ خزاں کے مصداق ہے یہ اور بات کہ اس خرابے میں بہر حال غنیمت ہے کہ دامن تر ہے اور دوستا
بادہ گساراں قدرے سلامت ——— کچھ پیراگراف، تمثیلی طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں ——— جو میری رائے میں بہت اہم ہیں:

"دو سیاہ پوش اسے میز کے پاس فرش پر پھر سے گرا دیتے ہیں۔ دو اور ساتھ مل کر اسے پوری طرح شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں انچارج اس کے سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے۔ اپنے مضبوط ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں کو اس کے جبڑوں کے دونوں طرف جما کے پوری قوت سے دباتا ہے۔ وہ مدافعت کرتا ہے لیکن اسے منہ کھولنا ہی پڑتا ہے۔ پائپ والا ایک چھوٹا سا دہکتا ہوا انگارہ، بیڈ کی کلپ میں انگیٹھی سے اٹھا کر، اس کے قریب آتا ہے۔ انگارہ اس کی آنکھوں کے قریب لاتا ہے۔ انگارے کی حدت اور سرخی سے اس کی آنکھوں کو سکون پہنچتا ہے ——— "تم واقعی بہت بکواسی ہو۔"
پائپ والا انگارہ اس کے کھلے منہ کے راستے سے اس کی زبان پر رکھتا ہے۔ کونے میں گرم چادر کے نیچے ماں اور بیوی ایک دوسرے کو بھینچ لیتی ہیں۔ وہ سیاہ پوش کے شکنجے میں جکڑا تڑپتا ہے، چیختا ہے۔ ماں، بیوی کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہیں۔ پائپ والا، اس کی زبان سے انگارہ اٹھا کر پھر رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ منہ کے لعاب سے انگارہ بجھ جاتا ہے۔ پائپ والا کلپ سمیت انگارہ پھینک کر بڑے اطمینان سے اٹھتا ہے۔ سوچتا ہے۔ اب یہ سدا کیلئے گونگا ہو گیا... وہ فرش پر لیٹا، اپنے جسم کے تشنج پر قابو پا کر حواس مجتمع کرتا ہے۔ احتجاج میں پھڑکتی جلی زبان سے ان تمام لفظوں کا سیلاب امڈ آتا ہے جو آج دوپہر ہجوم کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ درد، اذیت اور غصے میں جلتی زبان سے لکنت میں ابھرتے الفاظ، پائپ والے اور دیگر سیاہ پوش کی سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ سدا کے لئے گونگا ہو گیا، اپنی دانست میں ان بے معنیٰ آوازوں کو سنتے ہوئے، پائپ والے اور اس کے حواریوں کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے قہقہوں میں پھٹ پڑتے ہیں۔ قہقہے، کونے سے ابھرتی ماں اور بیوی کی سسکیاں، اس کی جلتی ہوئی لکنتی زبان سے دیوانہ وار نکلتے لفظ اور باہر کڑکتی بجلی، سرد سنسناتی ہوا پر تیز بارش کا منتاثر ——— تیز بارش میں کارپوریشن لیمپ پوسٹ کی روشنی سے بنے، اندھے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے بچے کو ایک ترکیب سوجھتی ہے۔ اپنی پوری قوت سے، اپنے بستر کا لحاف اٹھا کر اوڑھتا ہے، پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ صحن کے وسط میں پہنچ کر بیٹھ جاتا ہے اور ننھی منّی کونپل کو اپنے دامن میں لے لیتا ہے جو منوں مٹی کو اپنی تیز کٹاری سی نوک سے چیر کر ابھری ہے اور درخت بننے پر جس کی شاخوں سے سوہنے مہکتے، سرخ سرخ پھول فانوس کی صورت جھولیں گے۔" (کونپل۔ انور سجاد)

یہ مناظر ـــــــ معاشی، معاشرتی اور سیاسی جدّ و جہد کی ترجمانی اور عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں احتجاج اور اس کے سبب اذیّت ناک سزاؤں کا استعارہ ہے۔ پاکستانی افسانوں میں یہ نئی آواز، احتجاج کی آواز ہے جسے دبانے کے لئے ڈاکٹر، نوکر، سیاہ پوش اور انچارج وغیرہ اذیّتیں دے رہے ہیں۔ وہ گولیوں اور انگاروں سے زبان کو داغ دیتے ہیں اور اپنے تئیں سمجھتے ہیں کہ اب یہ گونگا ہو گیا اور اس طرح احتجاج کی آواز ہمیشہ کے لئے دب گئی۔ مگر جلی ہوئی لکنت بھری زبان کی جگہ لینے کے لئے ننھی مُنّی کونپل ابھرنے لگتی ہے، تو، نئی شخصیت یا احتجاج کی یہ نئی آواز اسے اپنے دامن میں محفوظ کر لیتی ہے۔ انور سجاد کی یہ کہانی "کونپل" نئی کہانیوں میں ایک مبارک تبدیلی ہے اور وہ اس تبدیلی میں تنہا نہیں، ان کے معاصرین میں سے کئی نام اور ایسے ہیں، جن کے یہاں ایسی ہی مبارک تبدیلی صاف طور پر نظر آتی ہے۔

نئی کہانیوں کے ایک اور معتبر نام بلراج مین را کی یوں تو کئی کہانیاں ایسی نکل آئیں گی جن کا تفصیلی مطالعہ ضروری قرار پائے گا، جیسے مین را کی کہانی "وہ" سرمایہ دار طبقے کے گھٹن پر ایک اچھی کہانی ہے۔ تاہم! میں ان کی کہانی "ماچس" کا ذکر قدرے تفصیل سے کروں گا کہ یہ کہانی علامتی حیثیت کے باوجود بڑے بلیغ مفاہیم کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے۔ "ماچس" ـــــ ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جس کی نیند رات کو بے وقت ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ سگریٹ سُلگانا چاہتا ہے، مگر ماچس خالی ہے۔ وہ پورا کمرہ کھنگھال ڈالتا ہے مگر سب ماچسیں خالی ملتی ہیں۔ سرد رات میں وہ باہر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ کئی جگہوں پر ماچس کی ناکام تلاش کے بعد وہ ایک مرمّت شدہ پُل پر پہنچتا ہے۔ یہاں سرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لالٹین سے وہ سگریٹ سلگانا ہی چاہتا ہے کہ ایک سپاہی اسے پکڑ کر تھانے لے جاتا ہے۔ وہاں کئی افراد، میز کے چاروں طرف بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں اور کئی ماچسیں رکھی ہیں۔ لیکن اس پر آوارگی کا الزام لگا کر، اس کو وہاں سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ واپسی پر اس کو ایک آدمی ملتا ہے۔ جس سے وہ ماچس مانگتا ہے۔ لیکن وہ شخص خود بھی ماچس کی تلاش میں ہی گھر سے نکلا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چھوڑتے ہوئے راستے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ میری رائے میں "ماچس یہاں علامت ہے، زندگی کی حرارت کی، جسے شاید زندگی کی معنویت بھی کہا جائے تو کوئی خاص مضائقہ نہ ہوگا۔ اور آج کا انسان اس کہانی کی روشنی میں زندگی کی معنویت یا حرارت کے لئے، سرگرداں ہے۔ وہ سُرخ کپڑے میں لپٹی ہوئی لالٹین سے سگریٹ سُلگانا ہی چاہتا ہے کہ ایک سپاہی اسے پکڑ کر تھانے لے جاتا ہے اور اس پر آوارگی کا الزام لگا کر وہاں سے فوراً نکال دیا جاتا ہے۔ پھر وہ حلوائی کی دُکان پر سوتے ہوئے آدمی سے ماچس طلب کرتا ہے۔ سویا ہوا آدمی کہتا ہے۔" ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے۔ وہ آئے گا تو بھٹّی گرم ہوگی" یہ فقرہ طنز یہ ہے اور یہاں آج کے معاشرے پر طنز ہے جہاں زندگی کی ہلکی سی حرارت بھی سیٹھوں کی تحویل میں بند ہے۔ اور پھر تھانے سے نکلنے کے بعد اس کی ملاقات ایک اور شخص سے ہوتی ہے۔" آپ کے پاس ماچس ہے کیا؟" "ماچس" "آپ کے پاس ماچس نہیں ہے" "ماچس کے لئے تو میں..." وہ شخص اس کی بات سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔ یہاں افسانہ نگار نے بات ادھوری چھوڑ کر، تمام مافی الضمیر ادا کر دیا۔ اور اس عنوان ایک مخصوص قسم کا افسانوی حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے تک افسانوں میں، جو ایک نئی نسل آئی تھی تو ابتدا میں تو ایسا لگا کہ نئی نسل کو تنہائی کا احساس ہے۔ پھر ان کے اندر جو غصّہ تھا، وہ اپنی ذات سے تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ افسانہ نگار، خود اپنی ذات کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔ خود اپنے آپ سے لڑ رہا ہے، نبرد آزما ہے مگر اب یہ لڑائی اندر سے باہر آ گئی ہے اور جو باہر کی طرف سماجی طاقتیں ہیں، اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انور سجاد کی کہانی "کونپل" اس کی مثال ہے اور بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں جیسے سریندر پرکاش کی کہانی "بجوکا" یہاں بیانیہ انداز کی سادگی کے باوجود، علامت، ڈرامائی انداز لئے ہوتے ہے۔ علامت کے ساتھ، دراصل، تلازمات کا ایک پورا سلسلہ ہوتا ہے اور یہ سلسلہ ہی اسے معانی و مفاہیم عطا کرتا ہے۔ جیسے مثال کے طور پر THE OLD MAN AND THE SEA میں تجرید تو ہے۔ مگر حقیقت کے سمجھنے میں وہ مزاحم ہو ـــــ ایسا نہیں۔ بات یہ ہے کہ علامت، معنی کا استحصال نہیں کرتی، بلکہ معنی کو پھیلاتی ہے، بڑھاتی ہے۔ رہی بات کہانی پن کی، تو کیا ہے کہ کہانی پن کی تعریف بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ کہانی پن کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی ہم کسی کہانی کو پڑھ کر یہ سوچتے ہیں کہ اس میں کہانی کہاں گم ہو گئی لیکن ایک فن کار اس ٹوٹے ہوئے سچویشن کو ایک رنگ بخشتا ہے، ایک آہنگ بخشتا ہے۔ ماضی اور حال کو مربوط کرتا ہے، اور کہانی اپنے نفس سے جُدا نہیں ہوتی۔ یہ بات کردار سے بھی ممکن ہے، پلاٹ سے بھی، فضا سے بھی۔ "بجوکا" کا ایک حُسن یہ بھی ہے کہ یہاں ایک چونکا دینے والی کیفیت ہے

"بجوکا" کی زندہ شبیہہ نظر آتے ہی، قاری کا چونک جانا، بالکل فطری ہے، اور یہ چونکنا، ہوری اور اس کے پوتے کے چونکنے سے ہم آہنگ اور یک رنگ ہو جاتا ہے۔ بجوکا کھیت اور فصل کاٹنے کی روایت سے وابستہ ہے۔ پنچایت کا تعلق گاؤں کے رواج سے ہے۔ ہوری نے فصل اگانے میں تکلیفیں جھیلیں مگر فصل کاٹتے وقت، وہ نئی، غیر متوقع مصیبت کا شکار ہو گیا۔ اب کیا ہے کہ بجوکا، کا نہایت اطمینان سے، نرمی اور ملائمیت سے مسکرانا، اور ہوری کا غم و غصہ، جھنجھلاہٹ اور پیچ و تاب کھانا یہ دو متضاد کیفیتیں ہیں اور ان متضاد کیفیات کے ملنے سے ایک دلچسپ کیفیت اور صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک بات برسبیل تذکرہ عرض کرتا چلوں کہ یہ درست کہ افسانوں میں نت نئے تجربے ہوتے اور بہت ہوتے لیکن کیا ہے کہ اکثر نئے لکھنے والے تجربہ بہ معنی EXPERIMENT اور تجربہ بہ معنی EXPERIENCE کا فرق برقرار نہ رکھ سکے، اس لئے ان کے اکثر تجربے، اعتبار اور وقعت حاصل کرنے میں ناکام رہے اور پھر ایک مشکل اور رہی اور وہ یہ کہ اکثر لکھنے والے چند مخصوص چلتی ہوئی تکنک کے پیچھے بھاگے۔ سریندر پرکاش کی ہی مثال لے لیجئے۔ وہ "بجوکا" میں تو ضرور کامیاب ہیں لیکن "بازگوئی" میں کہانی کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف، پوری کہانی پر چھایا ہوا ہے۔

نئے افسانے کی ایک اور مانوس اور معتبر آواز جوگندر پال کا المیہ یہ ہے کہ وہ آزادی کے بعد بھی برسوں، تاج برطانیہ کے حکومت میں، افریقہ میں، جلاوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ جلاوطنی اور آشفتہ سری کی یہ زندگی، اپنی دھرتی سے، اپنی جڑوں سے دور، اپنی شناخت کی جستجو میں سرگرداں رہی کہ انھیں واقعی زندگی کی بے معنویت کے صبر آزما امتحان سے گزرنا پڑا ہے۔ زندگی کے اس خلا کو پر کرنے کے لئے جوگندر پال نے مغربی علوم و فنون، افکار و نظریات کے لئے اپنے وجود کے سارے دروازے کھول دئے۔

> "یہ خالی خالی شخص اپنے چہرے میں صاف نظر آتا ہے۔ اس کی ہر سوچ، ہر عمل اس کا اپنا ہوتا ہے۔ اس کی اپنی مخصوص سادہ سی شخصیت کا اظہار ــــــ لیکن جس طرح خالی خالی مکان میں مکین آجائیں تو مکان کی اپنی شخصیت اس کے وجود سے خالی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جو شخص خالی نہ رہے اور اس کے اندر اجنبی علوم کا کنبہ آباد ہو جائے تو وہ بے چارہ بے شخصیت ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرے اندر ایک نہیں کئی مہاجر کنبے ہیں۔ یہ علوم میرے اندر بس جانے کی نیت سے نہیں رہ رہے، بلکہ کہیں سے جان بچا کر، یہاں کیمپ کرنے کو آجاتے ہیں... دن رات اودھم مچا مچا کر، میرے وجود کی توڑ پھوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ میرے دروازے اور کھڑکیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے ہیں۔ دیواروں سے بھر بھری مٹی نکل رہی ہے۔ اڑتیس برس کی عمر میں ہی ان وحشیوں نے میرا اچھا بھلا وجود بوسیدہ بنا کر رکھ دیا ہے... مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ میرے اندر آتشزدگی کی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔ ان آوارہ علوم کا آپس میں دنگا شروع ہو گیا ہے۔"
> (بازیافت)

یہاں شناخت کا مسئلہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور یہ مسئلہ داخلی شکست و ریخت کے بعد کا مسئلہ ہے ــــــ "کینیا میں اتنے سال قیام رہا لیکن دل و دماغ ہمیشہ بھاگ دوڑ کے عالم میں رہے، گویا ہم کسی ایئر پورٹ کے ویٹنگ روم میں پڑے ہوں کہ ابھی ہوائی جہاز آئے گا اور اڑا کر گھر لے جائے گا۔"
(کھوا)

میری رائے میں نئے افسانوں میں صالح قدروں کے امانت داروں میں، جوگندر پال کا نام بھی ہونا ہی چاہئے۔ تمثیلی طور پر ان کی کہانی "پناہ گاہ" کو ہی لیجئے۔ تقسیم اور فسادات کے صحیح المیئے کو پیش کرنے والی کہانیوں میں، یہ خوبصورت کہانی بہت ہی اہم کہی جائے گی۔ تقسیمِ ہند کا حادثہ، اس برصغیر کا ایسا حادثہ تھا، جس نے ہمارے سماجی رشتوں، تہذیبی روایات اور جذباتی ہم آہنگی کو توڑ پھوڑ کر، رکھ دیا۔ کہانی کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس کہانی میں جا بجا انسان کی روح کا حسن بھی ہے اور اس کے مسخ ہونے کی پراگندگی بھی۔ جوگندر پال ہمیں بتاتے ہیں کہ تاریخ کا پاگل پن ہمیں پناہ نہیں دے سکتا کہ ہماری پناہ گاہ صرف محبت، انسانیت اور دردمندی ہے۔ وہ کہانیاں بیان نہیں کرتے، بلکہ کرداروں کو ہمارے اندر اس طرح داخل کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی سانسوں میں، ان کرداروں کی سانسیں گھلتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں۔

جوگندر پال کا اپنی کہانیوں کے بارے میں یہ قول کہ ــــــ "میں نے کہانیاں نہیں لکھی ہیں بستیاں بسائی ہیں۔ میرے لئے ان کی آبادکاری سب سے بڑا
مسئلہ ہے۔ ہر جگہ کچھ ایسا لگے... ورنہ سمندروں کے بیچ کورے ٹاپو کتنے ہی ابھارتے چلے جاتیے۔ ایک دن ٹاپو بھی اپنے اکیلے پن سے تنگ آکر
تہ آگر میں بیٹھ جائے گا"۔ اہم ہے اور فکر انگیز بھی ــــــ اب آئیے کچھ اشارتی افسانوں کی باتیں کی جائیں تو کیا ہے کہ ــــــ

اشاریتی افسانوں کے سلسلے میں، لوگوں نے عموماً نئے افسانے اور افسانہ نگاروں کا ذکر بہ طورِ خاص کیا ہے، ہر چند کہ اشاریتی افسانوں
کی عمر اتنی مختصر نہیں کہ ہلکی سی چلتی پھرتی اشاریتی فضا تو سجاد حیدر یلدرم کے "خارستان و گلستان" احمد علی کے "قید خانہ" "ہمارا کمرہ" اور
"موت سے پہلے" میں بھی ملتی ہے اور بہ طورِ خاص کرشن چندر کے افسانوں "مردہ سمندر" اور "غالیچہ" میں تو اشاریتی فضا صاف صاف جھلکتی
ہے۔ "غالیچہ" میں اول الذکر افسانے سے نسبتاً کہیں زیادہ، اب اسے اشاریتی افسانوں میں شامل کرنے سے گریز ہو، تو ممکن ہے اس لئے، کہ کرشن
چندر کے یہاں وضاحتی اندازِ بیان تو مزور ہی ہوتا ہے۔ بہر حال! اشاریتی افسانوں میں انور عظیم کے دو افسانے بھی اہم کہے جائیں گے "قصہ
رات کا" اور دوسرا قصہ رات کا"۔ "قصہ رات کا" میں رات ایک جزیرہ ہے، جو ہندوستان ہے۔ یہاں ہندوستان کی آزادی اور فرقہ وارانہ
فسادات کا بیان بڑے ہی پر اثر انداز سے کیا گیا ہے۔" دوسرا قصہ رات کا" ملک کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر طنز ہے۔ یہاں سرگوشیاں ایک اشارہ
بن کر سامنے آتی ہیں۔ یہ ملک کے دانشور طبقے پر طنز ہے۔ یہ طبقہ اس افسانے کی روشنی میں ایک ایسا طبقہ ہے، جو صرف غور اور فکر سے کام لیتا ہے
لیکن اپنے افکار اور نظریات کو بہ روئے کار لانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ذیل کا اقتباس دیکھئے۔

"پھر سرگوشیوں کو جھرجھری سی آئی اور ان کے فیصلے کا اعلان ہوا۔
"اگر ہم نے کچھ نہ کہا تو گھٹ کر مر جائیں گے"
"درختوں کی ٹہنیوں پر اگے ہوئے پتے ہاتھوں کی طرح لمبے ہو گئے، انھوں نے ایک دوسرے کو تھام لیا۔ فیصلے کا
اعلان ہو رہا تھا۔
اور پھر دانشور طبقے پر یہ طنز "بے لباس سرگوشیاں سگار پی رہی تھیں۔ سگریٹ کے کش اڑا رہی تھیں"۔

بہر حال اشاریتی افسانوں میں کئی نام آئیں گے، دیکھنے والی بات یہ ہے کہ علامتیں یا اشارات فنکار کی داخلی کیفیات کا اظہارِ محض نہیں ہوتے، بلکہ
ان کا تعلق خارجی باتوں سے بھی ہوتا ہے اور یہ کسی نہ کسی سطح پر ماحول سے وابستہ ہوتے ہیں ورنہ پھر مجرّد اشاریت وجود میں آئے گی اور
کہانی پن کے اخراج کا مسئلہ ابھر کر سامنے آئے گا۔

میں نئے لکھنے والوں میں سے کئی مثالیں اس سطح پر دیتا، لیکن نئے افسانہ نگاروں پر کچھ عرض کرنے سے قبل نئی افسانوی روایت کے
ایک اہم معمار کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ سچ تو یہ ہے کہ آخری دہائی کی افسانہ نگاری کی ابتدا غیاث احمد گدّی سے ہوتی ہے۔ ان کا
افسانوی مجموعہ "بابا لوگ" سنہ ۶۹ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ "بابا لوگ" میں گدّی کے نو افسانے شامل ہیں۔ اور بابا لوگ، ان کی ایک خوبصورت
کہانی ہے، جو ایک چھوٹی سی کرسچین فیملی کی داخلی کشمکش کی خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ گدّی کی خوبصورت کہانیوں میں سے
ایک کہانی "جوہی کا پودا اور چاند" میری رائے میں اس افسانے میں گدّی کی انفرادیت بڑی خوبصورتی سے اجاگر ہوتی ہے۔ کہانی مختصراً یہ ہے
کہ ایک نوجوان خوب صورت لڑکی، ایک ناجائز بچّے کی ماں بن جاتی ہے۔ بدنامی کے ڈر سے، بچے کو گاؤں کی بوسیدہ مسجد میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ بچّے کی
آواز تو اس طور بظاہر دبا دی جاتی ہے لیکن دیدی کے دل اور دماغ میں اب بھی وہ آواز، صدائے بازگشت کی طرح گونجتی رہتی ہے۔ وہ ہر وقت آنگن
میں جوہی کی سپید کلیوں کو چاند کی روشنی میں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے۔ بہ قول غیاث احمد گدّی، دیدی ایک چکور ہے، جو اپنے چاند کے انتظار میں
شب و روز کاٹ رہی ہے، لیکن شاید چاند کو گہن لگ گیا ہے۔ یہاں بعض بے حد خوبصورت اور فکر انگیز، پیراگراف ہیں، جنہیں پیش کئے بغیر آگے
بڑھنا، مناسب نہ ہوگا۔

"مرنا اور جینا دونوں کٹھن کام ہیں منّی۔ یہ سمے سمے اور جگہ جگہ کی بات ہے۔ کہیں کانٹوں کی باڑھ میں بھی رہنے کو جی
چاہتا ہے تو کبھی پھولوں کے بستر پر بھی تیاگنے کے لئے دوڑتا ہے۔ سورج کی جو کرنیں زندگی کو امرت پلاتی ہیں،

وہی نوکیلی کرنیں کبھی بھالے کی نوک کی طرح زندگی کے جسم کو چھید بھی دیتی ہیں۔"

یہ پیراگراف۔

"کسی کو، کوئی معاف نہیں کرتا۔ زندگی کے کھیت میں زہر بونا آسان ہے مگر اسے کاٹنا مشکل ہے۔ خود اپنے ہاتھ نیلے پڑ جاتے ہیں۔ مگر یہاں کا دستور ہی الگ ہے، جو بوتا ہے، نہ کہاں کاٹتا ہے۔ زہر کی اس کھیتی کو، زندگی کے وہ بے گناہ ہاتھ کاٹتے ہیں۔ جن کی کوملتاؤں میں دیوتاؤں کا تقدس رچا ہے۔ جب سچائی کسی گھائل پرندے کی طرح، وقت کے خلا میں لڑکھڑاتی کسی بے رحم چٹان پر گر پڑتی ہے تو، کوئی شکاری خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ سچائیوں کو زخمی کرنیوالے شکاریوں سے کوئی پوچھے، ان زخمی جسموں پر تم ٹھنڈے مرہم کے پھاہے رکھ سکتے ہو؟" (جوہی کا پودا اور چاند۔ غیاث احمد گدی)

یہ جملے غیاث احمد گدی کی اس گہری نظر کی غمازی کرتے ہیں، جو ان کے معاصرین میں کم ہی افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔

غیاث احمد گدی کی نئی کہانی ہے "آخ تھو" ـــــ یہ کہانی اپنی تکنیک کے اعتبار سے بالکل ہی نئی ہے۔ یہاں کلو قصائی، بڑھیا کے سود کے پیسوں کی عدم ادائیگی کے سبب، بڑھیا سے بکری چھین لیتا ہے۔ وہ بکری، جو بڑھیا اور اس کے پوتے کا واحد سہارا ہے اور جس کا دودھ بیچکر دونوں کا پیٹ مشکل سے بھرتا ہے۔ بکری موقع پاتے ہی ریوڑ سے نکل بھاگتی ہے اور پھر یہ پیراگراف دیکھئے جہاں کتنے ہی ملے جلے تاثرات فن میں ڈھل گئے ہیں:

"ادھر بکری کیسے نہ کیسے کھڈ سے نکل، پہنچی بڑھیا کے پاس، بڑھیا گھر پر نہیں تھی۔ پوتا تھا۔ کانٹوں سے بھری لہولہان، بکری کو دیکھتے ہی پہچان گیا اور تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگا، خوشی سے جھومتا، بکری کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ بکری کی وہ ساری رگیں جو کئی دنوں سے تنی ہوئی تھیں، ڈھیلی پڑنے لگیں۔ بکری ہواؤں میں اڑنے لگی، غباروں کی طرح، آنکھوں میں ایسی چمک عود کر آئی گویا وہ ایک دم سے مالا مال ہو گئی ہو... بڑھیا آئی تو بجائے خوش ہونے کے رونے لگی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ پانی بہنے لگا، وہ بکری کے گلے میں بانہیں ڈالے سسک سسک کر روتی رہی۔

پھر تھنوں کو دیکھا۔ جو کسمسا رہا تھا بلکہ ٹپ ٹپ دودھ ٹپک رہا تھا۔ دوڑی دوڑی اندر سے مٹی کا آب خورہ لے آئی۔ تھنوں کو ہاتھ لگایا کہ سفید گاڑھا اشتہا انگیز دودھ، بھر بھر آب خورے میں گرنے لگا۔" (آخ تھو۔ غیاث احمد گدی)

سود، استحصال کی بدترین شکل ہے۔ گدی نے استحصال کے مسئلے کو، داخلی احساسات سے ہم مزاج و آشنا کر کے، فن میں خوبصورتی سے متشکل کر دیا ہے۔ اور شاید یہ بھی گدی کے فن کی شناخت کا اہم پہلو ہو گا کہ ان کے یہاں داخلی احساسات، افسانوں میں اس طرح ڈھل جاتے ہیں کہ تخلیقی دنیائے باطن کا دلکش مرقع بن جاتی ہے۔

غیاث احمد گدی کے فن پر کچھ لکھنے سے قبل، میں نے بات یہاں پر لاکر چھوڑ دی تھی کہ... "ورنہ پھر مجرد اشاریت وجود میں آئے گی اور مہانی پن کے اخراج کا مسئلہ ابھر کر سامنے آئے گا۔" ـــــ تو کیا ہے کہ نئے افسانے اور نئی شاعری دونوں ہی علامت نگاری کی تحریک سے شدت سے متاثر ہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ افسانوں کی زبان، شاعری سے مختلف بہر حال ہو گی اور ایک بین فرق تو یہ بھی ہے کہ افسانے منثور تخلیقات کہے جائیں گے۔ پال والیری، علامتی تحریک اور فرانسیسی ادب کا اہم نام ہے۔ میں یہ ذکر یہاں پر ایک بار ایک اس لئے کر رہا ہوں کہ نثر اور شاعری کے فرق کی نمایاں طور پر وضاحت، علامت نگاروں میں، بہ طور خاص والیری نے کی ہے۔ اس کا یہ اقتباس نئے اشاریتی افسانہ نگاروں کے لئے بہ طور خاص اہم ہے۔ "نثر کا مقصد ہے غائب ہو جانا، قابل تفہیم ہونا، تحلیل ہو جانا اور کالعدم ہو جانا اور لسانی روایات کے مطابق، اس تصور اور جذبے کے لئے جگہ خالی کر دینا، جس کا اس میں اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ نثر ہمیشہ عمل اور تجربے کی دنیا کی جانب اشارہ کرتی ہے، ایک ایسی کائنات کی طرف لے جاتی ہے، جس میں ہمارے مشاہدات، ہمارے اعمال و جذبات کا اسلوب اظہار تقریباً یکساں ہی ہوتا ہے کہ عملی دنیا "مقاصد کے مجموعے" کی تعبیر میں محدود کی جاسکتی ہے۔" پال والیری کے نزدیک شاعری اور نثر میں دراصل الفاظ کے استعمال کا فرق ہے۔ الفاظ کا استعمال شاعر بھی کرتا ہے اور نثر نگار بھی (جیسے افسانہ نگار، نقاد، فلسفی، صحافی وغیرہ) لیکن شاعر اور دوسرے افراد میں فرق وہی ہے، جو نظم اور انتشار میں ہے، یا پھر نغمے اور بے ہنگم آواز میں ہے۔ بہ قول والیری شاعری کبھی فنا نہیں ہو سکتی کیونکہ شعرا الفاظ کا استعمال ایک مخصوص انداز سے کرتے ہیں اور پھر

میں الفاظ فنا نہیں ہوتے اور نہ بہ طور ذریعۂ اظہار استعمال ہوتے ہیں۔ میلارمے اور والیری دونوں ہی کے نظریات کی رُو سے، شاعری کو اظہارِ خیال
حد تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر نثر بہ قول والیری، چلنے کی مانند ہے، جس کا ایک طے شدہ مقصد ہوتا ہے اور ہر حرکت مابعد کے بعد
ل ختم اور فنا ہو جاتی ہے لیکن شاعری، کا معاملہ مختلف ہے کہ شاعری، رقص کی مانند ہے، جو بجائے خود، اپنی غایت اور اپنا مقصود
، اس کا کوئی خارجی مقصد نہیں بلکہ ایک کیفیت کو پیدا کرنا ہی اس کا مقصد ہے۔ کہ شعر اور رقص اپنے اختتام کے بعد غائب نہیں ہو جاتے
QUESTION DE POESIE والیری کی نظر میں، شاعری، زبان کے اعمال کو پایۂ تکمیل یا اتمام تک نہیں پہنچاتی، وہ خود پر نئی
ذمے داریاں عائد کر لیتی ہے۔ یہ وہ زبان نہیں ہے جو عموماً تقریروں، خطوط، فلسفہ طرازی اور داستان گوئی میں استعمال ہوتی رہتی ہے اور جسے
عر تکمیل تک پہنچا کر، ممتاز اور منفرد کر دیتا ہے۔ بلکہ شاعری ایک، ایسی ہمہ گیر شے ہے جو کئی نوعیتوں کی زبان کا احاطہ کرتی ہے۔ شاعری، ممتاز
ر بے مثل خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ ایک UN LANAGE DENSE LE LANGAGE ہے۔ اشاریت کا مقصود، میلارمے کے
لفاظ میں ان تمام صلاحیتوں پر زور دینا اور تکمیل تک پہنچانا ہے جن کی وہ اہل ہے۔ علامت نگاروں کی نظر میں، رومانیت اور فطرت نگاری،
دونوں زبان کے ایسے استعمال ہیں، جو حقیقت کو زبان کی حدود سے پرے رکھتے ہیں۔ علامت نگاری، ان سارے مکاتیبِ فن سے بغاوت کا
علان ہے، جو زبان اور ہیئت کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ میلارمے اور اس کے متبعین نے الفاظ کو مقصود بالذات قرار دے کر، ان کو کانٹ
کی شے بذاتہٖ THING IN IT SELF کا درجہ دے دیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامت نگاری کا سارا فلسفہ، الفاظ کا فلسفہ ہے
در علامت نگاری کا سارا مسئلہ، ایک ایسی ہیئت کی تخلیق کرنا ہے، جو الفاظ کو خیال کی ماتحتی سے آزاد کر دے اور ان کے بقا اور تحفظ کی ضامن ہو۔
یکھنے والی بات تو یہ ہے کہ شاعری ہو کہ افسانہ نگاری، خیال کی اہمیت دونوں ہی سطحوں پر تسلیم شدہ ہے۔ (ڈیکارٹ کہتا ہے CORGITO ERGOSUM
میں سوچتا ہوں اس لئے میرا وجود ہے) لیکن میلارمے اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ یہ زبان ہی کا فیضان ہے، جس سے میں موجود ہوں۔ زبان اور فن اس کی نظر میں ایسی
چیزیں ہیں جس سے آگے ارتقا ناممکن ہے اور زبان کی حدود، ہمارے دنیا کے حدود ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ علامت نگاری سے میلارمے کا مقصود
ہرگز نہ تھا کہ بہ حدِ امکان، کسی زندہ، مکمل اور مفید کارنامۂ فن کی تخلیق کی جائے، بلکہ اس کے پیشِ نظر صرف اور صرف یہ مقصد تھا کہ
جہاں تک ممکن ہو سکے، فرانسیسی شاعری کو مطابقیت کی طرف لے جایا جائے اس لئے اس نے "پیرا ناسی این ازم" PARANASSIANISM
واقعیت نگاری میں فرانسیسی ادب کو دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا اور اسی لئے ردِّ عمل کے طور پر، سب سے پہلے اس نے واقعیت نگاری کے خلاف
بغاوت کی تھی۔ اور سچ تو یہ بھی ہے کہ اس تحریک کے لئے کوئی مثبت اور ٹھوس دلیل ہے ہی نہیں۔ اکثر جگہوں پر صرف جواز پیش کئے گئے ہیں۔ خود
میلارمے نے بھی ایک مابعد الطبیعاتی جواز پیش کیا ہے کہ بہ قول میلارمے اشیا، اس لئے موجود ہیں کہ شاعرانہ تعبیرات سے اپنی معراج کو پہنچ جائیں۔
اس کے نظریے کے مطابق "دنیائے واقعی" فن کار کی دنیا کے سامنے (یا بالمقابل) ایک نفرت انگیز انتشار کے سوا کچھ نہیں اور بہ قول میلارمے
بس دنیا کا، ہم، ہر روز مشاہدہ کر رہے ہیں، وہ دراصل حقیقی دنیا کی پراگندہ اور مسخ شدہ شکل ہے۔ لیکن حقیقی دنیا ہی دراصل ابدی ہے
اور شاعری اسی ابدیت کی دریافت ہے عقلی دنیا، میلارمے، کی نظر میں نامکمل اور پراگندہ ہے، وجہ ظاہر ہے کہ یہ حقیقی دنیا کی مسخ شدہ شکل ہے۔ پھر
سی بات کو ذرا دوسرے انداز سے دیکھئے کہ اشیا کے عقلی مشاہدے میں، ہمیں جو خلا محسوس ہوتا ہے، شاعری اسی خلا کو پر کرتی ہے اور اس عنوان
کائنات کے گم شدہ اجزا کا سراغ لگاتی ہے اور شاعر کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ عالمِ شہود کی نمودِ کاذب کا پردہ چاک کر کے، براہ راست حقیقت
سے رابطہ قائم کرے۔ اب رہ کیا جاتا ہے، سوا اس کے کہ ہمیں بہ قول میلارمے، خیالات سے گزر جانا چاہئے اور صرف الفاظ کی مدد سے فنی تخلیق
کرنا چاہئے اور ہیئت کی مدد سے تخلیق کے مخفی دروازوں کو کھولنا چاہئے۔ علامت نگاری کی تفصیلی بحث میں فی الحال جانے کا موقع تو ہے نہیں،
لیکن دو باتیں کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک تو یہ زبان بہر حال ایک سماجی حقیقت ہے اور ہر لفظ اپنے سماجی حوالے سے پہچانا جاتا ہے، لطف وہاں
آتا ہے، جہاں لفظ کی سماجی معنویت، علامتی پس منظر سے ہم مزاج و آشنا ہو جاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ تخیل، فن کے لئے غذا کا کام کرتا
ہے۔ تخیل کی گرفت سے آزاد کر کے فن کو ہیئتی تجربوں کی بھینٹ چڑھا دینا یا الفاظ کو علامت کے خول پہنا کر ان کے گرد پیچیدہ ہیئت کی دیواریں کھڑی
کر دینا دوسرے لفظوں میں فن کے قابلِ فہم ہونے کو نہ ہونے کے مترادف قرار دینا ہے۔ رہی بات فن میں خالصیت کی تو میں نے خود ہی کہیں لکھا ہے

ن کی خالصیت کا انحصار اس پر ہے کہ اس میں کتنی آمیزش ہے ویسے یہ طے ہے کہ ـــــــ DELIBERATE SYMBOLISM IS HAZARDOUS FOR ART CAN BE PURE BY VIRTUE OF THE IMPURITIES IT ASSIMILATES'

ر نئے شعرا اور ادبا کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ انہیں نئی تنقید کی روشنی میں اپنے فن کی تخلیق کرنے کا خبط سوار ہو گیا ہے۔ بلراج کومل نے اپنے مضمون ’’شاعری اور فکشن کی فرضی حد بندیاں‘‘ میں لکھا ہے ـــــــ ’’استعارہ اور علامت، حالانکہ تمام فنون کا بنیادی وصف ہیں۔ فکشن میں اس کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ فکشن کی حد بندی میں، فینٹسی کی سی فضا میں ملفوف استعارہ اور علامت کی سرگرم پیش قدمی نے بہت بڑی دراڑیں پیدا کی ہیں۔‘‘ بلراج کومل بھی نثر اور شاعری کے فرق کو سمجھانے کی اپنے طور پر کوشش کی ہے، اور بڑے بڑے ناول نگاروں کے نام بھی جا بجا پیش کئے ہیں۔ لیکن دیکھنے والی بات صرف اتنی سی ہے کہ فن میں ہیئت ہی سب کچھ نہیں، موضوع بھی ہوا کرتا ہے اور بلراج کومل کسی فنکار کو صرف اس طرح سے پیش کریں کہ اس کے یہاں ہیئتی سطح پر کتنے تجربے ہوئے ہیں اور کیا کیا تجربے ہوتے ہیں تو پھر یہ تو تصویر کا ایک ہی رخ کہا جائے گا اور تصویر کا دوسرا رخ تو یہ ہے کہ فن کے پرکھنے میں ہم ان غیر ادبی معیاروں کو بھی سامنے رکھ کر چلیں جو فن کے لئے محرک ثابت ہوتے ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ،

"LITERATURE CAN NOT BE DESCRIBED COMPLETELY IN TERMS OF LITERATURE."

نئے افسانہ نگاروں میں علامتی افسانے لکھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے، ہر چند کہ میری رائے میں ان نئے ناموں میں، معدودے چند نام ہی ایسے نکل سکتے ہیں جن سے توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں، اور ان چند ناموں میں سلام بن رزاق بہر حال ایک ایسا معتبر نام ہے، جس نے بہت کم مدت میں ہی ایک معیار اور مرتبہ حاصل کر لیا ہے ’’ننگی دوپہر کا سپاہی‘‘ ان کا ایک قابلِ ذکر افسانہ ہے۔ ننگی دوپہر اور ننگی دوپہر کی تیز دھوپ دراصل جبر، استبداد اور استحصال کی علامت ہے جس میں آج کا انسان جھلس رہا ہے۔ عصر حاضر نے آج کے انسان سے اس کی زندگی چھین لی ہے۔ عوام، اس نظام کو بدل دینے کی آرزو تو رکھتی ہے لیکن وہ وسائل نہیں رکھتی، جو اس تبدیلی کے لئے ضروری ہیں۔ دانشور طبقہ، صرف علم اور دانش کے سمندر میں غوطہ زن ہے، لیکن بے عمل اور بے حس و حرکت۔ انجام کار صورتِ حال یہ ہے کہ سارے مسائل ایک سوال کی صورت میں سامنے آتے ہیں ـــــــ ’’یہ دھوپ کب ڈھلے گی؟ ہمارے گرد روز بروز تنگ ہوتی ہوئی دیواریں کب گریں گی؟‘‘

سلام بن رزاق کی دیگر اہم کہانیوں میں ’’درندہ‘‘ اور ’’کالے ناگ کے پجاری‘‘ بھی غور و فکر کی متقاضی ہیں۔ ’’درندہ‘‘ کا موضوع ہے، حکمراں طبقے کا اپنے اقتدار کی خاطر، عوام میں نفرت پھیلانے والی سیاست، اور معاشرے میں عدمِ اعتمادی اور غیر یقینیت کی فضا قائم کرنا۔ ’’درندہ‘‘ کا اختتام بہت ہی خوبصورت ہے۔

’’جو بھی ہو، فاتح گروہ کو اطمینان تھا کہ دشمن کے درندے کا قضیہ بھی ختم ہو چکا ہے وہ سب مالِ غنیمت لئے عورتوں کو لونڈیاں اور بچوں کو غلام بنا کر ظفر مندی کے نشے میں جھومتے ہوئے اپنی بستی کی طرف لوٹے مگر وہ سب اس بات سے بے خبر تھے کہ اب بھی ایک سایہ دبے پاؤں ان کے پیچھے چلا آ رہا ہے۔‘‘

’’کالے ناگ کے پجاری‘‘ ـــــــ سلام بن رزاق کی ایک خوبصورت اشاریتی کہانی ہے۔ کہانی مختصراً یہ ہے کہ ایک بڈھا، کہانی سناتا ہے اور لوگوں کو ڈر اور خوف سے محفوظ رکھنے کے لئے کہانی کا انجام بدل دیتا ہے۔ اور کہانی طربیہ بن جاتی ہے۔ افسانہ نگار، کہانی کے انجام کے بارے میں مشکوک رہتا ہے اور بڈھے سے تنہائی میں صحیح بات دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بڈھا کہتا ہے کہ ـــــــ ’’ورنہ حقیقتاً کالے ناگ کے پجاری آج بھی زندہ ہیں اور ان کا خونی کاروبار بھی اسی طرح جاری ہے۔‘‘ یہ کالے ناگ کے پجاری کون ہیں؟ اور ان کا خونی کاروبار کیا ہے؟ یہ دونوں ہی باتیں علامت کے طور پر استعمال ہوتی ہیں اور گہری سماجی معنویت کی حامل ہیں۔ دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ کالے ناگ کی علامت خونی کاروبار کی علامت سے ہم آہنگ ہے۔

ان کہانیوں کے علاوہ نئے افسانہ نگاروں کی بعض نمائندہ تخلیقات ہیں ’’خالی پٹاریوں کا مداری‘‘ (اقبال متین) ’’دو بھیگے ہوئے لوگ‘‘ (اقبال مجید) اور ’’چورا ہے پر ننگا آدمی‘‘ (انور قمر) موخر الذکر کہانی کا اہم پہلو شاید یہ ہے کہ آج کا انسان، لاسمتیت کا شکار ہے اور یہ نہیں جانتا کہ کون سی راہ اس کے لئے فلاح کی راہ ہو گی اور اسے کہاں جانا ہے ـــــــ ذیل کا اقتباس ایک خوبصورت سوال بن کر

سامنے آتا ہے ــــــ کہ اس مکالماتی اندازِ گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آج کا انسان نظریات کے ہجوم میں گھرا ہے اور اپنی منزل اور اپنی راہ دونوں ہی سے ناواقف ۔

"تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"تم ہی بتاؤ، تم سب کہاں جانا چاہتے ہو؟" اس نے وہی سوال ان سے کر دیا۔

"ہم کہاں جانا چاہتے ہیں ... ہم کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

وہ سب ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے۔

چوراہے پر ننگے آدمی نے قہقہہ لگایا ــــــ ہا... ہا... ہا

"جب تمہیں خود ہی نہیں معلوم اور تم سبھوں کو نہیں معلوم کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو، تو یہ سوال تم نے مجھ سے کیوں کیا؟

اپنے آپ سے ہی پوچھ لیتے؟"

"تم مہان ہو" وہ سب بولے۔

"اس لئے کہ میں چوراہے پر لٹک رہا ہوں" ــــــ (چوراہے پر ننگا آدمی۔ انور قمر)

"دو بھیگے ہوئے لوگ" (اقبال مجید) کی ایک ایسی کوشش ہے جہاں سرمایہ دار طبقے کی گھٹن افسانے کا موضوع قرار پاتی ہے۔ ان کہانیوں کے علاوہ بعض ایسی خوبصورت کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں، جن کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنا انصاف اور دیانت داری کے خلاف ہوگا۔ تمثیلی طور پر رام لعل کی کہانی "اکھڑے ہوئے لوگ" قاضی عبدالستار کی کہانی "مالکن" اور پھر لکھنؤ کے شیعہ سنی کشیدگی سے متاثر ہو کر لکھی گئی عابد سہیل کی کہانی "سوا نیزے پر سورج" اور اس کے علاوہ رتن سنگھ کی کہانی "پنجرے کا آدمی" ــــــ یہ سب کہانیاں تفصیلی مطالعے اور تنقیدی تجزیے کی متقاضی ہیں کہ میری رائے میں یہ نئی افسانوی روایت میں گراں قدر اضافے کے مصداق ہیں۔

اب آئیے کچھ تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل کی جانب ــــــ گزشتہ چند برسوں میں نسبتاً نئے لکھنے والوں میں دو نام بہت تیزی سے اُبھر رہے ہیں یہ نام ہیں عبدالصمد اور عبید قمر ــــــ عبدالصمد کی انفرادیت کا راز یہ ہے کہ ان کے یہاں معاشرے کی شکست و ریخت، علامتی انداز لئے ہوئے افسانوں میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ ان کی بعض خوبصورت کہانیاں ہیں "کال بیل" "چند غیر مصدقہ واقعات" اور پھر "جانی انجانی راہوں کے مسافر" ــــــ آخرالذکر کہانی کا یہ پیراگراف خوب صورت ہے اور توجہ چاہتا ہے۔

"آگ کا کیا ہے، پھر کہیں مل جائے گی اور نہ بھی ملے گی تو دو آدمیوں کی یکجائی خود ایک آگ سے کم ہے کیا؟ اتنا سن کر میں نے اپنے اندر تہہ در تہہ رکھی ہوئی آگ نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ آگ پا کر وہ بے حد خوش ہوا اور میرا بے حد شکریہ ادا کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ تمام کام چھوڑ کر پہلے وہ کام کرے جو اسے کرنا چاہئے۔ چنانچہ وہ آگ لے کر اپنی کشتی کے پاس گیا لیکن بجائے کشتی چلانے کے وہ اس میں سوار ہو گیا اور چپّو چلاتا ہوا دور ہٹ کر مجھ سے بولا کہ "بھیّا معاف کرنا اتنی سی آگ کے لئے میں نے کہاں کہاں نہیں سر پھوڑا، وہ آگ تم سے ملی۔ اگرچہ تم اسے دھوکا کہو گے لیکن میرا کام بن گیا۔ اب دیکھتا ہوں وہ کم بخت دریا میرا کیا بگاڑ لیتا ہے"

(جانی انجانی راہوں کے مسافر۔ عبدالصمد)

عبید قمر کا افسانوی مجموعہ "آخری کش" ایک خوبصورت افسانوی مجموعہ ہے۔ یوں تو اس مجموعے کی اکثر کہانیاں معیاری ہیں لیکن بطورِ خاص "مجرم"، میری رائے میں بہت ہی خوب صورت کہانی ہے۔ یہ کہانی سماج کے اس طبقے کے افراد سے متعلق ہے، جنہیں سماج نے اس درجہ کچل کر رکھ دیا ہے کہ نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے ہیں۔ "بھولی" کا کیریکٹر بہت ہی جاندار ہے، جو استحصال کے بھینٹ چڑھ جاتی ہے اس معصوم سی بچّی کی موت کا ذمے دار کون ہے؟ یہ سوال دماغ کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہم سب مجرم ہیں اور اس مشترکہ احساسِ جرم کے بندھن میں سارا سماج جکڑا ہوا ہے۔ عبید قمر نئے افسانہ نگاروں میں اہم کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کی نظر

گہری ہے اور ان کے یہاں کہانی پن کے اخراج کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی کہانیاں عام قارئین سے بھی داد و تحسین حاصل کر لیں گی۔ اور اس کے باوجود، ان کے ادبی معیار و مرتبہ میں فرق پیدا نہ ہوگا۔ ویسے سچ تو یہ بھی ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کو شدّت سے قاری کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ افسانوں کو تجربات کی جولان گاہ کچھ اس طرح بنا دیا گیا کہ اس پروسیس میں اصل آدمی ہاتھ سے نکل گیا اور وہ ہے قاری۔ یہ صورت حال ہندوستان میں شدّت سے تو محسوس ہو ہی رہی تھی، اب پاکستان میں بھی بڑی شدّت سے محسوس ہو رہی ہے۔ احمد ہمیش کا یہ اقتباس اسی مسئلے کی جانب نشان دہی کرتا ہے۔ میری رائے میں اس اقتباس کا آخری پیراگراف، نئے لکھنے والوں کے لئے بہ طورِ خاص اہم ہے۔

"دراصل پچھلے چار برسوں کے عرصے میں اردو نئی کہانی میں جو واضح تبدیلی آئی ہے۔ وہ ہے بیان کی سادگی اور تہہ داری مگر قدرِ اظہار کا انوکھا پن بہ دستور موجود ہے۔ جس کی نشاندہی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے دس سال پہلے اپنے ایک مضمون میں یوں کی تھی کہ اس عہد کی رُوح انوکھے پن میں ہے۔ مگر اب انوکھے پن کی خواہش تجربۂ محض سے نکل آئی ہے۔ اب پاکستان میں ایسی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں جو ۱۹۸۵ء سے پہلے کی FOSSILISED جدیدیت سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً نعیم اعظمی نے ۸۰۔ ۷۸ کے عرصے میں مجرّد جدیدیت سے انحراف کے طور پر کئی کہانیاں لکھی ہیں۔ خاص کر "شایان" "لایموت" اور "کوڑھی" قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں پوری ماجرائیت کے ساتھ قاری کو پینورامائی وژن میں لئے چلنے کی صلاحیت ہے۔ اصل مقصد کی وضاحت اور اس سے گمبھیر ہونے کی مثال مسعود اشعر کی کئی کہانیوں میں ملتی ہے۔ خاص کر "آنکھوں پر دونوں ہاتھ" ویسے مسعود اشعر بے ضرورت علامتی اور استعاراتی ٹریٹمینٹ سے کام نہیں لیتے۔ اس طرح علامتی اور تجریدی اظہار کی ظاہریت سے بے نیازی کے طور پر اکرام اللہ کی کہانی "بگّی اور نقلی چوکیدار" اور مستنصر حسین تارڑ کا ایک ناولٹ "فاختہ" کو گزشتہ چند برسوں میں پاکستان کے ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ اسی طرح نگہت رضوی کی کہانی "وبا" میں ہمارے شہری معاشرے کی زرد صحافتی اشتہار انگیزی کا واضح علامتی بیانیہ میں ملتا ہے۔ دراصل اب پاکستان کے کہانی کار شدّت سے قاری تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ امراؤ طارق، رخسانہ صولت، افسر آذر، زاہدہ حنا، اقبال فریدی، فاطمہ حسن، کاظم رضا، انور احمد زئی، فردوس حیدر، طاہر مسعود، اظہر نیاز، نزہت رضوی، منظر امام، یہاں تک کہ ۶۰ کی نسل کے ایک ابہام پسند کہانی کار سمیع آہوجہ کو بھی اب قاری کی بے حد ضرورت ہے۔ ۶۰ کی نسل کا ایک اور کہانی کار ریحان صدّیقی تو اپنے اس موقف پر زور دے رہا ہے کہ اردو کہانی کی ادبی قدر و قیمت کا تعیّن اب اس پر منحصر ہے کہ وہ عام قاری تک بھی پہنچے۔" (پاکستان میں ۷۰ء کے بعد کی نئی اردو کہانی۔ احمد ہمیش۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل۔ مرتب گوپی چند نارنگ ص ۵۴۳)

اب تک عہدِ حاضر کے چند نمائندہ افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ تو بہر حال صاف طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں اردو افسانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور یہ سچ ہے کہ نئے افسانوں میں نہ صرف زندگی کی پیچ در پیچ حقیقتیں، سیاسی و معاشرتی زندگی کے متضاد، متنوع اور رنگارنگ پہلوؤں اور انسانی کشمکش کو دیکھا جا سکتا ہے بلکہ اس کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تہہ میں اس سماج کو بدلنے کی، جو تخلیقی قوتیں پروان چڑھ رہی ہیں، ان کا صحیح ادراک اور ان کی فن کارانہ مصوّری میں، ہمارے افسانہ نگار کسی سے پیچھے نہ رہے ہیں۔ پھر یہ بھی درست ہے کہ موجودہ دور میں افسانہ نگاری کے فن میں، دنیا کے ادب نے عالمی سطح پر، جو ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں ان سے حسبِ توفیق استفادہ اور انھیں اپنی روایات سے ہم آہنگ کر کے ہمارے ادیبوں نے اردو افسانے کو بیسویں صدی کے فنی معیار اور سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ اور بہت سے افسانہ نگار ایسے

ب، جنھوں نے اپنے فنی اکتساب سے اس ذخیرے میں اضافہ کیا ہے اور اپنی بعض تخلیقات میں، کہیں کہیں، اس سطح کو چھو لیا ہے، جو فن کے مطالبات
ر پورا کرتی ہے۔

رہی بات منٹو کی عظمت اور بلندی کی، تو اس سلسلے میں ایک اہم بات جو، رہ گئی تھی، کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس بات کی روشنی میں،
ٹو کے طریقۂ کار کی بھرپور وضاحت ہو جاتی ہے کہ ذیل کا اقتباس، میری رائے میں بے حد اہم ہے اور منٹو کی فطرت کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

"کچھ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ دنیا کے ہر مہذّب ملک اور مہذب سماج میں یہ اصول مروّج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے صرف محاسن بیان کئے جاتے ہیں اور عیوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذّب سماج پر، ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخّص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔

میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہ ہو سکی، اس کے منہ سے گالیوں کے بجائے پھول نہیں جھڑا سکا، میراجی کی غلاظت پر مجھ سے استری نہ ہو سکی اور نہ اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اسکا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔" (گنجے فرشتے ص ۲۴۷)

منٹو کی عظمت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بناؤ سنگار کرنا نہیں جانتا تھا۔ اور یہ صفت، نجی زندگی اور فن دونوں ہی
طحوں پر اس کی معاون اور، مددگار رہی ہے اور آج کا المیہ یہ بھی ہے کہ ایک عجیب قسم کا INVERSION وجود میں آگیا ہے کہ
عض فن کار، جن کی اپنی شناخت بھی ہے اور اپنی شخصیت بھی، اپنی تہذیب بھی ہے اور اپنے تہذیبی اقدار بھی، خواہ مخواہ میک اپ
ر کے، اپنی شخصیت کو بگاڑنے پر تل گئے ہیں۔ یہ درست کہ میک اپ کر لینے سے، یا کسی عجیب و غریب لباس اور وضع قطع اختیار
ر لینے سے شکل و شباہت کچھ اس طرح مسخ اور پراگندہ ہو جاتی ہے کہ شناخت کا مسئلہ دشوار ہو جاتا ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر کہ
ہت سارے فن کار اپنے فن میں میک اپ کر کے آنے لگیں تو یہ جدّت طرازی فیشن بھی بن سکتی ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہی ہے کہ
پ چاہے جتنا بھی میک اپ کریں، لیکن نہ تو آپ کی شخصیت ہی بدلے گی اور نہ ہی آپ کی فطرت اور آپ کا مزاج اور کیا پتہ کہ آپ
امیڈی کے کیریکٹر کی طرح بن جائیں ؟ آخر الکلام یہ کہوں گا کہ فن بہر حال شخصیت کا اظہار ہے اور فن کار کو بے رحم زمانے کے جبر
استبداد سے سمجھوتا کئے بغیر اپنی شخصیت کے گہرے نقوش اپنے الفاظ اور ان کے استعمال سے اپنے فن پر کچھ اس طرح ساتھ ساتھ
بت کرتے جانا ہے کہ افسانے یا ناول کی روح پلاٹ میں نہ مل سکے ـــــــ اس لئے کہ اس کی روح تو فنکار کے ساتھ ساتھ دھڑکتی ہے۔

زرِ سالانہ ختم ہونیکی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری نومبر ۱۹۸۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ ازراہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۴۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

روز کا قصّہ

جیلانی بانو ● ۱۷۸ - اے معظم پورہ - حیدرآباد

بہت دن ہوئے۔

ورانڈے کے بیچوں بیچ بھاسکر نے زنجیر سے باندھ کر ایک گڑیا لٹکا دی تھی۔ بچّوں کی دل چسپی کے لئے۔

جب تیز ہوا کے جھونکے اسے دھکے دیتے تو وہ ہولے ہولے یوں حرکت کرنے لگتی، جیسے سچ مچ چل رہی ہو ——— ممّی کی طرح ——— تیز ہواؤں نے گڑیا کے بال بکھیر دئے تھے کپڑوں پر مٹی دھول جم گئی تھی ——— صورت پر ٹھیکرے برستے۔ گڑیا کے ———؟ اوہ، ممّی کے۔

کبھی جب ٹی وی پر کوئی مذاحیہ پروگرام آتا تو سب کے قہقہوں کا شور سن کر ممّی بھی ڈرائننگ روم میں آکر بیٹھ جاتی ہے یا کسی وقت لان میں چلی جاتی تو کیسا عجیب سا لگتا ہے نا۔ بچّوں کو اور بھاسکر کو اپنی چیزیں وہاں سے ہٹانا پڑتی تھیں کہ ممّی کے لئے وہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر ہی ٹھیک لگتی ہے نا۔

وہ تو صرف کچن دیر تھی۔ کچن سے ڈائننگ ٹیبل تک دوڑتی رہتی تھی۔ زنجیر سے بندھی گڑیا کی طرح۔ بال بکھرائے۔ میکسی پر سالنوں کے دھبّے۔ صورت پر ٹھیکرے برستے۔ گڑیا کے۔ اوہ ممّی کے۔

ممّی کو سب ممّی کیوں کہنے لگے، خود ممّی کو بھی اب یاد نہیں رہا۔ اس کی پڑوسنیں کہتیں ——— شیکھر کی ممّی ——— بھاسکر بچّوں سے کہتا ——— تمہاری ممّی ——— ممّی سے کہتا ——— شمی کی ممی۔

اور کسی کا فون آتا تو ممّی کہتی۔

”میں ہیپّو کی ممی بات کر رہی ہوں!“

”کیا میں مسز بھاسکر ریڈی سے بات کرسکتا ہوں؟“

”جی ——— جی ہاں۔ میں مسز بھاسکر ریڈی ہی بات کر رہی ہوں!“ ممّی کو بڑی مشکل سے یاد آتا کہ وہ مسز بھاسکر ریڈی بھی ہے۔

اب ممی کے ہر انگ میں سالنوں کی بُو رچ چکی ہے۔ اسی لئے تو کبھی کبھار بھاسکر کی باسی کڑھی میں ابال آتا تو وہ ممی کو سونگھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ سڑی ہوئی دال کے خراب ذائقہ سے اس کا منہ بھر جاتا تھا۔ ممی نے ہمیشہ وہ خراب بدمزہ کھانا کھایا جو کوئی نہیں کھاتا تھا۔ بھاسکر کو یوں لگتا جیسے اب ممی سالنوں اور اچاروں میں گھل گھل کر اپنا مزہ کھو چکی ہے۔

اب گھر کے سارے لوگ ممی کو بھون کر کھا سکتے ہیں۔ دھو کر نچوڑ سکتے ہیں۔ چبا چبا کر نگل سکتے ہیں اور کڑواہٹ کی طرح تھوک سکتے ہیں۔

اپنی ماں کی ضد کے آگے ہار مان کر رانی کی بجائے جب بھاسکر ممی کو دلہن بنا کر گھر لایا تو ممی بھاسکر کی بے رخی سے گھبرا کے کچن میں جا کھڑی ہوتی شاید وہ بیوی بننے کا عذاب جان چکی ہو اور کھولتے ہوئے تیل میں ڈوب دینے کو تیار رہو۔

اکتا کر ایک دن بھاسکر پریشر کُکر خرید لایا۔ جیسے وہ زبردستی ممی کو گھلا دینا چاہتا ہو۔ منٹوں میں ہر چیز پک کر تیار۔

مگر ممی اس کے لئے تیار نہ ہوتی۔

سوں ——— سوں ——— سوں ——— گوشت ترکاریاں نرم کر دیتیں۔ نگل جانے کو تیار ——— خوب اچھل کود کرتیں۔

نے گھبرا کر بھاسکر کو دیکھا —— کبھی پریشر ککر کو —— اتنا ظلم —— ؟ کسی کو زبردستی گھلا دینے، گلا دینے کی ضد کیوں کرتا ہے
دی —— ! اس دن سے پریشر ککر شیلف میں رکھا تھا اور ممی چولھے کے اوپر بیٹھی گلتی رہتی۔ گھلتی رہتی تھی —— دھیرے دھیرے
ی دھیمی آنچ پر —— اس میں ابال کب آتا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا۔

"پاگل ہے یہ عورت"! بھاسکر طے کر چکا تھا۔ سوائے سالن جلانے کے اس نے زندگی بھر کچھ نہیں کیا۔

پھر بھی بچوں کے لئے لٹکتی ہوئی گڑیا کو وہ جھولا جھلاتے ہوئے دالان سے گزرتا تھا۔

دو دن کے بعد تھکی ہاری شمی پکنک پارٹی سے آتی تو اس نے بھی گڑیا کو ایک ٹھوکا دیا۔

"ممی —— ممی کٹ لٹ بناؤ نا آج —— کٹ لٹ —— اندر قیمہ —— اس کے اوپر آلو —— اس کے اوپر انڈے
یسٹ —— اس کے اوپر چٹنی —— پھر ٹماٹر کا ساس انڈیل دو —— مجال ہے کہ اب کچھ نظر آئے —— بناؤ نا ممی آج۔
می کی تیز نظروں سے گھبرا کے جرسی کا کھلا ہوا ایک لگاتی ہے —— سچی، کٹ لٹ کتنے بھید چھپا لیتا ہے۔ جتنی بار دانتوں تلے آئے نیا مزہ
بھید۔

بے چاری ممی چیٹ پٹ کٹ لٹ بنانے میں جٹ گئی۔ بھید چھپانا اس گھر میں اسی کی ذمہ داری ہے نا۔

کھلے بال، ڈھیلی ڈھالی میکسی پہنے، ماتھے سے پسینہ پونچھتی ہوئی ممی —— سالنوں میں سنے ہوئے ہاتھ لئے، کچن سے کھانے کی میز
، دوڑتے دوڑتے جانے کتنا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔

(ایک دن ممی نے بھی یہ بات سوچی تھی) اگر اسی حساب سے وہ چلتی رہتی تو آج جانے کہاں پہنچ جاتی۔ مگر سامنے بھاسکر کو بیٹھا دیکھ کر
ہ سہم گئی۔

ور انڈے میں سے شیکھر گزرا تو اس کے سر سے ٹکرا کے گڑیا جھولنے لگی۔ نیچے کرسی پر بیٹھے ہوئے بھاسکر کی سفید دھوتی پر بہت سی
ول جا پڑی۔

(ایک دن اس گڑیا کو جھاڑ پونچھ کر صاف کرنا ہے۔ یہ پلان بھاسکر نے برسوں سے بنا رکھا ہے)

ممی کے ہاتھوں میں جتنی ریکھائیں تھیں، اتنے ہی داغ لگے تھے۔ یہ چوکا روٹی پکاتے میں لگا تھا۔ یہ زخم رانی کے لئے کبابوں کا گوشت
تے میں۔ یہ شیکھر کی دال کے بگھار کا داغ ہے۔ اور یہ بھاسکر کے ——

"ممی آپ کو یہ کیسے یاد رہتا ہے کہ کون سا داغ کب لگا تھا؟ سفید بے داغ جلد والی شمی تعجب سے پوچھتی ہے۔

"جب چرکا لگتا ہے نا تو —— تو —— ممی کی سمجھ میں نہیں آتا اس تکلیف کا اظہار اپنی بیٹی سے کیسے کرے۔ اس نے تو ہر دکھ کو
رد کو سینے ہی میں اتارا تھا —— سدا ——

جب ہاتھ جلتا تھا تو ممی آنکھوں میں آنسو لئے سسکیاں بھرتی۔ کچن سے باہر آتی اور ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر زخم پر پھونکیں مارنے لگتی تھی۔

"ممی جلدی سے انک لگا لیجئے"! بیٹا ممی کو انک دینے کی بجائے BONY M کا کیسٹ لگانے بیٹھ جاتا ہے۔

کیا ابھی ٹھنڈک نہیں پڑی —— ؟ بھاسکر اخبار رکھ کر ممی کی طرف دیکھتا ہے۔

"ارے آٹھ بج گئے۔ آفس کا ٹائم ہو رہا ہے"!

ممی گھبرا کے اٹھتی۔ اور جلدی جلدی جلتی انگلیوں سے کڑھائی میں پوریاں چھوڑنے لگتی ہے۔

جس دن ممی کا ہاتھ جلتا ہے تو شمی کو یاد آتا کہ ممی بھی گوشت پوست کی بنی ہوتی ہے۔ اسے چرکا بھی لگتا ہے۔

"اتنی جلدی جلدی کام کیوں کرتی ہیں ممی آپ! شمی کو ممی سے بڑی ہمدردی ہے مگر گھر کے کاموں میں اس کا جی نہیں لگتا۔ اور پھر کالج
پڑھائی فرصت بھی دے۔

ممی روز صبح یہی ارادہ کرتی ہے کہ جلدی اٹھے۔ مگر جوڑوں کا درد چین ہی نہیں لینے دیتا۔ رات کو نیند ہی کہاں آتی ہے!

آدھی رات تک وہ کروٹیں بدل بدل کر سوچے جاتی ہے۔ صبح پہلے برتن دھوؤں یا سبزی بناؤں! ماش کی دال ختم ہو گئی۔ کل صبح بازار بھی جانا ہے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ صبح تم شہر بازار چلی جاؤ۔ ذرا تفریح بھی ہو جائے گی۔ لنچ کے لئے دیر بھی ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔"

بے چارا بھاسکر کتنا قناعت پسند شوہر ہے۔ بیوی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار۔

جب ممی پندرہ کلو چاول اور دس کلو ونیلی پیکٹس سنبھالے ہانپتی کانپتی گھر آتی ہے، تو سب یہی سوچتے۔ آج تو ممی خوب آؤٹنگ کر کے آتی ہے۔ چلو اچھا ہے۔ بے چاری دن رات چولھے کے گھسی رہتی ہے۔

ممی کو یوں لگتا ہے جیسے اس کے ساتوں بچے ایک ساتھ پیدا ہوتے تھے۔ اور ایک ساتھ بڑے ہو گئے۔ ممی ان کے سامنے گھٹنے لگی۔ گھٹتے گھٹتے اتنی چھوٹی ہو گئی کہ اب اپنے بچوں کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے۔

وہ کتنی احمق ہے۔ کتنی جاہل ہے۔ اس کی حماقتوں سے گھر والوں کو کتنی تکلیف پہنچتی ہے۔ ہر دن اس پر نئے نئے انکشاف ہوتے ہیں۔ اس لئے جب اس کے بچے اپنے قابل باپ کے ساتھ مل کر ممی کی حماقتوں پر ہنستے ہیں تو ممی کچن میں کباب جلانے کھڑی ہو جاتی ہے۔

"تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پھر پکانا۔"

جب بھاسکر اتنے میٹھے لہجے میں بات کرتا ہے تو ممی چونک پڑتی ہے۔ مگر پھر کڑواہٹ میں ڈوب جاتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ بھاسکر کی اس نرم بات کے پیچھے تلوار کی انی جیسی کوئی بات ضرور چھپی ہو گی۔

"مجھے کل صبح رانی کے گھر جانا ہے۔ اس کے لڑکے کا ایڈمیشن کروانا ہے۔"

جس دن بھاسکر کو اپنی محبوبہ رانی کے گھر جانا ہوتا وہ رات ہی سے ممی کو کسی نئی ڈش میں الجھا دیتا۔ تاکہ ممی کریلوں کی کڑواہٹ نکالنے میں کوئی اور کڑواہٹ نہ چکھ سکے۔

جب ممی نئی نئی دلہن تھی تو ایک دن بھاسکر نے بتایا۔

"تمہارے بناتے ہوئے کباب رانی کو بہت پسند آئے۔ آج اس کے گھر پارٹی ہے۔ بہت سے کباب بنا دینا۔"

رانی کو اس کے کباب پسند آئے! ممی خوش ہو گئی۔ مگر بعد میں ممی کو پتہ چلا کہ رانی کو تو اس کی ہر چیز پسند تھی۔ ممی کے پتی سے لے کر اس کا گھونگھٹ تک رانی کو میٹھی چیزیں پسند تھیں مگر بھاسکر تو اسے بہت میٹھا لگتا تھا۔ اتنا میٹھا کہ وہ اسے چیونٹی کی طرح چٹ کر جاتی۔ مگر رانی کا پتی بیچ میں آ گیا۔ ویسے بھی رانی مردوں کو صرف چکھ کر چھوڑ دیا کرتی تھی۔ بھاسکر جیسا میٹھا ہو تو اور دو چار دن ـــــ ورنہ آج تو۔

مگر بھاسکر کا مزہ کچھ اور ہی تھا۔ سو وہ ایک دن راکھی لے کر آئی اور بھاسکر کی کلائی پر باندھ دی۔ بس اب تو سب کے کلیجوں میں ٹھنڈک پڑ گئی نا ـــــ!

اب بھاسکر بلا خوف رانی کے لئے کباب اور حلوے لے کر جاتا ہے۔ رانی کے لئے تحفے خریدے جاتے ہیں۔ دونوں پکچر دیکھنے جاتے ہیں۔ رانی کا ہر کام اب بھاسکر کے ذمہ تھا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے لے کر بچوں کے ایڈمیشن تک۔ اب اس کے پتی کو بڑا آرام ہو گیا تھا۔ وہ کلب میں بیٹھا بیر پیتے جاتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ رمی کھیلتا۔ رانی تاش کی ملکہ ہوتی اور سب کھیلنے والے احمق چڑی کے غلام۔

اس دن سات بچوں کی تیز نگاہوں سے گھبرائی ممی، کچن میں اپنی دال گلانے چلی گئی۔ بار بار چکھ کر دیکھتی ـــــ ابھی کچی ہے۔ پھر جب سب چلے گئے۔ شمی اکیلی رہ گئی تو ممی اپنی ساری ہمت کو سمیٹ کر ڈرتے ڈرتے بولی۔

"آج کا پیپر دیکھا شمی ـــــ! ایک کالج کی لڑکی کو دو لڑکے دھوکا دے کر لے گئے۔ بے چاری کو کہیں کا نہ رکھا!" ممی جلدی جلدی کیریاں کاٹنے میں سسکیاں لینے لگی۔ جیسے یہ حادثہ شمی کے ساتھ ہوا ہو۔

"کہیں کا کیوں نہ رکھا ـــــ؟" شمی نے یہ بات ممی سے نہیں پوچھی۔ وہ چائے بنانا چھوڑ کر ممی کے پاس آ کھڑی ہوتی۔ کچی کیریوں سے کھیلنے لگی۔

"اب تو وہ لڑکی ہر مرد سے ڈرنا چھوڑ دے گی۔ مزے میں گھوما کرے گی ـــــ" مگر یہ بات بھی ممی شمی سے نہیں کہتی۔

"دھوکا دے کر کیسے لے گئے ممی! وہ بدمعاش لڑکی ہی اپنی مرضی سے گئی ہو گی۔ آپ کو نہیں معلوم ممی کہ کالج میں ـــــ"

"کالج میں کیا ہوتا ہے!" ممی نے گھبرا کے پوچھا۔ وہ کیری کاٹتے کاٹتے رک گئی تھی۔

کٹی ہوئی کیریوں سے کھیلتے کھیلتے، اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو پیچھے جھٹک کر شمی نے کیری کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا۔

"اوہ ——— کتنا کھٹا ہے ——— میرا مطلب ہے ممی ———"

وہ کیری چباتے ہیں بولی۔

"بعض لڑکیاں ممی ——— ممی ہمارے کالج میں بعض لڑکیاں کیا کرتی ہیں معلوم ——— ؟" اس نے پھر کیری کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا

"ممی اب ان کا اچار بنے گا نا ——— ؟"

چٹ پٹے کھٹے اچار کا مزہ شمی کے منہ میں گھلنے لگا۔ اس نے تھوک نگل کر گھڑی دیکھی۔

"ارے! ساڑھے نو ہو گئے۔ میں کالج جاؤں"

"مگر آج تو سٹرڈے ہے۔ تمہاری کلاس گیارہ بجے سے ہوگی"

اف ——— ممی کی میموری تو کلنڈر ہے۔ کبھی بھولے سے کوئی بات کہہ دو۔ جھٹ یاد کر لیتی ہیں۔

"مگر آج تو اسپشل کلاس ہے ممی"

اچانک شمی نے ممی کے چہرے پر جانے کیا دیکھا کہ وہ جاتے جاتے رک گئی

"ممی آج اچار ضرور بنانا۔ سریندر کو بھی اچار بہت پسند ہے۔ پورا چاٹ گیا" شمی چائے بنانے میں ہنسنے لگی۔ جیسے ابھی تک سریندر کو اچار اٹھتے دیکھ رہی ہو۔

"کون سریندر!" ممی نے اسے غور سے دیکھا (دال گل چکی تھی)

"وہ میرا ——— میرا کلاس فیلو ہے" اور شمی کو یاد آیا ممی کہتی ہے کسی لڑکے سے بات مت کرو۔ اس کے ساتھ لنچ مت کرو۔ جانے کیوں ممی کو لڑکوں سے ڈر لگتا ہے۔ شاید بچپن میں انھیں کسی نے ڈرا دیا ہوگا!

"او! ممی آپ سمجھتی کیوں نہیں! ساتھ پڑھنے والے لڑکوں سے بات نہ کرو تو وہ دشمن بن جاتے ہیں"

پھر وہ چائے کی پیالی لے کر ممی کے پاس آ کھڑی ہوئی اور ممی کا دھیان کسی اور طرف کرنے کے لئے ممی کی طرف شرارت سے دیکھنے لگی۔

"اوہ ممی آپ کے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا ہے کلیجے سے لگا لو۔ اور پھر اس نے جھک کر پوچھا۔

"ممی ——— ممی آپ ڈیڈی سے پہلے کسی لڑکے سے ملی تھیں ——— ؟"

ممی چونک پڑی۔ جیسے اچانک شمی نے اس کی میکسی اتار پھینکی ہو۔

اب ننگی ممی چھپے تو کیسے ——— جائے تو کدھر! اور گھبراہٹ کے مارے وہ چاقو رکھ کر شمی کو دھکیلنے لگی۔

"چل ہٹ چڑیل" ممی کو بچوں کے سامنے بڑا اپنا نہیں آتا تھا

"میں نے تو اس سے کبھی بات بھی نہیں کی"

"کیوں! کیوں ممی! کیا تمہارا جی نہیں چاہتا تھا؟ بکھرے بال منہ پر سے سمیٹ کر شمی نے غور سے ممی کو دیکھا"

"اگر میری دادی اس سے بات کرتے دیکھ لیتی نا تو چونڈا پکڑ کے اتنا مارتی کہ میں مر ہی جاتی" شمی نے دیکھا۔ ممی کے ہاتھ ہی نہیں چہرہ بھی بڑا پیارا سا تھا یا پھر اس وقت کسی خوبصورت یاد کا اجالا اس کے چہرے کو جگمگا گیا تھا۔

"اوہ ——— تو صرف دادی کے ڈر سے" شمی نے مٹھی بھر کٹی ہوئی کیریاں دھیرے دھیرے ٹرے میں گرا دیں۔

"تم کتنی پاگل تھیں ممی"

ڈیڈی سے پہلے ——— ڈیڈی سے پہلے۔ صرف دادی کے ڈرنے سے؟ تم کتنی پاگل تھیں ممی ——— ؟

شمی چلی گئی تو ممی سوچے جا رہی تھی ——— وہ روز اتنی کیریوں کا کچومر کیوں بناتی ہے۔ اتنی دیر تک دال کیوں گلاتی ہے۔ اتنے سالن کیوں

(باقی صفحہ ۴۳ پر دیکھئے)

کیا رشتہ کیا ناتا

فرخندہ لودھی ● ۱۷۶ - سیج بلوک، علامہ اقبال ٹاؤن-لاہور، (پاکستان)

"سکھ واقعی بے وقوف ہوتے ہیں۔ بھلا اس نے چالیس روپے نقد میں بیمار اور لاغر چھوکرا خرید لیا۔ کیا کرے گا اس کا؟ آٹھ دس برس پالے گا جب کہیں کام کاج جوگا ہوگا۔ نیما کے ابا میں تو سوچے جاتی ہوں اور حیران ہوئی جاتی ہوں" شکیلہ کی حیرانی، پریشانی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ اس کے شوہر جمیل نے زچ ہوکر کہا:

"اب تجھے کیا فکر؟ وہ چاہے جاکے چولھے میں گرے یا چوکے پہ بٹھائے۔ اپنا ہاتھ تو کچھ کھلا اور تیری نیما کا کھانا بچا۔ تو خوش ہو، نیما کے لئے دوائی آگئی اب وہ اچھی ہو جائے گی۔"

رات تاروں بھری تھی۔ وہ دونوں کھلے آسمان کے نیچے، پاس پاس لیٹے تھے۔ مطلع کئی روز کے بعد صاف ہوا تھا اور آج وہ اپنی ننھی بچی کیلئے شہر سے دوائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے تھے۔ ننھی نیما کئی دن کے بعد سکون سے سو سکی تھی ——— پکوڑوں اور لڈوؤں کا ذائقہ ابھی تک شکیلہ کے منہ میں موجود تھا۔ شکم سیر تھا اور برسات کی نرم ہوا ہلکورے دے رہی تھی۔ پانی میں بھیگے بستر پر سونا مشکل تھا۔ فضا میں سخت سڑاند تھی۔ لوگ مسلسل بول رہے تھے اور کچھ کراہ رہے تھے۔ صرف نیما ماں کے سینے پر اوندھی لیٹی خراٹے لے رہی تھی۔ آج اس کے پیٹ میں مروڑ نہیں اٹھا تھا آخر پیٹنٹ دوائی نے اپنا اثر دکھایا تھا۔

"نیما کے ابا! میں سوچوں ہوں چھوکرا رو تو نہیں رہا تھا۔" بیوی نے پوچھا۔

"وہ تو ایک روتی روح تھا ہر وقت ریں ریں کرتا رہتا تھا۔" جمیل نے بیوی کو مطمئن کرنے کے لئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ اس کو روتے دیکھ کر میری نیما بھی رو دیتی تھی۔ دیکھو، آج کیسے سکون سے سو رہی ہے ——— میں تو کہوں کہ وہ سکھ کتنا پاگل تھا۔"

"دنیا میں پاگلوں کی کمی نہیں۔ اگر دنیا میں احمق نہ ہوں تو داناؤں کے لئے وقت گزارنا مشکل ہو جائے۔ اب تو ہی بتا کہ نمک والی روکھی روٹی کھا کھا کر منہ کیسا پھیکا ہو رہا تھا اور نیما دوائی کے بغیر اللہ کو پیاری ہو جاتی۔"

"لیکن نیما کے ابا چھوکرا آپ کے پیچھے لپکا تو ہوگا۔ کچھ کہتا تو ہوگا۔"

"اب بڑی ممتا جاگ اٹھی ہے ——— بھلی لوگ جو میرا فرض تھا میں نے پورا کیا۔ خاوند کا کام ہے کہ وہ بیوی بچوں کا خیال رکھے۔ خواہ کیسے ہی۔ اور میرے لئے تو تم ہی سب کچھ ہو۔ میں تمہارے دم سے زندہ ہوں۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ مجھے دوسروں سے کیا غرض؟ یہ اتنے سارے لوگ جو ہمارے ساتھ اس کیمپ میں ٹھہرے ہوئے ہیں میرے کچھ نہیں لگتے۔ گو بظاہر اس وقت ہم سب کی قسمت ایک، منزل ایک ہے مگر ہم پھر بھی ایک نہیں۔ اس لئے کہ شکیلہ! جب تم اداس ہوتی ہو تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ نیما روتی ہے تو میں دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ آج صبح ہم سے چار گز کے فاصلے پر زخمی نوجوان لڑکی تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ مجھے ذرا بھی دکھ نہیں ہوا۔ اس لئے کہ رنج کرنے سے کیا فائدہ؟ میرے رنجیدہ ہونے سے مرنے والی واپس نہیں آسکتی اور اس کے رشتہ داروں کے آنسو تھم نہیں سکتے۔ تو ایسے ہی سسکیاں بھرتی رہی۔ دیکھو مصائب کے پہاڑ انسان پر ہی ٹوٹتے ہیں جگرے سے برداشت کرنا چاہئے۔ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ انسان کے بس میں کچھ نہیں۔ ذرا سوچو کس کا جی چاہتا تھا گھر بار چھوڑنے کو اور کیمپوں میں ذلیل ہونے کو۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا اور جو کچھ آگے ہوگا وہ بھی اس کی مرضی سے۔ اس کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا۔ ہم جو اپنی جگہ

اس میں کوئی بھید ہوگا جسے وہی جانتا ہے۔ اس کی حکمتوں کو دیکھو۔ عثمان کے ماں باپ دونوں ہی مر گئے۔ پھر سرجیت سنگھ جیسا پاگل بھیج دیا اور اس قدرت نے میری نیما کی تندرستی کا بندوبست کر دیا۔ آج چین کے ساتھ ماں کے سینے پر لیٹی خرّاٹے لے رہی ہے جیسے اپنے گھر کے آنگن میں لیٹی ہو ——— اللہ بڑا کارساز ہے۔"

اس نے بیوی کا بازو آہستہ سے ہلایا:

"تم بھی سو گئیں! کیوں نہیں سوؤ گی۔ بیٹی کی چنتا ختم ہوئی۔ سچ کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آجاتی ہے ——— کئی راتیں جاگنے والے کو یا سرہانے کی کیا پروا۔ جیسے کئی دنوں کا بھوکا گلی سڑی اور حرام چیز دل کو ہاتھ بڑھا کر جھپٹ لے اور نگل لے ——— اور سچ کہا کہ انتہائی اور بے بسی کے وقت حرام شے کو حلق سے اتار لینے میں گناہ نہیں۔ زندگی قائم رکھنے کے لئے جائز ہے۔"

جمیل کے ذہن میں دین کے حوالے سے بہت سی کارآمد باتیں چلی آ رہی تھیں ——— اخاہ، ہمارے دین میں کتنی وسعت اور فراخدلی انسان کی بقا کا مذہب ہے۔ اسے ہر حال میں جینے کا حق دیتا ہے۔ حوصلہ بخشتا ہے۔ میں نے عثمان کا سودا کر کے بُرا نہیں کیا۔ سرجیت سنگھ میں اللہ تعالیٰ نے خیال ڈال دیا کہ لڑکا خرید لو۔ اللہ نے اس کو ہمارے لئے اتنے پیسے دئے کہ وہ ایک مریل بچّے کے بدلے میں ہمیں دیدے۔ ہماری قسمت کے تھے جو عثمان کے لبادے ہم تک پہنچے ورنہ سرجیت سنگھ کے لئے کیا مشکل تھی کہ جب ان مٹی کے مول کا بھی نہیں۔ کسی کی جوانی کی کوئی قیمت نہیں۔ کیمپوں کے آزو بازو میں سرجیت جیسے سکھوں کے ٹولے ایسے گھس آئے ہیں جیسے خربوزے کے کھیت میں۔۔۔۔۔

جو بھی سامنے آتا ہے کرپانوں، چھتولیوں، گنڈاسوں سے کاٹتے جاتے ہیں۔ سکھ پاگل ہو گئے ہیں۔ اور سرجیت مہا پاگل۔ اس کا جی چاہتا تو اس کیمپ میں سے کسی کو بھی کھینچ لے جاتا۔ کتنی نوجوان لڑکیاں ایک ہی ہلّے میں اٹھا لی جاتی ہیں۔ پیچھا کرنے والے مر جاتے ہیں یا زخمی ہو جاتے ہیں اس وقت کافر لوگ طاقت میں آتے ہوتے ہیں اور ہم اللہ کے بندے ہجرت کی حالت میں ہیں۔ ہم رسولؐ کی امّت ہیں اور اس کی سنّت پر چلنے کے لئے خدا نے ہمیں چن لیا ——— شکیلہ کمزور دل کی عورت ہے۔ ایسے موقعوں پر عورت مرد دونوں کو برابر دلیر ہونا چاہئے ——— ایک معمولی بچّے کو فروخت کر دینا ایک نہایت معمولی بات ہے جو خدا کا حکم ——— دلوں میں نیکی بدی ڈالنے والا وہی ہے۔ اس کے حکم کے بغیر پتّہ نہیں ہلتا میں اس کا ادنیٰ بندہ۔

اسی لمحے چار پانچ آدمی چھوڑ کر لیٹے ہوئے کسی بیمار نے دم توڑ دیا۔ عورتوں کی چیخوں سے زمین آسمان ایک ہو گئے۔ شکیلہ کی آنکھ کھل گئی۔ نے نیند میں غوطے کھاتے ہوئے پوچھا ——— "ارے کون مرا؟"

"جسے مرنا تھا مر گیا۔"

"اچھا ———" وہ پھر اونگھ گئی۔

"سونے والے سولی پر بھی سو جاتے ہیں۔" وہ بڑبڑاتا لیٹا رہا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ عورتوں کی آہ و بکا دل دہلا دینے والی تھی۔ اسکے ہمسائے نے کہا:

"عورتوں میں یہ عادت بے حد بری ہے کوئی مرے یہ چلّانا شروع کر دیتی ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ قرآنِ پاک کی تلاوت کریں تاکہ اللہ تعالیٰ والے کی مغفرت کرے۔"

اس پر جمیل کے ذہن میں ایک سوال سا پیدا ہوا ——— کیا اللہ تعالیٰ صرف عربی زبان سمجھ سکتا ہے ——— یہ بھی اچھا ہی ہے۔ ہم نت گناہ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اپنی زبان میں ——— میں نے عثمان کا سودا کیا پنجابی میں۔

کیمپ میں قیام کے دوران نئی نئی باتیں، عجیب عجیب خبریں گردش کیا کرتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان کی مدد کو ایران اور ترکی کی فوجیں آ رہی مسلمان بھائی مسلمان بھائیوں کو نہیں بچائیں گے تو کون بچانے آئے گا ——— سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ ہر سمت صدا بلند ہوتی یا سرحد کے پار پاکستان والے ہاتھوں میں ہار پھول اور چابیوں کے گچھے لے کر کھڑے ہیں، جس مہاجر کے پاس جتنی چابیاں ہوں گی ان کے برابر ں، کمروں، صندوقوں کی چابیاں ملیں گی ——— یہ خبر پھیلی تو لوگ ایک دوسرے کی چابیاں چرانے لگے۔

انسان خواہ کیسے دگرگوں حالات میں بھی اپنی بقا اور اچھے دنوں کی امید کا دامن ہاتھ نہیں چھوڑتا۔ لوگوں میں رہتا ہے، اپنی خاطر۔ معاشرہ اس کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ مگر جنگلی سوچ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ شہر میں ہو یا کیمپ میں۔

اور جب کسی سکھ جتھے کے حملے کی خبر پھیلتی تو ہر فرد اپنے بچاؤ کے لئے تجویزیں کرتا۔ اپنے بچوں بیویوں کے بعد اس کی سوچ اپنی ذات پر آ کے رک جاتی ——— میں کیسے بچ سکتا ہوں ——— کیمپ میں رہتے ہوئے بھی ہر فرد کبوتر کی طرح اپنے اپنے کابک میں بیٹھا لرزتا تھا کہ کوئی بلی آ کر دبوچ نہ لے۔

جمیل بے حد چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ پھر بھی نہ معلوم اس کے بکس کی چابی کون لے اڑا۔ چابی کی چوری اس کے لئے نقصانِ عظیم تھا۔ بیوی کو موردِ الزام ٹھہرایا اور سب کے سامنے ٹھکائی کر دی۔

"گدھی کہیں کی اگر میں بے خبر تھا تو تجھے خبردار ہونا چاہئے تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے اس لئے کہ ایک ایک دو گیارہ جب دو ہوتے ہیں تو برکت ہوتی ہے مگر تجھ جیسی بے خبر بزدل مجھے پھلنے پھولنے نہ دے گی ——— ادھر چابی کے بدلے چابی ملے گی۔ چابی نہ ہوئی تو گھر کیسے کھلے گا کم بخت!"

بہر کیف میاں بیوی نے اگلے دو دنوں میں اس گھاٹے کو پورا کر لیا۔ جمیل نے نہ جانے کہاں کہاں سے کھینچ کر چابیوں کا گچھا بنا لیا۔ شکیلہ اپنے چاندی کے بندوں کے عوض چابیوں کی جوڑی لے آئی اور ان سب کو اپنے ازاربند میں پرو کر تین چار گانٹھیں خوب کس کر لگا دیں اس وقت ازاربند سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی نہ تھی۔

پھر قافلہ چلا جمیل، شکیلہ اور نیما بخیر و خوبی پار پہنچ گئے۔ افسوس کہ چابیوں کے گچھے بے کار گئے۔ افراتفری کے عالم میں چابی گھمانے کی فرصت کہاں؟ جس کا جہاں پاؤں پڑا جاگزیں ہوا۔

انسان فانی ہے مگر فنا اور شکست کی کوئی صورت بھی قبول نہیں کرتا۔ خوشیوں کے پیچھے بھاگتا ہے کہ خوشیاں زندگی کے میوے ہیں۔ ماضی میں وہ جب جب ذلیل ہوا یا جس جس نے اسے مارنا چاہا، بھلا دیتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ گزرے ہوئے کامراں لمحے اس کے تخیل میں ستاروں کی طرح دمکتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے مدار میں اٹل حقیقت کی مانند ——— اپنے اپنے مقام پر۔

جمیل پاکستان میں آ کر خوب پھولا، خوب پھلا۔ گویا ہجرت اس کے لئے ضروری تھی جیسے بعض پودوں کی پنیریاں ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ نہ لگائی جائیں تو وہ نہ جڑ پکڑتے ہیں اور نہ ہی پھلتے پھولتے ہیں۔ جمیل کا گھر بار، کاروبار سب ٹھاٹھ کا ہو گیا جیسے وہ یہی کرنے کے لئے ادھر بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے سات سلام بھیجے۔ جمیل سلاموں کے تسلسل سے تلملا اٹھتا تھا۔ ہر بار بیوی کو الٹی میٹم دیدیتا۔

"مجھے دوسری کرنی پڑے گی شکیلہ بیگم! ایک ہی پٹڑی پر چلی جاتی ہو!"

"قدرت کے کام ہیں میاں! میرا کیا قصور ہے؟"

"قدرت ودرت کچھ نہیں۔ آخر حیلہ وسیلہ بھی کوئی چیز ہے۔ آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے تو خدا اس کے منہ میں ———"

"بس بس گناہوں کا بوجھ بھاری نہ کرتے رہا کرو۔ اوپر والے نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ شکر کیا کرو!"

"زیادہ شکر کرتے رہنا اچھا نہیں ہوتا، میں نادان نہیں کہ چند کلیوں پر قناعت کر جاؤں جب کہ علاجِ تنگیٔ دامن کے ساماں موجود ہیں۔ سمجھی! دنیا بدل گئی پر تو رہی عورت کی عورت!"

جمیل اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار اور وسیع معلومات رکھنے والا فرد بن چکا تھا۔ روپیہ اور فارغ البالی انسان کی سوجھ بوجھ اور علم و شعور میں آہنگ اور اعتماد پیدا کر دیتے ہیں۔ علامہ اقبال کا اردو کلام جمیل نے تقریباً حفظ کر لیا تھا۔ جابجا حوالے کے لئے استعمال کرتا کیونکہ یہ یہاں کے ماحول اور علمی زندگی میں خوب کام دیتا تھا۔ شکیلہ ایسے موقعوں پر ہار ماننے کے بجائے جمیل کو دبانے کی کوشش کرتی۔

"میں تو جانوں میری کوکھ کو تمہارے بھانجے کی بددعا لگی جیسے تم چند سکوں کے لئے کافر کے ہاتھ بیچ آئے تھے۔ آخر وہ تمہاری مرحوم بہن کا بچہ تھا۔ سارا قصور تمہارا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگا کرو!"

اس پر جمیل بادل کی طرح گرجتا۔ شکیلہ بجلی بن کر کڑکتی۔ پھر چھم چھم برکھا ہوتی۔ برکھا رت شکیلہ اور اس کی بیٹیوں کے حصے میں آتی۔ وہ اشکوں سے بھیگے دو پٹے پھیلا دیتیں۔

"اللہ ابّا کو ہدایت دے۔"

"اے خدا ہمیں ایک بھائی دے۔"

اور شکیلہ کو عثمان کی پھیلی باہیں یاد آتیں جب وہ اس کی گود میں آنے کے تڑپتا تھا۔ مگر گود میں نیما ہوتی تھی۔ اس کی پہلوٹھی کی بیٹی۔ اس کی لختِ جگر ــــ اور ایک شام جب نیما بہت بیمار تھی جمیل سوتے ہوئے عثمان کو اٹھا کر لے گیا تھا اس کے بعد اس بچے کی صورت نظر نہ آئی۔ یہ یاد کر کے شکیلہ کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔

انسان اپنی محرومیوں پر رونے کے لئے دوسروں کے دکھوں کا سہارا لیتا ہے اسی کا نام ہمدردی ہے۔ اسی زنجیر کے ساتھ انسان ایک دوسرے سے بندھا ہے۔ جب یہ زنجیر ٹوٹتی ہے تو انسان خود غرض کہلاتا ہے۔ اور اسی مقام سے زمانہ گہرے موڑ مڑ جاتا ہے۔

جمیل اور شکیلہ کو نئی سرزمین پر بستے بیس برس گزر گئے۔ ان دنوں بیساکھی کا تہوار منانے کے لئے سکھوں کا ایک جتھا ادھر آیا ہوا تھا ان کی ٹولیاں مع اہل و عیال شہر کی سڑکوں، بازاروں میں نظر آتی تھیں۔ پاکستانی بچے انھیں شوق اور حیرت کے ساتھ دیکھتے تھے۔ جمیل اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کا ہاتھ پکڑے انار کلی میں سے گزر رہا تھا۔ بچی کا متجسس ذہن سکھوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر مُصر تھا۔

"ابّو! سکھ انسان ہوتے ہیں؟"

"ہاں انسان ہوتے ہیں بیٹی!"

"پھر یہ انسانوں کو مارتے کیوں ہیں؟"

"مارتے ہیں! تمہیں کس نے بتایا؟"

"امّی نے"

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

جمیل نے قہقہہ لگایا۔

"تمہاری امّی بڑی شریر ہیں۔ دیکھو بیٹی! راہ چلتے میں باتیں نہیں کیا کرتے۔ راستا دیکھتے ہیں اور بڑوں کا ہاتھ پکڑے رکھتے ہیں۔"

بچی نے چڑ کر کہا۔

"میں نے آپ کا ہاتھ پکڑ تو رکھا ہے۔ راستا مجھے دکھ رہا ہے مگر میری بات کا جواب دو۔ یہ جو سکھ ہوتے ہیں گندے ہوتے ہیں۔"

جمیل خاموش تھا۔ اصل میں اس وقت اس کی نظریں ایک سکھ خاندان پر جمی تھیں جو بھیڑ میں سے اس کی طرف بڑھتا چلا آتا تھا۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر مرد اور عورت، ایک جوان خوبرو اور اس کی نازک اندام کم عمر بیوی جس کی گود میں پھول سا بچہ ٹھمک رہا تھا۔

جمیل بیٹی کو لئے سرعت سے آگے نکلنے والا تھا کہ ادھیڑ عمر سکھ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی آنکھیں جمیل کی آنکھوں میں پیوست ہو گئیں

"تسیں ــــ بے میں بھلیکا نئیں کھاندا جمیل صاحب او ــــ جمیل خاں صاحب ــــ"

جمیل نے مصافحہ کے لئے بڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ کو میکانیکی طریقے سے روک لیا۔ وہ اجنبی سکھ کے چہرے کو گھور رہا تھا جس کی لمبی دھول داڑھی میں کوئی دھندلی شام الجھ رہی تھی۔ پاس کھڑا نوجوان سکھ اشتیاق، مروّت اور نامعلوم کن کن جذبوں سے بھیگی آنکھوں کے ساتھ جمیل کی طرف تکے جاتا تھا اس کے چہرے پر محبت بھری مسلسل مسکراہٹ نے شفق سی پھیلا دی تھی جمیل نے بدقّت مصافحہ کیا۔ بڑا سکھ کہہ رہا تھا۔

"میں سرجیت سنگھ آں ــــ خورے تہانوں یاد ہووے۔ تے ایہہ ــــ ایہہ ــــ"، اس نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا:

"تہاڈا عثمان! میرا مطلب اے میرا ــــ مان سنگھ ــــ دیکھیا جے کنڈا سوہنا گبرو نکلیا جے ــــ"

اسی لمحے سردارنی آگے بڑھی اپنے شوہر کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

(باقی صفحہ ۴۳ پر دیکھئے)

ایکس-وائی-زیڈ

آمنہ ابو الحسن ● ۳۷ - بٹودی ہاؤس - نئی دہلی — ۱

اف — ظفر نے آنکھیں بند کرلیں۔

کتنا بھیانک چہرہ تھا۔ مڑا تڑا سا جیسے کسی نے بہت عجلت میں یا بڑی بے دلی سے بنایا ہو۔ مرد کے ساتھ بدشکلی اتنی محسوس نہیں ہوتی جتنی عورت کے ساتھ۔ عورت کے ساتھ تو نرمی نزاکت لطافت کا خیال ہی آتا ہے۔ مگر یہ کیسی عورت تھی جسے دیکھ کر آنکھیں آپ ہی آپ مند گئیں —

بڑی دیر تک ظفر بدمزگی سی محسوس کرتا رہا جیسے کوئی کڑوی کسیلی چیز زبان سے چھو گئی ہو پھر ڈرتے ڈرتے جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ چہرا بازار کے ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ ظفر نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اسے دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا تبھی کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ گھوم کر ظفر نے دیکھا۔ یہ رضا تھا۔

"تو یہ کچھ ہو رہا ہے۔ یہاں۔ وہ قدرے تبسم سے بولا" کیا — ؟ ظفر نے حیرانی سے دریافت کیا

"بازار کی خوبصورت بھیڑ سے آنکھ مچولی —"

"آنکھ مچولی — ؟"

"اور کیا —"

"ارے یہ تو لڑکیوں کا کھیل ہے یار رضا — مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں اور میں تو سخت بدمزہ ہوں اس وقت —"

"کیوں کیوں — خیریت — ؟"

"کیونکہ ابھی ابھی ایک اتنا بھیانک چہرہ دیکھا ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ یار — میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں مگر عورت کی بدصورتی بالکل برداشت نہیں کرسکتا" مسکراتا ہوا رضا یکلخت گم سم سا ہو گیا پھر دھیرے دھیرے بولا۔

"مگر یہ بھی تو سوچو خوبصورت یا بدصورت ہونا اپنے بس میں تھوڑی ہوتا ہے —"

"ہو نہ ہو یار لیکن —— !"

"اچھا — اگر ایسا اتفاق ہو جائے کہ ایسی بیوی تمہیں مل جائے تو — ؟"

"میں اسے فوراً طلاق دے دوں گا رضا —"

"چاہے اس میں کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں۔ ؟"

"خوبیاں تو بعد میں نظر آئیں گی یار رضا مگر چہرہ تو ہر وقت۔ اور ہر وقت سولی پر لٹکنا مجھے منظور نہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"چلتا ہوں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ گھر نہیں چلوگے میرے ساتھ — ؟"

"پھر کبھی یار۔ فی الحال تو جانے ہی دو۔"

"نہیں نہیں۔ تمہیں گھر چلنا ہی ہوگا۔ میرا چھوٹا سا گھر تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔"

"لیکن ——"

"لیکن کیا۔ تم بھی عجیب ہو یار۔ پل میں خوش پل میں اداس۔ ابھی کچھ دیر پہلے کتنا مسکرا رہے تھے تم اور اب ایکا ایکی....."

"اچھا چلو۔ گھر چلو ——"

اور تھوڑی دیر بعد جب رضا ظفر کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوا تو اس کے مغموم چہرے پر آپ ہی آپ مسرت پھیل گئی۔

باہر والے صحن میں بچے کھیل رہے تھے۔ احاطے کی دیوار پر بڑے خوش رنگ پھولوں کی بیل لہرا رہی تھی اور اندر سے چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ دبے دبے قہقہوں کی گونج سنائی دے جاتی تھی۔

گھر بڑا نہیں تھا مگر ظفر کے دل کی طرح اختصار میں بھی اس وقت ہی وسعت نظر آرہی تھی۔ مسرت کی ضو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی ان کی آہٹ پاتے ہی ایک لڑکی نے درمیان والے دروازے سے جھانکا اور سوال کیا۔

"چائے لاؤں بھیا —— ؟"

"ہاں" ظفر نے کہا۔ "جلدی سے بھیجوا دو اور کچھ کھلانے کی بابت بھی سوچو۔"

لڑکی غڑاپ سے غائب ہوگئی۔

"اتنی دیر میں نہیں رک سکوں گا ظفر۔ کھلانے پلانے کا تکلف مت کرو۔ جب موڈ ہوگا خود ہی آکر کھا لوں گا۔"

"اچھا اچھا بیٹھو تو۔ میں ذرا کپڑے بدل آؤں۔"

جب ظفر چلا گیا تو رضا خاموشی سے ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ کمرہ کوئی خاص سجا ہوا نہیں تھا پھر بھی ایک طرح کا اچھا پن اور گہرا سکون اعلانیہ محسوس ہوتا تھا۔ اسے ظفر کے چہرے پر اس کمرے کا عکس اور کمرے کی ہر ہر چیز پر ظفر کی انمٹ چھاپ محسوس ہوئی۔

وہ اپنے ہی احساسات میں غرق تھا کہ ظفر کمرے میں داخل ہوا اور کچھ ہی دیر بعد چائے کی جگہ مختصر لوازمات کے ساتھ کھانا میز پر لگ گیا۔

"ارے" —— رضا بولا۔ "اتنی جلد کھانا۔ ؟"

"چار بہنوں کا خوش قسمت بھائی ہوں یار۔ سب نے ایک ایک چیز بنا ڈالی تو کھانا بھی تیار ہو گیا۔"

چار بہنیں۔ ؟ اس زمانے میں۔ ؟ رضا نے سوچا

ظفر اس پر خواہ مخواہ ہی رعب ڈال رہا ہے۔ لیکن اس کی خاطر داری کے لئے چاروں لڑکیاں بھی باہر والے کمرے میں آگئیں۔ ظفر نے چاروں کو رضا سے ملایا۔

لڑکیاں چارمنگ تھیں۔ سیدھی سادی۔

فیشن اور بناوٹ سے نابلد۔ شگفتہ شگفتہ، ہنس مکھ ہنس مکھ۔ اندرونی سادہ لوحی اور خلوص کی خاموش مہک لئے۔ رضا نے سب سبھوں سے بڑے دلار سے باتیں کیں اور بولا" بھئی آج سے ہمیں بھی ظفر کی طرح سمجھنا کیونکہ ہمیں بہنیں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

مگر یہ کہتے کہتے وہ کچھ ڈوب سا گیا۔

ظفر نے اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو محسوس کیا اور سوچا اس کی وجہ پوچھ ہی ڈالے مگر پھر چپ ہو رہا۔

رضا کے چلے جانے کے بعد اسے بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ کئی خیال الجھاتے رہے۔ اس نے تو سن رکھا تھا خاصے ماڈرن اور مالدار گھرانے کا فرد ہے رضا ایسے میں نہ اسے مالی دشواری ہو سکتی تھی نہ بندشوں کی پابندی۔ کیوں کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ رضا کے والد گذر چکے ہیں اور اب تمام سیاہ و سفید کا وہی مالک ہے۔ تب —— ؟

سوچتے سوچتے ظفر سو ہی گیا اور پھر کافی دنوں بعد جب وہ اپنی ایک بہن کی شادی کا دعوت نامہ لے کر رضا کے گھر پہونچا تو

یہ دیکھ کر کچھ مرعوب سا ہو گیا کہ رضا کی امارت اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ بہت بڑی کوٹھی۔ بہت زیادہ سجی ہوئی۔ سر سے پاؤں تک جگمگاتی ہوئی۔ نفاست باذوقی اور قرینے کی مظہر۔ چونکہ رضا گھر پر نہیں تھا اس لئے وہ دعوت نامہ دے کر جلدی سے لوٹ گیا لیکن اتنی ہی دیر میں اس نے محسوس کیا کہ نسوانیت اس گھر میں اپنے تمام ہنر کے ساتھ موجود ہے۔ اسی خیال کے تحت ایک خیال اچانک ظفر کے ذہن میں آگیا اور رضا کی دوستی کے بھروسے اس نے اس خیال کو اپنے جی سے لگا لیا۔

اگلی صبح آفس میں رضا کا فون آیا کہ وہ آفس ختم کر کے آئے گا اور اب سے شادی ختم ہونے تک ہر کام میں ظفر کا ہاتھ بٹائے گا۔

۔ اور جب رضا آیا تو ظفر چھوٹتے ہی بولا۔

"میں تمہارے گھر گیا تھا یار۔ تم تو نہیں ملے مگر ایک خیال۔ ایک بہت خوبصورت خیال سے مڈبھیڑ ہو گئی وہاں"۔ رضا نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

"مجھے بدمعاش مت سمجھنا۔" ظفر مسکرایا۔

"تم نے تو میری بہنوں کو اپنی بہنیں بنا لیا ہے لیکن میرا معاملہ الگ ہے"۔

"مطلب۔" رضا نے قدرے بے چینی سے پوچھا

"مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ تمہاری کتنی بہنیں ہیں لیکن جتنی بھی ہیں ان میں سے ایک کو جسے تم مناسب سمجھو میرے لئے سمجھ لینا۔ میرا گھر بہت چھوٹا ہے دوست لیکن خوشی کا تعلق بیرون سے زیادہ اندرون سے ہوتا ہے اور تم تو جانتے ہی ہو میں زندگی سے کتنا مخلص ہوں۔ نفاست میری کتنی بڑی کمزوری ہے"۔

"جانتا ہوں جانتا ہوں مگر ...."

"مگر کیا رضا۔ کہیں تمہیں اسٹیٹس کا خیال تو نہیں آ رہا ہے۔ ؟ کیا دوستی اسٹیٹس سے زیادہ اہم نہیں۔ ؟ دوستی بہت بڑی اخلاقی قوت ہوتی ہے دوست"۔

"یار پہلے تمہارے گھر کی تقریب تو ہو جائے پھر سوچ لیں گے"۔

"نہیں۔ ابھی جواب چاہیئے مجھے۔ یا وہ جب تم چاہو کر سکتے ہو"

"رضا نے اس بار ظفر کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

"ظفر کو لگا جیسے اسے بڑی زور کا تھپڑ پڑ گیا ہو۔ یقیناً یہ سماجی نابرابری ہی ہے جو اُن دونوں کے درمیان آکھڑی ہوئی ہے۔ دوستی دوستی سب بے کار کی باتیں ہیں۔

اس نے اپنے آپ کو بڑا کھوکھلا محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پہلی بار اس نے سوچا۔ کاش ــــ وہ بھی بہت سا روپیہ کما لیتا۔ ناجائز طریقے سے ہی سہی۔ کوٹھی بنوا لیتا۔ موٹر خرید لیتا۔ ٹھاٹ باٹ سے رہتا تو یقیناً آج رضا اُسے اپنی رئیسانہ آن بان نہ دکھا پاتا۔

اس سے بھی زیادہ کوفت اُسے اپنے اعتماد پر ہوئی۔ رضا کی مرضی جانے بغیر کیوں اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ کیوں خود کو ذلیل کیا۔

وہ پچھتاتا رہا۔ ملول و غمگین رہا۔ رضا جا چکا تھا اور ظفر کو یقین تھا اب اس سے کبھی ملاقات نہ ہوگی۔

رات اپنی پوری تاریکی کے ساتھ اس کے آگے تھی۔ رضا واقعی پھر نہیں آیا۔ لیکن اس کی طرف سے دلہن کے لئے پیغام خلوص اور بے حد قیمتی تحفے آئے جنہیں ظفر نے اپنی الماری میں مقفل کر دیا۔ ان میں سے ایک بھی تحفہ اس نے اپنی بہن کو نہیں دیا۔ اپنی طرح وہ اپنی بہن کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ تحفے اسی طرح رکھے رکھے گل جائیں یہی اس کی خواہش تھی۔ اس کی بہن کی شادی ہو گئی ــــ رونق اور گہما گہمی ختم ہو گئی۔

تقریب کے بعد کا سناٹا ہر طرف چھا گیا مگر اس سے جان لیوا سناٹا خود ظفر کی ذات میں بس چکا تھا۔
توہین کا گہرا اندھیرا۔

اس نے کوشش کر کے اپنا تبادلہ دوسرے شہر میں کروالیا۔ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ یہ کبھی نہ بھول سکا کہ رضا نے کتنی اونچائی سے اسے نیچے دھکیل دیا اور اف تک نہ کی۔

کئی سال گذر گئے۔

پھر ایک روز اچانک ظفر کو اطلاع ملی کہ کار ایکسیڈنٹ میں رضا گذر گیا۔

اس خبر نے اسے دہلا دیا۔

وہ زندگی سے جتنا مخلص تھا اتنا ہی اپنے دوستوں سے بھی ـــ وہ بلا تاخیر رضا کے گھر پہونچ جانا چاہتا تھا مگر پھر ایک خیال اس کے ذہن میں جاگا۔ فی الحال خاموشی ـــ شاید اس کی ذلت کا خاتمہ ہو جائے۔ رضا سے نہ سہی اس کی موت سے وہ اپنا انتقام چکالے۔ بڑے بوجھل دل و دماغ سے وہ مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا اور وقت آنے پر اس نے اپنا پیغام اس شرط کے ساتھ رضا کے گھر بھیجوایا کہ وہ روپیہ پیسہ یا جہیز کچھ بھی قبول نہیں کرے گا۔

اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب کچھ عرصے بعد ہی جواب اثبات میں ملا۔ وہ حیران اس لئے بھی رہا کہ اتنے امیر گھر کی لڑکی کے لئے اس کا رشتہ کس طرح منظور کر لیا گیا مگر زیادہ سوچ بچار کا وقت نہ تھا۔ وہ جلد سے جلد چھٹی لے کر شادی کے لئے پہونچ گیا۔
بیاہ کے لئے دونوں طرف سے کوئی شرطیں نہیں تھیں۔ اس کے کیرکٹر کے بارے میں خاندان اور آفس دونوں جگہ دریافت کیا جا چکا تھا لہٰذا جلد ہی بیاہ ہو گیا۔

اب وہ فارغ تھا۔ سرنگوں نہیں ـــ

بے حد دھڑکتے دل سے وہ دلہن کے قریب پہونچا۔ اس وقت وہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ پوری خواہش اور خاموشی کے ساتھ اپنی تمنا میں گھل مل جانا چاہتا تھا۔ اس پھانس کو جو مدتوں اس میں دھنسی رہی جلد سے جلد نکال پھینکنا چاہتا تھا چنانچہ چراغ بجھا کے وہ ساری دنیا کو بھول گیا۔

اس وقت وہ کتنا خوش تھا۔ نہایت حسین بیش قیمت مستقبل اس کے آگے ٹھہرا ہوا تھا جس میں کہیں کوئی رات نہیں تھی۔ اب تو ہر رات بھی صبح ہی صبح تھی۔

بے شک اس کی دلہن اپنے ساتھ بہت کچھ لائی تھی اور اس جواز کے تحت کہ رضا کے گذر جانے کے بعد وہ اس کی تمام دولت کی واحد وارث تھی۔ ظفر نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی دولت کا جس طرح چاہے استعمال کرے وہ اس میں سے ایک پائی بھی نہیں لے گا اور نتائج کی انتہا پر پہنچ کر تمام تر ذہنی اور جسمانی آسودگی کے ساتھ وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

مدتوں بعد وہ میٹھی اور گہری نیند سویا۔

صبح جاگ کر جیسے ہی اس نے کروٹ بدلی اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔ آنکھیں آپ ہی آپ مند گئیں

خدایا ـــ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

وہی ناقابل برداشت چہرا۔ مڑا تڑا سا۔ جیسے کسی نے بہت عجلت یا بڑی بے دلی سے بنایا ہو۔

تب ایک پردہ سا اس کے احساس سے ہٹا۔ ایک کراہ اس کے اندر پھیلی۔

رضا ـــ رضا ـــ !! اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

پشیمانی کے آنسو ـــ مجبوری کے آنسو۔

ایکس ـــ وائی ـــ زیڈ ـــ تو کیا زندگی شروع ہوتے ہی ختم ـــ ؟ ■■■

تتلیاں ڈھونڈنے والی

زاھدہ حنا ● اے - ۵۴ ، بلوک - ۱ ، گلشن اقبال - کراچی - ۴۷

نرجس نے سفید سروالی امّاں کو دیکھا جو سلاخ دار دروازے کے دوسری طرف بیٹھی تھیں۔ اور جن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ بھیّا سر جھکائے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ نرجس کو نظر نہیں آرہا تھا۔

مہدی تالی بجا کر زور سے ہنسا پھر اس نے سلاخوں کے درمیان سے اپنے دونوں ہاتھ باہر نکال دیے۔ "ممّا، میری ٹافی!" وہ چہکا۔ تب بھیّا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور مہدی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ نمکین پانی کے قطرے مہدی کے گرد آلود ہاتھوں کو دھونے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

نرجس نے دوسرے اچھے اور برے مناظر کی طرح اس منظر کو بھی اپنے اندر رکھ لیا۔ اس کے دل کو تسلّی ہوئی۔ امّاں نہیں رہیں گی تب بھی مہدی کے سر پر ہاتھ رکھنے والا تو رہے گا۔ بھیّا اسے جی جان سے چاہتا تھا، وہ یقیناً مہدی کو بھی عزیز رکھے گا۔ بھیّا نے رحم کی اپیل پر دستخط کروانے کے لیے اس سے کیسی کیسی منتیں نہ کی تھیں لیکن نرجس کے لیے بس یہی ممکن نہ تھا۔ اپیل کا وقت گزر گیا تھا اور اب وہ تنہا موت کے مقابل تھی۔

امّاں اس کا ہاتھ یوں تھامے ہوئے تھیں جیسے تیرنے والے، ڈوبنے والوں کا ہاتھ تھامتے ہیں۔ اس لمس میں بے بسی تھی، جدائی تھی، بے پایاں الم تھا۔ یہ لمس باہر کی دنیا سے اس کا آخری رابطہ تھا۔ وہ دنیا جو حسن اور بدصورتی سے، اچھوں اور بروں سے، محبّت اور نفرت سے بھری ہوئی تھی۔

مہدی کھلکھلاتا رہا۔ بھیّا سے باتیں کرتا رہا۔ کبھی وہ سلاخوں کے درمیان سے اپنا ننّھا سا چہرہ آگے نکال کر ممّا کا چہرہ چومتا رہا اور کبھی ہاتھ بڑھا کر نانّا کے سفید بالوں سے الجھتا رہا۔

"امّاں اسی بات پر خوش ہو لیں کہ مہدی اب آزاد ہو جائے گا۔ اس نے سلاخوں، ہتھکڑیوں، زنجیروں اور سنگینوں کے سوا دیکھا بھی کیا ہے۔ وہ یہیں پیدا ہوا۔ یہی بیرکیں اس کی کل کائنات ہیں۔ اب وہ اسکول جائے گا، بازار جائے گا، باغ میں کھیلے گا۔ بھیّا اسے جھولے پر ضرور بٹھانا!"

"آپا تمہیں خدا رسول کا واسطہ، چپ رہو!" بھیّا بکنے لگا اور وہ خاموش ہو گئی۔ وہ امّاں کی اور بھیّا کی اذیت، ان کا عذاب سمجھتی تھی لیکن انھیں یہ نہیں سمجھا سکتی تھی کہ کبھی انسان اپنے لیے موت منتخب کرتا ہے کہ دوسرے زندہ رہیں۔ موت کے پیالے میں جب تک زندگی کے سکّے نہ ڈالے جائیں، آدرش ہاتھ نہیں آتے۔

وہ اور حسین ایک ساتھ ہی گرفتار ہوئے تھے پھر اطلاع آئی کہ تفتیش کے دوران حسین نے خودکشی کر لی۔ وہ جانتی تھی کہ قاتل، مقتولوں کو خودکشی کرنے والے ہی کہتے ہیں۔ حسین پر سے اس کا ایمان ایک لحظے کے لیے بھی متزلزل نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح ضمیر کا قیدی تھا اور ضمیر کے قیدی خودکشی نہیں کرتے، رحم کی درخواستیں نہیں گزارتے۔

آخری ملاقات کا وقت ختم ہوا تو امّاں غش کھا گئیں۔ بھیّا سلاخوں سے چمٹ گیا۔ وہ اس کی پیشانی چوم رہا تھا، اس کے ہاتھوں کو پیار کر رہا تھا، اس کے بالوں کو چھو رہا تھا۔

پھر وہ لوگ چلے گئے۔ نہیں، وہ لوگ گئے نہیں، لے جائے گئے۔ نرجس کا کیسا جی چاہا تھا کہ ایک بار، آخری بار کھیا کو سینے سے لگالے لیکن یہ ممکن
ا۔ جیل کے آداب انسانوں نے بنائے تھے۔ ان سے انسانی رشتوں اور جذبوں کا خیال لاحاصل تھا۔

مما چلا گیا تو مہدی بلکنے لگا۔ وہ وہاں جانا چاہتا تھا جہاں کی کہانیاں امّی نے سُنائی تھیں لیکن امّی تو اسے کہیں بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔

"کل چلے جانا ـــــ مما تمہیں کل لے جائیں گے۔" نرجس مہدی کے رخسار چومنے لگی۔

وارڈن مریم نے ماں اور بیٹے پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ یہ کیسی عورت تھی جس نے موت کی سزا کے خلاف رحم کی اپیل نہیں
ی، جس نے پھانسی گھاٹ پہنچ کر ایک آنسو نہیں بہایا تھا، چیخیں نہیں ماری تھیں، خدا سے لیکر جیلر تک، کسی کو بھی گالیاں نہیں دی تھیں۔

یہ عجیب عورت تھی کہ جب اسے قرآن دیا گیا تو اس نے اسے آنکھوں سے لگا کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے بیٹے کو چومتی رہی۔ مولوی
ب نے آکر اسے نماز پڑھنے کی، بارگاہِ ربّ العزت میں توبہ استغفار کرنے کی ہدایت کی تو وہ مسکراتی رہی۔ مولوی صاحب کے
نے کے بعد اس نے جا نماز اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ پھر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اپنے بیٹے کو کہانیاں سُنانے لگی۔

زنانہ وارڈ کیسی کیسی مجرم و ملزم عورتوں سے بھرا ہوا تھا لیکن نرجس ان سب کو اپنے آپ میں سے نہیں لگتی تھی۔ گزشتہ چار برسوں میں
بڑی عورتوں نے اسے بہت اچھی طرح رکھا تھا۔ وہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھی اس لئے وہ اس سے محبت کرتی تھیں، اس کا احترام کرتی
ں، اس سے خوف کھاتی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اس نے کسی کی ناک چُٹیا نہیں کاٹی، کسی کے مویشی نہیں چرائے، کچی شراب اور
، نہیں بیچی، کسی کو قتل نہیں کیا تو پھر اسے کن گناہوں کی اتنی بڑی سزا ملی ہے۔

"بی بی تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" پھانسی گھاٹ منتقل ہونے کے چند دن بعد وارڈن مریم نے اس سے پوچھا تھا۔

"کس بات سے ڈر؟" نرجس کے لہجے میں سکون تھا۔

"موت سے۔"

"نہیں، موت جب اپنا اختیار ہو تو اس سے ڈر نہیں لگتا۔ پھر مہدی بھی تو ہے۔ وہ میرے بعد رہے گا اور میں اس میں رہوں گی پھر
، وہ چلا جائے گا تو میں اس کے بچوّں میں زندہ رہوں گی۔"

مریم نے اس کے بعد نرجس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ہاں بیرکوں میں یہ بات ضرور گھوم گئی تھی کہ پھانسی گھاٹ میں جو بی بی بند ہے
بہت پہنچی ہوئی ہے۔ اسے بشارت ہوئی ہے کہ وہ اپنے بعد بھی رہے گی۔ ہاتھی کے کلیجے والی ہے۔ نہ ہوتی تو دوسری عورتوں اور
ہرے مردوں کی طرح چیخیں مار رہی ہوتی، کپڑے پھاڑ رہی ہوتی، منتیں کر رہی ہوتی۔

نرجس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے سامنے پہنچ کر لیڈی وارڈنوں کی نگاہیں جھک جاتی ہیں، سپرنٹنڈنٹ جیل کو اس کی کوٹھری
جانے کی جلدی ہوتی ہے اور صبح و شام جب وہ اپنی کوٹھری سے باہر نکالی جاتی ہے تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ لڑتی ہوئی، شور مچاتی
ی عورتیں خاموش ہو جاتی ہیں اور سلاخ دار دروازوں کے پیچھے سے اسے یوں دیکھتی ہیں جیسے وہ ان میں سے نہیں ہے، کہیں اور سے آئی ہے۔

وہ کھانا، وہ آخری کھانا کس اہتمام سے آیا تھا THE LAST SUPPER اسے بڑے آرٹسٹوں کی تصویریں
آئیں۔ مہدی اس کھانے کو دیکھ کر کس قدر خوش ہوا تھا "آج بڑا مزا آیا۔" اس نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں۔

"ہاں میری جان، سچ کہتے ہو۔" نرجس نے اسے نوالہ بنا کر دیتے ہوئے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ مہدی ان آنسوؤں کو نہ دیکھ لے جو پلکوں کی
ن سے لگے بیٹھے تھے۔

پھر رات ہو گئی۔ مہدی اونگھنے لگا لیکن نرجس اس سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتی تھی، اس کی آواز سننا چاہتی تھی۔ وہ اسے
یہ جگانا چاہتی تھی تاکہ وہ لوگ پو پھٹنے سے پہلے جب اسے لینے آئیں تو وہ میٹھی نیند سو رہا ہو۔

نرجس نے اس کی روشن آنکھوں کو دیکھا، اس کے خوبصورت ماتھے کو دیکھا۔ یہ حسین کی آنکھیں تھیں، یہ حسین کا ماتھا تھا۔ اس
ن سے حسین کی خوشبو پھوٹتی تھی، حسن کی، زندگی کی، اُمید کی خوشبو۔ حسین اب جب کہ تم کہیں نہیں ہو تو کیا اب بھی تم کہیں رہتے ہو؟

زمین و آسمان کے درمیان؟ اس کے لبوں میں بھنور پڑنے لگے۔ اس نے مہدی کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا۔

"بہت زور کی نیند آرہی ہے امّی" مہدی نے فریاد کی۔

"میری جان، بس ابھی کچھ دیر میں سو جانا۔ مجھ سے تھوڑی سی باتیں کر لو" نرجس کی آواز لرزنے لگی "کل صبح ممّا تمہیں اپنے گھر لے جائیں گے۔ وہ تمہیں کہانیاں سنائیں گے، بازار لے جائیں گے، جاؤ گے نا؟"

"سچ امّی؟ ہمارے ساتھ آپ بھی بازار چلیں گی نا؟" مہدی نیند کو بھول کر اٹھ بیٹھا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی بیٹے"

"تو کیا آپ اسی کوٹھری میں رہیں گی۔؟"

"نہیں بیٹے، میں تمہارے لئے تتلیاں ڈھونڈنے جاؤں گی"

راہداری میں آہٹ ہوتی، نرجس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وارڈن مریم سلاخیں تھامے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"امّی کل تتلیاں ڈھونڈنے جائیں گی" مہدی نے خوش ہو کر مریم کو بتایا۔

"ہاں راجا —— امّی سے خوب باتیں کر لو، خوب پیار کر لو" مریم کی آواز ٹوٹنے لگی اور وہ جلدی سے مڑ گئی۔

"آپ شام تک تو آجائیں گی نا؟"

"نہیں مہدی، تتلیاں بہت تیز اڑتی ہیں۔ میں انھیں ڈھونڈنے نکلوں گی تو بہت دور چلی جاؤں گی"

"آپ کون سی تتلی ڈھونڈیں گی؟"

نرجس ایک لمحے کے لئے رکی "آزادی کی تتلی میری جان" اس نے بیٹے کے بال چوم لئے۔

"وہ کس رنگ کی ہوتی ہے؟"

"اس میں دھنک کے ساتوں رنگ ہوتے ہیں"

"دھنک کیسی ہوتی ہے؟"

"اس بار جب مینہہ برسے تو ممّا سے کہنا وہ تمہیں دھنک دکھا دیں گے"

"پھر میں بھی دھنک تتلیاں ڈھونڈوں گا"

"نہیں میری جان، دھنک تتلیاں تمہارے پاس آپ سے آپ آجائیں گی۔ ہم اسی لئے تو انھیں ڈھونڈنے نکلے ہیں کہ تمہیں ہماری طرح سفر نہ کرنا پڑے"

نرجس کا بدن لرزنے لگا۔ وہ دیوانہ وار اس کی بے داغ گردن چومنے لگی۔ اس ایک ہفتے کے دوران اس کی آنکھوں سے پہلی مرتبہ آنسو گرنے لگے۔

مہدی سو گیا تو نرجس نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ مہدی کے وجود میں امید کا پودا نمو پا رہا تھا اور اسی امید نے اسکے سینے میں ہاتھی کا کلیجہ رکھ دیا تھا۔ اسے آنے والے زمانوں میں زندہ رہنے کی بشارت دی تھی۔

آس پاس کی بیرکوں سے آیتیں پڑھنے اور کلمہ دہرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی عورت بڑی خوش الحانی سے سورۂ رحمٰن کی تلاوت کر رہی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ آج بی بی رخصت ہونے والی ہے اور یہ اسی کی رخصت کی تیاریاں تھیں۔

اس کے سینے میں کسی نے برچھی ماری۔ یقیناً صدر دروازے کے سامنے خاک پر بیٹھا ہوگا۔ اس نے جب شماریات میں ایم۔ایس کیا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کبھی وہ آپا کی زندگی کی ساعتوں کا شمار کرے گا اور بالکل تنہا ہوگا۔

چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے چک پھیریاں کھانے لگے۔ مہربان اور نامہربان چہرے۔ اجنبی اور آشنا آوازیں۔ نرجس کو ان اجنبی آوازوں پر بے ساختہ پیار آیا جو اس کا آخری سفر آسان کرنے کے لئے اپنی نیندیں قربان کر رہی تھیں۔ ایک ہفتہ پہلے تک وہ

ن آوازوں کے ساتھ تھی۔ یہ آوازیں اسے کچھ بھی تو نہیں سمجھتی تھیں، اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی تھیں۔

جس دن رحم کی اپیل کی مدت ختم ہوئی اور اطلاع آئی کہ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل اسے بیرک سے پھانسی گھاٹ قتل کرنے لے لئے آ رہے ہیں تو ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ اور مہدی بیرک سے رخصت ہوئے تو اس نے کئی عورتوں کو چپکے چپکے آنسو پونچھتے اور چہرے پھکاتے ہوئے دیکھا۔ یہ وہ عورتیں تھیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو گالیاں بکتی تھیں، گریبان تار تار کرتی تھیں اور جنھیں علیحدہ کرنے کے لئے میٹرن اور وارڈن کو بید کا آزادانہ استعمال کرنا پڑتا تھا۔

نرجس کو نیند کا جھونکا چھو کر گزرا۔ اس کا دل اینٹھنے لگا۔ مہدی کا دل اس کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اس ننھے سے دل کا دھڑکتے رہنا ہی موت کے سامنے اس کی سب سے بڑی جیت تھی۔ وہ اپنے بعد بھی رہے گی۔ لیکن روح کیا تھی اور اگر تھی تو بدن سے نکل کر کہاں قیام کرتی تھی۔ حسین کہاں تھا؟ کہیں بھی نہیں۔ سب کچھ فنا ہو گیا تھا۔ فنا کا مطلب کیا ہوتا ہے، لغوی طور سے اسے معلوم تھا۔ لیکن تو اس خمسہ کی سطح پر بس معلوم ہونے ہی والا تھا۔

"بی بی" مریم نے سلاخوں کے پاس آ کر دھیرے سے اسے آواز دی۔

"کیا بات ہے مریم؟" اس نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"راجا کو بستر پر لٹا دو بی بی، وہ لوگ آ رہے ہیں۔" مریم کی آواز تڑ پنے لگی۔

ایک لمحے کے لئے نرجس کو زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی پھر سنبھل کر اس نے کروٹ لی اور سینے سے لپٹے ہوئے مہدی کو بستر پر لٹا دیا۔ اسے بھلا میری صورت کیا یاد رہے گی اس کے لئے تو میں محض ایک نام، ایک سایہ رہوں گی۔

"ساری خطائیں معاف کر دینا بی بی، ہم روٹی اسی کی کھاتے ہیں۔ پیٹ بڑا بدکار ہے بی بی۔" مریم سلاخوں سے سر ٹکا کر بلکنے لگی۔

نرجس نے چارپائی سے اتر کر دونوں ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالے اور مریم کا شانہ تھام لیا۔ لفظ بے کار تھے۔ بھاری قدموں کی چاپ قریب آئی تو نرجس نے مریم کا بازو تھپتھپایا۔ اس نے سر اٹھا کر لبریز آنکھوں سے نرجس کو دیکھا۔ سفید ململ کے دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور اٹین شن کھڑی ہو گئی۔

مریم نے تالے میں چابی گھمائی اور پھر جس قدر آہستگی سے ممکن تھا، دروازہ کھول دیا۔ آہنی دروازے کو سپرنٹنڈنٹ جیل نے دھکا دیا تو دیوار سے ٹکرا کر آواز ہوئی۔

"صاحب جی۔ بچہ سو رہا ہے، جگ نہ جائے۔" وارڈن مریم نے حدِ ادب کو عبور کرتے ہوئے آنے والوں کو لجاجت سے یاد دلایا۔

"اچھا بک بک مت کرو، بڑی آئی بچے کی سگی۔" سپرنٹنڈنٹ نے اسے تیز آواز میں جھڑکا۔

"SIR, I REQUEST YOU NOT TO TALK LOUDLY." نوجوان مجسٹریٹ نے ایک نظر سوئے ہوئے مہدی پر ڈالی اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

سپرنٹنڈنٹ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ یہ نئے افسر اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتے ہیں۔ اس کا منہ کڑوا ہو گیا پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے ضابطے کی کارروائی شروع کر دی۔ اس نے پہلے نرجس کو شناخت کیا پھر ایک کاغذ کھول کر دفتری لہجے میں بآوازِ بلند پڑھنے لگا۔ یہ کاغذ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہو کر اس مفہوم پر ختم ہوا کہ مجرمہ کے گلے میں پھانسی کا پھندا اس وقت تک پڑا رہے جب تک کہ اس کا دم نکل نہ جائے۔

میڈیکل افسر نے آگے بڑھ کر نرجس کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکن سنی اور آہستہ سے سر ہلا دیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے اس سے چند کاغذوں پر دستخط کروائے۔ نوجوان مجسٹریٹ نے ان دستخطوں کی تصدیق کی اور سپرنٹنڈنٹ کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے وارڈن مریم کو اشارہ کیا۔ وہ اندر آئی۔ اس کا چہرہ جیسے کانسی میں ڈھل گیا تھا۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ نرجس کے دونوں ہاتھ تھام کر پشت پر لے گئی اور انھیں چمڑے کے تسمے سے باندھنے لگی۔ نرجس نے اس کی انگلیوں کی لرزش اور نرمی کو

محسوس کیا۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ باہر بہت سے لوگ تھے، اندر بھی بہت سے لوگ تھے۔ تمام بیرکوں پر اس وقت رائفل برداروں کا پہرا ہوگا صدر دروازے کے باہر بارہ وارڈنوں کی ایک پلٹن تعینات ہو چکی ہوگی۔ ان سب کی رائفلوں میں دس دس گولیاں ہوں گی۔ اور انھیں کے مقابل خاک پر بھیّا بیٹھا ہوگا۔

مہدی کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ ایک ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ میٹرن کے اشارے پر مریم نے اس کا بازو تھاما "چلو بی بی۔"

وہ ایک قدم بڑھی پھر پلٹ کر اس نے مہدی کو دیکھا۔ وہ کلبلا رہا تھا۔ سسکیاں لے رہا تھا۔ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ نرجس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ آنکھوں کی دہلیز تک آنے والے آنسوؤں کو اس نے بہ جبر دھکیلا۔ وہ ان لوگوں کے سامنے تھی جنھوں نے اس کی اور اس جیسے دوسروں کی روح کو شکست دینے کی تمام کوششیں کی تھیں لیکن وہ ان سے ہاری نہیں تھی تو اب آخری لمحوں میں انھیں فتحمندی کے ذائقے سے آشنا کیوں کرے۔

نوجوان مجسٹریٹ کی نگاہوں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ "بچّہ کہاں رہے گا؟" اس نے میٹرن سے پوچھا۔

"بچّے کا ماموں باہر انتظار کر رہا ہے جی۔"

نرجس کے سینے پر گھونسا لگا۔ بھیّا کو اس نے کس امتحان میں ڈال دیا تھا۔

مجسٹریٹ کی پیشانی پر شکن تھی۔ اس نے نرجس پر ایک گہری نظر ڈالی پھر راہداری میں کھڑی ہوئی ایک وارڈن کو آواز دی۔

"جی صاحب!" وارڈن اندر آ گئی۔

"بچّے کو گود میں اٹھالو۔ ذرا احتیاط سے۔"

"صاحب جی، میں اٹھالوں!" مریم کی آواز سرتاپا التجا تھی۔

"چلو تم ہی سہی۔ اسے بی بی کے ساتھ لے کر چلو۔"

"لیکن یہ تو جیل مینول کے..." ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے مداخلت کرنی چاہی "TO HELL WITH THE JAIL MANUAL." نوجوان مجسٹریٹ نے کہا، اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ مریم نے آگے بڑھ کر مہدی کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ وہ فوراً ہی چپ ہو گیا۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی سرکردگی میں قافلہ روانہ ہوا۔ دو سپاہی آگے چل رہے تھے اور دو پیچھے۔ درمیان میں وہ تھی اور اسکے دائیں بائیں مریم اور دوسری وارڈن چل رہی تھیں۔ چلتے ہوئے بھی نرجس کی نگاہیں مہدی پر جمی ہوئی تھیں۔

باہر مئی کے مہینے کی رات میں پو پھٹنے سے پہلے کی خوشگوار خنکی رچی ہوئی تھی۔ ڈوبتے ہوئے چاند کی روشنی میں اس نے تختۂ دار کو دیکھا۔ سیڑھیاں اسے نظر آ رہی تھیں۔ موت تو پاتال میں اترنے کا نام ہے، اس پاتال میں اترنے کے لئے سیڑھیاں کیوں چڑھنی پڑتی ہیں؟ اسے جلّاد نظر آیا۔ آج اس کے بچّے کتنے خوش ہوں گے۔ باپ کو آج پھانسی کھتّہ ملے گا۔ دس روپے۔ دس روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ ان روپوں سے کئی چیزیں خریدی جاسکتی ہیں۔ نرجس کا ذہن بھٹک رہا تھا۔ اس کے پیروں میں کوئی لرزش نہ تھی۔ ہر طرف سنّاٹا تھا۔ ہر شخص کی نگاہیں اس کے بے لغزش قدموں پر جمی ہوئی تھیں۔

اچانک وہ رک گئی۔ "مریم"۔ اس کی آواز سنّاٹے میں بجلی کی طرح چمکی۔

"حکم دو بی بی!" وارڈن مریم کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ جانے کون حاکم تھا اور کون محکوم۔ اس نے مریم کو قریب آنیکا اشارہ کیا۔ مریم اسکے سامنے جھک گئی پشت پر بندھے ہوئے نرجس کے دونوں ہاتھ مہدی کو چھونے کیلئے پھڑکے پھر اپنی جگہ ساکت ہو گئے مہدی نیند میں ہنس رہا تھا، شاید پریوں سے کھیل رہا تھا۔ نرجس نے دھندلاتی ہوئی آنکھوں سے زندگی کو دیکھا پھر آہستہ سے اسکا ماتھا چوما، رخسار چومے، بال چومے زندگی زندگی سے رخصت ہو رہی تھی

وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تختۂ دار پر پہنچی تو سرکاری جلّاد اسکے قدموں میں جھکا اور تسمے سے پیر باندھنے لگا۔ نرجس نے اوجھل ہوتے ہوتے منظر پر ایک نظر ڈالی پھر اسے اپنے اندر رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور منظر اسکے اندر تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چاند ڈوب رہا ہے صبح کا ستارہ طلوع ہو گیا ہے۔ مہدی پریوں سے کھیل رہا ہے۔ سورج کا ظہور ہونے والا ہے اور اللہ کے بابرکت نام سے شروع ہونے والے حکم نامے پر عمل درآمد کا وقت آپہنچا ہے۔ ■ ■

تمنّائے

بنتِ مسعود ● آر-ایچ-۴/ای-۱۱، سیکٹر-۹-سی بی ڈی-بیلاپور-نئی بمبئی ۴۰۰۶۱۴

وہ آہستہ آہستہ ریشمی کا جسم سہلاتی رہی۔ تڑپ، چبھن، جلن تھی کہ بجھنے کا نام لیتی۔

"ریشمی! ریشمی!!" ناہید نے پچکارا۔ "جانے کیا ہوگیا ہے اسے؟" ریشمی نے بمشکل ایک آنکھ کھولی اور دوبارہ بند کرلی۔ پھر جیسے یکلخت اسے قرار آگیا۔ وہ آنکھیں میچے چپ چاپ پڑی رہی۔ ریشمی سیامی نسل کی تھی۔ دونوں کان اور ناک کالے بھنورے جیسے اور پورا جسم گورا ریشم جیسا۔ یہ ناہید کی عادت سی بن گئی تھی کہ وہ ہر حسین شے کا خود سے موازنہ کرتی اور گھنٹوں سوچتی رہتی۔ بس یہی روزگار تھا۔ کیا وہ خود کم حسین تھی لیکن شاید قسمت کو خوبصورت ہونا چاہئے۔ جسم کی خوبصورتی کا کیا۔

اسے اپنے حسین ہونے کا اس وقت بھی احساس تھا جب وہ گول مٹول سی بظاہر لاپرواہ تاروں والی چنریا اوڑھے کبھی ادھر کبھی ادھر اڑتی پھرتی تھی۔ اس وقت بھی نادانستگی میں اس کی آنکھیں لڑکوں سے یہی پوچھتیں "مجھے کون چنے گا؟" اور آج وہ چالیس کے قریب ہے اور پرانے خمیر کی طرح سڑ رہی ہے۔ یہ بات بھی نہیں کہ کسی نے اسے منتخب نہیں کیا مگر قسمت کو کیا کیا جائے یا پھر شاید بے صبر تمنّا کو سلیقہ نہ تھا۔

کہانیوں کے ہیرو کی طرح اسلم اپنی کٹی پتنگ لینے اس کی چھت پر آیا تھا۔ پھر ترنگیں، امنگیں، خوشیاں سب اس سے وابستہ ہوگئیں۔

"ناہید مجھے کبھی نہ چھوڑنا۔" نسیم نے اسے بھینچ بھینچ کر کہا تھا۔

"بس انجینیرنگ کرلوں پھر تمہیں دلہن بنا کرلے جاؤں گا۔"

دلہن بننے کا سپنا ہر لڑکی بچپن سے آنکھوں میں سجالیتی ہے لیکن زندگی کا یہ موڑ اسے کہاں لے آیا اور اس میں سے نکلنے والی پیچ پیچ گلیاں اس کا راستہ ہی کھو گیا۔ اسلم اسے چھوڑ کر پاکستان چلا گیا۔ کتنا انتظار کیا تھا اس نے نسیم کا اس کے خطوں کا۔ ان دنوں آنکھوں میں آج کی طرح خشک سالی نہ تھی۔ ایک سیلاب تھا جو امڈ پڑتا تھا۔

مگر شاید یہ انسانی مزاج کا تضاد ہی ہے کہ ایک امید ختم نہیں ہوئی کہ وہ دوسری آس باندھ لیتا ہے پھر کچھ عمر کا تقاضہ بھی! اسے ندیم اچھا لگنے لگا۔ اس مرتبہ گھر والے راضی نہ ہوئے "ایسی کون سی عمر بیت گئی جو لڑکی اپنا بر منہ سے مانگ رہی ہے۔" پھوپھی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے "اور پھر شیعوں، پٹھانوں کا کیا میل؟" امّی نے کہا۔ ننھے بھیّا کو پتہ چلا تو ان کے افغانی خون نے جوش مارا اور انھوں نے شیعوں کے محلّے میں جاکر اندھا دھند چار پانچ فائر کر دئے۔ شکر ہے کہ کوئی مرا نہیں بس لائسنس چھن گیا۔ بدنامی ہوئی سو وہ تو ہونا ہی تھی۔ ننھے بھیّا دل برداشتہ ہو کر دوبئی چلے گئے۔ بھیّا کے جانے کا قلق اسے بھی تھا۔

"نصیبوں جلی اری خود منہ کالا کر گئی ہوتی۔ مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا۔ ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگوایا سو الگ۔" بددعاؤں کا طومار باندھے ہوئی امّی روتیں بلکیں۔ امّاں جی اور پھوپھی نے بھی بول چال بند کر دی۔ پھوپھی تو جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں۔ ننھے بھیا کو انھوں نے بڑے دلارے پالا پوسا تھا وہ بھی سدھ بدھ کھو بیٹھیں۔ دوبئی میں ننھے بھیا کو اچھی ملازمت مل گئی۔ انھوں نے سبھوں کو بلا بھیجا مگر ابّا اپنا گھر، اپنا شہر اپنا ملک چھوڑ کر کہیں جانا نہ چاہتے تھے۔ بس چپ چپ سے رہنے لگے۔ اور ان کی وجہ سے کوئی بھی ننھے بھیا کے

پاس نہیں گیا اور سبھوں کا قہر اسی پر ٹوٹتا۔

بوکھلائی سی ناہید ندیم کے پاس پہنچی اس نے یہی کہا "اگر تم میں ہمّت ہے تو دنیا سے بغاوت کرنی ہوگی"۔ بس بس ناہید نے اسے روک دیا۔ دونوں کے والدین راضی نہ تھے اس لئے انھوں نے کورٹ میں درخواست دے دی جس کے لئے ایک ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ یہی قاعدہ تھا۔ ناہید واپس آگئی بس ایک ماہ ہی کی تو بات ہے۔

پھر امّی نے ایسا بستر پکڑا کہ اٹھ ہی نہ پائیں۔ ناہید نے رات رات بھر خدمت کی۔ ماں کا دل تھا پسیج گیا۔ دونوں گلے مل کر روئیں۔ پھوپھی نے اور ساتھ دیا۔ ساری کدورت دور ہوگئی۔ ایک ماہ کو پورا ہونے میں کم عرصہ رہ گیا تھا لیکن اب وہ پہلی سی امنگ اور جوش باقی نہ رہا تھا۔ پھر بھی با دل نخواستہ وہ وقت مقررہ پر اٹھی۔ امّی کی دوائیں لانے کا بہانہ تھا۔ دو چار کپڑے لئے۔ کچھ زیور پرس میں ڈال لئے۔ نوٹوں کی ایک گڈی تجوری کھول کر اڑس لی۔ جاتے جاتے دل نہ مانا سوچا ایک نظر امّی کو دیکھ لوں۔

"ناہید بیٹا آجا۔ بیٹھ جا میرے پاس۔ جانے کیوں دل پھٹا جا رہا ہے"۔ امی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"امّی میں بس ابھی آپ کی دوا لے کر آتی ہوں"۔ ناہید نے کشمکش کے لہجہ میں جواب دیا۔

"کسی اور سے منگوا لے بیٹا۔ میرے پاس سے نہ اٹھ"۔

"امّی بس ابھی آئی"۔ ناہید نے جلدی سے کہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ ایک سکنڈ بھی ٹھہر گئی تو پھر کبھی نہ جا پائے گی۔

خیر جو ہونا تھا وہ سب کچھ ہو گیا۔ کاغذوں پر دستخط ہوئے اور بس اللہ اللہ خیر صلّا۔ یہ بھی کوئی شادی ہے۔ شہنائی نہ بارات، ڈھول نہ تاشے، ڈومنیاں نہ گالیاں۔ وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ ندیم سمجھ دار تھا حالات سے باخبر بھی تھا۔ اس نے کہا "ناہید تم گھر واپس چلی جاؤ میں اپنے گھر والوں کو بھیجتا ہوں۔ تمہارے گھر کے لوگ اب اعتراض نہیں کریں گے۔ جب ہم شادی کر ہی چکے ہیں تو اسی میں ان کی عزّت ہے کہ وہ سبھوں کے سامنے نکاح پڑھوا کر خوشی خوشی رخصت کر دیں۔

گھر لوٹی تو ماتم بچھا تھا۔ ڈاکٹر امّی کے سرہانے کھڑے تھے۔ دو دنوں میں امّی کا قصّہ ختم ہوگیا۔ یہ جا وہ جا! ندیم نے کہلوا بھیجا کہ وہ اسے لینے کے لئے سوگ کے دنوں کے بعد آئے گا۔ ایسے حالات میں ابّا جی سے کچھ کہنا مناسب نہیں۔ بلا وجہ ان کا دل دکھے گا۔

باتیں کہیں چھپتی ہیں، ابّا جی کو تمام حالات معلوم ہوتے تو انھوں نے کہرام مچا دیا۔

"چاہے میں بھنگی کو بیٹی دے دوں پر ندیم کو نہیں دوں گا جس کے لئے مجھے اپنے بیٹے سے جُدا ہونا پڑا، بیوی سے ہاتھ دھونا پڑا اگر اسے بیٹی بیاہ دی تو میں پٹھان نہیں۔

وہ زبان کے پکّے تھے وہی ہوا۔ گھر کے دروازے مقفل کر دئے گئے پھوپھی سائے کی طرح ساتھ رہتیں۔ جانے والا سات تالے بھی توڑ کر نکل جاتا ہے مگر اب گھر چھوڑتے ہوتے ڈر لگتا تھا کہ کہیں ابّا جی مارے غیرت کے خودکشی نہ کرلیں۔ ناہید سلگتی، تڑپتی رہی نہ اس پل چین نہ اس پہلو قرار! کورٹ کچہری ہوتی رہی۔ پورا شہر مقدمہ سننے آتا۔ ہتک، بدنامی، باپ کی جھکی گردن ذلّت کا احساس کراتی۔

پھر ناہید نے بھری عدالت میں کہہ دیا کہ شادی کے کاغذوں پر اس کے دستخط نہیں ہیں۔ اس نے گواہوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ندیم اسے بدنام کر رہا ہے۔ اس کا اور ندیم کا کوئی رشتہ نہیں۔ ابّا جی خوش ہو گئے اور جس طرح کورٹ میں شادی ہوئی تھی کورٹ ہی میں ختم ہوگئی۔ ایک لمحے میں سارے بندھن کچّے بخیوں کی طرح ادھڑ کر رہ گئے۔

ندیم نے البتہ اپنے وقار کی خاطر ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ تک مقدمے کو کھینچا۔ دس بارہ سال کا عرصہ در و دیوار سے ٹکرائے بنا جانے کدھر سے گزر گیا۔ بالوں میں چاندی کے تار پڑ گئے پھر آگے کی پٹیاں سفید ہونے لگیں۔

"نزلہ کھا گیا بٹیا کو"۔ پھوپھی بال بناتے بناتے آہ کھینچتیں۔ دکان سے خضاب منگوا کر دیا "کہ بٹیا لگا لو" مگر اب ان چیزوں کی اُسے فرصت نہ رہی تھی۔ قرار آ ہی گیا تھا۔ مگر خشک سالی اب بھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ سیلاب بلا اب بھی اس کی دہلیز پکڑے بیٹھا تھا۔

پھر ایک روز ننھے بھیا کا خط آیا کہ ان کا ایک دوست آ رہا ہے جس کے ہاتھ انھوں نے ناہید، ابّا جی اور پھوپھی کے لئے بہت سے تحفے

ہیں۔ ابا جی کو یہ بھی ہدایت کی تھی کہ ناہید کا نکاح اس کے دوست سے کر دیا جائے۔ آنکھیں بھیگتی رہیں خط پڑھ کر۔ پھوپھی نے کارچوبی
رڈوں کو دھوپ دکھائی۔ ناہید نے سوچا اب جو بھی قسمت میں ہوگا وہ اسے قبول کر لے گی اور لڑنے کی ہمّت ٹوٹ چکی تھی۔ اس نے
ال دی۔

دلچسپی لے کر ننھے بھیّا کے مہمان کے لئے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکایا۔ قورمہ، بریانی، شاہی ٹکڑے، پراٹھے اور جانے کیا کیا۔ کواڑ کی آڑ میں سے
ہو پھی کو رکابیاں قابیں دے رہی تھی اور مہمان کا جائزہ بھی لیتی جا رہی تھی۔ لڑکا کیا اچھا خاصا آدمی تھا۔ توند نکلی ہوئی، گہری سانولی رنگت
ر آنکھوں پر چشمہ۔ مگر اس نے سوچ لیا کہ اب وہ اپنے دل کے بہکانے پر نہیں جائے گی۔ پر یہ کیا؟ کیا اس کے کان بج رہے ہیں۔ اس نے
سُنا۔ ننھے بھیّا کا مہمان ابا جی سے کہہ رہا تھا۔

" خان چچا آپ کی لڑکی کیا یہاں نہیں ہے۔ یہاں تو میں نے دو ہی عورتیں دیکھی ہیں۔ ایک تو یہ پھوپھی اور دوسری کوئی ادھیڑ عمر کی عورت
دبلی پتلی کھچڑی بالوں والی۔ وہ قابیں چھوڑ کر دوڑتی ہوئی اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ جیسے
ں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ جیسے کسی نے اس کے تمام کپڑے اتار لئے ہوں۔ وہ سُن سی ہوگئی۔ خدا! کسی کا اس طرح بھی بھرم نہ نکلے۔ باوجود
ں کے ایک قطرہ آنسو کا نہ نکلا۔ یوں خشک سالی شروع ہوئی پھر خشک سالی کا موسم کبھی ختم نہ ہوا۔ اسے یقین تھا کہ اب اگر وہ روئے گی
ھوں سے خون بہے گا۔

" ریشمی! ریشمی!" اس نے پھر بلّی کو جھنجھوڑا سکوت سے بے حسی سے وہ بے چین ہو جاتی۔ "میاؤں" ریشمی نے درد کے ساتھ کہا۔ ناہید نے اطمینان کا سانس
اس میں ابھی زندگی کی لہر باقی ہے۔ ناہید نے آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے روز جانوروں کے معالجاتی اسپتال میں جب ناہید ریشمی کو لے گئی تو ڈاکٹر نے بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ریشمی بالغ ہوگئی ہے۔
ے لئے کوئی بلّا تلاش کرنا ہوگا۔ جو اس کی نسل کا ہونا چاہیئے اور پھر سامی نسل کی بلّیاں ایک ہی بچہ پیدا کرتی ہیں اس کے برعکس یہ کا پالن کرتی
پہلی مرتبہ یہ URGE ان میں دوسرے جانوروں سے بہت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے ریشمی بیمار سی ہوگئی۔

" ہائے!!!" پھوپھی نے بھی تعجب کیا۔ پھر یہ بات ابا جی کو بھی معلوم ہوگئی۔ اب تینوں کا ایک ہی مطمح نظر تھا ریشمی کے لئے بلّے کی تلاش۔
ایک دو بلّے ناہید نے کہیں سے منگوائے۔ دراصل اسے بہت جلدی تھی مگر ریشمی نے انھیں اپنے قریب پھٹکنے بھی نہ دیا وہ سامی نسل کے نہ تھے۔
" بلّا ملے گا بھی یا نہیں؟" ناہید کو جانے کیوں ڈر سا لگنے لگا تھا کہ کہیں ریشمی کا حشر بھی اس جیسا نہ ہو۔ کشتی اتنی شکستہ نہ ہو جائے کہ ساحل کی تمنّا
ٹ جائے۔ ریشمی جب تنہائی میں روتی تو ناہید کی راتیں بے چینی سے گزرتیں وہ نہیں چاہتی تھی کہ جن ناسوروں کو اس نے پالا ہے ریشمی بھی
ہکا شکار ہو جائے۔

پھر ایک روز ابا جی نماز کے لئے مسجد گئے تو گھنٹوں بعد واپس لوٹے۔ تانگے پر آئے تھے۔ ساتھ میں ایک آدمی بھی تھا اور ایک
ورت سا بلّا بھی سامی نسل کا۔ کالے کالے کانوں اور کالی ناک والا۔ ناہید کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اف! کتنے عرصے بعد خوشی کا اسے احساس
تھا ورنہ وہ تو اس جذبہ کو مکمل طور پر بھول ہی گئی تھی۔ ناہید نے بجائے چائے اور ناشتے کے اس شخص کو کھانا کھلا کر بھیجا اس کی ایسی خاطر
یہ وہ ان کا سمدھی ہو۔ اسے خوش دیکھ کر ابا جی اور پھوپھی بھی ہنسنے لگے۔ ریشمی کے لئے ہی سہی مگر پورا خاندان مدّت دراز کے بعد
ھکر ہنسا بولا تھا۔

پھوپھی نے کہا۔

" دُولہا کو نہلا دے لڑکی، ہی ہی ہی!" ابا جی مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ناہید نے بلّے کے گلے میں سیاہ پٹّا باندھا۔ اسے تازی مچھلیاں
اکر کھلائیں۔ بالائی والا دُودھ پینے کو دیا۔

مگر جس کھیل کا انتظار تھا وہ شروع نہ ہوتا تھا۔ ناہید نے پھوپھی سے کہا " چلو ہم دونوں باہر چلتے ہیں۔ شاید ہمارے سامنے بلّا شرما رہا ہے
ریشمی غرّا کر بلّے پر جھپٹتی، بیٹھتی اور وہ کسی کونے میں دبک جاتا۔ ناہید اور پھوپھی نے دراز میں سے جھانکا۔ لیکن کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

پھوپھی نے کہا۔

"مجھے تو بٹیا پتے میں کوئی کمی معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو کیسے چپ چپ رہتا ہے۔ شاید بیمار ہے۔

"اف اب کیا ہوگا پھوپھی!" ناہید پریشان ہوگئی۔

ریشمی نے بھی اب بیٹے کی جانب دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسی طرح راتوں کو روتی بلکتی رہتی۔ برہمن بنی۔

"ہائے ری قسمت۔ بلا بھی ملا تو......!" "ریشمی ریشمی" ناہید کو اس پر مزید پیار آنے لگا۔ وہ اسے سینے سے چمٹاتے رہتی۔

کوئی خبر لایا کہ بڑی کوٹھی والے وکیل صاحب کے پاس سامی لنس کا بلا ہے۔ ناہید خود ریشمی کو وہاں لے کر گئی۔ وکیل صاحب بہت اخلاق سے پیش آئے اور بولے۔

"گھبرائیے مت۔ آپ کا کیا کیس ہے؟" "جی وہ ....." ناہید نے اپنا مدعا بیان کیا۔ وکیل صاحب نے کہا۔

"وچ وچ" "میرا بلا تو چار پانچ ماہ قبل ہی ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ کار کے نیچے آگیا تھا بے چارا!" ناہید کا دل دھک سے رہ گیا وہ ہرصورت حقائق کی تلخیوں سے بچنا چاہتی تھی مگر کیسے اور کیونکر بچا جائے اس کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی تمنائی کو دیکھتی تو اس کا قرار لٹ جاتا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ریشمی بھی اسی کی طرح بے حسی اور جمود اختیار کرلے۔ تمنائی تو وہ بھی تھی پر کسی نہ کسی طرح اب اسے قرار آہی گیا تھا، اب ناہید ریشمی کو ایک لمحے کے لئے بھی اپنے سے دور نہ ہونے دیتی۔ ریشمی اس ٹوٹے ہوئے آئینہ کی طرح اس کے ہاتھوں میں رہتی جس میں ماضی کے خواب جھلملاتے رہتے ہیں۔ ■■

بقیہ صفحہ ۲۶ روزنا قصہ

جلاتی ہے۔ اس کچن میں آکر اس نے اپنا نام کھو دیا ہے۔ وہ نام جو شاید اب کسی کو یاد نہ رہا ہو۔

ممی کے ہاتھ میں پھر تیز دھار والا چاقو آگیا اور اب وہ کیریوں کے بجائے دھیرے دھیرے اپنی انگلیاں کاٹ رہی تھی ——

سارے کچن میں دھواں پھیل رہا تھا —— دال کو داغ لگ چکا ہے —— پورا کچن دھوئیں سے بھر گیا

شام کو سب سے پہلے بھاسکر گھر آیا ——

دالان میں جھولنے والی گڑیا چپ چاپ لٹک رہی تھی ——

سارے گھر میں کسی چیز کے جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی اور ممی کچن سے غائب ——

بھاسکر نے سارے گھر میں ڈھونڈا ——

اور OVEN میں ایک جلی ہوئی مرغی پڑی تھی —— ■■

بقیہ صفحہ ۳۰ کیا رشتہ کیا ناتا

"ایویں منہ بھر کے نہ آکھیا کرو ——" وہ فخر کے ساتھ بہو بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"چلو، کیرتن نوں دیر ہو جاوے گی!"

جمیل پر جلد بازی نے اچانک حملہ کر دیا۔ وہ وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا جیسے وہ کوئی کمزور کبوتر ہو۔ اس نے عجلت کے ساتھ اپنے جمیل ہونے کا اعتراف کیا۔ رسمی سا حال چال پوچھا۔ معذرت کی اور چل پڑا۔

چند قدم چل کر اس کا دھیان خود بخود پیچھے مڑ گیا۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان سکھ بھی مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے۔ جمیل نے منہ پھیر لیا۔ اگلے ہی لمحے دوبارہ پیچھے دیکھا تو جوان بھی دیکھ رہا تھا —— مان سنگھ —— مان سنگھ دیکھ رہا تھا۔ ننھا عثمان کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ عثمان ہی تھا سرخ و سپید پٹھان بچہ —— اس کا۔

جمیل اپنی بیٹی کو کھینچتا انارکلی سے نیلا گنبد کی طرف بڑھ گیا کہ وہاں مسجد کے سامنے تیز چلنے والی ٹیکسیاں اور رکشا ہر وقت تیار ملتے ہیں۔ ■■

مکتوبات

شمارہ نمبر ۶

وارث علوی ____________ سید واڑہ آستودیا احمد آباد

ادھر شاعر میں تمہارا مضمون دیکھا۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم نے پیار اور محبت سے اختلاف کے گوشے نکالے CONTROVERSIES نہ ہوں تو تنقید بے جان ہو جاتی ہے اور نقاد خود نقاد مر جاتا ہے۔ کنویں کے مینڈک کی طرح ٹرایا کرتا ہے اور کوئی اس کی نوٹس نہیں لیتا۔ اختلافِ رائے دلیل ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ اسی کا INVOLVEMENT قائم ہے۔ اخبار "جنگ" کے انٹرویو میں میں نے یہ بات کہی تھی کہ اب نارنگ فاروقی سے اور مجھ سے جرأت مندانہ اختلافِ رائے کر رہے ہیں جو ان کی تنقید کے نئے پہلوؤں کو سامنے لا رہے ہیں۔ جدید افسانے پر ابھی بھی ذہن صاف نہیں ہے اور اس پر کھل کر بحث ہونی چاہئے۔ تم نے اس بحث کا آغاز کیا اچھا کیا۔ (گوپی چند نارنگ کے نام۔ ۱۲؍اگست ۸۵ء)

بلراج کومل ____________ اے ۱۲۹، کالکاجی، نئی دہلی

شمارہ نمبر ۶ میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقالہ: "نیا افسانہ، علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر" انتہائی دلچسپی سے پڑھا۔ مقالہ بھرپور اور فکر انگیز ہے۔ میں فن پاروں کی انفرادی ساختی "وحدت کے اصول کو قبول کرتا ہوں اور علامت تمثیل اور دیگر وسائل کو فن پاروں کی ساختی "وحدت کا حصہ ہی سمجھتا ہے۔ کہانی کے جوہر کے بغیر کہانی کے نام پر پیش کئے جانے والی تحریروں کا جو بھی نام ہم اپنی خوشی کے لئے رکھ لیں لیکن بہرحال وہ نام اس وقت کہانی نہیں ہوگا جب تک اس میں کہانی پن کے عناصر نہیں ہوں گے۔ یہ مقالہ لکھنے کے لئے ڈاکٹر نارنگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"ندا فاضلی کی نظمیں تازہ کار لب و لہجے اور زندگی کی تمازت سے سرشار ہیں۔

شاعر کا یہ شمارہ پہلے سے بہتر ہوا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے میں دعا کرتا ہوں۔

محمد سلیم الدین ____________ ۳/۱۶۔ ۱۵۹، مولانا آزاد روڈ، بمبئی ۔ ۸

"شاعر" شمارہ ۱۲، جلد ۵۶ اپنے مشمولات کے اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہے کہ فکشن میں اشفاق احمد موجود ہیں شاعری میں ندا فاضلی اور دیگر شعراء اور مقالات میں گوپی چند نارنگ۔

گوپی چند نارنگ کے مقالہ کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلا احساس جو دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نارنگ صاحب نے اپنا مقالہ "نئے افسانے کی محبت" پسندیدگی یا اس کے جواہر سے متاثر ہو کر نہیں وارث علوی کی ضد میں تحریر کیا ہے۔ اس احساس کو یقین کا پیکر خود نارنگ صاحب کی تحریر عطا کرتی ہے ملاحظہ فرمائیں صفحہ ۱۲ پر ان کا بیان

"اس بحث کے بعد اب دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے نئے افسانہ نگار حقیقت نگاری کی کہانی کو کس تخلیقی سطح پر برت رہے ہیں۔ اس کیلئے سلام بن رزاق کی کہانی "انجام کار" کو لیا جاتا ہے جو کہ پہلی بار ۱۹۷۰ء میں چھپی تھی اور جیسے ترقی پسند تنقید کے غلط رویوں کی وجہ سے مصنف نے اپنے مجموعے ننگی دوپہر کا سپاہی (۱۹۷۷) میں سب سے آخر میں جگہ دی ہے۔ سات سال پہلے اس کہانی کو پہلی بار پڑھنے کے بعد مجھے توقع تھی کہ جدید نقاد نہ سہی کم از کم ترقی پسند نقادوں میں سے کوئی اس کے معنیاتی انسلاکات سے پردہ اٹھائے گا۔"

نارنگ صاحب کا بیان یا مرثیہ سلام کے افسانے کی اشاعت کے سات سال بعد تحریر کی صورت میں "شاعر" کے صفحات پر کچی روشنائی سے شائع ہوا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترقی پسند نقاد یا جدید نقاد سے قطع نظر خود نارنگ صاحب نے سات برسوں تک اپنے خیالات یا پسندیدگی کے اظہار کے لئے قلم کیوں نہ اٹھایا؟ جبکہ ۷۷ سے ۸۵ء تک موصوف نے فکشن کے تعلق سے دو مضامین تحریر کئے۔ لیکن ان میں کہیں سلام بن رزاق کی کہانی "انجام کار" کا ذکر نہیں ہے۔ اب سات برسوں کے بعد نارنگ صاحب نے سلام کے افسانہ پر محض اس لئے اظہارِ خیال کیا کہ وارث علوی نے "جواز" مئی ۸۳ء میں سلام کے فن پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ مسئلہ دیگر ہے کہ وارث علوی نے سلام بن رزاق کو صرف ایک افسانہ کا خالق قرار دیا ہے تنقید کے ترازو میں ڈنڈی وارث علوی نے بھی ماری تھی اور اب نارنگ نے بھی فن کاری دکھائی ہے۔ وارث علوی کی مجبوری یہ ہے کہ نیا افسانہ

علامتی، تمثیلی، استعاراتی، تجریدی وغیرہ وغیرہ ان کے ادبی تخلیہ میں مداخلت محض ہے۔ شمس الرحمان فاروقی بیاکے گھونسلہ کو بھی افسانہ قرار دے لیتے ہیں۔ باقر مہدی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نئے افسانے کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے افسانوی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ کچھ مجبوریاں خود نارنگ صاحب کے راستہ میں بھی حائل ہوجاتی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ان تمام مجبوریوں کو آپ تنقید کے بے مزہ کھیل سے بھی موسوم کرسکتے ہیں یعنی اردو تنقید کا کوئی بھی ناقد سچی بات کہنے سے پہلے خوف میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ وہ جو ہمارے سامنے دُکان لگائے بیٹھا ہے ہماری بات نہ لے اڑے۔ پھر نقاد حضرات غلط فہمی کے اس سرسام میں بھی مبتلا ہیں کہ ہمارے لکھنے سے نئے افسانہ نگار پہچان لئے جائیں گے۔

بدقسمتی سے نقادوں کو اس مرض میں مبتلا بھی کچھ افسانہ نگاروں نے کیا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ مستقبل قریب میں اردو افسانے کے قاری کو "کھیلے" سے پاک تنقید پڑھنے کے لئے ملے گی یا نہیں ؟

حسین الحق ___________ شعبۂ اردو فارسی، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا

شاعر کے تازہ شمارے میں گوپی چند نارنگ صاحب کا مضمون بہت خوب، فکرانگیز اور سوچ سمجھ کر لکھا ہوا ہے اور شاید اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کے پچھلے مضمون "روایت سے انحراف اور مقلدین کے لئے لمحۂ فکریہ" پر جو ہائے تو بہ مچی اور رد ناد ھوتا مچا اس سے خود نارنگ صاحب بھی متاثر ہوئے اور آخرکار اپنے خیالات میں تبدیلی کی طرف مائل ہوئے، یہ نارنگ صاحب کا بڑ پن ہے ورنہ اردو کا ناقد کہیں اپنی رائے تبدیل کرتا ہے ؟

ویسے کچھ باتیں اس مضمون میں بھی اختلاف کی راہیں پیدا کرتی ہیں اور بعض ایسی باتوں کو بھی نارنگ صاحب نے پچھلے مضمون سے وابستہ کردیا ہے جو پچھلے مضمون میں نہیں تھیں، یہ غالباً بشری تسامح ہے۔

مضمون اتنا فکر انگیز ہے، کہ اس کا تفصیلی تجزیہ کرنا ادبی دیانتداری کے منافی ہوگا۔ انشاء اللہ یہ تجزیہ بھی آپ ہی کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ اشفاق احمد نے مایوس کیا... یا شاید میری فہم ناقص ہو۔

شمارہ نمبر ۷

نامی انصاری ___________ ۹۶/۱۷ پریڈ، کانپور

شاعر کا شمارہ ۷ علامہ اقبال کے خطوط "اقبال ـــ جہانِ دیگر" کی وجہ سے بڑا اہم اور محفوظ کرنے کے لائق ہے۔ اس کے بارے میں ایک اشتہاری مضمون یہاں کے سیاست جدید اخبار میں میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ان عام نوعیت کے خطوط میں ایک خط ایسا بھی ہے جس سے انکشاف ہوتا ہے کہ پاکستان کی تشکیل کے بارے میں اقبال کا نظریہ وہ نہیں تھا جو عام طور سے ان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ انڈین یونین کے اندر ہی مسلمانوں کے ایک صوبے کے حق میں تھے نہ کہ ایک آزاد مملکت کی شکل میں۔ خیر یہ تو ایک قصۂ پارینہ ہے مگر ان کے اردو خطوط کا انداز تخاطب بڑا عجیب سا لگا۔ ڈیر راغب صاحب اور پھر السّلام علیکم! خط ۲ شروع تو "آپ" سے ہوتا ہے مگر دوسری ہی سطر میں انداز تخاطب بدل جاتا ہے۔ شاید اس زمانے کی یہی روش رہی ہو۔ ہرچرن چاولہ کا سفرنامہ "تم کو دیکھیں" خیال تھا کہ اطمینان سے پڑھیں گے مگر ایک مرتبہ شروع کردیا تو ایک ہی نشست میں پورا پڑھ ڈالا۔ بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے جس سے آج کے لاہور کا پورا ادبی منظرنامہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ چاولہ صاحب کو اتنے اچھے سفرنامے پر مبارکباد!

محسن زیدی کی تینوں غزلیں بہت اچھی ہیں اور ممتاز راشد کی بھی۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی علامت فہمی کے بارے میں کیا عرض کروں! جدیدیت کے بارے میں انکی انتہاپسندی معقولیت کی سرحدوں کو پار کرجاتی ہے۔ اس مضمون میں بھی وہ حسب معمول دور کی کوڑی لائے ہیں یعنی:-

"تخلیقی عمل کے تحت شاعر کا خارجی حقیقت سے رشتہ برائے نام رہ جاتا ہے..... یہ عدم سے وجود کا سفر ہے۔ اس عمل میں خارج اور داخل میں کسی رشتۂ باہم کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ موجودہ صدی میں اقبال، فیض یا اخترالایمان خارج اور داخل میں رشتۂ باہم قائم کرنے سے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیتے "!

کارنامہ تو در اصل یہ جدید نقاد انجام دیتے ہیں جب وہ شاعر کو ذات کے عدم میں تحلیل کر کے پھر زندہ کرتے ہیں مگر اسطرح کہ نہ اس کے دل ودماغ ہوتا ہے نہ چشم وگوش۔ ساون کے اندھے کو تو کم از کم ہرا ہرا سوجھتا ہے مگر حامدی کاشمیری کا شاعر اس سے بھی محروم ہے۔ آپ نے اداریے میں قاری، کتاب اور ادبی رسائل کے مسائل کا بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ آپ کو جدید تنقید کے انتشار اور انارکی پر بھی اداریہ لکھنا چاہئے جو ان دنوں بہت ہی عام، فاضل نقادوں کے مشقِ ستم کا شکار ہے۔ یہ لوگ مغربی تنقید کی کتابیں خوب پڑھتے ہیں، مگر اس کو ہضم کئے بغیر سارا استیال مادہ ادبی رسائل کے صفحات پر اُگل دیتے ہیں۔ پڑھنے والا حیران وششدر رہ جاتا ہے۔ آج کل اردو افسانے کی جان پر بنی ہوئی ہے وہ کھینچا تانی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ترقی پسند نقاد، سوائے ممتاز حسین کے، سب مبہوت اور خاموش ہیں۔ جدید نقاد بے پیر کی اڑا رہے ہیں۔ ہر شخص کلیم الدین احمد بننا چاہتا ہے۔ خدا کرے انجام بخیر ہو۔

ڈاکٹر طاہرا ہی قریشی

شعبۂ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی۔ گلبرگہ

شاعر کا شمارہ ۵ نظر نواز ہوا۔ علامہ اقبال کے مکاتیب اس دور کے اہم ترین سیاسی حالات پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔

علامہ مرحوم کے پانچویں خط (مورخہ ۲۷ر جنوری ۱۹۳۲ء) میں فارسی شعر کی صاف نویسی میری رائے میں محتاجِ توجہ ہے۔ صاف نویسی اس طرح ہوئی ہے ؎

اے فلک چشمِ تو بے باک و بلاخوف ہنوز

می شناسم کہ تماشائے دگر می خواہی

اس شعر کا مصرع اولیٰ یوں لکھا جانا چاہئے تھا ؎

اے فلک چشمِ تو بے باک و بلاجوست ہنوز

(یعنی اے فلک! چشمِ تو ہنوز بے باک و بلاجو است) اس طرح فعل "است" کی کمی دور ہو کر مطلب صاف اور شعر بہ لحاظِ قواعد بے عیب ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال کا آخری یعنی دسواں مکتوبِ گرامی بھی از ابتدا تا انتہا محتاجِ توجہ ہے۔ اس کا اندازِ تحریر عجیب وغریب لگتا ہے اور دستخط تو اقبال کے ہمارے سے قطعاً مختلف ہیں۔ اقبال کے ایسے دستخط کم از کم میری نظر سے آج تک نہیں گزرے۔ ہو سکتا ہے کہ علامہ مرحوم نے اپنی مذکورہ علالت کے باعث یہ خط کسی اور سے لکھوایا ہو اور اسی راقم الحروف نے "محمد اقبال" بھی آخر میں لکھ دیا ہو۔

شمارہ نمبر ۸ - ۹

ڈاکٹر گیان چند

شعبۂ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، حیدرآباد

شاعر کا شمارہ نمبر ۸ - ۹ تفصیل سے دیکھا۔ اس میں ترانہ کی رباعیوں سے زیادہ بیش بہا تخلیقی ادب والی ۱۳۱ رباعیاں ہیں۔ پاکستان کا تخلیقی ادب ہندوستان میں بس نایاب ہے۔ مجھے ایک خیال آتا ہے۔ قاضی عبدالودود نے رسالہ معاصر کے کئی شماروں میں آخری حصہ میں تذکرۂ مسرت افزا چھپوایا اس کے صفحات کے نمبر بھی الگ سے تھے۔ میں نے ان تمام شماروں میں سے ان اوراق کو نکال کر جلد بندھوالی۔ اس طرح میرے پاس مکمل تذکرۂ مسرت افزا ہے۔ آپ بھی ترانہ کی رباعیوں اور تخلیقی ادب کی رباعیوں کو یک جا رسالے کے آخر میں دیتے تو ان کو الگ سے کتاب کی طرح بندھوا لیا جاتا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ آپ انھیں علیحدہ کتاب کی طرح ہی چھاپ دیتے۔ وہی خرچہ آتا اور کتابی شکل میں مشمولات بہتر طریقے پر محفوظ ہو جاتے۔

ڈاکٹر نیر مسعود کا مضمون بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے اس سے پہلے اکادمی میں بھی انھوں نے یگانہ پر مفصل مضمون لکھا تھا۔

کالی داس گپتا رضا

اے-۳۰۴- جل درشن نیپنسی روڈ- بمبئی ۳۶

شاعر کا تازہ شمارہ ملا۔ سرورق پر لکھا ہوا ہے "اردو شاعری کی ایک منفرد آواز مرزا یاس یگانہ چنگیزی ..." آپ کے مرتبہ پرچے سے یہ بات قطعی ثابت ہے۔ آپ بطور مدیر بھی اس میں خوب نمایاں ہیں۔ ایسی خوش سلیقگی آج کل کم دیکھنے میں آتی ہے۔

یگانہ کی شاعری زیادہ تر روایتی ہے مگر روایتی شاعری کوئی کالا ناگ نہیں جسے چھوا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کا احترام بھی ہم پر لازم آتا ہے اور

پھر یگانہ کی اس شاعری کو تو بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا جو روایت کے ہوتے ہوئے بھی اپنا قد نمایاں کئے ہوتے ہے۔

عنوان چشتی ——— صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

شاعر کا نیا شمارہ (جلد ۵۶ شمارہ ۸-۹) موصول ہوا۔ آپ نے اس شمارہ میں یگانہ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رباعیوں کو یکجا شائع کر کے یقیناً ایک اہم علمی اور ادبی خدمت انجام دی ہے۔ آپ نے جو کچھ یگانہ اور ترانہ کے بارے میں تحریر کیا ہے، اس میں بعض باتیں اہم اور چونکا دینے والی ہیں۔ میری یہ رائے ہے (بلکہ اصرار ہے) کہ آپ آئندہ ہر ماہ جرعات کے علاوہ اپنی پسند کے موضوعات پر اپنی ایک نثری تحریر ضرور شاعر میں شائع کیجئے۔ اب کے تو آپ نے جرعات میں (خیال، لفظ اور لمحے) میں غضب ڈھایا ہے۔ خدا جانے یہ تحریر کس عالم میں لکھی ہے۔ یہ کیفیت تو معمولی ادیب کی نہیں بلکہ کسی صوفی کی ہو سکتی ہے۔ بہر حال میں آپ کی شاعری کا تو دلدادہ تھا ہی، اب آپ کی نثر کا مداح بھی ہوں۔ مگر اصرار یہی ہے کہ لکھتے رہئے۔ آپ کے پاس کہنے کی بہت سی باتیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ شمارہ یگانہ شناسی میں معاون ہوگا۔ اگر یگانہ کے معرکوں کے علاوہ ان رباعیوں پر کوئی جامع تنقیدی مقالہ ہوتا تو بہتر تھا۔ تاکہ رباعی کے آئینہ میں اصلی اور نقلی یا طاقت ور اور کمزور یگانہ الگ الگ ہو جاتے۔ آپ شاعر میں قدیم کتابیں ہی نہیں نئی کتابیں بھی شائع کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر نیر مسعود ——— ادبستان، دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

شاعر کا شمارہ ۸-۹ موصول ہوا۔ نہایت شکر گزار ہوں۔ آپ نے اسے یگانہ کے بارے میں ایک دستاویز کی حیثیت دیدی ہے۔ آفسیٹ پر آنے کے بعد "نئے شاعر" میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں۔ مبارکباد قبول کیجئے۔

سرورق کے دوسرے صفحے پر "بساط سخن" کے تحت یگانہ کی تصنیفوں کی فہرست بہت ضروری تھی۔ اس فہرست کے تحت آپ نے جو تین حاشیے لکھے ہیں، ان کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ حاشیہ [۱] "آیاتِ وجدانی... طبع سوم کا سنہ اشاعت۔ نیر مسعود نے ۱۹۴۵ء دیا ہے اور مشفق خواجہ نے ۱۹۴۶ء درج کیا ہے۔"

طبع سوم میرے سامنے ہے اور اس پر نہایت واضح طور پر سنہ ۱۹۴۵ء چھپا ہے۔

۲۔ حاشیہ [۲] شہرتِ کاذبہ کے بارے میں خاتمۂ کتاب کا حوالہ میں نے اس سلسلے میں دیا تھا کہ یہ کتاب ۱۹۲۰ء میں لکھی گئی تھی۔ آپ نے جو نسخہ دیکھا ہے اس کا سرورق موجود نہیں۔ ذخیرۂ ادیب کے نسخے میں سرورق موجود ہے جو علی گڑھ کے مطبع النور میں چھپا تھا (اصل کتاب اصح المطابع لکھنؤ میں چھپی) سرورق پر ۱۹۲۵ء درج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۲۲ء میں یہ کتاب پریس میں دی گئی لیکن ۱۹۲۵ء میں شائع ہو سکی۔

۳۔ حاشیہ [۳] "غالب شکن، سنہ اشاعت ۱۹۳۴ء کتاب کے سرِ ورق پر درج ہے... نیر مسعود نے... "یگانہ کے معرکے" میں ۱۹۳۵ء لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔"

۱۹۳۴ء غالب شکن کی طبع اوّل کا سال اشاعت ہے (آپ کی فہرست میں اس کا سال اشاعت ۱۹۲۵ء دے دیا گیا ہے۔ غالب شکن ترانہ کی اشاعت ستمبر ۱۹۳۳ء کے بعد اسی کی رباعیوں کے سلسلے میں یگانہ کا وہ خط ہے جو انھوں نے ادیب مرحوم کو ۲۵/دسمبر ۱۹۳۳ء کو لکھا تھا۔ مئی ۱۹۳۴ء تک یگانہ اور ادیب کے درمیان اس کی اشاعت کے بارے میں خط و کتابت ہو رہی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں اس کی اشاعت کا امکان نہیں ہے) اس طبع اول کے سرِورق کی نقل میں نے "اکادمی" میں اپنے مضمون مرزا یگانہ (بحوالۂ ادیب) میں دے دی ہے۔ غالب شکن کا دوسرا ایڈیشن جو "غالب شکن دو آتشہ" کے نام سے چھپا، وہ بھی میرے سامنے ہے اور اس پر سالِ اشاعت ۱۹۳۵ء درج ہے۔

آپ نے مجھے خط لکھ کر یگانہ کی ان تصنیفوں کے سالِ اشاعت دریافت کئے تھے لیکن اس زمانے میں یہ سب کتابیں ڈاکٹر انیس اشفاق مجھ سے لے گئے تھے (انتخاب یگانہ کے مقدمے کے سلسلے میں) آج یہ کتابیں میرے پاس واپس آئی ہیں۔ اس وجہ سے اس وقت میں آپکے سوالوں کے جواب نہیں دے سکا، اس طرح مندرجۂ بالا حواشی میں جو تسامحات رہ گئے ان کا ذمہ دار خود کو سمجھ کر شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔

پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر نعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھاکر دوار، بمبئی ۲ میں چھپوا کر دہلی سے شائع کیا۔

رفتار ــــــــ علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

○ **عروضی اور فنی مسائل**۔ پروفیسر عنوان چشتی کا ہنگامہ خیز تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ جس میں پرانے مسائل کی نئی تعبیر و تشریح کے ساتھ نکالے والے نتائج پیش کئے گئے ہیں۔ عروضیات اور شعریات کے میدان میں ہنگامہ خیز تحقیقی دستاویز جو شاعروں، ادیبوں، طالب علموں اور استادوں کے لئے یکساں قابلِ توجہ ہے۔ قیمت ساٹھ روپے۔ پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) راؤز ایونیو۔ نئی دہلی ۲۔

○ **پریم چند اور تصانیفِ پریم چند** (کچھ نئے تحقیقی گوشے) پریم چند پر کام کرنے والوں کے لئے ایک رہنما کتاب جس میں مانک ٹالہ نے بڑی دماغ سوزی اور عرق ریزی سے تمام فنی جزئیات کا محاکمہ و محاسبہ کیا ہے۔ آخر میں پریم چند کی کچھ غیر مطبوعہ تصانیف کی تفصیل بھی کتاب میں شامل ہے۔ ڈیمائی سائز خوبصورت گرد پوش، قیمت ۵۴ روپے۔ ملنے کا پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔

○ **اندیشہ** (سہ ماہی) نئے اقدار کا ادبی منظر نامہ، ہر شمارہ معیاری، ہر شمارہ بحث طلب، صفحات ۱۴۰، قیمت ۲۰ روپے، مدیر ارشد رضا، اعزازی مدیر قیصر جمال۔ قلم کار حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔ رابطہ: اردو لائبریری، حسین پور، بھاگل پور ۸۱۲۰۰۲ (بہار)

○ **ڈیڈ لائن** نوجوان افسانہ نگار محمد سلیم خان ہمراز کے جدید افسانوں کا پہلا مجموعہ۔ اعلیٰ کتابت و طباعت، ڈیمائی سائز۔ ۱۲۰ صفحات قیمت ۲۰ روپے۔ ناشر: کرن پبلی کیشنز، بے ۵/۲، فتح پور دلیج روڈ گارڈن ریچ، کلکتہ ۲۴

○ **بوند بوند لہو** نصرت ساویری کا اولین شعری مجموعہ۔ دیدہ زیب سرورق، عمدہ کتابت و طباعت۔ قیمت ۱۵ روپے۔ پتہ امام باڑا راویرا ۴۲۵۵۰۸۔

○ **اوراق**۔ (سالنامہ) اوراق (لاہور) کا سالنامہ اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵ء ضخامت ۴۶۲ صفحات۔ قیمت خاص نمبر ۳۵ روپے۔ مدیران وزیر آغا اور سجاد نقوی کے ترتیب دیے ہوئے ادبی دستاویز میں ۳۲ نظمیں، ۲ طویل نظمیں، رباعی، گیت، ہائیکو، ماہیا، دوہا۔ دس گراں قدر متنوع مضامین، ۶ انشائیے، ۴۸ شعراء کی معیاری غزلیں، ۱۶ افسانے۔ ترقی پسند ادب پر دو مضامین۔ گوشہ شہزاد احمد۔ سریندر پرکاش کے افسانے "بجوکا" کا تجزیاتی مطالعہ علی حیدر ملک کے ذریعہ۔ ۷ کتابوں پر طویل تبصرے۔ نئی کتابوں پر تبصرے، خطوط وغیرہ شامل ہیں۔ قابلِ مطالعہ۔ مواد و معیار اوراق کی روایت ہے۔ پتہ: دفتر اوراق، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان)

○ **نیا تعلیمی تجربہ** (حصہ اول) دینی اور عصری علوم کے امتزاج پر مبنی نظام تعلیم کی تشکیل کے عنوان پر ہدایت گڑھ ایجوکیشن کونسل (عالمی دانہ سفینۃ الہدایہ) کی جانب سے منعقدہ سیمینار ۲۸/دسمبر ۸۴ء میں پڑھے گئے ۱۱ مضامین کا فکر انگیز مجموعہ جسے عقیل الغروی نے ترتیب دیا ہے صفحات ۱۶۰۔ قیمت ۱۶ روپے۔ پتہ: ہدایت گڑھ، عدل ہاٹ، مرزا پور (یوپی)

○ **دوسری کرن** معروف افسانہ نگار دریندر پٹواری کی ۲۷ مختصر کہانیوں کا مجموعہ۔ "فرشتے خاموش ہیں"، اور "آخری دن" کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے منظر ناموں سے بنتی ہوئی سچائیوں کو ماخذ بنا کر کہانیوں کو تخلیقی روپ دینے کی سعی نے ان کہانیوں کو روشن کر دیا ہے ضخامت ۱۵۷ صفحات۔ قیمت ۳۵ روپے۔ پتہ: پریم گنج، حضوری باغ، تالاب تلو۔ جموں توی۔

○ **لفظوں کا آسمان** (اڑیا نظموں کا اردو روپ) اڑیا زبان کے صاحب طرز جدید شاعر سیتاکانت مہاپاترا کی اڑیا نظموں کا اردو ترجمہ ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے کیا ہے۔ ان نظموں کے اردو تراجم میں اصل نظموں کی پوری روح اس طرح سما گئی ہے کہ دونوں زبانوں میں تخلیقی امتیاز کرنا مشکل ہے۔ تعارف اور مشاہیر کی آراء ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے "کچھ اس ترجمے کے بارے میں" کے عنوان سے نہایت ہی وقیع معلومات اپنے قارئین کو دی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ ۱۱۲ صفحات کے اس خوب سیرت نظموں کے مجموعے کی قیمت ۲۰ روپے ہے۔ پتہ: نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی ۔ علامہ سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

بہ یادگار ۔ اعجاز صدیقی (مرحوم)

اشاعت کا ۵۶ واں سال ● علمی، ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

جلد ــ ۵۶ ◎ شمارہ ــ ۱۲

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ ۴۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ تاعمر خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

قیمت: ● ۴ روپے

فون ۰۱ ۳۵۴۹۰۳

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶،
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

کتابیں ہی کتابیں

نیشنل بک ٹرسٹ نے انگریزی اور ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری بڑی زبانوں میں اہم اور معلوماتی موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ مشترکہ ادب کی اشاعت بھی کی ہے۔ ٹرسٹ کی مطبوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ٹرسٹ کے اشاعتی پروگرام میں بچوں کے ادب کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یقیناً ہر قاری کے لئے ٹرسٹ کی مطبوعات میں اس کی پسند کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ اُردو کی مطبوعات میں سے چند درج ذیل ہیں۔ ٹرسٹ کی کتابیں ملک بھر میں اُردو کے تمام کتب فروشوں، پبلی کیشنز ڈویژن کے اسٹالوں اور این بی ٹی بک شاپس سے مل سکتی ہیں۔

کتاب	مصنف / مرتب	مترجم	قیمت
عوامی ترسیل	از: آر، کے، چیٹرجی	مترجم عرفان صدیقی	قیمت ۱۹—۲۵ روپے
آپ اور آپ کی غذا	از: کے، ٹی، اچیا	〃 من موہن تلخ	۱۴—۲۵ روپے
آدرش ہندو ہوٹل	از: بھبھوتی بھوشن بندیا دھیائے	〃 اشرف عابدی	۱۹—۲۵ روپے
درد کے رشتے	از: میرجی انا دائے	〃 بلراج ورما	۲۰—۰۰ روپے
عصری ملیالم کہانیاں	مرتب، ایم۔ مکندن	〃 عبدالحق	۱۸—۵۰ روپے
اُردو افسانے	مرتب: رضیہ سجاد ظہیر (نیا ایڈیشن)	〃	۱۱—۰۰ روپے
اُردو طباعت و اشاعت کے مسائل	مرتب: انور کمال حسینی	〃	۷—۰۰ روپے
آزادی کی چھاؤں میں	از: بیگم انیس قدوائی	〃	۱۳—۵۰ روپے
پریم چند کے مختصر افسانے	مرتب: رادھا کرشن (نیا ایڈیشن)	〃	۱۸—۵۰ روپے
امیر خسرو	از: غلام سمنانی	〃	۹—۷۵ روپے
ٹیپو سلطان	از: بی شیخ علی	مترجم: ظفر احمد نظامی 〃	۸—۵۰ روپے

بچوں کے لئے

کتاب	مصنف / مرتب	مترجم	قیمت
ہم ہندوستانی	از: مہرو جے واڈیا	مترجم: ایس، اے، رحمٰن	۲—۵۰ روپے
منیا نے پایا سونا	از: جگدیش جوشی	〃 〃	۲—۵۰ روپے
چھوٹی سی ایک لہر	از: ایس، چندراورکر	〃 〃	۲—۵۰ روپے
کتابوں کی انوکھی دنیا	از: سیموئل اسرائیل	مترجم: سید احسان الرحمٰن	۲—۵۰ روپے
دمدار کہانی	از: ایم، سی، گیبریل	〃 انیس مرزا	۲—۵۰ روپے
مہابھارت	از: کے، کمٹپ راؤ	〃 تعظیم احمد	۲—۵۰ روپے
جنگل میں تالاب	از: اوما آنند	〃 عابدہ بیگم	۲—۵۰ روپے
جانوروں کے ایک نگہبان کی مہمیں	از: ای، آر، سی، داویدار	〃 امر سنگھ	۲—۵۰ روپے
عقلمند اور چالاک	از: کلا تھیرانی	〃 صادقہ ذکی	۲—۵۰ روپے
کائناتی تحفہ	از: موہن سندراجن	〃 خالدہ ناہید	۲—۵۰ روپے
گلی محلے کے کھیل	از: ملک راج آنند	〃 اوما گپتا	۲—۵۰ روپے
بس کی سیر	از: دلی کن ن	〃 ایس، اے، رحمٰن	۲—۵۰ روپے
یہ دنیا پیاری پیاری	از: جینتی منوکرن	〃 اُردو تحریر: سعدیہ رحمٰن	۲—۵۰ روپے
دس کہانیاں	مرتب: سراج انور		۴—۰۰ روپے
بھارت کے بہادر بچے	از: سگرن سریواستوا	مترجم: سعیدالرحمٰن	۲—۵۰ روپے
عیدگاہ (نیا ایڈیشن)	از: پریم چند		۲—۵۰ روپے
گوتم بدھ	از: نیلا جارج	مترجم: سید ضمیر حسن	۲—۵۰ روپے

زیرِ طبع

کتاب	مصنف / مرتب	مترجم
منتخب قومی شاعری	مرتب: سردار جعفری	
پنجاب، ادب اور ثقافت	از: ایس، ایس، بیدی	مترجم: اسلم پرویز
آوارہ مسیحا	از: وشنو پربھاکر	〃 راشد نہسوانی
تاریکیاں	از: بھیشم ساہنی	〃 شہلا نقوی
سکھ دھرم اور سیکولرزم	از: کرتار سنگھ دگل	〃 زبیدہ صدیقی

فہرستِ کتب اور دیگر تاجرانہ معلومات کے لئے لکھیں

ڈائریکٹر، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا (شعبہ سیلز اینڈ مارکیٹنگ) اے ۵، گرین پارک، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

ترتیب

محفل اپنی

۱۹۸۵ء میں شاعر کا یہ آخری شمارہ نذر قارئین ہے۔ یہ سال ہمارے لئے جہاں بے شمار مسرتوں کا باعث ہوا کہ شاعر لیتھو سے آفسٹ پر شائع ہونے لگا اور مواد و معیار میں تنوع کے نت نئے رنگ سجائے گئے، وہیں ہمیں قدم قدم اپنے محدود وسائل سے بھی الجھنا پڑا ہے دسمبر ۱۹۸۵ء کا یہ شمارہ تجربات کا ایک اور خوب سیرت روپ لئے ہوئے ہے، جیسا کہ ہم نے وعدہ کیا تھا اور ہماری خواہش بھی یہی تھی کہ شاعر کو اردو کے ایڈیو ٹائپ ادبی رسائل کی فرسودہ نہج سے الگ کرتے ہوئے اسے زیادہ معیاری مگر دلچسپ، عصری اور تازہ کار بنایا جائے۔ لہٰذا آفسٹ کے افتتاحی شمارے سے اس آخری شمارے تک اپنی سی بھرپور سعی کرتے ہوئے ہم نے اپنے قارئین کو ۱۲ صفحات میں اتنا کچھ پڑھنے کو دیا ہے کہ دوسرے رسائل اپنی کسی بھی ضخامت میں اتنا اور ایسا مواد نہیں دے پاتے جو صرف اور صرف شاعر ہی کا حصہ ہے۔

شاعر کو آفسٹ پر شائع کرتے ہوئے ہمیں ہر سطح پر بڑھتے ہوئے اخراجات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اخراجات کا بڑھنا ناگزیر تھا لیکن اس میں دن بہ دن اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ دکھ کا پہلو تو یہ ہے کہ ہم نے پوری اردو دنیا سے ہر ممکنہ تعاون کی اپیل کی تھی۔ تمام لوگوں تک اپنی آواز پہنچائی تھی لیکن افسوس کہ اس کا ردِّ عمل قطعی مایوس کن رہا۔ شاعر کے وہی ہمدرد ہماری ہمت و حوصلہ بنے رہے جو ہمیشہ ہی آڑے وقتوں میں کام آتے رہے ہیں۔ جی تو چاہتا ہے کہ اردو والوں کی بے حسی کا احوال نامہ پیش کیا جائے کہ سوائے دہلی اردو اکاڈمی اور مہاراشٹر اردو اکاڈمی کے شاعر کو کہیں سے بھی کسی طرح کا مالی تعاون نہیں مل سکا ہے۔ اردو کے سب سے بڑے ادبی ماہنامے کا مقدر تو وہی ہے جو اردو زبان کا ہے۔ ہم مایوس تو نہیں، ہماری کوششیں بھی کم نہیں لیکن ہو یہ رہا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تمام تر سرگرمیاں ان لوگوں سے وابستہ ہو گئیں ہیں جنہیں کچھ معلوم ہی نہیں کہ اردو زبان کی بے لوث خدمت کرنیوالے کون لوگ ہیں؟ کن لوگوں نے اس زبان کے لئے اپنی قربانیاں دی ہیں؟ کون لوگ زبان و ادب کی تاریخ بنا رہے ہیں۔ لیکن ایسے ہی کم علم لوگ اردو کے فعال اداروں میں عزت مآب کہلاتے ہیں۔

شاعر کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ اسے خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد ہمیشہ ہی سے خاصی رہی ہے چاہے وہ ایجنٹوں سے خریدتے ہوں یا براہ راست ہم سے منگواتے ہوں، تاہم ہماری شکایت ان مستقل خریداروں سے زیادہ رہی ہے جو شاعر کو پسند تو کرتے ہیں اسے جاری رکھنے پر بھی مصر رہتے ہیں لیکن اپنے بقایا جات کی ادائیگی میں بے حد سست ہیں۔ شاعر جیسے غیر تجارتی ادبی ماہنامے کو اگر بر وقت زرِ سالانہ ارسال نہ کیا جائے تو دشواریوں میں اضافہ ہی ہوگا۔ ہماری خواہش تو یہ ہے کہ شاعر کے صفحات میں اضافہ ہو اسے ہر اعتبار سے خوب سیرت اور دیدہ زیب بنایا جائے۔ کچھ اور تجربے کئے جائیں کہ ہمارے پاس اپنے قارئین کو دینے کے لئے نہ تو تخلیقات کی کمی ہے اور نہ ہی متنوع تجربات کی۔ ہمارے خواب تو بہت مختلف اور منفرد ہیں۔ ان کو تعبیر دینے والے تو آپ سب ہیں کیا آپ ہمیں اپنا عملی تعاون نہیں دیں گے؟ شاعر کو تا عمر خرید لیجئے اپنے بقایا جات کی جلد از جلد تکمیل کیجئے۔ ۱۹۸۵ء میں شاعر کو جو رنگ و روپ ہم نے دیا ہے ہم ۱۹۸۶ء میں اسے مزید نکھارنا، سنوارنا چاہتے ہیں لیکن یقین کیجئے کہ آپ سبھوں کے عملی تعاون کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ آپ کا بھرپور تعاون شاعر کی زندگی ہے۔

ہم نے گزشتہ شماروں میں یہ گزارش بھی کی ہے کہ شاعر کے لئے نایاب تحریریں، تصویریں، خطوط وغیرہ ارسال کیجئے ہم آپ کے شکریے کے ساتھ انہیں شائع کریں گے اور بہ حفاظت آپ تک پہنچا دیں گے۔ ہم ایک بار پھر آپ سب سے خصوصاً ان حضرات سے جنکے پاس ایسے نوادرات موجود ہیں، درخواست کرتے ہیں کہ اپنے نوادرات شاعر کے لئے ارسال کیجئے تاکہ ہماری زبان و ادب کی تاریخ کو مستند بنانے والے یہ ماخذات شاعر کے صفحات پر محفوظ ہو جائیں۔ یقین کیجئے کہ شاعر اردو زبان و ادب کی ترسیل و تفہیم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ہمیں آپ کے گراں قدر مشوروں اور عملی تعاون کا انتظار رہے گا۔

غضب ہوا دل صبر آزما نے لوٹ لیا — فریب دیکے مجھے رہنما نے لوٹ لیا

شاعر	مصرع اول	مصرع ثانی
	دعویٰ ثبوت کا محتاج ہے۔ ۱۲۔ آرزو	
آرزو	متاع ہوش کو صبر آزما نے لوٹ لیا	بتا کے راہ مجھے رہ نما نے لوٹ لیا
آزاد	متاع ہوش دل مبتلا نے لوٹ لیا	یہ قافلہ خضرِ رہ نما نے لوٹ لیا
اطہر	شکیب و صبر سب اُن کی ادا نے لوٹ لیا	رہ وفا میں مجھے رہ نما نے لوٹ لیا
افضل	یہ کیا کیا دل صبر آزما نے لوٹ لیا	غریب پا کے مجھے رہ نما نے لوٹ لیا
باقی	صبر آزما سے اس مقام پر کیا مطلب۔ باقی	
٭	لٹے ہم۔ آہ دل مبتلا نے لوٹ لیا	دکھا کے آس کی گلی رہ نما نے لوٹ لیا
بیخود موہانی	ارے غضب دل کا فرادا نے لوٹ لیا	
ریاض	وفا نما تری طرزِ جفا نے لوٹ لیا	
شاد		دہائی عشق کی اس رہ نما نے لوٹ لیا
	صبر آزما دل کی صفت نہیں ہو سکتی۔ صبر کی آزمایش کرنا غافل یا جفا کا کام ہے۔ شہرت	
شہرت	متاع صبر کو عشق ادا نے لوٹ لیا	
	رہنما اور صبر آزما میں ایطا ہے۔ شفق	
شفق		فریب دیکے مجھے بیوفا نے لوٹ لیا
شوق	یہ مصرع مطلب سے خاموش ہے کیا لوٹ لیا۔ اگر مصرعۂ ثانی کا خیال ہو کہ مجھے لوٹ لیا تو سوا	
؍؍	اس کے کہ مجھے لوٹا لوٹنے کی کوئی شے نہیں ظاہر ہے۔ کیا فریب؟ اس کا ذکر نہیں ہے۔ تو	
	فریب دینے کا ادعا صحیح نہیں۔ شوق	
شوق	قرار سب دل درد آشنا نے لوٹ لیا	ستم کیا کہ مجھے رہنما نے لوٹ لیا
٭	سکون سب دل درد آشنا نے لوٹ لیا	
صفی	غضب ہوا دل درد آشنا نے لوٹ لیا	
فانی	غضب ہوا دل زود آشنا نے لوٹ لیا	

اصلاحِ سخن مؤلفہ محمد عبدالعلی شوق سندیلوی؛ مطبع النوید پریس علی گڑھ ۱۹۲۶ء ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مؤلف نے اپنی ۱۷ غزلوں پر ۳۵ اساتذہ سے ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۲ء کے درمیان اصلاح لی تھی۔ ہر غزل پر مختلف اساتذہ نے جو اصلاحیں دیں انہیں کتابی شکل دے کر شائع کیا گیا۔ نیاز فتح پوری، عبدالحلیم شرر اور سلطان حیدر جوش کی آرا کتاب کے شروع میں دی گئی ہیں۔ کتاب میں پہلے ہر صفحہ پر ایک غزل پھر ہر صفحے پر ایک شعر جلی قلم سے پھر اصلاحیں دی گئی ہیں۔ حاشیے پر اصلاح کے سامنے اساتذہ کے تخلص دیئے گئے ہیں جس شعر پر کسی استاد نے کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ بھی اصلاح کے ساتھ دیدیا گیا ہے۔ جن حضرات نے داد کے طور پر اشعار پر "ص" بنایا ہے ان کے صرف تخلص لکھ دیئے گئے ہیں۔ ۱۶ غزلوں پر تمام اصلاحوں کے اختتام پر ۲۵ شعرا کے مختصر و طویل ۴۴ خطوط شامل کیے گئے ہیں جو غزلوں کی اصلاحات سے تعلق رکھتے ہیں کتاب کے آخر میں امیر احمد علوی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے تبصرے ان اصلاحوں پر دیئے گئے ہیں۔

[افتخار]

چہرہ چہرہ یادیں

ایک یادگار تصویر دائیں سے بائیں۔ اعجاز صدیقی مرحوم، سردار جعفری، غلام ربانی تاباں

کرشن چندر — شہاب جعفری

انجمن ترقی پسند مصنفین کی دعوت پر انجمن کے سالانہ جلسے منعقدہ فروری ۱۹۵۲ء میں کرشن چندر پہلی مرتبہ علی گڈھ گئے تھے یہ تصویر اسی موقع کی یادگار ہے۔ اس جلسے میں سردار جعفری، مجاز، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالعلیم، معین احسن جذبی، اسلوب احمد انصاری، اختر انصاری، غلام ربانی تاباں، ش پنڈت اور خلیل الرحمن اعظمی نے شرکت کی۔ [بہ شکریہ شہاب جعفری دہلی]

قطعہ معذرت

والعذر عند کرام الناس مقبول

مانگتے ہیں آپ حالاتِ حیات + بات کرنے کی یہاں فرصت نہیں
عمر اٹھتّر سال کے ہوگی قریب + اور تفصیلات کی حاجت نہیں
شاعری سے خاص اپنی طبع زاد + غیر کی اسمیں ذرا شرکت نہیں
مشغلہ بھی ہے کچھ ایسا ناگزیر + چھوڑ بیٹھوں اسکی بھی طاقت نہیں
تھے جو حاضر باش وہ بھی چھوڑ گئے + مجھکو فرصت کے سوا مہلت نہیں
کون لکھے کسطرح ہو انتخاب + ظاہرا اسکی کوئی صورت نہیں
بولتی تصویر شاعر ہے کلام + نطق کی تصویر کو طاقت نہیں
حضرت سیماب سے شرمندگی + جانے والی دل سے یہ حسرت نہیں

سچ ہی سچ ہے معذرت آزاد کی
جھوٹ کہنے کی مجھے عادت نہیں

بخطِ خاص
۲۴ر نومبر ۱۹۳۵ء

یہ منظوم خط حکیم آزاد انصاری سہارنپوری مرحوم [پ ۱۸۷۰ء ـ م ۱۹۴۱ء شاگرد خواجہ الطاف حسین حالی] نے علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کے ایک خط کے جواب میں تحریر کیا تھا۔ سیماب اکبر آبادی اپنے معاصر شعراء کا ایک مکمل یکجائی مصور تذکرہ ترتیب دینا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ شاعر کا معاصر نمبر شائع کرنے کا تھا لیکن بروقت یہ تذکرے موصول نہ ہو سکے اور معاصر نمبر شائع نہ ہو سکا تاہم شاعر جنوری ۱۹۳۶ء کے شمارے سے "متغزلینِ اردو" کے عنوان سے ہر شمارے میں یہ تذکرے شائع کئے گئے۔ [افتخار]

وطہ خوری کے دوران میں ماہی گیر نے زوردار دھماکے کی آواز سُنی۔

کچھ ہی دیر قبل اس نے ڈھیر ساری مچھلیاں پکڑی تھیں۔ اس کے دوسرے ساتھی روانہ ہو چکے تھے۔ ساحل پر جال ایک طرف رکھنے کے بعد
ں کر غوطہ خوری کی مشق اس نے شروع کر دی تھی۔ بچپن سے ہی اسے سانس روکنے اور غوطہ خوری کی عادت تھی۔ کیا جانے کب اس
سے ہواؤں کا خاتمہ ہو جائے اور بغیر ہوا کے جینے کی جدوجہد کرنی پڑے۔ اس طرح غواصی کے درمیان پرانیام کی مختلف منزلوں سے گزرتے
ے اپنے پھیپھڑے پر اچھا خاصا کنٹرول ہو چکا تھا۔

زوردار آواز سُنتے ہی اس نے اوپر کی طرف آنا شروع کیا۔ اچانک سارے سمندر کا پانی گدلا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا
کا پانی گدلا نہیں ہوا تھا بلکہ کثیف اور سیاہ دھوئیں کی چادر نے فضا کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ غوطہ خوری کی معرکہ آرائیوں کا سارا نشہ
چکا تھا۔ ایک پراسرار خوف اور ہیبت ناک سنّاٹے نے اس کے پورے وجود کو گرفت میں لے لیا۔

معاً اسے یاد آیا کہ کچھ دنوں سے اس خطّے پر مختلف لڑاکو طیاروں کی پرواز میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بوٹوں کی چاپ بڑھ گئی تھی۔ ہمہ وقت کوئی
یارہ اس خطّے کے فضائی حدود پر چکّر کاٹتا رہتا۔ شروع میں لوگوں کو بے حد کوفت ہوتی۔ شاہراہ کی ٹریفک کے شور میں طیاروں کے شور
نے ان کا سکون غارت کر دیا تھا۔ جلوس، کانفرنس، سمینار اور مظاہروں کے کئی دور چلے لیکن جیسے جیسے احتجاجی اقدامات میں اضافہ ہوتا
روں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے ان تبدیلیوں کو معمول کی سطح پر قبول کر لیا۔

سمندر کی سطح پر برآمد ہوتے ہی اس نے سیاہ دھواں دیکھتے ہوئے خطرے کا احساس کیا اور اپنی سانسوں کو جوں کا توں روکے رکھا۔
ری کے لئے اسے زیادہ تگ و دو کرنی پڑی تھی۔ گھر سے بغیر کچھ کھائے روانہ ہوتے وقت بیوی نے سویرے لوٹ آنے کی ہدایت کی تھی۔
"سُنو..... ذرا سویرے آجانا..... جلدی کام ختم کر لینا..... تمہارے ساتھ کھانا کھائے ہوئے بہت دن ہو گئے..... !"

ابھی آیا منّی... ابھی آیا... وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہوا جال کی طرف لپکا۔ لیکن اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔
ہد غصہ آیا۔ بھلا دن میں بھی کبھی اس قدر تاریکی ہوتی ہے۔ وہ ایک کنارے بیٹھ گیا اور فضا کے صاف ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ دھواں دھیرے
چھٹنے لگا۔ اس نے جال ہاتھ میں لیا۔ یہ دیکھ کر اسے بے حد حیرت ہوئی کہ تمام مچھلیاں مردہ تھیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اتنی جلدی تمام مچھلیاں
۔ اس نے مچھلیوں کے ڈھیر کو ہاتھوں سے الٹنا شروع کیا۔ کم از کم رنگین مچھلی زندہ ہو۔ تاکہ اسے اپنے بیٹے کی نگاہوں میں شرمندہ نہ ہونا پڑے
۔ ننھا بیٹا ایک مدّت سے زندہ رنگین مچھلی کے لئے ضد کر رہا تھا۔ لیکن جس طرح کی رنگین مچھلی اسے پسند تھی وہ خال خال ہی ملتی تھی۔ آج گھر سے
، اس کا موڈ اچھا تھا۔ کافی دیر تک ان مچھلیوں کے لئے وہ جال ڈالتا رہا تھا۔ اور آخر کو رنگین مچھلیوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا
ل لپیٹ کر اس نے پانی کے نزدیک ہی رکھا تھا کہ رنگین مچھلیاں زندہ رہیں لیکن آج تو چند لمحوں کی غوطہ خوری کے درمیان ہی تمام
ہی جان گنوا بیٹھی تھیں۔ اب وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو کیا منہ دکھائے گا۔ اسے بیحد قلق ہوا۔ ساری محنت اکارت گئی۔ اس نے اپنے پھیپھڑوں
رفت اور بھی مضبوط کر لی۔

بازار سے گزرتے ہوئے اس نے عجیب منظر دیکھا۔ جس بازار میں بڑے بڑے دھماکے بھی شور میں گم ہو جاتے! آج وہاں سناٹا اور مکمل سکوت تھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ پن گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ خود اس کے قدموں کی آواز عام دنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ نمایاں تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کے پاؤں کے ساتھ ایک پوری بھیڑ کے پاؤں گامزن ہیں۔ فضا کا گدلا پن کم ہونے لگا تھا۔ اچانک سے ٹھوکر لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے پاؤں کسی لاش میں الجھے ہوتے ہیں۔ اس نے نظر دوڑائی۔ یہاں سے وہاں تک پوری سڑک پر جا بجا مختلف لاشیں تھیں۔ ساتھ ہی سائیکل، موٹر، رکشا اور بس بھی۔ اس نے بس کے اندر جھانک کر دیکھا۔ ہر سیٹ مسافروں سے بھری تھی لیکن سب کے سب بے حس و حرکت۔ آگے ڈرائیور کا ہاتھ ہینڈل پر ٹکا ہوا تھا۔ ہاتھوں کی تمام نسیں ابھر آئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈرائیور نے جان نکلنے سے پہلے پوری قوت سے بس کو قابو میں کرنا چاہا ہو۔

بس ایک دیوار سے ٹکرا کر رک گئی تھی۔ آگے کا حصہ اونچائی پر چڑھ گیا تھا۔ تین پہیے زمین پر ٹکے ہوتے تھے۔ ایک پہیا زمین سے بے تعلق تھا اور ابھی بھی پوری رفتار سے گھوم رہا تھا۔ ایک موٹر کے اندر میاں بیوی اغل بغل میں بیٹھے تھے۔ موٹر کے گیٹ کھلے ہوتے تھے۔ موٹر بند کرنے اور اسٹارٹ کرنے سے قبل ہی وہ بلا نازل ہو چکی تھی جس نے ان دونوں کو اپنی جگہ منجمد کر دیا تھا۔ عورت کی انگلیوں میں پرس ابھی بھی جھول رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک، گالوں کی کریم، آنکھوں کے کاجل اور زلفوں کی آرائش، سب کچھ اپنی اپنی جگہ پوری آب و تاب کے ساتھ قائم تھا۔ شوہر کی پیٹھ سیٹ سے لگی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ عینک کی کمانی کی درستگی میں لگا تھا اور دوسرا ہاتھ دروازے پر۔ آنکھ بھی جھپکی جھپکی سی تھی جیسے عینک کو آنکھوں پر جاتے وقت ہوا کرتی ہے۔

ماہی گیر بوکھلا گیا۔ فوراً ہی اسے اپنی بیوی بچوں کا خیال آیا۔ آج بیوی نے سویرے لوٹ آنے کے لئے کہا تھا۔ وہ بغیر کچھ کھائے پئے اپنے کام پر روانہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی بھوکی ہو گی۔ بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ بیٹی اور بیٹے۔ سب کے سب اس کی راہ تک رہے ہوں گے۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس کی بیٹی نے بھی سموسوں کی فرمائش اور تاکید کی تھی۔ اس نے دونوں جانب نگاہ دوڑائی ایک حلوائی کی دوکان کے آگے وہ رک گیا۔

حلوائی کی دوکان کا اس نے غور سے جائزہ لیا۔ چولھا سلگ رہا تھا۔ اس پر کڑاہا چڑھا ہوا تھا۔ تیل کھول رہا تھا۔ اور اسمیں گرما گرم پوریاں ناچ رہی تھیں۔ چھنوٹے پر حلوائی کا ہاتھ ٹکا ہوا تھا۔ حلوائی کے سر پر چھت سے لٹکا ہوا پنکھا پوری تیزی سے گھوم رہا تھا۔ دیوار پر جا بجا مختلف ہرے بھرے مناظر کی تصویریں لگی ہوئی تھیں ـــــــ چند کرسی ٹیبل قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو ٹیبل پر ایک ایک آدمی بیٹھا تھا۔ ان کے سر ٹیبل پر ٹکے ہوئے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ ٹیبل پر اور دوسرا نیچے لٹکا ہوا جھول رہا تھا۔ ٹیبل پر پلیٹ میں کچھ مٹھائیاں سجی ہوئی تھیں۔ ایک آدمی اوندھے منہ اس طرح ٹیبل پر ٹکا ہوا تھا کہ اس کا پورا چہرہ پلیٹ کے اندر تھا۔ مٹھائیوں نے اس کے چہرے کو چاروں طرف سے ڈھک لیا تھا۔

ماہی گیر نے احتیاطی کارروائی کے طور پر حلوائی کی دوکان کے سامنے ہی رکھے ہوتے شوکیس کو تھپتھپایا۔ حلوائی پر اس کی تھپتھپاہٹ نما دستک کا کوئی رد عمل نہ ہوا۔ اس نے اور زور سے تھپتھپایا۔ حلوائی نے ذرا بھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ بولنے سے احتراز کر رہا تھا کہ اس کے لئے اسے اپنی رکی ہوئی سانس توڑنی پڑتی اور فضا کے زہر کو پھیپھڑے میں سرایت کرنے کا موقع ملتا۔ وہ دوکان پر چڑھ آیا۔ حلوائی کے قریب آکر اس نے اسے چھوا۔ چشم زدن میں حلوائی کسی بھر بھرائی ہوئی عمارت کی طرح نیچے آ رہا۔ حلوائی فرش پر ڈھیر ہو چکا تھا اور پورا کھولتا ہوا کڑاہا اس کی طرف الٹ چکا تھا۔ ماہی گیر جھٹکے سے اچھلا اور لپکتا ہوا دوکان سے نیچے آگیا۔

اب اسے اپنے گھر پہنچنے کی جلدی ہو گئی۔ ان تمام اموات کا راز اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جانے کیا بات تھی کہ دھماکے کی آواز سننے کے بعد سے اب تک اس کی کسی ذی روح پر نظر نہیں پڑی تھی۔ اس نے بغل کے ایک گھنے درخت پر نظر دوڑائی شاید کسی پرندے کی چہچہاہٹ سنائی دے اور مردہ گھاٹ بنے ہوتے اس خطے میں اسے زندگی کی رمق دکھائی دے۔ لیکن اسے کوئی پرندہ نظر نہیں آیا۔ ایک جگہ اسے کوؤں کا غول نظر آیا لیکن سب کے سب بے جان۔

اس نے اغل بغل کی دوکانوں اور مکانوں پر نگاہ دوڑائی۔ تمام دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ بیشتر مکانوں کے دروازے بھی کھلے
تھے۔ تمام عمارتیں اپنی اپنی جگہ پوری چمک دمک کے ساتھ قائم تھیں۔ لیکن کسی دوکان میں کوئی آہٹ، کوئی سرسراہٹ نہیں تھی۔
گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

کولیوں کی بستی شروع ہو چکی تھی۔ اس تنگ گلی میں بھی زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ گلی کے موڑ پر رات میں چور دُ
ے میں دم کرنے والے کتے کی لاش نے اس کا استقبال کیا۔ اور سر سے پاؤں تک وہ سہم گیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب
ولی کے دروازے پر پہنچ کر بھی دروازے میں قدم رکھنے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھیپھڑوں میں تناؤ پیدا ہونا شروع
ا تھا اور اس کی سانسوں کو روکے رکھنے کی معینہ مدت قریب آرہی تھی۔ اس نے جی کڑا کر کے دروازے میں قدم رکھ دیا۔
ی اس کھولی میں جہاں وہ ہر روز بچوں کے شور اور بیوی کی بچوں کو ڈانٹ پلاتی ہوئی آواز سنتا تھا، آج مرگھٹ کی سی
شی تھی۔

آج اس کے میلے کچیلے بچے خاموش تھے۔ دالان میں لڑھکے پڑے تھے۔ ان کی بغل میں کانچ کی گولیاں بکھری پڑی تھیں۔
طرف ٹوٹی پھوٹی رکابی میں کھانا رکھا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا، بیٹی کے منہ میں نوالہ بھرا ہوا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ
چبا رہی ہو۔ بیٹے کی مٹھی میں نوالہ پھنسا ہوا تھا اور اوندھی ہوئی حالت میں بھی اس کی مٹھیوں کا رخ اس کے منہ کی جانب تھا۔
ی بجھتی ہوئی آنکھوں نے بیوی کو ڈھونڈا۔ وہ بالکل ایک کونے میں چولھے کے پاس بیٹھی کسی اور دنیا میں گم تھی۔ چولھا جل رہا تھا
اپر چڑھی ہانڈی میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اسے لگا کہ بیوی کہہ رہی ہو :

اب آتے ہو..... جب ہم سب غوطہ لگا چکے ہیں.....

ماہی گیر بوکھلا گیا۔ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک چھوٹے سے غوطے کے دوران میں یہ کیسا تغیّر
نما ہو گیا۔ اس بستی میں کبوتروں والا ایک بابا رہتا تھا، جو اپنی زندگی کبوتروں کی رفاقت میں گزار رہا تھا۔ ان کے علاوہ
کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مشکلات اور افتاد میں لوگ اسی سے ہدایات طلب کرتے تھے۔

ماہی گیر نے محسوس کیا کہ اس کی رکی ہوئی سانسوں کا وقفہ پورا ہونے والا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ سانسیں لے بابا سے
سے ان حالات کے اسباب کا پتا چلانا چاہتا تھا۔ ماہی گیر شدت سے یہ سوچنے لگا تھا کہ وہ جب تک سانسیں نہیں لے رہا ہے
تک زندہ ہے ـــــ سانس لیتے ہی اس کا شمار بھی مُردوں میں ہو جائے گا۔

تیزی سے وہ بابا کے مکان میں داخل ہو گیا۔ بابا بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ان کی دونوں آنکھوں اور لمبی داڑھی کے
یان آنسوؤں کی لکیریں اب بھی گیلی تھیں۔ ان کے تمام کبوتر ان کے سینے پر سر رکھے ابدی نیند میں گم تھے۔ کابک اور دیگر
ب، اپنی جگہ ثابت و سالم تھیں۔

ماہی گیر کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے چیخے اور دہاڑیں مار کر رو دے۔ لیکن ان افعال کے لئے اسے سانسیں لینے کی ضرورت
ی۔ ہر طرف سنّاٹوں اور مردوں کو دیکھ کر اسے سکتہ سا ہوتا جا رہا تھا۔ آگے اسے کیا کرنا چاہئے، یہ بات اس کے ماؤف
تے ذہن میں آندھی کی طرح منڈلا رہی تھی۔ ناگاہ اسے محسوس ہوا کہ اب وہ مزید سانس نہیں روک سکے گا۔ لیکن سانس
کا مطلب تھا موت کے سمندر میں غوطہ خوری۔

پھیپھڑے بے قابو ہو رہے تھے۔ اسے لگا کہ تمام مردے اٹھیں گے اور اس کا گلا گھونٹ کر اسے بھی اپنی صف میں شامل کر لیں گے۔
کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سمندر کی طرف قدم بڑھایا۔ اس کے مسامات میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ پھیپھڑے
کی انتہا پر پہنچ چکے تھے۔ سارا خون چہرے پر سمٹ آیا تھا ـــــ اس نے ایک چیخ کے ساتھ زوردار سانس لی اور اس تصویر میں
ل ہو گیا جس کا ایک پاؤں زمین پر تھا اور دوسرا بے حد لمبا ہو کر سمندر تک پہنچ گیا تھا۔ ◆◆
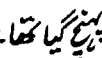
علی امام نقوی

معرفت مکتبہ جامعہ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۔۳

باؤجی
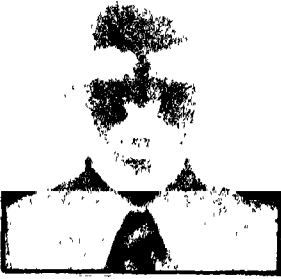
"تم جاؤ۔ اب تو باؤجی کی طبیعت بھی سنبھل گئی ہے۔ پھر ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں"۔ اسے دیور کی رخصت یاد آئی۔ پھوپی جی کی دہلی روانگی یاد آئی۔ اسے کاکا کا جانا یاد آیا۔ یہ سب ابھی تو گئے ہیں۔ دن ہی کتنے ہوتے ؟

بھائی اور بہن سب سے پہلے آتے تھے۔ دونوں نے ایک ایک نظر جوان بیوہ بہو پہ ڈالی تھی۔ اور فوراً بائیں طرف راہداری میں مڑ گئے چھوٹی سی راہداری کے اختتام پر، کمرے میں سنگل بیڈ کے اوپر ان کا بڑا بھائی بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ بس سانسوں کے زیر و بم سے زندگی ہویدا تھی۔

' باؤجی کو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ..... بس آپ سب جائیں ....

دونوں نے بس ایک پل توقف کیا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور اس کے بعد ساتھ ہی کمرے میں داخل ہو گئے۔ بہن نے سرہانے پہنچ کر بھائی کا سر اٹھایا۔ اپنی ران پہ رکھا۔ اور بھائی کے گال پہ اپنا گال رکھتے ہوئے زار زار رونے لگی۔ چھوٹے بھائی نے پائینتی کی پٹی سنبھالی اور بھائی کے تلوے سہلانے لگا۔ کافی دیر بعد تلوے سہلاتے ہوئے اسے جوان بیوہ بہو اور چھوٹے بچوں کا خیال آیا جنھیں وہ ہال میں چھوڑ آیا تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ تینوں بچے اپنی ماں کے ساتھ دروازے پہ کھڑے تھے۔

' وہاں۔ کیوں کھڑی ہو۔ آؤ۔ اندر آؤ

بھائی کی آواز سن کر بہن نے ہچکیوں پہ قابو پاتے ہوئے سر اٹھایا۔ دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر بانہیں پھیلا دیں۔ بہو دوڑ کر پھوپھیا ساس سے لپٹ گئی۔ اور بچے چھوٹے دادا کے چرنوں میں جا بیٹھے۔ ان کے کانوں سے اپنی ممی اور بڑی پھوپھی کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لیکن ان کے دل، چھوٹے دادا کے آجانے سے مطمئن ہو چلے تھے۔ ورنہ ایک روز قبل —— جب دادا اسپتال سے ڈسچارج کئے گئے تھے تو سب ہی گھبرا گئے تھے۔

ببلی، ببلو، پپی اور ان کی ماں۔

بچوں کی ماں نے کتنی جگہ فون لگائے تھے۔ جان پہچان والوں کو مطلع کیا۔ ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں۔ بس وہ سکتہ کے عالم میں ہیں۔ میں انھیں آج ہی گھر لائی ہوں۔ آپ آئیں۔ میں اکیلی ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ہوگا۔ کیسے ہوگا ؟

بہت ہی نازک صورت حال تھی۔ ابھی تو وہ جی بھر کر اپنے پتی کو بھی نہ رو پائی تھی کہ ڈاکٹروں نے صاف جواب دے دیا۔ دیور ملک سے باہر۔ انجان دیس میں۔ رشتہ دار سب دور۔ کوئی بھی تو پاس نہ تھا۔ نہ اس کے پتی کے دوست نہ ہی باؤجی کے۔

کس دنیا میں جی رہے ہیں ہم ؟ اندھیروں اور اجالوں کی دنیا میں۔ سب اجالوں کے ساتھی ہیں۔ اندھیری انڈسٹری۔ کالے فیتے۔ کالی زندگی۔ کالا روپیہ۔ اور اس سے حاصل ہونے والا اجالا۔ جب تک روشنی ہے۔ سب ساتھ اور اب ......

مگر باؤجی کی ایک اور دنیا بھی تو تھی۔ اور اس دنیا کا ایک باسی۔ بس ایک باسی باؤجی کے ساتھ ہے۔ یا پھر گھر کا ملازم۔

تم روتی رہوگی تو بچّوں پہ برا اثر پڑے گا۔ دہلی فون کرو۔ ان کے بھائی کو، بہن کو۔ بیٹے کو ٹرنک کال کرو۔ مجھے امید ہے وہ ان کی زندگی میں
بن گے۔

اسی دوست کے کہنے پر۔ بیوہ بہو نے سب سے پہلے دہلی فون کیا۔ پھر گھنٹہ بھر بعد وہ دیور سے کہہ رہی تھی۔
ہاں بھیا۔ فوراً چل پڑو ...۔ شاید جیوت پاؤ گے .... چرن چھونے کو مل جائیں۔
کوئی گھنٹہ بھر بعد دوبارہ بیل بجی۔ ملازم نے دروازہ کھولا۔ باؤجی کا چھوٹا بیٹا اٹیچی لئے کھڑا تھا۔ ملازم نے چھوٹے مالک کو لپٹا لیا
تے ہوئے بولا۔
تو زندگی میں آگیا۔

دوسرے ہی پل ایک ہلکا سا اطمینان بیٹے کے چہرے پہ نظر آیا۔ بچّوں نے کاکا کو دیکھا دوڑ کر کاکا سے لپٹ گئے۔ وہ ہنس بھی رہے تھے۔
ہے تھے۔ بچّوں کی آواز پر کچن سے ان کی ماں نکلی۔ دیور کو دیکھتے ہی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ پھر زار وقطار رونے لگی۔ سب کو
اسی تسلیاں تھوڑے سے دلاسے دینے کے بعد وہ باؤجی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ باؤجی کے کمرے کا ماحول بڑا ہی روح فرسا تھا۔
سرہانے بیٹھی تھیں باؤجی کا سر زانو پہ لئے۔ کاکا پائنتی اور باؤجی کے دوست فرش پر بیٹھے تھے۔ اپنے دوست کا داہنا ہاتھ دونوں
میں لئے۔ اس نے آگے بڑھ کر کاکا کے چرن چھونے پھر پھوپھی جی کے۔ باؤجی کے دوست کو پرنام کیا۔ پھر باؤجی کو دیکھنے لگا۔
ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ سانسیں معمول کے مطابق چل رہی تھیں۔ لیکن باؤجی کہاں تھے ؟

کھانے کی میز پر پھوپھی جی کے علاوہ سب ہی تھے۔ اور سب کے سب۔ انتہائی خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔
ڈاکٹروں نے کیا کہا ——— کاکا کے پوچھنے پر دیور کی نظریں بھی بھابھی کی طرف اٹھ گئیں۔
کوئی بیس روز اسپتال رہے۔ اسی عالم میں۔ جس میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ کل انھوں نے بھی ڈسچارج کر دیا کہ زیادہ سے زیادہ....
اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ ماں کو روتے دیکھ کر بچّے بھی سسکنے لگے۔
چار۔ چار روز ——— ملازم نے بہو کی بات پوری کی اور خود بھی انگوچھے سے آنکھیں پونچھنے لگا۔ کاکا نے سب کو غور سے دیکھا۔
جوان بہو رو رہی تھی۔ بچّے رو رہے تھے اور بھتیجہ گم صم بیٹھا تھا۔
گرو.... کرپا کریں گے..... ہمت سے کام لو تم سب ..... ہونی ... ہونی تو ہو کے رہے گی۔
کاکا۔
جوان جہان بیٹا ضبط نہ کر سکا۔ انھوں نے کرسی چھوڑی۔ بھتیجے کو گلے سے لگا کر ڈھارس بندھائی اور بولے۔
دعا کر بیٹے..... پراجی ... ہوش میں آئیں۔ بس۔ ایک بار... دیکھیں۔ سب ہی ان کے پاس ہیں۔
پھر انھوں نے دیکھا۔ سب ہی کے ہاتھ رکے ہوئے تھے۔ انھوں نے ملازم کو اشارہ کیا۔ ادھر اس نے سب کے سامنے رکھے ہوئے
میں پانی بھرا۔ ادھر انہوں نے ایک فیصلہ کیا۔ بڑے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں انہوں نے کہنا شروع کیا۔
میں بھول ہی نہیں سکتا اس گھڑی کو۔ جب پاپا جی کا دیہانت ہوا تھا۔ ہم سب چھوٹے تھے۔ بہت ہی چھوٹے۔ ماں تھیں۔ سدا کی بیمار۔ میں
تھا اور تمہاری پھوپھی جی۔ بلو سے بھی چھوٹی تھیں۔ باؤجی... باؤجی کی نئی نئی نوکری لگی تھی۔ ڈاکخانے میں۔ روز ڈیوٹی پر جانے سے
ہی مجھے۔ تمہاری پھوپھی جی کو اپنے ہاتھوں سے نہلاتے۔ کپڑے بدلتے۔ ہمارے لئے ماں کے ساتھ ناشتہ بناتے۔ پھر ہمیں اسکول چھوڑنے کے
خانے جایا کرتے تھے۔ اور۔ اور...
اور اس کے بعد ان کی آواز بھی بھرا گئی۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اپنا پانی کا گلاس اٹھایا۔ ہونٹوں سے لگا لیا۔ سب کے کہنے پر باؤجی
نے بھی دو نوالے کھائے۔ پھر سب ہی باؤجی کے پاس پہنچ گئے۔

دوسرے روز کاکا اور دادا کے کہنے پر بیوہ بہو نے بچوں کو اسکول بھیجا تھا۔ گھر پر دہی جان لیوا خاموشی چھائی تھی۔ سب ہی ہونی کے منتظر تھے
بس دو روز..... ڈاکٹروں کے علم و یقین کے مطابق انھیں اور زندہ رہنا تھا۔ بہو کچن میں ملازم کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ اسے وہ باتیں یاد آ رہی تھیں جو اس کے سسر نے اس کے پتی یعنی اپنے بیٹے سے کی تھیں۔ وہ سب ایک تقریب سے لوٹ رہے تھے۔ اس کا پتی کار ڈرائیو کر رہا تھا ہمیشہ کی طرح تیز اور باؤجی نے اسے ڈانٹ کر گاڑی رکوائی تھی۔ پھر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ کار چلانے لگے تھے۔

"تم اتنی تیز موٹر چلاتے ہو۔ کبھی بھی حادثہ ہو سکتا ہے۔
"وہ تو سلو ڈرائیونگ میں بھی ہو سکتا ہے باؤجی۔
"بحث کرنا تمہاری عادت ہے۔
"آپ بھی تو.....

شوہر کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ کیونکہ اس کے سسر نے کار کو بریک لگائے تھے۔ ان سب نے دیکھا ایک بکری راستہ پار کر رہی تھی اور اسے بچانے کے لئے باؤجی نے کار کی رفتار کم کر دی تھی۔

"اگر تم اسٹیرنگ پر ہوتے تو یہ بکری مر جاتی۔
"کبھی نہیں۔
"کیسے۔
"میں تب تک اگلا سگنل کراس کر جاتا۔

ملازم نے تیل میں پوری ڈال دی تھی۔ اور کڑھائی کا کھولتا ہوا تیل سن سنا کر چھوٹے چھوٹے بلبلوں کی طرح ابھر ابھر کر پھوٹ رہا تھا سچ مچ۔ انھوں نے سگنل کراس کر لیا۔ اس روز مفلوج باؤجی نے میرے سر پر ہاتھ رکھنے کے بعد کہا تھا۔

"میں نے جو کھویا ہے۔ جانتا ہوں۔ تم نے جو کھویا ہے تو بھی جانتی ہے۔ لیکن ان بچوں نے کیا کھویا ہے نہیں جانتے۔

ایک ہی دنیا کے تو باسی تھے دونوں۔ ان کے آخری سفر پر کتنی بھیڑ تھی۔ بھیڑ تو ان کے دوستوں کی بھی ہوا کرتی تھی لیکن جب سے مفلوج ہوئے ہیں انقلاب آگیا ہے۔ کوئی بھی نہیں آتا۔ سوائے اس اکلوتے دوست کے۔ جس کا اجالوں کی دنیا سے کوئی سمبندھ نہیں۔ لیکن باؤجی صرف روشنی کے باسی تو نہیں۔ ان کی ایک دنیا اور بھی ہے۔ شبدوں کی دنیا۔ تو کیا اس دنیا میں صرف یہی دونوں بستے ہیں۔ ؟

تیسرے دن سورج ڈوبا تو اس کے ساتھ بہت سے دل ناامیدی کے سمندر میں ڈوب گئے۔ سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور باؤجی کے پاس براجے رہے۔ رات سب نے آنکھوں میں گزاری، چوتھے روز باؤجی کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ چھوٹے بھائی کی نگاہ پڑی تو بھیگی ہوئی آنکھوں میں مسرتوں کے جگنو چمک اٹھے۔ اس نے ہلکی سی آواز سے بہن کو متوجہ کیا۔ خود بہن بھائی کے سر کی کسمساہٹ محسوس کر رہی تھی۔ دونوں نے بہو کو ایک ساتھ پکارا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں دوڑی دوڑی آئی۔ بدلی ہوئی صورتِ حال کو دیکھتے ہی سسر کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ باؤجی کا کانپتا ہوا ہاتھ بہو کے سر پر پہنچا۔ وہ خاموشی سے سر سہلاتے رہے۔ اور اپنے بیٹے کو دیکھتے رہے کچھ دیر بعد ان کا دوست بھی آگیا۔ اور جب انھیں پتہ چلا کہ ان کا دوست روز ہی آ رہا ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

دن بدن باؤجی کی طبیعت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ گھر میں زندگی لوٹ آئی تھی۔ بچوں کے کمرے سے پاپ میوزک کا مدھم سا شور بھی باؤجی کے کمرے میں آنے لگا تھا۔ اب بہو کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور بہن کے چہرے پر اطمینان۔ دوست اپنی دنیا کی سناتا بھائی سیوا میں لگا رہتا۔ بیٹا بھائی اور باپ کے بقایاجات کی وصولی میں لگا رہا۔ اور ڈاکٹر حیران۔

"میری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ آپ کے کہنے کے مطابق بیس روز کی ایمرجنسی لیو ملی تھی۔

بیٹے نے باپ کی سنبھلتی ہوئی حالت کو دیکھنے کے بعد ایک روز اپنی بھابھی سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تم جاؤ..... اب تو... باؤجی کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔ پھر ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں۔

پہلے بیٹا رخصت ہوا پھر بھائی۔ پچیسویں روز بہن کا شوہر آ کر اپنی بیوی کو لے گیا۔ بچے حسب معمول اسکول جاتے رہے۔ بہو اپنی مصروفیات میں روز و شب گزارنے لگی۔ زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی۔ بس انھیں یاد تھا تو اس قدر کہ چند روز پہلے موت ان کے گھر جھانک گئی تھی۔

ایک روز صبح ملازم نے کواڑ تھپتھپاتے۔ بہو نے دروازہ کھولا۔ دیرینہ ملازم منہ لٹکائے کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے۔

"باؤجی ابھی تک اٹھے نہیں

دونوں دوڑ کر ان کے کمرے میں پہنچے۔ بہو نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا۔ وہ آیا۔ باؤجی کا معائنہ کیا اور چادر اوڑھا کر خود بھی سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ بہو سراپا سوال اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"صبح کسی وقت وہ چلے گئے۔ دل کی دھڑکن.....

"تم جاؤ۔ اب تو باؤجی کی طبیعت بھی سنبھل گئی ہے۔ پھر ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں۔

اسے دیور کی رخصت یاد آئی۔ پھوپھی کی مہلی روانگی یاد آئی۔ اسے کاکا کا جانا یاد آیا۔ یہ سب ابھی تو گئے ہیں۔ دن ہی کتنے ہوتے ؟

ب..... انہیں... پھر..... ایک مرتبہ پھر اس کے بائیں ہاتھ میں ریسیور تھا اور اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی ڈائل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اہم ادبی کتاب

جس میں شاعری کے مسائل سے متعلق ایک اہم تفصیلی مضمون ہے۔ اس کے علاوہ قلی قطب شاہ، سودا، غالب، میر، میر انیس وغیرہ پر بھی مضامین شامل ہیں جو نئے تناظر میں تحریر کئے گئے ہیں۔

مصنفہ
ڈاکٹر عبید الرحمٰن ہاشمی

قیمت
چالیس روپے

آج ہی طلب کریں

رنگ محل پبلی کیشنز، انصاری روڈ، مظفر نگر (یو پی)

ورِیندر پٹواری

○

پریم کنج، بھوری تالاب تلّو - جموں (جموں کشمیر)

روبوٹ

بابوجی کو شکایت ہے کہ اس کے اکلوتے بیٹے نے ان کو ایک بد دماغ نوکر کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ جبکہ رگھو کو یہ گلہ ہے کہ مالک نے اپنے وفادار نوکر کو ایک غیر معقول بوڑھے کے عتاب کا شکار بنا دیا ہے۔ رہی بات مالک کی تو اس کو ان دونوں پر غصہ آتا رہا ہے کہ ان کے طویل خطوط سکون دینے کے بجائے انتشار پیدا کرتے ہیں۔ تب ہی تو وہ اپنے پوسٹ بکس میں دو جانے پہچانے لفافے دیکھ کر چونک پڑتا ہے اور تحدشات کے دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں کو بے حد خوش رکھنے کے لئے وہ کیا کچھ نہیں کرتا رہتا ہے۔ ہر ماہ دونوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ ڈرافٹ بھیجتا ہے۔ تحائف بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ بابوجی کے لئے بلڈ پریشر کی جدید دوائیاں اور رگھو کے لئے بواسیر کی دوائیاں بھیجتا رہتا ہے۔ مگر پھر بھی آگ بجھتی نہیں بلکہ سُلگتی ہی رہتی ہے۔ اندر ہی اندر روئی کی طرح اور یہی وجہ ہے کہ دونوں کی تحریر کا ہر لفظ ادھ جلے گوشت کی مانند نظر آتا ہے۔ باپ کا خط پڑھ کر اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو جاتی ہیں اور رگھو کا خون پی جانے کو جی چاہتا ہے۔ اگلے لمحے جب وہ رگھو کی روداد پڑھ لیتا ہے تب بابوجی کو سختی سے ٹوکنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر گزشتہ دو برسوں سے نہ تو وہ کسی سوال کا جواب دے پایا ہے اور نہ ہی کوئی جواز پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یوں وہ چاہنے اور نہ چاہنے کے بھنور میں پھنس کر دن کا چین اور راتوں کا قرار کھو بیٹھا ہے۔ آج بھی جب اس نے اپنے پوسٹ بکس کی کھڑکی کھول کر دو جانے پہچانے لفافے دیکھ لئے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کھڑکی کھولتے ہی کسی تنور سے نکلتے ہوئے شعلوں نے اس کے چہرے کو جھلس دیا ہو۔ کچھ گھبرا کر اور کچھ خوفزدہ ہو کر اس نے کھڑکی بند کر دی مگر پھر بابوجی کی یاد نے اسے پریشان کر دیا اور اس نے وہ دونوں لفافے پوسٹ بکس سے نکال لئے اور تلاؤں میں گھورنے لگا۔

ایک خط بابوجی کا تھا اور دوسرا رگھو کا۔ ایک انگریزی میں اور دوسرا ٹوٹی پھوٹی ہندی میں۔ وہ جانتا تھا کہ بابوجی نے کیا لکھا ہوگا یہی کہ رگھو مجھے بہت تنگ کرتا رہتا ہے۔ جان بوجھ کر اذیتیں پہنچاتا ہے۔ بات بات پر ذہنی تناؤ پیدا کر دیتا ہے۔ چائے مانگ لوں تو دھوکے سے دودھ میں بورن وِٹا ملا کر پلا دیتا ہے۔ کھانا مانگ لوں تو وہ شوربہ سامنے رکھ کر چلا جاتا ہے۔ چاول مانگ لوں تو وہ روٹیاں کھلانے کے لئے بضد رہتا ہے۔ کشمیری نمکین چائے پینے کی حسرت ہی رہ جاتی ہے اور کم بخت اب قہوے میں بھی شکر نہیں ڈالتا کچھ کہہ دوں تو جوابی حملہ کر دیتا ہے اور چپ رہوں تو میرا مذاق اڑانے کے لئے فوراً ڈاکٹر کو بلا کر لے آتا ہے۔ صبح سویرے پوجا کرتے وقت اگر اتفاقاً میری آنکھ لگ جاتی ہے تو یہ راکھشس جانے کہاں سے نمودار ہو کر میری نبض ٹٹولنے لگتا ہے۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ میں زندہ ہوں یا مردہ۔ شام کو سیر کے لئے نکلوں تو یہ ظالم کسی آسیب کی طرح میرا پیچھا کرتا ہے۔ یا پھر دن بھر کچھ کام کرنے کے بجائے تمہاری بھیجی ہوئی ویڈیو فلمیں دیکھتا رہتا ہے۔ کیا وہ یہ سب کرنے کے بجائے درختوں کی شاخ تراشی نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کو دیکھتے ہی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ سانس لیتا ہوں تو لگتا ہے جیسے میرے دل پر خاردار تار چلائے جا رہے ہیں۔ یہی حالت رہی تو میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا بیٹے!

رگھو نے کیا لکھا ہوگا۔ وہی پرانی باتیں دہرائی ہوں گی۔ اس نے بھی کہ بابوجی کو شکر کی بیماری ہو گئی ہے۔ ان کا بلڈ پریشر بھی ٹھیک

نہیں ہے۔ آپ کی بھیجی ہوئی شوربے کی گولیاں گرم پانی میں ڈال کر دیتا ہوں تو یہ کہہ کر ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں کہ میں دھوکے سے انکو ملاب کی گولیاں دے رہا ہوں۔ فریج کا پانی پلا دوں تو مٹکے کا پانی طلب کرتے ہیں۔ ڈاکٹر پرہیز کی تاکید کر رہا ہے اور بابوجی بے ذائقہ کھانے کھا کر بوکھلا جاتے ہیں۔ کبھی تھالی تو کبھی کھانا میرے سر پر دے مارتے ہیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی بواسیر کی دوائی سے ٹھیک تو ہو گیا ہوں مگر اب میرا بلڈ پریشر بڑھنے لگا ہے۔ ان حالات میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر پاؤں گا بے شک آپ میری تنخواہ دوگنی بھی کر دیں۔ تب بھی نہیں۔

لفافے بند تھے مگر اس کو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے دو پرانے کیسٹ رک رک کر چل رہے ہوں۔ دونوں کی آواز میں درد تھا۔ تڑپ تھی۔ فریاد تھی ـــــ ایک آہ بھر کر اس نے دونوں لفافے جیب میں یوں رکھ دیے گویا کسی کینسر کے مریض کی تازہ ترین رپورٹ فائل میں رکھ دی گئی ہو۔ مگر گزشتہ رات اپنے البم کی ورق گردانی کرتے کرتے وہ بے ساختہ رو پڑا تھا۔ ماضی کی یادیں بابوجی کی قربانیوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ ایک معمولی کلرک کی جد و جہد کی کہانی بیان کر رہی تھیں۔ اس طرح اسے بابوجی کی بہت یاد آئی تو اس نے لفافے کھول دیے۔ اور دونوں کی تحریریں پڑھ لیں۔ مختصر مختصر تحریریں دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے دھند چھٹ گئی ہے۔ اور تمام مسائل کا حل ایک نئے خوبصورت جزیرے کی طرح نظر آ رہا ہے۔

باپ نے لکھا تھا کہ میں تنہائی برداشت کر سکتا ہوں مگر رگھو کی موجودگی نہیں۔ اگر تم اپنے پرانے لاڈلے نوکر کو نہیں نکالنا چاہتے ہو تو اسکو ہدایت دو کہ وہ زبان پر مہرِ خاموشی لگا کر میرے ہر حکم کی تعمیل کرے۔ وہ جب بولتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس مکان پر بم گر رہے ہوں۔

رگھو نے لکھا تھا کہ میں آپ کے پتاجی کو تنہا تو نہیں چھوڑنا چاہتا ہوں مگر کیا کروں وہ چاہتے ہیں کہ وہ بٹن دبائیں اور میں مشین کی طرح جاتے لاؤں۔ دودھ لاؤں۔ پھول لاؤں۔ کپڑے لاؤں۔ درخت کی شاخ تراشی کروں۔ نئے پودے اگاؤں اور اگر ان تمام کاموں میں ذرا سی بھی دیر ہو جائے تو وہ شہد کی مکھی کی طرح میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور مجھے اپنے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ مجھے اس قید سے آزاد کیجئے، میرے مالک!

خطوں کو سرہانے رکھ کر وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا اور بابوجی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اپنے باپ سے بہت پیار کرتا ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ بابوجی اپنا گھر چھوڑ کر امریکہ آنا نہیں چاہتے اور وہ خود امریکہ چھوڑ کر اپنے ملک کے کسی دور دراز علاقے میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔

درجنوں سگریٹ پھونک پھونک کر آخر اس نے اپنے لچک دار فیصلوں اور وسوسوں کو نظر انداز کر کے ایک ٹھوس قدم اٹھایا ـــــ اس نے رگھو کو آزاد کر دیا اور اپنی بچت کی ساری رقم خرچ کر کے اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کے لئے ایک روبوٹ یعنی مشینی انسان بھجوا دیا۔ اس فیصلے سے بابوجی بھی خوش تھے اور رگھو بھی۔ مشینی انسان بابوجی کے اشاروں پر ناچتا رہا اور بوڑھا روبوٹ کی عجیب نقل و حرکت دیکھ کر یوں مطمئن نظر آتا گویا ماں باپ سے بچھڑا ہوا بچہ اپنے ارد گرد چند کھلونے دیکھ کر ہنس پڑا ہو مگر کچھ دیر بعد زار و قطار رونے کی خاطر۔

بیٹا اپنے اس فیصلے سے بے حد خوش تھا۔ وہ اپنی مشینی زندگی کے دائرے میں دولت بھی سمیٹ رہا تھا اور خوشیاں بھی۔ ادھر اس کا بوڑھا باپ ایک بہت بڑے مکان میں روبوٹ کے ساتھ بھی باتیں کرتا تو کبھی ہنستا اور کبھی روتا رہا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خطوط بھی لکھتا رہا اور بیٹا بڑے اشتیاق سے پوسٹ بکس کی کھڑکی کھولتا رہا۔ بالکل ویسے ہی جیسے ایک پجاری مندر کے دوار کھول کر بھگوان کے درشن کرنے جا رہا ہو۔ اب تو بابوجی وہ ساری شکایتیں بھول گئے تھے جن سے وہ پریشان رہتا تھا مگر ان کو ایک شکایت اب بھی بدستور تھی کہ رگھو جانے کیوں ادھ کھلے دروازے سے جھانک جھانک کر بوڑھے کا تماشہ دیکھتا رہتا ہے۔

یوں چند ماہ گزر گئے۔ اور ایک دن جب بیٹے نے اپنے پوسٹ بکس کی کھڑکی کھول کر بابوجی کی چٹھی کے بجائے رگھو کی چٹھی دیکھی تو اس کا جسم کانپنے لگا۔ تھرتھراتے ہاتھوں سے اس نے لفافہ کھول کر تحریر پڑھی مگر دوسرے ہی لمحے خط کے سارے حروف دھندلا گئے۔

رگھو نے لکھا تھا کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل کرتا رہا ہوں اور ہفتے میں تین چار بار بابوجی کو دیکھتا رہا ہوں۔ وہ خود ہی کھانا

[باقی صفحہ ۴۸ پر دیکھئے]

نئی شاعری نئے نام

ترتیب و تہذیب ○ افتخار امام صدیقی

۲۵ شعرا کے کلام کا یہ انتخاب کسی ترتیبی سوچ کے تحت شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک سلسلہ ہے جس میں ان شعرا کو شامل کیا گیا ہے جو بالکل نئے یا پھر ۱۹۷۰ء کے بعد جنہوں نے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا۔ اس سلسلے کی ابھی دو تین کڑیاں اور آنی ہیں۔ اس انتخاب میں بعض وہ نام بھی شامل جو شاعری کے مختلف انتخابات میں آ چکے ہیں اور نئی شاعری کے ذیل میں ان کے اشعار تنقیدی مضامین میں یہاں وہاں ٹنکے ہوئے رہتے ہیں۔

اردو شاعری کو عموماً نام نہاد اصطلاحوں کے تناظر میں دیکھا جاتا رہا ہے جیسے کلاسیکی شاعری، ترقی پسند شاعری، جدید شاعری وغیرہ وغیرہ۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش نے اردو کے شعری سرمائے میں کیا اضافہ کیا اور کیا نقصانات پہنچائے یہ ایک طویل تنقیدی بحث کا موضوع ہے۔ یہاں اس انتخاب سے متعلق چند وضاحتیں ضروری ہیں جن پر بحث کی جا سکتی ہے۔

ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد کیا؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے جو نہ تو ترقی پسندی کی توسیع ہے اور نہ ہی جدیدیت کی۔ اگر ایسا کچھ ہے تو پھر نئے شعرا ادھر کی زد پر کیوں ہیں؟ وہ اس کشمکش میں کیوں رہیں کہ کس طرف جایا جائے حالانکہ نیا شاعر اور ادیب ان جھگڑوں میں الجھنے کے بجائے آزادانہ صرف اور صرف اپنے تخلیقی سفر پہ توجہ دینا چاہتا ہے۔ سوال تو یہ بھی ہے کہ ابھی جدیدیوں میں کتنے ہی ایسے نام ہیں جو اچھی اور سچی شاعری خلق کرنے کے باوجود بے توجہی کا شکار ہیں۔ کیا اردو شعر و ادب ایک بار پھر جمود کا شکار ہے؟

ہو سکتا ہے کہ اس انتخاب میں شامل شعرا کی نظمیں غزلیں کہیں کہیں کم معیار معلوم ہوں۔ دراصل یہاں ساری توجہ اس نکتہ پر ہے کہ نیا ذہن شاعری کے حوالے سے اپنے 'آج' کو کس طرح دیکھ رہا ہے۔ ان کے شعری رویے، فکری اور جمالیاتی سطح پر کیا ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ اب آئندہ کے شعری امکانات پر جو بھی گفتگو ہو وہ انہی شعرا کے حوالے سے ہو۔ ان شعرا کے متعلق میں نے جو تاثراتی تجزیے رقم کئے ہیں ان میں بعض مشترک باتیں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں نے صرف امکانی صورت حال پر توجہ دی ہے اور نئے شعرا کی مجموعی شاعری کو ان کی انفرادی شعری تخلیقات کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔

یہ اپنی نوعیت کا اولین انتخابی سلسلہ ہے جس میں نئے قلم کاروں کے کلام کے علاوہ سوانحی اشاریہ، تاثراتی تجزیے اور اتنی بڑی تعداد میں تصویریں دی گئی ہیں۔ یہ سلسلہ اور بھی منفرد ٹھہرے گا کہ اس میں تازہ کار شعرا کی شمولیت میں کسی طرح کا گروہی تعصب، کوئی مصلحت یا خودساختہ معیارات کے بجائے صرف روشن شعری امکانات پر توجہ دی گئی ہے۔

سال ۱۹۸۵ء عالمی سطح پر نوجوانوں کا سال تسلیم کیا گیا۔ سال ۱۹۸۵ء میں ختم ہوتی ہوئی بیسویں صدی اور ۲۱ ویں صدی کی آمد آمد کا ذکر زیادہ رہا۔ ۱۹۸۵ء ترقی پسند تحریک کی نصف صدی مکمل ہونے کا سال ہے۔ ۱۹۸۵ء جدیدیت کے رجحان کی سلور جوبلی کا سال ہے۔ یہ انتخابی سلسلہ ۱۹۸۵ء تک سمٹنے والے ایسے ہی تاریخ ساز واقعات کی نذر ہے۔

عبد اللہ کمال — [محمد عبداللہ]

○ ۱۷/اپریل ۱۹۴۶ء مظفرپور (بہار)
○ بی۔ اے بمبئی یونیورسٹی | فلمی وصحافتی سرگرمیاں، ڈائرکشن دینا اور فلمیں لکھنا۔ "فلم ہی فلم" کی بمبئی میں نمائش ہو چکی ہے
○ میں: ۱۹۷۷ء - بے آسمان (زیرِ طبع)
○ شام جی بلڈنگ، دوسرا منزلہ، نور باغ، ڈونگری۔ بمبئی ۹

"ھول"

نفس تیرگی میں اک شہرِ جسم ٹوٹے
طولِ شب ہے کہ صبح کا ہر طلسم ٹوٹے
اے برتر کا اِسم ٹوٹے!

وہ ایک خواہش، جو خون میں زہر ذائقہ تھی
جو ریڑھ کی ہڈیوں میں تفکیر کا خدا تھی
جو گونگے لفظوں کا درد، بے صوت سی صدا تھی
شکستہ راتوں میں صبح کی تازہ دم دُعا تھی
مگر وہ خواہش بھی آج بے نام مر رہی ہے
کہ میرے اندر پھر آج اک شام مر رہی ہے

منتظر ہوں کہ صبح کا پھر طلسم جاگے
س کی دستک پہ پھر کوئی شہرِ جسم جاگے
ے برتر کا اسم جاگے۔

[طویل ترین نظم "ہول" کے حصہ اول "لا اِلٰہ" سے]

◆

دِل سے یادوں کے چمن، آنکھوں سے گل منظر تمام
رفتہ رفتہ ہو گئے سب خواب کے پیکر تمام

آنے والی نسل کے حصّے میں روشن ہے خدا
خوف، نفرت، تیرگی، اس عہد میں ہم پر تمام

جانے کس سچے نشانے پر پرندہ آ گیا،
دُور تک اُڑتے گئے ہیں ٹوٹے بال و پر تمام

خوشۂ گندم کے رخ پر اک طلسمِ صد جہات
شاہزادے کے مقابل خواب کے لشکر تمام

یہ نہیں، غالبؔ کے قدموں سے لپٹ کر رہ گئی
ہاں، غزل ہے (ایک حد تک) آج باقی پہ تمام

بے طلب بے یاد روز و شب ہیں، عبداللہ کمال
یوں اُبھرتے ڈوبتے رہتے ہیں دشت و در تمام

ش ک نظام

- ۲۶/ نومبر ۱۹۴۷ء جودھ پور (راجستھان)
- بی۔ اے (جودھ پور یونیورسٹی) | الیکٹرک سٹی بورڈ۔ جودھ پور
- لمحوں کی صلیب ۱۹۷۱ء۔ ساعتوں کے سلسلے ۱۹۸۱ء۔ نا د۔ ۱۹۸۳ء۔ دشت میں دریا (ہندی) ۱۹۸۴ء
- کلوں والی گلی، جودھ پور (راجستھان)

چاند سا پیار

جانے، کتنے لمحے بیتے
جانے، کتنے سال ہوئے ہیں
تم سے بچھڑے!

جانے کتنے
سمجھوتوں کے داغ لگے ہیں
رُوح پہ میری!

جانے کیا کیا سوچا میں نے
کھویا، پایا
کھویا میں نے
زخموں کے جنگل پر لیکن
آج ——
ابھی تک ہریالی ہے، ——

تم نے
ٹھیک کہا تھا
اس دِن ——
"پیار —— چاند سا ہی ہوتا ہے
اور نہیں بڑھنے پاتا تو
دھیرے دھیرے
خود ہی
"گھٹنے لگ جاتا ہے!"

◆

تجھ میں مٹی کی بو بولے   تیرے خطّے کی خو بولے
میرے چہرے سے تو بولے   ہوا سے جب تیری بو بولے
میری تنہائی سے تیرے   خال و خط کی خوشبو بولے
تجھ سے مل کر ایک زباں کیا   میرا تو اِک اِک مو بولے
ضد دونوں کی تھیں دیواریں   بولے تو پہلے تو بولے
سُن کے صدائیں تنہائی کی   میرے اندر کا ہو بولے
میرے تو گھر کے بھی سر میں   اب جنگل کا جادو بولے

اب باقی حسرت ہے اتنی
بند زباں ہو پہلو بولے

◆

دشت میرا ہے اب نہ در میرا   رات کی راکھ مقدر میرا
کون جانے کہاں کہاں جاؤں،   ہم سفر اب کے ہے سفر میرا
آئینہ میں تو عکس ہے لیکن   مار ڈالے گا مجھ کو ڈر میرا
جسم کتنے —— گذار آیا ہوں   راستہ صرف سانس بھر میرا
تجھ کو سب سے جُدا بنا دوں گا   چھین مت حرف کا ہنر میرا
دشت و صحرا اُجاڑ آیا ہوں   ڈھونڈتا ہوں کہاں ہے گھر میرا
دست و بازو لئے زباں مت لے   آخری پر تو مت کتر میرا

ق

آسمانوں پہ تو رہا خاموش   گھر گیا تیرے نام پر میرا
میں نے سجدہ میں سر جھکایا تھا   لے گئے سر اُتار کر میرا

رشید افروز [شیخ عبدالرشید]

○ یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء احمد آباد
○ ایم کام - ایم اے، ایل۔ ایل۔ بی | بینک آف بڑودہ (احمد آباد) میں ملازمت
○ نفی (شعری مجموعہ) ۱۹۸۰ء
○ سہیل منزل، ۸ - آشیانہ سوسائٹی، محمدی پارک، احمد آباد (گجرات)

سوغات

ہی یہ راہ روشن ہے
ہی میری نگاہوں میں
ہ منظر جگمگاتے ہیں
جن سے زندگی تشکیل پاتی ہے
—— یہ منظر
ں قدر شفاف، کتنے خوبصورت ہیں
ران کے جسم پر اب
ھول مٹی کچھ نہیں باقی
رے اشکوں سے ڈھل کر
سب نے اپنا حُسن پایا ہے

منظر
ج میری ذات کا حصّہ سہی، لیکن
فیں اک بار تم
پنی نگاہوں سے اگر چھو لو
، یہ منظر تمہارے ہیں

◆

پیاس بھڑکے گی تو ہم صحرا کی جانب جائیں گے
پھر چمکتی دھوپ کا دریا اٹھا لے آئیں گے

اُس نے پھولوں کی نمائش کا کیا ہے اہتمام
ہم بھی اپنے زخم کاغذ پر سجا لے جائیں گے

جانتے ہیں، وہ کسی کی بات اب سنتا نہیں
اور ہمیں ضد ہے، اسے سب کچھ سنا کر آئیں گے

یہ بھی خوش فہمی ہے اپنی یا غلط فہمی کہ ہم
سوچتے ہیں، وہ بلانے آئے گا تب جائیں گے

اس برس ویسے بھی گرمی سخت ہے اس شہر میں
وہ بہانہ جو نہ آیا بھی تو کیا کر پائیں گے

ہم نہ ہوں گے پھر ہمیں گلشن میں ڈھونڈے گی صبا
دیکھ لینا تم کبھی ایسے بھی موسم آئیں گے

◆

نئی زمین، نیا آسمان میرا ہے
بہت دنوں سے یہ سارا جہان میرا ہے

وہ شاخ جس پہ کوئی پھول ہی نہیں باقی
مہک اٹھی ہے جہاں تک گمان میرا ہے

یہ سوچنا بھی گوارا نہیں دشاؤں کو
کہ راستوں میں کہاں تک نشان میرا ہے

یہ کون نیند سے آواز دے رہا ہے مجھے
یہ کس کے خوابوں کو اب تک دھیان میرا ہے

بہت بُرا ہوں، مگر پھر بھی یاد آؤں گا
میں جانتا ہوں کہ یہ بھی گمان میرا ہے

عداوتوں میں بھی پنہاں ہے دوستی کا بھرم
وہ مجھ سے لاکھ سہی بدگمان میرا ہے

بدل گئے سبھی کردار اِس کہانی کے
بس ایک میں ہوں جو شاید گمان میرا ہے

اسعد بدایونی [اسعد احمد]

- ۲/اگست ۱۹۵۷ء سہسوان ضلع بدایوں (یوپی)
- ایم۔ اے (اردو) ایم فل | پی ایچ ڈی کی مصروفیات
- دھوپ کی سرحد ۱۹۷۷ء۔ خیمۂ خواب ۱۹۸۴ء
- شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

◆

کوئی منظر مرے خوابوں سے کم قیمت نہیں ہوگا
مگر منظور یہ سودا کسی صورت نہیں ہوگا

چراغ خیمہ بجھ جائے کہ مقتل سے صدا آئے
جو تجھ کو چاہتا ہے منکرِ بیعت نہیں ہوگا

قبیلہ کس لئے جشنِ طرب کے دف بجاتا ہے
جو سناٹا دلوں میں بس چکا رخصت نہیں ہوگا

گریزاں صورتوں اور ساعتوں کی داستانوں میں
ہوا کا استعارہ قابلِ نفرت نہیں ہوگا

میں اب تک کس لئے اک خواب کے سائے میں بیٹھا ہوں
گذر اُس کا اِدھر سے اب کسی صورت نہیں ہوگا

مرے اجداد کو بھی راس کب آئی ہے یہ دُنیا
مجھے بھی یہ خرابہ باعثِ راحت نہیں ہوگا

یہ سارے چاند تارے آسمانوں کی امانت ہیں
زمیں سے رابطہ ان کا کبھی مثبت نہیں ہوگا

◆

ہمارے خواب بھی اک دن حقیقت ہوگئے ہوتے
اگر ہم بھی اسی دنیا کی صورت ہوگئے ہوتے

اگر اس بار بھی پاگل ہوا سے ہم اُلجھ جاتے
تو بس دو چار خیمے اور غارت ہوگئے ہوتے

اگر اس دھوپ جیسے رُوپ سے کچھ واسطہ رکھتے
تو ہم بھی آشنائے رنج و راحت ہوگئے ہوتے

چراغوں کی لوؤں سے آنکھ کو دوچار کرنا کیا
جو یوں ہوتا تو سب اہلِ بصیرت ہوگئے ہوتے

جنھیں اوراقِ گل پر رات کی آنکھوں نے رکھا ہے
وہی آنسو ہمارے فن کی قیمت ہوگئے ہوتے

◆

مرے چراغ کو یہ وہم کھائے جاتا ہے
کہ اُس کو ہاتھ ہوا کا بلائے جاتا ہے

میں اپنے جسم کی سرحد میں گھٹتا جاتا ہوں،
وہ مملکت کو انا کی بڑھائے جاتا ہے

فرات اپنے کناروں سے سر پٹکتی ہے
یہ کون دشت میں خیمے لگائے جاتا ہے

چمک رہا ہے فلک پر بس اک ستارۂ سحر
شبِ سیاہ مری جگمگائے جاتا ہے

کسی رجز سے شجاعت سوا نہیں ہوتی
تو کس لئے یہ دلِ زار گائے جاتا ہے

میں ایسے ہاتھ کی تعظیم کر نہیں سکتا
جو آسماں سے پرندے گرائے جاتا ہے

میں سب سے ناتواں انساں ہوں قبیلے کا
یہ اک جنوں مجھے میداں میں لائے جاتا ہے

◆

بجھتے ہوئے افق سے اترتی اُداس شام
جگنو مثال ذہن میں کچھ جلتے بجھتے نام

سب کون سے چراغ کی لو پر فنا ہوئے
کچھ دیر پہلے تھا جو پتنگوں کا اژدہام

فکرِ سخن میں گم ہیں پہاڑوں کے سلسلے
یہ آبشار ان سے اترتا ہوا کلام

ناآشنا ہیں وحشت و دیوانگی سے ہم
ہر رہگذر پہ خاک اُڑانا ہمارا کام

اک کوزہ گر کے چاک پہ مٹی کا ایک ڈھیر
مٹی کے ایک ڈھیر میں چہروں کا اژدہام

علی ظہیر

○ ۱۹؍فروری ۱۹۴۷ء۔ حیدرآباد

○ رات کے ہزار ہاتھ [۱۹۷۷ء] انگلیوں سے خون ۱۹۸۵ء، مضامین کا مجموعہ

○ ساز اپارٹمنٹس، روڈ نمبر ۱، بنجارہ ہلز، حیدرآباد   اور ایک ناول زیر ترتیب

شہر

شہر یوں جاگتا ہے
کوئی اژدہا جیسے
کنڈلی کھول رہا ہو
ذرا دھیرے دھیرے

شہر پھنکارتا ہے
اپنے مکینوں کی طرف
جیسے کھالے گا انھیں
شام کے آتے آتے

شام آتی ہے
تو آکاش سلگ جاتا ہے
اژدہا موم کی مانند پگھلتا ہے
تو اجسام بھی پانی کی طرح بہتے ہیں
ہر طرف نیلی فضا
زخموں کا مرہم بن کر
شہرِ غم خوردہ کے اعصاب میں گھل جاتی ہے

اژدہا
پھر وہی خوں خوار
درندہ سایہ
شہرِ غم خوردہ کی تقدیر بنا رہتا ہے
موت کے زخم کی تصویر بنا رہتا ہے

ایک دیوار سی آتی ہے نظر کیا دیکھوں

ایک دیوار سی آتی ہے نظر کیا دیکھوں
راستے بند ہیں پھر
کچھ تو ہوا ہے دیکھو
یوں تو
شادی میں غمی میں
یہاں ہوتا ہے یہی
فرق یہ ہے
کہ اس ہنگام میں سناٹا ہے
نہ کوئی کہرام ہے رونے کا
نہ نغمہ کوئی
ایک سناٹا سا سناٹا ہے
کتنے کہرام چھپے ہوں گے
یا نغمے اس میں
کون جانے گا ابھی
وہ جو خاموشی کا دشمن تھا
مرا دوست، رفیق
اس نے سناٹے کو کس طرح بسایا ہوگا
مجھ سے کہتے ہو کہ دیکھوں میں ادھر۔ کیا دیکھوں؟
ایک دیوار سی آتی ہے نظر کیا دیکھوں۔

بارش

بارش کی اک حالت ہے
مٹی کی طرح
احساس کو بھی تبدیل کئے دیتی ہے
بارش جب کے مسلسل ہو
سب کام ہوں بند
اور ہم
کھڑکی کے باہر
لوہے کی جالی سے پرے
جب پانی کے قطروں کو
ہوا میں گرتا دیکھیں

تب کچھ ہوتا ہے
دل کی اک چنگاری
شعلہ بن جاتی ہے
چہرے پھر سے ڈھلتے ہیں
اک صورت پھر یاد آتی ہے۔

شہنشاہ مرزا

○ ۲۷/جون ۱۹۴۲ء لکھنؤ

○ ایم۔اے (اردو) ایم۔اے (تاریخ) | لکچرر اردو، گورنمنٹ انٹر کالج۔ بارہ بنکی

○ سنگ لرزاں (شاعری) ۱۹۷۸ء۔ تنقیدی تجزیے (مضامین) ۱۹۸۵ء۔ پارۂ سنگ (زیر ترتیب)

○ ۸۲۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ۔

سب سے بڑا عذاب

روز و شب بکھر رہے ہیں
ہر پل، ایک بھاری پتھر ہے
جو اعصاب کی پھنگی پر
جانے کب سے دھرا ہے
نہ انحاد ہے، نہ فساد
بس ایک خلفشار ہے
سُنسان جنگل میں
کہیں کوئی پتا بھی نہیں کھٹکتا
اور روز و شب ہیں کہ بکھر رہے ہیں

سُوکھے پتے ہواؤں کا نوحہ پڑھ چکے
اب یہ کھاد بن کر
دھرتی کی کوکھ میں سما جائیں گے
تا کہ
نئی کونپلیں پھوٹیں
مگر ہماری آنکھیں
انھیں دیکھ کہاں سکتی ہیں
کہ روز و شب کا بکھرنا
شاید ہمارے لئے سب سے بڑا عذاب ہے۔

چشمہ

وہ عجیب لمحہ تھا
جب میرے دل میں
تمہارے لئے
ایک ایسا جذبہ بیدار ہُوا
جو میرے لئے بھی اجنبی تھا

اب اگر تمنّا کے
منھ زور گھوڑے کو
زور کی ایڑ لگاؤں بھی
تو تم تک رسائی ممکن نہیں

کوئی معصوم بچی
میرے سونے آنگن میں
اپنی خوش رنگ کلکاریوں سے
رنگ بھر رہی ہے
اور میں اس کی دلچسپ ترا وتوں سے
لُطف اندوز ہو رہا ہوں

مگر کہاں!
ممتا کے سبھی سوتے
جانے کب کے خشک پڑے ہیں

ہنگامِ قتل

خوف، بے چینی، کرب اور ملال
کتنے جذبے، نہ جانے کتنے خیال
جاگ اُٹھتے ہیں، ڈوب جاتے ہیں
اور دل ڈوب ڈوب کر ہر بار
بس یہی اک دھیان کرتا ہے
کوئی آیا ضرور تھا،
ناگاہ!
دھیان کی سیڑھیوں پہ آہٹ تھی
رات کی چاپ تھی
یا پھر کیا تھا؟

ہر طرف اک دبیز کُہرا ہے
کوئی چہرہ نظر نہیں آتا
کوئی آواز بھی نہیں ہوتی
کند احساس، بے گماں جذبے
کب تلک یوں گذر بسر ہوگی؟

روف خیر [محمد عبدالرؤف]

○ ۵/نومبر ۱۹۴۸ء حیدرآباد (دکن)

○ ایم۔ اے | لکچرر گورنمنٹ جونیر کالج، ہنمکنڈہ، ورنگل (آندھرا پردیش)

○ اقرار (شعری مجموعہ) ۱۹۷۷ء ایلاف (ترائیلے) ۱۹۸۲ء کلمات (مضامین کا مجموعہ زیر طبع)

○ بیت الخیر، ۹-۱۰-۲۰۲/۱۹، دیوان شاہ نگر، رسالہ بازار، گولکنڈہ، حیدرآباد ۸

◆

فروتنی مری دشمن کو ہنر کرتی ہے
بڑے ادب سے وہیں ردِ کبر کرتی ہے

وہ شام جس نے سنبھالے ہوئے رکھا ہے ہمیں
کبھی کبھی تو بہت تیرا ذکر کرتی ہے

یہ رکھ رکھاؤ بھی ملنے سے روکتا ہے ہمیں
یہی انا ہے جو مائل بہ ہجر کرتی ہے

مجھے یہ فکر کہیں شاخِ بے نمو، نہ رہوں
یہی زمین بھی کیا میری فکر کرتی ہے

ملال یہ ہے کہ آسودہ ہے وہ چنگاری
جلا کے خاک جو یونان و مصر کرتی ہے

قدم قدم پہ کلیمی رہی جوازِ طلب
پیمبری کہیں تقلیدِ خضر کرتی ہے

نکال سر سے یہ بادِ شمال کا سودا
دکن کی خاک بھی تکریمِ جبر کرتی ہے

بہ ہر لحاظ سلیقہ ہی شرط ہے ورنہ
غلط مذاقی بھی توہینِ عطر کرتی ہے

رؤف خیر عقیدے کی ضرب ہے ایسی
عدد بڑا بھی اگر ہو تو صفر کرتی ہے

◆

کھل گیا ہم سے بہرحال جو سب سے نہ کھلا، ہائے وہ شخص خدا جانے جو کب سے نہ کھلا
شعر مبہم وہ نہ تھا، حرفِ مذبذب بھی نہ تھا جو کسی ڈھب سے کھلا اور کسی ڈھب سے نہ کھلا
وہ کھلا شہر تھا چیک پوسٹ نہیں تھے جس کے کوئی دروازہ جہاں نام و نسب سے نہ کھلا
میری پہچان ہی کیا تیرے حوالے کے بغیر، میں کسی پر بھی مگر تیرے سبب سے نہ کھلا
کچھ تو ہم نے بھی تکلف سے بہت کام لیا اور وہ شخص بھی کچھ پاسِ ادب سے نہ کھلا
اسمِ اعظم ہے عجب شاہ کلیدی اپنی ہم پہ وہ در بھی کھلا جو جدّ و اَب سے نہ کھلا
فرق اک روزنِ دیوار سے کیا کیا نہ پڑا جو عجم سے نہ ہوا ہند، عرب سے نہ کھلا

خیر یاروں نے پہاڑوں پہ پہاڑے لکھے
چاہنے کیا ہیں کبھی شعر و ادب سے نہ کھلا

◆

وہ بات اور ہی ہے جو تمہیں سنانا ہے سخن وری تو مری بات کا بہانہ ہے
ہمیں سنبھال کہ ہیں شاہکارِ کوزہ گری ہماری خاک تری آگ سے توانا ہے
جو ایک دیو تھا سرکس کا شیر ٹھہرا ہے ہوا کے ہاتھ میں یہ کیسا تازیانہ ہے
کوئی نشان لگاتے چلو درختوں پر کہ اس سفر سے تمہیں لوٹ کے بھی آنا ہے
چلے جو ہم تو کسی نے وداع بھی نہ کیا ملال یہ کہ ہمارا سفر سہانا ہے
سدا بہار ہے اس کے سخن کی ہریالی وہ میرے واسطے موسم نہیں زمانہ ہے
مجھے تو چھوڑ کم از کم سنبھال تو خود کو میں بے ٹھکانا سہی کچھ ترا ٹھکانا ہے

غزل تو جیسی بھی کہتا ہے وہ تو ظاہر ہے
رؤف خیر کا لہجہ تو شاعرانہ ہے

◆

ترا خیال ہی دل سے نکل گیا جیسے ہمارے شعر کا مصرع بدل گیا جیسے
سفر میں اس کا کلیجہ دہل گیا جیسے بھنور سے بچ کے وہ پہلے پہل گیا جیسے
یہ کس کا روشنی دیتا ہوا سا پیکر ہے چراغ سا کوئی رستے میں جل گیا جیسے
سیاہ گھوڑے کی زد میں ہیں بادشاہ و وزیر اڑھائی گھر کی کوئی چال چل گیا جیسے
سنا ہے جب سے کہ کائی بھری زمین ہے تو بڑے بڑوں کا بھی پاؤں پھسل گیا جیسے
نئی کہانی نئی رات پھر نیا لہجہ خلافِ قصۂ ضرب المثل گیا جیسے

زبان پھیر رہا تھا وہ خشک ہونٹوں پہ خیر
ہمارا حرفِ تر و تازہ کھل گیا جیسے

پرتپال سنگھ بیتاب

○ ۲۶ جولائی ۱۹۴۹ء انبالہ

○ ایم۔اے (پولیٹیکل سائنس) ایل ایل بی (جموں یونیورسٹی) ڈپٹی سکریٹری۔ پی ڈبلیو ڈی، جموں کشمیر گو۔

○ پیش خیمہ ۱۹۸۱ء - سراب سراب ۱۹۸۴ء

○ پی سی گورنمنٹ فلیٹس تلسی باغ، سری نگر۔ (کشمیر)

◆

کرتے رہے نجات کی ہر ہر سبیل ہم
لیکن نہ توڑ پائے اَنا کی فصیل ہم

کیوں نا روکتا نہیں ہمیں اب شوقِ گمرہی
کیوں ڈھونڈتے ہیں گمشدہ اپنی قبیل ہم

دن بھر خود اپنی ذات کا کرتے ہیں خونِ قتل
کمروں میں دفن رہتے ہیں شب بھر قتیل ہم

بے سمتیٔ سفر پہ رلاتا ہے دل بہت
جب دیکھتے ہیں رہ میں کوئی سنگِ میل ہم

ناپید اپنے طفل کی تصویر کے لئے
دیوار و در میں گاڑتے رہتے ہیں کیل ہم

جہلم خموش بہتا رہا اپنی راہ پر
خوابوں میں دیکھتے رہے دریائے نیل ہم

بیتاب ہم کو دشت پکارا کیے بہت
صحراؤں میں اگاتے رہے ہیں نخیل ہم

◆

صحرا بسے ہوئے تھے ہماری نگاہ میں
خیمہ لگا نہ پائے ہم آب و گیاہ میں

اک بار بھی نہ مل سکی لذّت گناہ میں
ہر بار آ کھڑا ہوا اخلاق راہ میں

بے سود ڈھونڈنا انھیں دشت و جبل میں ہے
وہ قافلے جو کھوئے گئے شاہراہ میں

وقت اور مقام سے نہ گذر پائے ہم کبھی
گذرے مقام و وقت فقط رسم و راہ میں

اک بار ہاتھ لگ گئے اس اندھی بھیڑ کے
واپس نہ لوٹ پائے ہم اپنی پناہ میں

کچھ دیر زیرِ پا جو ٹھہرتی کوئی زمین
ہم بھی قیام کرتے کسی جا نگاہ میں

صدیاں ہماری راہ کو روکے کھڑی رہیں
اور زندگی گذرتی رہی سال و ماہ میں

بس جاتے ہم کہیں بھی سمندر کے درمیاں
آیا مگر نہ کوئی جزیرہ ہی راہ میں

تعبیر کی امید بر آتی نہیں کوئی
بیتاب آؤ لوٹ چلیں خوابگاہ میں

◆

مٹی کے ساتھ رشتے ہمارے قدیم تھے
یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم مقیم تھے

پگڈنڈیوں کے جال نے الجھا دیا ہمیں
وہ راستے کہاں گئے جو مستقیم تھے

ہم بس گئے وہاں مگر آباد ہو نہ پائے
کچھ شہر وہ جدید تھا کچھ ہم قدیم تھے

بچے سوال کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے
یخ بستہ لاجواب کھڑے سب علیم تھے

حاوی تصورات پہ ہجرت تھی بے طرح
اور اپنے اپنے خیموں میں ہم سب مقیم تھے

لٹتے رہے تھے رات اندھیرے میں بے طرح
اور صبح اٹھ کے دیکھا تو ہم خود غنیم تھے

میدان میں اتر کے ہمیں علم یہ ہوا
دشمن کی فوج میں سبھی اپنے ندیم تھے

بیتاب اپنی جڑ ہی جنھیں دے گئی دغا
اشجار وہ بلند و لحیم و شحیم تھے

فاروق شفق [محمد فاروق]

- ۱۴ جنوری ۱۹۴۵ء جونپور (یوپی)
- ایم۔ اے۔ | درس و تدریس
- شہر آئندہ (زیر طبع)
- جی۔ ۱۸۵، دھان کھیتی، گارڈن ریچ، کلکتہ

◆

دور تک ہر طرف برف باری لگے
نیند سی جیسے ہر شئے پہ طاری لگے
راستے میں کہیں کوئی چہرہ نہیں
جس کو دیکھیں وہ صورت ہماری لگے
جن سے ملنے کی حسرت میں جیتے رہے
ان سے بھی مِل لئے کاروباری لگے
طے شدہ زندگی جی رہے ہیں سبھی
رونا، ہنسنا سبھی اختیاری لگے
کس طرح سے کٹے گا پہاڑ ایسا دن
پھول سی رات بھی ہم پہ بھاری لگے
بادلوں کی گرج بجلیوں کی چمک
سوختہ لوگوں کی پاسداری لگے

◆

اک طرف سے دئے سب بجھانے لگی
رات آئی مجھے پھر ڈرانے لگی
دونوں کے درمیاں گر نہیں ہے کوئی
پھر کہاں سے یہ دیوار آنے لگی
رات مجھ کو سمندر بلاتا رہا
کیا کہوں مجھ کو ہی نیند آنے لگی
جس کو اپنانا تھا اس نے اپنا لیا
خیر سے میری مٹی ٹھکانے لگی
راستہ دیکھ کر راستے سو گئے
اب ستاروں کو بھی نیند آنے لگی
چند بوندیں جھلستی زمیں پر گریں
نرم مٹی شفق کسمسانے لگی

◆

لوگوں کے اشاروں پہ اگر یوں ہی چلو
جگنو کی طرح سے نہ جلوگے نہ بجھو
کردیں گی تمہیں راہ میں تقسیم ہوا
بیٹھوگے کہاں جاکے جو اس در سے اٹھ
اک چھوٹا سا کمرہ ہے، تنہائی ہے، می
کیا چیز یہاں دیکھوگے کس کس سے ملو
تنہا بھی ہو، کمزور بھی ہو، خوف زد
ان چیزوں سے تم سارے زمانے سے لڑو
آنکھوں میں کوئی حادثہ لے کر نہ گھر
سونا بھی شفق چاہوگے تو سو نہ سکو

٭ ٭ ٭

◆

جوش دریا کا گیا موجیں بھی اب پاگل نہیں
زندگی اب بھی وہی ہے لیکن اب ہلچل نہیں
اپنی اپنی پیٹھ پر ہر شخص ہے گٹھر لئے
کون ہے اس شہر میں جس کا بدن بوجھل نہیں
آج بھی خاموشیوں سے کتنے گھر آباد ہیں
جان لوگے تو دھری بستی میں کیوں ہلچل نہیں
تم نہیں پہچانتے ہو رخ ہواؤں کے ابھی
جو تمہاری چھت بھگو دیں ایسے یہ بادل نہیں
پاؤں تو رکھو زمیں پر ہم فقیروں سے ملو
جانتے ہیں ٹاٹ ہیں کمخواب یا مخمل نہیں
اب ہرے معصوم پیڑوں کے تلے بیٹھو کبھی
اس سے تم ملتے ہو جس کے پاس کوئی حل نہیں

شاہد میر

○ ۱۰؍فروری ۱۹۴۹ء سردنگ مدھیہ پردیش
○ ایم۔ایس۔سی۔(نباتات) لکچرر و صدر شعبۂ نباتات
○ موسم زرد گلابوں کا (شعری مجموعہ) فروری ۱۹۸۴ء
○ گورنمنٹ کالج، بانسواڑہ (راجستھان)

◆

یہ معجزہ آخر ہُوا اپنے ہی اندر بے صدا
جو تھا ثبوتِ زندگی ٹوٹا وہ پتھر بے صدا
آسائشیں جتنی بڑھیں ہونے لگے گھر بے صدا
چہرے یہ ہنستے بولتے لگتے ہیں اکثر بے صدا
ساحل کے پتھر بے صدا موجوں کے اژدر بے صدا
کشتی جو ڈوبی ہو گیا سارا سمندر بے صدا
اک چپ نے سمجھایا ہمیں ترسیل کا ایسا ہُنر
یہ بولتے الفاظ بھی لگتے ہیں اکثر بے صدا
پھولوں کی خوشبو کی طرح پردیس میں شہرت گئی
گل کاریاں کرتا رہا اپنا مقدر بے صدا
سلطان کی اُمید میں فرمان کی اُمید میں
آنکھوں کے رن میں صف بہ صف خوابوں کے لشکر بے صدا

◆

آنکھوں ہی آنکھوں میں جانے کیا اظہار ہوئے
کبھی کبھی کے ملنے والے سچے یار ہوئے
چلتے پھرتے پیکر بھی نقشِ دیوار ہوئے
سناٹے آباد گھروں کے پہرے دار ہوئے
جانے کب پہونچوں گا میں اپنی تکمیل تلک
میرے ساتھ کے جتنے پودے تھے اشجار ہوئے
پھولوں کا انداز لگانا تھا گلشن گلشن
میرے بدن کے زخموں کے بھی آج شمار ہوئے
راہ کنارا دیکھ رہا تھا موجوں کی تہہ میں
کچے گھڑے پر تیرنے والے آخر پار ہوئے
کئی دلوں سے کسک رہے تھے یادوں کے چھالے
حرفِ غزل ہی آخر مثلِ نوکِ خار ہوئے

◆

ہری بھری کشت خواب بکھر گئے ہوئے پائمال گزرا — ہماری آنکھوں سے ایک قطرہ سمندروں کی مثال گزرا
جسے بھی دیکھو وہ نکتہ چیں ہے اسی لئے خوش خصال گزرا — زمانے والوں کی دسترس سے چھپائے میں اپنا حال گزرا
خلوص کے پھول کھل رہے تھے رفاقتوں کے شجر ہرے تھے — گیا نہ احساس تشنگی کا اگرچہ دن بے مثال گزرا
کہیں فصلیں کھڑی ہوئی تھیں کہیں کمانیں چڑھی ہوئی تھیں — جدھر جدھر سے ہماری آنکھ محبتوں کا غزال گزرا

ملی نہیں کوئی شے مثالی ہمیشہ لوٹا ہے ہاتھ خالی
"اسیر لفظوں" کی بستیوں سے اگر گدائے خیال گزرا

[محمد مظفر نقشبندی]

مظفر ایرج

- یکم اگست ۱۹۴۴ء صفاکدل، سری نگر (کشمیر)
- بی کمشنائن | سرکاری ملازمت
- ابجد (شعری مجموعہ) ۱۹۸۳ء
- کہکشاں، نوگام، نئی پورہ، سری نگر (کشمیر)

◆

ایک میں ، اک تیری یادوں کی نوازش کتنی،
ایسے طوفانوں میں مرجانے کی خواہش کتنی
جسم صحرا پہ دعا، پھول کوئی اُگ نہ سکا
دل سمندر میں رہی موجوں کی لرزش کتنی
چھن گیا آنکھ جھپکنے میں مرا سارا وجود
غیر ممکن ہوئی سایوں کی پرستش کتنی،
اب تو صدیوں کا سفر لمحوں میں طے ہوتا ہے
زندگی تیرے ہی پاؤں میں ہے لغزش کتنی
وہ پسِ پردہ مرے قتل کے درپے ہے ابھی
اور کھلے عام مرے حق میں سفارش کتنی
گھر کی دیواروں کو تصویر بنا لیتے ہیں
لوگ کرتے ہیں تخیل کی ستائش کتنی
کیسے ملبوس میں خود کو میں چھپاؤں ایرج
ہر طرف ہے مرے زخموں کی نمائش کتنی

◆

آنگن پھول، نشیلے موسم، چاند صنوبر ٹوٹ گئے،
جو پس منظر تک آئے تھے سارے منظر ٹوٹ گئے
ہاں پتھر میں ڈھلتے ڈھلتے بس اتنا ہی یاد رہا
مجھ پر منتر پھونکے، پھونکتے ہی جادوگر ٹوٹ گئے
آخری لمحے کی سولی چڑھ کر جانے کیا سوچ لیا
ہم تو آپ کے دروازے پر دستک دیکر ٹوٹ گئے
بستی بنجر یادوں کی پہنائیاں کس کو راس آئیں
دشت کے دامن تک آکر چپ چاپ سمندر ٹوٹ گئے
ساحل سے ٹکراتی موجیں کہتی تھیں آ دُور نکل
شام کے تیور دیکھ کے لیکن ہم سے شناور ٹوٹ گئے
سب اپنا کشکول لیے چلاتے رہے قریہ قریہ
اس دنیا سے خالی ہاتھ ہی کتنے سکندر لوٹ گئے
ساری اڑانیں سوئے فلک آسان ہوئیں لیکن ایرج
وہ کس سمت کے پنچھی تھے جو بے بال و پر ٹوٹ گئے

◆

ساون آنکھوں سے اُترے جب دل آنگن میں یاد گلاب
شب دہلیز پہ موسم بیتے دن جنگل میں اُترے شام
لب صحرا کشکول سجائے دریا دریا موج سراب
خون حرارت ساکن ہووے برف شگوفے جسم کی آنچ...
ٹیک لگا کر ہاتھ سرہانے سے جب ماضی پڑھتا ہوں،
کیا تتلی تصویریں کھینچوں اُس آنکھوں کے منظر سے

◆

کھل کھل اُٹھے رُوپ سمندر، چاندبدن میں یاد گلاب
کیا کیا رنگ اُفق منظر کے سوچے بن میں یاد گلاب
کانٹے ہی کانٹے بو دیتا ہے تن من میں یاد گلاب
جب جب ناگن پھن لہرائے مدھوبن میں یاد گلاب
نور ستاروں سے چھنتے ہے نیل گگن میں یاد گلاب
ایسا کون ہے چاند مقدر لائے گہن میں یاد گلاب
عشق منڈھیر پہ ایرج صاحب عمر گذاری دشت وجود
پھر کیوں کرے عکس کشیدہ رُخ درپن میں یاد گلاب

منور رانا

- ۲۶/نومبر ۱۹۵۲ء رائے بریلی (یوپی)
- بی کام (امیش چند کالج کلکتہ) ٹرانسپورٹ کا کاروبار
- غزل گاؤں (شعری مجموعہ ہندی میں) نیم کے پھول (زیر ترتیب)
- رانا ٹرانسپورٹ ۲۱- ذکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳

◆

مفلسی پاسِ شرافت نہیں رہنے دے گی
یہ ہوا پیڑ سلامت نہیں رہنے دے گی

شہر کے لوگ بہت اچھے ہیں لیکن مجھ کو
میرؔ جیسی یہ طبیعت نہیں رہنے دے گی

کچھ نہیں ہوگا تو آنچل میں چھپا لے گی مجھے
ماں کبھی سر پہ کھلی چھت نہیں رہنے دے گی

آپ کے پاس زمانہ نہیں رہنے دے گا
آپ سے دور محبت نہیں رہنے دے گی

شہر کے شور سے گھبرا کے اگر بھاگو گے
پھر تو جنگل میں بھی وحشت نہیں رہنے دے گی

راستہ اب بھی بدل دیجئے راناؔ صاحب
شاعری آپ کی عزّت نہیں رہنے دے گی

◆

وہ غزل پڑھنے میں لگتا بھی غزل جیسا تھا
صرف غزلیں نہیں لہجا بھی غزل جیسا تھا

وقت نے چہرے کو بخشی ہیں خراشیں ورنہ
اک زمانے میں یہ چہرا بھی غزل جیسا تھا

کوئی موسم بھی بچھڑ کر ہمیں اچھا نہ لگا
ویسے پانی کا برسنا بھی غزل جیسا تھا

تجھ سے بچھڑا تو پسند آگئی بے ترتیبی
اس سے پہلے مرا کمرہ بھی غزل جیسا تھا

میرا بچپن تھا مرا گھر تھا کھلونے تھے مرے
سر پہ ماں باپ کا سایا بھی غزل جیسا تھا

نرم و نازک سا، بہت شوخ سا، آوارہ سا
کچھ دنوں پہلے تو راناؔ بھی غزل جیسا تھا

◆

رِستے ہوئے زخموں کو دوا بھی نہیں ملتی
اب ہم کو بزرگوں سے سزا بھی نہیں ملتی

کیا جانے کہاں ہوتے مرے پھول سے بچّے
ورثے میں اگر ماں کی دعا بھی نہیں ملتی

مدّت سے تمہارا کوئی خط بھی نہیں آیا
رستے میں کہیں بادِ صبا بھی نہیں ملتی

جو دھوپ میں جلنے کا سلیقہ نہیں رکھتے
ان پیڑوں کو پتّوں کی قبا بھی نہیں ملتی

بستے کی جگہ پیٹھ پہ جو بوجھ لئے ہوں
ان بچوں میں بچوں کی ادا بھی نہیں ملتی

اس شہر میں روزی کے لئے آئے ہو راناؔ
جس شہر میں بہنوں کی رِدا بھی نہیں ملتی

خالد سعید

○ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۰ء گلبرگہ (کرناٹک)

○ بی ای (میکانیکل) ایم اے (اردو) | لکچرار، کرناٹک کامرس کالج بیدر

○ شب: رنگ نمو (شعری مجموعہ) ستمبر ۱۹۸۵ء - مدیر: پیش رفت - تنقیدی مضامین اور افسانوں زیر ترتیب

○ مسلم چوک گلبرگہ - ۴ - (کرناٹک)

◆

"شہرِ طلب میں کچھ نہ سہی بے گھری تو ہے"
ورثہ میں اپنے دولتِ بے چادری تو ہے

اتنا بھی اے خدا، تہی ماسہ نہیں ہوں میں
پلکوں کی نوک نوک پہ شادمنی تو ہے

اک تو ہی جاگنے کا سزاوار یاں نہیں
اک آنکھ اور ساتھ ترے جاگتی تو ہے

ہاتھوں میں آسمان پگھلتا نہیں تو کیا
ہونٹوں پہ جھلملاتی ہوئی تشنگی تو ہے

پھینا ہے تونے جسم و لبادہ تو کیا ہوا
خوش ہوں کہ میرے پاس مری بے تنی تو ہے

رکھتا ہوں چھیڑیوں بھی کہ کچھ سلسلہ نہیں
دل کی لگی نہیں نہ سہی دل لگی تو ہے

◆

ہوتی ہے صرف دولتِ بیدار بے سبب
پھر بھی پلک پلک ہے گرانبار بے سبب

اندیکھے دشمنوں کے اشارے گھڑی گھڑی،
ہم نے لگایا جسم میں رداڈار بے سبب

اک تو کہ سود و نفع کا قائل ہے ہر گھڑی
اک میں کہ خرچ ہوتا ہوں بے کار بے سبب

شکلیں بگاڑ دی ہیں تو آنکھیں بھی نوچ لے
چھوڑا ہے اس خرابے میں آثار بے سبب

ویسے بھی اب دلوں سے تعلق نہیں رہا،
کیوں درمیاں اُٹھاتے ہو دیوار بے سبب

نے عشق ہے کسی سے، نہ سودا، نہ کوئی غم
پھرتے ہیں شہر شہر ہیں خوار بے سبب

◆

دیوار سے دھوپ ڈھل گئی ہے
اک اور گھڑی نکل گئی ہے

اپنے ہی گھر اجنبی سے ٹھہرے
جون اپنی کہاں بدل گئی ہے

ہوں صرفہ نفس، امانتِ دل
ہاتھوں سے مرے پھسل گئی ہے

بالوں میں پھرے ہے ریشمی ہاتھ
بجھتی ہوئی جاں سنبھل گئی ہے

جاتی ہوئی شب ترے بدن پر
ہر صبح شفق سی مل گئی ہے

عابد صدیقی

- ۲۷ مئی ۱۹۵۷ء میرٹھ (یو.پی)
- ایم.اے (اردو) | پروگرام ایگزیکیٹو — آل انڈیا ریڈیو
- رہائی کا ایک لمحہ (شعری مجموعہ زیر ترتیب) مرتب علی گڑھ میگزین (ہم عصر اردو ادب نمبر)
- پروگرام ایگزیکیٹو، ریڈیو کشمیر، سری نگر (کشمیر)

◆

رنگ برنگی پریاں آئیں میں چپ تھا
سب نے اُن سے باتیں بنائیں میں چُپ تھا

جانے میں نے کیا چاہا تھا نہیں ملا
سب نے اپنی مرادیں پائیں میں چُپ تھا

میں نے اپنے گوشِ سماعت پاک کیے
بول رہا تھا میرا سایہ میں چپ تھا

ساحل ہی کی جانب تھا لہروں کا رُخ
اُس نے ریت پہ شکلیں بنائیں میں چُپ تھا

ہونٹوں پہ چسپاں تھی میرے مُہرِ سکوت
دنیا نے سب رسمیں نبھائیں میں چُپ تھا

تم ہی بولو میں نے کسی کی شکایت کی
لوگوں نے بے پر کی اڑائی میں چُپ تھا

◆

اک یاد وہ ہوتی ہے سہانی نہیں ہوتی
اور اُس پہ ستم یہ کہ بھلانی نہیں ہوتی

اس درجہ کبھی یاد ستاتی نہیں اُس کی
آنگن میں اگر رات کی رانی نہیں ہوتی

موسم کے بدلنے سے بدل جاتا ہے منظر
دنیا میں کوئی چیز پُرانی نہیں ہوتی،

اُس کو بھی ہُنر آ گیا آنکھوں سے سخن کا
ہم سے بھی کوئی بات زبانی نہیں ہوتی

ہم بھی کوئی شے اُس سے چھپا لیتے ہیں اکثر
اُس کو بھی کوئی بات بتانی نہیں ہوتی

◆

ہم سے دُنیا نے کہا کچھ اور تھا
زندگی تیرا پتہ کچھ اور تھا

بارہا پھر آئی ساعت وصل کی
لمسِ اوّل کا مزہ کچھ اور تھا

سب نشے پانی ہیں اُس کے سامنے
عُمرِ رفتہ کا نشہ کچھ اور تھا

رک نہیں پائے مرے بڑھتے قدم
وہ نہ تھی اُس کی صدا کچھ اور تھا

خونِ انساں اس قدر ارزاں نہیں
کل جو گلیوں میں بہا کچھ اور تھا

کام تو اچھا نہ کیا بارش نے   راستہ روک لیا بارش نے
کوئی افسردہ ہوا کوئی خوش   جانے کیا کِس سے کہا بارش نے
آج لگتا ہے کہ کر لی ہے قبول   ریگزاروں کی دُعا بارش نے
آبجو ہو گئیں آنکھیں میری   نام جب اس کا لیا بارش نے
ہم تھے ڈوبے ہوئے یادوں میں تری   دی بہت ہم کو صدا بارش نے

قہر راتوں کا ہُوا ہے نازل
کی ہے کچھ ایسی خطا بارش نے،

پرمار

- ۱۱؍اکتوبر ۱۹۵۵ء احمدآباد
- بی۔ اے | بینک آف بڑودہ کی ملازمت
- اردو میں نظم و غزل کے علاوہ گجراتی زبان میں بھی شاعری کی۔ دلت ادب میں بھی دلچسپی ہے
- اے/۳۰۰، امبالی خلیا، سرکی وارڈ، شاہ پور، احمدآباد (گجرات)

نہیں ہے، ایسا ایک بھی رشتہ

ریڈیو ٹی وی فرتج
ہے سب کچھ
پھر بھی جیسے
کچھ بھی نہیں ہے
بھرے پورے اسی گھر میں
اب تو خود سے بھی ڈر لگتا ہے
چاروں سمت خلا کا پہرا
کسی کے کاندھے پہ سر رکھ کر
اچھے بُرے موسم کی کتھائیں
بھولی بسری بات سناؤں
نہیں ہے ایسا ایک بھی رشتہ
اسی لئے تنہائی شب میں
آئینے میں
اپنا سر
اپنے ہی کاندھے پہ رکھ کر
پہروں رولیتا ہوں

صرف البم میں ہیں محفوظ

آج میں ناراض ہوں
تم بھی کچھ غمگین سی ہو
میں پریشاں
تم بھی چپ
گیارہ اکتوبر کا دن
کیوں کیلنڈر میں کہیں دکھتا نہیں
تم گھری رہتی ہو بچوں میں ہمیشہ
میں بھی دھندوں میں پھنسا ہوں
رک گئی ہیں کیوں گھڑی کی سوئیاں
ساری باتیں اب ہوا ہونے لگی ہیں
ساری یادیں
صرف البم میں ہیں محفوظ
اور ہم باہر بھٹکتے ہی رہے ہیں،

◆

سروں میں سر پھری وحشی ہوا ہے
نہ جانے شہر کو کیا ہو گیا ہے

نکل بھاگے تو میں اک دائرے سے
مگر آگے نیا پھر دائرہ ہے

سرِ مژگاں پہ چمکے گا نہ قطرہ
کنواں اس دل کا خالی ہو گیا ہے

سمٹتا ہے کرن کا سرخ پیکر
سیاہ نقطے میں سورج ڈھل رہا ہے

صدائے موج کب کی مر چکی ہے
کناروں پر ابھی شورِ ہوا ہے

◆

لہو کی جھیل میں ہے چاند کی صدا روشن
ذرا سے لمس نے حرفِ بدن کیا روشن

اُتر گئی ہے گھروں سے پہاڑیوں سے دھوپ
یہ برگ برگ پہ ہیں کس کے نقشِ پا روشن

ہواؤں میں، پھول میں، گھر میں، لہو میں، حرفوں میں،
کہیں بھی جاؤں ہر اک سمت ہے خلا روشن

وہ اپنے دُکھ کی کہانی مجھے سناتا رہا
مری خوشی کی حویلی کو کر گیا روشن

گرا تو مجھ کو زمیں بھی نظر نہیں آئی،
ابھی نگاہ میں اک آسمان تھا، روشن

کبھی تو لوٹ کے آئے گی رات پھولوں کی
ہے طاقِ سینہ میں اُمید کا دیا روشن

گلی میں کالی ہوا سائیں سائیں کرتی تھی
کھلی جو دھوپ تو پھر ہو گئی فضا روشن

شہپر رسول | [وجیہ الدین]
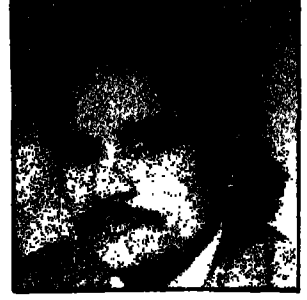
- ۱۷/اکتوبر ۱۹۵۶ء بجبراؤں، مرادآباد (یوپی)
- ایم۔ اے (علیگ) اردو شاعری میں پیکر تراشی کا مطالعہ ۱۹۷۲ء سے تا حال۔ پی ایچ ڈی کا موضوع ہے
- صدف سمندر (شعری مجموعہ زیرِ طبع) چشم ددرن (مضامین زیرِ ترتیب)۔ مدیر: حرف زار
- ۴۔ اکبر مارکیٹ، دودھ پور، سول لائنز، علی گڑھ

◆

جب مری سمتوں سے انجانے سفر الجھا کئے
برگ و گل سے جسم و جاں شاخوں سے پر الجھا کئے

ذہن سے آبادیاں، دل سے کھنڈر الجھا کئے
خشک اور ویران آنکھوں سے یہ گھر الجھا کئے

ہم "خرد آسیب" جب بھی راہِ دل میں آئے ہیں
عزم سے انکار اور قدموں سے ڈر الجھا کئے

ایک مدت تک کئی باگیں رہیں "طوفاں سوار"
ایک مدت تک ہواؤں سے شجر الجھا کئے

کل مرے خاموش لفظوں سے بہت ہی دیر تک
تیرگی، تنہائیاں، دیوار و در الجھا کئے

◆

کشادہ دل ہیں کہ ہم کو پناہ کوئی نہیں
ہمارے ساتھ گدا، بادشاہ کوئی نہیں

نفی و جمع کے مابین راہ کوئی نہیں
نہ میرا سر نہ گریبانِ شاہ کوئی نہیں

میں صاف بچ کے نکل آؤں تو حسد کرنا
تمہارا شہر ہے میرا گواہ کوئی نہیں

یہاں کدھر سے یہ بوئے دروغ آپہنچی
مرے قریب تو مرعوبِ جاہ کوئی نہیں

محاذ چھوڑ کے بھاگا ہوا ہوں صدیوں سے
میں لفظِ عجز ہوں میری سپاہ کوئی نہیں

میں خاک پہ کبھی اپنے قدم نہیں رکھتا
جہاں میں میرے سفر کا گواہ کوئی نہیں

یہ شہر ہے کہ کوئی دشت کہہ نہیں سکتے
مگر یہاں پہ بحالِ تباہ کوئی نہیں

بزعمِ خود جو نہ ہو رشکِ آسماں شہپر
"ادب جہان" میں ایسی کلاہ کوئی نہیں

◆

وسوسے، سرگوشیاں، خنجر اداس
میری ہی گردن پر میرا سر اداس

آنکھ خود بینی میں ہے اندر اداس
اور آنسو آنکھ کے باہر اداس

ذکر تھا اجداد کے اوصاف کا
ہو گیا پل بھر میں گھر کا گھر اداس

اور سن پچھلی صدی کی رونقیں
اور کچھ بوڑھوں سے ہو مل کر اداس

فتح کیا مالِ غنیمت کے بغیر
شاہ تو خوش ہے مگر لشکر اداس

کچے اور بے رنگ سے پھل دیکھ کر
لوٹ آیا پیڑ سے پتھر اداس

کیا کوئی خوشبو اکیلا کر گئی
یک بہ یک کیوں ہو گئے شہپر اداس

روانق شہری | عبدالغفار خان

- ۲۰/اپریل ۱۹۵۲ء جھریا ضلع دھنباد (بہار)
- پوسٹ گریجویٹ آرٹس (اردو ادب) گریجویشن (کامرس) | لکچرار
- کالی دھرتی کی غزلیں (شعری مجموعہ) آتش سبز (زیر ترتیب)
- شعبۂ اردو، آر ایس پی کالج جھریا، دھنباد (بہار)

Dr. Zakir Husain Library • J.M.I. New Delhi
Jamia Nagar

◆

ﻧﯽ مرے لمحوں کا نتیجہ سن لے
یرے وقت کا تو مجھ سے قصیدہ سن لے

سی میں شب و روز سسکتے ہیں پیڑ
ا آندھی کی نہیں برگ شکستہ سن لے

ساحل پہ نہیں حادثہ امکانی
زاری سی ہے ابھی تہہ دریا سن لے

ت مجھ میں ابھی سمتِ سفر روشن ہے
پھڑاتا ہے بہت کوئی پرندہ سن لے

با موجود علامت ہے میرے ہونے کی
ی نام و پتہ کچھ نہیں میرا سن لے

◆

شفیق رُت کو مزاجِ برہم پکارتا تھا
ہواؤں کو اک چراغِ مدّھم پکارتا تھا

وہ خوش گلو ہے حیات پیوندِ خاک ہو کر
بلند چھت سے جو اسمِ اعظم پکارتا تھا

وہ اپنی سانسوں کے زیر و بم سے کہیں تھی غافل
مجھے مہکتے بدن کا موسم پکارتا تھا

رگوں میں اس کی ہوس کی بجلی چمک رہی تھی
فرشتہ خو کو گناہِ آدم پکارتا تھا

میں دل کے ٹھنڈے سے ایک گوشے میں بیٹھ جاتا
لہو کا پیپل بنامِ گوتم پکارتا تھا

پھٹی نگاہوں سے دیکھتے تھے عزیز میرے
بڑی محبّت سے جب مرا غم پکارتا تھا

◆

وہ جنگجو صف شکن جو خنجر سمیٹتا تھا
مکاں میں آ کر اُداس منظر سمیٹتا تھا

تعلق اس کا نہیں تھا میرے لہو سے لیکن
نہ جانے کیوں دکھ مرا برابر سمیٹتا تھا

نہ جانے کس سمت کی ہوا تھی کہ جس کی شہ پر
پتنگ کی ڈور مجھ سے بہتر سمیٹتا تھا

کسی تصادم کی شکل واضح نہیں تھی لیکن
فساد کی لُو میں اپنے اندر سمیٹتا تھا

بگڑ کے بھی اس میں کچھ سنورنے کی خو تھی رونق
رفیق لمحوں کو خود بکھر کر سمیٹتا تھا

پرکاش تیواری

○ سیالکوٹ ....

○ ایم۔ اے (اردو) امرتسر | سرکاری ملازمت

○ شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے

○ ڈی۔ ۵۱، پٹیل دھام، سردار پٹیل مارگ، نئی دہلی

◆

دل کو پہلے لہو لہو کرنا
پھر بہاروں کی آرزو کرنا
بھول بیٹھا ہے خود کو وہ شاید
آئینہ اس کے روبرو کرنا
زندگی ہے کہ دشت ظلمت میں
اپنے سائے کی جستجو کرنا
کیا یہی ہے حیات کا حاصل
نوحۂ خونِ آرزو کرنا
اس کو اس طرح پا سکو گے کہاں
دل کی آنکھوں سے جستجو کرنا
غم دل نے سکھا دیا پرکاش
میر کی طرح گفتگو کرنا

◆

تھا آئینے کا عکس، عکس میں رہا
میں تیری روح، تیرے لمس میں رہا
سمجھ سکا نہ میں فریب آئینہ
کہ عکس ایک اور عکس میں رہا
مہک سکا نہ گل کی طرح کھل سکا
میں زیست کے عجیب حبس میں رہا
عجیب بے کلی میں زندگی کٹی
مرا دھیان ایک شخص میں رہا
پرکاش رنگ رنگ ہے جدا ترا
تو زندگی کے کیسے رقص میں رہا

◆

جاگتی حسرتوں کا پودا ہوں
غم کے چھینٹوں سے اور نکھرا ہوں
قافلہ میں اداسیوں کا ہوں
اپنے ہی جسم میں بھٹکتا ہوں
اندھی لہروں کے بیچ اترا ہوں
زندگی کا نیا تقاضا ہوں
جو پلٹ کر کبھی نہیں آتا
میں اسی پل کی راہ تکتا ہوں
یوں بھی چھائے ہیں درد کے بادل
اپنے اندر گرج کے برسا ہوں
روندتے ہیں مجھے سبھی پرکاش
درد کی راہ کا اندھیرا ہوں

◆

چمن کے پتے پتے پر خزاں کے سائے بیٹھے ہیں
ہوا کے زرد جھونکوں سے شجر گھبرائے بیٹھے ہیں

حوادث کے مسافر درد کے ہمسائے بیٹھے ہیں
ہمارے دل کے آنگن میں غموں کے سائے بیٹھے ہیں

دیارِ فکر میں ٹوٹے ہوئے یہ گھر امیدوں کے
اندھیروں میں دلِ آشفتہ کو الجھائے بیٹھے ہیں

سلگتی ریت فریادی ہے لیکن کیا کرے کوئی
برستے ہی نہیں بادل جو سر پر آئے بیٹھے ہیں

سنہرے شہر میں پرکاش ہر جانب ہے یہ عالم
سیاسی سازشوں کے ناگ پھن پھیلائے بیٹھے ہیں

عبدالاحد ساز
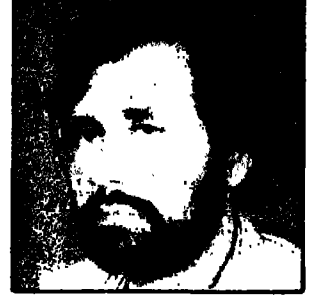
○ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۴۰ء بمبئی
○ بی۔ کام (بمبئی یونیورسٹی) ڈپلوما کمپیوٹر پروگرامنگ | کپڑوں کی تجارت
○ کرن کرن امید (شعری مجموعہ زیر ترتیب)
○ محمد حاجی آدم اینڈ کمپنی، ۸۴ - چکلا اسٹریٹ، بمبئی ۳

حمد

میں ریگِ زیست پہ ڈھلتا سا برگِ آوارہ
تو شاخِ ہست پہ کھلتا سا پھول کی مانند

تو، ایک پیکرِ معنیٰ، سراپۂ اظہار
میں لوحِ زیست پہ حرفِ فضول کی مانند

تو اک طلوع - مثالِ فروغِ فکرِ جواں
میں اک غروب - نگاہِ ملول کی مانند

میں انتشار سا اِک عرضِ بدعا کی طرح
تو اک سکون دعا کے قبول کی مانند

تو میری ذات کے ظلمت کدے میں در آیا
فلک سے نورِ ازل کے نزول کی مانند

مرا وجود تھا اک دیارِ جہل و دروغ
تری نمود، ظہورِ رسول کی مانند

تڑپ اٹھا تو، مرے نفس میں سعی کی طرح
سمو گیا مری جاں میں حصول کی مانند

میں تھا شکستہ و مغرور، جُرم کی صورت
ترے طفیل ہوں قائم اصول کی مانند

میں جسم و روح کے مابین پردگی کی مثال
تو - آتما کے بدن میں حلول کی مانند

◆

جو کچھ بھی یہ جہاں کی، زمانے کی، گھر کی ہے
روداد، ایک لمحۂ وحشت اثر کی ہے

پھر دھڑکنوں میں گذرے ہوؤں کے قدم کی چاپ
سانسوں میں اک عجیب ہوا پھر اُدھر کی ہے

پھر دور منظروں سے نظر کو ہے واسطہ
پھر ان دنوں فضا میں حکایت سفر کی ہے

پہلی کرن کی دھار سے کٹ جائیں گے یہ پر
اظہار کی اڑان فقط رات بھر کی ہے

ادراک کے یہ دکھ، یہ عذابِ آگہی کے دوست
کس سے کہیں خطا نگہِ خود نگر کی ہے

وہ اَن کہی سی بات، سخن کو جو پُر کرے
ساز اپنی شاعری میں کمی اُس کسر کی ہے

◆

بند فصیلیں شہر کی توڑیں، ذات کی گرہیں کھولیں
برگد نیچے، ندی کنارے، بیٹھ کہانی بولیں

دھیرے دھیرے خود کو نکالیں اس جکڑن جیون سے
سنگ کسی آوارہ منش کے ہولے ہولے ہولیں

فکر کی کس سرشار ڈگر پر شام ڈھلے جی چاہا
جھیل میں ٹھہرے اپنے عکس کو چومیں، ہونٹ بھگولیں

ہاتھ لگا بیٹھے تو جیون بھر مقروض رہیں گے
دام نہ پوچھیں درد کے صاحب! پہلے جیب ٹٹولیں

نوشادر، گندھک کی زباں میں شعر کہیں اس یُگ کے
سچ کے نیلے زہر کو لہجے کے تیزاب میں گھولیں

اپنی نظر کے باٹ نہ رکھیں ساز ہم اک پلڑے میں
بوجھل تنقیدوں سے کیوں اپنے اظہار کو تولیں؟

◆

چھڑے بھی تار مگر بے بسی کے جال بنے
اُلجھ کے رہ گئی آواز، سُر نہ تال بنے

کسی کی آنکھ سے ٹپکا تھا دل میں لمحۂ درد
ہماری عمر کے سرسبز ماہ و سال بنے

کبھی فضائے تخاطب میں دوڑ جائے کرن
یہ راہ و رسم کبھی غایتِ وصال بنے

سنوارنا کوئی آساں نہیں ہے کاکُلِ فن
ذرا ہوا سے بھی اُلجھے تو بال بال بنے

وہ متفق بھی رہے، اختلاف بھی تھا انھیں
مزے کے لوگ تھے جو میرے ہمخیال بنے

فصیلِ خواب ہے مابین دو سمندر کے
بس ایک موجِ صدا ہے کہ اتصال بنے

یہاں تک آ کے معطل ہے وقت کی شطرنج
نہ ذہن مات ہی دے دے، نہ دِل ہی چال بنے

فنا کے سائے جو سمٹیں، بقا کی دھوپ کھلے
مِٹے جو شکل مری — "وجہِ ذوالجلال" بنے

حامد اقبال صدیقی

- ۱۰ مئی ۱۹۵۸ء (بمبئی)
- بی۔ اے — بمبئی یونیورسٹی
- کیشئر
- ۲۲۸ — ۲۰۲ دینا ناتھ بلڈنگ، تیسرا منزلہ، روم نمبر ۱۲، فاکلینڈ روڈ، بمبئی ۴

◆

مجھے بے رنگ اور بے رس نفی جیون بتانا ہے
تمہیں تو اپنے گرد و پیش اک موسم سجانا ہے

چلو ہم اجنبیت کی ابھی سے عادتیں ڈالیں،
کہ کل پہچان کی سب ڈوریوں کو ٹوٹ جانا ہے

کبھی سب کائناتی سلسلے بے کار لگتے ہیں،
کبھی اک ہوک اٹھتی ہے نیا عالم بسانا ہے

بتاؤ مصلحت، جذبہ، تاثر کس کو کہتے ہیں،
مجھے کس بات پر رونا ہے کس پر مسکرانا ہے

وہ اک آہنگ کی صورت ہے سانسوں کے تسلسل میں
کوئی موسم، کوئی رُت ہو اسے ہی گنگنانا ہے

سفر جاری سہی لیکن پڑاؤ بھی ضروری ہے
مسلسل جاگنا، چلنا، میاں تھکنا تھکانا ہے

◆

مجھے بھی خود سے تکلم کا گیان دے اللہ
شعور جاگ اُٹھا ہے زبان دے اللہ

تری زمین پہ چہرے بدلنا عام ہوا
تو میری رُوح پہ کوئی نشان دے اللہ

کسی بھی سمت چلیں سائے جسم جھلسائیں
کہاں تلک یہ کوئی امتحان دے اللہ

ہے سر پہ پھیلی ہوئی چھت اُڑان میں حائل
تو سر سے بوجھ ہٹا لامکان دے اللہ

میں اپنے دَور کا غالب نہ میرؔ کہلاؤں
مری غزل کو نیا اک بیان دے اللہ

◆

دُکھ شجر ہیں بے ثمر ہو جائیں کیا
کھلتے موسم میں مگر مُرجھائیں کیا

یہ بتاؤ کیا ہوا بستی کو ہے
اب تلک ہوتی ہے سائیں سائیں کیا!

آگے پیچھے دیکھنا تو ٹھیک ہے،
صف کہاں کی اور دائیں بائیں کیا

موسموں سے بچ رہیں عزت مآب
بلبلاتی چیختی "پرچھائیں" کیا

جُز ندامت کچھ نہیں جینا مگر
اس قدر مفلوج ہیں جھنجلائیں کیا

◆

فن کی میراث دی، سوچ شہپر دیئے شکریہ اے خدا
پھر زمیں تا فلک مجھ کو محصور کیوں کر دیا اے خدا

رنگ، خوشبو، ہوا، خواب، شبنم، شفق، چاندنی بخش دے
میرے موسم مری دسترس میں رہیں لے خدا، اے خدا

دیکھ لے اے خدا وقت میرے لئے ایک پل نہ رکا
ایک دن میں یہی بات دہراؤں گا دیکھنا اے خدا

دو رنگ ساتھ چلتی رہیں خواہشیں اور محرومیاں
کچھ پتہ ہی نہیں ہے کہاں کھو گئی ہر دعا، اے خدا

نُور کی اک کرن آنکھ کے راستے دِل تلک آ گئی
اور کوئی مرے جسم و جاں سے الگ ہو گیا اے خدا

اسد رضوی

○ ۱۳؍ فروری ۱۹۵۴ء محمد پور مبارک ضلع مظفر پور (بہار)
○ بی. ایس. سی (بہار یونیورسٹی) کمپیوٹر پروگرامنگ (دہلی) ڈپلومہ؍ ڈیمانسٹریٹر شعبہ نباتا...
○ لہو کی شاخ (نوحے) ۱۹۸۲ء - پلکوں کے صدف (شعری مجموعہ زیر ترتیب) محفل نقد...
○ شعبہ بوٹنی، ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کالج۔ مظفر پور (بہار)

◆ ◆ ◆

لہو کی شاخ سے اُلجھا ہُوا ہوں
کہیں ٹوٹا کہیں بکھرا ہُوا ہوں

زمانہ گردشوں میں گھومتا ہے
جہاں تھا میں وہیں ٹھہرا ہُوا ہوں

تمہاری سانسوں سے خوشبو کی صورت
تمہارے جسم میں اُترا ہُوا ہوں

کبھی حیرت سے نہ یہ دیکھ مجھکو
ترا سوچا ترا سمجھا ہُوا ہوں

یہاں کے حادثے میں ایک میں بھی
مقدر کی طرح لکھا ہُوا ہوں

مقدر ان دنوں بگڑا ہوا ہے
خدا شاہد مرا رُوٹھا ہُوا ہے

تمہارا گھر کسی زنجیر جیسا
ہمارے پاؤں سے لپٹا ہُوا ہے

تعاقب کیا کرے کوئی بھی اس کا
وہ مثلِ آسماں پھیلا ہوا ہے

کہ تم بھی مبتلا ہو کشمکش میں
ہمارا ذہن بھی اُلجھا ہُوا ہے

عبث حیران ہو مقبولیت پر
اسدؔ اس شہر میں رُسوا ہُوا ہے

زمیں اک عمر سے سوکھی ہوئی ہے
یہاں برسات بھی رُوٹھی ہوئی ہے

مُسافر کی طرح میں جا رہا
مری منزل کہیں ٹھہری

بدن پہ دُھوپ کی چادر ہے پھیلی
لہو میں چاندنی گھولی ہوئی ہے

مقاومت نشانِ زند...
عقیدت پاؤں سے لپٹ...

تمہیں دیکھوں بھی تو کس طرح دیکھوں
نظر حالات سے اُلجھی ہوئی ہے

بلراج کمار [بلراج کمار بخشی]

○ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۹ء

○ بی ایس سی۔ ایل ایل بی | ذاتی کاروبار

○ مجموعۂ کلام زیر ترتیب ہے

○ پلاٹ نمبر۔ ۴، ادہمپور ۔ ۲ (جموں کشمیر)

◆

ہمارے بیچ کوئی حد بھی قائم ہو تو اچھا ہے
کہ یہ ملنا ملانا اور کچھ کم ہو تو اچھا ہے

عجب لگتا ہے پہچانی ڈگر پر بے خطر چلنا
پرائے شہر میں کوئی نہ محرم ہو تو اچھا ہے

بہاریں دیکھ لیں میں نے خزائیں دیکھ لیں میں نے
رُتوں کے پھر نہ آنے کا ہی موسم ہو تو اچھا ہے

مری دلجوئی کرتے کرتے مر جائے گا وہ گھٹ کر
وہ بے مطلب ہی اک دن مجھ سے برہم ہو تو اچھا ہے

تری یادوں کا سرمایہ کسی کام آئے گا بھی آخر
نمک ہو جائے تو اچھا ہے مرہم ہو تو اچھا ہے

وہ کیا سوچے اگر بلراج پر سب راز کھل جائیں
کہ ان الجھے ہوئے دھاگوں میں ریشم ہو تو اچھا ہے

◆

ہونٹوں پر ہر وقت شکایت رہتی ہے
یہ کیسی ان دنوں طبیعت رہتی ہے

اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہوں
اب مجھ کو فرصت ہی فرصت رہتی ہے

میں تو ہمیشہ اپنا کچھ بھول آتا ہوں
گھر واپس جانے کی صورت رہتی ہے

تیز ہوا کے جھونکے سے تم آتے ہو
دیر گئے تک گھر میں قیامت رہتی ہے

اچھا ہے تاریکی اوڑھ کے سو جاؤ
روشنیوں میں سب کو مصیبت رہتی ہے

دشت میں جیسے تنہا چاند بکھر جائے
کچھ ایسی بلراج کی حالت رہتی ہے

◆

خشک پتوں کی یہ مجبوری طرفداری نہ تھی
تم نے کیسے اپنی دنیا سے الگ جانا مجھے —

تیرا دیواروں پہ لکھنا تو غلط تھا ہی مگر
بس یونہی بیٹھے بٹھائے دھک سے رہ جاتا ہے دل

اک الگ ہی کیفیت میں گردشِ افلاک تھی
اب تو سر پر آسماں بھی بوجھ سا لگنے لگا

آندھیوں کے ساتھ ہو لینے میں دشواری نہ تھی
میرے حصے میں کبھی مدہوشی تھی سرشاری نہ تھی

میرا خود سے کہہ نہ پانا بھی سمجھداری نہ تھی
زندگی پہلے کبھی ایسی تھکی ہاری نہ تھی

نیند کا عالم نہیں تھا اور بیداری نہ تھی
ان دنوں دیوار و در سے اتنی بیزاری نہ تھی

اب کے ہیں بلراج! جو دشمن قطار اندر قطار
ان میں تو پہلے کسی سے دوستی یاری نہ تھی

شاہد لطیف
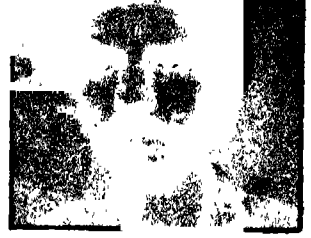
○ ۱۳ مارچ ۱۹۵۹ء بھساول ضلع جلگاؤں (مہاراشٹر)
○ بی کام (بمبئی یونیورسٹی) | اکاؤنٹنٹ
○ ۲۸۰۲/۱۷۱، پنت نگر، گھاٹ کوپر (ایسٹ) بمبئی ۷۵

◆

رگڑتے ہیں ہم اپنی ایڑیاں ہر دم سمجھتے ہیں
ابھی زندہ ہیں لیکن موت کا عالم سمجھتے ہیں
سلگتی دھوپ نے ہر موڑ پر دوزخ بچھا دی ہے
بہت نزدیک ہے اب چھاؤں کا موسم سمجھتے ہیں
ہماری اولیں خواہش یہی ہے چین سے جی لیں
ہم ایسے لوگ اپنی آزمائش کم سمجھتے ہیں
مگر اس جسم و جاں کا جشن بھی مقصود ہے بھائی
سمجھتے ہیں ہم اپنی روح کا ماتم سمجھتے ہیں
اسی نے کاٹ دی ہیں امن کی ساری جڑیں لیکن
اسی کے ہاتھ میں ہے امن کا پرچم سمجھتے ہیں
نہیں اس بار بھی اپنے تحفظ کا یقیں کوئی،
مگر اس بار بھی بے جان کا جوکھم سمجھتے ہیں
ہماری عمر کی تاریکیوں میں اس کی قربت کے
ہیں کتنے روشنی بردار لمحے ہم سمجھتے ہیں

◆

سب کے چہرے کھل اٹھے تھے اس نے گھر مہکایا تھا
جب بھی الجھی ڈور کا کوئی ایک سرا ہاتھ آیا تھا
شاید تیری سوچ سے بچنا بس ایسے ہی ممکن تھا
خود کو کتنے غیر ضروری کاموں میں الجھایا تھا
ننگی ننگی تصویروں نے دیواروں کو ڈھانپ لیا
دیمک چاٹ رہی تھی جس کو تہذیبی سرمایہ تھا
رشتوں کی مجبوری کیا تھی، ہم سے پوچھو کتنی بار
اپنے آپ کو مجرم ہم نے دانستہ ٹھہرایا تھا
دھوپ کے ڈر سے لوگ گھروں میں سہمے سہمے بیٹھے تھے
میں چل نکلا، دیکھا سر پہ دھوپ نہیں تھی سایہ تھا
خاموشی بے محل تھی اپنی اور صدائیں بے معنی
آوازوں کے شہر میں ہم نے کیا کھویا؟ کیا پایا تھا؟

◆

کیسی بستی ہے؟ کسی کا کوئی محرم ہی نہیں
خود میں مسرور ہے ہر شخص کوئی غم ہی نہیں
روز مرتا ہوں مگر کون ہے رونے والا
موت کیسی ہے کہ اس موت پہ ماتم ہی نہیں
مدتوں بعد بھی جسموں میں تغیر نہ ہوا
ایک پت جھڑ ہے، کوئی دوسرا موسم ہی نہیں
ہم سے قائم ہے شب و روز کی گردش کا نظام
کیسی دنیا؟ تری دنیا میں اگر ہم ہی نہیں
غیر معمولی خوشی ان کے مقدر میں کہاں
جن کے حصہ میں کوئی جان کا جوکھم ہی نہیں
دل، کہ دوچار ہے اک درد سے، کیا کیجے مگر
زخم ایسا ہے کہ اس زخم کا مرہم ہی نہیں

◆

کیوں دن کا اختتام بھی قاتل ہے ان دنوں؟
کیوں ذہن کل کی صبح سے غافل ہے ان دنوں؟
آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے ہیں جلوہ گر
اک شخص آئینہ کے مقابل ہے ان دنوں،
مجھ کو بھی اپنے حال کی بالکل خبر نہیں
تو بھی مرے خیال سے غافل ہے ان دنوں
ہر سوچتا دماغ، ہر اک دیکھتی نظر
لمحوں کی بھاگ دوڑ میں شامل ہے ان دنوں
لیکن یہاں پہونچ کے سفر رائیگاں لگا،
پیش نظر امیدوں کی منزل ہے ان دنوں
احساس، بے حسی کی پناہوں میں کھو گیا
سینے پہ جیسے برف کی اک سل ہے ان دنوں

شائستہ یوسف

- ۱۵ر جون ۱۹۵۲ء
- ایم۔ اے (فلسفہ) بمبئی یونیورسٹی۔ ایم۔ اے (اردو) فائنل بنگلور یونیورسٹی
- گلِ خودرو (شعری مجموعہ) ۱۹۸۵ء
- ۲۵ - چناسوامی، مدلیار روڈ، ٹاسکر ٹاؤن، بنگلور

ایک نظم

عجیب گھٹن کا احساس ہو رہا ہے ،
چاہتا ہے سینے میں رکتے ہوئے دم کو،
زوں میں منتقل کر دوں ـــــ
ژں ، جلاؤں ـــــ
وں تلے بچھے ہوئے سرخ قالین کو ،
ندر کی تہہ میں غرق کر دوں ـــــ
رکیوں اور دروازوں ،
پڑے مخملی پردوں کو ،
، لگادوں ـــــ
جل کر راکھ ہو جائیں ،
اکھ میں پھر آگ لگا دوں ـــــ
ازوں اور دریچوں ،
اسنک سے ،
ہ ریزہ کر دوں ـــــ
ری عینک کو ،
کی سے باہر پھینک دوں ـــــ
ہے آنکھوں پر سجالو ،
یں نور بن کر تمہاری پتلیوں میں ،
رجاؤں ـــــ
تم بے اختیار سسکیاں بھر کر روؤ ،
یں قطرہ قطرہ آنسوؤں میں ،
اکر تمہارے سینے میں سما جاؤں ـــــ

ایک نظم

پتہ نہیں تم کتنی صدیوں سے میرے ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہو،
برفیلی گھاٹیوں سے اتر کر ،
گنجان آبادیوں سے بچ کر ،
ویران جنگلوں میں تم نے پناہ لی ـــــ
اور میں شہر کی طرف لوٹ گئی ـــــ
معلوم نہیں تم نے کتنے انجان منظروں سے دوستی کر لی،
شاید میرے بارے میں ،
تمہاری رائے اچھی نہیں تھی ـــــ
وقت کے نشیب و فراز نے ،
تمہیں پہاڑیوں کی بے درد اور خوفناک ،
باہوں میں ڈھکیل دیا ـــــ
اچانک برسوں بعد تمہاری ملاقات ،
میرے ہوش اڑا لے گئی ـــــ
مگر تم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا ،
بربادی تمہارا مقدر تو نہیں تھی ـــــ
شک اور ضد آج تمہیں ،
کہاں لے آئے ہیں ـــــ
دیکھو تم کس دوراہے پر کھڑے ہو،
سمندر ملنے کے لئے بے چین ہے ـــــ
اب بھی وقت ہے ،
میرا آنچل تھام لو،
میں تمہارا رخ آج بھی موڑ سکتی ہوں ـــــ

ایک نظم

تمہارے بارے میں ،
سوچتے ہوئے ـــــ
مجھے جو لطف ملتا ہے ،
کیا تم بھی اس لذت سے
آشنا ہو ؟
ہر لمحہ تمہاری خوشبو
میرے الفاظ سے لپٹ کر ،
ایک نئے شاہکار ،
کو جنم دیتی ہے ـــــ
اور پھر جب بھی تم سے ملتی ہوں
تو جذبات سے عاری آنکھوں
اور کھردرے ہاتھوں کو دیکھ کر ،
ایسا محسوس ہوتا ہے ،
یہ تخلیق تمہاری نہیں ہے ـــــ

حیدر صفت

○ ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء

○ ایم۔ اے | لکچرر، شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی

○ میراجی اور ن م راشد کے اثرات نئی اردو شاعری پر" ریسرچ کا موضوع" اردو گیت اور میراجی [زیر ترتیب]

○ ۱/۱۱ مدار تلا لین، ہاوڑہ ۷۱۱۱۵۱

◆

مری نگاہوں میں جھانک کر بھی اداس لکھے

مرے لبوں پہ سمندروں کی وہ پیاس لکھے

جو مجھ کو دیکھے نظر بچا کے گذرتا جائے

مگر زمیں پر وہ اپنے پیروں سے آس لکھے

یہ میں کہ رستے کی دھول ہی سے اٹا ہوا ہوں

وہ مجھ کو دیکھے تو خوف لکھے ہراس لکھے

مری انا سے وہ ہار کر بھی نہ ہار مانے

ہر اک دشا سے مجھے یونہی بے لباس لکھے

میں چاہتا تھا فسانہ لکھوں مگر وہ روٹھا

وہ سوچتا ہے کہ اب کوئی اتہاس لکھے

◆

اک قدم پاس کئی صدیوں کی دوری اور میں

رات چیختے ہوئے کچھ خوابوں کی تلخی اور میں

پھر اسی زاویۂ فکر و نظر کا رونا

پھر وہی شام سے پہلے کی سیاہی اور میں

خوف آہٹ کا سسکتا ہوا سایہ اور تم

چاند، خوشبو، کسی خواہش کی جوانی اور میں

کیسے منظر تھے چرا لائے ہیں آئینے ہی

اب یہ خاموشی یہ تنہائی اداسی اور میں

کسمساتی ہوئی لہریں وہی پہلو وہی گیت

ساحلی قصبے کی صندل سی وہ لڑکی اور میں

پانیوں پہ کہیں پھسلن نہ کہیں نقشِ قدم

ڈوبتے شخص کی بس آخری ہچکی اور میں

◆

خواب پلکوں سے لبوں سے گئی فریاد کہ بس

ہم ہوئے ایسے خرابے میں یوں آباد کہ بس

اجنبی شہر، سیہ شام، کڑی تنہائی

اور ایسے میں کوئی آئے مجھے یاد کہ بس

اس کی آواز مرے پیچھے نہ آئی ہوتی

اس طرح سے تو نہ ہوتا کوئی برباد کہ بس

میں نے مڑ کر بھی کئی بار پکارا اس کو

جانے کس کھوج میں گم ہو گیا ہمزاد کہ بس

کس نے احساس کی دہلیز پہ دستک دی تھی

شکل تک بھول گیا ایسی تھی بے داد کہ بس

راستہ جاتا ہے پھر سے گھنے جنگل کی طرف

ہم جزیروں میں ہوئے اس طرح آزاد کہ بس

اس کی جنت تو خیالی نہ تھی حیدرؔ لیکن

پھر بھی بدبخت تھا اس درجہ وہ شداد کہ بس

◆

میں کسی کے ذہن کے پاس ہوں مجھے سوچتا کوئی اور ہے

مری آرزو کوئی اور ہے مجھے چاہتا کوئی اور ہے

وہی ایک ساعتِ بے عمل کوئی نام جس کو نہ دے سکا

مرے دشمنوں کو خبر نہیں اسے جانتا کوئی اور ہے

اسے بھول کر نہ بھلا سکوں یہ مقام کیسا ہے کچھ کہو

وہ شبیہہ خواب و خیال سی جسے دیکھتا کوئی اور ہے

میں ہوا نہیں میں صدا نہیں میں ہوں جسم جس کی ہیں خواہشیں

اسے چھو لوں عزم تو ہے مگر مجھے ٹوکتا کوئی اور ہے

میں کتابِ زیست کے حاشیے پہ لکھا ہوا کوئی لفظ سا

کہیں گم کسی کے خیال میں مجھے ڈھونڈتا کوئی اور ہے

اے دھنک بدوشِ فلک بتا ہے مری طرح وہ اداس کیا

کیوں مری نگاہوں میں شام سے یونہی جھانکتا کوئی اور ہے

جو لپٹ گئے کبھی دھند سے انھیں منظروں کی کہانیاں

میں کہوں تو بزم میں نشاط میں مجھے ڈانٹتا کوئی اور ہے

مرا غم زمانے کا غم نہیں کہ ہے زمانہ مجھ سے پرے کہیں

میں شکستہ خوابوں کا نوحہ ہوں مجھے جوڑتا کوئی اور ہے

مرا ساتھ دیتا وہ کس طرح اسے ہمدمی کا ہے شوق بس

مری منزلیں ہیں وہی تو کیا مرا راستہ کوئی اور ہے

نقد و نظر

انگلیوں سے خون :- علی ظہیر کا دوسرا شعری مجموعہ ہے [رات کے ہزار ہاتھ ، ۱۹ء] اس مجموعے میں شامل نظموں اور غزلوں کے اشعار کا لہجہ، اسلوب اور موضوعات قدرے مختلف اور مولود و ماخذات موجودہ عہد کی وہ سچائیاں ہیں جن کا تعلق براہ راست ٹوٹتے، بکھرتے انسان سے ہے زوال آمادہ تہذیبوں کی ازسرنو ترتیب اور بنیادی اقدار کو نئی روح دینے کی خواہشات سے ہے ۔ علی ظہیر کی شاعری ایک ایسا زندگی نامہ ہے جس میں مجروح عصر اپنے کرب کا نوحہ پڑھ رہا ہے ۔ اس شاعری میں عصری ذہنی گونج بھی ہے اور ایک ایسے انقلاب کی دھمک بھی جو انسان کے لئے راہ نجات بن سکے ۔ زندگی اور موت کے حوالے سے احساسات کو نئے نئے پیکر دینے میں علی ظہیر کامیاب نظر آتے ہیں ۔ خود کلامی اور خطیبانہ لہجے کی فضابندی میں تجسس، سوال، تشکیک اور خواب، منظر ناموں کی صورت ابھرتے ہیں ۔ نظموں کے عنوانات، فن پارہ کی ترتیب و تشکیل لفظیات و تراکیب نظموں کا شعری آہنگ، علامتیں، استعارے، یہ سب کچھ "انگلیوں سے خون" کی شاعری کو قابل مطالعہ بناتے ہیں ۔ پھر یہ کہ اس نوع کی شاعری کے تانے بانے کچھ الگ ہی ہوتے ہیں، علی ظہیر نے حساس فن کار کی دردمندی کے اظہار کو جو تانے بانے دیئے ہیں ان میں نثری شاعری زیادہ ابھر کر آئی ہے ۔

یہاں نثری شاعری کا جواز بنا ہے کہ شدت آثار لہجہ، مروجہ ہیئتیں سہار نہیں سکتیں حالانکہ مجموعے میں چند غزلیں اور اشعار بھی موجود ہیں لیکن ان میں بھی نظموں کا سا آہنگ اور اور لکا نہ ہے ۔ موضوعات و مواد کی سطح بھی نظموں ہی کی طرح ہوئی ہے غزلوں کے اشعار کا خارجی آہنگ کہیں کہیں لرزتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔ علی ظہیر کے نئے شعری مجموعے کی پذیرائی کے امکانات ہیں ۔

صفحات ۱۰۴، قیمت ۲۵ روپے ● مطبوعہ ۱۹۸۵ء ● ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں، نئی دہلی

خیمۂ خواب :- اسعد بدایونی گذشتہ کئی برسوں سے خوب سیرت معیاری غزلوں کا تخلیقی میلہ سجائے ہوئے ہیں جہاں زندگی کے مختلف رنگ طرح طرح کے پیکروں میں پل پل بدلتے گذرتے وقت کی کہانیاں سنا رہے ہیں ۔ زندگی رنگ، پیکر، وقت اور کہانیاں یہ سب کچھ اسعد بدایونی کی شاعری کا حصہ ہیں جو شعور و لاشعور کی کشمکش اور خرابوں کے تواتر سے جنم لے رہے ہیں ۔ اپنے آپ کو اکائی کی صورت محسوس کرنا اور پھر تیز رفتار وقت میں بکھر جانا کبھی تماشا ہونا تو کبھی تماشائی بن جانا، زمین و آسمان کے تمام اسرار کے ادراک کی خواہش تو کبھی ایک نقطہ میں ان دونوں کا سمٹ آنا یہ سب کچھ اسعد کی شاعری میں موجود ہے، وہ ایک ایسے تازہ کار فن کار ہیں جو اپنی لفظیات و تراکیب کے ذریعہ مفاہیم کے نئے ابعاد ابھارتے ہیں ۔ مجرد تراکیب کے ذریعہ خیال کی ترسیل اور شعری قدر کی تعبیر کرنا فن پارے کو تخلیقی تازگی دینا اور زندگی کی ہر تصویر کو اپنی آنکھ اور زاویے عطا کرنا اچھی شاعری کی علامتیں ہیں، بڑی شاعری کے امکانات ہیں، نئی شاعری کا معیار ہیں ۔ اسعد بدایونی کی شاعری کو امکانات کی شاعری کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے یہاں مروجہ لفظیات میں تخلیقی پیوندکاری، اثر پذیر ہے جہاں نہ تو الجھاوے ہیں اور نہ ہی بوجھل تقلیدی رویے، بلکہ شعر کی کسی متعین ساخت میں پیکری لفظوں کی آمد ان کی ترتیب اور پھر شعری آہنگ یہ سب کچھ قاری اور سامع پر خوشگوار اثرات مرتب کرتے ہیں ۔

اسعد کا غالب وسیلۂ اظہار غزل ہے تاہم خیمۂ خواب میں ۱۵ نظمیں بھی شامل ہیں ۔ ان نظموں کا مزاج اور تخلیقی فضا بندی وہی ہے جو کہ غزلوں کا خاصہ ہے ۔ علحدہ سے ان نظموں کا تجزیہ اسعد کی شاعری کو کوئی نیا رخ نہیں دے گا ۔

صفحات ۱۱۲ ● قیمت ۲۰ روپے ● مطبوعہ ۱۹۸۴ء ● ایجوکیشنل بک ہاؤس یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڈھ

سراب اندر سراب - پرتپال سنگھ کے پہلے شعری مجموعے پیش خیمہ [۱۹۸۱ء] پر میں نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا [شاعر ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام، مارچ ۱۹۸۱ء] "کہ بیتاب اپنی شاعری میں منفرد ہونے کی سمت سفر کر رہے ہیں ۔ وہ محسوسات کا جو اسلوبیاتی ڈھانچہ بناتے ہیں اس میں خود کسی نہ کسی طرح موجود ہوتے ہیں" نظمیں اور غزلیں بغور مطالعے کے بعد ان ٹھہرے ہوئے لمحوں کو متحرک کر دیتی ہیں جن سے شاعر خود جڑا ہوا ہے ۔ لمحوں کے تواتر میں "پیش خیمہ" سے "سراب اندر سراب" تک بیتاب نے خاصا متنوع تخلیقی سفر طے کیا ہے ۔ اس سفر میں نہ تو اصطلاحی حصار ہیں اور نہ ہی

بہت زیادہ چونکا دینے والا شعوری عمل عصری شاعری کی لفظیات وتراکیب علامتوں اور استعاروں میں اپنی سوچوں کو سجا دینے میں سادگی اور گہرائی ہے۔ اپنی روح کے آئینہ خانے میں زندگی کو مہمان کرنا' اس کے ہر رنگ کو علیحدہ کرنا اور پھر رنگوں میں خود کو بکھیر دینا' کبھی دائرہ ہوجانا تو کبھی محور بن جانا اور پھر بے معنویت کے دکھ سمندر میں گم ہوجانا۔ خواہشوں اور خوابوں سے الجھنا اور پھر بے خواب ہوجانا۔ یہ سارے تضادات اور پیچیدگیاں جب شعری تجربہ بن کر جمالیات کی شاعری میں ابھرتی ہیں تو بے پناہ غمناکی، یاسیت محرومی اور بے بسی کا احساس چمک اٹھتا ہے۔ خیال، الفاظ اور مزاج میں کہیں کہیں بے تعلقی اور جلد بازی سے فن پارہ اپنے مکمل وجود میں نہیں آپاتا اور درمیان میں کہیں رہ جاتا ہے' خصوصاً نظموں میں بعض موضوع و مواد کے اعتبار سے بہت اہم ہوسکتی تھیں لیکن الفاظ کے انتخاب وترتیب میں بکھراؤ نے انہیں غیر معمولی ہونے نہیں دیا۔ لیکن جمالیات کے یہاں جو تخلیقی امکانات ہیں ان سے یہ امید ضرور بنتی ہے کہ وہ اپنے آپ میں ابھی اور گہرے ہوں گے، اپنے علامتی اور استعاراتی نظام کو مزید سنواریں گے۔ انہیں الفاظ کی ترتیب اور تراش خراش پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

صفحات ۱۲۸ ● قیمت تیس روپے ● مطبوعہ ۱۹۸۴ء ● العطش پبلی کیشنز جموں

موسم زرد گلابوں کا ۔ شاہد میر، نئی نسل کے معروف شاعر ہیں جنہوں نے اپنے شعری سفر میں بتدریج تخلیقی امکانات کو ابھارا ہے۔ نئی شاعری کی نیشی زندگی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے بغیر اپنے عصر کی سچائیوں کو بھرپور شعریت کے ساتھ پیش کرنے کی فن کارانہ کوشش کی ہے، مزاج میں رچی بسی موسیقی اور نغمگی نے درد و کرب کو لذت آمیز بنا دیا ہے لیکن جہاں انہوں نے الفاظ کا غیر تخلیقی استعمال کیا ہے شعر محض اپنی ظاہری ساخت ان کردہ گیا ہے۔ نئی شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے شعریت کے فقدان کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ غزل کی مخصوص ساخت میں فلسفہ، معاشیات، لسانیات، سائنس اور منطق وغیرہ کے مسائل کو نئی تراکیب و لفظیات کے ساتھ سمو دینے کا عمل شاعری نہیں ہے۔ زندگی کی تفہیم کے لئے مختلف علوم ذریعہ ہیں۔ زندگی کا ہر پل اپنے آپ میں ایک دنیا ہوتا ہے' فن کار ان دنیاؤں کو بالکل مختلف سطحوں پر دیکھتا اور سوچتا ہے، وہ ایک ایک پل کی شدتوں سے براہ راست متاثر ہوتا ہے' اسے جذب کرتا ہے' خام مواد کو ہیئتوں میں جوں کا توں پیش کر دینا غیر تخلیقی اور غیر معیاری کام ہے۔ شاہد میر اس اعتبار سے اہم ہوسکتے ہیں کہ ان کے یہاں شعریت ہے۔ تخلیقی چمن بندی ہے جس پر رومانی فضا کے لہریئے خوش نما منظر بناتے ہیں۔ الفاظ کی شکست و ریخت یا ان کی گاڑھی تجریدیت یا پھر ڈھلے ڈھلائے مانوس مصرعوں اور تقلیدی ترکیب سازی کے بغیر سیال محسوسات کے سادہ اور پرکار پیکر بنانے میں تخلیقی ہنرمندی ملتی ہے جو اور گہری ہوتی جائے گی۔

صفحات ۱۳۶ ● قیمت ۲۵/روپے ● مطبوعہ فروری ۱۹۸۴ء ● نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن (یوپی)

شب : رنگِ نمو ۔ خالد سعید کا اولین شعری مجموعہ ہے جس میں غزلیں، آزاد نظمیں اور نثری نظمیں شامل ہیں خالد سعید کے تخلیقی سفر کی عمر کچھ زیادہ تو نہیں ہے تاہم موضوع و مواد کے تنوع اور فنی برتاؤ میں امکانات اور شعری اپج میں ایک طرح کی ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ یہاں وہاں مصرعوں اور ٹکڑوں میں کچا پن اور تخلیقی بے ساختگی کے ساتھ ساتھ مصنوعی پیوندکاری بھی موجود ہے لیکن اکہرے پن کے بجائے تہہ داری نے نظم و غزل میں نت نئے گل بوٹے بنائے ہیں شخصی اظہار اور ناگزیریت کو اپنے طور پر سوچنے اور تخلیقی روپ دینے کا عمل بھلا معلوم ہوتا ہے جہاں بہت زیادہ غیر تخلیقی اوڑھی ہوئی تجریدیت نہیں۔ خالد ابھی اپنے تجربوں میں بہت اندر تک اتر نہیں سکے ہیں یا پھر تجزیاتی زاویے' اطلاع نامہ سے بہت حد تک پاک نہیں ہوسکے ہیں یا پھر الفاظ و تراکیب کی سجائی نحوی ترتیب سے آزاد نہیں ہوسکے ہیں۔ بعض الفاظ اور ان کا استعمال الجھاوے پیدا کرتا ہے۔ ارتقاء پذیر شعری شخصیت میں مروجہ ہیئتوں سے انحراف کی کوشش بھی ملتی ہے جو نثری نظموں سے نمایاں ہے۔ اکہرے لفظوں کے پیکر یا پھر پیکروں سے ابھرنے والے استعارے اپنی پوری روح کے ساتھ جلوہ گر ہوں تو شعر بولنے لگتا ہے، خالد کے شعر گفتگو کرتے ہوئے معلوم تو ہوتے ہیں لیکن بھرپور یا دھیمی آواز کے بیچ سرگوشیوں میں — نوجوان خالد کو اپنے شعری امکانات میں ابھی بہت دور تک جانا ہے لفظوں کو نئے نئے مفاہیم دینا ہے، جمالیاتی حسن دینا ہے "شب : رنگِ نمو" ایک ذہین فن کار سے متعارف کرواتا ہے۔

صفحات ۱۱۲ ● قیمت ۱۵/روپے ● مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۵ء ● مسلم چوک، گلبرگہ [کرناٹک]

ابجد ۔ مظفر ایرج کا اولین شعری مجموعہ ہے جس میں نظموں غزلوں کے تخلیقی دھنک رنگ احساس افق پر خوبصورتی کے ساتھ بکھرے ہوئے

ہیں۔ ایرج کی شعری کائنات بہت وسیع نہ ہوتے ہوئے بھی دبیز معلوم ہوتی ہے۔ حواس کا داخلی اور خارجی رابطہ تجربوں، تجزیوں اور مشاہدوں کے ذریعہ جو تناسب بناتا ہے اس میں منفرد ہو جانے کا شعوری عمل نمایاں ہے لیکن عصری شعری رویوں کی تقلید کے باوجود انحراف کی کوششیں مجرد تراکیب اور علامتوں کے ذریعہ سے نئے تخلیقی ذائقوں کا احساس بھی دیتی ہیں۔ تقلید، انحراف اور انفرادیت کی کشمکش میں مواد، اظہار، لہجہ اور اسلوب روشن تو ہوئے ہیں تاہم ایرج کی سلیقہ مندی یہ ہے کہ انہوں نے نئی لفظیات یا الفاظ کی شکست و ریخت کے بجائے علامتوں اور استعاروں کے باہمی ارتباط سے نئے مگر متحرک پیکروں کو اجالنے کی سعی کی ہے۔ یہ کوشش لسانی سطح پر بھی ہے اور معنیاتی سطح پر بھی اس نوع کی ینا کاری سے غیر تخلیقی اور بے جوڑ تراکیب کا بھونڈا پن ظاہر ہو سکتا ہے اور مظفر ایرج اس سے بچ نہیں سکے ہیں لیکن بعض مقامات پر دہرے استعارے تازہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تجریدیت کون سے نئے شعری امکانات پیدا کر سکتی ہے! لیکن یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ نئے نئے، پیکروں کی تشکیل کے لئے، احساس و اظہار کی ترسیل کے لئے، شعر کو کائنات بنانے کے لئے اس طرح کے تجرباتی انسلاکات اپنے تخلیقی مدارج کے ساتھ آئیں تو یہ لفظ و معنی کو نیا اسلوب بھی دے سکتے ہیں اور وسعت بھی۔

ایرج بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں، نظموں میں جو اساطیری فضا بکھری ہوئی ہے وہ ان تضادات کا رد عمل ہے جو انسان اور کائنات کے درمیان صدیوں سے بنے ہوئے ہیں۔ ذاتی مسائل اور الجھنوں کو اجتماعیت سے علیحدہ کر کے دیکھنا اور پھر خود کو گم ہوتے ہوئے نہ روک پانا، کسی اعتماد و ایقان کو بنیاد بنا کر ایک مخصوص ذہنی ساخت میں دنیا کو سمو دینا یہ سب کچھ ایرج کی نظموں سے نمایاں ہے۔

صفحات ۱۲۸ ● قیمت تیس روپے ● مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۳ء ● کہکشاں لوگام، سری نگر (کشمیر)

گلِ خود رو ــ شائستہ یوسف ایک نئی اور ابھرتی ہوئی شاعرہ ہیں۔ یہ ان کا اولین شعری مجموعہ ہے جس میں ۵۴ نظمیں، دس غزلیں اور ۲۵ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں میں بھی اشعار کی تعداد تین یا چار سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان میں اردو شاعری کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونے والی خواتین کی تعداد ہمیشہ سے کم ہی رہی ہے حالانکہ چار سو سالہ شعری روایت کے تسلسل میں بہت سے نام لئے جا سکتے ہیں اور اچھی شاعرات ہر دور میں اپنا کردار ادا کرتی رہی ہیں لیکن یہ کبھی بھی نہیں ہوا کہ ان کی ترتیب و تدوین کی طرف توجہ دی جا سکے۔ پاکستان میں شاعرات کو ابھرنے کے مواقع زیادہ سے زیادہ میسر آئے اور وہاں بعض بالکل نئی آوازیں اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ روشن ہوئیں جن کے یہاں شعری اظہار ایک نئے اسلوب و آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوا اور اعتبار و تقلید کا درجہ اختیار کر گیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستانی شاعرات نے اس نئے لب و لہجے کو وہاں سے مستعار لیا ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض بہت ہی منفرد شاعرات دوسروں کے لئے شاہراہ بنی ہیں۔ شائستہ یوسف ایسی ہی گذرگاہ کی ایک خوبصورت شاعرہ ہیں جن کے یہاں نسائی مزاج کے محور پر جذبات و احساسات کے پیکر، زندگی کے گمبھیر مسائل، عورت کی نفسیات، مرد کو اپنے وژن میں دیکھنے کا عمل ایک نئی صناعی کے ساتھ شاعری کا اسلوب اور موضوع اپنے محسوسات کو بغیر کسی پیچیدہ تخلیقیت سے کہیں سادہ تو کہیں بیانیہ مصوری کے ذریعہ اجالنا، اپنی ذات کو بنیاد بنا کر کبھی کہانی ہو جانا تو کبھی جذباتی کشمکش کی دل پذیر تصویریں بن جانا نرم نرم درشت الفاظ کے سہارے اپنی بات کہنا ایک اچھی شاعرہ کا تعارف نامہ ہے۔ اپنی نثری نظموں میں ڈرامائی عناصر کے ساتھ چھوٹے چھوٹے خوبصورت منظر نامے ترتیب دینے کا سلیقہ ان سے بہت سی امیدیں باندھتا ہے کہ وہ اپنے تخلیقی سفر میں اور زیادہ گمبھیر زیادہ عمیق اور زیادہ منفرد ہوں۔

صفحات ۱۲۸ ● قیمت ۳۰ روپے ● مطبوعہ ۱۹۸۵ء ● ۲۵ چنا سوامی مدلیار روڈ، سکر ٹاؤن بنگلور

امکانات

عبد اللہ کمال ــــ ایک نہایت ہی زرخیز ذہن رکھنے والا تخلیق کار ہے جو نقاد بھی ہے، ادیب بھی اور صحافی بھی۔ اسے زندگی کی تمام ترسچائیوں اور پیچیدگیوں کو حوصلہ مندی کے ساتھ قبول کرنا آتا ہے، کیوں کہ وہ کسی لمحے سے سمجھوتہ نہیں کرتا۔ خود اعتمادی اس کا ایمان ہے اور وہ ہر لمحہ کو پوری طرح جینا جانتا ہے۔ کمال کے یہاں تجربوں کی فراوانی ہے، وہ کبھی شاعری کی مروجہ ہیئتوں میں موضوع و مواد کا ارتسام کرتے ہیں تو کبھی اپنے لب و لہجہ کے ذریعہ شکست و ریخت کرتے ہیں، انہیں خوبصورت پیکروں کو خلق کرنے کا فطری سلیقہ آتا ہے۔ زبان و بیان کا فنی ادراک اور رچاؤ جس میں بھرپور شعریت

می موہبت کم فن کاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ نئے فن کار اس طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں یا پھر اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ کمال کے یہاں نہ تو نام نہاد ترقی پسندی کا شور ہے اور نہ ہی غیر تخلیقی جدیدیت کی فضا بندی بلکہ پل پل گزرتی زندگی سے ہم آہنگی اور روزانہ کے تجربوں اور وارداتوں کو محض اپنی ذات تک محدود کئے بغیر دوسروں کو اس میں شامل کرنے کا عمل ہے یہ تجربے اور وارداتیں سب کی اپنی معلوم ہوتی ہیں۔

رشید افروز ــــ کو گاہے گاہے جب بھی ادبی رسائل یا شاعری کے انتخابات میں پڑھا تو یہی احساس ہوا ہے کہ وہ ایک ایسا فن کار ہے کہ جس کا تخلیقی ذہن نظم و غزل کے سانچے میں وسعتوں کی دنیا لئے ہوئے ہے۔ جو صرف متاثر ہی نہیں کرتا بلکہ ذہن کو متحرک بھی کرتا ہے۔ رشید افروز کی پوری شاعری میں عمل اور ردِ عمل کی شعری کشمکش اسے قابلِ توجہ بناتی ہے۔ علامتوں اور استعاروں کا التزام چونکہ شعوری نہیں لہذا غزل و نظم میں الجھاؤ تشکیک یا ابہام کی بے محل فضا نہیں ملتی۔ غزلوں سے زیادہ نظموں میں چمک اور تازگی ہے لیکن غزلوں میں جو دھیما پن ہے وہ بھی نظموں ہی کا دوسرا روپ ہے۔ رشید افروز کی شاعری معنویت کی ایک ایسی گونج لئے ہوئے ہے جو آواز بن سکتی ہے۔

ش ک نظام ــــ ایک شاعر، نقاد اور ادیب کی حیثیت سے نئی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک ذہین فنکار ایک فطری تخلیق کار جو اپنی غزلوں اور نظموں میں نت نئے خواب جہان بناتے ہیں اور چونکاتے ہیں۔ تصویروں اور منظروں میں بعض ایسے خوش نما رنگوں کا امتزاج پیش کرتے ہیں کہ ہر رنگ کا اپنا لہجہ، اپنی آواز اور الفاظ اس کے اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ ہر رنگ سے ابھرنے والے متنوع پیکر جذبہ و فکر کا خوب صورت سنگم ہوتے ہیں۔ غزل کی مخصوص ہیئت میں نرم نرم الفاظ کی موسیقی آمیز تخلیقی ترتیب میں شعریت اور اثر پذیری ہے۔ نظام کی نظمیں ایجاز و اجمال سے مملو ہیں۔ خیال کو پیکروں میں مکتوم کرنا اور پھر نئے نئے معنی کو راہ دینا۔ اپنے آپ سے الجھنا، غصہ ہونا، ذہنی تناؤ کا سوالوں میں بکھرنا، حیرتوں کے آئینہ خانے ان کی نظموں میں سجے ہوئے ہیں اور قاری ان کے شعری سفر میں ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

رؤف خیر ــــ کا تعلق نئی نسل کے بعض ان شعراء میں سے ہے جن کے یہاں اچھی اور نئی شاعری دونوں ہی کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ رؤف خیر کی شاعری میں انحراف، تلاش، تجسس، مشاہدے، ذاتی تجربے اور تجزیئے معانی کے نئے نئے جہان بناتے ہیں۔ ان کی مخصوص ذہنی ساخت ایک مستحکم اور واضح نشانِ راہ متشکل ہوئی ہے۔ انہوں نے تخلیقی سطح پر تلمیحات کو عصری مسائل سے منطبق کر کے اپنی شاعری کو زیادہ نیا اور بامعنی بنانے کی کوشش کی ہے۔ نظم و غزل اور ترائیلے ان کا وسیلۂ اظہار ہیں جن میں خوب صورت پیکر سازی اور بیانیہ کے تخلیقی رنگ ڈھنگ شعری روایت کی توسیع معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے خلاؤں میں شاعری نہیں کی بلکہ آزادانہ فضاؤں میں بے زمین ہوئے بغیر شعر کہے ہیں۔

شہنشاہ مرزا ــــ کو نئی نظم کی تعمیر و تشکیل کا بھرپور شعری ادراک ہے۔ ان کے یہاں نظم کا خود کار ڈھانچہ سطر بہ سطر جو آہنگ بناتا ہے وہ پہلے سے موجود میکانیکی سانچوں کو رد کرتا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات و مواد میں نئی نسل کی غصہ وری 'بکھراؤ'، بے یقینی اور احتجاج اپنی پوری شدتوں کے ساتھ آتا ہے۔ نثری اوقاف میں مربوط اور نامیاتی آہنگ کی موجودگی کے باوجود پابندیوں اور حد بندیوں کی نا قبولیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ شدت آمیز سوچ کی ترسیل ہی ان کا بنیادی مسئلہ ہے، وہ لغوی الفاظ و معنی سے گریز نہیں کرتے اور نہ ہی لفظوں کو اپنے پر حاوی کرتے ہیں۔

فاروق شفق ــــ کی شعری شخصیت میں جمالیاتی تناسب نغمگی اور موسیقیت اور لفظیات میں تخلیقی سلیقگی متاثر کرتی ہے۔ موضوع و مواد اور الفاظ کے انتخاب اور ان کی پیش کش میں نہ تو تجریدیت ہے اور نہ الجھاوے بلکہ وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے محسوسات کی تجسیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی توجہ زیادہ سے زیادہ شعریت پر ہے، مترنم بحروں میں لفظ لفظ لہجے کا دھیما پن اپنی بات کہتا جاتا ہے حالانکہ یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ یہ موضوع یا اسلوب ایک بازگشت ہے جو اس سے قبل بھی سنی جا چکی ہے۔ دراصل غزل کے بنیادی مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے عصر کو کشید کرنے کا عمل اس طرح کے گمان پیدا کرتا ہے۔ فاروق شفق کی شاعری میں اخذ و جذب اپنی پوری سچائیوں کے ساتھ نئی شاعری کے بہتر امکانات کو تقویت دیتا ہے۔

منور رانا ــــ کا شعری لہجہ نہایت ہی بے باک اور بے حد طنزیہ اور کاٹ دار ہے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی سچائیوں اور اس کی تلخیوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں اس طرح بہت صاف اور واضح پیکر اور منظر نامے بنتے چلے جاتے ہیں۔ معنی کی تہہ داری پر شدت آثار جذبہ زیادہ حاوی نظر آتا ہے اس طرح انحراف و تقلید کی کشمکش اور شعری روایت کے ردّ و قبول سے جو ہیجانی کیفیت بنتی ہے وہ غزل میں من و عن ابھر آتی ہے۔ وقت کے تسلسل سے ابھرنے والے زندگی کے ناگزیر تضادات کبھی تجربہ تو کبھی مشاہدہ بن کر ان کی غزل میں آتے ہیں اسی طرح کسی غیر معمولی شاعری کا تصور، تجریدیت، ابہام ذہنی کسی تجسیمی شکل کے بجائے

ت واقعہ کے سبب یہ شاعری براہ راست اور فوری اثر پذیری سے مملو نظر آتی ہے لیکن جہاں عصری حسیت اپنی پوری تخلیقیت کے ساتھ شعری تجربہ بن کر سامنے آتی ہے
تک نئے نئے ابعاد خلق ہوتے چلے جاتے ہیں ان میں شعریت بھی ہوتی ہے اور ارتکاز بھی ___

عبید صدیقی ___ کی فکری اساس ان کی شعری روایت ہے۔ ان کا لہجہ اور اسلوب اس روایت کا آج ہیں اور اس آج میں ان کا عصر جلوہ گر ہے۔
ات و تراکیب سے جو پیکر ابھرتے ہیں ان میں کردار واقعات عبید کے وہ خواب ہیں جو انسان کے معاشرتی اور تمدنی جغرافیے کی کشمکش اور تضادات سے
لیتے رہتے ہیں۔ عبید کا خلاقانہ ذہن شاعری کی خارجی میکانکی حد بندیوں اور الفاظ کی صناعی پر توجہ کے بجائے جذبے کی شدت کے الاؤ روشن کرنے کو
رہ اہمیت دیتا ہے چنانچہ ان کے محسوسات کے منطقے بغیر کسی الجھاوے کے ایک پسندیدہ فضا بناتے ہیں۔ نئے شعرا میں عبید صدیقی کی شعری انفرادیت
رنگ و روپ نکھار رہی ہے۔

بنت پرمار ___ کی شاعری لفظ و بیان کی تازہ کاری کا خوشگوار احساس دیتی ہے۔ تجربہ پسند ذہن صوت و معنی کے نئے جہانوں
یر کا خواہشمند ہے غزل و نظم میں مختلف النوع تخلیقی جہتوں کی کشیدہ کاری کرنا، علامتوں اور استعاروں سے اپنے تجربوں اور محسوسات
ظ لفظ پیکر بنا، کسی نئے اسلوب کی تخلیقی تلاش میں لسانی سطح پر شکست و ریخت کرنا، الفاظ کی تجریدیت اور تخیل کی وسعتوں کو تلاشنے کی کوشش مسلسل
۔ نئے شعرا کی فہرست میں وہ جو بہت نمایاں ہیں اور آنے والے کل کی معتبر آواز بن جائیں گے ان میں جینت پرمار کے لئے بہ آسانی جگہ بنائی جا سکتی ہے۔

شہپر رسول ___ کی شاعری وہ تخلیقی دستاویز ہے جس میں نئے انسان کے خواب رقم ہو رہے ہیں ان کی شعری سرگزشت میں عصری
گونج کو سنا جا سکتا ہے۔ شاعری میں اپنے عہد کی روح کو سمونے کی کوشش، خوابناک لہجے کی گدازیت، نئے تخلیقی امکانات کی جستجو انہیں تازہ دم رکھتی
وہ علامتوں اور استعاروں میں گفتگو تو کرتے ہیں لیکن یہ گفتگو ابھی سرگوشیوں سے آواز کی سمت سفر میں ہے۔ نئی نسل کے فکری رویوں کی تفہیم اور
اعری میں اس کی توثیق کا عمل شہپر رسول کے یہاں کے یہاں مسلسل ہے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا شعری تدوقت کے ساتھ پھیل کر اور زیادہ خوبصورت لگے گا۔

شوق شہری ۔ کی شاعری میں تجربے اور واردات کا سیال، رومان اور احتجاج کے پیکروں میں متشکل ہوتا ہے۔ وقت کی سفاکی اور اپنی
بکھراؤ، جدید انسان کی بے بسی اور اپنی تہذیب کی بازیافت کی خواہش، انسانی دردمندی اور آشوب عصر میں فرد کا گم ہو جانا۔ مروجہ الفاظ اور
وں میں اپنے محسوسات کے جگنو روشن کرنا رونق شہری کی سلیقہ مندی ہے۔ وہ اپنے تخلیقی سفر میں بتدریج آگے بڑھ رہے ہیں۔

کاشف تیواری ۔ کی شاعری میں موضوع اور فکر نئے لب و لہجہ کے ساتھ اپنی نمو کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خاموشی کی خود کلامی جو حزنیہ آہنگ بناتی ہے
تلخیاں سب کچھ رد کرنے کی خواہش، مزاحمت ذہنی تناؤ، طنز اور بے نیازی کے لہریئے تخلیقی سطح پر ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ آہنگ کے اس ارتعاش
بننے والا گراف نئے انسان کی ذہنی کشمکش اور عصری پیچیدگیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ پرکاش تیواری زندگی اور اشیا کو اپنے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں
شاعری میں ایک طرح کی جمالیاتی کسک کا احساس بھی ہے جو ان کے پورے وجود میں سرایت کر گیا ہے۔ وہ لفظ لفظ پیکر ہوتے ہوئے نئے
کی دریافت کے لئے اپنا تخلیقی سفر آراستہ کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ نئی شاعری کی معتبر آواز بن جائیں گے۔

عبد الاحد ساز ۔ کو اپنی شعری روایت کا ادراک ہے، وہ نظم و غزل میں لفظ کے استعمال کو مرکزیت کا درجہ دیتے ہیں نئی شاعری کی لفظیات کو برتتے
بھی ہے اور پرانی لفظیات کو نئے تخلیقی معنی دینے کی خواہش بھی۔ وہ لفظوں سے نت نئے پیکر تراشتے ہیں، وہ ایک ایسے نئے اسلوب کی فضا
کرتے ہیں جو ہر اعتبار سے تازہ کار معلوم ہوتی ہے۔ نئے شعرا میں عبد الاحد ساز کی انفرادیت بہت جلد اعتبار کا درجہ حاصل کر لے گی۔
یہ شاعری بالکل مختلف اور امکانات سے معمور ہے ان کے یہاں بے پناہ تخلیقی جوہر نئی شعری تہذیب کی تشکیل و تعمیر کریں گے۔

سید اقبال صدیقی ___ نئی نسل کے نہایت ہی تازہ کار شاعر ہیں جو مستحکم شعری روایت کے تسلسل سے ابھرے ہیں۔ وہ مختلف فکری
، اور جذبوں کے سیال، مجرد تراکیب کے ذریعہ جو شدت آمیز لہجہ بناتے ہیں وہ بے مدنیا اور منفرد معلوم ہوتا ہے۔ وہ تو لفظوں کے محکمانہ رویئے
برتے ہیں اور نہ ہی لفظ ان کے غلام بلکہ وہ لفظوں کو دوستانہ ماحول میں تخلیقی پیکر دیتے ہیں اس طرح استعارے، علامتیں اور پیکر ان کی شاعری
خود نمو پاتے ہیں۔ کسی اچھی اور بڑی شاعری کے لئے لسانی سطح پر شکست و ریخت اور تمام ترفنی التزام کے خارجی ساختیوں میں کائنات کو

مو دینے کی کوششیں اور ان سے انحراف کی شکلیں ضروری ہیں۔ حالانکہ شاعری میں ایسے امکانات کی چمک موجود ہے۔ حالانکہ وہ اپنے عصر کی کش کے لئے صرف شعر کی فطری تخلیق پر اصرار کرتے ہیں۔

اسعد رضوی ـــ کی شاعری میں مرتی ہوئی صدی کے نوحوں کی بازگشت ہے۔ فکری سطح پر وہ خود کو دریافت کرنے کے عمل سے گذر رہے ہیں وہ زندگی کو اس کے مسائل کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تخلیقی اظہار میں شدت آمیز لہجہ نا آسودگی کا اعلامیہ ہے۔ یہ نوجوان شاعر آج کی شا کی ابھرتی ہوئی آوازوں میں شامل ہوگا اور نئی تخلیقی فضا بندی میں معاونت کرے گا۔

بلراج کمار ـــ کے یہاں نئی شاعری کی توسیع کا تخلیقی عمل نمایاں ہے، وہ اپنے مزاج میں کسی سرپھری ہوا اور آرا کی طرح ہیں۔ عادتِ زا کے برخلاف اپنے شعری تدکی تعمیر کرنا لئے آہنگ اور ذائقہ کے ذریعہ شعری معیار قائم کرنا، لہجے میں تیزی اور ترشی، نئی نسل کے شعراء کی خصوصیت اور بلراج کمار اس خصوصیت کو تخلیقی سطح پر برتنے میں بے حد بیباک ہیں۔ موضوع اور میکانیکی ہیئت ان کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ نظموں میں زیادہ کاٹ دار لہجہ اختیار کر لیتے ہیں، ابھی بلراج کمار کی شعری شخصیت نے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا ہے جسے قدم قدم خوشگوار ہونا ہے اور نئی معیاری شاعری کے امکانا کو روشن کرنا ہے۔

شاھد لطیف ـــ کو نئی شاعری کے افق کا ایک منور ستارہ کہا جا سکتا ہے۔ تخلیقی سطح پر زندگی کو فن کارانہ روپ دینے کی خواہش لفظ کو نئے معنی دینے کی کوشش نوم جذبوں کو شعری پیکر عطا کرنے کی کاوش ان کے یہاں دعاؤں کی صورت ہے۔ کچھ کر گذرنے کا جذبہ "تلاش و تجسس" غیر تقلیدی مزاج کی جگداگا بھیڑ سے الگ چلنے کی روش، شاہد لطیف کو آگے لے جائے گی۔

حیدر صفت ـــ ایک بالکل ہی نئی شعری کونپل ہے جو ہر زاویئے سے خوب صورت اور خوش رنگ ہے، اس میں زندگی کی مہک ہے، جینے اور پھلنے کی خواہش ہے۔ افند و تہذیب کی شدتیں ہیں، جمالیاتی احساس ہے، شعر، روایت کا شعور ہے۔ تخلیقی تحور اپنے نقش و نگار ابھار رہے ہیں دعاؤں کی نرم مٹی میں زرخیزی ہوگی تو ریاضت، اکتساب اور استغراق کی آب رسانی میں یہ کونپل اپنا بھرپور شعری قد بنا لے گی۔ ◆◆

بقیہ صفحہ ۱۶ روبوٹ

بناکر روبوٹ کو حکم دیتے تھے۔ کھانا لاؤ۔ پانی لاؤ۔ پھول لاؤ۔ وہ کھڑکی بند کردو۔ دروازہ بند کردو۔ بجلی بند کردو۔ روبوٹ واقعی ایک فرما گر خاموش نوکر کی طرح کام کرتا رہا تھا۔ گر پچھلے تین دن سے جب بابو جی نے دروازہ نہیں کھولا اور محلے میں بدبو پھیلنے لگی تو آج صبح ہم۔ پولیس کی مدد سے دروازہ توڑا اور ایک بھیانک منظر ہم لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تھا، اف! ہم نے دیکھا کہ روبوٹ نے بابو جی کا گلا دبایا ہوا تھا اور غالباً وہ بابو جی کے اگلے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ ◆◆

"شاعر" کے لئے نایاب تصویریں، تحریریں اور خطوط ارسال کیجیے۔ ہم آپ کے شکریے کے ساتھ انھیں شائع کریں گے اور بہ حفاظت آپ تک پہنچا دیں گے۔

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری دسمبر ۱۹۸۵ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۸۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر نعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس [illegible] میں چھپوا کر [illegible] سے شائع کیا۔

Accession Number
86095